7

مرقاة المفاتيح

شرح اردو

مشكوٰة المصابيح

للعلامه الشيخ القارى على بن سلطان محمد القارى

مترجم: مولانا راؤ محمد نديم

مكتبة رحمانية

مرقاۃ المفاتیح اردو

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری هجری ۱۰۱۴

شرح

مشکوٰۃ المصابیح

للامام العلامۃ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی المتوفی ۷۴۱

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

جلد ہفتم

مکتبہ رحمانیہ

اقرأ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 37355743-37224228-042

MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: .... مِرقاۃ المفاتیح اردو (جلد ہفتم)

مترجم: .... مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

الموضوع

كِتَابُ الْقِصَاص

قصاص کا بیان

لُغوی تشریح:

''قصاص'' قاف کے کسرہ کے ساتھ ''مقاصّة'' کا مصدر ہے۔ ''مقاصّة'' کے معنی ہیں ''مماثلت'' (چنانچہ قصاص میں بھی مماثلت ہوتی ہے۔) یہ ''قصّ الاثر'' سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں کسی کے پیچھے جانا۔ وجہ مناسبت واضح ہے کہ مقتول کا ولی قاتل کا پیچھا کرتا ہے۔ ''المغرب'' میں ہے کہ ''القصّ'' کے معنی ہیں ''القطع'' کاٹنا ''قصاص الشعر'' بال کٹنے کی جگہ بال نکلنے کی منتہیٰ پیشانی سے لے کر سر کے اطراف تک جگہ، اسی سے لفظ ''قصاص'' نکلا ہے جس کے معنی ہیں مقتول کے ولی کا قاتل سے قتل کے بدلے قتل میں اور مجروح کا جارح سے زخم کے بدلے زخم میں برابر کا بدلہ لینا۔ پھر اس لفظ کا استعمال ہر مساوات کے لئے ہونے لگا۔

الفصل الاول:

قتل مسلم کے جواز کی صورتیں

۳۴۴۶: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَّا بِاِحْدٰى ثَلَاثٍ: اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالثَّيِّبُ الزَّانِيْ، وَالْمَارِقُ لِدِيْنِهِ التَّارِكُ لِلْجَمَاعَةِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٢/ ٢٠١ رقم ٦٨٧٨۔ ومسلم في ٣/ ١٣٠٢ رقم (٢٥۔١٦٧٦)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو مسلمان شخص اس امر کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشک میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں' اس کا خون

بہانا حلال نہیں ہے' اِلا یہ کہ ان تین باتوں میں سے کوئی پیش آ جائے: ① جان کے بدلہ جان (یعنی قاتل کو بطور قصاص قتل کرنا) ② شادی شدہ (مسلمان' مکلف اور آزاد) کا زنا کرنا (اس کو سنگسار کیا جائے)۔ ③ اپنے دین سے نکلنے (یعنی مرتد ہونے) اور اپنی جماعت کو چھوڑنے والا (یعنی جو مسلمان مرتد ہو جائے اس کو قتل کرنا جائز ہے)''۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: لا یحل دم امریٔ...الا باحدی ثلث: لایحل دم امری: ای اراقتہ : یعنی خون بہانا۔ عرف میں یہ معنی واضح ہیں۔ لہٰذا ''**لا یحل دم امرء**'' میں کسی قسم کا کوئی اجمال ہے اور نہ اس تحریم میں جو مضاف الی الاعیان ہو۔

''**امریءٍ**'' سے مراد انسان ہے چونکہ اس حکم میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں۔ البتہ مرتدّہ کا حکم آگے آ رہا ہے۔

''**مسلم**'' صفت مقیدہ ہے ''**امریٔ**'' کے لئے۔

تشہد ان۔۔۔۔وأنی رسول اللہ: اس گواہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے وجود، وجوبِ وجود، توحید و تمجید کا علم اعتقاد و یقین رکھے اور یہ کہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔

قولہ متفق علیہ: جامع الاصول میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو اصحابِ ستہ نے سوائے ابن ماجہ کے سب نے ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ متن میں مذکورہ روایت کے الفاظ صحیحین کے ہیں۔ جامع الاصول کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **لا یحل دم امری مسلم یشہد ان لا الہ الا اللہ وأنی رسول اللہ إلا باحدی ثلاث :الثیب الزانی' والنفس بالنفس' والتارک لدینہ المفارق للجماعۃ**۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اربعین میں یہ جملہ ''**یشہد أن لا الہ الا اللہ**'' ساقط کر دیا ہے۔ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں: **کذا ہذہ الزیادۃ فی روایۃ' واللّٰہ اعلم بما فیہا**۔

صاحب مشکوٰۃ نے باوجودیکہ آغازِ کتاب میں صحیحین اور جامع الاصول کے تتبع کا التزام کیا ہے لیکن یہاں اس کی مخالفت کی ہے اور **الثیب الزانی** کو **النفس بالنفس** سے مؤخر کر دیا ہے حالانکہ ہماری ذکر کردہ روایت میں رتیب برائے ترقی ہے۔ اس طور پر کہ زنا کا درجہ قتل سے کم ہے اور قتل کا درجہ ارتداد سے کم ہے۔ یہ بات نہ کہی جائے کہ ''واؤ'' ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی۔ چونکہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ حکیم و فصیح ذات کے کلام میں ترتیب ذکری معتبر ہے۔ مثلاً نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشادِ گرامی ملاحظہ فرمائیے: **ابدأ بما بداللہ بہ ان الصفا والمروۃ**......۔

مشکوٰۃ کے نسخوں میں لفظ ''زانی'' یاء کے ساتھ ''الزانی'' ہے۔ بخاری کی روایت میں اور مسلم کے بعض نسخوں میں بھی یوں ہی ہے۔ لیکن امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں۔ اسی طرح کئی نسخوں میں ''الزان'' بغیر یاء کے ہے۔ یہ لغت بھی صحیح ہے۔ چنانچہ اس آیت مبارکہ: ﴿**الکبیر المتعال**﴾ میں قراءتِ سبعہ کی ایک قراءت بغیر یاء کے ہے۔ اثبات یاء کی لغت زیادہ مشہور ہے۔

الا باحدی ثلاث : حدیث مبارکہ کا یہ جملہ ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی مسلمان کو ان تین باتوں کے علاوہ کسی اور وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا؟ مثلاً ترکِ صلوٰۃ۔ ہمارے ہاں تارکِ صلوٰۃ کو قتل کرنا جائز نہیں۔

اربعین نے بعض شراح فرماتے ہیں جمہور کی رائے اس کے مخالف ہے۔ان کا استدلال اس حدیث سے ہے: من ترك الصلاۃ متعمدا فقد کفر۔امام شافعی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے: أی استحق عقوبۃ الکفر۔ یعنی ایسا شخص کفر کی سزا کا حقدار ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ حدیث باب کا حصر اس کے قتل کی نفی کر رہا ہے۔لہٰذا اس قسم کے استدلال کے ذریعہ یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوسکتا۔علاوہ ازیں یہاں دیگر احتمالات بھی ہیں۔چنانچہ اس کی متعدد تفسیریں ہیں:

① ایسا شخص کفر کے دہانہ پر پہنچ گیا۔
② اس کا یہ عمل کفر کے مشابہ ہے۔
③ ایسے شخص پر کفر کا اندیشہ ہے۔
④ کفر سے مراد کفران (یعنی ناشکری) ہے۔
⑤ اس سے مراد مستحل (اس کے ترک کو حلال سمجھنے والی ہے۔
⑥ وہ شخص مراد ہے جو اس کی فرضیت کا منکر ہو۔
⑦ زجر شدید مراد ہے جیسا کہ حج کے بارے میں فرمایا: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [آلِ عمران: ٩٧] کہ حج نہ کرنے کو ''کفر'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

قولہ: النفس بالنفس:

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''النفس بالنفس'' سے مراد قصاص بشرط ہے۔(حدیث) اس جملہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے ''المسلم بالذمی والحر بالعبد'' پر بھی استدلال کیا ہے اور جمہور، امام مالک، امام شافعی، امام لیث اور احمد رحمۃ اللہ علیہم اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں ہمارے مذہب کی تائید اس آیت مبارکہ سے بھی ہوتی ہے: ﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ [المائدۃ: ٤٥] البتہ اس آیت مبارکہ: ﴿ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ [البقرۃ: ١٧٨] کا مفہوم مخالف ہمارے نزدیک معتبر نہیں ہے۔خصوصاً جب کہ منطوق موجود ہے، مزید یہ کہ آیت کے باقی حصہ ﴿ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى﴾ [البقرۃ: ١٧٨] کے مفہوم مخالف کے معتبر نہ ہونے پر اتفاق ہے۔ضمیر②:

عرضِ مرتب:

زانی کی سزا کے تفصیلی احکام ''کتاب الدیات'' کے ذیل میں آئیں گے۔اھ

قولہ: المارق لدینہ:

اس سے مراد ''الخارج عن الدین'' (دین سے خارج شخص) ہے۔لفظ مارق، مروق سے مشتق ہے۔مروق کے معنی ہیں ''خروج'' نکلنا۔لفظ مرق بھی اسی سے ماخوذ ہے۔''مرق'' اس پانی کو کہتے ہیں جو گوشت پکاتے وقت اس سے نکلتا ہے۔(اردو والے اسے ''شوربہ'' کہتے ہیں)

امام طیبی فرماتے ہیں اس کا خون مسلمانوں کے حق میں رائیگاں ہے' اس کے قاتل پر قصاص نہیں ہے۔ ہاں! اگر اس کو کسی ذمی نے قتل کر دیا تو یہ صورت مختلف فیہ ہے۔

التارك للجماعة "المارق" کے لئے صفت مؤکدہ ہے۔ یعنی وہ شخص جس نے مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ دیا ہو۔ ان میں سے نکل گیا ہو اور اس ارتداد کو اختیار کر لیا جو اسلام کے لئے قولا یا فعلا یا اعتقاد قاطع ہو۔ پس ایسا شخص اگر توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے اور اس "مسلما" ارشاد فرمان باعتبار ما کان (یعنی ماضما کے اعتبار سے ہے' بدعتی یا نامی اجماع شخص مراد نہیں ہے۔ مثلا روافض اور خوارج۔ بدعتی و روافض کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

قاضیؒ فرماتے ہیں "**یشهد**" اپنے متعلق سے مل کر صفت ثانیہ ہے جو لفظِ "**مسلم**" کی توضیح و بیان کی غرض سے لائی گئی ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ

"مسلم" سے مراد شہادتین بجالانے والا ہے۔ اور محض کلمہ شہادت پڑھ لینا عصمت کے لئے کافی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر "**یشهد**" حال ہے جو موصوف کے ساتھ صفت کو مقید کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی مشیر ہے کہ شہادتین خون کے محفوظ کرنے میں اصل ہیں۔ اس کی تائید حدیثِ اسامہؓ میں نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے:

"**کیف تصنع بلا اله الا اللّٰه**"۔

ثلاث سے مراد تین خصلتیں ہیں: ① کسی کو ناحق قتل کرنا ② محصن کا زنا کرنا ③ دین اسلام سے نکل جانا۔ آگے ان موجب قتل کاموں کے متصفین کا تفصیلی تذکرہ ہے

"**النفس**": مجرور ہے لیکن منصوب و مرفوع پڑھنا بھی درست ہے۔ نیز اگلے معطوفات میں بھی یہی وجوہ اعراب ہیں۔ مرفوع پڑھنے کی صورت میں مبتدا کی خبر، مجرور پڑھنے کی صورت میں بدل، اور منصوب پڑھنے کی صورت میں "أعنی" فعل محذوف کا مفعول بہ ہے۔ لیکن روایت جرّ کے ساتھ ہے۔ اھ۔ شاید کہ کازرونیؒ کی روایت جر کے ساتھ ہو' ورنہ اس طرح کی تراکیب میں مجرور پڑھنا مشہور ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ کے اس فرمان میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الفاتحة:۲]۔

"**النفس**" سے پہلے یہاں مضاف محذوف ہے۔ مضاف محذوف میں دو احتمال ہیں: ① "**قاتل**" مضاف محذوف ہے ای قاتل النفس بالنفس۔ اس صورت میں مابعد اس کے موافق ہو جائے گا۔ یعنی قاتل النفس بالنفس والثیب الزانی والمارق لدینہ (اس صورت میں موجب قتل کاموں کے متصفین کا بیان ہوگا۔) "**أی قتل النفس**" (معنوی اعتبار سے) تقدیری عبارت یوں ہے: **قتل النفس وزنا الثیب و مروق المارق**۔ اس تقدیر کی صورت میں یہ ان تین خصلتوں کا بیان ہوگا۔

"**بالنفس**"، فعل مقدر کے متعلق ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: **قتل ملتبس بالنفس**۔ (کذا قیل) زیادہ ظاہر یہ ہے کہ "باء" برائے "مقابلہ" ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: **قتل النفس المقتص بالنفس** اور قتل سے مراد قتل ناحق ہے کیونکہ قتل برحق کا حکم یہ نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ "**قتل النفس بالنفس التی قتلها عدوانا** کا حق صرف ولی الامر کو ہے اس

کے علاوہ کسی اور کو یہ حق وصول کرنے کا حق نہیں حتیٰ کہ اگر غیر ولی الامر نے کسی کو قصاصاً قتل کر دیا تو اس قاتل پر قصاص لازم آئے گا۔

۳۴۴۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يَزَالَ الْمُؤْمِنُ فِيْ فُسْحَةٍ مِنْ دِيْنِهٖ مَا لَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری ۱۸۷/۱۲۔ الحديث رقم: ۲۸۶۲

ترجمہ:''اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''جب تک مؤمن کی حرام خون (یعنی ناحق قتل) کا مرتکب نہ ہو وہ ہمیشہ اپنے دین کی وسعت میں رہتا ہے''۔(بخاری)

تشریح:قوله: لن يزال المؤمن فی فسحة من دته ......:

فسحة: فاء کے ضمہ، سین کے سکون اور حاء مہملہ کے فتحہ کے ساتھ ہے بمعنی سعة(گنجائش، وسعت، کشادگی)۔

آنحضرت کے اس ارشاد گرامی کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① جب تک کوئی شخص کسی کو ناحق قتل نہیں کرتا اپنے رب سے رحمت کی امید میں رہتا ہے۔

② ابن الملکؒ فرماتے ہیں: جب تک کوئی شخص کسی کے ناحق خون سے اپنا ہاتھ نہیں رنگتا اس کے لئے دین کے امور سہل رہتے ہیں اور عمل صالح کی توفیق عطا ہوتی ہے۔

③ امام طیبیؒ نے فرمایا: جب تک کوئی شخص کسی کے خونِ ناحق سے ہاتھ نہ رنگے، اگر چہ کبائر کا مرتکب ہو، اس کے لئے رحمتِ باری تعالیٰ اور لطف و کرم کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن جب ناحق قتل کرتا ہے تو اس پر تنگی مسلط کر دی جاتی ہے اور وہ ان لوگوں کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے جو رحمت خداوندی سے ناامید و محروم ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آتا ہے:

''من أعان علی قتل مؤمن ولو بشطر كلمة لقی اللّٰه مكتوب بين عينيه آيس من رحمة اللّٰه''۔

بشطر كلمة سے مراد بعض حضرات نے یہ لیا ہے کہ مثلاً ''اقتل'' پورا نہیں کہا بلکہ صرف ''اُق'' کہا۔

④ اس حدیث کا مطلب وہ بھی ہوسکتا ہے جو فصل ثانی کی حدیث میں آرہا ہے: **''لا يزال المؤمن معنقا صالحًا''** یعنی مؤمن کو نیکی کی توفیق ملتی رہتی ہے اور نیکیوں میں تیزی سے بڑھتا رہتا ہے جب تک کہ قتل ناحق کا ارتکاب نہ کرے۔ جب وہ ایسا کر گزرتا ہے تو اس ارتکاب گناہ کی نحوست کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

طبرانی نے یہ روایت قتادہ بن عیاش سے ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے:

''لن يزال العبد فی فسحة من دينه مالم يشرب الخمر ،فاذا شربها خرق اللّٰه عنه ستره وكان الشيطان وليه وسمعه وبصره ورجله يسوقه الی كل شر ويصرفه عن كل خير'' (كذا فی الجامع الصغير)

فائدہ: اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مطلقاً کبائر سے بچنا ضروری ہے اور نا صرف مذکورہ بالا افعال بلکہ اس جیسے دوسرے افعال سے بھی بچنا ضروری ہے۔ مختلف احادیث میں مختلف افعال کا ذکر موقع محل کی مناسبت سے ہے۔ واللہ تعالیٰ

خونریزی کی اہمیت کا بیان

۳۴۴۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الدِّمَاءِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۸۷/۱۲ الحديث رقم ٦٨٦٤۔ ومسلم فی ۱۳۰٤/۳ الحديث رقم (۲۸۔ ۱٦۷۸)۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں (یعنی مؤمنین) کے درمیان خون کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: یوم القیامة: یہ یقضی کا مفعول فیہ ہے۔ فی الدماء: یہ ''أول ما یقضی'' کی خبر ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے دماء کے معاملہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ بظاہر یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بظاہر معارض ہے: ''أول مایحاسب به العبد صلاته'' ترجمہ: (قیامت کے دن) سب سے پہلے بندہ سے نماز کا محاسبہ ہوگا۔

اس تعارض کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں:

① یہ حدیث حقوق اللہ سے متعلق ہے اور حدیث باب حقوق العباد سے متعلق ہے۔

② ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: حدیث باب کا منہیات کے قبیل سے ہونا زیادہ واضح ہے اور محاسبۂ صلاۃ والی حدیث مأمورات سے متعلق ہے۔

③ پہلی حدیث کا تعلق محاسبہ سے ہے اور دوسری کا تعلق فیصلہ سے ہے۔ اس توجیہ کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس مرفوع حدیث سے ہوتی ہے جو نسائی نے ذکر کی ہے:

''أول ما يحاسب العبد عليه صلاته، وأول ما يقضى بين الناس في الدماء''

حدیث سے اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی حقیقی چیز نماز ہے چونکہ محاسبہ فیصلہ سے پہلا ہوتا ہے۔ یہ حدیث درحقیقت اللہ جل شانہ کے ان فرامین سے مقتبس ہے:

① ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ [المومنون: ۱۔۲]

''بالتحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں''

② ﴿اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ [المعارج: ۲۲۔۲۳]

''مگر وہ نمازی (یعنی مؤمن) جو اپنی نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں''۔

کلمہ گو کو قتل کرنے کی مذمت کا بیان

۳۴۴۹: وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ' اَنَّهٗ قَالَ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَاَيْتَ اِنْ لَقِيْتُ رَجُلاً مِنَ الْكُفَّارِ' فَاقْتَتَلْنَا فَضَرَبَ اِحْدٰى يَدَيَّ بِالسَّيْفِ فَقَطَعَهَا ثُمَّ لَاذَ مِنِّیْ بِشَجَرَةٍ فَقَالَ: اَسْلَمْتُ لِلّٰهِ ـ وَفِیْ رِوَايَةٍ : فَلَمَّا اَهْوَيْتُ لِاَقْتُلَهٗ قَالَ : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَقْتُلُهٗ بَعْدَ اَنْ قَالَهَا قَالَ : لَا تَقْتُلْهُ فَقَالَ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّهٗ قَطَعَ اِحْدٰى يَدَيَّ' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَقْتُلْهُ فَاِنْ قَتَلْتَهٗ فَاِنَّهٗ بِمَنْزِلَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَقْتُلَهٗ' وَاِنَّكَ بِمَنْزِلَتِهٖ قَبْلَ اَنْ يَقُوْلَ كَلِمَتَهُ الَّتِیْ قَالَ . (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۲/۱۸۷ الحديث رقم ٦٨٦٥ـ ومسلم فی صحيحه ۱/۹۵ الحديث رقم (۱۵۵ـ ۹۵)ـ

ترجمہ: ''اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! مجھے بتائیے کہ اگر میرا کسی کافر شخص سے مقابلہ ہو جائے اور ہمارے درمیان لڑائی چھڑ جائے (اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے کے قتل کے درپے ہو جائے) اور وہ (کافر) میرے ایک ہاتھ پر تلوار کے ذریعے وار کر کے اس (ہاتھ) کو کاٹ دے اور پھر ایک درخت کی آڑ میں مجھ سے چھپ کر یہ کہے کہ میں خدا کے لئے مسلمان ہو گیا اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اور جونہی میں نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا' اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا تو کیا میں اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے کے بعد اس کو قتل کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کو قتل نہ کرو''۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! اس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا ہے (اس کے باوجود میں اس کے درپے نہ ہوں)؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (اس کے باوجود) اس کو قتل نہ کرو کیونکہ اگر تم نے اس کو قتل کر دیا تو وہ اس جگہ پہنچ جائے گا جہاں تم اس کو قتل کرنے سے پہلے تھے اور تم اس جگہ پہنچ جاؤ گے جہاں وہ کلمہ پڑھنے سے پہلے تھا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: يارسول الله أرأيت ـــ فقال: أسلمت لله**: لاذ ''لیاذ'' سے مشتق ہے بمعنی ''العیاذ'': (پناہ لینا)۔

محل' آلہ اور جائے پناہ (ہاتھ پر تلوار مارنا اور درخت کے پیچھے چھپنا)

یہ قیودات احترازیہ نہیں بلکہ فرضی اور غالبی ہیں۔

أقتله: ایک نسخہ میں استفہام محذوف ہے۔

قالها: **ای قال هذه الكمة**۔ اور ایک نسخہ میں ''**قالها**'' کی بجائے ''**قاله**'' ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد ''**قال هذا اللفظ**'' ہوگا۔

قوله: قال لا تقتله:

قاضیؒ فرماتے ہیں: یہ اس بات کو لازم ہے کہ اس پر اسلام کا حکم لگایا جائے۔ نیز اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ

''مکرہ'' کا اسلام صحیح ہے اور کافر جب یہ کہے کہ ''أسلمت'' یا ''أنا مسلم''، تو اسے مسلمان سمجھا جائے گا۔ **لا تقتله:** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قتل سے منع فرمانا' قطع ید کے بعد بھی اس سے تعرض کرنے سے منع فرمانا' اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حربی اگر کسی مسلمان پر جنایت کرنے کے بعد مسلم ہو جائے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، چونکہ اگر قصاص واجب ہوتا تو اسے اس حربی مسلمان کا ہاتھ قصاصاً کاٹ ڈالنے کی اجازت حضور سے مل جاتی۔

قوله: فان قتلته فانه بمنزلتك قبل ان تقتله ...... چونکہ وہ تمہارے اس فعل کے ارتکاب سے پہلے اسلام لانے کی وجہ سے معصوم الدم ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم اس کو قتل کرنے سے پہلے معصوم الدم تھے اب وہ اسلام لانے کی وجہ سے معصوم الدم ہو گیا۔

قوله: وانك بمنزلته...... :

اب تم مباح الدم ہو جیسا کہ وہ اسلام لانے سے قبل مباح الدم تھا۔ لیکن سبب مختلف ہے۔ قاتل کا مباح الدم ہونا قصاصاً ہے اور کافر کا مباح الدم ہونا بوجہ اسلام کے ہے۔

اس حدیث سے خوارج نے گناہ کبیرہ کے مرتکب مسلمان کی تکفیر پر استدلال کیا ہے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ''انك بمنزلته'' سے مراد کفر مماثلت ہے۔ حالانکہ ان کا یہ گمان سراسر غلط ہے چونکہ اللہ جل شانہ نے مسلمان قاتل کو مسلمانوں میں ہی شمار کیا ہے یہاں مراد وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ (انتهى كلام القاضى)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کو تغلیظ وتشدید پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے جیسا کہ اللہ جل شانہٗ کے یہ فرامین بھی اسی پر محمول ہیں:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران: ۹۷]

''اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے ذمہ جو کہ طاقت رکھے وہاں تک کی سبیل کی''۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۵٤]

''اے ایمان والو خرچ کر لو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن (قیامت کا) آ جاوے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی اور نہ (بلا اذنِ الٰہی) کوئی سفارش ہوگی اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (تم تو ایسے مت بنو)''

ان آیات میں تارکِ حج وزکوٰۃ کو تغلیظاً وتشدیداً کفار کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے تاکہ سب کو اطلاع ہو جائے کہ یہ اوصافِ کفریہ ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے احتراز کرنا چاہیے۔

بمنزلتہ کے الفاظ سے یہ بات صراحۃً معلوم ہوتی ہے کہ قاتل حقیقۃً کافر مقتول کی مانند نہیں بلکہ اس فعل شنیع وفظیع کے ارتکاب میں وہ بمنزلہ اسی کافر کے ہے اور ''بمنزلتك'' کے الفاظ سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافر مقتول کلمہ شہادت کی وجہ

سے بمنزلہ مؤمن کے ہے۔اس مفہوم کے صحیح ہونے کی تائید۔

گزشتہ احادیث باب اور اگلی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم قاضی عیاضؒ کی ذکر کردہ بات بھی اس کے قریب قریب ہے۔

بعض حضرات اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ حکم شرعی کی مخالفت وگناہ کے ارتکاب میں تم اس کے مثل ہو،اگرچہ ایمان مختلف ہے۔اس مقتول کے گناہ کو کفر اور قاتل کے گناہ کو معصیت کا نام دیا ہے۔

۳۴۵۰:وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اُنَاسٍ مِنْ جُهَيْنَةَ فَاَتَيْتُ عَلٰى رَجُلٍ مِنهُمْ فَذَهَبْتُ اَطْعَنُهُ ، فَقَالَ : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَطَعَنْتُهُ فَقَتَلْتُهُ فَجِئْتُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرْتُهُ فَقَالَ :اَقَتَلْتَهُ وَقَدْ شَهِدَاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّمَا فَعَلَ ذٰلِكَ تَعَوُّذًا قَالَ :فَهَلَّا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهٖ ؟ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٢/ ١٩١ الحديث رقم ٦٨٧٢ـ ومسلم في ١/ ٩٦ الحديث رقم (١٥٨ ـ ٩٦)۔

ترجمہ:''اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں (صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ) قبیلۂ جہینہ کے لوگوں کی جانب روانہ فرمایا چنانچہ (ان سے مقابلہ کے دوران) میں ایک شخص کے پاس سے گزرا تو میں اس پر نیزے سے حملہ کرنے لگا کہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا لیکن میں نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔پھر جب میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں واپس آیا اور آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(صد افسوس) کہ تم نے اس کو اس صورت میں قتل کر دیا جب کہ اس نے اس بات کی گواہی دی تھی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے یعنی لا الہ الا اللہ پڑھ لیا تھا؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ!اس نے یہ محض قتل سے بچنے کے لئے کیا تھا۔(یعنی اس لئے کلمہ پڑھا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا:''تو تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہیں دیکھ لیا تھا؟''

(متفق علیہ)

تشریح:جهينة:تصغیر کے ساتھ'ایک قبیلہ کا نام ہے۔

قاموس میں ہے:طَعَنَهُ بالرمح تمنعه'ونصره طعنا ضربه وزجره:یہ باب منع' نصر اور ضرب تینوں سے آتا ہے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ اس نے اسلام،صدق دل سے قبول نہیں کیا یا انہوں نے اجتہاد کیا کہ اس طرح کی حالت کا ایمان نافع نہیں۔نبی کریم ﷺ نے یہ بات واضح فرمادی کہ تم سے اجتہاد میں خطا ہوئی ہے۔اگلے جملہ کا یہی مطلب ہے۔

وقد شهد:جملہ حالیہ ہے۔

قوله:قلت یارسول ...... :

ذلك:''ذلك'' سے اظہار ایمان کی طرف اشارہ ہے۔

تعوذا: مفعول لہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''مستعیذا'' کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ أی ''انما فعل ذلك مستعیذا من القتل بکلمة التوحید، وما کان مخلصا فی اسلامه''۔ اس نے ایسا کلمہ توحید قتل نے بچتے ہوئے کیا وہ اپنے اسلام میں مخلص نہیں تھا۔)

فھلا شققت عن قلبه یعنی تم جب یہ بات جان چکے تھے تو تم نے اس کا دل چیر کے کیوں نہ دیکھا تاکہ تمہیں اس کے باطن کا بھی پتہ چل جاتا کہ اس نے یہ کلمہ جان بچانے کے لئے پڑھا تھا یا اخلاص کے ساتھ پڑھا تھا؟ ''شق القلب'' (دل چیرنا) ستعارہ ہے ''فحص'' سے کہ اس کا دل ٹٹول کے دیکھتے کہ وہ مؤمن ہے یا کافر۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے سبب قتل ایسا ذکر کیا کہ جس کے باعث قتل کرنا جائز تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتفاء سبب کے باعث جواز کی نفی فرمادی۔ چونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کردہ سبب ایسا تھا کہ جس پر آگاہی دل میں جھانکے بغیر ہو نہیں سکتی اور دل میں جھانکنا ''العلام الغیوب'' کے علاوہ کسی سے متصور نہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تو ظاہری عمل اور قول لسانی کے مطابق عمل کے مکلّف تھے۔ دل میں کیا ہے؟۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا: **مھلا شققت عن قلبه**، ''فقہ اور اصول فقہ کے ایک مشہور قاعدہ: ''**الاحکام یحکم فیھا بالظواھر واللّٰہ تعالٰی یتولی السرائر**'' (احکام میں فیصلہ ظاہر کی بنیاد پر ہوتا ہے اور رازوں کا معاملہ اللہ ہی کے سپرد ہے) کی دلیل بھی ہے۔

مقتول کے کلمہ طیبہ کی اہمیت کا بیان

۳۴۵۱: وَفِیْ رِوَایَةِ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَجَلِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: کَیْفَ تَصْنَعُ بِلَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ اِذَا جَاءَ تْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ؟ قَالَهُ مِرَارًا۔ (رواہ مسلم)

تخریج: أخرجه مسلم فی صحیحه ۹۷/۱ الحدیث رقم (۱۶۰۔ ۹۷)۔

ترجمہ: اور جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب قیامت کے دن کلمہ لا الٰہ الا اللہ آئے گا تو اس وقت تم اس کا سامنا کیسے کرو گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (خوف دلانے کے لئے) یہ الفاظ (اسی مجلس میں یا متعدد مجالس میں) کئی مرتبہ ارشاد فرمائے''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: کیف تصنع بلا اله الا الله: أذاجاء ت: یوم القیامة**: یعنی جب قیامت کے دن کلمہ ''لا اله الا الله'' آئے گا یا اس کی طرف سے کوئی فرشتہ مخاصحت کے لئے آئے گا یا صاحب کلمہ آئیگا۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ حدیث دلیل ہے کہ کفار کے خون میں اصل اباحت ہے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو یوں لگا کہ اس نے موت سے بچنے کی خاطر کلمہ ڈھال بنایا ہے۔ سچے دل سے کلمہ نہیں پڑھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے ''مباح الدم'' سمجھتے ہوئے اور یہ گمان کرتے ہوئے کہ مجھ پر اس شخص کو قتل کرنا لازم ہے قتل کر ڈالا۔ (یہ گویا ان کا اجتہاد تھا) اور مجتہد سے خطا معاف ہے یا حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ

اس مسئلہ میں ''متاول'' تھے اس طور پر کہ ایسی حالت میں (جب کہ موت یقینی دکھائی دے رہی ہو) توبہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ......﴾ [غافر: ۸۵] ''لیکن جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے (اس وقت) ان کے ایمان نے انکو کچھ فائدہ نہ دیا (یہ) خدا کی عادت (ہے) جو اسکے بندوں (کے بارے) میں چلی آتی ہے اور وہاں کافر گھاٹے میں پڑ گئے''۔

قاضیؒ فرماتے ہیں اس شخص پر اسلام کا حکم نہیں لگایا جاسکتا تھا کیونکہ نبوت کا اقرار تو اس نے کیا ہی نہیں تھا لیکن توحید کا اقرار کہ جو درحقیقت مقصود بالذات تھا وہ بہر حال پایا گیا، ایسی صورت میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو توقف کرنا چاہئے تھا حتیٰ کہ اصل صورتحال معلوم ہو جاتی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کے سیاق اور آنحضرت کے ملفوظ گرامی میں کہیں یہ بات نہیں کہ قاتل کا خون رائیگاں ہوگا یا قصاص لیا جائے یا دیت لی جائے بلکہ اس حدیث میں اس شبہ کا رد ہے جس شبہ سے انہوں نے استدلال ان الفاظ میں کیا تھا۔ **انما فعل ذلك تعوذا۔**

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ''**کیف یضع بلا اله الا الله**'' کے ذریعہ سخت زجر وتوبیخ کے ساتھ ساتھ اس شبہ کی نفی بھی فرمائی۔ اھ۔

مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی کافر پر غالب آگئے۔ اس کا سر تن سے جدا کرنے کے لئے اس کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں اس کافر نے حضرت علیؓ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ اس کافر کو چھوڑ چھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا مبارزت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کافر یہ سن کر بولا: آپ مجھے قتل کرنے پر قادر تو ہو چکے تھے۔ پھر چھوڑ کیوں دیا؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: تیرے اس فعل شنیع کی وجہ سے مجھے جوش آگیا مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں تجھے یہ قتل کرنا اللہ کی رضا کی بجائے میری ذاتی غیرت و حمیت کی وجہ سے نہ ہو۔ وہ کافر حضرت علیؓ کے ان جذبات کو سن کر بہت متاثر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔

قتل معاہد کی مذمت کا بیان

۳۴۵۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَاِنَّ رِيْحَهَا تُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٢٦٩/٦ الحدیث رقم ٣١٦٦۔ وابن ماجه فی السنن ٨٩٦/٢ الحدیث رقم ٢٦٨٦۔

ترجمه: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کسی معاہد (یعنی ذمی) کو قتل کیا وہ جنت کی بو نہیں پائے گا حالانکہ جنت کی بو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس کی جائے گی۔'' (بخاری)

تشریح: قوله: من قتل معاهدالم یرح رائحة الجنة: عبد الله عمرو:

''عمرو'' واؤ کے ساتھ ہے۔ **معاهدا**: ھاء کے کسرہ کے ساتھ، عہد کرنے والا، معاہد اس کافر کو کہتے ہیں جس نے امامِ وقت (سربراہ مملکت اسلامی) سے جنگ وجدل نہ کرنے کا عہد کیا ہو، خواہ وہ کافر ذمی ہو یا غیر ذمی۔

لفظ ''**معاهد**'' ھاء کے فتحہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے یعنی وہ کافر جس سے امامِ وقت نے (مذکورہ بالا) عہد لیا ہو۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: معاہد سے مراد وہ شخص ہے جس کا مسلمانوں کے ساتھ باقاعدہ عہد شرعی ہو، خواہ بصورت عقدِ جزیہ ہو یا بادشاہ کی طرف سے وقفہ جنگ بندی ہو یا کسی مسلم کی امان میں ہو۔

لم یرح: یہ لفظ تین طرح سے مروی ہے: ① راء کے فتحہ کے ساتھ، **راح یراح**۔ ② راء کے کسرہ کے ساتھ، **راح یریح** ③ راء کے ضمہ کے ساتھ، **أراح یریح**۔

عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: راء اور باء کے فتحہ کی لغت زیادہ بہتر ہے۔ اکثر حضرات نے یوں ہی روایت کیا ہے۔ البتہ معانی ایک ہیں اور مطلب یہ ہے کہ وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا اور نہ خوشبو ہی پائے گا۔ نیز جنت کی خوشبو نہ پانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شخص ہمیشہ کے لئے جنت کی بو سے محروم رہے گا بلکہ اس خاص موقع پر جنت کی خوشبو نہیں پائے گا کہ جب وہ تمام مسلمان اس خوشبو کو سونگھیں گے جنہوں نے کبائر کا ارتکاب نہیں کیا ہوگا۔

حدیث میں مندرجہ بالا تاویل ناگزیر ہے تاکہ اس مسئلہ میں وارد دلائل عقلیہ اور دلائل نقلیہ میں توافق ہو جائے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب بشرطیکہ حالت ایمان پر مرا ہو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں جائے گا اور جنت سے محروم نہیں ہوگا۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد سے مراد معاہد کو قتل کرنے کی سخت مذمت بیان کرنا ہے۔

قوله: وان ریحها توجد ......: خریفا:

مراد ''عام'' (یعنی سال) ہے جیسا کہ ایک روایت میں صراحۃً مذکور ہے۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: ایک روایت میں ستّر برس، ایک روایت میں سو برس، اور فردوس (کی روایت) میں ہزار برس کے الفاظ ہیں۔ ان روایات میں یہ فرق واختلاف بظاہر اشخاص واعمال کے مختلف ہونے اور درجات کے تفاوت کی بناء پر ہے۔ چنانچہ (میدانِ حشر میں) اللہ مشیت کے مطابق بعض لوگوں کو جنت کی خوشبو ہزار برس کی مسافت سے، بعض لوگوں کو پانچ سو برس کی مسافت سے آئے گی۔ اسی طرح اس خوشبو کو مختلف لوگ مختلف مسافتوں سے محسوس کریں گے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان تمام اعداد سے تحدید مراد نہ ہو بلکہ طولِ مسافت مراد ہو۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمدؒ نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

ایک روایت میں ہے ''**من قتل معاهدا فی غیر کنهه حرم الله علیه الجنة**''۔

''جس نے کسی معاہدہ کو ایسے وقت میں قتل کیا جس میں اس کا قتل جائز نہیں تھا اس (قاتل) پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کردے گا''۔ **کنهه**: کاف کے ضمہ اور نون کے سکون کے ساتھ، بمعنیٰ ''**فی غیر وقته الذی یجوز فیه قتله**۔ (اس وقت کے علاوہ میں جس میں اس کو قتل کرنا جائز تھا)۔

اس پر جنت کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے دن کی مدت کے بقدر جنت میں داخل

ہونے سے روکے رکھے گا۔

اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے ابوبکرۃ۔تاء کے ساتھ۔سے روایت کیا ہے۔

طبرانی نے واثلہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: **من قذف ذمیًا حد له یوم القیامة بسیاط من نار۔**"

"جس نے کسی ذمی پر تہمت لگائی اس (تہمت لگانے والے) کو قیامت کے دن آگ کے کوڑوں سے حد لگائی جائے گی۔"

ہمارے علماء فرماتے ہیں: ذمی کی خصومت مسلم کی خصومت سے زیادہ شدید ہے۔

خودکشی کا وبال

۳۴۵۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ : قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ : مَنْ تَرَدّٰی مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَفِیْ نَارِجَهَنَّمَ یَتَرَدّٰی فِیْهَا خَالِدًا مُخَلَّدًافِیْهَا اَبَدًا، وَمَنْ تَحَسّٰی سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَسَمُّهٗ فِیْ یَدِهٖ یَتَحَسَّاهُ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا، وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِیْدَةٍ فَحَدِیْدَتُهٗ فِیْ یَدِهٖ یَتَوَجَّأُ بِهَا فِیْ بَطْنِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲٤۷/۱۰۔ الحدیث رقم ۵۷۷۸۔ ومسلم فی صحیحه ۱۰۳/۱ الحدیث رقم (۱۷۵۔ ۱۰۹)۔ والترمذی فی السنن ۳۳۸/٤ الحدیث رقم ۲۰٤٤۔ والنسائی فی ٦٦/٤ الحدیث رقم ۱۹٦۵۔ والدارمی ۲۵۲/۲ الحدیث رقم ۲۳٦۲ واحمد فی المسند ۲۵٤/۲۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر خودکشی کر لی وہ شخص دوزخ میں گرتا رہے گا اور وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا جس شخص نے زہر کے ذریعہ خودکشی کر لی اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ دوزخ کی آگ میں پئے گا۔اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور جس شخص نے لوہے کے (کسی) ہتھیار (جیسے چھری وغیرہ) سے اپنے آپ کو مار ڈالا اس کا وہ (ہی ہتھیار یا اس کا مثل) ہتھیار (دوزخ کی آگ میں) اس کے ہاتھ میں ہوگا جس کو وہ اپنے پیٹ میں گھونپے گا اور دوزخ میں ہمیشہ رہے گا اس سے کبھی نہیں نکلے گا"۔ (بخاری ومسلم)

قوله: ابن تردی ۔۔۔۔فیھا أبدا: تردی: قاضیؒ فرماتے ہیں: ردی سے مشتق ہے، تردی کے اصل معنی ہیں "ہلاکت کے درپے ہونا"، پھر یہ لفظ تہور (انجام سے بے پروائی کے ساتھ عجلت بازی) کے معنی میں استعمال ہونے لگا، کیونکہ تہور بھی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔

فقتل نفسه: یعنی اپنے آپ کو گرانے کی وجہ سے اپنے قتل کا سبب ہونا

خالدا: حال ہے۔

مخلدًا: أبدا تاکید در تاکید ہے

(اس حدیث میں مذکور سزا کے بارے میں کئی احتمالات ہیں:

① یہ مستحل پر محمول ہے

② اس فعل کا مرتکب اس عذاب کا مستحق ہے

③ خلود سے مراد طویل مدت ہے اور ''مخلدا'' اور ''ابدا'' کی تاکید برائے تشدید وتہدید ہے۔

قوله: ومن تحسى۔۔۔فيها أبدا: تحسّی: **تحسی** اور ''**حسو**'' کے ایک ہی معنی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ''**تحسّی**'' میں ''تکلف'' کے معنی ہیں، تھوڑا تھوڑا پینا۔

سما: اکملؒ فرماتے ہیں: ''**سم**'' کے سین پر تینوں حرکات درست ہیں۔

فسمه: مبتدا ہے۔

حدیث کا یہ حصہ اللہ جل شانہٗ کے اس فرمان کے ہم معنی ہے: ﴿وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ﴾[ابراھیم۔۱۷]

''اس کو ایسا پانی پینے کو دیا جائیگا جو کہ پیپ لہو (کے مشابہ) ہوگا جس کو گھونٹ گھونٹ کر کے پیوے گا اور گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر چہار طرف سے اس پر (سامان) موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح مرے گا نہیں اور اس کو اور سخت عذاب کا سامنا ہوگا''۔

قوله: ومن قتل نفسه ......:

يتوجأ: آخر میں ہمزہ ہے۔ از باب تفعل، **الوجء** سے مشتق ہے، (کسی کو چھری وغیرہ مارنا) جامع الاصول میں یہ روایت اسی طرح ہے۔ ''مصابیح میں ''**يجأ**'' ہے بروزن **يضع**۔ شارح فرماتے ہیں: ''**وجأته بالسكين**'' سے ماخوذ ہے بمعنی ''**ضربته به**''، (چھری مارنا) پہلے معنی مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ **يتردى** اور **يتحسّى** کے قرینہ کی وجہ سے اور ''**بها**'' کی ضمیر ''**حديدة**'' کی طرف راجع ہے

في نار جهنم: حال ہے یعنی ''**حال كونه في نار جهنم**'' کے معنی میں ہے۔ (فلان ہمیشہ کی قید میں داخل کر دیا گیا) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سزا کے مستحق بظاہر وہ خودکشی کرنے والے افراد ہیں جنہوں نے یہ کام حلال سمجھتے ہوئے کیا ہو۔ اگر عموم مراد لیا جائے تو خلود وتابید سے مراد مکث طویل ہے۔ چونکہ خلود اور تابید کا استعمال دو معنی کے لئے ہوتا ہے: ① قابل انقطاع دوام۔ ② استمرارِ مدید جو عرصۂ دراز کے بعد قابل انقطاع ہو۔ کہتے ہیں: **وقف وقفا مخلدا مؤبدا**۔ (وہ ہمیشہ کھڑا ہی رہا) اور اسی طرح کہا جاتا ہے: **أدخل فلان حبس الأبد**

رابط؟ اشتراک اور مجاز خلافِ اصل ہے۔ لہٰذا ان دونوں لفظوں سے ایسا معنی مراد لیا جائے جو ان دونوں میں مشترک ہو۔ تاکہ اس میں اور ہمارے ذکر کردہ دلائل میں تطبیق ہو جائے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت جندبؓ سے مروی نبی کریم ﷺ کے اس فرمان: ''**بادرني عبدي بنفسه فحرمت عليه الجنة**'' کا کیا جواب دیں گے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکایتِ حال ہے اس میں عموم نہیں ہے۔ چونکہ یہ احتمال بہر حال موجود ہے کہ وہ آدمی کافر ہو یا شدتِ زخم کی وجہ سے مرتد ہو گیا ہو، یا خودکشی کو مباح سمجھتا ہو اور ''**فحرمت علیه الجنة**'' کی دوام واقناط پر دلالت تو ظنی بھی نہیں چہ جائیکہ قطعی ہو۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: چونکہ انسان تنگی، پریشانی، حماقت اور غصہ کے باعث اپنی جان گنوانے کے درپے ہو جاتا ہے اور شیطان اسے یہ سمجھاتا ہے کہ ایسا کرنا کسی کو ناحق قتل کے مقابلہ میں ہلکا ہے اور چونکہ مخلوق میں سے کوئی بندہ بھی اس سے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا لہٰذا اللہ تعالیٰ بھی تجھے معاف کر دے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے مکلف لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ ان سے قیامت کے دن اس فعل کی بابت باز پرس ہوگی اور شدید عذاب دیا جائے گا اور اس فعل کی حرمت بھی دوسروں کو ناحق قتل کرنے کی حرمت کی طرح ہے۔ اھ۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

''**صلوا خلف من قال لا اله الا اللّٰه، وصلوا علی من مات من اهل لا اله الا اللّٰه**''۔

اس روایت کو دارقطنی نے کئی طرق سے ضعف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ (كذا فی شرح عقيدة الطحاوية) اور فرمایا: اس عموم سے باغی اور راہزن مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح خودکشی کرنے والا ہے اس میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اختلاف ہے۔

خودکشی کرنے کا بیان

۳۴۵۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَلَّذِیْ يَخْنِقُ نَفْسَهٗ يَخْنِقُهَا فِی النَّارِ، وَالَّذِیْ يَطْعَنُهَا يَطْعَنُهَا فِی النَّارِ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲۳۷/۳۔ الحديث رقم ۱۳۶۵۔ واحمد فی المسند ۴۳۵/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے گلا گھونٹ کر خودکشی کی وہ دوزخ میں بھی اپنا گلا گھونٹے گا اور جس شخص نے اپنے آپ کو نیزہ مار کر خودکشی کی وہ دوزخ میں (بھی) اپنے آپ کو نیزہ مارے گا''۔ (بخاری)

تشریح: **قوله: الذی یخنق نفسه یخنقها فی النار**:

یخنق: نون کے ضمہ کے ساتھ، از باب نصر ہے (بحوالہ قاموس) اور ایک نسخہ میں نون کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اپنے آپ کو پھانسی دینا بھی اسی حکم میں ہے۔ ''**مصابیح**'' کے ایک شارح نے اس لفظ کی تشریح ''**یعصر حلقه**'' (اپنا گلا بھینچے گا) کے ساتھ کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ از باب ''**ضرب**'' ہے۔ مصدر ''**الخنق**'' ہے خاء اور نون کے فتحہ کے ساتھ۔

یخنقها: اس میں دو احتمال ہیں: ① اپنا گلا خود گھونٹے گا۔ ② اللہ تعالیٰ اس کا گلہ گھونٹے گا۔

قوله: والذی یطعنها ...... : فطعنها:

عین کے ضمہ کے ساتھ ہے ''**التنقیح**'' کے مطابق۔ قاموس میں ہے کہ: **طعنه بالرمح**، ~~منع~~ **نصر** اور **ضرب** سے

ہے۔عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اصول'' میں عین مہملہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

پچھلی اُمتوں کے ایک شخص کی کا ایک واقعہ

۳۴۵۵:وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِيْ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ بِهٖ جُرْحٌ ، فَجَزِعَ فَاَخَذَ سِكِّيْنًا ، فَحَزَّ بِهَا يَدَهٗ ، فَمَا رَقَأَ الدَّمُ حَتّٰى مَاتَ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى :بَادَرَنِيْ عَبْدِيْ بِنَفْسِهٖ، فَحَرَّمْتُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (متفق عليه)

تخریج : صحيح بخاری' كتاب احاديث الانبياء' باب ما ذكر عن بنی اسرائيل' ح ٣٤٦٢۔

أخرجه البخاری فی صحيحه ٤٩٦/٦ ۔ الحديث رقم ٣٤٦٣۔ ومسلم فی ١٠٧/١ الحديث رقم (١١٣/١٨)۔۔

ترجمہ:''اور حضرت جندب بن عبداللہ (بجلی) رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) فرمایا: ''تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص تھا (جو کسی طرح) زخمی ہو گیا چنانچہ اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو اس نے چھری پکڑی اور (چھری سے) اپنے (زخمی) ہاتھ کو کاٹ ڈالا۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے نے اپنی جان کے بارے میں مجھ سے جلدی کی لہٰذا میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح:**قوله: كان فيمن كان ۔۔۔۔فحنه بهايده:**

جرح:جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔

فجزع:زاء کے کسرہ کے ساتھ،

حزّ: حاء مہملہ اور زاء کی تشدید کے ساتھ۔ **أی: قطع بغير ابانة**،(کاٹا مگر الگ نہ کرنا)۔بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ لفظ جیم کے ساتھ مروی ہے اور دونوں ہم معنی ہیں۔صاحب قاموس لکھتے ہیں: **الحز: القطع** (کاٹنا) **والجز بالجيم قطع الشعر والحشيش** (یعنی بال اور گھاس وغیرہ کاٹنے کے لئے لفظ ''جز'' استعمال کرتے ہیں)۔

بها: ضمیر مجرور ''سکین'' کی طرف راجع ہے ''مصابیح'' کے بعض شراح کی تصریح کے مطابق لفظ ''سکین'' مذکر و مؤنث ہر دو طرح استعمال ہوتا ہے رقأ: تینوں حرفوں پر فتحہ ہے۔

قوله:قال الله تعالٰى ...... :بادرنی عبدی بنفسه

یعنی اپنی روح میرے دربار میں پیش کرنے میں جلد بازی کا ارادہ کیا۔

فحرمت عليه الجنة:ابن الملک فرماتے ہیں (اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں)

① یہ (حدیث) مستحل پر محمول ہے

② اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک دوزخ میں جا کر اپنے کئے کی سزا نہ چکھ لے، اس پر دخول جنت کو حرام کر دیا ہے الا یہ کہ اللہ اپنا فضل کر کے رحم کرے۔

ایک صحابی کی خودکشی کا ایک واقعہ

۳۴۵۶: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ الطُّفَيْلَ بْنَ عَمْرٍو الدَّوْسِيَّ لَمَّا هَاجَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ هَاجَرَ اِلَيْهِ وَهَاجَرَ مَعَهُ رَجُلٌ مِنْ قَوْمِهِ، فَمَرِضَ، فَجَزِعَ فَاَخَذَ مَشَاقِصَ لَهُ فَقَطَعَ بِهَا بَرَاجِمَهُ، فَشَخَبَتْ يَدَاهُ حَتّٰى مَاتَ، فَرَآهُ الطُّفَيْلُ بْنُ عَمْرٍو فِيْ مَنَامِهِ وَهَيْئَتُهُ حَسَنَةٌ، وَرَآهُ مُغَطِّيًا يَدَيْهِ فَقَالَ لَهُ: مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ؟ فَقَالَ: غَفَرَلِيْ بِهِجْرَتِيْ اِلٰى نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَالِيْ اَرَاكَ مُغَطِّيًا يَدَيْكَ؟ قَالَ: قِيْلَ لِيْ: لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا اَفْسَدْتَ، فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٠٨/١ الحديث رقم (١٨٤ـ ١١٦)۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو طفیل بن عمر و دوسی رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کر کے آپ ﷺ کے پاس آ گئے ان کے ساتھ ان کے قبیلے کے ایک اور شخص نے بھی ہجرت کی۔ وہ شخص مدینہ میں (آ کر) بیمار ہو گیا اور اس سے صبر نہ ہو سکا' چنانچہ اس نے تیر کی پیکان لے کر اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے' اس کی وجہ سے اس کے دونوں ہاتھوں سے اتنا خون جاری ہوا کہ وہ مر گیا (اس کے انتقال کے بعد ایک دن) طفیل بن عمر و رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو اپنے خواب میں اس حالت میں دیکھا کہ اس کی ہیئت تو اچھی تھی مگر اس نے دونوں ہاتھ ڈھانپ رکھے تھے۔ طفیل رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ ''تمہارے رب نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟'' اس شخص نے کہا ''مجھے نبی ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کے سبب بخش دیا ہے''۔ پھر طفیل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''میں تمہیں اپنے دونوں ہاتھ چھپائے ہوئے کیوں دیکھ رہا ہوں؟ اس شخص نے کہا کہ مجھ سے (بواسطہ یا بالا واسطہ) کہا گیا ہے کہ جس چیز کو تم نے (خود اپنے ہاتھوں سے) خراب کیا ہے ہم اس کو درست نہیں کریں گے''۔ جب طفیل رضی اللہ عنہ نے یہ خواب رسول کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا تو آپ ﷺ نے (اس شخص کے لئے دعا فرماتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''اے اللہ! (اس کو) اور اسکے دونوں ہاتھوں کو بھی بخش دے''۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

طفیل بن عمرو۔ یہ ''طفیل بن عمرو دوسی'' ہیں مکہ میں اسلام لائے اور حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے۔ آنحضور ﷺ کی طرف ہجرت کی۔ یہ جنگ یمامہ میں شہید کر دیے گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ جنگ یرموک میں دور خلافت عمر میں شہید ہوئے۔ ان سے جابرؓ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں۔ ان کا شمار ''حجاز'' کے علماء میں ہوتا ہے۔

تشریح: قوله:لما هاجر النبیؐ...... حتی مات:

مشاقص: میم کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ،'' مشقص'' بروزن'' منبر'' چھری کو کہتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی'' نصل السهم'' (تیر کی پیکان) بیان کئے ہیں۔(كذا في القاموس)'' النهاية'' میں صرف دوسرے معنی ذکر کئے ہیں۔

براجمه: باء موحدہ کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ، برجمة۔ باء اور جیم کے ضمہ کے ساتھ۔کی جمع'' براجم'' انگلیوں کے ان جوڑوں کو کہتے ہیں جو'' رواجب'' کے درمیان ہوں، اور'' رواجب'' ان جوڑوں کو کہتے ہیں جو انگلی کے ساتھ ملے ہوئے ان جوڑوں کو کہتے ہیں جو'' اشاجع'' کے درمیان ہوں، اور'' اشاجع'' وہ جوڑ ہیں جو ہتھیلی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

صاحب'' النهاية'' لکھتے ہیں کہ'' تراجم'' انگلیوں کے جوڑ (انگلیوں کے باہر والے حصہ کے جوڑون کو کہتے ہیں جہاں شکنیں پڑتی ہیں اور میل بھی جم جاتا ہے اس کا واحد'' ترجمه''۔باء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

فشخبت: خاء اور باء معجمہ کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی'' سالت'' (زخم سے خون نکلنا، بہنا)۔

قوله:فراه الطفيل الخ:

وهيته حسنة: جملہ حالیہ ہے۔

وراہ: صیغۂ ماضی کے ساتھ، پہلے والے'' فراہ'' پر عطف ہے۔ایک نسخہ میں الف ممدودہ کے بعد ہمزہ کے ساتھ ہے۔(یعنی'' وراء ہ'' ہے۔) بمعنی عقبہ (پیچھے) ظرف ہے'' فراہ'' کے لئے۔

مالی: یاء کے فتحہ کے ساتھ اور سکون بھی درست ہے۔

مغطيا: طاء کے کسرہ کے ساتھ، مفعول سے حال ہے۔

لن نصلح منك ما أفسدت: ہوسکتا ہے کہ اس سے آگے یہ تقدیری عبارت بھی ہو: (یعنی جس چیز کو تم نے خود خراب کیا ہے ہم اس کو درست نہیں کریں گے الا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفارش فرمائیں)

وليديه: یہ عطف علی المقدر ہے۔تقدیری عبارت یوں ہے: تجاوز عنه وليديه۔

فاغفر: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا عطف معنوی اعتبار سے'' وقيل لي لن نصلح منك ما أفسدت'' پر ہے، چونکہ اس کی تقدیری عبارت یوں ہے:'' قيل لي غفرنا لك سائر اعضائك الا يديك، فقال رسول الله ﷺ: اللهم وليديه فاغفر'' (یعنی مجھ سے کہا گیا کہ ہم نے تیرے سب اعضاء کو بخش دیا سوائے تیرے ہاتھوں کے۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! اور اس کے دونوں کو بھی بخش دے)'' لام'' فاغفر کے متعلق ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث۔اگرچہ اس میں ایک خواب کا ذکر ہے جو صحابی کو دکھائی دیا تھا اور اس کی تعبیر آئندہ ظاہر ہونی تھی، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا: اللهم وليديه فاغفر، یہ ان احادیث میں سے ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کلمہ گو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں جائے گا۔اگرچہ وہ خودکشی کرلے، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس'' جانی'' (جنابت کرنے والا) کے لئے مغفرت کی دعا ان احادیث میں سے ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں ہے اور جس شخص نے

لئے ہمیشہ جہنم میں رہنا واجب ہو چکا ہو اس کے حق میں استغفار کرنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ ایسے شخص کے بارے میں استغفار کرنے کی نہی وارد ہو۔

قتل عمد کے موجب کا بیان

۳۴۵۷: وَعَنْ اَبِیْ شُرَیْحِ الْكَعْبِیِّ ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، قَالَ : ثُمَّ اَنْتُمْ يَا خُزَاعَةُ ! قَدْ قَتَلْتُمْ هٰذَا الْقَتِيْلَ مِنْ هُذَيْلٍ ، وَاَنَا وَاللّٰهِ عَاقِلُهُ ، مَنْ قَتَلَ بَعْدَهُ قَتِيْلًا فَاَهْلُهُ بَيْنَ خِيَرَتَيْنِ ، اِنْ اَحَبُّوْا قَتَلُوْا ، وَاِنْ اَحَبُّوْا اَخَذُوْا الْعَقْلَ۔ (رواه الترمذی والشافعی)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ٦٤٣/٤ الحديث رقم ٤٥٠٤۔ والترمذی فی ١٤/٤ الحديث رقم ١٤٠٦۔ والشافعی فی مسند ص ٣٤٣۔ من كتاب الديات والقصاص۔ واحمد فی المسند ٢٣/٤۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو شریح کعبی رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (فتح مکہ کے دن جو خطبہ ارشاد فرمایا اور جس کا ابتدائی حصہ حرم مکہ کے باب میں گزر چکا ہے' اس کے آخری الفاظ یہ تھے) فرمایا: "اے خزاعہ (کے قبیلہ والو!) تم نے اس مقتول کو جو قبیلہ ہذیل کا تھا' قتل کیا ہے میں خدا کی قسم! اس کا خون بہا (یعنی دیت) میں دوں گا' اب اس کے بعد اگر (تم میں سے کسی نے یا دوسرے) کسی شخص نے (کسی کو) قتل کیا تو مقتول کے ورثاء کو دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہے: اگر وہ چاہیں (تو اس اگر کو) قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو (قاتل کے عاقلہ سے) خون بہا (یعنی دیت) لے لیں۔ (ترمذی' شافعی)

قوله: ثم انتم یاخزاعة۔۔۔وأنا والله عاقله:

خزاعة: خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

یہ حدیث فتح مکہ کے دن کے خطبہ کا تتمہ ہے۔ خطبہ کا ابتدائی حصہ "کتاب الحج" کے "باب حرم مکة" کی پہلی فصل میں مذکور ہے۔ حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں قبیلہ ہذیل نے قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، اور قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے اب اپنے مقتول کے بدلے میں قبیلہ ہذیل کے ایک شخص کو قتل کر دیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں قبیلوں کے درمیان فتنہ کی آگ بجھانے کے لئے قبیلہ ہذیل کے اس مقتول کا خون بہا ادا فرمایا۔

هذیل: تصغیر کے ساتھ ہے۔

وانا والله عاقله: "عاقل" **عقل** بمعنی دیت سے ماخوذ ہے' دیت کو' عقل' کہنے کی وجہ سے ہے کہ (عقل) کا معنی ہے رسّی سے باندھنا) دیت کے اونٹ ولی الدم کے گھر کے سامنے کے میدان میں باندھے جاتے ہیں یا اس کی وجہ یہ ہے کہ دیت قاتل کا خون بہانے سے روکتی ہے (عقل کا ایک معنی ہے منع کرنا' روکنا)۔

قوله: من قتل بعده......: **خیرتین:** خاء کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ، ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔ بمعنی "اختیارین" (دو اختیار) مصابیح کے بعض حنفی شراح کا کہنا ہے کہ "الخيرة" یہ "اختیار" کا اسم ہے۔ چنانچہ اس جملہ کا

مطلب یہ ہوا کہ فاھلہ مخیّر بین امرین (کہ اس کے اہل کا نہ کو دو اختیار حاصل ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث دلیل ہے کہ (اگر کوئی شخص کسی کو ناحق مار ڈالے تو) مقتول کے ولی الدم کو دو چیزوں کا اختیار ہے: ① چاہے تو قاتل کو قتل کر دے ② چاہے قاتل سے خون بہا لے لے۔ پس اگر قصا میں معاف کر دیا تو قاتل سے دیت لی جائے گی۔ (خواہ قاتل دیت دینے کے لئے تیار ہو یا تیار نہ ہو۔) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ سعید ابن المسیّب، شعبی، ابن سیرین اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی، احمد اور اسحاق کا مذہب بھی یہی ہے۔

بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو قاتل سے خون بہا لینے کا حق اسی صورت میں حاصل ہوگا جب کہ قاتل خود بھی اس پر راضی ہو۔ یہ حسنؒ اور نخعیؒ کا قول ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اصحاب اور امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔

جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ مقتول کے ورثہ کو صرف قصاص کا حق ہے اور کوئی حق حاصل نہیں ان حضرات کے نزدیک اس ارشاد گرامی کی تاویل یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو اختیار ہے کہ چاہے وہ قاتل کو قتل کر دیں، چاہے اس سے خون بہا لے لیں اگر خون بہا ان کو دیا جائے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہے کہ دیت میں تمام اہل خانہ کا حق ہے۔ اس استحقاق میں عورتیں، مرد، اور بیویاں بھی شریک ہیں۔ چونکہ یہ سب لوگ اس کے اہل خانہ میں سے ہیں۔ نیز اگر اہل خانہ میں سے کوئی شخص غائب ہو یا کوئی بچہ ہے تو باقی ورثاء کو حق قصاص حاصل نہ ہوگا۔ حتی کہ وہ بچہ بالغ ہو جائے اور غائب شخص واپس لوٹ آئے۔ امام شافعیؒ کا یہی قول ہے۔

۳۴۵۸: وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِاِسْنَادِهٖ وَّصَرَّحَ: بِاَنَّهٗ لَيْسَ فِی الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ اَبِیْ شُرَيْحٍ ' وَقَالَ: وَاَخْرَجَاهُ مِنْ رِوَايَةِ اَبِیْ هُرَيْرَةَ يَعْنِیْ بِمَعْنَاهُ۔

ترجمہ: اور شرح السنۃ کے مصنف علامہ بغویؒ نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ حدیث صحیحین (بخاری ومسلم) میں ابو شریح سے منقول نہیں ہے' اور (بغوی نے) کہا ہے کہ ان دونوں (یعنی شیخین نے یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے حالانکہ اس میں بھی بالمعنی منقول ہے (بعینہ منقول نہیں ہے)''۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٠٥/١۔ الحديث رقم ١١٢۔ ومسلم في ٩٨٩/٢ الحديث رقم (٤٤٨۔ ١٣٥٥)۔

تشریح: تو گویا مشکوٰۃ کے مصنف نے صاحب مصابیح امام بغویؒ پر یہ اعتراض کیا کہ اس روایت کو یہاں فصل اول میں کیوں نقل کیا، کیونکہ فصل اول میں تو وہی حدیثیں نقل کی جاتی ہیں جو بخاری ومسلم میں مذکور ہوں، حالانکہ یہ حدیث غیر صحیحین نہیں کی ہے۔ (ہاں البتہ بامعنی متفق علیہ ہے۔ از مرتب)

قصاص میں مماثلت کا بیان

۳۴۵۹: وَعَنْ اَنَسٍ: اَنَّ يَهُوْدِيًّا رَضَّ رَاْسَ جَارِيَةٍ بَيْنَ حَجَرَيْنِ ' فَقِيْلَ لَهَا: مَنْ فَعَلَ بِكِ هٰذَا؟

اَفُلَانٌ؟ اَفُلَانٌ؟ حَتّٰى سُمِّيَ الْيَهُوْدِيُّ، فَاَوْمَاَتْ بِرَاْسِهَا، فَجِيْئَ بِالْيَهُوْدِيِّ فَاعْتَرَفَ، فَاَمَرَبِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَرَضَّ رَاْسَهٗ بِالْحِجَارَةِ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۱۳/۱۲۔ الحدیث رقم ٦٨٨٤۔ ومسلم فی ۱۲۹۹/۳ الحدیث رقم (۱۵۔ ۱٦٧٢)۔ وابوداوٗد فی السنن ٦٦٣/٤ الحدیث رقم ٤٥٢٧ والترمذی فی ۹/٤ الحدیث رقم ۱۳۹٤۔ والنسائی فی ۲۲/۸ الحدیث رقم ۲۷٤۲۔ وابن ماجه فی ۸۸۹/۲ الحدیث رقم ۲٦٦٥۔ والدارمی فی ۲٤۹/۲ الحدیث رقم ۲۳۵۵۔ واحمد فی المسند ۱۹۳/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک باندی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل ڈالا (یعنی ایک پتھر پر اس کا سر رکھ کر دوسرے پتھر سے اس پر ضرب ماری) چنانچہ (جب لڑکی کا نزعی بیان لیا گیا تو) اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے ساتھ کس نے یہ (کچلنے کا معاملہ) کیا ہے؟ کیا فلاں شخص نے (تمہارا سر کچلا ہے)؟ کیا فلاں شخص نے (تمہارا سر کچلا ہے)؟ (یعنی جن جن لوگوں پر شبہ تھا ان کا نام لیا گیا) یہاں تک کہ جب اس یہودی کا نام لیا گیا تو لڑکی نے اپنے سر کے اشارے سے بتایا کہ ہاں! (اس نے ایسا کیا ہے)۔ پھر اس یہودی کو حاضر کیا گیا اور اس نے اپنے جرم کا اقرار کیا' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح اس یہودی کا سر پتھروں کے درمیان کچلنے کا حکم فرمایا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: أن يهود يارض ـ ـ ـ فأومات برأسها:

رض: صاحب النہایہ لکھتے ہیں: الرض: الدق الجريش کوٹنا۔

جارية: اس کا اطلاق نابالغ لڑکی پر ہوتا ہے۔ أفلان: أى افلان فعل بك: کنایہ ہے مشتبہ افراد کے ناموں سے۔

سمی: مجہول کا صیغہ ہے۔

فأومأت: ایک نسخہ میں ''فأومت'' ہے، ہمزہ ثانیہ کے حذف کے ساتھ، شاید کہ یہ حذف برائے تخفیف ہو۔ قاموس میں ہے کہ: ومأ (بروزن وضع) بمعنی أشار ہے۔ أومأ اور ومأ ہم معنی ہیں۔ مختصر النہایہ میں لکھا ہے کہ ''ایماء'' اس اعضاء کے ساتھ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً سر، ہاتھ، آنکھ، ابرو کا اشارہ۔ اس مصدر سے فعل أومأت آتا ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ أومأت اور ومأت ایک ہی لغت ہے۔ ''أومأت'' بمعنی اشارت ہے۔ (فرض) مجہول کا صیغہ ہے۔

فرض رأسه بالحجارة: بظاہر اس یہودی کا سر بھی دو پتھروں کے درمیان کچلا گیا ہوگا تا کہ مماثلت کامل ہو۔

شرح السنۃ کے مطابق یہ حدیث کئی فوائد پر مشتمل ہے: ① جس طرح اگر کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر دے تو مقتول مرد کے بدلے میں اس عورت کو قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح مقتول عورت کے بدلے میں اس کے مرد قاتل کو بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ سوائے حسن بصریؒ اور عطاءؒ سے جو مروی ہے۔ ② پتھر اور کسی ایسی بھاری چیز سے کسی کو ہلاک کر دینا جس کی ضرب سے عام طور پر ہلاکت واقع ہو جاتی ہو، موجب قصاص ہے۔ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب فرماتے ہیں اگر کسی بھاری چیز کی ضرب سے ہلاکت واقع ہو جائے تو

اس کی وجہ سے قصاص لازم نہیں ہوتا۔ ⑤ جس طریقے سے مقتول کا قتل ہوا اسی طرح سے قاتل کو بھی قتل کرنا جائز ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اگر جنایت شبہ عمد ہو یعنی قاتل نے ایسی چیز سے قتل کا ارادہ کیا کہ اس سے عام طور پر ہلاکت واقع نہیں ہوتی مثلاً چھڑی، کوڑا، تھپڑ، قضیب (کٹی ہوئی شاخ) اور بندوق، تو اس صورت میں امام مالکؒ اور لیثؒ فرماتے ہیں کہ قصاص واجب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، اوزاعی، ثوری، احمد، اسحاق، رحمہم اللہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور تابعین رحمہم اللہ یہ فرماتے ہیں کہ (مذکورہ بالاصورت میں) قصاص واجب نہیں۔

اس حدیث سے اس کا جواز معلوم ہوا کہ زخمی سے یہ سوال کرنا کہ تمہیں کس نے زخمی کیا؟ درست ہے۔ سوال کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ متہم پہچانا جائے گا۔ اس سے پوچھا جائے گا، اگر وہ اقرار کرلے گا تو قتل اس پر ثابت ہو جائے گا اور اگر انکار کرے گا تو یمین لازم ہوگی۔ محض مقتول کے قول سے کوئی شی لازم نہ ہوگی۔ جمہور کا مذہب یہی ہے۔ امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ محض مجروح کے قول سے ثبوت قتل ہو جائے گا۔

اعضائے جسمانی میں قصاص کا بیان

۳۴۶۰: وَعَنْ اَنَسٍ، قَالَ: كَسَرَتِ الرُّبَيِّعُ - وَهِيَ عَمَّةُ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ - ثَنِيَّةَ جَارِيَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَاَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَ بِالْقِصَاصِ، فَقَالَ اَنَسُ بْنُ النَّضْرِ عَمُّ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ: لَا وَاللّٰهِ لَا تُكْسَرُ ثَنِيَّتُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا اَنَسُ! كِتَابُ اللّٰهِ الْقِصَاصُ فَرَضِيَ الْقَوْمُ، وَقَبِلُوْا الْاَرْشَ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (متفق عليه)

تخريج: صحيح بخاري، كتاب التفسير، باب والجروح قصاص، ح ٤٦١١۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٤٦/٢۔ الحديث رقم ٦٩٠٣۔ ومسلم في ١٣٠٢/٣ الحديث رقم (٢٤۔ ١٦٧٥)۔ وابوداوٗد في السنن ٧١٧/٤ الحديث رقم ٤٥٩٥۔ والنسائي في ٢٧/٨ الحديث رقم ٤٧٥٧۔ واحمد في المسند ١٢٨/٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ربیع نے (اس حدیث کے راوی) جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھیں' ایک انصاری لونڈی کے دانت توڑ دیئے۔ اس لڑکی کے رشتہ دار (استغاثہ لے کر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلہ لینے کا حکم فرمایا (یعنی یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ربیع رضی اللہ عنہا کے بھی دانت توڑے جائیں) انس بن نصر رضی اللہ عنہ نے جو انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا تھے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! ایسا نہیں ہوگا' خدا کی قسم! ربیع رضی اللہ عنہا کے دانت نہیں توڑے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے انس! اللہ کا حکم بدلہ لینے کا ہے'' لیکن (خدا نے ایسا کیا کہ) لڑکی کے خاندان والے (ربیع کے دانت نہ توڑے جانے پر) راضی ہو گئے اور دیت (مالی معاوضہ) قبول کرلیا' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کہ ''بعض اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ کسی بات پر خدا کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے''۔
(بخاری و مسلم)

تشریح: الربیع: راء کے ضمہ، باء موحدہ کے فتحہ، یاء تحتیہ مشدّدہ کے کسرہ کے ساتھ، ربیع بنت نضر انصاریہ مراد ہیں۔ (ثنیّة) ثنیة: ثاء مثلثہ کے فتحہ، نون کے کسرہ، تاء تحتیہ کے کسرہ کے ساتھ، اس کی جمع ''ثنایا'' ہے۔ کسرت کا مفعول بہ ہے۔ (لا تکسر): مجہول کا صیغہ ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دانت (توڑنے) میں بھی قصاص ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ لا واللّٰہ لا تکسر ثنیتها یا رسول اللّٰہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو ماننے سے انکار کے طور پر نہیں تھا بلکہ اس کی بنا حق تعالیٰ کے اس فضل و کرم کی توقع اور امید پر تھی کہ وہ مدعی کو راضی کر دے اور ان کے دل میں یہ ڈال دے گا کہ وہ قصاص کو اللہ کی رضا کی خاطر معاف کر دیں گے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس بن نضر کے بارے میں وہ مدحیہ کلمات ارشاد فرمائے۔ انس سے مراد ابن النضر ہیں۔ (کتاب اللّٰہ) تقدیری عبارت یوں ہے: حکمه (کتاب اللّٰہ) یا حکم کتابه، مضاف محذوف ہے۔ گویا اشارہ اللہ جل شانہٗ کے ان فرامین کی طرف تھا: فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم۔

''سو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی ہے''

کتاب اللہ القصاص: (و کتبنا علیهم فیها أن النفس بالنفس۔۔۔۔ السنّ بالسن: والجروح قصاص۔

''اور ہم نے ان پر اس (توراۃ) میں یہ بات فرض کی تھی کہ جان بدلے جان کے اور آنکھ بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے''

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''لا واللّٰہ'' سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا ردّ نہ تھا بلکہ وقوع کی نفی مراد تھی۔ ''واللّٰہ لا تکسر'' سے عدم وقوع کی اطلاع دی۔ چونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل تھا، انہیں اللہ کے فضل و کرم سے پختہ یقین حاصل تھا کہ وہ قسم میں حانث نہیں ہونگے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قسم کا پورا فرمائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اولیاء کے دل میں عفو و درگزر کے جذبات پیدا فرما دیئے۔

اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو اللہ کے مخلص بندوں، اور چیدہ اولیا میں شمار کیا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں' اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

① کسی ایسی بات پر قسم اٹھانا جائز ہے جس کے واقع ہونے کا قسم کھانے والے کو گمان ہو۔ ② کسی شخص کے منہ پر اس کی تعریف و توصیف کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس کی وجہ سے اس شخص کے کسی فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خوف نہ ہو۔ ③ قصاص کے معاملہ میں عفو و درگزر کا معاملہ مستحب ہے۔ ④ قصاص اور دیت میں اختیار کا حق مستحق قصاص و دیت کو، نہ کہ مستحق علیہ کو۔ ⑤ قصاص کا حکم مرد و عورت دونوں کے لئے ہے۔ ⑥ دانت میں بھی قصاص ہے۔ یہ اجماعی فیصلہ ہے، بشرطیکہ

دانت (جڑ سے) اکھڑا ہو۔ دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ جانے اور ہڈی کے ٹوٹ جانے کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اکثر حضرات کے نزدیک اس صورت میں قصاص نہیں ہے۔ اھ۔

کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کرنے کا بیان

۳۴۶۱: وَعَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ قَالَ سَاَلْتُ عَلِیًّا هَلْ عِنْدَکُمْ شَیْءٌ لَیْسَ فِی الْقُرْاٰنِ فَقَالَ: وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَاَ النَّسَمَةَ مَا عِنْدَنَا اِلَّا مَا فِی الْقُرْاٰنِ اِلَّا فَهْمًا یُعْطٰی رَجُلٌ فِیْ کِتَابِهٖ وَمَا فِی الصَّحِیْفَةِ قُلْتُ: وَمَا فِی الصَّحِیْفَةِ قَالَ: اَلْعَقْلُ وَفِکَاكُ الْاَسِیْرِ وَاَنْ لَّا یُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِکَافِرٍ. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٢٤٦/١٢۔ الحديث رقم ٦٩٠٣۔ والترمذی فی السنن ١٧/٤ الحديث رقم ١٤١٢۔ والنسائی فی ٢٣/٨ الحديث رقم ٤٧٤٤۔ والدارمی فی ٢٤٩/٢ الحديث رقم ٢٣٥٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو؟ انہوں نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑا (یعنی نبات' اناج کو پیدا کیا) اور جان کو وجود بخشا' ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو' البتہ قرآن کی وہ سمجھ (مجھ کو ضرور دی گئی) جو کسی انسان کو عطا ہو سکتی ہے' نیز ہمارے پاس کچھ ایسی چیزیں ہیں جو صحیفہ میں لکھی ہوئی ہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ ''صحیفہ میں کیا (لکھا ہوا) ہے؟ انہوں نے فرمایا (ناحق قتل) کا خون بہا' (اس کی مقدار اور اس کے احکام) اور قیدی کو چھوڑنے (کا ثواب لکھا ہے) اور یہ کہ کافر (جو ذمی نہ ہو) کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے کے بارے احکامات اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کہ ''کسی ناحق جان کو قتل نہ کیا جائے''' کتاب العلم میں مذکور ہے''۔ (بخاری)

تشریح: (عند کم): جمع برائے تعظیم ہے یا اس سے مراد تمام اہل بیت ہیں اس صورت میں ''تغلیب'' ہے۔ (شیئ) ایک روایت میں **شیئ من الوحی** کے الفاظ ہیں۔ (**وبرأ النسمة**) نون اور سین کے فتحہ کے ساتھ، نسمہ کے معنی ہیں نفس، ہر ذی روح جانور کو بھی نسمہ کہتے ہیں۔ ای: **خلقها**۔ قسم کھا کر اس بات کی اشارہ کیا کہ اللہ ہی نے رزق پیدا کیا اسی نے مرزوق کو پیدا کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی قسم میں زور پیدا کرنے کے لئے اس طرح قسم کھایا کرتے تھے۔ (**ماعندنا**) جواب قسم ہے۔ **عندنا** سے مراد اہل بیت ہیں۔ استثناء منقطع ہے یا استثناء اوّل کے **ما یفی** سے استثناء ہے۔ ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں: **فقال: لا والذی فلق الحبة وبرأ النسمة، (الا فهما يعطى رجل فی كتابه)** استثناء منقطع ہے یا استثناء اوّل کے مانفی سے استثناء ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **الا فهما يعطيه الله رجلا فی القرآن**۔

یہ ہے کہ **أنه ليس عندنا غير القرآن الا فهما**...... مظہرؒ فرماتے ہیں: یعنی جو فحوائے کلام سے سمجھ میں آئے، اور الفاظ کے ان معانی کا استدراک کہ جو ظاہر لفظ کے علاوہ ہیں، اس میں ہر قسم کا قیاس اور استنباط داخل ہے کہ جس تک فہم و تفہیم کے ذریعہ ہی پہنچا جا سکتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: **جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنه أفهام الرجال۔** "قرآن میں تمام علوم ہیں، لیکن (عام طور پر) لوگوں کے فہم (قرآن کی گہرائی تک پہنچنے سے) قاصر رہتے ہیں"۔ **(وما فی الصحیفة)** اس کا عطف "**فهما**" پر ہے۔ ایک روایت میں "**وما فی هذه الصحیفة**" کے الفاظ ہیں۔

حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو سوال کیا اس کی بنیاد شیعہ کا یہ گمان فاسد تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم وحی کے کچھ ایسے اسرار و رموز بتائے ہیں جو ان کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں بتائے گئے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ سوال اس لئے کیا کہ اہل تشیع کا گمان تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل بیت کے مخصوص افراد، خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم وحی کے کچھ ایسے اسرار و نکات بتانے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں بتائے۔ یا پھر حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ سوال اس لئے کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی بھی شخص علم و تحقیق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہم سر نہیں تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر بتایا کہ میرے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے یا یہ کہ ایسی کوئی بات نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے لوگوں سے ہٹ کر مجھے مخصوص طور پر تبلیغ و ارشاد سے نوازا ہے۔ ہاں مجھ میں اور دوسروں میں جو علمی تفاوت ہے اس کی بنیاد فہم اور استعدادِ استنباط ہے۔ حق تعالیٰ جس شخص کو بھی ایسی سمجھ اور ادراک عطا فرمادے کہ قرآن کی آیات میں تأمل کرنے، اور معانی میں تدبر کرنے کی توفیق عنایت ہو جائے تو اس پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے اور **مافی الصحیفة** کا استثناء احتیاطاً کیا، چونکہ احتمال تھا کہ صحیفہ میں کوئی ایسی چیز ہو جو غیر صحیفہ میں نہ ہو، اس اعتبار سے وہ منفرد ہوتے، اور ظاہر یہ ہے کہ **ما فی الصحیفة** کا عطف **ما فی القرآن** پر ہے، وگرنہ تو فہما سے استثناء منقطع ہوگا۔ **ما عندنا الا ما فی القرآن** سے جو حصر مفہوم ہو رہا تھا اس کے مقتضی کے استدراک کے لئے چونکہ جب یہ بات ٹھہری کہ **ما عندی الا ما فی القرآن** تو قرآن جیسا علی رضی اللہ عنہ کے پاس ہے، ایسا ہی دوسروں کے پاس بھی ہے، لہٰذا جو علوم ان کے پاس ہیں، وہ دوسروں کے پاس بھی ہیں لیکن ان کے علوم میں اور غیروں کے علوم میں فرق ہے، جس کا کسی کو بھی انکار نہیں، لہٰذا انہوں نے اس بات کو بیان کر دیا کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے قرآن کو جو سمجھ عطا کی ہے اس کے ذریعے میں قرآن کے علوم و معانی تک رسائی حاصل کرتا ہوں اور پھر اس سے احکام و مسائل نکالتا ہوں، اور لطائف و رموز کا ادراک کرتا ہوں۔ **(قلت وما فی الصحیفة)** ایک روایت میں "**فی هذه الصحیفة**" ہے۔

(وفکاك الأیسر) عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا: **فکاك**: فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ البتہ کسرہ بھی درست ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس نوشتہ میں قیدی کی خلاصی کا حکم، خلاصی کی ترغیب، اور قابل اہتمام نیکی کئی انواع کا ذکر تھا۔ **(وأن لا یقتل مسلم بکافر)** یہاں کافر سے مراد غیر ذمی ہے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ اگر مقتول کافر ذمی ہو تو اس کے بدلے میں قاتل مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: **لا یقتل مسلم بکافر** میں عموم ہے کہ مقتول کافر کے بدلے میں قاتل مسلمان کو قتل نہ کیا جائے، خواہ وہ مقتول کافر ذمی ہو یا حربی ہو، حضرت عمر، عثمان، علی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی قول ہے۔ عطاء، عکرمہ، حسن اور

عمر بن عبد العزیزؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔ثوریؒ، ابن شبرمہؒ، اوزاعیؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مقتول کافر اگر ذمی ہو تو اس کے بدلے میں قاتل مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔حدیث مذکور سے کافر ذمی مخصوص ہے۔ یہ قول نخعیؒ اور شعبیؒ کا ہے۔امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔ان حضرات کا مستدل یہ روایت ہے: **أن رجلا من المسلمين قتل رجلا من أهل الذمة، فرفع ذلك الى النبی ﷺ فقال: "أنا أحق من أوفی** ہوئی ہے۔**بذمته" ثم أمر به فقتل**۔اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں: ① یہ روایت منقطع ہے لہٰذا صالح الاحتجاج نہیں۔② راوی سے خطا قاتل عمرو بن امیہ ضمیری تھے۔حالانکہ یہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی دو سال تک بقید حیات رہے۔③ بالا جماع متروک ہے چونکہ مروی ہے کہ کافر سفیر تھا، تو مستامن ہوا اور مستامن کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا بالاتفاق۔

④ اور اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ منسوخ ہے۔چونکہ مروی ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے۔حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے روز بیت اللہ شریف کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: **ولا يقتل مؤمن بكافر ولا ذوعهد فی عهده۔"**

علماء فرماتے ہیں کہ اس نوشتہ میں مذکور تمام چیزوں کو راوی نے ذکر نہیں کیا چونکہ تفصیل مقصود نہ تھی۔یا یہ کہ حضرت علیؓ نے نوشتہ امور کو تفصیلاً ذکر کیا تھا مگر راوی کو وہ باتیں یاد نہ رہیں۔

جزری نے ابوالطفیلؓ سے روایت کیا ہے: **قال: سئل علی رضی الله عنه هل خصكم رسول الله ﷺ بشیء؟ فقال: ما خصّنا رسول الله ﷺ بشیء لم يعم به الناس كافّة الا ما فی قراب سيفی هذا۔ قال: فأخرج صحيفة مكتوب فيها: لعن الله من ذبح لغير الله، ولعن الله من سرق منار الأرض، ولعن الله من لعن والديه، ولعن الله من آوی محدثا۔**

اشرفؒ فرماتے ہیں: اس میں اس بات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ عالم کو چاہیے کہ وہ فہم کے ذریعہ قرآن سے استخراج کرے۔اور غور وفکر کے ساتھ ان مسائل میں استنباط کرے جن میں مفسرین سے کچھ منقول نہیں ہے۔البتہ اصول شرعیہ کی موافقت کا التزام کرے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قاضیؒ کا یہ کہنا: **الظاهر ان مافی الصحيفة عطف علی ما فی القرآن** شاہد کہ شیخ تور پشتی ؒ کی ذکر کردہ اس توجیہ پر تعریض ہے۔**قال: حلف حلفة ان ليس عنده من ذلك شیء سوی القرآن ثم استثنٰی انشناء ارادیه استدراك معنی اشتبه عليهم معرفته فقال الا فهما يعطی رجل فی كتابه** یہ بات معلوم ومحقق ہے کہ استنباط من القرآن اور جو کچھ اس صحیفہ میں تھا در جال سے خالی نہیں یا تو وہ قرآن مین منصوص ہے۔یا مستبط من القرآن ہے۔ چنانچہ نتیجتاً یہی لازم آتا ہے کہ کوئی بھی شئی قرآن کریم سے خارج نہیں۔جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الانعام:۵۹) "کوئی دانا اور کوئی ہری اور کوئی سوکھی چیز نہیں ہے مگر کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے" چنانچہ اس شخص کی بہت احسن طریقہ سے تردید کی جا سکتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

اپنے اہل بیت کو بعض علوم وحی خصوصی طور پر عنایت فرمائے تھے جو دوسروں کے پاس نہیں۔ نیز ان لوگوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا۔ ابوالحسن صغانیؒ الا الملتقط میں لکھتے ہیں:

روایات موضوعہ میں یہ کلام بھی ہے: **قال النبی صلی الله علیه وسلم فی المرض الذی توفی فیه یا علی ادع بصحیفة و دواة فأملی رسول الله صلی الله علیه وسلم و کتب علی و شهد جبریل ثم طویت الصحیفة۔**

راوی فرماتے ہیں: جو شخص تم سے یہ بیان کرے کہ: **انه یعلم ما فی الصحیفة الا الذی املا ها و کتبها و شهد ها فلا نصدقوه** ۔حضرت کے بارے میں یہ کلام بھی موضوع ہے۔ **وجی و موضع سری و خلنقی فی اهلی ، وخیر من اخلف بعدی علی بن طالب۔**

''اسنی المناقب'' میں جزریؒ فرماتے ہیں: امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہؒ نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذیؒ نے یزید بن شریک تیمی جو ابراہیم تیمی کے والد کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے: **ما عندنا شیئ یقرأء الا کتاب اللّٰه وهذه الصحیفة: المدینة حرام۔**

امام احمد نے یہ روایت اپنی مسند میں قیس بن عباد اور عامر شعبی کے طریق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کی ہے۔ جزریؒ نے اپنی سند کے ساتھ ابوالطفیل سے روایت کی ہے: **قال: قلنا لعلی رضی اللّٰه عنه: أخبرنا بشیئ أسره الیك رسول اللّٰه ﷺ؟ فقال: ما أسر الی شیئا کتمه اللّٰه الناس ولکنی سمعته یقول: لعن اللّٰه من ذبح لغیر اللّٰه ولعن اللّٰه من آوی محدثا، ولعن اللّٰه من لعن والدیه، ولعن اللّٰه من غیر تخوم الأرض ،یعنی المنار أی العلامة۔** فرماتے ہیں: **هذا الحدیث متفق علی صحته من طریقه عن علی رضی اللّٰه تعالٰی عنه۔** امام مسلمؒ نے بھی اس روایت کو اسی طریق سے ذکر کیا ہے۔ مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **کنت عند علی فجاء ہ رجل فقال: ما کان النبی ﷺ یسر الیك؟ فغضب، فقال: ما کان یسر الی شیئا یکتمه عن الناس غیر أنه حدثنی بکلمات، قال: لعن اللّٰه من لعن والدیه۔** نسائی نے بھی یہ روایت یوں ہی ذکر کی ہے۔ احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً ذکر کی ہے: **لا یقتل مسلم بکافر۔**

لا تقتلنفس ظلما کا آخری ٹکڑا یہ ہے: **الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمها۔ لانه اول من سّن القتل** ۔مصنفؒ نے تکرار کے خوف سے اس ٹکڑے کو ساقط کر دیا۔ حالانکہ اگر ابتدائی حصہ ساقط کر دیتے تو باب کی مناسبت سے زیادہ بہتر تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

زوال دینا قتل مؤمن سے ''اھون'' ہے

الفصل الثانی:

۳۴۶۲: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو : اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : لَزَوَالُ الدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ۔ (رواه الترمذی والنسائی وَوَقَفَهُ بَعْضُهُمْ وَهُوَالْاَ صَحُّ)۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱۰/٤ الحديث رقم ۱۳۹۵۔ والنسائی فی ۸۲/۷ الحديث رقم ۳۹۸۶۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک پوری دنیا کا ختم ہو جانا ایک مسلمان شخص کے قتل ہو جانے سے زیادہ آسان ہے۔ (ترمذی' نسائی) اور بعض راویوں نے اس حدیث کو موقوف قرار دیا ہے (یعنی یہ کہا ہے کہ یہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے بلکہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا قول ہے) اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

تشریح: (لزوال الدنيا أهون): لام ابتدائیہ ہے۔ ''اھون'' خبر ہے۔ (أهون بمعنی ای احقر وأمهل علی الله): علیٰ بمعنی عند ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: دنیا اس دار قربیٰ سے عبارت ہے جس کو دار اخریٰ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آسمان و زمین کا پیدا کرنے کا مقصد وحید یہ ہے کہ یہ کائنات غور و فکر کرنے والوں کی نگاہوں کے لئے حد نگاہ ہے اور مطاع و فرمانبرداروں کے لئے عبادت گاہ ہے۔

اس آیت کریمہ میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے: ﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ (العمران:۱۹۱) یعنی بلاوجہ نہیں بلکہ کسی حکمت کے پیش نظر ان کو وجود بخشا ہے۔ مکلّفین کے لئے اس کو مسکن بنایا اور اپنی ذات کی معرفت کے لئے دلائل بنایا چنانچہ جو شخص ایسی ہستی کو مٹانا چاہے کہ جس کی خاطر یہ کائنات وجود میں آئی تو گویا اس شخص نے ساری دنیا کو زوال سے دوچار کر دیا۔ اسی مفہوم کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ ہے: " لاتقوم الساعة علی احد يقول الله الله'' ۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں اور اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ......﴾ (المائدہ:۳۲)

''جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی پیدا کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا اور لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر روشن دلیلیں لا چکے ہیں پھر اس کے بعد بھی ان میں بہت سے لوگ ملک میں حد اعتدال سے نکل جاتے ہیں۔''

(ووقفه) اس حدیث کو صحابی پر ''موقوف'' قرار دیا ہے۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ قول امام ترمذیؒ کا ہے۔

۳۴۶۳: وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ۔

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۸۷٤/۲ الحديث رقم ۲۶۱۹۔

ترجمہ: نیز ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو (حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی بجائے) حضرت براء بن

عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے''۔

مؤمن کی جان کی اہمیت کا بیان

۳۴۶۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : لَوْاَنَّ اَهْلَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اشْتَرَكُوْا فِیْ دَمِ مُؤْمِنٍ لَاَكَبَّهُمُ اللّٰهُ فِی النَّارِ ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذی فی السنن ١١/٤ الحديث رقم ١٣٩٨۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر (یہ ثابت ہو جائے) کہ آسمان والے اور زمین والے سب کے سب کسی ایک مرد مؤمن کے قتل (یعنی ناحق قتل) میں شریک پائے جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو دوزخ کی آگ میں الٹا ڈال دے گا۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: (لوأن أهل السماء والارض اشتركوا) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: لو ماضی کے لئے ہے۔''اهل السماء'' فاعل ہے۔تقدیری عبارت گویا ہے:''لو اشترك اهل السماء والارض ''الأكبهم اشرفی النار۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ بات نوادر میں سے ہے کہ أفعل لازم ہو اور فعل معتدی ہو۔(الجوهری) جاراللہ زمخشری فرماتے ہیں: باب افعال فعل کی مطاوعت کے لئے نہیں آتا۔لہٰذا أكب کا ہمزہ صیرورت یا دخول کے لئے ہے۔تو اس کے معنی ہوں گے: صار ذا كب أو، دخل فی كب۔

فعل کا مطاوع انفعل آتا ہے، جیسے: كب وانكب وقطع وانقطع۔

امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صحیح ''كبهم الله'' ہے۔شاید کسی راوی سے سہو ہو گیا ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ بات محل نظر ہے۔ چونکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ لفظ اپنی اصل کے مطابق ہی استعمال ہوا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی اتباع اولیٰ ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جوہری نفی کر رہے ہیں اور رواۃِ حدیث مثبت ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: جوہری نے تعدیہ کی نفی نہیں کی بلکہ مثبت لزوم ہیں۔ثبوت لزوم سے نفی تعدیہ لازم نہیں آتی۔حالانکہ اكبہ کو قاموس میں لازمی اور متعدی دونوں طرح نقل کیا گیا ہے لکھتے ہیں: كبّه: قلبه وصرعه كالكبة، وكبكبه كأكب هو لازم متعد۔اھ۔

ہمزہ تاکید تعدیہ کے لئے ہے۔جیسا کہ مدا اور أمدّ میں، یہاں پر اسی معنی کے لئے ہے اور ہمزہ سلب کے لئے بھی آتا ہے۔جیسا کہ دوسری متعدد جگہوں پر ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ متعدی ظرف ہے اور حرف جر مقدر ہے۔جیسا کہ حبتك الدار میں ہے، کہ حرف جر مقدر ہے۔أی رحبت بك الدار۔

یہ بات ہر اعتبار سے زیادہ مناسب ہے کہ ثقہ اور عادل راویوں کی طرف خطأ اور سہو کی نسبت کرنے کے بجائے اولیٰ اور احوط یہ ہے کہ بعض بلکہ تمام اہل لغت کی طرف خطا کی نسبت کردی جائے۔اس تحقیق کو غنیمت جانیے۔

اختلافِ روایات: الجامع الصغیر میں اس روایت کے یہ الفاظ منقول ہیں: لكبهم الله عزوجل فی النار۔

قاتل ومقتول بارگاہِ الٰہی میں

۳۴۶۵:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :يَجِئُ الْمَقْتُوْلُ بِالْقَاتِلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ نَاصِيَتُهٗ وَرَأْسُهٗ بِيَدِهٖ، وَاَوْدَاجُهٗ تَشْخُبُ دَمًا تَقُوْلُ :يَا رَبِّ!قَتَلَنِىْ حَتّٰى يُدْنِيَهٗ مِنَ الْعَرْشِ

(رواه الترمذی والنسائی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲۲٤/۵ الحديث رقم ۳۰۲۹۔ والنسائی فی ۸۵/۷ الحديث رقم ۳۹۹۹ وابن ماجه فی ۸۷٤/۲ الحديث رقم ۲٦۲۱۔ واحمد فی المسند ۲٤۰/۱۔

ترجمہ:''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو اس طرح پکڑ کر لائے گا کہ قاتل کی پیشانی (کے بال) اور اس کا سر مقتول کے ہاتھ میں ہوگا اور اس کی رگوں سے خون بہہ رہا ہوگا۔ وہ یہ کہے گا:''اے پروردگار! (اس نے) مجھے قتل کیا ہے (میری فریادرسی کر) یہاں تک کہ مقتول اس قاتل کو (کھینچتا ہوا) عرش الٰہی کے قریب لے جائے گا''۔

(ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

تشریح: بالقاتل: باء برائے تعدیہ ہے۔ جملہ حالیہ ہے۔ فاعل یا مفعول سے باوجودیکہ فاصلہ ہے۔ ضمیر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ جملہ مستانفہ ہوسکتا ہے۔ مجیئ کی کیفیت کے سوال کی تقدیر پر: **ای کیف یجیئ**۔

(**وأوداجه**): النہایہ میں لکھا ہے: **الاوداج هی ما أحاط بالعنق من العروق التی يقطع هما الذابح**۔ (گردن کے اطراف کی وہ دو رگیں جسے ذبح کرنے والا کاٹ دیتا ہے تو دَم نکل جاتا ہے)۔ اس کا واحد ودج (واؤ اور دال کے فتحہ کے ساتھ) ہے۔ مصابیح کے بعض شراح کا کہنا ہے کہ **ای: ودجاه، وهما عرقان علی صفحتی العنق**۔ بعض حضرات کا کہنا ہے: **الودجان عرقان غليظان عن جانبی نقرة النحر**، بعض کا کہنا ہے کہ ودجان تثنیہ کی جگہ أوداج جمع کا استعمال کرنا اشارہ کرنا ہے کہ ''الباس'' سے مامون ہوگا جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: **(وقد صغت قلوبكما)**

(دما): تمیز محول عن الفاعل ہے۔ معنوی تقدیر ''**تشخب دمها**'' ہے۔ **يدنيه، أدنی** کا مضارع ہے۔ یعنی **يقرب المقتول القاتل من العرش**،

فائدہ: اس حدیث سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مقتول قیامت کے دن اپنا پورا حق طلب کرے گا۔ نیز یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عدل وانصاف سے مقتول کو بھرپور طریقے سے راضی ومطمئن کردے گا۔

''مجھے کیوں قتل کرتے ہو؟''

۳۴۶۶:وَعَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ :اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَشْرَفَ يَوْمَ الدَّارِ فَقَالَ : اَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا

بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ :زِنًی بَعْدَ اِحْصَانٍ' اَوْ کُفْرٍ بَعْدَ اِسْلَامٍ اَوْ قَتْلِ نَفْسٍ بِغَیْرِ حَقٍّ' فَقُتِلَ بِہٖ فَوَاللّٰہِ مَا زَنَیْتُ فِیْ جَاھِلِیَّۃٍ وَلَا اِسْلَامٍ وَلَا ارْتَدَدْتُ مُنْذُ بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَا قَتَلْتُ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ فَبِمَا تَقْتُلُوْنَنِیْ ۔ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجة ولدارمی لفظ الحدیث)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٦٤٠/٤ الحدیث رقم ٤٥٠٢۔ والترمذی فی ٤٠٠/٤ الحدیث رقم ٢١٥٨ والنسائی ٩١/٧ الحدیث رقم ٤٠١٩۔ وابن ماجه ٨٤٧/٢ الحدیث رقم ٢٥٣٣۔ والدارمی فی ٣٠٥ الحدیث رقم ٢٤٩٧۔ واحمد فی المسند ٦١/١۔

ترجمہ:''اورحضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ یوم الدار (جن ایّام میں باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گھیر رکھا تھا) مکان کی چھت پر چڑھے اور (بلوائیوں کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نہیں جانتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: کسی مرد مؤمن کا خون (کسی بھی صورت میں) حلال نہیں ہوتا اِلا یہ کہ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات پیش آجائے: ① نکاح کرنے کے بعد زنا کرنا ② اسلام لانے کے بعد کافر ہو جانا ③ اور کسی کا ناحق قتل کر دینا کہ اس کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ پس قسم ہے خدا کی' میں نے نہ تو زمانۂ جاہلیت میں زنا کیا ہے اور نہ زمانہ اسلام میں اور جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت (یعنی بیعت اسلام) کی ہے آج تک اسلام سے نہیں پھرا ہوں اور نہ ہی میں نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا ہے جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو' تو (خدارا مجھے بتاؤ) تم مجھے کس بناء پر قتل کرنا چاہتے ہو؟ اس روایت کو ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور حدیث کے الفاظ داری کے ہیں''۔

تشریح: (أنشدکم): شین کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی أقسمکم، (باللّٰہ أتعلمون) ہمزہ برائے تقریر ہے۔ یعنی قد تعلمون۔

فقتل به: معنی کی مزید توضیح وتقریر کے لئے فرمایا۔ ایک نسخہ میں ''قتل'' ہے اور ایک اور نسخہ میں تقتل به ہے۔ تقتلوننی: دونوں کے ساتھ، ایک نسخہ میں نون مشددہ کے ساتھ ہے۔ ایک اور نسخہ میں تخفیف نون کے ساتھ ہے۔ خطاب تغلیباً ہے۔

حدیث کے یہ الفاظ دارمی کے ہیں، باقی محدثین نے یہ روایت بالمعنی ذکر کی ہے۔ البتہ حدیث کے یہ الفاظ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی ذکر کئے ہیں، جیسا کہ ابتدائے کتاب میں گزر چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

قتل مؤمن کا وبال

٣٤٦٧: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ' عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ : لَا یَزَالُ الْمُؤْمِنُ مُعْنِقًا صَالِحًا مَالَمْ یُصِبْ دَمًا حَرَامًا' فَاِذَا اَصَابَ دَمًا حَرَامًا بَلَّحَ . (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤/٤٦٣ الحديث رقم ٤٢٧٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان اس وقت تک اطاعت گزاری اور اعمالِ صالحہ کی ادائیگی میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں) مستعد رہتا ہے (اور اس کی طرف سبقت کرنے کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے) جب تک کہ وہ خون حرام کا ارتکاب نہیں کرتا اور جب وہ خون حرام کا مرتکب ہو جاتا ہے تو وہ تھکاوٹ کا شکار ہو جاتا ہے (یعنی نیکی کے کام سے رُک جاتا ہے)۔'' (ابوداؤد)

حل اللغات: **(معنقا)**: میم کے ضمہ اور نون کے کسرہ کے ساتھ، صاحب نہایہ معنقا کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **معنقا: أی: مسرعا فی طاعته منبسطا فی عمله**۔ ''صالحا'' صفت کاشفہ ہے۔

(مالم یصب): یاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: **المعنق: السرع فی المشی، عنق**۔ بمعنی **الاسراع و الخطو الفسیح** سے ماخوذ ہے اور **تبلیح** کے معنی ہیں **الاعیاء**۔ **(بلح)** باء موحدہ کے بعد لام کی تشدید و تخفیف، اور حاء مہملہ کے ساتھ۔

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **بلح الرجل: انقطع من الاعیاء، فلم یقدر أن یتحرك، ومنه من أصاب دما حراما بلح، یرید وقوعه فی الهلاكه**۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **بلح الرجل بلوحا** کے معنی ''تھک جانا'' ہیں۔ **بلّح بلیحا** بھی اس کے مثل ہے۔ ہمارے پاس موجود حدیث میں یہ لفظ تشدید کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہی معنی مراد لینا اولیٰ ہیں۔ چونکہ یہ مبالغہ اور تاکید کا فائدہ دے رہے ہیں۔

حدیث کا مطلب:

یہ ہے کہ مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کو برابر نیکی اور بھلائی کی طرف سبقت کرنے کی توفیق دی جاتی ہے، جب تک ناحق خون نہ بہائے اور جب وہ کسی کو ناحق قتل کر ڈالتا ہے تو اس گناہ کی شامت سے نیکی و بھلائی کرنے سے عاجز آ جاتا ہے۔

ابوعبیدہؒ فرماتے ہیں: **معنقا منبسطا فی سیره**۔ یعنی **یوم القیامة**۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں یہ (معنی) درست نہیں سمجھتا چونکہ **معنقا ما لم یصب** کے ساتھ مشروط ہے اور قیامت کے دن ناحق خون سے اپنے ہاتھ رنگنا کا مفہوم صحیح نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ نے پیشینگوئی کی ہو۔ گویا یوں فرمایا ہے:

''**لا یزال المؤمن منبسطا فی سیره یوم القیامة مالم یصب فی الدنیا دما حراما**''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی اسی معنی میں ہے: **من أعان علی قتل مؤمن بشطر كلمة لقی الله مكتوب بين عينيه آيس من رحمة الله**''۔

ہوسکتا ہے کہ سبب ومسبّب کا وقوع دنیا میں ہوجائے۔یعنی حدیث کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ:**لا یزال المؤمن فی سعة من دینه یرجی له رحمة اللّٰه ولطفه ولو باشر الکبائر سوی القتل، فاذا قتل أعیا وضاقت علیه۔** یہ مفہوم فصل اول کی دوسری حدیث میں گزر چکا ہے۔

قتل وشرک نا قابل معافی جرم ہے

۳۴۶۸:وَعَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : كُلُّ ذَنْبٍ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَغْفِرَهُ اِلَّا مَنْ مَاتَ مُشْرِكًا اَوْ مَنْ يَقْتُلُ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤٦٣/٤ الحدیث رقم ٤٢٧٠۔

ترجمه:''اورحضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''ہر گناہ کے بارے میں یہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا سوائے اس شخص کے جو شرک کی حالت میں مرجائے یا جس نے کسی مسلمان کا قتل عمد (یعنی جان بوجھ کر قتل) کیا ہو۔(ابوداؤد)

تشریح: اشرفؒ فرماتے ہیں: اس عبارت میں مستثنیٰ سے پہلے یا مستثنیٰ منہ سے پہلے مضاف محذوف ہے **کل قارف ذنب** اَی مضاف محذوف ہے۔گویا عبارت یوں ہے: **الا ذنب من مات مشرکا**۔اھ۔دوسری تقدیر اولیٰ ہے: **فان الحاجة الیه عنده۔کما لا یخفی۔(أومن یقتل)**: الجامع الصغیر کی روایت میں''**أو قتل**'' ہے۔**(مؤمنا متعمدا)** مظہرؒ فرماتے ہیں: یہ سزا اس شخص کی ہے جو قتل مسلم کو حلال سمجھتا ہے: ① اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص قتل مسلم کو حلال جان کر کسی مسلمان کو قتل کرے گا اس کو نہیں بخشا جائے گا ② قتل کی شدید ترین مذمت بیان کرنا مقصود ہے۔③ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک بخشش نہ ہوگی جب تک خصم راضی نہ ہوجائے ④ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس فرمان: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ج۔:''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ انکے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اسکے سوائے اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دینگے'' کے بدولت معاف کردے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:**الا من مات مشرکا**، اللہ جل شانہٗ کے قول:**وان اللّٰه لا یغفر أن یشرك به ویغفر مادون ذلك لمن یشاء** سے ماُ خوذ ہےاور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی''**ومن یقتل مؤمنا متعمدا**'' اللہ تعالیٰ کے اس قول**ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ جهنم خالدا فیها**:''اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اسکی سزا جہنم ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہنا'' سے ماخوذ ہے۔

معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ شرک کی طرح دوسرے گناہ کبیرہ بھی توبہ سے پہلے نا قابل معافی جرم ہیں، البتہ توبہ کے بعد معاف ہوجاتے ہیں۔حدیث کا ظاہری مفہوم معتزلہ کے مذہب کا مؤید ہے۔ملاحظہ ہو:**(ومن یقتل مؤمنا متعمدا)** کی تشریح از تفسیر کشاف۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل کبائر اگر توبہ تائب نہ ہوں تو **مخلّد فی النار** ہوں گے۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: **من یقتل** میں عموم ہے کہ قاتل خواہ مسلم ہو، کافر ہو، تائب ہو یا غیر تائب ہو۔ تائب تو اس وعید سے مستثنٰی ہے جس کے لئے واضح دلائل موجود ہیں۔ مسلم غیر تائب کے استثناء کے لئے اگر کوئی دلیل ہے تو پیش کی جائے۔ میں نے یہ مسئلہ کافی شافی انداز میں اپنے رسالہ "**القول السدید فی خلف الوعید**" میں بیان کر دیا ہے۔

۳۴۶۹: **وَرَوَاهُ النَّسَائِیُّ عَنْ مُعَاوِیَةَ ۔**

أخرجہ النسائی فی ۸۱/۷ الحدیث رقم ۳۹۸۴۔ واحمد فی المسند ۹۹/۴۔

ترجمہ: نسائی نے اس روایت کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے"۔

تشریح: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾

"اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا' شرک کے علاوہ اور گناہوں کو جس کو وہ چاہے بخش دیتا ہے"۔

الجامع الصغیر میں ہے کہ: اس حدیث کو احمد، نسائی اور حاکم نے حضرت معاویہ سے روایت کیا ہے۔

والد کو قصاصاً قتل کرنے کا بیان

۳۴۷۰: **وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ : لَا تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِی الْمَسَاجِدِ، وَلَا یُقَادُ بِالْوَلَدِ الْوَالِدُ۔** (رواہ الترمذی والدارمی)

أخرجہ الترمذی فی السنن ۱۲/۴ الحدیث رقم ۱۴۰۱۔ وابن ماجہ ۸۸۸/۲ الحدیث رقم ۲۶۶۱ والدارمی ۲۵۰/۲ الحدیث رقم ۲۳۵۷ واحمد فی المسند ۱۶/۱۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسجدوں میں حدود قائم نہ کی جائیں اور نہ اولاد کا والد سے قصاص (یعنی اولاد کے قتل کے بدلے باپ کو قتل) کیا جائے بلکہ باپ سے دیت (یعنی مالی معاوضہ لیا جائے)"۔ (ترمذی' دارمی)

اختلافِ نسخ:

(**المساجد**) ایک نسخہ میں "مسجد" ہے۔ اس ممانعت کا سبب یہ ہے کہ مساجد فرض نماز اور فرائض کے توابع کے لئے ہیں اور ذکر اور دینی علوم پڑھانے کے لئے ہیں۔ (ذکرہ ابن ہمام)

مظہرؒ فرماتے ہیں: ممانعت کی غرض مساجد کی حفاظت ہے اور مساجد کی حرمت کا تحفظ ہے اور اس کا حکم تو بطریقہ اولیٰ ہے۔ البتہ اگر ایسا شخص کہ جس کو قصاصاً قتل کیا جانا ہے اگر وہ حرم میں پناہ لے لے تو اس شخص سے حرم کی حدود میں بھی قصاص لیا جا سکتا ہے۔ خواہ قصاص فی النفس ہو یا قصاص فی الاطراف۔ البتہ چمڑا اچھا لیا جائے پھر قصاص لیا جائے، تاکہ جلد از جلد حق کی وصولی یابی ہو سکے۔

یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے: قصاص النفس حرم میں نہ لیا جائے، بلکہ اس ملتجی کا حقہ پانی بند کر

دیا جائے یہاں تک کہ وہ خود حرم سے باہر نکلنے پر مجبور ہو جائے۔ اس کے بعد اسے قتل کیا جائے۔

لایفاد، قود بمعنی قصاص سے ماخوذ ہے۔

بالولد الوالد اور مطلب یہ ہے کہ اگر باپ اپنی اولاد کو قتل کر دے تو مقتول اولاد کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ البتہ باپ پر دیت واجب ہو گی۔ ابن ہمام نے اس مسئلہ کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اختلافِ ائمہ میں فرماتے ہیں: اگر بیٹا اپنے والدین میں سے کسی کو قتل کر دے تو اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ بیٹے کو بطور قصاص قتل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر باپ بیٹے کو مار ڈالے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ باپ کو بطور قصاص قتل نہ کیا جائے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: اگر باپ نے بیٹے کو ذبح کر کے مار ڈالا ہے تو اس صورت میں باپ کو بطور قصاص قتل کیا جا سکتا ہے۔ اھ۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس بارے میں ماں کا حکم بھی وہی ہے جو باپ کا ہے۔ نیز دادا، دادی، نانا، نانی بھی ماں اور باپ کے حکم میں ہیں۔ (نقلہ ابو جندی)

اشرفؒ فرماتے ہیں: اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① **لا یقتص والد بقتل ولدہ**۔ یعنی اگر باپ اپنی اولاد کو قتل کر دے تو مقتول اولاد کے باپ کو قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا۔ ② **لا یقتل الوالد بعوض الولد الذی وجب علیہ القصاص بأن قتل الولد أحدا ظلما**۔ یعنی بیٹا اگر کسی کو ناحق قتل کر دے تو قصاص میں اس لئے کے بجائے اس کے باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

زمانۂ جاہلیت میں یوں ہوتا تھا کہ باپ کے بدلے میں بیٹے کو، اور بیٹے کے بدلے میں باپ کو قصاصاً قتل کر دیا جاتا تھا، شارع صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جاہلیت کے اس غلط کام کی روک تھام کے لئے یہ ارشاد فرمایا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلی بات زیادہ واضح ہے اور علت یہ بیان فرمائی کہ والد اولاد کے وجود کا سبب ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ درست نہ ہو گا کہ بیٹا باپ کے عدم کا سبب بنے۔ دادے، دادیوں اور پوتے پوتیوں کا حکم، نانے، نانیوں اور نواسے، نواسیوں کا حکم وہی ہے جو والدین اور اولاد کا ہے۔ بخلاف العکس۔

''کرے کوئی بھرے کوئی'' کا بیان

۳۴۷۱: **وَعَنْ اَبِیْ رِمْثَۃَ قَالَ: اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَعَ اَبِیْ، فَقَالَ: مَنْ ھٰذَا الَّذِیْ مَعَکَ؟ قَالَ: اِبْنِیْ اِشْھَدْ بِہٖ قَالَ: اَمَا اِنَّہٗ لَا یَجْنِیْ عَلَیْکَ وَلَا تَجْنِیْ عَلَیْہِ** (رواہ ابوداود والنسائی وزادفی شرح السنۃ فی اولہ) **قَالَ: دَخَلْتُ مَعَ اَبِیْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَاٰی اَبِی الَّذِیْ بِظَھْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: دَعْنِیْ اُعَالِجُ الَّذِیْ بِظَھْرِکَ، فَاِنِّیْ طَبِیْبٌ، فَقَالَ: اَنْتَ رَفِیْقٌ وَاللّٰہُ الطَّبِیْبُ۔**

أخرجه ابوداؤد ٦٣٥/٤ الحديث رقم ٤٤٩٥۔ والنسائى فى ٥٣/٨ الحديث رقم ٤٨٣٢ والدارمى ٢٦٠/٢

الحديث رقم ٢٣٨٨۔ و احمد فی المسند ١٦٣/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے (میرے والد سے) ارشاد فرمایا: یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے' آپ اس کے متعلق گواہ رہئے (کہ زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق ہم دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے جرم میں قابل مؤاخذہ ہوں گے) آپ ﷺ نے (ان کے اس زعم کو رد کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''آگاہ ہو جاؤ! نہ تو تمہارے گناہوں کو مواخذہ اس سے ہوگا اور نہ ہی اس کے گناہوں کے مؤاخذہ تجھ سے ہوگا۔'' (ابوداؤد' نسائی) اور صاحب مصابیح نے شرح السنۃ میں اس روایت کے شروع میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ ''ابو رمثہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' میرے والد نے رسول اللہ ﷺ کی پشت مبارک پر (مہر نبوت) دیکھی تو کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کی پشت پر جو چیز ہے میں اس کا علاج کروں کیونکہ میں طبیب ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم (تو بس) رفیق ہو' طبیب (تو) اللہ ہے''۔

راویٔ حدیث:

ابو رمثہ۔ یہ ''ابو رمثہ'' رفاعہ بن یثربی کے بیٹے ہیں۔ خاندانی اعتبار سے ''تمیمی'' ہیں امراء القیس بن زید بن مناۃ بن تمیم کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے نام میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ بعض نے وہ نام بیان کیا ہے جو ہم نے ابھی ذکر کیا اور بعض نے ''عمارۃ بن یثربی'' کہا ہے اور بعض نے دوسرے نام ذکر کیے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی خدمت میں اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوئے ان کا شمار کوفیین میں کیا جاتا ہے۔ ایاد بن لقیط نے ان سے روایت کی ہے۔ رمثہ راء کے کسرہ اور میم کے سکون اور ثائے مثلثہ کے ساتھ ہے۔ فوقانی متن میں ''تیمی'' تحتانی متن میں ''تیم'' اور شمائل کی روایت میں ''تیم الرباب'' مذکور ہے' اس کے ذریعہ احتراز ہے تیم قریش ہے' جو ابوبکر کا قبلہ ہے۔

(ابنی): ھو مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ (**اشھد به**) ہمزہ وصل اور ھاء کے فتحہ کے ساتھ، ای: **کن شاھدا بأنه ابنی من صلبی**۔ (آپ اس بات کے گواہ بن جائیں کہ یہ میرا صلبی بیٹا ہے) ایک نسخہ میں متکلم کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں یہ تقریر ہوگی کہ یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ (أما) تخفیف کے ساتھ برائے تنبیہ ہے۔ (**انه**): میں ضمیر شان ہے۔ یا ضمیر کا مرجع ''ابن'' ہے۔ (**لا یجنی علیك**) اگر تم سے کوئی جرم و گناہ سرزد ہو جائے تو دنیا و آخرت میں تمہارے بیٹے سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا اور نہ اس کے گناہ کی پاداش میں تم سے کوئی مؤاخذہ ہوگا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① **انه لا یجنی جنایة یکون القصاص أو الضمان فیھا علیك**۔

② یا یہ کہ خبر بمعنی نہی ہو: **لایجن علیك و لاتجن علیه**۔

یہ معنی ماقبل سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں اور نہ ہی باپ سے، کسی بھی سمجھدار پر یہ مخفی نہیں۔

سلعۃ کے معنی بیان کرتے ہوئے صاحب المغرب فرماتے ہیں: **سلعة: لحمة زائدة تحدث فی الجسد**

كالغدة تجيئ و تذهب بين الجله و اللحم۔

(أعالج): مرفوع ہے۔تقدیری عبارت یوں ہے:**أنا اعالج** ۔بعض حضرات فرماتے ہیں یہ مجزوم ہے اور کسرہ التقاء ساکنین کی وجہ سے ہے۔**(أانت رفيق)** یعنی تم تو بس رفیق ہو، بایں معنی کہ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ جب تم کسی مریض کو دیکھو تو اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر کوئی نسخہ اور دوا تجویز کر دو۔اس کے علاج کے دوران جو چیز بظاہر اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرو۔

و الله الطبيب : مرض کی حقیقت بھی وہی جانتا ہے اور دوا کی حقیقت بھی اس کے علم میں ہے اور صحت وشفا بھی اس کے قبضہ قدرت میں ہے جو بقاء کے ساتھ موصوف ہے۔

بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ: شفا دینے والی ذات اور بیماریوں کو زائل کرنے والی ذات تو اللہ کی ذات پاک ہے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان آنحضور ﷺ کے اس فرمان کے مشابہ ہے: **فان الله هو الدهر** ۔یعنی جن کاموں کی نسبت تم دہر کی طرف کرتے ہو، درحقیقت اس کا فاعل اللہ ہے نہ کہ دہر۔لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ''طبیب'' کے نام سے موسوم کرنا درست نہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ابورمثہ کے والد نے آنحضرت ﷺ کی پشت مبارک پر ابھری ہوئی مہر نبوت کو دیکھا تو ان کو یہ خیال گزرا یہ کوئی گلٹی ہے جو جسم کے فاضل مادوں کی وجہ سے بن گئی ہے۔نبی کریم ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید فرمائی کہ اس کو علاج کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارا کلام قابل علاج ہے کہ تم نے اپنے آپ کو ''طبیب'' کہا۔طبیب تو اللہ کی پاک ذات ہے۔یہ اسلوب حکیمانہ ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: شفا یابی کی دعا مانگتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو یوں مخاطب کرنا تو درست ہے: **اللهم أنت المصح والمرّض والمداوى والطيب** ۔مگر ''یا طبیب'' نہ کہا جائے۔جیسا کہ ''**یا حلیم**'' ''**یا رحیم**'' کہا جاتا ہے۔چونکہ یہ بعید از ادب ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ولله الاسماء الحسنٰى فادعوه بها﴾: ''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لئے ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو''۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: خلافِ ادب ہونے کی علت یہ ہے کہ ابہام لازم آتا ہے چونکہ عرف عام میں ''طبیب'' کا اطلاق مخلوق پر ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو ''معلم'' نہیں کہا جاتا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا خود کا فرمان ہے: **(علم آدم الأسماء)** ''اور علم دیدیا اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو'' اور **(الرحمٰن علم القرآن)**: ''رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی''۔ممانعت کی علت اس بات کو بنانا کہ اسماء توقیفی جس میں یہ لفظ موجود نہیں ہے۔واضح نہیں۔ہاں اگر توقیف سے مراد صحت دلیل ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مشہور ننانوے اسماء حسنیٰ میں سے نہیں ہے تو یہ بات درست ہے۔**(و اللّٰه تعالٰى اعلم)**

اختلاف روایات: الجامع الصغیر کی روایت میں **الله الطبيب** کے الفاظ ہیں۔اس حدیث کو ابوداؤد نے ابورمثہ سے، اور شیرازی نے مجاہد سے مرسلاً روایت کیا ہے: **الطبيب الله، ولعلك ترفق بأشياء يخرق بها غيرك۔**

باپ بیٹے کے قصاص کا بیان

۳۴۷۲: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ : حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقِيْدُ الْاَبَ مِنْ ابْنِهٖ، وَلَا يُقِيْدُ الْاِبْنَ مِنْ اَبِيْهِ ۔ (رواه الترمذی وضعفه)

أخرجه الترمذی ١١/٤ الحديث رقم ١٣٩٩۔

ترجمه: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے' وہ اپنے دادا سے اور وہ حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹے سے باپ کا قصاص لیتے تھے لیکن باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیتے تھے''۔ (ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے اس روایت کو نقل ضعیف قرار دیا ہے''۔

تشریح: قوله: حضرت رسول الله ﷺ ......:

يقاد ياء تحتيه: کے ضمہ کے ساتھ، از باب افعال

من ابنه التقاء ساکنین کی وجہ سے (پہلا) نون مکسور ہے اور ''من سببيه'' ہے۔ ای: **لاجله وسببه ،يقيد الاب من ابنه:** یہ جملہ مفعول سے حال ہے۔

بعض حضرات کا فرمانا ہے کہ ابتداء اسلام میں یہ حکم موجود تھا البتہ بعد میں منسوخ ہو گیا۔ (ذكره ابن الملك)۔ النهاية میں لکھتے ہیں: ''قود'' کا مطلب ہے قصاص میں مقتول کے بدلہ میں قاتل کو قتل کرنا۔ یہ باب افعال سے آتا ہے: **أقدته به أقيده اقادة** قاتل کو مقتول کے بدلہ میں مار ڈالنا۔ **استقدت الحاكم:** حاکم سے مقتول کا بدلہ دلانے کی درخواست کرنا۔

(ولا يقيد الابن): التقاء ساکنین کی وجہ سے لام مکسور ہے شرح الفرائض میں سید فرماتے ہیں: یہ بیٹا مجنون تھا یا صبی تھا۔

ضعفه: عین کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی حدیث کو ضعیف کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔

غلام پر ظلم وزیادتی کا بیان

۳۴۷۳: وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قَتَلْنَاهُ، وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهٗ جَدَعْنَاهُ (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة والدارمی وزاد النسائی فی رواية اخری) وَمَنْ خَصٰى عَبْدَهٗ خَصَيْنَاهُ .

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٦٥٤/٤ الحديث رقم ٤٥١٦۔ والترمذی فی ١٨/٤ الحديث رقم ١٤١٤۔ والنسائی ٢٠/٨ الحديث رقم ٤٧٣٦۔ وابن ماجه فی ٨٨٨/٢ الحديث رقم ٢٦٦٤۔ والدارمی فی ٢٥/٢ الحديث قم ٤٧٣٦ واحمد فی المسند ١٠/٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت حسن بصریؒ (تابعی) حضرت سمرہ (بن جندب) رضی اللہ عنہ (صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اس کو قتل کریں گے اور جو شخص اپنے غلام کے اعضاء (کان' ناک' ہاتھ' پاؤں وغیرہ) کاٹے گا' ہم اس کے اعضاء کاٹیں گے۔ (ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ' دارمی) اور نسائی نے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ ''جو شخص اپنے غلام کو خصی کرے گا ہم اس کو خصی کر دیں گے''۔

تشریح: **قولہ: من قتل عبدہ قتلناہ:**

اس کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① خطابیؒ فرماتے ہیں یہ آپ ﷺ نے بطور زجر و تشدید اور تنبیہ فرمایا کہ لوگ اپنے غلاموں کو مار ڈالنے سے باز رہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص نے سخت ترین ممانعت اور تنبیہ کے باوجود بھی جب چوتھی یا پانچویں بار شراب پی لی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو قتل کر دو' لیکن جب وہ آپ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو قتل نہیں کیا

② بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں غلام سے مراد وہ شخص ہے جو غلام بھی رہا ہو اور پھر آزاد کر دیا گیا ہو' اگرچہ ایسے شخص کو غلام نہیں کہا جاتا لیکن اس کے سابق حال کے اعتبار سے اس کو یہاں ''غلام'' سے تعبیر کیا گیا۔

③ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس آیت کریمہ: ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ...... والجروح قصاص﴾ [المائدة:٤٥] ''آزاد آدمی آزاد آدمی کے عوض میں اور غلام غلام کے عوض میں'' کے ذریعہ منسوخ ہے۔ اھ۔

اس بارے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے غلام کو قتل کر دے تو اس کو غلام کے بدلے میں قتل کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اس نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو اس غلام کے بدلے میں اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعی اور امام امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ والعبر بالعبر﴾ کے بموجب کسی آزاد شخص کو نہ تو اپنے غلام کے بدلے میں قتل کیا جائے اور نہ کسی دوسرے کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کا مذہب یہ ہے کہ مقتول غلام کے بدلے میں قاتل آزاد کو قتل کیا جائے خواہ وہ مقتول اس کا اپنا غلام ہو یا کسی دوسرے کا ہو۔

قولہ: ومن جدع عبدہ جدعناہ:

جدع: دال مہملہ کے فتحہ کے ساتھ، از باب فتح کان، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کاٹنا۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی آزاد کسی غلام کے اعضاء جسم کاٹ ڈالے تو اس کے بدلے میں اس آزاد کے اعضاء جسم نہ کاٹے جائیں' علماء کے اس اتفاق سے یہ ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ''ہم اس کے اعضاء کاٹ دیں گے'' یا تو زجر و تنبیہ پر محمول ہے یا منسوخ ہے۔

قتل عمد کی دیت کا بیان

۳۴۷۴: وعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ' اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ قَتَلَ مُتَعَمِّدًا دُفِعَ اِلٰى اَوْلِيَاءِ الْمَقْتُوْلِ' فَاِنْ شَاءُوْا قَتَلُوْا' وَاِنْ شَاءُوْا اَخَذُوْا الدِّيَةَ وَهِيَ ثَلَاثُوْنَ حِقَّةً وَثَلَاثُوْنَ جَذَعَةً وَاَرْبَعُوْنَ خَلِفَةً' وَمَا صَالَحُوْا عَلَيْهِ فَهُوَ لَهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٦/٤ الحديث رقم ١٣٨٧۔ وابن ماجه في ٨٧٧/٢ الحديث رقم ٢٦٢٦۔ واحمد في المسند ١٨٣/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص (کسی شخص کو) جان بوجھ کر قتل کرے اس کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے چاہے وہ اس کو (مقتول کے بدلے میں) قتل کر دیں اور چاہے اس سے (مقتول کی) دیت (یعنی خون بہا) لے لیں اور خون بہا (کی مقدار و تعداد) یہ ہے کہ تیس حقہ (یعنی وہ اونٹنیاں جو تین سال کی ہو کر چوتھے سال میں لگی ہوں) اور تین جذعہ (یعنی وہ اونٹنیاں جو چار سال کی ہو کر پانچویں سال میں لگی ہوں) اور چالیس حاملہ اونٹنیاں ہوں (اس کے علاوہ) جس چیز پر صلح ہو جائے تو وہ اس کے حقدار ہوں گے (یعنی دیت جو مقتول کے ورثاء کا حق ہے اس کی اصل مقدار و تعداد تو یہ ہے ہاں اگر ورثاء اس سے کم پر راضی ہو جائیں تو قاتل پر وہی واجب ہوگا)''۔ (ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قوله: من قتل متعمد االخ: متعمدا: اس قید سے ''خطا'' سے احتراز ہے۔

دفع: ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔

حقة: حاء مہملہ کے کسرہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ

جذعة: جیم اور ذال کے کسرہ کے ساتھ۔

خلفة: خاء معجمہ کے فتحہ، اور لام کے کسرہ کے ساتھ۔

(وماصالحوا عليه: اس کا ایک مطلب تو ترجمہ میں بین القوسین گذر چکا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ادائیگی کے جس زمان و مکان کی تعیین پر کی مصالحت ہوئی ہو۔

لهم: جار کا متعلق ''جائز'' محذوف ہے، یعنی ''**جائز للمصالحين**'' **أوثابت لاولياء المقتول۔**

امام مالک نے مؤطا میں عمرو بن شعیب سے یہ روایت ذکر کی ہے: **أن رجلا حذف ابنه بالسيف فقتلة، فاخذ عمر منه الدية وثلاثين حقة، وثلاثين جذعة، واربعين خلفة۔**

شمنیؒ فرماتے ہیں: امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کا مسلک اور امام احمدؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ دیت میں جو سو اونٹ مشروع ہیں وہ چار طرح کے ہونے چاہئیں: ۲۵ بنت مخاض، ۲۵ بنت لبون،

۲۵ حقہ، اور ۲۵ جذعہ۔ امام مالکؒ کا مسلک اور امام احمدؒ کی دوسری روایت بھی یہی ہے۔

دلائل: پہلی دلیل ابوداؤد کی روایت ہے: عن والأسود قالا: قال عبدالله فی شبه العمد: خمس وعشرون حقة، وخمس وعشرون جذعة، وخمس وعشرون بنات لبون، وخمس وعشرون بنات مخاض۔ امام ابوداؤد اور منذری نے اس پر سکوت کیا ہے۔ یہ روایت اگرچہ موقوف ہے مگر حکماً مرفوع ہے کیونکہ مقادیر کی تعیین عقل سے نہیں ہوتی۔

دوسری دلیل ابن حبان کی روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کے نام خط میں لکھا: ان فی النفس المؤمن مائة من الابل۔ مراد ادنیٰ سے ادنیٰ ہے اور جو ہم نے کہا ہے وہ بھی ادنیٰ ہے اور اس وجہ سے بھی کہ شبہ عمد کی دیت، خطا محض کی دیت سے زیادہ سخت ہے، اور یہ ہمارے بیان کردہ ہی میں ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، احمد، ثوری، اسحاق نخعی، حکم، حماد، شعبی، ابن سیرین، ابن شبرمہ، ابوثور، قتادہ، زہری، حارث عکلی رحمۃ اللہ علیہم کے ہاں شبہ عمد کی دیت عاقلہ پر ہے۔ احمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ دیت قاتل کے مال سے ادا کی جائے گی۔ امام مالکؒ کا قول بھی یہی ہے، چونکہ ان کے ہاں شبہ عمد بھی عمد کے قبیل سے ہے۔ ہماری دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت ہے: قال: اقتلت امرأتان...... ۔ یہ روایت عنقریب آئے گی کیونکہ اس (حدیث) میں ہے کہ اس (عورت) کی دیت اس کے عاقلہ پر ہے۔

ہر مسلمان کا خون برابر ہے

۳۴۷۵: وَعَنْ عَلِيٍّ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاءُهُمْ وَيَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ اَدْنَاهُمْ، وَيَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ، وَهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ اَلَا لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ وَلَا ذُوْعَهْدٍ فِيْ عَهْدِهٖ. (رواه ابوداود والنسائی)

ترجمہ: "اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (قصاص اور دیت میں) تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔ ان کے عام آدمی کی امان کا بھی خیال رکھا جائے گا اور ان سے دور رہنے والا شخص مالِ غنیمت ان کے نزدیک والے پر لوٹائے گا۔ تمام مسلمان دشمن کے مقابلے میں ایک ہاتھ کی مانند ہوتے ہیں (یعنی تمام مسلمان دشمنوں کے مقابلہ میں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہونے میں ایک ہاتھ کی مانند ہوتے ہیں کہ جس طرح کسی چیز کو پکڑنے یا سکون وحرکت کے موقع پر ایک ہاتھ کے تمام اجزاء میں کوئی مخالفت یا جدائی نہیں ہوتی اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ دشمنوں کے مقابلے میں متحد و متفق رہیں اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں) اور آگاہ رہو! کافر کے بدلے میں کسی مسلمان کو نہ قتل کیا جائے اور نہ عہد والے (یعنی ذمی) کو قتل کیا جائے جب تک کہ وہ عہد وضمان میں ہے۔ (ابوداؤد، نسائی)

واحمد فی المسند ۱/۱۲۲۔

فائدہ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث بھی اس صحیفہ کے نوشتہ جات میں سے ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کی نیام

میں تھا۔

قولہ: المسلمون تنکافأ مصأهم: تتکافأ: مؤنث کا صیغہ ہے اس کے آخر میں ہمزہ ہے۔

شرح السنۃ میں ''سب مسلمان برابر ہیں'' کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قصاص اور خون بہا کے لینے دینے میں سب مسلمان برابر ہیں۔ رذیل کے بدلے میں شریف کو قتل کیا جائے گا' عالم کو جاہل کے بدلے میں، عورت کو مرد کے بدلے میں، اگرچہ مقتول شریف ہو یا عالم اور قاتل رذیل یا جاہل ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا نہ ہوگا جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا کہ اگر کوئی باحیثیت آدمی کسی کم حیثیت والے کو قتل کر دیتا تھا تو وہ قصاص میں اس کو قتل نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے عوض میں اس کے قبیلے کے ان چند آدمیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا جو زبردست ہوتے تھے۔

قولہ: ویسعی بذمتهم أدناهم:

فائق میں لکھا ہے: **الذمة: الأمان**، معاہد کو ذمی اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ جزیہ کے بدولت اس کی جان اور مال مأمون ہو جاتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان کا کوئی ادنیٰ ترین فرد کسی کافر کو امان دیدے تو کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس عہد کو توڑیں۔

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: اگر مسلمانوں کا کوئی ایک فرد کسی کافر کو امان دے دے تو تمام مسلمانوں پر اس کا خون بہانا حرام ہوگا۔ اگرچہ امان دینے والا مسلمان ان کا کوئی ادنیٰ فرد ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً امان دینے والا مسلمان کوئی غلام ہے یا عورت یا عسیفِ تابع یا کوئی اور ہے تو اس کے ذمّہ کو نہ توڑا جائے جامع صغیر میں ہے: **یجیر علی امتی ادناهم**۔ اس حدیث کو امام احمد اور حاکم نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

ویرد علیهم اقصاهم:

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں:

① اگر کسی ایسے مسلمان نے جو دارالحرب سے دور رہتا ہے کسی کافر کو امان دے رکھی ہے تو ان مسلمانوں کے لئے جو دارالحرب کے قریب ہیں یہ جائز نہیں ہے کہ اس مسلمان کے عہد و امان کو توڑیں۔

② جب مسلمانوں کا لشکر دارالحرب میں داخل ہو جائے، اور مسلمانوں کا امیر لشکر کے ایک دستہ کو کسی سمت بھیج دے اور پھر وہ دستہ مال غنیمت لے کر واپس آئے تو وہ مال غنیمت صرف اسی دستہ کا حق نہیں ہوگا بلکہ وہ سارے لشکر والوں کو تقسیم کیا جائے گا، چونکہ پیچھے والے لوگ اگرچہ ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے البتہ اس سریہ کے لئے پشت پناہ تو تھے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: النہایہ میں بھی اس طرح ہے اس کو قاضی نے اختیار کیا ہے اور ظاہر پہلا ہے، چونکہ دوسری صورت میں ''**تعمیه**'' اور ''**الغاز**'' لازم آتا ہے چونکہ ''**یرد**'' کا مفعول مذکور نہیں ہے، اور کلام میں بھی ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو ''بخلاف اول کہ'' کہ اس پر ''**ویسعی بذمتهم أدناهم**'' دلالت کر رہا ہے اور دونوں جملوں میں تکرار نہیں ہے' اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہے: **بحیر بعهس هم أدناهم منزلة و أبعهم منزلا**۔ دوسری صورت کی تائید ''باب الدیات'' میں موجود فصل ثانی کی چھٹی حدیث سے ہو رہی ہے۔ اس کا بیان عنقریب آئے گا۔

علی من سواهم:

ابوعبیدہؒ فرماتے ہیں: مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے سے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں۔ بلکہ تمام ملل وادیان کے خلاف باہمی طور پر تعاون کریں گے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس جملہ کی ترکیبی تحقیق اور مجاز کی تشریح وتوضیح ماقبل میں بیان ہوچکی ہے۔

قوله: ألا ئقتل مسلم بكافر...... :ألا: تخفیف کے ساتھ، برائے تنبیہ ہے۔

لایقتل مسلم بکافر: کافر سے مراد ''حربی'' ہے۔اس کی دلیل اس کا معطوف ہے۔

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کا یہ فرمانا کہ ''مسلمان کو ذمی کے بدلے میں قتل کیا جاسکتا ہے'' اس کے منافی نہیں۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں: مسلمان کسی بھی کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ذمی جب تک عہد نبھائے، اس کو ابتداءً قتل کرنا درست نہیں۔قاضیؒ فرماتے ہیں: جب تک وہ عہد پورا کرلے، خلاف ورزی نہ کرے، اس کے کفر کی وجہ سے اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔حنفیہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں: **لا یقتل ذوعهد فی عهده بکافر قصاصا۔**

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ کافر کہ جس کے بدلے میں معاہد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔اس سے مراد حربی ہے نہ کہ ذمی۔لہٰذا معطوف، معطوف علیہ کے درمیان تسویہ کا تقاضا یہ ہے کہ: ''**الکافر الذی لا یقتل به المسلم**'' سے مراد بھی حربی ہے نہ کہ ذمی۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: ہم تو یہ نہیں جاتے تھے۔

فرمایا: یہ ضعیف ہے چونکہ بلاوجہ اضمار لازم آتا ہے جب کہ یہاں اضمار کا کوئی مقتضی نہیں ہے۔مستزاد بریں کہ معطوف، معطوف علیہ میں تسویہ ہونا کوئی ضروری نہیں۔ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں تسویہ کا ضروری نہ ہونا مسلّم ہے۔البتہ ہونا مستحسن ضرور ہے، لہٰذا اس کو مبنیٰ بنانا مستحسن ہے اور یہی دلیل مقتضی ہے اضمار کی۔لہٰذا اس کو ضعیف قرار دینا اس بنیاد پر کہ اضمار بلا حاجت لازم آتا ہے خود ضعیف ہے۔

مزید یہ فرمایا کہ اس بات کے نتیجہ میں پھر یہ تاویل لازم آتی ہے کہ: **لا یقتل مؤمن بکافر، لا یقتل مؤمن بحربی،** (مؤن کو کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے' مؤمن کو حربی کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے) اور یہ تاویل بے فائدہ اور لغو ہے۔ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: اس کا فائدہ یہ ظاہر ہوگا کہ ہمارے نزدیک مؤمن کو ذمی کے بدلہ قتل نہیں کیا جائے گا، لہٰذا یہ تاویل تو متعین ہے۔تورپشتی فرماتے ہیں: اگر اس کی مراد وہ نہ ہو جو اصحاب نے لی ہے تو یہ کلام فائدہ سے خالی ہوجائے گا۔چونکہ یہ مسئلہ تو مجمع علیہ ہے کہ معاہد کو قتل نہیں کیا جائے گا جب تک وہ اپنے عہد وپیماں میں ہے۔

شرح السنہ میں لکھتے ہیں اس کا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس موقع پر مسلمان سے دیت کو ساقط قرار دے دیا تو اس سے کفار کے خون کی حرمت کی توہین لازم آئی، تو اندیشہ تھا کہ سامعین میں سے کوئی کفار کی حرمت کے بارے میں شبہ میں پڑجائے اور کافروں کے قتل کے درپے ہوجائے، اس لئے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بات

دہرائی تا کہ شبہ دور ہو جائے اور کوئی متاول تاویل نہ کر پائے۔ اھ۔ اس کا ضعیف ہونا مخفی نہیں، اگرچہ امام طیبیؒ نے تکلف کرتے ہوئے اس کو قوی قرار دیا ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں: حافظ ابوموسیٰ کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں ایک اور توجیہ کا احتمال ہے وہ یہ کہ اس کا معنی ہو: **لا يقتل مؤمن بأحد من الكفار ولا معاهد ببعض الكفار وهو الحربى** (کہ مؤمن کو کسی بھی کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے اور نہ کسی معاہد کو بعض کفار کے بدلہ میں قتل کیا جائے اور وہ حربی ہے) اور یہ کوئی قابل انکار بات نہیں کہ لفظ ایک ہو اس پر دو کا عطف کیا جائے، خصوصاً جب کہ ایک ''جمیع'' کی طرف راجع ہو اور دوسرا بعض کی طرف۔ میں کہتا ہوں اس صورت کی تائید کے لئے کلام میں کسی مؤید کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے بعض محقق علماء اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ''**ذو عهد**'' کا عطف ''**مسلم**'' پر ہے اور اس سے مراد ذوامان ہے نہ کہ ذوایمان۔ کیونکہ عطف تغایر کا مقتضی ہے، وگرنہ اس کا مطلب یہ ہوگا: **لا يقتل مؤمن ولا مؤمن بكافر**۔ البتہ اس میں کچھ تقدیم وتاخیر ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: **لا يقتل مسلم ولا ذو عهد في عهد بكافر**، اور کافر سے مراد ''حربی'' ہے نہ کہ ذمی، کیونکہ ذمی کو اس کے مثل میں قتل کرنا مجمع علیہ ہے۔

۳۴۷۶: وَرَوَاهُ ابْنِ مَاجَةِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

أخرجه ابن ماجه في السنن ۸۹۵/۲ الحديث رقم ۲۶۸۳۔

ترجمہ: ''امام ابن ماجہ نے اس روایت کو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے''۔

قوله: من أصب بدم أو خيل۔۔۔ احدى ثلاث:

تشریح: خبل: خاء معجمہ کے فتحہ اور باء موحدہ کے سکون کے ساتھ ہے ''جیم کے ضمہ کے ساتھ اس کا معنی ہے ''زخم''۔ ''النہایہ'' میں ہے کہ الخبل: باء کے سکون کے ساتھ، اعضاء کا فساد۔

بين: منصوب ہے ''بالخیار'' کا ظرف ہونے کی وجہ سے' اور ایک نسخہ میں ''من بين'' ہے۔ ''خیار'' بمعنی اختیار ہے۔

قوله: فان اراد الرابعة ......:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: (مثلاً) پہلے تو اس نے معاف کر دیا اور پھر بعد میں مالی معاوضہ کا مطالبہ کیا۔

أبدا: دوہری تاکید کا اسلوب سخت زجر وتنبیہ اور شدید وعید کے اظہار کے لئے ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''بين أن يقتص'' بدل ہے ''بين'' احدى ثلاث'' سے اور تقسیم کی وضاحت کے لئے لایا گیا۔

اور ''فان أراد الرابعة'' حصر پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا ''فان أخذ الخ'' ''فان أراد الرابعه، فخذوا على يده'' کے لئے بھی بمنزلہ توضیح کے ہے۔

یعنی جو شخص کسی چوتھی چیز کا مطالبہ کرتا ہے وہ حد سے تجاوز کر رہا ہے، لہٰذا وہ (دوزخ کی) آگ کا مستحق ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمودہ جملہ، اللہ جل شانہ کے اس فرمان: ﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [البقرة: ۱۷۸] ''ہاں جس کو اس کے فریق کی طرف سے کچھ معافی ہو جاوے۔'' سے ماخوذ ہے۔ خلود اور تابید کی

وضاحت فصل اول میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت (نمبر۷) کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

قصاص میں زیادتی کا بیان

۳۴۷۷: وَعَنْ اَبِیْ شُرَیْحِ الْخُزَاعِیِّ قَالَ :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ :مَنْ اُصِیْبَ بِدَمٍ اَوْ خَبَلٍ' وَالْخَبَلُ الْجُرْحُ ' فَھُوَ بِالْخِیَارِ بَیْنَ اِحْدٰی ثَلَاثٍ: فَاِنْ اَرَادَ الرَّابِعَةَ فَخُذُوْا عَلٰی یَدَیْہِ :بَیْنَ اَنْ یَقْتَصَّ' اَوْ یَعْفُوَا' اَوْ یَا خُذَ الْعَقْلَ فَاِنْ اَخَذَ مِنْ ذٰلِكَ شَیْئًا ثُمَّ عَدَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ النَّارُ خَالِدًا فِیْھَامُخَلَّدًا اَبَدًا ۔(رواہ الدارمی)

أخرجہ ابوداوٗد فی کتاب ٦٣٦/٤١ الحدیث رقم ٤٤٩٦۔ وابن ماجه فی ٨٧٦/٢ الحدیث رقم ٢٦٢٣۔ والدارمی فی ٢٤٧/٢ الحدیث رقم ٢٣٥١۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوشریح خزاعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص اپنے کسی عزیز کے ناحق قتل یا زخم کے باعث غمزدہ ہو (یعنی جس شخص کے مورث کو ناحق قتل کر دیا گیا ہو یا اس کے جسم کا کوئی عضو کاٹ دیا گیا ہو) تو وہ (وارث) تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کا حقدار ہے اور اگر وہ (ان تینوں چیزوں میں سے زائد) کسی چوتھی چیز کو طلب کرنے کا ارادہ کرے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو (یعنی اس کو وہ چوتھی چیز طلب کرنے سے روک کر دو) اور وہ تین چیزیں یہ ہیں: ① یا تو وہ (اس قاتل یا جارح سے) قصاص لے لے۔ ② یا معاف کر دے۔ ③ اور یا دیت (مالی معاوضہ) لے لے۔ پھر اگر اس نے ان (مذکورہ) چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کے بعد کسی دوسری چیز کا اضافہ کیا (یعنی مثلاً پہلے تو اس نے معاف کر دیا اور پھر بعد میں قصاص یا مالی معاوضہ کا مطالبہ کیا) تو اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس میں اس کو ہمیشہ رکھا جائے گا''۔ (دارمی)

قتل خطاء کی ایک صورت کا بیان

۳۴۷۸: وَعَنْ طَاؤُوْسٍ' عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ :مَنْ قُتِلَ فِیْ عِمِّیَّةٍ فِیْ رَمْیٍ یَکُوْنُ بَیْنَھُمْ بِالْحِجَارَةِ اَوْ جَلْدٍ بِالسِّیَاطِ اَوْضَرْبٍ بِعَصًا فَھُوَ خَطَاءٌ' وَعَقْلُهٗ عَقْلُ الْخَطَاءِ' وَمَنْ قَتَلَ عَمْدًا فَھُوَ قَوَدٌ' وَمَنْ حَالَ دُوْنَهٗ فَعَلَیْہِ لَعْنَةُ اللّٰہِ غَضَبُهٗ لَا یُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ ۔(رواہ ابوداود والنسائی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٦٧٧/٤ الحدیث رقم ٤٥٤٠۔ والنسائی فی ٣٩/٨ الحدیث رقم ٤٧٨٩۔ وابن ماجه فی ٨٨٠/٢ الحدیث رقم ٢٦٣٥۔

ترجمہ: اور حضرت طاؤس ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے

ارشاد فرمایا: جوشخص لوگوں کے درمیان پتھراؤ میں یا کوڑوں اور لاٹھیوں کی اندھا دھند مار میں مارا جائے' (یعنی یہ نہ پتہ چلے) کہ اس کا قاتل کون ہے تو یہ قتل (گناہ نہ ہونے کے اعتبار سے) قتل خطاء کے حکم میں ہوگا (کیونکہ وہ بلاقصد قتل مارا گیا ہے) اور اس کی دیت' قتل خطا کی دیت ہے (کیونکہ اس نے کوتاہی کی ہے) اور جوشخص جان بوجھ کر مارا گیا تو اس کا قتل قصاص کو واجب کرے گا اور جوشخص اس (قصاص لینے میں حائل ہوا اس پر اللہ کی لعنت (یعنی رحمت سے دوری) اور اس کا غضب (یعنی ناراضگی) ہے' نہ اس کے نفل قبول کئے جائیں گے اور نہ فرض (اور نہ فدیہ)''۔

(ابوداؤد' نسائی)

قوله: من قتل۔۔۔فهو خطاو عقله عقل الخطأ: قتل:

ماضی مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔ **عمية**: عین مہملہ کے کسرہ ضمہ، فتحہ، میم مشدّدہ کے کسرہ، اور یاء تحتیہ مشددہ کے ساتھ، بروزن **فعليّة**، **عمي** بمعنی ''ضلالت'' سے مأخوذ ہے۔ بعض حضرات نے اس کے معنی ''فتنہ'' بتاتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ایسے معاملہ کو کہتے ہیں جس کی صورتحال بالکل غیر واضح ہو۔

رمی بمعنی ''حذف'' پھینک کر مارنا۔

أوجلد: اس کا عطف ''رمی'' پر ہے۔ **ابالسياط**: سین کے کسرہ کے ساتھ' یہ ''سوط'' کی جمع ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''**فی رمی** الخ'' یہ ''**فی عمية**'' کے لئے بمنزلہ بیان ہے۔

① قاضیؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ایسی کیفیت کے ساتھ مارا جائے کہ یہ پتہ نہ چلے کہ اس کا قاتل کون ہے؟ نہ یہ کہ قتل کیسے ہوا؟ کہا جاتا ہے: **فلان في عمية أي جهلة**، یعنی فلاں جہالت میں ہے۔

② بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ انسان کو کوئی ایسی ضرب لگے کہ جس سے قتل کا ارادہ نہ ہو مثلاً کوئی چھوٹا سا پتھر، ہلکی سی چھڑی اور پھر اسی ضرب کے باعث مارا جائے۔ **عمية، تعميه** بمعنی تلبیس سے مأخوذ ہے۔ اس جیسے قتل کو فقہاء ''شبہ عمد'' کہتے ہیں۔ **قوله: ومن قتل عمدا فهو قود**: **قتل**: معروف کا صیغہ ہے۔ **عمدا** مفعول مطلق، یا حال ہے بمعنی **متعمدا**۔

قود: یہاں مضاف محذوف ہے۔ **أي: قتله سبب قود**۔ ایک نسخہ (قتل) میں مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ لہٰذا تقدیر ثانی متعین ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''**من**'': مبتدا متضمن معنی شرط ہے۔ اسی وجہ سے اس کی خبر پر ''فاء'' آیا ہے۔ ''**هو**'' مبتدا ثانی ہے اس کا مرجع ''من'' ہے۔ ''قودٗ' اس کی خبر ہے تو گویا مطلب یہ ہوگیا: مصدر مفعول کے معنی میں ہے اس کا استعمال باعتبار **ما يؤول اليه** بطور مبالغہ فرمایا۔

قوله: ومن حال دونه فعليه لعنة الله ......:

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① ''**دونة**'' کا ضمیر کا مرجع ''' قاتل'' ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جوشخص قاتل کے ورے حائل ہو بایں طور کہ قاتل سے قصاص لینے میں ولی الدم کی راہ آڑ بنے اس پر اللہ کی لعنت۔ ② دونہ کی ضمیر کا مرجع قصاص ہو تو

مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص حقدار کو قصاص وصول کرنے میں رکاوٹ بنے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

قوله: ومن حال دونه ......:

یہ جملہ درحقیقت تابید کی طرف اشارہ ہے اور تاکید بھی ہے مراد زجرِ شدید، اور تہدید وعید ہے اگلا جملہ "**لایقبل منه صرف ولاعدل**" بھی اسی غرض سے ارشاد فرمایا ہے۔

وصولِ دیت کے بعد قصاصاً قتل کرنے کا بیان

۳۴۷۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا اُعْفِيْ مَنْ قَتَلَ بَعْدَ اَخْذِ الدِّيَةِ ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤/ ٦٤٦ الحديث رقم ٤٥٠٧ ۔ واحمد فی المسند ٣/ ٣٦٣۔

ترجمه: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص (قاتل سے) دیت (خون بہا) لینے کے بعد اس کو قتل کرے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا''۔ (ابوداوٗد)

تشریح: لا أعفي: اعفاء واحد متکلم کا صیغہ ہے۔

''عفو'' میں ایک لغت ہے یعنی اگر کسی نے دیت لینے کے قاتل کب قتل کیا تو میں اس شخص کو چھوڑ درں گا نہیں' کہ اس کو معاف کر دیا جائے گا اور اس سے دیت لینے پر رضا مندی ہو جائے گی۔ چونکہ اس کا یہ جزم بہت بڑا ہے۔ اس (وعید) سے اس کام کی تغلیظ وتفزیع بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ فرمان، اللہ جل شانہٗ کے اس قول: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾[البقرة:١٧٨]: ''پھر جو شخص اس کے بعد تعدی کا مرتکب ہو تو اس شخص کو بڑا دردناک عذاب ہوگا'' کی نظیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے معاف کرنے اور دیت لینے کے بعد حد سے تجاوز کیا اس کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: اس کے لئے دردناک عذاب دنیا میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اس قول کے بموجب: **لا أعافي أحدا قتل بعد أخذ الدية** ۔ اس کو بھی لامحالہ قتل کر دیا جائے گا۔

سید معین الدین صفویؒ فرماتے ہیں: بعض سلف کا مذہب یہی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ولی قاتل سے دیت وصول کر لیتا تھا اور جب قاتل بے خوف ہو جاتا اور ولی اس پر قابو پالیتا تو اسے قتل کر کے دیت واپس لوٹا دیتا تھا۔

مصابیح کے بعض نسخوں میں ''**لا یعفٰی**'' مجہول کا صیغہ ہے، یعنی اس کو نہ چھوڑا جائے گا۔ جملہ صورۃً خبر ہے معنیً نہی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے نہایت وقیع ہے بشرطیکہ روایت صحیح ہو۔

بعض نسخوں میں ''**لا أعفی**'' ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ قاتل کے لئے بددعا ہے۔

ابوداوٗد طیالسیؒ نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے:

لا أعافي أحدا قتل بعد أخذ الدية۔

''میں کسی بھی ایسے شخص کو معاف نہیں کروں گا جو دیت لینے کے بعد قتل کرے گا''

اعضاء کے قصاص کی معافی کا اجر وثواب

۳۴۸۰:وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :مَا مِنْ رَجُلٍ يُصَابُ بِشَیْءٍ فِی جَسَدِهٖ فَتَصَدَّقَ بِهٖ اِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهٖ دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْهُ خَطِيْئَةً.(رواه الترمذی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی ٨/٤ الحديث رقم ١٣٩٣۔ وابن ماجه فی السنن ٨٩٨/٢ الحديث رقم ٢٦٩٣۔ واحمد فی المسند ٤٤٨/٦۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جس شخص کے جسم کے کسی حصہ کو زخمی کیا گیا اور اس نے زخمی کرنے والے کو معاف کر دیا (یعنی اس سے کوئی بدلہ نہیں کیا بلکہ درگزر کیا اور تقدیر الٰہی پر صابر رہا) تو اللہ تعالیٰ اس (درگزر) کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور اس کا ایک گناہ معاف فرماتا ہے''۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح:قوله:مامن رجل يصاب...... :فتصدق:صیغۂ ماضی کے ساتھ ہے اور ''جامع صغیر'' میں ''فيتصدق'' مضارع کے صیغہ کے ساتھ ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں:اس کا ترتب ''يصاب'' پر ہے اور اس کے لئے مخصوص ہے۔کیونکہ مصیبت ہوسکتا ہے کہ آسمانی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بندوں کی طرف سے پہنچے تو دوسرے جملہ نے اس عموم میں تخصیص پیدا کردی۔دلیل اس کی یہ ہے کہ ''فتصدق به'' کے معنی ہیں جانی اور خطا کار سے درگزر کرنا۔

عنه:ایک روایت میں ''به'' کی زیادتی ہے۔

حاکم نے بھی یہ روایت ان سے یوں ہی ذکر کی ہے۔البتہ حاکم اور ضیاء نے عبادہ سے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے:

''ما من رجل يجرح فی جسده جراحة فيتصدق بها الا كفر اللّٰه تعالىٰ عنه مثل ما تصدق۔

الفصل الثانی:

''ایک مقتول کئی قاتل''

۳۴۸۱:عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ:اَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ قَتَلَ نَفَرًا خَمْسَةً اَوْسَبْعَةً بِرَجُلٍ وَاحِدٍ قَتَلُوْهُ قَتْلَ غِيْلَةٍ' وَقَالَ عُمَرُ !لَوْتَمَالَأَعَلَيْهِ اَهْلُ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ جَمِيْعًا ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك فی الموطا ٨٧١/٢ الحديث رقم ١٣ من كتاب العقول۔

ترجمہ:''اور حضرت سعید بن میتبؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (خلیفۃ المسلمین) نے ایسے پانچ یا سات آدمیوں کی ایک جماعت کو قتل کیا جنہوں نے دھوکے سے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا''اگر صنعاء والے سب لوگ اکٹھے ہوکر اس شخص کے قتل میں باہم براہ راست مدد کرتے تو

میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ (مالک)

تشریح:قوله:ان عمر بن الخطاب قتل ---قتلوه قتل غيلية: خمسة:''نفرا'' کا بیان ہے۔

أو سبعة: راوی کو تعداد میں شک ہے۔قتلوه: استیناف بیانی ہے۔

قتل غيلة: غین معجمہ کے کسرہ کے ساتھ، اور فتحہ کے ساتھ، ''قتل'' منصوب علی المصدریۃ ہے۔

قتل عغصة : صاحب النہایہ لکھتے ہیں:أى فى خفية واغتيال، وهو أن يخدع ويقتل فى موضع لا يراه فيه أحد۔دھوکہ سے مارڈالنا۔اغتيال: دھوکہ سے بے خبری میں مار ڈالنا۔

''المغرب'' میں الغیلة کے معنی ''القتل خفية'' (چھپ کر قتل کرنا) بیان کئے ہیں قاموس میں ہے:الغيلة بالكسر الخديعة والاغتيال، وقتله غيلة أى خدعة۔

قوله:قال عمر ص لو تما لا الخ: تمالا :''ميل'' سے باب تفاعل کا صیغہ ہے۔

اہل صنعاء:حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صنعاء کا ذکر اس لئے کیا کہ جن قاتلوں کو انہوں نے قصاص میں قتل کیا تھا وہ سب ہی صنعاء کے رہنے والے تھے۔یا یہ کہ اہل صنعاء اہل عرب کے ہاں کسی چیز کی زیادتی اور کثرت کو ظاہر کرنے کے لئے اپنے کلام میں ضعاء مثل کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔:''صنعاء'' یمن کا ایک مشہور شہر ہے۔

۳۴۸۲ : وروى البخاری عن ابن عمر نحوه ـ

أخرجه البخاری فی ۲۲۷/۱۲ الحديث رقم ۶۸۹۶۔

ترجمہ:امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی کے مانند روایت (یعنی اسی معنی) کو نقل کیا ہے(اگر چہ اس کے الفاظ مختلف ہیں۔)''۔

فائدہ:ایک نسخہ میں:''وروى البخاری عن ابن عمر'' ہے۔

قاتل ومقتول کا مکالمہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

۳۴۸۳ :وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ : حَدَّ ثَنِیْ فُلَانٌ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : يَجِيْءُ الْمَقْتُوْلُ بِقَاتِلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُوْلُ : سَلْ هٰذَا فِيْمَ قَتَلَنِیْ؟ فَيَقُوْلُ : قَتَلْتُهٗ عَلٰى مُلْكِ فُلَانٍ قَالَ جُنْدُبٌ :فَاتَّقِهَا۔ (رواه النسائی)

أخرجه النسائی فی ۸٤/۷ الحديث رقم ۳۹۹۸۔

ترجمہ:''اور حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے فلاں صحابی نے (کہ جن کا نام یا تو حضرت جندب نے نہ لیا یا انہوں نے نام لیا لیکن راوی کے ذہن میں وہ نام نہیں رہا) یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو (پکڑ کر) لائے گا اور (اللہ تعالیٰ سے) فریاد کرے گا کہ (اے پروردگار!)''اس سے پوچھئے کہ اس نے مجھ کو کس بناء پر قتل کیا تھا؟'' چنانچہ قاتل کہے گا کہ میں نے اس کو فلاں شخص کی سلطنت میں قتل کیا

تھا'' جندب نے (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد) کہا کہ ''تم اس سے بچو''۔ (نسائی)

تشریح: قوله: حدثني فلان۔۔۔يوم القيامة:

صحابی کا نام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے حدیث کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کیونکہ سارے صحابہ عادل اور ثقہ ہیں۔

یجئی المقتول بقاتلہ: باء برائے تعدیہ ہے۔ ''یأتی بہ'' یا ''یضرہ'' کے معنی میں ہے۔ یا ''باء'' مصاحبت کے لئے ہے۔ یعنی یجیٔ۔

قوله: فيقول: سل هذا...... : فیم: ''فی'' تعلیلیہ ہے۔ ''ما'' استفہامیہ پر چونکہ حرف جر داخل ہے لہٰذا الف کو تخفیفاً وجوباً حذف کردیا ہے۔ ''فیم'' کا مطلب ہے: بأی سبب ولأی غرض ''۔

ملك : میم کے ضمہ، اور کسرہ کے ساتھ۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر مقتول کے سوال اور قاتل کے جواب میں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی، کیونکہ مقتول نے تو قتل کا سبب پوچھا تھا (نہ کہ قتل کی جگہ کو دریافت کیا تھا) اس کا جواب یہ ہے کہ قاتل کے جملہ ''قتلته على ملك فلان'' کی مراد یہ تھی کہ فلاں بادشاہ کے زمانے میں اس کی مدد سے قتل کیا تھا۔ لیکن یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جب کہ روایت میں لفظ ''ملك'' میم کے ضمہ کے ساتھ ہو اور اگر یہ لفظ میم کے کسرہ کے ساتھ ہو تو پھر یہ معنی مراد ہوں گے کہ میں نے اس کو جھگڑے کے دوران قتل کیا تھا۔ جو میرے اور اس کے درمیان فلاں شخص مثلاً زید کی عملداری میں ہوا تھا۔ (اس اعتبار سے قاتل کا مذکورہ جملہ بیان واقعہ کے لئے گا۔ از مترجم)

قوله: قا جندب فاتقها:

جندب رضی اللہ عنہ کے اس قول کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① اجتنب القتلة، کہ قتل سے بچو۔

② احترز النصرة أو المشاجرة، کہ قتل میں مدد کرنے نیز جھگڑا فساد کرنے سے بچو، کیونکہ یہ کام عام طور پر قتل کا باعث بنتے ہیں۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت جندب رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے شخص کو یہ نصیحت کرتے ہوئے اس حدیث سے استشہاد پکڑا کہ جو اس گھناؤنے کام کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ ''فاتقها'' سے حضرت جندب رضی اللہ عنہ کا مقصود یہ تھا کہ اب جب کہ تم یہ سن چکے ہو تو اس کام سے بچو۔ والله تعالىٰ اعلم بالمراد۔

قتل مؤمن میں معاونت کی مذمت

۳۴۸۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: مَنْ اَعَانَ عَلٰى قَتْلِ مُؤْمِنٍ شَطْرَ كَلِمَةٍ لَقِیَ اللّٰهَ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ: اٰيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی ٢/ ٨٧٤ الحديث رقم ٢٦٢٠۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے صرف آدھا جملہ کہہ کر بھی کسی مؤمن کے قتل میں مدد کی (یعنی مثلاً اقتل پورا نہیں کہا بلکہ صرف اق کہا) تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان یہ جملہ لکھا ہوگا ''یہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہیں''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله: من اعان عل قتل مؤمن شطر كلمة:

''شطر'': منصوب علی نزع الخافض ہے۔ ایک نسخہ میں ''بشطر كلمة'' ہے۔ یہی ظاہر ہے۔ الجامع الصغیر کی روایت بھی اس کے موافق ہے۔

قرطبیؒ نے فرمایا: شقیقؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً اقتل پورا نہیں کیا بلکہ صرف ''اُق'' کہا)۔ اس کو عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

النہایۃ میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی نظیر ''كفى بالسيف شا'' ہے أی شاهدا۔ لقی الله: یعنی اس حال میں مرے گا یا اس حال میں اٹھایا جائے گا۔

آیس: ''هذا اللفظ'' کی تقدیر میں ہو کر مبتدا ہے۔ ''مكتوب بين عينيه'' خبر ہے۔ جملہ ''لقی'' کے فاعل سے حال ہے۔

آئس: ہمزہ ممدودہ کے بعد ہمزہ مکسورہ ''ایاس'' سے اسم فاعل کا صیغہ ہے بمعنی ''یاس'' یعنی قانط۔ من رحمة الله: یہ جملہ گویا اس کے کفر کا کنایۃً پیرایۂ اظہار ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ: ﴿لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [یوسف: ٨٧]: ''اللہ کی رحمت سے وہی لوگ نااُمید ہوتے ہیں جو کافر ہیں'' کے بموجب اللہ کی رحمت سے ناامیدی صرف کافر کے لئے ہے۔

اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن مذکورہ علامت کے ذریعے خلائق کے درمیان رسوا ہوگا یہ حدیث سخت وعید و تہدید پر محمول ہے یا یہ وعید اس شخص کے لئے جو قتل مؤمن کی معاونت کو حلال سمجھتا ہے۔

قتل مؤمن میں معاونت کا بیان

٣٤٨٥: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا اَمْسَكَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ وَقَتَلَهُ الْاٰخَرُ يُقْتَلُ الَّذِىْ قَتَلَ وَيُحْبَسُ الَّذِىْ اَمْسَكَ۔ (رواه الدارقطنی)

أخرجه الدارقطنی فی ٣/ ١٤٠ الحديث رقم ١٧٦۔

ترجمه: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب ایک شخص نے کسی آدمی کو پکڑا اور دوسرے نے اس کو قتل کیا تو (مقتول کے بدلہ میں ~~بطور قصاص~~) قاتل کو قتل

کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو (بطور تعزیر) قید کیا جائے گا"۔ (دارقطنی)

تشریح: قوله: اذا أسلك الرجل۔۔۔يقتل الذى قتل:

الآخر: خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص کسی کو پکڑ کے رکھتا ہے حتی کہ دوسرا شخص اس کو جان سے مار دیتا ہے تو پکڑنے والے سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ جس طرح کسی عورت کو ایک شخص پکڑے اور دوسرا شخص اس کے زنا کرے تو پکڑنے والے پر حد جاری نہیں کی جاتی۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: اگر پکڑنے والے کو اندازہ تھا کہ اس کو قتل کرنے کا ارادہ ہے تو اس صورت میں قاتل اور "ممسک" (پکڑے والا) دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ اگر خیال یہ تھا کہ محض مار پیٹ ہوگی تو ضارب کو قتل کر دیا جائے اور "ممسک" کو ٹھیک ٹھاک، سخت قسم کی سزا دی جائے اور سال بھر قید رکھا جائے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ تفصیل مستحسن ہے، جیسا کہ عقل مندوں پر مخفی نہیں۔

(قوله: ويحبس الذى مسك)

قید کی مدت کا انحصار امام کی رائے پر ہے۔ اس میں مماثلت لغوی بھی ہے کہ "**الامساك بالامساك**" اور ظاہری مماثلت تب ہوگی کہ اس کو موت آنے تک قید میں رکھا جائے۔

شمنیؒ نے "ملتقی" میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو شیر یا کسی اور درندے کے سامنے ڈال دے اور وہ شیر یا درندہ اس شخص کو مار ڈالے تو اس صورت میں ڈالنے والے پر نہ قصاص واجب ہوگا، نہ دیت واجب ہوگی بلکہ اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو تعزیر کی جائے اور اتنا مارا جائے کہ اس کا جسم درد کرنے لگے اور قید میں ڈال دیا جائے جب تک توبہ نہ کرلے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: موت تک قید رکھا جائے۔ امام شافعی، مالک اور احمد رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں: اگر غالب یہ تھا کہ قتل کرے گا تو قود واجب ہے اور اگر ظن غالب یہ نہیں تھا تو اس صورت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں:

① قود واجب ہوگا۔ ② قود واجب نہیں ہے البتہ دیت واجب ہوگی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں قود واجب ہونا چاہئے۔

كِتَابُ الدِّيَاتِ

دیتوں کا بیان

لغوی تشریح: صاحب'' المغرب''لکھتے ہیں:''الدية'' مصدر ہے۔عرب''ودى القاتل المقتول''اس وقت کہتے ہیں جب قاتل کا ولی مال یعنی جان کے بدلہ میں مالی معاوضہ اولیاء مقتول کوادا کرتا ہے۔پھراس لفظ کا اطلاق اس مال (یعنی مال دیت) پر ہونے لگا۔''الدية'' چونکہ''تسمیہ''بالمصدر ہے اسی وجہ سے ترجمۃ الباب میں جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا۔''عدۃ کی طرح اس کا بھی فاءکلمہ محذوف ہے شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ لفظ اصل کے اعتبار سے''جری'' پر دال ہے۔اسی سے لفظ''وادی'' ہے۔وادی کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ اس میں پانی جاری ہوتا ہے۔

دیت کا ثبوت کتاب اللہ سے ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰی اَهْلِهٖ ﴾[النساء:۹۲]اور سنت سے بھی ہے، بہت سی احادیث دیت کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں۔نیز وجوبِ دیت کے مسئلہ پر اہل علم کا اجماع ہے۔

الفصل الاول :

اُنگلی اور انگوٹھے کی دیت کا بیان

۳۴۸۲:عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ،عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: هٰذِهِ وَهٰذِهِ سَوَاءٌ .يَعْنِی الْخِنْصَرَ وَالْاِبْهَامَ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی الصحیح ۲۲۶/۱۲ الحدیث رقم ۶۸۹۵۔ وابوداؤد فی السنن ۶۹۰/٤ الحدیث رقم ٤٥٥٨ ۔ والترمذی ٤/٨ الحدیث رقم ۱۳۹۲۔ والنسائی فی ٨ / ٥٦ الحدیث رقم ٤٨٤٧۔ وابن ماجه فی ۸۸٥/۲ الحدیث رقم ۲٦٥۲۔ والدارمی فی ۲٥٥/۲ الحدیث رقم ۲۳۷۰۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ اور یہ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے چھوٹی انگلی اور انگوٹھے کی طرف اشارہ فرما کر فرمایا کہ) چھنگلی اور انگوٹھا (دیت کے اعتبار سے) دونوں برابر ہیں''۔ (بخاری)

تشریح: اور انگلی انگوٹھا دیت میں برابر ہیں، اگرچہ انگوٹھے میں دو جوڑ اور چھنگلیا میں تین جوڑ ہوتے ہیں۔ ہر انگلی میں مکمل دیت کا دسواں حصہ واجب ہوتا ہے۔ دیت کا دسواں حصہ (۱۰) اونٹ ہیں۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ ہر انگلی میں پوری دیت کا دسواں حصہ واجب ہوگا چنانچہ انگلی کی ہر گانٹھ کی دیت میں اسی حساب کا اعتبار ہوگا کہ انگلی کی ہر گانٹھ کی دیت میں دسویں حصہ کا تہائی دینا ہوگا۔ البتہ انگوٹھے کی ہر ایک گانٹھ کی دیت میں ایک کامل انگلی کی نصف دیت دینا ہوگی، کیونکہ انگوٹھے میں دو گانٹھیں ہوتی ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کے پوروں کی دیت میں کوئی فرق نہیں۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو اصحاب سنن اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

جنین کی دیت کا بیان:

۳۴۸۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ : قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فِی جَنِيْنِ امْرَأَةٍ مِنْ بَنِی لِحْيَانَ سَقَطَ مَيِّتًا بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ ثُمَّ اِنَّ الْمَرْأَةَ الَّتِیْ قَضٰی عَلَيْهَا بِالْغُرَّةِ تُوُفِّيَتْ فَقَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بِاَنَّ مِيْرَاثَهَا لِبَنِيْهَا وَزَوْجِهَا وَالْعَقْلَ عَلٰی عَصَبَتِهَا ۔ (متفق علیه)

صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب جنین المرأة، ح ۶۹۰۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی لحیان کی ایک عورت کے اس بچہ کی دیت میں جو مر کر اس کے پیٹ سے ساقط ہو گیا (عاقلہ پر) غرہ واجب کیا تھا اور غرہ سے مراد غلام یا لونڈی ہے' پھر جب وہ عورت کہ جس کے عاقلہ پر غرہ واجب کیا تھا مر گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بیٹوں اور اسکے خاوند کے لئے ہے اور اس کی دیت اس کے عصبہ پر ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: قضى رسول الله ﷺ ۔۔۔۔ بغرة عبد أو أمة:

جنین: صاحب قاموس ''جنین'' کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **الجنين: الولد فی البطن**، (جنین اس بچہ کو کہتے ہیں جو پیٹ میں ہو۔) اس کی جمع ''أَجِنَّةٌ'' آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُم ﴾ [النجم: ۳۲]: ''وہ تم کو (اور تمہارے احوال کو اس وقت سے) خوب جانتا ہے جب تم کو زمین سے پیدا کیا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔'' میں یہ لفظ اس کے موافق ہے۔

لحیان: لام کے کسرہ اور حاء کے سکون کے ساتھ ہے، لام پر فتحہ بھی درست ہے۔ **لحیان**، ہذیل کا ایک بطن ہے۔

میتا: حال مقیدہ ہے۔

بغرة تنوین کے ساتھ ہے۔حرف جار" قضی "کے متعلق ہے۔

عبد:"غرّہ" کا بیان ہے۔ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:"عبد"مرفوع ہونے کی صورت میں"ھی "مبتدامحذوف کی خبر ہے۔

أو أمة:"أو "برائے تنویع ہے۔

ایک نسخہ میں"بغرة عبد"اضافت کے ساتھ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: روایت "غرّۃ" کی تنوین کے ساتھ ہے اور مابعداس سے بدل ہے۔اور بعض نے اسے اضافت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

"أو "،تقسیم کے لئے ،شک کے لئے نہیں۔

النہایہ میں ہے:الغرة :العبد نفسه أو الأمة۔کہ غرّہ سے مراد غلام یا باندی ہی ہے۔"غرہ"اصل میں اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی پر ہوتی ہے۔ابوعمرو بن العلاء فرماتے تھے:غرہ سے مراد سفید رنگ کا غلام یا سفید رنگ والی باندی مراد ہے۔لہٰذا جنین کی دیت میں کالا غلام یا کالی باندی قبول نہیں کی جائے گی جب کہ فقہاء کرام کے ہاں گورا ہونا شرط نہیں۔

جنین کی دیت:

اگر بچہ زندہ پیدا ہوا اور پھر مر گیا تو پوری دیت واجب ہوگی۔اگر بچہ مردہ پیدا ہوا اور پھر ماں بھی مر گئی تو دیت اور غرّہ واجب ہوگا۔اگر پہلے حاملہ مر گئی اور بچہ بھی مردہ پیدا ہوا تو صرف دیت واجب ہوگی۔

امام زیلعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:"غرة" کا معنی ہے"خیار"(مال)اور"غرة المال" سے مراد ہوتا ہے بہترین جانور مثل گھوڑا' اونٹ' غلام' خوبصورت جوان باندی' یہاں مراد یہ ہے کہ جنین اگر مذکر ہے تو مرد کا عشر دیت،اور اگر مؤنث ہے تو عورت کا عشر دیت،عشر دیت خواہ مرد کا ہو یا عورت کا پانچ سو درہم ہے۔

اگر جنین کسی باندی کا تھا،اور مذکر تھا اور زندہ تھا تو اس کی قیمت کا نصف عشر ہوگا اور اگر مؤنث تھا تو کیونکہ اس کی قیمت کا عشر ہوگا۔

جنین کی دیت از روئے قیاس

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اس صورت میں ماں کی قیمت کا عشر واجب ہوگا۔

قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جنین کے مسئلہ میں کوئی شئ بھی واجب نہیں ہونی چاہیے کیونکہ جنین کی زندگی یقینی نہیں۔البتہ اس حدیث کی وجہ سے استحساناً لازم ہے۔جنین خواہ مذکر ہو،خواہ مؤنث ہو دونوں برابر ہیں، چونکہ حدیث مطلق ہے۔مزید یہ کہ بعض مرتبہ مذکر،مؤنث کی پہچان بھی نہیں ہو پاتی،چنانچہ آسانی کی خاطر دونوں کے لئے ایک ہی مقدار مقرر کر دی۔

قوله:ؤم ان المرأة التي قضى عليها ......:

قضی: مجہول کا صیغہ ہے۔ بمعنی ''حکم علیھا''۔ ایک نسخہ میں بصیغہ معروف ہے۔ اس صورت میں ضمیر فاعل رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہوگی تو فیت کا فاعل جانیہ ہے۔ گویا معنوی تقدیر یوں ہے: أن المرأة الجانية على الجنين ماتت۔ جنین پر جنایت کرنے والی عورت مرگئی۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کی دیت اس کے عاقلہ پر واجب ہوگی۔

والعقل: منصوب ہے۔ ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ مطلب یہ ہے کہ جنین کی دیت کی ادائیگی کا فیصلہ عاقلہ پر فرمایا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ قتل خطا کی دیت عصبہ پر ہے، ابناء اور آباء پر نہیں۔ لیکن یہ بات اسی وقت درست مانی جاسکتی ہے کہ جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ یہ حدیث اور آنے والی حدیث الگ الگ ہے۔

''شرح السنۃ میں لکھا ہے ''عقل'' کا مطلب ہے ''دیت'' اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ ''عقل'' بمعنی ''شد'' (باندھنا) سے ماخوذ ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل اونٹوں کو لاکر مقتول کے گھر کے سامنے کے میدان میں باندھتا تھا اور اسی وجہ سے ان عصبہ کو' عاقلہ'' کہا جاتا ہے جو تحمل دیت کرتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ عاقلہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ عقل بمعنی ''منع'' سے ماخوذ ہے 'انسان کی عقل مرکب کو یہ نام اسی وجہ سے دیا گیا ہے چونکہ عقل انسان کو غیر مستحسن کاموں سے منع ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ مجمع علیہ ہے کہ جنین کی دیت غرہ ہے، جنین مذکر ہو یا مؤنث ہو' تام الخلقت ہو یا ناقص الخلقت ہو بشرطیکہ انسانی خلقت واضح ہو' دیت میں برابری ہے چونکہ جنین بمعنی مرتبہ مخفی ہوتا ہے، جس کی وجہ سے نزاع ممکن ہے۔ شریعت نے ایسی چیز مقرر کردی جو قاطع نزاع ہے۔ غرہ، جنین کے تمام ورثاء کا حق ہے۔ یہ ایسا شخص ہے جو مورث تو ہے وارث نہیں شریعت میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی سوائے اس کے کہ کسی شخص کا بعض حصہ آزاد ہے اور بعض مملوک، تو وہ ہمارے ہاں وارث نہیں ہوگا۔ اصح یہ ہے کہ وہ صورت تب ہے کہ جب جنین مردہ ہونے کی حالت میں ساقط ہوا۔ اگر زندہ ہونے کی حالت میں ساقط ہوا اس کے بعد مرا تو اس صورت میں بڑے آدمی کی مکمل دیت واجب ہوگی۔ اگر جنین مذکر تھا تو سو اونٹ، اور اگر مؤنث تھا تو پچاس اونٹ واجب ہوں گے خواہ یہ فعل عمداً کیا یا خطاءً کیا۔ غرّہ جب بھی واجب ہوگا عاقلہ پر ہوگا، جانی پر نہ ہوگا۔

علماء فرماتے ہیں: ان المرأة التی قضی الخ، میں خلافِ مراد کا وہم ہوجاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ متوفیہ ''مجنی علیھا'' تھی یا اس کا جنین تھا، نہ کہ جانیہ۔ اس بات کی تصریح خود اگلی حدیث میں موجود ہے: فقتلتھا و ما فی بطنھا۔ لہٰذا ''التی قضی علیھا بالغرۃ'' سے مراد ''التی قضی لھا بالغرۃ'' ہے اسی وجہ سے ''عنھا'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

''حجر'' سے مراد ایسا حجر صغیر ہے کہ جس سے عام طور پر قتل کا ارادہ نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا یہ قتل شبہ عمد ہوا، اس کی دیت عاقلہ پر واجب ہوگی۔ جانی پر نہ قصاص ہے، نہ دیت۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور کا مذہب ہے اھ۔ دیگر مذاہب کا بیان عنقریب آرہا ہے ہمارے ہاں حجر صغیر و کبیر برابر ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر حجر کبیر سے ہلاک کیا جائے تو یہ بھی شبہ العمد ہے چنانچہ اس صورت میں بھی قصاص لازم نہیں آئے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ اگر چٹان لے کر ماردی جائے اور مضروب مرجائے تو قصاص لازم ہوگا یا نہیں؟ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وان ضربه بجبل الجاقين۔ بعض کا کہنا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یوں تھے: وان ضربه باباقيس۔ اس کو ''قتل بالمثقل'' کہتے ہیں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب اس کلام پر کئی اعتبار سے اشکال ہوتا ہے مثلاً وہ یہ ہے کہ ''بأبا'' کی بجائے ''بأبی'' کہنا چاہئے تھا۔ کیونکہ ''اب'' حالت جری میں ہے، اور حالت جری میں اس کا اعراب یاء کے ساتھ ہوتا ہے، الف کے ساتھ نہیں ہوتا چنانچہ بعض جاہل لوگوں نے اس بات کو بنیاد بنا کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ اعراب نہ جانتے تھے۔ اگر وہ جانتے ہوتے تو ''بأ با قيس'' کی جگہ ''بابي قيس'' کے الفاظ ارشاد فرماتے۔ اس اعتراض کی تردید کرتے ہوئے امام قدوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اول تو یہ جملہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ثابت نہیں اور نہ ان کی کتاب میں موجود ہے۔ ثانیاً یہ کہ اگر ثابت ہو تو یہ خطا اعرابی نہیں، چونکہ بعض اہل عرب کی لغت اسی کے موافق ہے۔ چنانچہ بنی حارث بن کعب کی لغت یہی ہے۔ امام سیبویہ فرماتے ہیں: هذا هو القياس۔ (قیاس یہی ہے) چنانچہ قرآن کریم میں اسی کے موافق وارد ہوا ہے: ﴿اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ﴾ [طه: ٦٣]

ایک شاعر کہتا ہے: ان أبا ها و ايا أبا ها۔

قد بلغا في المجد غايتاها

علاوہ ازیں اگر لفظ معروف ہو تو متکلم کے لئے اس کا تکلم صحیح ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ اعرابی خلل ہو بشرطیکہ لوگوں کو سمجھانا مقصود ہو۔ چونکہ تحصیل مقصد میں یہ ابلغ ہے۔ چنانچہ امام ابومحمد رحمۃ اللہ علیہ نے کئی ایسے مواقع پر کیا ہے۔ اھ۔

اس کی نظیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ مشہور بات کہ انہوں نے اپنا نام ''علی بن ابو طالب'' لکھا۔ (حالانکہ علی بن ابی طالب لکھنا چاہئے تھا) والله اعلم بالمقصد والمطالب

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''لها'' کی جگہ ''عليها'' کے استعمال کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے: ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرة۔١٤٣] ترجمہ: ''تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو اور تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ'' عليكم، لكم کے معنی میں ہے رقیب کے معنی کو متضمن ہونے کی وجہ سے۔

چنانچہ حدیث میں ''قضى عليها بالغرة'' کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے لئے غرہ کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے حق کو ضائع ہونے سے بچایا۔ اس توجیہ کی صورت میں اگلی حدیث میں ''على عاقلتها'' کی ضمیر جانیہ، اور ''ورثها'' کی ضمیر دیت اور ''ولدها'' کی ضمیر مجنی علیھا کی طرف راجع ہوگی۔ معھم میں جمع کی ضمیر کا لانا اس بات پر دلالت کے لئے ہے کہ ''ولد'' جمع کے معنی میں ہے اور من ''معهم'' سے مراد زوج ہے، اس کی دلیل گذشتہ حدیث کا یہ جملہ ہے: فقضى رسول الله ﷺ بأن ميراثها لبنيها وزوجها۔ یہ اس تقدیر پر کہ دونوں حدیثوں کو ایک قضیہ پر محمول کیا جائے، ظاہر بھی یہی ہے۔ اگر دو قضیے ہوں تو قضى عليها سے مراد ''جانیہ'' ہوگی، اور اس کی میراث اس کے بیٹوں اور شوہر کے لئے ہوگی اور دیت اس کے عصبہ پر ہوگی۔ اھ۔ شراح حدیث میں سے ہمارے اصحاب کے نزدیک آخر والی بات زیادہ پسندیدہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۴۸۸: وَعَنْهُ قَالَ: اِقْتَتَلَتْ اِمْرَأَتَانِ مِنْ هُذَيْلٍ فَرَمَتْ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى بِحَجَرٍ فَقَتَلَتْهَا وَمَا فِي

بَطْنِهَا، فَقَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اِنَّ دِيَةَ جَنِيْنِهَا غُرَّةٌ عَبْدٌ اَوْوَلِيْدَةٌ، وَقَضٰى بِدِيَةِ الْمَرْأَةِ عَلٰى عَاقِلَتِهَا، وَرَّثَهَا وَوَلَدَهَا وَمَنْ مَعَهُمْ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲۵۲/۱۲۔ الحديث رقم ۶۹۰۹۔ ومسلم فی ۹/۳۔۱۳ الحديث رقم (۳۵۔ ۱۶۸۱)۔ وابوداوٗد فی السنن ۷۰٤/٤ الحديث رقم ۲۵۷۷۔ والترمذی فی ۱٦/٤ الحديث رقم ۱٤۱۰۔ والنسائی فی ٤۷/۸ الحديث رقم ٤۸۱۷۔ وابن ماجه۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں (بقول بعض یہ دونوں سوکنیں تھیں) چنانچہ ان میں سے ایک عورت نے دوسری عورت کو (چھوٹا یا بڑا) پتھر مارا جس سے وہ عورت اور اس کے پیٹ کا بچہ دونوں مرگئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مقتولہ کے اس بچہ کی دیت جو اس کے پیٹ میں مر گیا غرہ یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام ہے اور حکم فرمایا کہ مقتولہ کی دیت' قاتلہ کے خاندان و برادری والوں پر ہے نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت کا وارث اس کی اولاد اور ان لوگوں کو بنایا جو اولاد کے ساتھ (وراثت میں شریک) تھے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: جنینها ایک نسخہ میں ''جنین'' ہے۔

غرة: تنوین کے ساتھ ہے۔

وليدة: أی جارية، ایک نسخہ میں اضافت کے ساتھ ہے۔

وورثها: ها: ضمیر دیت کی طرف راجع ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ'' ورثها'' کی ضمیر ''جانیا'' کی طرف راجع ہے۔ بظاہر یہ سہو ہے۔ البتہ مضاف محذوف مانا جا سکتا ہے۔ تقدیر عبارت أموالها ہوگی۔ مگر یہ احتمال اس مقام پر بعید از مراد ہے۔ ''ولدها'' سے مقتولہ کی اولاد مراد ہے۔ کہا گیا کہ ضمیر جانیہ کی طرف راجع ہے، جانیہ کی اولاد مراد ہے۔

''ولد'' سے ''اولاد'' کے معنی مراد لینا اس لیے درست ہیں کہ اسم جنس جب ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے تو اس میں عموم آ جاتا ہے۔ **ومن معهم:** ضمیر اولاد کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر اور اولاد کو وارث قرار دیا۔ **معهم** میں ضمیر جمع کی استعمال کی گئی کیونکہ جمع کے معنی مراد ہیں۔ پچھلی حدیث میں گزرا کہ: قضی بأن ميراثها لبنيها وزوجها۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''**من معهم**'' سے وارثًا مراد ہیں اور جمع کی ضمیر جنین ولد کی طرف راجع ہے چونکہ ولد سے مراد اولاد ہے۔

یہ بات اتفاقی ہے کہ قتل خطا کی دیت ''جانی'' کے عاقلہ پر ہے۔ مؤجل ہے۔ اس کی ادائیگی تین سال کی مدت کے اندر اندر کی جائے گی۔ البتہ یہ مسئلہ اختلافی ہے کیا اس ادائیگی میں جانی بھی عاقلہ کے ساتھ شریک ہوگا یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ بھی عاقلہ کی مانند ہے، جو عاقلہ پر لازم ہوگا اس پر بھی لازم ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کا اس بابت اختلاف ہے۔ چنانچہ ابن قاسم فرماتے ہیں کہ ان کا قول ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ جانی عاقلہ کے ساتھ نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر عاقلہ کو وسعت ہو تو جانی شریک نہیں ہوگا اور اگر عاقلہ کو وسعت حاصل نہ ہو تو جانی بھی شریک ہوگا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جانی پہ کوئی شی لازم نہیں خواہ عاقلہ میں وسعت ہو

خواہ نہ ہو۔اور جب عاقلہ تحمل دیت کے وسعت ہوتو باقی دیت کی ادائیگی بیت المال کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

اگر جانی اہل دیوان میں سے ہوتو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے اہل دیوان اس کے عاقلہ ہوں گے اور ادائے دیت میں عصبہ پر مقدم ہوں گے اگر وہ متحمل نہ ہوں تو عصبہ پر لازم ہوگی۔اسی طرح اگر وہ اہل بازار میں ہے تو اہل بازار اس کے عاقلہ ہوں گے۔اس کے بعد پھر قرابت دار ہیں، اگر وہ بھی عاجز عصبہ ہوں تو اس کے اہل محلّہ پر لازم ہوگی، اگر اہل محلّہ میں بھی وسعت نہ ہوتو اس کے اہل شہر پر ہوگی۔جانی اگر اہل قری میں سے ہو اور وسعت نہ ہوتو اس شہر پر لازم ہوگی کہ جس کے شہر کے مضففات میں یہ بستی واقع ہے۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں: ادائے دیت میں ان کا کوئی فعل نہ ہو، اگر یہ جانی کے اقرباء میں سے نہ ہوں۔

پھر اس بات میں اختلاف کہ عاقلہ پر جو دیت ہے کیا وہ مقرر ہے؟ یا بقدر طاقت لازم ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دیت سب پر برابر برابر ہوگی چنانچہ ہر شخص سے تین سے چار دراہم لئے جائیں گے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سلسلہ میں کوئی مقدار مقرر نہیں ہے اعتبار سہولت کا ہے ضرر نہ پہنچے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقدار مقرر ہے، چنانچہ غنی پر نصف دینار لازم ہوگی متوسط پر ربع دینا ہوگی، اس سے کم نہ ہوگی۔

تحمل دیت میں غنی وفقیر عاقلہ برابر ہیں؟ چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سلسلہ میں غنی وفقیر برابر ہیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عاقلہ میں سے کوئی شخص اگر دوسری اقلیم میں ہے تو وہ عاقلہ حاضرہ کے ساتھ شریک نہ کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں طرح کے قول مروی ہیں۔

ترتیب تحمل میں بھی اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس بابت قریب وبعید برابر ہیں۔امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں ترتیب کا لحاظ رکھا جائے گا کہ عصبات میں الاقرب فالاقرب کا لحاظ ہوگا۔چنانچہ اگر یہی لوگ استغراق دیت کرلیں تو دیگر لوگوں پر دیت لازم نہ ہوگی۔اگر اقرب تحمل نہ رکھتا ہوتو بعید پر لازم ہوگی۔بعید حسب ترتیب میراث متحمل ہوگا۔

ادائے دیت کیلئے مدت کا آغاز کب سے شمار ہوگا؟ کیا موت کا اعتبار ہے یا قضائے قاضی کے وقت سے۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قضائے قاضی کے وقت سے مدت شروع ہوگی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں موت کے وقت سے آغاز ہوگا۔

سال کے بعد اگر عاقلہ میں سے کوئی مرجائے تو کیا اس کے حصہ کی دیت ساقط ہو جائے گی یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دیت ساقط ہوجائے گی اور اس کے ترکہ سے نہیں لی جائے گی۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نیز امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت یہ ہے کہ دیت اس کے ترکہ کی طرف منتقل ہو جائے گی۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بیان کرتے ہوئے ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: دیت اس کے مال میں واجب ہے، اس کے ترکہ سے لی جائے گی۔(**کذافی کتاب الرحمة فی اختلاف الأئمة**)

شرح جمع الجوامع میں احکام غیر مدرک بالقیاس کے تحت لکھتے ہیں:
جیسا کہ عاقلہ پر وجوب دیت اور کہا گیا ہے کہ مدرک بالقیاس ہے۔ یہ اصل میں جانی کے لئے اعانت ہے۔ اس سلسلہ میں جس میں وہ معذور ہے۔ جیسا کہ اصلاح ذات البین کرانے والے غام کی اعانت زکوٰۃ کے مال سے کرنا۔ اھ۔ اس مسئلہ کو بطور نظیر پیش کرنا محل نظر ہے۔

۳۴۸۹: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ: اَنَّ امْرَاتَيْنِ كَانَتَا ضَرَّتَيْنِ فَرَمَتْ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى بِحَجَرٍ اَوْ عَمُوْدِ فُسْطَاطٍ فَاَلْقَتْ جَنِيْنَهَا فَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فِى الْجَنِيْنِ غُرَّةً عَبْدٍ اَوْ اَمَةً وَجَعَلَهٗ عَلٰى عَصَبَةِ الْمَرْاَةِ هٰذِهٖ (رواية الترمذى وفى رواية مسلم) **قَالَ: ضَرَبَتِ امْرَأَةٌ ضَرَّتَهَا بِعَمُوْدِ فُسْطَاطٍ وَهِىَ حُبْلٰى فَقَتَلَتْهَا قَالَ: وَاحِدَهُمَا لِحْيَانِيَّةٌ قَالَ: فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم دِيَةَ الْمَقْتُوْلَةِ عَلٰى عَصَبَةِ الْقَاتِلَةِ وَغُرَّةً لِمَا فِىْ بَطْنِهَا۔**

أخرجه البخارى فى صحيحه ٢٥٢/١٢ الحديث رقم ٦٩١٠۔ ومسلم فى ١٣٠٩/٣ الحديث رقم (٣٦۔ ١٦٨١)۔ وابوداوٗد فى ٧٠١/٤ الحديث رقم ٤٥٧٦ والنسائى فى ٤٨/٨ الحديث رقم ٤٨١٨۔ والدارمى فى ٢٥٨/٢ الحديث رقم ٢٣٨٢۔ ومالك فى الموطا ٨٥٥/٢ الحديث رقم ٥ من كتاب العقول واحمد فى المسند ٥٣٥/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دو عورتیں جو آپس میں سوکنیں تھیں (ایک دن باہم لڑ پڑیں) چنانچہ ان میں سے ایک نے دوسری کو (جو حاملہ تھی) پتھر یا خیمے کا بانس مارا جس کی وجہ سے اس کا حمل ساقط ہوگیا۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ کے بچہ کی دیت میں غرہ یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام دینے کا فیصلہ کیا اور دیت کو آپ نے قاتلہ عورت کے عصبات پر واجب کیا۔ یہ ترمذی کی روایت ہے اور مسلم کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''ایک عورت نے اپنی سوکن کو جو حاملہ تھی' خیمہ کے بانس سے مارا جس کی وجہ سے وہ مرگئی (اور اس کے پیٹ کا بچہ بھی مرگیا) مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک عورت لحیان کے خاندان سے تھی (جو قبیلہ ہذیل کی ایک شاخ ہے) مغیرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عاقلہ پر واجب کی اور پیٹ کے بچہ کی دیت میں غرہ یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام دینے کا حکم فرمایا''۔

تشریح: **قوله: ان امرأتين كانت ـــ وجعله على عصبه المرأة: عمود:** عین کے فتحہ کے ساتھ، **فسطاط:** فاء کے ضمہ کے ساتھ۔ صاحب النہایۃ لکھتے ہیں:
(یعنی نفری خیمہ ایک قسم ہے جو سرادق یعنی شامیانہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔)
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ عمود، عمود صغیر پر محمول ہے۔ چونکہ عمود صغیر سے عام طور پر قتل کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا جیسا کہ حجر کے ذیل میں گزرا۔ **غرة:** صرف تنوین کے ساتھ مروی ہے۔ ایک نسخہ میں ''**و جعلها**'' ہے اور یہی ظاہر ہے۔ ''**ها**'' ضمیر ''**غرة**'' کی طرف عائد ہے۔ **قوله: هذه رواية الترمذى:**

اس عبارت میں صاحب مشکوٰۃ نے صاحب مصابیح پر اعتراض کیا ہے کہ ترمذی کی روایت فصل اول میں ذکر کی ہے۔

قوله: وفي رواية الحيانية: حاء کے فتحہ اور کسرہ اور یاء تحتیہ (برائے نسبت) کی تشدید کے ساتھ ہے: **لما في بطنها:** میں ''من'' صولہ ہے

في بطنها: '' کان'' محذوفہ کے متعلق ہے۔

الفصل الثاني:

قتل خطا اور اس کی دیت کا بیان

۳۴۹۰ :عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :اَلَا اِنَّ دِيَةَ الْخَطَأِ شِبْهِ الْعَمْدِ مَاكَانَ بِالسَّوْطِ وَالْعَصَا مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ، مِنْهَا اَرْبَعُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهَا اَوْلَادُهَا ۔ (رواه النسائي وابن ماجة والدارمي)

أخرجه النسائي في السنن ٤٢/٨ الحديث رقم ٤٧٩٩۔ وابن ماجه في ٨٧٨/٢ الحديث رقم ٢٦٢٨۔ والدارقطني في ١٠٥/٣ الحديث رقم ٨ في كتاب الديات۔ واحمد في المسند ١١/٢۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سن لو! قتل خطا کی دیت شبہ عمد کی دیت کے مثل ہے جو کہ کوڑے اور لاٹھی کے ذریعہ واقع ہوا ہو، اس کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں سے چالیس ایسی اونٹنیاں بھی ہونی چاہئیں جن کے پیٹ میں بچے ہوں (یعنی حاملہ ہوں)۔'' (نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: أَلا: برائے تنبیہ ہے۔ (**دية الخطا شبه العمدما كان:** امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس میں کئی اعرابی وجوہ ہیں:

① **شبه العمد**، خطا کی صفت ہے، باوجودیکہ وہ معرفہ ہے، یہ درست ہے چونکہ ''**شبه العمد**'' ضدین کے درمیان واقع ہوا ہے۔ ② خطا سے مراد جنس ہو تو اس صورت میں یہ بمنزلہ نکرہ ہے۔ اور ''ما'' دونوں تقدیر پر موصولہ ہے یا موصوفہ ہے اور بدل یا بیان بن رہا ہے۔ ③ **شبه العمد**، بدل ہے خطاً سے۔ اور ما کان اس بدل سے بدل ہو۔ اس صورت میں تابع متبوع دونوں معرفہ بھی آسکتے ہیں اور نکرہ بھی آسکتے ہیں اور ایک نکرہ اور دوسرا معرفہ بھی آسکتے ہیں۔ **مائة** :ان کی خبر ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ: یہ حدیث قتل خطاعمداً کے ثبوت کی دلیل ہے۔ بعض حضرات کا زعم ہے کہ قتل، عمدِ محض ہوتا ہے یا خطاِ محض ہوتا ہے۔ شبہ عمد غیر معروف ہے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ شئ مثقل کے ذریعے ہلاک کرنا شبہ عمد ہے' موجب قصاص نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس حدیث سے مسئلہ بالا میں استدلال قطعاً درست نہیں چونکہ یہ حدیث کوڑے اور ہلکی چھڑی کے بارے میں ہے۔ ان چیزوں سے قتل شبہ عمد لازم آتا ہے۔ شئ مثقل جو بڑی بھی ہو، تیز دھار آلۂ قتل کے حکم میں ہے۔ اھ۔

یہ بات عیاں ہے کہ حدیث میں مطلقاً عصا کا ذکر ہے۔ جو عصا خفیف وثقیل دونوں کو شامل ہے۔ مطلق میں تخصیص کے لئے دلیل مثل یا دلیل اقوی ہونا ضروری ہے۔

قوله:منها أربعون في بطونها اولادها:

منها: ضمیر مائة کی طرف راجع ہے۔شرح السنہ میں مذکور ہے کہ آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔قتل عمدِ محض میں دیتِ مغلظہ قاتل کے مال سے فوری طور پر ادا کی جائے گی۔قتل شبہ عمد میں دیت مغلظہ عاقلہ پر ہوگی البتہ مؤجل ہوگی۔قتل خطا میں دیتِ مخففہ عاقلہ پر ہوگی،مؤجلہ ہوگی۔تغلیظ وتخفیف کا تعلق اونٹوں کی عمروں سے ہے۔.....

(کذا ذکرہ الطیبی)

''کتاب الرحمۃ'' میں مذکور ہے کہ یہ مسئلہ ائمہ میں اتفاقی ہے کہ آزاد مسلمان مرد کی دیت سو اونٹ ہے جو قتل عمد کے مرتکب قاتل سے لی جائے گی جبکہ وہ دیت کی طرف عدول کرے۔البتہ یہ بات اختلافی ہے کہ یہ دیت معجّل ہے یا مؤجل؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ،امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں معجّل ہوگی۔امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں مؤجل ہوگی،تین سال میں ادا کی جائے گی۔

قتل عمد کی دیت میں اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت یہ ہے کہ چار طرح کی سو اونٹنیاں ہوں گی۔پچیس بنت مخاض،پچیس بنت لبون،پچیس حقہ،اور پچیس جذعہ۔(اونٹوں کی ان اقسام کی وضاحت ماقبل میں حدیث:۳۴۷۷ کے تحت گذر چکی ہے)(از مرتب)امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:تین طرح کی سو اونٹنیاں ہوں۔تیس حقہ،تیس جذعہ اور چالیس مثنہ اور سب حاملہ ہوں۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت بھی یہی ہے۔

شبہ عمد کی دیت،عمد محض کی دیت کے مثل ہے۔یہ مسلک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں۔قتل خطا میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پانچ طرح کے سو اونٹ واجب ہوتے ہیں۔بیس جذعہ،بیس حقہ،بیس بنت لبون،بیس بنت مخاض،اور بیس ابن مخاض۔اھ۔اس خاص تفصیل میں حکمت یہ ہے کہ یہ اُحق ہے اور یہ خطا کے زیادہ لائق تھا۔چونکہ خاطی فی الجملہ معذور ہے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔البتہ ابن مخاض کی جگہ ابن لبون واجب ہے۔

فائدہ:ان تینوں محدثین نے یہ حدیث صرف ابن عمرو سے روایت کی ہے۔

۳۴۹۱:ورواه ابوداود عنه وعن ابن عمرو في شرح السنة لفظ المصابيح عن ابن عمر۔

أخرجه ابوداوٗد في السنن ٦٨٢/٤ الحديث رقم ٤٥٤٧ عن ابن عمرو وأخرجه عن ابن عمر الحديث رقم ٤٥٤٨۔

ترجمہ:ابوداؤد نے اس روایت کو ابن عمرو رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما دونوں سے نقل کیا ہے'نیز شرح السنۃ میں یہ روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بالفاظ مصابیح نقل کی گئی ہے''۔

تشریح: یہ روایت بالفاظ مصابیح یوں منقول ہے:**الا ان في قتل العمد الخطأ بالسوط والعصا مائة من الابل مغلظة منها......۔**

قتل عمد، زخموں اور اعضاء دیت کا بیان

۳۴۹۲:وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِوبْنِ حَزْمٍ، عَنْ اَبِیْہِ، عَنْ جَدِّہٖ :اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کَتَبَ اِلٰی اَہْلِ الْیَمَنِ وَکَانَ فِیْ کِتَابِہٖ اَنَّ مَنِ اعْتَبَطَ مُؤْمِنًا قَتْلاً، فَاِنَّہٗ قَوَدُ یَدِہٖ اِلاَّ اَنْ یَّرْضٰی اَوْلِیَاءُ الْمَقْتُوْلِ، وَفِیْہِ اَنَّ الرَّجُلَ یُقْتَلُ بِالْمَرْاَۃِ، وَفِیْہِ فِی النَّفْسِ الدِّیَۃُ مِائَۃٌ مِّنَ الْاِبِلِ وَعَلٰی اَہْلِ الذَّہَبِ اَلْفُ دِیْنَارٍ، وَفِی الْاَنْفِ اِذَا اُوْعِبَ جَدْعُہُ الدِّیَۃُ مِائَۃٌ مِنَ الْاِبِلِ وَفِی الْاِسْنَانِ الدِّیَۃُ، وَفِی الشَّفَتَیْنِ الدِّیَۃُ، وَفِی الْبَیْضَتَیْنِ الدِّیَۃُ وَفِی الذَّکَرِ الدِّیَۃُ، وَفِی الصُّلْبِ الدِّیَۃُ، وَفِی الْعَیْنَیْنِ الدِّیَۃُ، وَفِی الرِّجْلِ وَاحِدَۃٍ نِصْفُ الدِّیَۃِ وَفِی الْمَاْمُوْمَۃِ ثُلُثُ الدِّیَۃُ، وَفِی الْجَائِفَۃِ ثُلُثُ الدِّیَۃِ وَفِی الْمُنَقَّلَۃِ خَمْسَ عَشَرَۃَ مِنَ الْاِبِلِ وَفِیْ کُلِّ اِصْبَعٍ مِنْ اَصَابِعِ الْیَدِ وَالرِّجْلِ عَشْرٌ مِنَ الْاِبِلِ وَفِی السِنِّ خَمْسٌ مِنَ الْاِبِلِ (رواہ النسائی والدارمی وفی روایۃ مالک) وَفِی الْعَیْنِ خَمْسُوْنَ، وَفِی الْیَدِ خَمْسُوْنَ، وَفِی الرِّجْلِ خَمْسُوْنَ، وَفِی الْمَوْضِحَۃِ خَمْسٌ.

أخرجہ النسائی فی السنن ٥٧/٨ الحدیث رقم ٤٨٥٣۔ والدارمی فی ٢٥٣/٢ الحدیث رقم ٢٣٦٦۔ مالک فی الموطا ٨٤٩/٢ الحدیث رقم ١ من کتاب العقول۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اپنے والد (حضرت محمد بن عمرو) سے اور وہ ابوبکر کے دادا (حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اہل یمن کے پاس ایک ہدایت نامہ بھیجا جس میں لکھا ہوا تھا کہ جس شخص نے قصداً کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا (یعنی قتل عمد کا ارتکاب کیا) تو اس کا قصاص اس کے ہاتھوں کے فعل کی وجہ سے ہے (یعنی اس نے اپنے ہاتھوں کے فعل اور تقصیر کے ذریعہ جو قتل عمد کیا ہے اس کی سزا میں اس کو بھی قتل کر دیا جائے) مگر یہ کہ مقتول کے ورثاء راضی ہو جائیں (یعنی اگر مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف کر دیں یا اس سے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو اس کو قتل نہ کیا جائے) اس ہدایت نامہ میں یہ بھی تھا کہ (مقتول) عورت کے بدلے میں (قاتل) مرد کو قصاصاً قتل کیا جائے''۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''جان کا خون بہا سو اونٹ ہیں (یعنی جس کے پاس اونٹ ہوں وہ خون بہا میں مذکورہ تفصیل کے مطابق سو اونٹ دے) اور جس کے پاس سونا ہو وہ ایک ہزار دینار دے اور ناک کی دیت جب کہ اس کو مکمل طور پر کاٹ دیا جائے (وایں طور کہ ناک کا کچھ بھی حصہ باقی نہ رہے) پوری دیت ہے (یعنی ایک سو اونٹ کی تعداد ہے) اور دانتوں میں (جبکہ وہ سب توڑے گئے ہوں) پوری دیت ہے اور ہونٹوں کی دیت (جب کہ وہ پورے کاٹ دیئے گئے ہوں) پوری دیت ہے اور دونوں خصیوں کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت ہے اور پیٹھ کی ہڈی توڑے جانے کی پوری دیت ہے اور عضو خاص کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت ہے اور کمر کی ہڈی توڑے جانے میں پوری دیت ہے اور دونوں آنکھوں کو پھوڑ دینے کی بھی پوری دیت ہے اور ایک پیر کاٹنے پر آدھی دیت ہے اور سر کی جلد زخمی کرنے پر تہائی

دیت ہے اور پیٹ میں زخم پہنچانے پر بھی تہائی دیت ہے اور اس طرح زخمی کرنے پر کہ ہڈی اپنی جگہ سے سرک گئی ہو پندرہ اونٹ دینے واجب ہیں اور ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں سے ہر ایک انگلی (کاٹنے) پر دس اونٹ دینے واجب ہیں اور ہر ہر دانت کا بدلہ پانچ پانچ اونٹ ہیں۔ (نسائی' دارمی) اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ایک آنکھ (پھوڑنے) کی دیت پچاس اونٹ ہیں اور ایک ہاتھ اور ایک پیر کی دیت پچاس پچاس اونٹ ہیں اور ایسا زخم پہنچانے کی دیت جس میں ہڈی نکل آئی ہو یا ظاہر ہو گئی پانچ اونٹ ہیں''۔

تشریح: قوله:أن رسول الله ﷺ كتب۔۔۔الاان يرضى اولياء المقنول:

أن من: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ **اعتبط** بعین مہملہ، تاء، باء اور طاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔''**عبطت الناقة**'' اور''**اعتبطتها**'' اس وقت کہتے ہیں جب اونٹنی کو بلاوجہ ذبح کیا جائے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جو بغیر کسی جنایت کے قتل کرے۔

قتلا: مفعول مطلق ہے، اس لئے کہ قتل کی نوعیت پر دلالت کر رہا ہے انواع قتل میں سے قتل عمد۔

قود: قاف اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ موقود کے معنی میں ہے۔ یعنی اپنے ہاتھوں کے ذریعے کیے ہوئے قتل عمد کی سزا میں اس کو بھی قتل کر دیا جائے۔''قود'' کے اصل معنی ہیں''انقیاد''(تابعدار ہونا' مرونی کرنا) اور قصاص کو''قود'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں''جانی'' کا انقیاف ہوتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:''فانہ الخ'' جواب میں شرط ہے اور ظاہر یہ تھا کہ یقتص منہ' فرمایا جاتا چونکہ یہ اس کا سبب ہے' پس سبب کو سبب کے قائم مقام کر دیا اور استثناء مسبب سے ہے حقیقت میں: قاضیؒ نے اپنے اس کلام میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

ان يقتل قصاما مقتول يده قصاصا اذ لو لم يجز لما اقتص منه

قوله:وفيه ان الرجل ۔۔۔وفى النفس الدية مناوئة من الابل:

فيه: ضمیر کا مرجع''کتاب'' ہے۔

مرد کو عورت کے بدل میں قتل کیا جانا مسئلہ اجماعی ہے اور اس کا برعکس بطریق اولیٰ اجماعی ہے کہ عورت کو مرد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ قتل نفس میں دیت ہے۔ اگر قتل عمد کے مرتکب کو مقتول کے ورثاء قصاص میں قتل نہ کرنا چاہیں، بلکہ دیت پر راضی ہو جائیں تو تب دیت واجب ہوگی۔ لیکن قتل شبہ عمد اور قتل خطا کے مرتکب پر دیت ہی متعین ہے۔

مائة:''**دية**'' سے بدل ہے۔

قوله: وعلى أهل الذهب الف دينار:

درہم اور دینار دیت میں قبول کئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد فرماتے ہیں کہ اگر دینے والے کے پاس اونٹ موجود ہوں، لیکن وہ زرِ نقد کی صورت میں دیت ادا کرنا چاہتا ہے تو اس سے لینا جائز ہے۔ پھر ان دونوں حضرات سے دو روایات ہیں کہ اونٹ ہی اصل ہیں یا اونٹ اصل ہیں اور درہم و دینار اس کا بدل ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں از روئے شرع دیت اصل ہے، اونٹوں کا بدل نہیں ہے۔
امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اونٹوں کی موجودگی میں زرِ نقد دے کر اونٹوں سے عدول نہ کیا جائے۔ ہاں اگر طرفین راضی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

دیت کی مدّ کے دراہم کی تعداد میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دس ہزار درہم ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بارہ ہزار درہم ہیں۔ (کذا فی اختلاف الأئمة)۔حدیث کا ظاہر: ''**وعلی اهل الذهب الف دینار**'' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مؤید ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ: **مائة من الابل علی أهل الابل، وألف دینار، أوما یقوم مقامها، وهو عشرة آلاف درهم علی أهل الذهب۔**

قوله: وفي الانف اذا وعب جدعه الدية مائة من الابل: جدعه: نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔
شمنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خواہ ناک کا ظرف بنی کاٹا جائے خواہ نرم حصہ کاٹا جائے دونوں صورتوں میں، بہرحال مکمل دیت لازم آئے گی۔

حاصل یہ ہے کہ جنایت سے اگر اعضاء جسم کی جنس منفعت بالکل ختم ہوگئی یا اس کی موزونیت اور خوبصورتی بالکل زائل ہوگئی تو ایسی صورت میں پوری دیت واجب ہوگی، کیونکہ یہ ایک طرح کا جانی نقصان ہے۔ جسے انسانی عظمت کی وجہ سے مکمل جانی نقصان کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ناک کی دیت کے مسئلہ میں دلائل ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی دلیل نقلی:

① **روی عبدالرزاق فی مصنفه، عن ابن جریج، عن ابن طاوس أنه قال فی الکتاب الذی عندهم، عن النبیؐ فی الأنف: اذا قطع مارنه الدية۔** کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناک کے بارے میں فرمایا ناک کی دیت جب کہ ناک کا ''مارن'' (ناک کا کنارہ یا ناک کا نرم حصہ) کاٹ دیا جائے تو پوری دیت ہے۔

② **ومارواه ابن ثیسبة فی مصنفه، عن وکیع، عن ابن أبی لیلٰی، عن عکرمة بن خالد، عن رجل من آل عمر قال: قال رسول الله ا فی الأنف: اذا استؤصل مارنه الدية۔** رسول اللہ نے ناک کے بارے میں: ناک کی دیت جب کہ کا ''مارن'' جڑ سے اکھاڑ دیا جائے (یعنی مکمل ناک کاٹ دی جائے) تو پوری دیت ہے۔

③ پوری ناک کاٹنے سے کامل طور پر جمال مقصودی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے پوری دیت لازم ہے۔ ناک کا نرم حصہ کاٹنے کی صورت میں منفعت مقصودہ فوت ہو جاتی ہے۔ بایں طور کہ ناک کی منفعت جو ہواؤں کو جمع کر کے قصبہ کے راستے سے دماغ تک پہنچاتا ہے۔ قطع المارن کی وجہ سے یہ منفعت فوت ہو جائے گی۔ اس لئے ''قطع المارن'' میں پوری دیت لازم آتی ہے اور اگر مارن مع قصبہ الانف کاٹ دیا گیا تو امام مالک و امام احمد کے نزدیک صرف ایک دیت لازم آئے گی۔ اس سے زائد کچھ لازم نہ ہوگا کیونکہ یہ ایک ہڈی ہے۔ ایک قضہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مارن کاٹنے پر ''حکومت عدل'' کے مطابق علیحدہ سے ایک ضمان لازم ہوگا۔ چونکہ مارن علیحدہ سے موجب دیت ہے۔ چنانچہ

شئ زائد کو کاٹنے میں حکومت واجب ہوگی۔ جیسا کہ اگر صرف قصہ کاٹا اور اس کی زبان کاٹی تو دیت کے بعد حکومت عدل ہوتی ہے عرض مرتب: ''حکومت'' کی وضاحت آگے دسویں حدیث کے ذیل آ رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائے حدیث: ۳۵۰۲۔اھ۔

ہماری دلیل مسند بزار کی روایت ہے عن أبي بكر بن عبيدالله بن عمر عن أبيه۔ قال :قال قالٌ :في الأنف اذا استوعب جدعه الدية۔ کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ناک کی دیت جب کہ اس کو مکمل طور پر کاٹ دیا جائے پوری دیت ہے۔

عقلی دلیل:

یہ ایک عضو ہے۔ لہٰذا ایک ہی دیت لازم آئے گی۔ اگر کسی کی ناک کاٹ دی گئی۔ پس اس کی قوت شامہ بھی ختم ہوگئی تو ایسی صورت میں دو دیتیں لازم ہونگی۔ چونکہ قوت شامہ کا تعلق ناک سے نہیں ہے' چنانچہ دیتوں میں تداخل نہیں ہی ہوگا۔

قوله: وفي الاسان --- في قلع كل سن: تمام دانت توڑ دینے کی صورت میں کامل دیت واجب ہوگی۔ ایک دانت یا ایک داڑھ کی دیت کامل دیت کا بیسواں حصہ (یعنی پانچ اونٹ) ہے جبکہ خطا ہو خواہ داڑھ ہو یا دانت ہو۔ پہلی دلیل: عمرو بن حزم کا خط ہے کہ جس میں یہ لکھا تھا: وفي السن خمس من الابل۔ مزید دلیل عنقریب آئے گی۔ (اگلی حدیث ملاحظہ فرمائیے) اصل منفعت میں دانت اور داڑھیں سب برابر ہیں۔ اور اصل منفعت ''چبانا'' ہے۔ اگرچہ بعض کی منفعت دوسری بعض سے زیادہ ہے۔ لیکن بعض دوسریوں میں جمال ہے اور آدمی میں جمال بھی منفعت کی طرح ہے۔

خطا کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ دانت اگر عمداً توڑے ہیں تو قصاص واجب ہوگا۔ اگر سارے دانت اکھاڑ دیئے تو سولہ ہزار (۱۶۰۰) واجب ہوں گے۔ پورے انسانی جسم میں دانت ہی وہ عضو ہیں کہ جس کی دیت، دیتِ نفس سے بڑھ کر ہے۔

کوسج (کم دانت والے) کے سارے دانت توڑنے کی صورت میں ۱۴ ہزار واجب ہوں گے، چونکہ اس کے ۲۸ اٹھائیس دانت ہوتے ہیں۔

حکایت بیوی نے اپنے شوہر کو کہا: او رکوسج! شوہر نے کہا: اگر میں کوسج ہوا تو تجھے طلاق۔، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مسئلہ پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا: اس کے دانتوں کو گنا جائے اگر اٹھائیس ہیں تو وہ کوسج ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر بیس سے زیادہ دانت اکھاڑ دیئے تو بیس دانتوں میں مکمل دیت واجب ہوگی اور باقی میں کوئی شئ واجب نہ ہوگی۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

قوله: وفي الشفتين الدية۔۔۔۔وفي الصلب الدية:

حشفہ کی دیت کا بیان:

الشفتين: شین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہونٹ،

البیضتین: اس سے مراد خصیتین ہیں۔ خصیتین کاٹنے پر مکمل دیت واجب ہے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صرف حشفہ کٹ گیا یا ذکر سمیت کٹ گیا تو مکمل دیت واجب ہوگی۔ اس مسئلہ کی دلیل مصنف ابن ابی شیبہ کی زہری سے یہ روایت ہے: **أن النبی صلی الله علیه وسلم قضٰی فی الذکر الدیة مائة من الابل اذا استوصل، أوقطعت حشفته**۔ " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ دیت کا فیصلہ فرمایا جب مرد کا عضو مخصوص جڑ سے کٹ جائے یا اس کا حشف کٹ کا جائے۔"

بیہقی نے ابن المسیّب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: **مضت السنة أن فی الذکر الدیة، و فی الأنشین الدیة۔** الصلب: صاد کے ضمہ کے ساتھ بمعنی "**ظَهُر یشت کمر**"۔ ابن الملک فرماتے ہیں: یعنی پشت پر اس طرح مارنا کہ پشت کا پانی خشک ہو جائے۔

قوله: وفی العینینالدیة:

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حواس میں سے کسی ایک کو کاٹ دیا جائے تو اس میں دیت آئے گی۔

چونکہ دونوں ہی منفعت مقصودہ ہیں۔

ابن ابی شیبہ اپنی مصنف میں ابن خالد عن عوف اعرابی سے روایت کرتے ہیں فرمایا: میں نے "جماجم" کے زمانہ میں ایک بوڑھے کی خبر سنی، کہا گیا کہ یہ ابوقلابہ کے چچا ابوالمہلب ہیں، اس نے کہا: حضرت عمر بن خطاب کے زمانہ میں ایک شخص نے دوسرے آدمی کے سر پر پتھر پھینکا، چنانچہ اس کی سماعت، عقل، زبان اور ذکر چاروں چیزیں زائل ہوگئیں، چنانچہ وہ شخص عورت کے پاس نہ جاسکا، حضرت عمرؓ نے ضارب پر چار دیتیں لازم فرمائیں۔ حالانکہ وہ مضروب شخص زندہ تھا۔ (اس روایت کو عبد الرزاق نے اپنے مصنف میں عن سفیان الثوری عن عوف بہ روایت کہ اپنے

"مبسوط" میں لکھا ہے کہ ان چیزوں کے زائل ہونے کا پتہ "جانی" کے تصدیق کرنے سے معلوم ہوگا، یا جب جانی سے حلف لیا جائے اور وہ حلف سے انکار کردے اور قوت بصارت کے زائل ہونے کا پتہ دو عدل طبیبوں کے قول سے معلوم ہوگا۔

قوله: وفی الرجل الواحدة نصف الدیة: شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جفت اعضاء مثلاً آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، ہونٹ، کان اور خصیتین میں مکمل دیت واجب ہوگی۔ اسکی دلیل وہ روایت ہے جو امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے مراسیل میں اس سند کے ساتھ روایت کی ہے: **عن أبی بکر بن محمد بن حزم، عن أبیه، عن جدّه أن رسول الله ﷺ کتب کتابا الی الیمن فیه الفرائض والسنن والآیات، وبعث به مع عمرو بن حزم فکان فیه: وفی الثفتین الدیة الریة، وفی البیضتین، وفی العینین الدیة، وفی العین الواحدة نصف الدیة وفی الیدالواحدة نصف الدیة، وفی الرجل الواحدة نصف الدیة۔**

قوله: وفی المامومة۔۔۔خمس عشرة من الابل:

المنقلة: قاف مشددہ کے کسرہ کے ساتھ

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ مقادیر حکم تعبدی ہیں، جن کی معرفت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں سوائے توقف کے۔

قوله:وفى كل اصع ---عشر من الابل:

أصبع :ہمزہ اور باء پر تینوں حرکتیں درست ہیں۔واؤ''بمعنی''اَوْ'' ہے۔یعنی عشر دیت ہے۔شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کی دلیل ترمذی کی حدیث ہے جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں ذکر کی ہے۔ابن القطان رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: **رجال اسناده كلهم ثقات۔**

عن ابن عباس قال:قال رسول الله ﷺ: دية أصابع اليدين والرجلين سواء، عشرة من الابل لكل أصبع۔

قوله:وفى الموضحة خمس :الموضحة: ضاد کے کسرہ کے ساتھ،

بیہقی کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

فى الأنف الدية اذا استوعب جدعه مائة من الابل، وفى اليد خمسون ،وفى الرجل خمسون، وفى العين خمسون، وفى الآمة ثلث النفس، وفى الجائفة ثلث النفس، وفى المنقلة خمس عشرة، وفى الموضحة خمس، وفى السن خمس، وفى كل أصبع مماهنا لك خمس۔

''جب پوری ناک کاٹ ڈالی جائے تو کامل دیت ہوگی۔ہاتھ کی دیت پچاس اونٹ ہیں۔پاؤں کی دیت پچاس اونٹ ہیں۔پاؤں کی دیت پچاس اونٹ ہیں۔آنکھ کی دیت پچاس اونٹ ہیں۔آمہ کی دیت ثلث نفس ہے۔جائفہ میں نفس کی تہائی دیت ہے۔''منقلہ'' کی دیت پندرہ اونٹ ہیں۔موضحہ کی دیت پانچ اونٹ ہیں۔ایک دانت کی دیت پانچ اونٹ ہیں،اور ہر انگلی کی دیت پانچ اونٹ ہیں''۔

ابن عدی نے الکامل میں،اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے:

فى اللسان الدية اذا منع الكلام، وفى الذكر الدية اذا قطعت الحشفة، وفى الشفتين الدية۔

دانتوں کی دیت کا بیان:

۳۴۹۳:وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ قَالَ :قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الْمَوَاضِحِ خَمْسًا خَمْسًا مِنَ الْاِ بِلِ وَفِى الْاِسْنَانِ خَمْسًا خَمْسًا مِنَ الْاِبِلِ ۔

(رواه ابوداود والنسائى والدارمى وروى الترمذى وابن ماجة الفصل الاول)

أخرجه ابوداوٗد فى السنن ١٩٥/٤ الحديث رقم ٤٥٦٦۔ والترمذى فى ٧/٤ الحديث رقم ١٣٩٠۔ والنسائى فى ٦٧/٨ الحديث رقم ٤٨٥٢۔ وابن ماجه فى ٨٨٦/٢ الحديث رقم ٢٦٥٥۔ والدارمى فى ٢٥٥/٢ الحديث رقم ٢٣٧٢۔ واحمد فى المسند ٢١٥/٢۔

ترجمہ:''اور حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ایسے زخموں کی دیت جس میں ہڈی ظاہر ہو جائے پانچ پانچ اونٹ ہے اور دانتوں کی (یعنی ہر ہر دانت) کی دیت بھی پانچ پانچ اونٹ ہے۔ابوداؤد نسائی دارمی اور ترمذی نے اس حدیث (کے دونوں جملوں) کو روایت کیا ہے اور ابن ماجہ نے

(اس حدیث کا) پہلا جملہ (یعنی جس میں زخموں کی دیت بیان کی گئی ہے) نقل کیا ہے''۔

تشریح: قوله: قضى رسول الله في المواضح الخ: المواضح: میم کے فتحہ کے ساتھ یہ ''**موضحة**'' کی جمع ہے۔ ہر دانت کے بدلے پانچ اونٹ ہیں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث اور حدیث سابق ''**وفي الاسنان الدية**'' میں بظاہر تعارض ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں جمع کے لفظ سے اس کے افراد مراد ہیں اور وہاں اس کی حقیقت مراد ہے۔ اس کی مثال ''ال'' ''جنسیہ اور ''ال'' استغراقیہ ہے۔ اسی وجہ سے ''**خمساً**'' کو مکرر ذکر فرمایا، تا کہ باعتبار اخماس کی دلالت کاملہ کا استیعاب کرے۔ عرب کسی شئی کا تکرار دو بار ہوتے ہیں تا کہ تکرار اس ئی کی جمع جنس کی تفصیل کا اس معنی کے باعتبار نے استیعاب کر لے جس پر لفظ مکرر دلالت کر رہا ہے۔ اھ۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ یہاں ''اخماس'' زائد از دیت ہیں جیسا کہ ماقبل میں تحریر کیا جا چکا ہے۔

قوله: رواه ابو داود ......:

یعنی ترمذی اور ابن ماجہ نے دوسرا جملہ یعنی ابن حاجب لکھتے ہیں: **العرب تكرد الشيء مرتين لتستوعب تفصيل جميع جنسه باعتبار المعنى الذى ادل عليه اللفظ المكر راه۔ وفيه أن الأ خماس هناز يادة على الرية۔**

''**وفي الأسنان**'' والا حصہ ذکر نہیں کیا۔ یہ شمنیؒ کی نقل کے مخالف ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ابو داؤد نے نقل کیا ہے: **عن عمرو شعيب عن أبيه، عن جده قال: قضى رسول الله ﷺ في الأسنان خمس من الابل في كل سن۔** (کہ اس روایت میں پہلا جملہ یعنی خمس میں زخموں کی دیت بیان کی گئی ہے منقول نہیں۔)

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **ولا قود في الشجاج** (سر اور چہرے کے زخموں میں قصاص نہیں)۔ ''شجاج'' کے لغوی معنی ''سر اور چہرہ کے زخم'' ہیں۔ جسم کے دوسرے حصوں کے زخموں کو ''**جراحت**'' کہتے ہیں۔ البتہ ''**موضحة**'' اس زخم کو کہتے ہیں جو ہڈی تک پہنچ کر اس کی سفیدی واضح کر دے۔

بیہقی میں طاؤس سے مرسلاً مروی ہے:

قال: قال رسول الله ﷺ: ولا طلاق قبل لملك ولا قصاص فيما دون الموضحة،

روای کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور قبل از ملک طلاق نہیں ہوتی اور موضحہ سے کم زخم میں قصاص نہیں ہوتا۔

مصنف عبد الرزاق میں حسن اور عمر بن عبد العزیز سے مروی: **أن النبي ﷺ لم يقض فيما دون الموضحة بشئ۔**

نیز یہ کہ موضحہ کے علاوہ دوسرے زخموں میں مساوات ممکن نہیں، چونکہ قصاص لیتے وقت چھری کا ہڈی تک پہنچانا ممکن ہے برخلاف دوسرے زخموں کے۔ اور اس سے وجہ بھی کہ **ضيمافوق الموضحة** میں تو ہڈی کا ٹوٹنا پایا جاتا ہے، اور اس میں قصاص نہیں ہے۔

امام محمدؒ ''اصل'' میں فرماتے ہیں یہ ظاہر الروایۃ ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ موضحہ سے کم زخم میں قصاص واجب

ہے چونکہ اس قصاص میں ہڈی ٹوٹے گی، نہ ہلاکت کا خوف غالب ہے۔اور مساوات بھی ممکن ہے سلائی ڈال کر زخم کی گہرائی ناپ لی جائے اور پھر اس پیمائش کے برابر لوہے کی ایک سلاخ بنا کر اسکے بقدر اس کے جسم کا حصہ کاٹ دیا جائے۔ شرح ''الواقی'' میں ہے کہ یہی ظاہر ہے اس ارشاد باری تعالیٰ کی وجہ سے: ﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾[المائدۃ۔٤٥]مزید یہ کہ ہم نے جو ذکر کیا ہے اس میں مساوات ممکن ہے حسن رحمۃ اللہ علیہ کی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے:

لا قصاص فیما دون الموضحۃ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ چونکہ موضحہ سے کم درجہ کا زخم ہڈی تک نہیں پہنچتا لہٰذا یہ زخم مامومہ کے مشابہ ہوگیا فرمایا: موضحۂ خطا میں نصف عشرِ دیت ہے اور ہاشمہ میں عشرِ دیت ہے۔اس کی دلیل ابوداؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمرو بن حسن کے خط میں لکھا تھا۔: **وفی المأمومۃ ثلث الدیۃ، و فی الجائفۃ ثلث الدیۃ، وفی المنقلۃ خمس عشرۃ من الابل، وفی الموضحۃ خمس من الابل۔** ''مامومہ'' میں ثلث دیت ہے''جائفہ'' میں ثلث دیت ہے''منقلہ'' میں پندرہ اونٹ ہیں اور''موضحہ'' میں پانچ اونٹ ہیں۔اس روایت میں''ھاشمۃ'' کا ذکر نہیں ہے۔لیکن مصنف عبدالرزاق میں زید بن ثابت سے مروی ہے:

قال: فی الموضحۃ خمس، وفی الھاشمۃ عشر، وفی المنقلۃ خمس عشرۃ، وفی المأمومۃ ثلث الدیۃ۔ فرمایا:''موضحہ'' میں پانچ اونٹ ہیں''ہاشمیہ'' میں دس اونٹ ہیں''منقلہ'' میں پندرہ اونٹ ہیں اور''مامومہ'' میں ثلث دیت ہے'ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اوران کے اصحاب کا اتفاق ہے کہ: جائفہ پیٹ کے علاوہ میں متصور نہیں، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جائفہ نافذہ میں دو ثلث دیت ہے۔

ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرے علم کے مطابق ان حضرات کا اس مسئلہ میں اختلاف نہیں۔امام ابوحنیفہ اور بعض شوافع سے مروی ہے کہ: یہ ایک ہی زخم ہے چونکہ جائفہ ظاہر بدن سے جوف تک ہوتا ہے اور دوسرا یہاں جائفہ جوف سے خارج بدن تک ہے۔(یہ مستقل جائفہ نہیں ہے از مرتب۔)

جمہور کی دلیل مصنف عبدالرزاق کی یہ روایت ہے: **عن الثوری، عن محمد بن عبدالرحمن، عن عمرو بن شعیب عن ابن المسیب، قال: قضی ابوبکر فی الجائفۃ تکون نافذۃ بثلثی الدیۃ، وقال ھما جائفتان۔** فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جائفہ نافذہ کے بارے میں دو ثلث دیت کا فیصلہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ جائفہ ہیں۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **ولا تکون الجائفۃ الا فی الجوف۔**

مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ روایت یوں ہے: **عن عبدالرحمٰن بن سلیمان، عن حجاج، عن عمرو بن شعیب، عن سعید بن المسیب، أن قوما کانوا یرمون فرمی رجل منھم بسھم خطأ فاصاب بطن رجل فأنفذہ الی ظھرہ فدووہ فرفع الی أبی بکر فقضٰی فیہ بجائفتین۔** کہ کچھ لوگ تیراندازی کر رہے تھے'ان میں سے ایک آدمی نے غلطی سے تیر پھینکا'وہ تیر ایک آدمی کے پیٹ میں لگا اور اس کی پشت سے آر پار ہوگیا۔چنانچہ لوگوں نے اس کا

علاج معالجہ کیا۔ پھر یہ معالجہ کیا۔ پھر یہ معاملہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں لے جایا گیا تو آپؓ نے اس سلسلہ میں دو جائفہ (کی دیت) کا فیصلہ فرمایا۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجروح کے بدلہ میں جارح سے اس وقت تک بدلہ نہیں لیا جائے گا جب تک وہ تندرست نہ ہو جائے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجروح کے تندرست ہونے سے پہلے بدلہ لینا جائز ہے۔ قصاص بالنفس پر قیاس کرتے ہوئے قصاص فی الجوارح میں انتظار کرنا مستحب ہے۔

حنیفہ کی دلیل:

مسندِ احمد کی یہ روایت ہے: **عن ابن جريج، عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جدّه: أن رجلا طعن رجلا بقرن في ركبته، فقال: يا رسول الله! أقدني، فقال له عليه الصلوٰة والسلام: لا تعجل حتى يبرأ جرحك، قال: فأبى الرجل الا أن يستقيده فأقاده رسول الله ﷺ، قال فعرج الرجل المستقيد وبرأ المستقيد منه، فأتى المستقيد الٰى النبى ﷺ فقال: يا رسول الله! عرجت منه وبرأ صاحبى، فقال له عليه الصلاة والسلام: الم آمرك أن لا تستقيد حتى يبرأ جرحك فعصيتنى) قال: ثم امر رسول الله ﷺ بعد من كان به جرح أن لا يستقيد حتى تبرأ جراحته، فاذا برأ استقاد**، چونکہ جراحات میں مآل کار کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ حال کا، چونکہ جراحات۔ اللہ بہتر جانتے ہیں۔ کیا صورت اختیار کر جائیں، ہوسکتا ہے کہ زخم مجروح کی جان لے لے، اور یہ زخم قتل کے حکم میں داخل ہو جائے۔

ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کی دیت کا بیان

۳۴۹۴: **وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ : جَعَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اَصَابِعَ الْيَدَيْنِ وَالرِّجْلَيْنِ سَوَاءً۔** (رواه الترمذى)

أخرجه ابوداوٗد فى السنن ٦٩١/٤ الحديث رقم ٤٥٦١۔ واخرج الترمذى نحوه مختصراً ٨/٤ الحديث رقم ١٣٩١۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی تمام انگلیوں کو (دیت کے اعتبار سے) مساوی قرار دیا ہے (یہاں تک کہ انگوٹھے اور چھنگلی کو بھی ایک دوسرے کے برابر قرار دیا ہے اگرچہ گانٹھوں کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے)۔'' (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: یہ مضمون ماقبل میں گزر چکا ہے۔

اُنگلی دانت اور داڑھ کی دیت کا بیان

۳۴۹۵:وَعَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم الْاَصَابِعُ سَوَاءٌ، وَلْاِسْنَانُ سَوَاءٌ، الثَّنِيَّةُ وَالضِّرْسُ سَوَاءٌ، هٰذِهٖ وَهٰذِهٖ سَوَاءٌ . (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤/ ٦٩٠ الحدیث رقم ٤٥٥٩ ۔ وابن ماجه فی ٢/ ٨٨٥ الحدیث رقم ٢٦٥٠ ۔

ترجمہ:''اور حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (دیت کے اعتبار سے) تمام انگلیاں برابر ہیں اور تمام دانت برابر ہیں (اگرچہ بعض دانت بڑے ہیں اور بعض دانت چھوٹے ہیں) اور آگے کے دانت اور داڑھیں برابر ہیں (اگرچہ داڑھیں آگے کے دانتوں سے بڑی ہیں مگر دیت دونوں کی برابر ہے) نیز (آپ ﷺ نے انگوٹھے اور چھنگلیا کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ) یہ اور یہ (دیت کے اعتبار سے) برابر ہیں''۔ (ابوداوٗد)

تشریح: قوله: والسنة والضرس سواء:

والثنية: والضرس: ضاد کسرہ کے ساتھ اور ''ثنیۃ'' یاء کی تشدید کے ساتھ ہے ''المغرب'' میں ہے کہ '' ثنیہ'' واحد ہے '' ثنایا'' کا۔ سامنے کے اوپر نیچے کے دو دو دانتوں کو ثنایا کہتے ہیں، وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہر دانت دوسرے دانت سے ملا ہوتا ہے۔ ثنایا کے علاوہ باقی دانتوں کو '' أضراس ک'' ہتے ہیں۔ اس کا واحد ''ضرس '' ہے۔ مذکر و مؤنث ہر دو طرح استعمال ہوتا ہے۔

أسنان کا ذکر کرنے کے بعد ضرس اور ثنیہ کو معنی کی تقریر کے لئے ذکر فرمایا۔ یعنی نظر آنے والے دانت اور نظر نہ آنے والے، زیادہ منفعت والے اور غیر منفعت یا کم منفعت والے سب برابر ہیں۔ قوله: هذه و هذه سواء یعنی چھنگلیا اور انگوٹھا، اس مفہوم پر اس باب کی پہلی حدیث بھی دال ہے۔ (كذا ذكره الطيبي وتبعه ابن الملك) اس جملہ کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ماقبل کلام میں اشارہ کسی ایک دانت کی طرف کسی داڑھ کی طرف فرمایا ہو ماقبل کی تاکید کے لئے۔

تخریج: اسی طرح اس روایت کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد، ابوداوٗد اور نسائی نے ابن عمر ؓ سے روایت کی ہے:

وفي الأصبع عشر عشر۔ ترجمہ: ''انگلیوں میں دس دس اونٹ ہیں''۔

کافر اور ذمی کی دیت کا بیان

۳۴۹۶:وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم عَامَ الْفَتْحِ ثُمَّ قَالَ :اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَا حِلْفَ فِي الْاِسْلَامِ وَمَا كَانَ مِنْ حِلْفٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّ الْاِسْلَامَ لَا يَزِيْدُهٗ اِلَّا شِدَّةً، الْمُؤْمِنُوْنَ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ يُجِيْرُ عَلَيْهِمْ اَدْنَاهُمْ وَيَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ يَرُدُّ

سَرَايَاهُمْ عَلٰى قَعِيْدَتِهِمْ لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ، دِيَةُ الْكَافِرِ نِصْفُ دِيَةِ الْمُسْلِمِ، لَا جَلَبَ، وَلَا جَنَبَ وَلَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ اِلَّا فِيْ دُوْرِهِمْ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) قَالَ دِيَةُ الْمُعَاهِدِ نِصْفُ دِيَةِ الْحُرِّ .(رواه ابوداود)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٧١٧/٤ الحديث رقم ٤٥٨٣۔ واحمد فی المسند ١٨٠/٢۔

ترجمہ:''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیب رحمۃ اللہ علیہ) سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال ایک خطبہ دیا اور اس (میں حمد وثناء) کے بعد فرمایا کہ ''اے لوگو! اسلام میں کوئی نیا عہد و پیمان کرنا جائز نہیں ہے لیکن وہ عہد جس کا رواج زمانۂ جاہلیت میں تھا' اس میں اسلام کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتا بلکہ اس کو مضبوطی سے قائم کرتا ہے۔ (یاد رکھو) تمام مسلمان اپنے غیر (یعنی کفار) کے مقابلے پر (بھلائیوں کو پھیلانے اور آپس میں ایک دوسرے کے مددگار رہونے میں) ایک ہاتھ کی مانند ہیں ایک ادنیٰ ترین مسلمان بھی تمام مسلمانوں کی طرف سے (کافر کو) پناہ دے سکتا ہے اور وہ مسلمان جو سب مسلمانوں سے کہیں دور ہو وہ بھی ان تک پہنچاتا ہے اور مسلمانوں کا لشکر ان مسلمانوں کو بھی (مال غنیمت کا) حقدار بناتا ہے جو (لشکر کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں) بیٹھے رہے ہوں' (خبردار) کوئی مسلمان کسی (حربی) کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے اور (ذمی کافر کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے اور (زکوٰۃ وصول کرنے والے کارکن بطور خاص سن لیں کہ) زکوٰۃ کے مویشیوں کو اپنے پاس نہ منگوایا جائے اور (زکوٰۃ دینے والے بھی سن لیں کہ وہ) اپنے مویشیوں کو کہیں دور لے کر نہ چلے جائیں (زکوٰۃ وصول کرنے والے کو چاہئے کہ) زکوٰۃ ان کے گھروں پر ہی وصول کر لی جائے اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ''عہد والے (ذمی) کی دیت آزاد (یعنی مسلمان) کی دیت کا نصف ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح:قوله: خطب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔لا حلف فی الاسلام انه: ضمیر شان ہے۔

لا حلف: حاء مہملہ کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے، ایک نسخہ میں حاء مہملہ کے فتحہ، اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: حلف کے معنی ہیں: عہد، اسی سے **حالفه** بمعنی **عاهده** اور **تحالفوا** بمعنی **تعاهدوا** ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے عہد و پیمان باندھ لیا کرتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، لڑائی جھگڑے کے موقع پر ایک دوسرے کی مدد کی جائے گی۔ اور اگر کسی معاملہ میں ایک پر کوئی تاوان واجب ہوگا تو دوسرا تاوان ادا کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی ''**لا حلف فی الاسلام**'' کے ذریعے اسلام میں اس قسم کے عہد و پیمان سے منع کیا۔ اور زمانہ جاہلیت کے اس قسم کے عہد و پیمان کو وفائے عہد، حفاظت حقوق کے پیش نظر برقرار رکھا۔

اس مسئلہ میں امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کی توضیح اور قاضی رحمۃ اللہ علیہ کی تلخیص کا حاصل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ باہم عہد و پیمان کیا کرتے تھے، کوئی آدمی دوسرے شخص سے عہد کرتے ہوئے کہتا: میرا خون تمہارا خون ہے۔ میری عزت تیری عزت ہے' تمہارے رشتہ دار کا قاتل میرے رشتہ دار کا قاتل ہے' میری جنگ تمہاری جنگ ہے، میری صلح تمہاری صلح ہے۔ تو میرا

وارث، میں تیرا وارث، تو میرا عاقلہ، میں تیرا عاقلہ۔'' چنانچہ یہ شخص اس قوم کا حلیف شمار ہوتا تھا، اور حسب معاہدہ نفع وضرر میں ایک دوسرے کی طرف سے تحمل ذمہ کرتے۔ اسلام نے بھی لوگوں کے ان معاملات کو برقرار رکھا۔ چونکہ یہ معاہدہ مجموعی طور پر فوائد اجتماعیہ پر مشتمل تھا۔ مثلاً خون ریزی کی راہ میں رکاوٹ تھا، دشمنوں کے خلاف مددونصرت حاصل ہوتی تھی۔ عہد کی پاسداری کی جارہی تھی۔ لوگوں میں باہمی الفت ومحبت کا ذریعہ تھا۔ فتح مکہ تک یہ معاہدات چلتے رہے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلامی تعلیمات کے معارض امور کی نفی فرمادی۔ چونکہ دینی رابطہ تعاضد وتعاون پر ابھارتا ہے اور ان کو مخالفت سے روکتا ہے۔

اسلام نے ایام جاہلیت کے رائج بعض امور کو برقرار رکھا مثلاً باہمی عہد و پیماں کی پاسداری اور حقوق کی حفاظت وغیرہ۔

میراث، قصاص ودیت کے سابقہ رواج ختم کر کے اسلامی حدود وقیود کو روشناس کرایا۔

النہایہ میں ''**لا حلف في الاسلام**'' وضاحت یوں کی ہے کہ ''**خلف**'' کا اصل معنی ہے معاقدہ، معاصدہ باہمی عہد و پیاں باہمی مددونصرت اور اتفاق چنانچہ زمانہ جاہلیت والے فتنوں، قتال اور لوٹ مار سے متعلقہ باہمی مدد ونصرت کے عہد و پیماں سے روکتے ہوئے فرمایا: **لاخلف في الاسلام** : اور زمانۂ جاہلیت کے جن عہد و پیمان میں لوگ آپس میں اس بات کا عہد کرتے تھے کہ وہ مظلوم کی مدد کریں گے، قرابتداروں سے حسن سلوک کریں گے تو ان کاموں اور ان سے ملتے جلتے کاموں کو ''**وایما حلق کان في من حلف الجاهلية فان الاسلام لا يزيد الا شدة**'' کے ذریعے اسلام میں برقرار رکھا۔

المؤمنون يد على من سواهم:

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ جملہ پہلے مفہوم کی تائید کرتا ہے۔ چونکہ یہ جملہ مخصوص حلف کی نفی کا بیان ہے۔ اسلامی اخوت تمام مسلمانوں کو ایک مضبوط لڑی میں پروتی ہے ایک ہاتھ کی طرح کرتی ہے (یعنی یک جان دو قالب) ایک دوسرے کو ذلیل ورسوا بے یارو مددگار کرنے سے روکتی ہے۔ بلکہ ہر شخص پر اپنے مسلمان بھائی کی مدد واجب کرتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ [الحجرات: ١٠] ''مسلمان تو سب بھائی ہیں''۔

يجير عليهم ادناهم: یہ جملہ بھی ماقبل کے لئے بمنزلہ بیان ہے۔ اس وجہ سے عاطف بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تمام مسلمان ایک ہاتھ کے حکم میں ہیں تو سارے مسلمان برابر ہیں۔ ادنیٰ مسلمان بھی اعلیٰ مسلمان کی طرح جسے چاہے امان دے سکتا ہے۔ **قوله: ويرد عليهم اقصاهم ويرد سرا يا هم على قعيد تهم:**

یہ جملہ بھی بیانیہ ہے چنانچہ بغیر واؤ کے ہے۔

اگر یہ جملہ واؤ کے ساتھ مروی ہے جیسا کہ مصابیح کے بعض نسخوں میں ہے، اس صورت میں برعکس ہوگا، کیونکہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے۔

امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **القعيدة** سے مراد لشکر ہیں جو دار الحرب میں پہنچ کر پڑاؤ ڈالتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے فوجی دستے دشمن کی طرف روانہ کرتے ہیں اور پھر غنیمت کے مال میں سے ان قاعدین کو بھی ان کا حصہ دیتے ہیں کیونکہ وہ اُن کے پشت پناہ تھے۔

قوله: لا يقتل مومن بكافر:

اس جملہ سے ائمہ ثلاث نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر ڈالے تو مسلمان کو قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا۔حنیفہ کے نزدیک کسی ذمی کو قتل کرنا دنیاوی احکام کے اعتبار سے ایسا ہی ہے جیسے کسی مسلمان کو قتل کرنا لہٰذا جس طرح مسلمان کو قتل کرنے سے قصاص لازم آتا ہے اسی طرح ذمی کو قتل کرنے سے بھی قصاص لازم آئے گا۔

قوله:دية الكافر نصف دية المسلم:

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کافر کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔البتہ امام احمد رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بشرطیکہ قتل خطا ہو،اگر قتل عمد تھا تو قصاص نہیں لیا جائے گا اور بارہ ہزار کا اضافہ کیا جائے گا۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب فرماتے ہیں:کافر اور مسلمان کی دیت برابر ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:کافر کی دیت،مسلمان کی دیت کا ایک تہائی ہے۔

شافعیہ کے دلائل پہلی دلیل:

حضرت عمرؓ سے مروی ہے:**انه قال دية اليهودی والنصرانی أربعة آلاف، ودية المجوسی ثمانمائة درهم۔**

''فرمایا:یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم،اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔''

دوسری دلیل:شمنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل مصنف عبدالرزاق،کتاب العقول میں ابن جریج عن عمرو بن شعیب کی یہ روایت ہے:**أن رسول الله ﷺ فرض على كل مسلم قتل رجلا من أهل الكتاب أربعة آلاف درهم۔**

''رسول ﷺ نے مسلمان اہل کتاب میں سے کسی شخص کو قتل کرنے والے ہر مسلم پر چار ہزار درہم لازم قرار دیئے۔''

تیسری دلیل:امام شافعی رحمہ اللہ اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:**عن فضيل بن عياض،عن منصور، عن ثابت، عن سعيد بن المسيّب، عن عمر بن الخطابؓ:أنه قضى فی اليهودی والنصرانی أربعة آلاف درهم، وفی المجوسی ثمانمائة درهم۔** کہ حضرت عمر بن خطاب نے فیصلہ فرمایا کہ یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہے اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔

چوتھی دلیل: اسی مسند میں ایک روایت یہ ذکر کی ہے:**عن ابن عيينه عن صدقة بن يسار عن سعيد بن المسيّب قال:قضى عثمان فی دية اليهودی والنصرانی بأربعة آلاف درهم۔**

فرمایا:حضرت عثمانؓ نے یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہے۔کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ ان کی......۔

حنیفہ کے دلائل:

پہلی دلیل ابوداؤد کی مراسیل میں سعید بن المسیّب کی روایت ہے:**قال:قال رسول الله ﷺ:دية كل ذی عهد فی عهده ألف دينار۔**رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:ہر معاہد کی دیت ایک ہزار دینار ہے۔اس روایت کو امام شافعی رحمہ اللہ نے

اپنی سند میں سعید پر موقوف قرار دیا ہے۔

دوسری دلیل:

ترمذی کی یہ روایت ہے: **عن أبی سعید البقال، عن عکرمة، عن ابن عباس: أن النبی ﷺ ودی العامریین بدیة المسلمین، وکان لهما عهد من رسول الله ﷺ۔**

اس روایت پر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کلام کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

حدیث غریب لا نعرفه الا من هذا الوجه۔

ابوسعید البقال کا نام سعید بن المرزبان ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ''عللِ کبیر'' میں فرماتے ہیں: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ''مقارب الحدیث'' کہا ہے۔ **قال البخاری: مقارب الحدیث**

تیسری دلیل:

ابوداؤد مراسیل میں سندِ صحیح کے ساتھ ربیعہ بن اَبی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں: **قال: کان عقل الذمی مثل عقل المسلم فی زمن رسول الله ﷺ، وزمن أبی بکر، وزمن عمر، وزمن عثمان رضوان الله تعالٰی علیهم أجمعین۔ حتی کان صدر من خلافة معاویة، فقال معاویة: ان کان أهله أصیبوا به فقد أصیب به بیت مال المسلمین، فاجعلوا البیت المال النصف، ولأهله النصف خمسمائة دینار وخمسمائة دینار۔ ثم قتل آخر من أهل الذمة فقال معاویه: لوأنا نظرنا الی هذا للذی یدخل بیت مال المسلمین فجلعه وضعا عن المسلمین، وعونالهم، قال: فمن هنالك وضع علیهم الی خمسمائة۔**

چوتھی دلیل:

مصنف عبدالرزاق میں عن ابن جریج، عن مجاہد، عن ابن مسعود مروی ہے: **دیة المعاهد مثل دیة المسلم:** ''معاہد کی دیت، مسلمان کی دیت کے مثل ہے''۔

پانچویں دلیل:

معمر عن الزهری، عن سالم، عن اَبیہ کی روایت میں یہ ہے: **أن رجلا قتل رجلا من أهل الذمة، فرفع الی عثمان فلم یقتله، وجعل علیه ألف دینار۔** ترجمہ: ''ایک آدمی نے کسی ذمی کو قتل کر ڈالا' یہ معاملہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جناب میں لایا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل نہیں کیا' بلکہ اس پر ایک ہزار دینار لازم فرمادیئے۔

چھٹی دلیل:

سنن دارقطنی میں حسین بن صفوان، عن عبداللہ بن اَحمد، عن رحمویہ، عن ابراہیم بن سعد، عن ابن شہاب مروی ہے: أن

أبابکر و عمر رضی اللّٰہ عنہما کان یجعلان دیة الیہودی والنصرانی المعاہدین دیة الحر المسلم۔ کہ حضرت ابوبکر وعمرؓ یہودی ونصرانی معاہد کی دیت آزاد مسلمان کی دیت کے مثل قرار دیتے تھے۔

ساتویں دلیل:

ابن أبی شیبہ نے علقمہ، مجاہد، عطاء، شعبی، نخعی اور زہری سے اس کے مثل روایت کی ہے۔

آٹھویں دلیل:

عبدالرزاق نے ابوحنیفہ عن الحاکم عن ابن عیینہ عن علی سے یہ روایت ذکر کی ہے: **قال: دیة کل ذمی مثل دیة المسلم**۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرا یہی قول ہے، نیز چونکہ آزاد، معصوم الدم ہے لہٰذا اس کی دیت کامل ہوگی۔

قولہ: لاجلب ولا جنب۔۔۔ فی دورھم: لا جلب ولا جنب:

دونوں میں جیم اور مابعد کے فتحہ کے ساتھ ہے اس جملہ کے دو طرح کے مطالب نکلتے ہیں۔ ایک مطلب کی مناسبت کتاب الزکوٰۃ سے ہے۔ چنانچہ وہ مطلب کتاب الزکوٰۃ میں بیان ہو چکا ہے۔ اور دوسرے مطلب کا تعلق گھوڑ دوڑ کے مسائل سے ہے سو وہ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

ولا یؤخذ: مذکر، مؤنث دونوں طرح ہے۔

دورھم: دال کے ضمہ اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ، ''دار'' کی جمع۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر واؤ کو ''جاء زید وذھب عمرو'' کی واؤ کی مانند قرار دیا جائے تو لا جلب ولاجنب'' کی تفسیر اسی کی جائے جو گھوڑ دوڑ مقابلہ کے مغامیر ہو چونکہ ''جلب'' اس صورت میں بمعنی صوت'' وزجر ہوگا تا کہ وہ اس کی بکریوں میں اضافہ کر لے اور ''الجلب'' یعنی ''جلب'' اس کے گھوڑے کے پہلو میں دوسرا گھوڑا اور اگر واؤ کو ''اعجبنی زید وکرمہ کی واؤ کی مانند قرار دیا جائے تو ضروری ہے کہ ان دونوں جملوں کو تفسیر ایسی کی جائے جو اس کے لئے مبین ہو۔ چنانچہ ''جلب'' یہ ہے کہ ''ساعی'' کسی جگہ پڑاؤ ڈالے اور ارباب مواشی کی طرف پیغام بھیجے کہ وہ اپنے جانور اس کے پاس لے آئیں تا کہ وہ ان کے صدقات وصول کر لیا اور ''جنب'' یہ ہے کہ ارباب مواشی اپنے مویشیوں کو اپنی جگہوں سے دور بھیج دیں حتی کہ مصدق کو زکوٰۃ کے جانور وصول کرنے میں مشقت کا سامنا کرنا پڑے اور اگر واؤ کو [النحل: ۱] کی واؤ کی مانند قرار دیں تو ''**ولا تأخذ صدقاتھم**'' یہ مبنین ہوگا اس قول ''**لاجلب ولا جنب**'' کے لئے کہ دو باتوں کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے اور ترتیب ذہن کے سپرد کی جا رہی ہے۔ واللہ اعلم:

قولہ: دیة المعاھد نصف دیة الحر:

المعاھد: ھاء کے کسرہ کے ساتھ ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں فتحہ کے ساتھ ہے اور مراد ''ذمی'' ہے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی کی دیت مسلمان کی نصف دیت ہے۔

مالکیہ کے دلائل:

پہلی دلیل: ان کی دلیل سنن اربعہ کی روایت ہے جو عن عمرو بن شعیب، عن أبیہ، عن جدہ کی روایت مروی ہے۔

ابوداؤد کی روایت جس کے الفاظ یہ ہیں: أن النبی ﷺ قال: **دیة المعاهد نصف دیة الحر**۔ نبی کریم نے فرمایا: معاہد کی دیت' آزاد آدمی کی دیت کا نصف ہے۔

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں: **دیة عقل الکافر نصف عقل المسلم۔ وقال حدیث حسن**۔ نسائی کے الفاظ یہ ہیں: **عقل أهل الذمة نصف عقل المسلمین وهم الیهود والنصارٰی**۔ اہل ذمہ کی دیت مسلمانوں کی دیت کا نصف ہے' اور اہل کتاب سے مراد یہود و نصاری ہیں۔

ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں: أن النبی ﷺ **قضٰی، أن عقل اهل الکتابین نصف عقل المسلمین وهم الیهود والنصارٰی**۔ رسول اللہ نے فرمایا: معاہدہ کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔

دوسری دلیل: طبرانی معجم اوسط میں نافع عن ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں: قال: **قال رسول اللہ ﷺ: ان دیة المعاهد نصف دیة المسلم**۔

''کتاب الرحمۃ'' میں فرماتے ہیں: آزاد مسلمان عورت کی دیت آزاد مسلمان مرد کی دیت کا نصف ہے۔ اس پر اجماع ہے۔

زخموں کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق نصف ہے۔ باقی ائمہ کے ہاں مساوی ہے۔

شمنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عورت کی دیت، مرد کی دیت سے نصف ہے، خواہ دیتِ اعضاء ہو یا دیت جانی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ظاہر مذہب، ابن المنذر کا مذہب مختار، ثوری لیث، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ اور ابن سیرین رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

پہلی دلیل:

بیہقی کی معاذ بن جبلؓ سے مروی یہ حدیث ہے: قال: **قال رسول اللہ ﷺ دیة المرأة علی النصف من دیة الرجل**۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔

دوسری دلیل:

ابراہیم عن علی ابن أبی طالب کی یہ حدیث ہے: **قال: عقل المرأة علی النصف من عقل الرجل فی النفس وفیما دونها**۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ثلث اور اس سے کم میں نصف نہیں کیا جائے گا۔

امام مالک رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ، فقہاء سبعہ، ابن المسیّب، عمر بن عبد العزیز، عروۃ ابن الزبیر، زہری، قتادہ، اعرج، ربیعہ، کا

یہی قول ہے۔ حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ اور زید بن ثابتؓ سے بھی یہی مروی ہے۔

پہلی دلیل:

سنن نسائی کی یہ روایت ہے: **عن عیسٰی بن یونس الرملی، عن ضمرة، عن اسماعیل بن عیاش، عن ابن جریج، عن عمرو بن شعیب، عن أبیه، عن جده أن رسول اللّٰه ﷺ قال: عقل المرأة مثل عقل الرجل حتی یبلغ العقل الثلث من دیتها۔**

دوسری دلیل:

بیہقی، شعبی عن زید بن ثابت روایت کرتے ہیں:

جراحات الرجال والنساء الٰی الثلث فما زاد علی النصف۔

تیسری دلیل:

ربیعہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے سعید ابن المسیّب سے عورت کی انگلی کی دیت کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا: دس۔ ربیعہ نے کہا: دو انگلیوں کی دیت کتنی ہے؟ انہوں نے فرمایا: بیس۔ ربیعہ نے پھر سوال کیا: تین انگلیوں کی دیت کتنی ہے؟ انہوں نے فرمایا: تیس۔ ربیعہ نے پھر سوال کیا: اچھا، تو چار انگلیوں کی کتنی دیت ہے؟ انہوں نے فرمایا: بیس۔ یہ سن کر ربیعہ نے کہا: **حین عظم جرحها واشتدت حصبتها: نقص عقلها۔**

ابن المسیّب رحمۃ اللہ فرمانے لگے: عراقی تو نہیں ہو؟ ربیعہ نے جواباً کہا: **عالم متثبت أو جاهل متعلم۔** ابن المسیّب رحمۃ اللہ نے ان کی یہ بات سن کر فرمایا: اے بھتیجے یہ سنت (سے ثابت) ہے۔

دلائل کے جوابات:

پہلی روایت کا جواب یہ ہے کہ: اسماعیل بن عیاش، حجازیین سے روایت کرنے میں ضعیف ہیں، اور ابن جریج حجازی ہیں۔

دوسری روایت کا جواب یہ ہے کہ یہ منقطع ہے۔

تیسری روایت کا جواب یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ آخر میں فرماتے ہیں: ہمارا یہ قول تھا، پھر میں نے اس سے رجوع کرلیا اور اللہ سے خیر کا سوال کرتا ہوں، اور ہم کسی ایسے شخص کو نہیں پاتے جو سنت کہتا ہو پھر یہ کہ نبی کریم ﷺ سے اس کا نفاذ بھی نہیں پاتے اور اس کے نافی سے قیاس اولیٰ ہے۔

قتل خطا کی دیت کا تفصیلی بیان

۳۴۹۷: وَعَنْ خِشْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ، قَضٰی رَسُول اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ

دِيَةِ الْخَطَأِ عِشْرِيْنَ بِنْتَ مَخَاضٍ، وَعِشْرِيْنَ ابْنَ مَخَاضٍ ذُكُوْرٍ، وَعِشْرِيْنَ بِنْتَ لَبُوْنٍ، وَعِشْرِيْنَ جِذْعَةً، وَعِشْرِيْنَ حِقَّةً (رواه ابوداود والترمذی والنسائی والصحیح انه مو قوف علی ابن مسعود وَخِشْفٌ مَجْهُوْلٌ لَا يُعْرَفُ اِلَّا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ وَرَوٰى فِي شَرْحِ السُّنَةِ) اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدّٰى قَتِيْلَ خَيْبَرَ بِمِائَةٍ مِنْ اِبِلِ الصَّدَقَةِ، وَلَيْسَ فِي أَسْنَانِ اِبِلِ الصَّدَقَةِ اِبْنُ مَخَاضٍ، اِنَّمَا فِيْهَا ابْنُ لَبُوْنٍ .

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٦٨٠/٤ الحديث رقم ٤٥٤٥ ـ والترمذی فی ٥/٤ الحديث رقم ١٣٨٦ ـ والنسائی فی ٤٣/٨ الحديث رقم ٤٨٠٢ ـ وابن ماجه فی ٨٧٩/٢ الحديث رقم ٢٦٣١ ـ

ترجمہ: ''اور حضرت خشف بن مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل خطا کی دیت بیس بنت مخاض (یعنی وہ اونٹنیاں جو دوسرے سال میں لگی ہوں) اور بیس ابن مخاض (یعنی ایسے اونٹ جو دوسرے سال میں لگے ہوں) اور بیس بنت لبون (یعنی ایسی اونٹنیاں جو تیسرے سال میں لگی ہوں) اور بیس جذعہ (یعنی ایسی اونٹنیاں جو چوتھے سال میں لگی ہوں) اور بیس حقہ (یعنی ایسی اونٹنیاں جو پانچویں سال میں لگی ہوں) مقرر فرمائی ہیں (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) اس حدیث کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے یعنی ان کا اپنا قول ہے اور (اس کے راوی) خشف ایک غیر معروف راوی ہیں جو صرف اس حدیث کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں (یعنی اس کے علاوہ اور کوئی روایت ان سے منقول نہیں ہے) بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنۃ میں یوں نقل کیا ہے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی دیت میں کہ جو خیبر میں قتل کر دیا گیا تھا (اور جس کا تفصیلی واقعہ باب القسامت میں بیان ہوگا) زکوٰۃ میں آئے ہوئے اونٹوں میں سے سو اونٹ (بطور دیت) ادا کئے تھے اور زکوٰۃ کے ان اونٹوں میں کوئی اونٹ ابن مخاض (یعنی ایک سال کا) نہیں تھا بلکہ بنت لبون (یعنی دو سال کے) تھے''۔

راویٔ حدیث:

خشف بن مالک۔ یہ خشف بن مالک قبیلہ ''طے'' میں سے ہیں۔ اپنے والد اور چچا اور عمرو بن مسعود سے روایت کرتے ہیں اور ان سے زید بن جبیر نے روایت کی۔ معتمد راوی ہیں۔ تقریب میں ہے کہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ ''خشف'' خاء کے کسرہ شین معجمہ کے سکون اور فائے معجمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: قضى رسول اللهؐ ۔۔۔ عشرين حقة:

بنت مخاض امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہاں دو احتمال ہیں:

① اس سے مراد جنس ہو۔ اس صورت میں نر اور مادہ دونوں کو شامل ہوگا

② اس سے مراد مادہ ہو۔ حدیث میں اگلے معطوف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مراد ہے۔

و عشرون ابن مخاض ذكور: جر جوار کی بنا پر مجرور ہے جیسا کہ اس مثل ''حجر ضب خرب'' میں ہے۔

ترمذی، ابوداؤد، شرح السنہ اور مصابیح کے بعض نسخوں کے مطابق ضبط اسی طرح ہے۔ مصابیح کے بعض نسخوں میں ''ذکورا'' نصب کے ساتھ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے ''ذکور'' سے ماقبل کی تاکید مقصود ہے

''جزعة'' جیم اور ذال کے فتح کے ساتھ ''و عشرین حقة'' حا کے کسرہ کے ساتھ۔

قتل خطا کی دیت کے اونٹوں کی تفصیل:

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: قتل خطأ کی دیت میں پانچ طرح کے اونٹ دیئے جائیں گے، اکثر اہل علم کا یہ کہنا ہے۔ لیکن ان کی تقسیم میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ۲۰ بنت مخاض، ۲۰ بنت لبون، ۲۰ ابن لبون، ۲۰ حقہ، ۲۰ جذعہ ہوں گے۔ لیث رحمۃ اللہ علیہ، مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بعض لوگ ۲۰ ابن مخاض کی بجائے ۲۰ ابن لبون کے قائل ہیں۔ خشف بن مالک کی روایت ان کی دلیل ہے۔ شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ان حضرات کی دلیل کتب ستہ میں مروی سہیل بن ابی حیثمہ کی حدیث ہے کہ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ دیت دینا مذکور ہے اور بنو مخاض کا صدقات میں کیا دخل ہے۔

حنفیہ کی دلیل: سنن اربعہ کی یہ حدیث ہے: **عن حجاج، بن ارطاة عن زید بن جبیر، عن خشف بن مالك الطائی، عن عبداللّٰه بن مسعود قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: فی دية الخطأ عشرون حقة، وعشرون جذعة، وعشرون بنت مخاض، وعشرون بنت لبون، وعشرون بنی مخاض ذكر۔**

قوله: والصحيح انه سوقوف۔۔۔لايعرف الا يهذ الحديث:

قوله: وروی فی شرح السنة...... :

وروی: مجہول کا صیغہ ہے اور بعض نسخوں میں بصیغۂ معروف مروی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: **روی صاحب المصابيح**۔

ودی: دال کی تخفیف کے ساتھ ہے

ليس: ایک نسخہ میں ''**وليس**'' ہے۔

ليس فی أسنان ابل الصدقه مخاض: جملہ حالیہ ہے۔

صاحب المصابیح کا یہ جملہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کے حدیث سابق پر اعتراض سے ملتا جلتا ہے کہ روایت میں ''**ابن مخاض**'' کا ثبوت محل نظر ہے۔

میں کہتا ہوں اس مسئلہ کی بنیاد شہاب، نے سلیمان بن یسار اس روایت پر ہے جو کی روایت ہے۔ حالانکہ دوسری طرف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''ابن مخاض'' کا ذکر ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

مؤطا امام محمد، ''**باب دية الخطا**'' میں یوں ہی مذکور ہے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ شخص کو جو دیت دی تھی اس کے بارے میں ~~اصحاب~~ فرماتے ہیں کہ وہ

بطور وجوب یا بطور حکم نہیں تھی بلکہ محض از راہِ تبرع عطا کی تھی۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: ''ہمارے جمہور اصحاب اور دیگر اہل علم اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اونٹ اہل صدقات سے خرید کر اپنی ملکیت میں لینے کے بعد قتیل کے اولیاء کو بطور تبرع عطا کئے تھے۔'' اھ۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس روایت سے مذکورہ بالا مسئلہ میں استدلال درست نہیں چونکہ ان لوگوں نے اہل خیبر پر قتل عمد کا دعویٰ کیا تھا۔لہٰذا یہ دیت قتل عمد کی تھی۔

خشف کو امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ثقہ قرار دیا ہے۔ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔زید بن جبیر یہ ''جسمی'' ہیں۔ ابن معین وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔نیز شیخین نے صحیحین میں ان سے روایات لی ہیں۔

دیت کا اصل معیار

۳۴۹۸:وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ : كَانَتْ قِيْمَةُ الدِّيَةِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَمَانَ مِائَةِ دِيْنَارٍ اَوْ ثَمَانِيَةَ الآفِ دِرْهَمٍ وَدِيَةُ اَهْلِ الْكِتَابِ يَوْمَئِذٍ نِصْفٌ مِنْ دِيَةِ الْمُسْلِمِيْنَ قَالَ :فَكَانَ كَذٰلِكَ حَتّٰى اُسْتُخْلِفَ عُمَرُ فَقَامَ خَطِيْبًا فَقَالَ. اِنَّ الْاِبِلَ قَدْ غَلَتْ قَالَ :فَفَرَضَهَا عُمَرُ عَلٰى اَهْلِ الذَّهَبِ اَلْفَ دِيْنَارٍ، وَعَلٰى اَهْلِ الْوَرِقِ اِثْنَىْ عَشَرَ اَلْفًا، وَعَلٰى اَهْلِ الْبَقَرِ مِائَتَىْ بَقَرَةٍ، وَعَلٰى اَهْلِ الشَّاءِ اَلْفَىْ شَاةٍ، وَعَلٰى اَهْلِ الْحُلَلِ مِائَتَىْ حُلَّةٍ قَالَ :وَتَرَكَ دِيَةَ اَهْلِ الذِّمَّةِ لَمْ يَرْفَعْهَا فِيْمَا رَفَعَ مِنَ الدِّيَةِ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٦٧٩/٤ الحديث رقم ٤٥٤٢۔

ترجمہ:''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں دیت (دیت کے سو اونٹوں) کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی' نیز اس زمانہ میں اہل کتاب (یعنی عیسائی اور یہودی) کی دیت مسلمانوں کی دیت کا نصف تھی۔ان کے دادا کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ مقرر ہونے تک اسی کے مطابق عمل درآمد ہوتا رہا۔چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ (خلیفہ ہونے کے بعد) خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ''اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے''۔راوی کا بیان ہے کہ (اس کے بعد) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو دیت مقرر کی تھی اس کی تفصیل یہ ہے' سونا رکھنے والوں پر ایک ہزار دینار' چاندی رکھنے والوں پر بارہ ہزار درہم' گائے کے مالکوں پر دو سو گائیں' بکری کے مالکوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے کے جوڑوں (کی تجارت کرنے) والوں پر دو سو جوڑے۔راوی نے کہا کہ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کی دیت چھوڑ دی یعنی جوں کی توں قائم رکھی تھی (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ذمیوں کی دیت چار ہزار درہم تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کو برقرار رکھا) جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیت

میں اضافہ کیا تو (ذمی کی دیت) میں اضافہ نہ کیا۔اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جیسا کہ اور دیتوں میں اضافہ کیا تھا''۔

(ابوداؤد)

دیت میں اصل کیا ہے؟

تشریح: بعض حضرات اس (حدیث) سے اس مسئلہ پر استدلال کرتے ہیں کہ دیت میں اصل، اونٹ ہیں۔البتہ وہ مختلف قیمتوں کے ہوں گے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب جدید بھی یہی ہے۔

النصف: خبر ''کان'' ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ایک نسخہ میں مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

من دية المسلمين: من تبعیضیہ ہے، النصف کے متعلق ہے۔

فقال خطيب: شمنی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں قال کی بجائے: ''فقام'' ہے

غلت: ایک روایت میں ''قد غلت'' ہے۔ **غلت:** غلاء سے مأخوذ ہے۔غلاء کہتے ہیں ارتفاعِ ثمن کو، یعنی قیمت کا زیادہ ہونا، مہنگا ہونا۔

الورق: راء کے سکون اور کسرہ کے ساتھ۔

(الشاء): (آخر میں ہمزہ ہے) اسم جنس ہے۔

الحلل: حاء کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حلہ سے مراد ''ازار'' اور ''رداء'' ہے۔خواہ کپڑا جس نوع کا ہو۔بعض حضرات فرماتے ہیں: اس سے مراد یمنی چادروں کے حلّے ہیں۔دو کپڑوں سے کم کے لباس پر حلّہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان کی دیت بارہ ہزار درہم مقرر ہوئی اور ذمی کی دیت وہی رہی جو پہلے تھی، یعنی چار ہزار درہم، تو اس اعتبار سے ایک ذمی کی دیت، ایک مسلمان کی دیت کا ثلث (تہائی) ہوئی۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سونے کی دیت ایک ہزار دینار، چاندی کی دیت دس ہزار درہم اور اونٹ کی دیت میں سو اونٹ ہیں لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں چاندی کی دیت بارہ ہزار درہم ہیں۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ، اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ان حضرات کی دلیل اصحابِ سنن اربعہ کی روایت ہے:

عن ابن عباس: أن رجلا من بنی عدی قتل فجعل النبی ﷺ دیته اثنی عشر ألفا۔ ''بنی عدی کا ایک شخص قتل ہو گیا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار قرار دی''۔

حنفیہ کی دلیل، بیہقی کی روایت جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے مروی ہے، **قال: قال محمد بن الحسن: بلغنا عن عمر أنه فرض علی أهل الذهب فی الدية ألف دينار، ومن الورق عشرة آلاف درهم، حدثنا بذلك ابو حنيفه، عن الهيثم، عن الشعبی، عن عمر قال: فقال أهل المدينة: فرض عمر علی أهل الورق اثنی عشر ألف درهم، قال محمد بن الحسن: صدقوا، ولكنه فرضها اثنی عشر ألفا وزن ستة، وذلك عشرة آلاف، كذافی نسخة،**

وفی ایک دوسری روایت میں ہے: **قال محمد بن الحسن: أخبرنی الثوری، عن مغیرة الضبی، عن ابراهیم قال: كانت الدية الابل فجعلت الابل كل بعير بمائة وعشرين درهما وزن ستة، فذلك عشرة آلاف درهم۔**

"التجرید للقدوی" میں مذکور ہے کہ دیت ہزار دینار ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں اور ہر دینار دس درہم کے برابر ہے۔اسی وجہ سے سونے کا نصاب ۲۰ دینار اور چاندی کا نصاب ۲۰۰ درہم ہے۔

دیت میں اصل کیا ہے؟ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ (ایک روایت میں) اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صرف اونٹ اصل ہیں۔لہٰذا اونٹوں کی قیمت واجب ہوگی خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ان حضرات پہلی دلیل: ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کی عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ **ان النبی ﷺ قال: ألا ان دية الخطأ شبه العمد ما كان بالسوط والعصا مائة من الابل منها أربعون فی بطونها أولادها۔** (ابن القطان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

دوسری دلیل: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبہ عمد اور قتل خطا کی دیت میں فرق فرمایا ہے۔بعض کی دیت مغلظہ اور بعض کی مخففہ مقرر فرمائی۔تغلیظ وتخفیف کا مفہوم اونٹوں میں ہی متحقق ہوسکتا ہے۔کسی اور چیز میں نہیں۔

تیسری دلیل:

دیت میں اونٹوں کا مقرر ہونا مجمع علیہ ہے اور دوسری اشیاء میں اختلاف ہے۔لہٰذا شی متیقن کو اختیار کیا جائے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: دیت میں اونٹ، سونا، چاندی سب اصل ہیں۔امام احمد اور امام شافعی کا قول (جدید) بھی یہی ہے۔مالکیہ کا قول کے مقتضی یہ ہے کہ قاتل اگر "اہل بوادی والعمود" میں سے ہو تو سو اونٹ ہوں گے، اور اگر اہل ذہب میں سے ہے (جیسا کہ شام، مصر، اور مغرب والے) تو ہزار دینار ہوں گے اور اگر اہل فضہ میں سے ہو (جیسا کہ خراسان، عراق، فارس والے) تو ۱۲ ہزار درہم ہوں گے۔

امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ (ایک روایت میں) فرماتے ہیں: کہ دیت میں اصل اونٹ، سونا، چاندی، دوسو گائے، اور ایک ہزار بکریاں، اور سو حلّے ہیں اس حدیث کی بنیاد پر۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے مروی بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جو ابھی گزری ہے۔

ثمرہ اختلاف، قاتل کے اختیار کی صورت میں ظاہر ہوگا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر قاتل کو تین اختیارات ہوں گے۔صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر چھ اختیارات ہوں گے۔نیز اس کا ثمرہ اختلاف صلح کے موقع پر ظاہر ہوگا، کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں صلح عن الدیۃ میں دوسو گائے سے زیادہ لینا درست نہ ہوگا۔امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے موافق ہے کہ یہ صلح ایسی ہے جیسا کہ سو اونٹ یا ہزار دینار سے زیادہ پر صلح ہوئی ہو۔

قوله: رواه ـ ـ ابن مسعود:

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر حدیث کو موقوف تسلیم کر بھی لیا جائے تو تب بھی کوئی نقصان لازم نہیں آتا کیونکہ اس جیسی موقوف روایت دو وجہ سے حکماً مرفوع ہوتی ہے۔

پہلی وجہ: **ان التقادیر لا تعرف من قبل الرأی۔**

دوسری وجہ: علم اصولِ حدیث کا یہ قاعدہ ہے: **اذا کان الحدیث مرفوعا وموقوفا یعتبر المرفوع۔**

حدیث جو مرفوع وموقوف (دونوں طرح) ہو تو اس کا مرفوع ہونا معتبر ہوگا۔

قولہ: وخشف مجھول لا یعرف الا بھذا الحدیث: راوی کے مجہول ہونے کا جواب یہ ہے کہ پیچھے خشف عبداللہ بن مسعود، عمر اور عن ابیہ کی روایت گزری ہیں۔ لہٰذا یہ راوی معروف ہوئے۔ چونکہ معروف کا اقل درجہ یہ ہے کہ وہ دو سے روایت کرے۔

امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مصابیح کے مؤلف پر تعجب ہے کہ انہوں نے اس کے موقوف ہونے کی تصحیح کی ہے۔ مستزاد براں یہ کہ راوی میں طعن کر رہے ہیں۔ خشف کو مجہول کہنے والے یہ پہلے شخص نہیں بلکہ یہ بات اس حدیث کی مخالفت کرنے والوں نے پہلے بھی کی ہے۔ گمان یہ ہے کہ یہ بات خطابی نے نقل کی ہے۔ انہیں یہ بات کہنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ حالانکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں: **خشف بن مالك سمع عمروابن مسعود۔** ''خشف بن مالک نے حضرت عمر اور ابن مسعود سے سماع کیا ہے''۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرنا موجب طعن نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انہوں نے ابوداؤد اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کی ہے۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **وھو قول عبداللّٰہ** ''یہ عبداللہ کا قول ہے'' اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **حدیث ابن مسعود لا نعرفہ مرفوعا الا من ھذا الوجہ۔ وقدروی عن عبداللّٰہ موقوفا۔**

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: **خشف بن مالك مجھول لا یعرف الا بھذا الحدیث، وقولہ: عن البخاری أن خشفا سمع عمروابن مسعود لا یجعلہ من المشھورین۔**

یہ بات تو بجا ہے کہ مشاہیر میں سے جو نہیں ہو جائیں گے۔ البتہ مجاہیل میں سے نکل جائیں گے۔ فرمایا اس طعن میں اصل غرض اپنے مذہب کی تائید ہے۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وجہِ طعن بالکل ظاہر ہے۔ چونکہ کسی حدیث کو صحیح کہنے کے بعد، خواہ وہ مرفوع ہو، خواہ موقوف ہو۔ راوی میں طعن کرنے کا کوئی مطلب نہیں بنتا اور شاید کہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ اس میں امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ پر سبقت لے گئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دیت کی مقدار کا بیان

۳۴۹۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنَّهٗ جَعَلَ الدِّيَةَ اِثْنَي عَشَرَ اَلْفًا۔

(رواہ الترمذی وابوداود والنسائی والدارمی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٦٨١/٤ الحديث رقم ٤٥٤٦، والترمذی فی ٦/٤ الحديث رقم ١٣٨٨۔ والنسائی فی ٤٤/٨ الحديث رقم ٤٨٠٣۔ وابن ماجه ٨٧٩/٢ الحديث رقم ٢٦٣٢۔ والدارمی ٢٥٢/٢ الحديث رقم ٢٣٦٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار درہم کی دیت مقرر فرمائی''۔ (ترمذی ابوداؤد نسائی دارمی)

دیت کا حقدار کون ہے؟

۳۵۰۰ : وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ : كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يُقَوِّمُ دِيَةَ الْخَطَاءِ عَلٰى اَهْلِ الْقُرٰى اَرْبَعَ مِائَةِ دِيْنَارٍ اَوْعِدْلَهَا مِنَ الْوَرِقِ وَيقوِّمُهَا عَلٰى اَثْمَانِ الْاِبِلِ فَاِذَا غَلَتْ رَفَعَ فِيْ قِيْمَتِهَا وَاِذَا هَاجَتْ رُخْصٌ نَقَصَ مِنْ قِيْمَتِهَا وَبَلَغَتْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مَا بَيْنَ اَرْبَعَ مِائَةِ دِيْنَارٍ اِلٰى ثَمَانِ مِائَةِ دِيْنَارٍ' وَعِدْ لُهَا مِنَ الْوَرِقِ ثَمَانِيَةُ الاٰفِ دِرْهَمٍ قَالَ : وَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم عَلٰى اَهْلِ الْبَقَرِ مِائَتَىْ بَقَرَةٍ وَعَلٰى اَهْلِ الشَّاءِ اَلْفَىْ شَاةٍ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم :اِنَّ الْعَقْلَ مِيْرَاثٌ بَيْنَ وَرَثَةِ الْقَتِيْلِ' وَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اِنَّ عَقْلَ الْمَرْاَةِ بَيْنَ عَصَبَتِهَا' وَلَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا ۔

(رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٦٩١/٤ الحديث رقم ٤٥٦٤۔ والنسائی فی ٤٢/٨ الحديث رقم ٤٨٠١ وابن ماجه ٤٧٨/٢ الحديث رقم ٢٦٣٠ واحمد فی المسند ٢٢٤/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستیوں والوں پر قتل خطاء کی دیت چار سو دینار یا اس کے مساوی قیمت (یعنی چاندی کے چار ہزار درہم) مقرر فرمایا کرتے تھے اور اس میں اونٹوں کی قیمت کا لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ جب اونٹوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیت کی قیمت میں بھی اضافہ فرماتے تھے اور جب اونٹوں کی قیمت میں کمی واقع ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیت کی قیمت بھی کم فرماتے دیتے تھے' یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیت کی قیمت چار سو دینار سے آٹھ سو دینار یا اس کی مساوی قیمت (چاندی کے آٹھ ہزار درہم) تک رہی۔ راوی کہتے ہیں کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکری والوں پر دو ہزار بکریاں (بطور دیت) مقرر فرمائی تھیں۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دیت کا مال مقتول کے ورثاء کی میراث ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عورت کی (جنایت کے سبب واجب ہونے والی) دیت اس کے عصبات پر ہے اور قاتل (نے اگر اپنے مورث ہی کو قتل کیا ہے تو وہ) مورث کی وراثت سے محروم رہے گا (نہ اسے مقتول کی دیت میں سے کوئی حصہ ملے گا اور نہ وہ اس کے ترکے میں سے کسی چیز کا حقدار ہوگا)''۔ (ابوداؤد نسائی)

تشریح: يقوم: واؤ مکسورہ کی تشدید کے ساتھ۔
القرى: "قرية" کی جمع ہے۔

لفظ عدل کی تحقیق

عدل: عین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ، بعض حضرات فرماتے ہیں: **عدل**: عین کے فتحہ کے ساتھ کسی شی کا قیمت میں مثل، کے معنی میں ہے اور کسرہ کے ساتھ "صورتِ مثل" کے معنی میں ہے۔ امام فراء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فتحہ کے ساتھ کسی غیر جنس کے مثل کو کہتے ہیں اور کسرہ کے ساتھ ہم جنس مثل کو کہتے ہیں۔

عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس روایت میں اکثر سے فتحہ مروی ہے۔ اس صورت میں مطلب ہوگا: **مثلها في القيمة**۔

الورق: راء کے کسرہ اور سکون کے ساتھ، بمعنی "**الفضّة**" ہے۔
ويقومها: اس کا عطف ماقبل "**يقومها**" پر ہے۔ "**هاء**" ضمیر کا مرجع "**دية الخطا**" ہے۔
أثمان: ثمن کی جمع ہے۔
فاذا غلت: کا فاعل "ابل" ہے۔
عدلها: عین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ، مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یہاں تقدیری عبارت یوں ہے: **مثلها كائن من......** ۔
عدلها: مبتدا کی خبر ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دیت میں اصل اونٹ ہیں۔ اونٹ ناپید یا کمیاب ہونے کی صورت میں اس کی قیمت واجب ہوگی خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ قولِ جدید کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔ دراہم و دنانیر میں تقویم و تعدیل کا تعلق اس زمانہ کے ساتھ تھا، مطلق نہیں ہے۔

وعلى أهل الشاء ألفي شاة: یہ جملہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کا مؤید ہے۔ **قوله عقل المرأة بين عصبتها**: اس جملہ کے دو مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

① امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**المرأة**" سے مراد "**قاتلة**" ہے۔ اگر کوئی عورت جنایت کی مرتکب ہوئی تو اس کی دیت اس کے عصبات پر ہوگی، جیسا کہ مرد کے بارے میں حکم ہے۔ گویا یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس بارے میں عورت غلام کے مانند نہیں ہوگی کہ جس طرح غلام کی دیت خود اس پر واجب ہوتی ہے، اس کے عصبات پر واجب نہیں ہوتی۔

② دوسرا مطلب: اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں کہ مقتولہ کی دیت اس کے عام متروکہ کی طرح ترکہ ہے اور یہ مفہوم حدیث کے اگلے جملہ کے مفہوم کے مناسب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمومی فرمان: "**أن عقل المرأة بين عصبتها**" میں قاتل بھی شامل تھا، "**لا يرث العاقل**" کے ذریعے تخصیص کر کے قاتل کو خارج کر دیا۔ اس

مفہوم کی تائید سابقہ حدیث سے بھی ہوتی ہے: ان العقل میراث بین ورثة القتیل ''لہٰذا'' المرأة'' سے مراد مقتولہ ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ مفہوم اس وقت درست ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان: ''قال رسول اللہ ﷺ: ان العقل میراث بین ورثة القتیل'' اور: أن عقل المرأة بین عصبتها ولا یرث القاتل شیئا کو دو مستقل علیحدہ علیحدہ حدیثیں مان لیا جائے' اس صورت میں ایک حدیث دوسری حدیث کے لئے مبین ہوگی اور اگر یہ ایک ہی حدیث ہو، عن عمرو شعیب جیسا کہ مشکوٰۃ کے متن میں ہے تو اس صورت میں (یہ مفہوم صحیح) نہیں تا کہ تکرار لازم نہ آئے اور ''لا یرث القاتل'' کا تعلق ''ان العقل میراث'' کے ساتھ ہوگا۔ دوسرے جملہ کے ساتھ نہیں ہوگا اور مزید یہ ہے کہ قتیل کی میراث، عصبہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ عصبہ ''دیت'' کے ساتھ مختص ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم اھ۔

بعض کا کہنا ہے لفظ عصبہ پہلی صورت کو ترجیح دیتا ہے۔ ماقبل میں گزرا کہ ''دیت'' تو بطور میراث ورثہ کے لئے ہوگی بطور، اور جو چیز ان پر واجب تھی اس کا بیان ''علی'' کے ذریعہ کیا گیا۔ اور اولیٰ یہ ہے کہ عموم پر محمول کیا جائے، تا کہ دونوں معنی کو شامل ہو۔ أی: أن عقل المرأة قاتلة بین عصبتها ومقتولة بین ورثتها، وما کان میراثا فهو للورثة فقط، وما کان غیره فهو علی العصبة فقط۔

قتل عمد اور قتل شبہ عمد کی دیت کا بیان

۳۵۰۱: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ، اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: عَقْلُ شِبْهِ الْعَمَدِ مُغَلَّظٌ مِثْلُ عَقْلِ الْعَمَدِ، وَلَا يُقْتَلُ صَا حِبُهُ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤/٦٩٤ الحديث رقم ٤٥٦٥۔ واحمد في المسند ٢/٢٢٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قتل شبہ عمد کی دیت قتل عمد کی طرح سخت ہے لیکن قتل شبہ عمد کے مرتکب کو قتل نہ کیا جائے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: بمقل العمد منغط مثل عقل العمد: قتل عمد سے متعلقہ بحث، فصل اول کی پہلی حدیث کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

قوله: ولا یقتل صاحبه:

مراد قتل شبہ عمد کا مرتکب قاتل ہے۔ ''قاتل'' کو ''صاحبه'' سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قتل تو بہر حال اسی سے صادر ہوا ہے۔ البتہ یہ بات اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمائی گئی ہے کہ حدیث کے پہلے جملے کے مطابق قتل شبہ عمد کا مرتکب، قتل عمد محض کے مرتکب کے مشابہ ہو۔ لہٰذا اس شبہ کو دور کر دیا گیا کہ اس مشابہت کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اس کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ (ذکرہ ابن الملک)

زخمی آنکھ کی دیت کا بیان:

۳۵۰۲: وَعَنْهُ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعَيْنِ الْقَائِمَةِ السَّادَةِ لِمَكَانِهَا بِثُلُثِ الدِّيَةِ. (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه ابوداوٗد فی ٦٩٥/٤ الحديث رقم ٤٥٦٧ـ والنسائی فی ٥٥/٨ الحديث رقم ٤٨٤٠ـ

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی آنکھ کی دیت جو (زخمی ہونے کے بعد) اپنی جگہ باقی رہے (لیکن روشنی سے محروم ہو جائے) (پوری دیت کا) ثلث (تہائی) مقرر فرمائی ہے''۔ (ابوداؤد،نسائی)

تشریح: **السادة**: دال مہملہ کی تشدید کے ساتھ، ابن الملک فرماتے ہیں: **العين القاعة السادة اى الباقية فی مكانها صعيغه لكن ذهب نظرها وابصارها**

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ آنکھ ہے جو حلقہ چشم سے باہر نہیں نکلی، اور اس کی جگہ خالی بھی نہیں ہوئی اور دیکھنے والوں کی نگاہ میں اس کے چہرے کی موزونیت اور جمال میں کوئی خلل نہ پڑا ہو۔ فرماتے ہیں: اگر یہ حدیث صحیح ہو تو ''حکومت'' پر محمول ہے۔ (یعنی آنحضرت ﷺ نے یہاں تہائی دیت کا جو حکم فرمایا ہے وہ بطریق ''حکومت'' ہے نہ کہ بطریق قاعدہ کلیہ کیونکہ پہلے گذر چکا ہے کہ دونوں آنکھوں کی دیت، دیت کاملہ یعنی سو اونٹ ہیں اور ایک آنکھ کی دیت نصف دیت یعنی پچاس اونٹ ہے۔ لہٰذا یہاں ثلث دیت کا حکم بطور کلیہ کے نہیں ہو سکتا۔ از)۔ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ بالا صورت میں زخم خوردہ آنکھ کی تہائی دیت کے قائل ہیں اور بعض علماء اس صورت میں ''حکومتِ عدل'' کے وجوب کے قائل ہیں۔ چونکہ زخم کی مذکورہ بالا کیفیت میں منفعت بالکلیہ زائل نہیں ہوتی، لہٰذا اس کی دیت بھی اس شخص کی دیت کے مانند ہونی چاہیے کہ جس کے دانت پر ضرب لگی اور دانت سیاہ ہو گیا ہو اور حدیث کو ''حکومت'' پر محمول کیا ہے۔

الطیبی میں لکھا ہے کہ یہ فیصلہ بطور ''حکومت'' تھا۔ وگرنہ تو زخم کی مذکورہ بالا صورت میں دونوں آنکھوں کی بینائی چلے جانے پر مکمل دیت لازم آتی ہے اور ایک آنکھ کی بینائی زائل کرنے میں فقہاء کے نزدیک نصف دیت لازم آتی ہے۔

''حکومت'' کا مطلب:

شرح السنۃ میں ''حکومت'' کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ فرض کریں جو شخص زخمی ہوا ہے۔ اگر وہ غلام ہوتا تو اس زخم کی وجہ سے اس کی قیمت میں سے کسی قدر کمی واقع ہو جاتی، پس اسی قدر اس شخص کی دیت زخمی کرنے والے پر واجب ہوگی اور ہر عضو کی حکومت اس میں مقررہ مقدار کو نہیں پہنچے گی۔ حتی کہ اگر کسی نے اس کا سر زخمی کر دیا، لیکن ''موضحہ'' سے کم درجہ کا تھا، تو اس کی حکومت، موضحہ کی ''دیت'' کو نہیں پہنچے گی، اگرچہ وہ زخم انتہائی قبیح ہو جائے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حکومت عدل کا مطلب یہ ہے کہ ''مجنی علیہ عبد'' کی اس نشان زخم کے بغیر کھڑا کر کے قیمت

لگوائی جائے، اور پھر اس زخم کے ساتھ قیمت لگوائی جائے، دونوں صورتوں میں آنے والے تفاوت کے بقدر دیت مقرر کی جائے۔ یہی حکومتِ عدل ہے۔ اور اسی پر فتویٰ ہے۔

قاضی خاں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''حکومت'' کی یہ تعریف امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ امام حلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو لیا ہے۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، شافعی رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ہر اہل علم کا قول ہے۔ (**كذا قال ابن المنذر** رحمۃ اللہ علیہ)۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: دیکھا جائے کہ اس شجہ کی مقدار موضحہ کے مقابلہ میں کتنی ہے۔ پس اسی مقدار کے بقدر موضحہ کی دیت واجب ہوگی چونکہ غیر منصوص کو منصوص کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ **أن ينظر كم مقدار هذه الشجة من الموضحة، فيجب بقدر ذلك من دية الموضحة، لأن مالا نصّ فيه يرد الى مافيه نص۔**

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہی اصح ہے۔ ''محیط'' میں ہے کہ علماء نے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (**واللّٰه تعالٰى اعلم**)

غرّہ کا بیان

۳۵۰۲: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ، عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ، قَالَ قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجَنِيْنِ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ اَوْ فَرَسٍ اَوْ بَغْلٍ (رواه ابوداود وقال: روى هذا الحديث حمادبن سلمة وخالد الواسطى عن محمد بن عمرو ولم يذكر او فرس او بغل)

أخرجه ابوداوٗد فى السنن ٧٠٥/٤ الحديث رقم ٤٥٧٩۔ والترمذى فى ١٦/٤ الحديث رقم ١٤١٠۔ واحمد فى المسند ٤٩٨/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت محمد بن عمروؓ حضرت ابوسلمہ سے اور وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حاملہ کے) پیٹ کے بچہ کی دیت مقرر فرمائی ہے اور غرہ سے مراد ایک لونڈی یا ایک غلام یا ایک گھوڑا یا ایک خچر ہے۔ ابوداوٗد نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس روایت کو حماد بن سلمہ اور خالد واسطی نے محمد بن عمرو سے روایت کیا ہے لیکن ان دونوں میں سے کسی نے بھی لفظ ''فرس'' اور بغل (یعنی گھوڑا اور خچر) ذکر نہیں کیا ہے (لہٰذا اس روایت میں فرس اور بغل کا اضافہ شاذ ہے)۔ (ابوداوٗد نسائی)

تشریح: **بغرة**: تنوین کے ساتھ، ایک نسخہ میں عبد...... کی طرف اضافت کے ساتھ ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عرب کے ہاں ''غرة'' کا اطلاق کفیس برتن شئ پر ہوتا ہے یہاں اس لفظ کا اطلاق انسان پر ہوا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ''احسن تقویم'' پیدا فرمایا ہے۔ بعض غیر صحیح روایت میں ''**أو فرس أو بغل**'' کے الفاظ ہیں۔ یہ بعض سلف کی روایت باطل ہے۔ اپنی من گھڑت ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں ''غرّہ'' کے مفہوم میں ''فرس'' اور ''بغل'' کو شامل کرنا عیسیٰ بن یونس، راوی حدیث کا اپنا وہم ہے۔ **قوله**: **رواه ابو داودقال**۔۔۔**ولم يذكر** یعنی محمد بن عمرو نے یا حماد اور خالد میں سے کسی نے بھی

"أو فرس أو بغل" کے الفاظ ذکر نہیں کئے۔ آخر الذکر احتمال کی تائید ایک نسخہ میں موجود "ولم یذکرا" (بصیغہ تثنیہ) کے الفاظ سے ہوتی ہے۔

اسنادی حیثیت: ان الفاظ کی زیادتی منقول نہیں، لہٰذا یہ زیادتی شاذ ہے جس کی وجہ سے حدیث ضعیف ہے۔

طبیب پر دیت کا بیان

۳۵۰۴: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: مَنْ تَطَبَّبَ وَلَمْ يُعْلَمْ مِنْهُ طِبٌّ فَهُوَ ضَامِنٌ۔ (رواه ابو داود والنسائی)

أخرجه ابوداوٗد فی ٧١٠/٤ الحديث رقم ٤٥٨٦ والنسائی فی ٥٢/٨ الحديث رقم ٤٨٣٠ وابن ماجه فی ١١٤٨/٢ الحديث رقم ٣٤٦٦۔

ترجمہ: "اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اُرشاد فرمایا: "جو شخص اپنے آپ کو طبیب ظاہر کرے حالانکہ وہ فن طب کے بارے میں علم نہ رکھتا ہو (پھر کوئی اس کے ہاتھ سے مرگیا) تو وہ ضامن ہوگا"۔ (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: قوله: ان رسول الله قال: من تطبب......

أن رسول الله: ایک نسخہ میں "عن رسول الله" ہے۔

تطبب: باء موحدہ کی تشدید کے ساتھ، علم طبّ حاصل کرنا، علم طبّ میں مشغول ہونا۔ بیمار کا علاج کرنا۔ اس کا طبیب اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ اس کا معالجہ صحیحہ خأ پر غالب ہو، وگرنہ وہ ماہر طبیب شمار نہ ہوگا اور اگر اس سے خطا ہوگئی تو وہ ضامن ہوگا۔

فهو ضامن: بعض حنفی شراح کا فرمانا ہے کہ چونکہ ہلاکت اس کے فعل کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے، وہ تعدّی کرنے والا ہے، کیونکہ وہ اس کی معرفت نہیں رکھتا، لہٰذا اس کی جنایت کا ضمان اس کے عاقلہ پر ہوگا۔ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی "وهم يعلم منه طب" کا مطلب یہ ہے طبیب اگر طبابت میں مشہور نہ ہوا اور مریض اس کی وجہ سے موت کے منہ میں چلا جائے تو وہ ضامن ہوگا۔ اس کی دیت طبیب کے عاقلہ پر ہوگی اس پر علماء کا اتفاق ہے اور قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ طبیب علاج معالجہ مریض کی اجازت کے بغیر نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کا حکم قتل خطا کا ہے۔

امام خطابی فرماتے ہیں: میرے علم کے مطابق اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کہ معالج کی تعدی کے سبب مریض اگر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو وہ ضامن ہوگا۔ لہٰذا تاوان دیت واجب ہوگا نہ کہ قصاص، چونکہ طبیب بہرحال علاج مریض کی اجازت اور رضامندی ہی سے کیا کرتا ہے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک طبیب کی دیت اس کے عاقلہ پر واجب ہوگی۔

تخریج: اس طرح اس حدیث کو امام ابن ماجہ اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

مفلس، غلام اور بچے پر دیت کا بیان

۳۵۰۵: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ، اَنَّ غُلَامًا لِاُنَاسٍ فُقَرَاءَ قَطَعَ اُذُنَ غُلَامٍ لِاُنَاسٍ اَغْنِيَاءَ، فَاَتَى اَهْلُهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا: اِنَّا اُنَاسٌ فُقَرَاءُ، فَلَمْ يَجْعَلْ عَلَيْهِمْ شَيْئًا. (رواه ابو داود والنسائی)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤/٧١٢ الحديث رقم ٤٥٩٠۔ والنسائی فی ٨/٢٥ الحديث رقم ٤٧٥١۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مفلس خاندان کے ایک لڑکے نے دولت مند خاندان سے تعلق رکھنے والے لڑکے کا کان کاٹ ڈالا' چنانچہ (جس لڑکے نے کان کاٹا تھا) اس کے خاندان والے (معافی چاہنے کے لئے عذر خواہی کرتے ہوئے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ ہم محتاج و مفلس ہیں (لہٰذا ہم پر دیت مقرر نہ کی جائے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی درخواست منظور کرتے ہوئے) ان پر کوئی چیز مقرر نہیں فرمائی''۔

(ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله: ان غلاما لاناس فقراء ......: عليهم :ایک صحیح نسخہ میں ''عليه'' ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر کوئی چیز نہیں مقرر نہیں فرمائی' اس لئے کہ لڑکے کے عاقلہ فقراء تھے اور بچہ کی جنابت عاقلہ پر آتی ہے چونکہ اس کی جنابت خطا ہے' اس لئے کہ جنابت اختیار صحیح کے ساتھ صادر نہیں ہوئی اور راہی لیے اگر کوئی بچہ کسی شخص کو قتل کر دے تو اس کو قصاص میں قتل نہیں کیا جاتا اور مفلس عاقلہ کسی تاوان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ حدیث کے ظاہر سے لگتا ہے کہ جس لڑکے نے کان کاٹا تھا وہ بچہ آزاد تھا، کیونکہ اگر وہ غلام ہوتا تو اس کی جنایت و دیت خود اس کی ذات کے ساتھ متعلق کی جاتی اور اس کے مالکان کا فقیر و مفلس ہونا اس کے وجوب کو اس کی ذات سے ختم نہ کرنا۔

(كذا ذكره ابن الملك وغيره من علمائنا)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ممکن ہے (کہ اس حدیث میں) غلامِ جانی سے مراد مدبّر ہو۔ اس صورت میں جنایت اس کے مولیٰ سے متعلق تھی اور مولیٰ فقیر تھا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خصم کو راضی کر لیں تا کہ تاوان سے ہماری جان چھوٹ جائے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کان کاٹنے والا لڑکا آزاد تھا، اس کی یہ جنایت خطا تھی اور اس کے عاقلہ فقراء تھے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کوئی چیز واجب نہیں کی، کیونکہ عاقلہ مالی فراخی کے ہوتے ہوئے مؤاسات کرتے ہیں۔ اگر وہ فقیر ہوں تو ان پر کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ممکن نہیں کہ وہ کان کاٹنے والا لڑکا غلام ہو۔ کیونکہ اگر وہ لڑکا غلام ہوتا تو اس کے اہل خانہ کا یہ اعتذار کوئی معنی نہیں رکھتا کہ وہ فقیر ہیں۔ کیونکہ عاقلہ، عبد کا تحمل نہیں کرتے، جیسا کہ عبد کا بھی تحمل نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک عبد مملوک اگر کسی غلام یا حر پر جنایت کرتا ہے تو جنایت کا تعلق خود اس جانی سے ہوتا ہے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صبی، مجنون اور معتوہ کی جنایت اگر عمداً ہو تو خطا شمار ہوگی اور تاوان ان کے عاقلہ پر ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی ہے۔

ہماری دلیل بیہقی کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی یہ روایت ہے: أن عمد الصبی والمجنون خطأ۔ لیکن "المعرفة" میں اس روایت کو سنداً ضعیف کہا ہے۔

الفصل الثالث:

قتل خطا اور شبہ عمد کی دیت کا تفصیلی بیان

۳۵۰۶: وَعَنْ عَلِيٍّ، اَنَّهٗ قَالَ دِيَةُ شِبْهِ الْعَمَدِ اَثْلَاثًا : اَثْلَاثٌ وَثَلَاثُوْنَ حِقَّةً، وَّثَلَاثٌ وَّثَلَاثُوْنَ جَذَعَةً، وَاَرْبَعٌ وَّثَلَاثُوْنَ ثَنِيَّةً اِلٰى بَازِلِ عَامِهَا كُلُّهَا خَلِفَاتٌ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) قَالَ: فِي الْخَطَاءِ اَرْبَاعًا: خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ حِقَّةً، وَخَمْسٌ وَعِشْرُوْنَ جَذَعَةً، وَخَمْسٌ وَعِشْرُوْنَ بَنَاتُ لَبُوْنٍ، وَخَمْسٌ وَعِشْرُوْنَ بَنَاتُ مَخَاضٍ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی ٦٨٥/٤ الحديث رقم ٤٥٥١۔

ترجمہ: "اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قتل شبہ عمد کی دیت تین قسم کے اونٹوں پر مشتمل ہے۔ بایں تفصیل تینتیس حقہ (یعنی ایسی اونٹنیاں جو چوتھے برس میں لگی ہوں) اور تینتیس جذعہ (یعنی ایسی اونٹنیاں جو پانچویں برس میں لگی ہوں) اور چونتیس حاملہ اونٹنیاں (جو چھٹے برس میں لگی ہوں) ایک اور روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا قتل خطاء کی دیت میں چار قسم کی (سو) اونٹنیاں دینی واجب ہیں بایں تفصیل کہ پچیس حقہ (یعنی ایسی اونٹنیاں جو تین برس کی ہوں) اور پچیس جذعہ (یعنی ایسی اونٹنیاں جو چار چار برس کی ہوں) اور پچیس بنت لبون (یعنی ایسی اونٹنیاں جو دو برس کی ہوں) اور پچیس بنت مخاض (یعنی ایسی اونٹنیاں جو ایک برس کی ہوں)۔" (ابوداوٗد)

تشریح: قوله: زية شبه العمد ـــــ كلها خلفات:

جذعة: جیم اور ذال کے فتحہ کے ساتھ۔

حقة: جائے مہملہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس پر سواری اور بوجھ لادنے کا حق ثابت ہو چکا ہوتا ہے۔

ثنية: یائے تحتیہ کی تشدید کے ساتھ

"دیۃ" مبتدا ہے۔ "أثلاثا" مبتدا سے حال ہے یا "أعنی" فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔ "ثلاث" مبتدا کی خبر ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مبتدا اور خبر کے درمیان تمیز "أثلاثا" کا فاصلہ ہے، جیسا کہ مثلاً یوں کہا جاتا ہے: التصريف لغة التغيير۔

الى بازل عامها: "بازل" مضاف ہے "عامها" کی طرف "الی" "ثنية" کے متعلق ہے جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم

ہوتا ہے اور مطلب یہ کہ "ما بينها"۔ (یعنی چھ سے نو سال تک کا اونٹ)

قاموس میں ہے کہ حمل 'ناقة، بازل 'بزول' اس اونٹ کو کہتے ہیں جو نوویں سال میں ہو، اس عمر سے زائد کسی اونٹ کا کوئی خاص نام نہیں۔

المصباح میں ہے: بزل البعير كنصر فطنابه بدخوله في السنة التاسعة، فهو بازل۔ نوویں سال میں داخل اونٹ کو "بازل" کہتے ہیں۔ مذکر، مؤنث ہر دو کے لئے "بازل" استعمال ہوتا ہے۔

النہایۃ میں ہے کہ "بازل" اسے کہتے ہیں جو پورے آٹھ سال کا ہو کر نوویں سال میں لگا ہو اس وقت اس کے انیاب ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں اور قوت میں کامل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد (عمر بتانے کے لئے) یوں کہا جاتا ہے: بازل عام، بازل عامين۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اسی سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں یہ لفظ آیا ہے: الا بازل عامين حديث سن۔ اى مستجمع الشباب مستكمل القوة

قوله: وفي رواية: قال في الخطا ......:

في الخطأ: اى شان الخطأ (مضاف محذوف ہے۔ "في الخطا" یہ راوی کا کلام ہے۔ أرباعا: تمیز ہے۔

خمس وعشرون: یہ "دية الخطا" مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اى دية الخطأ خمس وعشرون حقه۔

بظاہر "في الخطا" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کلام ہے، ترکیبی اعتبار سے خبر مقدم ہے اور "خمس وعشرون" مبتدا (مؤخر) ہے۔ اس حصہ سے متعلق اختلافی کلام ماقبل میں گزر چکا ہے (وہاں ملاحظہ فرمائیے۔)

شبہ عمد کی دیت کا بیان

۳۵۰۷: وَعَنْ مُجَاهِدٍ، قَالَ قَضٰى عُمَرُ فِیْ شِبْهِ الْعَمَدِ ثَلَاثِیْنَ حِقَّةً وَثَلَاثِیْنَ جَذَعَةً وَاَرْبَعِیْنَ خِلْفَةً مَابَیْنَ ثَنِیَّةٍ اِلٰی بَازِلِ عَامِهَا۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداؤد في ٦٨٥/٤ الحديث رقم ٤٥٥٠ واحمد في المسند ٤٩/١۔

ترجمہ: "اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قتل شبہ عمد کی دیت میں تیس حقہ (یعنی تین تین سال کی اونٹنیاں) اور تیس جذعہ (یعنی چار چار سال کی اونٹ، یاں) اور چالیس حاملہ اونٹنیوں کے ادا کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ (گویا یہ روایت حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے موافق ہے)"۔ (ابوداود)

جنین کی دیت کا بیان

۳۵۰۸: وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى فِی الْجَنِیْنِ یُقْتَلُ فِیْ

بَطْنِ اُمِّهٖ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ وَلِيْدَةٍ، فَقَالَ الَّذِیْ قَضٰی عَلَيْهِ : كَيْفَ اَغْرَمُ مَنْ لَاشَرِبَ وَلَا اَكَلَ وَلَا نَطَقَ وَلَا اسْتَهَلَّ وَمِثْلَ ذٰلِكَ يُطَلُّ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا هٰذَا مِنْ اِخْوَانِ الْكُهَّانِ۔ (رواه مالك والنسائي مرسلًا)

أخرجه النسائي في السنن ٤٩/٨ الحديث رقم ٤٨٢٠۔ ومالك في الموطا ٨٥٥/٢ الحديث رقم ٦ من كتاب العقول۔

ترجمہ: ''اور حضرت سعید بن میسب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بچہ کی دیت جو اپنی ماں کے پیٹ میں قتل کیا جائے ایک غرہ یعنی ایک غلام یا ایک لونڈی مقرر فرمائی۔ جس شخص پر یہ دیت واجب کی گئی تھی اس نے عرض کیا کہ میں اس کی دیت کس طرح بھروں جس نے کوئی چیز پی اور نہ کھائی ہو اور نہ بولا نہ چلایا' اس قسم کے قتل کو ساقط قرار دیا جاتا تھا''۔ رسول اللہ ﷺ نے (اس شخص کی بات سن کر حاضرین سے) فرمایا کہ ''اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ یہ شخص کاہنوں کا بھائی ہے''۔

اسنادی حیثیت: امام مالک اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بطریق ارسال (یعنی راوی صحابی کا ذکر کئے بغیر) نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله فقال الذی قضی علیه۔۔۔ ومثل ذلك یطل**: بعض حضرات فرماتے ہیں: معروف کا صیغہ ہے اور فاعل معلوم ہے۔

أغرم: راء مہملہ کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی أضمن۔

أکل: اگلے کلام میں موجود سجع کی رعایت کے پیش نظر اس پر وقف بالسکون کرنا چاہیے۔

ولا استهل: لام کی تشدید کے ساتھ ہے یہ عطف تفسیری ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ''نہ یہ چیخا چلایا اور نہ آواز بلند کی۔'' (بظاہر اس صورت میں یہ عام جملہ معطوفہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ از مرتب)

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''استہلال'' کو ''نطق'' سے مؤخر کرنے میں سجع کی رعایت کے ساتھ ساتھ صنعت ترقی بھی ہے۔ کیونکہ نفی استہلال نفی نطق کے مقابلہ میں ابلغ ہے چونکہ نفی استہلال, نفی نطق کو لازم ہے' اس کے برعکس نہیں۔ (نفی نطق نفی استہلال کو لازم نہیں) حالانکہ قرینہ سابقہ کی وجہ سے ایسا نہیں ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قرینہ سابقہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ ''أکل'' کو ''شرب'' پر مقدم کیا جاتا، چونکہ معتاد یہی ہے۔ اسی لئے اللہ جل شانہٗ کا فرمان ہے: [**کلوا واشربوا**] لیکن قائل نے برعکس کیا۔ جنین کو حی فرض کرتے ہوئے کہا۔

ومثل ذلك: اسم اشارہ کا مشار الیہ ''قتل'' ہے۔

یطل: یاء تحتیہ کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ یہ ماخوذ ہے: **طال دمه وأطل** سے' أی: **هدر أی یهدر**۔ (**أُطِلَّ دمُه**، خون رائیگاں جانا، بدلہ نہ لیا جانا، **أطل دمه**، حق رائیگاں جانا، بدلہ لیے بغیر چھوڑنا۔) ایک نسخہ میں ''**بطل**'' باء موحدہ کے ساتھ ہے۔

یہ زمانۂ جاہلیت اور عہد اسلام ہر دو کے آئینے میں باطل ہے، چونکہ اس کلام کا مفہوم (یعنی مفہوم مخالف) یہ ہے کہ چھوٹا بچہ جب تک بولنا اور کھانا شروع نہ کرے اس کا دم ہدر ہے۔اور ایسا ہونا کسی دور میں معروف نہیں ہے۔

عرض مرتب: اس مقام پر ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت بھی سجع سے خالی نہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: **وانما زوق كلامة بالسجع، الموافق للطبع ، المخالف للشرع۔قوله: فقال رسول الله ﷺ: انما هذا من اخوانكم الكهان:**

هذا: یہاں ترکیبی دو احتمال ہیں: پہلا یہ کہ مشار الیہ "القاتل" محذوف ہے۔دوسرا یہ کہ مضاف محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے: **قاتل هذا۔**

الكهان: کاف کے ضمہ اور ہاء کی تشدید کے ساتھ، کاہن کی جمع۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا اس کے اس سجع کی وجہ سے تھا۔سجع اپنے موقع محل میں ہو تو وہ مذموم نہیں ہوتا اور مذموم ہو بھی کیسے سکتا ہے نبی کریم ﷺ کا بہت سا کلام مبارک خود مسجع ہے۔میں کہتا ہوں جیسے یہ دعا ہے: **اللهم انی أعوذبك من علم لا ينفع، ومن قلب لا يخشع، ومن نفس لا تشبع، ومن دعاء لا يسمع، ومن هؤلاء الأربع۔**

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص کسی حاملہ کے پیٹ پر مارے اور اس کی وجہ سے اس کے پیٹ کا بچہ مردہ ہو کر باہر آجائے تو اس کی دیت میں غرّہ یعنی پانچ سو درہم، ضارب کے عاقلہ پر واجب ہوں گے۔مذکورہ بالا صورت میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ضارب پر کوئی شئ واجب نہ ہو۔چونکہ جنین کی حیات متیقن نہیں۔سوال اگر یہ کہا جائے کہ بظاہر وہ زندہ ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہر حال، استحقاق کے لئے حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

استحسان کی دلیل صحیحین میں مروی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے: **أن النبی ﷺ قضی فی جنين امرأة من بنی لحيان بغرة عبد أو أمة۔**

ہم نے غرّہ کی تفسیر پانچ سو درہم بیان کی ہے (اس کے دلائل حسب ذیل ہیں پہلی دلیل مصنف ابن أبی شیبہ کی یہ روایت ہے:

عن اسماعيل بن عياش، عن زيد بن أسلم أن عمر بن الخطاب رضی الله عنه قوّم الغرة بخمسين ديناراً، وكل دينار بعشرة دراهم۔

دوسری دلیل

مسند بزاز میں عبداللہ بن بریدہ عن أبیہ مروی ہے:

أن امرأة حذفت امرأة، فقضی رسول الله ﷺ فی ولدها بخمسمائة ونهی عن الحذف۔

تیسری دلیل

امام ابوداؤد اپنی سنن میں ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں: **قال: الغرة خمسمائة يعنى درهما۔ وقال ربيعة بن عبدالرحمن: هي خمسون دينارا۔**

ابراہیم حربی "کتاب غریب الحدیث" میں روایت کرتے ہیں:

عن احمد بن حنبل، عن عبدالرزاق، عن معمر عن قتادة قال: الغرة خمسون دينارا۔

۳۵۰۹: ورواه ابوداود عنه عن ابى هريرة متصلا۔

ترجمہ: اور ابوداؤد نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بطریق اتصال نقل کیا ہے"۔

أخرجه ابوداوٗد فى السنن ٧٠١/٤ الحديث رقم ٤٥٧٦۔ وعن مسلم نحوه ١٣٠٩/٣ الحديث رقم (٣٦۔ ١٦٨١)۔ وأخرجه احمد فى المسند ٢٧٤/٢۔

تشریح: جنین خواہ مذکر ہو یا مؤنث۔ اس کی دیت ۵۰۰ دراہم بطور غرہ ہے۔ حدیث کے اطلاق کے باعث اکثر اہل علم کا مذہب یہی ہے۔

غرّہ کی ادائیگی کس پر واجب ہے؟

حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ غرہ کی ادائیگی ضارب کے عاقلہ پر ہے۔

ہماری (اور شافعیہ) دلیل سنن ابی داؤد کی مغیرہ بن شعبہ سے مروی یہ حدیث ہے:

أن امرأتين كانتا تحت رجل من هزيل، فضى بت احداهما الأخرى بعمود فقتلتها، فاختصموا الى رسول الله ﷺ فقال أحد الرجلين : كيف ندى من لاصاح ولا أكل ولا شرب ولا استهل؟ فقال أسجع كسجع الأعراب فقضى فيه غرة وجعله على عاقلة المرأة۔

اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نقل کر کے فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: غرہ کی ادائیگی ضارب کے مال سے ہوگی

کیونکہ یہ بدل جز ہے۔ امام احمد بن حنبل کے ہاں مسئلہ میں تفصیل ہے: اگر حاملہ کو ضرب عمداً لگائی، اور صرف جنین مرا تو غرہ ضارب پر ہوگا۔ البتہ اگر یہ ضرب خطأً تھی یا شبہ عمد تھی تو اس صورت میں غرہ، عاقلہ پر واجب ہوگا۔

غرّہ کی ادائیگی کی مدت کتنی ہے؟

حنفیہ کے ہاں ایک سال، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ادائیگی کی مدت تین سال ہے۔

جنین کی حیات و ممات کے فیصلہ کیسے ہوگا؟

حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ جنین میں علامات حیات مثلاً استہلال، رضاعت، سانس لینا، چھینکنا وغیرہ کے پائے جانے پر جنین کے حق ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جنین کی حیات کے ثبوت کے لئے استہلال ضروری ہے۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے زہری، قتادہ اسحاق، ابن عباس، الحسن بن علی اور جابر کی رائے بھی یہی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارث کا دارومدار استہلال پر رکھا ہے۔

حنفیہ کی دلیل:

دودھ پینا، چھینکنا اور سانس لینا یہ تمام چیزیں علاماتِ حیات ہیں جیسا کہ استہلال علامتِ حیات ہے۔ البتہ جنین کے کسی عضو کا حرکت میں آنا، حیات پر دلالت نہیں کرتا، چونکہ ایسا بعض مرتبہ، اختلاج، یا تنگ مقام سے باہر آنے کے باعث بھی ہو سکتا ہے۔

جنین سے متعلقہ کچھ مسائل:

☆ اگر جنین ماں کے پیٹ سے زندہ باہر آیا اور پھر مر گیا تو کامل دیت واجب ہوگی اس مسئلہ میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

☆ اگر عورت نے مردہ بچہ جنا اور پھر خود بھی مر گئی تو غرہ اور دیت واجب ہوں گے۔ تعدادِ اثر کی وجہ سے دیت بھی متعدد آئے گی۔

جیسا کہ مثلاً ایک شخص نے تیر چلایا اور وہ کسی شخص کو لگ کر آر پار ہوتے ہوئے دوسرے شخص کو جا لگا دونوں مر گئے تو دو دیتیں واجب ہوں گی' بشرطیکہ پہلے کو خطاءً لگا ہو اور اگر پہلے کو عمداً مارا تو قصاص اور دیت دونوں واجب ہوں گے۔

☆ اگر ماں مر گئی اور مردہ بچہ جنا تو ماں کی دیت واجب ہوگی اور جنین کے بدلے میں کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ماں کی دیت کے ساتھ جنین کا غرہ بھی واجب ہوگا۔ خواہ ولادت کے وقت ماں زندہ تھی یا مردہ تھی۔

☆ اگر ماں مر گئی اور زندہ بچہ جنا پھر وہ بھی مر گیا تو دو دیتیں واجب ہوں گی۔ چونکہ دونوں کی موت کا باعث ضارب کی ضرب ہے۔ جیسا کہ مثلاً بچہ زندہ پیدا ہو کر مر جاتا۔

☆ جنین کو ملنے والا مال اس کے ورثہ کا ہوگا لیکن ضارب (اگر ورثہ میں سے ہے تو اس) کو کچھ نہیں ملے گا۔

باندی کے جنین کے غرہ کا حکم:

اگر اپنے شوہر سے حاملہ باندی کا جنین ضرب سے ساقط ہو جائے وہ جنین مذکر ہو تو اس کی قیمت کا نصف عشر واجب ہوگا اور اگر مؤنث ہو تو اس کی قیمت کا عشر واجب ہوگا۔ اس کی قیمت کا تعین یوں ہوگا کہ اس جنین کی ولادت کے بعد اس کی قیمت لگوائی جائے کہ اس رنگ روپ کا بچہ اگر زندہ ہوتا تو اس کی قیمت کیا ہوتی۔ چنانچہ اس قیمت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ باندی کے جنین میں جنین کی ام کا عشر واجب ہوگا۔ امام مالک، امام احمد، ابن منذر، حسن، نخعی، زہری، قتادہ اور اسحاق بھی یہی فرماتے ہیں۔ ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ جنین اپنی ماں کے پیٹ میں جنایت کے سبب مرا ہے۔ لہٰذا مذکر و مونث ہونے کی وجہ سے ضمان میں فرق نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ حرہ کے جنین کا مسئلہ ہے۔ نصوص کے مطلق ہونے کی وجہ سے اور بعض ظواہر کا کہنا ہے کہ باندی کے جنین میں کوئی شے واجب نہیں البتہ اس باندی کا نقصان واجب ہوگا بشرطیکہ اس میں کوئی نقص آیا ہو۔

بَابُ مَا لَا يُضْمَنُ مِنَ الْجِنَايَاتِ

جنایات کی ان صورتوں کا بیان جن میں تاوان واجب نہیں ہوتا

''لا يضمن''، فعل مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ ''من الجنايات'' یہ ''ما'' کا بیان ہے۔ ''المغرب'' میں ہے کہ ''الجناية'' جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے بمعنیٰ ''ما يجنيه من الشر'' (قابل سزا جرم، گناہ، قصور، خطا، بدعنوانی) تسمیۃ بالمصدر کے قبیل سے ہے۔ جنی علیه الشر سے ماخوذ ہے۔ جنایت کا مفہوم عام تھا، پھر اس میں خصوص پیدا کر کے جنایت کا اطلاق حرام کام کے ارتکاب پر ہونے لگا۔ یہ اصل میں جنی الثمر سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں۔ ''درخت سے پھل چننا، توڑنا''۔

عرض مرتب:

''جناية'' کی جمع ''جنايات'' اور ''جنايا'' آتی ہے۔ البتہ ''جَنَايَا'' قلیل الاستعمال ہے (القاموس الفقہی) اھ۔

الفصل الاول:

۳۵۱۰: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: الْعُجْمَاءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ، وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ، وَالْبِئْرُ جُبَارٌ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ٢٥٦/١٢ الحديث رقم ٦٩١٣۔ ومسلم فى ١٣٣٤/٣ الحديث رقم (٤٥۔ ١٧١)۔ وابوداوٗد فى السنن ٧١٥/٤ الحديث رقم ٤٥٩٣۔ والترمذى فى ٦٦١/٣ الحديث رقم ١٣٧٧۔

والنسائی فی (٤٥/٥ الحدیث رقم ٢٤٩٦۔ وابن ماجه فی ٨٩١/٢ الحدیث رقم ٢٦٧٣، والدارمی فی ٤٨٣/٢ الحدیث رقم ١٦٦٨۔ ومالك فی الموطا ٨٦٨/٢ الحدیث رقم ١٢ من كتاب العقول۔ واحمد فی المسند ٢٢٨/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''چوپایوں کا زخمی کر دینا معاف ہے (یعنی اس پر کوئی دیت نہیں ہے) کان میں دب جانا بھی معاف ہے اور کنویں میں گر پڑنا بھی معاف ہے''۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ: العجماء جرحها جبار:

العجماء: بہیمہ، دابہ، چوپایہ اور وجہ تسمیہ یہی ہے کہ یہ بولنے پر قادر نہیں ہوتے۔ ہر اس شخص کو جو کلام پر قادر نہ ہو ''اعجمی'' کہتے ہیں۔

جرحها: جیم کے فتحہ کے ساتھ، مصدر ہے۔ (قاله الازهری)۔ النہایہ اور القاموس میں ہے کہ جیم کے ضمہ کے ساتھ اسم مصدر ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ دو لغات ہیں۔ حدیث میں دو نسخے ہیں۔

جبار: جیم کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی ''هدر''

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: چوپایہ کا زخمی کر دینا اس وقت معاف ہے بشرطیکہ وہ ایک دم چھوٹ گیا ہو، جانور کے ساتھ نہ کوئی قائد ہو نہ سائق ہو۔ حدیث کے معنی اور دیگر تفصیلات گزر چکی ہیں۔ عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جرح'' کی تعبیر، اغلب احوال کی وجہ سے اختیار فرمائی۔ یا یہ بطور مثال ارشاد فرما کر مسئلہ پر تنبیہ مقصود ہے۔ **قوله: والمعدون جبار:**

المعدن: دال کے کسرہ کے ساتھ۔ **قوله والبئر جبار:**

البئر: ہمزہ کے ساتھ، اور ابدال کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔ اپنی زمین یا کسی اور مباح زمین میں کنواں کھودنے والے پر کوئی تاوان وقصاص واجب نہیں ہوگا اور کان کا بھی یہی حکم ہے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ میں لکھا ہے کہ: ''منفلتۃ'' (چھوٹا ہوا جانور) کسی آدمی یا کسی بھی چیز کو نقصان پہنچائے، خواہ رات میں خواہ دن کو، اس صورت میں ضمان نہیں آئے گا۔ اس مسئلہ کی دلیل اصحاب کتب ستہ کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مرفوع ہے:

العجماء جبار، والبئر جبار، والمعدن جبار، وفی الركاز الخمس۔

اس حدیث کو بخاری، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ''دیات'' میں، مسلم نے ''حدود'' میں، ترمذی نے ''احکام'' میں اور نسائی نے ''الزکوۃ'' میں ذکر کیا ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **العجماء** سے مراد ''**متفلته**'' ہے۔

ابن ماجہ فرماتے ہیں: ''**الجبار**'' کا مطلب ہے: **الهدی الذی لایغرم**۔ یعنی ایسا رائیگاں ہے جس میں جٹی نہیں

مؤطا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں فرماتے ہیں: ''**جبار أی لادية فيه**'' یعنی جبار کا مطلب یہ ہے کہ دیت واجب نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل حجاز یہ فرماتے ہیں کہ جانور کے مالک پر تاوان واجب ہوگا اگر جانور نے رات میں کوئی نقصان کیا ہے۔ اگر دن میں کسی چیز کو ضائع کیا ہے تو اس کے مالک پر کوئی تاوان واجب نہیں ہوگا۔

اس مسئلہ کی دلیل مالک عن الزهری عن حرام بن سعد بن محصہ کی روایت ہے:

أن ناقة للبراء دخلت حائط قوم، فأفسدت ،فقضى عليه الصلاة السلام أن على أهل الأموال حفظها بالنهار، وما أفسدت الماشية بالليل فهو مضمون۔

حدیث براء کا جواب:

پہلا جواب: صحیحین کی روایت متفق علیہ اور مشہور ہے۔ جبکہ مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت مرسل ہے اور مرسل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حجت نہیں

دوسرا جواب: حدیث براء میں یہ بھی ممکن ہے کہ چوپایہ کو خود اس کے مالک نے چھوڑا ہو اور اس خبر سے ایجاب ضمان بسوقہ کا فائدہ حاصل ہوگا اگرچہ افساد کا علم نہ ہو، تو اس معاملہ میں علم و جہالت کی برابری کو بیان کر دیا۔

عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے: **عن معمر، عن عبدالرحمن المسعودی، عن القاسم بن عبدالرحمٰن، قال: أقبل رجل بجارية من القادسية، فمرّ علٰى رجل واقف علٰى دابة، فنخس رجل الدابة فرفعت رجلها، فلم تخطئ عين الجارية، فرفع الى سلمان بن ربيعة الباهلی، فضمن الراكب، فبلغ ذلك ابن مسعود فقال: علی الرجل انما يضمن الناخس۔**

ابن ابی شیبہ نے بھی شریح اور شعبی کے طریق سے اس جیسی روایت ذکر کی ہے۔

۳۵۱۱: وَعَنْ يَعْلَى بْنِ اُمَيَّةَ قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم جَيْشَ الْعُسْرَةِ وَكَانَ لِيْ اَجِيْرٌ فَقَاتَلَ اِنْسَانًا فَعَضَّ اَحَدُهُمَا يَدَ الْاٰخَرِ، فَانْتَزَعَ الْمَعْضُوْضُ يَدَهُ مِنْ فِي الْعَاضِّ، فَاَنْدَرَ ثَنِيَّتَهُ فَسَقَطَتْ، فَانْطَلَقَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَاهْدَرَ ثَنِيَّتَهُ، وَقَالَ: اَيَدَعُ يَدَهُ فِيْ فِيْكَ تَقْضِمُهَا كَالْفَحْلِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ٤٤٣/٤ الحديث رقم ٢٢٦٥۔ ومسلم فى ١٣٠١/٣ الحديث رقم (٢٣۔ ١٦٧٤)۔ والنسائى فى السنن ٣٠/٨ الحديث رقم ٦٧٦٤۔ وابن ماجه فى ٨٨٦/٢ الحديث رقم ٢٦٥٦۔ واحمد فى المسند ٢٢٣/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت یعلی بن امیہ کہتے ہیں کہ میں (غزوہ تبوک کے) صبر آزما لشکر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (جہاد میں) شریک تھا' میرے ساتھ ایک نوکر بھی تھا' چنانچہ وہ (کسی بات پر) ایک شخص سے لڑ پڑا اور ان دونوں میں سے ایک نے دوسرے کا ہاتھ (دانتوں سے) کاٹ کھایا مگر اس نے اپنا ہاتھ کاٹنے والے کے منہ سے (اس طرح) کھینچا اس کے (سامنے کے) دانت گر پڑے۔ وہ شخص (کہ جس کے دانت گر پڑے تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (اپنا معاملہ

لے کر) حاضر ہوا (تا کہ آپ ﷺ اس کے دانتوں کا قصاص دلوائیں) لیکن آپ ﷺ نے اس کے دانتوں کو رائیگاں قرار دیا (اور ان کا تاوان نہ دلایا) اور اس سے فرمایا کہ کیا وہ شخص اپنا ہاتھ تمہارے منہ میں چھوڑ دیتا تا کہ تم اس کو اونٹ کی طرح (بے دردی سے) چباتے رہتے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:غزوت مع رسول اللهﷺ جيش العسرة:

جيش العسرة:غزوۂ تبوک **جيش العسرة** کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس غزوہ کے موقع پر گرمی شدید تھی زادِراہ اور سواریوں کی کمی تھی۔**غزوت مع رسول الله** :امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:**غزوت العدوّ** غزوہ کے معنی ہیں ''میں نے دشمن سے قتال کا ارادہ کیا''۔اور ''**مع رسول الله ﷺ**'' فاعل سے حال ہے اور ''**جيش العسرة**'' یہ ''**رسول الله**'' سے حال ہے۔معنوی تقدیری عبارت یوں ہوگی:**قصدت مصاحبا مع رسول اللهﷺ حال كونه مجهزا جيش العسرة**۔ (میں نے رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت کا ارادہ کیا درآنحالیکہ آپ ﷺ جیش عسرہ کی تیاری کررہے تھے)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے:**أنه جهز جيش العسرة وهو جيش غزوة تبوك، سمى به لانه ندب الناس الى الغزو فى شدة القيظ، وكان وقت ايناع الثمرة وطيب الظلال، فعسر ذلك عليهم وشقّ**۔

''عسر'' ضد ہے ''یسر'' کی۔عسر کے معنی ہیں:تنگی،سختی،صعوبت۔**قوله:وكان لى اجير**۔۔۔ **فأهدرثنيته:فانتزع**: ایک نسخہ میں ''**فنزع**'' ہے بمعنی ''**جذب**''۔**فأندر ثنيته:اى اسقط المحضوض ثنية العاض**۔

قوله:وقال: أيدع يده فى فيك ...... :تقضمها:ضاد معجمہ کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ،قاموس،مصباح اور مغرب میں ہے کہ ''**تقضم**ب'' اب فَرِحَ سے ہے۔**قضم الشىء**،دانتوں کے کناروں سے کوئی چیز کاٹ کھانا

البتہ صاحبِ ''مصباح'' کا کہنا ہے کہ ایک لغت باب ضرب بھی ہے۔

الفحل:(ہر طاقتور نر جانور،سانڈ)

قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اس ارشاد ''**أيدع يده الخ**''۔کے ذریعے آپ ﷺ نے اس کے دانتوں کا تاوان ہدر ہونے کے سبب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حملہ آور سے بچنے کے لئے چارہ گری میں حملہ آور کو نقصان پہنچے تو وہ رائیگاں جاتا ہے۔چونکہ دوسرے ایسے موقع پر ہاتھ اٹھانے پر خود حملہ آور نے مجبور کیا ہے۔لہٰذا حملہ آور کو پہنچنے والا نقصان خود حملہ آور کے اپنے فعل کے سبب سے ہے۔گویا کہ اس کی جان پر ظلم خود اس نے ڈھایا ہے۔قصہ مختصر یہ کہ اگر کوئی انسان کسی کی جان اس کے جسم،اس کے مال یا اہل وعیال پر حملہ کرے تو اس حملہ کا دفاع کرنا ضروری ہے۔اور دفاع کرنے والا چونکہ دفاع پر مجبور ہے اسلئے اس پر کوئی ضمان بھی واجب نہیں ہوگا۔

شرح السنۃ میں (اس حدیث کے تحت فوائد مسائل کا) ذکر کیا ہے:

① اسی طرح اگر کوئی مرد کسی عورت سے بدکاری کرنا چاہے اور وہ عورت اپنی آبرو بچانے کے لئے اس مرد پر حملہ کرے جس کے نتیجے میں وہ مرد ہلاک ہوجائے تو اس کی وجہ سے عورت پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔چنانچہ منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے پاس یہ مقدمہ آیا کہ ایک لڑکی لکڑیاں اکھٹی کر رہی تھی۔ایک شخص نے اس کا پیچھا کیا اور عصمت دری کی کوشش کی۔لڑکی نے ایک پتھر اٹھایا اور شخص کو دے مارا جس سے وہ شخص مر گیا۔حضرت عمرؓ نے اس کے بارے میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ قتل (حقیقت میں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے۔لہٰذا خدا کی قسم اس کی کوئی دیت ہرگز نہیں دی جائے گی۔یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

۲۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی شخص کا مال لوٹنے، خون ریزی کرنے اور اس کے گھر والوں کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کرے تو اس قسم کا ارادہ کرنے والے اور قتل کرنے والے کی مدافعت اور اس سے مقاتلہ کرنا جائز ہے۔مناسب تو یہ ہے کہ اچھے سے اچھا طریقہ اختیار کرے۔لیکن اگر وہ (ظالم) اپنے ارادہ سے باز نہ آئے تو اس سے مقاتلہ کیا جائے۔اگر اس (مظلوم) نے اسے قتل کر ڈالا تو اس کا خون ہدر ہوگا۔کیا ایسی صورت میں ہار ماننا اور تسلیم ہو جانا درست ہے؟ اس میں تفصیل ہے۔دیکھا جائے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اگر مال لینا چاہتا ہے تو تسلیم ہو جانا درست ہے۔اگر وہ اس کے خون کا پیاسا ہے، اور اپنی جان بچانا اسے قتل کئے بغیر ممکن نہیں تو اس میں علماء کی دو رائے ہیں:

۱۔ اس صورت میں تسلیم ہونا درست ہے' الا یہ کہ حملہ آور کوئی کافر ہو یا جانور ہو۔

۲۔ استسلام واجب ہے۔

عرض مرتب: صاحب ''شرح السنۃ'' کے کلام کا آخری حصہ' اگلی حدیث باب کے معارض معلوم ہوتا ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔اھ

۳۵۱۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يَقُوْلُ: مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ١٢٣/٥ الحدیث رقم ٢٤٨٠، وأخرجه مسلم فی ١٢٤/١ والحدیث رقم (٢٢٦-١٤١) وأخرجه ابوداوٗد فی السنن ١٢٧/٥ الحدیث رقم ٤٧٧١ بنحوه والترمذی فی ٢١/٤ الحدیث رقم ١٤١٩۔ والنسائی فی ١١٥/٧ الحدیث رقم ٤٠٨٧۔ واحمد فی المسند ١٦٣/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص اپنے مال کے لئے (یعنی اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے) قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے''۔(بخاری و مسلم)

تشریح: عمرو: واؤ کے ساتھ ہے۔

قتل: فعل مجہول کا صیغہ ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد' اصحاب سنن اربعہ سوائے ابن ماجہ کے اور ابن حبان نے حضرت سعید بن زید سے روایت کیا ہے۔

دورانِ دفاع حملہ آور کو قتل کرنے کا بیان

۳۵۱۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ : جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَأَيْتَ اِنْ جَآءَ رَجُلٌ يُرِيْدُ اَخْذَ مَالِیْ قَالَ: فَلَا تُعْطِهٖ مَالَكَ قَالَ: اَرَأَيْتَ اِنْ قَاتَلَنِیْ قَالَ: قَاتِلْهُ قَالَ اَرَأَيْتَ اِنْ قَتَلَنِیْ قَالَ: فَاَنْتَ شَهِيْدٌ قَالَ: اَرَأَيْتَ اِنْ قَتَلْتُهٗ قَالَ : هُوَفِی النَّارِ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی الصحیح ۱۲٤/۱ الحدیث رقم (۲۲۵۔ ۱٤۰)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے (رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہو کر) عرض کیا کہ ''یا رسول اللہؐ! مجھے بتائیے اگر کوئی شخص میرا مال (زبردستی) لینے آئے (تو کیا میں اپنا مال اس کے حوالے کر دوں؟) آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں تم اس کو اپنا مال نہ دو'' اس نے عرض کیا ''یہ بتائیے اگر وہ مجھ سے لڑ پڑے (تو کیا کروں؟) آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: تم بھی اس سے لڑو'' اس نے عرض کیا ''بتائیے اگر اس نے مجھے مار ڈالا؟ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: تم شہید ہو گے۔ اس نے عرض کیا اگر میں اس کو قتل کر دوں (تو اس کا کیا حشر ہوگا؟) آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا (اور تم پر اس کا کوئی وبال نہیں ہوگا)''۔

تشریح: قوله: یا رسول الله ﷺ! أرأیت۔۔۔فانت شهید:

فلا تعطه: ہاء میں اشباع ہے۔ اور ایک نسخہ میں ھاء ساکن ہے۔ اور ضمیر ''رجل'' کی طرف عائد ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: فلا تعطه، سوال کا جواب ہے۔ شرط کی جزا محذوف ہے جس پر سوال دلالت کر رہا ہے۔ جیسا کہ سوال شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ یعنی: ان جاء رجل بهذه الصفة فأعطيه أم لا؟ قال: فلا تعطه يعنی ان كان كما وصفته ۔(حدیث کا یہ) اگلا جملہ بھی اسی طرح ہے: قوله قال: أرأيت ان قتلني، قال: قاتله، قال: أرأيت ان قتلني؟ قال: فأنت شهيد۔ قال: أريت ان قتلته؟ قال: هو فی النار بغیر فاء والا کلام یہ جملہ مستانفہ ہے اور جواب شرط مقدر ہے۔ گویا کہ سائل نے پوچھا: فما ذا؟ تو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا (هو فی النار)۔ اھ۔

''هو فی النار'' کا مطلب یہ ہے کہ تم پر کوئی شئ نہیں۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قاتل سے مدافعت کرنا اور دورانِ مدافعت اس کو ہلاک کرنا مباح ہے۔

۳۵۱۴: وَعَنْهُ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: لَوِاطَّلَعَ فِیْ بَيْتِكَ اَحَدٌ وَلَمْ تَاْذَنْ لَهٗ فَخَذَفْتَهٗ بِحَصَاةٍ فَفَقَأْتَ عَيْنَهٗ مَاكَانَ عَلَيْكَ مِنْ جُنَاحٍ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی ۲۱٦/۱۲ الحدیث رقم ٦۸۸۸۔ ومسلم فی ۱٦۹۹/۳ الحدیث رقم ۲۱۵۸/٤٤۔ والسائی فی ٦۱/۸ الحدیث رقم ٤۸٦۱۔ واحمد فی المسند ۲٤۳/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اگر (تمہارا دروازہ بند ہو اور اس کی دراڑ یا کسی سوراخ میں سے) کوئی شخص تمہاری اجازت دینے کے بغیر تمہارے گھر میں

جھانکے حالانکہ تم نے اس کو (گھر میں آنے کی) اجازت نہیں دی تو تم (مثلاً) اس کے کنکری مارو اور اس کنکری سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تم پر کوئی گناہ (تاوان) نہیں"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: لو اطلع في بيتك ......:

اطّلع: طاء کی تشدید کے ساتھ بمعنی **أشرف و نظر**۔

فخذفته: خاء اور ذال معجمہ کے ساتھ، "خذف" سے مشتق ہے بمعنی "**الرمی بالأصبعين**" (دو انگلیوں سے پھینکا)

بحصاة: کنکر کا تذکرہ بطور مثال کے ہے۔

خذف اسے کہتے ہیں کہ کوئی کنکری یا گٹھلی یا ان جیسی کوئی چیز پکڑ کر ماری جائے۔ بعض حضرت نے فرمایا کہ: انگوٹھا کے کنارہ اور سبابہ کے کنارہ کو ملائے جانے کو خذف کہتے ہیں۔ خذف، بابِ ضرب سے مستعمل ہے۔ (**كذا في المغرب والمصباح**)۔

ففقأت: ہمزہ کے ساتھ۔

ما كان عليك من جناح: یعنی تمہارے لئے یہ بات باعث عیب و عار نہیں۔

"من" زائدہ، برائے تاکید ہے۔ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے اسی پر عمل کیا ہے اور ضارب سے ضمان عین کو ساقط کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب اس کو باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہو اور وہ پھر بھی باز نہ آیا ہو اور امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ حدیث کے اطلاق کے باعث اس پر مطلقاً ضمان نہیں ہے امام ابوصیفہؒ فرماتے ہیں اس پر ضمان ہے۔ یہ لہٰذا یہ حدیث زجر میں مبالغہ پر محمول ہے۔

تخریج: اس روایت کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

لو أن امرًا اطّلع عليك بغير اذن فخذفته بحصاة ففقأت عينه لم يكن عليك جناح۔

٣٥١٥: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ' اَنَّ رَجُلاً اِطَّلَعَ فِيْ جُحْرٍ فِي بَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وَمَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مِدْرًى يَحُكُّ بِهٖ رَأْسَهُ' فَقَالَ: لَوْ اَعْلَمُ اَنَّكَ تَنْظُرُنِيْ لَطَعَنْتُ بِهٖ فِيْ عَيْنَيْكَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِسْتِئْذَانُ مِنْ اَجْلِ الْبَصَرِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی ٢٤٣/١٢ الحديث رقم ٦٩٠١- ومسلم فی ١٦٩٨/٣ الحديث رقم (٤- ٢١٥٦) والترمذی فی السنن ٦/٥ الحديث رقم ٢٧٠٩ والنسائی فی ٦٠/٨ الحديث رقم ٤٨٥٩ والدارمی فی ٢٥٩/٢ الحديث رقم ٢٣٨٤ واحمد فی المسند ٣٣٠/٥۔

ترجمہ: "اور حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کے سوراخ میں سے جھانکا اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پشت خار یا کنگھی نما چیز تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر کھجا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب اس شخص کو جھانکتے ہوا دیکھا) تو فرمایا کہ اگر میں جانتا (یعنی مجھ کو یقین ہوتا) کہ تم (قصداً) جھانک

کر) مجھ کو دیکھ رہے ہو تو میں یہ کنگھا تمہاری آنکھ میں چبھو دیتا (کیا تم نہیں جانتے کہ کسی غیر کے گھر میں آنے کے وقت) اجازت لینے کا حکم اسی آنکھ کی وجہ سے دیا گیا ہے (کہ وہ کسی غیر محرم پر نہ پڑ جائے)''۔(بخاری ومسلم)

تشریح:قولہ:ان رجلا اطلع فی جحر۔۔۔یحك به راسه:

جحر:جیم کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی خرق (یہ موصوف ہے۔اور''فی باب'' جار'' کائن'' محذوف کے متعلق ہو کر صفت ہیای فی جحر کائن۔

مدری:میم کے کسرہ، دال مہملہ کے سکون اور راء منوّنہ کے ساتھ، یہ لکڑی یا لوہے سے بنی ہو کنگھی نما ایک چیز ہوتی ہے جو کنگھی سے بڑی ہوتی ہے۔اس کے ذریعے تلبید شدہ بالوں کو برابر کیا جاتا ہے۔جن کے پاس کنگھی نہیں ہوتی وہ لوگ اس کو بطور کنگھی استعمال کرتے ہیں۔(بحوالہ النہایہ)۔(اگلی تشریحات بھی اس کے قریب قریب ہیں)۔

بعض حضرات نے اِس کی وضاحت یوں کی ہے:

کہ یہ لکڑی کی ایک چیز ہوتی ہے جس شخص کے سر پر بال ہوں وہ اس کو سر میں داخل کر کے اپنے بالوں کو ملاتا ہے۔یہ ''مسلّہ'' کی مانند ہوتی ہے۔

اور بعض نے اس کی وضاحت یہ کی ہے:

کہ یہ لوہے کی ہوتی ہے ''حلال'' کی مانند ہوتی ہے' بڑے افراد کی عادت ہوتی ہے کہ جسم کے جس حصہ تک ان کا ہاتھ نہیں پہنچتا اس کے ذریعہ اس حصہ کو کھجلاتے ہیں۔

اس آخری مفہوم کی تاکید اگلے جملہ سے بھی ہوتی ہے۔

یحكّ:معروف کا صیغہ ہے۔

قولہ: فقال : یو أعلم انك تنظرنی لطعنت به فی عینك:امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اس (جملہ) میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص بلا قصد کسی کے گھر میں جھانکنے کا مرتکب ہو جائے مثلاً کوئی شخص کسی کے گھر کے سامنے سے گزر رہا ہو اور اضطراراً اس کی نظر گھر میں پڑ جائے تو اس پر اس حکم کا ترتب نہیں ہوگا۔

قولہ:انما جعل الاستئذان من أجل البصر الاستئذان:ہمزہ کے ساتھ اور ابدال کے ساتھ۔

یعنی کسی غیر کے گھر میں آنے کے وقت اجازت لینے کا حکم اسی آنکھ کی وجہ سے دیا گیا ہے کہ کسی غیر محرم پر نہ پڑ جائے۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو یہ حکم مشروع بھی نہ ہوتا۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلب کرنے کا حکم اس لیے ہے تاکہ گھر کے باہر سے کسی شخص کی نظر اندر نہ پڑے۔اس اعتبار سے بلا اجازت دیکھنا، بلا اجازت داخل ہونے کے مترادف ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اس حدیث سے اس بات کا جواز معلوم ہوتا ہے کہ:اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں جھانکے جہاں اس کا کوئی محرم رشتہ دار نہیں ہے تو کسی ہلکی پھلکی چیز سے اس جھانکنے والے کی آنکھ پر مارنا جائز ہے۔اور اگر آنکھ پھوٹ گئی تو پھوڑنے والے پر کوئی ضمان نہیں آئے گا۔امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ بات اسی طرح ذکر کی ہے۔البتہ شئ خفیف سے

مارنے کی قید پہلی حدیث کے مناسب ہے۔ **فتأمل۔**

یہ حدیث بظاہر زجر وتغلیظ پر محمول ہے۔جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا دونوں حدیثوں کے بارے میں مسلک ہے۔ البتہ دونوں صورتوں میں فرق یہ ہوگا کہ پہلی صورت میں دیت اور دوسری صورت میں قصاص ہوگا۔ان کے مذہب کا تقاضا تو یہی ہے۔باقی واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے ایسے شخص پر سے آنکھ کے تاوان کو ساقط کیا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں: یہ اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ پہلے اس کو منع کیا ہو مگر وہ باز نہ آیا ہو۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اصح یہ ہے کہ اس آدمی پر ضمان مطلق نہیں چونکہ حدیث مطلق ہے۔جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس پر تاوان کے وجوب کے قائل ہیں۔لہٰذا یہ حدیث مبالغہ اور سخت تنبیہ پر محمول ہے۔

٣٥١٦:وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ، اَنَّهُ رَاٰى رَجُلًا يَخْذِفُ فَقَالَ :لَا تَخْذِفْ، فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْخَذْفِ وَقَالَ :اِنَّهٗ لَا يُصَادُ بِهٖ صَيْدٌ، وَّلَا يُنْكَأُ بِهٖ عَدُوٌّ ،وَلٰكِنَّهَا قَدْ تَكْسِرُ السِّنَّ وَتَفْقَأُ الْعَيْنَ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٦٠٧/٩ الحديث رقم ٥٤٧٩ ومسلم في ١٥٤٧/٣ الحديث رقم (٥٤ـ ١٩٢٤)ـ وابوداوٗد في السنن ٤٢٠/٥ الحديث رقم ٥٢٧٠ـ والنسائي ٤٨/٨ الحديث رقم ٤٨١٥ـ وابن ماجه في ١٠٧٥/٢ الحديث رقم ٣٢٢٦ـ والدارمي في ١٢٨/١ الحديث رقم ٤٤ وأحمد في المسند ٨٦/٤ـ

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو (انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پکڑ کر) کنکریاں پھینکتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ کنکریاں نہ پھینکو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں پھینکنے سے منع کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طرح (کنکریاں پھینک کر) نہ تو شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ دشمن کو زخمی کیا جا سکتا ہے (پھر ممانعت کی علت بیان کرتے ہوئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ) البتہ اس طرح کنکریاں پھینکنا دانت کو توڑ سکتا ہے اور آنکھ کو پھوڑ سکتا ہے (یعنی اس میں نفع تو بہت کم ہے مگر نقصان بہت زیادہ ہے)''۔(بخاری ومسلم)

تشریح:قوله:انه رأى رجلا يخذف۔۔۔۔ ولا يتكابه عدو:

یخذف: خاء معجمہ، اور زال معجمہ کے کسرہ کے ساتھ۔

وقال: ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا عبداللہ ہیں۔الجامع الصغیر کی روایت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ''قال'' کا فاعل ''عبداللہ'' ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

انه: ضمیر شان ہے، یا ''خذف'' کی طرف راجع ہے۔

ولا ینکا: یاء تحتیہ کے ضمہ، نون کے سکون، کاف کے فتحہ، اور ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔نسخوں میں (اس کا تلفظ) اسی طرح ہے۔النہایۃ میں ہے: **نكيت العدوّ أنكي نكاية، اذا كثرت فيهم الجراح والقتل وقد يهمز۔** اور کبھی ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔اھ۔القاموس (کی عبارت) کا مفہوم بھی یہی ہے۔پس (اس کا تقاضا یہ ہے کہ حدیث میں یہ لفظ)

دونوں طرح ضبط ہونا چاہیے۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ ''لا ینکی'' یاء کے ساتھ اصل ہو۔ واللہ اعلم۔

قوله: ولكنها قدتكسر السن وتفقأ العين: ولكنها: ضمیر اس ''حصاۃ'' کی طرف راجع ہے جو ''الخذف''، ''الرمية یا ''الفعلة'' سے سمجھ آ رہا ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: انہوں نے ایک آدمی کو کنکری سے کھیلتے دیکھا تو اس کو منع کیا چونکہ اس کام سے کوئی فائدہ حاصل نہیں اور نہ کسی نقصان (دہ چیز) کو دور کر سکتا ہے بلکہ سراسر شر ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کنکریاں پھینکنے سے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں کوئی مصلحت تو ہوتی نہیں، البتہ فساد کا خوف لگا رہتا ہے۔ چنانچہ یہی حکم ہر ایسے عمل کا ہے جس میں یہ بات موجود ہو۔

تخریج وتوضح: الجامع الصغیر میں ہے: نھی عن الخذف۔ اس حدیث کو امام احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، مسلم، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے عبداللہ بن مغفل سے روایت کیا ہے

فائدہ: جامع صغیر کی تخریج سے اس بات سے تائید ہوتی ہے کہ ''قال'' کا فاعل ''عبداللہ'' ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۵۱۷: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: اِذَا مَرَّ اَحَدُكُمْ فِي مَسْجِدِنَا وَفِي سُوْقِنَا وَمَعَهُ نَبْلٌ فَلْيُمْسِكْ عَلٰى نِصَالِهَا اَنْ يُّصِيْبَ اَحَدًا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْهَا بِشَیْءٍ۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲٤/۱۳۔ الحدیث رقم ۷۰۷۵۔ ومسلم فی ۲۰۱۹/٤ الحدیث رقم (۱۲٤۔ ۲٦۱۵)۔ وابوداوٗد فی السنن ۷۰/۳ الحدیث رقم ۲۵۸۷۔ وابن ماجه فی ۱۲٤۱/۲ الحدیث رقم ۳۷۷۸ واحمد فی المسند ٤۱۸/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص ہماری مسجد اور ہمارے بازار سے گزرے اور اس کے پاس تیر ہوں تو اس کو چاہئے کہ پیکانوں پر ہاتھ رکھ لے تاکہ اس سے کسی مسلمان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے''۔ (بخاری ومسلم)

قوله: اذامر أحدكم فی سجرنا......:

فی مسجدنا: یہ اضافت تشریفی ہے۔

نبل: نون کے فتحہ اور باء موحدہ کے سکون کے ساتھ بمعنی عربی سہام۔ اس کا واحد من لفظہ نہیں۔ لہٰذا ''نبلة'' کہنا صحیح نہیں بلکہ سھم کہا جائے۔

و معه نبل جملہ حالیہ ہے۔

فليمسك: یاء کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی فلیأخذ۔

نصالها: نون کے کسرہ کے ساتھ، نصل کی جمع ہے۔ اس سے لوہے کا وہ ٹکڑا مراد ہے جو سہم کے آخر میں لگا ہوتا ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''امساك'' کو ''علی'' کے ساتھ متعدی بنا کر ذکر کرنا درحقیقت محافظت اور پکڑنے میں

مبالغہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

أن یصیب: حذف مضاف کے ساتھ، مفعول لہ ہے۔ اصل عبارت گویا یوں ہے: كراهة أن يصيب أحدكم أو المار ۔منها: ضمیر نصال کی طرف راجع ہے۔

بشيء: سے مراد أذیت ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہے ''بشی'' فاعل ہے اور اس پر باء زائدہ ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (حدیث کا یہ ٹکڑا) اللہ جل شانہٗ کے اس فرمان کے مشابہ ہے ﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ [النساء۔۱۷۶]: ''اللہ تعالیٰ تم سے دین کی باتیں) اسلئے بیان کرتے ہیں کہ تم گمراہی میں نہ پڑو''۔ کہ یہاں تقدیری عبارت ''كراهة ان تضلوا'' اھ بعض حضرات نے اس کی تقدیری عبارت ''لئلا تضلوا'' بتلائی ہے۔

تخریج وتوضیح: اس حدیث کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ الجامع الصغیر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **فليمسك على نصاله بكفه لا يعقر مسلما۔**

۳۵۱۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: لَا يُشِيْرُ اَحَدُكُمْ عَلٰى اَخِيْهِ بِالسِّلَاحِ، فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِیْ لَعَلَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ فِیْ يَدِهٖ فَيَقَعُ فِیْ حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في ۲۳/۱۳ الحديث رقم ۷۰۷۲۔ ومسلم في ۲۰۲۰/۴ الحديث رقم (۱۲۶۔ ۲۶۱۷)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی طرف ہتھیار کے ذریعہ اشارہ نہ کرے۔ اس لئے کہ اس کو نہیں معلوم کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے ہتھیار کھینچ لے اور اس کی وجہ سے وہ (ہتھیار کا مالک) آگ کے گڑھے میں جا پڑے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: لايشير احدكم ۔۔۔۔لعل الشيطان ينزع في يده:

لا يشير: نفی بمعنی نہی ہے۔ خواہ وہ بھائی مسلم ہو خواہ ذمی ہو۔

بالسلاح: سین کے کسرہ کے ساتھ، جنگ کے لئے لوہے کے تیار کردہ آلات۔

فانه: اس ضمیر میں دو احتمال ہیں: ① ''احد'' کی طرف راجع ہے۔ ② یہ ضمیر شان ہے۔

لا يدرى لعل الشيطان: ''يدرى'' کا مفعول ہے۔ ممکن ہے کہ يدرى بمنزلہ فعل لازم کے استعمال ہوا ہو۔ اول وہلہ میں تو درایت کی سرے سے نفی کردی پھر ''لعل الشيطان'' سے نیا کلام ارشاد فرمایا

ينزع: زاء کے کسرہ اور عین مہملہ کے ساتھ، معنوی اعتبار سے عبارت کی تقدیر یوں ہے: يجذبه حال كون السلاح في يده۔ ''نزع'' کی نسبت ''شیطان'' کی طرف سبب کی طرف اسناد الی السبب کے قبیل سے ہے۔

امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: أي يرمي به كأنه يوقع يده لتحقق اشارته۔

ایک نسخہ میں زاء اور عین معجمہ کے ساتھ (ينزغ) بھی مروی ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا: شاید شیطان تم کو ورغلادے' بھڑکا دے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہیں ایسا نہ ہوجائے ہنسی مذاق اور کھیل کود میں شیطان واقعی طور پر مارنے پر اکسادے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ﴾ [الاعراف: ۲۰۰]

ممکن ہے کہ ینزع فی یدہ، یطعن فی یدہ کے معنی میں ہو اور عرب کے اس قول سے ماخوذ ہو: نزعہ بکلمۃ: أی طعن فیہ (کسی بات کا طعنہ دینا)۔ جوہری کہتے ہیں: ''نزع فی القوس'' کے معنی ہیں ''مدّھا'' (کمان کو کھینچنا)

قاضی رحمۃ اللہ علیہ اس کے معنی ''أنه یرمی به کائنا فی یدہ'' بیان فرماتے ہیں۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس تقدیر پر ''فی یدہ''، ضمیر مجرور مقدر سے حال ہوگا اور الجوہری کی تقدیر پر ظرف ہوگا فعل کے متعلق ہوگا۔ جیسا کہ شاعر کے اس قول میں:

بجرح فی عراقیبھا نصلی

أی یوقع نزعه فی ید المشیر فیستوفیه بما أمکن سنه یہ آیت بھی اسی معنی میں ہے ﴿والنازعات غرقا﴾ [النازعات: ۱] صاحب کشاف لکھتے ہیں: النازعات أیدی الغزاۃ تنزع القسی باغراق السھام۔

قوله: فیقع فی حفرۃ من النار: فیقع: فاء فصیحیہ ہے۔ ای ینزع فی یدہ، فیقتله فیستوجب النار فیقع۔ شیطان اس کے ہاتھ سے ہتھیار کھینچ لے اور اس کو قتل کر ڈالے اور یہ مستوجب نار ہو کر آل کار آگ میں جا پڑے۔

قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مقصود یہ ہے کہ اسلحہ کے ساتھ کھیل کود نہ کی جائے کہ مبادا کھیلنے والوں کے درمیان حائل ہو جائے، اور مذاق، سنجیدگی کی صورت اختیار کر جائے اور کھیل، جنگ بن جائے، اور ایک دوسرے کو مار کر قتل کر ڈالے اور قتل کی پاداش میں جہنم میں جا پڑے۔

۳۵۱۹: وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم :مَنْ اَشَارَ اِلٰی اَخِیْهِ بِحَدِیْدَۃٍ فَاِنَّ الْمَلٰئِکَۃَ تَلْعَنُهٗ حَتّٰی یَضَعَھَا' وَاِنْ کَانَ اَخَاہُ لِاَبِیْهِ وَاُمِّهٖ . (متفق علیه)

أخرجه مسلم فی ٤/٢٠٢٠ الحدیث رقم (١٢٥۔ ٢٦١٦)۔ والترمذی فی ٤/٤٠٣ الحدیث رقم ٢١٦٢۔ واحمد فی المسند ٢/٢٥٦۔ وھذا الحدیث لیس عندالبخاری عما یاتی۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی کی طرف لوہے (یعنی ہتھیار وغیرہ جیسے آلہ قتل) سے اشارہ کیا اس پر فرشتے اس وقت تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ اس (لوہے) کو رکھ نہیں دیتا۔ اگرچہ وہ (مشیر) اس (مشار الیہ) کا حقیقی بھائی کیوں نہ ہو''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: من أشار الی اخیه۔۔۔ جتی یضعھا:

فا الملائکۃ تلعنه: جنت میں دخول اولی سے بُعد کی بد دعا کرتے رہتے ہیں۔

حتی یضعھا: ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک وہ آلہ اس کے ہاتھ میں ہے فقط ترک اشارہ کافی نہیں۔

قوله: وان کان اخاہ لابیه و أمه: ''ان'': وصلیہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ مذاق کر رہا ہو اور اسے مارنے کا ارادہ بالکل نہ ہو۔ (تب بھی ایسا نہ کرے)۔ حقیقی بھائی کا تذکرہ کیا۔ کیونکہ اپنے ماں باپ شریک سگے بھائی کے قتل کا عام طور پر کوئی بھی ارادہ نہیں کرتا۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگرچہ اس کا بھائی یتیم ہو اور یہ اس کو کھلا رہا ہو (یعنی اس کے ساتھ کھیل کود کر رہا ہو) اور

اشارہ کرنے کا ارادہ بھی نہ ہو۔ اولاً مطلق اخ کو ذکر کیا، پھر اس کو ام اور اب کے ساتھ مقید کیا یہ بتانے کے لئے کہ نرا کھیل کود جو شائبہ قصد سے پاک ہو جب اس کا یہ حکم ہے۔ تو غیر کا حکم کیا ہوگا؟

قوله: رواہ البخاری: سید جمال الدین کے نسخہ کے حاشیہ میں لکھا ہے: رواہ مسلم وعلیہ خ ظ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ الجامع الصغیر میں اس (حدیث) کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ حدیث مسلم اور ترمذی نے روایت کی ہے فرمایا: اور حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

من أشار بحديدة الى أحد المسلمين يريد قتله فقد وجب دمه۔

۳۵۲۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَاَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السَّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا (رواہ البخاری وزاد مسلم) **وَمَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا ۔**

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۳/۱۳ الحدیث رقم ۷۰۷۰۔ ومسلم فی ۹۹/۱ الحدیث رقم (۱۶۴۔ ۱۰۱) والنسائی فی السنن ۱۱۷/۷ الحدیث رقم ۴۱۰۰۔ وابن ماجه فی السنن ۸۶۰/۲ الحدیث رقم ۲۵۷۵ وعن ابن عمر الحدیث رقم ۲۵۷۶۔ واحمد فی المسند ۴۱۷/۲ وعن ابن عمر ۳/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص (ہنسی مذاق کے طور پر بھی) ہم پر (یعنی ہمارے خلاف اسلحہ) اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے (یعنی ہمارے طریقہ پر عامل نہیں ہے)''۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ جس شخص نے اپنی کوئی چیز فروخت کرتے وقت فروخت کی جانے والی چیز کے کسی عیب ونقصان کو چھپا کر) ہمیں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

تشریح: ابن عمر: بغیر واؤ کے ہے۔

قوله: من حمل علينا السلاح فليس منا: السلاح

یعنی اگرچہ ہنسی مذاق کھیل کود کے لئے ہی ہو۔ یا خوف اور گھبراہٹ پیدا کرنے کے لئے ہو۔

علينا: ضمیر جمع ذکر کی تا کہ اس مفہوم میں ساری امت داخل ہو جائے جیسا کہ عنقریب فصل ثانی کی (آخری) حدیث میں آرہا ہے: **لمن سلّ السيف على أمتى**

فليس منّا: یعنی ہمارا طریقہ اور روش اختیار کرنے والوں یا ہماری ملت سے نہیں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جار مجرور (**علينا**) فعل کے متعلق ہے۔ اور ''سلاح'' **منصوب على نزع الخافض** ہے۔ عرب کہتے ہیں: **حمل عليه فى الحرب حملة**۔ اور ممکن ہے کہ (جار مجرور) حال ہو اور ''السلاح'' مفعول ہو جیسا کہ کہتے ہیں: **حملت الشى**۔ یعنی ہمارے خلاف اسلحہ اٹھایا نا کہ ہمارے حق میں۔ پہلی توجیہ ''**بباب مالا يضمن من الجنايات**'' سے مناسبت کے باعث زیادہ واضح ہے۔ نیز یہ کہ ''**فليس منا**'' شرط کی جزا ہے۔ اور احتمال ثانی اختیار کرنے میں فائدہ نہیں، چونکہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ مسلمانوں کا دشمن ہم میں سے نہیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس سے یہ فائدہ ممکن ہے کہ جس آدمی سے یہ فعل واقع ہوگا ظاہر کے اعتبار سے وہ مسلمان نہیں۔ اسرار تو اللہ ہی جانتا ہے۔ پس اس کا قتل جائز ہوگا۔

قوله: وزاد سلم: ومن غشنا فليس منا:

یعنی جس نے ہم سے خیانت کی اور ہماری خیر خواہی چھوڑی مثلاً بیع کے عیب کو چھپایا۔

تخریج وتوضیح: (بخاری کی روایت کے بارے میں) الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو مالک، احمد، بخاری، نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ اھ۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے: **من غشنا فليس منا**۔ بعض حضرات فرماتے ہیں ایک روایت میں "**من غشنا فليس منا**" کے الفاظ ہیں اور اس کے اکثر طرق میں یہ مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار میں کسی غلہ کے ڈھیر میں تری محسوس کرنے کے موقع پر یہ ارشاد فرمایا تھا۔ شیخین نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

طبرانی نے اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **من غشنا فليس منا، والمكر والخداع فى النار**۔

احمد اور ترمذی نے حضرت عثمانؓ سے نقل کیا ہے: **من غش العرب لم يدخل فى شفاعتى ولم تنله مودّتى**۔

۳۵۲۱: وَعَنْ سَلَمَةَ بْنَ الْاَ كْوَعِ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ سَلَّ عَلَيْنَا السَّيْفَ فَلَيْسَ مِنَّا۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى الصحيح ٨٩/١ الحديث رقم (١١٢- ٩٩)۔ والترمذى فى ٣١٥/٢ الحديث رقم ٢٥٢٠ واحمد فى المسند ٤٦/٤۔

ترجمہ: "اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس شخص نے (بلا ارادہ قتل ہنسی مذاق میں بھی) ہمارے اوپر تلوار اٹھائی وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ (مسلم)

تخریج و توضیح: اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ فائدہ: ابن مردویہ حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں: **من سل سيفه فى سبيل الله فقد بايع الله**۔

۳۵۲۲: وَعَنْ هِشَّامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ هِشَامَ بْنَ حَكِيْمٍ مَرَّ بِالشَّامِ عَلٰى اُنَاسٍ مِنَ الْاَنْبَاطِ وَقَدْ اُقِيْمُوْا فِي الشَّمْسِ وَصُبَّ عَلٰى رُءُوْسِهِمُ الزَّيْتُ، فَقَالَ :مَا هٰذَا قِيْلَ :يُعَذَّبُوْنَ فِي الْخَرَاجِ فَقَالَ هِشَامٌ :اَشْهَدُ لَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ يُعَذِّبُ الَّذِيْنَ يُعَذِّبُوْنَ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا.

(رواه مسلم)

أخرجه فى صحيحه ٢٠١٨/٤ الحديث رقم (١١٨- ٢٦١٣)۔ والدارمى فى ٣١٥/٢ الحديث رقم ٢٥٢٠ واحمد فى المسند ٤٠٣/٤۔

ترجمہ: "اور حضرت ہشام بن عروہ اپنے والد (ابن زبیر) سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ہشام بن حکیم ملک شام (کے

سفر کے دوران) قوم انباط کے کچھ افراد کے پاس سے گزرے، جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سروں پر (گرم گرم) تیل ڈالا گیا تھا، ہشام بن حکیم نے کہا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ (یعنی ان لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی جارہی ہے؟) انہیں بتایا گیا کہ ''خراج'' کی وصولی کی وجہ سے ان کو اس عذاب میں مبتلا کیا گیا ہے (یعنی جراہ کی وصولیابی کے لئے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا جارہا ہے۔) حضرت ہشام (بن حکیم) نے فرمایا ''میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ (آخرت میں) ان لوگوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا جو لوگوں کو دنیا میں (ناحق اس) عذاب میں مبتلا کرتے ہیں جو عذاب اللہ تعالیٰ آخرت میں دیتا ہے)۔ (مسلم)

حالات راوی:

ہشام بن حکیم ۔ یہ ہشام ہیں ۔حکیم بن حزام کے بیٹے ہیں۔ ''قرشی واسدی'' ہیں ۔فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں صاحب خیر وفضل حضرات میں سے تھے۔یہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے۔ان سے ایک گروہ نے جن میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی ہیں روایت کی ۔اپنے والد کی وفات سے قبل ہی انتقال فرمایا۔ان کے والد کا انتقال ۵۴ھ میں ہوا۔

تشریح: قوله:ان هشام بن حكيم مر بالشام ......:

الأنباط: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، النہایۃ میں ہے کہ نبط اور نبیط مشہور پہاڑ ہیں۔لوگ بصرہ کوفہ کے درمیان سفر کرتے ہوئے (اس پہاڑ کی) کشادہ وادیوں میں پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''انباط'' عجمی دہقانوں کو کہتے ہیں۔

أشهد لقد سمعت: ''لقد'' میں لام جواب قسمیہ ہے چونکہ ''أشهد'' میں ''قسم'' کے معنی ہیں۔

تخریج وتوضیح: اسی طرح اسی حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے احمد رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عیاض بن غنم سے، اور ابوداوٗد، ترمذی، اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے: **لا تعذبوا بعذاب الله ۔**

۳۵۲۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يُوْشَكُ اِنْ طَالَتْ بِكَ مُدَّةٌ اَنْ تَرٰى قَوْمًا فِیْ اَيْدِيْهِمْ مِثْلُ اَذْنَابِ الْبَقَرِ، يَغْدُوْنَ فِیْ غَضَبِ اللّٰهِ وَيَرُوْحُوْنَ فِیْ سَخَطِ اللّٰهِ (وَفِیْ رِوَايَةٍ) يَرُوْحُوْنَ فِیْ لَعْنَةِ اللّٰهِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱۹۳/٤ الحديث رقم (۵۳ ـ ۲۸۵۷) واحمد فی المسند ۳۲۳/۲ ـ

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تمہاری عمر طویل ہوئی تو تم عنقریب ان لوگوں کو دیکھو گے جن کے ہاتھوں میں گائے کی دم کی مانند ایک چیز یعنی کوڑے ہوں گے، وہ صبح وشام اللہ تعالیٰ کے غضب وناراضگی میں گزاریں گے۔ (یعنی ان لوگوں پر ہمہ وقت اللہ کا عذاب نازل ہوتا رہے گا) اور ایک روایت میں

یہ ہے کہ ''وہ اللہ کی لعنت میں شام گزاریں گے۔'' (مسلم)

تشریح:قوله:یوشك ان طالت بك مدة۔۔۔مثل اذناب البقر:

أن ترى: یہ ''**یوشك**'' کا اسم ہے بمعنی ''**تبصر** اور ''**فی أیدیهم**'' خبر مقدم ہے۔

اور ''**مثل أذناب البقر**'': مبتدا مؤخر ہے۔ جملہ محل نصب میں ''**قوماً**'' کی صفت ہے۔

دیارِ عرب میں کوڑوں کو ''**مقارع**''۔ **مقرعة** کی جمع۔ کہا جاتا ہے۔ یہ چمڑہ کا ہوتا ہے، جس کے ایک کونے پر گرہ لگی ہوتی ہے اور درمیانی انگلی کے بقدر چوڑا ہوتا ہے۔ چوروں کو برہنہ کر کے (اس کے ذریعہ پیٹا جاتا ہے)۔

قوله:یغدون فغ طضب الله......: بعض علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ظالموں کے دروازوں پر منڈلاتے ہیں اور کاٹ کھانے والے پاگل کتوں کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں اور لوگوں کو کوڑوں کے ذریعے ہنکاتے ہیں۔ واضح رہے کہ '' **فی سخط الله**'' (کی تعبیر) کے الفاظ میں فی غضب اثر کے مقابلہ میں زیادہ شدت ہے۔ یہ لوگ چونکہ اس حرکت کو بار بار دہرار ہے ہیں' اس فعل پر دوام کے ساتھ کاربند ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے غضب کا صدور بھی مسلسل ہوتا ہے۔

یروحون فی سخطو الله: یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور رہیں گے چونکہ انہوں نے امیر کا حکم اللہ کے حکم سے مقدم جانا، حالانکہ: **لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق**۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''**یغدون ویرحون**'' سے دوام واستمرار مراد ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس قول میں ہے: ﴿**یدعون ربهم بالغداة والعشی**﴾[الکهف۔۲۸] ترجمہ: ''صبح وشام (یعنی علی الدوام) اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں'' حدیث بالا میں مراد یہ ہے کہ ان لوگوں پر مسلسل، اللہ کا غضب اور ناراضگی نازل ہوتی رہتی ہے۔ اللہ کے ''سخط'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ حلم کا معاملہ نہیں کرے گا اور نہ ان سے راضی ہوگا۔

اگر اس (**یغدون ویروحون**) سے دو مخصوص وقت مراد ہوں تو مطلب یہ ہوگا ان کی صبح اس حال میں گزرتی ہے کہ یہ لوگوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں' انہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں، لوگوں پر رحم نہیں کھاتے، چنانچہ ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ اور ان کی شامیں بھی اللہ کی ناراضگی والے کاموں، ایذارسانیوں اور ڈرانے دھمکانے کی فکروں میں بیتتی ہیں۔

فائدہ: امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:

من روّع مؤمنا لم یؤمن الله روعته یوم القیامة، ومن سعی بمؤمن أقامه الله مقام ذل وخزی یوم القیامة۔

۳۵۲۴: **وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِنْفَانِ مِنْ اَهْلِ النَّارِ لَمْ اَرَهُمَا: قَوْمٌ مَّعَهُمْ سِيَاطٌ كَاَذْنَابِ الْبُقَرِ، يَضْرِبُوْنَ بِهَا النَّاسَ، وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُءُ وْسُهُنَّ كَاَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ، لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا وَاِنَّ رِيْحَهَا لَتُوْجَدُ مِنْ مَّسِيْرَةِ كَذَا وَكَذَا۔** (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱۹۲/۴ الحدیث رقم (۵۲۔ ۲۱۲۸) الحدیث رقم ۳۵۶/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دوزخیوں کے دو گروہ ایسے ہیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا (اور نہ میں دیکھوں گا) ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جن کے ہاتھوں میں گائے کی مانند کوڑے ہوں گے جس سے وہ (لوگوں کو ناحق) ماریں گے اور دوسرا وہ گروہ ان عورتوں کا ہے جو بظاہر تو کپڑوں میں ملبوس ہوں گی مگر حقیقت میں برہنہ ہوں گی، وہ مردوں کو اپنی طرف مائل کریں گی اور خود ان کی طرف مائل ہوں گی ان کے سر بختی اونٹ کے کوہان کی طرح ہلتے ہوں گے۔ ایسی عورتیں نہ تو جنت میں داخل ہوں گی اور نہ جنت کی بو پائیں گی حالانکہ جنت کی بو اتنی اتنی (یعنی مثلاً سو برس کی) مسافت سے آئے گی۔''۔ (صحیح مسلم)

تشریح: قوله: صنفان من أهل النار لم أرهما:

''**صنفان**'': مبتدا ہے ''**من أهل النار**'': صفت ہے۔ ''**لم أرهما**'': خبر ہے۔ ایک روایت میں ''**لم أرهما بعد**'' کے الفاظ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں ان دونوں گروہوں کو نہیں دیکھا، وہ دور اس طرح کے لوگوں سے پاک تھا، یہ لوگ بعد میں پائے گئے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے۔ اس حدیث میں ان دونوں گروہوں کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

قوله: قوم معهم سياط كا ذناب البقرة يضربون يها الناس: سياط: سوط کی جمع ہے۔ جمع بناتے وقت واؤ کو ماقبل کے کسرہ کی وجہ سے یاء سے بدل دیا گیا۔

قوله: ونساء كا سيات۔۔۔ كاسنمة البخت المائلة: ونساء: ''قوم'' اور ''نساء'' صنفان سے ''بدل'' ہیں یا ''بیان'' ہیں اور ان کے بعد ان کی صفات ہیں۔

كاسيات غاريات: اس کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① یعنی اللہ کی نعمتیں زیب تن کئے ہوں گی۔ شکر سے عاری ہوں گی۔

② وہ اس طرح کپڑے پہنتی ہوں گی کہ جس کا کچھ حصہ چھپا رہتا ہوگا اور کچھ حصہ کھلا رہتا ہوگا تاکہ لوگوں کے سامنے اپنا حسن و جمال آشکارا کریں اور اپنے کمالات کا اظہار کریں۔

③ وہ اتنے باریک اور مہین کپڑے پہنتی ہوں گی کہ اس سے ان کا بدن صاف جھلکتا ہوگا، اگرچہ حقیقۃً انہوں نے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔

④ وہ زیورات اور لباس سے لدی پھدی ہوں گی مگر لباسِ تقوی سے محروم ہوں گی۔ اسی مفہوم میں یہ حدیث پاک بھی ہے:

رب كاسية في الدنيا عارية في العقبى۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک طرف تو یہ فرمایا کہ ''وہ لباس زیب تن کئے ہوں گی'' اور دوسری طرف اس کی نفی کی گئی، چونکہ لباس زیب تن کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ ستر عورت ہو جائے، تو جب ستر کا تحقق نہیں ہوا تو اس طرح کا لباس پہن بھی لیا تو کیا پہنا؟ گویا کچھ بھی نہیں پہنا۔ اسی قبیل سے میں شاعر کا یہ قول ہے:

خلقوا وما خلقوا لمكرمة فكأنهم خلقوا وما خلقوا

رزقو وما رزقوا سماح يد فكأنهم رزقوا وما رزقوا

''وہ پیدا کیے گئے اور کسی قابل قدر کام کیلئے پیدا نہیں کئے گئے گویا کہ پیدا کئے گئے اور پیدا نہیں کئے گئے۔ان کو رزق دیا گیا اور سخی ہاتھ نہیں دیا گیا گویا کہ ان کو رزق دیا گیا اور ان کو رزق نہیں دیا۔''

(مميلات) علماء نے ''مميلات'' کی کئی تشریحات بیان کی ہیں:

① مردوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔

② وہ عورتیں مراد ہیں جو اپنی اوڑھنیاں اپنے سروں سے اتار پھینکتی ہیں تا کہ مردان کے چہروں کا دیدار کر سکیں۔

③ وہ عورتیں بتلائی ہیں جو اپنے شانے جھٹکاتی ہیں

④ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو دوسری عورتوں کو اپنے اس فعل بد کی طرف مائل کرتی ہیں۔

مائلات: اس کے بھی متعدد مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① اپنے دل مردوں کو دے بیٹھنے والیاں

② اپنے تن مردوں پر نچھاور کرنے والیاں مراد ہیں۔

③ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو مٹک مٹک کر چلتی ہیں

④ عفت وعصمت کی راہ سے بھٹکی ہوئی عورتیں مراد ہیں

⑤ فسق و فجور اور خواہشات نفسانی میں گھری ہوئی عورتیں مراد ہیں۔

۳۵۲۵:وَعَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِذَا قَاتَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٨٢/٥ الحديث رقم ٢٥٥٩ ومسلم فی ٢٠١٧/٤ الحديث رقم (١١٥۔ ٢٦٢٢)۔ واحمد فی المسند ٤٦٣/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص (کسی کو) مارے؟ تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے چہرے سے پرہیز کرے (یعنی اس کے چہرے پر نہ مارے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ حکم استحبابی ہے۔ چونکہ مسلمان کا مقاتلہ کافر کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور کافر کے چہرہ پر وار کرنا مقصد برآری (یعنی اس کو شکست دینے میں) زیادہ مفید ہے۔

قوله:من كشف شرا۔۔۔ففقأ عينه ماعيرت عليه:

عورة: عورة کے اصل معنی ہیں ''خلل'' اس نے متعدد معانی آتے ہیں جو حسب ذیل ہیں: ① جسم کا ہر وہ حصہ جو انسان کراہت یا شرم کی بناء پر چھپاتا ہے۔ ② قابل پوشیدگی اعضاء' جسم' ستر۔ ③ عیب' خامی' برائی۔ ④ ہر وہ مکان جس میں ایسا شگاف ہو کہ اس سے دشمن کے گھس آنے کا خوف ہو۔

اهله۔ ضمیر ''بیت'' کی طرف راجع ہے اور لفظ ''حد'' تعزیر کے معنی میں ہے۔ اتی حدا کا مطلب ہے ''فعل شیئا یوجب الحد ایسا کام کرنا موجب حد ہو۔

لا یحل له أن یاتیه: یہ جملہ مستانفہ ہے' ماقابل جملہ کی علت کو متضمن ہے۔ اس جملہ کے بارے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس معنی میں ہو: أتی امر الا یحل له أن یاتیه (ایسا کام کرنا جو حلال نہ ہو۔) (بظاہر اس صورت میں یہ جملہ ''امرًا'' کی صفت واقع ہوگا۔ محل نصب میں ہوگا) اور یہ ارشاد باری تعالیٰ اسی طرف اشارہ کر رہا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ﴾[الطلاق: ۱] اور اس کی تائید اگلہ جملہ ''ولو انه حین ادخل بصرف'' بھی کرتا ہے۔

ما عیوت علیه' امام طیبی فرماتے ہیں احتمال ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ میں اس کو ایسی سزا دیتا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرتا۔ اس صورت میں معنوی تقدیر یوں ہوگی: **فقد أتی موجب حد** ۔ کہ مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا۔ جیسا کہ اشرف اور مظہر رحمہما اللہ کی رائے ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد ''حمی'' کی مانند کوئی ''حاجز بین الشیئین'' ہو۔ چنانچہ اس تقدیر پر ''لایحل'' صفت فارقہ ہوگی۔ اس سے دوسرے احتمال کی تخصیص ہو جائے گی۔ اس کی دلیل اگلا جملہ ہے جو ''من کشف سرا'' کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے۔

قوله: وان مر الرجل علی باب ......: غیر: منصوب علی الحالیہ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ مجرور علی الصفہ ہے۔ ''باب'' کی صفت ہے۔

معلق: لام کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ **أی غیر مردود**۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل خانہ پر دو باتوں میں سے ایک بات لازم ہے کہ یا وہ اپنے مکان کا دروازہ بند رکھیں یا دروازہ پر پردہ ڈال کر رکھیں۔

توضیح وتخریج:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے یہ روایت بایں الفاظ نقل کی ہے:

ایما رجل کشف سرا فأدخل بصره من قبل أن یؤذن له فقد أتی حدا لا یحل له أن یاتیه۔ ولو أن رجلا فقأ عینه لهدرت' ولو أن رجلا مر علی باب لا سترة علیه فرأی عورة اهله فلا خطیئة علیه' انما الخطیئة علی أهل الباب۔

عرضِ مرتب:

مرقات میں حدیث کا متن یوں ہے: **رواه ابو داود قال هذا حدیث غریب۔**

یہاں سہو ہوا ہے۔ چونکہ یہ روایت ابوداؤد کی نہیں بلکہ ترمذی کی ہے۔

الفصل الثانی:

۳۵۲۶:وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم :مَنْ کَشَفَ سِتْرًا فَاَدْخَلَ بَصَرَہٗ فِی الْبَیْتِ قَبْلَ اَنْ یُؤْذَنَ لَہٗ فَرَای عَوْرَۃَ اَھْلِہٖ فَقَدْ اَتٰی حَدًّا لَایَحِلُّ لَہٗ اَنْ یَّاْتِیَہٗ وَلَوْاَنَّہٗ حِیْنَ اَدْخَلَ بَصَرَہٗ فَاسْتَقْبَلَہٗ رَجُلٌ فَفَقَأَ عَیْنَہٗ مَا عَیَّرْتُ عَلَیْہِ وَاِنْ مَرَّ الرَّجُلُ عَلٰی بَابٍ لَا سِتْرَلَہٗ غَیْرُ مُغْلَقٍ فَنَظَرَ فَلَا خَطِیْئَۃَ عَلَیْہِ، اِنَّمَا الْخَطِیْئَۃُ عَلٰی اَھْلِ الْبَیْتِ . (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٦٠/٥ الحدیث رقم ٢٧٠٧۔ واحمد فی المسند ١٨١/٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر کسی شخص نے (کسی کے گھر کا) پردہ کھولا اور بلا اجازت (اس کے) گھر میں اپنی نظر ڈالی اور اس نے اس کی گھر والی کی پردہ کی چیز کو دیکھا تو اس نے ایک ایسی چیز کا ارتکاب کیا جو اس کے لئے حلال نہیں تھا (جس کی وجہ سے وہ قابل تعزیر ہوا) اس کے لئے یہ (ہرگز) جائز نہیں ہے کہ وہ (بلا اجازت کسی کے گھر پر آئے اور اس کے گھر میں جھانکے) اگر اس نے گھر میں جھانک کر دیکھا اور (گھر والوں میں سے) کوئی شخص سامنے آ گیا اور اس نے اس (جھانکنے والے) کی آنکھ پھوڑ ڈالی تو میں اس (آنکھ پھوڑنے والے) کو سرزنش نہیں کروں گا ہاں اگر کوئی مرد کسی ایسے دروازے پر سے گزرے جس پر نہ کوئی پردہ لٹکا ہوا ہو اور نہ وہ بند ہو اور اس کی نظر (گھر کے آدمیوں پر) جا پڑے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بلکہ گناہ تو گھر والوں پر ہوگا (کہ انہوں نے دروازے کو بند کیوں نہیں کیا اور اس پر پردہ کیوں نہیں ڈالا)۔ (ترمذی)

اسنادی حیثیت: ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

۳۵۲۷:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ :نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم :اَنْ یُتَعَاطٰی السَّیْفُ مَسْلُوْلًا۔

(رواہ الترمذی و ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٧٠/٣ الحدیث رقم ٢٥٨٨۔ والترمذی فی ٤٠٣/٤۔ الحدیث رقم ٢١٦٣۔ واحمد فی المسند ٣٠٠/٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بے نیام تلوار کسی کو دینے سے منع فرمایا ہے''۔

(ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: یتعاطی: مضارع مجہول کا صیغہ ہے بمعنی'' یتناول''۔

بے نیام تلوار لینے سے منع فرمایا چونکہ اس میں ضرر کا احتمال ہے کہ کہیں وہ غلطی سے لگ نہ جائے یا ننگی تلوار دیکھ کر کوئی خوف زدہ نہ ہو جائے (ننگی تلوار دیکھ کر دوسرے کو خوف پیدا ہوتا ہے۔ از مرتب)۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمد اور امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

۳۵۲۸:وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَۃَ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نَھٰی اَنْ یُّقَدَّ السَّیْرُ بَیْنَ

اِصْبَعَيْنِ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۷۱ الحديث رقم ۲۵۸۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت حسن حضرت سمرہ (بن جندب) رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جوتوں کے) تسمہ کو دونوں انگلیوں کے درمیان چیرنے سے منع فرمایا ہے۔'' (ابوداوٗد)

تشریح: قوله: نهى ان يقدر اليسر......:

یقد: بصیغہ مضارع مجہول ہے دال کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی لمبائی میں کاٹنا پھاڑنا سے منع فرمایا۔ یہاں مطلقاً کاٹنا پھاڑنا بھی مراد ہوسکتا ہے۔

انگلیوں کے درمیان تسمہ رکھ کر چیرنے سے منع فرمایا چونکہ اس طرح انگلیاں زخمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ان دونوں حدیثوں میں وارد نہی تنزیہ وشفقت ہے۔ (یعنی از راہ شفقت و ہمدردی ان دونوں کاموں سے منع فرمایا)

۳۵۲۹: وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَهْلِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ۔ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۵/۱۲۸ الحديث رقم ۴۷۷۲۔ والترمذی فی ۴/۲۲ الحديث رقم ۱۴۲۱۔ والنسائی فی ۷/۱۱۵ الحديث رقم ۴۰۹۰ وابن ماجه فی ۲/۸۶۱ الحديث رقم ۲۵۸۰۔ واحمد فی المسند ۱/۱۹۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت سعید بن زید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اپنے دین کی حفاظت کرتا ہوا قتل کیا جائے گا تو وہ شہید ہے' جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتا ہوا قتل کیا جائے گا وہ شہید ہے' جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا قتل کیا جائے گا وہ شہید ہے اور جو شخص اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتا ہوا قتل کیا جائے گا تو وہ شہید ہے''۔

(ترمذی' ابوداوٗد' نسائی)

تشریح: قوله: من قتل دينه فهو شهد:

قتل: بصیغہ مجہول ہے۔

دون: اس کے معنی میں دو احتمال ہیں: ① یہ بمعنی ''قدام'' ہو۔ شاعر کہتا ہے: **''وتريك القذى دونها وهى دونه''**

② یہ ''عند'' کے معنی میں ہے۔ ای عند حفظ دینہ۔ یہ اس صورت متصور ہوسکتا ہے جب مخالف کافر ہو یا بدعتی ہو اور اس کو دین کے معاملہ میں رسوا کرنا چاہتا ہوں یا اس کی توہین کرنا چاہتا ہو اور یہ اس کو ہٹا رہا ہو' اور یہ اس (مخالف) اور اس کے ارادہ کے درمیان یوں حائل ہو جیسے کوئی بچانے والا اس کو حقیقتاً ہٹا رہا ہو۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اکثر علماء کا کہنا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا مال چھینا چاہے' یا خون بہانا چاہے یا اس کے گھر والوں کے ساتھ یہ کرنا چاہے تو اس شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس حملہ آور کا اچھے انداز سے دفاع کرے۔ پس اگر اس سے

بچنا بغیر مقابلک کے بچنا نہ تھا اور اس کے قتل کر دیا تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

توضیح وتخریج: جامع صیغر میں فرماتے ہیں اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن ثلاثہ نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون أهله فهو شهيد۔**

اس حدیث کو امام نسائی اور ضیاء نے سوید بن مقرن نے جامع کے الفاظ میں روایت کیا ہے البتہ اس میں یوں ہے: **من قتل دون مظلمتهفهو شهيد۔**

۳۵۳۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: لِجَهَنَّمَ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ، بَابٌ مِنْهَا لِمَنْ سَلَّ السَّيْفَ عَلٰى اُمَّتِيْ، اَوْ قَالَ: عَلٰى اُمَّةِ مُحَمَّدٍ. (رواه الترمذی وقال: هذا حدیث غریب) وَحَدِيْثُ اَبِىْ هُرَيْرَةَ: اَلرِّجلُ جُبَارٌ ذُكِرَ فِيْ بَابِ الْغَصِبِ۔

أخرجه الترمذی فی ۲۷۷/۵ الحدیث رقم ۳۱۲۳۔ واحمد فی المسند ۹۴/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دوزخ کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ اس شخص کے لئے ہے جس نے میری امت (کے لوگوں) پر یا یہ فرمایا امت محمد یہ پر (ناحق) تلوار اٹھائی (ترمذی)''۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث الرجل جبار ...... باب الغصب میں نقل کی جا چکی ہے''۔

تشریح:

① امام احمدؒ نے اس حدیث کو بغیر شک کے پہلے والے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو تکرار کی وجہ سے یہاں سے ساقط کیا ہے باوجود یکہ معاملہ برعکس تھا کہ وہ اس باب سے زیادہ مناسب رکھتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالفظ

③ اس باب میں تیسری فصل نہیں ہے۔

بَابُ الْقَسَامَةِ

قسامت کا بیان

عرض مرتب: ''قسامت'' ایک بہت پیچیدہ فقہی مسئلہ ہے۔ اس کی تفصیلات میں فقہاء کرام کے درمیان اتنا شدید اختلاف ہے کہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ جنہوں نے اجماع کے موضوع پر ''کتاب الاجماع'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، وہ اپنی اس کتاب میں فرماتے ہیں: ''قسامت کے بارے میں کوئی مسئلہ متفق علیہ اور مجمع علیہ نہیں ہے سوائے ایک مسئلہ کے، وہ یہ

کہ قسم اللہ کی کھائی جائے گی، صرف اس پر اتفاق ہے، اس کے علاوہ کوئی مسئلہ بھی متفق علیہ نہیں ہے، اتنا شدید اختلاف ہے، ہر فقیہ کے ہاں "قسامت" کا تصور مختلف ہے اور پھر اس مسئلہ کے سمجھنے میں بہت غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ حدیث کی شروح میں اس مسئلہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کی وجہ سے بھی بڑا اخلجان واقع ہوا ہے اور ایک دوسرے کے مذاہب بیان کرنے میں بھی غلطیاں ہوئی ہیں۔ اھ۔ شرح مسلم للنووی رحمۃ اللہ علیہ میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث قسامت اصول دین میں سے ہے۔ احکام دین کا ایک قاعدہ ہے۔ اور دین کا ایک رکن ہے جس میں انسانوں کیلئے بہت سی مصلحتیں ہیں۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم 'تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے بعد کے سارے علماء قسامت کے قائل رہے ہیں۔ اگر چہ کیفیت قسامت میں اختلاف رہا ہے۔ ایک جماعت سے قسامت کا ابطال بھی مروی ہے۔

"قسامت" کی لغوی تحقیق:

یہ لفظ قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ صاحب مغرب لکھتے ہیں "القسم" کے معنی ہیں "الیمین" (حلف) اور بطور فعل کے باب افعال سے مستعمل ہے۔ کہتے ہیں: **أقسم باللّٰه**۔ (اللہ کی قسم کھانا) قسامہ اس کا اسم ہے، جو موضع أقسام میں مستعمل ہے۔ قسم کھانے والوں کو "**قسامة**" کہا جاتا ہے۔ قسم کھا کر اپنا حصہ ثابت کر کے لینے والے لوگوں کو بھی "**قسامة**" کہا جاتا ہے۔

شمنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لغوی اعتبار سے "**قسامة**" **أقسم** کا مصدر ہے، یا اس کا اسم مصدر ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اہل لغت اس لفظ کا اطلاق "حالفین" پر کرتے ہیں۔ "**تسمية المسمّٰى باسم المصدر**" کے قبیل سے ہے۔ چنانچہ یہ "**رجل عدل**" کی طرح ہے۔

عرض مرتب: **القسامة**: علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: قسامت ان قسموں کو کہا جاتا ہے جو اس محلّہ کے لوگوں سے لی جاتی ہیں جہاں مقتول پایا گیا ہو۔ "قسم" اصل کے اعتبار سے مطلق یمین کو نہیں کہتے، بلکہ "قسم" اسی "**قسامة الایمان**" سے ماخوذ ہے...... اھ۔ (**طلبة الطلبة: ۳۳۲**)

قسامت کا سبب

قسامت کا سبب مقتول کا محلّہ میں یا محلّہ کے قائم مقام کسی مقام پر پایا جانا ہے۔

قسامت کا رکن

قسامت کا رکن حالفین کا یہ حلف ہے کہ اللہ کی قسم ہم نے اس مقتول کو قتل نہیں کیا اور نہ ہمیں اس کے قاتل کا علم ہے۔

قسامت کی شرط

قسامت کی شرط یہ ہے کہ حالف آزاد عاقل بالغ مرد ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عورتیں قسامت خطا میں تو شریک ہوں گی، لیکن قسامت عمد میں شریک نہ ہوں گی۔

قسامت کا حکم

اس کا حکم یہ ہے کہ قسمیں لینے کے بعد وجوب دیت کا فیصلہ صادر ہوگا۔ خواہ دعویٰ قتل عمد سے تعلق رکھتا ہو، خواہ قتل خطا سے تعلق ہو۔

''قسامت'' کب شروع ہوتی ہے؟

قسامت اس وقت شروع ہوتی ہے جب کوئی شخص کسی ایسی جگہ پر مقتول پایا جائے جو جگہ کسی فرد واحد یا کچھ افراد کی مشترک ملکیت میں ہے، اور اس قتل کے واقعہ کو کسی نے نہ دیکھا ہو۔ مثلاً کوئی مقتول کسی شخص کے گھر میں پایا گیا، تو بھی قسامت واجب ہوگی، یا مقتول محلّہ میں ایسی جگہ پر پایا گیا جو پورے محلّہ کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی ہے۔

لیکن اگر وہ جگہ اہل محلّہ کی مشترک ملکیت نہیں ہے، مثلاً شارع عام ہے اور اس پر کوئی مقتول پایا گیا تو قسامت واجب نہیں ہوگی۔

اولیاء مقتول اس محلّہ کے لوگوں کو متہم ٹھہرائیں جس محلّہ سے مقتول کی لاش برآمد ہوئی ہے۔ یا یہ کہیں کہ ہمارا گمان غالب تو یہی ہے کہ جس محلّہ سے لاش ملی ہے اسی محلّہ کے لوگوں نے قتل کیا ہے، یا کم از کم ان اہل محلّہ کو قاتل کا پتہ ہے۔ اس صورت میں قاضی اولیاء مقتول سے کہے گا کہ تم اہل محلّہ میں سے پچاس آدمی منتخب کرو جن پر تمہیں شبہ ہے۔ چنانچہ اولیاء مقتول اہل محلّہ میں سے پچاس آدمی منتخب کریں گے۔ پھر قاضی ان پچاس آدمیوں سے یہ کہے گا: تم سب ان الفاظ کے ساتھ قسم کھاؤ ''ہم قسم کھاتے ہیں کہ نہ ہم نے اس مقتول کو قتل کیا ہے اور نہ ہمیں اس کے قاتل کا پتہ ہے کہ کس نے قتل کیا ہے''۔

اگر وہ لوگ قسم کھانے سے انکار کریں تو ان کو قید میں رکھا جائے گا اور اس وقت تک انہیں نہیں چھوڑا جائے گا کہ جب تک ان میں سے کوئی قتل کا اعتراف نہ کرے، یا قاتل کا پتہ نہ بتادے کہ فلاں نے قتل کیا ہے، یا قسم کھانے پر راضی ہوجائیں اور اگر وہ پچاس افراد مندرجہ بالا الفاظ کے ساتھ قسم کھالیں تو اس کے نتیجہ میں پورے اہل محلّہ پر اس مقتول کی دیت واجب کردی جائے گی۔ دوسرے حضرات کے نزدیک اہل محلّہ قسم کھا کر دیت سے بری ہوجائیں گے۔ حنفیہ کے نزدیک اگر محلّہ میں پچاس آدمی پورے نہ ہوسکیں تو یہی آدمی جنہوں نے پہلے قسمیں کھائی ہیں دوبارہ قسمیں کھا کر پچاس قسمیں پوری کریں گے۔ شوافع اس کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اگر اولیاء مقتول یہ کہیں کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اہل محلّہ نے قتل کیا ہے یا کوئی اور شخص قتل کر کے یہاں ڈال گیا ہے۔ غرض یہ کہ اہل محلّہ کو متہم نہ ٹھہرائیں تو تب بھی قسامت واجب نہ ہوگی۔ طرفین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قسامت

اور دیت ''اہل خطہ'' پر لازم ہوگی نہ کہ باشندگان اور خریداروں پر۔ اگر چہ ان میں سے ایک ہی بیا ہو۔ اہل خطہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے امام نے اس خط کھینچا تھا اور اراضی کو اپنے خط کے ساتھ تقسیم کیا ہو جس وقت اس نے ان اراضی کو فتح کیا تھا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمام لوگ اس میں شریک ہوں گے۔ امام مالک امام شافعی، امام احمد، امام ابن ابی لیلیٰ ان تمام حضرات کا قول بھی یہی ہے۔ اور ''اہل سجن'' بمنزلہ باشندگان کے ہیں اس پر بھی حسب سابق اختلاف متفرع ہوگا۔

(ماخوذ از فوائد حدیث: ۳۵۳۲)

قسمیں کون کھائے گا؟

اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ ''قیامت'' میں قسمیں کون کھائے گا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام ابو حنیفہ کے اصحاب یہ کہتے ہیں کہ پچاس اہل محلہ کو قسمیں دی جائیں گی ان پچاس افراد کا چناؤ ولی مقتول کرے گا اور وہ یہ قسم کھائیں گے کہ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ نہ ہم نے اس کو قتل کیا ہے' اور نہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں۔ پس میں وہ قسمیں کھالیں گے تو ان پر' اہل محلہ پر اور اس کے عاقلہ دیت واجب ہو جائے گی۔

امام مالک' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فرماتے ہیں کہ ورنہ قسم کھائیں گے اور ان کے قسم کھانے سے حق واجب ہو جائے گا۔

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: قسامت کی صورت یہ ہے کہ کوئی مقتول کسی قبیلہ میں یا کسی محلّہ میں پایا جائے اور ولی مقتول کسی شخص یا کسی جماعت پر اس کو قتل کرنے کا دعویٰ کرے اور قرائن بھی اولیاء مقتول کے دعوے کی تائید کرتے ہوں مثلاً یہ قرینہ ہو کہ جن لوگوں کے خلاف دعویٰ ہے ان کے ساتھ مقتول کی پرانی عداوت چلی آرہی ہو۔ تو ولی مقتول مدعی بنے گا اور اہل محلّہ مدعیٰ علیہ ہوں گے۔

ہمارے علماء (حنیفہ) فرماتے ہیں قسامت کے لئے ضروری یہ ہے کہ دعویٰ میت کے بارے میں ہو جس کو کوئی زخم آیا ہو یا اس پر ضرب کا کوئی نشان ہو یا اس کا گلا کاٹا گیا ہو یا اس کے کان یا آنکھ وغیرہ سے خون نکلا ہو۔ میت کی قید حنیفہ کے ہاں احترازی ہے، وگر ہمارے نزدیک قسامت نہیں آئے گی اور نہ دیت لازم ہوگی امام احمد کا ایک قول، حماد اور ثوری کی ایک روایت بھی یہی ہے۔

امام مالک امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں۔ ''اثر'' شرط نہیں ہے بلکہ لوث شرط ہے۔ لوث سے مراد وہ چیز ہے جو مدعی کے دل میں یدا کردے۔ یعنی مقتول پر قتل کی کوئی نشانی پائی جائے۔ مثلاً اس کے کپڑوں پر خون لگا ہوا ہو یا اس کی تلوار خون آلودہ ہو، یا مقتول اور اس کے درمیاں کھلم کھلا عداوت ہو، یا کسی ایک عادل نے قتل کرتے دیکھا ہو لیکن ایک کی گواہی چونکہ عدالت میں مؤثر نہیں اس لئے قصاص کا دعویٰ نہیں کیا جائے گا۔ یا کئی آدمیوں نے قتل کرتے دیکھا ہو لیکن سب غیر عادل ہوں جن کی شہادت قاضی تسلیم نہیں کرتا۔ بشرطیکہ اہل محلّہ نے اس کو قتل کیا ہو۔ دلیل یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انصار سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا تمہارے مقتول پر کوئی علامت قتل ہے کہ نہیں؟ دوسری بات یہ کہ قتل بعض مرتبہ اس انداز سے ہوتا ہے کہ کوئی نشان قتل نہیں ملتا۔ مثلاً کسی کو خصتین دبا کر مارا ہو یا دل پر کوئی ضرب لگائی ہو، چنانچہ یہ اثر کے مشابہ ہے۔ ہمارا

مؤقف یہ ہے کہ دیت میں قسامت تعظیم دم کی وجہ ہے۔اس کو رائیگاں جانے سے بچانے کیلئے ہے اور یہ قتل میں ہو سکتا ہے۔ طبعی موت میں نہیں اور قتل کا پتہ کسی اثر سے ہی چلتا ہے۔اور جہاں تک تعلق ہے حدیث میں اثر کے عدم ذکر کا سو عدم ذکر ذکر عدم کو لازم نہیں۔(ماخوذ از فوائد حدیث:۳۵۳۱)

عرض مرتب: تقریر ترمذی میں اس بابت مزید تفصیل بھی مذکور ہے جو حسب ذیل ہے جب پچاس آدمی قسم کھا چکے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب اس مقتول کی دیت ادا کرو اس پر ان لوگوں نے کہا:

لا ایماننا دفعت عن اموالنا ولا اموالنا دفعت عن ایماننا۔یعنی نہ تو ہماری قسموں نے ہمارے مال کا دفاع کیا اور نہ ہمارے مال نے ہمارا دفاع کیا۔ان کا مقصد یہ تھا کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے خلاف مثلاً رقم کا دعویٰ کرے اور مدعی کے پاس بینہ نہ ہو تو مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی اگر وہ قسم کھالے تو دعویٰ خارج ورنہ جس رقم کا دعویٰ کیا ہے مدعی علیہ وہ رقم ادا کرے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مدعی علیہ قسم کھائے تو پیسے واجب نہیں ہوتے اگر پیسے دے دیتا ہے تو قسم واجب نہیں ہوتی دونوں چیزیں یکجا جمع نہیں ہو سکتیں، ایمان اموال کو دفع کرتا ہے اور اموال ایمان کو دفع کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: **(ما ایمانکم فلدفع القصاص عنکم)**

یعنی تم سے جو قسم لی گئی وہ اس لئے کہ تا کہ تم سے قصاص کو دفع کیا جائے لہٰذا قسم کھانے کا فائدہ یہ ہوا، کہ تم پر قصاص نہیں آیا **واما اموالکم فلان القتیل وجد بین ظھرانیکم** اور دیت اس لئے لی جا رہی ہے کہ مقتول تمہارے پاس پایا گیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **کذلك قضٰی رسول اللّٰہ (او کما قال رسول اللّٰہ)** اس طرح حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ فیصلہ مرفوع کے حکم میں ہو گیا اور یہ حدیث حنفیہ کا مذہب بیان کرنے میں بالکل صریح ہے اس لیے کہ اس میں ایمان اہل محلّہ کو دی گئی اور پھر دیت بھی ان پر واجب کی گئی۔

خیبر کے واقعہ کا جواب

خیبر کے واقعہ کے بیان میں روایات اتنی مختلف اور مضطرب ہیں کہ ان میں سے ایک کو ترجیح دینا اور دوسری کو مرجوح قرار دینا مشکل ہے حدیث باب میں جو روایت آئی ہے اس میں بے شک اولیاء مقتول کو قسمیں دی گئی لیکن دوسری روایت میں تفصیل ہے کہ قسمیں ابتداء ہی سے یہودیوں کو دی گئی صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے کہ ابتداء میں قسمیں اہل محلّہ ہی کو دی گئی اور جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جس میں یہ بیان ہے کہ ابتداءً اولیاء مقتول کو قسمیں دی گئی تو ان کے بارے میں میرا غالب بیان یہ ہے۔**واللّٰہ سبحانہ اعلم**۔کہ درحقیقت کہ اولیاء مقتول یعنی محیصہ اور حویصہ اور عبدالرحمٰن بن سہیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس جوش کے ساتھ آئے تھے کہ ہمیں یہودیوں سے قصاص لینے کا حق حاصل ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ ان کو یہودیوں نے قتل کیا ہے تو تمہیں چاہیے کہ تم بینہ پیش کرو گواہ لاؤ، اور اگر گواہ نہیں ہے تو تم خود گواہی دو کہ فلاں نے قتل کیا ہے۔یہ مطالبہ آپؐ نے ان سے اس لیے کیا تا کہ ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے اور اتمام حجت ہو جائے کہ جب تمہارے پاس گواہ نہیں اور تم قسمیں کھانے کو بھی تیار نہیں تو پھر کسی پر قصاص کا دعوی کیسے درست ہو سکتا

ہے۔لہٰذا اتمام حجت کے لئے ان سے قسم کا مطالبہ کیا بطور مشروعیت کے مطالبہ نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے جواب میں کہا: ''کیف تخلف ولم یشھد'' بہرحال اصل مطالبہ ان سے یہ کیا گیا تھا کہ تم گواہی دو لیکن بعض روایوں نے بالمعنی روایت کرتے ہوئے گواہی کے لفظ کو یمین کے لفظ سے تعبیر کر دیا کہ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ تم قسم کھاؤ اور گواہی دو اور قسم کھانا دونوں اعتبار سے اتنے قریب ہیں کہ ان میں صرف فنی فرق ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں گواہی کا لفظ موجود ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ ایک راوی شہادت کا لفظ استعمال کر رہا ہے اور اسی کو بیان کرنے کے لئے کسی راوی نے یمین کا لفظ استعمال کر لیا ہو ایسے موقع پر لفظ یمین بحیثیت یمین استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ بحیثیت یمین استعمال ہوا ہے۔

حنیفہ کا اِستدال:

پہلا استدلال

صحاح ستہ کی اس معروف حدیث سے ہے:

البینة علی المدعی والیمین علی من انکر''۔

اور قسامت میں مدعی اولیاء مقتول ہوتے ہیں اور اہل محلّہ منکر ہوتے ہیں اس لئے اس قاعدہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اہل محلّہ کو قسم دی جائے۔

دوسرا استدلال: ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں **عن وکیع عن اسرائیل عن الجااسحاق عن لحارث بن الازمع قال: قتیل بالیمن بین وداعة وأحب مکتب عامل عمر بن الخطاب الیه فکتب عمر: انَ قس مابین الحین'فالی ایهما کان أقرب فخذهم به۔ قال: فقاسوه فوجدوه أقرب الی وداعة'فاخذنا وأغرسنا وأحلفنا فقلنا: یا امیر المؤمنین أتحلفنا وتغر منا؟ قال نعم 'فاحلف خمیس رجلا بالله مافتلت ولا علمت قاتلاله۔**

تیسرا استدلال: **عن أبی سعیدا الخدریؓ ان قتیلا وجد بین الحسین فأمر النبی صلی الله علیه وسلم أن یقاس الی أیها أقرب فوجد أقرب الی أحد الحیین بشبر قال الخدری: کأنی انظر الی شبر رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم زفالقی دیته علیهم۔** اس سے ہمارے نے استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی دو بستیوں کے درمیان سواری پر مقتول پایا جائے تو قیامت واجب ہوگی اور دیت دونوں میں سے قریب ترین بستی پر ہوگی۔

شافعیہ کی طرف سے اعتراض اور اس کا جواب:

شافعیہ کی طرف سے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے نزدیک اولیاء مقتول پر قسم نہیں بلکہ اہل محلّہ پر قسم آئے گی اس لئے وہ منکر دعوی ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب اہل محلّہ قسم کھالیں تو ان پر کچھ واجب نہیں نہ قصاص اور نہ دیت۔ حالانکہ آپ کے نزدیک یہ مسئلہ ہے کہ اگر اہل محلّہ قسم کھالیں تو ان پر دیت واجب ہوگی

حنفیہ یہ فرماتے ہیں کہ اس اشکال کا جواب حضرت فاروق اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے وہ یہ کہ قسم ان سے اس لئے لی گئی تا کہ ان پر سے قصاص ختم ہو جائے اور دیت اس لئے واجب ہے کہ ان کی طرف سے حفاظت میں تقصیر اور کوتاہی پائی گئی اس وجہ سے ان پر دیت واجب ہوئی۔

شافعیہ فرماتے ہیں کہ خیبر کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دیت ادا فرمائی اور اہل محلہ پر واجب نہیں کی

حنفیہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیت بیت المال سے اس لئے ادا کی کہ وہ یہودی دیت ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے ورنہ اصل حکم یہی ہے کہ دیت اہل محلہ پر واجب ہوتی ہے۔

چنانچہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے یہودیوں پر ہی دیت واجب کی تھی لیکن بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کمزوری کو مدّنظر رکھتے ہوئے بیت المال سے دیت دے دی۔

قسامت کے نتیجہ میں دیت یا قصاص؟

شرح مسلم للنووی رحمۃ اللہ علیہ میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قسامت کے نتیجہ میں دیت واجب ہوتی ہے یا قصاص واجب ہوتا ہے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ واجب ہے۔ امام مالک امام احمد، امام اسحاق کے قول کے مطابق اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قولِ قدیم کے مطابق (اگر قتل عمد کا دعویٰ ہو تو) قصاص آتا ہے۔ کوفیوں کا اور امام شافعیؒ کا ان کے دو اقوال میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ قصاص واجب نہیں ہوگا بلکہ دیت واجب ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فریق ثانی کا مستدل:

"استحقوا قتیلکم" کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ عموماً اس وقت استعمال ہوتے ہیں

جب قاتل کو قصاص لینے کے لئے اولیاءِ مقول کے حوالہ کر دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قسامت کے نتیجہ میں قصاص بھی آ سکتا ہے حنفیہ کی دلیل: حنفیہ یہ فرماتے ہیں کہ دوسری روایات میں اس بات کی صراحت ہے کہ قسامت کے نتیجہ میں دیت واجب ہوتی ہے۔

فریق ثانی کی دلیل کا جواب

یہ ہے کہ "قسامت" اثبات کا ایک ضعیف واقعہ ہے۔ اس سے قصاص اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک گواہی اور بینہ نہ ہو۔ شافعیہ بھی یہی کہتے ہیں۔

الفصل الاول:

۳۵۳۱: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ وَسَهْلِ بْنِ اَبِي حَثْمَةَ: اَنَّهُمَا حَدَّثَا اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ سَهْلٍ وَمُحَيِّصَةَ بْنَ مَسْعُوْدٍ اَتَيَا خَيْبَرَ، فَتَفَرَّقَا فِي النَّخْلِ، فَقُتِلَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَهْلٍ، فَجَاءَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ سَهْلٍ وَحُوَيِّصَةُ وَمُحَيِّصَةُ ابْنَا مَسْعُوْدٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَتَكَلَّمُوْا فِي اَمْرِ صَاحِبِهِمْ، فَبَدَأَ

عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَكَانَ اَصْغَرُالْقَوْمِ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: كَبِّرِ الْكُبْرَ، قَالَ يَحْيٰى بْنُ سَعِيْدٍ: يَعْنِيْ لِيَلِيَ الْكَلَامَ الْاَكْبَرُ، فَتَكَلَّمُوْا، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: اسْتَحِقُّوْا قَتِيْلَكُمْ اَوْ قَالَ: صَاحِبَكُمْ بِاَيْمَانِ خَمْسِيْنَ مِنْكُمْ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَمْرٌ لَمْ نَرَهُ، قَالَ: فَتُبْرِئُكُمْ يَهُوْدُ فِيْ اَيْمَانِ خَمْسِيْنَ مِنْهُمْ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَوْمٌ كُفَّارٌ، فَفَدَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مِنْ قِبَلِهٖ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) تَحْلِفُوْنَ خَمْسِيْنَ يَمِيْنًا، وَتَسْتَحِقُّوْنَ قَاتِلَكُمْ اَوْصَاحِبَكُمْ، فَوَادَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مِنْ عِنْدِهٖ بِمِائَةِ نَاقَةٍ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٣٥/١٠ الحديث رقم ٦١٤٢۔ ٦١٤٣ ومسلم في ١٢٩٢/٣ الحديث رقم (٢۔ ١٦٦٩)۔ والترمذي في السنن ٢٢/٤ الحديث رقم ١٢٢۔ والنسائي في ٧/٨ الحديث رقم ٤٧١٢۔ وأخرجه مالك في الموطا ٨٧٧/٢ الحديث رقم ١ من كتاب القسامة واحمد في ١٤٢/٤۔

ترجمہ: ''حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ دونوں روایت بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ اور محیصہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خیبر آئے تو (ایک دن سیر کرتے ہوئے) دونوں کھجور کے درختوں میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے (یعنی ایک کسی اور سمت کو نکل گیا اور دوسرا کسی اور سمت کو چلا گیا) چنانچہ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کو (اکیلا پا کر) کسی نے قتل کر دیا (اس حادثہ کے بعد عبدالرحمٰن بن سہل جو (مقتول کے حقیقی بھائی تھے) اور مسعود کے دونوں بیٹے حویصہ رضی اللہ عنہ اور محیصہ رضی اللہ عنہ (جو مقتول کے چچازاد بھائی تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے (مقتول) ساتھی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے' (یعنی چبت کا ارادہ کیا) تو عبدالرحمٰن نے گفتگو کی ابتداء کی (جو مقتول کے حقیقی بھائی تھے اور تینوں میں) سب سے چھوٹے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ اپنے بڑے کے بڑے پن کو ملحوظ رکھو' (یعنی تم تینوں میں جو شخص سب سے بڑا ہے اس کو گفتگو کی ابتدا کرنے دو) حضرت یحییٰ بن سعید (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ جو شخص سب سے بڑا ہو وہ گفتگو کا ذمہ دار ہو' چنانچہ (اس کے بعد) انہوں نے (یعنی ان کے بڑے نے) گفتگو کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم میں سے پچاس آدمی قسم کھالیں تو تم اپنے مقتول یا (اپنے مقتول کی بجائے) یہ فرمایا کہ اپنے ساتھی (کی دیت یا قصاص لینے کے) مستحق بن ہو''۔ انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! یہ تو ایسا معاملہ ہے جس کو ہم نے نہیں دیکھا ہے (یعنی ہم یہ قطعاً نہیں جانتے کہ مقتول کو کس نے قتل کیا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پچاس یہودی قسم کھا کر (تمہارے اس شبہ سے) تمہیں پاک کر دیں گے (یعنی وہ یہ قسم کھالیں گے کہ مقتول کو ہم نے قتل نہیں کیا ہے اور اس طرح ان پر جو قتل کا شبہ یا الزام ہے اس کو وہ ختم کر دیں گے) انہوں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! وہ تو کافر ہیں (ان کی قسموں کا اعتبار ہم کیسے کرلیں؟ ان کے قسموں کا تو ویسے بھی اعتبار نہیں ہے) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (فتنہ دفع کرنے کے لئے) مقتول کے ورثاء کو اپنی طرف سے دیت ادا کی'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) تم پچاس آدمی قسمیں کھاؤ اور اپنے مقتول یا یہ فرمایا کہ اپنے ساتھی کی دیت کے مستحق بن جاؤ (اس کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

طرف سے سواونٹ دیت کے طور پرادا کر دیئے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله ان عبد الله بن سهل ومحيصة بن مسعود أيتاً خيبر:

راویٔ حدیث:

محیصۃ بن مسعود۔ یہ "محیصہ" ہیں۔ مسعود کے بیٹے ہیں۔ اور انصاری وحارثی ہیں۔ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اوران میں ہی ان کی حدیثیں ملتی ہیں۔ غزوہ احد غزوۂ خندق اوراس کے بعد دیگر غزوات میں حاضروشریک ہوئے۔ ان سے ان کے بیٹے "سعد" نے روایت کی۔ محیصہ میں میم پر پیش اور حاء غیر منقوطہ پر زبر اور یاء مشدد کے نیچے زیر اور صاد غیر منقوطہ پر زبر ہے۔

قاموس میں لکھتے ہیں حویصہ اور محیصہ میں صاد مشدد ہے۔ یہ دونوں مسعود کے بیٹے ہیں۔ دونوں صحابی ہیں۔ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ مؤطا کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یائے مکسورہ کے ساتھ پڑھنا زیادہ مشہور لغت ہے۔ "التقریب" میں ہے کہ ان دونوں اسماء میں یاء مشدد مکسور اور ساکن مخفف دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ البتہ تشدید زیادہ مشہور ہے۔ تصحیح متن والے نسخوں اوراصول میں بھی اسی طرح ضبط کیا گیا ہے۔

قوله: فتفر قافي الذخل۔۔۔ كبر الكبر: نخل: اسم جنس ہے، نخیل کے معنی میں ہے۔

قتل عبدالله: ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔

"كبر الكبْر": کاف کے ضمہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں: **أى عظم من هوا كبر منك** ۔یعنی ان کو کلام میں پہل کرنے دو اور بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بات چیت کے لئے ان کو بڑا بناؤ۔ ایک روایت میں **"الكبر الكبر"** ہے۔ **أى كبر الكبر**۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات میں **"الكبر الكبر"** ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: کہا جاتا ہے: **فلان كبر قومه**۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ مورث اعلیٰ سے قریب النسب ہو۔ اس حدیث میں امت کی رہنمائی فرمائی ہے کہ عمر میں بڑے شخص کو مقدم کیا جائے اور ایک روایت میں **" كبر الكبر "** کے الفاظ ہیں۔ یعنی بڑے کو مقدم کرو۔ **قدم الاكبر**۔

قوله: قال يحى بن سعيد۔۔۔ فتكلوا: ليلى الكلام الاكبر: "الكلام" منصوب ہے اور " الاكبر" مرفوع ہے۔ "لیلی" یہ " **ولى الامر وتولاه**" سے ماخوذ ہے۔ **(كذا فى المغرب)**

ففداهم رسول الله صلى الله عليه وسلم من قبله۔

ابن الملک اور قاضی کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ اس موقع پر مقتول کی دیت نبی کریم علیہ السلام نے اپنے پاس تین درجہ سے ادا فرمائی:

① فتنہ وفساد رفع کرنے کے لئے۔

② نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کا خون رائیگاں جانے کو ناپسند سمجھا۔

۳ یہود کو قسمیں دینے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا اور مدعی ان کی قسموں کا اعتبار کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

بعض نسخوں میں "لیلی" کے دونوں لام مکسور اور دونوں یائیں مفتوح ہیں۔ بظاہر آخری یاء ساکن ہے۔ یہ اس لغت پر محمول ہے جس میں مجزوم بحذف العلۃ کو حذف نہیں کرتے۔ یہ ساری تقریر اس تقریر پر ہے کہ "کبر الاکبر" کے معنی میں ہو اور لام "لام امر" ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ لام تعلیلیہ ہو اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: **انما قال صلی اللہ علیہ وسلم: کبر الکبر لیلی الکلام الاکبر۔** اس تقدیر پر کوئی اشکال لازم نہیں آتا' واللہ اعلم بالحال۔

فائدہ : ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

۱ جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہو وہ اعزاز و اکرام کا زیادہ حقدار ہے۔

۲ گفتگو کی ابتداء کا حق اس شخص کو حاصل ہے جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہو۔

۳ حدود کے مطالبہ کے لئے وکالت جائز ہے۔

۴ حاضر شخص کی وکالت بھی جائز ہے' چونکہ مقتول کے ولی الدم عبدالرحمٰن بن سہل تھے جو مقتول کے بھائی تھے اور حویصہ اور محیصہ ان کے چچازاد بھائی تھے اور اس وقت گفتگو کے موقع پر بھی موجود تھے۔

قولہ: فقال النبی ﷺ: اسحقوا ۔۔۔ بایمان خمسین منکم:

استحقوا : صیغہ امر کے ساتھ ہے۔ اس میں تغلیب ہے' وارث کو غیر وارث پر غلبہ دیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی بطور "**استحقوا قتلیکم** :" حاء کے نہیں تھا' بلکہ مسئلہ کے فتویٰ کے طور پر تھا۔ چونکہ اس موقع پر خصم تو موجود نہیں تھا۔ حنیفہ کا مذہب اور امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ اس کا استحقاق سے مراد دیت کا استحقاق ہے۔ امام مالک و امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کا قول اور امام شافعیؒ کا قول قدیم یہ ہے کہ قصاص کا استحقاق مراد ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

أو قال صاحبکم: راوی کو (الفاظ کے بارے میں) شک ہے

معکم: اس سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت میں یمین کی ابتداء مدعی سے ہوگی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما یہی فرماتے ہیں' یا یہ حکم قیامت ہی کے ساتھ خاص ہے اس پر دیگر احکام کو قیاس نہیں کیا جا سکتا' شارع کو تخصیص کا حق حاصل ہے۔

بایمان خمسین : اضافت کے ساتھ ہے۔ ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے۔ ضمیہ **قولہ: یا رسول اللہ ﷺ أمر لم لرہ ۔۔۔ فی ایمان خمسین بینهم**۔ اصل عبارت یوں ہے: **صدور القتل أمر لم نرہ** (یعنی مبتدا محذوف ہے' امر خبر ہے اور "**لم لزہ**" یہ جملہ محل رفع میں امر کی صفت ہے)۔

فتبرٔکم: رائے مشدد و مخففہ کے ساتھ ہے۔

قوم کفار : (ہم مبتدا محذوف کی خبر ہے) **ای ہم قوم کفرۃ**۔ شمنیؒ فرماتے ہیں: اصحاب کتب ستہ نے سہل بن ابی حثمہ سے روایت کیا ہے: **قال: حرج عبد اللہ بن سهال بن ابی زید ومحیصة بن مسعود بن زید حتی اذا کا نا بخیر نفرقًا فی بعض ماهنا لك ثم اذا محیصة یجد عبد اللہ سهل قتیك فذفنه ثم أقبل الی رسول اللہ ﷺ هود**

حویصة بن مسعود وعبد الرحمن بن سهل وكان اصغر القوم فذهب عبد الرحمن ليتكم قبل صاحبه فقال له رسول الله ﷺ: الكبير خمسين ليمينا وتستحقوق دم صاحبكم ؟ قالوا كيف ولم تشهد۔وفی لفظ يقسم خمسون منكم على رجل منهم فيد فع يرمته ۔قالوا: لم شهده كيف تحلف؟قال تحلف لكم يهود قالوا: نيسوامسلمين۔ وفی لفظ كيف تقبل ايمان قوم كفار؟فوداه رسول الله ﷺ بمائة من ابل الصدقة۔ قال سهل: فلقدر كضتنى منها ناقة حمراء۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِىْ

''اوراس باب میں دوسری فصل نہیں ہے (چونکہ مصابیح میں۔ یہاں احادیث حسان موجود نہیں ہیں)''۔

الفصل الثالث:

۳۵۳۲:عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ :اَصْبَحَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ مَقْتُوْلاً بِخَيْبَرَ فَانْطَلَقَ اَوْلِيَاءُهٗ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ :اَلَكُمْ شَاهِدَانِ يَشْهَدَانِ عَلٰى قَاتِلِ صَاحِبِكُمْ : قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَمْ يَكُنْ ثَمَّ اَحَدٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ' وَاِنَّمَا هُمْ يَهُوْدُ' وَقَدْ يَجْتَرِؤُنَ عَلٰى اَعْظَمَ مِنْ هٰذَا' قَالَ: فَاخْتَارُوْا مِنْهُمْ خَمْسِيْنَ' فَاسْتَحْلِفُوْاهُمْ' فَاَبَوْا فَوَدَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مِنْ عِنْدِهٖ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤/٦٦١ الحديث رقم ٤٥٢٤۔

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص (یعنی عبداللہ بن سہل) خیبر میں قتل کر دیئے گئے۔ چنانچہ ان کے ورثاء (یعنی ان کا بیٹا اوران کے دو چچازاد بھائی) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اس کے متعلق تذکرہ کیا' آپ ﷺ نے (ان سے) فرمایا کہ ''کیا تمہارے پاس دو (عادل) گواہ ہیں جو تمہارے مقتول ساتھی کے قاتل کے بارے میں گواہی دیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! وہاں (یعنی جائے حادثہ پر) کوئی مسلمان موجود نہیں تھا البتہ یہود موجود تھے وہ تو اس سے بھی بڑے کام کی جرأت رکھتے ہیں (جیسے (نفاق' اللہ اور اس کے رسول کو دھوکہ دینا' انبیاء کو قتل کر دینا' کلام اللہ میں تحریف کرنا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اچھا تم ان میں سے پچاس آدمیوں کو منتخب کرلو اوران سے قسمیں لو''۔ لیکن انہوں نے (یعنی مقتول کے ورثاء) نے یہودیوں سے قسم لینے سے انکار کر دیا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقتول کی دیت اپنے پاس سے ادا کی۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: انما هم يهود:

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مبتدا اور خبر دونوں کو معرفہ لایا گیا ہے۔ اور ''انما'' مفید حصر ہے۔ یہ اسلوب بیان یہودیوں کی مذمت بیان کرنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا یہ قول:

أنا أبو النجم وشعرى شعرى

عرض مرتب:

اس کی ایک واضح مثال ہمارے آج کل کا یہ مشہور جملہ ہے: ''ویوز'' نام ہی کافی ہے۔اھ۔
یعنی اس واقعہ پر ہمارے پاس دو گواہ نہیں، اوران کی صورتحال یہ ہے کہ یہ قتل مسلم ہی نہیں بلکہ ہر بڑے سے بڑا گھناؤنا گناہ کرگزرتے ہیں۔ فاحتاروا۔۔۔۔فاستحلفوم: یہ دونوں فعل بصیغۂ امر ہیں
میں کہتا ہوں ظاہر حدیث حنیفہ کے مذہب کی بابت بالکل صریح ہے۔

بَابُ قَتْلِ اَهْلِ الرِّدَّةِ وَالسُّعَاةِ بِالْفَسَادِ

مرتدین ومفسدین کو قتل کردینے کا بیان

''سعاۃ'' سین کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ ''ساعی'' کی جمع ہے۔

الفصل الاول:

زندیق ومرتد کی سزا

۳۵۲۳: عَنْ عِكْرَمَةَ قَالَ: اُتِيَ عَلِيٌّ بِزَنَادِقَةٍ فَاَحْرَقَهُمْ فَبَلَغَ ذٰلِكَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ لَوْ كُنْتُ اَنَا لَمْ اُحْرِقْهُمْ لِنَهْيِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللّٰهِ وَلَقَتَلْتُهُمْ لِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ! مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۶۷/۱۲ الحدیث رقم ۶۹۲۲۔ وابوداوٗد فی السنن ۵۲۰/۴ الحدیث رقم ۴۳۵۱۔ والترمذی فی ۴۸/۴ الحدیث رقم ۱۴۵۸۔ والنسائی فی ۱۰۴/۷ الحدیث رقم ۴۰۵۹۔ وابن ماجه فی ۸۴۸/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۵۔

ترجمہ: ''حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کچھ زندیق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں لائے گئے توانہوں نے ان کو جلا ڈالا (یعنی ان کو جلانے کا حکم دیا' چنانچہ ان لوگوں کو جلا دیا گیا۔) پھر جب اس بات کی خبر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ''اگر میں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ممانعت فرمائی ہے کہ کسی شخص کو ایسے عذاب میں مبتلا نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح ہو (جیسے کسی کو آگ میں جلانا) بلکہ میں ان کو قتل کر دیتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس شخص نے اپنا دین بدل ڈالا اس کو قتل کردو''۔ (بخاری)

تشریح: ''بزنادقة:'' اصل میں ''زنادیق'' تھا، یاء کو تائے مدورہ سے بدل دیا گیا زندیق کی جمع ہے۔
صاحب قاموس کا کہنا ہے کہ ''زندیق'' زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ثعلب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ''زندیق'' اور

''فرزین''، یہ دونوں لفظ کلام عرب میں سے نہیں ہیں۔اس لفظ کی اصل میں دوقول ہیں:

① صاحب قاموس کا کہنا ہے کہ''زندیق''، زن دین یعنی دین المرأة (عورت کے دین والا) سے معَرب ہے۔

② قاضی کا کہنا ہے کہ یہ''زند'' سے معرب ہے زردشت مجوسی کی کتاب''زند'' کے پیروکار تھے۔لیکن بعد میں ہر ملحد ملحدی الدین کوزندیق کہا جانے لگا۔اھ۔عام لوگ ان کوملحد دہری کہتے ہیں

عرض مرتب:

ابن عصفور رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ''زنادقة'' کی تاء''زناديق'' کی یاء کے عوض آئی ہے۔

(الممتع الکبیر ص۳۱۶)

زنادقہ سے کون مراد ہے؟

اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

① اس سے مراد مرتدین ہیں۔

② اس سے مراد ملحدین ہیں۔

③ صاحب قاموس لکھتے ہیں:

(ا) یہ''ثنویہ''میں سے ہے۔

(ب) اس سے مراد نور وظلمت کے قائلین ہیں۔

(ج) اس سے مراد آخرت اور ربوبیت کے منکر ہیں۔

(د) جو باطن میں کفر رکھے اور اسلام کو ظاہر کرے۔

④ اس سے مراد بقائے دہر کے قائلین ہیں۔یعنی آخرت اور خالق کے منکر ہیں۔ان کا اعتقاد یہ ہے کہ اموال اور''حرم'' مشترک ہیں۔

(۸) جو کسی معبود کے قائل ہیں اور نہ کسی چیز کی حرمت کے قائل ہیں۔

(۹) قاضی فرماتے ہیں مجوس ہیں اور ان کو ثنویہ کہا جاتا ہے، ان کے نزدیک دو مبدأ ہیں: نور۔ان کے نزدیک یہ مبدأ خیر ہے۔۲ظلمت،ان کے نزدیک یہ مبدأ شرور ہے۔

(۱۰) لیث رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: زندیق معروف ہے۔ان کے زندقہ کی حقیقت یہ ہے کہ زندیق آخرت اور وحدانیت خالق پر ایمان نہیں رکھتا۔(۱۱) نووی فرماتے ہیں: زندیق وہ شخص ہے کہ جو شریعت کا منکر ہو۔

زندیق کی توبہ:

شرح مسلم نووی میں فرماتے ہیں: زندیق کی توبہ قبول کرنے کے بارے میں ہمارے اصحاب کا اختلاف ہے۔اس میں

پانچ اقوال ہیں:

① سب سے صحیح اور درست بات یہی کہ اس کی توبہ قبول ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ مطلقہ اس پر دال ہیں۔
② اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس کو قتل ہی کیا جائے گا لیکن اگر اس کی توبہ صادق ہوئی تو اس کو آخرت میں نفع دے گی، وہ جنت میں جائے گا۔
③ اگر ایک مرتبہ توبہ کرتا ہے تو توبہ قبول ہے، اگر مکرر کرتا ہے تو قبول نہیں کی جائے گی۔
④ اگر اس نے ابتداء اسلام بغیر کسی کی طلب کے قبول کیا تھا تو توبہ قبول کی جائے گی۔ اور اگر تلوار سے اسلام قبول کیا تھا تو توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔
⑤ اگر وہ گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے تو قبول نہیں کی جائے گی ورنہ قبول کی جائے گی۔ راجح یہ ہے کہ زندیق کی توبہ قبول نہیں ہے۔ (کذا فی الفتاوی لقارئ الھدایة)

الدرایہ میں فرماتے ہیں: زندیق کے بارے میں ہمارے ہاں دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی' جیسا کہ یہی قول امام مالک اور امام احمد کا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہے جیسا کہ یہی قول امام شافعیؒ کا ہے۔ یہ (تفصیل) تو دنیاوی احکام کے اعتبار سے ہے۔ جہاں تک معاملہ ہے اس کے اور اللہ کے درمیان تو اگر اس کی توبہ سچے دل کے ساتھ تھی تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرے گا۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مرتد کی سزا کے احکام:

تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس مسئلہ پر اجماع ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ وجوب قتل مرتد کے مسئلہ میں آزاد اور غلام سب برابر ہیں۔ اگر چہ غلام کو قتل کرنے کی صورت میں آقا کے حق کا ابطال لازم آتا ہے۔ واضح رہے کہ اس باب میں وارد روایات مطلق ہیں، ان میں حر یا عبد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

مرتدہ کی سزا کے احکام

حنفیہ کے نزدیک مرتدہ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ قید میں ڈال دیا جائے گا حتیٰ کہ اسلام قبول کر لے، یا مر جائے اور ۷۵ کوڑے مارے جائیں گے۔ قاضی خاں نے فتویٰ کے لئے اس کو مختار قرار دیا ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مرتدہ کو قتل کیا جائے گا۔ دلیل بخاری شریف میں مروی آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: **من بدّل دينه فاقتلوه**۔ اس حدیث کو دیگر محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ شیخین کی روایت میں آتا ہے: **أن النبي ﷺ نهى عن قتل النساء والصبيان**۔ یہ حدیث مطلق ہے جو کافر اصلی اور کافر عارضی دونوں کو شامل ہے۔ البتہ اس کے عموم میں تخصیص ہے "**من بدل الكفر الى الالسلام**" کے ذریعہ۔

ہاں اگر مرتدہ صاحب رائے ہو اور مقتدی ہو تو اس کو قتل کیا جائے گا، اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے فساد

فی الارض کے پیش نظر۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں: **عن أبی حنیفة عن عاصم بن أبی النجود عن أبی رزین عن ابن عباس قال: لا تقتل النساء اذاهن ارتددن عن الاسلام ، ولکن یحبسن وید عین الی الاسلام ویجبرن علیه۔**

حنیفہ کے معارض پہلی دلیل

دارقطنی نے حضرت جابرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ام مروان نامی ایک عورت مرتد ہوگئی۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا کہ اس کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ اگر اسلام کی طرف لوٹ آئے (تو ٹھیک) وگرنہ اسے قتل کر دیا جائے۔

اس حدیث کے دو جواب ہیں:

① عمر بن بکار کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے۔

② دوسری روایات کے معارض ہے۔ امام طبرانی سند حسن کے ساتھ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو یمن بھیجا تو فرمایا: **ایما رجل ارتدعن الاسلام فادعه، فان تاب فاقبل عنه وان لم یتب فاضرب عنقه وایما امراۃ ارتدت عن الاسلام فادعهافان تابت فاقبل منها۔ وأن أبت فاستتبها۔**

ابن معین سے مروی ہے کہ ثوری امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر یہ عیب لگاتے ہیں کہ اس روایت کو **عن عاصم عن ابی رزین** ابو حنیفہ کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے روایت نہیں کیا۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کو دارقطنی نے ابو مالک نخعی عن عاصم عن اَبی رزین روایت کیا ہے، لہٰذا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے میں منفرد نہیں ہیں۔

دارقطنی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے: **المرتدۃ تُستَاب ولا تقتل**۔ یہ روایت خلاس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

واضح رہے کہ یہاں اس سے مراد مرتدین ہیں، دلیل یہ ہے کہ ابوداؤد کی روایات میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کو جلا دیا تھا جو اسلام سے مرتد ہو گئے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ نے جلایا تھا یہ "سبائی" تھے۔ عبداللہ بن سبا کے پیروکار تھے اور یہ وہ شخص ہے جس نے فتنہ پیروی اور امت کو گمراہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا چنانچہ اس نے پہلی کوشش یہ کی کہ حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے بارے میں فتنہ بھڑ لایا، اور پھر جو ہوسوا ہوا (سب کو معلوم ہے) اور پھر شیعوں کے ساتھ جا ملا، پھر ان کے جاہل لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا، حتی کہ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دعویٰ کیا کہ وہ خدا ہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے توبہ کرانی چاہی تو ان لوگوں نے توبہ نہیں کی، جس کے نتیجہ میں آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو آگ میں ڈال کر جلا دیا جائے۔ واضح رہے کہ تشدید و تہدید کی خاطر کفار کو آگ میں جلانا جائز ہے جیسا کہ مثلہ بھی جائز ہے۔ بہر حال حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو جب اطلاع ملی تو آپؓ نے فرمایا: اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ان کو قتل کر دیتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اپنا دین بدل دے، اس کو قتل کر دو، اور میں ان کو جلاتا نہیں، اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے

(خاص) عذاب کی طرح عذاب مت دو۔(یعنی جلانے کا عذاب اللہ ہی دے سکتا ہے۔ دوسروں کے لئے جائز نہیں کہ وہ مخلوق خدا کو یہ عذاب دیں۔) بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے میرے اس جلانے پر تبصرہ کیا ہے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عبداللہ بن عباس سچ کہتے ہیں۔(واقعی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ کا عذاب دینے سے منع فرمایا ہے۔اس لئے مجھے ان کو آگ میں جلانا نہیں چاہیے تھا، بلکہ قتل کرنا چاہئے تھا ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کو اس ممانعت کا پتہ نہ ہو، اور اپنے اجتہاد کی بناء پر یہ فیصلہ کیا ہو۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عمل اپنی رائے اور اجتہاد سے تھا۔ توقیفی نہیں تھا۔ چنانچہ جب انہیں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول: **لو کنت انالم احرقھم۔** پہنچا تو فرمایا: **ویح أم ابن عباس۔** اکثر علم کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ قول مقام مدح میں واقع ہے۔ اور اس کی تائید شرح السنہ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے اس میں ہے کہ **فبلغ ذلك عليا' فقال: صديق ابن عباس۔**

عرضِ مرتب

اس حدیث کے آخر میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف چرند و پرند اور حشرات کے مارنے نہ مارنے کے بارے میں چند روایات ذکر کی ہیں، ہم نے ان روایات کو یہاں سے حذف کر کے ''**کتاب الصید و الذبائح**'' میں ذکر کیا ہے۔

مرتد کے احکام:

لکھتے ہیں: جب کوئی مسلمان نعوذ باللہ' اسلام سے پھر جائے تو اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جائے اگر وہ اسلام کے بارے میں کسی شک وشبہ کا شکار ہو تو اس کا شک وشبہ ان دو امور میں سے احسن امر کے ساتھ رفع کیا جائے گا' یا قتل یا اسلام اور اسلام ان دونوں امور میں سے بہترین امر ہے اور قدوری کے کلام کا ظاہر یہ تھا کہ اسلام پیش کرنا واجب ہے' فرمایا: مگر یہ کہ اسلام پیش کرنا جب کہ مشائخ نے فرمایا ہے کہ واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ اسلام کی دعوت اس کو پہلے ہی پہنچ چکی ہے اب اس کو تجدید دعوت کی احتیاج نہیں ہے۔

صاحب ''ہدایہ'' فرماتے ہیں: ایسے شخص کو تین دن کے لئے قید میں ڈال دیا جائے اگر وہ ان تین دنوں میں توبہ کر کے دائرۂ اسلام میں لوٹ آئے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے کیونکہ اسلام نے مرتد کی سزا قتل مقرر کی ہے ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: واضح رہے کہ یہ تین دن کی مہلت دینا بقول صاحب قدوری واجب ہے اور جامع صغیر میں ہے کہ مرتد کو اسلام کی دعوت دی جائے گی' پس اگر وہ (اسلام قبول کرنے سے) انکار کرے تو قتل کر دیا جائے گا' اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو تین دن مہلت دینا نہ واجب ہے' نہ مستحب ہے۔ تین دن کی مہلت اس لئے دی گئی ہے کہ اگر کوئی عذر ہے تو واضح ہو جائے۔ اس مسئلہ کی دلیل حبان بن منقذ کی حدیث ہے:

فی الخیار ثلاثة امام۔ کہ تین دن کی مہلت تامل کے لئے ہے، تاکہ فتنہ دور ہو جائے۔ دوسری دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عبد صالح والا قصہ ہے: ﴿قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا﴾

[الکہف:۷۶] ''انہوں نے کہا اگر میں نے اس کے بعد (پھر) کوئی بات پوچھوں (یعنی اعتراض کروں) تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے گا کہ آپ میری طرف سے عذر (کے قبول کرنے میں غایت) کو پہنچ گئے''۔

ایک روایت میں ہے: **عن عمر أن رجلا أتاه من قبل أبی موسٰی فقال له: هل من مغربة خبر؟ فقال نعم، رجل ارتد عن الاسلام ، فقتلنا فقال: هلا جستموه فی بیت ثلاثة أيام وأطعمتموه فی کل یوم رغیفا لعله یتوب ، ثم قال: اللهم انی لم احضر ، ولم آمر ، ولم أرض۔ اخر جه مالك فی المؤطا۔**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اظہار براءت وجوب کا مقتضی ہے۔اس میں یہ تاویل ممکن ہے کہ اس نے مہلت مانگی ہو۔

شیخین سے مروی ہے کہ تین دن کی مہلت دینا مستحب ہے، خواہ وہ مہلت طلب کرے یا نہ کرے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ امام پر تین دن کی مہلت دینا ضروری ہے تین دن سے پہلے قتل کرنا جائز نہیں ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح یہی کہ اگر توبہ کر لے ٹھیک ہے، ورنہ قتل کر دیا جائے، جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، نیز زیر بحث حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: **من بدل دینه فاقتلوه** (جس شخص نے اپنا دین اسلام تبدیل کر دیا اس کو قتل کر دو) سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کو مہلت دینا واجب نہیں ہے۔ہمارا اور امام شافعی کا مستدل مشترک ہے۔۔ یہ روایت مطلق ہے، اس میں انظار کی قید نہیں ہے، ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور ایک دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿ **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ** ﴾[التوبۃ:۵] ''تو (اس وقت) ان مشرکین کو جہاں پاؤ مارو''۔

اس آیت کریمہ میں مذکور حکم کا تعلق کافر حربی کے ساتھ ہے۔اس سے مہلت دینے کے استحباب کی نفی ہو رہی ہے۔ہم کہتے ہیں کہ امر کے یہ صیغے مطلق ہیں یہ علی الفور کا تقاضا نہیں کرتے چنانچہ عرف کے مطابق تاخیر جائز ہے۔

مرتد کی توبہ کی کیفیت:

① دین اسلام کے علاوہ تمام مذاہب سے براءت کا اظہار کرے، اگر مرتد ہونے کے بعد کوئی خاص دین اختیار کیا ہے تو صرف اس خاص دین سے اظہار براءت بھی کافی ہے۔

② **بعث بعد الموت** کا اقرار کرانا بھی مستحب ہے۔ائمہ ثلاثہ کا کہنا بھی یہی ہے۔

شرح الطحاوی میں ہے کہ امام ابو یوسف سے پوچھا گیا: **الرجل کیف یسلم؟** تو آپ نے فرمایا: وہ یہ کہے: **أشهد ان لا اله الا الله وأن محمدا عبده رسوله**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا اقرار کرے اور اس دین سے برأت کرے، جو دین اس نے اختیار کیا تھا۔

بار بار مرتد ہونے والے کے احکام:

اسلام قبول کرنے کے بعد اگر دوبارہ مرتد ہو جائے اور پھر توبہ کرلے تو اس کی توبہ کو قبول کر لیا جائے گا، حتیٰ کہ تیسری اور چوتھی بار کی توبہ بھی قبول کر لی جائے گی۔

اور اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے ﴿ **فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ** ﴾ [التوبہ:۵] ''پھر اگر

(کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوۃ دینے لگیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو' یہ آیت کریمہ مطلق ہے۔ کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تیسری بار کے بعد اگر پھر ارتدا داختیار کرلے اور فوری توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور مہلت نہ دی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ بار بار مرتد ہونے والے شخص کی توبہ بھی زندیق کی طرح قبول نہیں کی جائے گی۔ امام مالک، احمد اور لیث کا بھی یہی قول ہے، اور دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ [البقرہ:۱۳۷] ترجمہ: ''بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے''۔

ابن اہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمارے تمام اصحاب کا قول یہی ہے: **المرتد يستتاب أبدا** اور رہی بات کرخی کا کلام کی تو وہ نوادر میں منقول ہے اور اس کی دلیل ہم یہ کہتے ہیں کہ عدم مغفرت کا حکم [**ثم ازدادوا كفرا**] کی شرط پر ہے۔

۳۵۳۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ النَّارَ لَا يُعَذِّبُ بِهَا إِلَّا اللّٰهُ۔

(رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١١٥/٦ الحديث رقم ٢٩٥٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آگ کے عذاب میں تو صرف اللہ تعالیٰ ہی مبتلا کرے گا۔ (لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے علاوہ کسی اور کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کو (اس کے کسی جرم کی وجہ سے) آگ میں جلانے کی سزا دے''۔ (بخاری)

تشریح: قاضیؒ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ کے ذریعہ عذاب دینے سے منع فرمایا' چونکہ آگ کے ذریعے کسی کو عذاب دینا، سب سے بڑا عذاب ہے، (اس لئے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو آگ میں جلائے۔) اللہ عزوجل نے اسی وجہ سے کفار کو آگ کے عذاب کی وعید سنائی ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آگ کے ذریعہ عذاب دینے کی ممانعت شاید اس وجہ سے ہے کہ اللہ جل شانہ نے آگ کو مخلوق کے فائدے کی خاطر پیدا فرمایا ہے، لہٰذا مخلوق کو ضرر پہنچانے کے لئے آگ کا استعمال درست نہیں، لیکن اللہ جل شانہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو تعذیب بالنار کرے، چونکہ ربّ اور مالک ہے، آگ سے جو چاہے کرے، خواہ وہ دوسروں کو تعذیب بالنار دے، خواہ وہ دوسروں کو تعذیب بالنار سے منع کرے۔ چنانچہ حدیث مبارکہ میں لفظ ''رب النار'' ارشاد فرما کر اس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ ان دونوں مفاہیم کا ذکر اس آیت کریمہ میں بھی ہے ﴿نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ﴾ [الواقعہ: ۷۳]: ''ہم نے اسکو یاددہانی کی چیز اور مسافروں کے فائدہ کی چیز بنایا'' یعنی ہم نے آگ کو پیدا کیا تاکہ یہ جہنم کی یاد دلائے۔ اس کو دیکھ کر لوگوں کو جہنم کی آگ کی وعیدیں تازہ ہوں اور ہم نے تمام اسباب معاش آگ کے ساتھ معلق کئے ہیں۔

۳۵۳۵: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ سَيَخْرُجُ قَوْمٌ فِي اٰخِرِ الزَّمَانِ حُدَّاثُ الْاَسْنَانِ سُفَهَاءُ الْاَحْلَامِ يَقُوْلُ مِنْ خَيْرِ قَوْلِ الْبَرِيَّةِ لَا يُجَاوِزُ إِيْمَانُهُمْ حَنَاجِرَهُمْ

يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ فَاَيْنَمَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ فَاِنَّ فِي قَتْلِهِمْ اَجْرًا لِمَنْ قَتَلَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲۹۵/۱۲ الحديث رقم ۶۹۳۰۔ ومسلم في ۷۴۶/۲ الحديث رقم (۱۵۴۔ ۱۰۶۶) وابوداؤد في السنن ۱۲۴/۵ الحديث رقم ۴۷۶۷۔ واحمد في المسند ۱۳۱/۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب اس زمانہ کے آخر میں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو نوعمر اور کمزور عقل والے ہوں گے' لوگوں سے اچھی باتیں بیان کریں گے لیکن ان کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا' (ایمان سے مراد نماز ہے یعنی ان کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی) ؟ اور وہ لوگ دین سے اس طرح نکل بھاگیں گے جس طرح تیر کمان کے درمیان سے نکل جاتا ہے لہٰذا تم میں سے جس شخص کی ایسے لوگوں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو انہیں وہیں قتل کر دو کیونکہ ان کے قتل کرنے میں قاتل کے لئے قیامت کے دن (عظیم الشان) اجر وثواب ہے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: سيخرج قوم۔۔۔سفيه الاحلام: حداث**: حاء کے ضمہ اور دال مہملہ کی تشدید کے ساتھ، ایک روایت میں ''**حدثاء الاسنان**'' کے الفاظ ہیں۔ بہرحال ''**حداث**'' اور ''**حدثاء**'' حدیث کی جمع ہیں۔ جیسے ''**صغراء**'' صغیر کی جمع ہے۔ حدیث ''**قديم**'' کا متضاد ہے۔ ''**حداث**'' جمع غیر قیاسی ہے۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: یہ ''**حداثة السن**'' سے ماخوذ ہے۔ یہ ''شباب'' سے کنایہ ہے۔

عرض مرتب:

صاحب القاموس الوحید نے ''**الحداثه**'' کے معنی نوعمری، نوجوانی، نیاپن، تازگی، ابتداء اور جدّت بتلائے ہیں۔ اھ۔

سفهاء: یہ ''**سفيه**'' کی جمع ہے، جو ''**سفه**'' سے مشتق ہے۔ **السفه** کے اصل معنی ہیں: **الخفة و الطيش** (ہلکا پن خواہ جسم میں ہو، عمل میں یا عقل میں' اوچھاپن' عقل زائل ہونا)، اور ''**سفه فلان رأيه**'' اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنی رائے میں متردد ہو اور اس میں استقامت نہ ہو۔

أحلام: حلم۔ حاء کے کسرہ کے ساتھ۔ کی جمع ہے بمعنی ''**عقول**''۔

قوله: يقولون من خير قول البرية: البرية: باء کے ساتھ ہے، ہمزہ کے ساتھ بھی درست ہے۔ اکثر وبیشتر بمعنی ''**خليقة**'' (مخلوق) استعمال ہوتا ہے۔

حناجرهم: ''**حنجرة**'' کی جمع ہے۔ صاحب النہایہ نے اس کے معنی ''**رأس الغلصمة**'' بیان کئے ہیں (**غلصمة** کا معنی ہے سر اور گلے کے درمیان کا گوشت) اور ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ نے ''**حلقوم**'' بیان کئے ہیں۔

قوله: لايحاوز اليما نهم ...... : كما يمرق: صاحب ''الفائق'' لکھتے ہیں کہ ''**المروق**'' کے معنی ہیں ''**خروج**'' (نکلنا)، مرق اسی سے ماخوذ ہے۔ ''**المرق**'' **هو الماء الذى يستخرج من اللحم عند الطبخ للائتدام به**۔ (یعنی سالن کا شوربہ)۔

الرمية: راء کے فتحہ، میم کے کسرہ اور یائے تحتانیہ کی تشدید کے ساتھ وہ شکار جس پر تیر پھینکا جائے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں الرمية: "فعلية" بمعنی "مفعول" ہے۔ تاء مدورہ لفظ "رمية" کو وصفیت سے اسمیت کے معنی میں منتقل کرنے کے لئے لائی گئی ہے۔

امورِ نحویہ: يوم القيامة: مفعول فیہ ہے "اُجرا کے لئے" یا منصوب بنزع الخافض ہے۔ أی: الی يوم القيامة۔

مشکوٰۃ کے متن میں "من خير قول البيرية" کے الفاظ ہیں، جب کہ مصابیح میں "من قول خير البرية" کے الفاظ ہیں۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "خير البرية" سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "خير قول البرية" سے مراد "قرآن کریم" ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اولیٰ قرار دیا ہے چونکہ "يقولون" بمعنی تجدثون" ہے یا بمعنی "يأ خذون" ہے۔ ای یأ خذون ہے۔ أی خذون من خير ما يتكلم به البرية۔ اس کی تائید شرح السنۃ میں مروی اس روایت سے ہوتی ہے:

وكان ابن عمر برٰی الخوارج شرار خلق الله، وقال انهم انطلقوا الى آيات نزلت فی الكفار فجعلوها علٰى المؤمنين۔

اور ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: **يدعون الٰی كتاب الله، وليسوا منا فی شئ۔**

يمرقون من الدين:

اس کے دو مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "دین" سے مراد "امام کی طاعت" ہے، یعنی امام کی طاعت سے نکل جائیں گے، حالانکہ امام کی طاعت فرض ہے

② صاحب النہایۃ فرماتے ہیں: مراد یہ ہے کہ ان کا دین میں داخل ہونا، اس سے نکلنا، اور دین کو بالکل نہ تھامنا یہ (سارا عمل) اس تیر کی مانند ہے جو کسی شکار میں داخل ہوا، اس کے جسم کو چیرا اور پھر نکل گیا، اور اس سے تیر پر اس شکار کی کوئی چیز لگی ہوئی نہ ہو۔

اس حدیث کے مصداق کون لوگ ہیں؟

اس حدیث کا مصداق خوارج ہیں۔ جو کسی بھی امام کے مذہب کے قائل و پیرو کار نہیں ہیں۔ ان کا ظہور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوا۔ ان کی بڑی تعداد مقتول ہوئی۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ خوارج اپنی گمراہی کے باوجود ایک مسلمان فرقہ ہیں، ان سے مناکحت درست ہے، ان کا ذبیحہ حلال ہے، ان کی شہادت مقبول ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا کیا یہ کافر ہیں؟ آپؓ نے فرمایا: نہیں یہ کفر سے بھاگے ہیں۔ پھر پوچھا گیا: کیا یہ منافق ہیں؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: منافقین تو اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں اور یہ تو اللہ کا ذکر صبح و شام کرتے ہیں۔ پھر کہا

گیا: آخر یہ کون ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کو فتنہ نے گھیر لیا ہے۔ پس وہ اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں۔

۳۵۳۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: یَکُوْنُ اُمَّتِیْ فِرْقَتَیْنِ، فَیَخْرُجُ مِنْ بَیْنِهِمَا مَارِقَةٌ یَلِیْ قَتْلَهُمْ اَوْلَاهُمْ بِالْحَقِّ. (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٧٤٦/٢ الحديث رقم (١٥١)۔ ١٠٦٤)۔ واحمد في المسند ٣٢/٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کچھ دنوں بعد میری امت دو فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ان دونوں فرقوں کے درمیان سے ایک ایسی جماعت پیدا ہوگی جو حق کی اطاعت سے نکلنے والی ہوگی' اس جماعت کو موت کے گھاٹ وہ لوگ اتاریں گے جو حق سے زیادہ قریب ہوں گے۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: یاون فی امتی فرقتین:

یکون: ایک نسخہ میں (مؤنث کا صیغہ) ''تکون'' ہے۔

مارقة: مروق سے مشتق ہے بمعنی ''خارجة'' (اس کا موصوف محذوف ہے۔) أی: جماعة مارقة۔

یلی قتلهم ......: اشرفؒ فرماتے ہیں: یہ جملہ محل رفع میں ''مارقة'' کی صفت ہے۔

فرقتین سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت ہے۔ اور ''مارقة'' سے مراد ''خوارج'' ہیں۔

أولاهم بالحق اسکے دو مطلب ہو سکتے ہیں): ۱۔ أقربهم الی الصواب۔ (راستگی کے زیادہ قریب) ۲۔ أقربهم الی اللّٰه، اللہ سے زیادہ قریب) جیسا کہ اگلی حدیث میں آرہا ہے: کان أولٰی باللّٰه منهم۔

''أولاهم بالحق'' کا مصداق کون ہیں؟ کہا گیا ہے کہ اس کا مصداق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ چونکہ حضرت علیؓ اسی نے ان لوگوں کو قتل کیا' حتی کہ یہ فرقہ خارجہ تتر بتر ہو کر ''حضر موت'' اور ''بحرین'' میں پناہ گزین ہوا۔ (ذکرہ ابن الملک)

یکون أمتی فرقتین، فیخرج من بینهما مارقة: کلام کا اسلوب اس بات کا مقتضی ہے کہ ''جماعة مارقة'' کا مصداق دونوں جماعتوں کے افراد تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ درحقیقت اس آیت کریمہ کی مانند ہے ﴿یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ [الرحمٰن: ۲۲]: '' ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے'' صاحب کشاف اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی جب دونوں مل جائیں اور شی واحد کی طرح ہو جائیں تو یہ کہنا درست ہے کہ ''یخرجان منهما'' کہ ان دونوں سے موتی اور مونگا دونوں برآمد ہوتے ہیں جب کہا جاتا ہے: نخرجان من جمع البحر کہ موتی اور مونگا سارے دریا سے برآمد ہوتا ہے' حالانکہ برآمدگی سارے دریا سے نہیں ہوتی بلکہ دریا کے کچھ حصہ سے ہوتی ہے اور (اسی طرح) آپ کہتے ہیں: خرجت من البلدة کہ میں شہر سے نکلا' حالانکہ آپ شہر کے محلول میں سے کسی ایک محلّہ سے نکلے ہوتے ہیں بلکہ محلّہ کے گھروں میں سے ایک گھر سے نکلے ہوتے ہیں۔ ولایخرجان۔

لہٰذا اچھی بات یہی ہے کہ جملہ میں موجود پہلے ضمیر کو ''مارقة'' اور دوسری ضمیر کو ''أمتی'' کی طرف راجع قرار دیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اہل معصیت کی تکفیر میں غلو کرنے کی وجہ سے ان کو اہل حق کے ساتھ یک گونہ مشابہت ہے۔ لیکن وہ چونکہ اجماع کی مخالفت کے مرتکب ہیں لہٰذا وہ اہل باطل ٹھہرے۔ اسی وجہ سے ''فیخرج من بینهما'' ارشاد فرمایا۔

۳۵۲۷: وَعَنْ جَرِيْرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: لَا تَرْجِعُنَّ بَعْدِيْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٢٦/١٣ الحديث رقم ٧٠٨٠ ومسلم فی ٨١/١ الحديث رقم (١١٨۔ ٦٥)۔ وابوداوٗد فی السنن ٦٣/٥ الحديث رقم ٤٦٨٦ والترمذی فی السنن ٤٢١/٤ الحديث رقم ٢١٩٣۔ والنسائی فی ١٢٧/٧ الحديث رقم ٤١٣١۔ وابن ماجه فی ١٣٠٠/٢ الحديث رقم ٣٩٤٢۔ والدارمی فی ٩٥/٢ الحديث رقم ١٩٢١۔ واحمد فی المسند ٣٦٦/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر (مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا کہ ''خبردار! میرے بعد کفر کے ذریعہ پیچھے نہ پھر جانا کہ تم میں سے بعض ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگیں۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ فی حجة الوداع لا ترجعن بعدی کفارا:

الوداع: واؤ پر فتحہ اور کسرہ دونوں درست ہیں۔

لا ترجعن: عین کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کے مطلب میں سات اقوال ہیں:

① قتل ناحق کے حلال جاننے والے کے حق میں کفر ہے۔
② کفر سے مراد ''کفرانِ نعمت'' ہے۔
③ یہ عمل کفر کے قریب ہے کفر تک لے جاتا ہے۔
④ یہ عمل کفار کا ہے۔
⑤ کفر حقیقی مراد ہے۔ یعنی ہمیشہ مسلمان ہی رہنا کافر مت ہو جانا۔
⑥ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب ہے: **المتكفر بالسلاح**، (یعنی اسلحہ سے لیس مت ہو جانا......) چنانچہ عرب کہتے ہیں: **تكفر الرجل بسلاحه**' یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی اسلحہ زیب تن کر لے۔
⑦ تم ایک دوسرے کی تکفیر مت کرنے لگ جانا، کہ باہم قتل وقتال کو حلال جاننے لگو۔ چوتھا قول زیادہ ظاہر ہے، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب مختار بھی یہی ہے۔ اھ

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرے نزدیک تیسرا قول ''اظہر'' ہے اس کے درحقیقت دو ہی معنی ہیں یا یہ زجر وتہدید اور شدید تغلیظ پر محمول ہے۔

قوله: يضرب بعضكم رقاب بعض: يضرب: مرفوع ہے البتہ بعض علماء نے مجزوم ضبط کیا ہے۔ ابوالبقاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ جواب نہی ہے اور شرط مقدر ہے۔ **أی ان ترجعوا يضرب بعضكم رقاب بعض۔**

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: روایت مشہورہ کے مطابق یہ جملہ مستانفہ ہے۔ ''نہی'' کا بیان ہے۔ گویا کہ کسی سائل نے

پوچھا: کیف نرجع کفارا؟ ہم کافر کیسے ہو جائیں گے؟) تو ارشاد فرمایا: یضرب بعضکم رقاب بعض، وھو فعل الکفار (تم میں سے بعض کی گردنیں ماریں گے اور یہ کافروں کا کام ہے۔) ۔ یا یوں سوال کیا: لم نرجع کفارا؟ (ہم کیوں کافر ہو جائیں گے؟) تو فرمایا: یضرب بعضکم رقاب بعض وھو یؤدی الی الکفر۔ (تم میں سے بعض کی گردنیں ماریں گے اور یہ کام کفر تک لے جاتا ہے۔)

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: ۱ ترجعوا بعدی کفارا، یضرب بعضکم رقاب بعض ۔

① اس روایت کو احمد، شیخین، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے جریرؓ سے نقل کیا ہے۔ ② ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ ③ بخاری اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس روایت کو ابوبکرہؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے۔

۳۵۳۸: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا الْتَقَی الْمُسْلِمَانِ حَمَلَ اَحَدُھُمَا عَلٰی اَخِیْہِ السِّلَاحَ فَھُمَا فِیْ جُرُفِ جَھَنَّمَ فَاِذَا قَتَلَ اَحَدُھُمَا صَاحِبَہٗ دَخَلَاھَا جَمِیْعًا وَفِیْ رِوَایَۃٍ عَنْہُ قَالَ: اِذَا الْتَقَی الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفَیْھِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِی النَّارِ ۔ قُلْتُ: ھٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ قَالَ: اِنَّہٗ کَانَ حَرِیْصًا عَلٰی قَتْلِ صَاحِبِہٖ ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۲/۱۲ الحدیث رقم ٦٨٧٥۔ ومسلم فی صحیحه ۲۲۱٤/٤ الحدیث رقم (۱٦۔ ۲۸۸۸) وأخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤٦٢/٤ الحدیث عقم ٤٢٦٨ وأخرجه النسائی فی ۱۲٥/۷ الحدیث رقم ٤١٢٠ وابن ماجه فی ۱۳۱۱/۲ الحدیث رقم ٣٩٦٥ واحمد فی المسند ٤١/٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب دو مسلمانوں کی آپس میں اس طرح مڈبھیڑ ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنے دوسرے (مسلمان) بھائی پر ہتھیار اٹھائے تو وہ دونوں دوزخ کے کنارے پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر اگر ان میں سے ایک اپنے ساتھی کو قتل کر دے تو دونوں ایک ساتھ (دوزخ میں) ڈالے جائیں گے۔ ایک روایت میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یوں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو مسلمانوں کی آپس میں تلوار کے ساتھ مڈبھیڑ ہو (اور ان میں سے) ایک دوسرے کو قتل کر دے تو قاتل و مقتول دونوں ہی دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ قاتل کا حکم تو ظاہر ہے (کہ وہ ظلم کرنے کا باعث وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا) مگر مقتول کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ (کہ وہ تو مظلوم ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لئے کہ وہ بھی تو اپنے ساتھی (یعنی حریف) کو قتل کرنے پر آمادہ تھا (یہ اور بات ہے کہ اس کا وار خالی گیا اور دوسرا کا وار بھرپور پڑا)۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: اذا التقی المسلمان۔۔۔فیھا فی جرف جھنم:

حمل أحدھما علی أخیه السلاح: یہ جملہ ''شرط'' سے ''بدل'' ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ جملہ حالیہ ہے، ''قد'' مقدر ہے۔ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہے: اذا التقی المسلمان حاملا کل واحد منھما علی الآخر .

السلاح۔ یہ تقدیری عبارت، شرط و جزاء میں مطابقت کے لئے ضروری ہے۔ ''**فهما فی جرف جهنم**'' یہ جملہ جزا ہے۔

الجرف: اس لفظ کو دو طرح پڑھا جاتا ہے:

① جیم اور راء، دونوں کے ضمہ کے ساتھ، ② جیم کے ضمہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔

اس حدیث مبارکہ میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے ﴿ وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ﴾ [آل عمران: ۱۰۳] : ''اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے''

قوله: فاذا قتل احد هما صباحبه دخلاها جمعيا......:

فاذا قتل أحدهما صاحبه: فا عاطفہ ہے' باقی کلام شرط ہے اور ''**دخلاها جميعا**'' جزاء ہے۔ اس جملہ شرطیہ جزائیہ کا عطف ماقبل شرط اول پر ہے۔ ''دونوں کو ایک ساتھ دوزخ میں ڈالے جانے کا یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ ان دونوں میں سے ایک بھی حق پر نہ ہو۔

اذا التقى المسلمان بسيفيهما: بصیغۂ تثنیہ ہے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ناحق قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ ایک روایت میں ''**بسيفهما، فقتل أحدهما صاحبه**'' کے الفاظ ہیں۔

قلت هذا القاتل: ایک روایت میں ''**قلت**'' کی بجائے ''**قيل**'' ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ کسی حرام چیز کے ارتکاب کی محض آمادگی پر بھی مواخذہ ہوتا ہے چنانچہ صورتِ مذکورہ میں یہی نوعیت ہے کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی جان کے طلب گار ہوتے ہیں اپنے دفاع کا قصد نہیں ہوتا' حتی کہ اگر ان میں سے ایک اگر محض اپنے دفاع کا ارادہ رکھتا ہو اور اس کی نیت میں دوسرے کے قتل کی خواہش و ارادہ کا دخل نہ ہوتا اور اس کے پاس اپنے دفاع کے لئے اپنے مدمقابل کو قتل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہو اور اس کو قتل کر ڈالے تو اس سے مواخذہ نہ ہوتا کیونکہ شریعت نے ''دفاعی کارروائی'' کی اجازت دی ہے۔

فائدہ: ابن ماجہ نے اس حدیث کو ابو موسیٰ سے نقل کیا ہے۔

۳۵۳۹: وَعَنْ اَنَسٍ' قَالَ قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفَرٌ مِنْ عُكْلٍ' فَاَسْلَمُوْا فَاجْتَوَوُا الْمَدِيْنَةَ' فَاَمَرَهُمْ اَنْ يَّأْتُوْا اِبِلَ الصَّدَقَةِ' فَيَشْرَبُوْا مِنْ اَبْوَالِهَا وَاَلْبَانِهَا' فَفَعَلُوْا' فَصَحُّوْا' فَارْتَدُّوْا' وَقَتَلُوْا رُعَاتَهَا' وَاسْتَاقُوْا لْاِبِلَ' فَبَعَثَ فِيْ اٰثَارِهِمْ' فَاُتِيَ بِهِمْ' فَقَطَعَ اَيْدِيَهُمْ وَاَرْجُلَهُمْ' وَسَمَلَ اَعْيُنَهُمْ' ثُمَّ لَمْ يَحْسِمْهُمْ حَتّٰى مَاتُوْ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) فَسَمَّرُوْا اَعْيُنَهُمْ (وَفِي رِوَايَةٍ) اَمَرَ بِمَسَامِيْرَ' فَاُحْمِيَتْ فَكَحَلَهُمْ بِهَا وَطَرَحَهُمْ بِالْحَرَّةِ' يَسْتَسْقُوْنَ فَمَا يُسْقَوْنَ حَتّٰى مَا تُوْا . (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١١١/١٢ الحديث رقم ٦٨٠٤ ومسلم فی ١٢٩٦/٣ الحديث رقم (١٦٧١/٩)۔ وابوداؤد فی السنن ٥٣١/٤ الحديث رقم ٤٣٦٤ والترمذی فی ١٠٦/١ الحديث رقم ٧٢۔ والنسائی فی ٨٦١/٢ الحديث رقم ٢٥٧٨ وابن ماجه فی ٨٦١/٢ الحديث رقم ٢٥٧٨۔ واحمد فی المسند ١٦٣/٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ عکل کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا لیکن ان کو مدینہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی (جس کی وجہ سے وہ اس مرض میں مبتلا ہو گئے کہ ان کے پیٹ پھول گئے اور رنگ زرد ہو) گیا آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ شہر سے باہر صدقہ کے اونٹوں کے رہنے کی جگہ چلے جائیں اور وہاں ان اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پئیں' چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور صحت یاب ہو گئے پھر وہ (ایسی گمراہی میں مبتلا ہوئے کہ) مرتد ہو گئے اور مزید یہ کہ (مال کے لالچ میں) اونٹوں کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کو ہانک کر لے گئے (جب رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو) آپ ﷺ نے ان کے تعاقب میں (چند سواروں حضرت علیؓ وغیرہ کو) بھیجا جو ان سب کو پکڑ لائے۔ (ان کے اس جرم کی سزا کے طور پر) آپ ﷺ نے ان کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے (یعنی کاٹنے کا حکم دیا) اور ان کی آنکھوں میں سلائیں پھیر دیں' پھر ان کا خون روکنے کے لئے ان کو داغا بھی نہ گیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں (لوہے کی) سلائیاں پھیر دیں اور ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے (ان لوگوں کے لئے) سلائیوں کے بارے میں حکم صادر فرمایا تو انہیں تپایا گیا اور ان کی آنکھوں میں پھیرا اور ان کو دھوپ میں پھینک دیا گیا۔ انہوں نے (پیاس کی شدت کے باعث) پانی طلب کیا لیکن ان کو پانی نہ دیا گیا' یہاں تک کہ وہ مر گئے۔''

تشریح: قولہ: قدم علی النبی نفر۔۔۔ فاجتو وا المدینة:

قدم: دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

نفر: دونوں حرفوں کے فتحہ کے ساتھ۔ تین سے دس افراد تک کی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ آٹھ افراد تھے۔

من عکل: بخاری کی روایات میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض میں ''**عن عکل، أو عرینة**'' شک کے ساتھ ہے اور بعض میں ''**من عکل**'' ہے۔ بعض میں ''**من عرینة**'' ہے اور کچھ روایات میں ''**من عکل وعرین**'' بواسطہ حرف عطف کے ہے، اور یہی درست ہے عسقلانیؒ نے ''کتاب الوضوء'' میں ذکر کیا ہے کہ۔ **وسمل أعینهم:** ایک روایت میں **فسمروا أعینهم** ہے۔ تشدید و تخفیف کے دنوں کے ساتھ ہے۔ **أی کحلوا أعینهم بمسا میر حدید۔ فصحوا:** حاء کی تشدید کے ساتھ ہے' یعنی صحت یاب ہو گئے۔

عکل: عین کے ضمہ اور کاف کے سکون کے ساتھ' ایک قبیلہ کا نام ہے۔

اجتووا: اجتواء بمعنی ناپسند کرنا، موافق نہ ہونا سے مشتق ہے۔ **البلاد:** قیام پسند نہ کرنا۔ **قولہ: فارتدوا قتلوا.....**

فطر جهم بالحرة رعاة: (راء کے ضمہ کے ساتھ)۔ ''راعی'' بمعنی ''چرواہا'' کی جمع ہے۔

استاقوا: مجرد سے بھی آتا ہے۔ مبالغہ کا معنی پیدا کرنے کے لئے مزید فیہ سے لایا گیا ہے۔ علامہ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ شرح بخاری میں باب احکام المحاربین کے تحت لکھتے ہیں: **قولہ: وسم أعینهم:** ایک روایت میں **''وسمل''** لام کے ساتھ آیا ہے۔ یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ یہ بات ابن التین وغیرہ نے ذکر کی ہے۔ یہ محل نظر ہے۔ لیکن قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: **سمر**

العین تخفیف کے ساتھ اس کا معنی ہے، **کحلھا بالمسمار المحماۃ**، (تیز گرم سلائی آنکھ میں لگانا) پس یہ معنی ''سمل'' کے مطابق ہے۔ چونکہ ''سمل'' کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ سخت گرم لوہے کا ٹکڑا آنکھ کے (اس قدر) قریب کیا جائے حتی کہ آنکھ بینائی چلی جائے۔ لہٰذا یہ اول کے مطابق ہے بایں طور کہ لوہے کا ٹکڑا ''سلائی'' ہو۔ **فانہ فربأن یدنی من العین حدیدۃ معماۃ حتی یذھب نظرھا فیطابق الاول** فرمایا: بعض نسخوں میں ہم نے اس کو تشدید کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ پہلا ضبط زیادہ عمدہ ہے۔ (اہل لغت نے) ''السمل'' کی تفسیر'' کانٹے کے ذریعہ آنکھ پھوڑنا'' کی ہے یہاں یہ مراد نہیں ہے۔ **سمل العین سمولۃ**: آنکھ پھوڑنا (لوہے کی سلاخ یا گرم لوہے سے)۔

سمر: سُمرا و سُمورا العین: گرم سلائی سے آنکھ پھوڑنا۔ **فسمروا**: میم کی تشدید کے ساتھ، از باب تفعیل۔

لم یحسمھم: راء کے کسرہ کے ساتھ۔

فکحلھم: از باب تفعیل، آنکھ میں سرمہ ڈالنا۔

الحرۃ: راءَ کی تشدید کے ساتھ سیاہ پتھروں والی زمین کو کہتے ہیں۔

یہ آٹھ افراد تھے، ابوعوانہ اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انسؓ سے ان کی تعداد سات نقل کی ہے۔ ۴ کا تعلق ''عرینہ'' سے تھا، اور ۳ کا تعلق ''عکل'' قبیلہ سے تھا۔

قولہ: فأمرھم أن یاتوا ابل الصدقۃ۔۔۔ففعلوا و صحوا: اس ارشاد گرامی سے امام محمدؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت حلال ہے ان کا پیشاب بھی پاک ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کا گوبر ولید بھی پاک ہے۔ شوافع ان کے پیشاب اور گوبر کے نجس ہونے کے قائل ہیں۔ ہمارے اصحاب اور دیگر حضرات جو ان دونوں چیزوں کی نجاست کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ اونٹوں کا پیشاب تداوی کے لئے تھا۔ چنانچہ ہر نجس کے ساتھ تداوی درست ہے سوائے مسکرات کے۔ ان لوگوں کو صدقہ کے انٹوں کا دودھ پینے کی اجازت اس لئے دی کہ یہ لوگ محتاج وفقیر تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابویوسف کے نزدیک ان جانوروں کا پیشاب نجس (ناپاک) ہے

حدیث باب کا جواب ہے کہ ان لوگوں کے مرض کی نوعیت کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ان کے مرض کا علاج صرف اونٹ کا پیشاب ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص طور پر ان لوگوں کو اس کا حکم دیا۔

پھر امام ابوحنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اونٹ کا پیشاب پینا دوا کے علاوہ حلال نہیں ہے اسی طرح دوا کے طور پر پینا بھی حلال نہیں ہے' کیونکہ اس بات پر کوئی بھی متفق نہیں ہے کہ پیشاب میں کسی مرض کی شفا ہے' امام ابویوسف کے نزدیک کسی مرض کے علاج کے لئے پینا حلال ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں دلیل ہے کہ ابن السبیل کے لئے صدقہ کے اونٹوں کا دودھ استعمال کرنا جائز ہے اور ضرورت کے وقت تداوی بالحرام جائز ہے۔ بعض لوگوں نے تداوی بالخمر کو بھی اسی پر قیاس کیا ہے، اکثر حضرات نے اس سے منع فرمایا ہے، چونکہ طبائع میں اس کی طرف تو میلان پایا جاتا ہے۔ دیگر نجاسات میں نہیں۔ اھ۔

فقطع ایدیھم و أرجلھم: عسقلانی فرماتے ہیں: یعنی ہر ایک کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ دیئے۔لیکن ترمذی کی روایت کے الفاظ ''من خلاف'' اس معنی کو رد کر رہے ہیں۔

قولہ: وسمل أعینھم:

نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں:

① بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے جن میں حدود کی شرعی سزاؤں اور قزاقوں کی سزا کے بارے میں صریح احکام بیان کئے گئے ہیں اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ بھی اسی واقعہ کے بعد کا حکم ہے اس اعتبار سے یہ حدیث منسوخ ہے

② دوسرے بعض حضرات کا قول یہی ہے کہ یہ حدیث منسوخ نہیں ہے' بلکہ اسی موقع پر وہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں قزاقوں کی یہ سزا بیان کی گئی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی دے دی جائے اور یا ان کا ایک ہاتھ اور پیر کاٹ دیا جائے' لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو سزا دی وہ بطور قصاص تھی کہ انہوں نے اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا گیا۔

③ بعض کا کہنا ہے کہ مثلہ کی ممانعت نہی تنزیہی پر محمول ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو اس طرح سزا دی' اس کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں:

① ان لوگوں نے اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور قصاص ان لوگوں کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ کیا۔

② کیونکہ ان مفسدوں نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا یعنی مرتد بھی ہوئے' چرواہوں کو قتل بھی کیا اور قزاقی بھی کی کہ لوٹ مار کر کے سارے اونٹ لے گئے اور امام وقت کو حق پہنچتا ہے کہ اس قسم کے جرم کی صورت میں بطور سیاست (یعنی زجر و تنبیہ اور بمصلحت امن و انتظام) مجرم کو مختلف طرح کی سزائیں بیک وقت دے۔

قولہ: یستسقون فما یسقون حتی ماتوا:

یسقون: بصیغۂ مضارع مجہول ہے آخری وقت میں ان مفسدوں کو پانی نہیں دیا گیا اس کے بارے میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں کہیں یہ بات نہیں ہے کہ ان کو پانی نہ دینے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا تھا اور نہ ہی پانی سے منع فرمایا تھا (بلکہ لوگوں نے ان مفسدوں کے تئیں انتہائی نفرت اور غصہ کے اظہار کے طور پر از خود ان کو پانی نہیں دیا۔علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص سزائے موت کا مستوجب ہو چکا ہو اگر وہ اپنے قتل کے وقت پانی مانگے تو پانی دینے سے انکار نہ کرنا چاہیئے کہ ایسا کرنا اس کو دو عذابوں میں گرفتار کرنے کے مترادف ہے۔بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کا پانی نہ دینا درحقیقت یہ بھی قصاص کے طور پر تھا کہ ان مفسدوں نے بھی اونٹوں کے چرواہوں کو اسی طرح بغیر پانی کے تڑپا تڑپا کر مارا تھا چنانچہ ان کے ساتھ بھی یہی کیا گیا کہ جب انہوں نے پانی مانگا تو انہیں پانی نہیں دیا گیا ہمارے اصحاب فرماتے ہیں اگر کسی

شخص کے پاس وضو کے لئے پانی ہو، اگر کوئی مرتد پیاس کی وجہ سے مر رہا ہو تو اس کو پانی پلانا جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی ذمی یا جانور پیاس کی وجہ سے مر رہا ہو اس کو پلانا واجب ہے اس وقت تو اس پانی سے وضو کرنا جائز نہیں ہوگا۔

الفصل الثانی:

۳۵۴۰: عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحُثُّنَا عَلَى الصَّدَقَةِ وَيَنْهَانَا عَنِ الْمُثْلَةِ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۱۲۰/۳ الحدیث رقم ۲۶۶۷. وأخرجه الدارمی فی ۴۷۸/۱ الحدیث رقم ۱۶۵۶۔ واحمد فی المسند ۴۴۰/۴۔

ترجمہ: ''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صدقہ خیرات دینے پر ہمیں رغبت دلاتے تھے اور مثلہ سے ہمیں منع فرماتے تھے (ابوداؤد)

تشریح: المثلة: میم کے ضمہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ مثلہ اسم ہے صاحب النہایہ لکھتے ہیں:

مثلت بالقتیل، جدعت أنفه، أو أذنه، أو مذاكيره، أو شيئا من أطرافه۔

یعنی جسم کے کسی عضو، ناک، کان، شرمگاہ یا کسی اور حصہ کے کاٹ ڈالنے کو مثلہ کہتے ہیں۔

عرضِ مرتب

''مثلہ'' کے احکام پچھلی حدیث کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

۳۵۴۱: وارواه النسائی عن انس

ترجمہ: ''نسائی نے اس روایت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے''۔

أخرجه النسائی فی السنن ۱۰۱/۷ الحدیث رقم ۴۰۴۷۔

۳۵۴۲: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ! عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ، فَانْطَلَقَ لِحَاجَتِهٖ، فَرَأَيْنَا حُمَّرَةً مَعَهَا فَرْخَانِ، فَاَخَذْنَا فَرْخَيْهَا، فَجَاءَتِ الْحُمَّرَةُ، فَجَعَلَتْ تُفَرِّشُ، فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: مَنْ فَجَّعَ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا؟ اِلَيْهَا، وَرَأٰى قَرْيَةَ نَمْلٍ قَدْ حَرَّقْنَاهَا قَالَ: مَنْ حَرَّقَ هٰذِهٖ؟ فَقُلْنَا: نَحْنُ، قَالَ: اِنَّهٗ لَا يَنْبَغِيْ اَنْ يُّعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ۔

(رواه ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۱۲۵/۳ الحدیث رقم ۲۶۷۵۔ واحمد فی المسند ۴۰۴/۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبدالرحمٰن بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک مرتبہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ (ایک موقع پر) آپ ﷺ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے تو ہم نے ایک حمرہ (سرخ رنگ کی چڑیا) کو دیکھا جس کے ساتھ دو بچے تھے۔ ہم نے (اس کی غیر موجودگی یا موجودگی میں) ان دونوں

بچوں کو پکڑ لیا' اس کے بعد حمرہ آئی اور (اپنے بچوں کی آزادی کے لئے) پھڑ پھڑانے لگی۔ اتنے میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے' آپ ﷺ نے (جب حمرہ کو اس طرح بے تاب دیکھا تو) فرمایا کہ کس نے اس (چڑیا) کے بچوں کو پکڑ کر اس کو بے چین کر رکھا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کر دو' پھر آپ ﷺ نے ان چیونٹیوں کے رہنے کی جگہ کو دیکھا جس کو ہم نے جلا دیا تھا اور فرمایا کہ کس نے ان کو جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے جلایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آگ کا عذاب دینا صرف آگ کے پروردگار کے لئے ہی مناسب ہے۔''۔ (ابوداؤد)

حالات راوی:

عبدالرحمٰن بن عبداللہ۔ پورا نام عبدالرحمٰن ابن عبداللہ بن ابی عمار ہے۔ مکہ کے رہنے والے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے حدیث کی سماعت کی۔ ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

تشریح: قولہ: كنا مع رسول الله ﷺ في سفر۔۔۔ وجعلت تفرش: كنا: ایک نسخہ میں ''كان'' ہے۔

تفرش: ایک تاء محذوف ہے، اور راء مشدّد ہے (یعنی باب تفعل سے ہے)۔ اور ایک صحیح نسخہ میں تاء کے ضمہ اور رائے مشددہ کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی باب تفعیل سے ہے اور ایک اور نسخہ میں تاء کے فتحہ، فاء کے سکون اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ (یعنی باب نصر سے ہے)

لفظ ''تفرش'' کا ضبط و معنی:

''النھایۃ'' میں اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ اس نے اپنے پھیلائے اور زمین کے قریب ہوگئی اور پھڑ پھڑانے لگی ''التفریش'' سے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے پھیلانے اور اپنے بچوں پر اپنے پروں کا سایہ کر لیا، **فجعلت تفرش أو تفوش** کے الفاظ ہیں۔ ''تفرش'' حرف مضارع کے ضمہ کے ساتھ ہے ''التفریش'' اور ''التفرش'' سے ماخوذ ہے امام خطابیؒ نے ''المعالم'' میں ذکر کیا ہے کہ ''التفرش'' یہ فرش الجناح بمعنی ''بسطہ'' سے ماخوذ ہے۔

اور ''تفریش'' سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے دونوں پر اوپر اٹھائے اور اپنے دونوں بچوں پر سایہ فگن ہوگئی یعنی ان کو اپنے پروں میں چھو پالیا۔

میرا خیال ہے کہ درست ضبط بصیغۂ مضارع ہی ہے دو تاؤں کے اکٹھا ہونے کی وجہ سے ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہے

قولہ: فجاء النبيّ ﷺ۔۔۔ فقلنا نحن: فجع: جم کی تشدید کے ساتھ۔

ردوا ولدها اليها: یہ امر برائے ندب ہے۔ چونکہ پرندوں کے بچوں کو شکار کرنا جائز ہے۔

ورأى: اس کا عطف ''فانطلق'' پر ہے۔

من حرق هذه: تانیث باعتبار جس کے ہے۔

قال انه: ضمیر شان ہے۔

قوله:قال انه لاينبغي ان يعذب ......:لا ينبغي:لا يجوز کے معنی میں ہے۔
اس حدیث سے شیخ کی صحبت کا فائدہ بھی معلوم ہوتا ہے، بایں طور کہ باوجود یکہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ہمراہ تھے۔تھوڑی دیر کے لئے جدا ہوئے تھے لیکن اتنی دیر میں دو کام خلاف صواب سرزد ہوئے۔
الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں:

امام احمد ٗ ابوداود اور ابن ماجہ نے **ابن عباس** سے مرفوعاً نقل کیا ہے: **نهي عن قتل أربع من الدواب: النملة والنحلة والهدهدو الصرد۔**

امام اُحمدٗ اُبوداوٗد **النساني** اور حاکم نے **عبد الرحمٰن بن عثمان تيمي** سے روایت کیا ہے: **نهي عن قتل الضفع للدواء** ۔ امام ابن ماجہ نے اُبی ھریرۃ سے روایت کیا ہے : **نهي عن قتل الصردو الضفدع ء النملة والهدهد۔**

خطابی نے فرمایا: شہد کی مکھی کو مارنے سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ اس میں منفعت ہے۔ ہدہد اور صرد کو مانے کی ممانعت ان کے گوشت کی حرمت کے باعث ہے۔وہ یوں کہ جب کسی حیوان کو مارنے سے منع کیا جاتا ہے تو یہ اس کی حرمت کی وجہ سے نہیں ہوتا، اور نہ اس میں موجود کسی ضرر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی گوشت کے حرمت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

عرض مرتب:

ملاعلی قاریؒ یہاں **تعذیب بالنار** کے مسئلہ پر شراح کا کلام ذکر فرمایا ہے، ہم نے وہ کلام یہاں سے حذف کر دیا ہے، حدیث:۳۵۳۴ کے تحت ذکر کئے ہیں آپ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

۳۵۴۳:وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ اِلْخُدْرِیِّ وَاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : سَيَكُوْنُ فِي اُمَّتِيْ اِخْتِلاَفٌ، وَفُرْقَةٌ، قَوْمٌ يُحْسِنُوْنَ الْقِيْلَ، وَيُسِيْئُوْنَ الْفِعْلَ، يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ، لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ، لَا يَرْجِعُوْنَ حَتّٰى يَرْتَدَّ السَّهْمُ عَلٰى فُوْقِهٖ، هُمْ شَرُّالْخَلْقِ وَالْخَلِيْقَةِ، طُوْبٰى لِمَنْ قَتَلَهُمْ، وَقَتَلُوْهُ، يَدْعُوْنَ اِلٰى كِتَابِ اللّٰهِ! وَلَيْسُوْا مِنَّافِيْ شَيْءٍ، قَاتِلُهُمْ كَانَ اَوْلٰى بِاللّٰهِ مِنْهُمْ، قَالُوْا :يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!مَا سِيْمَاهُمْ؟ قَالَ :التَّحْلِيْقُ .

(رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ١٢٣/٥ الحديث رقم ٤٧٦٥۔ واحمد فی المسند ٢٢٤/٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عنقریب میری امت میں اختلاف و افتراق پیدا ہوگا ایک فرقہ ایسا ہوگا جو باتیں تو اچھی کرے گا مگر اس کا عمل برا ہوگا' اس فرقہ کے لوگ قرآن کریم کی تلاوت کریں گے لیکن ان کا وہ پڑھنا ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا (یعنی قبول نہیں ہوگا) اور وہ لوگ دین یعنی امام وقت اور علماء حق کی اطاعت سے اس طرح نکل

جائیں گے جس طرح تیر شکار کے درمیان سے نکل (کر آر پار ہو) جاتا ہے اور وہ دین کی طرف اس وقت تک نہیں لوٹیں گے جب تک کہ تیر اپنے سوفار (چٹکی جہاں کان کا تانت ٹکتا ہے) کی طرف نہ لوٹ آئے اور وہ لوگ تمام مخلوقات سے بدترین ہوں گے۔ خوشخبری ہے اس شخص کے لئے جو ان لوگوں کو قتل کردے یا وہ لوگ اس کو قتل کردیں۔ (یعنی جو شخص ان لوگوں کے فتنہ اور ان کی گمراہی کا سر کچلنے کے لئے ان کا مقابلہ کرے یہاں تک کہ یا تو وہ ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دے یا وہ ان لوگوں سے حق کے لئے لڑتا ہوا خود شہید ہو جائے تو دونوں صورتوں میں اس کے لئے حق تعالیٰ کی جانب سے خوشنودی اور آخرت کی سعادتوں کی خوشخبری ہے کہ پہلی صورت میں تو وہ غازی کا لقب پائے گا اور دوسری صورت میں شہادت کا عظیم مرتبہ حاصل کرے گا) وہ لوگ بظاہر تو (انسانوں کو) کتاب اللہ کی دعوت دیں گے (لیکن رسول اللہ ﷺ کی سنت اور ان کی احادیث کو ترک کرنے پر اکسائیں گے حالانکہ احادیث نبوی ﷺ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح ہیں کہ احادیث کے بغیر قرآن کریم کو سمجھنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا ناممکن ہے) وہ لوگ کسی معاملہ میں ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہیں (یعنی وہ کسی بات میں مسلمان شمار نہیں ہوں گے) جو شخص ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارے گا وہ اپنی جماعت میں خدا کے سب سے زیادہ قریب ہوگا۔ صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا یا رسول اللہ! ان لوگوں کی پہچان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سر منڈانا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: سيكون في امتي ---- وسيئون الفعل:**

اختلاف و فرقة: یہاں مضاف محذوف ہے۔ أی: **أهل اختلاف و خقراق**۔

فرقة: فاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

قوم يحسنون القيل: مصدر ہے، قال يقول، کہا جاتا ہے: **قلت قولا و قالا و قيلا**، **قال** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلاً﴾ [النساء: ۱۲۲]: ''اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا''۔

ويسيئون الفعل: ماقبل سے بدل ہے، نیز توضیح بھی ہے۔

قوله: يقرء ون القرآن: یہ جملہ **يقرؤون القرآن** جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔ استیناف یعنی ایک الگ جملہ ہے جو ماقبل کی عبارت کی توضیح و بیان ہے یا شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق بدل ہے یا پھر اس سے نفس اختلاف کی وضاحت مراد ہے کہ عنقریب میری امت کے لوگوں میں اختلاف و افتراق پیدا ہو جائے گا اور وہ دو فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہوگا اور ایک فرقہ باطل پر ہوگا

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس تاویل کی تائید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو اسی باب کی پہلی فصل میں نقل ہو چکا ہے: **تَكُوْنُ اُمَّتِىْ فِرْقَتَيْنِ فَتَخْرُجُ مِنْ بَيْنِهِمَا مَارِقَةٌ يَلِىْ قَتْلَهُمْ اَوْلَاهُمْ بِالْحَقِّ** اس صورت میں کہا جائے گا کہ لفظ قوم مابعد کے جملہ کا موصوف ہے اور اس کی خبر جملہ **يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ** اور اس جملہ کا مقصد ان دونوں فرقوں میں سے ایک فرقہ کی (جو باطل ہے) نشان دہی کرنا ہے جب کہ دوسرے فرقہ کے ذکر کو اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ واضح ہے اھ۔ بعض نسخوں میں ''ويقرؤون واؤ عاطفہ کے ساتھ ہے'' یہ خطا ہے۔

تراقی: تاء کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ مجازاً کلام مراد ہوتا ہے۔ یہ دو ہڈیاں ہوتی ہیں جو سینہ کے بالائی حصہ یعنی گردن کے نچلے حصہ اور کاندھے کے درمیان ہوتی ہیں۔ المغرب میں لکھا ہے کہ فارسی میں ''گردن'' کہتے ہیں۔ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ بروزن ''فعلوۃ'' ترقوۃ کی جمع ہے۔ ترقوہ ہنسلی کی ہڈی کو کہتے ہیں۔

قوله: لَا يجاوز تراقيهم۔

امام طیبی فرماتے ہیں: ''ان کا پڑھنا ان کے حلق سے نیچے نہیں جائے گا'' کا پہلا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کو پڑھیں گے اس لئے ان کی قراءت کا اثر ان مخارج حروف اور ان کی آوازوں سے آگے نہیں جائے گا جس کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات کا کوئی بھی اثر نہ ان کے دل پر ہوگا اور نہ ان کے دوسرے اعضاء حرکت وعمل اثر پذیر ہوں گے چنانچہ قران کریم کی جن باتوں پر یقین واعتقاد کرنا لازم ہے ان پر وہ اعتقاد ویقین نہیں رکھیں گے اور قرآن کریم کی جن باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے وہ ان پر عمل نہیں کریں گے۔

دوسرا مطلب: اللہ تعالیٰ ان کی قراءت کو اس دنیا سے اوپر نہیں اٹھائے گا یعنی اس کو قبول نہیں کرے گا گویا ان کی قراءت ان کے حلقوم سے آگے نہیں بڑھے گی۔

تیسرا مطلب: عامل قرآن نہ ہونے کی وجہ سے ان کو قراءت کا ثواب حاصل نہیں ہوگا، اور سوائے قرامت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

عرض مرتب:

یہ تیسرا مطلب اس حدیث کی طرح ہے کہ جس میں بعض روزہ داروں کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ ان کو بھوکے پیاسے رہنے کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اھ۔

قوله: يمرقون من الدين مروق السهم من الرمية:

امام طیبی لکھتے ہیں: ''مروق'' باب نصر کا مصدر ہے۔ یہاں حرف تشبیہ محذوف ہے۔ منصوب ہے۔ **أی مثل مروق السهم۔** دین میں داخل ہونے اور دین سے نکلنے کو اس تیر کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کسی جاندار کے جسم سے اس تیزی کے ساتھ آر پار ہو جائے کہ ذرہ برابر خون آلود نہ ہوا ہو۔ یہ فرمانا درحقیقت تنبیہ ہے کہ یہ لوگ دین کی کسی بھی بات کو تھامے ہوئے نہ ہوں گے۔ دیکھو کسی طرف دھیان ہی نہیں کرتے۔ اسی مفہوم کو ایک دوسری روایت میں یوں بیان کیا ہے: **سبق الفرث والدم۔** باطل پر مصر ہونے کی وجہ سے وہ دین کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ ان کا یہ معاملہ اس آیت والا ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ﴾ [محمد: ۲۵]

قوله: لايرجعون حتى يرتد السهم على فوقه:

فوق: فاء کے ضمہ کے ساتھ تیر کا سوفار (تیر کی چٹکی جہاں کمان کا تانت ٹکتا ہے۔ یہ دو ہوتے ہیں۔ ازمرتب)

جب تک کہ تیر اپنے سوفار کی طرف نہ لوٹ آئے یہ تعلیق بالمحال ہے یعنی جس طرح تیر کا اپنے سوفار اپنی چٹکی کی جگہ

واپس آنا محال ہے اسی طرح ان لوگوں کا دین کی طرف پھر آنا بھی محال ہے گویا یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾[الاعراف: ٤٠] ترجمہ: ''وہ جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جاوے'' کی مانند ہے۔ اس کلام میں عجیب لطافت ہے کہ امر واحد میں پائی جانے والی مناسبت کو دو تمثیلوں کی رعایت رکھتے ہوئے بیان فرمایا ہے۔ پہلے ان کے ''خروج من الدین'' کو ''خروج السهم من الرميه'' سے تشبیہ دی اور پھر یہ فرض کرلیا کہ ان لوگوں کا دین میں داخل ہو کر اس سے نکلنا تیر کے اپنے سوفار سے نکل چکنے کے واپس لوٹ آنے کی طرح ہے۔

قوله: هم شر الخلق ولحليققه: قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ بدترین مخلوق ہیں چونکہ ان لوگوں نے کفر و معرفت (یا کفر وایمان) کو جمع کیا، باطن میں کفر کو رکھا اور گمان یہ کرتے رہے کہ ''**اعرف الناس فی الایمان**'' ہیں، اور قرآن کو بہت مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ چنانچہ خود بھی گمراہ ہوئے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ **قوله: طوبى لمن قتلهم وقتلوه:** وقتلوه: یہاں عبارت مقدر ہے: **ای ولمن قتلوه**۔ یہ جملہ دلیل ہے کہ موصوف کو حذف کرنا جائز ہے۔ اور واؤ صرف تشریک کے لئے ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہوگی: **طوبى لمن جمع بين الأمرين قتله اياهم وقتلهم اياه**۔ جیسا کہ یہ آیت ہے: ﴿وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾[آل عمران-١٩٥] **يدعون الى كتاب الله و يتركون سنة رسول الله:**

یعنی کتاب اللہ کے ظاہر کی دعوت دیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے تارک ہوں، احادیث بینہ پر عمل نہیں کریں گے حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾[النحل: ٤٤] اور دوسری جگہ فرمایا ﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾[الحشر: ٧] یعنی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت سے ڈرو۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو تلقین فرمائی: **جادلهم بالحديث** اور مثل مشہور ہے: **صاحب البيت أدرى بما فيه**۔ اس لئے فرمایا: **وليسو منافى شيء** یعنی ہمارے معتد بہ طریقہ پر نہیں ہیں۔ ہمارا طریقہ تو کتاب وسنت کو جامع ہے۔ **قوله: وليسوا منافى شى:** اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''**يدعون الى كتاب الله**'' کے بعد یہ جملہ ارشاد فرما کر نبی اور کتاب اللہ کے درمیان موجود شدت تعلق کو بیان کرنا مقصود ہے۔ وگرنہ ترکیب کا تقاضا یہ تھا کہ ''**وليسوا من كتاب الله فى شيء**'' فرماتے **قوله: كان اولى بالله منهم:**

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

١. ''من'' کو تعلیل کے لئے مان لیں۔ **أی من أجل قتالهم**
٢. اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ضمیر ''امت'' کی طرف عائد ہے۔ **أی : من قاتلهم من امتی أولى بالله من باقی أمتي**۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ تاویل ''**فی امتی اختلاف و فرقه**'' کے بیان کردہ پہلے معنی کی بنیاد پر درست ہوگی۔ **أی أهل اختلاف**۔ اور دوسرے معنی کی تقدیر پر ''**فرقه باطله**'' کی طرف راجع ہوگی۔ اور یہ صیغہ افعل، اس صیغہ افعل کی طرح ہوگا جو اس آیت میں ہے ﴿اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا﴾[مریم- ٧٣] اور اس جملہ کی طرح ہوگا: **العسل احلى من الخل**۔ چنانچہ حدیث کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا: **المقاتل أبلغ فى الولاية منهم فى العدوان**۔

قوله: ماسيما هم؟ قال الخليق:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے یہ صیغہ شاید اس لئے فرمایا کہ اس فعل حلق کے ذریعے متابقت میں تفریق مقصود ہے۔ یا یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ لوگ بکثرت سر منڈاتے ہیں۔ اس ارشاد کا مقصد سر منڈانے کی برائی یا تحقیر کرنا نہیں ہے کیونکہ سر منڈانا طاعت میں سے ایک عمل ہے اور نیک لوگوں کی عادات میں سے ہے بعض خبیث لوگ بھی بعض مرتبہ اپنی خباثت کے پھیلانے کے لئے اچھی عادات واطوار اپنا لیتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ نماز اور تہجد وغیرہ پڑھتے ہیں (تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ بڑے تہجد گزار اور نیکوکار ہیں)۔

التحليق: یعنی ان کی علامت ''تحلیق'' ہے سر منڈانے کے معنی کو بیان کرنے کے لئے مجرد کی بجائے مزید فیہ کا باب تفعیل ذکر کرنا تکریر وتکثیر کے لئے ہے۔ (کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنا سر بار بار منڈاتے ہیں)

دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ''تحلیق'' سے مراد سر منڈانا نہیں ہے بلکہ لوگوں کو ''حلقہ درحلقہ بٹھانا'' مراد ہے جو ان لوگوں کی طرف سے محض نمائش اور تکلف کے طور پر ہوگا۔

لفظ ''خلیقہ'' اصل کے اعتبار سے مصدر ہے لیکن یہاں بطور مصدر کے نہیں ہے، بلکہ تاکید معنوی کے لئے آیا ہے

خلاصۃ الآراء: خلق سے مراد انسان ہیں اور خلیقہ سے مراد تمام خلائق مراد ہیں۔ موجودہ اور آئندہ مخلوق مراد ہے۔ (اور مخلوقات میں بہائم بھی شامل ہیں۔ از مرتب)

الخلق، والخليقة: ان دونوں لفظوں کی تحقیق میں اہل علم کی مختلف آراء ہیں:

① فی النہایۃ: ''الخلق'' الناس، (لوگ) اور الخلیقۃ کا معنی ہے: البھائم (جانور) کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ ان کا اطلاق تمام خلائق پر ہوتا ہے۔

② تورپشتیؒ فرماتے ہیں: ''الخليقة'' اصل میں مصدر ہے، **وانما جاء باللفظين تاكيدا للمعنٰى الذى أراده، وهو استيجاب أصناف الخلائق، بالخليقة** سے مراد وہ مخلوق ہو جو پیدا ہو چکی ہے اور ''**الخلق**'' سے مراد وہ مخلوق ہو جو آئندہ پیدا ہوگی۔

طوبى: کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں:۔

① **طوبى طيبة:** مستحسنہ اچھی چیز کے معنی میں ہے **أى حالة طيبة حسنة وصفة مستحسنة**۔

② جنت کے ایک درخت کا نام ہے۔ طوبٰی، بروزن فعلٰی، یہ ''طیب'' سے مشتق ہے، طاء کو ضمہ دینے کی وجہ سے واؤ، کو یاء سے بدل دیا گیا۔

عرضِ مرتب:

''لغات الحدیث'' میں لفظ ''طوبٰی'' کے تحت لکھا ہے:

طوبى شجرة فى الجنة أصلها فى دارى، وفرعها فى دار علىّ، فقيل له فى ذلك، فقال: دارى ودار

عليّ في الجنة بمكان واحد۔اھ۔

۳۵۴۴:وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَّا بِاِحْدٰى ثَلَاثٍ:زِنًى بَعْدَ اِحْصَانٍ ' فَاِنَّهٗ يُرْجَمُ وَرَجُلٌ خَرَجَ مُحَارِبًا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ' فَاِنَّهٗ يُقْتَلُ اَوْ يُصَلَّبُ اَوْ يُنْفٰى مِنَ الْاَرْضِ' اَوْ يَقْتُلُ نَفْسًا فَيُقْتَلُ بِهَا . (رواه ابو داود)

أخرجه ابو داود في السنن ٤ / ٥٢٢ الحديث رقم ٤٣٥٣' والنسائي في ٧ / ١٠١ ال ٤٠٤٨ ح ٦ / ٢٠٥

ترجمہ:''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''کسی ایسے مسلمان کا خون حلال نہیں ہے جو اس امر کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' سوائے اس کے تین صورتوں کے) کہ ان میں اس کا خون حلال ہو جاتا ہے' ایک تو یہ کہ وہ محصن ہونے کے بعد زنا کرے تو اس کو سنگسار کر دیا جائے' دوسری صورت یہ کہ کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے نکلے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا سولی دے دی جائے گی یا اس کو جلاوطن کر دیا جائے اور یا کوئی شخص کسی جان کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اس کو قتل کر دیا جائے''۔(ابوداؤد)

تشریح:قوله:قال رسول الله ﷺ:لایحل دم امریء۔۔۔الاماحدی ثلاث:

يشهد أن لا اله الا الله وأن محمد رسول الله: بظاہر یہ صفت کاشفہ ہے۔امام طیبی ؒ کا کہنا ہے کہ ''مسلم'' کے لئے صفت ممیّزہ ہے نہ کہ کاشفہ،یعنی:اظهاره الشهادتين كاف في حقن دمه۔

ثلاث:اس کی تمیز''خصال''محذوف ہے۔

أو يقتل نفسا:صیغہ معروف کے ساتھ ہے اور''أو''بمعنی واؤ ہے:اس کا عطف''رجل خرج''پر ہے،

فيقتل بها:صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

قوله:زنا بعد احصان فانه يرجم:

عرض مرتب:

اس جملہ کی تشریح وتوضیح کتاب الحدود،فصل اول،حدیث ۳۵۵۷ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔یہاں اتنی بات کافی ہے کہ محاربًا:حال ہے۔یہاں''للہ'' کے الفاظ ہیں۔اس صورت میں مفعول پر باء زائدہ ہے اور لفظ اللہ لفظاً مجرور محلاً منصوب مفعول ہے۔جیسا کہ اس آیت کریمہ میں:﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾[البقرۃ۔۱۹۵]اور اپنے ہاتھوں کو تباہی میں مت ڈالو۔''محصن''ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمان جو آزاد ہو مکلّف ہو اور نکاح صحیح کے ساتھ صحبت کر چکا ہو یعنی شادی شدہ ہو اور پھر اس کے بعد زنا کا مرتکب ہو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو سنگسار کر کے ختم کر دیا جائے۔

قوله:ورجل خرج محاربا۔۔۔أو ينفى من الأرض:

یہاں محارب سے مراد ڈاکو یا باغی ہے۔

قزاق کے بارے میں تین سزائیں بیان کی گئی ہیں: ① قتل کر دیا جائے ② سولی دیا جائے ③ جلاوطن کر دیا جائے۔

ان تینوں میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ قزاق مال تو نہ لوٹ سکا ہو مگر اس نے کسی کو جان سے مار ڈالا ہو تو اس صورت میں اس کو قتل کیا جائے گا۔

اگر قزاق نے مال بھی لوٹا ہو اور کسی کو قتل بھی کیا ہو تو اس صورت میں اس کو سولی دی جائے گی۔ اس کے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو یہ فرماتے ہیں کہ اس کو زندہ سولی پر لٹکا دیا جائے اور نیزوں سے اس قدر مارا جائے کہ وہ مر جائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین فرماتے ہیں کہ اس کو قتل کر کے اس کی لاش سولی پر لٹکا دی جائے تا کہ دوسرے لوگوں کو اس کے انجام سے عبرت ہو۔

تیسری سزا جلاوطن کی بیان ہوئی ہے۔ اس حدیث میں "ینفی من الارض" کے الفاظ ہیں۔ اس کے معنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو یہ ہیں کہ اس کو مسلسل شہر بدر کیا جاتا رہے یعنی اسے کسی ایک شہر میں ٹھہرنے اور رہنے نہ دیا جائے بلکہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نکالا جاتا رہے تا کہ اسے قرار و آرام نہ مل سکے۔ بعض کا کہنا ہے کہ شہر بدر کر کے قید میں ڈال دیا جائے حتی کہ توبہ کر لے۔ ابن جریر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اس کو قید میں ڈال دیا جائے اور یہ قید کی سزا اس صورت میں ہے جب کہ اس نے نہ تو مال لوٹا ہو اور نہ کسی کو قتل کیا ہو بلکہ راہگیروں کو ڈرایا دھمکایا ہو۔ حدیث کا یہ جز (جس میں قزاقوں اور راہزنوں کی مذکورہ بالا سزاؤں کا حکم ہے) دراصل قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾ (المائدہ: ۳۳)

"جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد یعنی بدامنی پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا سولی دیئے جائیں یا ان میں سے ہر ایک کا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ دیا جائے یا زمین پر سے نکال کر جیل خانہ بھیج دیئے جائیں"۔

بظاہر حدیث میں "اَوْ يُنْفٰى فِي الْاَرْضِ" سے پہلے یہ عبارت "اَوْ تُقْطَعَ يَدُهٗ وَرِجْلُهٗ مِنْ خِلَافٍ" بھی ہونی چاہئے تھی تا کہ یہ حدیث مذکورہ آیت کے پوری مطابق ہو جاتی لیکن یہ قوی احتمال ہے کہ اصل حدیث میں تو یہ عبارت رہی ہو البتہ یہاں حدیث کے راوی کی بھول سے نقل ہونے سے رہ گئی ہو یا راوی نے اختصار کے پیش نظر اس کو قصداً حذف کر دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حرف "او" قرآن کی آیت میں بھی حدیث میں بھی اظہار تفصیل کے لئے ہے بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ تخییر کے لئے ہے یعنی یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ امام وقت اور حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ مذکورہ تفصیل کا لحاظ کئے بغیر ان سزاؤں میں سے جو سزا مناسب جانے قزاق کو دے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول ابن عباس، سعید بن مسیب، مجاہد عطاء، حسن بصری، نخعی اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سے نقل کیا ہے۔

قوله: أويقتل فيقتل بها: أو يقتل نفسا: صیغہ معروف کے ساتھ ہے اور''أو'' بمعنی واؤ ہے،''رجل''پر عطف ہو رہا ہے۔تقدیری عبارت یوں ہے: قتل رجل نفسا فيقتل بها: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

عرضِ مرتب:

اگر تقدیری عبارت''رجل يقتل نفسا''نکالی جائے تو ماقبل جملوں کے زیادہ موافق ہوگی۔واللہ اعلم بالصواب۔اھ۔

مسلمانوں کوڈرانے کی ممانعت کا بیان

۳۵۴۵: وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ: حَدَّثَنَا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ اَنَّھُمْ کَانُوْا یَسِیْرُوْنَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، فَنَامَ رَجُلٌ مِنْھُمْ، فَانْطَلَقَ بَعْضُھُمْ اِلٰی جَبَلٍ مَعَہٗ، فَاَخَذَہٗ، فَفَزِعَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یُّرَوِّعَ مُسْلِمًا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد في السنن ٥ / ٥٧٣ للل ٥٠٠٤ الحديث رقم:/ ٣٢٦

ترجمہ:''اور حضرت ابن ابی لیلیٰ (تابعی) کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کے صحابہ نے ہم سے یہ حدیث بیان کی کہ وہ کسی موقع پر رات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے ان میں سے ایک شخص سو گیا تو ان میں سے ایک (دوسرا) شخص (اپنی جگہ سے) اٹھا سونے والے کے ساتھ پڑئی ہوئی رسی کی طرف چلا اور اس اور اس (سوتے ہوئے شخص) کو (رسّی کے ساتھ) باندھ دیا' (یا اس رسی کو پکڑنے کا ارادہ کیا) تو وہ ڈر گیا (آپ ﷺ نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی یا آپ ﷺ نے اس کے بارے میں سنا تو) آپؐ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو ڈرائے''۔ (ابوداوٗد)

راویٔ حدیث:

ابن ابی لیلیٰ۔ یہ ابن ابی لیلیٰ ہیں۔نام عبدالرحمٰن ہے۔''یسار ابو لیلیٰ''ان کے والد ہیں۔انصار میں سے ہیں۔ان کی پیدائش اس وقت ہوئی جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھ سال باقی تھے اور کہا جاتا ہے کہ''دجیل''میں ۸۳ھ میں دریائے بصرہ میں ڈوب گئے۔ان کی حدیثیں اہل کوفہ کے یہاں ہیں۔صحابہ میں سے بہت سے حضرات سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے بہت بڑی جماعت نے حدیث سنی۔کوفہ کے تابعین میں یہ پہلے طبقہ کے تابعی ہیں۔

فائدہ: ابن ابی لیلیٰ بعض اوقات ان کے بیٹے''محمد''کو بھی کہا جاتا ہے۔یہ کوفہ کے قاضی اور فقہ کے مشہور امام اور صاحب مذہب ورائے ہیں۔جب محدثین''ابن ابی لیلیٰ''بلا تصریح کے بولتے ہیں تو''محمد''مراد ہوتے ہیں۔''محمد''کی پیدائش ۷۴ھ میں اور وفات ۱۴۸ھ میں ہوئی۔

قوله: حدثنا اصحاب محمد ......: حدثنا اصحاب محمد: سارے صحابہ عادل ہیں لہٰذا یہاں سند میں ان کا نام مذکور ہونا ضروری نہیں۔یسیرون:''سیر''سے مشتق ہے۔ایک نسخہ میں''یسرون''ہے،یہ''سَری''سے ماخوذ ہے،اس کے معنی ہیں رات کو چلنا۔

فزع: زاء کے کسرہ کے ساتھ۔
یروّع: از باب تفعیل مضارع معروف کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے ''ڈرانا''۔
تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

جزیہ والی زمین کی خریداری کی مذمت

۳۵۴۶: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اَخَذَ اَرْضًا بِجِزْیَتِھَا فَقَدِ اسْتَقَالَ ھِجْرَتَہٗ وَمَنْ نَزَعَ صَغَارَ کَافِرٍ مِنْ عُنُقِہٖ فَجَعَلَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ فَقَدْ وَلَّی الْاِسْلَامَ ظَھْرَہٗ.

(رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳ / ۳۵۹ الحدیث رقم: ۳۰۸۲

ترجمہ: ''اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی جزیہ والی زمین کو خریدا اس نے اپنی ہجرت (یعنی عزت) کو ختم کر دیا اور جس نے کافر کی ذلت کو اس کی گردن سے نکال کر اپنی گردن میں ڈال لیا اس نے اسلام کو پس پشت ڈال دیا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ:: **من أخذارضا بجز یتھا فقد استقال ھجرتہ: بجزیۃ:** جیم کے کسرہ اور زاء کے سکون کے ساتھ۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں دو ترکیبی احتمال ذکر کیے ہیں: ① متعلق محذوف سے مل کر ''أرض'' کی صفت ہے۔ **أی: ملتبسۃ بجزیتھا۔** ② فاعل سے حال ہے: **أی: حال کونھاملتزما بجزیتھا۔** یعنی بجزاجھا۔ کیونکہ یہ صاحب زمین کو ایسے ہی لازم ہوتا ہے جیسے ذمی پر جزیہ لازم ہوتا ہے۔

عرض مرتب

جزیہ کے تفصیلی احکام ''کتاب الجہاد، باب الجزیہ'' کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

مطلب یہ ہے کہ خراج کفار کی ذلت ہے، خراجی زمین خرید کر گویا وہ ہجرت الی الاسلام اور ہجرت الی دار السلام سے خارج ہو گیا، اور کفر کی ذلت کو اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اس نے گویا اسلام کی عطا کردہ عزت کو کفر کی ذلت کے بدلہ بیچ دیا اور اس نے اپنی ہجرت کا اقالہ کر لیا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں خراج کی دو صورتیں ہیں: ① جزیہ۔ ② کرایہ اور اجرت۔

چنانچہ جب کوئی زمین صلحاً فتح ہوئی بایں طور کہ زمین اہل زمین کی ہوگی، تو اس پر جو خراج آئے گا اس کا قائم مقام جزیہ ہوگا، جو ان لوگوں پر لازم ہوگا۔ ان میں سے جو شخص اسلام قبول کر لے گا اس پر سے خراج ساقط ہو جائے گا، جیسا کہ اس پر سے جزیہ ساقط ہو جائے گا اور اس کی زمین کی پیداوار میں عشر لازم ہوگا۔

توربشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں ''جزیہ'' سے مراد خراج ہے جو ذمی کے ہاتھ میں چھوڑی گئی زمین پر لازم

ہوتا ہے۔ چنانچہ جب مسلمان کسی ذمہ سے ایسی زمین خرید لے گا تو اس شے کی ادائیگی کا کفیل بھی ہوگا جو اس ذمی پر لازم تھی۔

جزیہ کی وجہ تسمیہ:

لانه يجزى فى الموضوع على الاراضى المتروكة فى أيدى أهل الذمة مجراها' فيما يوخذ من رؤوسهم۔

خراجی زمین خریدنے کو ''استقالہ ہجرت'' سے تعبیر فرمایا۔ کیونکہ اہل ذمہ سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں ''مہاجر'' کا ایک بڑا حصہ ہوتا ہے۔ زمین خریدنے کی صورت میں اس مسلمان نے اپنے آپ کو ادائے خراج کے معاملہ میں ذمی کے قائم مقام کرلیا۔ یہ مسلمان اس مسلمان کی طرح ہوگیا کہ جس نے معمولی مال کے عوض اپنی ہجرت کا اقالہ کرلیا ہو۔

جزیہ ''ذلت'' اور ہجرت ''عزت'' کیوں؟

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر یہ سوال کیا جائے کہ جزیہ کا ذلت و رسوائی سے کنایہ ہونا تو مشہور و معروف بات ہے، ہجرت، عزت سے کیوں کنایہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہجرت اسلام کی عزت کا مبدا ہے۔ اسلام کی نشاۃ بھی ہجرت کے ذریعہ ہوئی بایں طور کہ اللہ تعالیٰ نے انصار کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد و نصرت فرمائی۔ ان حضرات کے ذریعہ اسلام کو ایک باعزت عالی مقام ملا۔ مشرکوں کی شان و شوکت نہ صرف ٹوٹ کر رہ گئی، بلکہ جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

قوله: مومن نزع صفار كافر من عنقه ......:

یعنی جس نے کافر کی ذلت کو اس کے گلے سے اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا بایں طور پر کہ کافر کے جزیہ کا ذمہ اٹھالیا اور اس کی ذلت کا تحمل خود کرلیا تو اس نے اسلام کو اپنی پشت کے ورے ڈال دیا اور یہ کلام ماقبل کے لئے مبین کی مانند ہے' یعنی جس نے کسی کافر کے جزیہ کی ضمانت لی اور اس کی ذلت کو خود اٹھالیا تو گویا کہ اس نے اسلام کو کفر سے بدل ڈالا چونکہ اس نے اپنی عزت کو اپنی ذلت سے بدل ڈالا ہے۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: جو کسی کافر کے جزیہ کا ذمہ لیتا ہے تو گویا اس نے اسلام سے پشت پھیر لی۔ بایں معنی کہ اس نے دین کے اعزاز کو کفر کی ذلت کے التزام سے بدل دیا ہے اور اس کی ذلت کو اٹھالیا ہے۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف کیا کسی مسلم کا کسی ذمی کے جزیہ کی ضمانت لینا صحیح ہے عدم جواز کے قائلین کے استدلال اسی حدیث سے ہے۔

۳۵۴۷: وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَرِيَّةً اِلٰى خَثْعَمَ' فَاعْتَصَمَ نَاسٌ مِنْهُمْ بِالسُّجُوْدِ فَاَسْرَعَ فِيْهِمُ الْقَتْلَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ فَاَمَرَ لَهُمْ بِنِصْفِ الْعَقْلِ' وَقَالَ: اَنَا بَرِيْءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ مُقِيْمٍ بَيْنَ اَظْهُرِ الْمُشْرِكِيْنَ' قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ؟ قَالَ: لَا تَتَرَا اٰى نَارَاهُمَا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فى السنن ٣ / ١٠٤' الحديث رقم: ٢٦٤٥' والترمذى ٤ / ١٣٢' الحديث رقم: ١٦٠٤

ترجمہ: ''اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یمن کے قبیلہ) قبیلہ خثعم کی جانب ایک لشکر روانہ کیا تو اس قبیلہ کے کچھ لوگ (جو مسلمان بچنے کے لئے (سجدے کرنا (یعنی نماز پڑھنا) شروع ہوگئے۔ لیکن

ان کے قتل میں عجلت سے کام لیا گیا (یعنی لشکر والوں نے ان کے سجدوں کا اعتبار نہ کیا اور یہ گمان کر کے کہ یہ بھی کافر ہیں اور محض قتل سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے ہیں ان کو بھی قتل کر دیا) جب اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے ان مسلمان مقتولین کے ورثاء کو آدھی دیت دیئے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں ان مسلمانوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی بیزاری کا سبب کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (مسلمانوں کو کافروں سے اتنی دور رہنا چاہئے) کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکیں (لیکن اگر کوئی مسلمان کافروں میں مخلوط رہا تو گویا اس نے حکم کی پرواہ نہیں کی)''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: بعث رسول الله ﷺ سرية۔۔۔فأمر نهم بنصف العقل:

سریۃ: فوج کا ایک دستہ جس میں زیادہ سے زیادہ چار سو افراد ہیں۔ خثعم: خاء معجمہ کے فتحہ اور تائے مثلثہ کے سکون کے ساتھ، یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ صاحب قاموس نے ''خثعم'' کو بروزن جعفر قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے۔

قوله: انا بری مئ کل سلم مقیم بین اظهر المشرکین بین أظهر المشرکین: لفظ ''اظهر'' یہاں ''مقحم'' (یعنی زائد) ہے۔

قوله: قالو یا رسول الله لم ؟قال ......:

لم؟: الف محذوف ہے، چونکہ ''ما'' استفہامیہ ہے۔ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: **أي لأی شیء تکون بریتا، أو أمرت بنضف العقل:**

قال: لا تتراء ی ناراهما: جملہ مستانفہ تعلیلہ ہے۔ ''تتراء ی'' کا (ناراهما کی طرف) اسناد مجازی ہے اور نفی بمعنی نہی ہے۔ **أی: یتباعد منز لاهما، حتی لاتتراء ی ناراهما۔**

أنا بری من کل ......:

توربشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ ''لبراءت من دم'' مراد ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''**برات من موالاۃ**'' مراد ہو۔

''**لا تتراء ی ناراهما**'' کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

۱. ابوعبیدہؒ کہتے ہیں: مسلمان کسی ایسی جگہ پڑاؤ نہ ڈالے کہ جہاں سے اس کی آگ، مشرک کو دکھائی دے، مسلمان کو دیگر مسلمانوں کے ہمراہ کسی مسلمان کے ہاں پڑاؤ ڈالنا چاہیے، چونکہ مشرک کا نہ کوئی عہد ہے اور نہ کوئی امان۔
۲. ابوالہیثم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: مسلمان طور طریقہ، شکل وصورت میں (غرض سے کہ کسی بھی اعتبار) سے مشرک سے تشبہ اختیار نہ کرے اور نہ ان کے اخلاق اپنائے۔ ''**لا تتراء ی ناراهما**'' عرب کے اس قول ''**مانار نعملك أی ماسمتها؟**'' سے ماخوذ ہے۔
۳. ابوحمزہ فرماتے ہیں: مسلمان اور مشرک آخرت میں اکھٹے نہیں ہوں گے، کیونکہ دونوں میں بہت ہی بُعد ہوگا۔
۴. صاحب فائق کہتے ہیں: ان دونوں پر لازم ہے کہ ان کے ٹھکانے اس قدر دور ہوں کہ جب آگ جلائی جائے تو آگ نظر نہ آئے، ''ترائی'' کی اسناد ''نار'' کی طرف کرنا عرب کے اس قول کی قبیل سے ہے: **دور بنی فلان متناظرة**۔ ترائی

،باب تفاعل کا مصدر ہے جو"رؤیة" سے ماخوذ ہے۔کہا جاتا ہے تراء ی القوم(ایک دوسرے کو دیکھنا)

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اس قبیل سے یہ آیات کریمہ بھی ہیں:

① ﴿فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ﴾ [الشعراء:٦١] ترجمہ:"پھر دونوں جماعتیں (آپس میں ایسی قریب ہوئیں کہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں"۔

② ﴿تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ﴾ [الانفال۔٤٨] ترجمہ:"دونوں جماعتیں (کفار و مسلمین کی) ایک دوسرے سے مقابل ہوئیں"۔

④ قاضیؒ فرماتے ہیں:یعنی مسلمان ایسی جگہ سکونت اختیار نہ کرے کہ جہاں کافر آباد ہوں اور نہ اس قدر قریب ہوں کہ ان کی آگ بھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جائے اور ایک دوسرے کی آگ قریب قریب ہو جائے۔حتی کہ دونوں کو ایک دوسرے کی آگ دکھائی دے رہی ہو یہی بات ابوعبیدہ نے کہی ہے۔

⑤ تورپشتی فرماتے ہیں:"نار" سے مراد"نار العرب" ہے۔یعنی مسلمان اور مشرک دور دور کناروں پر ہیں،کافر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر رہا ہے،اور شیطان کی طرف دعوت دے رہا ہے،اور مسلمان اللہ اور اس کے رسول کی خاطر شیطان اور اس کے گروہ سے جنگ کر رہا ہے۔لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دونوں متفق ہو جائیں اور ایک ساتھ رہنے پر صلح کریں۔

فوائد: خطیب فرماتے ہیں:یہ حدیث دلیل ہے کہ کوئی مسلمان اگر کافروں کی قید میں ہو اور اس کے لئے بھاگنا اور خلاصی ممکن ہو تو اس کے لئے کافروں کے ساتھ اقامت اختیار کرنا حلال نہیں اور اگر وہ اس سے نہ بھاگنے پر حلف لیں تو جب بھی اس پر واجب ہوگا کہ بھاگ کھڑا ہو۔البتہ اگر قسم کے معاملہ میں اس پر جبر کیا گیا ہو تو اس صورت میں کفارہ نہیں آئے گا۔اھ۔ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس پر کفارہ واجب ہوگا۔

فأمه لهم بنصف العقل: خطابیؒ فرماتے ہیں:آنحضرت کو ان لوگوں کے مسلمان ہونے کا علم ہو چکا تھا:اس کے باوجود آپؐ نے کامل دیت کا فیصلہ نہیں فرمایا' چونکہ ان لوگوں نے خود اپنے خلاف مجاہدین کی مدد کی تھی بایں طور پر کہ وہ کفار کے درمیان رہتے تھے اور ان لوگوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو شخص اپنی اور کسی دوسرے کی جنابت کے باعث ہلاک ہوا ہو چنانچہ اس کی جنابت کا حصہ دیت سے ہو جاتا ہے۔

۳۵۴۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ' عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' قَالَ: اَلْاِيْمَانُ قَيْدَ الْفَتْكِ لَا يَفْتِكُ مُؤْمِنٌ۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٣ / ٢١٢ ' الحديث رقم : ٢٧٦٩

ترجمہ:"اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:ایمان اپنے حامل یعنی مؤمن کو اچانک قتل کرنے سے روکتا ہے۔لہٰذا کوئی (کامل) مؤمن اچانک قتل نہ کرے"۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله:الايمان قيد الفتك قيد:یائے تحتانیہ کی تشدید کے ساتھ۔أی:منع۔

الفتك: صاحب قاموس فرماتے ہیں:الفتك مثلثة، ركوب ماهم من الأمور، ودعت اليه النفس

فتك: يفتك و يفتك۔ (یعنی جو دل چاہے بے دھڑک کرنا، نفس کا بندہ ہونا) فهو فاتك جرئ و شجاع۔

قوله: لالفتك مؤمن:

لا يفتك: تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ خبر بمعنی نہی ہے یعنی وہ ایسا نہ کرے چونکہ اس پر یہ حرام ہیلا يفتك کو فعل نہی ہونے کی وجہ سے مجزوم پڑھنا بھی جائز ہے۔ أي: لا يفعل ذلك، بعض لوگ اس کو مجہول پڑھتے ہیں، یہ وہم ہے، جو نہ روایۃً درست ہے اور نہ درایۃً صحیح ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ کسی مسلمان کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ غفلت میں کسی کی جان لے لے اور کسی کو اس کے حال کی تحقیق کے بغیر کہ وہ مسلمان ہے یا کافر قتل کردے۔ ایمان صاحب ایمان کو "فتك" سے روکتا ہے جس طرح "قيد" صاحب قید کو تصرف سے روکتی ہے۔ یہ عبارت "ذکر الملزم و ارادة الملزوم" (ذکر "ملزوم" کو کرنا اور مراد لزوم کو لینا) کے قبیل سے ہے۔ صحابہ کی عادت شریفہ یہ ہے کہ جب ان کا گزر کسی غافل کافر کے پاس سے ہوتا تو اس کے متنبہ کرتے اگر وہ دعوت اسلام دیئے جانے کے بعد بھی اسلام قبول کرنے سے انکار کرتا تو اس کو قتل کر دیتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن سلمہ خزرجی کو ایک جماعت کے ساتھ کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے لئے روانہ کیا تھا، اور عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ اوسی کو صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ رافع کی طرف اور عبداللہ بن انیس جہنی کو سفیان بن خالد کو قتل کرنے کے لئے روانہ کیا تھا۔ چنانچہ ان واقعات میں کہ جن کا حکم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اور اس حدیث میں تطبیق کیسے ہوگی؟

پہلا جواب کہ ان کو ناگہاں قتل کیا گیا' وہ خاص بحکم الٰہی تھا۔ ان لوگوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں گستاخی کی تھی' انتہائی تکلیف پہنچائی تھی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا تھا۔ دوسرا جواب ایک احتمال یہ ہے کہ یہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت تھی۔ تیسرا جواب بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان دونوں کا قتل' اس ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہی احتمال زیادہ ظاہر ہے۔ اس لئے کہ ان واقعات میں سے پہلا واقعہ تیسرے سال' دوسرا واقعہ چوتھے سال اور تیسرا واقعہ پانچواں سال خندق کے بعد واقعہ ہوا تھا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسلام ساتویں سال میں غزوہ خیبر والے سال قبول کیا تھا۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور قاضی رحمۃ اللہ علیہ اسی توجیہ کو پسند کیا ہے اور اس کی تلخیص کی ہے اور فرمایا: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایمان اس حرکت سے روکتا ہے، اس کو حرام قرار دیا ہے، لہٰذا کسی مؤمن کے لئے اس کا ارتکاب جائز نہیں، کیونکہ اگر (ناگہاں قتل کرنے سے) مقصود وہ مسلمان ہے تو صورتحال واضح ہے' اور اگر کافر ہے تو پہلے انذار، اور توبہ کرائے۔ کیونکہ مقصود بالذات اس کو قتل کرنا نہیں ہے، بلکہ استکمال مقصود ہے۔ اور حتی الامکان اسلام پر ابھارا جائے، الّا یہ کہ کوئی دینی داعیہ ہو، مثلاً اگر معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے کفر پر مصر ہے، مسلمانوں کو قتل کرنے کی حرص رکھتا ہے، اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہے، تو ایسی صورت میں اگر اندیشہ ہو کہ اس کے بغیر اس کے پر قابو نہیں پایا جاسکتا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بظاہر پہلا جملہ دوسرے جملہ کے بعد ذکر کرنا چاہیے تھا، کیونکہ تعلیل، معلّل کے بعد ذکر کی

جاتی ہے۔ لیکن رتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اور ایمان کا فضل وشرف بیان کرنے کی خاطر تعطیل کو معلل پر مقدم ذکر فرمایا اور ایمان کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر شخص حتی کہ کافر کے ساتھ بھی خیر خواہی کی جائے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: الدین النصیحۃ۔

چنانچہ جو شخص بھی صفت ایمان کے ساتھ متصف ہو اس کو اس صفت سے بھی موصوف ہونا چاہئے اور کئی صفات سے اجتناب کرنا چاہئے۔ کلام اصالتاً ایمان کے بارے میں ہے اور مؤمن کا ذکر تبعاً ہے۔ اگر اس کو مؤخر کرتے معاملہ برعکس ہو جاتا اور اس تقدیر پر حدیث میں نسخ اور تکلف کا التزام نہ کرنا پڑتا۔ اھ۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ کہنا محل نظر ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ اور اس حدیث کو امام احمد نے حضرت زبیر اور حضرت معاویہ سے بھی روایت کیا ہے۔

٣٥٤٩: وَعَنْ جَرِيْرٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا اَبَقَ الْعَبْدُ اِلَى الشِّرْكِ فَقَدْ حَلَّ دَمُهُ۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٢٨، الحدیث رقم: ٤٣٦٠، أخرجه احمد فی المسند ٤ / ٣٦٢

ترجمہ: ”اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جب کوئی غلام شرک (یعنی دار الحرب) کی جانب بھاگ جائے تو اس کا خون حلال ہوگا“۔ (ابوداوٗد)

تشریح: **قوله: اذا الق العبد الى المشرك** ...... : أبق: بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ۔ صاحب المصباح لکھتے ہیں: أبق: ضرب، نصر اور فرح سے آتا ہے۔ یعنی اس کا ماضی مثنی اور مضارع مثلث ہے۔

اگر ایسے غلام کو کوئی قتل کردے تو قاتل سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ اس پر کچھ واجب ہوگا چونکہ اس غلام نے مشرکوں کی محافظت اختیار کی اور دار الاسلام کو ترک کیا۔ اگر کوئی غلام نہ صرف یہ کہ دار الحرب بھاگ جائے بلکہ مرتد بھی ہو جائے تو اس کا خون بطریق اولیٰ حلال ہوگا۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (حدیث میں مذکور سزا دار الحرب بھاگ کر جانے کی ہے) اگرچہ ارتداد تو پایا ہی نہیں گیا، اس کا مشرکین کا محاورت اختیار کرنا اور دار الاسلام کو چھوڑنا ایسا فعل ہے جس نے اس کے خون کو رائیگاں کر دیا ہے، حالانکہ ماقبل میں گزر چکا ہے کہ لا یتراء ی ناراھما۔

شاتم رسول کی سزا کا بیان

٣٥٥٠: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ يَهُوْدِيَّةً كَانَتْ تَشْتِمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَتَقَعُ فِيْهِ، فَخَنَقَهَا رَجُلٌ حَتّٰى مَاتَتْ، فَاَبْطَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَمَهَا. (رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٢٩، الحدیث رقم: ٤٣٦٢

ترجمہ: ''اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی عورت نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو برا بھلا کہا کرتی تھی اور آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میں عیب نکال کر طعن کیا کرتی تھی' چنانچہ (ایک شخص آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شان اقدس میں یہ گستاخی برداشت نہ کر سکا اور) اس نے اس عورت کا گلا گھونٹ ڈالا جس سے وہ مرگئی' نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کا خون معاف کر دیا''۔(ابوداوٗد)

تشریح: قوله: ان لهودية كانت تشتم :

تشتم: تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے جب کہ ایک نسخہ میں تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس کے بیان کے مطابق یہ دولغات ہیں۔

وتقع فيه: عطف تفسیری ہے۔''في'' کے ساتھ اس لئے متعدی کیا گیا کہ ''طعن'' کے معنی کو متضمن ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: کہا جاتا ہے: وقعت فيه اذ اعبته و ذممته۔ (کسی میں عیب نکالنا، برائی کرنا، غیبت کرنا)۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ذمی کا فر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شان اقدس میں گستاخی کرنے سے نہ رکے تو وہ مباح الدم حربی ہو جاتا ہے۔ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہی ہے' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اس ذمی کا عہد و ذمہ نہیں ٹوٹتا چنانچہ یہ مسئلہ فقہ کی کتابوں میں ''کتاب الجزیہ'' کے آخر میں مذکور ہے۔

جادوگر کی سزا بیان

۳۵۵۱: وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبُهُ بِالسَّيْفِ ۔

(رواه الترمذی)

والترمذی ٤ / ٤٩ الحديث رقم: ١٤٦٠

ترجمہ: ''اور حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جادوگر کی حد (شرعی سزا) اس کو تلوار سے قتل کرنا ہے''۔(ترمذی)

تشریح: قوله: حد الساحر ضربه بالسيف:

ضربه: ضرب کی اضافت کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں بصیغہ مرۃ ''یعنی ''ضربة'' کے الفاظ ہیں۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ یہ لفظ تاء اور ہاء دونوں کے ساتھ مروی ہے۔ پہلی صورت اولیٰ ہے۔

بظاہر کہنا یوں چاہئے تھا: ''حد الساحر القتل'' لیکن اس اسلوب کو چھوڑ کر یہ انداز کلام اختیار کرنا، اس کی سزا کی منظر کشی کے لئے ہے۔ نیز یہ کہ اس کی سزا ہی یہی ہے، کوئی اور سزا نہیں ہے۔

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: جادوگر کو قتل کرنے کے مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ صحابہ وغیرہ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جادوگر کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت حفصہ کے بارے میں مروی ہے کہ ان کی ایک باندی نے ان پر جادو کر دیا، تو آپؓ نے اس کو قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا، چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ لکھا ہے: اقتلوا كل ساحر وساحرة:''

ہر جادوگر اور جادوگرنی کو قتل کر ڈالو'، راوی کا بیان ہے کہ ہم نے تین (جادوگرنیوں کو قتل کیا امام شافعیؒ نے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ساحر اگر یہ سحر کرتا ہو اور توبہ نہ کرتا ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ اگر اس کا جادو کفر کو پہنچا ہوا نہ ہو تو اس کا قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک سحر کی تعلیم کفر نہیں ہے' الآ یہ کہ وہ قلب اعیان کا عقیدہ رکھتا ہو۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: ساحر کا سحر اگر ستارہ یا کسی اور چیز کی پرستش جو موجب کفر ہو کے بغیر پورا نہ ہوتا تو اس جادوگر کو قتل کر دیا جائے۔ چونکہ تضام اور تعاون تناسب شرط ہے اور اس (تفصیل) سے ساحرٗ ولی اور نبی ممتاز ہو جاتے ہے اور جہاں تک تعلق ہے تعجب میں ڈال دینے والے امور کا' جیسا کہ اصحاب حیل آلات وادویہ کے ذریعہ کرتے ہیں' تو یہ حرام نہیں ہے اور اس کو سحر کہنا ''تجوزا'' ہے' چونکہ اس میں ''دقت'' ہوتی ہے' اس لئے کہ سحر اصل میں اس کو کہتے ہیں جس کا سبب مخفی ہو۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سحر کی حرمت پر اجماع ہے۔ سحر کی تعلیم وتعلّم کے بارے میں تین قول ہیں:

① صحیح اور جمہور کے نزدیک قطعی بات یہی ہے کہ یہ دونوں حرام ہیں۔

② سیکھنا سکھانا مکروہ ہے۔

③ دونوں مباح ہیں۔

مزید فرماتے ہیں کہ کہانت کرنا، کاہنوں کے پاس جانا، علم نجوم اور اس کی تعلیم دینا حرام ہے اور اس پر عوض لینا بھی حرام ہے، جیسا کہ ''حلوان الکاھن'' کے مسئلہ میں نص صریح سے ثابت ہے۔ واضح رہے کہ علوم شرعیہ کے علاوہ دیگر علوم بعض حرام ہیں' بعض مکروہ ہیں اور بعض مباح یہاں مثلاً فلسفہ، شعبدہ، رمل، علم طبیعات اور قول صحیح کے مطابق علم سحر بھی حرام ہے۔ البتہ حرمت کے درجات میں فرق ہے۔ مکروہ علوم میں وہ اشعار جو غزلیات، یا بہادری وغیرہ پر مشتمل ہوں اور مباح علوم میں ان کے وہ اشعار جو بے ہودہ نہ ہوں، جو شر پر نہ ابھارتے ہوں، خیر کی راہ میں رکاوٹ نہ ہوں۔

تفسیر مدارک میں ہے کہ شیخ ابو منصور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سحر کو علی الاطلاق کفر کہنا خطا ہے۔ حقیقت حال جاننا ضروری ہے۔ پس اگر سحر ایسا ہے کہ جس سے شروط ایمان میں سے کسی شرط کا ردّ لازم آتا ہو تو وہ کفر ہے، ورنہ نہیں۔ علاوہ ازیں جو سحر کفر ہے ،اس کا مرتکب خواہ مرد ہو کہ عورت دونوں کو قتل کیا جائے۔ جس سحر میں کسی شرط اسلام کا ردّ لازم نہ آتا ہو: لیکن اس جادو سے کسی کی جان چلی جائے تو ایسے جادوگر پر ''قزاق'' کے احکامات جاری ہوں گے۔ اس کا مرتکب خواہ مرد ہو، خواہ عورت ہو، دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ اگر وہ توبہ تائب ہو جائے تو اس کی توبہ قبول ہے اور جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس کی توبہ قبول نہیں، سو یہ قائلین غلطی پر ہیں، کیونکہ فرعون کے جادوگر کی توبہ قبول کی گئی تھی۔

الفصل الثالث:

۳۵۵۲: عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَيُّمَا رَجُلٍ خَرَجَ يُفَرِّقُ بَيْنَ اُمَّتِيْ فَاضْرِبُوْا عُنُقَهٗ۔ (رواه النسائی)

أخرجه النسائي في السنن ٧ / ٩٣ ' الحديث رقم: ٤٠٢٣

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو شخص (امام وقت کے خلاف) خروج کرے اور اس طرح وہ میری امت میں تفرقہ ڈالے تو اس کی گردن اڑا دو''۔(نسائی)

تشریح: قوله:ایما رجل خرج ......:

يفرق بين أمتي: اس جملہ میں دو ترکیبی احتمال ہیں: ا۔جملہ حالیہ ہے۔۲۔جملہ مستانفہ، بیانیہ ہے۔امام طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: ''یفرق'' میں افعال مقاربہ کا ''شائبہ'' ہے۔أی : جعل یفرق۔یا ''خرج'' کا ''مطاوع'' ہے۔خرجته فخرج أی مهر فی صيغة التفريق بين المسلمين (یعنی تفریق بین المسلمین کے عمل میں ماہر ہو گیا)۔اس صورت میں یہ حال ہوگا۔فاصربوا عنقه: امام نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی مسلمان امام المسلمین کے خلاف خروج کرے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کا ارادہ کرے تو ضروری ہے کہ اس کو منع کیا جائے۔اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے قتال کیا جائے، اگر اس کا شر اس کو قتل کئے بغیر ختم کرنا ممکن نہ ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے، اس کا خون ''ہدر'' ہے۔

۳۵۵۳:وَعَنْ شَرِيْكِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: كُنْتُ اَتَمَنّٰى اَنْ اَلْقَى رَجُلاً مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْأَلُهُ عَنِ الْخَوَارِجِ، فَلَقِيْتُ: اَبَا بَرْزَةَ فِي يَوْمِ عِيْدٍ فِي نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ فَقُلْتُ لَهُ: هَلْ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ الْخَوَارِجَ؟ قَالَ: نَعَمْ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاُذُنَيَّ وَرَاَيْتُهُ بِعَيْنَيَّ اُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَالٍ فَقَسَمَهُ فَاَعْطٰى مَنْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَمَنْ عَنْ شِمَالِهٖ، وَلَمْ يُعْطِ مَنْ وَّرَاءَهُ شَيْئًا فَقَامَ رَجُلٌ مِنْ وَّرَائِهٖ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ مَا عَدَلْتَ فِي الْقِسْمَةِ، رَجُلٌ اَسْوَدُ مَطْمُوْمُ الشَّعْرِ، عَلَيْهِ ثَوْبَانِ اَبْيَضَانِ، فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَضَبًا شَدِيْدًا، وَقَالَ وَاللّٰهِ لَا تَجِدُوْنَ بَعْدِيْ رَجُلاً هُوَ اَعْدَلُ مِنِّيْ، ثُمَّ قَالَ: يَخْرُجُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ، كَاَنَّ هٰذَا مِنْهُمْ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ، لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، يَمْرُقُوْنَ مِنَ الْاِسْلَامِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ، سِيْمَاهُمُ التَّحْلِيْقُ. لَا يَزَالُوْنَ يَخْرُجُوْنَ حَتّٰى يَخْرُجَ اٰخِرُهُمْ مَعَ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ، فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ، هُمْ شَرُّ الْخَلْقِ وَالْخَلِيْقَةِ۔

أخرجه النسائي في السنن ۷ / ۱۱۹ ، الحديث رقم : ٤٠١٣

ترجمہ: ''اور حضرت شریک بن شہاب تابعی کہتے ہیں کہ میری بڑی آرزو تھی کہ میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے صحابہ میں سے کسی ایک صحابیؓ سے ملاقات کی سعادت حاصل کروں اور ان سے خوارج کے بارے میں دریافت کروں (کہ آج کل جو خوارج پیدا ہو رہے ہیں کیا آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کے متعلق کوئی پیشینگوئی کی تھی؟) چنانچہ میں نے ایک صحابی حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے عید کے دن ان کے دوستوں کی موجودگی میں ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو خوارج کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا ہاں! میں نے اپنے کانوں سے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو خوارج کا ذکر کرتے ہوئے بھی سنا ہے اور اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ بھی دیکھا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں کچھ مال لایا گیا'

آپ ﷺ نے اس مال کو حاضرین مجلس میں اس طرح تقسیم فرمایا کہ جولوگ آپ کی داہنی جانب بیٹھے ہوئے تھے ان کو دیا اور جولوگ بائیں جانب بیٹھے تھے ان کو دیا لیکن جولوگ آپ کے پیچھے تھے ان کو کچھ نہیں دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے محمد! آپ ﷺ نے تقسیم میں انصاف کا پہلو نہیں اپنایا۔ وہ شخص کالے رنگ کا تھا' اس کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے اور دو سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔ (اس کی بات سن کر) رسول اللہ ﷺ سخت غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ ''اللہ کی قسم! تم میرے بعد کسی شخص کو مجھ سے زیادہ انصاف کرنے والا نہیں پاؤ گے اور پھر فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہوگا اور یہ شخص گویا اسی گروہ کا ایک فرد ہے اس گروہ کے لوگ قرآن کی تلاوت کریں گے لیکن ان کا پڑھنا ان کے حلق سے آگے نہیں اترے گا اور وہ لوگ (امام وقت کے خلاف خروج وسرکشی کے ذریعہ) اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کے درمیان سے (آر پار ہو کر) نکل جاتا ہے۔ ان کے سر منڈے ہوئے ہوں گے۔ اس گروہ کے لوگ (ہر زمانہ میں پائے جائیں گے اور) ہمیشہ خروج کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کا آخری شخص دجال کے ساتھ مل کر خروج کرے گا لہٰذا جب بھی تمہارا ان سے سامنا ہو جائے ان کو قتل کر ڈالو' وہ لوگ تمام مخلوقات میں بدترین مخلوق ہیں''۔ (نسائی)

راویٔ حدیث:

شریک بن شہاب۔ یہ شریک بن شہاب ''حارثی وبصری'' ہیں۔ ان کو تابعین میں شمار کیا گیا ہے۔ ''ابی برزہ اسلمی'' سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے ازرق بن قیس روایت کرتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں مشہور نہیں۔

قوله: كنت اتمنى ۔۔۔في نفر من اصحابه: أساله عن الخواج: یہ (جملہ) ''احد'' کی صفت ہے' یا اس سے حال ہے چونکہ وہ موصوف ہے۔

في نفر من اصحابه: (كائنا محذوف کے متعلق ہو کر حال ہے۔) أي: **كائنا في جماعة۔**

قوله: فقلت له: هل سمعت۔۔۔ ورأيته يعنسي: يذكر الخوارج: امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حال ہے، عبارت کی معنوی تقدیر یوں تھی: **سمعت ذكر رسول الله ﷺ الخوارج۔** مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ لایا گیا، پھر لفظ ''يذكر'' پر مشتمل جملہ حالیہ لایا گیا جو مضاف محذوف پر دلالت کرے۔

بأذني: مفرد اور تثنیہ دونوں کے صیغہ کے ساتھ مروی ہے۔ صیغۂ مفرد کی صورت میں یہاں جنس مراد ہوگی بہر تقدیر ''**بأذني**'' افادۂ تاکید کے لئے ہے۔ یہی تقریر ''**سمعت بعيني**'' کے بارے میں ہے۔ ان دونوں میں تاکید یوں ہے کہ سماع بغیر کان کے اور رؤیت بغیر آنکھ کے نہیں ہوتی۔ چنانچہ حدیث مبارکہ کا یہ جملہ، اس آیت کریمہ: ﴿ وَلَا طَٰٓئِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ ﴾ [الانعام:۳۸] کے قبیل سے ہے۔

قوله: أتى رسول الله ۔۔۔ عليه ثوبان أبيضان أتى رسول......:

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جملہ کو ''رأيته'' کی ضمیر مفعول سے حال قرار دیا ہے۔ أي: **رأيته حال كونه ما أتيا بمال** صحابی کا یہ کہنا: ''**سمعت رسول الله بأذني، ورأيته بعيني، أتى رسول الله ﷺ بمال**'' یہ اسلوب کلام واقعہ کے محقق

ہونے اوران کے ثبت فی الروایۃ ہونے کو ظاہر کرتا ہے اور یہ کہ ان کو اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔

رجل أسود: مبتدا محذوف کی خبر ہے، اوراس صفت لانا ذم وشتم کے لئے ہے، کیونکہ بدشکل ہونا بھی خبث باطن پر دلالت کرتا ہے۔

قوله: فغضب رسول الله ﷺ ۔۔۔قوم کان هذا منهم: "أعدل منی": عادل مثلی کے معنی میں ہیں۔یعنی مجھ سے بڑھ کر تو کیا میرے مثل بھی نہیں ہوگا۔

کأن: حرف مشبہ بالفعل ہے۔**هذا:** اس کا مشارالیہ "**الرجل**" محذوف ہے۔

"**هذا منهم**" کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص ان کے سرداروں میں سے ہے، امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **أی من شیعتهم و مقتفی سیر تهم**: یہ اس آیت مبارک کی طرح ہے ﴿ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ﴾ [التوبة:٦٧]: "منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں۔"

یقروون القرآن: یہ جملہ مستانفہ ہے، اس میں ان کی بدحالی اور برے انجام کا ذکر ہے۔

لایجاوز: اس کی ضمیر فاعل میں دواحتمال ہیں: ① قرآن کی طرف راجع ہے۔② قراءت کی طرف راجع ہے۔

سیما هم التحلیق: یعنی ان کی علامت یہ ہے کہ ان کا ظاہر بہت صاف ستھرا ہوگا، اور صفائی ستھرائی میں اس قدر مبالغہ در حقیقت ان کے بد باطن ہونے اور مال وجاہ کا دلدادہ ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

قوله: لایزالون یخرجون......:

یہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ہر جگہ لوگوں میں فتنہ فساد برپا کریں گے۔

فاذا القیتموهم هم شرا الخلق والخلیفة: یہ جملہ شرط کی جزاء ہے۔کیونکہ شرط فعل ماضی ہے اس لئے جزاء پر فاء داخل نہیں کی۔ابوالبقاء نے اس آیت مبارکہ ﴿ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴾[الانعام۔١٢١] میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لیکن اس کے باوجود اس میں تاویل ضروری ہے چنانچہ یہاں اصل عبارت یوں ہے: **فاذا لقیتموهم فاعلموا أنهم شرار خلق الله فاقتلوهم۔** جیسا کہ فرمایا: **طوبی لمن قتلهم و قتلوه** اور دوسری تاویل یہ ہے کہ جزاء محذوف ہے۔**أی فاقتلوهم۔** اور مابعد جملہ مستانفہ ہے، موجب کا بیان ہے "**الخلیفة**" کا عطف "**الخلق**" پر ہے، عطف کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں مغایرت ہونی چاہئے۔لہٰذا شر کو تفصیل پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔**أی هم شر خلقا و شر سجیة**۔اور یہ جملہ: **اللهم کما حسنت خلقی وضعسن خلقی** بالکل اس کے برعکس ہے۔

مطموم الشعر: صاحب النہایہ فرماتے ہیں: **طمّ شعره وجزه استأصله** اھ۔(بال چونٹنا، جڑ سے اکھاڑنا)

اس کے سر کا برہنہ ہونا فساد برپا کرنے کے لئے ہے، اور یہ کہ اس آدمی میں شعور اور ادب نام کی چیز برائے نام بھی نہیں ہے۔**علیه ثوبان أبیضان:** یہ صفت بھی اس کے نفاق کا پول کھول رہی کہ ظاہر میں بڑی نظافت باطن میں بڑی کثافت، کپڑے اجلے اور تن کا لا۔

۳۵۵۴: وَعَنْ اَبِیْ غَالِبٍ رَأَی اَبُوْ اُمَامَةَ رُءُوْسًا مَنْصُوْبَةً عَلٰی دَرَجِ دِمَشْقَ، فَقَالَ اَبُوْ اُمَامَةَ کِلَابُ

النَّارِ شَرُّ قَتْلٰی تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ، خَيْرُ قَتْلٰی مَنْ قَتَلُوْهُ ثُمَّ قَرَأَ: يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ اَلْاٰيَةَ قِيْلَ: لِاَبِيْ اُمَامَةَ اَنْتَ سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: لَوْ لَمْ اَسْمَعْهُ اِلاَّ مَرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا حَتّٰى عَدَّ سَبْعاً مَا حَدَّثْتُكُمُوْهُ. (رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث حسن)

والترمذی ٥ / ٢١٠، الحديث رقم: ٣٠٠٠، ابن ماجه فی السنن ١ / ٦٢، الحديث رقم: أخرجه احمد فی المسند ٥ / ٢٥٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابو غالب رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ (صحابی) نے (ایک دن) دمشق کی شاہراہ پر (خوارج کے) سر نصب کئے ہوئے دیکھے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ دوزخ کے کتے ہیں اور آسمان کے نیچے بدترین مقتول ہیں اور بہترین مقتول وہ ہے جس کو انہوں نے قتل کیا ہو اور پھر انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی۔ اس (قیامت کے) دن کہ بہت سے چہرے سفید (روشن) ہوں گے اور بہت سے چہرے سیاہ ہوں گے۔ حضرت ابوامامہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟ ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نے یہ بات ایک بار دو بار تین بار یہاں تک کہ انہوں نے سات بار گنا نہ سنی ہوتی تو اس حدیث کو تمہارے سامنے بیان نہ کرتا (یعنی اگر میں نے اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی کثرت سے بار بار نہ سنا ہوتا تو تمہارے سامنے ہرگز بیان نہ کرتا) (ترمذی، ابن ماجہ)۔ اسنادی حیثیت امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے''۔

راویٔ حدیث:

ابو غالب۔ ''ابو غالب'' کنیت اور ''حزور'' نام ہے۔ بنو باہلہ کے فرد ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ حضرت عبد الرحمن ابن الحضرمی نے ان کو آزاد کیا۔ ابوامامہ اور ابوبکر بن عبداللہ سے روایت کی اور ان سے شام میں ملاقات کی۔ ان سے ابن عیینہ، حماد بن زید اور ضمرہ بن ربیعہ روایت کرتے ہیں۔ ''حزور'' میں حا مہملہ پر زبر، راء معجمہ پر زبر، واؤ مشدد اور آخر میں راء مہملہ ہے۔

تشریح: قوله: رأى ابو امامة رؤوسا۔۔۔خير قتلى مت قتلوه:

منصوبة: یہ بمعنی ''واقعة'' یا بمعنی ''مصلوبة'' ہے۔

درج: اس سے مراد ''رابتہ'' ہے اور اس کی وضاحت جوہری نے ''مرقاۃ'' کے ساتھ کی ہے، اور جمع ''درج'' بتائی ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں لفظ ''منصوبہ'' کے پیش نظر یہاں یہی معنی مراد معلوم ہوتے ہیں۔

دمشق: اس لفظ کو دو طرح سے پڑھا جاتا ہے: ① دال کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ۔ ② دال اور میم، دونوں کے کسرہ کے ساتھ۔

کلاب النار: مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ أی: هم كلاب۔ یا عبارت کی تقدیر یوں ہے: علی صورة كلاب فيها۔

قتلی: یہ ''قتیل'' بمعنی ''مقتول'' کی جمع ہے۔ (اس کی ترکیب میں تین احتمال ہیں:)

ا۔مبتدامحذوف کی خبر ہے۔۲۔خبرثانی ہے۔۳۔بدل ہے۔

تحت أديم السماء: ظرف ہے۔

"**خير قتلى**"مبتدا ہےاور"**من قتلوه**":خبر ہے۔ظاہر کا تقاضااس کے برعکس تھا۔لیکن اہتمام کی غرض سے برعکس کردیا جیسا کہ شاعر کےاس قول میں:

الا ان خير الناس حيًّا وميتاً ☆ أيسر سقيف عندها فى السلاسل

قوله:ثم ارق...... الآية:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کا اس موقع پر آیت کریمہ پڑھنا،درحقیقت اس تفصیل کی طرف اشارہ تھا:﴿**فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ**﴾ [آل عمران : ۱۰۶]"**أَكْفَرْتُمْ**" سے پہلے فعل محذوف ہے۔أی:**فيقال لهم:أكفرتم؟** ہمزہ"توبیخ"کے لئے ہے۔ان کے حال پر"تعجب"کااظہار ہے۔

رؤوسا منصوبة:(یہ کون لوگ تھے؟اس میں متعدد آزاد ہیں:)① کہا گیا ہے کہ وہ مرتد تھے② بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بدعتی تھے③ حضرت ابوامامہؓ سے منقول ہے کہ وہ خوارج تھے۔

كِتَابُ الْحُدُوْدِ

حدود کا بیان

شرح الالفاظ: حدود، حد: کی جمع ہے۔امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الحد الحاجز بین شیئین الذی یمنع اختلاط أحدهما بالآخر: یعنی حد وہ چیز ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو اور ان دونوں چیزوں کو باہم مخلوط ہونے سے روکے۔ حد الزنا، حد الخمر کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ یہ سزائیں بندوں کو گناہوں میں مبتلا ہونے سے روکتی ہیں' اور ان کا خوف انسان اور جرم کے درمیان حائل رہتا ہے۔

شرعی سزاؤں کی قسمیں

شرعی قانون نے جرم وسزا کا جو ضابطہ مقرر کیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں سزائیں تین طرح کی ہیں:

① وہ سزائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے متعین کر دیا ہے مگر ان کے اجراء کو خود بندوں پر چھوڑ دیا ہے ان میں کسی خارجی طاقت جیسے حاکم یا حکومت کو دخل انداز ہونے کا حکم نہیں ہے' شریعت نے اس طرح کی سزا کا نام کفارہ رکھا ہے جیسے قسم کی خلاف ورزی یا رمضان میں بلا عذر شرعی روزہ توڑ دینے کا کفارہ!

② وہ سزائیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور ساتھ ہی متعین ہیں' ان سزاؤں کو جاری کرنے کا اختیار تو حاکم یا حکومت کو ہے مگر ان میں قانون سازی کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے' اس طرح کی سزا کو شریعت میں حد کہتے ہیں جیسے چوری' زنا اور شراب نوشی کی سزائیں۔

③ وہ سزائیں جنہیں کتاب وسنت نے متعین تو نہیں ہے مگر جن برے کاموں کی یہ سزائیں ہیں ان کو جرائم کی فہرست میں داخل کیا ہے اور سزا کے تعین کا مسئلہ حاکم یا حکومت کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ موقع ومحل اور ضرورت کے مطابق سزا خود متعین کریں گویا اس قسم کی سزاؤں میں حکومت کو قانون سازی کا حق بھی حاصل ہے مگر اس دائرہ کے اندر رہ کر جو

شریعت نے متعین کر رکھا ہے اس طرح کی سزا شریعت میں ''تعزیر'' کہلاتی ہے۔

حد اور تعزیر میں فرق

حد اور تعزیر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حد تو شریعت میں ''عقوبت'' ہے جو اللہ کا حق قرار دی گئی ہے اسی لئے اس کو حق اللہ کہا جاتا ہے بایں وجہ کہ اس میں کوئی بندہ تصرف نہیں کرسکتا اور تعزیر کو حق اللہ کہا جاتا ہے بایں وجہ کہ بندہ اس میں تصرف کرسکتا ہے یعنی اگر وہ کوئی مصلحت دیکھے تو قابل تعزیر مجرم کو بھی معاف کرسکتا ہے اور موقع ومحل اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا میں کمی زیادتی اور تغیر وتبدل بھی کرسکتا ہے، حاصل یہ کہ حد تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہے جس میں کوئی تصرف ممکن نہیں اور تعزیر قاضی یا حکومت کے سپرد ہے اسی عدم تقدیر وتحقیق کی بنا پر تعزیر کو حد نہیں کہا جاتا۔ یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ جن جرائم سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہے اس میں مخلوق پر بھی ظلم ہوتا ہے۔ اور خالق کی بھی نافرمانی ہوتی ہے، اس لئے ہر ایسے جرم میں حق اللہ تعالیٰ اور حق العبد دونوں شامل ہوتے ہیں، اور انسان دونوں کا مجرم بنتا ہے۔

الفصل الاول :

زنا کی سزا ازروئے کتاب اللہ

۳۵۵۵: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ، وَزَیْدِ بْنِ خَالِدٍ اَنَّ رُجُلَیْنِ اخْتَصَمَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ اَحَدُهُمَا: اِقْضِ بَیْنَنَا بِکِتَابِ اللّٰهِ وَقَالَ الْاٰخَرُ اَجَلْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَاقْضِ بَیْنَنَا بِکِتَابِ اللّٰهِ وَائْذِنْ لِیْ اَنْ اَتَکَلَّمَ، قَالَ تَکَلَّمْ، قَالَ: اِنَّ ابْنِیْ کَانَ عَسِیْفًا عَلٰی هٰذَا، فَزَنٰی بِامْرَاَتِهٖ، فَاَخْبَرُوْنِیْ اَنَّ عَلٰی ابْنِیْ الرَّجْمَ، فَافْتَدَیْتُ مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَبِجَارِیَةٍ لِیْ، ثُمَّ اِنِّیْ سَاَلْتُ اَهْلَ الْعِلْمِ، فَاَخْبَرُوْنِیْ اَنَّ عَلٰی ابْنِیْ جَلْدَ مِائَةٍ وَتَغْرِیْبُ عَامٍ، وَاِنَّمَا الرَّجْمُ عَلٰی امْرَاَتِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَمَّا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَاَقْضِیَنَّ بَیْنَکُمَا بِکِتَابِ اللّٰهِ اَمَّا غَنَمُکَ وَجَارِیَتُکَ فَرَدٌّ عَلَیْکَ وَاَمَّا ابْنُکَ فَعَلَیْهِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِیْبُ عَامٍ، وَاَمَّا اَنْتَ یَا اُنَیْسُ فَاغْدُ عَلٰی امْرَاَةِ هٰذَا فَاِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا فَاعْتَرَفَتْ، فَرَجَمَهَا (متفق علیه)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ١١ / ٥٢٣، الحدیث رقم : ٢٦٣٣، أخرجه المسلم فی صحیحه ٣ / ١٣٢٤، الحدیث رقم : (٢٥۔ ١٦٩٧) أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٥٩١، الحدیث رقم : ٤٤٤٥، والترمذی ٤ / ٣٠، الحدیث رقم : ١٤٣٣، والنسائی ٨ / ٢٤٠، الحدیث رقم : ٥٤١٠، وابن ماجه فی ٢ / ٨٥٢، الحدیث رقم : الحدود، أخرجه احمد فی المسند ٤ / ١١٥

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں دو آدمی اپنا قضیہ لے کر آئے' ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کیجئے دوسرے نے بھی عرض کیا کہ ہاں' یا رسول اللہ! ہمارے درمیان کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کیجئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں (آپ کی خدمت میں کچھ) بیان کروں کہ (قضیہ کی صورت کیا ہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بیان کرو۔ اس شخص نے بیان کیا کہ میرا بیٹا اس شخص کے ہاں مزدور تھا اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا' لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے بیٹے کی سزا سنگساری ہے لیکن میں نے اس کو سنگسار کرنے کے بدلے میں سو بکریاں اور ایک لونڈی دے دی' پھر جب میں نے اس بارے میں علماء سے سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہارے بیٹا کی سزا (چونکہ وہ محصن یعنی شادی شدہ نہیں ہے اس لئے) اس کی سزا سو کوڑے ہیں اور ایک سال کی جلا وطنی ہے۔ اور اس کی عورت کی سزا سنگساری ہے (کیونکہ وہ شادی شدہ ہے) رسول اللہ ﷺ نے (یہ قصہ سن کر) فرمایا کہ آگاہ رہو! قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ یعنی قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میں تمہارے درمیان کتاب اللہ ہی کے موافق فیصلہ کروں گا تو سنو کہ تمہاری بکریاں اور تمہاری لونڈی تمہیں واپس مل جائے گی (اور اگر خود ملزم کے اقرار یا چار گواہوں کی شہادت سے زنا کا جرم ثابت ہے تو) تمہارے بیٹے کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی اور ایک سال کیلئے جلا وطن کر دیا جائے گا (پھر آپ ﷺ نے حضرت انیس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ) اے انیس! تم اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ (زنا کا) اعتراف کر لے تو اس کو سنگسار کر دیا۔ چنانچہ اس عورت نے (زنا کا) اعتراف کر لیا اور حضرت انیس نے اس کو سنگسار کر دیا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **فان اعترفت فارجمها**: حضرات شافعیہ اس جملہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اگر کوئی شخص ایک مرتبہ بھی اعتراف کر لے تو اس کو رجم کیا جائے گا۔ حضور اقدس ﷺ نے حضرت انیس رضی اللہ عنہ سے یہ نہیں فرمایا: **ان اعترفت أربع مرات**، بلکہ مطلق فرمایا کہ جب اعتراف کر لے تو رجم کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ کا اعتراف کر لینا بھی کافی ہے۔ حنفیہ اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ **فان اعترفت** کا مطلب یہ ہے کہ **فان اعترفت بالطریق المعروف** یعنی معروف طریقہ کے مطابق اعتراف کر لے تو رجم کر دو اور معروف طریقہ یہ ہے کہ چار مرتبہ اعتراف کرے۔ چنانچہ صحیحین کی یہ روایت اس مسئلہ میں بالکل صریح ہے۔

۳۵۵۶: **وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَأْمُرُ فِيْمَنْ زَنٰى وَلَمْ يُحْصِنْ جَلْدَ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبَ عَامٍ**. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲ / ۱۵۶ ' الحدیث رقم: ۶۸۳۱

ترجمہ: ''اور حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو غیر شادی شدہ زانی کے بارے میں سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کا حکم سنا''۔ (بخاری)

تشریح: **ولم یحصن**: صاد مہملہ کے کسرہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں کہ ''احصان'' کے معنی ہیں ''منع''، عورت کے لئے شرائط احصان یہ ہیں: ① اسلام ② عفت ③ حریت ④ شادی شدہ ہونا۔

صاحب النہایۃ لکھتے ہیں:الاحصان: المنع، والمرأة تكون محصنة بالاسلام والعفاف والحرية والتزويج، يقال : أحصنت المرأة، فهي محصنة ومحصنة، وكذلك الرجل والمحصن بالفتح بمعنى الفاعل والمفعول وهو أحد الثلاثة التي جئن نوادر، يقال أحصن فهو محصن، وأسهب فهو مسهب والفح فهو ملفح۔

ان سائلین کا تقاضا یہ تھا کہ فیصلہ اللہ کے حکم کے موافق فرمائیے، حالانکہ وہ دونوں یہ بات جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ اللہ کے حکم کے موافق ہی فرماتے ہیں، چونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اصل حکم بتائیے بطور صلح کے حکم کا فیصلہ نہ فرمائیں۔ چونکہ حاکم کو یہ اختیار تو ہوتا ہے کہ خصمین اگر راضی ہوں تو صلح بھی ہوسکتی ہے (بشرطیکہ اس معاملہ میں شریعت نے صلح کا اختیار رکھا ہو)

علی هذا: امام طیبیؒ فرماتے ہیں علی هذا، اُمیر کے لئے صفت ممیزہ ہے أی أجيرا ثابت ادأجرة عليه ۔

فرد عليك: رد بمعنیٰ ''مردود'' ہے، أی مردود عليك ۔ جلد مائة اضافت کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ''جلد'' منصوب وممنون ہے اور ''مائة''، منصوب علی لاتمیز ہے۔

أنيس: أنس کی تصغیر ہے۔ انس سے مراد انس بن ضحاک اسلمی ہیں۔

فاغد: ''غددوة'' سے امر کا صیغہ ہے۔ (صبح کے وقت جانا) اور اسی طرح ''روحة'' ہے۔ (شام کے وقت جانا) لیکن یہ دونوں مطلق جانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مطلق جانا مراد ہے۔ صبح کے وقت جانا مراد نہیں ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث (چند مسائل) دلالت کر رہی ہے ① آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں دیگر حضرات کا فتویٰ دینا جائز تھا۔ ''زانی'' کے والد کے قول: سألت أهل العلم فأخروني...... پر نبی کریم کا نکیر نہ فرمایا اس کے جواز پر دلالت کر رہا ہے۔ ② کہ ''بکر'' کی حد زنا سو (۱۰۰) کوڑے اور سال بھر جلاوطنی ہے۔ ③ اقامت حدود کے وقت امام کی موجودگی ضروری نہیں۔ جیسا کہ یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت انیس رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمادیا تھا۔ ④ اقامت حدود میں نیابت جائز ہے۔ اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ان (صحابی) کی موجودگی ان کی (یعنی حضور) کی موجودگی ہے۔ لہٰذا استدلال نام نہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت انس کو اس زانیہ کی طرف بھیجنا اس بات پر محمول ہے کہ وہ اس عورت کو آگاہ کریں کہ عیف کے والد نے اپنے بیٹے کو اس کے ساتھ زنا میں متہم ٹھرایا ہے۔ تو کیا وہ عیف کے باپ پر حد قذف کا اجراء چاہتی ہے یا معاف کرتی ہے یا اعتراف زنا کرتی ہے۔ پس اگر وہ اعتراف کر لیتی ہے تو عیف کے باپ پر حد قذف جاری نہیں کیا جائے گی، البتہ اس عورت پر حد زنا (یعنی رجم کی سزا) جاری کی جائے گی، چونکہ وہ ''محضہ'' ہے یہاں یہ تاویل کرنا ضروری ہے، چونکہ ظاہر حال سے یوں لگتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو طلب اقامت حد زنا اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا اور یہ مراد نہیں ہوسکتا چونکہ ''حد زنا'' میں ''تجسس'' نہیں ہوتا، نہ کھود کرید ہوتا ہے بلکہ اگر زانی اقرار کر بھی لے تو اس کو رجوع کی تلقین کرنا مستحب ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خصمین میں سے اگر کوئی قاضی یا امام سے یہ کہے کہ ''انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو'' یا اس طرح کی کوئی اور بات کرے تو قاضی اور امام کو چاہئے کہ صبر تحمل سے کام لے۔

شرح السنہ میں مذکور ہے کہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ مقدمہ کی سماعت کی ابتداء خصمین میں سے جس سے چاہے کرسکتا ہے۔

اور ''فرد عليك'' اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ بیع فاسد اور صلح فاسد کے ذریعہ لیا گیا مال، صاحب مال کو واپس کیا جائے گا، وہ مال اس ''آخذ'' کی ملکیت نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے بارے میں صرف ایک بار بھی زنا کا اقرار کر لے تو اس پر حد قائم کی جائے گی، مکرر اقرار ضروری نہیں۔ جیسا کہ اگر کوئی شخص چوری کا اقرار ایک بار کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کا اعتراف ایک بار کرے تو اس سے قصاص لیا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب فرماتے ہیں کہ چار مجالس میں چار اقرار ضروری ہیں۔ اور جب کوئی ایک مجلس میں چار بار اقرار کرے تو وہ ایک اقرار کی طرح ہے۔ اھ۔

عن أبي هريرة: قال: أتى رجل من المسلمين رسول الله ﷺ وهو في المسجد فقال: يا رسول الله! اني زنيت فأعرض عنه حتى بين ذلك أربع مرات، فلما شهد على نفسه أربع شهادات، دعا رسول الله فقال: لا قال: هل أحصنت؟ قال: نعم، فقال رسول الله ﷺ: اذهبوا به فارجموه، فرجمناه بالمصلّى، فلما أذلقته الحجارة هرب، فادركناه بالحرة فرجمناه۔

یہ روایت اس مسئلہ میں ظاہر ہے کہ ان کا اعتراف ایک مجلس میں تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ کی بات بجا ہے کہ یہ روایت اس مسئلہ میں ظاہر ہے، لیکن مسلم شریف کی روایت اس مسئلہ میں اظہر ہے کہ یہ اعتراف مختلف مجالس میں تھے: **عن بريدة أن ما عزا أتى النبي ﷺ فردّه، ثم أتاه الثانية من الغد فرد ثم أرسل الى قومه هل تعلمون بعقله بأسا؟ فقالوا: ما نعلمه الا وفي الفعل من صالحينا، فأتاه الثالثة فأرسل اليهم أيضا فسألوه فأخبروه أنه لا بأس به، ولا بعقله، فلما كان الرابعة حفر له حفيرة فرجمه۔**

احمد اور اسحاق بن راہو یہ دونوں نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ اپنے مصنفہ میں نقل کرتے ہیں:

حدثنا وكيع عن اسرائيل عن جابر عن عبدالرحمن بن أبزى عن أبي بكر رضي الله تعالى عنه قال: أتى ما عز بن مالك النبي ﷺ، ثم جاء فاعترف وأنا عنده الثالثة فردّه، فقلت له: ان اعترفت الرابعة رجمك، قال: فاعترف الرابعة فجسه ثم سأل عنه، فقالو الا نعلم الا خير فأمر به، فرجم۔

اس روایت میں راوی نے ماعز کے بار بار کے آنے کی تصریح کی ہے، یہ بار بار کا آنا ''غیبوبت'' کو مستلزم ہے۔ اور جا کر دو بارہ آنے سے مجلس تبدیل ہو جاتی ہے اسی وجہ سے ہم چار مجالس میں اقرار کے قائل ہیں۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے: **قال: جاء ماعز بن مالك الى النبي ﷺ فقال: ان الأبعد زنى فقال له: ويلك، وما يدريك الزنا؟ فامر به فطرد فأخرج، فأتاه الثانية، فقال له: مثل ذلك، فأمر به فطرد فأخرج، ثم أتاه الثالثه فقال له: مثلك لك فأمر به فطرد فأخرج، ثم أتاه الرابعة، فقال: مثل ذلك۔ فقال: أدخلت، وأخرجته؟ قال: نعم، فأمر به أن يرجم۔** یہ اور دیگر روایت تعددِ مجالس کے مسئلہ میں بالکل ظاہر ہیں،

لہٰذا ضروری ہے کہ پہلی حدیث کو بھی اسی پر محمول کیا جائے۔

ثبوت زنا کیسے ہوگا؟

۳۵۵۷: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ، وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ، فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى اٰيَةُ الرَّجْمِ، رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ، وَالرَّجْمُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى، اِذَا اَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ، اِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ، اَوْ كَانَ الْحَبَلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٢ / ١٣٧، الحديث رقم: ٦٨٢٩ و مسلم في ٣ / ١٣١٧، الحديث رقم: (١٥ / ١٦٩١) أخرجه ابوداؤد في السنن ٤ / ٥٧٢، الحديث رقم: ٤٤١٨، والترمذي في ٤ / ٣٠، الحديث رقم: ١٤٣٢، وابن ماجه في ٢ / ٨٥٢ الحديث رقم: ٢٥٥٣، والدارمي في ٢ / ٢٣٤ الحديث رقم: ٢٣٢٢ و مالك في الموطأ ٢ / ٨٢٤ الحديث رقم: ١٠ في كتاب الحدود وأحمد في المسند ١ / ٤٠

ترجمہ: ''اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر اپنی کتاب نازل کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں جو کچھ نازل کیا ہے اس میں آیت رجم بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے بھی رجم کیا اور کتاب اللہ میں اس شخص اور عورت کو رجم کرنے کا حکم ثابت ہے جو محصن ہونے کے باوجود زنا کرے بشرطیکہ گواہی ثابت ہو جائے یا عورت حاملہ ہو جائے یا جرم کا اعتراف ہو جائے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: آية الرجم: آیة ''کان'' کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، مما: من تبعیضیہ ہے، یہ ''کان'' کی ''خبر'' ہے۔ ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ اس صورت میں تقریر یوں ہوگی: فکان بعض ما أنزل اللّٰه آیة الرجم۔ رجم رسول ﷺ: جملہ مستانفہ، بیانیہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اندیشہ موجودہ دور کے آئینے میں

آیت رجم اور قرآن:

کیا یہ آیت رجم قرآن کریم کا حصہ تھی؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل فرمائی اس میں آیات رجم بھی موجود تھی اس قول کا مطلب عام طور پر یہی بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ مشہور آیت ہے: الشیخة والشیخ اذا زنیا فارجموھا۔

اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ آیات پہلے قرآن کریم میں موجود تھی بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی لیکن حکم منسوخ نہیں ہوا اور اگلی حدیث میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے بارے لوگ کہیں گے کہ اس نے کتاب اللہ

میں زیادتی کردی تو میں یہ آیات قرآن کریم لکھ دیتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات قرآن کریم کا حصہ تھی۔

آیت رجم اور تقریرات:

یہ آیت رجم تورات کا حصہ تھی۔ لیکن تحقیق کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے۔ **واللّٰہ سبحانہ اعلم ان کان صوابا فمن اللّٰہ، وان کان خطاءً فمني ومن الشيطان۔** وہ یہ کہ یہ آیات قرآن کریم کا حصہ کبھی نہیں رہی بلکہ درحقیقت تورات کی آیات تھی لیکن جب حضور اکرم ﷺ کے پاس تورات کا حکم آیا تو تورات کی اس آیات کو امتِ محمدیہ کیلئے باقی رکھا گیا اور بذریعہ وحی آپ کو بتایا گیا کہ یہ تورات کی آیات ہے اور اس کا حکم آپ ﷺ کی امت کیلئے باقی رکھا گیا ہے اس وجہ سے یہ آیت کبھی بھی قرآن کے طور پر نہیں لکھی گئی بلکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضور ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ، یہ آیت **الشيخ والشيخة!** یہ جب آیت ہی ہے تو کیا میں اس کو قرآن کریم کی دوسری آیات کے ساتھ لکھ لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ اگر ''شیخ''، محصن نہ ہو تو رجم نہیں ہوتا اور اگر ''محصن'' شیخ نہ ہو تو رجم ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ رجم کا مدار شیخ ہونے پر نہیں ہے اس لئے یہ آیت مت لکھو۔ اگر یہ آیت قرآن کریم کا حصہ ہوتی تو حضور اکرم ﷺ اس کو لکھنے سے کیسے انکار فرماتے کہ اس آیت میں تو لفظ ''شیخ'' ہے اور شیخ پر رجم کا مدار نہیں ہوتا یہ بات کیسے فرماتے؟ اس لئے کہ یہ قرآن کا لفظ ہے اور قرآن میں تبدیلی کا امکان نہیں ہوتا اور حضور ﷺ اپنی مرضی سے تو یہ نہیں کر سکتے تھے کہ قرآن کریم نے فلاں لفظ پر یہ اشکال وارد ہو رہا ہے اس لئے اس کو قرآن نہ سمجھو اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت شروع ہی سے قرآن کریم کا حصہ نہیں تھی بلکہ تورات کا حصہ تھی۔

تورات کا حصہ ہونے کی دلیل:

اور تورات کا حصہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شیخین کی ایک روایت ہے کہ جب یہودیوں میں زنا کا ایک واقعہ پیش آیا تو حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور بتایا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کرلیا ہے حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تورات کے اندر تم رجم کے بارے میں پاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ تورات کے حکم کے مطابق ان کو رسوا کرتے ہیں اور کوڑے لگاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم جھوٹ بولتے ہو اس میں آیت رجم موجود ہے۔ چنانچہ وہ لوگ تورات لائے اور اس کو حضور ﷺ کے سامنے پڑھنا شروع کیا تو عبداللہ بن صوریا نے آیت رجم پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس سے پہلے اور بعد کی آیت پڑھ لی تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ جب اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو آیت رجم موجود تھا۔ البتہ چونکہ اس ایک آیت کا حکم امت محمدیہ پر باقی رکھا گیا تھا اور بذریعہ وحی آپ ﷺ کو بتا دیا گیا تھا کہ اس کا حکم آپ ﷺ کی امت پر باقی ہے اس لئے اس کو اس بات سے تعبیر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔ لہٰذا اب وہ اشکال کہ اگر اس آیت کا حکم باقی تھا تو پھر اس آیت کی تلاوت کیوں منسوخ کی گئی یہ اشکال اب ختم ہو گیا۔

اِس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی دوراندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ جب زمانہ طویل گزر جائے گا تو اس کے بعد لوگ کہیں گے کہ کتاب اللہ کے اندر آیت رجم موجود نہیں ہے اور اس کی بنیاد پر وہ رجم سے

انکار کردیں گے ایسا معلوم ہوتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہمارے آج کے زمانے کو دیکھ کر یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔ چنانچہ آج منکرین رجم مختلف قسم کے اعتراضات کررہے ہیں۔

منکرین رجم کا پہلا اشکال:

قرآن کریم میں تو صرف کوڑوں کا ذکر ہے رجم کا ذکر نہیں۔ لہذا ہم اسے نہیں مانتے۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: الزانیہ والزانی اور رجم کے بارے میں کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔

منکرین رجم کا دوسرا اشکال رجم کے سلسلہ میں:

اسی وجہ سے لوگوں نے رجم کی مشروعیت ہی کا انکار کردیا۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو وہ اخبارِ احاد ہیں اخبارِ احادیث سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہوسکتی۔

منکرین رجم کا تیسرا اشکال:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رجم کے احکام میں اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہوں اور یہ آیت اس کیلئے ناسخ ہوگئی ہو۔ منکرین رجم کی یہ تینوں باتیں غلط ہیں۔ پہلے اشکال کا جواب: پہلے اشکال کا جواب اوپر گزر چکا ہے۔ دوسرے اشکال کا جواب: رجم کی احادیث اخبارِ آحاد نہیں ہیں بلکہ متواترۃ المعنی ہیں۔ رجم کی احادیث ۵۴ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اس لیے ان کے متواترہ المعنی ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور متواترۃ المعنی سے کتاب اللہ پر زیادتی بھی ہوسکتی ہے۔ تیسرے اشکال کا جواب: یہ کہنا غلط ہے کہ رجم کے احکام اس ایک آیت کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت سورۃ النور کی آیت ہے اور سورہ نور قصہ اُفک کے موقع پر نازل ہوئی اور قصہ اُفک سن چھ ہجری میں پیش آیا تھا۔ دلیل اس بات کی یہ ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا رجم یہودیوں کا تھا جس واقع اوپر گذرا ہے۔ اس رجم کے بارے میں حضرت عبداللہ بن الحارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان میں رجم کرنے والوں میں تھا اور یہ صحابی سن چھ ہجری کے بعد اسلام لائے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور یہودیہ کے رجم کا واقعہ سن چھ ہجری کے بعد پیش آیا اور وہ اسلام میں پہلا رجم تھا اور دوسرے رجم اس کے بھی بعد کے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ واقعات رجم میں اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں۔

آیت: "جلد مائه" پر اشکال اور جواب:

ایک اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ کتاب اللہ میں آیت مطلق ہے، اس میں محصن اور غیر محصن کا کوئی فرق نہیں کیا گیا پھر احادیث میں محصن کو رجم کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس کی وجہ سے حدیث سے آیت کو ایک طرح سے نسخ کیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں یہ نسخ ہے بلکہ میرا رجحان اس طرف ہے (واللہ سبحانہ اعلم) کہ قرآن کی آیت کہ: الزانیہ والزانی میں جو حکم دیا گیا ہے وہ عام ہے اور محصن اور غیر محصن دونوں کو شامل ہے۔ صرف غیر محصن کے ساتھ خاص نہیں ہے اور قرآن نے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محصن کیلئے سو کوڑوں کے ساتھ دوسری سزا یعنی رجم کا اضافہ فرمایا،

یعنی محصن دو سزاؤں کا مستوجب ہوتا ہے۔ایک سو کوڑے اور دوسرے رجم۔یہی وجہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے رجم کا اعلان فرمایا تو اس اعلان میں فرمایا کہ **جلدۃ مائہ رجم**۔یعنی اس پر سو کوڑے ہیں اور رجم ہے لہٰذا جو محصن زنا کرے اس پر کتاب اللہ کی رو سے سو کوڑے واجب ہیں اور سنت رسول ﷺ کی رو سے رجم واجب ہے۔

دو سزاؤں کو مدغم کرنے کا بیان:

دو سزاؤں کو مدغم کیا جا سکتا ہے لیکن قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شخص پر دو سزائیں جمع ہو جائیں اور ان میں سے ایک سزا ایسی ہو جو انسان کی موت واقع کرنے والی ہو تو اس صورت میں چھوٹی سزا بڑی سزا میں مدغم ہو جاتی ہے۔اس لئے امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اگر چاہے تو سو کوڑے کی سزا کو موت کی سزا میں مدغم کر کے صرف رجم کر دے اور اگر چاہے تو دونوں سزائیں جاری کر دے۔چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب شراح حمدانیہ کو رجم کیا جس کا واقعہ آپ صحیح بخاری میں پڑھیں تو آپ ﷺ نے جمعرات کے روز سو کوڑے لگائے اور جمعہ کے روز رجم کیا پھر آپؓ نے فرمایا: (**جلدتها بكتاب الله ورحمتها بينه رسول الله** ﷺ) اور دوسرے حضرات خلفاء نے ان دونوں سزاؤں کو مدغم کیا اس سے معلوم ہوا کہ محصن پر دونوں سزائیں اپنی اپنی جگہ پر ثابت ہیں اور رجم کی حدیث نے سورہ نور کی آیت کو منسوخ نہیں کیا اور نہ ہی اس میں تقیید کی ہے اور نہ ہی اس میں تخصیص کی ہے بلکہ اس کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور ایک سزا کا اور اضافہ کر دیا یہ میری تحقیق ہے جو میں نے تکملہ فتح الملہم میں ذکر کی ہے اور اس کی بناء پر تمام روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

کیا ''حمل'' زانی ہونے کی دلیل کافی ہے؟

''**او کان حمل**'' اس سے استدلال کرتے ہوئے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کنواری لڑکی کو حمل ہو جائے تو یہ اس کے زانیہ ہونے کی دلیل قاطع ہے۔اس بنیاد پر اس پر زنا کی سزا جاری ہوگی۔اسی طرح اگر وہ عورت مطلقہ تھی یا بیوہ تھی اور شوہر سے اس کی جدائی اتنا عرصہ پہلے ہو چکی تھی جو اکثر مدت حمل سے زائد ہے۔مثلاً ایک عورت کے شوہر کو فوت ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں اور اب اس عورت کا حمل ظاہر ہو گیا تو امام مالکؒ کے نزدیک یہ حمل اس کے زانیہ ہونے کیلئے دلیل قاطع ہے۔لہٰذا اس کی بناء پر اس کو رجم کیا جا سکتا ہے۔چاہے زنا پر گواہ نہ ہو اور نہ وہ اعتراف کرے۔

جمہور فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ مجرد ظہور حمل سے زنا موجب رجم کا ثبوت نہیں ہوتا اس لئے اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس کے ساتھ کسی نے زبردستی کی ہو کیونکہ زبردستی کی صورت میں اس پر رجم کی سزا جاری نہیں ہو سکتی۔اس شبہ کی وجہ سے محض حمل کی بنیاد پر رجم نہیں کیا جائے گا اور جمہور فقہاء حدیث بالا کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ''**او کان حمل**'' کو اگلے جملے والا اعتراف کے ساتھ ملا کر پڑھیں گے اور درمیان میں لفظ ''او'' یہ منع الخلو کیلئے ہے یعنی یہاں منفصلہ حقیقہ نہیں ہے۔بلکہ **مانعة الخلو** ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''حمل'' اور ''اعتراف'' دونوں چیزیں جمع ہو سکتی ہیں۔لہٰذا جب کسی عورت کو حمل ہوگا تو اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا وہ بالآخر وہ عورت اعتراف کرے گی اب اس عورت پر جو حد جاری کی جائے گی وہ اعتراف کی وجہ سے کی جائے گی حمل کی وجہ سے نہیں کی جائے گی۔

آیت رجم پر ایک اشکال:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رجم کیا اور میں نے رجم کیا۔ اگر میں اس بات کو ناپسند نہ سمجھتا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ کتاب اللہ میں زیادتی کر دی تو میں اس آیت رجم کو صحف میں لکھ دیتا اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ بعد میں کچھ لوگ ایسے نہ آجائیں جو رجم کو قرآن کریم میں نہ پاکر اس کا انکار کر دیں۔ حضرت عمرؓ کا یہ مفہوم متعدد روایات میں ثابت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی توجیہ:

اِس حدیث سے بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آیت رجم یا تو قرآن کریم کی آیت تھی پھر تو اس کو قرآن کریم میں ہونا چاہیے تھا چاہے لوگ کچھ بھی کہیں اور اگر یہ قرآن کریم کی آیت نہیں تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو قرآن کریم میں لکھنے کا ارادہ ہی کیوں کیا؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ مسند احمد میں اس کی تفصیل آئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا ارادہ یہ تھا کہ اس کو مصحف کے حاشیہ میں لکھ دوں تا کہ یہ قرآن کا جزو تو نہ سمجھا جائے لیکن یہ سمجھا جائے کہ یہ رجم کا حکم حق ہے۔ چنانچہ متعدد روایات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ نے کچھ تفسیری جملے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر اپنے مصاحف کے حاشئے میں لکھے ہوئے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی حاشئے میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن خطرہ یہ تھا کہ بعد میں لوگ اس کو کتاب اللہ طرف منسوب کر دیں اور کتاب اللہ کے اندر اضافہ کر دیں۔ اس ڈر سے میں نہیں لکھ رہا ہوں۔

① قال: خشيت أن يطول باالناس زمان حتى يقول قائل: لا نجد الرجم فى كتاب الله فيضلوا بترك فريضة أنزلها الله، ألا وان الرجم حق على من زنى وقد أحصن اذا قامت البينة، أوكان الحبل أو الاعتراف۔

(رواه البخارى)

② روى أبو داؤد أنه خطب: وقال: ان الله تعالىٰ بعث، ومحمدا ﷺ بالحق، وأنزل عليه الكتاب وكان فيما أنزل عليه آية الرجم، فقرأناها ورجم رسول الله ﷺ ورجمنا بعده، وانى خشيت أن يطول الناس زمان، فيقول قائل: لا نجد الرجم، الحديث۔

③ وقال: لو لا أن يقال أن يقال ان عمر زاد فى كتاب الله لكتبتها علىٰ حاشية المصحف۔

④ فى الحديث المتفق عليه من حديث ابن مسعود: لا يحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث الثيت الزانى، والنفس بالنفس، والتارك لدينه المفارق للجماعة۔

۵) عن عثمان، أنه أشرف عليهم يوم الدار، وقال: أشدكم بالله أتعلمون أن رسول الله ﷺ قال: امراعى مسلم الا من احدى ثلاث: كفر بعد ايمان، وزنا بعد احصان، وقتل نفس بغير نفس۔ رواه الترمذى

ورواه البزار والحاكم، وقال: صحيح على شرط الشيخين، والبيهقى وأبوداؤد والدارمى، واخرجه البخارى عن فعله عليه الصلوة والسلام من قول أبى قلابة حيث قال: والله ما قتل رسول الله ﷺ أحدا قط الا فى ثلاث خصال، رجل قتل بجريرة نفسه فقتل، أورجل زنى بعد احصان أو رجل حارب الله ورسوله وارتد عن الاسلام۔

۳۵۵۸: عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خُذُوْا عَنِّي، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلاً اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ، وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم: ٣ / ١٣١٦ الحديث رقم: (١٢ ـ ١٦٩٠) أخرجه ابوداؤد فى السنن ٤ / ٥٦٩ الحديث رقم: ٤٤١٥ والترمدى فى ٤ / ٣٢ الحديث رقم: ١٤٣٤ أخرجه ابن ماجه فى السنن ٢ / ٨٥٢ الحديث رقم: ٢٥٥٠ والدارمى فى ٢ / ٢٣٦ الحديث رقم: أخرجه احمد فى المسند ٥ / ٣١٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (زانیہ کے بارے میں) مجھ سے یہ حکم حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کیلئے راہ مقرر کردی ہے جو غیر شادی شدہ مرد کسی غیر شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو اس کو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے اور جو شادی شدہ مرد کسی شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو سو کوڑے مارے جائیں اور سنگسار کر دیا جائے''۔ (مسلم)

تشریح: خذوا عنی: کا مفعول بہ محذوف ہے۔أی: حکم حد الزنا۔ خذوا عنی: کو مکرر لانا تاکید کی غرض سے ہے۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ خذوا عنی کا تکرار امر مخفی کے اظہار اور اہتمام پر دلالت کر رہا ہے چونکہ قد جعل الله لهن قرآن حکیم میں یہ حکم مبہم تھا اور سبیل معلوم نہ تھی کہ محصن وغیر محصن کے بارے میں کیا حکم ہے۔ چنانچہ البکر بالبکر اس مبہم کا بیان ہے اور استئناف کے طریقہ پر مجمل کی تفصیل ہے گویا اس حکم قرآنی: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ [النحل: ٤٤] کا مصداق ہے۔مفہوم کے اعتبار سے یہ تقسیم حاجر سے چونکہ فاحشہ کا ارتکاب کرنے والی دو حال سے خالی نہیں، یا بکر ہوں گی یا ثیب ہونگی اور پھر ''بکر'' کسی بکر سے زنا کرے گی یا کسی ثیب سے کرے گی اور یہی تفصیل ثیب میں بھی ہے چنانچہ حدیث میں: حد البکر بالبکر اور حد الثیب بالثیب کو تو بیان فرمایا: حد الثیب بالبکر کو بیان نہیں فرمایا چونکہ وہ بالکل واضح تھی۔اور حدیث عسیف سے بھی اس کی وضاحت ہو رہی ہے۔۔قد جعل لهن سبیلا: فرمایا:

البکر بالبکر: یہاں مضاف محذوف ہے: أی: حد زنا البکر بالبکر۔

تغریب عام: ایک روایت میں نفی سنة کے الفاظ آئے ہیں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: البکر بالبکر مبتداء ہے اور جلد مائة خبر ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اِس آیت کے: واللاتی أاتین الفاحشة من سائکم فاستشهدوا علیهم أربعة منکم فاستشهدوا علیهم أربعة منکن فان شهد وافامسکوهن فی البیوت حتی یتو فاهن الموت أویجعل لهن سبیلا [النساء: ١٥] کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کا کہنا ہے کہ محکم ہے اور یہ حدیث اس کی تفسیر و بیان ہے، بعض کا

کہنا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، اور ناسخ، سورۂ نور کی ابتدائی آیت ہے: **الزانية والزاني فاجلاوا كل واحد منهما مائة جلادة** [النور: ٢] بعض کا کہنا ہے کہ سورۂ نور کی آیت ''بکر'' کے بارے میں ہے، اور سورۃ نساء کی آیت ''ثیب'' کے بارے میں ہے۔ وطی بالشبہ یا نکاح فاسد وغیرہ کے ساتھ مجامعت کر چکے ہوں۔ مسلمان اور کافر رشید اور **محجور عليه بسفه** کا حکم یکساں ہے، اور ثیب سے مراد بالکل اس کے برعکس ہے۔

والتي يأتين الفاحشة من نسائكم فاستشهدوا عليهن أربعة منكم فان شهدوا فامسكوهن في البيوت حتى يتوفهن الموت أو يجعل لهن سبيلا :''اور جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں تمہاری بیویوں میں سے تم لوگ ان عورتوں پر چار آدمی اپنوں میں سے گواہ کرلو سو اگر وہ گواہی دیویں تو تم انکو گھروں کے اندر مقید رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ تجویز فرمادیں''۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس آیات کی رو سے ابتداء اسلام میں حکم یہ تھا کہ اگر کوئی عورت زنا کرے تو اس کو گھر میں محبوس کر دیا جائے یہاں تک کہ اس کو موت آجائے یا اللہ تعالیٰ اُس کیلئے کوئی دوسرا راستہ نکال دے تو اس آیت میں اس طرف اشارہ تھا کہ کوئی دوسرا حکم زانی عورت کیلئے آنے والا ہے اور پھر اس حدیث میں وہ دوسرا حکم بتا دیا کہ وہ دوسرا حکم آ گیا ہے وہ حکم یہ ہے کہ جب ثیب ثیب کے ساتھ زنا کرے تو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور رجم کیا جائے گا۔

آیت رجم تورات کے آئینہ میں

٣٥٥٩: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ الْيَهُوْدَ جَا ئُوْا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرُوْا لَهُ اَنَّ رَجُلاً مِنْهُمْ وَامْرَاَةٌ زَنَيَا' فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا تَجِدُوْنَ فِي التَّوْرَاةِ فِيْ شَاْنِ الرَّجْمِ؟ قَالُوْا: نَفْضَحُهُمْ وَيُجْلَدُوْنَ' قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ: كَذَبْتُمْ اِنَّ فِيْهَا الرَّجْمَ فَاْتُوْا بِالتَّوْرَاةِ' فَنَشَرُوْهَا فَوَضَعَ اَحَدُهُمْ يَدَهُ عَلٰى اٰيَةِ الرَّجْمِ' فَقَرَاَ مَا قَبْلَهَا وَمَا بَعْدَهَا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ اِرْفَعْ يَدَكَ' فَرَفَعَ فَاِذَا فِيْهَا اٰيَةُ الرَّجْمِ' فَقَالُوْا: صَدَقَ يَا مُحَمَّدُ! فِيْهَا اٰيَةُ الرَّجْمِ' فَاَمَرَ بِهِمَا النَّبِيُّ ﷺ فَرُجِمَا (وَفِيْ رِوَايَةٍ) قَالَ: اِرْفَعْ يَدَكَ' فَرَفَعَ فَاِذَا اٰيَةُ الرَّجْمِ تَلُوْحُ' فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! اِنَّ فِيْهَا اٰيَةُ الرَّجْمِ' وَلٰكِنَّا نَتَكَاتَمُهُ بَيْنَنَا فَاَمَرَ بِهِمَا فَرُجِمَا ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٢ / ١٦٦ الحديث رقم: ٦٨٤١ و مسلم في ٣ / ١٣٢٦ الحديث رقم: (٢٦ ، ١٦٩٩) أخرجه ابوداؤد في السنن ٤ / ٥٩٣ الحديث رقم: ٤٤٤٦ والدارمي في ٢ / ٢٣٣ الحديث رقم: ٢٣٢١' و مالك في الموطا ٢ / ٨١٩۔

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دن یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے یہ بیان کیا کہ ان کی قوم میں سے ایک عورت اور ایک مرد نے (جو دونوں محصن (شادی شدہ) تھے) نے زنا کیا؟ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم تورات میں رجم کے

بارے میں کیا پاتے ہو؟ یہودیوں نے کہا کہ ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور ان کو کوڑے مارے جاتے ہیں (ان کی یہ بات سن کر) حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا کہ تم نے جھوٹ بولا۔اس میں بھی رجم کا حکم مذکور ہے (تورات لاؤ میں تمہیں رجم کا حکم دکھاتا ہوں) چنانچہ جب وہ تورات لائے اور اس کو کھولا تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے آیت رجم پر اپنا ہاتھ رکھ دیا (یعنی اس نے اپنے ہاتھوں سے رجم کی آیت کو چھپانے کی کوشش کی) اور اس کے آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنے لگا۔(یہ دیکھ کر) حضرت عبداللہ بن سلام نے اس سے کہا کہ اپنا ہاتھ ہٹاؤ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو دیکھا گیا کہ وہاں رجم کی آیت موجود تھی' اس (آیت کو چھپانے والے) نے کہا کہ اے محمد! اس نے (عبداللہ بن سلام نے) سچ کہا تورات میں رجم کی آیت موجود ہے لیکن ہم آپس میں اس کو چھپاتے تھے۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے (کہ جس نے رجم کی آیت کو اپنے ہاتھ کے نیچے چھپانے کی کوشش کی تھی) کہا کہ اپنے ہاتھ ہٹاؤ اور پھر جب اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو دیکھا گیا کہ وہاں رجم کی آیت موجود تھی' اس آیت کو چھپانے والے نے کہا کہ ''اے محمد! تورات میں رجم کی آیت موجود ہے مگر ہم آپس میں ظاہر نہیں کرتے''۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کے بارے میں حکم فرمایا اور ان کو سنگسار کر دیا گیا''۔دوسری روایت میں ہے: انہوں نے (عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے) کہا: اپنا ہاتھ اٹھاؤ' اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو اس میں (تورات میں) آیت رجم واضح موجود تھی۔اس (یہودی) نے کہا: اے محمد! اس میں (تورات میں) آیت رجم ہے لیکن ہم آپس میں اس کو چھپاتے تھے۔آپ ﷺ نے ان کے بارے میں فیصلہ فرمایا تو انہیں رجم کر دیا گیا۔

(بخاری ومسلم)

تشریح: رجلا منهم وامرأة: ایک روایت میں ''امرأة ورجلا'' کے الفاظ آئے ہیں۔

ما تجدون: ''ما' استفہامیہ ہے۔بمعنی شیٔ ہے أي أي شيء تجدونه مذكورا **نفضحهم**: ضاد کے فتحہ کے ساتھ۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اصل کلام یوں ہے: **لا يجدفي التوراه حكم الرجم ، بل نجدان ان نقضحهم و يجلدون** ایک فعل کو معروف اور ایک فعل کو مجہول ذکر کیا، یہ بتانے کیلئے کہ فضیحت کا معاملہ عوام کے سپرد ہے، ان کیا جتہاد پر موقوف ہے۔اگر وہ چاہیں تو زانی کا منہ کوئلہ وغیرہ سے کالا کر دیں اور چاہیں تو تعزیر کریں۔اور کوڑوں کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔**ويجلدون**: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔**فأتوا بالتوراة**: صیغۂ امر کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ماضی کے صیغہ کے ساتھ ہے۔مسلم شریف کی روایت سے صیغۂ امر کی تائید ہوتی ہے: قال ﷺ: **فاتوا بالتوراة، فاتلوها ان كنت صادقين، فجاؤ وابها**۔

امام نووی نے اس حدیث کے تحت چند فوائد مستنبط فرمائے ہیں جو حسب ذیل ہیں: ① کافر زانی پر حد کا اجراء واجب ہے ② کفار کا باہم نکاح درست ہے ③ کافر محض زانی کو رجم کیا جائے گا ④ رجم کے ساتھ کوڑوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔اگر کافر کا نکاح صحیح نہ ہو تو وہ محصن نہیں اس کو رجم بھی نہیں کیا جائے گا ⑤ کفار بھی شرائع کے خروج کے مکلف ہیں ⑥ کافر اگر مسلمان قاضی کی عدالت میں اپنا مقدمہ لائیں تو اس کا فیصلہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں کیا جائے گا۔علماء فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ان

سے یہ سوال فرمانا: "ما تجدون فی التوراۃ" کیا اس لئے نہیں تھا کہ ان کی تقلید کی جائے گی۔ اور نہ اس لئے تھا کہ اس قضیہ کا حکم معلوم کیا جائے بلکہ یہ سوال ''الزام'' کیلئے تھا، کہ تم لوگ اپنی کتاب پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس حق کا اظہار مقصود تھا جس کو وہ چھپا رہے تھے، اور اس کو معطل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اس سوال کے ذریعہ سائلین کی فضیحت مقصود تھی۔ ① آنحضرت کو تورات کے حکم کا پتہ بذریعہ وحی ہوا کہ تورات میں اگرچہ یہ لوگ تحریف کر چکے ہیں مگر رجم کا حکم اب تک جوں کا توں صحیح وسالم محفوظ ہے دوسری چیزوں کی طرح ابھی تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ② یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام قبول کرنے والے کسی یہودی نے بتائی ہو۔

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ یہودیوں کی گواہی کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں ہے تو فقط ان کی اتنی بات "أن رجلا منهم وامرأة زنیا" سن کر رجم کا فیصلہ کیسے صادر فرما دیا۔ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں

① بظاہر ان دونوں بدکاروں نے اعتراف کیا ہوگا۔ ② ممکن ہے کہ چار مسلمانوں نے گواہی دی ہو۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے۔ **شهد علیها أربعة أنهم رأوا ذكره فی فرجها۔**

مستحب یہ ہے کہ امام ایک طائفہ کو اس اقامت حد کے وقت آنے کا حکم کرے۔ اس طائفہ میں کتنے افراد کا ہونا ضروری ہے؟ تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک، امام احمد بھی یہی فرماتے ہیں۔ عطاء اور اسحاق کا کہنا ہے کہ دو، زہری کا کہنا ہے کہ تین، حسن بصری کا کہنا ہے کہ دس، شافعی اور مالک کا کہنا ہے کہ چار افراد ہوں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد: **مصلی الجنائز** (جنازہ گاہ) ہے اور اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں **بقیع الغرقد** کا ذکر ہے اور مدینہ میں جنازگاہ وہی تھی۔ امام بخاریؒ وغیرہ فرماتے ہیں: یہ دلیل ہے کہ جنازہ گاہ اور عیدگاہ کو جب تک مسجد نہ بنایا جائے اس وقت تک ان جگہوں کیلئے مسجد کا حکم ثابت نہیں ہوگا۔ چونکہ اگر اس جگہ کا حکم مسجد والا ہوتا تو یہاں رجم کرنے سے اجتناب کیا جاتا، خون کی وجہ سے جگہ کے لت پت ہو جانے کی وجہ۔ ہمارے اصحاب میں سے دارمی کا کہنا ہے کہ عیدگاہ وغیرہ۔ اگر مسجد نہ ہوں تو کیا ان کیلئے مسجد کا حکم ثابت ہوگا؟ اس میں دو قول ہیں: نمبرا: اصح یہ ہے کہ وہ جگہ مسجد کے حکم میں ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: فقہاء کا اجماع ہے کہ مسجد میں حدود وتعزیرات جاری نہیں کی جائیں گی۔ البتہ امام مالکؒ سے مروی ہے کہ مسجد میں پانچ کوڑوں کی حد تک تادیب میں کوئی حرج نہیں۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: ابن ابی لیلیٰ نے حد مسجد میں جاری کی تو امام ابو حنیفہؒ نے اس کو خطا قرار دیا۔ حدیث میں آتا ہے: **((أنه علیه الصلوٰة والسلام قال: جنّبوا مساجدكم صبيانكم، ومجانینكم، ورفع أصواتكم وشرائكم وبيعكم واقامة حدودكم، وجمروها فی جمعكم وضعوا علی أبوابها المطاهر))** اور اس وجہ سے بھی کہ حد جاری کے دوران مرحوم سے خروجِ نجاست کا اندیشہ بھی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ حدود مسجد کے علاوہ کہیں جاری کی جائیں۔

اس سلسلہ کی ایک واضح دلیل: ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ روایت بھی ہے: **((وعن ابن عباس، قال: قال رسول الله ﷺ: لا تقام الحدود فی المساجد، ولا یقاد بالولد الوالد))** یہ روایت ماقبل میں کتاب القصاص کی فصل ثانی، میں بھی گذر

چکی ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: ابوداؤد، نسائی اور عبدالرزاق نے مصنفہ میں روایت نقل کی ہے: **فأعرض عنه فأقبل فی الخامسة** (ازمرقاۃ) **أنها رالجنة ینغمس فیها۔**

فان جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم ورفع اصواتکم وشرائکم وبیع واقامة حد ودکم وجمر وهافی جمعکم وضعوا علی ابوابها المطاهر.

''آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنی مسجدوں کو اپنے بچوں سے، دیوانوں سے، شور مچانے سے، خرید وفروخت کرنے سے اور حد قائم کرنے سے بچائے رکھو اور جمعہ کے دن مسجدوں کو اگر کی دھونی دو نیز مسجدوں کے دروازوں پر طہار (وضو) کی جگہ بناؤ''۔

۳۵۶۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ وَهُوَ فِی الْمَسْجِدِ، فَنَادَاهُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّی زَنَیْتُ، فَاَعْرَضَ عَنْهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَتَنَحّٰی لِشِقِّ وَجْهِهِ الَّذِیْ اَعْرَضَ قِبْلَهُ، فَقَالَ: اِنِّی زَنَیْتُ، فَاَعْرَضَ عَنْهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا شَهِدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ دَعَاهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اَبِکَ جُنُوْنٌ؟ قَالَ: لَا فَقَالَ: اَحْصَنْتَ؟ قَالَ: نَعَمْ! یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: اذْهَبُوْا بِهٖ فَارْجُمُوْهُ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: فَاَخْبَرَنِیْ مَنْ سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ یَقُوْلُ: فَرَجَمْنَاهُ بِالْمَدِیْنَةِ فَلَمَّا اَزْلَقَتْهُ الْحِجَارَةُ هَرَبَ، حَتّٰی اَدْرَکْنَاهُ بِالْحَرَّةِ، فَرَجَمْنَا حَتّٰی مَاتَ (متفق علیه وفی روایة) **لِلْبُخَارِیِّ عَنْ جَابِرٍ بَعْدَ قَوْلِهٖ قَالَ نَعَمْ فَاَمَرَبِهٖ فَرُجِمَ بِالْمُصَلّٰی، فَلَمَّا اَزْلَقَتْهُ الْحِجَارَةُ فَرَّ فَاُدْرِکَ، فَرُجِمَ، حَتّٰی مَاتَ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرًا وَصَلّٰی عَلَیْهِ۔**

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲ / ۱۳۶ الحدیث رقم ۸۱۲۵ و مسلم فی ۳ / ۳۱۸ الحدیث رقم ۱۶ ـ ۱۶۹۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اس وقت آپ ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں تشریف فرما تھے، اس شخص نے آواز دی ''یارسول اللہ ﷺ! مجھ سے زنا کا ارتکاب ہوگیا ہے'' نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) اپنا منہ اس کی طرف سے پھیرلیا۔ اس شخص نے دوسری سے سمت سے ہو کر عرض کیا کہ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہوگیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے پھر اپنا منہ اس کی طرف سے پھیرلیا، یہاں تک کہ جب اس نے اس طرح چار مرتبہ (اپنے جرم کی) گواہی دی تو نبی کریم ﷺ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ کیا تو دیوانہ ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں! پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم شادی شدہ ہو؟ اس نے کہا کہ ہاں یا! رسول اللہؐ! اس کے بعد آپ ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ اس شخص کو لے جاؤ اور اس کو سنگسار کردو۔ اس حدیث کے ایک راوی ابن شہاب کا بیان ہے کہ جس شخص نے اس حدیث کو حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سنا تھا، اس نے مجھے بتایا کہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کے بعد) اس شخص کو مدینہ میں سنگسار کیا چنانچہ جب (ہم نے اس کو پتھر مارنے شروع کئے اور) اس کو پتھر لگنے لگے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ ہم نے اس کو "حرہ" میں جا کر پکڑا (مدینہ کا وہ مضافاتی علاقہ جو کالے پتھروں والا تھا حرہ کہلاتا تھا) اور پھر اس کو سنگسار یہاں تک کہ وہ مرگیا"۔ (بخاری ومسلم) اور امام بخاری کی ایک اور روایت میں جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر کہ کیا تو محصن ہے) اس شخص کے جواب "ہاں" کے بعد یہ الفاظ ہیں کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو سنگسار کئے جانے کا حکم دیا چنانچہ اس کو عیدگاہ میں سنگسار کیا گیا' جب اس کو پتھر لگنے لگے تو وہ بھاگنے لگا مگر پھر پکڑ لیا گیا اور سنگسار کیا گیا یہاں تک کہ مرگیا اس کے مرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھلائی بیان کی (یعنی اس کی تعریف وتوصیف کی) اور اس کی نماز جنازہ پڑھی (یا **وَصَلّٰى عَلَيْهِ** کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے دعا کی)۔

تشریح: **أتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل وهو فی المسجد**: "**وهو فی المسجد**" یہ جملہ مفعول بہ سے "حال" ہے۔ **تنحی**: "نحو" بمعنی جہت سے ماخوذ ہے، باب تفعل سے مستعمل ہے شرح السنہ میں لکھتے ہیں: **أی قصد الجهة التی الیها وجهه**۔ اور نحا نحوها عرب کے اس قول **نحوت الشیء أنحوه** سے ماخوذ ہے **شق**: شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ "**وجهه**" کی ضمیر آنحضرت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ **الذی وجهه** کی صفت ہے۔ **أعرض**: ایک نسخہ میں "**أعرض عنه**" ہے۔ **قبلہ**: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ **فأعرض عنه**: ایک صحیح نسخہ میں "**فاعرض عنه النبیؐ**" ہے۔ "شرح السنہ" میں لکھتے ہیں کہ اقرار بالزنا میں تکرار کے قائلین نے اس روایت سے استدلال کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جوانب اربعہ سے آنے کو دلیل بنایا ہے کہ چار بار چار مجالس میں اقرار ضروری ہے اور جو حضرات تکرار کی شرط کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کو بار بار واپس کرنا درحقیقت شبہ کی وجہ سے تھا۔ اسی وجہ سے **أبك جنون** کے ذریعہ سے مزید تحقیق فرمائی۔ ایک روایت میں یوں ہے: **فقال أشربت خمرا؟ فقام رجل فاستنهكه فلم يجد منه ريح الخمر فقال: أزنيت؟ قال نعم۔ فأمر به فرجم**۔ غرض یہ کہ ان کو بار بار لوٹا تکشف احوال کے لئے تھا، تاکہ شرط تکرار کی وجہ سے اھ۔ یہ تاویل محل نظر ہے یہ دعویٰ تب تام ہوتا اگر ماخذ صرف یہی روایت ہوتی اور اس شخص کے علاوہ دیگر افراد میں تکرار کا معاملہ ثابت نہ ہوتا۔

فقال: أبك جنون: نوویؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مقصد اس شخص کے حال کی تحقیق تھا کیونکہ عام طور پر کوئی بھی انسان اپنے کسی بھی ایسے جرم وگناہ کے اقرار پر مصر نہیں ہوتا جس کی سزا میں اس کو موت کا منہ دیکھنا پڑے بلکہ وہ اسی میں اپنی راہ نجات دیکھتا ہے کہ وہ اپنے جرم وگناہ پر شرمسار ونادم ہو کر خدا سے توبہ واستغفار کرے اور اس کے ذریعہ اپنے گناہ کو ختم کرائے۔

فلما شهد أربع شهادات: ایسے معاملات میں مسلمان کی حالت کی تحقیق وتفتیش میں پوری پوری سعی کرنی چاہئے تاکہ فیصلہ میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہ رہے وہیں اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی جرم کی سزا میں ایک مسلمان کی جان

بچانے کے لئے اس کو جو بھی قانونی فائدہ پہنچایا جا سکتا ہو اس سے صرفِ نظر نہ کیا جائے' نیز یہ جملہ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگر کوئی دیوانہ یہ کہے کہ میں نے زنا کیا ہے تو اس کے اقرار کا اعتبار نہیں ہوگا اور نہ اس پر حد جاری کی جائے گی۔

قال: اذهبوا به فارجموه: یہ کلام دلیل ہے کہ زانی محصن کی سزا میں رجم پر اکتفاء کیا جائے کوڑے نہ مارے جائیں۔ شرح السنہ میں مذکور ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ ''مرجوم'' کو باندھا نہیں جائے گا اور نہ گڑھے میں دبایا جائے گا، چونکہ اگر ایسا کیا گیا تو مجرم کیلئے بھاگنا ممکن نہیں ہوگا۔ اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ محل نظر ہے اھ۔ مزید لکھتے ہیں کہ بعض علما کا کہنا ہے کہ گڑھا مطلقاً نہیں کھودا جائے گا اور بعض کا کہنا ہے کہ مرد کیلئے تو نہیں کھودا جائے گا البتہ عورت کے لئے کھودا جائے گا۔

۳۵۶۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: لَمَّا اَتَى مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ: لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ، اَوْغَمَزْتَ، اَوْ نَظَرْتَ، قَالَ: لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ اَنِكْتَهَا لَا يَكْنِيْ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَعِنْدَ ذٰلِكَ اَمَرَ بِرَجْمِهٖ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲ / ۱۳۵ الحدیث رقم: ٦٨٢٤ و أبو داود فی ٤ / ٥٧٩ الحدیث رقم: ٤٤٢٧

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب ماعز بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (مسجد نبوی) میں آئے اور کہا کہ ''مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ شاید تم نے (اجنبیہ کا) بوسہ لیا ہوگا' یا اس کو (شہوت کے ساتھ) چھوا ہوگا یا دیکھا ہوگا (یعنی یہ چیزیں زنا کا باعث بنتی ہیں تم ان میں سے کوئی حرکت کر گزرے ہو گے اور اب اسی کو زنا سے تعبیر کر رہے ہو!)'' انہوں نے عرض کیا کہ ''نہیں'' یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے جماع کیا ہے؟ اور راوی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اشارے میں نہیں پوچھی بلکہ واضح الفاظ میں پوچھا کہ کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے؟ ماعز نے کہا کہ ہاں (میں نے جماع کیا ہے)۔ اس (تحقیق و تفتیش) کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کو سنگسار کئے جانے کا حکم فرمایا''۔ (بخاری)

تشریح: لما أتى ما عزبن مالك النبی ﷺ: ایک نسخہ میں ''الی النبی ﷺ'' ہے۔ **قبلت:** باء کی تشدید کے ساتھ، از باب تفعیل ہے۔ **أوغمزت:** ایک روایت میں ''لمست'' ہے۔ یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ کہا جاتا ہے: **غمزت الشیء بیدی ۔ أی لمست بها ۔ أو أشرت الیها۔ نکتها:** نون کے کسرہ اور کاف کے سکون کے ساتھ **أی جامعتها۔ لایکنی:** یہ جملہ حالیہ ہے۔ **لا یکنی** ''کنایۃ'' سے ماخوذ ہے۔ جو ''تصریح'' کی ضد ہے۔ یہ تصریح اس بات کے استحباب پر دلالت کر رہی ہے کہ ''جانی'' اگر کنایہ کلام کرے، تصریح نہ کرتا ہو تو عفو و درگزر کی تلقین کی جائے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر اقرار زنا یا اقرار سرقہ وغیرہ کرے تو اس کو رجوع کرنے کی تلقین کرنا اور ایسے اعتراض کی تلقین کرنا جو موجب شبہ ہو مستحب ہے۔ اور اس کا رجوع قبول کر لیا جائے۔ چونکہ حدود کا منیٰ مساہلت و درء پر ہے۔ بخلاف اللہ اور بندوں کے حقوق حالیہ کے۔ مثلاً زکوٰۃ کفارہ وغیرہ میں تلقین کرنا جائز نہیں ہے۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: ابوداود، نسائی اور عبد الرزاق کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منہ پھیر لیا وہ پانچویں بار آئے تو آپ نے اس سے فرمایا: کیا تم

نے اس سے جماع کیا ہے؟ وہ بولے ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: حتیٰ کہ تمہاری یہ چیز اس کی اس جگہ چھپ گئی؟ انہوں نے کہا جی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا ایسے کہ جیسے سلائی سرمہ دانی میں چھپ جاتا ہے؟ ماعز بولے ہاں جی! حضورؐ نے پوچھا تمہیں معلوم ہے زنا کیا ہوتا ہے؟ وہ بولے جی ہاں۔ میں نے اس سے وہ کام حرام طریقہ پر کیا جو کام آدمی اپنی بیوی سے حلال طریقہ پر کرتا ہے آنحضرتؐ نے فرمایا: اس بات سے تمہارا کیا ارادہ ہے؟ وہ بولے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پاک کر دیجئے۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے ان کے بارے میں حکم صادر فرمایا تو انہیں سنگسار کر دیا گیا (اسی دوران) رسولؐ نے اپنے صحاب میں سے دو افراد کو یہ باتیں کرتے ہوئے سنا، کہ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ دیکھو اس شخص کو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ستاری فرمائی اور اس کو اس کے نفس نے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ کتے کی طرح پتھر مار مار کر سنگسار کر دیا گیا۔ آنحضرتؐ نے ان دونوں کی باتوں پر خاموشی اختیار فرمائی اور پھر کچھ دیر چلے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک مردار گدھے کے پاس سے گزرے کہ جس کی دونوں ٹانگیں اٹھی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: فلاں فلاں آدمی کہاں ہے؟ وہ دونوں بولے: یا رسول اللہ ہم دونوں یہاں ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: آؤ اور اس مرے ہوئے گدھے کو کھاؤ۔ وہ دونوں بولے: یا رسول اللہ اس مردار کو کون کھا سکتا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ابھی (تھوڑی دیر پہلے) تم نے جو بھائی کی آبروریزی کی ہے وہ اس مردار کو کھانے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ وہ (یعنی ماعز) اس وقت جنت کی نہروں میں غوطہ کھا رہا ہے۔

۳۵۶۲: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ: جَاءَ مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! طَهِّرْنِيْ، فَقَالَ: وَيْحَكَ ارْجِعْ، فَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ وَتُبْ إِلَيْهِ قَالَ فَرَجَعَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ثُمَّ جَاءَ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! طَهِّرْنِيْ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلُ ذٰلِكَ حَتّٰى إِذَا كَانَتِ الرَّابِعَةُ قَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَ أُطَهِّرُكَ؟ قَالَ: مِنَ الزِّنَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَبِهِ جُنُوْنٌ؟ فَأُخْبِرَ أَنَّهُ لَيْسَ بِمَجْنُوْنٍ، فَقَالَ: أَشَرِبَ خَمْرًا؟ فَقَامَ رَجُلٌ: فَاسْتَنْكَهَهُ فَلَمْ يَجِدْ مِنْهُ رِيْحَ خَمْرٍ فَقَالَ: أَزَنَيْتَ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَأَمَرَبِهِ فَرُجِمَ، فَلَبِثُوْا يَوْمَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةً ثُمَّ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: اسْتَغْفِرُوْا لِمَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ، ثُمَّ جَاءَتْهُ امْرَأَةٌ مِنْ غَامِدٍ مِنَ الْأَزْدِ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! طَهِّرْنِيْ فَقَالَ: وَيْحَكِ ارْجِعِيْ، فَاسْتَغْفِرِيْ اللّٰهَ وَتُوْبِيْ إِلَيْهِ فَقَالَتْ: تُرِيْدُ أَنْ تُرَدِّدَنِيْ كَمَا رَدَدْتَّ مَاعِزَ بْنَ مَالِكٍ إِنَّهَا حُبْلٰى مِنَ الزِّنٰى فَقَالَ أَنْتِ؟ قَالَتْ نَعَمْ قَالَ لَهَا حَتّٰى تَضَعِيْ مَا فِيْ بَطْنِكِ قَالَ فَكَفَلَهَا رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ حَتّٰى وَضَعَتْ فَأَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: قَدْ وَضَعَتِ الْغَامِدِيَّةُ فَقَالَ إِذًا لَا نَرْجُمُهَا وَنَدَعُ وَلَدَهَا صَغِيْرًا لَيْسَ لَهُ مَنْ يُرْضِعُهُ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ إِلَيَّ رِضَاعُهُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ قَالَ فَرَجَمَهَا (وَفِيْ رِوَايَةٍ) أَنَّهُ قَالَ: لَهَا اذْهَبِيْ حَتّٰى تَلِدِيْ، فَلَمَّا وَلَدَتْ قَالَ اذْهَبِيْ فَأَرْضِعِيْهِ حَتّٰى

تَفْطِمِيْهِ، فَلَمَّا فَطَمَتْهُ اَتَتْهُ بِا لصَّبِيِّ وَفِيْ يَدِهٖ كِسْرَةُ خُبْزٍ فَقَالَتْ هٰذَا يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! قَدْ فَطَمْتُهٗ وَقَدْ اَكَلَ الطَّعَامَ فَدَفَعَ الصَّبِيَّ اِلٰى رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، ثُمَّ اَمَرَ بِهَا فَحُفِرَلَهَا اِلٰى صَدْرِهَا، وَاَمَرَ النَّاسَ فَرَجَمُوْهَا فَيُقْبِلُ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ فَرَمٰى رَأْسَهَا فَتَنَضَّحَ الدَّمُ عَلٰى وَجْهِ خَالِدٍ فَسَبَّهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَهْلاً يَا خَالِدُ! فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ! لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهٗ، ثُمَّ اَمَرَبِهَا فَصَلّٰى عَلَيْهَا، وَدُفِنَتْ . (رواه مسلم)

صحيح مسلم، ٣ / ١٣٢٢ الحديث رقم: (٢٢ ـ ٢٣ / ١٦٩٥) أخرجه ابو داؤد فى السنن ٤ / ٥٨٨ الحديث رقم: ٤٤٤٢، والدرمى فى السنن ٢ / ٢٣٥، الحديث رقم: ٢٣٢٤، وأحمد فى المسند ٥ / ٣٤٨ ـ

ترجمہ: ''اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ماعز بن مالک حاضر ہوئے اور عرض جربے لگے کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے (یعنی مجھ سے جو گناہ سرزد ہو گیا ہے اس کی حد جاری کر دیں تاکہ وہ میرے اس گناہ کی معافی کا سبب بن جائے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم پر افسوس ہے واپس جاؤ (اپنے گناہوں کی) اللہ سے بخشش طلب کرو اور توبہ کرو۔ راوی کہتے ہیں وہ چلا گیا اور تھوڑی دور جا کر پھر واپس آ کر عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی الفاظ فرمائے جو پہلے فرمائے تھے اور جب چوتھی بار ایسا ہوا (یعنی ماعز نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تجھے کسی چیز سے اور کس وجہ سے پاک کروں؟ اس نے کہا کہ (حد جاری کر کے) زنا کے گناہ سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات سن کر صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا یہ دیوانہ ہے؟ (صحابہؓ کی طرف سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ یہ دیوانہ نہیں ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ (یہ سن کر ایک شخص نے کھڑے ہو کر اس کا منہ سونگھا (تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس نے شراب پی رکھی ہے یا نہیں) لیکن شراب کی بو نہیں پائی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ماعز سے پوچھا کہ کیا (واقعی) تم نے زنا کیا ہے؟ عرض کیا ہاں! اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں حکم دیا چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا۔ دو یا تین روز اسی طرح گزر گئے (یعنی مجلس نبوی میں ماعز کی سنگساری کے بارے میں دو تین دن تک کوئی ذکر نہیں ہوا) پھر (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فرمایا کہ تم ماعز کے لئے (اللہ تعالیٰ سے) بخشش طلب کرو۔ بلاشبہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کو پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو وہ سب کے لئے کافی ہو جائے۔ پھر اس کے بعد (ایک دن) ایک عورت جو قبیلہ ازد کے ایک خاندان غامد سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھ پر افسوس ہے، واپس جا اور اللہ سے (اپنے گناہوں کی) بخشش طلب کر اور توبہ کر۔ اس عورت نے عرض کیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز بن مالک کو پہلی دفعہ واپس کر دیا تھا اسی طرح مجھ کو بھی واپس کر دیں؟ حالانکہ (میں) وہ عورت (ہوں جو) زنا کے ذریعہ حاملہ ہوئی ہوں لہٰذا اس اقرار کے بعد میرے انکار کی گنجائش تھی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرح سے اپنے تغافل کو ظاہر کرنے اور اس کو اقرار

زنا سے رجوع کرنے کا ایک اور موقع دینے کے لئے فرمایا کہ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا تو زنا کے ذریعہ حاملہ ہوئی ہے!) اس عورت نے اس کے باوجود اپنے اقرار پر اصرار کیا اور کہا کہ "ہاں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اچھا تو اس وقت تک انتظار کر) جب تک کہ تو اپنے بچہ کی ولادت سے فارغ نہ ہو جائے۔ راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد ایک انصاری نے اس عورت کی خبر گیری اور کفالت اس وقت کی جب تک کہ وہ ولادت سے فارغ نہ ہوگئی اور پھر (کچھ عرصہ کے بعد) اس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ وہ غامدیہ عورت (بچہ کی) ولادت سے فارغ ہوگئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ابھی اس کو سنگسار نہیں کریں گے اور اس کے کمسن بچے کو اس حالت میں نہیں چھوڑیں گے کہ کوئی اس کو دودھ پلانے والا نہ ہو۔ (یعنی اگر ہم نے اس کو ابھی سنگسار کر دیا تو اس کا بچہ جو شیر خوار اور بہت چھوٹا ہے ہلاک ہو جائے گا کیونکہ اس کی ماں کے بعد اس کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہے اس لئے ابھی اس کو سنگسار کرنا مناسب نہیں ہے۔) ایک اور انصاری (یہ سن کر) کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسول! اس بچہ کے دودھ پلانے اور اس کی کفالت کا میں ذمہ دار ہوں" راوی کہتے ہیں (کہ اس کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو سنگسار کیا (یعنی اس کو سنگسار کئے جانے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کی گئی)۔

ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا کہ جا جب تک کہ تو ولادت سے فارغ نہ ہو جائے (انتظار کر) پھر جب وہ ولادت سے فارغ ہوگئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ جا اس بچہ کو دودھ پلا یہاں تک کہ تو اس کا دودھ چھڑائے اور پھر جب اس نے بچہ کا دودھ بھی چھڑا دیا تو اس بچہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی اس وقت اس کے بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا' اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اس بچہ کا دودھ چھڑا دیا ہے یہ اب روٹی کھانا کھانے لگا ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچہ کو ایک مسلمان مرد کے حوالے کیا اور اس عورت کے لئے حکم فرمایا (کہ ایک گڑھا اس کے سینہ تک کھودا جائے) جو اس کے سینہ تک کھودا جائے جب اس کے سینہ تک گڑھا کھود دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور اس کو سنگسار کیا گیا اس کی سنگساری کے دوران جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک پتھر اس کے سر پر مارا اور اس کے سر کا خون حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے منہ پر آ کر پڑا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کو برا بھلا کہنے لگے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے خالد! اس کی بخشش ہو چکی ہے اس کو برا بھلا مت کہو' قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ محصل (یعنی ناجائز ٹیکس لینے والا) کرے تو اس کی مغفرت و بخشش ہو جائے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے اس کے بارے میں حکم فرمایا اور اس کی نمازِ جنازہ خود پڑھائی اور اس کو دفن کر دیا گیا۔ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا چنانچہ اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور وہ دفن کی گئی"۔ (مسلم)

تشریح: طهري: أي كن سبب تطهيري من الذنب باجراء الحد علي۔

ویحك: النہایہ میں ہے کہ "ویح" ترحم و توجع کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ کلمہ ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے جو کسی ایسی ہلاکت میں پڑ جائے جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ اور کبھی بطور مدح و تعجب کے استعمال ہوتا ہے۔ یہ منصوب علی المصدر ہے۔ کبھی مرفوع و مصاف ہوتا ہے مصاف الیہ نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے: ‌غیح زید و بحالہ و یح لہ قولہ: فرجع غیر بعید أي غير

زمان بعید۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: **فمکث غیر بعید** [النحل:۲۲] اس کو طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور زیادہ واضح یہ ہے کہ غیر بعید سے مراد غیر مکان بعید یا رجوعاً غیر بعید ہے اور مطلب یہ ہے کہ غائب ہونے کے تھوڑی دیر بعد پھر لوٹ آئے۔ ان کا بار بار آنا شاید اس وجہ سے تھا کہ وہ توبہ صحیحہ اور رجعت نصیحہ کے ذریعہ اپنے نفس کی تطہیر پر قادر نہیں تھے۔ ''فاجز'' بصیغہ مجہول ہے۔

فیم أطهرك: امام طیبیؒ کا کہنا ہے کہ مصابیح کے نسخوں میں ''**ثمّ أطهرك؟**'' ہے اور ایک نسخہ میں **بم أطهرك؟**۔

قال من الزنا: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ما'' کے ذریعہ ''عموم احوال'' کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔

گویا کہ سوال و جواب کی معنوی تقدیر گویا کہ یوں ہے: **في أي سبب أطهرك؟ وأحاب: بسبب الزنا**۔ معنوی اعتبار سے اس کی نظیر یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **قل من رب السمٰوٰت السبع ورب العرش العظيم سيقولون الله**: [المؤمنون:۷٦] ''آپ یہ بھی کہیے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) ان سات آسمانوں کا مالک اور عالی شان عرش کا مالک کون ہے (اسکا بھی) وہ ضرور ہی جواب دینگے کہ یہ بھی (سب) اللہ کا ہے۔''

''**من رب السمٰوٰت**'' میں مالکیت کے معنی ہیں۔ گویا کہ سوال یوں ہے: **لمن السموات والأرض**۔

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ کیوں نہیں پڑھی؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعز کی نمازِ جنازہ تو نہیں پڑھی لیکن غامدیہ کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ اس میں جو حکمت نظر آتی ہے وہ یہ کہ ''غامدیہ'' یہ جانتی تھی کہ اقرار زنا کے بعد میرا یہ انجام ہونے والا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے زنا کا اقرار کیا بلکہ اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے فرمایا کہ ابھی تمہارے پیٹ میں بچہ ہے جب یہ بچہ پیدا ہو جائے اور کھانے پینے کے قابل ہو جائے تو میرے پاس آنا۔ چنانچہ وہ عورت چلی گئی جب بچے کی ولادت ہوئی پھر اس بچے کو دودھ پلایا اور جب وہ بچہ دودھ سے منتفع ہو گیا تو وہ خاتون اپنے اوپر حد جاری کرانے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ مجھے پتھر سے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس کے باوجود وہ حاضر ہوئیں۔ اس طرح انہوں نے توبہ کا بہت مؤثر طریقہ اختیار کیا۔ بخلاف حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے بارے میں روایت مختلف ہیں۔ ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر رجم کا فیصلہ فرمایا تو انہوں نے کہا کہ لوگوں نے مجھے مروا دیا اس لیے کہ جن لوگوں سے میں نے ذکر کیا تھا انہوں نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر جرم کا اعتراف کر لو اور معافی مانگ لو تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تم کو معاف کر دیں گے اور میں اسی خیال سے آ بھی گیا تھا بعد میں پتہ چلا کہ مجھے رجم کیا جا رہا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کا یہ خیال تھا کہ ان کو پہلے پتہ چل جاتا کہ مجھے اس طرح رجم کیا جائے گا تو شاید وہ آ کر اس طرح اعتراف نہ کرتے اور پھر رجم کے دوران بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو ثباتِ قدم غامدیہ کے واقعہ میں ہے اور جتنی وضاحت ان کے واقعہ میں ہے کہ اپنے انجام کو جاننے کے باوجود اپنے آپ کو پیش کیا اور آ کر اعتراف کیا۔ یہ بات حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں نہیں ہے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی اور امراۃ غامدیہ کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں یہاں تک فرمایا کہ غامدیہ نے ایسی توبہ کی اگر اس کا دسواں حصہ بھی سارے اہل مدینہ پر تقسیم کیا

جائے تو سارے اہل مدینہ کی مغفرت ہو جائے۔

والی رضاعه یا نبی اللّٰه: نوویؒ کہتے ہیں کہ (یہاں اس عورت کے بارے میں دو روایتیں نقل کی گئی ہیں اور) بظاہر دوسری روایت پہلی روایت کے مخالف ہے کیونکہ دوسری روایت سے تو صراحتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کو اس وقت سنگسار کیا گیا جب اس عورت نے اپنے بچے کا دودھ چھڑا دیا تھا اور وہ روٹی کھانے لگا تھا لیکن پہلی روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بچے کی ولادت کے بعد ہی سنگسار کر دیا گیا تھا' لہٰذا دوسری روایت کے صریح مفہوم کے پیش نظر پہلی روایت کی تاویل کرنی ضروری ہوئی تا کہ دونوں روایتوں کا مفہوم یکساں ہو جائے کیونکہ دونوں روایتوں کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے اور دونوں ہی روایتیں صحیح ہیں۔ پس تاویل یہ ہے کہ پہلی روایت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اس بچے کو دودھ پلانے کا ذمہ دار ہوں تو انہوں نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب کہ اس عورت نے اپنے بچے کا دودھ چھڑا دیا تھا اور دودھ پلانے کا ذمہ دار ہونے سے اس کی مراد یہ تھی کہ میں اس بچہ کی کفالت اور پرورش کی ذمہ داری لیتا ہوں اور اپنے اس مفہوم کو انہوں نے مجازاً دودھ پلانے سے تعبیر کیا۔

ثم أمر بها فصلی علیها: علیہ کے بارے میں روایات، ضبط، اور نسخوں کا اختلاف ہے۔ ہمارے نسخوں میں صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور **علیهما** نائب فاعل ہے۔

ایک نسخہ میں صیغۂ معروف کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں اس کا فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مامور شخص ہے۔

قال القاضی عیاض: هی بفتح الصاد واللام عند جماهیر، رواه صحیح مسلم، وعند الطهری بضم الصاد، قال: وکذا هو فی روایة ابن أبی شیبة وأبی داود، کذا نقله النووی۔

قصہ مختصر یہ کہ صیغۂ معروف والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی نماز جنازہ پڑھی تھی، اور صیغۂ مجہول والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں تو صراحت کے ساتھ منقول ہے۔ نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم دیا۔

فصلّٰی علیه وذفت: اب رہی یہ بات کہ جب مسلم کے اکثر راویوں نے لفظ ''صلی'' صیغہ معروف کے ساتھ نقل کیا ہے تو یہاں صاحب مشکوٰۃ نے اس لفظ کو صیغہ مجہول کے ساتھ کیوں نقل کیا؟ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اگرچہ اثبات' نفی پر مقدم ہوتا ہے اس اعتبار سے صاحب مشکوٰۃ کو یہ لفظ صیغہ معروف کے ساتھ نقل کر کے اثبات کو ترجیح دینا چاہئے تھا لیکن جب انہوں نے معتمد و صحیح نسخوں میں دیکھا کہ اس بارے میں مختلف روایات ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے جنازے کی نماز پڑھی یا نہیں پڑھی تو انہوں نے لفظ صلی کو صیغہ مجہول کے ساتھ نقل کرنے کو ترجیح دی تا کہ اس صورت میں دونوں ہی احتمال ملحوظ رہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ صورت ابہام سے خالی نہیں ہے اس لئے اس بارے میں اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ جمہور کی متابعت اور نقل مشہور کی موافقت کے پیش نظر اس لفظ کو صیغہ معروف ہی کے ساتھ قبول کیا جائے کہ

آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔۔ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: روی ابن ابی شیبة عن أبی معاویة۔ بہرکیف یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حد اس گناہ کو ختم کر دیتی ہے جس کی سزا میں اس کا نفاذ و اجراء ہوتا ہے مثلاً اگر زید زنا کا مرتکب ہوا اور اس کے اس جرم کی سزا میں اس پر حد جاری کی جائے تو وہ زنا کے گناہ سے بری ہو جائے گا اور آخرت میں اس سے اس زنا پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

ایک بات اور نوویؒ کہتے ہیں کہ (یہاں اس عورت کے بارے میں دو روایتیں نقل کی گئی ہیں اور) بظاہر دوسری روایت پہلی روایت کے مخالف ہے کیونکہ دوسری روایت سے تو صراحتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کو اس وقت سنگسار کیا گیا جب اس عورت نے اپنے بچے کا دودھ چھڑا دیا تھا اور وہ روٹی کھانے لگا تھا لیکن پہلی روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بچے کی ولادت کے بعد ہی سنگسار کر دیا گیا تھا' لہٰذا دوسری روایت کے صریح مفہوم کے پیش نظر پہلی روایت کی تاویل کرنی ضروری ہوئی تا کہ دونوں روایتوں کا مفہوم یکساں ہو جائے کیونکہ دونوں روایتوں کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے اور دونوں ہی روایتیں صحیح ہیں۔ پس تاویل یہ ہے کہ پہلی روایت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اس بچے کو دودھ پلانے کا ذمہ دار ہوں تو انہوں نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب کہ اس عورت نے اپنے بچے کا دودھ چھڑا دیا تھا اور دودھ پلانے کا ذمہ دار ہونے سے اس کی مراد یہ تھی کہ میں اس بچہ کی کفالت اور پرورش کی ذمہ داری لیتا ہوں اور اپنے اس مفہوم کو انہوں نے مجازاً دودھ پلانے سے تعبیر کیا۔

زانیہ کی باندی کی سزا کا بیان

۳۵۶۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: اِذَا زَنَتْ اَمَةُ اَحَدِکُمْ فَتَبَیَّنَ زِنَاهَا فَلْیَجْلِدْهَا الْحَدَّ' وَلَا یُثَرِّبْ عَلَیْهَا' ثُمَّ اِنْ زَنَتْ فَلْیَجْلِدْهَا الْحَدَّ' وَلَا یُثَرِّبْ' ثُمَّ اِنْ زَنَتِ الثَّالِثَةَ فَتَبَیَّنَ زِنَاهَا فَلْیَبِعْهَا وَلَوْ بِحَبْلٍ مِنْ شَعَرٍ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٤ / ٤٢١ الحدیث رقم : ٢٢٣٤ و مسلم فی ٣ / ١٣٢٨ الحدیث رقم : ٣ / ١٧٠٣' أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٢١٤' الحدیث رقم : ٤٤٧٠' والترمذی فی ٤ / ٣٠' الحدیث رقم : ١٤٣٣' وابن ماجه فی ٢ / ٨٥٧' الحدیث رقم : ٢٥٦٥' والدارمی فی ٢ / ٣٢٦' الحدیث رقم : ٣٣٢٦' و مالك فی المؤطا ٢ / ٨٢٦' الحدیث رقم : ١٤ من کتاب الحدود وأحمد فی المسند ٤ / ١١٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اگر تم میں سے کسی شخص کی لونڈی' زنا کا ارتکاب کرے اور اس کا زنا ظاہر ہو جائے (یعنی اس کی زنا کاری ثابت ہو جائے) تو اس کو چاہیے کہ اس پر حد جاری کرے اور اس کو عار نہ دلائے اگر وہ پھر زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر حد جاری کرے اور اس کو عار نہ دلائے پھر اگر وہ تیسری مرتبہ زنا کا ارتکاب کرے اور اس کی زنا کاری ظاہر ثابت ہو جائے تو اب اس کو چاہیے کہ وہ اس لونڈی کو فروخت کر دے اگرچہ بالوں کی رسّی (یعنی حقیر ترین چیز) ہی کے بدلے فروخت کرنا

پڑے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **فليجدها الحد**: امام طیبیؒ نے فرمایا کہ ''**الحد**'' مفعول مطلق ہے۔ لا یثرب: راء کی تشدید کے ساتھ ہے: **أي لا يعيب** ۔ حد قائم ہو چکنے کے بعد کوئی شخص اس باندی کو عار نہ دلائے، چونکہ وہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو چکی ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: تثریب سے مراد تانیب وتعییر (سخت شرم وعار دلانا) ہے۔ زانیوں کے لئے حد کا حکم آنے سے پہلے ان کی تادیب کا جو طریقہ مقرر تھا وہ تثریط ہی تھا۔ چنانچہ جب حد کا حکم آیا تو تثریب پر اکتفاء کرنے کی ممانعت ہوگئی اور جلاوطنی ساقط کرنا شاید کہ مالک کے حقوق کی رعایت کے پیش نظر ہے۔

اور تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ غلام اور باندی کا زنا کرنا، زمانہ جاہلیت میں کوئی عیب کی بات نہ تھی۔ چنانچہ اس ارشاد گرامی میں تنبیہ فرمادی کہ حد جاری ہونے کے معاملہ میں غلام اور آزاد برابر ہیں۔ البتہ غلاموں اور باندیوں کی سزا آدھی ہوگی۔ جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ **فان أتين بفاحشة فعليهن نصف ما على المحصنت من العذاب**۔ [النساء: ۲۵]

فليجد ها الحد و لا يشرب: اس جملہ سے معلوم ہوا کہ حد وتثریب کو جمع نہیں کیا جائے گا۔

زانیہ باندی کی بیع کا حکم:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب باندی کو زنا کی عادت پڑی ہوئی ہے تو وہ بہت خراب باندی ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو اپنے پاس نہ رکھو بلکہ فروخت کر دو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی بلا دوسرے کے سر کیوں ڈالی جائے؟ اس لیے حدیث شریف میں ہے کہ جس چیز کو تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو اس کو اپنے بھائی کیلئے بھی ناپسند کرو۔ لہٰذا جب خراب باندی کو تم اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کرتے تو بیچ کر دوسرے کے سر پر خراب باندی کیوں ڈالتے ہو؟ پہلا جواب: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے کو بیچنے سے حالات بدل جاتے ہیں۔ مثلاً یہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت وہ باندی جس جگہ رہتی ہے وہاں اس نے کسی سے دوستی کر رکھی ہے اور بیچنے کے نتیجے میں جب وہ باندی یہاں سے چلی جائے گی تو ہوسکتا ہے کہ اس کی دوستی ختم ہوجائے اور اس کی اصلاح ہوجائے دوسرا جواب: ہوسکتا ہے کہ آقا تو اس باندی پر قابو نہیں کر سکا لیکن جب دوسرے آقا کے پاس جائے گی تو وہ اس کی صحیح تربیت کر سکے گا اور اس پر قابو کر سکے گا۔ تیسرا جواب: ہوسکتا ہے کہ دوسرا شخص اس باندی کی شادی کرادے اس وجہ سے آپ ﷺ نے بیچنے کیلئے فرمایا۔ چوتھا جواب ہوسکتا ہے کہ دوسرا شخص اس باندی کے ساتھ احسان وتومع کا معاملہ اختیار کرے تو اس کی اصلاح ہو جائے پانچواں جواب؟ یہ حکمت بھی ہوسکتی ہے کہ اتنی بار زنا معلوم ہو جانے کے باوجود اس کو اپنی ملک میں رکھنے سے اس بات کا تو ہم ہوسکتا ہے کہ شاید مولیٰ بھی زنا پر راضی ہے۔ اس تو ہم سے بچنے کے لئے بیع کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو درحقیقت یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، چونکہ اگر عیب بتا کر بیچی جارہی ہے تو اس میں کوئی اشکال بات کی نہیں۔ سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشتری جانتے بوجھتے ایسی باندی کیوں خرید رہا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر باندی کی فروختگی، ازروئے زجر وسیاست بمنزلہ تغریب کے ہے، اور دلالت کر رہی ہے کہ یہ باندی ناقابل اصلاح ہے۔

عرضِ مرتب:

باندی پرحد کون جاری کرسکتا ہے؟ یہ بحث اگلی حدیث کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں ① فاسق وفاجر اور اہل معاصی کے ساتھ رہن سہن کو ترک کردینا ② اس طرح کی لونڈی کو بیچ دینا مستحب ہے لیکن علماء ظواہر کے نزدیک واجب ہے۔ ③ زانی اگر بار بار زنا کرے تو ہر بار اس کو حد لگائی جائے گی۔ ④ اگر زنا کئی بار کیا مگر کبھی حد جاری نہیں، اور پھر ایک بار حد جاری ہوگئی تو یہ حد پچھلے زنا کیلئے کافی ہوگی۔ ⑤ قیمتی شئی کو معمولی قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے۔

اپنے غلاموں پرحد جاری

۳۵۶۴: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: يَا اَيُّهَا النَّاسُ! اَقِيْمُوْا عَلٰى اَرِقَّائِكُمُ الْحَدَّ مَنْ اَحْصَنَ مِنْهُمْ وَمَنْ لَمْ يُحْصِنْ، فَاِنَّ اَمَةً لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَنَتْ، فَاَمَرَنِيْ اَنْ اَجْلِدَهَا، فَاِذَا هِيَ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِنِفَاسٍ، فَخَشِيْتُ اِنْ اَنَا جَلَدْتُّهَا اَنْ اَقْتُلَهَا فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ اَحْسَنْتَ (رواه مسلم وفي رواية ابي داود:) قَالَ: دَعْهَا حَتّٰى يَنْقَطِعَ دَمُهَا، ثُمَّ اَقِمْ عَلَيْهَا الْحَدَّ، وَاَقِيْمُوا الْحُدُوْدَ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔

أخرجه المسلم فی صحيحه ۳ / ۱۳۳۰، الحديث رقم: (۳۴ ـ ۱۷۰۵) أخرجه ابوداؤد فی السنن ۴ / ۶۱۷ الحديث رقم: ۴۴۷۳، والترمذی فی ۴ / ۳۷، الحديث رقم: ۱۴۴۱، وأحمد فی المسند ۱ / ۱۵۶

ترجمہ: ''اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''اے لوگو! اپنے غلام لونڈیوں پرحد جاری کرو (یعنی اگر وہ زنا کے مرتکب ہوں تو پچاس کوڑے مارے) خواہ وہ محصن یعنی شادی شدہ ہوں یا غیر محصن''۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک لونڈی نے زنا کا ارتکاب کیا تو آنحضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس پرحد جاری کروں مگر جب (مجھے معلوم ہوا کہ) ابھی حال ہی میں اس کے ولادت ہوئی ہے تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے اس کے پچاس کوڑے مارے تو وہ مر جائے گی چنانچہ میں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اچھا کیا (کہ اس حالت میں اس پرحد جاری نہیں کی)''۔ (مسلم) اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ نے اس بارے میں ذکر کیا تو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک کہ اس کا (نفاس کا) خون بند نہ ہو جائے اس وقت تک کے لئے اسے چھوڑ دو اس کے بعد اس پرحد جاری کرو اور اپنے غلاموں پرحدود جاری کیا کرو''۔

تشریح: أرقائكم: قاف کی تشدید کے ساتھ، رقیق کی جمع ہے۔ رقیق کا اطلاق عبید اور أمة دونوں پر ہوتا ہے۔ من أحصن منهم: اس میں تغلیب ہے، مذکر کو مؤنث پر غلبہ دیا گیا ہے یا حذف ہے۔ أی منهم ومنهنّ۔

اس سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ حنفیہ کا مذہب ہے کہ آقا اپنے غلام یا باندی پر کسی قسم کی کوئی حد جاری نہیں کرسکتا۔ حاکم یا قاضی کی عدالت کے ذریعہ ہی حد جاری کرواسکتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مولیٰ اپنے غلام و باندی پر حدزنا جاری کرسکتا ہے۔ دیگر حدود خود جاری نہیں کرسکتا۔ حنفیہ کے دلائل: یہ پہلی دلیل یہ حدیث ہے: **ان النبی صلی اللہ قال: أربع الی الولاۃ الحدود و الصدقات، و الجمعلت و الفیی۔** یعنی یہ چار امور ولاۃ کے سپرد ہیں۔ ان کے اِذن پر موقوف ہیں۔ مولیٰ اپنے غلام یا باندی پر بغیر اذن امام حد جاری نہیں سکتا۔ اس حدیث کو اصحابِ سنن نے ابن مسعود، ابن عباس و ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے مرقوفاً اورمرفوعاً روایت کیا ہے۔

دوسری دلیل: حدود خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کا نائب یعنی امام المسلمین ہی اس حق کو وصول کرسکتا ہے، اس کے اجازت کے بغیر درست نہیں۔

تیسری دلیل: اقامت حدود کے لئے اہم شرائط کا فیصلہ امام ہی کرسکتا ہے۔ عام آدمی نہیں کرسکتا۔

جمہور کے دلائل: پہلی دلیل: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی پچھلی حدیث ہے۔ دوسری دلیل: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہی روایت ہے۔ **أقیمو الحدود علی مالملکت ایمانکم** تیسری دلیل: آقا کو اپنے غلام پر ولایت مطالقہ میں تصرف کا جوحق آقا کو حاصل ہے وہ امام کو بھی حاصل نہیں۔ لہٰذا مولیٰ زیادہ حقدار ہے۔ چوتھی دلیل: مولی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مملوک کی حفاظت کی خاطر اس پر تعزیر جاری کرسکتا ہے۔ لہٰذا حد کا حق بھی اس کو حاصل ہے۔

جمہور کے دلائل کا جواب: مذکورہ بالا دونوں حدیث میں ''اقامت حد'' کا موالی کی طرف اسناد حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔ یعنی اقامت حد کی نسبت موالی کی طرف حقیقی نہیں، ان کو براہ راست اقامت حد کا حکم نہیں دیا جارہا بلکہ اجراء حد کا سبب بننے کا حکم دیا جارہا ہے۔ کہ موالی اپنے غلام کے زنا کی اطلاع مع شہادت شرعیہ امام المسلمین کے دربار میں کرکے، اس جرم کو ثابت کرے اور اپنے غلام پر حد جاری کرنے کے لئے سبب بنو۔ نیز حدیں قائم کرنے کا حکم اس بات کے پیش نظر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کے اس جرم کو چھپاؤ اس بناء پر کہ وہ تمہارے غلام ہیں اور ان پر حد جاری کرانے سے گریز کرو۔ دوسرا جواب: اقامت حدود کا معاملہ انتہائی احتیاط کا متقاضی ہے، ہر آدمی اس کا اہل نہیں ہوتا، ہر کسی کو حد جاری کرنے کا اختیار دینا احتیاط کے خلاف ہے۔ تیسرا جواب: روایات میں خطاب عام ہے۔ مثلاً حضرت علی کی حدیث میں **یا ایھا الناس** کے الفاظ ہیں، پچھلی حدیث میں **أحدکم** ہے۔ یہ لفظ امام وغیرہ امام دونوں کو شامل ہے۔ اور بلا شبہ امام فرد اکمل ہے۔ لہٰذا اس مطلق کو اسی فرد اکمل پر محمول کیا جائے گا۔ چوتھا جواب: علی الاطلاق اجازت دینے میں فساد لازم آتا ہے۔ مالک کے بارے میں یہ تو ہم ہوسکتا ہے کہ اس نے کسی اور سبب سے اپنے غلام کو شدید سزا دینے کیلئے یہ بہانہ تراشا ہے۔

فقال: أحسنت: اگر کوئی عورت حالت حیض میں ہے اور اس پر گواہوں کے ذریعہ یا اقرار سے حدزنا کا ثبوت ہوگیا تو اس پر حد جاری کی جائے گی اگر کسی عورت کو حمل ہو تو اس پر حد جلد قائم کرنے میں وضع حمل اور نفاس ختم ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ نفاس ایک طرح کا مرض ہے اور مریض کو اس کے اچھا ہونے تک مہلت دینی چاہئے۔ اگر زانیہ حاملہ ہو اور اس پر حد رجم ہو تو وضع حمل اور اس کے بعد بچہ کا دودھ چھوٹنے تک انتظار کیا جائے گا۔ جب بچہ دودھ چھوڑے تب رجم کریں گے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: ① اگر کوئی مریض زنا کا مرتکب ہوا اور اس کے محصن شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اس کو رجم سنگسار کا سزاوار گردانا جا چکا ہو تو اس کو اسی مرض کی حالت میں رجم کیا جائے ② اگر اس کے غیر محصن غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اس کو کوڑے مارے جانے کا سزاوار گردانا گیا ہو تو پھر اس کو اس وقت تک کوڑے نہ مارے جائیں جب تک کہ وہ اچھا نہ ہو جائے ③ ہاں اگر وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جس سے بچنے کی امید نہ کی جاتی ہو جیسے دق وسل وغیرہ یا وہ ناقص وضعیف الخلقت ہو تو اس صورت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ سزا پوری کرنے کے لئے اس کو کھجور کی ایسی بڑی شاخ سے مارا جائے جس میں چھوٹی چھوٹی سوٹھنیاں ہوں اور وہ شاخ اسی کو ایک دفعہ اس طرح ماری جائے کہ اس کی ایک ایک ٹہنی اس کے بدن پر لگ جائے اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس مقصد کے لئے پھیلی ہوئی شاخ استعمال کرنا ضروری ہے۔

الفصل الثانی:

دورانِ رجم زانی کے بھاگنے کا بیان

۳۵۶۵: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: جَآءَ مَاعِزٌ الْاَسْلَمِیُّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: اِنَّهٗ قَدْ زَنٰی، فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ جَاءَ مِنْ شِقِّهِ الْآخَرِ، فَقَالَ: اِنَّهٗ قَدْ زَنٰی، فَاَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ جَآءَ مِنْ شِقِّهِ الْآخَرِ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّهٗ قَدْ زَنٰی، فَاَمَرَ بِهٖ فِی الرَّابِعَةِ، فَاُخْرِجَ اِلَى الْحَرَّةِ، فَرُجِمَ بِالْحِجَارَةِ، فَلَمَّا وَجَدَ مَسَّ الْحِجَارَةِ فَرَّ يَشْتَدُّ حَتّٰی مَرَّ بِرَجُلٍ مَعَهٗ لَحْیُ جَمَلٍ، فَضَرَبَهٗ بِهٖ وَضَرَبَهُ النَّاسُ حَتّٰی مَاتَ، فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ فَرَّ حِيْنَ وَجَدَ مَسَّ الْحِجَارَةِ وَمَسَّ الْمَوْتِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَلَّا تَرَكْتُمُوْهُ (رواه الترمذی وابن ماجة وفی رواية) هَلَّا تَرَكْتُمُوْهُ لَعَلَّهٗ اَنْ يَّتُوْبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ۔

والترمذی فی السنن ٤ / ٢٧، الحديث رقم: ١٤٢٨، وابن ماجه فی ٢ / ٨٥٤، الحديث رقم: ٢٥٥٤، وأحمد فی المسند ٢ / ٤٥٠

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اس نے (یعنی میں نے) زنا کا ارتکاب کیا' (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا (یعنی اپنا چہرہ مبارک اس سے پھیر لیا) وہ دوسری جانب سے گھوم کر یعنی تبدیل مجلس کر کے پھر آپ ﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ ﷺ نے پھر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور وہ بھی پھر دوسری جانب سے گھوم کر آپ ﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے! آخر کار چوتھی مرتبہ میں آپ ﷺ نے (اس کی سنگساری کا) حکم صادر فرمایا' چنانچہ اس کو حرہ میں لایا گیا (جو مدینہ کا کالے پتھروں والا

مضافاتی علاقہ ہے) اور اس کو پتھر مارے جانے لگے جب اس کو پتھروں کی چوٹ لگنے لگی تو بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ وہ ایک شخص کے پاس سے گزرا جس کے ہاتھ میں اونٹ کے جبڑے کی ہڈی تھی' اس شخص نے اسی جبڑے کی ہڈی سے اس کو مارا اور دوسرے لوگوں نے بھی (دوسری چیزوں سے) اس کو مارا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ کیا کہ وہ پتھروں کی چوٹ کھا کر اور موت کی سختی دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا (لیکن ہم نے اس کا پیچھا کر کے سنگسار کر دیا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیا؟ (ترمذی' ابن ماجہ) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ذکر سن کر فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیا' شاید کہ وہ توبہ کر لیتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا۔

راویٔ حدیث:

ماعز بن مالک۔ یہ ماعز ہیں۔ مالک کے بیٹے ہیں۔ اور قبیلہ کے اعتبار سے اسلمی ہیں۔ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حد زنا میں سنگسار کرایا تھا۔ ان سے ان کے صاحبزادے ''عبداللہ'' نے صرف ایک روایت کی ہے۔

تشریح: **انه قد زنی:** یہ اسلوب کلام ظاہر کرتا ہے کہ یہ حدیث روایت بالمعنی ہے، چونکہ وگرنہ یہ الفاظ ہوتے: **أني قد زنيت:** یا مراد یہ ہے: **أن ماعزا قد زنی۔ في الرابعه:** دوسری روایات کی روشنی میں اس کو چار مختلف مجالس پر محمول کیا گیا ہے۔ **یشتد:** یہ جملہ حالیہ ہے۔ **لحی:** لام کے فتحہ اور حاء مہملہ کے سکون کے ساتھ، جبڑے کی ہڈی۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر کوئی محصن اپنے ارتکاب زنا کا خود اقرار کرے، اور پھر جب اسے رجم کرنا شروع کیا تو بھاگ پڑے۔

ابن الہمامؒ فرماتے ہیں: اگر رجم کے دوران بھاگ کھڑا ہو تو: اگر وہ ''مقر'' تھا تو اس کا پیچھا نہ کیا جائے اور چھوڑ دیا جائے، اور اگر مشہود علیہ'' تھا تو اس کا پیچھا کیا جائے گا اگر وہ ٹھہرا نہ ہو اور لوگوں کو تھکا دے تو اس صورت میں اس کو پکڑ کر باندھ دیا جائے اور سنگسار کیا جائے گا حتی کہ مر جائے، چونکہ اس کا بھاگنا ظاہری اعتبار سے رجوع ہے۔ اس کا رجوع اس کے اقرار کی صورت میں تو مؤثر ہوگا۔ شہادت کی صورت میں مؤثر نہیں ہوگا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

امام شافعی اور امام احمدؒ وغیرہ کا کہنا ہے کہ چھوڑ دیا جائے، لیکن اگر وہ اقرار سے رجوع کرلے تو چھوڑ دیا جائے اور اگر اعادہ کرے تو رجم کر دیا جائے۔ ان کی دلیل ابوداؤد کی روایت ہے: **أن النبي ﷺ قال: هلا تركتموه، ولعله يتوب فيتوب الله عليه۔** ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔ یہ حدیث تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اسے مطلق چھوڑ دیا جائے۔ امام مالکؒ وغیرہ کا کہنا ہے کہ اس کا پیچھا کیا جائے گا اور رجم کیا جائے گا، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرت پر دیت لازم نہیں کی، باوجودیکہ ان صاحب کے بھاگ کھڑے ہونے کے بعد انہوں نے انہیں قتل کیا تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ انہوں نے صراحتاً رجوع نہیں کیا حالانکہ ان پر حد ثابت تھی۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: بظاہر لوگوں کو اس حکم شرعی کا اس سے پہلے علم ہی نہیں تھا، لہٰذا یہ ''جملہ'' ان کے حق میں عذر ہے۔

۳۵۶۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ لِمَا عِزِ بْنِ مَالِكٍ: اَحَقٌّ مَا بَلَغَنِیْ عَنْكَ؟ قَالَ: وَمَا بَلَغَكَ عَنِّیْ؟ قَالَ: بَلَغَنِیْ اَنَّكَ قَدْ وَقَعْتَ عَلٰی جَارِيَةِ اٰلِ فُلَانٍ' قَالَ: نَعَمْ فَشَهِدَ اَرْبَعَ شَهَدَاتٍ' فَاَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه المسلم فی صحیحه ۳ / ۱۳۲۰' الحدیث رقم: (۱۹ ـ ۱۶۹۳)

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم نے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے جو بات پہنچی ہے' کیا وہ سچ ہے؟ اس نے عرض کیا: (یا رسول اللہؐ!) آپ کو میرے بارے میں کیا بات پہنچی ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھے (تمہارے بارے میں) یہ بات پہنچی ہے کہ تم نے آلِ فلاں کی لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ اس نے عرض کیا: جی ہاں! انہوں نے چار بار اس بات کا اقرار کیا لہٰذا آپ ﷺ نے اس کی سنگساری کا حکم فرمایا اور اس کو سنگسار کر دیا گیا''۔ (مسلم)

تشریح: ''أحق'' ثابتٌ کے معنی میں ہے۔ **بجارية آل فلان:** ایک صحیح نسخہ میں **علی جارية آل فلان** کے الفاظ ہیں۔ جاریہ سے مراد بنت ہے۔

قوله :رواه مسلم:

اس حدیث کے بارے میں صاحب مصابیح پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو پہلی فصل کے بجائے یہاں دوسری فصل میں کیوں نقل کیا؟

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ماعز رضی اللہ عنہ کے ارتکاب زنا کا علم تھا اور پھر آپ ﷺ نے ان سے اعتراف جرم کرایا جب کہ ابو ہریرہ اور بریدہ کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو حضرت ماعزؓ کے ارتکاب زنا کا علم نہیں تھا۔ حضرت ماعزؓ آئے اور اقرار کیا آنحضرت ﷺ نے ان سے بار بار اعراض فرمایا اس کے بعد پھر مختلف احوال پیش آئے اور پھر بالآخر رجم کر دیا گیا۔ اس اعتبار سے ان احادیث میں باہم تضاد نظر آتا ہے لہٰذا ان کے درمیان وجہ تطبیق یہ ہوگی کہ کوئی مقام ایجاز کا مقتضی ہوتا ہے اس لئے وہاں کلمات معدودہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور کہیں مقام اطناب کا تقاضا کرتا ہے چنانچہ وہاں مکمل اطناب برتا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے؟ **یرمون بالخطب الطوال وتارة وحی الملا حظ خیفته الرقباء** ابن عباس اختصار کی راہ پر چلے، قصہ کا ابتدائی اور انتہائی منظر بیان کر دیا۔ ان کے پیش نظر زانی محصن کے اقرار کے بعد ہونے والے رجم کو بیان کرنا مقصود تھا۔ اس لئے اس حدیث میں اختصار کو ملحوظ رکھا اور پورا واقعہ نقل کئے بغیر صرف رجم کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ دوسری احادیث میں حضرت بریدہ، ابو ہریرہ اور یزید نے اطناب کی راہ پکڑی تا کہ امت کے سامنے اہم مسائل آسکیں۔ واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا چنانچہ یہ اغلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ماعز رضی اللہ عنہ کے ارتکاب زنا کا علم پہلے سے ہوگا پھر بعد میں آپ ﷺ نے خود ماعز رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں بات چیت فرمائی کہ وہ اپنی طرف منسوب بات کا انکار کر دیں تو ان کے حد ساقط ہو جائے، لیکن انہوں نے اقرار کر لیا اور صورت وہ اختیار کی جو دوسری احادیث میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ جب ماعز رضی اللہ عنہ اپنے ارتکاب زنا کا اقرار کرتے تو آپ ﷺ اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتے تھے' کہ پہلے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو آ کر اقرار کیا، پھر دائیں طرف سے اقرار کیا: حضور علی الصلوٰۃ والسلام نے اعراض فرمایا تو بائیں جانب سے آ کر اقرار کیا جیسا کہ ابو ہریرہ کی حدیث میں تفصیل سے مروی ہے۔ پھر دوسری جانب سے آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار اپنا رخ زیبا ان کی طرف سے پھیر لیا تا کہ اقرار سے رجوع کر لیں۔ جب اتنی بار اعراض کے باوجود حضرت ماعزؓ نے رجوع نہیں کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہیں جنون تو نہیں ہے...... حضرت ابن عباسؓ کے اس اسلوب بیان کی نظیر یہ آیت مبارکہ ہے: كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا [المزمل: ۱۵، ۱۶] "فَاَخَذْنٰهُ" کی فاء "فاجر بہ فرجم" کی فاء کی مانند ہے قصہ کی ابتداء سے لے کر یہاں اس فاء کے درمیان تک متعدد احوال ہیں جن کا ضبط بھی ناممکن سا ہے جیسا کہ کما ارسلنا فعصی میں ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں اس روایت میں اسی طرح ہے باقی روایات میں مشہور یہ ہے کہ وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور "طهرنی" کی درخواست کی تھی۔ علماء فرماتے ہیں ان روایات میں کوئی تناقض نہیں۔ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں از خود حاضر ہوئے ہوں ان کو کسی نے بلایا نہ ہو۔ چنانچہ مسلم کے علاوہ کی روایت میں ہے کہ ان کی قوم نے ان کو بھیجا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجنے والے سے فرمایا: اے ہزال اگر تم پردہ پوشی کر لیتے تو تمہارے لئے بہتر تھا۔ پھر بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعزؓ سے پوچھا کہ جو بات مجھ تک پہنچی ہے کیا وہ درست ہے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب گویا چار مجلسوں میں چار مرتبہ اقرار کرالیا تب سنگساری کا حکم صادر فرمایا اس اعتبار سے ان احادیث میں باہم کوئی تضاد نہیں رہا۔

زنا پر ستر پوشی کا بیان

۳۵۶۷: وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ نُعَيْمٍ، عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ مَاعِزًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَقَرَّ عِنْدَهٗ اَرْبَعَ مَرَّاتٍ، فَاَمَرَ بِرَجْمِهٖ، وَقَالَ لِهَزَّالٍ: لَوْ سَتَرْتَهٗ بِثَوْبِكَ كَانَ خَيْرًا لَّكَ، قَالَ ابْنُ الْمُنْكَدِرِ: اِنَّ هَزَّالاً اَمَرَ مَاعِزًا اَنْ يَّاْتِيَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُخْبِرَهٗ۔ (رواه ابو داود)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ٤ / ٥٤١، الحديث رقم: ٤٣٧٨

ترجمہ: "اور حضرت یزید بن نعیم اپنے والد سے روایت بیان کرتے ہیں کہ ماعز رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (چار مجلسوں) چار مرتبہ (اپنے زنا کا) اقرار کیا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا (اور اس کو سنگسار کر دیا گیا) نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اگر تم ماعز رضی اللہ عنہ کو اپنے کپڑے سے چھپا لیتے (یعنی اس کے زنا کے واقعہ پر پردہ ڈال دیتے اور اس کو ظاہر نہ کرتے) تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا۔ ابن منکدرؒ (جو تابعی اور اس حدیث کے راوی ہیں) نے کہا کہ ہزال رضی اللہ عنہ ہی نے ماعز رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے واقعہ کی خبر دیدو۔" (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

یزید بن نعیم۔ "الاکمال" میں لکھا ہے کہ یہ "یزید" ہیں نعیم بن ہزال کے بیٹے ہیں۔ خاندانی لحاظ سے "اسلمی" ہیں۔

انہوں نے اپنے والد اور جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ ''نعیم'' میں نون پر فتحہ اور عین مہملہ ہے اور ''ہزال'' میں ہاء مفتوح اور زائی مشدد ہے۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''نعیم'' صیغہ تصغیر ضبط کیا ہے اور ''اب'' کی وضاحت ''ہزال'' سے کی ہے اور کہا ہے کہ ان کی کنیت ''ابونعیم'' تھی ان سے ان کے بیٹے نعیم اور محمد بن منکدر روایت کرتے ہیں۔

هزال: زاء کی تشدید کے ساتھ، هازل سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قال ابن المنکدر، ایک نسخہ میں وقال ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: **من نفس عن مسلم كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب الاخرة ومن ستر مسلما ستره الله في الدنيا والآخرة، والله في عون العبد مادام العبد في عون أخيه۔**

ابوداؤد اور نسائی عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من رأى أي عورة فسترها كان كمن أحيا موؤدة۔** لہٰذا جب ستر مندوب الیہ ٹھہرا تو شہادت خلافِ اولیٰ ٹھہری۔ کہ جس کا مرجع کراہت تنزیہی ہے۔ چونکہ یہ جانب فعل میں بمنزلہ مندوب کے ہے، اور جانب ترک میں تنزیہ ہے۔ شہادت خلاف اولیٰ اس صورت میں ہے کہ جب وہ زانی معتاد نہ ہو، البتہ جب معاملہ اشاعت تک پہنچ جائے، بلکہ بعض لوگ تو اس پر فخر کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں شہادت، عدم اداء شہادت سے اولیٰ ہوگی۔ چونکہ شارع کا اپنے خطابات کے ذریعہ مطلوب یہ ہے کہ زمین کو معاصی سے اور فواحش سے خالی کیا جائے اور یہ یوں ممکن ہے کہ مرتکبین توبہ کرلیں یا زجر وتنبیہ کے ذریعہ متحقق ہوگا۔

لہٰذا مثلاً جب لوگ زنا اور شراب نوشی میں مگن ہوتے جارہے ہوں تو اخلاء کیلئے دوسرے سبب کا تحقق ضروری ہوگا اور وہ حدود ہی ہیں، بخلاف اس شخص کے، کہ جس سے ایک مرتبہ لغزش ہوگئی، یا ہوئی تو بار بار، مگر چھپ چھپا کر، ڈرتے ڈرتے، ندامت کے ساتھ، تو یہ ''ستر'' شاہد کیلئے محل استحباب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہزال سے یہ کہنا: **لو كنت سترت بتوبك۔** ہمارے ذکر کردہ کلام کی ایک مثال ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حدود کی ستر پوشی کا بیان

۳۵۶۸: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: تَعَافُوْا الْحُدُوْدَ فِيْمَا بَيْنَكُمْ، فَمَا بَلَغَنِيْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ.

(رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٤٠، الحديث رقم: ٤٣٧٦، والنسائی فی ٨ / ٧٠، الحديث رقم: ٤٨٨٥

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم آپس میں اپنی حدود کو معاف ومحو کر دیا کرو (اس سے پہلے

کہ ان کی خبر مجھ تک پہنچے) (اور وہ ثابت ہوگیا) تو معاملہ مجھ تک پہنچ گیا (اس پر) حد واجب ہوگئی''۔

(ابوداؤد‘نسائی)

تشریح: تعافوا: تعافی مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔ أی لیعف بعضهم عن بعض۔

حدیث کا مطلق مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر کسی مملوک (غلام یا لونڈی) سے اس قسم کا کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے آقا کو نہ تو خود اس مملوک پر حد جاری نہیں کرنا چاہئے بلکہ چاہئے کہ وہ اس کو معاف کر دے یا وہ اس مملوک کو حاکم کے سامنے پیش کرے۔

اس حدیث میں ''معاف کرنے'' کا جو حکم دیا گیا ہے وہ وجوب کے طور پر نہیں ہے بلکہ استحباب کے طور پر ہے۔

۳۵۶۹: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَقِیْلُوْا ذَوِی الْهَیْئَاتِ عَثَرَاتِهِمْ اِلَّا الْحُدُوْدَ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٥٤٠‘ الحديث رقم: ٤٣٧٥‘ وأحمد فی المسند ٦ / ١٨١

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اچھی صفات والوں کی لغزشیں سوائے حدود کے معاف کر دو (کیونکہ حدود کی معافی جائز نہیں ہے)۔'' (ابوداؤد)

تشریح: أقیلوا: یہ خطاب نہ صرف ائمہ بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی ہے کہ جو مؤاخذہ اور تادیب کا حق رکھتے ہیں کہ عزت داروں کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر کریں هیئات اور ذوی الهیئات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔

الاحدود: ''عشرات'' سے مراد اگر صغائر و خطایا ہوں تو یہ استثناء منقطع ہے اور اگر ''عشرات'' سے مراد مطلق ذنوب ہوں اور ''حدود'' سے مراد ''موجب حد'' ہو تو یہ استثناء متصل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوف محسوس ہوا کہ مرورِ زمان کے ساتھ ساتھ لوگ بھی بدل جائیں گے، ان کے اخلاق و اطوار بدل جائیں گے لوگ مداہنت پر اتر آئیں گے بڑے لوگوں کے ساتھ مداہنت کا معاملہ کریں گے ان کی ستر پوشی کرنے لگیں گے، ان کے خوف، یا ان سے کسی لالچ کے باعث وہ ان پر حدود جاری نہیں کریں گے، چنانچہ یہ حکم صادر فرما دیا کہ جیسے عام لوگوں پر حدود جاری کرو۔ ایسے ہی ان لوگوں پر بھی حدود جاری کرو ان سے اگر عفو و درگزر کا معاملہ برتو تو حدود کے علاوہ میں برتو۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اسلوب لطیف کے ساتھ یہ بیان فرما دیا کہ اگر اس بات کو صراحتاً ذکر کیا جاتا تو عین ممکن ہے کسی کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے۔ یعنی عبارت گراں گزرے۔

خلاصۃ الآراء:

ذوی الهیئات سے مراد صالحین، متقین، اخلاقِ حمیدہ سے متصف، صاحب مروت و معززین ہیں۔

ہیئت کے متعدد معنی آتے ہیں: ① شکل وصورت ② ہر چیز کی وہ حالت جس پر وہ قائم ہو محسوس ہو یا معقول ہو ③ خصلت ④ وہ مخصوص حالت و کیفیت جو اشیاء متعدد میں پائی جاتی ہو جس کی وجہ سے ان اشیا متعددہ کو شی واحد شمار کیا جائے۔

ابن عدی نے اس روایت کو بحوالہ ابن عباس ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ادروا الهدود باشبهات واقيلو الكرام عثوالهم الا في هد من حدود الله ۔

ثبوتِ جرم میں شبہ کا بیان

۳۵۷۰:وَعَنْهَا قَالَتْ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:اِدْرَأُوا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَاِنْ، كَانَ لَهُ مَخْرَجٌ فَخَلُّوْسَبِيْلَهُ، فَاِنَّ الْاِمَامَ اَنْ يُخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِنْ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعُقُوْبَةِ۔ (رواه الترمذی وقال : قد روی عنها ولم يرفع وهو اصح)

والترمذي في السنن ٤ / ٢٥، الحديث رقم : ١٤٢٤

ترجمہ:''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو حدود (کی سزا) سے دور رکھو، اگر مسلمان (ملزم) کے لئے بچاؤ کا ذرا بھی کوئی موقع نکل آئے تو اس کی راہ چھوڑ دو (یعنی اس کو بری کر دو) کیونکہ امام (یعنی حاکم و منصف) کا درگزر کرنے میں خطا کرنا، سزا دینے میں خطا کرنے سے بہتر ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی گئی ہے اور اس کا مرفوع نہ ہونا زیادہ صحیح ہے۔ (یعنی یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا ارشاد ہے حدیث نبوی ﷺ نہیں ہے کیونکہ جس سلسلہ سند سے یہ حدیث موقوف ثابت ہوتی ہے وہ اس سلسلہ سے زیادہ صحیح اور قوی ہے جس سے اس کا حدیث مرفوع ہونا معلوم ہوتا ہے)۔''

زنا بالجبر میں مہر کا بیان

۳۵۷۱:وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ:اسْتُكْرِهَتِ امْرَأَةٌ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَدَرَأَ عَنْهَا الْحُدُوْدَ، وَاَقَامَهُ عَلَى الَّذِيْ اَصَابَهَا، وَلَمْ يَذْكُرْ اَنَّهُ جَعَلَ لَهَا مَهْرًا . (رواه الترمذی)

والترمذي في السنن ٤ / ٤٥، الحديث رقم : ١٤٥٣، وابن ماجه الحديث رقم : ٢٥٩٨، وأحمد في المسند ٤ / ٣١٨

ترجمہ:''اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں ایک عورت کے ساتھ زبردستی کی گئی (یعنی ایک مرد نے اس سے زبردستی زنا کیا) آپ ﷺ نے اس عورت سے تو حد کو دور کر دیا لیکن اس زنا کرنے والے پر حد جاری کی گئی۔ راوی نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے اس عورت کے لئے مہر مقرر کیا تھا۔''۔ (ترمذی)

تشریح: مظہر اور ابن مالکؒ فرماتے ہیں: راوی کے ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسی صورت میں مہر واجب نہیں ہوتا، چنانچہ دوسری احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے ایسی عورت کے لئے مہر کو واجب

قرار دیا ہے۔ استکرھت امرأة: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ولم یذکر: کو معروف و مجہول دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ معروف پڑھنے کی صورت میں فاعل کی ضمیر راوی کی طرف لوٹے گی اور مجہول پڑھنے کی صورت میں مابور جملہ بتاویل مصدر نائب فاعل ہوگا۔ ای ولم یذکر فی الحدیث۔

۳۵۷۲:وَعَنْهُ اَنَّ امْرَاَةً خَرَجَتْ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُرِيْدُ الصَّلٰوةَ' فَتَلَقَّاهَا رَجُلٌ فَتَجَلَّلَهَا' فَقَضٰى حَاجَتَهُ مِنْهَا' فَصَاحَتْ' وَانْطَلَقَ' وَمَرَّتْ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ' فَقَالَتْ:اِنَّ ذٰلِكَ الرَّجُلَ فَعَلَ بِيْ كَذَا وَكَذَا فَاَخَذُوا الرَّجُلَ' فَاَتَوْابِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهَا: اذْهَبِيْ فَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكِ وَقَالَ لِلرَّجُلِ الَّذِيْ وَقَعَ عَلَيْهَا:اُرْجُمُوْهُ' وَقَالَ:لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ لَقُبِلَ مِنْهُمْ۔ (رواه ابوداود والترمذی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٤١' الحديث رقم : ٤٣٧٩' والترمذی فی ٤ / ٤٥' الحديث رقم : ١٤٥٣' وأحمد فی المسند ٦ / ٣٩٩

ترجمہ:''اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں ایک دن ایک عورت نماز کے لئے گھر سے نکلی تو راستہ میں اس کو ایک شخص ملا جس نے اس پر کپڑا ڈال کر اس سے اپنی حاجت پوری کر لی (یعنی اس کے ساتھ زبردستی زنا کا ارتکاب کیا) وہ عورت چلائی اور وہ مرد (اس کو وہیں چھوڑ کر) چلا گیا' جب کچھ مہاجر صحابہؓ کی ایک جماعت اِدھر سے گزری تو اس عورت نے ان کو بتایا کہ اس شخص نے میرے ساتھ ایسا ایسا کیا ہے (یعنی میرے اوپر کپڑا ڈال کر مجھے بے بس کر دیا اور پھر مجھ سے زنا کا ارتکاب کیا۔ لوگوں نے اس شخص کو پکڑ لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے اس عورت سے تو یہ فرمایا کہ جاؤ' اللہ تعالیٰ نے تمہاری بخشش فرما دی ہے۔ (کیونکہ اس بدکاری میں تمہاری خواہش و رضا کا دخل نہیں تھا بلکہ تمہیں مجبور و بے بس کر دیا گیا تھا) اور جس شخص نے اس عورت سے بدکاری کی تھی اس کے حق میں (صحابہ سے) فرمایا کہ اس کو سنگسار کر دیا جائے (یعنی اس نے اپنے جرم زنا کا اقرار کیا اور چونکہ وہ شادی شدہ تھا اس لئے آپ ﷺ نے (لوگوں کو) حکم دیا کہ اس کو سنگسار کر دو چنانچہ اس کو سنگسار کر دیا گیا۔ (اس سنگسار کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے (اپنے اوپر حد جاری کرا کر یا اعتراف کر کے) ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس طرح کی توبہ مدینہ والے کرتے تو ان کی توبہ قبول کی جاتی۔

(ترمذی' ابوداؤد)

تشریح:قوله:ان امراة خرجت۔۔۔فعل بی کذاو کذا:

فتجللها:أی فغشيها بثوبه، فصار كالجل عليه۔ ''تجلل'' جل سے ماخوذ ہے ''جل'' زین کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ شخص ایسا ہو گیا جیسے گھوڑے کے لئے زین ہوتی ہے'

قاضیؒ فرماتے ہیں ''تجلل'' وطی سے کنایہ ہے، جیسا کہ لفظ ''غشیان'' وطی سے کنایہ ہے عصابۃ: عین مہملہ کے کسرہ کے ساتھ' طاقتور جماعت کو کہتے ہیں۔

فعل بی کذا و کذا: پہلا ''کذا'' یہ غُیان'' سے اور دوسرا ''کذا'' یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے۔

ترید الصلٰوۃ: اس جملہ میں دو احتمال ہیں: ① یہ جملہ حالیہ ہے ② جملہ مستانفہ ہے علت بیان کر رہا ہے

قولہ: بقد تاب توبۃ لو تابھا أھل المدینۃ:

یعنی اگر کسی شہر والے اس طرح (یعنی اس خلوص نیت کے ساتھ) توبہ کریں تو وہ بھی قبول کر لی جائے، حالانکہ ان میں بھتہ خور جیسے دیگر ظالم لوگ بھی ہوتے ہیں۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کی یہ مقدار اگر اہل مدینہ پر تقسیم کردی جائے تو سب کیلئے کافی ہو جائے۔ اھ۔ ملا علی قاریؒ نے اس مطلب کو رد کیا ہے، چونکہ توبہ کوئی قابل تقسیم چیز نہیں ہے اور حدیث ماعز بن مالک میں: **لقد تاب توبۃ لو قسمت بین أمۃ لو سعتھم** کے الفاظ مبالغہ پر محمول ہیں یا ان کا بھی وہی مطلب ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

زانی پر دوہری حد جاری کرنے کا بیان

۳۵۷۳: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَجُلاً زَنٰی بِامْرَاَۃٍ فَاَمَرَ بِہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجُلِدَ الْحَدَّ ثُمَّ اُخْبِرَ اَنَّہٗ مُحْصِنٌ فَاَمَرَبِہٖ فَرُجِمَ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجہ ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٨٥٦' الحدیث رقم : ٤٤٣٨

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارہ میں حکم فرمایا' چنانچہ اس کو بطور حد کوڑے مارے گئے اس کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ وہ شخص شادی شدہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں حکم فرمایا۔ چنانچہ اس کو سنگسار کر دیا گیا''۔

(ابوداوٗد)

تشریح: قولہ أن رجلا زنی بامرأۃ فأمر:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''فأمر'' کا عطف کلام محذوف پر ہے وہ کلام محذوف خبر'' ان '' ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: **أخبر بہ النبی ﷺ فأمر**۔ اھ ملا علی قاریؒ نے اس ترکیب کو تکلف قرار دیا ہے اور ''زنی'' کو خبر قرار دیتے ہوئے ''فأمر'' کو اس معطوف قرار دیا ہے۔

فجلد: مجہول کا صیغہ ہے۔

الحد: مفعول مطلق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے کوڑے مارنے کا حکم ممکن ہے اس لئے دیا ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے نہیں بتایا کہ وہ محصن ہے۔ (اور کسی دوسرے نے یہ بتایا ہو کہ وہ محصن ہو اور وہ واقعتاً محصن تھا) دوسرا احتمال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گمان یہ ہو کہ وہ غیر محصن ہے۔ اس گمان کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوڑوں کی سزا کا فیصلہ فرمادیا۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک چیز (یعنی کوڑے) دوسری چیز (رجم) کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر امام المسلمین یا قاضی کسی کو کوئی سزا دے اور پھر یہ معلوم ہو کہ مجرم اس سزا کا نہیں بلکہ دوسری سزا کا مستحق تھا تو ضروری ہے کہ حاکم دوبارہ اس سزا کو جاری کرے جس کا وہ مستوجب تھا۔ (ذکرہ الاشرف وتبعہ ابن الملک ؒ) لیکن یہ بات کہ ایک چیز دوسری چیز کے قائم مقام نہیں ہوسکتی" علی الاطلاق درست نہیں، کیونکہ رجم صورۃ ومعنیٰ جلد کے قائم ہوسکتا ہے۔ اور بلاشبہ یہ سزا اس کے لئے کفارہ کا سبب مع الزیادت ہوگی۔

بیمار زنا کار پر حد جاری کرنے کا بیان

۳۵۷۴: وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ اَنَّ سَعْدَ بْنِ عُبَادَةَ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرَجُلٍ كَانَ فِي الْحَيِّ مُخْدَجٍ سَقِيْمٍ فَوُجِدَ عَلٰى اَمَةٍ مِنْ اِمَائِهِمْ' يَخْبُثُ بِهَا' فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خُذُوْا لَهٗ عِثْكَالًا' فِيْهِ مِائَةُ شِمْرَاخٍ فَاضْرِبُوْهُ ضَرْبَةً. (رواه فی شرح السنة وفی رواية ابن ماجة نحوه)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۳ / ۸۵۹' الحديث رقم: ۲۵۷۴' وأحمد فی المسند ۵ / ۲۲۲

ترجمہ: "اور حضرت سعید بن سعد بن عبادہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ایک ایسے شخص کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے جو اپنے محلّہ کا ایک ناقص الخلقت کمزور اور بیمار شخص تھا (اور ایسا بیمار تھا کہ اس کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہ تھی) اس شخص کو اہل محلّہ کی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کرتے ہوئے پایا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں یہ حکم صادر فرمایا کہ کھجور کی ایک ایسی (بڑی) ٹہنی لو جس میں چھوٹی چھوٹی سو ٹہنیاں ہوں اور پھر (اس ٹہنی) سے اس شخص کو (ایک مرتبہ اس طرح سے) مارو۔) کہ اس کے جسم تک سو کی ٹہنیوں کا اثر پہنچے) (شرح السنۃ) ابن ماجہؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

راویٔ حدیث:

سعید بن سعد۔

عرض مرتب:

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "صاحب "الاکمال" نے ان کا تذکرہ نہیں کیا" اھ۔ مگر ہمارے نسخہ میں ان کا ذکر موجود ہے۔ فوقانی متن میں "سعید بن سعد بن عبادۃ" ہے۔ اور تحتانی متن میں "سعید بن عبادۃ" ہے۔ اس اختلاف پر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی کلام نہیں فرمایا اھ۔

یہ سعید بن سعید بن عبادہ کے بیٹے تھے۔ "انصاری" ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ شرف صحبت نبی کریم ﷺ سے مشرف ہوئے۔ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں اور ان کے بیٹے شرحبیل اور ابوامامہ بن سہل ان سے روایت کرتے ہیں۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ان کا صحابی ہونا صحیح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے یمن کے گورنر تھے۔

تشریح:قوله:انی النبیؐ برجل۔۔۔یخبث بها:مخدج:اسم مفعول کا صیغہ ہے، مجرور ہے

سقیم: ایسا بیمار جس کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو

فاضربوه: ایک نسخہ میں ''بها'' کا اضافہ ہے

یخبث: باءِ موحدہ کے ضمہ کے ساتھ أی یزنی۔زنا فعل خبیث ہے، اس لئے ''یخبث'' کی تعبیر اختیار فرمائی۔

قوله:فقال النبیؐ بخذفاله عثکالا ......:عثکالا:عین مہملہ کے کسرہ کے ساتھ

شمراخ: شین معجمہ کے کسرہ کے ساتھ

فاعل ومفعول کی سزا

۳۵۷۵:وَعَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ وَجَدْتُّمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوْا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ. (رواہ الترمذی وابن ماجة)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٦٠٧' الحديث رقم: ٤٤٦٢' والترمذی فی ٤ / ٤٧' الحديث رقم: ١٤٥٦'
وأخرجه ابن ماجه فی السنن ٢ / ٨٥٦' الحديث رقم: ٢٥٦١' وأحمد فی المسند ١ / ٣٠٠

ترجمہ:''اور حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم کسی شخص کو قوم لوط کا سا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو''۔

(ترمذی،ابن ماجہ)

تشریح:شرح السنہ میں لکھتے ہیں:

لوطی کی سزا کے بارے میں فقہا کا اختلاف ہے۔چنانچہ امام شافعیؒ کے دوقولوں میں سے زیادہ صحیح قول، اور امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب یہ ہے کہ فاعل پر حد زنا جاری ہوگی، یعنی اگر وہ محصن ہے تو اس کو رجم کر دیا جائے، اور اگر غیر محصن ہے تو سو کوڑے مارے جائیں۔ مذکورہ بالا قول کی بنیاد پر امام شافعیؒ کے نزدیک اس کو سو کوڑے مارے جائیں گے، اور جلاوطن کیا جائے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، خواہ محصن ہو، یا غیر محصن ہو، کیونکہ تمکین فی الدبر کی وجہ سے وہ محصنہ نہیں لہٰذا اس کو محصنک والی حد نہیں ماری جائے گی اور علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ لوطی کو رجم کر دیا جائے خواہ وہ محصن ہو، خواہ وہ غیر محصن ہو۔امام مالک اور امام احمد یہی فرماتے ہیں۔

امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ فاعل ومفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ جیسا کہ حدیث کے ظاہر تقاضا ہے۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لواطت پر کوئی حد نہیں، البتہ تعزیر جاری کی جاسکتی ہے۔اھ۔

کہا گیا ہے کہ یہ حدیث تہدید پر محمول ہے، قتل کرنا مقصود نہیں ہے۔ چونکہ بعض مرتبہ سخت قسم کی مار کو بھی قتل سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔کمال پاشا شرح جامع صغیر سے نقل کرتے ہیں کہ لواطت کی سزا کی تعیین کا معاملہ امام کے رائے پر موقوف ہے کہ اگر وہ شخص لواطت کا عادی ہو تو امام اس کو قتل کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو اس کو مارے اور قید میں ڈال دے اھ۔

فاعل ومفعول کو قتل کرنے کا طریقہ

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ان پر عمارت گرادی جائے جیسا کہ حضرت ابوبکر نے کروایا تھا۔
بعض کا کہنا ہے کہ ان کو کسی بلند جگہ پہاڑ وغیرہ سے گرادیا جائے۔ جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ کیا گیا۔
بعض کا کہنا ہے کہ جلا دیا جائے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل سے ثابت ہے۔ جلانے اور ان پر عمارت گرانے کی سزا کا بیان فصل ثالث کی پانچویں حدیث میں آرہا ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ یہاں تک کہ ان دونوں کو موت آجائے، یا توبہ کرلیں اور اگر اس عمل کو دوبارہ کریں تو قتل کردیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالد بن ولید ؓ نے ان کو خط لکھا کہ یہاں ایک ایسا آدمی ہے جس سے لوگ اسی طرح شہوت پوری کرتے ہیں جس طرح عورت سے شہوت پوری کی جاتی ہے اس بارے میں حکم شریعت بتایئے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے حضرات صحابہ ؓ کو جمع فرمایا تو حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ یہ ایسا گناہ ہے جسے صرف ایک ہی امت نے کیا ہے ان سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو معاملہ کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے میری رائے یہ ہے کہ اس کو آگ میں جلا دیا جائے۔ (از شرعی حدود قصاص۔ ص ۷۰)

جانور سے بدفعلی کی سزا

۳۵۷۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ اَتٰى بَهِيْمَةً فَاقْتُلُوْهُ وَاقْتُلُوْهَا مَعَهٗ قِيْلَ لِابْنِ عَبَّاسٍ: مَا شَانُ الْبَهِيْمَةِ؟ قَالَ: مَا سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذٰلِكَ شَيْئًا وَلٰكِنْ اَرَاهُ كَرِهَ اَنْ يُّؤْكَلَ لَحْمُهَا اَوْ يُنْتَفَعَ بِهَا وَقَدْ فُعِلَ بِهَا ذٰلِكَ۔

(رواه الترمذى وابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٦٠٩، الحدیث رقم: ٤٤٦٤، والترمذی ٤ / ٤٦، الحدیث رقم: ١٤٥٥، وابن ماجه فی ٢ / ٨٥٦، الحدیث رقم: ٢٥٦٤، وأحمد فی المسند ١ / ٣٠٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو اس کے ساتھ اس جانور کو بھی قتل کردو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ جانور کے بارے میں یہ حکم کیوں ہے؟ (یعنی جانور نہ تو عقل رکھتا ہے اور نہ وہ مکلف ہے تو اس کو قتل کرنے کا حکم کیوں ہے؟) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے (اس کی حکمت وعلت کے بارے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کچھ نہیں سنا البتہ میرا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ (جس جانور کے ساتھ یہ فعل مکروہ کیا گیا ہو) اس کا گوشت کھایا جائے یا اس (کے دودھ بالوں اور اس کی افزائش نسل وغیرہ) سے فائدہ اٹھایا جائے (اور جب اس جانور سے کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھانا مکروہ ہو تو پھر اس کو قتل کردینا ہی ضروری ہے)''۔

(ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد)

تشریح:قولہ:من اتی بھیمة فاقتلوھا معہ:

فاقتلوہ: اس میں ویلات کی گئی ہیں: ① اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بہت سخت پٹائی کرو۔② اس سے مراد وعید یا تہدید ہے۔ **واقتلوھا معہ:** کہا گیا ہے کہ یہ حکم اس لئے ہے تا کہ اس سے ایسا کوئی حیوان پیدا نہ ہو۔ جو انسان صورت صورت کا ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ سے یہ کہ اس جانور کو باقی رکھ کر کہیں ایسا نہ ہو کہ اس شخص کو دینا میں رسوا ہو جائے

مظہر کی شرح میں ہے کہ امام مالک' امام شافعیؒ کے دونوں میں سے زیادہ واضح قول' امام ابوحنیفہ اور امام احمد فرماتے ہیں کہ اس شخص پر تعزیر ہوگی اور اسحاق فرماتے ہیں کہ فاعل نے اگر یہ حرکت اس نہی کا علم ہونے کے باوجود کی ہے تو اس کو بھی اور جانور کو بھی قتل کر دیا جائے کہا گیا ہے کہ اگر جانور ماکولہ ہے تو قتل کر دیا جائے ورنہ دو صورتیں ہیں ظاہر حدیث کی بناء پر قتل کر دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قتل نہ کیا جائے' چونکہ اس بات کی ممانعت آئی ہے کہ جانور کو کھانے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے ذبح نہ کیا جائے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس عالم میں اللہ جل شانہ جس چیز کو بھی وجود بخشا ہے اس کو کسی فعل خاص کے لئے قابل بتایا ہے۔ پس اس کام کے لئے' کسی اور چیز کو استعمال میں لانا صحیح نہیں۔ چونکہ ماکول جانور کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ انسان اس کو کھائے' نہ یہ کہ اپنی شہوت اس سے پوری کرے۔ انسانوں میں سے مرد فاعلیت کے لئے اور عورت مفعولیت کے لئے پیدا کی گئی ہے' اور ان دونوں میں شہوت رکھی گئی تا کہ تکثیر سبل ہو اور نوع انسانی کو بقاء حاصل رہے پس اگر اس کے برعکس کیا جائے گا تو اس حکمت کا ابطال ہوگا' اللہ جل شانہ نے اپنے اس ارشاد گرامی میں اسی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭبَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ﴾[الاعراف۔۸۱] یعنی اس فعل پر تم کوئی چیز نہیں ابھارتی سوائے مجرد شہوت کے' اس کا اور کوئی داعی نہیں ہے' اور اس سے بڑھ کر کوئی مذمت نہیں اور یہ کہ از جہت عقل ان کے لئے اس فعل کا کوئی داعی نہیں مثلاً طلب نسل اور عبادت کے لئے خلوت وغیرہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۵۷۷:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِىْ عَمَلُ قَوْمِ لُوْطٍ . (رواه الترمذی و ابن ماجة)

والترمذی فی السنن ٤ / ٤٨' الحدیث رقم : ١٤٥٧' وابن ماجه فی ٢ / ٨٥٦' الحدیث رقم : ٢٦٥٣' وأحمد فی السمند ٣ / ٤٤٦٧

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی امت کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ جس چیز کا اندیشہ ہے وہ قوم لوط کا عمل (یعنی اغلام) ہے''۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح:قولہ:ان اخوف ما أخاف ......: اخوف: افعل التفضیل ہے اور ''مفعول'' کے معنی میں ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔:''اخوف'' کو ''ماتکرہ'' موصوفہ کی طرف مضاف کیا۔ تا کہ یہ اس بات پر دلالت کرے کہ جب ''مخوف منھا'' اشیاء کا یکے بعد دیگر استقصاء کیا جائے گا تو کوئی بھی شئی لوط کے عمل سے بڑھ کر خوفناک نہیں ہوگی۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

تہمتِ زنا کی حد کا بیان

فاقر اربع مرات: دوسری روایات کی روشنی میں حنفیہ کے نزدیک یہ "اربع مرات" چار مختلف مجالس پر محمول ہے۔

أربع مرات: أقر کے لئے ظرف ہے۔

الفریة: فاء کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ، بمعنی کذب۔ اور یہاں "الفریة" سے مراد "قذف" ہے۔

۳۵۷۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلاً مِنْ بَنِیْ بَکْرِ بْنِ لَیْثٍ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَاَقَرَّ اَنَّهٗ زَنٰی بِامْرَاَةٍ اَرْبَعَ مَرَّاتٍ، فَجَلَدَهٗ مِائَةً وَکَانَ بِکْرًا، ثُمَّ سَاَلَهُ الْبَیِّنَةَ عَلَی الْمَرْاَةِ، فَقَالَتْ: کَذَبَ وَاللّٰهِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَجُلِدَ حَدَّ الْفِرْیَةِ . (رواہ ابوداود)

سنن أبی داود، کتاب الحدود، باب اذا اقرا الرجل بالزنا، ح ٤٤٧٦۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن بکر بن لیث کے خاندان کا ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے ایک عورت کے ساتھ چار بار (یعنی چار مجلسوں میں) زنا کا ارتکاب کرنے کا اقرار کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو سو (کوڑے) لگوائے کیونکہ وہ شخص غیر محصن (یعنی کنوارہ) تھا۔ پھر آپ ﷺ نے اس شخص سے اس عورت کے خلاف (زنا کاری پر) گواہ طلب کئے (جب وہ مرد بینہ پیش کرنے سے عاجز آ گیا تو) عورت نے عرض کیا کہ "خدا کی قسم یا رسول اللہ! یہ شخص (مجھ پر) جھوٹ بولتا ہے"۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس شخص پر حد قذف (یعنی تہمت لگانے کی حد اسی کوڑے) جاری کی"۔ (ابوداؤد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کی حد کا بیان

۳۵۷۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا نَزَلَ عُذْرِیْ قَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَذَکَرَ ذٰلِکَ فَلَمَّا نَزَلَ مِنَ الْمِنْبَرِ اَمَرَبِا لرَّجُلَیْنِ وَالْمَرْاَةِ، فَضُرِبُوْا حَدَّهُمْ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٦١٨، الحدیث رقم: ٤٤٧٤، والترمذی فی ٥ / ٣١٤، الحدیث رقم: ٣١٨١، وابن ماجه فی ٢ / ٨٥٧، الحدیث رقم: ٢٥٦٧

ترجمہ: "اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب میری برأت نازل ہوئی (یعنی عفت و پاکدامنی کے ثبوت میں آیات نازل ہوئیں) تو نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور اس کا ذکر فرمایا اور پھر جب آپ ﷺ منبر سے اترے تو دو مردوں (حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ) اور ایک عورت (حمنہ بنت جحش) کے بارے میں حکم فرمایا، (کہ ان دونوں کو حاضر کیا جائے یا ان پر حد جاری کی جائے) چنانچہ (تہمت لگانے کی) ان پر حد جاری کی گئی"۔ (ابوداؤد)

تشریح:قوله:لما نزل عذری ......:

بالرجلین:ای بحدها أو احضار هما(یعنی یہاں مضاف محذوف ہے۔کہ ان کو حد مارنے کا یا ان کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔)

عذری: برأت کو "عذر" سے تشبیہ دی، بایں مناسبت کہ عذر معذور کو "جرم" سے بری کر دیتا ہے۔(ذکرہ القاضی وغیرہ)

فضربوا: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

حدهم:أی حد المفترین۔ ترکیبی اعتبار سے مفعول مطلق ہے۔أی فحدوا حدهم۔

الفصل الثالث:

زانی غلام کی سزا کا بیان

۳۵۸۰:عَنْ نَافِعٍ اَنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ اَبِىْ عُبَيْدٍ اَخْبَرَتْهُ اَنَّ عَبْدًا مِنْ رَقِيْقِ الْاِمَارَةِ وَقَعَ عَلٰى وَلِيْدَةٍ مِنَ الْخُمُسِ، فَاسْتَكْرَهَهَا حَتّٰى اقْتَضَّهَا، فَجَلَدَهُ عُمَرُ، وَلَمْ يَجْلِدْهَا مِنْ اَجْلِ اَنَّهُ اسْتَكْرَهَهَا .

(رواه البخاری)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ۱۲ / ۳۲۱، الحدیث رقم : ۶۹۴۹

ترجمہ:"حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت صفیہ بنت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہا نے ان سے بیان کیا کہ امارت وخلافت (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت) کے ایک غلام نے خمس کی ایک لونڈی سے زبردستی زنا کا ارتکاب کیا۔ یہاں تک کہ اس کی بکارت (یعنی اس کے کنوارے پن) کو زائل کر دیا، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو پچاس کوڑے مارے اور اس لونڈی کے کوڑے نہیں مارے کیونکہ اس غلام نے اس کے ساتھ زبردستی زنا کا ارتکاب کیا تھا"۔ (بخاری)

تشریح:قوله:ان عبد امن الا مارة ......:ولیدة :بچی، لونڈی۔ یہاں لونڈی مراد ہے۔

الخمس :خاء اور میم دونوں کے ضمہ کے ساتھ،خاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ

اقتضها: قاف اور ضاد مشدد کے ساتھ ہے ایک نسخہ میں قاف کی بجائے فاء ہے۔چنانچہ "المغرب" میں لکھا ہے۔کہا جاتا ہے:اقتض الجارية ذهب بقضتها، ازالہ بکارت کرنا۔قاف اور ضاد مشدد کا مادہ "کسر" کے معنی پر دلالت کرتا ہے

عقلانی فرماتے ہیں: یہ لفظ قاف اور ضاد معجمہ مشددہ کے ساتھ ہے "قضه" بمعنی "بکارت " سے ماخوذ ہے۔ (دوشیزگی)اور فاء کے ساتھ بھی اسی معنی میں ہے

"النہایہ" میں لکھا ہے:"فض الخاتم " (مہر توڑنا)وطی سے کنایہ ہے۔ جاء بنطفة فی أداوة فافتضها أی صبها (بہانا)(ایک شخص تھوڑا سا پانی ایک ڈول میں لے کر آیا اور اس کو بہا دیا)اور قاف کے فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے"اقتصاص

البکر“ سے ماخوذ ہے (جس کا معنی ہے بکارت زائل کرنا)۔

اقرارِ زنا کرنے والے سے تحقیق کا بیان

۳۵۸۱: وَعَنْ يَزِيْدَ بْنَ نَعَيْمِ بْنِ هَزَّالٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ : كَانَ مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ يَتِيْمًا فِي حِجْرِ اَبِيْ، فَاَصَابَ جَارِيَةً مِنَ الْحَيِّ، فَقَالَ لَهُ اَبِيْ : اِئْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَاَخْبِرْهُ بِمَا صَنَعْتَ لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُلَكَ، وَاِنَّمَا يُرِيْدُ بِذٰلِكَ رَجَاءَ اَنْ يَكُوْنَ لَهُ مَخْرَجًا فَاَتَاهُ، فَقَالَ :يَا رَسُوْلَ اللّٰه! اِنِّي زَنَيْتُ، فَاَقِمْ عَلَيَّ كِتَابَ اللّٰهِ، فَاَعْرَضَ عَنْهُ، فَعَادَ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّي زَنَيْتُ، فَاَقِمْ عَلَيَّ كِتَابَ اللّٰهِ حَتّٰى قَالَ اَرْبَعَ مَرَّاتٍ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّكَ قَدْ قُلْتَهَا اَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَبِمَنْ؟ قَالَ : بِفُلَانَةٍ قَالَ هَلْ ضَاجَعْتَهَا؟ قَالَ : نَعَمْ، قَالَ : هَلْ بَاشَرْتَهَا؟ قَالَ نَعَمْ، قَالَ : هَلْ جَامَعْتَهَا؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ : فَاَمَرَبِهِ اَنْ يُرْجَمَ، فَاُخْرِجَ بِهِ اِلَى الْحَرَّةِ، فَلَمَّا رُجِمَ فَوَجَدَ مَسَّ الْحِجَارَةِ، فَجَزَعَ فَخَرَجَ، يَشْتَدُّ، فَلَقِيَهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اُنَيْسٍ وَقَدْ عَجَزَ اَصْحَابُهُ، فَنَزَعَ لَهُ بِوَظِيْفِ بَعِيْرٍ فَرَمَاهُ بِهِ، فَقَتَلَهُ، ثُمَّ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ: هَلَّا تَرَكْتُمُوْهُ لَعَلَّهُ اَنْ يَتُوْبَ فَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ . (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد في السنن ٤ / ٥٧٣، الحديث رقم : ٤٤١٩

ترجمہ: ”اور حضرت یزید بن نعیم بن ہزال اپنے والد (حضرت نعیم بن ہزال) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یعنی حضرت نعیم نے کہا کہ ماعز بن مالک یتیم تھے اور میرے والد (حضرت ہزال) کی پرورش میں تھے انہوں نے (جوان ہو کر) محلّہ کی ایک لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا۔ میرے والد (یا ہزال) نے ان سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو اور جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے بارے میں آپ ﷺ کو اطلاع دو۔ شاید آپ ﷺ تمہارے مغفرت کی دعا کر دیں اور ان کے (یعنی میرے والد کے) اس کہنے کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں تھا کہ استغفار گناہ سے ان کی نجات کا سبب بن جائے (یعنی میرے والد کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ آپ ﷺ کے پاس جائیں اور آپ ﷺ ان کو سنگسار کیے جانے کا حکم دیں جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے)۔ ماعز رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے آپ مجھ پر کتاب اللہ (کا حکم) جاری کیجئے۔ آپ ﷺ نے (اس کی یہ بات سن کر) اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیا (وہ وہاں سے ہٹ گئے) اور دوبارہ آئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے آپ مجھ پر کتاب اللہ کا حکم جاری کیجئے' یہاں تک کہ انہوں نے یہ بات چار بار (یعنی چار مجلسوں میں) کہی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تو نے یہ بات چار بار کہی ہے (یعنی چار بار قرار کرنے سے تمہارا جرم زنا ثابت ہو گیا ہے) اب یہ بتا کہ تو نے کس کے ساتھ

زنا کیا؟ یہ اس نے (نام لے کر) کہا کہ فلاں عورت کے ساتھ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو اس کے ساتھ ہمخواب یعنی ہم آغوش ہوا تھا؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو نے اس کے جسم کو اپنے جسم سے لپٹایا تھا؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو اس نے اس کے ساتھ جماع کیا تھا؟ اس نے کہا ہاں! اس کے بعد ان کو سنگسار کرنے کا حکم دیدیا گیا۔ چنانچہ ان کو حرہ لے جایا گیا اور جب وہاں سنگسار کیا جانے لگا اور انہیں پتھروں کی چوٹ لگنے لگی تو وہ بدحواس ہو گئے (یعنی وہ پتھروں کی چوٹ برداشت نہ کر سکے اور جہاں سنگسار کیا جا رہا تھا) وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ راستہ میں ان کو عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ ملے جبکہ ان کے ساتھی ان سے (یعنی ان کو پکڑنے سے) عاجز آ گئے تھے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اونٹ کی پنڈلی کی ہڈی ان کو ماری اور کو قتل کر دیا اور اس کے بعد وہ (یعنی عبداللہ رضی اللہ عنہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ان کو چھوڑ کیوں نہیں دیا' شاید کہ وہ توبہ کر لیتے اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ (سنگساری کئے بغیر ہی) قبول فرمالیتا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: حجر: حاء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔

ائت: ''اتیان'' سے امر کا صیغہ ہے۔

انما: ایک نسخہ میں ''وانما'' ہے۔

یرید: ایک نسخہ میں ''ھو یرید'' ہے

بذلك: کا مشار الیہ ''اتیان واخبار'' ہے۔

یکون له مخرجا: امام طیبیؒ فرماتے ہیں، کان کا اسم ضمیر مستتر ہے جو مذکور کی طرف لوٹ رہی ہے اور خبر ''مخرجا'' ہے اور ''له'' ظرف لغو ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں: ﴿ولم یکن له کفوا أحد﴾ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہوگی: **یکون اتیانك واخبارك رسول اللّٰه ﷺ مخرجا لك** ۔ اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا آنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری صورتحال سے آگاہ کرنا تمہارے لئے راستہ نکالے گا۔ ''**فاقم علی کتاب اللّٰه**'' یہاں:

فیمن: فعل محذوف ہے اور فاء جزائیہ ہے شرط محذوف ہے۔ **أی اذا کان کما قلت فبمن زنیت** ۔

انك فلتها أربع مرات: یہ جملہ بالکل صریح دلیل ہے کہ چار مرتبہ کا اقرار معتبر ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی حد درجہ ستر پوشی کرنے والا ہے۔

بفلانة: تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے۔ **باشرتها**: اس کے لغوی معنی ہیں جلد کا جلد سے مل جانا اور کبھی جماع سے کنایہ ہوتا ہے۔ مثلاً جیسے اس آیت میں: ﴿ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ [البقرة:۱۸۷]

فأمر به فرجم: ضمیر مجرور سے بدل الاشتمال ہے۔

فأخرج به: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: متعدی ہونے کے باوجود بار کے ذریعہ متعدی کرنا، تاکید کیلئے ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے۔: ﴿تنبت بالدهن﴾ [المومنون:۲۰] **(قاله الحزیری فی درة الغواص)**

يشتد: جملہ حالیہ ہے۔

" قد عجز أصحابه: یہ جملہ بھی حالیہ ہے۔''أصحابه'' کی ضمیر میں دو احتمال ہیں: ① عبداللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔② اس کا مرجع ''ماغز'' ہے۔

وظيف بعير: قاموس میں لکھتے ہیں: مستدق الزراع والساق من الخيل والا بل وغيرهما۔ اور ''المغرب'' میں لکھا ہے: وظيف البعير مافوق الرسغ من الساق ۔اونٹ کے کھر کی ہڈی۔اونٹ یا گھوڑوں وغیرہ کی پنڈلی یا ہاتھ کا پتلا حصہ۔قوله: فقال هلاتر كتموه لعله ان يتوب۔

فيتوب الله عليه:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:''فلما رجم'' کے بعد''فقتله'' تک کی ہر فاء کے بارے میں عطف کا احتمال ہے ①(اور عطف میں دو احتمال ہیں) شرط پر عطف ہے ② جزاء پر عطف ہے۔

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ لغت فصحیٰ کی رو سے جواب لما پر فاء داخل نہیں ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جزاء مقدر ہو۔ اور تقدیری عبارت یوں ہو: لما رجم فكان كيت فكيت علمنا حكم الرجم وما ترتب عليه۔اس تقدیر پر تمام فاؤں میں عطف علی الشرط کے علاوہ کوئی دوسرا احتمال نہیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس روایت کو عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں ذکر کیا ہے مصنف کی روایت میں یوں ہے: فأمر برجم فرجم فلم يقتل حتى رماه عمر بن الخطاب بلحى بعير فاصاب راسه فقتله۔

مضاف محذوف ہے۔اى حكم كتاب الله۔

إنك قد قلتها أربع مرات فبمن : یہاں فعل محذوف ہے۔أى فبمن زنيت ۔یہ صریح دلیل ہے کہ اقرار زنا میں عدد مذکور کا اعتبار ہے۔اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر کمال پردہ پوشی کرتا ہے۔امام طیبی فرماتے ہیں''فبمن'' کی فاء جزاء ہے۔شرط محذوف ہے۔أى اذا كان كما قلت :فبمن زنيت قال :بفلانة تاء کے فتحہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے۔

هل باشر تها:''مباشرة'' ''بشرة'' مجامعت سے کنایہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فالآن باشروهن﴾

فأمر به أم يرجم :بہ کی ضمیر مجرور سے بدل اشتمال ہے

''فأخرج به'' بصیغہ مجہول ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں''أخرج'' کو باء کے ساتھ متعدی کرنا تاکید کی غرض سے ہے۔جیسا کہ ارشاد باری میں ہے:﴿تَنۡبُتُ بِالدُّهۡنِ﴾[المومنون۲۰] (قاله الحويرى فى درة الغواص) کہا گیا ہے کہ تاء کے ضمہ کی قراءت میں دو حروف تعدیہ کو جمع کرنے کے جواز میں کئی اقوال ہیں۔

زنا اور رشوت کی نحوست کا بیان

۳۵۸۲:وَعَنۡ عَمۡرِوبۡنِ الۡعَاصِ قَالَ سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ يَقُوۡلُ مَا مِنۡ قَوۡمٍ

يَظْهَرُ فِيهِمُ الزِّنَا اِلَّا اُخِذُوْا بِالسَّنَةِ وَمَا مِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيهِمُ الرُّشَا اِلَّا اُخِذُوْا بِالرُّعْبِ . (رواه احمد)

أخرجه احمد فى المسند ٤ / ٢٠٥۔

ترجمه: ''اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس قوم میں زنا کی کثرت ہو جاتی ہے وہ قوم قحط سالی کا شکار ہو جاتی ہے اور جس قوم میں رشوت کی وبا عام ہو جاتی ہے اس پر رعب (وخوف) مسلط کر دیا جاتا ہے۔'' (احمد)

تشریح: قوله: مامن قوم يظهر فيهم الزنا الاأخذوا بالسنة:

السنة : سین اور نون دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: ''سنة '' کے معنی ہیں جدب۔ کہا جاتا ہے:

أخذ تهم السنة اذا أجدبوا او أقحطوا۔

لفظ ''السنة'' اسمائے غالبہ میں سے ہے، جیسا کہ ''دابة'' کا اطلاق ''فرس'' پر، اور ''مال'' کا اطلاق ''ابل'' پر۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: زنا کی وجہ سے قحط مسلط ہونے کی حکمت شاید یہ ہے کہ زنا مفضی الی ابطال النسل ہے اور قحط سالی، اہلاک الحرث کو لازم ہے اور اصل فساد ہی یہی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ [البقرة: ٢٠٥]

قوله: ومامن قوم يظهر فيهم الرشا:

الرشا: راء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ' یہ ''رشوة'' کی جمع ہے۔ قاموس میں لکھا ہے: ''الرشوة'' میں تینوں حرکات درست ہیں اس کا معنی ہے ''الجعل'' اور ''النہایہ'' میں ہے کہ ''رشا'' وہ چیز ہے جس کے ساتھ مرارات کے ذریعہ حاجت تک پہنچ ہو اور ''راشی'' اس شخص کو کہتے ہیں جو اس شخص کو عطا کرتا ہے جس نے اس کی باطل میں مدد کی ہو' اور ''مرتشی'' لینے والے کہتے ہیں' اور ''راش'' اس شخص کو کہتے ہیں جو ان دونوں کے درمیان معنی کرتا ہے اس سے زیادہ طلب کرتا ہے اور اس سے کم کراتا ہے۔ اھ۔ یہ ''الرشاء'' سے ماخوذ ہے ''رشاء'' ڈول کی رسّی کو کہتے ہیں' چونکہ اس کے ذریعہ مقصود تک پہنچا جاتا ہے جس طرح ڈول کی رسّی سے پانی تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

الرعب: پہلے ضمہ اور پھر سکون ہے' نیز دونوں پر ضمہ بھی درست ہے' اس کا معنی ہے خوف۔ چونکہ حاکم اپنا حکم ذلیل وشریف پر اسی وقت جاری کر سکتا ہے جب وہ رشوت سے بچتا ہو جب وہ رشوت سے لتھڑ جاتا ہے تو خوفزدہ ومرغوب ہو جاتا ہے۔

۳۵۸۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَلْعُوْنٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ۔

رواه رزين

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط کا عمل (سدومیت) کرے۔ (رزین)

تشریح: الجامع الصغیر میں ہے کہ اس روایت کو امام احمد نے سند حسن کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں نقل کیا ہے:

ملعون من سب أباه، ملعون من سب أمه، ملعون من ذبح لغير الله ، ملعون من غير تخوم الأرض ، ملعون

من كمه أعمى طريق، ملعون من وقع على بهيمة،ملعون من عمل بعمل قوم لوط ۔

''ملعون ہے وہ شخص جو اپنے باپ کو برا بھلا کہے'ملعون ہے وہ شخص جو اپنی ماں کو برا بھلا کہے'ملعون ہے وہ شخص جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے ملعون ہے وہ شخص جو زمینوں کے درمیان حد فاصل کو بدلے۔ملعون ہے وہ شخص جو بینا کو اندھا کہہ کر پکارے۔ملعون ہے وہ شخص جو قومِ لوط کا عمل کرے۔

عرضِ مرتب:

صاحب ''لغات الحدیث'' نے ''من كمه أعمى طريق'' کے تین مطلب بیان کئے ہیں:

① جس شخص نے نابینا کو اندھا کہہ کے پکارا (اس کا عیب کرنے کو) وہ ملعون ہے۔
② جس شخص نے اندھے کو بہکا دیا راہ پر نہ لگایا (وہ ملعون ہے۔)
③ جاہل کو سیدھا راستہ نہ بتلایا بلکہ گمراہ کر دیا غلط بات بتا کر (وہ ملعون ہے۔)

۳۵۸۴:وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ عَلِیًّا اَحْرَقَهُمَا وَاَبُوْبَكْرٍ هَدَمَ عَلَيْهِمَا حَائِطًا ۔

رواه رزين

ترجمہ: اور رزین ہی کی ایک اور روایت میں (صرف) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (بطور سزا) ان دونوں (یعنی فاعل اور مفعول) کو چلا دیا تھا (یعنی جلانے کا حکم دیا تھا) اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں پر دیوار گرا دی تھی (یعنی دیوار گرانے کا حکم دیا تھا''۔

بدفعلی کی اخروی سزا کا بیان

۳۵۸۵:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى رَجُلٍ اَتٰى رَجُلًا اَوِ امْرَاَةً فِیْ دُبُرِهَا۔ (رواه الترمذی وقال : هذا حديث حسن غريب)

والترمذی فی السنن ۳ / ٤٦٩ الحديث رقم ۱۱٦٥ وأحمد فی المسند ۲ / ۳٤٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ عزوجل اس شخص کی طرف (رحمت کی نظر سے) نہیں دیکھتا جو کسی مرد یا عورت کے ساتھ بدفعلی کرے''۔(ترمذی)

اسنادی حیثیت: کو امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قوله: لاينظر الله عزوجل الى رجل...... :نظر نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر نظر رحمت و رعایت نہیں فرماتے۔

جانور سے بدفعلی کی سزا

۳۵۸٦:وَعَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ: مَنْ اَتٰى بَهِيْمَةً فَلَا حَدَّ عَلَيْهِ (رواه التر مذی وابوداود وقال الترمذی عن

سفیان الثوری انه قال وهذا اصح من الحدیث الاول) وَهُوَمَنْ اَتٰی بَهِيمَةً فَاقْتُلُوْهُ وَالْعَمَلُ عَلٰى هٰذَا عِنْدَ اَهْلَ الْعِلْمِ .

أخرجه ابو داؤد فی السنن ٤ / ٦١٠، الحدیث رقم: ٤٤٦٥، والترمذی ٤ / ٤٦، الحدیث رقم: ١٤٥٥۔

ترجمه: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت منقول ہے کہ انہوں نے (بطریق مرفوع) کہا کہ جو شخص کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کرے وہ حد کا سزاوار نہیں (لیکن قابل تعزیر ہے) اس روایت کو ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ نیز ترمذیؒ سفیان ثوری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی سفیان نے) کہا کہ یہ (حدیث) ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس پہلی حدیث سے زیادہ صحیح ہے (جو دوسری فصل میں ان سے نقل کی گئی ہے) اور وہ پہلی حدیث یہ ہے کہ جو شخص کسی جانور سے بدفعلی کا ارتکاب کرے اس کو قتل کردو۔ چنانچہ اہل علم کے ہاں اسی پر عمل ہے (جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے والا حد کا سزاوار نہیں ہوتا البتہ بطور تعزیر اس کو کوئی سزا دی جاسکتی ہے)۔''

تشریح: حاصل کلام یہ ہے کہ یہ حدیث معنوی اعتبار سے پہلی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ چونکہ ماقبل میں گزر چکا ہے کہ اس حیثیت ترمذی ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ اسناد کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ اور ممکن ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ یہ موقوف اس مرفوع سے زیادہ صحیح ہے واللہ تعالیٰ اعلم

۳۵۸۷: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقِيْمُوْا حُدُوْدَ اللّٰهِ فِي الْقَرِيْبِ وَالْبَعِيْدِ، وَلَا تَأْخُذُكُمْ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ . (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ٢ / ٨٤٩، الحدیث رقم: ٢٥٤٠، وأحمد فی المسند ٥ / ٣٣٠۔

ترجمه: ''اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قریب و بعید (نسب کے لحاظ سے یا قوت کے لحاظ سے) سب پر اللہ کی حدود جاری کرو اور (خبردار) اللہ کا حکم (یعنی حد جاری کرنے) میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت تمہارے آڑے نہ آئے''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله: اقامة حد من حدود الله خير ......: امام طیبیؒ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حد جاری کرنا گویا مخلوق خدا کو معاصی کے ارتکاب سے روکنا ہے، چنانچہ جب ارتکاب معاصی سے روکا جائے گا تو آسمان کے دروازے کھل جائیں گے اور حدود جاری نہ کرنا یا ان کے جاری کرنے میں سستی کا مظاہرہ کرنا گویا مخلوق کو معاصی منہمک کرنے کے مواقع فراہم کرنا ہے،

اور معاصی وہ چیز ہیں کہ جس کے سبب قحط سالی واقع ہوتی ہے، قحط سالی سے اللہ کی مخلوق اپنی جان تک سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ ایک روایت میں ہے: ان الحباری لتموت هزلا بذنب بنی آدم کہ سرخاب بنی آدم کے گناہوں کے سبب دبلا ہو کر مر جاتا ہے مراد یہ ہے کہ معاصی کی نحوست کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بارش نہیں برساتا حباری کا ذکر یہاں خصوصی طور پر اس لئے کیا کہ حباری گھاس اور بارش کے مقامات کی تلاش میں بہت دور تک نکل جاتا ہے۔ کبھی اس کو ذبح بصرہ میں کیا جاتا ہے اور اسکے پوٹے میں سرسبز دانے موجود ہوتے ہیں۔ حالانکہ بصرہ اور اس کے کھیتوں میں کئی دن کی مسافت ہے اور رات کا ذکر ''خصب''

(زرخیزی) کے معنی کی تتمیم کے طور پر ہے۔

اجراءِ حد کی برکت کا بیان

۳۵۸۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِقَامَةُ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ مَّطَرِ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً فِيْ بِلَادِ اللّٰهِ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۲ / ۸٤۸ ' الحدیث رقم : ۲۵۳۷

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی حدود میں سے کسی ایک حد کا جاری کرنا اللہ کے تمام شہروں پر چالیس رات تک بارش برسنے سے بہتر ہے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: **ولا تاخذ کم**: مرقاۃ کے متن میں مذکر کے صیغہ کے ساتھ یأخذ کم ہے، حالت اعرابی کے اعتبار سے دوطرح پڑھا گیا ہے۔ ① مجزوم اس کا عطف ''أقیموا'' پر ہے چنانچہ یہ نہی پچھلے امر کی تاکید ہوگی۔

② مرفوع: اس صورت میں یہ ''خبر'' بمعنی ''نہی'' ہوگی

فی القریب والبعید: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ① القریب والبعید فی النسب ② القریب والبعید فی القوۃ والضعف عرض مرتب: ان دونوں احتمال کی فصاحت حسب ذیل ہے پہلے احتمال کی وضاحت۔

اگر مجرم تمہارا رشتہ دار ہو، خواہ قریبی رشتہ دار ہو، خواہ دور پار کا رشتہ دار ہو، اس پر حد جاری کرو، اجراء حد میں رشتہ داری آڑ نہ بننے پائے۔ دوسرے مطلب کی وضاحت: بعید سے مراد وہ شخص ہے جو تمہاری پہنچ سے دور ہے۔ مثلاً وہ مالدار ہے، یا طاقتور ہے، وغیرہ وغیرہ) اور ''قریب'' سے مراد وہ شخص جو تمہاری پہنچ میں ہے پہنچ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس تک پہنچنا اور حد جاری کرنا آسان ہے مثلاً وہ شخص کمزور ہے، یا غریب ہے۔ اھ۔

۳۵۸۹: وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

اخرجه النسائی فی السنن ۸ / ۸٦ ' الحدیث رقم : ٤٩٠٥

ترجمہ: ''نسائی نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے''۔

بَابُ قَطْعِ السَّرِقَةِ

چور کے ہاتھ کاٹنے کا بیان

امام طیبیؒ نے کہا ہے کہ ''قطع السرقہ'' میں مصدر اضافت مفعول ہے اور مضاف محذوف ہے۔ معنوی تقدیر یوں ہے: باب قطع أهل السرقة۔ اھ۔

''سرقة'' سین کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ بمعنی چوری' اور دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہو تو ''سارق'' کی جمع ہے۔

صاحب ''المغرب '' لکھتے ہیں:سرق منه مالا، وسرقه مالا سرقا وسرقة (حلیہ سے خفیہ طور پر مال لینا'' سرقه'' میں ایک لغت راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔البتہ راء کے سکون کے ساتھ ہم نے نہیں سنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ'' سرق ''از باب ضرب، بواسطہ'' من'' اور براہ راست ہر دو طرح متعدی ہوتا ہے۔ بواسطہ'' من'' متعدی ہوتو اس کا مصدر'' سرقا'' آتا ہے،اور براہ راست متعدی ہوتو اس کا مصدر'' سرقا و سرقة '' آتا ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:'' سرقه'' کے لغوی معنی ہیں:أخذ الشئ من الغير على وجه الخفية،'' کسی دوسرے کا مال خفیہ طور پر لے لینا''،استراق السمع بھی اسی سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں چوری چھپے سے سننا۔

'' سرقہ'' کی اس لغوی تعریف پر چند قیود کا اضافہ کرنے سے چوری کی اصطلاحی تعریف مکمل ہو جاتی ہے۔ بایں طور کہ ان میں سے کسی بھی شرط کے نہ پائے جانے کی صورت میں قطع ید نہ ہوگا۔ یہ شرائط درحقیقت اس حکم شرعی کے ثبوت کیلئے ہیں۔پس اگر اس کی تعریف یوں کی جائے:السرقه في الشريعة الأخذ خفية مع كذا و كذا۔ تو یہ تعریف مستحسن نہیں ہے۔ بلکہ وہ '' سرقہ'' کہ جس پر شریعت نے قطع ید کی سزا کو معلق کیا ہے وہ یہ ہے کہ سرقہ یہ ہے کہ کوئی عاقل کسی کا محفوظ کیا ہوا دس درہم یا اس کی مقدار کے مساوی ایسا مال جو شبہ سے پاک ہو،محفوظ و محترم ہو خراب ہونے والا نہ ہو۔اور شبہ میں عموم ہے چنانچہ اگر کوئی چور دوسرے چور سے مال چرالے، یا میاں بیوی ایک دوسرے کا مال چرالیں یا ذی رحم رشتہ دار ایک دوسرے کا مال چرالیں تو قطع ید نہ ہوگا۔

وجوب قطع کی اصل دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ﴾ [المائدة۔۳۸]

''اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے سو ان دونوں کے (داہنے) ہاتھ (گٹے پر سے) کاٹ ڈالو''

نصابِ سرقہ:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ حکم تو اتفاقی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے البتہ کم سے کم مالیت کی وہ مقدار کیا ہے جس کو چوری کرنے سے قطع ید کی سزا لازم ہوتی ہے۔اس بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک نصاب سرقہ ربع دینار ہے یا تین درہم یا اس کی قیمت کی کوئی بھی چیز۔حضرت عائشہ،عمر بن عبدالعزیز،اوزاعی،لیث ،ابوثور اور اسحاق وغیرہ کا قول بھی یہی ہے۔

امام مالکؒ احمد اور اسحاق کی ایک روایت یہ ہے کہ ربع دینار یا تین دراہم یا ان دونوں میں سے کسی کی قیمت کے مساوی چیز چرانے پر ہوگا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک نصاب سرقہ دس درہم یا ایک دینار ہے۔اس سے کم مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔اور صحیح بات وہی ہے جو امام شافعیؒ نے فرمائی۔

نصابِ سرقہ کے اختلاف کی بنیاد

واضح رہے کہ فقہاء کے اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ایک ڈھال کی چوری پر دی گئی تھی۔اس زمانے میں ڈھال کی قیمت کیا تھی؟اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔

۱۔ لا قطع الا فی ربع دینار فصاعدا۔

امام حاکم نے مستدرک میں عن مجاهد، عن اَیمن نقل کیا ہے: قال: لم تقطع الید علی عهد رسول اللّٰه ﷺ الا فی لمن المجن و تمنه یو نئذ دینار۔ اس روایت پرامام احاکم نے سکوت کیا ہے

امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے محمد بن حسن سے فرمایا: هذه سنة رسول اللّٰه أن یقطع فی ربع دینار فصاعدا ' تو تم نے کیسے کہا: لاتقطع الیدالافی عشرة دراهم فصاعدا؟ تو آپؒ نے فرمایا شریك نے مجاهد عن أیمن ابن أم أیمن أخی أسامة بن زید لأمه۔ امام شافعیؒ نے یہ سن کر فرمایا۔ ایمن تو جنگ حنین میں مجاہد کی ولادت سے پہلے ہی شہید ہو گئے تھے۔

ابن اَبی حاتم مراسیل میں فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا: الحسن بن صالح، عن منصور، عن الحکم، عن عطاء و مجاهد عن أیمن و کان فقیها قال: تقطع یدالسارق فی ثمن المجن، و کان ثمن المجن علی عهد رسول اللّٰه ﷺ دینارا۔ میرے والد نے فرمایا: یہ مرسل ہے۔ اور میرا گمان ہے کہ یہ عبدالواحد بن ایمن کے والد ہیں، یہ صحابی نہیں ہیں۔ اس قدر بات سے اتنا تو معلوم ہو ہی گیا کہ اَیمن صحابی کا نام ہے اور وہ ابن اُم اَیمن ہیں اور یہ جنگ حنین میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ہمراہ تھے، اس جنگ میں یہ شہید ہوئے تابعی کا نام کچھ اور ہے۔

ابو الحجاج المزنی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: أیمن الجشی، مولی بنی مخزوم، روی عن سعد وعائشة، جابر، وعنه ابنه عبدالواحد، وثقه أبو زرعة، ثم قال: أیمن مولی ابن الزبیر، وقیل: مولی ابن أبی عمر، عن النبی ﷺ فی السرقة الی أن قال: وعنه عطاء ومجاهد۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں: میرا گمان نہیں ہے کہ یہ صحابی ہیں، انہوں نے اس نام کے متعدد تابعین گنوائے ہیں۔ ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے ان دونوں کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے۔ ابن ابی حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: أیمن مولی ابن ابی سمعت أبی یقول ذلك۔ ابوزرعہ سے عبدالواحد کے والد ایمن کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے: یہ مکی ہیں ثقہ ہیں۔

ابن حبان ''الثقات'' میں فرماتے ہیں: أیمن بن عبید الجشی مولی لابن عمر المخزومی، من أهل مکة، وروی عن عائشة، وروی عنه مجاهد وعطاء وابنه عبد الواحد بن أیمن، وکان أخا أسامة بن زید لأمه، وهو الذی یقال له: أیمن بن أم أیمن مولاة النبی ﷺ قال: ومن زعم أن له صحبة وهم، حدیثه فی القطع مرسل۔

یہ تصریح امام شافعیؒ اور ان دیگر حضرات کی تصریحات کے خلاف ہے جنہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ ایمن بن ام ایمن کو جس کے دن قتل کر دیا گیا تھا اور یہ کہ یہ صحابی ہیں۔

اسی جیسی بات دار قطنیؒ نے اپنی سنن میں ذکر کی ہے: أیمن لا صحبة له، وهو من التابعین، ولم یدرك زمان النبی ﷺ، ولا الخلفاء بعده، وهو الذی یروی أن ثمن المجن دینار، وروی عنه ابنه عبدالواحد وعطاء ومجاهد۔

حاصل یہ ہے کہ "قیمة المجن" والی حدیث کے راوی ایمن کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ صحابی تھے؟ یا ثقہ تابعی تھے۔ اگر تو وہ صحابی ہیں پھر تو اشکال والی کوئی بات ہی نہیں اور اگر وہ ثقہ تابعی ہیں، جیسا کہ ابوزرعہ جیسے عظیم الشان امام اور ابن حبان کا کہنا ہے تو ان کی یہ حدیث مرسل ہے، اور ارسال نہ ہمارے ہاں، اور نہ جمہور علماء کے نزدیک قادح ہے، نا صرف قادح نہیں بلکہ حجت ہے۔ لہٰذا اس کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ رہ گیا اختلاف "مجن" کی قیمت کا کہ وہ تین درہم تھی یا دس درہم؟ تو اکثر قیمت کا اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ ادرؤ الحدود ہے۔

حنفیہ کے مستدل کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو امام نسائی نے اپنی سند کے ساتھ عن ابی اسحاق، عن عمرو بن شعیب، عن ابیہ، عن جدہ، ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

قال: كان ثمن المجن على عهد رسول الله ﷺ عشرة درهم۔

اس حدیث کو دارقطنی نے بھی روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو دارقطنی نے، اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں **عن الحجاج بن أرطاة، عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده** کے طریق سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح اسحاق بن راہویہ نے، اور ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف کی کتاب اللقطہ میں **عن سعيد بن المسيب، عن رجل من مزينة، عن النبي ﷺ** روایت کی ہے: **قال: ما بلغ ثمن المجن وقطعت يدصاحبه، وكان ثمن المجن عشرة دراهم۔**

مصنفؒ یعنی صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: **لا قطع الا في دينار اوعشرة دراهم** اور یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ ابن مسعود سے موقوفاً ہے حالانکہ یہ ان سے مرسلاً ہے۔ اس کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے، اور ایک طریق سے طبرانی نے اپنی معجم میں روایت کی ہے۔ امام ترمذیؒ اپنی جامع میں اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **وقد روى عن ابن مسعود أنه قال: لا قطع الا في دينار أوعشرة دراهم، وهو مرسل، رواه القاسم بن عبدالرحمن، عن ابن مسعود، والقاسم بن عبدالرحمن لم يسمع من ابن مسعود اھ۔**

اور یہ بالکل درست ہے، کیونکہ یہ قاسم ہی سے مروی ہے، لیکن مسند ابی حنیفہ میں **عن مقاتل عن أبي حنيفة، عن القاسم بن عبدالرحمن، عن أبيه، عن عبدالله بن مسعود قال: كان تقطع اليد على عهد رسول الله ﷺ في عشرة دراهم**، یہ روایت موصولاً بھی ہے اور مرفوعاً بھی ہے، اگر یہ موقوف ہے تو مرفوع کے حکم میں ہے چونکہ مقدرات شرعیہ میں عقل وارائے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پس اس مسئلہ میں موقوف روایت بھی مرفوع پر محمول ہے۔

الفصل الاول:

چوتھائی دینار کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا بیان

۳۵۹۰: عَنْ عَآئِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُقْطَعُ يَدُ السَّارِقِ اِلَّا بِرُبُعِ دِيْنَارٍ فَصَاعِدًا۔

(متفق عليه)

أخرجه ابوداؤد في السنن ١٢ / ٩٦، الحديث رقم: ٦٧٨٩، و مسلم في صحيحه ٣ / ١٣١٢، الحديث رقم:

(۲۔۱٦۸٤) و أبو داود فی السنن ٤ / ٥٤٥‘ الحدیث رقم : ٤۳۸۳‘ والترمذی فی ٤ / ٤٠‘ الحدیث رقم : ١٤٤٥‘ والنسائی فی ۸ / ۷۹‘ الحدیث رقم : ٤٩۲۸‘ وابن ماجه فی ۲ / ۸٦۲‘ الحدیث رقم : ۲٥۸٥‘ وأحمد فی المسند ٦ / ١٠٤

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی مالیت کی چوری کی صورت میں چور کا ہاتھ کاٹا جائے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: **لاتقطع ید السارق** ......:

لاتقطع: صیغۂ مؤنث کے ساتھ مرفوع ہے۔ اور ایک نسخہ میں صیغۂ مذکر کے ساتھ مجزوم مروی ہے۔

السارق: مراد جنس ہے، لہٰذا یہ حکم سارقہ کو بھی شامل ہے، یا یہ کہ سارقہ کا حکم نص قرآنی اور قیاس سے ثابت ہے اور ''ید'' سے مراد دایاں ہاتھ ہے اس کی دلیل ابن مسعود کی یہ قراءت ہے: **فاقطعوا ایمانهما** اور ہاتھ پہنچے تک کاٹا جائے گا جیسا کہ اس تحقیق عنقریب آئے گی۔

الا بربع دینار: ایک روایت میں ''**فی ربع دینار**'' ہے۔ **أی بسببه أولأجله فصاعدا: أی فما فوقه من الزیادة۔**

یہ حدیث امام شافعیؒ کا مستدل ہے کہ ربع دینا سے کم میں قطع ید نہیں ہوگا، اور اس وقت ربع دینار تین دراہم کا ہوتا تھا۔ یہ روایت ابن مسعود کی اس حدیث سے معارض ہے: **لا یقطع الا فی دینا** (یہ حدیث موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح مروی ہے۔)

تین درہم کی چیز پر ہاتھ کاٹنے کا بیان

۳٥٩١: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَطَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَ سَارِقٍ وَفِي مِجَنٍّ ثَمَنُهُ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ۔

(متفق علیه)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ١۲ / ٩۷‘ الحدیث رقم : ۷۸٩۷‘ و مسلم فی ۳ / ١۳١۲‘ الحدیث رقم : (٦ ـ ١٦۸٦) أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٤۷‘ الحدیث رقم : ٤۳۸٥‘ والترمذی فی ٤ / ٤٠‘ الحدیث رقم : ١٤٠٤٦‘ وابن ماجه فی ۲ / ۸٦۲‘ الحدیث رقم : ۲٥۸٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین درہم کی مالیت کی ایک ڈھال چرانے پر چور کا داہنا ہاتھ کٹوا دیا تھا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: **قطع النبی** صلی اللہ علیہ وسلم ......:

مجن: میم کے کسرہ، جیم کے فتحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ ''جن'' بمعنی ''ستر'' سے ماخوذ ہے۔ ڈھال کو ''ترس'' بھی کہتے ہیں ''**درقة**'' اس ڈھال کو کہتے ہیں جو چمڑے کی ہو، جس میں نہ لکڑی ہو اور نہ پشتہ ہو۔

شمنیؒ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ یہ کی یہ حدیث عبداللہ بن عمرو بن عاص کے روایت کے معارض ہے جس کو ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے: **کان ثمن المجن عشرة دراهم۔**

حقیر چیز کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا بیان

۳۵۹۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَعَنَ اللّٰهُ السَّارِقَ یَسْرِقُ الْبَیْضَةَ فَتُقْطَعُ یَدُهٗ، وَیَسْرِقُ الْحَبْلَ فَتُقْطَعُ یَدُهٗ. (متفق علیه)

صحیح مسلم، ١٢ / ٩٧، الحدیث رقم: ٦٧٩٩، و مسلم فی ٣ / ١٣١٤، الحدیث رقم: (١٦٨٧/٧) والنسائی فی ٨ / ٦٥، الحدیث رقم: ٤٨٧٣ وابن ماجه فی ٢ / ٨٦٢، الحدیث رقم: ٢٥٨٣، وأحمد فی المسند ٢ / ٢٥٣

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے، انڈا چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور رسّی چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے''۔ (بخاری و مسلم)

قولہ: لعن اللّٰہ السارق یسرق البیضة فتقطع یدہ:

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بلاتعین گنہگاروں پر لعنت بھیجنا جائز ہے اور یہی بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ﴾[ہود:١٨]: ''سب سن لو کہ ایسے ظالموں پر خدا کی لعنت ہے'' سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ ہاں کسی شخص کو متعین کر کے یعنی اس کا نام لے کر اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ لعنت سے مراد اہانت وخذلان ہو، گویا کہ یوں فرمایا ہے: جب عمدہ ترین کو رسوا کن اور حقیر ترین چیز میں استعمال کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ورسوا کرے حتی کہ ہاتھ کات دیا جائے۔ تقطع بصیغۂ مذکر ومؤنث دونوں طرح درست ہے۔

عرض مرتب: نصاب سرقہ کے سلسلے میں یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ چوتھائی دینار یا تین درہم سے کم مالیت کی چوری پر قطع ید کی سزا جاری ہوسکتی ہے جب کہ چاروں ائمہ میں سے کسی کے بھی مسلک میں چوتھائی دینار یا تین درہم سے کم میں قطع ید کی سزا نہیں ہے اس اعتبار سے یہ حدیث تمام ائمہ کے مسلک کے خلاف ہے۔اھ۔

اس حدیث کے بارے میں مختلف جواب دیئے گئے ہیں:

① یہاں بیضہ سے ''بیضہ آہن''، یعنی ''خود'' مراد ہے اسی طرح رسّی سے کشتی کی رسّی مراد ہے (جو بڑی قیمتی ہوتی ہے)

② ابتدائے اسلام میں (انڈے اور رسّی کے چرانے پر) قطع ید کی سزا دی جاتی تھی مگر بعد میں اس کو منسوخ قرار دے دیا گیا۔

③ مراد یہ ہے کہ اس کو چوری کی عادت اسی طرح پڑتی ہے کہ چھوٹی اور کمتر چیزیں چراتے چراتے بڑی بڑی اور قیمتی چیزیں چرانے لگتا ہے جس کے نتیجے میں اس کو قطع ید کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

④ یہ حدیث تہدید پر محمول ہے۔

⑤ یہ روایت سیاست پر محمول ہے۔

⑥ ان دونوں چیزوں سے شئی حقیر مراد ہے، چونکہ نصاب سرقہ ان دونوں کو بھی شامل ہے۔

الفصل الثانی:

درخت پر لگے ہوئے پھل کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا بیان

۳۵۹۳: عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا قَطْعَ فِي ثَمَرٍ وَلَا كَثَرٍ۔

(رواه مالك والترمذی وابوداود والنسائی والدارمی وابن ماجة)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٤٩، الحديث رقم: ٣٤٨٨، والترمذی فی ٤ / ٤٢، الحديث رقم: ١٤٤٩، والنسائی فی ٨ / ٨٧، الحديث رقم: ٤٩٦٠، وابن ماجه فی ٢ / ٨٦٥، الحديث رقم: ٣٢ من كتاب الحدود وأحمد فی المسند ٢ / ٤٦٣۔

ترجمہ: ''حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: درخت پر لگے ہوئے پھل اور شگوفے کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے''۔

(مالک' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' داری' ابن ماجہ)

تشریح: **قوله: لاقطع فی خمر ولا کثیر ثمر:** تائ کے فتحہ کے ساتھ، ''ثمر'' کا اطلاق تمام پھلوں پر ہوتا ہے، اور اہل عرب کے ہاں اس کا اطلاق ''ثمر النخل'' یعنی (پکی ہوئی تازہ کھجور) پر ہوتا ہے جب تک کہ وہ درخت پر ہو۔ درخت سے توڑنے کے بعد بھی جب تک وہ تروتازہ رہے اس کو ''رطب'' ہی کہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کو ''بُسر'' کہتے ہیں۔ ناپختہ کھجور ،گدر کھجور کو ''بسر'' کہتے ہیں اور خشک کھجور اور چھوہارا کو لمر کہتے ہیں۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: **الثمر: الرطب مادام علی رأس النخلة، فاذا قطع فهو الرطب، فاذا كنز بالكاف والنون والزای فهو التمر۔**

کثر: کاف اور ثائے مثلثہ کے فتحہ کے ساتھ

جمار النخل: ''جمار'': جیم کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ۔ درخت خرما کا گوند جو چربی کی طرح (سفید) ہوتا اور کھایا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد کھجور کا شگوفہ ہے یہ بھی کھایا جاتا ہے۔

اس حدیث کا ظاہر امام ابوحنیفہؒ (اور امام محمد) کا مستدل ہے وہ اس کی بنیاد پر فرماتے ہیں کہ تر میوہ چرانے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ خواہ وہ میوہ محرز ہو یا غیر محرز ہو۔ گوشت' دودھ' روٹی' اور ان چیزوں کو بھی قیاس کیا گیا ہے جو دیرپا نہ ہوں اور جلدی ہی خراب ومتغیر ہو جاتی ہوں کہ ان کی چوری میں بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ان چیزوں کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر فقہاء نے ان سب چیزوں کی چوری میں قطع ید کی سزا کو واجب کیا ہے چنانچہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا یہی قول ہے۔

امام شافعیؒ نے اس حدیث کو درخت پر لگے ہوئے غیر محفوظ پر محمول کیا ہے اور فرمایا: مدینہ کے اکثر نخلستانوں کی دیواریں

نہیں تھیں اور اس کی دلیل عمرو بن شعیب کی حدیث ہے جو دلیل ہے کہ محرز پھل کی چوری پر قطع ید ہوگا۔ اھ۔ اس پر کلام عنقریب آ رہا ہے۔

''ہدایہ'' میں ہے: **لا قطع فیما یوجد تا فھا مباحا فی دارالاسلام**۔ یعنی ایسی چیزوں پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جو بہت معمولی حقیر ہوں اور دارالسلام میں ہر شخص کیلئے مباح ہوں ابن ہمام فرماتے ہیں: یعنی جب یہ ایسی حرز سے چرائی جائیں جس میں شبہ نہ ہو نیز لے کر حرز میں شامل کر کے مملوک منانے کے بعد، اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ابن ابی شیبہ کی یہ روایت ہے:

قالت: لم یکن السارق یقطع علی عهد رسول اللّٰه ﷺ فی الشئ التافه۔ اور مسند (کی روایت) میں اتنا اضافہ ہے: **ولم یقطع فی أدنی من ثمن جحفة أو ترس**۔ اھ۔

پھل جب تک خشک کر کے کھلیاں وغیرہ میں جمع نہ کر لئے جائیں اس وقت تک ان کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اگر پھلوں کو توڑ کر خشک کرنے کے لئے کھیلان میں لا کر پھیلا دیا گیا، تو اس صورت میں بھی چوری کرنے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ حرز نہیں پائی گئی اور اگر اس دوران وہاں کوئی محافظ موجود تھا اس کی موجودگی میں چوری ہوئی ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ تر پھلوں پر۔

پرندہ کی چوری کا بیان

واضح رہے کہ ''**لا قطع فی الطیر**'' یہ روایت مرفوعاً ثابت نہیں ہے۔ اس روایت کو عبدالرزاق نے سنداً نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے مرغی چرائی تھی، انہوں نے اس چور کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا تو سلم بن عبدالرحمٰن نے کہا: **قال عثمان: لا قطع فی الطیر**۔ اس روایت کو جعفی نے عبداللہ بن یسار سے نقل کیا ہے۔

اسی روایت کو ابن ابی شیبہ نے عبدالرحمٰن بن مهدی عن زہیر بن محمد عن یزید بن حفصة نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے پرندہ چوری کیا تھا، اس سلسلہ میں سائب بن یزید سے استفتاء کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: **ما رأیت احدا قطع فی الطیر و ما علیه فی ذلك قطع**۔ چنانچہ اس چور کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ روایت ایسے معاملہ پر مشتمل ہے جس میں رائے کا دخل نہیں لہٰذا یہ روایت سماع کے حکم میں ہے ورنہ صحابی کی تقلید تو واجب ہے ہی۔

۳۵۹۴: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنِ الثَّمَرِ الْمُعَلَّقِ قَالَ مَنْ سَرَقَ مِنْهُ شَيْئًا اَنْ يُؤْوِيَهُ الْجَرِيْنُ فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۲ / ۳۳۵، الحدیث رقم: ۱۷۱۰، الترمذی فی ۳ / ۵۸٤، الحدیث رقم: ۱۲۸۹، والنسائی فی ۸ / ۸٤، الحدیث رقم: ٤۹۵۷، أخرجه احمد فی المسند ۲ / ۲۰۷۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ سے درخت پر لگے ہوئے پھلوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے ان پھلوں کو محفوظ کر لینے کے بعد چوری کیا اور ان (چرائے ہوئے پھلوں) کی قیمت ایک ڈھال کی قیمت کے برابر پہنچ گئی ہو تو وہ قطع ید کا سزاوار ہوگا''۔ (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله: من سرق منه شيا ......:

''جرین'' جیم کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ وہ جگہ جہاں کھجوریں خشک کرنے کے لئے رکھی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ''بیدر'' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں گندم رکھی جاتی ہے۔ (كذا فى النهاية)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ سوال و جواب میں مطابقت نہیں ہے کہ سوال ''ثمر معلق'' کے چرانے کے بارے میں تھا جواب میں بظاہر ''لا'' فرمانا چاہئے تھا، جواب میں اس قدر اطناب کیوں فرمایا؟ اس عدم مطابقت کا جواب یہ ہے کہ یہ جواب اس حکم کی علت پر مشتمل ہے گویا کہ یہ جواب دیا کہ قطع ید نہیں ہوگا کیونکہ اس میں ''حرز'' نہیں پایا گیا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں فقہاء نے مندرجہ ذیل شروط بیان فرمائی:

① ''حرز'' شرط ہے، لہٰذا حرز سے چرائے جانے والی چیزوں میں قطع ید ہوگا، اور ''حرز'' کے سلسلہ میں عرف کا اعتبار ہے۔ (کہ کونسی چیز کس جگہ کس انداز سے رکھی ہوگی تو وہ ''محروز'' کہلائے گی) چنانچہ جس چیز کیلئے جس حرز کو عرف حرز شمار نہ کرتا ہو وہ حرز اسی شے کے بارے میں معتبر نہیں ہے۔ ② سارق کیلئے شئی مسروق میں کوئی شبہ بھی نہ ہو۔ اگر کوئی شبہ ہوا تو قطع ید نہیں ہوگا۔ ③ ''مسروق منہ'' مال کا مطالبہ بھی کرے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: اس چیز کے چرانے پر بھی قطع ید نہیں ہوگا جو جلد خراب ہو جاتی ہے۔ مثلاً دودھ، گوشت، روٹی، تازہ پھل۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اس میں قطع ید ہوگا اور امام شافعیؒ بھی یہی فرماتے ہیں اور دلیل یہ حدیث ہے جس کو ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ عبداللہ بن عمر روایت کیا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ''ثمر معلق'' کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: **من أصاب بفيه من ذى حاجة غير متخذ خبنة فلا شى عليه، ومن خرج بشى منه فعليه غرامة مثليه**۔

اس حدیث کو ابوداؤد نے (ان چاروں): ابن عجلان، ولید بن کثیر، عبیداللہ بن خنس اور محمد بن اسحاق کے طریق سے عن عمرو بن شعیب نقل کیا ہے۔

اس حدیث کو امام شافعیؒ نے بھی وہب عن عمرو بن الحارث اور ہشام بن سعد عن عمرو بن شعیب نقل کیا ہے۔

ایک روایت میں ہے: **أن رجلا من مزينة سأل رسول اللهﷺ عن الحريسة التى تؤخذ من مراتعها؟ فقال: فيها ثمنها مرتين وضرب ونكال، وما أخذ من عطنه ففيه القطع اذا بلغ ما يؤخذ من ذلك ثمن المجن۔ قالوا: يا رسول الله! فالثمار وما أخذ من أكمامها؟ فقال: من أخذ بفيه ولم يتخذ خبنة فليس عليه شئ، ومن احتمل المجن فعليه ثمنه مرتين وضرب ونكال، وما أخذ من أجرانه ففيه القطع**۔ اس کو احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

ایک روایت میں یوں ہے:ما ترى فى الثمر المعلق؟ فقال :ليس فى شئ من الثمر المعلق قطع الا ما أواه الجرين، فما أخذ من الجرين فبلغ ثمن المجن ففيه غرامة مثليه وجلدات ونكال۔

امام حاکم نے اس حدیث کو اسی متن کے ساتھ روایت کیا ہے اور فرمایا:قال امامنا اسحاق بن راهويه: اذا كان الراوى عن عمرو بن شعيب ثقة، فهو كأيوب عن نافع عن ابن عمر۔

اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے، اور عبداللہ بن عمرو پر ''موقوف'' قرار دیا ہے، قال: ليس فى شئ من الثمار قطع حتى يأوى الجرين۔ ابن عمر سے بھی اس کے مثل روایت نقل کی ہے۔

خواہ یہ کہا جائے کہ یہ بات انہوں نے موافق عادت ذکر فرمائی یا وہ جرین ہے جو ان کے ہاں خشک پھلوں کے لئے ہوتا ہے اور اس میں قطع ید ہوگا لیکن ''المغرب'' میں ہے کہ ''الجرين: المربد وهو الموضع الذى يبقى فيه الرطب ليجف۔'' اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں جب ابتداءً کھجوریں رکھی جاتی ہیں تو وہ تر ہوتی ہیں اور آخر میں خشک ہوتی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت نبی کریم ﷺ کے دیگر اقوال کے اطلاق کے معارض ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے: **لاقطع فى ثمر ولا كثر**۔ اور دوسری حدیث میں ہے: **لاقطع فى طعام**۔ پہلی حدیث امام ترمذیؒ نے لیث بن سعد سے، اور امام نسائی اور ابن ماجہ نے سفیان بن عیینہ سے، اور پھر ان دونوں نے یحییٰ بن سعید، عن محمد بن یحییٰ بن حبان، عن عمہ واسع بن حبان سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے:أن غلاما سرق وديا من حائط فرفع الى مروان فأمر بقطعه، فقال رافع بن خديج، قال النبى ﷺ: لا قطع فى ثمر ولا كثر۔ ابن حبان نے اس حدیث کو اپنی ''صحیح'' میں دو مرتبہ ذکر کیا ہے۔ قسم اول میں بھی اور قسم ثانی میں بھی۔

عبدالحقؒ فرماتے ہیں: سفیان بن عیینہ وغیرہ نے بھی اس حدیث کو اسی طرح روایت کیا، البتہ دیگر راویوں نے ''واسع'' کا ذکر نہیں کیا۔ یہ حدیث اسی طرح امام مالکؒ نے نقل کی ہے۔اھ۔

حاصل یہ کہ وصل وانقطاع کا اختلاف ہے۔ وصل اولیٰ ہے، جیسا کہ معروف ہے کہ یہ زیادتی ثقہ راوی سے منقول ہے اور اس حدیث کو تلقی بالقبول بھی حاصل ہے۔ لہٰذا جرین میں رکھی ہوئی تازہ کھجوروں کے بارے میں روایت کا تعارض ٹھہرا۔ باب حدود کے اس قسم کے مسائل میں ''ادلأللحد'' کو مقدم مانا جاتا ہے، اور اس لئے بھی کہ ماقبل میں جو گذرا ہے وہ متروک الظاہر ہے کیونکہ شئی مسروق کا ضمان اس کی قیمت کے دو مثل نہیں ہوتا، اگر چہ امام احمدؒ سے منقول ہے۔ تاہم علمائے امت کا موقف اس کے برعکس ہے کہ یہ قول کتاب اللہ کی قوت کو نہیں پہنچتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرة:١٩٤] لہٰذا یہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحیح طور پر ثابت نہیں۔ چنانچہ اس میں دلالت ضعف ہے، یا نسخ ہے۔ لہٰذا یہ حدیث منفرد ٹھہری۔ پس قائلین کا یہ کہنا باطل ٹھہرا کہ حدیث ثمر و کثر اس تفصیل کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی جو تفصیل جو حدیث بالا میں مذکور ہے کہ درخت پر سے کھائے تو اس پر کوئی شئی نہیں ہے اور اگر نکال کر لے جائے تو دوگنی قیمت، کوڑے اور سزا ہوگی، اور اگر ''بیدر'' سے لے جائے تو قطع ید ہوگا۔

دوسری حدیث کو ابوداؤد نے ''مراسیل'' میں عن جریر بن حازم، عن الحسن البصری کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انى لا

أقطع في الطعام: عبدالحق نے بھی اس کو ذکر کیا ہے، اور ارسال کے علاوہ کوئی علت بیان نہیں کی، اور یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ہمارے نزدیک یہ کوئی علت نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے موجب پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور غیر محل اجماع میں بھی اس کا اعتبار ضروری ہے۔ جب یہ بات مجمع علیہ ٹھہری کہ گندم اور سکر میں ہاتھ کاٹا جائے گا تو لازم ہے کہ اس کو ان چیزوں پر بھی محمول کیا جائے جو جلد خراب ہو جانے والی ہیں، مثلاً پکا ہوا تیار کھانا، اور وہ چیزیں بھی جو اس کے حکم میں ہیں، جیسا کہ گوشت اور تر پھل مطلقاً، خواہ وہ جرین میں ہوں یا غیر جرین میں۔

حطہ وغیرہ میں قطع ید کا حکم قحط سالی کے علاوہ میں ہے۔ البتہ قحط سالی میں قطع ید نہیں ہوگا، خواہ جلد خراب ہونے والی چیزوں میں سے ہو یا نہ ہو، چونکہ ضرورت واضح ہے، اور ضرورت تناول کو مباح قرار دیتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

لا قطع في مجاعة مضطر، اور حضرت عمر سے مروی ہے: **لا قطع في عام سنة**۔ اھ۔

۳۵۹۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ حُسَيْنِ الْمَكِّيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا قَطْعَ فِیْ ثَمَرٍ مُعَلَّقٍ وَلَا فِیْ حَرِيْسَةِ جَبَلٍ فَاِذَا آوَاهُ الْمُرَاحُ وَالْجَرِيْنُ فَالْقَطْعُ فِيْمَا بَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ٢ / ٨٣١، الحديث رقم: ٢٢ من كتاب الحدود

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابو حسین مکی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(درخت پر) لگے ہوئے پھلوں اور پہاڑوں پر چرنے والے جانوروں (کی چوری) کے مقدمہ میں قطع ید کی سزا نہیں ہے ہاں اگر کوئی شخص کسی پہاڑی جانور کو جانوروں کے باندھنے کی جگہ لا کر باندھ دے یا پھل کو (خشک ہونے کے بعد) کھلیان میں جمع کر دے تو اس کی چوری میں قطع ید کی سزا دی جائے گی بشرطیکہ چوری کی گئی شے کی مالیت ایک ڈھال کی قیمت کے برابر پہنچ جائے''۔ (مالک)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن عبدالرحمٰن۔ نام نامی ''عبداللہ ابن عبدالرحمٰن بن ابی حسین'' ہے۔ مکہ کے رہنے والے ہیں۔ قریش خاندان تعلق رکھتے سے ہیں اور تابعی ہیں۔ ابو الطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ تابعین کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی۔ مالک، ثوری اور ابن عیینہ رحمہم اللہ نے ان سے روایت کی ہے۔

تشریح: **قوله: عن عبد الله ۔۔۔ حسين المكي** ایک نسخہ میں ''ابن'' کی بجائے ''عن'' ہے، یہ صحیح نہیں ہے (صحیح وہی ہے جو پہلے مذکور ہے۔)

قوله لا قطع في ثمر معلق: عرض مرتب: اس کے بارے میں تفصیلی احکام، حدیث: ۳۵۹۳ فصل ثانی کی پہلی حدیث کے تحت گذر چکے ہیں۔

قوله: ولا في حريسة جبل: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''حَرِيسة'' بروزن ''فعيلة'' ہے۔ ''محروسة الجبل'' اس

جانور کو کہتے ہیں جو پہاڑوں پر چرتا پھرتا ہو اور کوئی شخص اس کی حفاظت بھی کر رہا ہو۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ''حریسه'' سے مراد، رات کے وقت میں چرائی گئی بکری ہے، اور ''جبل'' کی طرف اضافت اس لئے گئی کہ چور بکری کو پہاڑ پر لے جاتا ہے اور پہاڑ پر لے جانا مقصد برآری کیلئے زیادہ مفید ہے۔ صاحب النہایہ فرماتے ہیں: اور اسی سے یہ حدیث ہے: **أنه سئل عن حريسة الجبل؟ قال فيها غرم مثليها و جلدات نكالا۔**

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

اگر اونٹوں کی قطار میں سے کوئی اونٹ پالان چرالیا، تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ یہ حرز مقصود نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں شبہ عدم ممکن ہے اور وہ اس وجہ سے کہ سائق، قائد اور راکب کا مقصود قطع مسافت اور سامان منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ان کے پیش نظر (اونٹوں کی) حفاظت نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اگر لدان کے ساتھ کوئی محافظ ہو اور حفاظت کی غرض سے آ رہا ہو تو فقہاء کہتے ہیں کہ ہاتھ کاٹا جائے گا اگر لدان کی بوری کو پھاڑ کر اس میں سے مال نکال لیا تو اس پر بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ چونکہ اس طرح کے مواقع پر بوری بھی حرز ہوتی ہے کیونکہ بوری میں کوئی چیز درحقیقت اس کی حفاظت ہی کے لئے رکھی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں حرز کی وجہ سے ہاتھ کاٹا جائے گا۔

اور ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں: راکب اور سائق دونوں محافظ ہیں۔ لہٰذا حرز پائی گئی۔ چنانچہ اونٹ، جوالق اور پالان کی بوری سے چرانے میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔

آخذ اور قائد کے بارے میں ہمارا کہنا ہے کہ وہ محض اس اونٹ کا محافظ ہے کہ جو اونٹ کی مہار اس کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ پیچھے مڑ کر سب کو دیکھتا ہے تو وہ سب کا محافظ ٹھہرا۔ لہٰذا سارے اونٹ محرز ہوئے، اور فرض کیا کہ اس کا مقصود قطع مسافت اور نقل سامانی ہے۔ تو بھی یہ ماقبل کے منافی نہیں، بلکہ ظاہر بھی یہی ہے۔ لہٰذا اس کا اعتبار کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور **حريسة** جبل کے مسئلہ پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا **لا قطع** فرمانا اس صورت پر محمول ہوگا کہ چرواہا بکریوں کو چرنے کیلئے چراگاہ میں چھوڑ دے اور وہ خود وہاں نہ ہو یا (ہو مگر) سو رہا ہو۔ اھ۔ (فتح القدیر ۵/۱۵۲)

قوله: فاذا آواه المراح ...... : آواہ: مدّ کے ساتھ اور ضمیر مفرد لانا باعتبار ''مذکور'' کے ہے۔

المراح: میم کے ضمہ کے ساتھ صطبل، مویشیوں کے رہنے کی جگہ، اونٹوں اور بکریوں وغیرہ کا باڑہ۔

حريسة: اس بکری کو کہتے ہیں جسے ''مراح'' پہنچنے سے پہلے رات آن گھیرے۔

فلان ياكل الحريسات: یعنی فلاں آدمی لوگوں کی بکریاں چرا کر کھاجاتا ہے۔ اور ''احتراس'' کا مطلب ہے چراگاہ سے کوئی شئ چرنا۔ (كذا فى النهاية)

والجرين: موطا کے نسخوں میں ''أو الجرين'' کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا یہاں ''واوٗ'' بمعنی ''اَوْ'' یعنی برائے تنویع ہے۔

فيما بلغ: اس کا متعلق محذوف ہے۔ أی: **لازم**۔

قوله: رواه مالك:

مناسب یہ تھا کہ مصنفؒ ''مرسلا'' کا اضافہ بھی کرتے۔ چونکہ اس حدیث کے راوی تابعی ہیں اور وہ اس روایت کو موصولا

بیان کررہے ہیں، اورصحابی کا ذکرنہیں کررہے۔ پھرامام طیبیؒ فرماتے ہیں: الثالث عبد الله و الرابع و الخامس و السادس جابر و السابع بسر۔ تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اصل سے ایک حدیث ساقط ہے اور یہ بات اصول معتمدہ اور تصحیح شدہ نسخوں کے خلاف ہے' شاہد کہ امام طیبیؒ کی مراد 'السادس' سے حدیث صفوان ہو' چنانچہ قصور و کوتاہی امام طیبیؒ کی تعبیر میں ہے۔

لٹیرے کی مذمت کا بیان

۳۵۹۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ عَلَى الْمُنْتَهِبِ قَطْعٌ، وَمَنِ انْتَهَبَ نُهْبَةً مَشْهُوْرَةً فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٥١، الحديث رقم: ٤٣٩١، وأحمد فی المسند ٣ / ٢٨٠

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ڈاکو کی سزا قطع ید نہیں ہے (بلکہ اس کی سزا الگ ہے) اور جو شخص بڑے ڈاکے ڈالے وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قوله: ليس على المنتهب قطع:

عرض مرتب: کی وضاحت اگلی حدیث کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔ اھ۔

قوله: ومن انتهب لهبة ......:

نهبة: نون کے ضمہ کے ساتھ ''لوٹا گیا مال'' اور نون کے فتحہ کے ساتھ بھی درست ہے۔ اس صورت میں مصدر کے معنی مراد ہوں گے۔

مشهورة: ای ظاهرة غير مخفية صفت کاشفہ ہے۔

فليس منا: زجر مقصود ہے، کہ وہ شخص ہمارے طریقے کے لوگوں میں سے نہیں یا ہمارے اہل ملت میں سے نہیں ہے۔

خائن اور اُچکے کی سزا

۳۵۹۷: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَيْسَ عَلٰى خَائِنٍ وَلَا مُنْتَهِبٍ، وَلَا مُخْتَلِسٍ قَطْعٌ۔

(رواه الترمذی والنسائی و ابن ماجة والدارمی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٥٥١، الحديث رقم: ٤٣٩٣، والترمذی فی ٤ / ٤٢، الحديث رقم: ١٤٤٨، والنسائی فی ٨ / ٨٨، الحديث رقم: ٤٩٧٢، وابن ماجه فی السنن ٢ / ٨٦٤، الحديث رقم: ٢٥٩١، والدارمی فی ٢ / ٢٢٩، الحديث رقم ٢٣١٠، أخرجه احمد فی المسند ٣ / ٣٨

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: خیانت کرنے والے' ڈاکا ڈالنے اور چھین کر مال حاصل کرنے والے کا ہاتھ کاٹنا مشروع نہیں ہے''۔ (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' دارمی)

تشریح: قوله: ليس على خائن:

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: خائن، خيانة سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ صورت مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس کوئی چیز بطور

عاریت یا ودیعت کے امانت تھی، پھر یہ شخص اس چیز کو لے لے، اور دعویٰ یہ کرے کہ وہ چیز تو میرے پاس سے ضائع ہوگئی، یا سرے سے انکار کردے، کہ میرے پاس تو کوئی چیز ودیعت یا عاریت کے طور پر تھی ہی نہیں۔

صاحب ہدایہ اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس میں حرز قاصر ہے چونکہ وہ چیز تو خائن کے ہاتھ میں تھی، اور اس کی حرز میں تھی، خالص طور پر مالک کی حرز میں نہیں تھی۔ اس خائن کی حرز اگر چہ مالک کی حرز ہے۔ بایں طور کہ یہ چیز خود مالک نے ہی اس کے پاس ودیعت رکھوائی تھی اس وجہ سے تو اس خائن کی حرز میں آئی۔ لیکن یہ حرز ایسی ہے کہ خود سارق، اس چیز میں مداخلت کیلئے مجاز ہے۔

قوله: ولا منتهب:

لٹیرا (لوٹنے والا) اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کا مال اعلانیہ طور پر زبردستی حاصل کرے۔ اس طرح لوگوں کا مال لوٹنا اگر چہ چوری چھپے مال اڑانے سے بدتر ہے لیکن ایسے شخص پر ''چور'' کا اطلاق نہ ہونے کی وجہ سے اس کو قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ چور اس شخص کو کہتے ہیں جو چھپ چھپا کر لوگوں کا مال اڑائے۔ لہٰذا جب یہ چور نہیں تو قطع ید کیوں کر ہوگا۔

قوله: ولا مختلس:

صاحب مغرب لکھتے ہیں: **الاختلاس: أخذ الشئ من ظاهر بسرعة:**

قطع، لیس کا اسم مؤخر ہے۔

اُچکا کوئی چیز گھر سے یا مالک کے ہاتھ سے لے اچکے، اور وہ شیَٔ (عین) نصاب ہو یا نصاب کی قیمت کے مساوی ہو تو قطع ید نہ ہوگا۔ کیونکہ شرط ''**اخراج ماهو نصاب أو قيمه من الحرز، أيب خفية**'' مفقود ہے۔

شرح مسلم للنووی میں قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: قطع ید کا وجوب من جانب اللہ، سارق کیلئے مشروع ہے۔ غیر سرقہ کیلئے مشروع نہیں ہے۔ مثلاً اختلاس، انتہاب اور غصب چونکہ اول تو یہ معاملات بنسبت سرقہ کے قلیل الوقوع ہیں، دوم یہ کہ ان مسائل میں **ولاة الامور** کے ہاں استغاثہ کر کے شی کا استرجاع ممکن ہے۔ سوم یہ کہ ان افعال کے مرتکب پر اقامت بینہ آسان ہے لہٰذا سرقہ کا معاملہ بہت اہم ہے۔ اس کی سزا بھی شدید ہوگی، اور **أبلغ في الزجر** بھی ہوگی۔

اس حدیث کو اصحاب سنن اربعہ نے روایت کیا ہے ابن ہمام فرماتے ہیں: امام ترمذیؒ نے اس کو ''حدیث حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔ ابن قطان اور عبدالحق نے سکوت اختیار کیا ہے۔ ان دونوں کا یہ سکوت ان کی جانب سے تصحیح ہے۔ ابوداؤد کی تعلیل مرجوح ہو کر رہ جاتی ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: ہمارا مذہب یہی ہے، باقی ائمہ ثلاثہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ جاحدِ عاریت کے بارے میں اسحاق بن راہویہ کا مذہب، اور امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ قطع ید ہوگا۔

ان کی دلیل صحیحین میں مروی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہے:

أن امرأة كانت تستعير المتاع وتجحده، فأمر النبي ﷺ بقطعها۔

جمہور علماء نے اسی حدیث کو لیا ہے، اور حضرت عائشہؓ کی حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ خاتون عاریت لی ہوئی چیز کا

انکار کرنے میں مشہور و معروف تھی، اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے اس مشہور وصف کا ذکر کیا۔ اس کا ہاتھ چوری کرنے کی وجہ سے کاٹا گیا تھا جیسا کہ حدیث میں صراحتاً منقول ہے۔ یہ ساری تقریر اس تقدیر پر ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے اور اصل بھی یہی ہے یعنی عدم تعدد، اور جمع بین الحدیثین۔ علاوہ ازیں اس حدیث کو امت سے تلقی بالقبول والعمل بھی حاصل ہے

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس خاتون نے چوری نہیں کی تھی، تو پھر حدیث کا محمل یہ ہوگا کہ اس کا ہاتھ جحد عاریت کی وجہ سے کاٹا گیا تھا اور یہ منسوخ ہو چکا ہے اس صورت میں یہ دو علیحدہ علیحدہ واقعات شمار ہوں گے۔ سنن ابی داؤد میں مروی روایت کا محمل بھی جحد عاریت ہوگا۔ ابن شہاب سے مروی ہے کہ عروہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

استعارت منی حلیا علی ألسنة أناس يعرفون ولا تعرف هی، فباعته فأخذت فأتی بها النبی ﷺ فأ مر يقطع يدها۔

سنن ابن ماجہ کی روایت میں اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے:

حدثنا أبو بكر بن أبی شيبة، حدثنا عبدالله بن نمير، حدثنا محمد بن اسحاق، عن محمد بن ركانة، عن أمه عائشة بنت مسعود بن الأسود عن أبيها قال: لما سرقت المرأة تلك القطيفة من بيت رسول الله ﷺ أغضبنا ذلك، وكانت امرأة من قريش، فجئنا النبی ﷺ نكلمه فقلنا: نحن نفديه بأربعين وقية، فقال ﷺ: (تطهرها خيرلها) فأتينا أسامة بن زيد فقلنا له: كلّم لنا رسول الله ﷺ، فلما كلمه قال: (ما اكثاركم علیّ فی حدّ من حدود الله، والذی نفسی بيده لو كانت فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها):

ابن سعد طبقات میں فرماتے ہیں: یہی وہ عورت ہے جو فاطمہ بنت اسود بن عبدالاسود کے نام سے موسوم ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ خاتون اُم عمیر بنت سفیان بن عبدالأسود اخت ہیں، عبداللہ بن سفیان کی بہن ہیں۔ (فتح القدیر ۱۳۲/۵)

چور کو معاف کرنے کا بیان

۳۵۹۸: وَرُوِیَ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ صَفْوَانَ بْنَ اُمَيَّةَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَنَامَ فِی الْمَسْجِدِ، وَتَوَسَّدَ رِدَاءَهُ فَجَاءَ سَارِقٌ، وَاَخَذَ رِدَاءَهُ فَاَخَذَهُ صَفْوَانُ فَجَاءَ بِهٖ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاَمَرَ اَنْ تُقْطَعَ يَدُهُ فَقَالَ صَفْوَانُ: اِنِّیْ لَمْ اُرِدْ هٰذَا، هُوَ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَلَّا قَبْلَ اَنْ تَاْتِيَنِیْ بِهٖ۔

أخرجه مالك فی الموطأ ۲ / ۸۳٤، الحديث رقم: ۲۸ من كتاب الحدود

ترجمہ: اور صاحب مصابیح نے (اپنی سند کے ساتھ) شرح السنۃ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت صفوان بن امیہ مدینہ تشریف لائے اور سر کے نیچے اپنی چادر رکھ کر مسجد میں سو گئے۔ اس (دوران) ایک چور آیا اور اس نے ان کی وہ چادر (آہستہ سے) کھینچ لی (اور بھاگنا چاہا) مگر صفوان رضی اللہ عنہ نے اس کو پکڑ لیا اور اس کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے (اور واقعہ بیان کیا) آپ ﷺ نے (خود مجرم کے اقرار یا گواہوں کے ذریعہ چوری ثابت ہو

جانے پر) اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ (یہ فیصلہ سن کر) حضرت صفوان رضی اللہ عنہ (نے عرض کیا کہ اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانے سے) میرا یہ ارادہ نہیں تھا (کہ صرف میری چادر کی وجہ سے اس کے ہاتھ کاٹے جائیں بلکہ تعزیر مقصود تھی) میں نے وہ اپنی (اپنی چادر) اس (چور) کو صدقہ کر دی''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''پھر اس کو میرے پاس لانے سے پہلے ہی تم نے اپنی چادر اس کو معاف کیوں نہ کر دیا''۔

راویٔ حدیث:

صفوان بن امیہ۔ یہ صفوان بن امیہ ابن خلف جمی قریشی ہیں۔ فتح مکہ کے دن مسلمانوں سے بھاگے، پھر عمیر بن وہب اور ان کے بیٹے وہب بن عمیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے لیے پناہ طلب کی تھی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امان دے دی اور ان دونوں کو امن کی علامت کے طور پر اپنی چادر عطا فرمائی۔ پھر وہب نے صفوان بن امیہ کو پالیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے تو صفوان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یہ وہب بن عمیر کہتے ہیں کہ آپ نے مجھ کو امن دیا ہے کہ میں دو ماہ تک آزادانہ چلوں پھروں۔ اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابو وہب (سواری سے) نیچے اترو، تو صفوان نے کہا کہ میں اس وقت تک نہیں اتروں گا جب تک آپ صاف صاف مجھے نہ بتلا دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی سواری سے اترو اور تمہارے لیے ۴ ماہ تک آزادانہ چلنے پھرنے کی اجازت ہے پس صفوان اتر آئے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حنین اور طائف میں بحالت کفر شریک ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مال غنیمت میں سے بہت کچھ دیا۔ اس پر صفوان نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اس کثیر غنیمت کو دے کر نبی پاکیزہ نفس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص خوش نہیں ہو سکتا اور اسی دن اسلام لے آئے اور مکہ میں قیام کیا پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پاس قیام کیا، اور اپنی ہجرت کا واقعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں رہی (کیونکہ اب مکہ ہی دارالاسلام بن چکا ہے) صفوان زمانہ جاہلیت میں قریش کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی بیوی ان سے ایک ماہ پہلے اسلام لے آئی تھیں جب صفوان بھی مسلمان ہو گئے تو دونوں کا نکاح برقرار رکھا گیا۔ ۴۲ھ میں مکہ میں صفوان کا انتقال ہوا۔ ان سے متعدد آدمی روایت کرتے ہیں اور یہ ان میں سے ہیں کہ جن کے ساتھ اسلام پر راسخ کرنے کے لیے تالیف قلب کا معاملہ کیا جاتا تھا۔ یہ مکہ میں ہی مخلص مسلمان بن چکے تھے۔ یہ قریش کے فصیح زبان لوگوں میں سے تھے۔ ''امیہ'' تصغر کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: قدم المدينة: وتوسّد رداءه:

''ہدایہ'' میں لکھا ہے کہ اصح یہ ہے کہ چیز کو سر کے نیچے رکھنا بھی حرز ابن ہمام فرماتے ہیں: اکثر اہل علم کے نزدیک ''حرز'' سے اخراج شرط ہے۔ حضرت عائشہ حسن اور نخعی سے منقول ہے کہ جو شخص حرز میں مال جمع کرے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اگرچہ اس نے مال کو حرز سے نکالا نہ ہو۔ حسن سے دیگر حضرات کے مثل بھی قول منقول ہے، اور داؤد سے منقول ہے کہ ''حرز'' کا سرے سے کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ اقوال اپنے ''منقول عنہ'' سے ثابت نہیں ہے اور اہل علم سے وہی کہا جاتا ہے جو ہم نے ذکر کیا، پس یہ اجماع کی مانند ہے۔ (قالہ ابن المنذر)

حرز کی قسمیں

حرز کی دو قسمیں ہیں: ① حرز کبالمکان' جیسے دور اور بیوت ② حرز بالحافظ' یعنی مہافظ یعنی حرز کبھی حرز کبھی محافظ کے ذریعہ ہوتی ہے' یہ تعمیر شدہ مکانوں کا بدل ہے جیسا کہ ''المحیط'' میں مذکور ہے۔ اس کی مثال وہ شخص ہے جو راستہ میں یا صحراء میں یا مسجد میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پاس سامان ہے۔ پس یہ البناماں اس کی کی وجہ سے ''حرز'' میں ہے۔

فجاء به الى رسول الله: ایک روایت میں ''الى النبى'' کے الفاظ ہیں۔ ان تقطع یدہ: ابصیغۂ تانیت ہے' اگرچہ بصیغہ مذکر بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔ ھو: او ایک روایت میں میں ''ردائی'' ہے اور ایک روایت میں ہے کہ **فقطعه رسول الله ﷺ فهلاّ قبل أن تاتيني به**: حدیث کے ان آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس کو پہلے ہی کیوں نہ معاف کر دیا تھا اور اپنا حق کیوں نہیں چھوڑ دیا تھا اب جب تم اس کو میرے پاس لے آئے اور اس کا جرم ثابت ہو جانے پر میں نے اس کا ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دے دیا تو اس کا ہاتھ کاٹنا واجب ہو گیا ہے' اب اس معاملہ میں تمہارا کوئی حق باقی نہیں رہ گیا ہے بلکہ یہ اللہ کا حق ہو گیا ہے لہٰذا تمہارے معاف کرنے سے اس کا جرم معاف نہیں ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چور جب حاکم کے سامنے پیش ہو جائے اور اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر اسے کوئی بھی سزا سے نہیں بچا سکتا' خود مدعی اور صاحب مال کے معاف کرنے سے بھی اس کی سزا معاف نہیں ہو گی' ہاں حاکم کے پاس قضیہ پہنچنے سے پہلے اس کو معاف کر دینا جائز ہے۔ (طیبی وابن الملک)

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو چوری کی وجہ سے اس کے ہاتھ کاٹنے کی سزا سنادی جائے اور پھر اسے چوری کی ہوئی چیز کو اس کا مالک اس شخص (چور) کو ہبہ کر کے اس کے سپرد کر دے یا اس چیز کو اس کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس صورت میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام زفر' امام شافعی اور امام احمد یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور حضرت امام ابو یوسفؒ ایک روایت بھی یہی ہے اور حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ چنانچہ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک روایت میں تو یہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح یہاں نقل کی گئی لیکن حاکم وغیرہ کی روایت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ کچھ اضافہ وزیادتی کے ساتھ ہے: **أنا أبيعه و أهبه ثمنه** ۔ امام حاکم نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے' بہت سی روایات میں اس کا ذکر نہیں۔ بعض روایات میں ہے: '' **ما كنت أريد هذا** '' اور بعض میں ہے: '' **أو يقطع رجل من العرب في ثلاثين درهما** '' اور بطور ہبہ سپردگی کا ذکر موجود نہیں ہے اور واقعہ بھی ایک ہی ہے۔ لہٰذا اس اضافہ وزیادتی کی وجہ سے اضطراب واقع ہو گیا اور اضطراب حدیث کے ضعیف ہونے کا موجب ہو جاتا ہے۔

عرض مرتب:

مولانا زکریا صاحب قدس اللہ سرہ نے اس مسئلہ پر ''اوجز السالک'' میں کافی تفصیلی بحث ذکر کی ہے۔ بحث کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ اس مسئلہ میں حضرات حنفیہ کی نقول مختلف ہیں، جیسا کہ شیخ نے ذکر کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ایسی صورت میں حد ساقط نہیں ہو گی اور بعض اس کے برعکس فرماتے ہیں۔ اور روایت کا اسنادی اعتبار سے حال یہ ہے کہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ صفوان کے سلسلہ میں کوئی بھی شی اصلاً صحیح نہیں ہے۔ تمام روایات میں انقطاع ہے۔ عطاء' عکرمہ' عمرو بن یسار اور

ابن شہاب میں ہے کسی نے بھی صفوان کا زمانہ نہیں پایا اور عطاء عن طارق مجہول ہے، عن اسباط عن سماک عن حمید بن اخت صفوان یہ سلسلہ سند ضعیف عن ضعیف عن مجہول پر مشتمل ہے۔اھ۔(أو جز المسالك، ج: ٦، ص:٦٥: ترك الشفاعة للسارق)

ابن ہمام فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی، حاکم، امام مالک نے مؤطا، اور امام احمد نے مسند میں متعدد وجوہ سے ذکر کیا ہے۔صاحب تنقیح، ابن عبدالہادی فرماتے ہیں: **انه حديث صحيح، وله طرف كثيرة، والفاظ مختلفة وان كان في بعضها انقطاع، وفي بعضها من هو مضعف، ولكن تعددت طرقه، واتسع مجيئه اتساعا يوجب الحكم بصحته بلا شبهة۔**

سنن کے ایک طریق میں عن عبداللہ بن صفوان، عن أبیہ یہ الفاظ آئے ہیں: **أنه طاف بالبيت وصلى، ثم لف رداء له من برد فوضعه تحت رأسه، فقام فأتاه لص، فاستله من تحت رأسه، فأخذه فأتى به النبي ﷺ فقال: ان هذا سرق ردائي، فقال له النبي ﷺ: (أسرقت رداء هذا؟) قال: نعم، قال: (اذهباله فاقطعا يده) فقال صفوان: ما كنت أريد أن تقطع يده في ردائي، فقال: (لولا كان قبل أن تأتيني به)** نسائی کی روایت میں ''**فقطعه**'' کا اضافہ ہے۔مستدرک کی روایت میں، **سماه خميصة ثمنه ثلاثون درهما** اھ۔یہ حدیث اصل کی روایت کے معارض ہے کہ اس میں **قدم المدينه** کا ذکر ہے، قضیہ ایک ہی ہے، تعدد کا احتمال نہیں، لہٰذا یہ امام بغوی کا وہم ہے۔انہوں نے اصحاب سنن کی مخالفت کی ہے یا مدینہ سے مراد مدینہ لغوی ہے جو مکہ کو بھی شامل ہے۔

٣٥٩٩: وَرَوَى نَحْوَهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ اَبِيْهِ۔

أخرجه ابن ماجه في السنن ٢ / ٨٦٥، الحديث رقم: ٢٥٩٥، وأحمد في المسند ٣ / ٤٠١، (راجع الحديث السابق)

ترجمہ: اسی طرح کی (یعنی اس کے ہم معنی) روایت ابن ماجہ نے عبداللہ بن صفوان سے اور انہوں نے اپنے والد (حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے) نقل کی ہے۔

٣٦٠٠: وَالدَّارِمِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

أخرجه الدارمي في السنن ٢ / ٢٢٦، الحديث رقم: ٢٢٩٩، وأخرجه النسائي في السنن ٨ / ٦٩، الحديث رقم: ٤٨٨٢۔

ترجمہ: ''اور دارمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی''۔

تشریح: قوله: **والدار مي عن ابن عباس:**

''**الدارمي**'' کا عطف ''**ابن ماجه**'' پر ہے، اور ''**عن ابن عباس**'' یہ ''**رواه**'' مقدر کے متعلق ہے۔فتدبر۔

٣٦٠١: وَعَنْ بُسْرِبْنِ اَرْطَاةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: لَا تُقْطَعُ الْاَيْدِىْ فِي الْغَزْوِ ۔ رواه الترمذي والدارمي وابوداود والنسائي الا انهما قالا: **في السفر** بدل **الغزو**۔

أخرجه ابوداؤد في السنن ٤ / ٥٦٣، الحديث رقم: ٤٤٠٨، والترمذي في ٤ / ٤٣، الحديث رقم: ١٤٥٠، والنسائي في ٨ / ٩١، الحديث رقم: ٤٩٧٩، ولدارمي في ٢ / ٣٠٣، الحديث رقم: ٢٤٩٢

ترجمہ: ''اور حضرت بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''غزوہ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں کہ اس کی سزا نافذ نہیں ہوگی''۔ اس روایت کو ترمذی' دارمی' ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ''غزوہ'' کی بجائے ''سفر'' کا لفظ ہے''۔

راویٔ حدیث:

بسر بن ابی ارطاۃ۔ یہ'' بسر بن ابی ارطاۃ ابوعبدالرحمٰن'' ہیں اور ''ابوارطاۃ'' کا نام ''عمیر العامری قرشی'' تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کم عمری کی وجہ سے یہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ نہیں سن سکے اور اہل شام ان کا سننا ثابت کرتے ہیں۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہ حضور ﷺ کی وفات سے دو سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر عمر میں ان کا دماغ صحیح نہیں رہا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں انتقال ہوا اور ایک قول یہ ہے کہ عبدالملک کے زمانہ میں وفات ہوئی۔ بعض نسخوں میں ''ابی'' کا لفظ موجود نہیں ہے یعنی بسر بن ارطاۃ ہے یہ نادرست ہے ''بسر'' میں بائے موحدہ مفتوح سین مہملہ ساکن اور آخر میں رائے مہملہ ہے۔

تشریح: **قوله: لا تقطع الأيدى فى الغزو:**

ابن ملک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب ہے کہ جب اسلامی لشکر دارالحرب میں کفار سے برسر جہاد ہو اور امام وقت ان میں موجود نہ ہو بلکہ امیر لشکر ان کا کارپرداز ہو اور اس وقت (جہاد میں) کوئی شخص چوری کا مرتکب ہو جائے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے' مبادا وہ شخص (اس سزا کے خوف سے) دارالحرب ہی کو اپنا مستقل مسکن بنالے اور اس طرح وہ فتنہ وگمراہی میں مبتلا ہو جائے لہٰذا اس کی سزا کو واپسی تک مؤخر کر دیا جائے۔ چنانچہ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اکثر فقہاء نے اس مسئلہ میں دارالحرب اور غیر دارالحرب کا فرق روا نہیں رکھا، ان کا مؤقف ہے کہ جو بھی جہاں بھی اس فعل کا ارتکاب کرے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے جیسا کہ دیگر فرائض وعبادات میں دارالسلام اور دارالحرب کا کوئی فرق نہیں ہے۔

بعض فقہاء کا مذہب ہے زیادہ مناسب بات یہ لگتی ہے کہ ایسے شخص سے حد کو اس لئے ساقط فرمایا ہے کہ امام نہیں تھا۔ بلکہ امیر تھا یا صاحب جیش تھا اور امیر جیش دارالحرب میں کسی شخص پر حد جاری نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر امام ہو یا وسیع مملکت کا امیر ہو جیسے عراق، شام اور مصر کے امراء تو وہ اپنے معسکر میں حد جاری کر سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ تو رپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ امام اوزاعی کے پیش نظر یہ بات ہو کہ کہیں یہ شخص فتنہ کا شکار ہو کر دارالحرب نہ چلے جا یا یہ بات پیش نظر ہو کہ اگر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور امیر لشکر اس وقت جنگ میں مصروف ہوا) تو یہ شخص قتال نہیں کر سکے گا اور ہمیں (یعنی مسلمانوں کو) کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ لہٰذا اس کی سزا کو واپسی تک مؤخر کر دیا جائے۔

کہ اگر اسلامی لشکر کا کوئی فرد مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس میں سے کچھ چرائے تو اس کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں (کیونکہ اس مال غنیمت میں اس کا بھی حق ہے۔) اھ۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مراد یہ ہو کہ مال غنیمت سے چرائے گئے قال پر قطع ید سے ممانعت ہو۔ اھ۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: بیت المال سے چوری کرنے والے شخص کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا امام شافعی، احمد، نخعی اور شعبی

بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ حماد اور ابن منذر کا بھی یہی قول ہے۔ ان کا استدلال آیت سرقہ کے ظاہر سے ہے، نیز یہ مال محرز ہے، اور قبل از حاجت اس شخص کا اس مال میں کوئی حق بھی نہیں ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ مال عوام کا ہے اور یہ شخص بھی عوام میں سے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیت المال سے چوری کرنے والے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں:

ارسله فما من أحد الا وله فى هذا المال حق۔اھ۔

طیبیؒ کہتے ہیں ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ''سفر'' کا جو لفظ مطلق نقل کیا گیا ہے اس کو مقید پر محمول کیا جائے یعنی ''سفر'' سے ''سفر جہاد'' مراد لیا جائے۔

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: **لا تقطع الأيدى فى السفر**: اس حدیث کو امام احمد، اصحاب ثلاثہ اور ضیاء نے بسر بن أبی أرطاۃ سے نقل کیا ہے۔

کئی بار چوری کرنے کی سزا کا بیان

۳۶۰۲: وَعَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِى السَّارِقِ: اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا يَدَهٗ ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا رِجْلَهٗ، ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا يَدَهٗ، ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا رِجْلَهٗ۔

(رواه فى شرح السنة)

البيهقى السنن، كتاب الحدود، الديات، ح ۲۹۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کے بارے میں فرمایا کہ ''جب وہ چوری کرے تو اس (دائیں ہاتھ) کو کاٹ دو، اگر وہ چوری کرے تو اس (کے بائیں پاؤں) کو کاٹ دو، پھر اگر چوری کرے تو (کے بائیں ہاتھ) کو کاٹ دو اور پھر اگر چوری کرے تو اس (کے دائیں پاؤں) پاؤں کاٹ دو''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: **قوله: قال فى البارق: ثم ان سرق فاقطعوا رجله:**

فى السارق: اى فى شانه أو لاحد۔ (یعنی یہاں مضاف ہے یا ''فی'' تعلیہ ہے۔)

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: اس حکم پر اجماع ہے۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں اکثر اہل علم فرماتے ہیں کہ پاؤں ''کعب'' کے پاس سے کاٹا جائے گا، حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا تھا۔ ابوثور اور روافض کا کہنا ہے کہ ''نصف قدم'' یعنی معقد شراک پر سے کاٹا جائے گا کیونکہ حضرت علیؓ نے چور کا پاؤں اس طرح کٹوانے تھے اور ایڑی جھڑوا دیتے تھے تا کہ وہ چل پھر سکے۔ شرح السنہ میں لکھتے ہیں: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چور جب پہلی بار چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا، پھر جب دوبارہ چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے، پھر جب سہ بارہ چوری کرے تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ تو اکثر اہل علم کا فرمانا ہے۔ تو اکثر اہل علم کا فرمانا ہے کہ تیسری بار چوری کرے تو بایاں ہاتھ کاٹ ڈالا جائے اور اگر چوتھی بار بھی چوری کرے

تو اس کا دایاں پاؤں بھی کاٹ ڈالا جائے' اس کے بعد بھی چوری کرے' اس کے بعد بھی چوری کرے تو تقریر جاری کی جائے اور اس کو قید کر دیا جائے۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹ کے جانے بعد اگر کوئی چوری کر لے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹ جائے گا' بلکہ قید کر دیا جائے۔ یہ حضرت شافعیؒ سے مروی ہے۔

اور ہدایہ' میں ہے کہ اگر تیسری متربہ چوری کرے گا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا' بلکہ تعزیر جاری ہوگی اور ہمیشہ کے لئے قید کر دیا جائے گا حتی کہ توبہ کر لے یا مر جائے اور اس کی تحقیق عنقریب آئے گی۔

عرضِ مرتب

اس حدیث کی کچھ تشریح اگلی حدیث کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

چور کو قتل کرنے کا بیان

۳۶۰۳ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ : جِیْءَ بِسَارِقٍ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ' قَالَ : اقْطَعُوْہُ فَقُطِعَ' ثُمَّ جِیْءَ بِہِ الثَّانِیَۃَ' فَقَالَ : اقْطَعُوْہُ' ثُمَّ جِیْءَ بِہِ الثَّالِثَۃَ' فَقَالَ : اقْطَعُوْہُ' فَقُطِعَ ثُمَّ جِیْءَ بِہِ الرَّابِعَۃَ' فَقَالَ : اقْطَعُوْہُ فَقُطِعَ' فَأُتِیَ بِہِ الْخَامِسَۃَ' فَقَالَ : اقْتُلُوْہُ' فَانْطَلَقْنَا بِہٖ' فَقَتَلْنَاہُ ثُمَّ اجْتَرَرْنَاہُ' فَاَلْقَیْنَاہُ فِیْ بِئْرٍ' وَرَمَیْنَا عَلَیْہِ الْحِجَارَۃَ۔

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤ / ٥٦٥' الحدیث رقم : ٤٤١٠

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا (دایاں) ہاتھ کاٹ دو' چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا' دوبارہ اس کو پھر پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (اس کا بایاں پاؤں) کاٹ دو' چنانچہ (اس کا بایاں پاؤں) کاٹ دیا گیا' پھر تیسری مرتبہ اس کو پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا (اس کا بایاں ہاتھ) کاٹ دو' چنانچہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر چوتھی مرتبہ اس کو پیش کیا گیا تو فرمایا کہ (اس کا دایاں پیر) کاٹ دو' چنانچہ (اس کا دایاں پیر) کاٹ دیا گیا' اور پھر جب پانچویں مرتبہ اس کو پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو قتل کر دو' چنانچہ ہم اس کو (پکڑ کر) لے گئے اور قتل کر دیا' پھر ہم نے گھسیٹ کر کنوئیں میں پھینک دیا اور اس پر پتھر ڈال دیئے۔ (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله: قال اقطعوه۔۔۔قال: اقتلوه:

''الثانیه'': صفت ہے موصوف محذوف ہے۔ أی المرة الثانیة أو المجیئة الثانیة۔

فأتی به: امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ اصل میں فأتوا به النبیؐ تھا' مفعول کو فاعل کے قائم مقام کر دیا گیا' اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جار مجرور فاعل کے قائم مقام ہوں اور یہی ترکیبی احتمال ''جیء به میں بھی ہے اور'' جئی بسارق'' میں بھی ہے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں' پہلی مرتبہ چوری کرنے پر دایاں ہاتھ کاٹنا اور پھر دوبارہ چوری کرنے پر بایاں پیر کاٹنا اس پر

اجماع ہے۔

تیسری مرتبہ چوری کرنے پر بایاں ہاتھ کاٹنے اور چوتھی مرتبہ چوری کرنے پر دایاں پیر کاٹنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے' چنانچہ امام شافعیؒ اوران کے متبعین تو یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق تیسری اور چوتھی مرتبہ چوری کرنے پردایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے'

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ چوری کرنے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ اس کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا تا آنکہ وہ اسی میں مرجائے یا توبہ کرے امام اعظمؒ کے اس مسلک کی دلیل یہ ہے کہ اس بات پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا تھا' جہاں تک اس حدیث کا سوال ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہو تو تہدید یا سیاست پر محمول ہے۔ (کذا ذکر بعض علمائنا)

''سراجیہ'' میں ہے کہ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو سیاستاً قتل کرادے۔

امام خطابی فرماتے ہیں: میں نہیں جانتا کہ کوئی ایک فقیہ بھی تعدد سرقہ پر سارق کے مباح ہونے کا قائل ہو۔ ہاں بعض فقہاء کے مذہب پر یہ ''مفسدین فی الارض'' کا مصداق ہونے کی بناء پر مباح الرم ہے اور امام کو یہ حق حاصل ہے کہ مفسد کو تعزیر جاری کرے اور جو سزا بھی مناسب سمجھے دے دے۔ اگر چہ حد سے زائد ہو اگر رائے ہو کہ قتل کر دیا جائے تو قتل کردے۔ یہ امام مالک بن انس کی طرف منسوب ہے اور حدیث اگر ثابت ہو تو وہ بھی اس رائے کی موید ہے اھ۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض شراح کا فرمانا ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس میں توجیہ یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے اور ناسخ یہ حدیث صحیح ہے: **لایحل دم امری مسلم الا باحدی ثلاث النفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق لدینہ**

قولہ: فألقیناہ فی البر ور مینا علیہ الحجارۃ:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ دلالت کرتا ہے کہ اس کو اہانۃً قتل کیا تھا، اس طرح سے کسی مسلمان کے ساتھ کرنا مناسب نہیں، اگر چہ وہ کبائر کا مرتکب ہو۔ کیونکہ جس شخص پر تعزیر جاری کی جاتی ہے ان کی نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے خصوصاً جب کہ اس پر حد جاری ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو بذریعہ وحی یہ بتلایا گیا ہو کہ یہ مرتد ہو چکا ہے جیسا کہ عرنیین کے ساتھ کیا کہ مثلہ کیا اور شدید سزا دی اور ممکن ہے کہ قطع ید کے بعد اس نے کوئی ایسی بات کی ہو جو اس کے قتل کا موجب ہو اھ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شخص ''سرقہ'' کو حلال سمجھتا تھا۔ واللہ اعلم۔ دوسری بات یہ کہ بہت سارے محدثین نے اس کے صحیح ہونے میں کلام کیا ہے چنانچہ طحاویؒ نے اس حدیث پر ان الفاظ میں طعن کیا ہے کہ میں نے صحابہؓ کے بہت آثار و قضایا (اور نظائر و فیصلے) دیکھے لیکن انتہائی تلاش کے باوجود مجھے اس حدیث کی کوئی بنیاد نہیں مل سکی' علاوہ ازیں میں نے بہت سے حفاظ حدیث سے ملاقات کی وہ سب اس حدیث (کی واقفیت) سے انکار کرتے تھے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

قال جئ بسارق الی النبی ﷺ فقال: اقتلوہ فقالوا یا رسول اللہ انما سرق قال: فاقطعوہ، فقطع ثم جئ بہ فی الثانیۃ فقال: اقتلوہ قالو: یا رسول اللہ انما سرق قال: اقطعوہ فقطع ثم جی بہ فی الثالثۃ فقال

اقتلوه فقالو يا رسول الله :انما سرق قال:اقطعوه ثم جئ به في الرابعه فقال:اقتلوه فقالوا رسول الله انما سرق قال:اقطعوه ثم جئ به في الخامسة قال اقتلوه قال جابر فانطلقنا به فقتلناه ثم اجرر ناه فألقيناه في بئر و رمينا عليه الحجارة۔

امام نسائی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث ''منکر'' ہے۔مصعب بن ثابت قوی نہیں ہے۔

امام نسائی کی ایک نے روایت کیا ہے۔:**عن أحمد بن سلمة أخبرنا احمد بن سلمة أنا يوسف بن سعد عن الحارث بن حاطب اللخمي أن النبي ﷺ أتي بلص فقال: اقتلوه ، قالو يا رسول الله انما سرق قال : اقطعوه ثم سرق فقطعت رجله على عهد أبي بكر حتى قطعت قوائمه الأربع كلها، ثم سرق الخامسة فقال ابو بكر كان رسول الله ﷺ أعلم بهدا حين قال:اقتلوه۔**

اس حدیث کو طبرانی نے نیز حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے اور ''صحیح الاسناد'' قرار دیا ہے۔

محمد بن حسن اپنی مؤطا میں فرماتے ہیں: زہری کہتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

قالت:انما كان الذى سرق عقد أسماء أقطع اليد اليمنى، فقطع أبوبكر رجله اليسرى۔

فرمایا: ابن شہاب اس حدیث کو دوسرے لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔

عطاء، عمرو بن العاص، عثمان اور عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ پانچویں مرتبہ میں قتل کر دیا جائے، جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے، امام مالک اور امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ تعزیر جاری کی جائے گی اور قید میں ڈال دیا جائے، جیسا کہ ہم تیسری بار کی بابت کہتے ہیں۔

ہماری دلیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے:**قال محمد بن الحسن "محتاب الآثار"** میں فرماتے ہیں:۔ یہ ایسا ثبوت ہے جو نا قابل تردید ہے۔لہٰذا یہ بات بعید ہے۔

ممکن ہے کہ قطع ید کے بعد اس شخص نے کوئی ایسی بات کی ہو جو موجب قتل ہو (یعنی یہ شخص مرتد ہو گیا ہے اس لئے آپ ﷺ نے اس کا خون مباح کر دیا اور اس کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔) اھ۔

اسی طرح بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شخص چوری کو حلال جانتا تھا (اس لئے بار بار اس کا ارتکاب کرتا تھا اسی وجہ سے اس کو اتنی سخت سزا دی گئی' بہر کیف ان تاویلات میں سے کسی بھی ایک تاویل کو اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کو مار ڈالنے کے بعد اس کی لاش کو اس طرح کھینچ کر کنویں میں ڈال دینا ہرگز مباح نہ ہوتا۔) ورنہ تعالیٰ اعلم

چور کا ہاتھ کاٹنے کے بعد داغنے کا بیان

۳۶۰۴ : وَرُوِیَ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ فِیْ قَطْعِ السَّارِقِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، اقْطَعُوْهُ ثُمَّ احْسِمُوْهُ۔

سنن أبي داود' كتاب الحدود' باب في السارق يسرق مراراً' ح ٤٤١٠۔

ترجمہ: ''اور بغویؒ نے شرح السنۃ میں چور کے ہاتھ کاٹنے کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ ''اس کا ہاتھ کاٹو اور پھر اس ہاتھ کو داغ دو۔''

تشریح: قوله: **اقطعوه ثم احسموه:** ابن ہمامؒ فرماتے ہیں راغنے کی دلیل یہ روایات ہے: ① امام حاکم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:

انه عليه الصلاة والسلام اتى بسارق سرق شملة فقال صلى الله تعالىٰ عليه وسلم: مااخاله سرق ، فقال السارق بلى يا رسول الله فقال: اذهبوا به فاقطعوه ثم احسموه ثم ائتونى به فقطع ثم حسم ثم أتى فقال: تبت الى الله قال: تاب الله عليك۔ یہ حدیث صحیح ہے، مسلم کی شرط پر ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے' علاوہ ازیں قاسم بن سلام نے غریب الحدیث میں نقل کیا ہے۔

② دار قطنی حضرت علیؓ سے روایت نقل کرتے ہیں:

انه قطع أيديهم من المفصل ثم حسمهم فكأنى أنظر اليهم والى أيديهم كأنها أيور الحمر۔

''المغرب'' میں اور ابن قدامہ کی مغنی میں لکھا ہے کہ کھولائے گئے تیل میں کٹے ہوئے ہاتھ کو ڈبو یا جائے گا۔ تیل کی قیمت اور داغنے کی کلفت کا خرچہ ان کے نزدیک بیت المال سے دیا جائے گا امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے اور ہمارے نزدیک یہ سارا خرچہ چور کے ذمہ ہے اور صاحب ہدایہ کا یہ فرمانا: ''چونکہ اگر اس کو نہ داغا گیا تو جان کے ضیاع کا سبب ہوگا'' وجوب کا متقاضی ہے۔ امام شافعی اور احمد سے منقول ہے کہ یہ مستحب ہے' اگر نہ کیا تو گناہ گار نہ ہوگا۔ (فتح القدیر ۵/۱۵۳۔۱۵۴)

عرضِ مرتب

اس حدیث سے متعلقہ کچھ مسائل، ہم نے ''احکام باب'' کے تحت بھی ذکر کئے ہیں۔

۳۶۰۵: وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ: اُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَارِقٍ' فَقُطِعَتْ يَدُهٗ' ثُمَّ اَمَرَ بِهَا' فَعُلِّقَتْ فِيْ عُنُقِهٖ۔ (رواه الترمذى وابوداود والنسائى وابن ماجة)

أخرجه ابوداؤد فى السنن ٤ / ٥٦٧' الحديث رقم : ٤٤١١' والترمذى فى ٤ / ٤١' الحديث رقم : ١٤٤٧' والنسائى فى ٨ / ٩٢' الحديث رقم : ٤٩٨٢' وابن ماجه فى ٢ / ٨٦٣' الحديث رقم : ٢٥٨٧' وأحمد فى المسند ٦ / ١٩٠

ترجمہ: ''اور حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا چنانچہ (آپ ﷺ کے حکم سے) اس کا ہاتھ کاٹا گیا پھر آپ ﷺ نے اس (کے) ہاتھ (کے) بارے میں حکم دیا (کہ اس کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دیا جائے تا کہ اس سے دوسرے لوگ عبرت پکڑیں) چنانچہ وہ ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دیا گیا''۔ (ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ)

تشریح: ''فضالۃ'' فاء کے فتحہ کے ساتھ' اور ''عبید'' تصغیر کے ساتھ ہے۔

قوله: ثم امربها ......:

فعلقت : لام کی تشدید کے ساتھ بصیغہ ہے۔ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ سے منقول ہے کہ چور کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دینا سنت ہے چونکہ حضورؐ نے اس کا حکم دیا تھا جب کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ امام (حاکم) کی مرضی پر موقوف ہے (کہ اگر وہ مناسب جانے تو چور کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دے یہ سنت نہیں ہے) کیونکہ یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس چور کا بھی ہاتھ کاٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکایا ہو۔لہٰذا یہ سنت نہیں۔

(فتح القدیر ۵/۱۵۴)

چوری کرنے والے غلام کی سزا

۳۶۰۶:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِذَا سَرَقَ الْمَمْلُوْكُ فَبِعْهُ وَلَوْ بِنَشٍّ۔ (رواه ابوداود والنسائی وابن ماجة)

سنن أبی داود' کتاب الحدود' باب بیع المملوك اذا سرق' ح ۴۴۱۲۔

ترجمہ:''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''جب غلام چوری کرے تو اس کو بیچ ڈالو خواہ ایک نش (یعنی بیس درہم) ہی کے عوض بیچنا پڑے''۔(ابوداؤد'نسائی'ابن ماجہ)

تشریح:**قوله:اذا سرق المملوك فبعه ولوبنش:**

یعنی غلام خواہ چوری چھوٹی کرے،خواہ بڑی کرے خواہ آبق ہو خواہ غیر آبق ہو اس کو اپنے پاس مت رکھو، وہ معیوب ہے اس کو بیچ ڈالو خواہ معمولی قیمت ملے

نش:نون کے فتحہ شین معجمہ کی تشدید کے ساتھ بیس درہم نصف اوقیہ۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

أن عبدًا له سرق وكان آبقا، فأرسل به الى سعيد بن العاص ليقطع يده فأبى سعيد وقال: لا تقطع يد الآبق اذاسرق، فقال عبدالله: فی أی كتاب وجدت هذا؟ فأمر به عبدالله فقطعت يده۔

عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے بھی یہ حکم صادر فرمایا تھا۔امام مالک،امام شافعی اور اکثر اہل علم کا کہنا بھی یہی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: اگر خاوند بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے کا مال چرائے یا کوئی غلام اپنے مالک یا اپنے مالک کی بیوی اور یا اپنی مالکہ کے خاوند کے مال کی چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ عام طور پر خاوند بیوی کو ایک دوسرے کے مال پر اور غلام کو اپنے آقا اور اس کے گھر والوں کے مال واسباب پر خود ان کی اجازت سے دسترس حاصل ہوتی ہے اس صورت میں ''حرز'' کی شرط پوری طرح نہیں پائی جاتی جو قطع ید کی سزا کے لئے ضروری ہے۔

مؤطا امام مالک میں ابن عمرؓ سے مروی ہے:

أنه أتی بغلام سرق مرآة لا مرأة سيده، فقال: ليس عليه شئ، خادمكم يسرق متاعكم۔

لہٰذا جب شوہر کے خادم کا ہاتھ نہیں کاٹا جارہا تو شوہر کا ہاتھ بطریق اولیٰ نہیں کاٹا جائے گا۔ (فتح القدیر ۵/۱۴۳۔۱۴۴)

عرض مرتب:

یہی حدیث آگے متن میں بھی آرہی ہے۔ اھ۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

چور سے نرمی برتنے کا بیان

۳۶۰۷: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ: اُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَارِقٍ، فَقَطَعَهٗ، فَقَالُوْا: مَا كُنَّا نَرَاكَ تَبْلُغُ بِهٖ هٰذَا قَالَ: لَوْ كَانَتْ فَاطِمَةُ لَقَطَعْتُهَا۔ (رواه النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۸ / ۷۲، الحدیث رقم: ٤٨٩٦، حج ٦ / ٤١

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا (یعنی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔) تو (مجلس عالی میں موجود صحابہؓ نے (یا اس کے کو لانے والے لوگوں نے) عرض کیا کہ ہمیں یہ خیال نہ تھا کہ آپ ﷺ اس کے بارے میں کچھ کریں گے (بلکہ ہمارا گمان تو یہ تھا کہ آپ ﷺ اس کو کے ساتھ رحمت ورأفت کا معاملہ گے) آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا ''اگر فاطمہ (بنت محمد) بھی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ (بھی) کاٹ دیتا''۔ (نسائی)

تشریح: قوله: اتی رسولٌ ۔۔۔ماكنا نراك تبلغ به: فقطعه: ایک نسخہ میں صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے اس کو معروف پڑھنا بھی درست ہے۔

نراك: نون کے ضمہ کے ساتھ ہے بمعنی'' نظنك''اور ایک نسخہ میں نون کے فتحہ کے ساتھ ''الرأی'' سے ہے۔

تبلغ به: تاء کے فتحہ اور لام کے ضمہ کے ساتھ، اور باء برائے تعدیہ ہے۔ ای توصله هذاالقطع۔

لوكانت فاطمة: ای لوفرض كون السارق فاطمة الزهراء

(یعنی معنوی اعتبار سے تقدیر عبارت یوں ہے۔) یعنی آیت کے اطلاق اور اس بات کے پیش نظر کہ امت میں برابری کمال عدالت کا تقاضا کرتی ہے میں بنی بیٹی......۔

امام طیبیؒ ''ماكنا نراك تبلغ به'' کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یعنی ہمارا گمان نہیں تھا کہ آپ اس کا ہاتھ کاٹیں گے، بلکہ ہمارا گمان تو یہ تھا کہ آپ کے ساتھ رحمت ورأفة کا معاملہ فرمائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی یہ بات سن کر فرمایا: یہ حقوق اللہ میں سے ایک حق ہے، اس حق کی ادائیگی ضروری ہے، اس میں مصلحت کی گنجائش نہیں ہے، اگر یہ کام میرے جگر گوشہ، میرے جسم کا ٹکڑا یعنی فاطمۃ الزہراء بھی کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالتا۔ گویا کہ آنحضرت ﷺ اس ارشاد

باری تعالیٰ کی طرف ارشاد فرمایا تھا ﴿ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ ﴾ [النور: ۲]

خادم اگر چوری کرے

۳۶۰۸: وَعَنِ بْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی عُمَرَ بِغُلَامٍ لَّهٗ، فَقَالَ: اقْطَعْ يَدَهٗ، فَاِنَّهٗ سَرَقَ مِرْآةً لِاِمْرَأَتِیْ، فَقَالَ عُمَرُ: لَا قَطْعَ عَلَيْهِ، وَهُوَ خَادِمُكُمْ اَخَذَ مَتَاعَكُمْ. (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ۲ / ۸۳۹، الحديث رقم: ۳۳ من كتاب الحدود

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے غلام کو لے کر آیا اور کہنے لگا کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیجئے کیونکہ اس نے میری بیوی کا آئینہ چرایا ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''یہ قطع ید کا مستوجب نہیں ہے کیونکہ یہ تمہارا خدمت گار ہے اور تمہارا ہی سامان لیا ہے۔''

(مالک)

تشریح: قوله: اقطع يده فانه سرق مرآة امرأتي ......:

''مرآۃ'' میم کے کسرہ راء کے سکون اور ہمزہ ممدودہ کے ساتھ ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس آئینہ کی قیمت ساٹھ (۶۰) درہم تھی۔

مزید فرماتے ہیں کہ اگر مولیٰ نے اپنے عبد مکاتب کی کوئی چیز چوری کر لی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ اس کی کمائی میں مولیٰ کا حق ہے اور اسلئے بھی کہ اس کا مال موقوف ودائر ہے سارق وغیر سارق کیلئے۔ جیسا کہ بائع مشتری میں سے کوئی اس چیز کو چرالے جس میں خیار شرط تھا اور جیسا کہ مولیٰ پر قطع ید نہیں ہے۔ اسی طرح عبد مکاتب پر بھی قطع ید نہیں ہے، اس لئے کہ یہ اس کا غلام ہے، اس طرح اگر مولیٰ کی بیوی کی کوئی چیز چرائی تو پھر بھی قطع ید نہ ہوگا۔ اکثر اہل علم کا فرمانا یہی ہے امام مالک، ابوثور اور ابن منذرؒ فرماتے ہیں کہ مولیٰ کے علاوہ کسی اور شخص کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا، مثلاً مولیٰ کی بیوی کی چیز چرانے پر اور اس کی دلیل آیت کا عموم ہے حضرت عمرؓ کا اثر ماقبل میں گزر چکا ہے کہ جو اپنے مولیٰ کی بیوی کی کوئی چیز چرانے کے بارے میں تھا۔ ابن مسعود سے بھی اسی کے مثل مروی ہے کسی بھی صحابی سے اس کے برعکس منقول نہیں ہے لہٰذا یہ اجماع کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا اس سے آیت میں تخصیص ہو جائے گی۔ اور مدبر کا حکم بھی اسی طرح ہے اور یہی حکم مال غنیمت سے چوری کرنے والے کا بھی ہے کہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس لئے کہ خود اس چور کا بھی اس مال غنیمت میں حصہ ہے یہ حضرت علیؓ سے منقول ہے عبد الرزاق نے اس کو اپنے مصنف میں ذکر کیا ہے:

أخبرنا الثوري عن سماك من حرب من أبي عبيد بن لابرص وهو يزيد بن دثار قال: حضرت علی کے پاس ایک چور لایا گیا جس نے مال غنیمت سے چوری کی تھی حضرت علیؓ نے فرمایا: له نصب وهو خائن۔ کہ مال غنیمت میں اس کا بھی حصہ ہے، یہ خائن ہے اور اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ اس نے ''مغفر'' (جنگی ٹوپی) چرائی تھی اس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اسی باب میں ایک حدیث ہے جو ابن ماجہ نے روایت کی ہے: ثنا جيادة بن المفلس عن حجاج بن

تمیم ، عن میمون بن مهران ، عن ابن عباس: خمس کے غلاموں میں سے ایک غلام نے مال خمس سے چوری کی، یہ قضیہ دربار رسالت میں پیش ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا اور فرمایا: مال الله سرق بعضه بعضا کہ ''اللہ کے کچھ مال نے اللہ ہی کے مال سے چوری کی ہے''۔ لیکن یہ ہمارا مطمع بحث نہیں ہے، اس لئے کہ ہمارا کلام اس چوری کے بارے میں ہے جو مال غنیمت کے حقدار کسی شخص سے صادر ہوئی ہو اور روایت کی سند بھی ضعیف ہے:

کفن چور کی سزا

۳۶۰۹: وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا اَبَا ذَرٍّ! قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَسَعْدَيْكَ قَالَ: كَيْفَ اَنْتَ اِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ يَكُوْنُ الْبَيْتُ فِيْهِ بِالْوَصِيْفِ يَعْنِى الْقَبْرَ قُلْتُ: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ' قَالَ: عَلَيْكَ بِالصَّبْرِ' قَالَ حَمَّادُ بْنُ اَبِىْ سُلَيْمَانَ: تُقْطَعُ يَدُ النَّبَّاشِ لِاَنَّهٗ دَخَلَ عَلَى الْمَيِّتِ بَيْتَهٗ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٥٦٤' الحديث رقم: ٤٤٠٩

ترجمہ: اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: ''اے ابو ذر رضی اللہ عنہ!'' میں نے عرض کیا ''میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! اور فرمانبردار ہوں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تمہاری اس وقت کیا حالت ہوگی جب لوگوں کو موت (یعنی کوئی بہت بڑی وباء اپنی لپیٹ میں لے لے گی) اور گھر (یعنی قبر) کی جگہ ایک غلام کے برابر ہو جائے گی (یعنی اس وقت وبا کی وجہ سے اتنی کثرت سے اموات ہوں گی کہ ایک ایک قبر کی جگہ ایک ایک غلام کی قیمت کے برابر خریدی جائے گی) میں نے عرض کیا اس کے بارے میں اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس وقت تم پر صبر لازم ہے'' حضرت حماد بن سلمہ کہتے ہیں کہ کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ وہ میت کے گھر میں داخل ہوا ہے''۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

حماد بن ابی سلیمان۔ یہ حماد ''ابوسلیمان'' کے بیٹے ہیں۔ ابوسلیمان کا نام ''مسلم اشعری'' ہے۔ یہ کوفی ہیں۔ ان کا شمار تابعین میں کیا جاتا ہے۔ ایک جماعت سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور ان سے شعبہ اور ابوسفیان ثوری وغیرہ نے روایت کی ہے۔ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم ہوئے ہیں۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی۔

تشریح: قوله: یا أباذر ---- قلت الله ورسول ماعلم:

لبيك وسعديك: أى أجبت لك مرة بعد أخرى مطلبت السعادة لاجابتك فى الاولى والآخرى

كيف أنت: اى كيف حالك وما لك۔ (یعنی اس وقت تیرے حال و مال کا کیا عالم ہوگا؟)

یکون البیت ای بیت الموت (موت کا گھر) أوبیت المیت (میت کا گھر)۔یعنی یہاں مضاف محذوف ہے۔):

یعنی القبر: یہ جملہ معترضہ ہے۔اس کا قائل حضرت ابوذر یا کوئی اور راوی ہے۔

قلت الله ورسوله اعلم: حضرت ابوذر کا یہ جواب درحقیقت اس آیت مبارکہ کی روشنی میں تھا: ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾[لقمان۔ ٣٤] قال علیك بالصبر۔

"علیك" بمعنیٰ "الزم" ہے۔ای الزم الصبر۔

یعنی ان تمام امور میں صبر کا مظاہرہ کرنا، چونکہ ایسے وقت میں صبر کرنے والا شخص اسی شخص کی مانند ہے جس نے انگارہ تھام رکھا ہو اور اس میں اشارہ ہے کہ اس وقت فتنے دین و بدن اور زندوں مردوں سب کو اپنی لپیٹ میں لئے ہونگے۔

قوله: حماد بن سلمان: نقطع یدالباش ...... علی المیت بیته: "بیتہ" مجرور ہے ایک نسخہ میں منصوب ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں، "میت" سے بدل ہونے کی بناء پر مجرور ہے۔تمیز و تفسیر ہونے کی بناء پر منصوب بھی ہوسکتا ہے۔جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَه﴾[البقرة۔ ١٣٠] یاأعنی فعل محذوف (کا معمول) ہے۔بعض نحویوں کا مذہب ہے کہ تمیز کا نکرہ آنا بھی جائز ہے۔

اس حدیث میں قبر پر بیت کا اطلاق کرنے کی وجہ سے حماد نے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ قبر، میت کیلئے حرز ہے۔لہٰذا کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔اھ۔

اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ قبر پر بیت کا حقیقتاً یا حکماً اطلاق کرنے سے اس کا حرز ہونا لازم نہیں آتا۔چنانچہ اگر کوئی شخص کسی ایک مکان سے کوئی چیز چرالے کہ جس کا دروازہ بند نہ ہو یا چوکیدار نہ ہو تو بالاتفاق اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ ہر چیز کی حرز عرف کے مطابق ہوتی ہے، کہ حرز وہ ہے جو عرف میں حرز شمار ہوتی ہو۔اسی لئے اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: نباش کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، طرفین ثوری، اوزاعی، اور زہری کا مذہب یہی اور "نباش وہ شخص ہے جو مردوں کے کفن ان کے دفن کے بعد چراتا ہے۔یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک ہے، امام ابویوسف اور ائمہ ثلاثہ کا کہنا ہے کہ ہاتھ کاٹا جائے گا۔یہی مذہب صحابہ میں سے عمر، ابن مسعود، عائشہ کا، اور علماء میں سے ابوثور، حسن، شافعی، شعبی، نخعی، قتادہ، حماد اور عمر بن عبدالعزیز کا ہے۔امام ابوحنیفہ کا قول ابن عباس ثوری، اوزاعی اور زہری کا قول ہے۔ان کی دلیل یہ روایت ہے: من نبش قطعناه

یہ حدیث "منکر" ہے۔اس روایت کی تخریج امام بیہقی نے کی ہے، اور اس کے ضعف کی صراحت کی ہے۔اس روایت کی سند یہ ہے: عن عمران بن یزید بن البراء بن عازب، عن أبیه، عن جده۔

اس کی سند میں بعض مجہول الحال ہیں مثلاً بشر بن حازم وغیرہ۔صاحب ہدایہ کی ذکر کردہ حدیث "لا قطع فی المختفی" بھی اس حدیث کی مانند ہے۔فرمایا اہل مدینہ کی لغت یعنی ان کے عرف میں اس کو "نباش" کہا جاتا ہے۔

آثار:

① ابن المنذر فرماتے ہیں: حضرت زبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے ''بناش'' کا ہاتھ کاٹا تھا۔ یہ روایت ضعیف ہے، اس روایت کو امام بخاریؒ نے ''تاریخ'' میں ذکر کیا ہے، اور سہیل بن ذکوان مکی کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے۔ عطاء کا کہنا ہے کہ ہم اس کو متّہم بالکذب قرار دیتے ہیں۔

② ابن أبي شیبہ روایت کرتے ہیں: قال: حدثنا شيخ لقيه بمنى، عن روح بن القاسم، عن مطرف، عن عكرمة، عن ابن عباس، قال: ليس على النباش قطع۔ یہ اثر بھی پچھلے اثر کی مانند ضعیف ہے، اس میں ایک راوی مجہول ہے۔

③ عبدالرزاق کی روایت ہے :أخبرنا ابراهيم بن أبي يحيٰى الاسلمي، أخبرني عبدالله بن أبي بكر، عن عبدالله بن عامر بن ربيعة: أنه وجد قوما يختفون القبور باليمن على عهد عمر بن الخطاب، فكتب فيهم الى عمر، فكتب عمر أن اقطع أيديهم۔ یہ روایت پچھلی روایت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

④ ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں: حدثنا عيسى بن يونس عن معمر عن الزهري، قال: أتى مروان بقوم يختفون أي ينبشون القبور۔ فضربهم ونفاهم والصحابة يتوافرون۔اھ۔

⑤ اس کو عبدالرزاق نے مصنفہ میں معمر کے طریق سے ''طوّف به'' کی زیادتی کے ساتھ روایت کیا ہے۔

⑥ عن ابن أبي شيبة حدثنا حفص بن أشعث عن الزهري، قال: أخذ نبّاش في زمن معاوية، وكان مروان على المدينة، فسأل من بحضرته من الصحابة والفقهاء، فأجمع رأيهم على أن يضرب ويطاف به اھ۔

لہٰذا از روئے آثار ہمارا مذہب بلاشبہ راجح ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں قطع نباش کے ثبوت کی تقدیر پر اس کو سیاست یا فسادی پر محمول کیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالعباد۔ (فتح القدیر ۵/۱۳۷)

بَابُ الشَّفَاعَةِ فِي الْحُدُوْدِ

حدود کے مقدمہ میں سفارش کا بیان

الفصل الاول:

۳۶۱۰: عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ قُرَيْشًا اَهَمَّهُمْ شَانُ الْمَرْاَةِ الْمَخْزُوْمِيَّةِ الَّتِيْ سَرَقَتْ فَقَالُوْا وَمَنْ تَكَلَّمَ فِيْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَقَالُوْا وَمَنْ يَجْتَرِئُ عَلَيْهِ اِلَّا اُسَامَةُ بْنِ زَيْدٍ حِبُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَلَّمَهُ اُسَامَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ: ثُمَّ قَامَ، فَاخْتَطَبَ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّمَا اَهْلَكَ الَّذِيْنَ قَبْلَكُمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ

الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ، وَاِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ اَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَاَيْمُ اللّٰهِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا (متفق عليه وفی رواية لمسلم) قَالَتْ: كَانَتِ امْرَأَةٌ مَخْزُوْمِيَّةٌ تَسْتَعِيْرُ الْمَتَاعَ وَتَجْحَدُهُ، فَاَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَطْعِ يَدِهَا، فَاَتَى اَهْلُهَا اُسَامَةَ فَكَلَّمُوْهُ فَكَلَّمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهَا، ثُمَّ ذَكَرَ الْحَدِيْثَ بِنَحْوِ مَا تَقَدَّمَ۔

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ٦ / الحديث رقم : ٣٤٧٥، و مسلم فی ٣ / ١٣١٥، الحديث رقم : (٨۔١٦٨٨) والترمذی فی ٤ / ٢٩، الحديث رقم : ١٤٣٠، والنسائی فی ٨ / ٧٣، الحديث رقم : ٤٨٩٩، وابن ماجه فی ٢ / ٨٥١، الحديث رقم : ٤٥٤٧، والدارمی فی ٢ / ٢٢٧، الحديث رقم : ٢٣٠٢

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ (ایک مرتبہ) قریشی صحابہؓ کو ایک مخزومی عورت جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا کے واقعہ نے غمگین کر دیا (وہ لوگوں سے عاریۃً سامان لے کر مکر بھی جاتی تھی اور آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا) ان قریشی صحابہؓ نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ اس عورت کے بارے میں کون شخص آپ ﷺ سے گفتگو (یعنی سفارش) کرے اور پھر انہوں نے یہ کہا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کو بہت محبت و تعلق ہے اس لئے اس بارے میں آپ ﷺ سے کچھ کہنے کی جرأت اسامہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہوسکتی (چنانچہ ان سب نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس پر تیار کیا کہ وہ اس عورت کے بارے میں آپ ﷺ سے گفتگو کریں) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے (ان لوگوں کے کہنے پر) آپ ﷺ سے گفتگو کی' رسول اللہ ﷺ نے (ان کی بات سن کر) فرمایا کہ ''تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟'' اور پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور (حمد و ثنا کے بعد اس خطبہ میں) فرمایا کہ ''تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ ان میں سے اگر کوئی شریف آدمی (یعنی دنیاوی عزت و طاقت رکھنے والا) چوری کرتا تو وہ اس کو (سزا دیئے بغیر یعنی اس پر حد جاری کئے بغیر) چھوڑ دیتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی کمزور و غریب آدمی چوری کرتا تو سزا دیتے تھے' قسم ہے خدا کی اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالوں''۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ''ایک مخزومی عورت (کی یہ عادت) تھی کہ وہ لوگوں سے عاریۃً کوئی چیز لیتی اور پھر اس سے انکار کر دیتی تھی' چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اس عورت کے رشتہ داروں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی اور پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے اس کے متعلق عرض کیا''۔ اس کے بعد (امام مسلم نے یا حضرت عائشہ سے روایت نقل کرنے والے راوی نے) حدیث کے وہی الفاظ ذکر کئے ہیں جو اوپر کی حدیث میں نقل کئے گئے ہیں''۔

قوله: ان قريشاأهمهم۔۔۔حب رسول الله ﷺ:

تشریح: عرب کہتے ہیں: أهمنی الأمر یہ اس وقت کہتے ہیں جو کوئی بات قلق میں ڈال دے اور غمگین کر دے۔

المرأة المخزومية: حدیث میں جس عورت کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام فاطمہ بنت اسود بن عبدالاسد تھا۔ وہ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے بھائی کی بیٹی تھی' چونکہ وہ بنی مخزوم سے تھی جو قریش کا ایک بڑا قبیلہ تھا' اس لئے قبیلہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کو''مخزومیہ'' کہا گیا ہے۔ابوجہل کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔

فقالوا: ایک نسخہ میں''قالوا'' ہے۔

حب: حاء مہملہ کے کسرہ کے ساتھ بمعنی''محبوب'' ''عطف بیان'' ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یا اسامہ سے''بدل'' ہے۔

من: کا عطف محذوف پر ہو رہا ہے۔أی : لا یجتری علیه منّا أحد لمهابته، ولما لا یأخذه فی دین اللّٰه رأفة وما یجتری علیه الا أسامة۔اھ۔

اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ استفہام انکاری ہے، نفی کے معنی دے رہا ہے، تقدیری عبارت کی بالکل ضرورت نہیں، لہٰذا معنی یہ ہوں گے: لا یجترئ علیه الا أسامة گویا یہ جملہ اس آیت کریمہ کی طرح ہے ﴿فهل یهلك الا القوم الفاسقون﴾ [الانعام: ٤٧] ترجمہ:''سو وہی برباد ہونگے جو نافرمانی کرینگے''۔

امام نووی فرماتے ہیں:''یجتری علیه'' کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ میں لاڈ پیار کے انداز میں سفارش کرنے کی جسارت حضرت اسامہ ہی کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی کھلم کھلا منقبت ہے۔اھ۔

قوله: فکلّمه أسامة:

یعنی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا گمان یہ تھا کہ ہر شفاعت حسنہ مقبول ہوتی ہے، اور اس آیت کریمہ سے ذہول ہوگیا: ﴿من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها ومن یشفع شفاعة یکن له کفل منها﴾ [النساء : ٨٥]'' جو شخص اچھی سازش کرے اس کو اس کی وجہ سے حصہ ملے گا اور جو شخص بری سازش کرے اس کو اس کی وجہ سے حصہ ملے گا۔''

أتشفع: استفہام برائے توبیخ ہے فاختطف: یعنی پر مبالغہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یا اس کا مطلب ہے کہ "الظهر خطبته"۔یہ معنی شارح کے اس معنی''خطب'' سے بہتر ہے

ثم قال: یعنی دوران خطبہ ارشاد فرمایا' یا اپنے رب کی حمد وثناء کے بعد ارشاد فرمایا۔

انما أهلك: صیغۂ معروف کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ حصر ادّعائی ہے' کہ ان لوگوں میں صرف ایک یہی برائی نہیں تھی بلکہ بہت سی برائیاں تھیں، ان برائیوں میں ایک برائی یہ تھی الذین من قبلکم: ممکن ہے کہ وہ سب لوگ اسی طرح کے ہوتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے بعض لوگ اس طرح کرتے ہوں۔انهم کانوا: ای سرق الخ أو ما أهلکم الا انهم کانوا۔ حصر ادعائی ہے' چونکہ ان لوگوں میں بہت سے امور پائے جاتے تھے ان میں سے ایک کام یہ تھا جو آگے آ رہا ہے۔

قوله: وایں اللّٰه ۔۔۔لقطعت یدها: ایم اللّٰه :(اس لفظ کے ضبط ومعانی میں مختلف آرائیں) ہمزہ وصلی' یاء کے سکون اور میم کے ضمہ وکسرہ کے ساتھ' علاوہ ازیں ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔صاحب قاموس لکھتے ہیں:

وايمن اللّٰه وايم اللّٰه بكسر أولهما، و ايم اللّٰه بكسره الهمزة والميم وهو اسم وضع للقسم ، والتقدير ايمن اللّٰه قسمي۔

صاحب النہایہ لکھتے ہیں کہ ''وأيم اللّٰه'' الفاظ قسم میں سے ہے۔اس کے ہمزہ کو مفتوح مکسور اور قطعی و وصل بنا کر پڑھا جاتا ہے

مصنفؒ کے صاحبزادہ شرح جزریہ میں لکھتے ہیں کہ اس میں اصل کسرہ ہے اس لئے کہ ہمزہ وصل جو گر جاتا ہے اور اس اسم میں فتحہ اس لئے دیا گیا کہ یہ حرف قسم واؤ کے قائم مقام ہے، پس واؤ کی وجہ سے اس کو بھی فتحہ دے دیا گیا۔بصریوں کے نزدیک یہ مفرد ہے اور سیبویہ کے نزدیک ''یمن'' برکت سے ماخوذ ہے گویا کہ کلام یوں ہے: بركة اللّٰه قسمي اور کوفیوں کا مذہب یہ ہے کہ یہ جمع ہے'اس کا ہمزہ قطعی ہے اور حالت وصل میں کثرت استعمال کی وجہ سے گر جاتا ہے۔

شرح مشارق میں لکھا ہے کہ ''وايم اللّٰه''، ہمزہ قطعی اور ہمزہ وصل کے ساتھ ہے۔یہ اصل میں ''اُیمن'' تھا۔جب یہ کلام عرب میں بکثرت استعمال ہونے لگا تو انہوں نے اس کا نون حذف کر دیا اور یوں کہنے لگے: ايم اللّٰه' أم اللّٰه ، م اللّٰه اھ۔اس لفظ میں کئی لغات ہیں جو صاحب قاموس نے ذکر کی ہیں۔

لو ان فاطمة: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر خصوصی طور پر اس لئے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ میں سے آپؓ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔

جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص کسی سے عاریۃً کوئی چیز لے کر اس سے مکر جائے اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی جب کہ حضرت امام احمدؒ اور اسحٰقؒ کا قول یہ ہے کہ ایسے شخص کا بھی ہاتھ کاٹنا واجب ہے۔ اس حدیث کے بموجب مجہور علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب حد کا کوئی قضیہ امام (حاکم) کے پاس پہنچ جائے تو اس کے بعد مجرم کے حق میں امام سے سفارش کرنا بھی حرام ہے اور کرانا بھی حرام ہے۔ہاں امام کے پاس قضیہ پہنچنے سے پہلے سفارش کرنے کرانے کی اکثر علماء نے اجازت دی ہے بشرطیکہ جس شخص کے حق میں سفارش کی جائے وہ شریف اور لوگوں کو ایذا پہنچانے والا نہ ہو۔اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی ایسے جرم وگناہ کا ارتکاب کیا ہو جس میں حد جاری نہ ہوتی ہو بلکہ ''تعزیر'' نافذ ہوتی ہو تو اس کے حق میں سفارش کرنا اور سفارش کرانا بہرصورت جائز ہے خواہ اس کا قضیہ امام کے پاس پہنچ چکا ہو یا نہ پہنچا ہو کیونکہ ایسی صورت میں سفارش کرنا نہ صرف یہ کہ آسان ہے بلکہ مستحب بھی ہے بشرطیکہ جس شخص کے حق میں سفارش کی جائے وہ کوئی شریف اور لوگوں کو ایذا پہنچانے والا نہ ہو۔

قوله:وفى رواية المسلم ......:

(مسلمؒ کی اس روایت کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو اس جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی کہ وہ لوگوں سے عاریۃً چیزیں لے کر مکر جاتی تھی حالانکہ یہ شرعی مسئلہ کے بھی منافی ہے' چنانچہ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری روایت میں) ''انکار'' کا ذکر محض اس عورت کا حال بتانے کے لئے ہے کہ وہ عورت اس قسم کی تھی اور اس کو قطع ید کی جو سزا دی گئی تھی اس کا تعلق اس کے چوری کے جرم سے تھا جیسا کہ پہلی روایت (جس کو بخاری ومسلم دونوں نے نقل کیا

ہے) میں بیان ہوا۔ گویا حاصل یہ نکلا کہ دوسری روایت لفظ ''وتجحدہ'' کے بعد لفظ ''فسرقت'' مقدر ہے (یعنی یہ لفظ ''فسرقت'' اگرچہ عبارت میں نہیں ہے مگر اس کے معنی مراد لئے جائیں گے)۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مراد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ چوری کی وجہ سے کاٹا گیا تھا' عاریت کا ذکر محض اس عوت کی پہچان کرانے اور صف بیان کرنے کے لئے ہے' تاکہ اس لئے کہ اس کا ہاتھ کٹنے کا سبب عاریت تھا۔ اس روایت میں سرقہ کا ذکر نہیں ہے' چونکہ اس روایت سے روای کا مقصود حدود کے بارے میں شفاعت کے ممنوع ہونے کو بیان کرنا ہے' تاکہ سرقہ کے بارے میں خبر دینا (مقصود ہے)

الفصل الثالث:

۳۶۱۱: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ حَالَتْ شَفَاعَتُهُ دُوْنَ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ فَقَدْ ضَادَّ اللّٰهَ' وَمَنْ خَاصَمَ فِيْ بَاطِلٍ وَهُوَ يَعْلَمُهُ لَمْ يَزَلْ فِيْ سَخَطِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَتّٰى يَنْزِعَ' وَمَنْ قَالَ فِيْ مُؤْمِنٍ مَا لَيْسَ فِيْهِ اَسْكَنَهُ اللّٰهُ رَدْغَةَ الْخَبَالِ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ (رواه احمد وابوداود وفي رواية للبيهقي في شعب الايمان) مَنْ اَعَانَ عَلٰى خُصُوْمَةٍ لَا يَدْرِيْ اَحَقٌّ اَمْ بَاطِلٌ فَهُوَ فِيْ سَخَطِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْزِعَ۔

أخرجه ابوداؤد في السنن ٤ / ٣٢ ' الحديث رقم: ٣٥٩٧' وأخرجه ابن ماجه في ٢ / ٢٨٧' الحديث رقم: ٢٣٢٠' وأحمد في المسند ٢ / ٧٠' والبيهقي في الشعب ٦ / ١٢٢' الحديث رقم: ٢٦٧٦

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جس شخص کی سفارش اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد کے درمیان حائل ہوئی (یعنی جو شخص اپنی سفارش کے ذریعہ حاکم کو نفاذِ حد سے روکے) گویا اس نے اللہ تعالیٰ سے ضد کی (اور گویا اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ حد جاری کی جائے) اور جس شخص نے جانتے ہوئے بھی کسی ناحق اور جھوٹی بات میں (کسی سے جھگڑا کیا) تو وہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار رہے گا جب تک کہ اس سے باز نہ آ جائے اور جس نے کسی مؤمن کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی جو اس میں نہیں پائی جاتی (یعنی کسی مؤمن پر بہتان لگایا) تو اس کو اللہ تعالیٰ اس وقت تک دوزخیوں کے کیچڑ' پیپ اور خون میں رکھے گا جب تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے نہ نکل آئے (یعنی جب تک کہ وہ توبہ کر کے اس گناہ سے نہ نکل آئے وہ دوزخیوں کی سی حالت میں رہے گا' یا یہ کہ جب تک کہ وہ اس گناہ کے عذاب کو بھگت کر پاک نہ ہو جائے دوزخیوں کے درمیان رہے گا) اس روایت کو احمدؒ اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ ''جس شخص نے کسی ایسے جھگڑے میں مدد کی جس کے حق و ناحق ہونے کا اس کو علم نہیں تو جب تک کہ وہ اس مدد سے باز نہ آ جائے اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار رہے گا''۔

تشریح: قوله: من حالت۔۔۔ فقد ضاد الله:

حالت: حیلولة بمعنیٰ ''حائل ہوجانا، رکاوٹ بننا'' سے مشتق ہے۔

ینزع: کہا جاتا ہے: نزع عن الامر نزوعاء اذاانتھی عنه (کسی کام سے رکنا)

قوله: ومن قال في مؤمن۔۔۔۔حتي يخرج مما قال: ردغة: راء مہملہ کے فتحہ، دال مہملہ کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ۔ محدثین اس لفظ کو دال کے سکون کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

ردغہ کا معنی ہے کیچڑ، بہت زیادہ دلدل، حدیث میں اس کی تفسیر ''عصارة اهل النار'' (جہنمیوں کا دھوون) کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

خبال: خاء معجمہ کے فتحہ کے ساتھ۔ اس کے اصل معنیٰ ''فساد'' ہیں (یعنی خرابی، نقصان، ہلاکت، تباہی، زہر قاتل، بوجھ، تھکن، تکلیف مشقت)۔

''فساد'' افعال میں بھی ہوتا ہے، ابدان میں بھی ہوتا ہے اور عقلوں میں بھی ہوتا ہے۔ اھ بعض کا کہنا ہے کہ حدیث میں اس کو ''صدید'' کا نام دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ بھی درحقیقت فاسد مواد ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''خبال'' جہنم کی ایک وادی ہے۔ جو حوض کی مانند ہے، جس میں اہل جہنم کا خون' پیپ' آنسو اور دھوون جمع ہوتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

حتي يخرج مما قال: یہاں سے نکلنے کی عقلاً تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

① اپنے جرم کی پوری پوری سزا بھگت لے۔

② اس کے حق میں کسی کی شفاعت قبول ہوجائے۔

③ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرماتے ہوئے اس کو معاف فرمادیں۔ قاضیؒ فرماتے ہیں اس سے خروج کی صورت یہ ہے کہ توبہ کرے اور اس شخص سے وہ چیز حلال کرائے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو یہاں اس وقت تک رکھیں گے جب تک وہ اپنی کہی ہوئی بات کے گناہ سے باہر نہیں نکل آتا، اور جب اس بات کے گناہ سے نکل آئے گا یعنی اپنے کیے کی پوری پوری سزا بھگت چکے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو یہاں مزید نہیں ٹھہرائیں گے بلکہ اس کو نجات عطا فرمادیں گے

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قاضیؒ کے کلام کے مطابق یہ ''حتی'' غیبت کرنے والے شخص کے فعل کی غایت ہے۔ اس کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے۔ لہٰذا ''اسكنه الله ردغة الخبال'' میں ''بسخطه وغضبه'' کی تاویل کرنا ضروری ہے، چونکہ درحقیقت اسی کے سبب اس شخص کو ''ردغة الخبال'' کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی تائید اس سے پچھلے اور اگلے جملہ سے بھی ہوتی ہے۔ چونکہ پہلے جملہ میں ''نزع'' کی تفسیر ترک خصوصیات باطلہ کے ساتھ کی گئی ہے۔ اور ایسا ہی تیسرے جملہ میں بھی ہے اور شفاعت کے ذریعہ آڑے آنا ان میں عظیم ترین جرم ہے، چونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے ضد بازی ہے۔ اس کے ساتھ ''نزع'' کا ذکر نہیں فرمایا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: چونکہ عام طور پر سفارش میں استمرار نہیں ہوتا، بخلاف ذکر کردہ دیگر امور کے اس کی تائید اس کے ساتھ مذکورہ قید سے بھی ہورہی ہے اھ اس حدیث میں غیبت کا ذکر غیبت کرنے والے شخص کے اس فعل غیبت کے گھٹیاپن کی منظر کشی ہے گویا کہ وہ شخص اب بھی اس گھٹیا کام کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اور اغتیاب کا ذکر مسبب کا سبب کی جگہ ذکر قبیل سے

یہ محل نظر ہے۔ چونکہ غیبت کی تعریف یہ ہے: **هي أن تذكر أخاك بما يكرهه وهو فيه** اور اگر وہ بات اس شخص میں موجود نہ ہو تو وہ ''غیبت'' نہیں بلکہ ''بہتان'' ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں منقول ہے:

فمن قال في مومن ماليس فيه لايكون مغتابابل يكون آتيا بالبهتان ۔

(أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٠١ الحديث رقم ٧٠-٢٥٨٩)

۳۶۱۲: وَعَنْ اَبِیْ اُمَیَّةَ الْمَخْزُوْمِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِلِصٍّ قَدِ اعْتَرَفَ اِعْتِرَافًا وَلَمْ یُوْجَدْ مَعَهٗ مَتَاعٌ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَا اِخَالُكَ سَرَقْتَ قَالَ بَلٰی فَاَعَادَ عَلَیْهِ مَرَّتَیْنِ اَوْ ثَلَاثًا كُلَّ ذٰلِكَ یَعْتَرِفُ فَاَمَرَبِهٖ فَقُطِعَ فَجِیْءَ بِهٖ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِسْتَغْفِرِاللّٰهَ وَتُبْ اِلَیْهِ فَقَالَ: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَللّٰهُمَّ تُبْ عَلَیْهِ ثَلَاثًا (رواه ابوداود والنسائی وابن ماجة والدارمی) **هٰكَذَا وَجَدْتُّ فِی الْاُصُوْلِ الْاَرْبَعَةِ وَجَامِعِ الْاُصُوْلِ وَشُعَبِ الْاِیْمَانِ وَمَعَالِمِ السُّنَنِ عَنْ اَبِیْ اُمَیَّةَ۔**

أخرجه ابوداوٗد في السنن ٤ / ٥٤٢، الحديث رقم: ٤٣٨٠، والنسائي في ٨ / ٦٧، الحديث رقم: ٤٨٧٧، وابن ماجه في ٢ / ٨٦٦، الحديث رقم: ٢٥٩٧، وأحمد في المسند ٥ / ٢٩٣

ترجمہ: ''اور حضرت ابوامیہ مخزومی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چور کو پیش کیا گیا جس نے اپنے جرم کا صریح اعتراف واقرار کیا لیکن (چوری کے مال میں سے) کوئی سامان اس کے پاس سے برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ ''میرا خیال نہیں ہے کہ تم نے چوری کی ہے'' اس نے کہا کہ ''ہاں میں نے چوری کی ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبار یا تین بار یہ کہا کہ (کہ میرا خیال نہیں ہے کہ تم نے چوری کی ہے) مگر وہ ہر بار یہ اعتراف واقرار کرتا تھا (کہ میں نے چوری کی ہے) آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم جاری کیا پھر کٹنے کے بعد) اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ ''(اپنی زبان کے ذریعہ) اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرو (اور اپنے دل کے ذریعہ) اس سے توبہ کرو''۔ اس نے کہا میں اللہ سے بخشش طلب کرتا ہوں اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں (یعنی توبہ کرتا ہوں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا ''اے اللہ! اس کی توبہ قبول فرما''۔ اس حدیث کو امام ابوداوٗد' نسائی' ابن ماجہ' دارمی نے (ابوامیہ سے اسی طرح) روایت کیا ہے (جس طرح میں نے روایت کیا ہے کہ یہ حدیث ابوامیہ سے مروی ہے تا کہ ابورمثہ سے) اور (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) میں نے اس روایت کو ان چاروں اصل کتابوں (ابوداوٗد' نسائی' ابن ماجہ' دارمی) میں' (ابن اثیر کی) جامع الاصول میں اور بیہقیؒ کی شعب الایمان میں اور (خطابی کی) معالم السنن میں (اسی طرح) یعنی ابوامیہ رضی اللہ عنہ سے منقول پایا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابوامیہ مخزومی ۔ یہ ابوامیہ مخزومی صحابی ہیں۔کہا گیا ہے کہ ان کا نام معلوم نہیں ہے ان کا شمار اہل حجاز میں ہے۔ان سے ''ابوذر'' کے آزاد کردہ غلام ''ابوالمنذر'' روایت کرتے ہیں۔

تشریح:قوله:ان النبی ﷺ أتی بلص۔۔۔کل ذلك یغرف:

بلص: صاحب قاموس کا کہنا ہے کہ لام پر تینوں حرکتیں درست ہیں،اور صاد مہملہ تشدید کے ساتھ ہے۔

قد اعترف: ایک نسخہ میں فقد اعترف ہے۔

اخال: ہمزہ کے کسرہ اور فتحہ دونوں طرح پڑھا جاتا ہے،کسرہ پڑھنا افصح ہے۔اصل میں ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔فتحہ کو خلاف قیاس کسرہ سے بدل دیا۔صرف بنواسد ہی ہمزہ کو مفتوح پڑھتے ہیں۔

مرتین او ثلاثا: راوی کو شک ہے کہ'' مرتین''فرمایا تھا یا'' ثلاثا'' فرمایا تھا۔

کل ذلك: منصوب ہے''یعترف'' کا ظرف ہے اور اہتمام کے پیش نظر مقدم کیا گیا ہے اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے،لیکن رفع پڑھنے کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔اور ذلک کا مشارالیہ''مذکور'' ہے۔

ثلاثاً: منصوب علی المصدر ہے،اور عامل''فأعاد'' ہے۔

اور ثلاثا کا مابعد جملہ اس کی صفت واقع ہو رہا ہے۔

قوله:فأمربه۔۔۔ اللهم تب علیه ثلاثا:اللّٰهم تب علیه ثلاثا: آنحضرتؐ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے کہ حد بالکلیہ مظہر نہیں،یہ اس معین گناہ کے لیے مظہر ہے چنانچہ من جانب اللہ اس پر دوبارہ عقاب نہیں ہوگا۔قطع ید ہوچکنے کے بعد اس شخص کو آنحضرت ﷺ نے استغفار کرنے کا حکم فرمانا اور پھر اس کے لئے دعا فرمانا یہ تاکید ہے اور توبہ کی تقریر ہے اھ یہ محل نظر ہے یہ جملہ ارشاد فرمانے کی غرض یہ تھی کہ اللہ اس کی توبہ کو قبول ترتیب وتصحیح کرنے (اور اگر توبہ قبول ہو چکی ہے تو) اس پر ثابت قدم فرمائے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے فقہاء نے استشہاد کیا ہے کہ امام کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ چور کو رجوع کی تلقین کرے نیز اگر اعتراف کے بعد رجوع کرے تو اس کا رجوع مقبول ہے،اس پر سے حد ساقط ہو جائے گی۔جیسا کہ زنا کے بارے میں بھی یہی مسئلہ ہے۔امام شافعی سے حکایت کئے گئے ان کے اقوال میں سے قول اصح بھی یہی ہے۔اور جو حضرات فرماتے ہیں کہ سرقہ کا ثبوت ایک مرتبہ اقرار سے بھی ثابت ہو جاتا ہے وہ فقہاء بھی اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔امام ابویوسف،امام احمد اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک یہی ہے۔کیونکہ اگر اقرار اول کے ذریعہ اس کا جرم ثابت ہو گیا تو اس پر حد قائم کرنا ضروری ہوگا اور اس کو رجوع کی تلقین کرنا حرام ہوگا۔اور دلیل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے:**تعافوا بالحد و دفیما بینکم، فما بلغنی من حد فقد وجب۔**

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کو رجوع کی تلقین اسلئے کی تھی کہ آپ اس کیلئے رجوع کی گنجائش سمجھ رہے تھے۔چنانچہ ارشاد نبوی ہے:**ادرؤوا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله** ایسے

موقع پر واجب ہے جہاں کوئی مخرج نہ ہو۔

خطابیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم کے اس قول: "مااخالك سرقت" کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ آپ کا گمان یہ تھا کہ ممکن ہے اس نے اعتراف غفلت کی بناء پر کرلیا ہو سرقہ اور اس کے احکام سے یا اس کو سرقہ کا معنی ہی معلوم نہ ہو۔ اس بات کے پیش نظر حضور نے یہ چاہا کہ اس سلسلہ میں اس سے حقیقت حال معلوم کی جائے سارق کو رجوع کرنے کی تلقین کا مسئلہ صحابہ کی ایک جماعت سے منقول ہے اھ

ملا علی قاریؒ اس پر رد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں تو صرف اعادہ اقرار ہی ہوا تھا، سرقہ اور اس کے احکام کی وضاحت طلبی تو اس سے ظاہر نہیں ہوتی نہ ظنی طور پر اور نہ یقینی طور پر۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ نے اس کے بارے میں جو گمان کیا سو کیا، اور جب اس نے اعتراف کرلیا اور صورتحال یہ تھی کہ اس کے پاس چوری کا مال نہیں تھا، اسلئے مسلمان کے بارے میں حسن ظن کے لئے اس علامت کو کافی سمجھا۔ اھ یہ بھی محل نظر ہے اس لئے کہ مسلمان کے بارے میں حسن ظن کسی علامت پر موقوف نہیں ہے جب کہ مسلمان کے بارے میں حسن ظن یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں جھوٹ نہیں بولتا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کے اقرار پر بھی قطع ید ہوگا طرفین امام مالک، امام شافعی اور اکثر علمائے امت کا یہی موقف ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں قطع ید نہیں ہوگا۔ امام احمد، ابن ابی لیلی، زفر اور شبرمہ ان تمام حضرات کی رائے اس حدیث کی بنیاد پر یہی ہے کہ قطع ید تکرار کے بغیر نہیں ہوگا۔

مزید دلیل طحاوی کی روایت ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ایک شخص نے چوری کا اقرار دو مرتبہ کیا تو آپؓ نے فرمایا تم اپنے خلاف دو مرتبہ گواہی دے چکے ہو۔ چنانچہ آپؓ نے حکم صادر فرمایا تو اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کی گردن میں لٹکا دیا گیا۔

امام ابوحنیفہ کا مستدل بھی طحاوی کی روایت ہے جو ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے عرض کیا یا رسول اللہ! اس نے چوری کی ہے رسول اللہ نے فرمایا میں خیال نہیں کرتا کہ اس نے چوری کی ہے چور بولا کیوں نہیں یا رسول اللہ حضور نے فرمایا: اس کو لے جاؤ اور اس کا ہاتھ کاٹ دو، اور پھر داغ کر میرے پاس لے آؤ۔ راوی کہتے ہیں کہ ان صاحب کو لے جایا گیا اور ہاتھ کاٹنے کے بعد داغ دیا گیا تو پھر رسول ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا: تبت الی الله عزو جل اس نے کہا: "تبت الی الله عزو جل"۔ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا: "تاب الله عليك"۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایک مرتبہ کے اقرار سے قطع ید ہوجائے گا۔

اور ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ جب احادیث میں تعارض ہو تو تصحیح و ترجیح کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ پچھلی حدیث کو اس بات پر حمل کرنا اولیٰ ہے کہ پہلا اقرار صحابہ کی موجودگی میں کیا تھا۔ پھر صحابہ نے اسی اعتراض کی بناء پر حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اس نے چوری پر گواہی دی۔ اس طرح سے دونوں حدیثوں میں تطبیق ہوسکتی ہے اور تعارض بھی رفع ہوسکتا ہے۔ اور دونوں کا حاصل یہی کہ متعدد بار اقرار ضروری نہیں۔ واللہ اعلم۔

۳۶۱۳: وَفِی نُسَخِ الْمَصَابِیحِ عَنْ اَبِی رِمْثَۃَ بِالرَّاءِ وَالثَّاءِ الْمُثَلَّثَۃِ بَدَلَ الْھَمْزَۃِ وَالْیَاءِ۔

مصابیح السنۃ ۲ / ۵۵۳' الحدیث رقم : ۲۷۲۱

لیکن مصابیح کے بعض نسخوں میں اس روایت میں ابو رمثہ ہمزہ اور یا کی بجائے را اور ثا مثلثہ کے ساتھ منقول ہے (رمثہ میں میں ساکن سے پہلے را مکسور ہے)

فائدہ: جان لیجئے کہ یہ باب فصل ثالث سے خالی ہے اور مؤلف نے بھی اس بات کو ذکر نہیں کیا' فصل ثالث کے عدم التزام کے باعث اس کی احتیاج بھی نہیں۔ البتہ بہت سی ایسی احادیث چھوٹ گئی ہیں جن کا تعلق اصل باب سے تھا؛ دران کا علم بہت اعلم تھا۔ مثلاً چوری کا مال چور کے پاس پایا گیا اور قطع ید کے بعد مفقود ہو گیا تو سارق پر ضمان آئے گا یا نہیں وغیرہ۔ لیجئے میں یہ مسئلہ اختلاف علماء اور ادلہ کے ساتھ آپ کے لئے ذکر کرتا ہوں۔

''ہدایہ'' میں مذکور ہے کہ جب چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور مال مسروق چور کے پاس ہو تو صاحب مال کو واپس لوٹایا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ مال مسروق سابقہ ملک پر برقرار ہے اور اگر مال مسروق ہلاک ہو گیا تو ضامن نہیں ہوگا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ یہ اطلاق ہلاک و استہلاک دونوں کو شامل ہے۔ جب استہلاک کی صورت میں وہ ضامن نہیں ہے حالانکہ اس کی جنایت ثابت ہے تو ہلاک کی صورت میں جب کہ جنایت بھی نہیں ہے تو ضامن نہ ہونا بطریق اولیٰ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ کی ایک روایت امام ابو یوسف کے طریق سے یہی منقول ہے اور یہی مشہور ہے سفیان ثوری عطاء شعبی مکحول، ابن شبرمہ اور ابن سیرین بھی یہی فرماتے ہیں اور حسن نے ان سے روایت کیا ہے کہ استہلاک کی صورت میں ضامن ہوگا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں یعنی ہلاک و استہلاک میں ضامن ہوگا یہی قول امام احمدؒ، حسنؒ نخعیؒ، لیثؒ، اسحاقؒ اور حمادؒ کا بھی ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر سارق موسر ہو تو ضامن ہوگا اور اگر معسر ہو تو ضامن نہیں ہوگا۔ اس میں طرفین کی رعایت ہے اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر وہ چیز اس کے ہاتھ میں موجود ہو تو مالک کو واپس لوٹائی جائے گی اور اسی طرح اگر اس کو بیچ دیا، یا ہبہ کر دیا تو مشترک اور موہوب لہ سے واپس لی جائے گی۔

یہ تمام صورتیں قطع ید کے بعد ہیں اگر شیء کے مالک نے قطع ید سے پہلے کہا کہ میں اس کا ضامن ہوں تو ہمارے نزدیک اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا چونکہ اس کا یہ ضمانت لینا دعویٰ سرقہ سے دعویٰ مال کی طرف رجوع کو متضمن ہے۔

دیگر حضرات کی دلیل اس آیت مبارکہ کا عموم ہے ﴿ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [البقرۃ : ۱۹۴] اور اس لئے بھی کہ اس نے ایک مملوک کو عدواناً تلف کیا ہے لہٰذا غصب پر قیاس کرتے ہوئے ضامن ہوگا۔

اور مانع تو محض منافات ہے کہ حق قطع اور حق ضمان کے درمیان منافات ہے' حالانکہ کوئی بھی منافاۃ نہیں اس لئے کہ یہ دو علیحدہ حق ہیں اور دونوں کا سبب بھی مختلف ہے۔ ان میں سے ایک اللہ کا حق ہے اور وہ ہے اس جنایت خاصہ سے نہی اور دوسرا حق حق عبد ہے لہٰذا حق اللہ کی رعایت کے پیش نظر قطع ہوگا اور حق عبد کے پیش نظر ضمان آئے گا۔ یہ ایسے ہو گیا جیسے حرم میں کسی صید مملوک کو ہلاک کر دیا جائے کہ حق اللہ کے پیش نظر جزاء واجب ہوگی اور حق عبد کی خاطر ضمان آئے گا۔

ہماری دلیل وہ ارشاد نبوی ہے جو امام نسائیؒ نے نقل کیا ہے: عن حسان بن عبد اللہ عن المفضل بن فضالۃ عن

یزید قال سمعت سعد بن ابراهیم یحدث عن اخیه المسور بن ابراهیم عن عبد الرحمن بن عوف :لایعرم صاحب سرقة اذا قیم علیه الحد

اوردارقطنی کی روایت میں یوں ہے: **لا غرم علی السارق بعد قطع یمینه** اس کوضعیف کہا گیا ہے۔ چونکہ مسور بن ابراہیم نے عبدالرحمٰن بن عوف کونہیں پایا وہ ان کے دادا تھے یہ مسور بن ابراہیم بن عوف ہیں۔ اور سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف ہیں اور سعد بن ابراہیم مجہول ہے

اس میں ایک اور انقطاع بھی ہے کیونکہ اسحاق بن فرات نے مفضل سے روایت لی ہے اور ابن منذرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سعد بن ابراہیم مجہول ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ قاضی مدینہ زہری ہیں اور وہ ثقات میں سے ہیں اور ہمارے نزدیک ارسال قادع نہیں ہے بشرطیکہ راوی ثقہ ہو اور امین ہو اور یہ ساقط راوی اگر زہری ہیں تو پھر جہالت کا قدح بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ابن قدامہ کے اس کلام ''**انه یحمل غرم السارق علی أجرة القاطع**'' کا جواب بزار کی یہ روایت ہے: **لایضمن السارق سرقته بعد اقامة الحد** اھ

مبسوط میں ہشام نے محمد سے نقل کیا ہے کہ سارق سے ضمان قضاءً ساقط ہو جائے گا چونکہ مماثلت کا حکم متعذر رہے البتہ دیانتاً ضمان کا فتویٰ دیا جائے گا۔ چونکہ مالک کو سارق کی وجہ سے نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

''ایضاح'' میں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سارق کیلئے اس چیز سے کسی بھی طرح انتفاع درست نہیں، اس لئے کہ کپڑا پر مسروق منہ کی ملک برقرار ہے اسی طرح اگر اس کی قمیص سلوائی تو بھی انتفاع درست نہیں، اس لئے کہ وہ اس کا مالک ایک محظور سبب سے بنا ہے اور قضاء کے وجود کا مسئلہ ماقبل میں محقق ہو چکا ہے جیسا کہ وہ شخص جو دارالحرب میں امان لے کر داخل ہو اور ان کی کوئی چیز اٹھا لے تو قضاءً اس چیز کو لوٹانا واجب نہیں اور دیانتاً لازمی ہے جیسا کہ باغی جب عادل کا مال تلف کر دے اور پھر توبہ کرے تو اس پر ضمان کا حکم تو عائد نہیں ہوگا چونکہ ایجاب ضمان متعذر رہے ایک ایسے عارض کی وجہ سے جو حکم کے حق میں ظاہر ہوا ہے البتہ دیناً اعتبار کیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بَابُ حَدِّ الْخَمْرِ

عرض مرتب:

حد خمر کے بارے میں ''تقریر ترمذی'' کی بحث ''چھنی چھنائی'' محسوس ہو رہی تھی سو افادہ قارئین کی خاطر جوں کی توں پیش کی جاری ہے:

حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں چالیس کوڑے مارے گئے اور دو جوتوں سے مارے گئے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے ہی سے اس بارے میں یہ اختلاف ہو گیا کہ کیا حد چالیس کوڑے ہیں؟ یا آلے کی تثنیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی کو اسّی (۸۰) کوڑے کہا جائے؟ چنانچہ اس اختلاف کو دور کرنے کیلئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع بلایا۔

اس وقت حضرت علی نے یہ مشہور جملہ کہا:

''ان الرجل اذا ضرب سکر، واذا سکر هذی، واذا هذی حذف واذا قذف حد ثمانین، اجعلوه ثمانین''

یعنی جب آدمی شراب لیتا ہے تو نشہ آتا ہے اور جب نشہ آیا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان بکتا ہے تو کسی پر تہمت لگاتا ہے اور جب تہمت لگاتا ہے تو اس پر اسّی (۸۰) کوڑے کی حد مقرر ہوتی ہے اس لئے شرب خمر پر بھی اسّی (۸۰) کوڑے لگانے چاہیں۔

اسی روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسّی (۸۰) کوڑے کی جو سزا مقرر فرمائی گئی وہ اس قیاس سے کی گئی جو حضرت علی نے پیش کیا۔

اِس قیاس سے وہ فرماتے ہیں کہ شراب پینے کے نتیجے میں سکر ہوگا اور سکر کے نتیجے میں ہذیان ہوگا اور ہذیان کے نتیجے میں قذف ہوگا اور قذف کے نتیجے میں اسّی (۸۰) کوڑے ہونگے۔ حضور اقدس ﷺ کے عمل کی دو تشریحات کی جاسکتی ہیں:

ایک تشریح یہ ہے کہ چالیس کوڑے کی حد ہے

دوسرے یہ کہ اسّی (۸۰) کوڑے کی حد تو اب حضرت علی نے اسّی (۸۰) کوڑے والی تشریح کو اختیار کرتے ہوئے ایک وجہ ترجیح نکتے کے طور پر یہ پیش کی تو حضرت فاروق اعظمؓ نے پھر اسّی (۸۰) کوڑوں کو ہی مقرر فرمایا۔

حضور ﷺ کے عمل میں دونوں احتمال تھے؟ لیکن چونکہ حضور اقدس کے عمل میں دونوں احتمال تھے چالیس کا بھی احتمال تھا اور اسّی کا بھی احتمال تھا اس لئے حضرت علیؓ نے فرمایا:

''اگر میں کسی شخص پر حد جاری کروں اور کوڑے لگنے کی وجہ سے اس کا انتقال ہو جائے تو مجھے صدمہ نہیں ہوگا۔ البتہ اگر شرب خمر کی وجہ سے کسی پر اسّی (۸۰) کوڑے کی حد جاری کروں اور اس کا انتقال ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے یہ اسّی (۸۰) کوڑے قیاس سے مقرر کئے ہیں''

لیکن اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسّی (۸۰) کوڑوں کی حد قیاس سے مقرر کی بلکہ مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے دونوں باتیں ثابت تھیں اور دونوں احتمال تھے ان میں سے ہم نے اسّی (۸۰) والے احتمال کو جو مقرر کیا اس میں قیاس کا تھوڑا سا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ شرب خمر میں حد نہیں ہے بلکہ یہ چالیس کوڑے یا اسّی (۸۰) کوڑے تعزیر ہے۔ اور امام کو یہ حق حاصل ہے کہ چاہے تو وہ چالیس کوڑے لگائے چاہے تو اسّی (۸۰) کوڑے لگائے۔ یہ امام طحاوی کا مسلک ہے۔

حنفیہ کی تائید میں ایک اور حدیث:

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

''حضور اقدس ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی ہوئی تھی تو آپؐ نے اس کو دو شاخوں سے تقریباً چالیس مرتبہ مارا۔''

یہاں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ اگر چہ عدد چالیس کا ہے لیکن آلے دو ہیں۔حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی ایسا ہی کیا۔جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے لوگوں سے مشورہ کیا،مشورہ کرنے کی وجہ پیچھے بیان کردی ہے۔تو حضرت علی نے یہ مشورہ دیا کہ شراب کی ''حد سب سے ہلکی حد کے برابر ہونی چاہیے اور سب سے ہلکی حد حدِ قذف ہے۔لہٰذا اس کے برابر اسّی (۸۰) کوڑے ہونے چاہئیں''۔

گویا کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم آلے کی تثنیہ کو مدنظر رکھیں تو عدد ثمانین بنتا ہے اور یہ عدد اخف الحدود کے موافق ہے۔اس لیے (۸۰) کو مقرر کرنا زیادہ بہتر ہے چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اسی کے مطابق حکم دے دیا۔

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص شراب پئے تو اس کو کوڑے لگاؤ اور اگر یہ چوتھی مرتبہ بھی شراب پئے تو اس کو قتل کردو۔

یہی وہ حدیث ہے جس کے بارے میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''علل'' میں فرمایا ''اس حدیث پر کسی فقیہ نے عمل نہیں کیا۔کیونکہ چوتھی مرتبہ شراب پینے کے نتیجے میں قتل کرنے کا حکم کسی فقیہ کے نزدیک نہیں ہے۔''

لیکن حنفیہ اس حدیث پر عمل کرتے ہیں وہ اس طرح کہ ان کے نزدیک چوتھی مرتبہ شراب پینے پر قتل کرنا حد کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ تعزیراً اور سیاستاً ہے۔لہٰذا اگر امام یہ محسوس کرے کہ یہ شخص شراب پینے سے باز نہیں آرہا اور اس کا یہ عمل دوسرے لوگوں کیلئے فساد کا موجب ہوسکتا ہے تو اس صورت میں امام کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو تعزیراً قتل کردے اس طرح حنفیہ ایسی حدیث پر عمل کرلیتے ہیں۔

الفصل الاول :

۳۶۱۴:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَرَبَ فِی الْخَمْرِ بِالْجَرِیْدِ وَالنِّعَالِ وَجَلَدَ اَبُوْبَکْرٍ اَرْبَعِیْنَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٢/ ٦٣، الحديث رقم: ٦٧٧٣، و مسلم في ٣/ ١٣٣١، الحديث رقم: (٣٦ ـ ١٧٠٦) وأبو داود في السنن ٤/٦٢١، الحديث رقم: ٤٤٧٩، وابن ماجه في ٢/ ٨٥٨، الحديث رقم: ٢٥٧٠، وأحمد في المسند ٣/ ١٧٦۔

ترجمه: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے شراب نوشی پر (بطور سزا کے) کھجور کی ٹہنیوں (چھڑیوں) اور جوتوں سے مارا (یعنی مارنے کا حکم دیا) اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (اپنے دور خلافت میں شراب پینے والے کو) چالیس کوڑے مارے۔(بخاری ومسلم

تشریح: قوله:ضرب في الخمر بالجريد والنعال:

في الخمر: یہاں مضاف محذوف ہے:أي في شارب الخمر یا تقدیری عبارت یوں ہے:ضرب شارب الخمر لأجل شربها۔

الجريد: جريدة کی جمع ہے کھجور کی ٹہنی ۔''جریدۃ'' کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مجردۃ عن الخص'' پتوں سے کالی) ہوتی

ہے۔''خوص'' کھجور کے پتوں کو کہتے ہیں۔
نِعَال: بروزن ''کتاب'' ہے اس چیز کو کہتے ہیں جو پاؤں میں پہنی جاتی ہے۔
أربعين: کی تمیز محذوف ہے۔أی جلدة أو ضربة ۔

عرض مرتب:

اس حدیث کے متعلقہ مباحث ''احکام باب'' میں ذکر کئے ہیں وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

۳۶۱۵:وَفِیْ رِوَايَةٍ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَضْرِبُ فِی الْخَمْرِ بِالنِّعَالِ وَالْجَرِيْدِ اَرْبَعِيْنَ.

اخرجه البخاری ح ۶۷۷۳۔أخرجه مسلم فی صحيحه ۳ / ۱۳۳۱' الحديث رقم : (۳۷ ۔ ۱۷۰۶)

ترجمہ:اور ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یوں منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شراب نوشی کی حد (بطورِ سزا) چالیس جوتے اور کھجور کی ٹہنیاں مارتے تھے (یعنی مارنے کا حکم دیتے تھے)۔''

۳۶۱۶:وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ :يُؤْتٰی بِالشَّارِبِ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِمْرَةِ اَبِیْ بَكْرٍ وَصَدْرًا مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ' فَنَقُوْمُ عَلَيْهِ بِاَيْدِيْنَا وَنِعَالِنَا وَ اَرْدِيَتِنَا' حَتّٰی كَانَ آخِرُ اِمْرَةِ عُمَرَ' فَجَلَدَ اَرْبَعِيْنَ حَتّٰی اِذَا عَتَوْا وَ فَسَقُوْا جَلَدَ ثَمَانِيْنَ . (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۲ / ۶۶' الحديث : ۶۷۷۹

ترجمہ:''اور حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے ابتدائی دور میں یہ معمول تھا کہ جب کوئی شراب پینے والا لایا جاتا تو ہم اٹھ کر اس کو اپنے ہاتھوں اپنے جوتوں اور اپنی چادروں سے (یعنی چادروں سے کوڑے بنا کر) اس کی پٹائی کرتے یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں چالیس کوڑے مارنے لگے (پھر یہی سزا برقرار رہی) یہاں تک کہ جب شراب پینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور سرکشی بڑھ گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسّی کوڑے (بطور سزا کے) مارے''۔(بخاری)

تشریح:امرة :ہمزہ کے کسرہ، میم کے سکون، بمعنی امارت خلافت۔
كان آخر :مرفوع ہے، اور ایک نسخہ میں منصوب ہے ''کان'' کی خبر ہونے کی وجہ سے۔ أی كان الزمان آخر امارة عمر ۔

الفصل الثانی:

۳۶۱۷:عَنْ جَابِرٍ' عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَاجْلِدُوْهُ' فَاِنْ عَادَ فِی الرَّابِعَةِ فَاقْتُلُوْهُ' قَالَ :ثُمَّ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذٰلِكَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ فِی الرَّابِعَةِ

فَضَرَبَهُ وَلَمْ يَقْتُلْهُ ۔ (رواه الترمذی)

سنن أبی داود، ح ٤٤٨٥، خرجه الترمذی فی السنن ٤ / ٣٩، الحدیث رقم : ١٤٤٤

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص شراب پئے اس کو کوڑے مارو اور جو شخص (بار بار پئے یہاں تک کہ) چوتھی مرتبہ پئے تو اس کو قتل کر ڈالو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس (ارشاد گرامی) کے بعد ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ایسے شخص کو پیش کیا گیا جس نے چوتھی مرتبہ شراب پی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور سزا کے) اس کو مارا لیکن اس کو قتل نہیں کیا۔ (ترمذی)

قوله: قال من شرب الخمر فاجلدوه۔۔۔فاقتلوه:

من شرب : اور ایک صحیح نسخہ میں ''أن من'' ہے۔

فاقتلوه: اس سے مراد ضرب شدید ہے، یا یہ امر وعید کے لئے ہے چونکہ متقدمین ومتأخرین میں سے کسی ایک کا مذہب یہ نہیں ہے کہ شرابی کو قتل کیا جائے گا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

قوله : فضربه ولم يقتله: اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ چوتھی مرتبہ شراب نوشی قتل کرنے کا حکم منسوخ ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ قرینہ ہے کہ ''**فاقتلوه**'' ضرب مبرح سے مجاز ہے اس شخص کی ڈھٹائی اور تمرد کی وجہ سے اس کی سزا میں مبالغہ کے لئے فرمایا۔ اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ حضرت عمرؓ نے اسی (۸۰) کوڑے کا حکم اسی کی بنیاد پر دیا ہو۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ کبھی ''امر'' وعید کے لئے ہوتا ہے، اس سے وقوع فعل مراد نہیں ہوتا، بلکہ ردع وتحذیر مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان ہے: **من قتل عبده قتلناه** جب کہ اکثر فقہاء فرماتے ہیں کہ کسی نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ابو عیسیٰ فرماتے ہیں یہ حکم ابتداء میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ شراب نوشی حرام ہے۔ شرابی پر حد واجب ہو گی، خواہ اس نے شراب تھوڑی مقدار میں پی ہو، خواہ زیادہ مقدار میں پی ہو، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، اگرچہ اس سے یہ فعل بارہا صادر ہوا ہو۔ قاضی عیاض نے ایک طائفہ شاذہ سے نقل کیا ہے کہ چار کوڑے مارنے کے بعد اس کو قتل کر دیا جائے۔ ان قائلین کا مستدل یہی روایت ہے ان کا یہ موقف باطل ہے۔ کیونکہ خلاف اجماع ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ناسخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مبارک ہے: **لایحل دم امریء مسلم الا باحدی ثلاث**۔ غلام کی حد، آزاد کی حد کے مقابلہ میں نصف ہے۔ جیسا کہ حد زنا اور حد قذف میں ہے۔

نبیذ پینے والے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے یہ اختلاف انگور کی نبیذ کے علاوہ دیگر نشہ آور نبیذ کے بارے میں ہے۔ امام مالک امام شافعی اور جمہور فرماتے ہین کہ یہ حرام ہے اس کے پینے پر بھی کوڑے مارے جائیں گے، خواہ وہ شخص اس کی اباحت کا اعتقاد رکھتا ہو، خواہ تحریم کا۔ امام ابو حنیفہ اور کوفی فرماتے ہیں نہ حرام ہے اور نہ حد جاری کی جائے گی۔ اور ابو ثور فرماتے ہیں یہ حرام ہے اس کی تحریم کا اعتقاد رکھتے ہوئے اس کو پینے والے شخص کو کوڑے لگائے جائیں نہ کہ اس کو مباح سمجھنے والے کو۔ اھ۔ اس مسئلہ کی تحقیق اور اس سے متعلقہ دلائل عنقریب آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

۳۶۱۸: وروا ه ابو داود عن قبيصة بن ذؤيب ۔

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ١٢٥' الحديث رقم : ٤٤٨٥

ترجمہ: ''ابوداؤد نے اس روایت کو قبیصہ بن ذؤیب سے روایت کیا ہے۔''

تشریح: قبیصہ ''میں پہلے فتحہ اور پھر کسرہ ہے اور'' ذؤیب'' یہ تصغیر ہے'' ذئب'' کی ان کے حالات ماقبل میں گذر چکے ہیں۔ مصنفؒ کا کہنا ہے کہ ان کی صحابیت مختلف فیہ ہے۔

۳۶۱۹:(وفی اخری لهما وللنسائی وابن ماجة والدارمی) عَنْ نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنهُمُ بْنُ عُمَرَ' وَمُعَاوِيَةُ' وَاَبُوْهُرَيْرَةَ' وَالشَّرِيْدُ اِلٰی قَوْلِهٖ:فَاقْتُلُوْهُ۔

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٦٢٤' الأحاديث رقم ٤٤٨٢' ٤٤٨٣' ٤٤٨٤' والترمذی فی السنن ٤ / ٣٩' وابن ماجه فی ٢ / ٨٤٩' الحديث رقم : ٢٥٧٣' والدارمی فی ٢ / ٢٣٠' الحديث رقم : ٢٣١٣

ترجمہ: ترمذی' ابوداؤدونسائی' ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت سے نقل کی ہے جس میں حضرت ابن عمرؓ حضرت معاویہؓ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت شرید رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں یہ حدیث لفظ فاقتلوہ تک منقول ہے (یعنی ان روایتوں میں ثُمَّ اُتِیَ الخ کی عبارت نہیں ہے)۔''

۳۶۲۰:وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَزْهَرَ قَالَ: كَاَنِّی اَنْظُرُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الْخَمْرَ' فَقَالَ لِلنَّاسِ: اضْرِبُوْهُ' فَمِنْهُمْ مَنْ ضَرَبَهٗ بِالنِّعَالِ' وَمِنْهُمْ مَنْ ضَرَبَهٗ بِالْعَصَاءِ' وَمِنْهُمْ مَنْ ضَرَبَهٗ بِالْمِيْتَخَةِ' قَالَ ابْنُ وَهْبٍ: يَعْنِی الْجَرِيْدَةَ الرَّطْبَةَ' ثُمَّ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُرَابًا مِنَ الْاَرْضِ فَرَمٰی بِهٖ فِی وَجْهِهٖ (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٤ / ٦٢٨' الحديث رقم : ٤٤٨٩' وأحمد فی المسند ٤ / ٨٨

ترجمہ: ''اور حضرت عبدالرحمٰن بن ازہر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ گویا کہ میں (اب) رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ (ایک دن) آپ ﷺ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کو پیش کیا گیا جس نے شراب پی تھی تو آپ ﷺ نے (اس کے بارے میں) لوگوں کو ارشاد فرمایا: ''اس کی پٹائی کرو چنانچہ ان لوگوں میں سے بعض نے اس کو جوتوں سے مارا اور بعض لوگوں نے اس کو لاٹھی سے مارا اور بعض نے کھجور کی سبز شاخ سے مارا۔ حضرت ابن وہبؒ (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن نے'' میتخہ'' سے (کھجور کی ہری ٹہنی جس پر پتے نہ ہوں یعنی) چھڑی مراد لی تھی۔ پھر (حضرت عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ جب سب لوگ اس شرابی کی پٹائی کر چکے تو) آپ ﷺ نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اس کے منہ پر پھینک دی (اس کے منہ پر مٹی پھینک کر گویا آپ ﷺ نے اس کے بارے میں حقارت کا اظہار کیا کیونکہ اس نے شراب پی کر ایک بہت ہی برے فعل کا ارتکاب کیا تھا)۔'' (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن ازہر: یہ عبدالرحمٰن ابن ازہر قریشی ''عبدالرحمٰن بن عوف'' کے بھتیجے ہیں۔ غزوہ حنین میں شریک ہوئے۔

اُن سے اِن کے بیٹے عبدالحمید وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ واقعہ ''حرہ'' سے قبل ان کی وفات ہوئی ہے۔ اور ''مرقات'' میں ہے کہ ''حرہ'' میں وفات پائی مؤلف نے ان کا ذکر فصل صحابہ میں کیا ہے۔

تشریح: **قوله كأني انظر۔۔۔۔ ومنهم من ضربه بالميتخة**:

اذا أتي برجل: ماضی کا صیغہ استحضار قصہ کا فائدہ دے رہا ہے۔ گویا کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہے۔

العصا: '' اصول'' میں الف کے ساتھ ہے۔ اگر یہ یاء کے ساتھ لکھا ہوا ہوتا تو بصیغہ جمع ہوتا، کہ عین اور صاد دونوں مکسور ہوتیں اور یاء مشدد ہوتی۔

الميتخة: میم کے کسرہ، یائے تحتانیہ کے سکون، تائے فوقانیہ کے فتحہ اور خائے معجمہ کے ساتھ بروزن ''ملعقة'' ہے' اصول میں فقط اسی طرح ضبط کیا گیا ہے۔ بمعنی عصا خفیفہ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مرا ''درة'' دال مہملہ کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے (یعنی کوڑا) اس کو اور طرح بھی روایت کیا گیا ہے۔ (كذا ذكره بعض الشراح من علمائنا)

قاموس میں ہے کہ ''متيخة'' بروزن ''سكينة'' عصا اور مطرق دقيق (روئی، اون دُھننے کا ڈنڈا،)

''النہایہ'' میں ہے کہ اس لفظ کے ضبط میں اختلاف ہے: ① بعض کا کہنا ہے یہ میم کے کسرہ اور تاء کی تشدید کے ساتھ ہے

② میم کے فتحہ اور تاء کی تشدید کے ساتھ ہے

③ میم کسرہ یاء ساکنہ اور تاء کے ساتھ ہے

④ میم کے فتحہ اور (تاء کی) کی تشدید۔

⑤ میم کے کسرہ اور تاء کے بعد یائے ساکنہ کے ساتھ۔ ازہری کہتے ہیں یہ تمام مختلف کھجور کی ٹہنیوں کے نام ہیں۔ اور ''عرجون'' کی جڑ کو بھی کہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ ''عصا'' کا نام ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ کٹی ہوئی پتلی نرم شاخ کو کہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ جرید' عصا درہ وغیرہ کے قبیل سے ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے مارا جائے۔ اس کی اصل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ''تنخ الله رقبته بالسهم'' سے ماخوذ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ ''يبخه الله و طبغه'' بمعنی ''اتاح عليه'' سے ماخوذ گے تاء کو طاء سے بدل دیا' اسی سے یہ حدیث ہے: **انه خرج وفي يده ميتخه في طرفيها خوص معتمدا على ثابت بن قيس**۔

۳۶۲۱: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الْخَمْرَ' فَقَالَ: اضْرِبُوْهُ' فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهٖ' وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهٖ' وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهٖ' ثُمَّ قَالَ: بَكِّتُوْهُ' فَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِ يَقُوْلُوْنَ مَا اتَّقَيْتَ اللّٰهَ' مَا خَشِيْتَ اللّٰهَ وَمَا اسْتَحْيَيْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: اَخْزَاكَ اللّٰهُ قَالَ: لَا تَقُوْلُوْا هٰكَذَا' لَا تُعِيْنُوْا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ' وَلٰكِنْ قُوْلُوْا: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ**۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٤ / ٦٢٠' الحديث رقم: ٤٤٧٧

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی آپ ﷺ نے (ہم سے فرمایا) کہ اس کی پٹائی کرو۔ چنانچہ ہم میں سے بعض اس کو اپنے ہاتھ سے مار رہے تھے' بعض اپنے کپڑے سے اور بعض اپنے جوتوں سے اس کو مار رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب زبان سے اس کو ملامت و عار دلاؤ۔ چنانچہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہنے لگے کہ تو اللہ (کی مخالفت) سے نہیں ڈرا' تجھے اللہ تعالیٰ (کی عقوبت) کا خوف نہ آیا اور تو اللہ کے رسول ﷺ (کی متابعت ترک کرنے یا اس حالت میں آپ کے سامنے آنے) سے کہ بھی نہیں شرمایا اور پھر جب بعض لوگوں نے یہ کہا اللہ تعالیٰ تجھ کو (دنیا و آخرت دونوں جگہ یا آخرت میں) ذلیل و رسوا کرے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح نہ کہو اور اس پر شیطان کی اعانت نہ کرو بلکہ یوں کہو کہ اے اللہ! (اس کا گناہ مٹا کر) اس کی بخشش فرما دے اور (اس کو طاعت و نیکی کی توفیق عطا فرما کر) اس پر رحم فرما دے (یا اس کو دنیا میں بخش دے اور آخرت میں اس پر اپنا رحم فرما)۔''

(ابوداؤد)

تشریح: **قوله: ان رسول الله ﷺ مرحل۔۔۔فقال بعض القوم أخر اك الله:**

قدشر ب الخمر: بعض نسخوں میں ''الخمر'' نہیں ہے۔

بکتوه: تبکیت سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے: توبیخ: شرم دلانا۔

فأقبلو: ''اقبال'' مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔

اضربوه یہ امر وجوبی ہے اور **بکتوه** میں امر استحبابی ہے:

أخزاك الله انتہائی غلط تھی، اس لئے آپ نے اس سے منع فرمادیا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ﴾ [التحریم: ۸]

قصہ مختصر یہ کہ ابتدائی کلام تو نصیحت تھا مگر آخری کلام فضیحت تھا اس لئے اس سے منع فرمایا۔ **لا تعينوا عليه الشيطان**:

قاضیؒ فرماتے ہیں: یعنی اس قسم کی بددعا کر کے شیطان کی مدد مت کرو۔ چونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو ذلیل و رسوا کر دیا تو شیطان اس پر غالب آجائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شخص اس قسم کی بددعا سن کر اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جائے اور معاصی میں منہمک ہو جائے، یا اس کو غصہ آجائے اور وہ آئندہ کے لئے اس فعل کو بار بار کرنے کی ٹھان لے۔ (خلاصہ یہ کہ اس قسم کی بددعا کرنا درحقیقت ایک مسلمان کے خلاف شیطان کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔)

قوله: اللهم اغفرله وارحمه: (اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:)

۳۶۲۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ شَرِبَ رَجُلٌ فَسَكِرَ فَلُقِيَ يَمِيْلُ فِي الْفَجِّ فَانْطُلِقَ بِهٖ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا حَاذٰى دَارَ الْعَبَّاسِ انْفَلَتَ فَدَخَلَ عَلَى الْعَبَّاسِ فَالْتَزَمَهٗ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَحِكَ فَقَالَ: اَفَعَلَهَا؟ وَلَمْ يَامُرْ فِيْهِ بِشَيْءٍ۔

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤ / ٦١٩' الحديث رقم: ٤٤٧٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نے شراب پی اور (نشہ کے باعث) مدہوش ہو گیا یہاں تک کہ (لوگوں کو) راستہ میں جھومتا ہوا ملا (جیسا کہ شرابیوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں لڑکھڑاتے جھومتے راستہ میں چلتے ہیں) چنانچہ (لوگوں نے اس کو پکڑ لیا اور) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کو لے جایا گیا لیکن جب وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان کے قریب پہنچا تو (لوگوں کے ہاتھ سے چھٹ گیا اور) حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ کر ان سے چمٹ گیا (یعنی اس نے اس طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے سفارش اور پناہ چاہی) جب نبی کریم ﷺ سے یہ بیان کیا گیا تو آپ ﷺ مسکرا دیئے اور فرمایا: کیا اس نے ایسا کیا؟ اور پھر آپ ﷺ نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: شرب رجل۔۔۔فالتزمه: ضسلكم: کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے

لقی: بصیغہ مجہول ہے

یمیل: ''لقی'' کی ضمیر سے حال ہے

الفج: فاء کے فتحہ اور جیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔

قوله: فذكر ذلك للنبی ﷺ...... أفعلها: یہ ہمزہ استفہامیہ تعجب کیلئے ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ضمیر مونث ماقبل میں مذکور افعال انفلات، دخول اور التزام کی طرف راجع ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول مطلق ہو۔ **أی أ فعل الفعلة؟** جیسا کہ اس جملہ میں ہے ''**واجعله الوارث منا**'' فعل بمنزلہ لازم کے ہے۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں مرا خیال ہے کہ یہ واقعہ مکہ کا ہے، اس لئے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا جو مکان مکہ میں تھا وہ ایک گھاٹی میں تھا، کیونکہ مدینہ منورہ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا جو گھر تھا نہ وہ کسی ''فج'' میں تھا اور نہ کسی ''فج'' کے قریب تھا۔ اھ

خطابیؒ فرماتے ہیں یہ دلیل ہے کہ شراب کی حد سب حدود سے اخف ہے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہونے کے بعد اس سے تعارض اس لئے نہیں کیا گیا کہ نہ خود اس کے اقرار سے اس پر حد ثابت ہوئی تھی اور نہ عادل گواہوں کی شہادت کے ذریعہ یہ ثابت تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ صاحب راستہ میں لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے، ان کے بارے میں گمان ہوا کہ نشہ میں ہیں چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تحقیق حال نہیں فرمائی اور معاملہ جوں کا توں چھوڑ دیا۔

الفصل الثالث:

۳۶۲۳: عَنْ عُمَيْرِ بْنِ سَعِيْدِ النَّخْعِيِّ قَالَ سَمِعْتُ عَلِيَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ يَقُوْلُ: مَاكُنْتُ لِاُقِيْمَ عَلٰى اَحَدٍ حَدًّا فَيَمُوْتُ فَاَجِدُ فِی نَفْسِیْ مِنْهُ شَيْئًا اِلَّا صَاحِبَ الْخَمْرِ، فَاِنَّهٗ لَوْ مَاتَ وَدَيْتُهٗ، وَذٰلِكَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسُنَّهٗ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۲ / ٦٦، الحديث رقم: ٦٧٧٨، و مسلم فی ۳ / ۱۳۳۲، الحديث رقم: (۷۳۹ - ۱۷۰)

ترجمہ: ''حضرت عمیر بن سعید نخعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو یہ

ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اگر میں کسی شخص پر حد جاری کروں اور وہ شخص حد مارے جانے کی وجہ سے مرجائے تو میں اپنے دِل میں کسی قسم کا افسوس محسوس نہ کروں گا۔ (یعنی مجھے کوئی غم نہیں ہوگا کیونکہ اس پر حد جاری کرنا شریعت کے حکم کے مطابق ہوگا اور شریعت کے حکم کے نفاذ میں رحم وشفقت کا کوئی محل نہیں ہے) سوائے شراب پینے والے کے کہ اگر وہ (چالیس سے زیادہ کوڑے مارے جانے کی وجہ سے) مرجائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے بارے میں (سزا کی) کوئی حد متعین نہیں فرمائی۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: ماکنت افیم علی اجد ......:**

لأقيم: لام مکسور ہے یہ لام جحد ہے اور میم مفتوح ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ کان کی خبر پر لام برائے تاکید ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں بھی ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ط﴾ [البقرة:۱۴۳]

"**فیوت**": "**اقیم**" کیلئے مسبّب ہے۔ "**فأجد**": سبب ومسبّب کے مجموعہ کا مسبّب ہے اھ

ایک نسخہ میں دونوں فعل مرفوع ہیں۔ پہلے جملہ میں فاء کے بعد "هو" مقدر ہے، اور دوسرے جملہ میں فاء کے بعد "أنا" مقدر ہے۔

الا صاحب الخمر: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ **أی لکن أجد من حد صاحب الخمر اذامات شیئا۔**

اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستثنیٰ متصل ہو۔ **أی ما أجد من موت أحد یقام ولیه الحدشیئا الا من موت صاحب الخمر** ۔اس صورت میں کچھ مقدر ماننا پڑتا ہے۔

و ذلك: اس کا مشارالیہ مجموع مذکور ہے یا وجدان ہے، یا استثناء ہے

ان: اس سے پہلے جر مقدر ہے۔ **أی بأن۔أو**

لأن لم یسنه صیغہ معروف کے ساتھ ہے کہ یاء پر فتحہ، سین پر ضمہ اور نون مفتوح مشدد ہے۔

۳۶۲۴: **وَعَنْ ثَوْرِ بْنِ زَيْدِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ اِنَّ عُمَرَ اسْتَشَارَ فِي حَدِّ الْخَمْرِ فَقَالَ لَهٗ عَلِيٌّ: اَرٰى اَنْ تَجْلِدَهٗ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً فَاِنَّهٗ اِذَا شَرِبَ سَكِرَ وَ اِذَا سَكِرَ هَذٰى وَاِذَاهَذٰى افْتَرٰى فَجَلَدَ عُمَرُ فِيْ حَدِّ الْخَمْرِ ثَمَانِيْنَ** ۔ (رواہ مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ۲ / ۴۲ الحدیث رقم: ۲ من کتاب الأشربة۔

ترجمہ: ''اور حضرت ثور بن زید دیلمی کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد سزا کے تعین کے بارے میں (صحابہؓ سے) مشورہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ شرابی کو اسّی (۸۰) کوڑے ماریں کیونکہ جب وہ شراب پیتا ہے تو مدہوش ہو جاتا ہے جب مدہوش ہو جاتا ہے تو ہذیان بکتا ہے (یعنی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے) اور جب ہذیان بکتا ہے تو افتراء پردازی (یعنی بہتان) لگاتا ہے۔ چنانچہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب پینے والے کو اسّی (۸۰) کوڑے مارے''۔ (مالک)

تشریح: **قولہ ان عمر استشار فی حد الخمر**:

یعنی مشورہ کیا کہ کیا شرابی کو چالیس کوڑوں سے بڑھا کر اسی کوڑے لگائیں؟ چونکہ مفسدین سرکش ہیں' چھوٹی موٹی سزائیں سے یہ لوگ اپنے کرتوتوں سے باز نہیں آ رہے ہیں۔

قولہ: أری أن تجلده ثمانین ......:

أری: ہمزہ کے ساتھ ''الرأی'' سے ماخوذ ہے اور ایک نسخہ میں ضمہ کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ بمعنی ''ظن'' ہوگا' یعنی میں یہ بات بہتر سمجھتا ہوں......۔

واذ اهدی افتری: یعنی جب وہ ہذیان بکتا ہے تو حدود سے تجاوز کر جاتا ہے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے چنانچہ وہ مرد و زن پر تہمت لگاتا ہے اور اسی کوڑوں کی سزا کا حق دار بن جاتا ہے اور حکم میں اغلب کا اعتبار ہے یا وجود سبب کا اعتبار ہے۔ جیسا کہ وضوء کے ناقص حکم کی بحث میں گزر چکا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: سبب کے مسبّب کو سبب قرار دیا اور اول پر وہ حکم جاری کیا جو ثانی پر جاری ہوتا ہے۔ چنانچہ شارب خمر کی حد بطور تغلیظ اور اس کی سرکشی کے حد قاذف ہے اور جس معاملہ کی شان یہ ہو وہ اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے۔

بَابُ مَا لَا يُدْعٰى عَلَى الْمَحْدُوْدِ

جس پر حد جاری کی جائے اس کے حق میں بددعا نہ کرنے کا بیان

ایک نسخہ میں ''باب'' تنوین کے ساتھ اور لفظ ''ما'' محذوف ہے اور ''محدود'' فی الحد'' ہے۔

الفصل الاول:

۳۶۲۵: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، اَنَّ رَجُلاً اسْمُهٗ عَبْدُ اللّٰهِ يُلَقَّبُ حِمَارًا، كَانَ يُضْحِكُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَلَدَهٗ فِي الشَّرَابِ، فَاُتِيَ بِهٖ يَوْمًا، فَاَمَرَ بِهٖ، فَجُلِدَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ: اَللّٰهُمَّ الْعَنْهُ مَا اَكْثَرَ مَا يُؤْتٰى بِهٖ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَلْعَنُوْهُ، فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ اَنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۲ / ۷۵، الحديث رقم: ۶۷۸۰

ترجمہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص تھا جس کا نام تو عبداللہ تھا مگر اس کو حمار (یعنی گدھا) کہا جاتا تھا وہ (اپنی باتوں سے) نبی کریم ﷺ کو ہنسایا کرتا تھا' نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ شراب پینے کے جرم میں اس پر حد جاری فرما چکے تھے پھر وہ ایک اور دن آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو کوڑے مارنے

کا حکم دیا اور اس کو کوڑے مارے گئے۔قوم میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ! اس پر لعنت فرما اس کو کتنی کثرت کے ساتھ (بار بار شراب پینے کے جرم میں) پکڑ کر لایا جاتا ہے۔آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس پر لعنت نہ بھیجو' اللہ کی قسم میں یہ جانتا ہوں کہ یہ شخص اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے''۔(بخاری)

۳۶۲۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ' فَقَالَ: اضْرِبُوْهُ' فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهٖ' وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهٖ' وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهٖ' فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ :اَخْزَاكَ اللّٰهُ قَالَ: لَا تَقُوْلُوْا هٰكَذَا' لَا تُعِيْنُوْا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۲ / ۶۶' الحديث رقم : ۶۷۷۷

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کو پیش کیا گیا جس نے شراب نوشی کا ارتکاب کیا تھا' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کی پٹائی کرو۔چنانچہ ہم میں سے بعض نے اس کو اپنے ہاتھ سے مارا' بعض نے اپنے جوتوں سے مارا اور بعض نے اپنے کپڑے (کو کوڑا بنا کر) سے مارا۔جب وہ شخص چلا گیا تو بعض لوگوں نے (اس کے بارے میں) کہا کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو ذلیل و رسوا کرے۔آپ ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ اس طرح نہ کہو اور اس پر غالب ہونے میں شیطان کی مدد نہ کرو''۔(بخاری)

تشریح: **فی الشراب**: أی فیؒ شربه ایک نسخہ میں ''فی الشرب'' ہے

ما اکثر ما یؤتی به: پہلا ''ما تعجبیه'' ہے اور دوسرا'' ما'' مصدریہ ہے۔ **أی ما اکثر اتیانه** یہ جملہ ''ما أحسن زیدًا'' کی طرح ہے۔

ما علمت أنه: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔''ما'' مبتدا ہے اور ''أنه'' الخ محل رفع میں مبتدا کی خبر ہے۔**أی: الذی علمت منه أنه**۔

دوسری ترکیب:''ما'' ھو مبتدا محذوف کی خبر ہے اور **انه الخ علمت** کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔**أی ھو الذی علمت أنه** ۔جملہ جواب قسم ہے۔

مطالع الانوار میں اس کا معنی یہ لکھا ہے۔:**فو الله الذی علمته أنه**۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس صورت میں '' **علم**'' بمعنی ''**عرف** '' ہے،اور''**أنه**''اسم موصول کی خبر ہے، یا یہ'' ما'' مصدریہ ہے۔**أی علمی به أنه**۔اور بعض کا کہنا ہے کہ''ما'' زائدہ ہے۔**أی والله لقد علمت منه ذلك لكنه قد يصدر منه الزلة**

بعض کا کہنا ہے کہ'' ما'' نافیہ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس صورت میں ان کو بکسر الہمزہ اور بفتح الہمزہ دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔جواب قسم بنانے کی تقدیر پر ان بالکسر ہوگا۔شرح السنہ کی روایت میں ''الا أنه'' ہے یہ بالکل واضح ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا:

① کسی گناہ گار کو خاص کر کے لعنت بھیجنا درست نہیں۔
② اللہ اور اس کے رسول کی محبت اللہ تعالیٰ کے قرب وتقرب کا موجب ہے۔لہٰذا ایسے شخص پر لعنت بھیجنا جائز نہیں، چونکہ یہ اللہ کی رحمت سے دور کرنے کے مترادف ہے۔

الفصل الثانی:

۳۶۲۷:عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ :جَاءَ الْاَسْلَمِیُّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَهِدَ عَلٰی نَفْسِهٖ اَنَّهٗ اَصَابَ امْرَأَةً حَرَامًا اَرْبَعَ مَرَّاتٍ، كُلَّ ذٰلِكَ يُعْرِضُ عَنْهُ، فَاَقْبَلَ فِی الْخَامِسَةِ فَقَالَ:اَنِكْتَهَا؟ قَالَ: نَعَمْ وَقَالَ:حَتّٰی غَابَ ذٰلِكَ مِنْكَ فِیْ ذٰلِكَ مِنْهَا؟ قَالَ:نَعَمْ قَالَ:كَمَا يَغِيْبُ الْمِرْوَدُفِی الْمُكْحَلَةِ وَالرِّشَاءُ فِی الْبِئْرِ؟ قَالَ:نَعَمْ، قَالَ:هَلْ تَدْرِیْ مَا الزِّنَا؟ قَالَ :نَعَمْ، اَتَيْتُ مِنْهَا حَرَامًا مَا يَاْتِی الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِهٖ حَلَالًا، قَالَ:فَمَا تُرِيْدُ بِهٰذَا الْقَوْلِ؟ قَالَ:اُرِيْدُ اَنْ تُطَهِّرَانِیْ، فَاَمَرَ بِهٖ، فَرُجِمَ فَسَمِعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَيْنِ مِنْ اَصْحَابِهٖ يَقُوْلُ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ:اُنْظُرْ اِلٰی هٰذَا الَّذِیْ سَتَرَاللّٰهُ عَلَيْهِ فَلَمْ تَدَعْهُ نَفْسُهٗ حَتّٰی رُجِمَ رَجْمَ الْكَلْبِ فَسَكَتَ عَنْهُمَا، ثُمَّ سَارَسَاعَةً، حَتّٰی مَرَّبِجِيْفَةِ حِمَارٍ شَائِلٍ بِرِجْلِهٖ، فَقَالَ:اَيْنَ فُلَانٌ وَفُلَانٌ؟ فَقَالَا:نَحْنُ ذَانِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ!فَقَالَ انْزِلَا فَكُلَا مِنْ جِيْفَةِ هٰذَا الْحِمَارِ فَقَالَا: يَا نَبِیَّ اللّٰهِ مَنْ يَّاْكُلُ مِنْ هَذَا؟ قَالَ:فَمَا نِلْتُمَامِنْ عِرْضِ اَخِيْكُمَااٰنِفًا اَشَدُّ مِنْ اَكْلٍ مِنْهُ، وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ اِنَّهُ الْآنَ لَفِیْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ فِيْهَا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤ / ٥٨٠، الحدیث رقم : ٤٢٦٦

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے بارے میں چار بار (یعنی چار مجلسوں میں) یہ گواہی دی یعنی یہ اقرار کیا کہ اس نے ایک عورت کے ساتھ حرام کام (یعنی زنا کا ارتکاب کیا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر بار (اس کے اقرار کرنے پر) اس سے منہ پھیر لیتے (تا کہ وہ اپنے اقرار سے رجوع کرے اور حد سے بچ جائے) اور پھر پانچویں بار اس کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ ''کیا تو نے اس عورت کے ساتھ صحبت کی ہے؟'' اس نے کہا کہ ''ہاں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کیا تو نے اس طرح صحبت کی کہ وہ (یعنی تیرا عضو مخصوص) اس (عورت کے حصہ مخصوص) میں غائب ہوگیا؟'' اس نے کہا کہ ہاں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کیا اس طرح) جس طرح سلائی سرمہ دانی میں اور رسّی کنوئیں میں غائب ہوجاتی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا جانتے ہو زنا کیا ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے اس عورت کے ساتھ حرام طور پر وہ کیا ہے جو ایک مرد اپنی بیوی کے ساتھ حلال طور پر کرتا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اچھا یہ بتا) یہ جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (مجھ پر حد جاری فرما کر) مجھ کو (اس گناہ سے) پاک کر دیجئے۔ چنانچہ (اتنی جرح کرنے کے بعد جب اس کا جرم زنا بالکل ثابت ہوگیا تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی

سنگساری کا) حکم جاری فرمایا اور اس کو سنگسار کر دیا گیا پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ میں سے دو آدمیوں کو یہ گفتگو کرتے ہوئے سنا کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے یہ کہہ رہا تھا ''اس شخص کو دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تھی لیکن اس کے نفس نے اس کو (اپنے گناہ کا اعتراف کرنے سے) باز نہ رکھا یہاں تک کہ وہ ایک کتے کی طرح سنگسار کیا گیا''۔ آپ ﷺ نے (یہ سن کر اس وقت) تو ان دونوں سے کچھ نہیں کہا البتہ کچھ دیر چلنے کے بعد ایک مرے ہوئے گدھے کے قریب سے گزرے جس کے پاؤں (اس کا جسم بہت زیادہ پھول جانے کے سبب) اوپر اٹھے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ فلاں فلاں (یعنی وہ دونوں) شخص کہاں ہیں؟ (جنہوں نے ماعز رضی اللہ عنہ کی اس وجہ سے تحقیر کی تھی کہ ان کو سنگسار کیا گیا تھا) انہوں نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! ہم دونوں حاضر ہیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم دونوں اترو اور اس گدھے کا مردار گوشت کھاؤ۔ انہوں نے (بڑی حیرت کے ساتھ) عرض کیا کہ یا نبی اللہ! اس کا گوشت کون کھاتا ہے؟ (یعنی اس کا گوشت کھائے جانے کے قابل نہیں ہے آپ ﷺ ہم سے اس کے کھانے کو کیوں فرماتے ہیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے ابھی اپنے بھائی کی جو آبروریزی کی ہے وہ اس (گدھے) کا گوشت کھانے سے بھی زیادہ سخت (بری بات) ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے بلاشبہ وہ (یعنی ماعز رضی اللہ عنہ) جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہے ہیں''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **کل ذلك**: منصوب علی الظرف ہے ''یعرض عنه'' کیلئے

نكتها: نون کے کسرہ کے ساتھ ہے بمعنی جماع

''**ذلك منك**'' میں ''ذلک'' سے اشارہ مرد کے عضو مخصوص کی طرف ہے اور

المرود: میم کے کسرہ کے ساتھ ہے

مكحلة: میم اور ھاء دونوں مضموم ہیں **الرشاء**: بروزن کساء مرفوع ہے۔ المرود پر عطف ہو رہا ہے۔

البئر: ہمزہ کے ساتھ ہے ابدال کے ساتھ بھی درست ہے۔

رُجِمَ: بصیغہ مجہول ہے۔ **رجم الكلب**: مفعول مطلق ہے

قوله: قال: مانلتما الخ مانلتما ''ما'' موصولہ مبتداء ''أشد'' اس کی خبر ہے، اور عائد محذوف ہے **أى مانلتماه**۔

آنفا: مد و قصر دونوں طرح درست ہے۔

كما يغيب المرودو الرشاء: اس میں احتمال ہے کہ پہلا لفظ باکرہ سے کنایہ ہو اور دوسرا ثیبہ سے کنایہ ہو۔

غیبت کی قباحت مردار گدھا کھانے سے زیادہ ہے، کیونکہ حالت اضطراری میں گدھے کا کھانا حلال ہے اور حالت اضطراری میں معصیت قاصرہ ہے۔ بخلاف غیبت کے خصوصاً جب کہ کسی پاکیزہ نفس کی کی جائے۔ **والذی لفی ---- لفی انها رالجنة**: یہ جملہ عذاب قبر اور نعمتوں کے ملنے کے برحق ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: **من أصاب ذنبا فاقيم عليه الخ** اس حدیث کو امام احمد اور ضیاء نے روایت کیا ہے۔

(الجامع الصغیر ۲/۵۱۴، الحدیث رقم ۸۴۴۵)

۳۶۲۸: وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ اَصَابَ ذَنْبًا اُقِيْمَ عَلَيْهِ حَدُّ ذٰلِكَ الذَّنْبِ فَهُوَ كَفَّارَتُهُ۔ (رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ)

أخرجه احمد فی المسند ۵ / ۲۱۵

ترجمہ: ''اور حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے (کسی ایسے) گناہ کا ارتکاب کیا (جو حد کو واجب کرنے والا ہو) اور پھر اس پر اس گناہ کی حد جاری کر دی جائے (مثلاً کسی شخص نے زنا کیا اور اس کو کوڑے مارے گئے یا کسی شخص نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا) تو وہ حد اس کے گناہ کا کفارہ ہے۔''

تشریح: قوله: من ائصاب ذبنا أقيم ...... : اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① یعنی کوئی ایسا گناہ کیا جو موجب حد تھا......۔

② یعنی کوئی ایسا گناہ کیا جس کی صفت یہ تھی کہ اس پر اس گناہ کی حد جاری کی گئی......۔

کفارتہ: ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

① **ذنب۔ای ایکفر ذلك الذنب** (یعنی تو وہ حد اس گناہ کا کفارہ نہ ہو جاتی ہے)

② **مذهب ای کفارة للذنب** ابن حجرؒ فرماتے ہیں: محض اقامت حد ہی کفارہ ہے جب کہ مسلم کی حدیث میں اس کی تصریح ہے۔ یعنی گناہ کی نسبت سے اور جہاں تک بات ہے اس گناہ سے ترک توبہ کی تو حد اس کا کفارہ نہیں بنتی' چونکہ یہ ایک دوسری معصیت ہے۔ علماء کا یہ قول بھی اسی معنی پر محمول ہے: اقامت حد کفارہ نہیں ہے' بلکہ توبہ ضروری ہے

تخریج: جامع صغیر میں لکھا ہے: **من اصاب ذنبا أقيم عليه......** ۔ اس حدیث کو امام احمد اور ضیاء نے بھی روایت کیا ہے۔ (شرح السنۃ)

۳۶۲۹: وَعَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اَصَابَ حَدًّا فَعُجِّلَ عُقُوْبَتُهُ فِي الدُّنْيَا فَاللّٰهُ اَعْدَلُ مِنْ اَنْ يُّثَنِّيَ عَلٰى عَبْدِهِ الْعُقُوْبَةَ فِي الْآخِرَةِ، وَمَنْ اَصَابَ حَدًّا فَسَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَفَا عَنْهُ فَاللّٰهُ اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يَّعُوْدَ وَ فِيْ شَيْءٍ قَدْ عَفَا عَنْهُ۔

(رَوَاهُ الترمذی و ابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث غريب).

والترمذی فی السنن ۵ / ۱۷' الحديث رقم : ۲۶۲۶' وابن ماجه فی ۲ / ۸۶۸' الحديث رقم : ۲۶۰۴' وأحمد فی المسند ۱ / ۹۹

ترجمہ: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے حد کو واجب کرنے والے گناہ کا ارتکاب کیا (یعنی کوئی ایسا گناہ کرے جس پر حد متعین ہے) اور پھر اسی دنیا میں اس کو اس کی سزا دے دی گئی (یعنی اس پر حد جاری کر دی گئی یا تعزیری یعنی کوئی اور سزا دی گئی تو) (آخرت میں اس کو اس گناہ کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ) اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ انصاف کرنے والا ہے کہ

وہ آخرت میں اپنے بندے کو دوبارہ سزا دے اور جو شخص کسی حد (یعنی گناہ) کا مرتکب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ کی پردہ پوشی فرمائی اور اس کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی شان اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ اس چیز پر دوبارہ مواخذہ کرے جس کو وہ معاف کر چکا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: **قوله: من أصاب ذنبا**......:

اصاب حدا: **ای ذنبا یوجب حدا** مسبّب کو سبب کے قائم مقام ذکر کیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ "حد" سے مراد محرم ہو جیسا کہ اس آیت ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ﴾[البقرة - ٢٢٩] میں کہ حدود سے "محارم" مراد ہیں۔ (طیبی)

فعجل: بصیغہ مجہول ہے۔

ثنى: نون مشدد ہے۔

جمہور کا کہنا ہے کہ بندہ کا اپنے گناہوں کے اوپر پردہ ڈالے رکھنا اور توبہ کرنا، فیما بینہ وبین اللہ اس کے اظہار سے بہتر ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم نے اس مستدرک میں روایت کیا ہے۔

بَابُ التَّعْزِيْرِ

ایک جرم وہ ہے جو شرعاً فی نفسہ گناہ تھا اور دوسرا جرم وہ ہے جو شرعاً فی نفسہ گناہ نہیں تھا لیکن حاکم کے حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے گناہ بن گیا ہے پہلے جرم کی مثال جیسے چرس، افیون، بھنگ کھانا یہ شرعاً بھی گناہ ہے اور قانوناً بھی جرم ہے۔ دوسرے جرم کی مثال یہ ہے جیسے ٹریفک قانون یہ ہے کہ بائیں طرف چلو اگر کوئی بائیں چلنے کے بجائے دائیں طرف چلے تو یہ قانوناً جرم ہے۔ شرعاً گناہ نہیں تھا لیکن حاکم کے حکم کی خلاف ورزی نے اسے گناہ بنا دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿**واطیعوا اللہ الرسول واولی الامر منکم**﴾

لہٰذا اولی الامر کی اطاعت بھی واجب ہے تو اولی الامر کے حکم کی وجہ سے گناہ بن گیا۔

حدیث "**لا یجلد فوق عشر جلدات الا حد من حدود اللہ**" میں دو توجیہات ہیں:

پہلی توجیہ یہ ہے کہ یہاں مراد وہ گناہ ہے جو شرعاً فی نفسہ گناہ ہے اور قانوناً بھی اس کو جرم قرار دے دیا گیا ہو۔ اب حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ دس کوڑوں سے زیادہ کی سزا نہ دی جائے مگر ایسے جرم میں جو شرعاً فی نفسہ بھی گناہ ہو اور جو اعمال شرعاً گناہ نہیں تھے مگر حاکم کے حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے گناہ بن گئے ہوں ان میں تعزیری سزا دس کوڑوں سے زیادہ نہیں دی جائے۔

مثلاً کوئی شخص ٹریفک کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرے تو اس کو دس کوڑوں سے زیادہ سزا نہ دی جائے۔ البتہ اگر ایسا گناہ کرے جو فی نفسہ بھی گناہ ہو تو اس کو دس کوڑوں سے زیادہ سزا دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا حدیث باب سے اس پر استدلال کرنا کہ تعزیری سزا دس کوڑوں سے زیادہ نہیں دی جا سکتی یہ استدلال درست نہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب کسی شخص پر شرعی اعتبار سے حد ثابت نہ ہو' یا تو اس لئے کہ معیار شہادت پورا نہ پایا گیا یا اس میں شبہ فی

الفعل یا شبہ فی المحل وغیرہ پایا گیا۔ جس کی وجہ سے حد لازم نہیں ہوئی۔ تو اس صورت میں اس کو جو تعزیری سزا دو اس میں حد تک نہ پہنچ جاؤ۔ بلکہ اس سے کم کم رکھو۔ مثلاً ایک شخص نے چوری کی لیکن ''حرز'' نہ پائے جانے کی وجہ سے اس پر حد ساقط ہوگئی۔ اور اس کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا اب اگر امام یہ کہے کہ میں تعزیراً اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہوں تو یہ حکم دینا جائز نہیں اس لئے کہ پھر تو حد ساقط ہونے کا کوئی مطلب ہی نہ رہا اس حدیث: من بلغ حدافي غير حد'' میں اسی کی ممانعت کی گئی ہے۔ (تقریر ترمذی)

تعزیراً قتل کرنے کا حکم:

تعزیراً کسی کو قتل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ حنفیہ کا مختار مسلک یہ ہے کہ تعزیراً قتل کیا جاسکتا ہے۔ اور دلیل یہ حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا: (وان عاد فی الرابعة فاقتلوه)

یعنی اگر چوتھی مرتبہ کوئی شخص شراب پئے تو اس کو قتل کر دو۔ حنفیہ فرماتے ہیں کہ (یہ حدیث) تعزیر پر محمول ہے۔

تعزیر کا باب بہت وسیع ہے اس میں امام کو بہت وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ حالات کے اعتبار سے جتنی چاہے سزا دے دے۔ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام کا نظام حدود وتعزیرات بڑا سخت ہے۔ حالانکہ اسلام میں نظامِ عقوبت اتنا لچک دار ہے کہ اور کسی نظام میں اتنی لچک نہیں۔ زیادہ تر جرائم تعزیر کے تحت آئے ہیں اور تعزیر میں کوئی سزا شریعت کی طرف سے مقرر نہیں کی گئی بلکہ امام کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ حالات کا مناسب جائزہ لے کر مناسب سزا دے۔ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ تعزیراً کسی کو ترش روئی سے دیکھ کر چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی سزا کافی ہے۔ اس کو ''نظرة شذرة'' کہا جاتا ہے۔ انتہائی سزا یہ ہے کہ تعزیراً قتل کر دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا باب وسیع ہے اور اس میں اصل اختیار تو امام کو ہے لیکن امام قاضی کو اپنے اختیارات سپرد کر دیتا ہے۔ اس صورت میں امام قاضی کو پابند کر سکتا ہے کہ فلاں جرم میں اتنی سزا تک دے سکتے ہو اور قانوناً اس کا دائرہ مقرر کر سکتا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ جن مسائل میں تعزیر منصوص ہے، مثلاً اپنی بیوی کی باندی سے، یا مشترکہ باندی سے وطی کرنا، کہ اس میں امتثال امر واجب ہے اور غیر منصوص علیہ نہیں ہے۔ امام اپنی خواہش نفسانی سے ہٹ کر مصلحت دیکھے، اور جان لے کہ اس کے بغیر اس کو زجر نہیں ہوگا تو تعزیر واجب ہے۔ اس لیے کہ وہ زاجر ہے۔ اس کی مشروعیت حق اللہ کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا حدّ کی مانند یہ بھی ضروری ہوگی، اور جہاں علم ہو کہ اس کے بغیر بھی زجر ہو جائے گا، تو وہاں واجب نہیں، مذکورہ بالا حدیث فأصبت منها کا محمل بھی یہی ہے، چونکہ ان صاحب کی اس واقعہ کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کرنے کی صرف ایک ہی غرض تھی، وہ تھی ندامت اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ اس ذکر کا مقصد فقط نبی کریم ﷺ کا اس واقعہ کی اطلاع دینا نہ تھا، اور جہاں تک تعلق ہے حضرت زبیرؓ کی حدیث کا، تو وہاں تعزیر آدمی کا حق تھا، اور وہ آدمی نبی کریم ﷺ تھے اور آدمی کیلئے اپنے حق کو ترک کرنا بھی جائز ہے۔

الفصل الاول:

کوڑوں کی تعزیر کتنی ہے؟

۳۶۳۰: عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ بْنِ نِيَارٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يُجْلَدُ فَوْقَ عَشْرِ جَلَدَاتٍ اِلَّا فِيْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ . (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٢ / ١٧٥، الحديث رقم: ٨٦٤٨، و مسلم في ٣ / ١٣٣٢، الحديث رقم: (٤٠ ـ ١٧٠٨) و أبو داود في السنن ٤ / ٦٢٩، الحديث رقم: ٤٤٩١، والترمذي في ٤ / ٥١، الحديث رقم: ١٤٦٣، وابن ماجه في ٢ / ٨٦٧، الحديث رقم: ٢٦٠١، والدارمي في ٢ / ٢٣١، الحديث رقم: ٢٣١٤، وأحمد في المسند ٥ / ٤٥

ترجمہ: ''اور حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ نے جو حدود مقرر کی ہیں ان میں سے کسی حد کے سوا دس کوڑوں سے زیادہ کی سزا نہ دی جائے''۔

(بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

ابو بردہ بن نیار۔ یہ ابو بردہ ہانی بن نیار ہیں۔ ستر (۷۰) اصحاب کے ساتھ عقبہ ثانیہ میں حاضر تھے۔ ''بدر'' اور اس کے بعد کے محاربات میں بھی شریک رہے۔ یہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے ماموں ہیں۔ ان کے اولاد نہیں ہوئی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے شروع زمانہ میں تمام محاربات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے کر وفات پائی۔ ان سے حضرت براءؓ اور حضرت جابرؓ نے روایت کی ہے۔

''ہانی'' میں نون مکسور اس کے بعد ہمزہ ہے۔ ''نیار'' میں نون مکسور، دو نقطوں والی یاء غیر مشدد اور آخر میں راء مہملہ ہے۔

تشریح: قوله: لايجلد فوق عشر جلدات ......:

الجامع الصغیر کی روایت میں ''فوق عشرة أسواط'' کے الفاظ ہیں عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کے تحت تقریباً تین صفحات کی مباحث ذکر کی ہیں جو انتہائی وقیع ہیں۔ البتہ خصوصاً اس حدیث کے بارے میں حنیفہ کا کوئی ''چھینا چھنایا'' مؤقف ذکر نہیں فرمایا اس تشنگی کو تسکین دینے کے لئے یہاں استاذ محترم شیخ الاسلام مفتی محمد عثمانی صاحب حفظ اللہ کی تحقیق انتہائی معمولی تصرف کے ساتھ ذکر کی جاری ہے جو ان کی کتاب ''تقریر ترمذی'' میں مسطور ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

چہرہ پر نہ مارا جائے

۳۶۳۱:عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :اِذَا ضَرَبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَّقِ الْوَجْهَ .

(رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤ / ٦٣١، الحديث رقم: ٤٤٩٣، وأحمد فی المسند ٢ / ٢٤٤،

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص (کسی شخص کو بطور حد یا تعزیر کے) مارے تو اس کو چاہئے کہ وہ (اس مضروب کے) چہرے (پر مارنے سے) سے اجتناب کرے''۔(ابوداوٗد)

تشریح: قوله: فليتق الوجه:

چہرہ پر مانے کی ممانعت کی علت ماقبل میں یہ بیان ہوئی ہے: فان اللّٰه خلق آدم على صورته...... ۔اس سے متعلقہ احکام ماقبل میں گذر چکے ہیں

امام ترمذیؒ ابوسعید سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

اذا ضرب أحدكم خادمه فذكر اللّٰه فارفعوا أيديكم۔أی: عن ضربه۔

جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو مارے اور وہ (خادم) اللہ کا نام لے تو اپنے ہاتھ اٹھالو'۔یعنی اس کو مارنے سے رک جاؤ۔

گالی دینا موجب تعزیر ہے

۳۶۳۲:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :اِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِلرَّجُلِ :يَا يَهُوْدِیُّ! فَاضْرِبُوْهُ عِشْرِيْنَ، وَاِذَا قَالَ :يَا مُخَنَّثُ فَاضْرِبُوْهُ عِشْرِيْنَ، وَمَنْ وَقَعَ عَلٰى ذَاتِ مَحْرَمٍ فَاقْتُلُوْهُ ۔

(رواہ الترمذی وقال : هذا حديث غريب)

والترمذی فی السنن ٤ / ٥١، الحديث رقم: ١٤٦٢، و ابن ماجه فی ٢ / ٨٥٦، الحديث رقم: ٢٥٦٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر کوئی شخص کسی (مسلمان) کو کہے ''اے یہودی'' تو اس کو بیس کوڑے مارو اور اگر کہے ''اے مخنث'' (یعنی اے ہیجڑے) کہے تب بھی اس کو بیس کوڑے مارو اور جو شخص محرم عورت سے (جانتے بوجھتے ہوئے) جماع کرے اس کو قتل کردو۔'' (ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے

قوله: اذا قال الرجل للرجل ...... : یایهودی: واضح رہے کہ اے نصرانی، اے کافر کہنے کا حکم بھی یہی ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یا یهودی میں ''توریہ'' اور ابہام'' ہے۔ ممکن ہے کہ کفر کے معنی مراد ہوں۔ چونکہ یہودی کی ذلت مشہور ہے۔ مخنث کہنا بھی ایسا ہی ہے۔ اھ۔ یہ محل نظر ہے۔

کسی کو نازیبا الفاظ کہنے پر تعزیر کے احکامات:

① ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: زنا کی تہمت لگانا، خواہ باندی پر لگائے خواہ کسی غلام پر لگائے، خواہ کسی ام ولد پر لگائے، خواہ کافر پر لگائے، تہمت لگانے والے پر بالا جماع تعزیر جاری کی جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ جنایت قذف ہے، ان لوگوں میں چونکہ صفت احصان مفقود ہے، اس لئے قاذف پر حد نہیں بلکہ تعزیر جاری ہوگی۔ داؤد فرماتے ہیں کہ غلام پر زنا کی تہمت لگانا موجب حد ہے۔

② زنا کی تہمت کے علاوہ کسی اور برائی کی تہمت کسی مسلمان پر لگائے، تو (بعض صورتوں میں تعزیر جاری کی جائے گی اور بعض میں جاری نہیں کی جائے گی۔)

مندرجہ ذیل الفاظ کی صورت میں تعزیر جاری کی جائے گی:

①او رے فاسق۔ ②اے کافر۔ ③اے خبیث۔ ④او چور۔ ⑤او فاجر۔ ⑥او زندیق۔ ⑦او لوطی۔ ⑧او لڑکوں کے ساتھ کھیلنے والے۔ ⑨او سود خور۔ ⑩او دیوث۔ ⑪او مخنث۔ ⑫او شرابی۔ ⑬او خائن (بددیانت)۔ ⑭او زانیوں کے پشت پناہ ⑮ چوروں کے پشت پناہ۔ ⑯ او رنڈی کی اولاد۔ ⑰او قرطبان۔ ⑱ او قوم لوط کا عمل کرنے والے۔ ⑲ اے منافق۔ ⑳اے یہودی۔

فتاویٰ قاضی خاں میں اسی طرح مطلق ہے' اور ناطفی نے اس کو مقید کیا ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب یہ کلمات کسی نیک آدمی کو کہے جائیں۔

③ اگر کوئی شخص کسی فاسق کو او فاسق، او چور، یا او فاجر کہے تو ان الفاظ کے کہنے والے پر تعزیر جاری نہیں کی جائے گی۔

④ زنا کی تہمت کے علاوہ جس قدر تہمتیں ہیں، ان کا معاملہ قاضی کی رائے کے سپرد ہے۔

⑤ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ان الفاظ کے ذریعہ مخاطب کرے تو وہ قابل تعزیر نہیں ہوگا' اے گدھے' اے خنزیر اے کتے' اے بندر' اے بکرے' اے الو' اے سانپ' اے بیل' اے بھیڑیئے' اے حجام' اے حجام کی اولاد (درآنحالیکہ وہ کسی حجام کی اولاد نہ ہو) اے ولد الحرام۔ اے گدھے' اے خنزیر پر کہنے کی صورت میں تعزیر جاری نہیں جائے گی' چونکہ قائل نے مخاطب کو کسی معصیت کی طرف منسب نہیں کیا' اور نہ اس سے کسی قسم کا کوئی عیب متعلق ہے۔ بلکہ اس صورت میں تو قائل نے اپنے آپ کو عیب کی طرف منسوب کیا ہے چونکہ اس کا کذب ظاہر ہے اے کتے' اے خنزیر اوران جیسے الفاظ کہنے پر تعزیر کا نہ ہونا' یہ ہماتے علمائے ثلاثہ کی ظاہر روایت ہے۔ ہندوانی نے تعزیر کو اختیار کیا ہے اور یہی قول ائمہ ثلاثہ کا ہے۔ کیونکہ عرف میں یہ الفاظ گالی کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور صاحب ہدایہ نے نے اس شخص پر تعزیر جاری کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے جو مذکورہ بالا الفاظ کے ذریعہ کسی ایسے شخص کو مخاطب کرے جو شرفاء میں سے ہو۔

⑥ خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ (مندرجہ ذیل صورتوں میں) اپنی بیوی پر تعزیر (کوئی سزا) جاری کرے
(ا) شوہر کے کہنے کے باوجود اس کے سامنے زینت وآرائش کرنے سے اجتناب کرتی ہو
(ب) شوہر اس کو اپنے بستر پر (ہمبستری کے لئے) بلائے اور وہ انکار کردے
(ج) وہ نماز نہ پڑھتی ہو۔
(د) غسل جنابت ترک کرتی ہو
(ھ) شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے باہر آتی جاتی ہو۔

⑦ شراب بیچنے والے، سودخور، گائیکار، مخنث، نائحہ ان سب پر تعزیر جاری کی جائے گی، اور قید میں ڈال دیا جائے گا تاوقتیکہ توبہ کرلیں۔

⑧ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو گالی دے تو مسلمان پر تعزیر جاری کی جائے گی، چونکہ گالی دینا بھی ارتکاب معصیت ہے۔

⑨ اگر کسی نے کسی اجنبیہ کو بوسہ دیا، یا گلے لگایا یا شہوت کے ساتھ چھوا تو اس پر بھی تعزیر جاری کی جائے گی۔

⑩ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی کہ وہ اس متکلم پر تعزیر کا باعث بنتی ہے، تو سامع کیلئے بہتر یہ ہے کہ جواب نہ دے اور اپنا قضیہ قاضی کے پاس لے جانا چاہے تاکہ وہ اس شخص پر تعزیر جاری کرے تو یہ بھی جائز ہے۔ اگر جواب مین کہا کہ تو ایسا ہے، تو جواباً ایسا کہنے میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

قوله: ومن وقع على ذات محرم فاقتلوه:

علماء کے نزدیک اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف مستحل کے ساتھ ہے۔ مظہرؒ فرماتے ہیں امام احمدؒ نے اس ارشاد کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے بعض دیگر حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ یہ ارشاد زجر پر محمول ہے ورنہ محرم عورت کے ساتھ زنا کا رکا بھی وہی حکم ہے جو دوسری عورتوں کے ساتھ زنا کا ہے' کہ اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے اور اگر غیر محصن (کنوارا) ہو تو کوڑے مارے جائیں۔

خیانت پر تعزیر کا بیان

۳۶۳۳: وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا وَجَدْ تُّمُ الرَّجُلَ قَدْ غَلَّ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاحْرِقُوْا مَتَاعَهُ وَاضْرِبُوْهُ ۔ (رواه الترمذی و ابوداود وقال الترمذی هذا حديث غريب)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳ / ۱۷۵' الحديث رقم ۲۷۱۳' والترمذی فی ٤ / ٥٠' الحديث رقم: ١٤٦١

ترجمہ: ''اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم کسی ایسے شخص کو پاؤ جس نے اللہ کی راہ میں خیانت کی ہو (یعنی اس نے مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس میں سے کچھ چرا لیا ہو) تو اس کا مال واسباب جلا ڈالو اور اس کی پٹائی کرو''۔ (ابوداؤ'د ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حکم اسلام کے ابتدائی زمانہ میں نافذ تھا' مگر بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔
خطابیؒ فرماتے ہیں: اس فعل بد پر جسمانی سزا کے نفاذ میں، علماء کا کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں۔ البتہ مالی عقوبت، کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اگر اس کے سامان میں قرآن کریم یا جانور ہوں تو ان کو نہ جلایا جائے۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا بھی یہی ہے۔ البتہ مالِ غنیمت میں سے چرائے گئے مال واسباب کا بطور سزا جلانا جائز نہیں، چونکہ اس مال واسباب میں غانمین کا حق بھی ہے۔
جو انہیں دیا جانا چاہیے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اس جنایت کرنے والے کو جسمانی سزا دی جائے، اس کے مال واسباب سے تعرض نہ کیا جائے۔
فائدہ: اس باب میں فصل ثالث نہیں ہے۔

بَابُ بَيَانِ الْخَمْرِ وَ وَعِيْدِ شَارِبِهَا

شراب کی حقیقت اور شرابی کے بارے میں وعید کا بیان

الفصل الاول:

انگور اور کھجور کی شراب کا بیان

۳۶۳۴: عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْخَمْرُ مِنْ هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ: النَّخْلَةِ وَالْعِنَبَةِ (متفق عليه)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٥٧٣' الحديث رقم: ١٣ ـ ١٩٨٥' بب ٤ / ٨٣' الحديث رقم: ٣٦٧٨' والترمذى فى ٤ / ٢٦٣' الحديث رقم: ١٨٧٥' والنسائى فى ٨ / ٢٩٤' الحديث رقم: ٥٥٧٢' وابن ماجه فى ٢ / ١١٢١' الحديث رقم: ٣٣٧٨' وأحمد فى المسند ٢ / ٢٧٩

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شراب ان دو درختوں یعنی انگور اور کھجور سے بنتی ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: الخمر من هاتين الشجرتين ......:
النخلة و العنبة: بدلیت کی بناء پر دونوں کو مجرور پڑھنا بھی درست ہے۔ ایک نسخہ میں دونوں مرفوع ہیں اور دونوں کو منصوب پڑھنا بھی درست ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان دو کا خصوصی طور پر ذکر فرمانا اس وجہ سے ہے کہ اکثر ان ہی دو چیزوں سے شراب بنتی ہے' اس اسلوب میں حصر نہیں ہے چونکہ ترکیب میں ادوات حصر نہیں ہے (یعنی یہ ظاہر کرنا مراد نہیں ہے کہ شراب بس انہی دو مخصوص

چیزوں سے بنتی ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

کل مسکر خمر ''ہر نشہ آور چیز شراب ہے''۔

چنانچہ اس ارشاد میں عمومیت ہے (**کذا ذکرہ بعضھم**) علاوہ ازیں یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس سے زیادہ کا ذکر ہے انہوں نے اس کی تعداد پانچ تک بتلائی ہے۔ مگر وہاں بھی حصر مراد نہیں ہے، عدم حصر کی دلیل اس کا اگلا جملہ ''**والخمر ما خامر العقل**'' ہے۔ (اس جملہ کے ذریعے اشارہ کیا کہ شراب انہی پانچ چیزوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ کسی بھی چیز سے بنا ہوا ہر وہ مشروب بھی شراب ہے جس میں نشہ ہو اور اس کے پینے سے عقل وشعور پر پردہ پڑ جاتا ہو۔) اس سلسلہ کی مزید تحقیق عنقریب ابن ہمام کے کلام میں آرہی ہے۔

عرضِ مرتب:

یہ حدیث متفق علیہ نہیں ہے اس حدیث کو صرف امام مسلمؒ نے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ الجامع الصغیر میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: رواہ احمد و مسلم والأربعة عن أبی ہریرة [۲/۲۵۲، الحدیث رقم ۴۱۴۳]

شراب کی چند اقسام کا بیان

۳۶۳۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: خَطَبَ عُمَرُ عَلٰى مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنَّهٗ قَدْ نَزَلَ تَحْرِيْمُ الْخَمْرِ، وَهِيَ مِنْ خَمْسَةِ اَشْيَاءَ: الْعِنَبِ، وَالتَّمْرِ، وَالْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ، وَالْعَسَلِ. وَالْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰ / ۴۵، الحدیث رقم: ۵۵۸۸، و مسلم فی ۴ / ۲۳۲۲، الحدیث رقم: (۲۳ - ۳۰۳۲) أخرجه ابوداؤد فی السنن ۴ / ۷۸، الحدیث رقم: ۳۶۶۹، والنسائی فی ۸ / ۲۹۵، الحدیث رقم: ۵۵۷۸

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے منبر پر (کھڑے ہو کر) خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ ''شراب کی حرمت نازل ہوگئی ہے اور شراب ان پانچ چیزوں سے تیار ہوتی ہے یعنی انگور سے، کھجور سے، گیہوں سے، جو سے اور شہد سے اور شراب وہ ہے جو عقل پر پردہ ڈال دے۔'' (بخاری)

تشریح: قولہ: خطب عمر علی منبر۔۔۔والعمل:

نہ یہ ضمیر ضمیر شان ہے۔ ھی۔ یہ ضمیر ''خمر'' کی طرف راجع ہے اور قاموس میں ہے کہ ''خمر'' کبھی مذکر استعمال ہوتا ہے **قولہ: والخمر ما خامر العقل:** ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس میں اس بات کا بیان ہے کہ ''خمر''، خمر بمعنی ''مستر'' سے ماخوذ ہے۔ اس حدیث سے ان حضرات کی تردید ہورہی ہے کہ جن کا گمان ہے کہ خمر صرف اس شراب کو کہتے ہیں جو انگور سے بنی ہو۔ اھ لیکن ان کا یہ فرمانا درحقیقت اپنے مذہب سے عدم واقفیت کے سبب ہے۔ ہمارے ہاں خمر کی تعریف یہ ہے:

الخمر هي التي من خاء عنب غلا واشتد وقذف بالمزبد۔

آخری شرط امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے۔صاحبین کے نزدیک ''وذفبالزید'' کی شرط نہیں ہے۔

عرضِ مرتب:

یہ حدیث متفق علیہ ہے،جیسا کہ تخریج میں بالکل واضح ہے۔

کچی اور خشک کھجور کی شراب کا بیان

۳۶۳۶:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: لَقَدْ حُرِّمَتِ الْخَمْرُ حِيْنَ حُرِّمَتْ، وَمَا نَجِدُ خَمْرَ الْاَعْنَابِ اِلَّا قَلِيْلًا، وَعَامَّةُ خَمْرِنَا الْبُسْرُ وَالتَّمْرُ . (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٠ / ٣٥، الحديث رقم : ٥٥٨٠، و مسلم بنحوه فی صحيحه ٣ / ١٥٧١، الحديث رقم : (٧ ـ ١٩٨٠) والنسائی فی السنن ٨ / ٢٨٨، الحديث رقم : ٥٥٤٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب شراب حرام قرار دی گئی تو اسی وقت اس کی حرمت (نافذ) ہوگئی تھی اور (اس وقت) ہمیں انگور کی شراب کم ملتی تھی۔عام طور پر ہماری زیادہ تر شراب کچی اور خشک کھجور سے تیار ہوتی تھی''۔(بخاری)

تشریح: قوله:لقد حرمت الخمر حين حرمت ......:

ان الفاظ میں اس بات کے خبر دی ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے اس کی حرمت کا حکم اپنے رسول پر نازل کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت پر نص (صراحت) فرمائی ہے چونکہ صحابی کے یہ الفاظ ''أمرنا یا ''حرم'' یا ان سے ملتے جلتے الفاظ پر مشتمل کلام حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔

البسر: بائے موحدہ کے ضمہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

نشہ آور مشروب کا بیان

۳۶۳۷:وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِتْعِ وَهُوَنَبِيْذُ الْعَسَلِ فَقَالَ: كُلُّ شَرَابٍ اَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٠ / ٤١، الحديث رقم : ٥٥٨٦، و مسلم فی ٣ / ١٥٨٥، الحديث رقم (٦٧ ـ ٢٠٠١) وأخرجه أبو داود فی السنن ٤ / ٨٨، الحديث رقم : ٣٦٨٢، و الترمذی فی ٤ / ٤٥٧، الحديث رقم : ١٨٦٣، والنسائی فی ٨ / ٢٩٨، الحديث رقم ٥٥٩٤، وابن ماجه فی ٢ / ١١٢٣، الحديث رقم : ٣٣٨٦، و مالك فی الموطأ ٢ / ٨٤٥، الحديث رقم : ٩ من كتاب الأشربة وأحمد فی المسند ٦ / ١٩٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بتع یعنی شہد کی نبیذ کے بارے میں سوال کیا

گیا (کہ آیا اس کا پینا جائز ہے یا نہیں؟) تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ "ہر مشروب جو نشہ آور ہو' حرام ہے"۔
(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: سُئل رسول الله ﷺ عن البتع:

البتع: بائے موحدہ کے کسرہ ہے تائے فوقانیہ کے سکون کے ساتھ، تاء کو متحرک بھی پڑھا جاتا ہے۔ (کذا قالہ فی النھایۃ) اور قاموس میں اتنا اضافہ ہے: **المشتد أو سلالة العنب و مالكسر الخمر** ۔یعنی تیز شراب یا کھجور کا عصار اور کسرہ کے ساتھ شراب کو کہتے ہیں۔

قوله: کل شراب اسکر فهو حرام: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "**کل شراب أسکر فهو حرام**" دلالت کرتا ہے کہ ہر مسکر حرام ہے۔حدیث مبارکہ کا یہ جملہ "کل مسکر خمر" (جو اگلی حدیث میں ہے) اور اگلا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ اطراد علت کی بنیاد پر قیاس جائز ہے۔

تخریج: اسی حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

"شرابی" جنت کی شراب سے محروم ہے

۳۶۳۸ :وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ، وَمَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا فَمَاتَ وَهُوَ يُدْمِنُهَا لَمْ يَتُبْ لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ۔

(متفق عليه)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ٥٨٧، الحديث رقم : (٧٣ ـ ٢٠٠٣) وأخرج البخارى شطره الثانى فى صحيحه ١٠ / الحديث رقم ٥٥٧٥، وأخرجه ايضًا الترمذى فى السنن ٤ / ٢٥٦، الحديث رقم : ١٨٦٨، وابن ماجه فى ٢ / ١١١٩، الحديث رقم : ٣٣٧٣، والدارمى فى ٢ / ١٥٢، الحديث رقم ٢٠٩٠، و مالك فى الموطا ٢ / ٨٤٦، الحديث رقم ١١، من كتاب الأشربة وأحمد فى المسند ٢ / ١٩

ترجمہ: "اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: "ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو وہ شراب ہے اور جو چیز نشہ آور ہے وہ حرام ہے (خواہ مقدار میں تھوڑی ہو یا زیادہ ہو) اور جس شخص نے دنیا میں شراب پی اور وہ مسلسل شراب پیتا رہا یہاں تک کہ بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کو آخرت میں شراب پینا نصیب نہ ہوگا"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: **ومن شرب الخمر فی الدنیا......** :

وهو يدمنها: یعنی ہمیشہ پیتا رہا حتی کہ توبہ کئے بغیر اسی حال میں مرا۔

لم یشربها فی الآخرة: اس جملہ کی مراد میں علماء کے متعدد اقوال ہیں۔

① اس شخص کی حالت کو بیان کرنا ہے جو شراب کو حلال جانتے ہوئے ہمیشہ پیتا تھا

۲ یہ ارشاد زجر و توبیخ اور شراب پینے کی شدید ممانعت پر محمول ہے۔
۳ النہایہ میں لکھتے ہیں: یہ ارشاد گرامی ''تعلیق بالیان'' کے قبیل سے ہے مراد یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا چونکہ خمر جنت کا مشروب ہے' پس جب وہ اس کو پی نہیں سکتا تو جنت میں داخل نہیں ہوگا۔
۴ امام نوویؒ فرماتے ہیں: کہا گیا ہے کہ جنت میں تو داخل ہوگا لیکن یہ شخص اس سے محروم رہے گا' کیونکہ خمر جنت کے مشروبات فاخرہ میں سے ہے۔ پس دنیا میں پینے کے سبب یہ عاصی جنت میں پینے سے محروم کر دیا جائے گا۔
۵ اس کو اسی کی چاہت ہی نہ ہوگی اگر چہ اس کو یہ یاد ہوگی اور یہ انتہائی عظیم نقصان ہے کہ جنت کی اشرف ترین نعمت سے محروم کر دیا جائے۔
۶ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اس کی نظر معتزلی اور اس جیسے لوگوں کا رؤیت سے محروم ہونا ہے۔
۷ ممکن ہے کہ یہ محرومی خاص مدت تک ہو کہ جتنا عرصہ دنیا میں شراب پی اتنا عرصہ جنت میں شراب نہیں پیئے گا۔ اس شخص کو آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ شراب طہور پینا نصیب نہیں ہوگا جو نجات یافتہ اور جنت میں پہلے داخل ہونے والوں میں ہوں گے۔
۸ مدمر شراب اس کیت و کیفیت کے ساتھ نہیں پیئے گا کہ جس کیت و کیفیت کے ساتھ شراب نوشی سے توبہ کرنے والے پئیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (آخری چاروں احتمالات بھی امام نوویؒ ہی کے ذکر کردہ ہیں۔)

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔ الجامع الصغیر میں ہے کہ احمد، شیخین، نسائی اور ابن ماجہ اس حدیث کو نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

من شرب الخمر في الدنيا لم يتب منها حرمها في الآخرة۔ [الجامع الصغير ٢/ ٥٣٠، الحديث رقم ٨٧٤٤]

شراب پینے پر وعید

٣٦٣٩ :وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَجُلاً قَدِمَ مِنَ الْيَمَنِ' فَسَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَرَابٍ يَشْرَبُوْنَهٗ بَاَرْضِهِمْ مِنَ الذُّرَةِ يُقَالَ لَهُ الْمِزْرُ' فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَوَ مُسْكِرٌ هُوَ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ: كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ' اِنَّ عَلَى اللّٰهِ عَهْدًا لِمَنْ يَشْرَبُ الْمُسْكِرَ اَنْ يَّسْقِيَهٗ مِنْ طِيْنَةِ الْخَبَالِ قَالُوْا :يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَا طِيْنَةُ الْخَبَالِ؟ قَالَ :عَرَقُ اَهْلِ النَّارِ' اَوْعُصَارَةُ اَهْلِ النَّارِ ..(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٣ / ١٥٨٧' الحديث رقم : ٧٢ / ٢٠٠٢' والنسائي في السنن ٨ / ٣٢٧' الحديث رقم : ٥٧٠٩' وأحمد في المسند ٣ / ٣٦١

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص یمن سے (دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں) حاضر ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جوار کی شراب جو وہ سرزمین (یعنی یمن) میں وہ پیتے تھے اور جس کو ''مزر'' کہا جاتا تھا کے بارے میں سوال کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: ''کیا وہ نشہ آور ہے؟'' اس نے کہا کہ ''ہاں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''نشہ لانے والی ہر چیز حرام ہے اور (یاد رکھو) کہ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد ہے کہ جو شخص نشہ آور کوئی بھی چیز پئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے دن) ''طينة الخبال'' سے سیراب کرے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ''طينة الخبال'' کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ دوزخیوں کا پسینہ ہے یا فرمایا کہ خبال وہ پیپ اور لہو ہے جو دوزخیوں کے زخموں سے بہتا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: أن رجلا قدم من اليمن۔۔۔ يقال له المزر:**

الذرة: ذال معجمہ کے ضمہ اور راء کی تخفیف کے ساتھ، اس کی اصل ''ذرو'' یا ''ذری'' ہے، اور ھاء عوض کی ہے۔ (ذکرہ جوہری)

من: جار مجرور ''يشربونه'' کے متعلق ہے، یا ''من'' بیانیہ ہے۔

قوله: أوسكر هو۔۔۔من طينة الخبال: أو مسكر: یہاں فعل محذوف ہے: أي: أيشربونه ومكسر؟۔

ان على الله عهد: یہ جملہ ''مستانفہ معللہ'' ہے۔ عهد ''وعید مؤکد'' کے معنی میں ہے۔

يسقيه: مجرد ومزید ہر دو سے درست ہے۔

الخبال: خاء کے فتح کے ساتھ ہے۔

''لمن'' کا ''لام'' بیان کیلئے۔ گویا کہ جب یہ فرمایا گیا: **ان على الله عهدا**، تو سوال ہوا: **هذا العهد لمن؟** تو جواب یہ دیا گیا: **لمن يشرب المسكر** ۔ یہ فرمان نبوی اس آیت مبارکہ کی طرح ہے: ﴿ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ [البقرة ۲۳۳]

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ''عهد'' ''حتم'' کے معنی کو متضمن ہونے کی وجہ سے ''علیٰ'' کے ذریعہ متعدی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشادِ باری تعالیٰ میں: ﴿ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مریم: ۷۱] **أي: كان ورودهم وسقيهم من طينة الخيالل واجبا على الله وعيدا أوجبه على نفسه وأوعد عليه وعزم على أن لا يكون غيرهما** (ان کا آنا اور ''طينة الخيال'' سے پینا یہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، یہ ایسی وعید ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے اور عزم کیا ہے کہ ان دو باتوں کے علاوہ نہ ہوگا۔) اس میں ''حلف'' اور قسم کے معنی ہیں۔ اس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی: ''**الا تحلة القسم**'' ہے نیز یہ حدیث ہے:

حلف ربی عزوجل، بعزتی لا يشرب عبد من عبيدی جرعة من خمرة الا سقيته من الصديد مثلها۔
''میرے رب عزوجل نے قسم کھائی ہے کہ میری عزت کی قسم میرے بندوں میں سے کوئی بندہ کسی شراب کا ایک گھونٹ بھی پیئے گا تو میں اس کو صدید سے اس کی مثل پلاؤں گا۔

قوله: وما طينة الخبال ......:

طينة: خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ایک نسخہ میں اعراب حکائی کی وجہ سے مجرور ہے، اگلا جملہ بھی اسی طرح ہے۔

نبیذ مفرد و مرکب کا بیان

۳۶۴۰:وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ' اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ خَلِیْطِ التَّمْرِ' وَالْبُسْرِ' وَعَنْ خَلِیْطِ الزَّبِیْبِ' وَالتَّمْرِ' وَعَنْ خَلِیْطِ الزَّهْوِ وَالرُّطَبِ وَقَالَ:انْتَبِذُوْا کُلَّ وَاحِدٍ عَلٰی حِدَةٍ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰ / ٦٧' الحدیث رقم : ٥٦٠٢' و مسلم فی ۳ / ۱۵۷٦' الحدیث رقم : (۲۱ ۰ ۱۹۸۸) أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ۱۰۰ ' الحدیث رقم : ۳۷۰٤' والنسائی فی ۸ / ۲۸۹' الحدیث رقم : ٥٥٥۱' وابن ماجه فی ۲ / ۱۱۲٥' الحدیث رقم : ۳۳۹۷' والدارمی فی ۲ / ۱٥۹' الحدیث رقم : ۲۱۱۳' وأحمد فی المسند ٥ / ۳۰۹

ترجمہ:''اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خشک اور کچی کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے' خشک کھجور اور خشک انگور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے اور کچی کھجور اور تر کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اگر نبیذ بنانا ہی ہو تو) ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ نبیذ بناؤ''۔ (مسلم)

تشریح:قوله: ان النبی ؑ نهی عن خلیط ...... :البسر : صاحب قاموس لکھتے ہیں: کھجور کو پکنے سے پہلے ''بسر'' کہتے ہیں۔ اھ۔ الزهو: رنگ دار کھجور (جو زرد یا سرخ ہو۔) قاضیؒ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو پھلوں کو ملا کر بھگونے (یعنی ان کا نبیذ بنانے) سے منع فرمایا اور الگ الگ کر کے بھگونے (اور اس کی نبیذ بنانے) کو جائز رکھا۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جب دو مختلف طرح کے پھل ایک ساتھ بھگوئے جائیں گے تو مخض مرتبہ کسی ایک چیز میں بہت جلد تغیر آ جاتا ہے چنانچہ وہ دوسری چیز کو بھی خراب کر دیتا ہے اور بسا اوقات ظاہر بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب اس نبیذ کو پیا جائے گا تو گویا ایک حرام چیز کو پینا لازم آئے گا۔

مظہرؒ لکھتے ہیں: امام مالکؒ اور امام احمدؒ اسی بنیاد پر اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسی نبیذ پینا جو دو پھلوں کو باہم بھگو کر بنائی گئی ہو' حرام ہے خواہ اس میں نشہ ہو یا نشہ نہ ہو امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ ایسی نبیذ کا پینا اسی صورت میں حرام ہوگا جب کہ وہ نشہ آور ہو۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا قول ثانی بھی یہی ہے۔

تخریج:اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

شراب کو سرکہ بنانا کیا ہے؟

۳۶۴۱:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْخَمْرِ یُتَّخَذُ خَلًّا ؟ فَقَالَ :لَا .

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۵۷۳' الحدیث رقم : (۱۱ ۱۹۸۳) والترمذی فی السنن ۳ / ٥۸۹' الحدیث رقم : ۱۲۹٤' والدارمی فی ۲ / ۱٥۹' الحدیث رقم : ۲۱۱٥' وأحمد فی المسند ۳ / ۲٦۰

ترجمہ:''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے بارے میں سوال کیا گیا

کہ اگر شراب (میں نمک یا پیاز وغیرہ ڈال کر یا اس کو دھوپ میں رکھ کر اس) کا سرکہ بنا لیا جائے تو وہ حلال ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ان لنبیؐ سئل عن الخمر...... :یتخذ: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے، یا حالیہ ہے۔

اس حدیث سے ''تخلیل'' کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام احمدؒ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہ اوزاعی اور لیثؒ فرماتے ہیں ''تخلیل'' کے ذریعہ وہ پاک ہوجائے گی۔ امام مالکؒ سے اس مسئلہ میں تین روایات ہیں سب سے صحیح روایت یہ ہے کہ ''تخلیل'' حرام ہے چنانچہ اگر شراب کو سرکہ بنایا تو ''عاصی'' ہوگا، البتہ وہ مشروب پاک ہوجائے گا۔ امام شافعیؒ کا موقف یہ ہے کہ شراب میں کوئی چیز سرکہ بنانے کیلئے ڈالی گئی تو وہ شراب کبھی بھی پاک نہیں ہوگی۔ ہاں البتہ اگر دھوپ وغیرہ میں رکھ کر سرکہ بنالیا جائے تو اس بارے میں شافعیہ کے ہاں دو قول ہیں قول اصح یہ ہے کہ پاک ہوجائے گی۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو حلال اس لئے نہیں فرمایا تھا کہ اس وقت شراب کی حرمت نازل ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا اور لوگوں نے بڑی طویل عادت کو ترک کر کے شراب سے منہ موڑا تھا اور یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان جس کو ایک طویل عادت کے بعد چھوڑتا ہے اس کی طرف اس کی طبیعت اور خواہش کا میلان کافی عرصہ تک رہتا ہے' لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس وقت شیطان کی مداخلت سے خوف محسوس فرما کر کہ مبادا شیطان لعین کو اپنا حربہ آزمانے کا موقع مل جائے اور اس کے نتیجہ میں لوگ اس چیز کو شراب پینے کا وسیلہ بنا لیں' لیکن شراب کی حرمت پر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد جب اس قسم کا کوئی خوف نہ رہا نعم الادام الخل (بہترین سالن سرکہ ہے) اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے اس حدیث کو امام مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے بیہقی نے اپنی کتاب معرفت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے: خیر خلکم خل خمر کم۔ (بیهقی)

''تمہارے سرکوں میں بہترین سرکہ وہ ہے جو شراب سے بنا ہو''۔

یہ حدیث بیان حکم پر محمول ہے، چونکہ یہی شارع کے منصب کے لائق ہے، شارع کا منصب بیان لغت نہیں ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام ابوداؤد اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

''شراب ایک بیماری''

۳۶۴۲: وَعَنْ وَائِلِ الْحَضْرَمِيِّ اَنَّ طَارِقَ بْنَ سُوَيْدٍ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَمْرِ فَنَهَاهُ، فَقَالَ: اِنَّمَا اَصْنَعُهَا لِلدَّوَاءِ، فَقَالَ: اِنَّهٗ لَيْسَ بِدَوَاءٍ، وَلٰكِنَّهٗ دَاءٌ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٣ / ١٥٧٣، الحدیث رقم: (١٢ ـ ١٩٨٤) والدارمی فی ٢ / ١٥٣، الحدیث رقم: ٢٠٩٥، وأحمد فی المسند ٤ / ٣٣١

ترجمہ: ''اور حضرت وائل حضرمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ طارق بن سوید نے نبی کریم ﷺ سے شراب (پینے یا بنانے) کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے ان کو (اس سے) منع فرمایا' پھر طارق نے کہا کہ ہم تو

شراب کو دوا کے طور پر استعمال کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ دوا نہیں ہے بلکہ (خود ایک) مرض ہے''۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

طارق بن سوید۔ یہ طارق بن سوید ہیں۔ ان کو آنحضور ﷺ کا شرف صحبت حاصل ہے۔ ان کی حدیث ''بیان خمر'' کے بارے میں موجود ہے ان سے علقمہ بن وائل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله: فقال: انه لیس بدواء لکنه داء:

انه: ضمیر ''خمر'' کی طرف راجع ہے۔ صاحب قاموس کا کہنا ہے کہ لفظ ''خمر'' مذکر بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس وقت یہ اسم مذکر مثلاً ''شراب'' کی تاویل میں ہوتا ہے۔

امام نووی ؒ فرماتے ہیں: اس (جملہ) میں تصریح ہے کہ شراب ''دوا'' نہیں ہے۔ لہٰذا دوا کے طور پر استعمال کرنا حرام ہے، چونکہ جب یہ دوا ہی نہیں تو اس کا استعمال بلا سبب ٹھہرا۔ البتہ اگر حلق میں کوئی لقمہ وغیرہ اٹک جائے اور اس کی وجہ سے جان کی ہلاکت کا خوف ہو نیز اس وقت شراب کے علاوہ ایسی اور کوئی چیز موجود نہ ہو جس سے وہ لقمہ وغیرہ حلق سے اتر جائے تو اس صورت میں اس شخص پر لازم ہے کہ وہ شراب کے ذریعہ لقمہ نکل جائے' چونکہ اس وقت اس سے حصول شفاء یقینی ہے بخلاف تداوی کے۔

الفصل الثانی:

''شرابی'' کی نماز کی قبولیت کا بیان

۳۶۴۳: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلَاةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَاِنْ عَادَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلَاةَ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَاِنْ عَادَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلَاةَ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاِنْ عَادَ فِي الرَّابِعَةِ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلَاةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، فَاِنْ تَابَ لَمْ يَتُبِ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَقَاهُ مِنْ نَهْرِ الْخَبَالِ۔ (رواه الترمذی)

والترمذی فی السنن ٤ / ٢٥٧، الحدیث رقم: ١٨٦٢ و احمد فی المسند ٢ / ٢٥

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص (پہلی مرتبہ) شراب پیتا ہے (اور توبہ نہیں کرتا) تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں فرماتا' پھر اگر وہ (خلوصِ دل سے) توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے پھر اگر وہ (دوسری مرتبہ) شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں فرماتا اور پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے پھر اگر وہ

(تیسری مرتبہ) شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں فرماتا اور پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ چوتھی مرتبہ شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ (نہ صرف یہ کہ) چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں فرماتا (بلکہ) اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ (بھی) قبول نہیں فرماتا اور (آخرت میں) اس کو دوزخیوں کی پیپ اور لہو کی نہر سے پلائے گا"۔ (ترمذی)

۳۶۴۴ : وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو۔

أخرجه النسائی فی السنن ۸ / ۳۱٦' الحدیث رقم : ٥٦٦٩' وابن ماجه فی ۲ / ۱۱۲۰' الحدیث رقم : ۳۳۷۷' والدارمی فی ۲ / ۱٥۲' الحدیث رقم : ۲۰۹۱' وأحمد فی المسند ۲ / ۱۸۹

ترجمہ: نسائی' ابن ماجہ اور دارمی نے اس روایت کو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے"۔

تشریح: واضح رہے کہ پچھلی حدیث جو امام ترمذیؒ نے ذکر کی ہے وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی تھی، اور یہ روایت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

طبرانیؒ نے سند حسن کے ساتھ سائب بن یزید سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

من شرب مسکرا ما کان لم یقبل له صلاة أربعین یوما۔

نشہ آور تھوڑی سی چیز بھی حرام ہے

۳۶۴۵: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ۔

(رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ۸۷' الحدیث رقم : والترمذی فی ٤ / ۲٥۸' الحدیث رقم : ۱۸٦٥' وابن ماجه فی ۲ / ۱۱۲٥' الحدیث رقم : ۳۳۹۳' وأحمد فی المسند ۳ / ۳٤۳

ترجمہ: "اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل ترین مقدار بھی حرام ہے"۔ (ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمد نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو امام احمد نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عمرو واؤ کے ساتھ سے روایت کیا ہے۔

نشہ آور چیز کی "چلو بھر" مقدار بھی حرام

۳۶۴٦: وَعَنْ عَآئِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا اَسْكَرَ مِنْهُ الْفَرَقُ فَمِلْءُ الْكَفِّ مِنْهُ حَرَامٌ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداود)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ۹۱' الحدیث رقم : ۳٦۸۷' و الترمذی فی ٤ / ۲٥۹' الحدیث رقم : ۱۸٦٦'

وأحمد فی المسند ٦ / ١٣١

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس چیز (مثلاً شراب) کا ایک ''فرق'' (سو رطل) نشہ آور ہو اس کا ایک بھرا ہوا چلو پینا بھی حرام ہے''۔

(احمد' ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: الفرق :اس لفظ کے سلسلہ میں علماء کی مختلف آراء ہیں چنانچہ تمام آراء بالترتیب ذکر کی جارہی ہیں، آخر میں ان آراء کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ الفرق: فاء کے فتحہ اور راء کے سکون اور فتحہ کے ساتھ مدینہ کا ایک معروف پیمانہ ہے یہ سولہ رطل کا ہوتا ہے۔

''النهاية'' میں ہے کہ ''الفرق'' فتحہ کے ساتھ اس میں سولہ رطل سماتے ہیں اور یہ بارہ مدتین صاع کا ہوتا ہے اہل حجاز کے نزدیک کہا گیا ہے۔ کہ ''فرق'' پانچ اقساط کا ہوتا ہے اور قسط نصف کا ہوتا ہے اور ''فرق'' سکون کے ساتھ ہو تو ایک سو بیس (۱۲۰) رطل کا ہوتا ہے۔ اسی سے یہ حدیث ہے۔

ماأسكر الفرق منه فالحسو منه حرام اھ۔ سکون مقام مبالغہ کے زیادہ مناسب ہے۔ اصول معتمدہ عین ضبط اسی طرح ہے اور قاموس میں ہے: ''فرق'' مدینہ کا پیمانہ ہے' اس میں تین صاع آتے ہیں اور اس کو حرکت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور یہ افصح ہے۔ یا یہ سولہ رطل اور چار ارباع کا ہوتا ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: الفرق'' سکون کے ساتھ برتنوں میں سے ہے اور مقاچیر میں وہ پیمانہ ہے جو سولہ رطل کا یا بارہ مدّ کا ہوتا ہے اور مقادیر میں وہ پیمانہ ہے جو سولہ رطل کا یا چھتیس رطل کا ہوتا ہے اور معتمد بات وہ ہے جو محقق ابن ہمام نے ذکر کی ہے کہ ''فرق'' اہل لغت کے نزدیک حرکت کے ساتھ ہے اور محدثین اس کو سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ معروف پیمانہ ہے جو سولہ رطل کا ہوتا ہے۔

قوله: فملء الكف منه حرام:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''الفرق'' اور ''ملء الكف'' تکثیر و تقلیل سے کنایہ ہیں، تحدید کیلئے نہیں ہیں۔ (یعنی جس نشہ آور چیز کی زیادہ مقدر حرام ہے اس کی قلیل ترین مقدار بھی حرام ہے۔) اس کی تائید حدیث سابق سے بھی ہوتی ہے۔

شراب کی چند معروف اقسام

۳۶۴۷: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ مِنَ الْحِنْطَةِ خَمْرًا، وَمِنَ الشَّعِيْرِ خَمْرًا، وَمِنَ التَّمْرِ خَمْرًا، وَمِنَ الزَّبِيْبِ خَمْرًا، وَمِنَ الْعَسَلِ خَمْرًا۔

(رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث غريب)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤ / ٨٣' الحديث رقم: ٣٦٨٦' والترمذی فی السنن ٤ / ٢٦٢

ترجمہ: ''اور حضرت نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گیہوں کی بھی شراب ہوتی ہے' جو

کی بھی شراب ہوتی ہے، کھجور کی بھی شراب ہوتی ہے، انگور کی بھی شراب ہوتی ہے اور شہد کی بھی شراب ہوتی ہے۔
(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

اسنادی حیثیت: ''امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قولہ: ان من النحطه خمرا: ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس کو خمر کہنا مجازاً ہے کیونکہ یہ عقل کو زائل کرتی ہے۔

آیت تحریم خمر کی روشنی میں

۳۶۴۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ، قَالَ: كَانَ عِنْدَنَا خَمْرٌ لِيَتِيْمٍ، فَلَمَّا نَزَلَتِ الْمَائِدَةُ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُ، وَقُلْتُ: اِنَّهٗ لِيَتِيْمٍ فَقَالَ: اَهْرِيْقُوْهُ. (رواه الترمذی)

والترمذی فی السنن ۳ / ۵۶۳، الحدیث رقم: ۱۲۶۳، وأحمد فی المسند ۳ / ۲۶

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک یتیم کی شراب رکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ سورۂ مائدہ نازل ہوئی تو میں نے اس یتیم کی شراب کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور عرض کیا کہ وہ ایک یتیم کی (شراب) ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس کو پھینک دو''۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ: نزلت المائدۃ:

مظہرؒ فرماتے ہیں: یہاں سورہ مائدہ سے مراد اس سورت کی یہ دو آیتیں ہیں جن میں تحریم خمر کا ذکر ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ﴾ [المائدة: ۹۰]

ان دو آیتوں میں تحریم خمر کے سات دلائل ہیں:

① اس کو ''رِجس'' قرار دیا ہے۔ اور رجس نجس ہے، اور ہر نجس حرام ہے

② ''من عمل الشیطان'' قرار دیا ہے اور جو چیز ''من عمل الشیطان'' ہو وہ حرام ہوتی ہے۔

③ اس کے بارے میں فاجتنبوه فرمایا۔ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے اجتناب کا حکم دیا ہو وہ حرام ہوتی ہے۔

④ لعلکم تفلحون: فرمایا اور فلاح کی امید جس چیز کے اجتناب کے ساتھ معلق ہو، اس چیز کا استعمال حرام ہوتا ہے۔

⑤ انما یرید الشیطان أن یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء'' قرار دیا ہے اور وہ چیز حرام ہوتی ہے جو مسلمانوں کے درمیان عداوت وبغضاء کا سبب ہو

⑥ ''ویصد کم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ'' قرار دیا، اور ہر وہ عمل کہ جس کے ذریعہ شیطان مسلمان کو ذکر اللہ اور نماز سے روکے وہ حرام ہے۔

⑦ فهل انتم منتهون۔ اگرچہ استفہام ہے مگر امر ہے کہ ''انتھوا'' اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے رکنے کا حکم دیا ہو اس چیز کو بجالانا حرام ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں اور آٹھویں دلیل یہ ہے کہ اس کا ذکر اوثان کے ساتھ متصلاً کیا ہے کہ: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ'' جو شخص امام یعنی سربراہ مملکت) کی اطاعت و فرمانبرداری سے نکل جائے اور اسلام کی جماعت (ملت کی اجتماعی ہیئت) سے علیحدگی اختیار کرے اور پھر اسی حالت میں مر جائے تو اس کا مرنا جاہلیت پر مرنے کے مترادف ہوگا' جو شخص کسی ایسے جھنڈے کے نیچے (یعنی کسی ایسے مقصد کے لئے) لڑا (جس کا حق و باطل ہونا ظاہر نہ ہو) اس حال میں کہ وہ تعصب سے غضبناک ہوا اور اس نے تعصب کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہو یا تعصب کی وجہ سے کسی کی مدد کرتا ہے (یعنی اس کا لڑنا' غضبناک ہونا لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلانا' یا کسی کی مدد کرنا اعلاء کلمۃ الحق اور دین کے اظہار کے لئے نہیں تھا بلکہ محض تعصب یعنی اپنی قوم کے ظلم کی حمایت اور ناروا جانبداری کی بنیاد پر تھا) اور اسی حالت میں وہ مارا گیا تو اس کا مرنا جاہلیت پر مرنے کے مترادف ہوگا اور جس شخص نے میری امت کے خلاف تلوار اٹھائی اور اس کے ذریعے میری امت کو اچھے اور برے آدمیوں کو قتل کیا اور میری امت کے مسلمانوں کی پرواہ نہ کی (یعنی اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ ایک مسلمان کو مارنا کتنا بڑا جرم ہے اور اس کا وبال و عذاب کتنا سخت ہے) اور نہ اس نے عہد والے کے عہد کو پورا کیا تو نہ وہ مجھ سے (یعنی میری امت میں سے نہیں یا میرے راستے پر چلنے والوں میں سے) نہیں ہے اور نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: من خرج الطاعت۔۔۔فقلت جاهلية:

''عمیۃ'' عین کے کسرہ وضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ ہے۔''القاموس'' میں ہے کہ ''عمیة'' ''غنیة'' کے وزن پر ہے۔ضمہ کے ساتھ اس کا معنی ''سخت دشمنی'' اور ''گمراہی'' ہے، اور عین کے ضمہ وکسرہ اور میم کی تشدید کے ساتھ اس کا معنی ''تکبر'' اور ''ضلالت'' ہے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ اس میں دو مشہور لغات ہیں: ① عین کے ضمہ اور تشدید میم ویاء کے ساتھ۔ ② عین کے کسرہ اور تشدید میم ویاء کے ساتھ۔ اس سے ''معمہ'' مراد ہے۔ یہ مطلب امام احمد بن حنبلؒ اور جمہورؒ کا بیان کردہ ہے۔ اور ''الغریبین'' میں اسحٰقؒ نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب ہے ''تحارج القوم وقتل بعضهم يعضا'' اس کی اصل ''تعمية'' ہے۔ جس کے معنی ''تلبیس'' ہیں۔

''يغضب لعصبيةٍ'': یہ جملہ حال ہے۔ عصبیۃ تعصب کی طرف منسوب ہو۔

ينصر عصبيةً'' ''عصبية'' تمیز ہے یا مفعول لہ ہے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بغیر بصیرت اور علم کے لڑائی کرتے ہیں صرف تعصب کی بناء پر جیسا کہ قتال جاہلیت تھا اور حق و باطل کا پتہ نہیں چلتا، اور یہ غصہ صرف عصبیت کی بناء پر ہوتا ہے دین کی نصرت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔

''عصبية'' اپنی قوم کی ظلم پر اعانت و مدد کو کہتے ہیں۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''راية عمية'' کنایہ ہے اس جماعت سے جو کہ امر مجہول پر مجتمع ہو اور یہ پہچان نہ ہوتی ہو کہ یہ حق ہے یا باطل ہے۔

"يغضب بعصبية" حال مؤکدہ ہے اگر یہ معاملہ فی نفسہ باطل ہو۔ تو حال منتقلۃ ہے جب کہ یہ فرض کیا جائے کہ یہ حق پر ہے۔ اگر لڑائی کرنے والے کی نیت تعصب ہو اظہار کلمۃ اللہ اور اظہار دین مقصود نہ ہو۔ تو اگرچہ اس صورت میں مغضوب لہ محق ہو تب بھی یہ شخص باطل پر ہوگا۔

"فقتله جاهلية": یہ مبتدا محذوف کی ضمیر ہے۔ ای "قتلته قتلة جاهلية" اور جملہ فاء سمیت "جواب شرط" ہے۔

قولہ: "ومن خرج على أمتى بسيفه ......":

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں: یہ بھی جائز ہے کہ "بسيفه" حال ہو۔ ای خرج مشاهرا بسيفه (یعنی تلوار کو لہراتے ہوئے نکلا۔)

"يضرب برها وفاجرها": یہ "حال متداخلہ" ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ "يضرب" کے متعلق ہو اور "جملہ حالیہ" ہو۔ اور "بر" کی وجہ سے تقدیم اس کے "اہتمام" اور حرص تکلیف کا اظہار ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ "اُمت" سے مراد "اُمت دعوت" ہے اور "برها وفاجرها" مؤمن، معاہد اور ذمی سب کو شامل ہے۔

"ولا يفى لذى عهد هده" یہ جملہ ماقبل کے لئے بمنزلہ تفصیل ہے۔ اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ "امت دعوت" مراد لینا بعید از مقصد" ہے۔

"ولست منه": اس میں تہدید و تشدید مقصود ہے۔ اور یہ سلب و نفی ایسی ہے جیسا کہ "ابن نوح" سے "اہلیت نوح" کی نفی کی گئی تھی۔ اس آیت میں: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ [هود۔ ٤٦] ترجمہ: "یہ شخص تمہارے گھر والوں میں نہیں یہ تباہ کار ہے کیونکہ اس نے اپنے باپ کی اتباع نہیں کی تھی۔

بہترین اور بدترین امیر کا بیان

٣٦٧٠: وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ، وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ، وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ، وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ، قَالَ: قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ؟ قَالَ لَا، مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلَاةَ، لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلَاةَ، اِلَّا مَنْ وُلِّيَ عَلَيْهِ وَالٍ فَرَآهُ يَاْتِيْ شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلْيَكْرَهْ مَا يَاْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٤٨٢، الحديث رقم: (٦٦ ـ ١٨٥٥) والدارمى فى ٢ / ٤١٧، الحديث رقم ٢٧٩٧، وأحمد فى المسند ٦ / ٢٤

ترجمہ: "اور حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہارے حاکموں میں سے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور تم ان

کے لئے اور وہ تمہارے لئے دعا کریں اور اس کی وجہ سے آپس میں ربط و تعلق اور محبت پیدا ہو) اور تمہارے حاکموں میں سے بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم بغض و عداوت رکھو اور وہ تم سے بغض و عداوت رکھیں اور تم ان پر اور وہ تم پر لعنت کریں۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم (صحابہؓ) نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! کیا اس صورت میں ہم ان کو معزول نہ کریں (یعنی کیا ان بدترین حاکموں کو معزول نہ کر دیں اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کر دیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کریں، نہیں! جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کریں! خبردار! جس پر کوئی حاکم مقرر کیا جائے اور وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والا عمل دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اس کے گناہ کو برا سمجھے۔ جو خدا کی نافرمانی (گناہ) پر مبنی ہو تو اس کو اس کے گناہ کے فعل کو برا سمجھنا چاہئے۔ لیکن اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے دست بردار نہ ہو''۔ (مسلم)

تشریح: أئمتكم: یہ دو ہمزوں کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ہمزہ ثانیہ ''کو'' یاء'' کے ساتھ بدل دیا جائے۔ ''امام'' کی جمع ہے یہاں پر اس سے مراد ''**ولاة الامور**'' ہیں اس لئے کہ پہلے وہی ''ائمہ'' ہوا کرتے تھے۔ لیکن پھر جب جاہل اور متکبروں کو ولایت مل گئی تو انہوں نے منصب امامت کو اپنے نائبین کے لئے چھوڑ دیا۔

قوله: خيار ألمتكم۔۔۔ يصلون عليكم:

''**الذين تحبونهم ويحبونكم**'' یعنی وہ امراء جو حکم میں عدل و انصاف سے کام لیں۔ جس کی وجہ سے تمہارے اور ان کے درمیان محبت مودت کا رشتہ قائم ہو۔

''**وتصلون عليهم، ويصلون عليكم**'' علامہ اشرفؒ کہتے ہیں: ''**صلوٰة**'' یہاں پر ''دعاء'' کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ کہ تم ان کیلئے اور وہ تمہارے لئے دعا کریں گے۔ یہ معنی مراد ہونے کی دلیل یہ اگلا جملہ ہے ''**تلعنونهم ويلعنونكم**''۔

اور شرح مسلم میں بھی اسی طرح ہے۔ مظہرؒ کہتے ہیں کہ جب تم مر جاؤ، تو وہ تمہارے لئے طوعاً و رغبتاً دعاء کریں۔ اور جب وہ مر جائیں تو تم ان کے لئے طوعاً و رغبتاً دعا کرو۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہی زیادہ راجح ہے کہ جیتے جی تم ان سے محبت کرو گے اور وہ تم سے محبت کریں گے۔ اور جب موت آجائے، تو تم میں سے بعض بعض پر رحم کریں گے۔ تم ان کا ذکر ''خیر'' کے ساتھ کرو گے، وہ تمہارا ذکر خیر کریں گے۔

''**وشرار ائمتكم الذين تبغضونهم**'' کہ تم ان کو بددعا دو گے اور وہ تم کو بددعا دیں گے۔ یا ان کے شر کی کثرت کی وجہ سے تم ان سے دوری اور بعد کو طلب کرو گے۔ اور وہ تم سے دوری چاہیں گے کیونکہ تم سے ان کو خیر کم ہی پہنچے گا۔

قوله: رسول الله افلا ننابذهم ......:

ما أقامو افيكم الصلوة: طیبی کہتے ہیں کہ اس جملہ سے نماز کی تعظیم کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس بات کا بھی کہ ترک صلوۃ ''**نزع اليد عن الطاعة**'' کا موجب ہے۔ جیسا کہ کفر (یعنی امام کا کفر اس کی طاعت سے نزع کا موجب ہے) جیسا کہ عبادہ بن الصامتؓ کی حدیث میں گزرا: ''**الا ان تروا كفرًا بواحًا**'' اور اسی لئے اس کو مکرر فرمایا: ''**لا ماأقاموا فيكم**

الصلوة'' اوراس میں اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔جیسا کہ بیہقیؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

''ألا'' یہ تنبیہ کیلئے ہے۔

ولی '': یہ ''التولیة'' سے مجہول کا صیغہ ہے۔''امیر بنانا''۔

من ولی عَلَیْهِ وَالٍ فَرَآهُ یَاتِیْ شَیْئًا مِنْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ فَلْیَكْرَهُ مَا یَاتِیْ مِنْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ :اس میں دراصل قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:﴿فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ [شعراء:۲۱٦] مطلب یہ کہ اگر زبان سے نکیر کی استطاعت نہ رکھتا ہوتو دل سے اس کو برا مانے۔لیکن اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔کہ وہ اس کے خلاف خروج کرے۔

ناپسندیدہ امیر کا بیان

۳٦۷۱:وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:یَكُوْنُ عَلَیْكُمْ اُمَرَاءُ تَعْرِفُوْنَ وَ تُنْكِرُوْنَ، فَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ، وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ، وَلٰكِنْ مَنْ رَضِیَ وَتَابَعَ، قَالُوْا :اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ:لَا مَا صَلَّوْا لَا مَاصَلَّوْا، اَیْ مَنْ كَرِهَ بِقَلْبِهٖ وَاَنْكَرَ بِقَلْبِهٖ . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱٤۸۱، الحدیث رقم : (٦۲ ـ ۱۸۵٤) وأبو داود فی السنن ۵ / ۱۱۹، الحدیث رقم : ٤۷٦۰، والترمذی فی ٤ / ٤۵۸، الحدیث رقم : ۲۲٦۵

ترجمہ:''اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (غیب کی خبر دیتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''ایسے لوگ بھی تم پر حاکم مقرر کئے جائیں گے جو اچھے برے دونوں قسم کے کام کریں گے لہٰذا جس شخص نے انکار کیا (یعنی جو شخص اپنے حاکم کے سامنے زبان سے یہ کہنے پر قادر ہو کہ یہ تمہارا یہ فعل برا ہے اور اس نے اس طرح کہہ بھی دیا) تو وہ (نفاق اور مداہنت سے پاک اور اپنی ذمہ داری سے) بری ہو گیا اور جس شخص نے مکروہ جانا (یعنی جو شخص حاکم کے منہ پر اس کے کسی برے فعل کو بیان کر دینے پر قادر نہ ہو لیکن اپنے دل سے اس کے اس فعل کو ناگوار سمجھے) تو وہ سالم رہا (یعنی اس فعل کی برائی و گناہ اور اس کے وبال میں شریک ہونے سے محفوظ رہا) لیکن جو شخص (حاکم کے برے افعال پر دل سے) خوش ہوا اور (خود بھی ان برے افعال میں مبتلا ہو کر گویا) حاکم کی اتباع کی (تو وہ گناہ اور اس کے وبال میں شریک ہوا)۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ (ایسی صورت میں جب کہ حکام برائیوں میں مبتلا ہو جائیں اور ان کی بے راہ روی کا اثر عوام پر بھی پڑنے لگے تو) کیا ہم ان کے خلاف قتال نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''نہیں! جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں، نہیں! جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں''۔یعنی جس شخص نے اپنے دِل سے برا سمجھا اور اپنے دل سے انکار کیا''۔(مسلم)

تشریح:قوله:یكون علیكم امراء ـــ من رضی وتابع:

ای تعرفرون بعض أفغالهم و تنكرون بعضها،تعرفون تنكرون''۔قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ یہ دونوں امراء

کی ''صفات'' ہیں۔ اور ضمیر راجع اس میں محذوف ہے۔ مطلب یہ کہ ان کے بعض افعال حسن ہوں گے اور بعض قبیح ہوں گے۔ ''فمن انکر فقد بریٔ'' یہاں پر خبر محذوف ہے۔ اور وہ ہے: ''من رضی'' دلالت حال اور سیاق کلام سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس کی ضد اور مقابل کی ضد کا حکم ہے **قوله: قالوا أخلائفا قلهم** ....:

صحابہ نے کہا کہ کیا ہم ان کے خلاف اس وقت قتال نہ کریں۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں ان کے ساتھ لڑائی نہ کرو۔ جب تک وہ نماز قائم کرتے ہیں اور تاکیداً دو مرتبہ فرمایا: ''الا ما صلّوا''۔

اور یہاں پر ان کے ساتھ قتال سے منع کر دیا گیا جب تک کہ وہ اقامت صلوٰۃ کریں چونکہ نماز اسلام کا عنوان ہے اور کفر وایمان کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہے۔

قتال سے ممانعت فرمانا درحقیقت زبان سے اختلاف امت اور فتنوں سے بچانے کیلئے ارشاد فرمایا۔

ای من کرہ بقلبه وانکر یقلبه: یہ جملہ تفسیر ہے ''فمن انکر'' کی اس میں اشکال ہے، تکرار کی ہے۔ لیکن اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جب ''انکار لسانی'' انکار قلبی سے متفرع ہوا تو اس کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوگئی۔

اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جس کسی نے زبان سے نکیر کی لیکن دل سے اس کو منکر نہ سمجھا تو وہ اس عصیان سے بری نہیں ہوا۔ تقدیری عبارت یوں ہوگی: ''من انکر انکارًا متلبسًا بقلبه'' اور مصابیح کے بعض نسخوں میں یوں ہے: ''من کرہ بقلبه وانکر بلسانه'' اور یہی ظاہر ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک معجزہ ہے کہ آپؐ نے مستقبل کے بارے میں خبر دی ہے اور وہ آپ علیہ السلام کی خبر کے مطابق واقع ہوئی ہے۔ اور حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ جو کوئی ''ازالۃ منکر'' سے عاجز آ گیا اور خاموش رہا تو وہ گنہگار نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ اس پر راضی نہ ہو۔ اور آپؐ کا یہ قول ''ومن کرہ فقد سَلِمَ'' یہ اس شخص کے بارے میں ہے کہ جو ہاتھ اور زبان سے انکار کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس کو دل سے برا ماننا چاہیے اور سلامت رہنا چاہیے۔ ''واللہ تعالیٰ اعلم''۔

توضیح وتخریج: جامع صغیر میں مسلم اور ابوداؤد کے حوالے سے یہ الفاظ منقول ہیں:

''سیکون امراء فتعرفون وتنکرون، فمن کرہ بریٔ ومن انکر سَلِم ولکن من رضی وتابع''

ابن ابی شیبہؒ اور طبرانیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

''ستکون امراء تعرفون و تنکرون فمن نابذھم نجا، ومن اعتزلھم سلم، ومن خالطھم ھلك''۔

طبرانیؒ نے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کیا ہے:

''ستکون علیکم امراء من بعدی ،یأمرونکم بما لاتعرفون ،ویعملون بما تنکرون، فلیس اولئك علیکم بائمةٍ'' یعنی وہ حقیقتاً ائمہ نہیں ہیں ابویعلیٰ اور طبرانی نے حضرت معاویہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

''ستکون ائمة من بعدی یقولون فلا یرد علیھم قولھم، یتقاحمون فی النار کما تقاحم القرۃ''۔

[الجامع الصغیر ۲ /۲۸۷ الحدیث رقم ٤٦٧١، ٤٦٧٥، ٤٦٨٦]

امیر و مامور کے حقوق کا بیان

۳۶۷۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدِیْ اَثَرَةً وَاُمُوْرًا تُنْكِرُوْنَهَا، قَالُوْا: فَمَا تَامُرُنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: اَدُّوْا اِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ، وَسَلُوْا اللّٰهَ حَقَّكُمْ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۳ / ۵، الحديث رقم: ۷۰۵۲، و مسلم فی ۳ / ۱۴۷۲، الحديث رقم: (۴۵ ۔ ۱۸۴۳) وأخرجه الترمذی فی السنن ۴ / ۴۷۰، الحديث رقم: ۲۱۹۰، وأحمد فی المسند ۱ / ۴۳۳

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ ''عنقریب تم میرے بعد ترجیح دینے کو اور بہت سی ایسی چیزوں کو دیکھو گے جس کو تم برا سمجھو گے۔'' صحابہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! پھر آپ ﷺ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں (کہ اس وقت ہمارا رویہ کیا ہو؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ان (حاکموں) کا حق ادا کرو اور اپنا حق اللہ تعالیٰ سے طلب کرو''۔

تشریح: **قوله: قال لنا رسول الله ﷺ......:**

''قال لنا'': لام اجلیہ ہے

اثرة تمام موجودہ نسخوں میں ''ہمزہ'' اور ''تاء'' مثلثہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''القاموس'' میں ہمزہ کے ضمہ اور تاء کے سکون کے ساتھ ہے اور دونوں کے فتحہ ساتھ بھی ہے۔ اور شرح مسلم میں ہے کہ ''ہمزہ'' اور ''تاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ ہمزہ کے ضمہ اور ''ثاء'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور ہمزہ کے کسرہ اور ''ثاء'' کے سکون کے ساتھ بھی ہے۔ یہ تین لغات ''المشارق'' میں منقول ہیں۔ اور اس کا مطلب ہے کسی کو دنیاوی امور میں خاص کرنا اور اس کو ترجیح دینا۔

''وأمورًا تنكرونها'': بعض روایات میں بغیر واو عاطفہ کے بھی منقول ہے۔ اس صورت میں ''امورًا'' ''اثرة'' کا بیان ہوگا۔

''وسلوا الله حقكم'': اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ وہ تم کو تمہارا وہ حق پہنچا دے گا جس میں انہوں نے اوروں کو تم پر ترجیح دی ہے۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے حق کے حصول کیلئے تم ان کے ساتھ قتال مت کرنا اور نہ برابر سرابر کا معاملہ کرنا۔ اس طور پر کہ جب وہ تم پر ترجیح دیں تو تم بھی اس کے بدلے میں ان پر ترجیح دو۔ بلکہ ان کو ان کے حقوق صحیح طریقے سے دینا کہ تم ان کی بات سننا ان کی اطاعت کرنا، دین کے حقوق میں ان کا خیال رکھنا۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگنا وہ تم کو پہنچا دے گا۔ تمہارے حقوق یعنی مال غنیمت اور مال فتح وغیرہ اور اپنے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا اللہ تعالیٰ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اور جامع صغیر میں یوں ہے: **''انكم ستلقون بعدی اثرة فاصبروا حتى تلقوني غدًا على الحوض''**

اس حدیث کو احمد، شیخین، ترمذی اور نسائی نے اُسد بن حضیر سے روایت کیا ہے اور احمد و شیخین نے انسؓ سے روایت کیا ہے۔

امیر و مامور کے حقوق تلفی کا بیان

۳۶۷۳: وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ سَأَلَ سَلَمَةُ بْنُ يَزِيْدِ الْجُعْفِيُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! اَرَأَيْتَ اِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا اُمَرَاءُ يَسْأَلُوْنَا حَقَّهُمْ وَيَمْنَعُوْنَا حَقَّنَا فَمَا تَامُرُنَا؟ قَالَ: اسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا، فَاِنَّمَا عَلَيْهِم مَاحُمِّلُوْا وَعَلَيْكُمْ مَاحُمِّلْتُمْ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحة ۳ / ۱٤٧٤، الحديث رقم: (٤٩ ـ ١٨٥٦) والترمذى فى السنن ٤ / ٤٢٣، الحديث رقم: ٢١٩٩

ترجمہ: ''اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور عرض کیا کہ ''یا نبی اللہ! مجھے اس بارے میں بتلائیں کہ اگر ہم پر ایسے امراء مقرر ہوں جو ہم سے تو اپنے حق (یعنی اطاعت وفرمانبرداری کا) مطالبہ کریں لیکن ہمیں ہمارا حق (یعنی عدل و انصاف اور مال غنیمت کا حصہ) نہ دیں؟ اس صورت میں آپ ﷺ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم ظاہر میں ان کی بات سنو اور باطن میں ان کی فرمانبرداری کرو (یعنی ان کی بات اور ان کے احکام کو سننا ظاہری اطاعت ہے اور ان کے احکام پر عمل کرنا باطنی فرمانبرداری ہے) یاد رکھو! ان پر وہ چیز فرض ہے جس کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے (یعنی رعایا کو عدل و انصاف دینا اور ان کے حقوق ادا کرنا اور تم پر وہ چیز فرض ہے جو تمہارے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے (یعنی اپنے حاکم وسردار کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا اور اگر ان حاکموں کی طرف سے تمہاری حق تلفی ہو یا اور کوئی مصیبت پیش آئے تو اس پر صبر کرنا)۔''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: یانبی الله أرأیت ان قامت ...... ویمنعونا حقنا:** ایک نسخہ میں ہے: ''**لو ضیعونا حقنا**'' اگر وہ ہمارے حقوق ضائع کریں۔ تو اس وقت آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ جزائے شرط پر تاً دیل اعلام ہے۔

''**سمعوا**'' یعنی ظاہراً ان کی بات سنو اور باطناً ان کی اطاعت کرو۔ یا مطلب یہ ہے کہ ان کے اقوال سنو اور ان کے افعال کی اطاعت کرو۔ یعنی عملاً ان کی اطاعت کرو۔

''**فانما علیهم ما حملوا وعلیکم ما حملتهم**'': گویا یہ حدیث اس آیت قرآنی سے اقتباس ہے: ﴿ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾[النور: ٥٤] ترجمہ: ''آپ کہیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو پھر اگر تم لوگ (اطاعت کے) روگردانی کرو گے تو سمجھ رکھو کہ رسولؐ کے ذمہ ہی (تبلیغ) ہے جس کا ان پر بار رکھا گیا ہے جس کا تم پر بار رکھا گیا ہے اور اگر تم نے ان کی اطعت کر لی تو راہ پر جالگو گے اور (بہر حال) رسولؐ کے ذمہ صاف صاف طور پر پہنچا دینا ہے''

حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر شخص پر وہی کچھ لازم ہے جس کا اس کو مکلف بنایا گیا ہے کوئی بھی اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر جار اور مجرور کو اختصاص کی غرض سے اس کے عامل پر مقدم کیا۔
امرا اور حکمرانوں پر وہی کچھ لازم ہے جن کا اللہ نے ان کو مکلّف بنایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عدل وانصاف کا مکلّف بنایا ہے۔ اگر وہ اس کی ادائیگی نہ کریں تو ان پر بوجھ اور وبال ہوگا۔ اور جہاں تک تم ہو تو تم پر وہ کچھ لازم ہے جس کا تم کو مکلّف بنایا گیا ہے یعنی سمع واطاعت اور اداء حقوق۔ پس جب تم ان فرائض کی ادائیگی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر اپنا فضل کرے گا اور تم کو اس پر ثواب دے گا۔

طاعتِ امیر سے خروج کا اُخروی نتیجہ

۳۶۷۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَهُ وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱٤۷۸، الحدیث رقم: (۵۸ ـ ۱۸۵۱) وأحمد فی المسند (۲ / ۱۵٤)

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص (امام یعنی اسلامی مملکت کے سربراہ کی اطاعت سے) ہاتھ کھینچ لے وہ قیامت کے دن بارگاہ رب العزت میں اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے پاس (ایمان کی) دلیل نہیں ہوگی اور جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کی گردن (امام کی) بیعت (یعنی امام برحق کی اطاعت) سے آزاد ہو (یعنی وہ امام برحق کا باغی ہو کر مرجائے) تو اس کی موت جاہلیت پر مرنے کے مترادف ہوگی''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: من خلع یدامن طاعة ......:
''طاعةٍ'': نکرہ ہے۔ چاہے قلیل طاعت ہو یا کثیر ہو۔
طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''وضع ید'' عہد اور انشاء بیعت سے کنایہ ہے۔ اس لئے کہ عام عادت یہی ہے کہ معاہدہ کے وقت ہاتھ کو ہاتھ پر رکھا جاتا ہے۔ یہاں پر ''خلع ید'' اور ''نزع ید'' نقض عہد سے کنایہ ہے۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ جس نے عہد کو توڑا اور اپنے نفس کو امام کی بیعت سے نکال دیا۔
''شرح العقائد'' میں سعد نے یہ حدیث نقل کی ہے: ''من مَاتَ ولم یعرف امام زمانه مات میتةً جاهلیةً'' جو کوئی اس حالت میں مرا کہ اس نے اپنے زمانہ کے امام کو نہیں پہچانا تو وہ جاہلیت کی موت مرا''۔

ایک سے زائد امیروں کی طاعت کا بیان

۳۶۷۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتْ بَنُوْا اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ، وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ، وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ، فَيَكْثُرُوْنَ، قَالُوْا: فَمَا

تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: فُوْا بَيْعَةَ الْاَوَّلِ، فَالْاَوَّلِ، اَعْطُوْهُمْ حَقَّهُمْ، فَإِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ.

(متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٦ / ٤٩٥، الحديث رقم: ٣٤٥٥، و مسلم في ٣ / ١٤٧١، الحديث رقم: (٤٤ - ١٨٤٢) وأحمد في المسند ٢ / ٢٩٧)

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بنی اسرائیل کی قیادت وراہنمائی اور تدبیر وانتظام کا فریضہ انبیاء سرانجام دیا کرتے تھے چنانچہ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو اس کا جانشین کوئی دوسرا نبی ہو جاتا (اس طرح یکے بعد دیگرے انبیاء اپنی قوم کی کا نظم قائم کیا کرتے تھے) لیکن میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ البتہ میرے بعد امراء وخلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے (جن کے ذمے) امت کی راہنمائی ونگہبانی ہوگی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ (''جب بیک وقت متعدد امراء ملک وامت کی سرداری کے دعویدار ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں گے تو) اس وقت کے لئے آپ ﷺ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم سب سے پہلے پھر اس کے بعد والے امیر کی بیعت پوری کرو (یعنی جب بھی بیک وقت مثلاً دو امیر اپنی سرداری کا دعویٰ کریں تو اس امیر کی بیعت وطاعت کرو جو پہلے مقرر ہوا ہو اور دوسرے کی مطلق پیروی نہ کرو) اور ان کے حقوق ادا کرو اور جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی مخلوق کی نگہداشت و حکومت کی ذمہ داری سونپی ہے اس کے بارے میں وہ خود ان سے باز پرس کرلے گا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: كانت نو اسرائيل۔۔۔خلفه نبي**: بنواسرائیل کے امور کی نگرانی اور قیادت انبیاء علیہم السلام کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ''حکمران'' اور ''ولاۃ'' اپنی رعایا کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ''سیاست'' نام ہے کہ کسی چیز پر ایسا قائم ہونا جو اس کی مصلحت کے مطابق ہے۔ (یعنی یہ تو جملہ) ''کان'' کی خبر ہے۔

كلما هلك نبي خلفه ۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ جملہ ''فاعل'' کی ضمیر سے حال ہے۔

قوله: وانه لانبي بعث......: ''انه'' یہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ ضمیر شان ہے۔ ''**لا نبي بعدي**'' اس جملہ کا عطف ''**كانت**'' پر ہے۔ اور معطوف ومعطوف علیہ کو علیحدہ اسلوب سے ذکر فرمایا، کیونکہ معطوف میں تاکید اور ثبوت کے معنی مراد ہیں۔

مسلم شریف میں ''**فیکثرون**'' کی جگہ پر ''**فتکثر**'' ہے۔

القاموس میں ہے کہ ''کثر'' بابِ ''کرم'' سے ہے۔ اور باب تفعیل، افعال اور مفاعلہ سے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کثرت میں ان پر غالب آگئے بعض نسخوں میں یاء کے فتحہ اور ثاء کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ بے اصل ہے۔

فماتا مرنا'' یہ شرط محذوف کا جواب ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی: ''**اذا كثر بعدك الخلفآء فوقع التشاجر والتنازع بينهم فما تأمرنا نفعل**؟ (یعنی جب آپ کے بعد خلفاء کی کثرت ہوگی اور ان کے درمیان اختلاف اور لڑائی واقع ہو جائے تو اس وقت آپ ہمیں کیا حکم کرتے ہیں، کہ ہم کیا کریں۔)

فوا: ''وفٰی: بفی'' سے امر ہے۔ای اوفوا۔ یہ منصوب بنزع الخافض ہے۔''أی ببیعة الأوّل'' جیسا کہ مسلمؒ کے بعض نسخ میں آیا ہے۔

''مصابیح'' کے بعض نسخوں میں ''قاف'' کے ساتھ ای ''قوا'' آیا ہے۔یہ ''وقٰی یقی'' سے امر ہوگا۔ مطلب یہ کہ تم حفاظت کرو اور بیعت اول کی رعایت رکھو۔

''فالأول'' علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ فاء تعقیب کیلئے ہے۔اور تکرار استمرار کیلئے ہے۔اس سے کوئی خاص زمانہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ حکم ہر زمانہ کیلئے ہے۔

''أعطوهم حقهم'' :یہ ''فوا بیعة الاوّل'' سے بمنزلہ بدل ہے۔

''فان الله سائلهم'' :أعطوهم حقهم کیلئے تعلیل وعلت ہے۔اس علت میں اختصار فرمایا ہے۔اصل عبارت اس طرح ہوگی: ''فأعطوهم حقهم وان لم یعطوکم حقکم فان الله سائلهم''۔

تمہارا ثواب تمہارے اس حق میں ہوگا تمہارا جو حق ان کے ذمہ لازم ہے۔جیسا کہ حدیث سابق میں گزرا:

''أدّوا الیهم حقهم وسلوا الله حقکم'': یعنی ان سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرو۔راعی والی ہے اور رعایا عوام ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ ''استرعیه الشئ فرعاه'' سے ہے۔اسی سے یہ مثل مشہور ہے: ''من استرعی الذئب فقد ظلم''۔

۳۶۷۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا بُوْیِعَ لِخَلِیْفَتَیْنِ فَاقْتُلُوْا الْاٰخِرَ مِنْهُمَا ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱٤۸۰، الحدیث رقم: (٦١ ۔ ۱۸۵۳)

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان دونوں میں سے دوسرا ہو اس کو قتل کر ڈالو''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: اذا بویع لخیفین ......: یہاں پر ''قتل'' اصل میں نقض عہد سے مجاز ہے۔اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر اس کو قتل کے بغیر دفع کرنا ممکن نہ ہو تو اس کا قتل جائز ہے۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں بعض کا قول ہے کہ یہاں قتل سے مراد ''مقاتلة'' ہے کیونکہ مقاتلہ انتہاءً یہ قتل تک لے جاتا ہے اور بقول بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی بیعت کو باطل کر دو اور اس کے حکم کی توہین کرو۔جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ''قتلت الشراب'' یہ اس وقت کہتے ہیں جب مشروب کے ساتھ کسی اور چیز وغیرہ کو ملا کر اس کی تیزی کو توڑ دے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ان دونوں توجیہات میں سے پہلی توجیہہ دوسری توجیہ سے مقتضی ہے۔کیونکہ حقیقت میں اس دوسرے خلیفہ نے پہلے خلیفہ کے حکم سے بغاوت کی ہے اور اس پر خروج کیا ہے تو اس ثانی کے ساتھ مقاتلہ اس وقت تک واجب ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔تو یہ بھی اس تاویل کے اعتبار پر جاری ہوگی کہ اس کو اس کے دفع، ابطال بیعت اور توہین امر پر ابھارے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ اہل بغی قتل کرنے والا ناقض العہد نہیں ہوگا اگر اس نے عہد کیا ہو۔اس لئے کہ انہوں (یعنی دونوں)

نے ان لوگوں کے ساتھ محاربت کی ہے جن کے ساتھ محاربت اور جنگ کو امام نے لازم کیا ہے۔

اور ائمہ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک ہی زمانہ میں دو شخصوں کیلئے عقد بیعت نہیں کیا جاسکتا چاہے دارالاسلام وسیع ہو یا نہ ہو۔ امام الحرمین نے اپنی کتاب ''الارشاد'' میں فرمایا ہے کہ ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ دو شخصوں کے لئے بیعت اور عقد کرنا جائز نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ایک ہی مملکت میں دو آدمیوں کیلئے عقد جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ان دونوں علاقوں کے درمیان بہت دوری (فاصلہ) ہو اور دونوں کے درمیان کئی منازل کا فاصلہ ہو تو پھر اس کے جواز کے احتمال کی گنجائش ہے اور یہ آدمی خارج از ''قواطع'' شمار ہوگا۔ اس کو علامہ مازریؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اسلاف اور اخلاف کے قول کے خلاف ہے اور بظاہر یہ حدیث مطلق ہے۔ (جو دور و نزدیک سب کو شامل ہے)

ملتِ اسلامیہ میں تفرقہ ڈالنے کا بیان

۳۶۷۷: وَعَنْ عَرْفَجَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ هَنَاتٌ وَهَنَاتٌ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يُفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ.

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٤٧٩، الحديث رقم: (٥٩ ـ ١٨٥٢) وأخرجطه ابو داود فى السنن ٥ / ١٢٠، الحديث رقم: ٤٧٦٢، وأحمد فى المسند ٤ / ٣٤١

ترجمہ: ''اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''عنقریب مختلف قسم کے فساد برپا ہوں گے' لہٰذا جو شخص اس امت کے اتحاد میں تفریق پیدا کرنا چاہے (درانحالیکہ امت آپس میں متحد و متفق ہو) تو اس شخص کو تلوار سے قتل کردو چاہے وہ کوئی بھی ہو''۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

عرفجہ بن اسعد۔ یہ عرفجہ بن اسعد ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے ''طرفہ'' ان سے روایت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ یہ اپنی ناک چاندی کی بنوالیں۔ پھر اس کے بعد سونے کی ناک بنوانے کا حکم دے دیا تھا۔ ''یوم کلاب'' میں ان کی ناک کٹ گئی تھی۔ ''کلاب'' کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

عرضِ مرتب:

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے ''طرفہ'' کا نام ذکر کیا ہے' اور نہ ان کے والد کا نام ذکر کیا ہے۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوب سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ''عبدالرحمان'' صحابی ہیں' اور وہ اس واقعہ کے وقت موجود تھے۔ چاندی کی ناک انہوں نے از خود بنوائی تھی' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا۔ البتہ سونے کی ناک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بنوائی تھی۔

قوله: انه" وهنات ": ''ھاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔اس سے مراد شر اور فسادات ہیں جو کہ یکے بعد دیگرے نازل ہوں جو سنت اور جماعت سے خارج ہونگے۔''**فتن متواليات** کا'' معنی یہ ہے کہ امارۃ اور حکمرانی حاصل کرنے کیلئے زمین میں طرح طرح کے فسادات ظاہر ہوں گے اور طرح طرح کے فتنے ہوں گے۔البتہ امام وہی ہوگا جس کیلئے بیعت سب سے پہلے واقع ہو جائے۔پس جو کوئی ارادہ رکھے اس امت کے کلمہ کو کاٹنے اور اس میں اختلاف پیدا کرنے کا حالانکہ یہ امت کسی ایک شخص پر مجتمع ہو تو اس کو تلوار سے مار دو۔مطلب یہ کہ وہ کٹنے اور جدائی کے زیادہ لائق ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو، میرے اقارب ہوں یا غیر اقارب ہوں۔لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ پہلا شخص امامت یعنی اہل اور لائق ہو۔

''**كائناً من كان**'': ایک نسخہ میں ''**كائناً ما كان**'' آیا ہے اور علامہ طیبیؒ کا اسی کے مطابق کہنا ہے کہ یہ حال ہے، اس میں معنی شرط پایا جا رہا ہے۔مطلب یہ کہ اس شخص کو جو امام کے خلاف خروج کرے' تلوار کے ذریعے دفع کر دو' اگرچہ ''اشرف'' اور ''اعلم'' ہو اور تم اس کو زیادہ حقدار اور اولیٰ سمجھتے ہو۔جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے:﴿ **وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا**﴾[الشمس-۷]

امام نسائی اور ابن حبانؒ نے ''**عرفجة**'' سے اس طرح روایت کیا ہے: **ستكون بعدی هنات وهنات، فمن رأيتموه فارق الجماعة أويريدأن يفرق أمرأ مة محمد كائنا من كان فاقتلوه، فان يد الله على الجماعة ، وان الشيطان مع من فارق الجماعة يركض۔**

اور حاکم نے خالد بن عرفجہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

ستكون أحداث وفتنه وفرقة واختلاف، فان استطعت ان تكون المقتول لا القاتل فافعل ''میرے بعد فتنے' فرقے اور اختلاف رونما ہوں گے۔اگر تم مقتول بننے کی استطاعت رکھو نہ کہ قاتل بننے کی تو ایسا کرلو۔

اور طبرانی نے ابوسلالہ سے اس طرح نقل کیا ہے:

''ستكون عليكم ائمة يملكون ارزاقكم يحدثونكم فيكذبونكم ويعملون فيسيؤن العمل لا يرضون منكم حتى تحسنوا قبيحهم وتصدقوا كذبهم فاعطوهم الحق ما رضوا به فإذا تجاوزوا فمن قتل على ذلك فهو شهيد''۔

ایک حدیث میں جس کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' یہ الفاظ آئے ہیں:

''سيليكم امراء يفسدون فی الارض وما يصلح الله بهم اكثر فمن عمل منهم بطاعة الله فلهم الأجر وعليكم الشكر ومن عمل منهم بمعصية الله فعليهم الوزر وعليكم الصبر''۔

۳٦٧٨:**وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ مَنْ اَتَاكُمْ وَاَمْرُكُمْ جَمِيْعٌ عَلٰى رَجُلٍ وَاحِدٍ يُرِيْدُ اَنْ يَشُقَّ عَصَاكُمْ اَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوْهُ** (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ٣ / ١٤٨١' الحديث رقم: (٦٠ ـ ١٨٥٢)

ترجمہ: ''اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ'' جو شخص (امام وقت کے خلاف بغاوت کر کے اور اپنی خلافت و امارت کا اعلان کر کے) تمہارے پاس آئے جبکہ تم سب کا معاملہ (پہلے سے) ایک شخص پر متفق اور ایک خلیفہ پر متحد ہو اور وہ شخص تمہاری لاٹھی کو چیرنے (یعنی تمہاری قوت کو بکھیرنے) یا تمہاری اجتماعی تنظیم میں تفرقہ پیدا کرنے کا ارادہ کرے تو تم اس کو قتل کردو''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: من أتاكم بأمر ....

''یرید ان یشق عصاکم'' ''النہایہ'' میں لکھا ہے کہ ''شق العصا'' اس وقت کو کہتے ہیں۔ جب کوئی جماعت کو چھوڑ دے۔

''اویفرق جماعتکم'' راوی کو شک ہے۔ یا یہ او ''تنویع'' کیلئے ہے۔ کیونکہ ''تفریق'' اور ''مفارقة'' میں معنوی فرق ہے۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان من وجهٍ ملازمت اور تلازم کی خاصیت ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''شق العصا'' تمثیل ہے۔ لوگوں کے امر واحد پر اجتماع اتفاق اس ''عصا'' کے مشابہ قرار دیا جو لکڑی چیری نہ گئی ہو، اور پھر اس معاملہ میں ہونے والے لوگوں کے افتراق کو ''شق عصا'' کے مشابہ قرار دیا، پھر ''شق عصا'' سے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا۔ اور اس کو ''تفریق'' کیلئے بطور مثل کے بیان کردیا۔ چنانچہ یہ '' أمركم جميع على رجلٍ اسی تاویل پر دلالت کر رہا ہے ''جمع کا اسناد ''امر'' کی طرف اسناد مجازی ہے۔ چونکہ یہ لوگوں کے اجتماع کا سبب ہے۔

۳۶۷۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ بَا يَعَ اِمَامًا فَاَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهٖ وَثَمَرَةَ قَلْبِهٖ فَلْيُطِعْهُ اِنِ اسْتَطَاعَ فَاِنْ جَاءَ اٰخَرُ يُنَازِعُهٗ فَاضْرِبُوْا عُنُقَ الْاٰخَرِ.

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٣ / ١٤٧٢، الحديث رقم: (٤٦ ـ ١٨٤٤) وأخرجه النسائي في السنن ٧ / ١٥٢) الحديث رقم: ٤١٩١، و ابن ماجه في ٢ / ١٣٠٦، الحديث رقم: ٣٩٥٦، وأحمد في المسند ٢ / ١٦١

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے امام سے بیعت کی بایں طور کہ اس کو اپنے ہاتھ کا صفقہ اور اپنے دل کا ثمرہ دیا (یعنی ظاہری طور پر اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کیا اور خلوصِ دل سے بھی اس کی حاکمیت و قیادت کو قبول کیا) تو اس کو چاہئے کہ وہ (حتیٰ المقدور) اس امام کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اور پھر اگر کوئی دوسرا شخص اپنی امامت کا اعلان کردے اور اپنے امام کے خلاف بغاوت کرے تو اس دوسرے امام کی گردن اُڑا دو''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: من ربع اماما۔۔۔ تلیطعه ان استطاع:

جس نے امام کے ساتھ بیعت کی اور امام نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، یا بیعت کرنے والے نے امام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ النہایہ میں ہے کہ صفقہ ''تصفیق بالید'' کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بیعت کرنے والے اپنا ہاتھ بیعت اور ملاقات کے وقت ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ جیسا کہ بیع وشراء کرنے والے کرتے ہیں۔

''وثمرة قلبه'': اس سے مراد اخلاص یا عہد خالص مراد ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''صفقة الید'' مال سے کنایہ ہے اور ''ثمرة القلب'' اولاد کے بیعت سے کنایہ ہے۔

قوله: فان جاء آخر۔۔۔۔فاضربوا عنق الآخر:

یہ خطاب عام ہے۔ جو کہ مبایع اور غیر مبایع سب کو شامل ہے۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''فاضربوا'' بصیغہ جمع ذکر فرمایا حالانکہ اس سے پہلے ''فلیطعه'' میں مفرد ذکر فرمایا، پہلی جگہ لفظ ''من'' کا اعتبار کیا اور دوسری جگہ پر ''مَنْ'' کے معنی اعتبار کیا ہے۔

''عنق الآخر'' یہاں ''عنقه'' کی جگہ پر ''عنق الآخر'' ارشاد فرمایا یہ بات بتلانے کیلئے کہ دوسرے کی گردن ''ضرب'' کے لائق ہے، مرادی معنی کو ثابت اور مقرر کرنے کیلئے یہ تعبیر اختیار فرمائی آخر بظاہر خاء کے فتح کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں ''خاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور از روئے معنی یہ زیادہ واضح ہے۔

امارت طلبی کا بیان

۳۶۸۰: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَسْأَلِ الْاِمَارَةَ، فَاِنَّكَ اِنْ اُعْطِیْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُكِلْتَ اِلَیْهَا، وَاِنْ اُعْطِیْتَهَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَیْهَا.

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳ / ۱۲۳، الحدیث رقم: ۷۱۴٦، و مسلم فی ۲ / ۱٤٥٦، الحدیث رقم: (۱۳ ـ ۱٦٥۲) وأبو داود فی السنن ۳ / ۳٤۳، الحدیث رقم: ۲۹۲۹، والترمذی فی ٤ / ۹۰، الحدیث رقم: ۱٥۲۹، والنسائی فی ۸ / ۲۲٥، الحدیث رقم: ٥۳۸٤، والدارمی فی ۲ / ۲٤٤، الحدیث رقم: ۲۳٤٦، وأحمد فی المسند ٥ / ٦۲

ترجمه: ''اور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم حکومت و سیادت کو طلب نہ کرنا کیونکہ اگر تمہاری خواہش اور طلب پر تم کو حکومت و سیادت دی گئی تو تمہیں اسی کے سپرد کر دیا جائے گا (تا کہ تم اس منصب کی ذمہ داریوں کو انجام دو درآنحالیکہ منصب و امارت کی ذمہ داریاں اتنی دشوار اور مشقت طلب ہیں کہ بغیر مدد الٰہی کے کوئی شخص ان کو انجام نہیں دے سکتا) اور اگر تمہاری خواہش و طلب کے بغیر تمہیں حکومت و سیادت ملے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری اعانت کی جائے گی (یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے تمہیں یہ توفیق بخشی جائے گی کہ تم عدل و انصاف اور نظم و ضبط کے ساتھ اس کی ذمہ داریوں کو انجام دے سکو''۔

(مسلم)

تشریح: قوله: لاتسأله الامامرة......:

''الامارة'' ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تم حکومت اور ولایت کا مطالبہ مت کرو نہ خالق سے مانگو اور نہ مخلوق سے مانگو اسلئے کہ اگر تمہارے مطالبہ کی بناء پر تم کو امارت دے دی گئی تو تم کو اس کے حوالے کر دیا جائے گا، اور تم اکیلے رہ جاؤ گے' تمہارے ساتھ اعانت والا کوئی نہ ہوگا، اس لئے کہ تم اس کے طلب میں اکیلے تھے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم امارت کے حوالہ کر دیئے جاؤ گے' اور بلا شک وشبہ یہ ایک مشکل اور مشقت والا معاملہ ہے' اس کو کوئی بھی شخص اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر قائم نہیں کر سکتا مگر اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو دنیاوی اور اخروی دونوں نقصانوں میں ڈال دے گا۔ جب یہ ایسا کام ہے تو اس کو کوئی بھی ہوشیار اور عقلمند آدمی نہیں مانگ سکتا۔

امارت اور آخرت کی ندامت

۳۶۸۱ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ' عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :اِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَی الْاِمَارَةِ' وَسَتَكُوْنُ نَدَامَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ' فَنِعْمَ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ . (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳ / ۱۲۵' الحدیث رقم : ۷۱۴۸' والنسائی فی ۸ / ۲۲۵' الحدیث رقم : ۵۳۸۵' وأحمد فی المسند ۲ / ۴۴۸

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:'' (میں دیکھ رہا ہوں کہ) عنقریب تم آئندہ زمانہ میں حکومت و سیادت کے ملنے کی حرص میں مبتلا ہو گے حالانکہ وہ (حکومت و سیادت جو حرص وطلب کے ساتھ ملے) قیامت کے دن باعث ندامت ہوگی (یاد رکھو) حکومت و سیادت دودھ پلانے والی بھی ہے اور دودھ چھڑانے والی بھی ہے''۔ (یعنی اس کا ملنا اچھا ہے اور اس کا سلب ہو جانا برا ہے)۔

(بخاری)

تشریح:**قوله :انكم ستحرصون ـــ يوم القيامة:**

عنقریب تم ''امارت'' پر حرص اور لالچ کرو گے۔ حالانکہ حرص والی امارت بروز قیامت ندامت (شرمندگی) اور پشیمانی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت کے دن حساب کے وقت تم جواب سے عاجز آ جاؤ گے۔ اور حقوق و مطالبہ کے مقابلہ میں تم کو عذاب اور رسوائی ملے گی۔

قوله :فنعم المرضعة ......:

''**فنعم المرضعة**'' اور مصابیح کے بعض نسخوں میں ''**فنعمت المرضعة**'' ہے۔

المخصوص بالمدح والذم ان دونوں جملوں میں محذوف ہیں اور وہ (محذوف) ''امارة'' ہے۔ مظہرؒ کہتے ہیں کہ لفظ ''نعم'' اور ''بئس'' کا فاعل جب مؤنث ہو تو ''الحاق تانیث'' اور ''ترک تانیث'' دونوں جائز ہے۔ اس لئے یہاں پر ''نعم'' میں ترک تانیث کیا ہے اور ''نعمت'' میں تانیث الحاق ہے۔ یعنی دونوں لغات پر عمل کیا ہے۔ اور دوسرا مقصد عبارت میں ''تفنن'' پیدا کرنا ہے۔ (فعل اول کے ساتھ الحاق تانیث نہیں کیا، اور دوسرے کے ساتھ کیا ہے) اس کے برعکس نہیں کیا ہے

اس لئے کہ ''فعل ثانی'' کے ساتھ تانیث اولیٰ کیا ہے۔ چونکہ ''مرضعة'' کو ''امارة'' کیلئے مستعار لیا گیا ہے اگرچہ وہ مؤنث ہے لیکن اس کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ اور اس کا الحاق ''بئس'' کے ساتھ کیا ہے اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ امارۃ ایک دہشت ناک چیز ہے۔

اور اس میں اشارہ ہے کہ امارت میں خلیفہ اور امیر کو جو مصائب اور مشکلات ملتی ہیں وہ ان نعمتوں اور سرور وخوشی سے زیادہ شدید اور ابلغ ہوتی ہیں جو اس کو اس امارت میں ملتی ہیں۔

''المرضع'' اور ''الفاطم'' میں تاء تانیث کو ذکر کیا حالت ارضاع اور فطام کے تجدید بیان کرنے کیلئے۔ ''المرضع'' اور ''الفاطم'' ان صفات میں سے ہیں جو عورتوں کیلئے مخصوص ہیں۔ لہٰذا مذکر ومؤنث کے درمیان فرق کیلئے تاء تانیث کی ضرورت نہیں رہتی۔ چنانچہ ''طالق'' اور ''حائض'' کہا جاتا ہے۔ ''فاطمه'' اور ''مرضعه'' کے ساتھ تائے تانیث ذکر فرمانا ان دونوں افعال کی صورت کی یاد تازہ کرنے کیلئے ہے۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ ''ولایة'' کو ''مرضعة'' اور اس کے انقطاع کو موت سے اور عزل کو ''فاطمة'' کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ گویا یوں فرمایا: ''نعمت المرضعة الولاية'' ولایت کا اچھا ہونا بایں طور ہے کہ اس پر منافع اور دنیاوی لذتیں ملتی ہیں۔ اور ''بئست الفاطمة'' اس اعتبار سے ہے کہ منافع اور لذات کو منقطع کر دیتی ہے، اس کی وجہ سے حسرت وندامت ہوگی۔ لہٰذا کسی عاقل کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ ایسی لذتوں میں مشغول ہو جائے جس کے بعد حسرتیں اور پشیمانیاں ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ ''امارة'' کو ارضاع کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ اس کے اوائل میں حلاوت اور مٹھاس ہوا کرتی ہے۔ جبکہ آخر میں کڑواہٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ''مرضعة'' ارضاع کے ساتھ بچہ کو اچھی لگتی ہے۔ اور ''فطام'' کے ساتھ بری لگتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں ایک لطیف سا اشارہ ہے اس طرف ہے کہ ''حلاوة امارة'' اور ''مرارة الولاية'' کو ''مضارع'' اور ''فطام'' کے ساتھ تشبیہ دینا اطفال طریقہ کی نسبت سے ہے نہ کہ ان رجال کی طرف نسبت سے جو اس مرتبہ کے حقیقت کو پہنچ چکے ہوں۔ اور اسی لئے بعض نے کہا ہے:

أضغاث احلام وظل زائل

ان اللبيب بمثلها لا يخدع۔

ہر امیر خطرہ میں ہے

۳۶۸۲: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اَلَا تَسْتَعْمِلُنِیْ؟ قَالَ: فَضَرَبَ بِیَدِہٖ عَلٰی مَنْکِبِیْ، ثُمَّ قَالَ: یَا اَبَاذَرٍّ! اِنَّکَ ضَعِیْفٌ، وَاِنَّھَا اَمَانَۃٌ وَاِنَّھَایَوْمَ الْقِیَامَۃِ خِزْیٌ وَّنَدَامَۃٌ اِلَّامَنْ اَخَذَھَا بِحَقِّھَا وَاَدَّی الَّذِیْ عَلَیْہِ فِیْھَا (وَفِیْ رِوَایَۃٍ) **قَالَ لَہٗ: یَا اَبَاذَرٍّ! اِنِّیْ اَرَاکَ ضَعِیْفًا، وَاِنِّیْ اُحِبُّ لَکَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَا تَاَمَّرَنَّ عَلٰی اثْنَیْنِ، وَلَا تَوَلَّیَنَّ مَالَ یَتِیْمٍ** (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۳ / ۱٤٥۷، الحديث رقم: (۱٦ ـ ۱۸۲٥) وأحمد في المسند ٥ / ۱۷۳)

ترجمہ: ''اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ مجھے (کسی جگہ کا) عامل (حاکم) کیوں نہیں بنا دیتے؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے (میری یہ بات سن کر) آپ ﷺ نے (از راہ لطف وشفقت) میرے کندھے پر اپنا ہاتھ مارا اور پھر فرمایا کہ ''اے ابوذر! تم کمزور وناتواں ہو اور یہ امارت وحکومت (خدا کی طرف سے) ایک امانت ہے جس کے ساتھ بندوں کے حقوق متعلق ہیں اور اس میں خیانت نہیں کرنی چاہئے) اور تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ امارت قیامت کے دن رسوائی و پشیمانی کا باعث ہوگی' سوائے اس شخص کے جس نے اس امارت کو حق کے ساتھ حاصل کیا اور اس حق کو ادا کیا جو اس امارت کے تئیں اس پر ہے) یعنی جو شخص مستحق ہونے کی وجہ سے امیر بنایا گیا اور پھر اس نے اپنے زمانہ حکومت میں عدل وانصاف کا نام روشن کیا اور رعایا کے ساتھ احسان وخیر خواہی کا برتاؤ کیا تو وہ امارت اس کے لئے رسوائی اور وبال کا باعث نہیں ہوگی اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ! میں تمہیں ناتواں دیکھتا ہوں (کہ امارت کا بار برداشت نہیں کرسکو گے) اور میں تمہارے لئے اس چیز کو پسند کرتا ہوں جو میں اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہوں' تم دو آدمیوں کا بھی امیر نہ بننا اور کسی یتیم کے مال کی کارپردازی ونگرانی قبول نہ کرنا''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: ألا تستعملني۔۔۔خزي وندامة:**

على منكبي: ایک نسخہ میں لفظ ''منکب'' بصیغہ تثنیہ آیا ہے۔

انها أمانة یعنی امانت کی طرح اس کی رعایت رکھی جائے گی کیونکہ یہ ایک ثقیل اور مشکل چیز ہے۔ جس سے سوائے شخص قوی کے کوئی عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ اور اس میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ [الاحزاب۔۷۲] طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہاں پر ضمیر تانیث لائی گئی ہے۔ جو ''ألا تستعملني'' کے ذیل میں موجود ''امارۃ'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یا خبر کو تانیث کے اعتبار سے مونث کی ضمیر لائی گئی ہے۔ تو دوسرے قول کے مطابق ضمیر کا مرجع العمل ہوگا جو کہ **تستعملني** سے مستفاد ہے اور پہلے قول کی تائید ''**وانها يوم القيامة** الخ'' سے ہوتی ہے۔

''**الا مَنْ اخذها**'' یہ استثناء منقطع ہے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ یہ امارت اس پر وبال ہو یا نہ ہو، اس کے لے مفید نہیں ہے۔ لہٰذا جب تک ''ضرورت'' کا تحقق نہ ہو اس کا ترک ہی اولیٰ ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ''**اجتناب ولاية**'' کے باب میں اصل عظیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ خصوصاً اس کیلئے جو عہدہ کی ذمہ داریاں بجالانے میں کمزور واقع ہوا ہو۔ اور اس شخص کیلئے رسوائی اور ندامت ہوگی جس میں اس کی اہلیت نہ ہو' یا وہ اہل ہو' لیکن اس نے اس میں عدل وانصاف سے کام نہ لیا ہو تو قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اِس زیادتی پر رسوا اور نادم کرے گا۔ اور جو شخص اس کا اہل ہو اور اس نے اس میں عدل سے کام بھی کیا ہو تو اس کیلئے اس میں عظیم فضیلت ہے۔ جس پر بہت سی احادیث صحیحہ دلالت کررہی ہیں۔ جیسا کہ یہ حدیث ہے:

''**سبعة يظلهم الله في ظله**'' اور یہ حدیث: ''**لمن المقسطين على منابر من نور**'' اس کے علاوہ بھی کئی احادیث

ہیں اوراس کے پر خطر ہونے کی وجہ سے آپ علیہ السلام نے اس سے ڈرایا ہے۔اسی وجہ سے بہت سارے سلف صالحین اس سے گریز کرتے رہے۔حتیٰ کہ اس عہدے کو قبول نہ کرنے پر طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا،مگر انہوں نے پامردی کے ساتھ صبر کا دامن تھامے رکھا،لیکن یہ منصب قبول نہیں کیا۔

''وفی روایةٍ'' حق یہ تھا کہ عبارت اس طرح لاتے ''وفی روایةٍ له''۔

''قال له'':اس میں التفات ہے یا نقل بالمعنی ہے۔

انی أراك ضعیفا: یہاں روایت ظن اور علم دونوں معنی میں ہوسکتا ہے۔کہ اگر میں تیری طرح اس میں کمزور اور ضعیف واقع ہوتا تو میں بھی اس بوجھ کو کبھی نہ اٹھاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے قوت دی ہے اس لئے مجھ پر یہ بوجھ ڈال دیا ہے۔اور اگر اللہ مجھ پر یہ بوجھ نہ ڈالتے تو میں اس کو نہ اٹھاتا۔اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے جو بعض صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ ''ولایت'' رسالت سے افضل ہے۔یعنی نبی کی ولایت اس کی رسالت سے افضل ہے۔کیونکہ رسالت کا تعلق ''خلق'' کے ساتھ ہے جبکہ ولایت کا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ ہے۔اور ''مولیٰ حق'' کی طرف متوجہ ہونا بلاشک وشبہ افضل واولیٰ ہے۔

''لا تأمرن'' یہاں پر ایک ''تاء'' محذوف اور میم مشدد ہے۔''اور مسلم'' کے ایک نسخہ میں ''فلا تأمرن'' ہے۔

یعنی اس امارت کو قبول مت کرنا اگر چہ دو آدمیوں پر ہو چہ جائیکہ اس سے زائد افراد پر اس لئے کہ ان کے درمیان عدل و مساوات قائم کرنا ایک مشکل کام ہے۔

''ولا تولین'' اور نہ ہی مالِ یتیم کی ولایت قبول کرنا۔''اور مسلم'' کے نسخے میں ''علی مال یتیم'' ہے یعنی اس پر والی نہ بنو۔اس لئے کہ اس میں خطرۂ عظیم ہے اور وبالِ جسیم ہے۔اور یہ مثال ایک شخص پر ولایت کی ہے (ایک سے زائد پر ولایت کا معاملہ خود سوچ لو)۔

طلبِ امارت پر تقرری کا بیان

۳۶۸۳:وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَ رَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ، فَقَالَ اَحَدُهُمَا، یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَاوَلَّاكَ اللّٰهُ وَقَالَ الْاٰخَرُ مِثْلَ ذٰلِكَ، فَقَالَ:اِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّی عَلٰی هٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَهٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْهِ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) قَالَ:لَا نَسْتَعْمِلُ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَرَادَهٗ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳ / ۱۲۵، الحدیث رقم: ۷۱۴۹، و مسلم ۳ / ۱۴۵۶، الحدیث رقم: (۱۴۔ ۱۷۳۳) و أبوداوٗد فی السنن ۴ / ۹، الحدیث رقم: ۳۵۷۹، و أحمد فی المسند ۴ / ۴۰۹

ترجمہ:''اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں اور میرے دو چچا زاد بھائی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جن امور کا حاکم بنایا ہے ہم کو ان میں سے کسی جگہ یا کسی کام کا حاکم ووالی مقرر فرمادیجئے''۔دوسرے نے بھی اسی طرح (کی خواہش)

کا اظہار کیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم! ہم ان امور میں کسی بھی ایسے شخص کو والی اور ذمہ دار نہیں بناتے جو اس کا مطالبہ کرے یا اس کی حرص رکھتا ہو' اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہم اپنے کام پر اس شخص کو عامل (کار پرداز) مقرر نہیں کرتے جو اس کا ارادہ (یعنی عامل ہونے کی خواہش) رکھے''۔

(مسلم)

تشریح:**قوله: دخلت على النبی ﷺ أنا ورجلان ......:**

''أنا'': یہ ضمیر فصل ہے۔ اس کو یہاں پر اس لئے لایا ہے تاکہ عطف صحیح ہو جائے۔

'امرنا'': یہ باب تفعیل سے ''امر'' کا صیغہ ہے۔

فرمایا کہ بے شک ہم اس کام پر اس شخص کو عامل نہیں بناتے جو اس کا مطالبہ کرے، کیونکہ اس کو مانگنا طلب جاہ و مال پر دلالت کرتا ہے' اس کا انجام بھی بہت برا ہوگا اور نہ ہی اس شخص کو جو اس پر حریص ہو یہ جملہ ماقبل کیلئے بمنزلہ تفسیر کے ہے۔

''حرص'' راء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔

امارت کی ناپسندیدگی کا بیان

۳۶۸۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجِدُوْنَ مِنْ خَيْرِ النَّاسِ اَشَدَّهُمْ كَرَاهِيَةً لِهٰذَا الْاَمْرِ حَتّٰی يَقَعَ فِيْهِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٦٠٤' الحديث رقم: ٣٥٨٨' و مسلم فی ٤ / ١٩٥٨' الحديث رقم: (١٩٩ - ٢٥٢٦) وأحمد فی المسند ٢ / ٤١٨

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں میں بہترین تم اس شخص کو پاؤ گے جو اس چیز (یعنی حکومت و سیادت) کو انتہائی ناپسند کرنے کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت ہو یہاں تک کہ وہ اس میں مبتلا ہو جائے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح:**قوله: يخدون من خير الناس ......:**

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''خیر الناس'' ''تجدون'' کا مفعول ثانی ہے، اور ''اَشدهم'' اس کا مفعول اوّل ہے اور جب مفعول ثانی کو مقدم کرتے ہیں تو ''اوّل'' میں ضمیر ثانی کی طرف راجع ہوتی ہے۔ جیسا کہ یہ قول ہے: ''**على التمرة مثلها زبدًا**'' اور بھی ہی جائز ہے کہ ''**خير الناس**'' مفعول اوّل ہو لیکن ان نحویوں کے مذہب پر جو کلام مثبت میں ''من'' کی زیادتی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ زیادہ واضح یہ ہے کہ ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی: ''**تجدون بعض خيار الناس اشدهم**''۔

طیبیؒ کہتے ہیں: اس میں دو احتمالات ہیں:

① یہ ''تجدون'' کیلئے ''غایت'' ہو۔ ای ''**تجدون من خير النّاس اشد كراهةً حتى يقع فيهٔ**' چنانچہ وہ اس وقت وہ سب بہترین نہیں ہوگا ② ''اشد'' کے لئے غایت ہو۔ اَی ''**انها غاية اشد ای يكرهه حتى يقع فيه**'' جس وقت

اللہ تعالیٰ اس کی اعانت کرے گا تو وہ امارت کو ناپسند نہیں کرے گا۔لیکن یہ قول زیادہ واضح ہے۔اھ۔بہر حال اتنی بات پکی ہے کہ امارت کے انجام کے اعتبار سے کوئی بھی خوش اور راضی نہیں ہوگا۔

ہر شخص جوابدہ ہے

۳۶۸۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ، وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ، فَالْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَھُوَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ وَھُوَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ، وَالْمَرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِہٖ وَھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ عَنْھُمْ، وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْہُ، اَلَا فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۳ / ۱۱۱، الحديث رقم: ۷۱۳۸، و مسلم في ۳ / ۱۴۵۹، الحديث رقم: (۲۰ ـ ۱۸۰۲) رواه أبو داود في السنن ۳ / ۳۴۲، الحديث رقم: ۲۹۲۸، والترمذي في ۴ / ۱۸۰، الحديث رقم: ۱۷۰۵، وأحمد في المسند ۲ / ۵

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سن لو تم میں سے ہر شخص اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور (قیامت کے دن) تم میں سے ہر شخص کو اپنی رعایا کے بارے میں جوابدہ ہونا پڑے گا' لہٰذا امام یعنی سربراہ مملکت وحکومت جو لوگوں کا نگہبان ہے اس کو اپنی رعایا کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی' مرد جو اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اس کو اپنے گھر والوں کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی عورت جو اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے' اس کو ان کے حقوق کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی اور غلام جو اپنے مالک کے مال کا نگہبان ہے اس کو اس کے مال کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی لہٰذا آگاہ رہو! تم میں سے ہر ایک شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص اپنی رعایا کے بارے میں جوابدہ ہوگا''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: ''ألا'': یہ تنبیہ کیلئے ہے۔

قوله: الأ کلم لاع رکله مسوول عن رعيته: ''النهاية'' میں ہے کہ ''رعية'' ہر اس کو کہتے ہیں کہ جو راعی کی حفاظت اور نظر میں ہو۔کہا جاتا ہے: ''رعی الأمير القوم رعاية'' کہ ''امیر اصلاح کے لئے کھڑا ہو گیا'' جن کا وہ والی بنایا گیا تھا۔اور ''ما يتولاه'' سے مراد اس کے رعایا ہیں۔اور لفظ ''رعية'' **فعليه** کے وزن پر ہے اور ''مفعول'' کے معنی میں ہے اور ''تاء'' غلبہ اسمیت کیلئے ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''عنهم'' کی ضمیر ''بيت زوجها وولده'' کی طرف راجع ہے۔یہاں پر عقلاء کو غیر عقلاً پر غلبہ دیا ہے۔

''شرح السنة'' میں ہے کہ ''راعی'' کا مطلب یہاں پر حافظ اور وہ امانت دار ہے۔جو ان چیزوں کے بارے میں امانت

داری سے کام کرے جن کے بارے میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو (حفظ امانت کا) حکم دیا ہے اوران کے بارے میں خیانت سے ڈرایا ہے کہ ان سے اس بارے میں پوچھا جائے گا۔ لہٰذا ''رعاية'' کا مطلب (شئی کی حفاظت کرنا) اوراس کی دیکھ بھال کرنا ہے تو یہ سارے اس نام میں برابر ہوں گے۔ (یعنی ان سب پر ''راعی'' کا لفظ صادق آتا ہے) لیکن ان کے معانی مختلف ہوں گے۔ ائمہ بایں طور نگہبان کریں کہ وہ ''امور رعیت'' کی ولایت کا خیال رکھیں۔ ''حدود'' اور ''احکام'' کولوگو میں قائم کریں اور مرداپنے بایں طور نگہبان کریں وہ ''نفقۃ'' اور ''حسن معاشرت'' میں اپنے اہل خانہ کا خیال رکھیں۔

''رعاية المرأة فی بیت زوجها'' کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں گھر کے امور میں حسن تدبیر کا خیال رکھیں' اپنے شوہروں کے مہمانوں کی خدمت کریں۔

اور ''رعاية خادِم'': اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس اس کے سردار اور آقا کا مال ہے اس کی حفاظت کرے اوراس کے کاموں کو پورا کرے۔

''فَكُلُّهُمْ'' علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''فاء'' شرط محذوف کے جواب میں ہے۔ اور تقدیری عبارت اس طرح ہوگی:

''واذا كان الأمر كذالك على ما فصلناه فكلم (اور جب معاملہ اسی طرح ہے کہ جس طرح ہم نے اس کی تفصیل بیان کی تو تم میں سے ہر شخص......)

''جامع صغیر'' کی روایت میں اس طرح ہے:

''كلكم راع وكلكم مسؤل عن رعية فالامام راعٍ وهو مسؤلٌ عن رعيته' والرجل راع فی اهله وهو مسؤل عن رعيته' والمرأة راعية فی بيت زوجها وهی مسؤلةٌ عن رعيتها، والخادم راع فی مال سيده وهو مسؤل عن رعيته 'والرجل راع فی مال ابيه وهو مسؤل عن رعيته، فكلكم راع وكلكم مسؤل عن رعيته''۔

ظالم وخائن امیر کی مذمت کا بیان

۳۶۸۶: وَعَنْ مَعْقَلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَا مِنْ وَالٍ يَّلِىْ رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌّ لَهُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۳ / ۱۲۷' الحديث رقم: ۷۱۵۱' و مسلم فی ۳ / ۱۴۶۰' الحديث رقم: (۲۲ - ۱۴۲) والدارمی فی السنن ۲ / ۴۱۷' الحديث رقم: ۲۷۹۶' وأحمد فی المسند ۵ / ۲۵

ترجمه: ''اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو بھی حکمران مسلمانوں پر حکومت و سیادت حاصل کر کے اپنی رعایا پر حکمرانی کرے اور پھر اس حالت میں مر جائے کہ وہ اپنی رعایا پر ظلم اوران کے حقوق میں خیانت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کردے گا''۔

(بخاری ومسلم)

تشریح: ''فیموت'' یہ ''رفع'' کے ساتھ ہے۔''یلی'' پر عطف ہے اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے نفی کا جواب ہونے کی بناء پر۔طیبیؒ کہتے ہیں: ''فیموت'' کی فاء اور اگلی حدیث میں آنے والے جملہ ''فلم یحطها'' کی فاء اس ارشاد باری تعالیٰ میں موجود ''فاء'' کی طرح ہے: **فالتقطه آل فرعون لیکون لهم عدوا و حزناً۔**

وهو غاش: شین معجمہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔اور مطلب اس کا ''خائن'' ہے۔یا اس سے مراد وہ ظالم ہے جو لوگوں کے حقوق نہ دیتا ہو، اور ان سے ناحق مال لیتا ہو۔

''**الاّ حرم الله علیه الجنة**'' (اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں)

① اس حرمت سے مراد یہ ہے کہ وہ نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہو پائے گا۔

② یہ مستحل پر محمول ہے۔

③ یہ بطور زجر شدید اور وعید شدید کے ہے۔

④ اس سے مراد سوءِ خاتمہ ہے۔نعوذ باللہ من ذلک۔

''**فیموت وهو غاشٍ**'' دلیل ہے کہ احوال موت طاری ہونے تک توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص رعایا کے بارے میں خیر خواہ نہ ہو اس پر توبہ پیش کی جائے۔

''**وهو غاشٍ**'' حال ہے۔فعل کیلئے ''قید'' ہے اور مقصود بالذکر ہے۔اس لئے کہ فعل حال میں حال کے معنیٰ ہی معتبر ہوتے ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو والی اور راعی اس لئے بنایا تا کہ وہ ان کیلئے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اس لیے نہیں کہ وہ ان کے ساتھ دھوکہ کریں۔اور اگر وہ اس حالت میں مر گیا، تو اس کی وجہ سے وہ جنت سے محروم کر دیا جائے گا۔

قاضی عیاض کہتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے امور حوالے کر دے' ان کے دینی اور دنیاوی امور و معاملات کی مصلحت کیلئے بطور والی نصب کرے۔جب وہ ان چیزوں میں خیانت کرنے لگ جائے جن پر اس کو امین بنایا گیا ہے اور اس کے حوالہ کردہ امور میں خیر خواہی سے کام نہ لے' اس طور پر کہ ان کے حقوق ضائع کرے یا امورِ دینیہ وغیرہ میں خلل پیدا کرے اس شخص نے ان کے ساتھ خیانت کی۔

جامع صغیر کی روایت اس طرح ہے:

''**ما من عبه یسترعیه الله دعیةً یموت یوم یموت وهو غاش لرعیة الاَّ حرم الله علیه الجنة**''۔

(۲/ ٤۹۳ ۔ الحدیث رقم ٦٥٤)

رعیت کی کوتاہی کی سزا جنت سے محرومی

۳٦۸۷: وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ اِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳ / ۱۲٦' الحدیث رقم : ۷۱۵۰' و مسلم فی ۳ / ۱٤٦۰' الحدیث رقم : (۲۱ ۔

١٤٢)

ترجمہ: ''اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''اللہ تعالیٰ جس شخص کو رعایا کا نگہبان بنائے (یعنی جس شخص کو رعیت کا حاکم ونگہبان بنائے) اور وہ ان کے ساتھ بھلائی وخیر خواہی نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله:''ما من عبد يسترعيه الله رعية......''**

''يسترعيه'': اس میں طلب ماخذ کی خصوصیت پائی جارہی ہے۔ **أي يطلبه أن يكون راعي جماعة۔**

فلم يحطها: ''النہایہ میں ہے کہ ''**حاطه يحوطه حوطًا وحياطة**'' کا معنی بنتا ہے اس کی حفاظت کرنا' اس کو بچانا اور اس سے شرور کو ہٹانا۔

لم يجد رائحة الجنة: جنت کی خوشبو نہیں پائے گا' اس کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① ایسا شخص قیامت کے روز جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔ حالانکہ اس کی خوشبو پانچ سو سال کے فاصلے سے سونگھی جاسکتی ہے۔

② فائزین سابقین کے ساتھ جنت میں داخلہ نہیں پائے گا۔

③ وہ مطلقاً اس کو نہیں پائے گا اگر اس کی موت کفر پر واقع ہوئی۔

④ اس نے ظلم کو حلال سمجھا (اس لیے وہ ایمان سے خارج ہوکر کفر تک پہنچ گیا)۔

⑤ یا یہ کہ وہ اس کا مستحق ہے کہ وہ اس کو نہ پائے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردے اور اس کے خصم کو راضی کردے۔

بدترین امیر کون ہے؟

۳۶۸۸: وَعَنْ عَائِذِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ٣ / ١٤٦١' الحديث رقم: (٢٣ ـ ١٨٣٠) وأحمد في المسند ٥ / ٦٤

ترجمہ: ''اور حضرت عائذ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ (سرداروں اور حاکموں میں سب سے) بدترین سردار ظالم شخص ہے (جو اپنی رعایا پر ظلم کرے)''۔

راویٔ حدیث:

عائذ بن عمرو۔ یہ ''عائذ بن عمرو مزنی'' ہیں۔ بیعت رضوان کرنے والوں میں سے ہیں۔ بصرہ میں رہے اور ان کی حدیث بصریوں میں پائی جاتی ہے ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ''عائذ'' عوذ مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔

تشریح: مرتب عرض کرتا ہے مرقات میں ''مزنی'' کے بجائے ''مدنی'' ہے۔ ''الاکمال'' کے محشی نے ''مزنی'' کو صحیح قرار دیا ہے۔

قوله:''ان شر الرعاء الحطمة''۔

الرعاء: ''راء'' کے کسرہ اور الف مدہ کے ساتھ ہے۔ ''داعٍ'' کی جمع ہے۔ جیسا کہ ''تجار'' ''تاجر'' کی جمع ہے۔ اسی طرح

''النہایہ'' میں ہے۔

الحطمة: ''حاءٗ'' کے ضمہ اور ''طاءٗ'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ''حاطم'' کی جمع ہے۔ اور ''حطم'' سے مأخوذ ہے اور یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو رعایا پر ظلم کرتا ہے' اور مصیبت و آزمائش میں ان پر رحم اور نرمی نہیں کرتا۔ بعض کا قول ہے کہ ''**حطمة**'' اس کھانے والے کو کہتے ہیں کہ جو حریص ہوتا ہے' اور جو کچھ نظر آتا ہے' اس کو کھا جاتا ہے۔ اور اس کو روک لیتا ہے۔ ''**حطمه**'' دہکتی ہوئی آگ کو بھی کہتے ہیں۔

کیونکہ یہ شخص بھی گھٹیا ہوتا ہے، اور فطرتاً ظالم ہوتا ہے' لوگوں کے مال کا سخت حریص ہوتا ہے۔ اھ یہ قاضی کے کلام کا خلاصہ ہے۔ ''الفائق'' میں ہے کہ ''**الحطمة**'' اس کو کہتے ہیں کہ جو بازار میں اونٹنی پر سختی کرتا ہے اس کی درآمدات اور برآمدات میں۔ یہ درحقیقت ''**والیٔ سئو**'' کی مثال ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''والی'' اور ''سلطان'' کیلئے لفظ ''**راعی**'' کو مستعار لیا ہے۔ تو اس کے ساتھ ملائمات استعارہ کو ذکر کیا اور وہ ہے صفت **حطمة**۔ پس ''**حطمة**'' ''سلطان و والی'' کے لئے استعارہ ترشیحیہ ہے۔

اور ''مسلم'' نے اپنی صحیح میں اس روایت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے:

''حدثنا شيبان بن فروخ حدثنا جرير بن حازم، حدثنا الحسن، عن عائذٍ بن عمرو، وكان من اصحاب رسول الله ﷺ دخل على عبيد الله بن زياد فقال: أي بني اني سمعت رسول الله ﷺ يقول: ''ان شرالدعاء الحطمة، فاياك ان تكون منهم'' فقال له: اجلس انما أنت من نخالة أصحاب محمد ﷺ فقال: أهل كانت لهم نخالة؟ انما كانت النخالة بعدهم، وفي غيرهم۔

امیر کے لئے حضور ﷺ کی دعا

۳۶۸۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ مَنْ وُلِّيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ، وَمَنْ وُلِّيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِمْ فَارْفُقْ بِهٖ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٣ / ١٤٥٨، الحديث رقم: (١٩ ـ ١٨٢٨) وأحمد في المسند ٦ / ٩٣)

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (بارگاہ قاضی الحاجات میں یہ عرض کی ''اے اللہ! جس شخص کو میری امت کے (دینی و دنیاوی) معاملات میں سے کسی کا ولی بنایا گیا اور پھر اس نے (اپنے اختیار ولایت و تصرف کے ذریعہ) ان پر (یعنی میری امت کے لوگوں پر) مشقت و سختی مسلط کر دی تو اس شخص پر تو بھی' مشقت و سختی مسلط کر دے اور جس شخص کو میری امت کے معاملات میں کسی چیز کا ولی و متصرف بنایا گیا اور اس نے میری امت کے لوگوں کے ساتھ نرمی و بھلائی کا سلوک کیا تو اس شخص کے ساتھ تو بھی نرمی و بھلائی کا معاملہ فرما''۔

(مسلم)

تشریح: **قوله: اللهم من ولى ......:**

''ولی:'' یہ ''واؤ'' کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔اور ایک نسخہ صحیحہ میں واؤ کے ضمہ اور لام مشددہ مکسورہ کے ساتھ ہے۔''ای من جعل والیاً''۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''منْ'' ''شیئا'' کا بیان ہے۔ پہلے وہ صفت تھا پھر اس کو مقدم کر دیا تو حال بن گیا ہے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ لوگوں پر مشقت کرنے والے شخص کے بارے میں اور ان پر نرمی کرنے کے سلسلہ میں بھی حددرجہ کی ترغیب ہے یہ مفہوم کئی احادیث میں وارد ہوا ہے۔علامہ طیبیؒ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اپنی امت کے تئیں انتہائی شفقت و رحمت کے اظہار پر مبنی ہے۔تو ہم زبان حال سے کہتے ہیں کہ اے اللہ! یہ وہ وقت کہ آپ اپنے محبوب کی امت پر رحم فرمائیں اور ان کو سخت مصیبت سے نجات دیں۔

عامل امیر کی فضیلت کا بیان

۳۶۹۰:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:اِنَّ الْمُقْسِطِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ عَنْ يَمِيْنِ الرَّحْمٰنِ وَ كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنُ الَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ فِيْ حُكْمِهِمْ وَاَهْلِيْهِمْ وَمَا وَلُوْا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٤٥٨، الحديث رقم: (١٨ ـ ١٨٢٨) والنسائي فى السنن ٨ / ٢٢١، الحديث رقم: ٥٣٧٩، وأحمد فى المسند ٢ / ١٦٠

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''بلاشک عادل حکمران' اللہ کے ہاں رحمٰن (یعنی اللہ) کے دائیں جانب نور کے منبروں پر جگہ پائیں گے اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں اور وہ لوگ اپنے احکامات میں' اپنے اہل وعیال اور رعایا کے معاملات میں انصاف کا پہلو اپناتے ہیں''۔(مسلم)

تشریح:قوله:ان لمقسطين عند الله۔۔۔ عن ليمن الرحمن:

''مقسطین'':''مقسط'' کی جمع ہے''مقسط''''عادل'' کو کہتے ہیں۔''قاسط'' کی ضد ہے۔اور''قاسط'' ظالم کو کہتے ہیں۔جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ [المائدة:٤٢]﴿ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ [الجن:١٥]

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ''قسط'' قاف کے کسرہ کے ساتھ''عدل'' کو کہتے ہیں اور اس کا اصل معنی''نصیب''اور'' حصہ''ہے۔

آپ کہتے ہیں:''قسط الرجل'' جب کوئی شخص کسی پر ظلم کرے یعنی اس کا حصہ مار جائے۔اور اس کا مصدر''قسوط'' آتا ہے اور''اَقسط''اس وقت کہتے ہیں جب وہ عدل وانصاف کرے یعنی جب کوئی شخص غیر کا حصہ کو ادا کرے اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ الف کو''سلب معنی'' کیلئے داخل کر دیا گیا ہو۔جیسا کہ بہت سے افعال میں ایسا ہی ہے لہٰذا''اقساط'' کا معنی

ہوگا:''ازالۃ القسوط''۔

''عند اللّٰہ'':اور''الجامع'' کی روایت میں''یوم القیامۃ'' کا اضافہ ہے۔

منا برمن نور:امام نوویؒ کہتے ہیں کہ''منابر'' منبر کی جمع ہے۔''منبر'' کو اس کے''ارتفاع'' اور بلندی کی وجہ سے منبر کہتے ہیں۔''علٰی منابر''یعنی وہ بہت بلند جگہوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔

''من نورٍ'':کے کئی مطلب ہوسکتے ہیں''

① یعنی وہ اس قدر منور ہوں گے گویا کہ وہ نور سے بنائے گئے ہیں۔

② یہ کہ وہ بذاتِ خود نور ہوں گے۔

③ یا اس کو بطور''مبالغہ''نور کہہ دیا ہے۔

④ قاضی عیاضؒ کہتے ہیں وہ ظاہری حدیث کے مطابق حقیقۃً منبروں پر ہوں گے۔ یہ''منازل رفیعہ'' سے کنایہ ہوگا۔

شیخ فرماتے ہیں کہ ان دونوں اقوال میں جمع اس طرح ممکن ہے کہ جو لوگ منبروں پر ہوں گے وہ لازماً اعلٰی اور بلند مرتبہ والے ہوں گے اور اس کی تائید اس قول سے بھی ہوتی ہے:''عن یمین الرحمٰن''۔

عن لیمن الرحمن:تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالٰی کے نزدیک باعث عزت، قرب محل اور علو منزلت والا ہے۔ کیونکہ جس کی قدر و منزلت لوگوں کے ہاں بڑھ کر ہو تو اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کو''بادشاہ'' دائیں طرف جگہ ملتی ہے۔''یمین'' کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ اللہ کا''یسار'' بھی ہے۔ چنانچہ جملہ اسی حقیقت پر ہے۔

قولہ: وکلتا یدیہ فمین :خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہاں شاہد صفت''یمین'' بیان ہوئی ہے جس کی اضافت اللہ کی طرف ہے۔ تو اس میں''شمال'' مراد نہیں ہے کیونکہ شمال کی دلالت نقص اور ضعف ہے اور''وکلتایدبہ یمین'' کی صفت توقیفی ہے، ہم اس کو اس کے اطلاق پر چھوڑتے ہیں، اس کی''کیفیت'' بیان نہیں کرتے اور ہم اتنی ہی بات پر اکتفاء کریں گے جتنی بات''کتاب اللہ'' اور احادیث صحیحہ میں بیان ہوئی ہے اور یہی اہلسنّت والجماعت کا مسلک مختار ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: جس کا حصول قوت اور جہد کے ساتھ ہو''عرب'' اس فعل کو اس کو''یمین'' کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اسی طرح''احسان'' اور''افضال'' کو بھی اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کی ضد کو''یسار'' کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ''یمین'' اصل میں''یمن'' سے ماخوذ ہے۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ'' وکلتا یدیہ یمین ''اس توہم کے دفع کیلئے آیا ہے کہ اللہ کیلئے بھی ایسا ہی یمین ثابت ہے جیسا کہ ہمارا ہے وہ''یمین''(داہنا ہاتھ) ہے جس کے مقابلے میں''یسار'' آتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالٰی کے قرب کی طرف سبقت لے گیا تو کامیابی کے مراتب پر فائز ہوگیا اور دوسرے لوگوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ وہ اس شخص کی مانند ہے جو شخص بادشاہ کے محل کے قریب ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ کیلئے تمام جہات اور جوانب برابر ہیں کہ جن کے ذریعے اس کے بندے اس کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔

قولہ:الذین بعد یون ......:

''الذین یعدلون'': اس کی ترکیبی حیثیت میں کئی احتمال ہیں:
① یہ ''مقسطین'' کی صفت ہے۔
② مقسطین'' سے بدل ہے۔
③ فعل محذوف ''أعنی'' کیلئے مفعول ہے۔
④ ''هم'' مقدر کی وجہ سے مرفوع ہے۔
⑤ یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ گویا یہ کہا گیا ہے: ''من هؤلاء السادة المقربون؟ فقيل هم الذين يعدلون'' ۔ (کہ قرب سے نوازے گئے یہ سردار کون ہیں؟ تو کہا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو عدل کیا کرتے تھے)۔

''الذین یعدلون فی حکمهم '' یعنی جو لوگ خلافت، قضاء اور امارت میں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور ان کے اہل وعیال کے حقوق پورا کرتے ہیں۔ جس کے وہ والی بن گئے ہیں یعنی ان پر ولایت کی وجہ سے جو حقوق واجب ہیں۔ مثلاً یتیم پر نظر رکھنا، وقف کرنا اور حسبہ وغیرہ۔

ولوا: ایک روایت ''واؤ'' کے ضمہ اور ''لام'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی جس جس چیز پر ان کو والی بنایا گیا ہے اور اس صورت میں اس کا معنی ہوگا کہ جس معاملے گئے وہ والی بن گئے اور اس میں خود ان کی ''ذات'' بھی داخل ہے۔

اشرفؒ کہتے ہیں کہ آدمی کا اپنے نفس کے ساتھ عدل یہ ہے کہ وہ'' غیر ما امر اللّٰہ تعالٰی به'' میں وقت ضائع نہ کرے بلکہ وہ اللہ کے اوامر میں امتثال کرے، اور اس کے نواہی سے ہمیشہ اجتناب برتے۔ جیسا کہ اولیاء کرام مقربین کی عادت ہے۔ یا اکثر مؤمنین صالحین کی عادت وخصلت ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُمت محمدیہ میں سے اپنے بندوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:
① ظالم۔
② مقتصد۔
③ سابق۔ مقتصد اس کو کہتے ہیں جو عدل سے کام لے اور اپنے نفس کے ساتھ ''حد ظلم'' تک تجاوز نہ کرے اور نہ وہ اس ''سابق'' کے درجہ کو پہنچ پائے جو عدل واحسان کو جامع ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور نسائیؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

ہر امیر کے دو رفیق

۳۶۹۱: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَبِيٍّ وَلَااسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيْفَةٍ اِلَّا كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ: بِطَانَةٌ تَامُرُهُ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ، وَبِطَانَةٌ تَامُرُهُ بِالشَّرِّ وَ تَحُضُّهُ عَلَيْهِ. وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳ / ۱۳۳، الحدیث رقم: ۷۱۹۸، والنسائی فی ۷ / ۱۵۸، الحدیث رقم:

۴۲۰۲، وأحمد فی المسند ۳ / ۳۹

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی نبی نہیں بھیجا اور ایسا کوئی خلیفہ مقرر نہیں کیا جس کے لئے دو خصوصی مشیر نہ ہوں، ایک خصوصی مشیر تو نیکی کا حکم کرتا ہے اور ترغیب دیتا ہے اور دوسرا خصوصی مشیر برائی کا حکم دیتا ہے اور برائی کی طرف رغبت دلاتا ہے اور معصوم (بے گناہ) وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے محفوظ رکھا''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: مابعث الله من نبي۔۔۔ وتحضه عليه:

وزیر کو ''بطن'' کے ساتھ مشابہت اس لئے دی ہے کیونکہ اس میں تلازم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مشیر بھی اس کی صحبت سے جدا نہیں ہوتے۔

حاصل یہ کہ کوئی بھی نبی ﷺ یا اس کا خلیفہ دو مختلف اشخاص یا دو مختلف جماعتوں سے خالی نہیں ہوتا جو اس کے ساتھ ''رأی'' میں اختلاف رکھتا ہو۔ جیسا کہ عام طور پر ''ملوک'' اور ''امراء'' کے جلساء میں ہوا کرتا ہے۔

اور معصوم درحقیقت وہی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ صاحب شر اور اس کے کلام کی مقبولیت سے محفوظ رکھے۔ اور اس کو اتباع خیر اور قضاء حسن کی توفیق سے نواز دے اور ان ''بطانتیں'' میں سے معصوم وہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ شر سے محفوظ کرے اور اس کو نیکی کی توفیق دے دیا اور ''النہایہ'' میں ہے کہ ''**بطانة الرجل**'' وہ شخص ہوتا ہے کہ جو اس آدمی کا راز دار ہو اور اس کے امور اور اموال میں بطور مشیر کے مداخلت کرنے والا ہو۔

''صاحب کشاف'' نے اس آیت کے تحت لکھا ہے ﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ [آل عمران:۱۱۸] : ''اپنے سوا کسی کو صاحب خصوصیت مت بناؤ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے'' کہ ''**بطانة الرجل**'' اس کا خاص اور چنا ہوا شخص ہوتا ہے جس پر بھروسہ کی وجہ سے وہ اپنے تمام حوائج اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور اس کو ''**بطانة الثوب**'' کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''**فلانٌ شعاري**''

طیبیؒ کہتے ہیں کہ حدیث میں ''بطانة'' کے یہ معنی بعض خلفاء کے بارے میں تو متصور ہو سکتے ہیں۔ لیکن انبیاء کے بارے میں اس کا تصور ان کی حالت کے منافی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اصل میں اللہ تعالیٰ نے آیت سابق میں اس سے عام مؤمنین کو منع کیا ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس میں ایک سے مراد ''فرشتہ'' ہے اور دوسرے سے مراد ''شیطان'' ہے۔ اس کی تائید آپ ﷺ کے اگلے جملہ (**والمعصو من عصمة الله**) سے بھی ہوتی ہے:

قوله: ''والمعصوم من عصمه الله''

یہ آپ علیہ السلام کے اس قول کی طرح ہے: ''**ما منكم من احد الا وقد وكل به قرينه من الجن وقرينه من الملائكة**'' **قالوا: واياك يا رسول الله؟ قال: ''واياى الاَّ أنَّ الله تعالىٰ أعانني عليه فأسلم فلا يأمرني الاَّ بخير**۔

''تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے دو مشیروں کے حوالے نہ کیا ہوا ایک جنات میں سے ہوتا ہے اور ایک

ملائکہ میں سے۔ صحابہ نے کہا کہ کیا آپ بھی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں مجھے بھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر میری اعانت کی تو میں اس سے محفوظ رہا۔ لہٰذا وہ مجھے صرف بھلائی ہی کا حکم دیتا ہے''۔

پہلے قول کی تائید ''ترمذی'' میں موجود ابوالہیثم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کی ضیافت کا تفصیلی قصہ بھی منقول ہے اس حدیث کے آخر میں ہے: **فقال صلی الله علیه وسلم: ان الله لم يبعث نبيا ولا خليفة الّا وله بطانتان بطانة تامره مالمعروف و تنهاه عن المنكر و بطانة لا تأ لوه خبالا و من يوق بطانة السوء فقدوقى**

[أخر جه الترمذی جی السنن ٤/ ٥٠٤ الحديث رقم ٢٣٦٩ باب ماجاء فی معيشة اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم]

آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ'' بے شک اللہ تعالیٰ نے کسی نبی اور خلیفہ کو نہیں بھیجا مگر اس کے دو وزیر اور مشیر ہوتے ہیں۔ ایک مشیر جو اس کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور اس کو منکر سے منع کرتا ہے اور ایک مشیر اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا، اور جو شخص برے مشیر سے بچ گیا تو وہ درحقیقت محفوظ رہا۔''

٣٦٩٢: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: كَانَ قَيْسُ بْنُ سَعْدٍ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْزِلَةِ صَاحِبِ الشُّرْطِ مِنَ الْاَمِيْرِ (رواه البخاری)

أحرجه البخاری فی صحيحه ١٣ / ١٨٩، الحديث رقم: ٧١٥٥، والترمذی فی السنن ٥ / ٦٤٧، الحديث رقم: ٣٨٥٠

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کا وہ مقام تھا جو امراء وسلاطین کے ہاں کوتوال کا ہوتا ہے''۔ (بخاری)

تشریح: **قوله: كان قيس بن بعد من النبی ......:**

'' **صاحب الشرط** '': یہ لفظ شین کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ''شرطی'' کی جمع ہے۔ شرطی وہ شخص ہوتا ہے جو امیر کے آگے آگے ہوتا ہے اُمور سیاسی کی وجہ سے شرطیوں پر مقرر حاکم۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ('' شرط'' کے لغوی معنی ہیں ''علامت'') ان کی ایک خاص علامت ہوتی ہے جس کے ذریعے سے اس کو پہچانا جا سکتا ہے۔

عرضِ مرتب:

عہد حاضر میں اردو میں اس کو سپاہی اور انگریزی میں ''پولیس مین'' کہا جاتا ہے۔ ''**صاحب الشرط**'' کا ترجمہ علامہ کیرانوی نے پولیس افسر اور کوتوال ذکر کیا ہے۔ اھ۔

عورت کی سربراہی کا بیان

٣٦٩٣: وَعَنْ اَبِىْ بَكْرَةَ قَالَ: لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَهْلَ فَارِسَ قَدْ مَلَّكُوْا

عَلَيْهِمْ بِنْتَ كِسْرٰى قَالَ: لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٨ / ١٢٦' الحدیث رقم: ٤٤٢٥' والترمذی فی السنن ٤ / ٤٥٧' الحدیث رقم: ٢٢٦٢' والنسائی فی ٨ / ٢٢٧' الحدیث رقم: ٥٣٨٨' وأحمد فی المسند ٥ / ٣٨

ترجمہ: ''اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ فارس والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنا لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیئے ہوں۔ (بخاری)

تشریح: قوله: لما بلغ رسول اللهﷺ ....:

کسری: ''کاف'' کے کسرہ کے ساتھ ہے جو ''خسرو'' سے معرب ہے۔ ''وسیع مملکت والا'' (القاموس) اور ''النهاية'' میں ہے کہ ''کسریٰ'' دراصل فارس کے بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا جیسا کہ ''قیصر'' روم کے بادشاہ کا لقب تھا۔ اور ''فرعون'' مصر کے بادشاہ کا لقب تھا۔ اور ''تبع'' یمن کے بادشاہ کا لقب تھا۔

''شرح السنة'' میں ہے کہ عورت نہ امام بن سکتی ہے اور نہ ہی قاضی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ ان دونوں افراد کو اپنے مفوضہ امور کی بجا آوری کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے جبکہ عورت یہ صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لئے بھی کہ عورت ناقص العقل ہے جبکہ ''قضاء'' کمال ولایت میں سے ہے۔ لہٰذا اس کیلئے رجال میں سے کامل شخص ہی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمد ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

ملتِ اسلامیہ سے منافقت کی مذمت کا بیان

۳۶۹۴: عَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَالْهِجْرَةِ، وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَاِنَّهٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ، اِلَّا اَنْ يُّرَاجِعَ، وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ مِنْ جُثّٰى جَهَنَّمَ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ۔ (رواہ احمد والترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥ / ١٣٦' الحدیث رقم: ٢٨٦٣' وأحمد فی المسند ٤ / ١٣٠

ترجمہ: ''حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں: ① مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ منسلک رہنے کا' تسلیم کرنے اور ان کی اطاعت کرنے کا' ہجرت کا اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے کا اور یاد رکھو کہ جو شخص ملت کی اجتماعی ہیئت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے (گویا) اسلام کی رسی کو اپنی گردن سے نکال دیا مگر یہ کہ وہ واپس آ جائے اور جس شخص نے جاہلیت کا نعرہ بلند کیا

وہ (گویا) دوزخیوں کی جماعت کا فرد ہے اگرچہ وہ روزے رکھے' نماز ادا کرے اور یہ اس بات کا گمان کرے کہ میں مسلمان ہوں''۔ (احمد' ترمذی)

تشریح: قوله: قال رسول الله أمركم بخمس ---في سبيل الله:

پہلی بات یہ ہے کہ جماعت المسلمین کے اجماع کا اتباع کرو۔ یعنی اعتقاد، اقوال اور اعمال جو دین کے متعلق ہوں۔ علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس جماعت سے مراد ''جماعت صحابہؓ'' اور صحابہؓ کے بعد تابعین اور تبع تابعین ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں تم کو ان کی سیرت اور ان کے طریقے پر چلنے کا حکم دیتا ہوں اور ان کے زمرے میں اپنے آپ کو شامل کرو۔

دوسری خصلت یہ ہے کہ امیر سے حق کلمۃ کو سنو اور اس کو قبول کرو چاہے وہ غنی ہو یا فقیر ہو۔ علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہاں ''سمع'' سے مراد اوامر اور نواہی کی طرف توجہ کرنا اور ان دونوں چیزوں کو سمجھ لینا۔

تیسری خصلت یہ کہ ''مشروعات'' میں امیر کی اطاعت کرو۔ علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''طاعة'' سے مراد امتثال اُوامر ہے۔ اور نواہی سے رکنا ہے۔

چوتھی خصلت ہجرت کا حکم کرتا ہوں یعنی فتح مکہ سے پہلے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا اور دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف اور دارالبدعۃ سے دارالسنۃ کی طرف اور معصیت سے توبہ کی طرف۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''المهاجر من هجر مانهى الله عنه''۔

پانچویں خصلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو۔ یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور دشمن کو تباہ و برباد کرنا اور نفس کے ساتھ اس طور پر کہ اس کے شہوات سے رکنا اور اس کی لذتوں سے رکنا۔ اس لئے کہ مفادات نفس شخص کے ساتھ زیادہ اقویٰ اور احضر ہیں معادات کفر سے۔ ایک روایت میں ہے: ''أعدى عدوّك'' تفسك التي بين جنبيك''۔

''فانّه'' اور ایک نسخہ میں ''أنه'' کا لفظ آیا ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''انّ'' کا اسم ضمیر شان ہے۔ اور اس کے بعد کا جملہ اس کی تفسیر ہے۔ اور وہ اس کیلئے بطور تعلیل اور علت'' کے ہے۔ یعنی لزوم جماعت کے حکم کیلئے بطور تعلیل اور علت کے ہے۔ اور اس میں ''واؤ'' اس آیت کے ''واؤ'' کی طرح ہے:

﴿وقالا الحمد لله﴾ [النحل: ١٠] جو اس قول کے بعد ہے: ﴿لقد آتينا داؤد: سليمان علمًا﴾ [النحل: ١٠]

ترجمہ: اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو (شریعت اور ملک داری کا) علم عطا فرمایا'' اور یہ اخبار عن لمین ہے اور ذہن سامع کو ایک ترتیب دے دیا ہے۔

قوله: ''من خرج من الجماعة قبد شهر......''

''قبد'': قاف کے کسرہ اور یاء'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ اُی ''قدره'' مقدر مراد ہے۔ اور اصل میں یہ ''القوذ'' سے ما خوذ ہے۔ جس کا معنی مماثلۃ اور قصاص ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ جس نے اس چیز کو چھوڑا جس پر پوری جماعت مسلمین ہے یعنی سنت کو ترک کیا اور بدعت کا اتباع کیا اور طاعت سے ہاتھ نکال لیا۔

اگر چہ یہ تمام اُمور معمولی مقدر میں بھی ہوں۔ یعنی ایک بال کے بقدر بھی ہو تو اس نے درحقیقت اسلام کے ذمہ اور عہد کو توڑ دیا۔ اور جماعت سے انحراف کرلیا اور موافقت اسلام سے نکل گیا۔

''الاَّ ان یراجع'' یہ باب مفاعلۃ کا صیغہ ہے اور مبالغہ کیلئے ہے۔

'ربقة'' را کے کسرہ اور باء کے سکون کے ساتھ ہے اور اصل میں ربقة: اس رسّی کی گرہ کو کہتے ہیں جو جانور کی گردن اور اس کے پاؤں میں اس کو باندھنے کیلئے ڈالی جاتی ہے اور یہاں پر ''اسلام'' کے لئے اس کو مستعار لیا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ چیز جس کے ذریعے مسلمان اپنے نفس کو حدود اسلام، احکامات، اُوامر ونواہی پر سختی سے کاربند بنالیتا ہے۔ جیسا کہ وہ جانور اس گرہ کی وجہ سے بھاگ نہیں سکتا اسی طرح یہ آدمی بھی اسلام کے حدود سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ اس نے درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عہد کو پھینک دیا اور اس ذمہ کو خاک میں ملا دیا جو ذمہ اور عہد بندوں کی گردنوں میں لازم ہوکیا گیا تھا۔ جیسا کہ ''ربقة'' لازم ہوتا ہے۔

''ربقه'' کا واحد ''ربق'' ہے اور اس رسّی کو کہتے ہیں جس میں سخت کاج لگا ہو جس کے ذریعے جانور کو سخت طریقے سے باندھا جاتا ہے۔ یعنی اونٹ کے بچے اور بھیڑ کے بچوں کو باندھا جاتا ہے۔ اور گرہوں کا واحد ''ربقة'' بھی ہے۔

''**ومن دعا بدعوی الجاهلية**'': علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس جملہ کا عطف اس جملہ میں ہے۔ جو کہ ''ضمیر شان'' کی تفسیر ہے یہ بات بتلانے کیلئے کہ جماعت کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اور معتبر مسلمین سے نہ نکلنا یہ مسلمان کی شان ہے اور مسلمانوں کی جماعت سے نکلنا جاہلیت والوں کا کام ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

''**من خلع يدًا من طاعة لقى الله يوم القيامة ولا حجة له۔ ومن مات وليس فى عنقه بيعة مات ميتةً جاهليةً**''۔ (ملاحظہ فرمایئے حدیث: ۳۶۷۴)

لہٰذا اس توجیہ کی بناء پر یہ تفسیر کرنی چاہئے کہ ''دعویٰ جاہلیت'' بسنہا علی الاطلاق مراد زمانہ جاہلیت کے طور اطوار علی الاطلاق مرقھا تیں۔ اس لئے کہ اسی کی طرف وہ دعوت دیتے تھے۔ یہ قاضیؒ کی توجیہات میں سے ایک توجیہ ہے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ ''دعویٰ'' کا اطلاق دعاء بمعنی نداء ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس نے اسلام میں 'نداء جاہلیت' کے ساتھ پکارا۔ زمانہء جاہلیت میں جب کسی شخص پر اس کا مدمقابل غالب آجاتا تو وہ اپنی قوم کو بلند آواز سے پکارتا'' اے میری قوم!'' تو وہ لوگ اس آدمی کی مدد ونصرت کیلئے جلدی پہنچ جاتے۔ چاہے وہ ظالم ہوتا، چاہے مظلوم ہوتا۔ ان کی یہ مدد جاہلیت وعصبیت کی بناء پر ہوتی تھی۔

اس توجیہ ثانی کا حاصل وہی ہے توجیہہ سابق کا ہے۔ اس کی تائید ''شرح السنة'' میں مذکور اسی روایت کے آخر کے یہ الفاظ ہیں: ''تم مسلمانوں کو ان کے ناموں کے ساتھ پکارو جو ان کو اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں۔ یعنی: **المسلمون والمؤمنون وعباد الله**''۔

جثا: جیم کے ضمہ اور الف مقصورہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی ''جماعت'' یہ ''جثوة'' کی جمع ہے۔ ''جثوة'' حرکات ثلاثہ کے ساتھ 'جمع کئے گئے پتھروں کے ڈھیر کو کہتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ''جثی'' تشدید یاء اور جیم کے ضمہ کے ساتھ آیا ہے۔ یہ

''جاث'' کی جمع ہے اور ''جُثا'' سے مشتق ہوگا۔ اور اس کا مطلب ہے گھٹنوں کے بل بیٹھے گا۔ ''جیم'' کا کسرہ بھی جائز ہے اور اس آیت کریمہ میں دونوں حرکات کے ساتھ پڑھا گیا ہے ﴿ونذر الظالمین فیھا جثیاً﴾ [مریم:۷۶] ترجمہ: ''اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں رہنے دیں گے''

اور ''الفائق'' میں ہے کہ اس کا واحد ''جثوۃ'' بضم الجیم ہے۔ بمعنی ''جماعت'' اور اصل میں مٹی وغیرہ کو جمع کر کے بنائے گئے ڈھیر کو کہتے ہیں پھر اس کو ''جماعت'' کیلئے مستعار لیا گیا۔

بادشاہ کی اہانت نہ کرو

۳۶۹۵: وَعَنْ زِيَادِ بْنِ كُسَيْبٍ الْعَدَوِيِّ قَالَ: كُنْتُ مَعَ اَبِي بَكْرَةَ تَحْتَ مِنْبَرِ ابْنِ عَامِرٍ وَهُوَ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَقَالَ اَبُوْ بِلَالٍ: اُنْظُرُوْا اِلٰى اَمِيْرِنَا يَلْبَسُ ثِيَابَ الْفُسَّاقِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرَةَ: اُسْكُتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ اَهَانَ سُلْطَانَ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ اَهَانَهُ اللّٰهُ

(رواه الترمذی وقال : هذا هديث حسن غريب)

أخرجه الترمذی فی صحيحه ٤ / ٤٣٥، وأحمد فی المسند ٥ / ٤٢

ترجمہ: ''اور حضرت زیاد بن کسیب عدوی (تابعی) کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ (صحابی) کے ساتھ حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ کے منبر کے نیچے بیٹھا تھا جب کہ وہ (ابن عامر) خطبہ دے رہے تھے اور انہوں نے باریک کپڑے پہن رکھے تھے (اسی موقع پر ایک تابعی) ابو بلالؒ نے کہا کہ ''ذرا تم ہمارے اس امیر کو دیکھو' اس نے فاسقوں جیسا لباس پہن رکھا ہے۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''خاموش! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جس شخص نے اللہ کے بادشاہ کی زمین پر اہانت کی تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی اہانت کرے۔ (ترمذی)

تشریح: اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

راویٔ حدیث:

زیاد بن کسیب۔ یہ زیاد کسیب کے بیٹے ہیں ''عدوی'' ہیں۔ یہ بصریوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تابعی ہیں ابوبکرہ سے روایت کرتے ہیں۔ ''کسیب'' تصغیر کے ساتھ ہیں۔ ''عدوی'' بنوعدی کی طرف منسوب ہے۔

قوله: کنت مع ابی بکرة تحت۔۔۔ثیاب الفساق:

''رقاق'': راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

''فقال ابو بلال'': مؤلف نے ''الاکمال'' میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا ہے۔ اور شاید اس سے مراد ''ابوبردۃ بن اَبی موسیٰ الاشعری'' ہیں۔ ان کے بیٹے ''بلال'' تھے جو بصرہ کے ''والی'' مقرر ہوئے تھے۔

''ثیاب الفساق'': اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ شاید یہ کپڑے حریر و دیباج کے تھے جو کہ پہننا حرام ہے۔ کیونکہ یہ دونوں کپڑے عام طور پر باریک ہوتے ہیں اور یہ اعتراض ممکن ہے کہ ایسی یہ نصیحت کی بناء پر ہو جو''فضیحت'' کو مشتمل ہے کہ جس پر ایک بڑا فتنہ متفرع ہوسکتا ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ کپڑے ریشم کے نہ ہوں لیکن چونکہ یہ کپڑے باریک تھے اور باریک کپڑے پہننا''متنعمین'' کی عادت ہے۔ گویا کہ انہوں نے اسکو فسق قرار دیا چونکہ بعض علماء کرام نے کہا ہے:''من رق ثوبه رق دينه'' (جس کا لباس باریک ہوگا اس کا دین کمزور ہوگا)

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس احتمال کا بظاہر یہ معنی بنتا ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا: ''من أهان...... ''یعنی آپ کا اس کو کپڑا پہننے کی وجہ سے کہ جس کپڑے سے اس نے اپنی عزت کو محفوظ کیا تھا نہیں ہے۔ اس لئے کہ معنی یہ ہیں کہ جس کو اللہ نے عزت دی اور اس کو''خلعت سلطنت'' پہنایا اور اس کو کسی نے رسوا کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو رسوا کرے گا۔ اور''في الأرض''''سلطان الله'' کے ساتھ متعلق ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿انّا جعلناك خليفةً في الأرض﴾[ص:٢٦] اور''سلطان اللہ'' میں اضافت تشریفی ہے۔ جیسا کہ''بیت اللہ'' اور''ناقة الله'' میں ہے۔

حکایت: جعفر صادق سے حکایت ہے کہ وہ سفیان ثوری کے پاس تھے۔ جعفرؒ پر خاکی رنگ کے ریشم کا جبہ تھا۔ سفیان ثوریؒ نے ان سے فرمایا کہ اے اللہ کے نبی کے بیٹے! یہ آپ کا لباس نہیں ہے۔ یہ سن کر انہوں نے اپنے جبہ کو کھولا۔ تو اس ریشم کے جبّہ کی نیچے سفید رنگ کے اون کا بنا ہوا کپڑا تھا اور بولے: اے ثوری! اس کو ہم نے اللہ تعالیٰ کیلئے پہنا ہے اور ریشم کو تمہارے لئے پہنا ہے۔ لہٰذا جو اللہ کیلئے پہنا تھا اس کو ہم نے چھپایا اور جو تمہارے لئے تھا اس کو ہم نے ظاہر کردیا۔ اس روایت کو صاحب''جامع الاصول'' نے اپنی کتاب''مناقب الاولیاء'' میں ذکر کیا ہے۔

حکایت: امام غزالی منہاج العابدین میں تحریر فرماتے ہیں کہ''فرقد سنجی'' حضرت حسنؒ کے پاس آئے۔ ان کے جسم پر ایک چادر تھی اور حضرت حسن نے''حلہ'' زیب تن کیا ہوا تھا پر وہ اس کو دیکھنے لگے' تو حضرت حسن نے ان سے فرمایا کہ تم میرے کپڑے کو غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میرے کپڑے اہل جنت کے ہیں اور تمہارے کپڑے اہل جہنم کے ہیں۔ مجھے یہ بات پہنچی کہ اکثر اہل نار چادروں والے ہوں گے۔ پھر حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ انہوں نے زہد اپنے کپڑوں میں اختیار کیا' اور دلوں میں تکبر کو چھپا رکھا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے نام کا حلف اٹھایا جاتا ہے' چادر پہننے والے میں تکبر ریشم پہننے والے سے زیادہ ہوتا ہے۔

امورِ معصیت میں طاعت کا بیان

۳۶۹۶: وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔

أخرجه البغوي في شرح السنة ١٠ / ٤٤' الحديث رقم: ٢٤٥٥

ترجمہ:''اور حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''مخلوق کے کسی ایسے حکم کی بھی اطاعت نہیں جس سے خالق (یعنی اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی ہوتی ہو''۔ (شرح السنۃ)

راویٔ حدیث:

الحارث بن الحارث۔ یہ حارث بن حارث ''اشعری'' ہیں۔ یہ علمائے شام میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان سے احادیث کو ابو سلام حبشی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله:''لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق'':

لمخلوق: یہ ''طاعة'' کے متعلق ہے۔ ''فی معصية الخالق:'' ''لا'' کی خبر ہے۔ یہ خبر نہی کے معنی میں ہے۔ یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی ایسا مناسب ہے۔

''خالق ومخلوق'' کی تخصیص حکم کی علّت بتانے کیلئے ہے۔ (طیبی)

''شرح السنة'' میں ہے کہ حاکموں کی طرف سے جاری ہونے والی سزاؤں کے احکامات کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں ایسے امور بجالانے کی گنجائش ہے جن امور میں حکام کو سزا دینے کا حق حاصل ہو اور محمد بن الحسنؒ کہتے ہیں کہ مامور کو اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اس کام کو کرے یہاں تک کہ یہ پتہ چل جائے کہ اس کا یہ حکم عدل پر مشتمل ہے اور اس کے سوا کوئی عادل شخص یہ گواہی دے کہ مأمور پر یہ واجب ہے۔

صاحب کشاف نے نقل کیا ہے کہ ابو حازم سے مروی ہے کہ سلمہ بن عبدالملک نے اس سے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں تم کو ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا ہے: ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾[النساء۔ ۵۹] تو انہوں نے فرمایا کہ جب تم نے حق کی مخالفت کی، تو کیا تم سے اس حکم کو پھیر نہیں دیا گیا؟

اس آیت ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾[النساء۔ ۵۹] کی وجہ سے

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''اطیعوا الرّسول'' کا عطف ''أطيعوا اللّٰه'' پر ہے۔ اور ''اطیعو'' فعل کو مکرر لایا تاکہ یہ اطاعت رسول کے استقلال پر دلالت کرے۔ اور ''اولی الأمر منكم'' کے ساتھ فعل (اطیعوا) ذکر نہیں کیا یہ دلالت ہے اس بات پر کہ ان کی اطاعت مستقل نہیں ہے۔ اور اس کی علت یہ بیان فرمادی: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ۵۹] گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ جب اولی الامر مستقل نہیں ہیں اور تم ان سے خلافِ حق باتوں کا مشاہدہ کرو۔ تو ان کو حق کی طرف لوٹا دو۔ اس بارے میں تم کو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت آڑے نہ آئے۔ اس سند کے ساتھ ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے اور احمد نے اور حاکم نے اپنی مستدرک میں عمران سے اور حاکم نے بن عمر الغفاری کے طریق سے ذکر کیا ہے۔

امام جزریؒ نے ''اسنی المناقب'' میں اپنی سند کے ساتھ حضرت علیؓ سے روایت نقل کیا ہے

فرماتے ہیں: کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلایا، اور فرمایا: کہ اے علی تیرے اندر عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اور مشابہت ہے۔ ان کے ساتھ یہود نے بغض رکھا یہاں تک کہ ان کی ماں پر بہتان لگایا اور نصاریٰ نے ان کے ساتھ اتنی زیادہ محبت کی کہ ان کو وہ مقام دیا جس کے وہ لائق نہیں تھے۔ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مان لیا) تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ~~فرمایا کہ~~ بے شک میری وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے جو میرے ساتھ زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور ان چیزوں کے ساتھ میری جھوٹی مدح اور تعریف کرتے

ہیں جو میرے اندر نہیں ہیں اور وہ زیادہ بغض رکھنے والا جس کو میری شان اس بات پر ابھارے گا کہ وہ مجھ پر بہتان لگائے اور سنو! میں کوئی نبی نہیں ہوں اور نہ ہی میری طرف وحی کی جاتی ہے۔لیکن میں تو کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل کرتا ہوں جتنی میری استطاعت ہو۔لہٰذا میں اللہ کی جس اطاعت کا تمہیں حکم دوں تو تم پر میری اطاعت لازم ہے۔ان خواہ تم امور پسند کو کرو یا ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ کی جس معصیت اور نافرمانی کا میں یا میرے علاوہ کوئی اور حکم دے دے تو اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں کسی کی اطاعت لازم نہیں ہے، اطاعت تو صرف نیک کاموں میں ہی ہوگی۔

یہ حدیث حسن ہے۔اس کو امام نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے' لیکن شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔اھ۔

[الحاكم فى المستدرك:٣/١٢٣]

اور جامع صغیر میں روایت اس طرح ہے: ''من أمركم من الولاة بمعصية فلا تطيعوه''

حکمران ولاۃ میں سے جو بھی تم کو معصیت کا حکم کرے' تو اس کی اطاعت مت کرو' اس حدیث کو امام احمدؒ' ابن ماجہ اور حاکم نے ابو سعیدؓ سے روایت کیا ہے۔

[الجامع الصغير ٢/٥١٩، الحديث رقم ٨٥٣٠]

امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یوں نقل کیا ہے ''ومن أمر بمعروف فليكن أمر بمعروفٍ''۔

''جو کوئی معروف کا حکم دے تو اس کا حکم معروف اور اچھے طریقے کے ساتھ ہونا چاہیے۔

[الجامع الصغير ٢/٥١٩ الحديث رقم ٨٥٣١ وأخرجه البيهقى فى الشعب الحديث رقم ٨٦٠٣]

امیر کا عدل و ظلم اور آخرت

٣٦٩٧:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:مَا مِنْ اَمِیْرِ عَشْرَةٍ اِلاَّ یُؤْتٰی بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَغْلُوْلاً حَتّٰی یَفُكَّ عَنْهُ الْعَدْلُ اَوْ یُوْبِقَهُ الْجَوْرُ (رواه الدارمى)

أخرجه الدارمى فى السنن ٢ / ٣١٣' الحديث رقم: ٢٥١٥

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دس آدمیوں کے حاکم کو بھی روزِ قیامت اس حال میں حاضر کیا جائے گا کہ اس کی گردن میں طوق ہوگا یہاں تک کہ اس کو اس طوق سے یا تو اس کا عدل نجات دلائے گا یا اس کا ظلم ہلاک کرے گا''۔(دارمی)

تشریح: قوله:مامن أمير عشرة ......:

''عشرة'' عین اور شین کے فتح کے ساتھ ہے۔اور سید کے نسخہ میں سکون شین کے ساتھ ہے' لیکن یہ غلط ہے۔

''مِن'' زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لئے ہے عموم کا فائدہ دے رہا ہے کہ چاہے وہ آمر ظالم یا عادل ہو۔

''الاَّ يؤتى به'' اور ایک دوسری روایت میں ''الاَّ وهو يؤتى به''۔ قیامت کے دن وہ اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کا

ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ باندھا ہوا ہوگا۔ جب کہ دنیا میں تو ہر طرح آزاد تھا۔

''حتی یفك عنه العدل'': اور ایک روایت میں ''حتی یفکه العدل ہے۔ یعنی اگر وہ عادل تھا تو اس کو اس کا عدل بچالے گا اور اگر ظالم تھا اس کو اس کا ظلم ہلاک کردے گا۔ پس ''أو'' تنویع کیلئے ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''أو یوبقه'' ''کا عطف ''یفك'' پر ہے۔ لہٰذا یہ جملہ غایت بنے گا ''یؤتی به یوم القیامة مغلولاً'' کیلئے أی لم یزل مغلولاً حتی یحله العدل أن یهکله الظالم''۔ اس وقت تک ہاتھ بندھے رہیں گے جب تک اس کا اس کا عدل خلاصی نہ دے، یا اس کو اس کا ظلم ہلاک نہ کردے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿وانَّ علیك لعنتی الٰی یوم الدین﴾ [ص:۷۸]: ''اور بے شک تجھ پر میری لعنت کررہے گی قیامت کے دن تک'' یعنی قیامت کے دن وہ اس عذاب کو دیکھے گا تو اس لعنت کو ہلکا اور کم تر سمجھے گا۔

اے کاش! میں امیر نہ ہوتا

۳۶۹۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: وَیْلٌ لِلْاُمَرَاءِ وَیْلٌ لِّلْعُرَفَاءِ وَیْلٌ لِلْاُمَنَاءِ لَیَتَمَنَّیَنَّ اَقْوَامٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَنَّ نَوَاصِیَهُمْ مُعَلَّقَةٌ بِالثُّرَیَّا یَتَجَلْجَلُوْنَ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَاَنَّهُمْ لَمْ یَلُوْا عَمَلاً (رواہ فی شرح السنة ورواہ احمد وفی روایته) اَنَّ ذَوَائِبَهُمْ کَانَتْ مُعَلَّقَةً بِالثُّرَیَّا یَتَذَبْذَبُوْنَ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَکُوْنُوْا عُمِّلُوْا عَلٰی شَیْءٍ۔

أخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۰ / ۵۹، الحدیث رقم ۲۴۶۸، وأحمد فی المسند ۲ / ۳۵۲

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہلاکت ہے امراء وحکام کیلئے، ہلاکت ہے ناظمین کیلئے، ہلاکت ہے امانتداروں کے لئے، بہت سے لوگ قیامت کے دن آرزو کریں گے کہ (کاش دنیا میں) ان کی پیشانیوں کے بال ثریا (ستارہ) میں باندھ کر ان کو معلق کردیا جاتا اور وہ زمین وآسمان کے درمیان جھولتے رہتے لیکن وہ کسی کام کی ولایت وسرداری کو قبول نہ کرتے''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله: ویل للأمراء:

ویل للأمراء: یہ مبتداء اور خبر ہیں۔ جیسا کہ یہ قول ہے: ''سلامٌ علیك'' کیونکہ کلمات دعائیہ وغیرہ نکرہ ہوکر بھی مبتدا بن سکتے ہیں۔

''وِیلٌ'': کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں:

① اس سے مراد ہلاکت، حزن اور مشقت عذاب ہے۔

② بعض کہتے ہیں جہنم کی ایک وادی ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ ''ویل'' جہنم کی ایک وادی ہے جس میں کافر چالیس سال تک گرتا رہے گا اس کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، ابن حبان وحاکم نے ابوسعید سے روایت کیا ہے

قوله:"ویل للعرفاء":

"عرفاء":"عریف کی جمع ہے۔ فاعل (یعنی "عارف") کے معنی میں ہے۔"عریف" اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی قبیلہ کے معاملے کا ذمہ دار اور امیر اس سے احوال معلوم کرتا ہے۔ بستیوں کے سردار اور ارباب ولایات بھی اسی حکم میں ہیں۔

قوله: ویل لأمناء:"امناء" امین کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے کہ جس کو امام نے صدقات، خراج اور مسلمانوں کے تمام اُمور کا امین بنایا ہے اور اس کی دلیل اس کا معطوف ہے۔ یعنی"اُمراءُ" اور"عرفاءُ" یہ اپنے عموم کی وجہ سے ہر اس شخص کو شامل ہے جس کو"امام" مال وغیرہ پر امین بنا دیتا ہے اور انہی میں سے یتیموں کا وصی اور اوقاف کا نگران ہوتا ہے۔

قوله: لیتمن اقوام۔۔۔لم یلوا اغملا:

نواصی":سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو کہتے ہیں۔"**النهاية**" میں ہے کہ "**ثریاء**" ستارے کو کہتے ہیں۔ اور"**ثروی**" سے اسم تصغیر ہے کہا جاتا ہے کہ ان ظاہری نظر آنے والے ستاروں کے درمیان کئی سارے پوشیدہ ستارے بھی ہیں۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ"**لیتمنین**" میں لام قسم کیلئے ہے۔ اور"**تمنی**" ناممکن الحصول کے طلب کرنے کو کہتے ہیں اور جس چیز کی صورت یہ ہوگی کہ کاش دنیا میں وہ اس منصب ولایت اور قضاء پر فائز نہ ہوتے۔ اس کے بدلے میں وہ دنیا میں ثریا کے ساتھ لٹکے ہوئے ہوتے۔ قیامت کے دن ان کی یہ تمنا ہوگی تاکہ تمام لوگ اس ذلت اور رسوائی کا مشاہدہ کرتے۔ لیکن یہ عزت اور منصب قضاء دنیا میں نہ ملا ہوا ہوتا۔ دراصل"**تعلیق بالناصية**" رسوائی اور ذلت کے لئے ضرب المثل ہے۔ اس لئے کہ عرب جب کسی قیدی کو چھوڑتے تو اس کی پیشانی کے بالوں کو کاٹ ڈالتے تھے۔ دراصل یہ تمنی وہی ندامت و پشیمانی ہے جس کا ذکر آپ ﷺ نے یوں فرمایا ہے کہ"**انکم ستحرضون علی الامارة وستکون ندامة یوم القیامة**" لہٰذا"**لیتمنین أقوامٌ**" عام کیلئے تخصیص ہے اور"مطلق" کیلئے بطور تقیید ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ نے جب تہدید کو عام کر دیا اور"وعید" میں مبالغہ کر دیا تو آپ ﷺ نے ارادہ کیا کہ اس کا تدارک کیا جائے۔ اور اس سے وہ شخص نکل جائے جو حق قیام کے ساتھ قائم رہے۔ اس میں"ظلم" سے پرہیز کرے اور اس کے ذریعے سے وہ ثواب کا مستحق ٹھہرا۔ اور وہ بڑے نصیبے والا ہو جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے ایک منصف اور عادل بادشاہ کے ساتھ کیا ہے۔

فرماتے ہیں:"ان لوگوں میں سے ایک گروہ ایسی تمنا کرے گا۔ یہ اسلئے فرمایا تاکہ مفہوم مخالف پر تنبیہ ہو جائے کہ ان کا حکم اس سے علیحدہ ہوگا، اور ان کے برعکس ہوگا۔ (اگر وہ عادل اور منصف ہوں) اور وہ لوگ"رحمٰن" کی دائیں طرف نور کے منبروں پر ہوں گے اور اس کے برعکس کا حکم بیان نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس روایت میں"مقسطین" اور عادل بادشاہوں کے مدح کے منطوق کی تصریح کی تاکہ"بالمفهوم" یہ ظالم و جابر کی مذمت پر دلالت کرے۔ اس لئے کہ یہ مقام مقام تہدید ہے اور"طلب امارت" پر زجر کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ ایک اہم کام ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اصلاح اموال اور لوگوں کے معاش کی حالت کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بڑا پرخطر کام ہے اس کے حقوق کا خیال رکھنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ لہٰذا کسی عاقل کیلئے مناسب نہیں کہ وہ اس مشقت میں اپنے آپ کو ڈالے اور بالطبع اس کی طرف میلان رکھے کیونکہ جس شخص کے قدم اس میں راہ حق سے پھسل جاتے ہیں بسا اوقات وہ ایسے فتنہ کی طرف چل پڑتا ہے جو کہ اس کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

قوله:وفی وروایته ...... ذوائب:"ذائبة" کی جمع ہے۔"بمعنی ظفائر"
عملوا :بصیغہء مجہول تشدید ہے۔

سربراہ جہنم میں جائیں گے

۳۶۹۹:وَعَنْ غَالِبِ الْقَطَّانِ، عَنْ رَجُلٍ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ الْعِرَافَةَ حَقٌّ، وَلَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ عُرَفَاءٍ، وَلٰكِنَّ الْعُرَفَاءَ فِى النَّارِ (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داود فی السنن ۳ / ٦٤٦، الحدیث رقم : ۲۹۳٤

ترجمہ:"اور حضرت غالب قطان ایک شخص سے اور وہ شخص اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"نظامت ایک حقیقت ہے اور لوگوں کے لئے ناظم کا ہونا ضروری ہے لیکن (اکثر) ناظمین دوزخ میں جائیں گے"۔(ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

غالب بن ابی غیلان۔نام"غالب"ابوغیلان کے بیٹے جن کو"ابن خطاف القطان" بھی کہتے ہیں۔بصرہ ان کا وطن اصلی ہے۔بکر بن عبداللہ سے روایت کی ہے۔ان سے ضمرہ بن ربیعہ روایت کرتے ہیں۔"قطان" میں قاف مفتوح اور طاء مشدد ہے۔

عرضِ مرتب

"اکمال" کے محشی لکھتے ہیں:امام احمد اور ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے اور ابوحاتم نے ان کو صدوق وصالح کہا ہے۔
(الجرح والتعدیل۳/۲/۴۸)

قوله: ان العراقه حق ولا بد للناس من عرفاء: تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ"حق" یہاں پر مصلحت کی جگہ پر ہے۔جیسے شکر ترتیب دینا، ان کے امور کو درست رکھنا ان کے وظائف وعطیات لوگوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا۔تاکہ ان میں ان کے مال غنیمت کے حصے وغیرہ صحیح طریقے سے تقسیم کئے جائیں وغیرہ،ان تمام امور میں"عریف" کی ضرورت ہوتی ہے اور "ولابد للناس من عرفاء" کا مطلب بھی یہی ہے۔

قوله:"ولکن العرفاء فی النّار"

یعنی"عرافہ ان امور میں سے ہے جو ان کو جہنم کے قریب کر دیتے ہیں۔اس قول میں دراصل تحذیر ہے اور ان امور وآفات سے ڈرانا مقصود ہے جن سے عام طور پر لوگ محفوظ نہیں رہتے۔اور ان فتنوں میں عام طور پر یہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں ان امور کے بارے تیقظ اور انتباہ ضروری ہے۔اس طرح کی خیانتوں سے محفوظ رہنے والے اس میں واقع ہو جانے والوں سے زیادہ ہیں۔

یہاں پر"عرفاء فی النّار" سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے فیصلہ میں عدل وانصاف سے کام نہیں لیا۔اور یہاں پر صیغہ

عموم کوذکرفرمایا۔''غالب'' کو''کل'' کی جگہ پرذکر کرنے کی مترادف ہے اور معنی یہ ہوگا۔ (کہ وہ ہمیشہ ایسے کام کرتے ہیں جوان کو آگ کی طرف کھینچ کر لے جارہے ہیں) یا تقدیری عبارت یوں ہے: **یکون اکثر هم فی النار** کہ ان میں سے اکثر لوگ آگ میں ہوں گے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ''**لکن العرفاء فی النّار**''میں اسم ظاہر کوذکر کیا مضمر کی جگہ تا کہ یہ بات معلوم ہوجائے کہ''**عرافة**'' بڑی پُرخطر چیز ہے اور جس نے اس کو حاصل کیا وہ آگ کے کنارے اور دہانے پر کھڑا ہے یہ حکم اس آیت کی طرح ہوگا: ﴿**اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا**﴾[النساء: ۱۰] اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں''اس عاقل شخص کو چاہیے کہ وہ چوکنا رہے اور اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے اس فتنہ سے اپنے آپ کو دور رکھے کہ اس فتنہ سے کہیں، وہ فتنہ اس کو عذاب میں نہ لے جائے۔

امیر اور حوض کوثر

۳۷۰۰: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ: قَالَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعِيْذُكَ بِاللّٰهِ مِنْ اِمَارَةِ السُّفَهَاءِ، قَالَ: وَمَاذَاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: اُمَرَاءُ سَيَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِىْ، مَنْ دَخَلَ عَلَيْهِمْ فَصَدَّقَهُمْ بِكَذِبِهِمْ وَاَعَانَهُمْ عَلٰى ظُلْمِهِمْ فَلَيْسُوْا مِنِّى وَلَسْتُ مِنْهُمْ وَلَنْ يَرِدُوْا عَلَىَّ الْحَوْضَ وَمَنْ لَمْ يَدْخُلْ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُصَدِّقْهُمْ بِكَذِبِهِمْ وَلَمْ يُعِنْهُمْ عَلٰى ظُلْمِهِمْ فَاُولٰئِكَ مِنِّى وَاَنَا مِنْهُمْ، وَاُولٰئِكَ يَرِدُوْنَ عَلَى الْحَوْضَ۔ (رواه الترمذي والنسائي)

أخرجه الترمذي في السنن ٢ / ٥١٢، الحديث رقم: ٦١٤، والنسائي في ٧ / ١٦٠، الحديث رقم: ٤٢٠٧، وأحمد في المسند ٤ / ٢٤٣

ترجمه: اور حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: ''میں تم کو بیوقوف لوگوں کی سرداری (کے طور طریقوں سے یا ان کی مصاحبت وحمایت) سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں''۔کعب فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیا ہے؟ (یعنی اس طرح کی سرداری کب ہوگی اور وہ کون لوگ ہوں گے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میرے بعد (بعض زمانوں میں) جو لوگ امیر وحاکم ہوں گے (وہ احمق و نادان آئین جہانبانی سے نابلد اور جھوٹے اور ظالم ہوں گے' لہٰذا جو لوگ ان (احمق و نادان اور کذاب و ظالم امیروں وحاکموں) کے پاس گئے (یعنی انہوں نے ان کی مصاحبت اختیار کی اور ان کے جھوٹ کی تصدیق کی (اور اپنے قول وفعل کے ذریعہ) ان کے ظلم کی امداد وحمایت کی تو نہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میں ان سے کوئی تعلق رکھتا ہوں (بلکہ ان سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہوں) اور نہ وہ لوگ حوض پر میرے پاس آئیں گے اور جو لوگ نہ تو ان امیروں اور حاکموں کے پاس گئے' نہ ہی انہوں نے ان کے جھوٹ کی تصدیق کی اور نہ ان کے ظلم کی امداد وحمایت کی تو وہ لوگ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں اور وہ حوض پر میرے پاس آئیں گے''۔ (ترمذی ونسائی)

تشریح: قوله:''أعيذك بالله من امارة السفهاء''

''امارت سفهاء'' سے مراد میں کئی احتمال ہیں:

①سفهاء کے اعمال مراد ہیں۔② ان کے پاس آمد و رفت مراد ہیں۔③ ان سے میل ملاپ مراد ہے

''سفهآء'' سے مراد کون لوگ مراد ہیں؟ اس میں دو احتمال ہیں:

① علم وعمل سے کورے مراد ہیں۔② طیبیؒ کا قول ہے کہ ''سفهآء'' سے مراد کم عقل لوگ ہیں۔

''النہایہ'' میں ہے کہ ''السّفه'' اصل میں ''خفت عقل'' اور ''اوچھے پن'' کو کہتے ہیں۔ ''سفه فلانٌ رأيه'' اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی اپنی رائے میں مضطرب ہو اور اس میں کوئی استقامت نہ رکھتا ہو۔ اور ''سفیه'' جاہل کو کہتے ہیں۔

قوله:ماذاك يا رسول الله ﷺ؟...ولم يردوا على الحوص:

''قال وماذاك:'' اس میں متکلم سے غائب کی طرف التفات ہے۔ یا اس میں تجرید ہے' اس لئے کہ یہاں ''قلت'' کہنا چاہئے تھا۔

''**وما ذاك يا رسول الله**'' ''ما'' بمعنی أی شئ ہے۔ معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہے؟ **اى شيىء ما ذكر ته من امارة السفهاء**؟ (آپ نے قیامت کی یہ کون سی نشانی بتائی ہے؟) امام طیبیؒ کہتے ہیں کہ ذلک میں ''**امارة سفهآء**'' کے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ان کا جو ظلم اور جھوٹ مراد ہے اور جس کا باعث ان کا جہل اور ان کا اوچھا پن ہے۔

''کذب'' کاف کے فتحہ اور ''ذال'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ''کاف'' کے کسرہ اور سکون کے ساتھ بھی ہے۔ لیکن قول اوّل اصح ہے۔ کیونکہ قرآن میں صرف یوں ہی وارد ہوا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ ''کذب'' جب ''صدق'' کے مقابلے میں بولا جائے ''ذال'' کے سکون کے ساتھ ہے اور جب اکیلا بولا جائے تو پھر ''کسرہ'' کے ساتھ ہوگا۔

فليسوا مني ولست منهم: تو میں ایسے لوگوں سے اظہار برأت کرتا ہوں اور ان کے ذمہ کو ختم کرتا ہوں۔

ولن يردوا: ایک نسخہ میں ''**لم يردوا**'' ہے۔ **يردون** ''**ورود**'' سے ماخوذ ہے۔ بمعنی ''**مرور**''۔

علي: میں یاء مشدد ہے۔

''**لن يردوا على**'' عرض کے معنی کو متضمن ہے أی **لن يردوا على معروضين** ۔

قوله:''ومن لم يدخل فاو لئك مني......''

طیبیؒ کہتے ہیں یہاں پر ''مَنْ'' کی خبر پر ''فاء'' داخل ہے تا کہ معنی شرط کو متضمن ہو جائے اور اس میں ''اُولئك'' کا اضافہ کیا اور اس کو مکرر ذکر فرمایا تا کہ علّت کو مزید تقویت مل جائے۔ اسم اشارہ اس جیسے مقام میں یہ بتاتا ہے کہ مابعد حصہ اپنے ماقبل کے زیادہ لائق ہے کیونکہ یہ مذکورہ خصال کے ساتھ متصف ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: [**أولئك على هُدًى من ربهم واولئك هم المفلحون**] ''**الذين يؤمنون بالغيب......**'' کے بعد

سفیان ثوریؒ کہتے ہے: ''**لا نخالط السلطان ولا من يخالطه**'' نہ ہم بادشاہ کے ساتھ مخالطت کریں گے (میل جول رکھیں) اور نہ ان کے ساتھ مخالفت کریں گے جو بادشاہ کے ساتھ مخالطعت کرتا ہے۔ اور فرمایا: صاحب قلم، صاحب دوات، کاغذ

والا اور زکسی بانس والا بعض بعض کے شرکاء ہیں۔

حکایت: روایت ہے کہ ایک درزی نے عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا کہ ان حکام کے کیلئے کپڑے وغیرہ سینے کا کام کیسا ہے؟ کیا میں قرآن کی اس آیت کی وعید میں تو داخل نہیں ہوں گا:﴿ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ [هود:۱۱۳] ترجمہ:'' اور (اے مسلمانوں) ظالموں کی طرف مت جھکو'' تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں وہ شخص بھی داخل ہوگا جو آپ کو سوئی بیچے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''جو شخص کسی ظالم کے کام سے خوش ہوا اگرچہ وہ ظالم وہاں موجود نہ ہو، تو وہ شخص ایسا ہے گویا کہ اس کے پاس حاضر ہو''۔ اور پھر اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی (جو اوپر ذکر ہوئی)۔

بادشاہ سے تعلق کی مذمت کا بیان

۳۷۰۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ سَكَنَ الْبَادِيَةَ جَفَا، وَمَنِ اتَّبَعَ الصَّيْدَ غَفَلَ، وَمَنْ اَتَى السُّلْطَانَ افْتُتِنَ (رواه الترمذى واحمد والنسائى وفى رواية ابى داود) **مَنْ لَزِمَ السُّلْطَانَ افْتُتِنَ، وَمَا ازْدَادَ عَبْدٌ مِنَ السُّلْطَانِ دُنُوًّا اِلَّا ازْدَادَ مِنَ اللّٰهِ بُعْدًا۔**

أخرجه ابوداود فى السنن ۳ / ۲۷۸، الحديث رقم: ۲۸۵۹، والترمذى فى ٤ / ٤٥٤، الحديث رقم: ۲۲۵٦، والنسائى فى ۷ / ۱۹۵، الحديث رقم ٤۳۰۹، وأحمد فى المسند ۱ / ۳۵۷

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص جنگل میں رہتا ہے وہ پتھر دل ہو جاتا ہے، جس نے شکار کا تعاقب کرتا ہے وہ غافل ہو جاتا ہے اور جو شخص بادشاہ کے پاس آتا ہے وہ فتنہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے (احمد، ترمذی، نسائی) اور ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ جو شخص بادشاہ کے قریب رہا (یعنی اس کے ہاں ہر وقت حاضر باش و حاشیہ نشین اور مددگار رہتا ہے) وہ فتنہ میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور جو شخص بادشاہ کے جتنا زیادہ قریب ہو، اتنا ہی اللہ سے بعید ہو جاتا ہے''۔

تشریح: قوله: من سكن البادية جفا:

ارشاد باری تعالیٰ:﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا﴾ [التوبة:۹۷] ترجمہ: (ان ضافتوں میں جو) دیہاتی لوگ (ہیں وہ) کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ '' جفا الرجل '' اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کا دل سخت ہو جائے اور وہ کسی نیکی اور صلہ رحمی کیلئے نرم نہ ہو۔ اور یہ چیز گاؤں میں رہنے والوں پر غالب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اہل علم سے دور ہوتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ ان کا اختلاط کم ہوتا ہے ان کی طبائع جانوروں کی طبائع کی طرح ہوتی ہیں۔

قوله: ''ومن اتبع الصيد غفل ''یعنی جس نے صید کے پیچھے کو لازم کیا اور اس کے ساتھ مشغول رہا اور کبوتر وغیرہ کے شکار کا پیچھا کرنے کیلئے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دوڑتا ہے۔ لہو ولعب کی خاطر۔

''غَفَلَ ''یعنی وہ طاعت، عبادت نماز یا جماعت اور جمعہ کی حاضری سے بھی غافل رہا، نرمی و رحمت سے دور رہا۔ درندوں

اور جانوروں کے مشابہ ہے

قولہ:''ومن اتی السلطان افتتن''یعنی جو شخص بغیر کسی ضرورت وحاجت کے بادشاہ کے دروازہ پر حاضری دے وہ فتنہ میں پڑ گیا۔اس لئے کہ اگر وہ امور کی بجا آوری میں بادشاہ کے ساتھ موافقت کرتا ہے یا اس طور کہ شریعت کی پاسداری نہیں کرتا تو اس نے اپنے دین پر خطرہ مول لیا۔اور اگر اس کی مخالفت کی تو دنیا کے خطرات مول لے گا۔(ملخصا از طیبی)

مظہرؒ کہتے ہیں کہ جس شخص نے دیہات کو لازم پکڑا اور نماز جمعہ ومجالس علماء میں خاضر نہ ہوا تو درحقیقت اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور جس کسی نے لہو ولعب کیلئے شکار کو اپنی عادت بنایا تو وہ غافل ہو گیا کیونکہ لہو ولعب مردہ دل سے پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ جس شخص نے خوراک کیلئے شکار کیا تو یہ جائز ہے۔اس لئے کہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی شکار کیا کرتے تھے اور جو شخص بادشاہ کے پاس آیا اور مداہنت سے کام لیا تو وہ شخص فتنہ میں پڑ گیا۔البتہ جس شخص نے مداہنت نہیں کی اور اس کو نصیحت کی۔معروف کا حکم کیا اور ''منکر'' سے منع کیا تو اس مقصد کیلئے بادشاہ کے پاس جانا ''افضل جہاد'' ہے۔

قولہ:من لزم السلطان ......:

''دیلمی'' نے مسند فردوس'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

''من ازداد علمًا ولم یزدد فی الدنیا زهدًا لم یزدد من اللّٰہ الاَّ بُعدًا''

کامیاب ہے وہ شخص......

۳۷۰۲:وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِ یْكَرِبَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَرَبَ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ ثُمَّ قَالَ:اَفْلَحْتَ يَا قُدَيْمُ! اِنْ مُتَّ وَلَمْ تَكُنْ اَمِيْرًا وَلَا كَاتِبًا وَلَا عَرِيْفًا .(رواہ ابوداود)

أخرجه ابوداود فی السنن ۳ / ۳۴۶' الحدیث رقم : ۲۹۳۳

ترجمہ:''اور حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (یعنی مقدام رضی اللہ عنہ) کے کندھے پر اپنا ہاتھ مار کر فرمایا''اے قدیم!اگر اس حالت میں تمہاری موت ہو کہ نہ تو تم امیر وحاکم ہو' نہ منشی ہو اور نہ ناظم تو تم نے کامیابی پائی''۔(ابوداوٗد)

تشریح: **قولہ:ان رسول اللّٰہ ضرب علی منکبیه** ......:رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک شفقت اور محبت کے اظہار اور ان کو حالت غفلت سے جگانے کیلئے حضرت مقدام کے کندھوں پر مارا۔

''عریف'':''عرفاء'' کا واحد ہے''۔اور یا اس سے مراد معروف ومشہور ہے یعنی تو گمنام ہو،لوگ تجھ کو پہچانتے نہ ہوں اس میں دراصل اشارہ ہے کہ گمنامی میں راحت وآرام ہے' اور شہرت میں آفت ومصیبت ہے۔

مولانا ابوعز بن برکات والی مکہ مکرمہ نے فرمایا:**السَّعید من لا یعرفنا ولا نعرفه** کہ نیک بخت شخص وہ ہے جو ہمیں نہیں پہچانتا اور ہم اس کو نہیں پہچانتے۔

طبرانی وحاکم نے فضالہ بن عبید سے مرفوعاً روایت کیا ہے:**افلح من هدی الی الاسلام و کان عیشه کفافًا وقنع**

بہ ''کامیاب ہوگیا وہ شخص جس کو اسلام کی ہدایت مل گئی اور اس کی زندگی ضروریات کے بقدر تھی اور اس پر قناعت کی''۔

بخاری نے اپنی ''تاریخ'' اور طبرانی نے ''الکبیر'' میں قرہ بن ہبیرہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: ''**افلح من رزق لبًا أی عقلاً کاملاً یختار الباقیة علی الفانیة ویعرض عن العاجلة ویقبل علی الآجلة۔**

ترجمہ: ''کامیاب ہوگیا وہ شخص جس کو عقل (یعنی کامل عقل) دی گئی۔ وہ ہمیشہ رہنے والی آخرت کی زندگی کو فانی زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور دنیا سے اعراض کرتا ہے اور آخرت پر پورے طور توجہ دیتا ہے۔''

۳۷۰۳: **وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ صَاحِبُ مَكْسٍ يَعْنِيْ الَّذِيْ يُعَشِّرُ النَّاسَ۔** (رواه احمد وابوداود والدارمی)

أخرجه ابو داود فی السنن ۳ / ۳٤۹، الحديث رقم: ۲۹۳۷، وأخرجه الدارمی فی السنن ۱ / ٤۸۲، الحديث رقم: ۱٦٦٦، وأحمد فی المسند ٤ / ۱٤۳

ترجمہ: اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''صاحب مکس (ٹیکس وصول کرنے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا'' صاحب مکس سے آنحضرت ﷺ کی مراد (حاکم کا کارپرداز) ہے جو لوگوں سے خلاف شرع محصولات وٹیکس وصول کرتا ہے''۔ (احمد، ابوداؤد، دارمی)

تشریح: **قوله: لايدخل الجنة صاحب مكس ......:**

مکس: میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ صاحب ''نہایہ'' لکھتے ہیں: **هو الضريبة التی يا خذلها الماكس وهو العشار۔** ''مکس'' اس محصول اور چنگی کو کہتے ہیں اور وہ جو دسواں حصہ لیتے ہیں اس کو ''عُشّار'' کہتے ہیں۔ ''صاحب مکس'' سے وہ شخص مراد ہے جو لوگوں پر دسواں حصہ چنگی اور محصول مقرر کر لیتے ہیں۔

یعشر: یاء کے فتحہ، عین کے سکون اور شین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں باب تفعیل سے ہے۔

''مصابیح'' میں لکھتے ہیں: کہا جاتا ہے: **عشرت المال عشرا و عشورا أی أخذت عشرا۔ ازباب قتل** (یعنی ازباب نصر ہے۔ اور **عشرت القوم عشرا** باب ضرب سے بمعنی **صرت عاشرهم۔** قاموس میں لکھتے ہیں: **عشر بعشر، أخذ واحدا من عشرة زادو حدا على التسعه والقوم صار عاشرهم و عشرهم بعشرهم عشرا وعشورا و عشرهم أخذ عشر أموالهم والعشار قابضه۔**

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ ''صاحب مکس'' سے مراد وہ شخص ہے جو ''تجار'' سے ''عشر'' کے نام کچھ محصول لیتے ہیں جب وہ ان پر سے گزرتے ہیں اور یہ وہ ہے جو اور جہاں تک بات ہے ساعی کی تو ساعی صدقہ کا مال جمع کرنے کیلئے آتا ہے اور وہ شخص جو اہل ذمہ سے وہ عشر لیتا ہے جس پر صلح ہوئی ہے تو وہ دراصل ''محتسب'' ہے۔ بشرطیکہ وہ ظلم وزیادتی نہ کرے اھ اور اسی طرح وہ شخص ہے جو ''حربی'' کے مال میں سے ''عشر'' لیتا ہے جب وہ حربی امان لے کر ہمارے ملک میں سامان تجارت کے ساتھ آتا ہے۔

یعنی الذی یعشر الناس: امام جزریؒ فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر محمد بن اسحاق بن مندہ نے ذکر کی ہے۔

اللہ کے نزدیک عادل اور ظالم امیر

۳۷۰۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَقْرَبُهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ عَادِلٌ وَاِنَّ اَبْغَضَ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَشَدَّهُمْ عَذَابًا (وَفِیْ رِوَايَةٍ) وَاَبْعَدَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ جَائِرٌ۔ (رواه الترمذی وقال: هذا حديث حسن غريب)

أخرجه الترمذی فی صحيحه ۳ / ٦١٧، الحديث رقم: ١٣٢٩، وأحمد فی المسند ۳ / ٥٥

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب اور (مجلس یعنی مرتبہ کے اعتبار سے) سب سے زیادہ قریب جو شخص ہوگا وہ عادل امام و حاکم ہوگا اور قیامت کے دن اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ نفرت کا مستحق اور سب سے زیادہ عذاب کا مستحق اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ سے سب سے زیادہ دور جو شخص ہوگا وہ ظالم امام و حاکم ہوگا''۔ امام ترمذی نے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

تشریح: قوله: ان احب الناس ......:

أقربهم مجلسا: ایک روایت میں ''أدناهم'' ہے۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں ہمارے بعض علماء نے ہمارے زمانے سے پہلے فرمایا کہ جس کسی نے آج کے بادشاہ کو ''عادل'' کہا تو وہ کافر ہوگیا۔

امام احمدؒ کے صاحبزادہ ''**زوائد الزهد**'' میں حضرت حسن سے مرسلاً نقل کرتے ہیں:

''**ان أحب عباد اللّٰه الى اللّٰه انصحهم لعباده**''۔

افضل ترین جہاد

۳۷۰۵: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔ (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٥١٤، الحديث رقم: ٤٣٤٤، والترمذی فی ٤ / ٤٧٩، الحديث رقم: ٢١٧٤، وابن ماجه فی ۲ / ١٣٢٩، الحديث رقم: ٤٠١١، وأحمد فی المسند ۳ / ١٩

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سب سے افضل جہاد اس شخص کا ہے جس نے ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہی''۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: افضل الجهاد من قال ......:

''**افضل الجهاد من قال**'' یہاں تقدیری عبارت دو طرح سے ہو سکتی ہے:

① **افضل جهاد من قال** ۔یعنی قائلین میں سے افضل جہاد اس بات کے قائل کا ہے۔

⑥ أفضل اهل الجهاد من قال یعنی اہل جہاد میں سے اَفضل وہ ہے جو کسی جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہے۔
''جائر'': اس کے معنی ہیں ''ظالم''۔
طیبیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جس نے کلمۂ حق کا تکلم کیا کیونکہ کلمۂ حق اس کو اس بات پر ابھارتا ہے۔
خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو بیان افضل الجہاد اسلئے کہا کہ جو شخص دشمن کے خلاف لڑتا ہے تو وہ زندگی کی امید اور خوف کے درمیان متردد ہوتا ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ غالب آئے گا یا مغلوب ہوگا جبکہ بادشاہ طاقتور ہوتا ہے اور یہ شخص اس کے قبضہ قدرت میں ہوتا ہے تو جب یہ حق بات کہتا ہے اور اس کو معروف اور نیکی کا حکم دیتا ہے تو گویا کہ اس نے اپنے آپ کو ضائع کرنے کیلئے پیش کر دیا۔ لہٰذا ''غلبہ خوف'' کی وجہ سے یہ افضل الجہاد ہو گیا کیونکہ اس میں تلف حیات اَغلب ہے۔ (یعنی عام طور انسانی جانیں چلی جاتی ہیں)۔
مظہرؒ نے ایک اور توجیہ بیان کی ہے وہ یہ کہ چونکہ حکمران کا ظلم اپنے تمام رعایا کے ساتھ ہوتا ہے، اس کے ماتحت ایک جم غفیر ہوتا ہے اس کا ظلم ان سب پر حاوی ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اس کو ظلم سے روکتا تو گویا کہ اس شخص نے کثیر مخلوق کو نفع پہنچایا۔ برخلاف ''قتل کافر کے'' اور یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ اس کو ''افضل الجہاد اس لئے کہا کیونکہ یہ ''جہاد اکبر'' ہے۔ جہاد اکبر ''مخالفة النفس'' کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ نفس اس قول سے براءت چاہتا ہے اور اس ظلم وخواہش نفس میں داخل ہونے سے دور ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں راعی اور رعایا دونوں کیلئے نصیحت اور خیر خواہی بھی ہے اور اس لئے بھی کہ ایک مؤمن کو قتل سے بچانا زیادہ افضل ہے برخلاف کسی کافر کو قتل کرنے کے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ [المائدة: ٣٢] ترجمہ: اور جو شخص کسی شخص کو بچالیوے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچالیا'' اس وجہ سے ''کتاب النکاح'' کو ''ابواب السیر والجہاد'' پر مقدم کیا گیا ہے کہ ایک مؤمن کو وجود دینا افضل ہے ہزار کافروں کے اعدام اور قتل سے اور اس لئے بھی کہ ''جہاد'' سے مقصود بالذات وجود ایمان اَہل ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاريات: ٥٦] ترجمہ: اور میں نے جن اور انسان کو اس واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کیا کریں''۔
امام غزالی ''اَحیاء العلوم'' میں فرماتے ہیں:
''سلطان'' کو امر بالمعروف کا مطلب اس کو وعظ و نصیحت کرنا ہے اور نرمی سے اس کو دعوت دینا ہے۔ رعایا میں سے کسی بھی شخص کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس کو قہر وغضب کے ساتھ کسی کام سے منع کرے کیونکہ اس سے فتنہ اور شر بھڑکے گا اور اس کی وجہ سے جو خوف وغیرہ پیدا ہوگا تو وہ اس کے نسبت زیادہ ہے اور اس کے ساتھ بات کرنے میں اس قسم کا کھردراپن اختیار کرنا کہ ''اے ظالم'' یا اے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا''۔ تو اگر اس کا شر غیر کی طرف متعدی ہوتا ہو تو جائز نہیں ہے اور اگر ''شر'' صرف اسی قائل کو ہو تو پھر جائز ہے، بلکہ مستحب ہے۔ اس لئے سارے صالحین کی عادت تھی، کہ خطرات کا سامنا کرتے تھے اور اپنی ہلاکت کی پرواہ کئے بغیر کھلم کھلا نکیر فرماتے تھے اس لئے کہ ان کو پتہ تھا کہ یہ جہاد اور شہادت ہے۔

۳۷۰۶: وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ ۔

أخرجه النسائي في السنن ٧ / ١٦١، الحديث رقم: ٤٢٠٩، وأحمد في المسند ٤ / ٣١٤

ترجمہ: اور احمد ونسائی نے اس روایت کو طارق بن شہاب سے نقل کیا ہے''۔

تشریح: ''جامع صغیر میں ہے۔ افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جابر''۔

ورواه ابن ماجه عن ابی سعيد، واحمد، وابن ماجه، والطبرانی، والبيهقی من ابی امامة، واحمد والنسائی والبيهقی عن طارق بن شهاب۔

امیر کے مشیر کا بیان

۳۷۰۷: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِالْاَمِيْرِ خَيْرًا جَعَلَ لَهٗ وَزِيْرَ صِدْقٍ، اِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهٗ، وِاِنْ ذَكَرَ اَعَانَهٗ وَاِذَا اَرَادَ بِهٖ غَيْرَ ذٰلِكَ جَعَلَ لَهٗ وَزِيْرَسُوْءٍ، اِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ وَاِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه ابو داود فی السنن ۳ / ۳۴۵، الحديث رقم : ۲۹۳۲، والنسائی فی ۷ / ۱۵۹، الحديث رقم : ۴۲۰۴

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی امیر (حکمران) کی (دینی ودنیاوی) بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے سچا (یعنی راست گفتار وراست کردار) وزیرو مشیر مقرر فرما دیتا ہے کہ جب وہ امیر (خدا کے احکام کو) بھولتا ہے تو وہ وزیر اس کو یاددہانی کراتا ہے اور اگر وہ یاد رکھتا ہے تو وہ وزیر اس کو (یاد رکھنے میں) مدد دیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی امیر کی بھلائی کا ارادہ نہیں کرتا تو اس پر برے وزیرو مشیر مسلط فرما دیتا ہے اور اگر امیر خدا کے احکام کو فراموش کر دیتا ہے تو وہ وزیر اس کو یاد نہیں دلاتا اگر وہ فراموش نہیں کرتا تو وہ وزیر (اس کو یاد کرنے میں) اس کی مدد نہیں کرتا''۔ (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: قوله: رسول اللّٰه اذا أراد اللّٰه بالامير۔۔۔ وان ذكر أعانه:

قال ''أی لی'' جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔

''اذا أراد اللّٰه بالأمر خيرًا جعل له وزير صدقٍ'' یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی حکمران اور سلطان کے ساتھ بھلائی اور خیر خواہی کا ارادہ کرے تو اس کیلئے ایک سچا وزیر اور مشیر مقرر کر دیتا ہے۔ یعنی ایسا وزیر اور مشیر مقرر کر دیتا ہے جو کہ سچا اور مصلح ہوتا ہے۔

''النہایہ'' میں لکھا ہے کہ ''وزیر'' اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو اُمیر کی مدد کرتا ہے اور اس سے اس کے بوجھ اور مشکلات کو اٹھاتا ہے۔ یعنی ''وزیر'' اصل میں ''وزر'' سے ماخوذ ہے جو بوجھ اور حمل کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے۔: ﴿حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا﴾ [محمد: ۴] یعنی اس کا معاملہ ختم ہو جائے اور اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے کہ اس کے بعد کوئی قتال باقی نہیں رہا۔ لیکن اکثر احادیث وغیرہ میں ''وزر'' کا اطلاق گناہ اور معصیت پر ہوتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِم﴾ [الانعام: ۳۱] تو ممکن ہے کہ وزیر کو وزیر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی دراصل بہت سارے امور اور کاموں میں اُمیر اور سلطان کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اگر وہ اُمیر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو بھول جاتا ہے۔ تو وہ وزیر اس اُمیر کو اس کی

خبر دے دیتا ہے۔اور اگر وزیر کو خود بخود وہ معاملہ یاد آ جائے تو پھر وہ وزیر اس کی اعانت اور مدد کرتا ہے۔

قوله: وان أرادبه غير ......:

جب اللہ تعالیٰ کسی اُمیر اور سلطان کے ساتھ برائی اور شر کا ارادہ رکھے تو اس کیلئے ایک برا وزیر مقرر فرما دیتا ہے۔ اگر وہ بھول جاتا ہے تو اس کو یاد دہانی نہیں کراتا اور اگر اس کو یاد آ جائے تو اس پر اس کی اعانت نہیں کرتا بلکہ اس سے صرف نظر کر لیتا ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اصل میں ''وزیر صدقٍ'' سے مراد ''وزیر صادق'' ہے۔ پھر یہ ''وزیر صدق'' بن گیا اس کے وصف کی بناء پر یعنی اس میں مبالغہ مقصود ہے۔ یعنی ایسا وزیر جو سراپائے صدق اور سچائی کا مجسمہ ہو۔ پھر مزید اختصاص کیلئے اس کو مضاف کر دیا گیا۔ اور ''بالصدق' سے مراد فقط اختصاص بالقول نہیں ہے بلکہ افعال اور اقوال سب کے ساتھ وہ مجسمہ صدق بن جاتا ہے۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ ایسا فعل جو کہ ظاہراً و باطناً فضیلت والا ہو اس کو ''صدق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور پھر اس فعل کی اس کی طرف اضافت کر دی جاتی ہے جس کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ﴾ [القمر:٥٥] اور ان اوصاف کے برعکس وزیر کو ''وزیر سوء'' کہتے ہیں۔

تخریج: اسی طرح بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ اور دیلمیؒ نے مسند الفردوس'' میں مہران سے مرفوعاً اس طرح نقل کیا ہے:

''اذا أراد اللّٰه بقوم خيرًا ولى عليهم علماء هم وقضٰى بينهم علماء هم وجعل المال فى سمحائهم واذا اراد بقومٍ شرًا ولى عليهم سفهاء هم وقضى بينهم جهالهم وجعل المال فى بخلائهم''۔

ترجمہ: ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو ان پر ان کے عقلمندوں کو ولی مقرر کر دیتا ہے' ان کے فیصلے ان کے علماء کرتے ہیں اور مال ان کے سخیوں کو دے دیتا ہے اور جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے تو ان پر ان کے ولی بے وقوفوں کو مقرر کر دیتا ہے' اور ان کے فیصلے ان کے جہلاء کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مال ان کے بخلاء کو دے دیتا ہے''۔

۳۷۰۸: وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ' عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْاَمِيْرَ اِذَا ابْتَغَى الرِّيْبَةَ فِي النَّاسِ اَفْسَدَهُمْ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داود فى السنن ٥ / ٢٠٠' الحديث رقم: ٤٨٨٩' وأحمد فى المسند ٦ / ٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''جو حکمران لوگوں میں عیوب تلاش کرتا ہے تو وہ فساد میں مبتلا کر دیتا ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: ''انّ الأمير اذا ابتغى......'' اس کے حکم میں ''وزیر'' بھی شامل ہے۔ جب یہ لوگوں کے عیوب کو تلاش کرنے لگتا ہے اور ان کے گناہوں کا تجسس کرنے لگتا ہے اور ان کے حوال میں بہت زیادہ کھود کرید کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے امور معاش ''نظام معاد'' کو خراب کر دیتا ہے اس لئے کہ انسان کم ہی کسی گناہ سے خالی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ہر فعل و قول میں ان کی تادیب شروع کر دی جائے گی تو ان پر یہ معاملہ بڑا شاق ہوگا بلکہ اس کو چاہئے کہ جتنا ممکن ہو سکے ان کی پردہ پوشی کرے۔ کہ

جو شخص گناہ کا اعتراف کرتا ہو تو اس سے حد کو دفع کرنے کیلئے اس کو تلقین کردی جاتی ہے کہ اقرار مت کرو۔اس لئے نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''من ستر أخاه المسلم ستره اللّٰه يوم القيامة''۔اس حدیث کو احمد نے ''عن رجلٍ'' کہہ کر روایت کیا ہے۔

اور ایک اور حدیث میں ہے:

''مَنْ ستر علٰى مؤمنٍ عورةً فكأنما أحيا ميتاً۔''جس نے کسی مؤمن بندہ کے عیب کو چھپایا تو گویا کہ اس نے مردہ کو زندہ کردیا۔

''طبراني''اور''ضياء'' نے شہاب سے نقل کیا ہے اور جامع صغیر میں اس کی تخریج کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس حدیث کو ابوداؤد،اور حاکم نے جبیر بن کثیر بن مرہ مقدام اور أبي أمامه سے نقل کیا ہے۔[الجامع الصغیر ۱/۱۲۱ الحدیث رقم ۱۹۵۶]

لوگوں کے پوشیدہ عیوب نہ ڈھونڈو

٣٧٠٩ : وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّكَ اِذَا اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَهُمْ ۔

أخرجه ابو داود في السنن ٥ / ١٩٩، الحديث رقم : ٤٨٨٨، والبيهقي في شعب الايمان ٧ / ١٠٧، الحديث رقم ٩٦٥٩:

ترجمہ:''اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جب تم لوگوں کے (پوشیدہ) عیوب کو تلاش کروگے تو ان کو خرابی میں مبتلا کروگے''۔(بیہقی)

تشریح: قوله:انك اتبعت عورات النساس:

اتبعت : ایک نسخہ میں ''ابتغيت'' ہے۔جس کے معنی طلب اور تلاش کرنے کے ہیں۔

''أفسدتهم'':یعنی تم ان کے خلاف فساد اور شر کا فیصلہ کروگے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ تم ان کے معاش و معاد کو بگاڑ دوگے جب کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث مذکور میں ''انك'' کے ساتھ خطاب عام ہے۔اور حدیث سابق میں ''انَّ الأمير'' کے لفظ کے ساتھ خطاب مذکور تھا تاکہ یہ وہم پیدا نہ ہو کہ یہ نہی صرف ''امیر'' کے ساتھ مختص ہے، بلکہ یہ نہی عام ہے اور اس شخص کے ساتھ مختص ہے کہ جو لوگوں کے پوشیدہ عیوب وغیرہ کے پیچھے پڑ جائے' چاہے وہ امیر ہو غیر امیر ہو۔

اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خطاب کرکے یہ بات اس لئے فرمائی کہ عنقریب یہ امیر بن جائیں گے' تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہوگا۔اس توجیہ کی تائید فصل ثالث کی پانچویں حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(ملاحظہ فرمایئے حدیث: ۱۵۔۳)

ظالم امیر کے ظلم پر صبر کا بیان

۳۷۱۰:وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَيْفَ اَنْتُمْ وَائِمَّةً مِنْ بَعْدِیْ يَسْتَاثِرُوْنَ بِهٰذَا الْفَیْءِ؟ قُلْتُ: اَمَا وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ اَضَعُ سَيْفِی عَلٰى عَاتِقِیْ ثُمَّ اَضْرِبُ بِهٖ حَتّٰى اَلْقَاكَ قَالَ: اَوَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى خَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكَ' تَصْبِرُ حَتّٰى تَلْقَانِیْ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داود فی السنن ٥ / ١١٩' الحديث رقم: ٤٧٥٩' وأحمد فی المسند ٥ / ١٨٠

ترجمہ:''اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (ہمیں مخاطب کر کے) فرمایا''میرے بعد تم حاکموں اور سرداروں کے ساتھ اس وقت کیسا برتاؤ کرو گے جب کہ وہ اس مالِ غنیمت کو خود رکھ لیں گے (آیا صبر کی راہ اختیار کرو گے یا ان کے خلاف تلوار اٹھاؤ گے؟) میں نے عرض کیا:''سن لیجئے،قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے میں اپنی تلوار کاندھے پر رکھوں گا اور پھر میں اس کے ذریعے قتال کرونگا یہاں تک کہ) آپ ﷺ سے جاملوں گا''۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''کیا میں تمہیں اس (تلوار اٹھانے) سے بہتر بات نہ بتادوں؟ (تو سنو) تم (اس وقت) صبر کی راہ اختیار کرنا یہاں تک کہ تم مجھ سے آملو (کیونکہ کسی دنیاوی حق کے ضائع ہونے کی صورت میں تلوار اٹھانے سے صبر کرنا اور خاموشی اختیار کرنا بہتر بھی ہے اور دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی اور پرہیزگاری کے شایانِ شان بھی''۔(ابوداؤد)

تشریح:قوله: كيف انتم۔۔۔لهذا الفی:

''كيف انتم:'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ''كيف'' حال کے سوال کے لئے آتا ہے اور اس کا عامل محذوف ہے عبارت اس طرح ہوگی:''كيف تصنعون'' جب فعل کو حذف کردیا تو اس کے فاعل کو ظاہر اور بارز کردیا۔جیسا کہ یہ قول تعالیٰ ہے:﴿لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ﴾ [الاسراء:١٠٠] اور حال مسئول عنہ ہے جو''أتصبرون أم تقاتلون'' ہے اور اس پر دلالت اس قول سے ہوتی ہے:''أضع سيفی'' اور آپ علیہ السلام کا یہ قول بھی اس پر دال ہے۔''تصبر حتی تلقانی''۔

''وأئمة من بعدی'' اس کیلئے مفعول معہ ہے۔

''يستأثرون'':جملہ حالیہ ہے۔اور عامل محذوف ہے اور اصل نسخہ کے مطابق یہ مبنی ہے۔جیسا کہ بعض نسخوں میں''أئمة'' نصب کے ساتھ آیا ہے۔اور''رفع'' کی صورت میں یہ جملہ اسمیہ ہوگا۔اور اس کا محل حالیت کی بناء پر منصوب ہے اور معنی یہ ہوگا۔''كيف حالكم''؟اور حال یہ ہوگا کہ تمہارے امراء اپنے آپ کو اس مال فئی کے ساتھ خاص کریں گے اور مستحقین کو نہیں دیں گے۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ جو مال کفار سے بغیر قتال اور لڑائی کے لیا جائے اس کو''فئی'' کہتے ہیں۔جیسا کہ خراج اور جزیہ ہے۔اور جو مال لڑائی اور قتال کے ساتھ لیا جائے اس کو''غنيمة'' کہتے ہیں۔

اور اس کی تائید اس آیت قرآنی سے بھی ہوتی ہے:﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ

وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ......﴾[الحشر: ٦] ''اور جو (مال) خدا نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے (بغیر لڑائی بھڑائی کے) دلوایا ہے اس میں تمہارا کچھ حق نہیں کیونکہ اس کے لئے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جن پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے''

قرآن کی یہ آیت بھی: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَه﴾[الأنفال: ٤١]

اور ''المغرب'' میں لکھا ہے کہ ''الفئی ہمزہ کے ساتھ'' اس مال کو کہتے ہیں جو لڑائی اور جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد مشرکین سے حاصل کیا جائے اور دار بھی دارالاسلام بن گیا ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ یہ تمام مسلمانوں کیلئے ہوگا اور اس سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اور ''غنيمة'' اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے قہراً حاصل کیا جائے جب کہ جنگ ابھی تک جاری اور قائم ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس سے ''خمس'' نکالا جائے گا اور خمس نکالنے کے بعد سارے خاص طور پر غانمین میں تقسیم ہوگا اور ''نفل'' اس مال کو کہتے ہیں جو کسی غازی کو اس کے سہم سے زائد دیا جاتا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ (اس) حدیث میں فئ غنیمت کو بھی شامل ہے تا کہ ان کے ظلم کا اظہار ہو اور اس بات کا بھی اظہار ہو کہ وہ ایسی چیز رکھ رہے ہیں جو ان کا حق نہیں ہے۔ اور یہاں پر ''اسم اشارہ'' ان کے مزید ظلم کی تصویر کیلئے ہے اور یہ بات علامہ مظہرؒ کے قول سے مزید واضح اور بیان ہوتی ہے کہ وہ ''بيت المال'' کا مال لیں گے جو کچھ غنیمت میں سے حاصل ہوا ہے۔ اور اس کو اپنے لئے خاص کریں گے۔ اور مستحقین کو نہیں دیں گے۔

قوله: ''قلت: ''أما والذی بعثك ...... ''أما'': تخفیف کے ساتھ ہے اور یہ تنبیہ کیلئے ہے۔

''والذی بعثك بالحق'' ''أی بالصّدق أو ملتبسًا بالحق''

''ثم اضرب به'' پھر میں ان سے لڑائی اور جنگ کرونگا۔

''حتی ألقاك'': یہاں تک کہ میں مرجاؤں اور آپ تک شہادت کے ذریعے پہنچ جاؤں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''ثمّ'' تراخی کیلئے ہے۔ کیونکہ ضرب کا رتبہ ''وضع'' کے بعد ہے۔ اور اس کو ''حتی القاك'' کے ساتھ اس کو شہید ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

''حتّٰی'' میں دو احتمال ہیں: ① بمعنی ''کیْ'' ہو۔ ② بمعنی غایت ہو۔

''قال أو لا أدلك'' اور ایک نسخہ میں ''افلا ادلك'' آیا ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ کلمہ تنبیہ ''الا'' کے درمیان حرف عطف کو داخل کر کے دو جملے بنا دیئے ہیں۔ ای'' **اتفعل هذا أو لا أدلك**''۔ ''الا'' اصل میں حرف استفہام ہمزہ اور ''لا'' نافیہ سے مرکب ہے۔

''تصبر'': یہ خبر ہے بمعنی امر ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی: ''**اصبر علٰى ظلمهم ولا تحاربهم**''۔ (یعنی تو ان کے ظلم پر صبر کرنا اور ان سے جنگ مت کرنا)

الفصل الثالث:

کچھ حاکم اللہ کے سائے میں ہوں گے

۳۷۱: عَنْ عَآئِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَتَدْرُوْنَ مَنِ السَّابِقُوْنَ اِلٰى ظِلِّ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ: اَلَّذِيْنَ اِذَا اُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوْهُ، وَاِذَا سُئِلُوْهُ بَذَلُوْهُ وَحَكَمُوْا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِاَنْفُسِهِمْ۔

أخرجه احمد فى المسند ٦ / ٦٧

ترجمه: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہؓ سے) فرمایا'' جانتے ہو قیامت کے دن اللہ عزوجل (کے عرش یا اس کے لطف وکرم) کے سایہ کی طرف سبقت لے جانے والے کون لوگ ہیں؟ (یعنی قیامت کے دن سب سے پہلے کون لوگ اللہ تعالیٰ کے عرش یا اس کے فضل وکرم کے سایہ میں جائیں گے؟)'' صحابہؓ نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ بہتر جاننے والے ہیں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(سبقت لے جانے والے) وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلمہ حق پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس کو قبول کرتے ہیں، جب ان سے حق کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ خرچ کرتے ہیں (یعنی اس کو بیان کرتے ہیں) اور لوگوں کے حق میں وہی فیصلہ کرتے ہیں جو اپنی ذات کے بارے میں کرتے ہیں''۔

تشریح: قوله: ''أتدرون من السّابقون......''۔

''من'' استفہامیہ ہے، ''تدرون'' فعل کے عمل میں 'تعلیق' ہے اور مابعد دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

''یوم القیامة'': ''سبق'' کیلئے مفعول فیہ ہے۔

''الّذین أعطوا الحق قبلوه'' اعطوا: یعنی جب ان کو ان کا حق دیا جائے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جب ان سے کلمہ حق کہا جائے وہ ان باتوں کو قبول کر لیتے ہیں، یا اس کی تابعداری کر دیتے ہیں۔

''واذا سئلوه بذلوه'' ایک نسخہ میں دونوں فعلوں کے ساتھ سے ضمیر کے حذف کے ساتھ واقع ہوا ہے۔ یعنی جب ان سے کسی کلمہ کے بارے پوچھا جاتا ہے تو وہ اس کا جواب دے دیتے ہیں اور اس کو چھپاتے نہیں ہیں اور نہ ہی اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے ہیں۔

یا اس کا معنی یہ ہے کہ جب ان سے کوئی اپنا حق مانگے تو وہ دینے میں حق ادا کرتے ہیں اور کمی بیشی نہیں کرتے اور لوگوں کیلئے فیصلے کرتے ہیں اگر چہ وہ حقیر ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ وہ اپنی ذات اور اپنے اقرباء کیلئے فیصلہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

خَبِيْرًا﴾[النساء:١٣٥] ''اے ایمان والو! انصاب پر قائم رہو اور خدا کے لئے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو خدا ان کا خیر خواہ ہے تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا اگر تم پیچ دار شہادت دو گے یا (شہادت سے) بچنا چاہو گے تو (جان رکھو) خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے''۔

اور حدیث میں بھی گزرا ہے: ''كلكم راع وكلكم مسئولٌ عن رعيته'' امام راغبؒ کہتے ہیں کہ اصل میں ''حق'' مطابقت اور موافقت کو کہتے ہیں اور ''حق'' موجد الشئ (شئ کو وجود بخشنے والا) کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی اس کی حکمت کے تقاضے کے مطابق اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ''هو الحق'' اور کیونکہ وہ بھی حکمت کے تقاضے کے مطابق اشیاء کو وجود عطاء کرتا ہے۔ اور اس وجہ سے کہا جاتا ہے۔ ''فعل الله تعالٰى كله حق'' کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے اور کسی چیز کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ یہ چیز فی نفسہٖ اس طرح واقع ہوئی ہے اور فعل و قول کو بھی کہتے ہیں جب وہ فعل یا قول واقع کے مطابق ہو۔ اور اس وقت میں جس سے وہ فعل واقع ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں: ''فعلك حق وقولك حق'' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ﴾[یونس۔۳۳] یعنی اس کلمۃ کو حق ثابت کر دیا یا یہ معنی کہ اس کے حق ہونے کے ساتھ اس کو مضبوط کر دیا گیا ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے کئی معانی ہو سکتے ہیں:

① اس کا اطلاق فعل حق اور قول حق پر کیا جاتا ہو۔ اور ''سابقون'' سے مراد ائمہ میں سے عادل لوگ ہیں۔ جیسا کہ حدیث ہے: ''سبعة يظلهم الله في ظله يوم لاظل الا ظله امامٌ عادِلٌ'' یعنی جب ان کو کوئی ناصح نصیحت کرے اور ان کے سامنے کلمہ حق انصاف کا اظہار کرے' تو وہ اس کو قبول کر لیتے ہیں' اور رعایا کے مقتضی حال کے مطابق فعل سرانجام دیتے ہیں اور یہ کہ برابری کے ساتھ حکم اور فیصلہ کرتے ہیں۔

② انسان کے لئے جو کچھ واجب ہے۔ یعنی عطیات وغیرہ۔ تو اس پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے یعنی جب ان کیلئے کوئی حق ثابت ہو جائے جب ان کو دیا جائے تو وہ اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ پھر وہ اس کو مستحقین پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ تا کہ یہ ان سخیوں اور برگزیدہ لوگوں کا درجہ حاصل کریں۔ جو اپنے اموال کو اعلانیہ اور خفیہ طور پر خرچ کرتے ہیں' اور اس سے وہ ایک ختم نہ ہونے والی تجارت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اسی قبیل سے آپ ﷺ کا یہ بھی ہے۔ جو آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

''خذه فتموله وتصدق به''۔

③ حکمت کے تقاضے کے مطابق کام کرنا اور بات کرنا۔ جیسا کہ آپ ﷺ ارشاد گرامی ہے: ''كلمة الحق ضالة الحكم فحيث وجدها فهوا بها۔ کہ کلمہ حق حکم کا متاع گم شدہ ہے پس جہاں کہیں وہ اس کو پالے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اس کو جانتا ہے اس پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔ اس کا ذاتی علم یہ ہے کہ وہ اس کو خود قبول کرے اور تعلیم الغیر یہ ہے کہ وہ اس کو دوسروں پر خرچ کرے اور اس پر عمل کرنا ''حکم'' ہے۔ میری عمر کی قسم! کہ یہ حدیث ان کلمات میں سے ہے جو ''ہر حکیم'' کی پوشیدہ میراث اور حکمت ہے۔ لہٰذا دونوں توجیہات کے مطابق

''سابقون'' سے مراد یہ ہے کہ ''هم السابقون السبقون او لٰك المقربون''۔

۳۷۱۲:وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ثَلَاثٌ اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِيْ: اَلِاسْتِسْقَاءُ بِالْاَنْوَاءِ، وَحَيْفُ السُّلْطَانِ، وَتَكْذِيْبٌ بِالْقَدْرِ۔

أخرجه احمد فی المسند ٥ / ٩٠

ترجمہ:''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ'' مجھے اپنی امت کے حق میں تین باتوں کا اندیشہ ہے کہ (کہیں وہ ان کو اختیار کر کے گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائے) ایک تو ستاروں کے ذریعے بارش طلب کرنا' دوسرے بادشاہ کا ظلم کرنا اور تیسرے تقدیر کا جھٹلانا (یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ تقدیر الٰہی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ انسان جو بھی فعل کرتا ہے وہ خود اس کا خالق ہوتا ہے جیسا کہ ایک جماعت قدریہ کا یہ مسلک ہے۔)''

تشریح:قوله:ثلاث أخاف علی امتی ......:

''ثلاث'':ای من الخصال اور ایک نسخہ میں ثلاثہ ہے۔ای من الافعال۔

''الاستسقآء بالآلواء'':یعنی بارش اور پانی کو ظہور کواکب اور ستاروں سے طلب کیا جائے گا۔یا آسمان میں قمر کے منازل کی وجہ سے طلب کیا جائے۔

صاحب النہایہ لکھتے ہیں کہ ''انواء'' سے مراد چاند کی اٹھائیس منازل ہیں۔ ہر شب چاند ایک منزل میں اترتا ہے اور مغرب میں تیرہویں رات طلوع فجر کے ساتھ ایک منزل گرتا ہے۔اور مشرق میں اس وقت اس کے مقابلے میں ایک دوسرا چاند طلوع ہوتا ہے۔ان تمام منازل کو سال کے اختتام پر پورا کر لیتا ہے۔اور عرب کا یہ خیال تھا کہ ایک منزل کے سقوط اور اس کے مقابل منزل کے طلوع ہونے کی وجہ سے بارش ہو جاتی ہے اور بارش کو اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ ہم پر فلاں ستارے کی وجہ بارش ہوگئی

اس کو ''نوء'' کہنے کی وجہ یہ تھی کہ جب مغرب میں ایک ستارہ غروب ہو جاتا تو مشرق میں ایک طلوع ہو جاتا تھا۔''ناء ینوء نوءا'' کا معنی چڑھنا اور طلوع ہونا ہے۔

بعض کا قول ہے کہ ''نوء'' سے مراد غروب ہے۔اور یہ کلمات اضداد میں سے ہے۔نبی علیہ السلام نے اس سلسلے میں سختی اس لئے کی کہ عرب بارش کو اس کی طرف منسوب کیا کرتے تھے۔البتہ جو شخص بارش کو اللہ تعالیٰ کا فعل قرار دے اور ''مطرنا بنوء کذا'' سے مراد ''في وقت كذا'' لے تو یہ جائز ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی عادت بنائی ہے کہ ان اوقات میں بارش برس جائے۔لیکن میں کہتا ہوں کہ بظاہر حدیث میں وارد یہ ممانعت سد باب کے پیش نظر مطلقاً ممانعت کے لئے ہے اور اسباب سے نظر قطع کرنا مقصود ہے۔اس لئے کہ اس میں تخلف بھی ہوتا ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ﴾ [لقمن:٣٤] یعنی ایسے وقت میں برساتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اس وقت کو نہیں جانتا۔

''وتكذيب بالقدر'':یعنی خیر وشر کا ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ شاید ان تین خصلتوں

سے اس لئے ڈرایا کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ اسباب مستقل ہیں اور ''مُسبب'' کی طرف نظر کو ترک کردے تو وہ شخص شرک میں واقع ہوا اور جس نے ''تقدیر'' کی تکذیب کی اور کہا کہ ''الأمر أنف'' سارے معاملات خود بخود ہوتے ہیں' وہ ''تعطیل'' (یعنی اللہ تعالیٰ کو بے کار محض ماننے یا بالکل نہ ماننے کے خطرناک نظریئے) کا شکار ہو گیا۔ اور جو شخص سلطان ظالم کے ساتھ مبتلا ہو گیا تو اس کے پاس گمراہی آئے گی۔

حضور ﷺ کی چند خاص نصیحتوں کا بیان

۳۷۱۳: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةَ اَيَّامٍ: اَعْقِلْ يَا اَبَا ذَرٍّ مَا يُقَالُ لَكَ بَعْدُ فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ السَّابِعُ قَالَ اُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ فِيْ سِرِّ اَمْرِكَ وَعَلَانِيَتِهٖ' وَاِذَا اَسَاْءَتَ فَاَحْسِنْ 'وَلَا تَسْاَلَنَّ اَحَدًا شَيْئًا' وَاِنْ سَقَطَ سَوْطُكَ وَلَا تَقْبِضْ اَمَانَةً' وَلَا تَقْضِ بَيْنَ اثْنَيْنِ۔

أخرجه احمد في المسند ٥ / ١٧٢

ترجمه: ''اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ چھ دن تک مجھ سے یہ ارشاد فرماتے رہے کہ ''اے ابوذر! بعد میں جو بات تم سے کہی جائے گی اس کے لئے تیار رہو (یعنی آپ ﷺ چھ دن تک مجھے آگاہ کرتے رہے کہ میں تمہیں ایک ہدایت دوں گا تم اس پر خوب غور کرنا اس کو یاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا) چنانچہ جب ساتواں دن ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تمہیں (ظاہر و باطن میں) اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں' جب تم سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو ساتھ ہی نیکی بھی کرنا (کیونکہ وہ برائی کو مٹا دیتی ہے یا یہ مقصد ہے کہ اگر تم کسی کے ساتھ کوئی برا سلوک کر بیٹھو تو اس کے ساتھ (نیکی کا) سلوک بھی کرو) کسی (مخلوق) کے آگے دست سوال دراز نہ کرنا اگرچہ تمہارا کوڑا ہی کیوں نہ گر پڑا ہو (یعنی اگر کوڑا گرے تو اس کو اٹھانے کے لئے بھی کسی سے نہ کہو) کسی کی امانت اپنے پاس نہ رکھنا اور دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرنا''۔

تشریح: **قوله: ستة ايام اعقل۔۔۔في سّر أمرك**:

''**قال لی ستة أيامٍ**'' ''یہ قول کیلئے ظرف'' ہے۔ اور قول کا مقولہ ''**اعقل يا ابا ذر**'' ہے۔

''**بعد**'' اس کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ **أی بعد هذا اليوم** اس دن کے بعد اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾ [العنكبوت: ٤٣] ''ہم یہ مثالیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں''۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ''**ستة ايامٍ**'' ''**اعقل**'' کے لئے ظرف ہے۔ اور ''**ما بقال**'' ''**أی شئ اعقل بستة ايامٍ**'' کا جواب ہے۔ پہلی ترکیب زیادہ واضح ہے۔

— طیبیؒ کہتے ہیں کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو اور اس کو کما حقہ بجا لائیں اور میری عمر کی قسم! اگر کلمہ اولی کا حق ادا ہو جائے تو یہ بھی ایک جامع کلمہ ہو میں کہتا ہوں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ولقد وصينا الّذين...... ﴾[النساء:۱۳۱]اور آپؐ کی حدیث ہے:''انّی أعلم ایةً لو آخذ الناس بها لکفتھم'' کہ یقیناً میں ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل کریں تو یہ ان کیلئے کافی ہوگی۔اور وہ آیت یہ ہے:﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق:۲] مسلسل وہ اس آیت کو پڑھتے رہے۔اور اس کا اعادہ کرتے رہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے:''أوصيك بتقوى اللّٰه فانه رأس كل شئ [أحمد فی المسند۳/۸۲]

اور ایک روایت میں ہے:''فانَّه رأس الأمر كله''۔[رواہ الطبرانی فی الکبیر]

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ''تقویٰ'' کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:﴿اتقوا اللّٰه حق تقاته﴾[آل عمران:۲۲] کہ اپنے باطن کو اس بات سے پاک کیجئے کہ وہ حق کو چھپانے میں مشغول۔اور باطن کی مکمل توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کیجئے اور یہی وہ حقیقی تقویٰ ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔

''وقوله:'' واذا اسأت فأحسن'':

اس میں اشارہ ہے کہ خواہشات انسان کی فطرت میں داخل ہیں اور اس میں ''ملکوتی'' اور بہیمی صفات ہیں۔جب ان رذائل سے کوئی سرزد ہوجاتی ہے تو اس کو ملکوتی اقتضاء کی وجہ سے مٹادیا جاتا ہے۔جیسا کہ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:''اتبع السیّئة الحسنة تمحها''[أخرجه الترمذی فی صحیحه۴/۳۱۲، الحدیث رقم ۱۹۸۷]اس میں دو معانی کا احتمال ہے:

① جب وہ کوئی گناہ اور معصیت کا کام کرے تو اس کے بعد ضرور کوئی طاعت اور توبہ کرے تاکہ وہ اس کو مٹادے۔

② جب کسی شخص کے ساتھ برائی کرے تو اس کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آئے۔اور اسی قبیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:﴿ولا تسوی الحسنة والا السیئة ادفع بالّتی هی آحسن﴾[فصلت:۳٤]

قوله:''ولا تسألن آحدًا وان سقط سوطك'':مخلوق میں سے کسی سے کوئی چیز مت مانگو۔اس میں یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر انتہا درجہ کا توکل کیا جائے اور تمام امور اسی کے حوالے کئے جائیں۔

''وان سقط سوطك'' یہ پہلے جملے کیلئے بطور تتمیم کے ہے۔اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سوال میں ذلت ہے اور ذلت و عاجزی کسی عزیز و کریم ذات کے سامنے ہی کی جاسکتی ہے۔بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ بغیر ضرورت کے حرام ہے۔کیونکہ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ سے شکایت پر مشتمل ہے۔چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ اپنی دعا میں فرماتے تھے:''

اللّٰھم کما صنت وجھی عن سجود غیرك فصن وجھی عن مسألة غیرك''

اے اللہ! جیسا کہ میں نے اپنے ماتھے کو آپ کے علاوہ کسی کے سامنے جھکانے سے بچا رکھا ہے۔اسی طرح میرے چہرہ کو آپ کے علاوہ سے مانگنے سے بچا۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے:''ان کنت لابد سائلاً فسل الصّالحین''

اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے الفراسی سے روایت کیا ہے۔

[أخرجه أبو داوٗد فی السنن۲/۲۹٦، لاحدیث رقم ۱٦٤٦، والنسائی فی ٥/۹٥، الحدیث رقم ۲٥۸۷]

قوله:''ولا تقبض امانةً'':

بغیر ضرورت کے لوگوں کی امانت اپنے پاس مت رکھو۔ کیونکہ اس میں خیانت اور تہمت کا خدشہ ہے۔ چنانچہ یہ حدیث دلالت کررہی ہے کہ اس کو اٹھانا بڑا بھاری کام ہے اور اس کی ادائیگی بڑا مشکل کام ہے اور اس لئے اللہ تعالیٰ نے مثال بیان کی ہے کہ مخلوقات پر امانت کا کتنا بوجھ تھا: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ [الاحزاب:۷۲] ''ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمینوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا''۔

قوله:''ولا تقض بین اثنین'' :

تم دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ مت کرو چہ جائیکہ دو سے زائد افراد کے درمیان کرو۔ اس میں آپ نے اس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے:''من جعل قاضیاً فقد ذبح بغیر سکین'' [أخرجه ابو دائود فی السنن ٤/٥ الحدیث رقم ٣٥٧٢] یہ حدیث عنقریب تفصیل کے ساتھ آئے گی۔

اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے خاص طور پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو قبض امانت اور خصومت میں فیصلہ کرنے سے روکا ہو۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ اس قسم کے معاملات کی اچھے انداز سے بجا آوری کے سلسلہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ضعیف و ناتواں ہیں۔ جیسا کہ فصل اوّل میں گذرا کہ جب انہوں نے ''امارت'' کا مطالبہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''یا ابا ذر انی اراك ضعیفًا لاتأمرن علی اثنین ولا تولین مال یتیم''۔ (ملاحظہ فرمایئے حدیث:۳۶۸۲)

امارت کے تین مراحل کا بیان

۳۷۱۴: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ: مَا مِنْ رَجُلٍ يَلِیْ اَمْرَ عَشَرَةٍ فَمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلَّا اَتَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مَغْلُوْلاً يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدُهٗ اِلٰی عُنُقِهٖ فَكَّهٗ بِرُّهٗ اَوْاَوْبَقَهٗ اِثْمُهٗ اَوَّلُهَا مَلَامَةٌ وَ اَوْسَطُهَا نَدَامَةٌ وَاٰخِرُهَا خِزْیٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

أخرجه احمد فی المسند ٥ / ٢٦٧

ترجمہ:''اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے دس آدمیوں کی یا اس سے زائد افراد کی سرپرستی قبول کی تو اس کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس طرح طوق میں جکڑا ہوا حاضر کرے گا (یعنی میدانِ حشر میں اٹھائے گا) کہ اس کے ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ جکڑے ہوئے ہونگے (یہاں تک کہ) یا تو اس کی نیکی اس کو نجات دلائے گی (یعنی اگر اس نے دنیا میں اپنے زیردستوں کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ اور حسن سلوک کیا ہوگا تو یہ اس کی نجات کا باعث بنے گا یا اس کا گناہ (یعنی اپنے زیردستوں پر اس کا کیا ہوا ظلم وغیرہ) اس کو ہلاکت میں (عذاب میں) مبتلا کردے گا۔ (یادرکھو) سرداری وحکمرانی کی ابتداء ملامت ہے' اس کا درمیان پشیمانی وندامت ہے' اور اس کا آخر قیامت کے دن کی ذلت ورسوائی ہوگا''۔

تشریح:قوله:مامن رجل۔۔۔۔ يده الى عنقه:

أتاه الله:اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا حکم ہے یا اس کے ملائکہ ہیں۔ایک روایت میں ''الاَّ اتی الله'' آیا ہے اور یہ الفاظ ''جامع صغیر'' کی روایت کے موافق ہیں۔

''يده الى عنقه'':علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں''يده''مغلولا کی وجہ سے مرفوع ہے حال ہے۔

''يوم القيامة'':''مغلولاً'' کے متعلق ہوگا۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ''مبتداء'' ہو اور''الى عنقه''اس کی خبر ہو اور یہ جملہ مستانفہ بھی ہوسکتا ہے اور حال ثانی بھی ہوسکتا ہے اور اس صورت میں''يوم القيامة'' یا تو''أتاه'' کیلئے ظرف ہوگا' اور یہی زیادہ واضح ہے'یا''مغلولاً'' کیلئے ظرف ہوگا اور جب یہ جملہ''مستأنفه''ہوگا تو''مغلولاً'' کا بیان ہوگا۔اور دونوں جملے مستانفہ''مجموعہ'' کیلئے بیان ہوگا۔گویا کہ ''سائل'' نے پہلے''مغلول'' کی ہیئت کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تو اس کو جواب دیا:''يده الٰى عنقه''پھر دوبارہ اس نے پوچھا۔کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ تو جواب دیا:''فكه بره أو اوبقه اثمه''اور اس معنی کے ذریعے سے''طیبیؒ'' نے فرمایا کہ اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ کسی چیز کی انتہاء اس کا اختتام ہوتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔کہ اس کے اور اس کے آخر کے درمیان کسی چیز کا خلل پڑ جائے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ "امارة" تو دنیا ہی میں ختم ہوجائے گی۔تو قیامت کے روز اس کا آخر کیسے رسوائی اور ذلت ہوگی؟لیکن میں کہتا ہوں کہ صفت امارة کو مجازاً قیامت تک مستمر اور جاری کیا گیا ہے۔

قوله:''اولها ملامةٌ......'':اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص''ولایت غالب'' کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو امور میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ دھوکہ میں پڑ جاتا ہے۔وہ صرف اس کی ظاہری لذتوں کو دیکھتا ہے تو اس کی طلب میں حرص کرتا ہے۔اور اس کو اس کے دوست واحباب ملامت کرتے ہیں۔پھر جب وہ اس کام میں لگ جاتا ہے تو اس کے متبعین اس کے پاس آجاتے ہیں۔ ابتداء میں تو وہ خوشی محسوس کرتا ہے لیکن انجام کار ندامت ہوتی ہے،اور آخرت میں رسوائی اور عذاب ہوگا۔یہ مفہوم ومعنیٰ ان حضرات کی رائے پر ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب جملہ متناسقہ کے بعد کوئی قید لائی جائے تو وہ اخیر کے ساتھ مختص ہوتا ہے اور جو یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں اس کے درمیان مشترک ہیں۔ان کے نزدیک ندامت،رسوائی اور ملامت کا تعلق روز قیامت کے ساتھ ہوگا۔پہلے قول کی تائید اس قول سے ہوتی ہے:''آتاه الله عزوجل مغلولاً يوم القيامة يده الٰى عنقه،''اس لئے کہ یہ حال ہی ذلت ورسوائی ہے۔

حاکم اللہ سے ڈرے

۳۷۱۵:وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:يَا مُعَاوِيَةُ اِنْ وَلِّيْتَ اَمْرًا فَاتَّقِ اللّٰهَ وَاعْدِلْ قَالَ:فَمَازِلْتُ اَظُنُّ اَنِّىْ مُبْتَلًى بِعَمَلٍ لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى ابْتُلِيْتُ۔

أخرجه البيهقى فى دلائل النبوة

ترجمہ:''اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا:

''اے معاویہ! اگر تمہیں کسی کام (یا کسی جگہ) کا امیر و حاکم بنایا جائے تو (امورِ حکومت کی انجام دہی میں) اللہ سے ڈرتے رہنا اور عدل و انصاف کے دامن کو تھامے رکھنا''۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں برابر یہ خیال کرتا رہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کی وجہ سے میں کسی کام (یعنی امارت و سرداری) میں مبتلا کیا جاؤں گا۔ یہاں تک کہ میں مبتلا کیا گیا (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان صحیح ثابت ہوا اور امارت و سرداری مجھے نصیب ہوئی''۔

تشریح: قوله: يامعاوية ان وليت ......:

حتى ابتليت: بصیغہ مجہول ہے۔ ''حتی'' اظن کے لئے غایت ہے یا ''فما زلت'' کے لئے غایت ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''فما'' میں ''فاء'' تسبب کیلئے ہے۔ یعنی رسول اللہؐ کے قول کے سبب مجھے یہ معلوم ہوگیا۔

اگر ''ان وليت'' کو جزم پر محمول کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے: ''ان يكن هذا من عند الله يمضه'' [اخرجه البخاری فی صحیحه ٨/٢٢٣ الحديث رقم ٣٩٥، ومسلم فی ٤/١٨٨٩ الحديث رقم ٧٩-٢٢٣٨]

گویا کہ فرشتے نے اس قضیہ کی خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی۔ اس صورت میں ''ظن'' بمعنی یقین ہوگا۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ [البقرة: ٤٦] چنانچہ حدیث میں ''حتّٰی'' کے معنی غایت کا مطلب ''علم یقین'' سے ''حق الیقین'' کی طرف انتقال ہوگا اور اگر ''ان وليت'' میں ''ان'' کو معنی تردید پر محمول کیا جائے تو ''ظن'' اپنے معنی حقیقی پر ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید آپؐ کی امت کے ہاں راجح ہی ہے۔ تو اس صورت میں ''حتی'' کا معنی غایت ظنّ سے یقین کی طرف انتقال ہوگا۔

بچوں کی امارت سے پناہ مانگنے کا بیان

۳۷۱۶: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ رَاسِ السَّبْعِيْنَ وَاِمَارَةِ الصِّبْيَانِ. (رَوَى الْاَحَادِيْثَ السِّتَّةَ اَحْمَدُ وروى البيهقي حديث معاوية في دلائل النبوة)

أخرجه احمد فی المسند ٢ / ٣٢٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ستر کی دہائی کے آغاز سے اور بچوں کی حکومت سے اللہ کی پناہ مانگو''۔ مذکورہ بالا چھ حدیثوں کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو بیہقی نے بھی دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے''۔

تشریح: قوله: ''تعوذوا بالله من رأس السبعين''

سبعین: اس سے مراد وہ فتنہ ہے جو ہجرت کے ستر (۷۰) سال بعد شروع ہوگا۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ستّر سال بعد ہوگا۔

قوله: ''وامارة الصبيان'' جاہل اور بچوں کی حکومت سے مراد یزید بن معاویہؓ کی، اور ''حکم بن مروان'' کی اولاد اور ان جیسوں کی حکومت ہے۔ علامہ طیبیؒ بیان کیا ہے کہ ''امارة الصبيان'' حال ہے۔ حال یہ ہوگا کہ بچے امیر حکومت ہوں

گے جو میری امت کے معاملات کی تدبیر کریں گے۔اور یہ قریش کے بچے ہوں گے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو خواب میں دیکھا تھا کہ وہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے منبر پر کھیل رہے ہیں۔اور اس آیت:﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْ يَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ [الاسراء:٦٠] آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خواب میں دیکھا کہ ''حکم'' کی اولاد منبر کے ساتھ یوں کھیل رہی تھی جیسا کہ بچے گیند کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

''حدیث اول'' میں طبرانی نے اس کی موافقت کی ہے۔طبرانی نے عوف بن مالک سے یوں روایت کیا ہے:

''ان شئتم أنباتكم عن الامارة وما هى اولها ملامة وثانيها ندامة، ثالثها عذاب يوم القيامة الا من عدل''

ابن عساکر نے ایک کمزور سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں تھا رسول اللہ کی خدمت اقدس میں ابو بکر، عمر عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہم بھی تھے کہ اچانک حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت معاویہؓ سے فرمایا: کیا تم علی کو پسند کرتے ہو۔تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں میں ان سے محبت کرتا ہوں۔تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارے درمیان تھوڑی دیر کے لئے ٹی سی جنگ واقع ہوگی۔تو معاویہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے عفو اور اس کی رضامندی طلب کرو۔تو انہوں نے فرمایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی قضاء وتقدیر پر راضی ہیں۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی:﴿**ولو شآء الله ما اقتتلوا ولكن الله يفعل ما يريد**﴾ (درمنثور)

جیسے مامور ہوں گے ویسے امیر ہوں گے

۳۷۱۷:وَعَنْ يَحْيٰى بْنِ هَاشِمٍ، عَنْ يُوْنُسَ ابْنِ اَبِىْ اِسْحَاقَ، عَنْ اَبِيْهِ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ۔

أخرجه البيهقى فى الشعب٦ / ٢٣' الحديث رقم : ٣٧٩٢

ترجمہ:''اور حضرت یحییٰ بن ہاشم' حضرت یونس بن اسحٰق سے اور وہ اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:''جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمہارے اوپر حکمران مسلط کئے جائیں گے''۔

راویٔ حدیث:

ابو اسحٰق سبیعی۔یہ''ابو اسحٰق عمرو بن عبداللہ سبیعی ہمدانی''وکوفی ہیں۔ان کی ولادت خلافت عثمانی کے دو سال گزرنے پر ہوئی۔ انہوں نے حضرت علی اور ابن عباس اور دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم کی زیارت کی ہے براء بن عازب اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے روایات ہیں ان سے اعمش' شعبہ اور ثوری رحمہم اللہ نے روایات لی ہیں۔یہ ایک مشہور کثیر الروایت تابعی تھے۔اور ۱۲۹ھ میں وفات ہوئی۔''سبیعی''میں سین مہملہ مفتوح باء موحدہ مکسور اور عین مہملہ ہے۔

تشریح: قوله:''**كما تكونون كذلك يؤمر عليكم**'':

طیبیؒ کہتے ہیں کہ کاف ابتداء کی بناء پر محلاً مرفوع ہے۔اور اس کی خبر''یؤمر''ہے۔اور''**كذلك**''کو شبہ کی تقریر و تاکید کے

لئے لایا گیا ہے۔ یہ حدیث: ''أعمالكم عمالكم '' بھی اسی معنی میں ہے اور اس حدیث کی مزید وضاحت ابودرداء کی آنے والی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اور ''جامع صغیر'' میں اس طرح ہے: ''كما تكونوا يولى عليكم '' اس کو ''دیلمی'' نے ''مسند فردوس'' میں ابی بکرہ سے اور بیہقی نے ابواسحاق سبیعی سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اھ۔

''كما تكونوا '' حذف نون کے ساتھ ہے۔ اور ''يولى '' اثبات یاء کے ساتھ ہے جو کہ الف بن گیا ہے اور زبانوں پر مشہور بھی یہی ہے اور علامہ زرکشی کے بھی یہی الفاظ ہیں اور فرمایا کہ اس کو ابن جمیع نے اپنی معجم میں ابوبکرہ ذکر کیا ہے اور بیہقی نے ''شعب'' میں یونس بن اسحاق کے طریق سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت منقطع ہے۔

''مختصر القاصد'' میں یہ حدیث: كما تكونون يولى عليكم أوْ يؤمر عليكم نون کے اثبات اور صیغۂ شک کے ساتھ ہے۔ دیلمی نے حدیث ابی بکرہ کو مرفوعاً نقل کیا ہے بیہقی نے ''يؤمر عليكم '' کے الفاظ نقل کئے ہیں بغیر صیغۂ شک کے اور ابوبکرہ کو حذف کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ منقطع ہے اور اس کے طریق میں ''یحیٰی بن ہاشم'' ہے جس کا شمار اہل وضع میں ہوتا ہے حذف ''نون'' کی توجیہ یہ ہے کہ ''ما'' مصدریہ ہے اس نے ''ان'' کا عمل کیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت: ﴿ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ [البقرة:۲۳۳] میں ایک قرات شاذ رفع کے ساتھ ہے۔

بادشاہ اللہ کا سایہ ہے

۳۷۱۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ السُّلْطَانَ ظِلُّ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ يَأْوِىْ اِلَيْهِ كُلُّ مَظْلُوْمٍ مِنْ عِبَادِهٖ، فَاِذَا عَدَلَ كَانَ لَهُ الْاَجْرُ وَعَلَى الرَّعِيَّةِ الشُّكْرُ وَاِذَا جَارَ كَانَ عَلَيْهِ الْاِصْرُ، وَعَلَى الرَّعِيَّةِ الصَّبْرُ۔

أخرجه البيهقي في شعب الإيمان ٦ / ١٥، الحديث رقم: ٧٣٩٩

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بادشاہ روئے زمین پر خدا کا سایہ ہے جس کے نیچے خدا کے بندوں میں سے مظلوم بندہ پناہ حاصل کرتا ہے لہٰذا جب بادشاہ عدل و انصاف کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو ثواب ملتا ہے اور رعایا پر (اس کا) شکر واجب ہوتا ہے اور جب وہ ظلم و زیادتی کرتا ہے تو وہ گنہگار ہوتا ہے اور رعایا پر اس کے ظلم کے مقابلے میں صبر لازم ہوتا ہے''۔

تشریح: قوله: ان السطان ۔۔۔ من عباده:

''انّ السّلطان ظل اللّٰه'' اور ایک روایت میں ''ظل الرحمٰن'' ہے۔

''في الأرض '' کیونکہ سلطان لوگوں سے تکلیف اور اذیت کو دفع کرتا ہے۔ جیسا کہ سایہ لوگوں کو سورج کی حرارت اور گرمی سے بچاتا ہے۔ اور بسا أوقات ''ظل'' کو حمایت اور مدد سے کنایہ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ''النہایہ'' میں ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''ظل اللّٰه'' تشبیہ ہے۔ ''يأوى اليه كل مظلوم من عباده'' وجہ تشبیہ کی وضاحت اور بیان کر رہا

ہے۔تشبیہ اس طرح ہے کہ جیسا کہ لوگ سایہ کی ٹھنڈک میں سورج کی گرمی سے بچ کر استراحت کرتے ہیں' اسی طرح لوگ سلطان کے عدل میں ظلم کی گرمی سے استراحت کرتے ہیں اور لفظ جلالہ کی طرف اضافت تشریفی ہے۔جیسا کہ "بیت اللّٰہ" اور " ناقة اللّٰہ" میں ہے۔اور یہ بتلانا تھا کہ یہ سایہ عام سایوں کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کی شان علیحدہ ہے اور اس میں مزید اختصاص ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی سرزمین میں خلیفہ بنایا ہے تاکہ بندوں میں عدل واحسان کو پھیلا دیا اور جب دنیا میں سلطان اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے کہ اس کی طرف ہر مظلوم شخص پناہ لیتا ہے تو آخرت میں وہ شخص اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ کے نیچے پناہ لے گا جبکہ اس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

قوله:فاذا عدل كان له الاجر......:

"**واذاجار**":اور ایک روایت میں "**اوجاف او ظلم**" ہے۔اور البتہ رعایہ پر صبر کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ امام عادل ایک نعمت وہدیہ ہے اور سلطان ظالم "قمت ومحنت" اور مصیبت وتکلیف ہے۔**وفی ذلکم بلاءٌ من ربکم عظیم وان فی ذلك لأیات لكل صبار شكور**۔یعنی ہر مؤمن کیلئے اس میں نشانیاں ہیں۔کیونکہ حدیث میں ہے: "**الایمان نصفان! نصف صبر ونصف شکر**" اللہ تعالیٰ ہمیں ان دونوں چیزوں کی توفیق عطاء فرمائے۔آمین

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی معترض یہ کہے کہ اضافت اور "**یأوی الیه کل مظلوم**" اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ سلطان عادل ہوتا ہے تو یہ بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے کہ یہ "**واذا جار کان علیه الامر**"؟

میں کہتا ہوں "**السلطان ظل اللّٰہ**" سے اس کی شان کا بیان ہے۔اور اس بات کا بیان ہے کہ اس کو عادل ہونا چاہئے۔ اب جب اس نے ظلم کیا۔تو گویا کہ وہ اپنی شان سے نکل گیا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا سایہ قرار دیا جائے۔اور اس پر یہ آیت دلیل ہے۔﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی......﴾[ص:٢٦] "اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی جو لوگ خدا کے راستے سے بھٹکتے ہیں انکے لئے سخت عذاب (تیار) ہے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا" تو اس پر حکم وصف مناسب کے ساتھ مرتب فرمایا اور نا مناسب سے منع کر دیا۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہراً سلطان ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہوتا ہے۔کیونکہ "فی الجملہ" اس سے انتفاع کیا جاتا ہے اور یہ "تقسیم" وصف اغلب کے اعتبار سے ہے۔یا احکام کلیہ کے قضیہ جزئیہ کے خصوص کی وجہ سے۔تو لہٰذا اس عظیم حکمت کے تقاضے کے مطابق رعایا پر صبر اور شکر کرنا واجب ہے۔اور اس کی تائید ایک سابق حدیث سے بھی ہوتی ہے:"**سیلیکم أمراء یفسدون فی الأرض وما یصلح اللّٰہ بهم اکثر فمن عمل منهم بطاعة اللّٰہ فلهم الوزر وعلیکم الصبر**"۔

پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ جب سلطان ظلم کرتا ہے۔تو وہ "ظل شیطان" بن جاتا ہے۔لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتا ہے۔پس اور رضاء بالقضاء اللہ کا عظیم ترین دروازہ ہے۔اور اس توجیہہ کی تائید ابوالشیخ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:"**السلطان العادل المتواضع ظل اللّٰہ وروحه فی الأرض یرفع له عمل سبعین صدیقاً**"۔

بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے: ''السلطان ظل الله فی الأرض فمن غشه ضل ومن نصحه اهتدی'' ابوالشیخ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے:

''السلطان ظل الله فی الأرض فاذا دخل احدکم بلدًا لیس له سلطان فلا یقمین به''

اور ابن النجاریؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ''السلطان ظل الله فی الأرض یأوی الیه الضعیف وبه ینتصر المظلوم ومن اکرم سلطان الله فی الدنیا اکرمه الله یوم القیامه''۔

۳۷۱۹: وَعَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَفْضَلَ عِبَادِ اللّٰهِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِمَامٌ عَادِلٌ رَفِيْقٌ، وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِمَامٌ جَائِرٌ خَرِقٌ۔

أخرجه البيهقي في شعب الإيمان ٦ / ١٦' الحديث رقم: ٧٣٧١٠

ترجمہ: ''اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بندوں میں بلند مرتبہ کے اعتبار سے سب سے بہتر جو شخص ہوگا وہ انصاف اور نرمی کرنے والا حاکم ہے اور قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بندوں میں مرتبہ کے اعتبار سے سب سے بدتر جو شخص ہوگا وہ ظالم اور سختی کرنے والا حاکم ہے''۔

تشریح: قوله: ان افضل عباد الله ......:

''امام عادل رفیقٌ'' یعنی اقارب اور اجانب کے ساتھ نرم رویہ رکھنے والا ہو اور شریف وضعیف کے ساتھ نرم خو ہو۔

''امام جائرٌ'' یعنی ظالم ہو۔

''خرق'' ''خاء کے فتحہ'' اور ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ''خرق'' سے صفت مشبہ ہے یہ ''رفق'' کی ضد ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے۔

''الرفق یمن والخرق شؤم واذا أراد الله بأهل بیتٍ خیرًا ادخل علیهم باب الرفق، فانّ الرفق لم یکن فی شیٔ قط الا زانة وان الخرق لم یکن فی شیٔ قط الاّ شأنه''

نرمی (نرم خوئی) قابل برکت ہے اور سختی (بدخوئی) نحوست ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی اہل بیت کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ ان پر رفق اور نرمی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس لیے کہ کبھی بھی کسی چیز میں نرمی نہیں رہی ہے مگر وہ اس کو بلند کر دیتی ہے اور کسی چیز میں سختی نہیں ہوتی مگر وہ اس کو پست اور بدصورت کر دیتی ہے۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''عادل'' کے ساتھ ''رفیق'' کی قید لگائی ہے۔ تاکہ ''عادل'' کی تکمیل ہو جائے۔ اس لئے کہ جب آپ علیہ السلام نے سلطان کی صفت عادل بنائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مجرد عدل کی صفت کافی نہیں ہے۔ کیونکہ بسا اوقات عادل شخص بھی بد اخلاق اور سخت دل ہوتا ہے تو اس کو ''رفیق'' کے ساتھ مکمل کر دیا۔ اور ''جائرٌ'' کے

ساتھ ''خرق'' کا لفظ لگایا کیونکہ یہ اس کے لئے باب تتمیم میں سے ہے۔کیونکہ صفت ثانی نے اوّل کے مبالغہ میں مزید اضافہ کر دیا۔کیونکہ سخت دلی اور بدخوئی اس کے ظلم میں مزید زیادتی کر دیتی ہے۔

۳۷۲۰:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ نَظَرَ اِلٰى اَخِيْهِ نَظْرَةً يُخِيْفُهُ اَخَافَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (روى الاحاديث اربعة البيهقى فى شعب الايمان وقال فى حديث يحى: هذا منقطع وروايته ضعيف)

أخرجه البيهقي في شعب الإيمان ٦ / ٥٠، الحديث رقم: ٧٤٦٨

ترجمه:''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی کی طرف ڈراؤنی نظر سے دیکھا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ڈرائے گا''۔ مذکورہ چاروں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور یحییٰ بن ہاشم کی روایت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ منقطع ہے اور یحییٰ کی روایت ضعیف (سمجھی جاتی) ہے''۔

تشریح: **قوله:من نظر الى اخيه ......**:

اس میں دوصورتیں جائز ہیں۔ ① یہ ''نَظَرَ'' کے فاعل سے حال ہو۔ ② یہ مصدر کیلئے صفت ہو۔''ای بها'' اس طور پر کہ اس کا راجع محذوف ہوگا اور اس ترکیب کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے۔جس میں آتا ہے۔''**يخفيه بها فى غير حقٍّ**'' تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو غضبناک نظر سے دیکھے گا تا کہ اس کو پورا پورا بدلہ دے دے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''اخیه'' کو اس لئے ذکر کیا تا کہ نرمی اور استعطاف ہو جائے۔یعنی اخوۃ اور بھائی چارگی امنیۃ کا تقاضا کرتی ہے خاص کر اسلامی بھائی چارہ۔اور حقیقی مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو اس باب میں لانے سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ مجرد اخافة پر روز قیامت عقوبت اور سزا ہوگی تو اگر اس سے بڑھ کر ظلم ہو تو اس پر کیونکر عقوبت اور سزا نہیں ہوگی اور اس کے مفہوم سے یہ بات بھی اخذ کی جاتی ہے کہ جس کسی نے اپنے بھائی کی طرف رحمت وشفقت کی نظر سے دیکھا تو روزِ قیامت اللہ تعالیٰ بھی اس کو عنایت ورحمت کی نظر سے دیکھے گا۔جیسا کہ ''حکیم'' نے ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے:''**مَنْ نَظَرَ اِلٰى اَخِيْهِ نَظْرَةً وُدًّ غفر الله له**''۔

قوله:وقال فى حديث يحى ......:''حدیثِ یحییٰ'' کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے۔یعنی اس حدیث میں علت انقطاع ہے۔لیکن یہاں پر اس سے مراد ارسال ہے۔کیونکہ راوی نے صحابی کو حذف کیا ہے۔اور صحابی حضرت ابوبکرہؓ ہیں یہ کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ جمہور کے ہاں مرسل حدیث حجت ہے۔البتہ اس کو اس کا قول''**وروايته ضعيفٌ**'' نقصان دیتا ہے اور حدیث کو کمزور کر دیتا ہے۔ بلکہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ''یحییٰ'' کی روایت ''موضوع'' ہے۔ اور یہاں پر لفظ ''ضعیف'' ذکر کیا ہے۔کیونکہ وزن مفعیل اس تذکیر وتانیث میں برابر ہیں۔

میرکؒ نے اس کے اصل حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''**وروايةٌ ضعيف ووضع عليه رمز ظاهر**'' حالانکہ یہ غیر ظاہر ہے۔

کیونکہ حدیث میں طعن یحیٰی کی جہت اور طریق سے آیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔

۳۷۲۱: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی يَقُوْلُ: اَنَا اللّٰهُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا مَالِكُ الْمُلُوْكِ وَمَلِكُ الْمُلُوْكِ قُلُوْبُ الْمُلُوْكِ فِیْ يَدِیْ، وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا اَطَاعُوْنِیْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَ مُلُوْكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالرَّحْمَةِ وَالرَّأْفَةِ، وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا عَصَوْنِیْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَهُمْ بِالسَّخْطَةِ وَالنِّقْمَةِ فَسَامُوْهُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ، فَلَا تَشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالدُّعَاءِ عَلَى الْمُلُوْكِ، وَلٰكِنَّ اشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ كَیْ اَكْفِيَكُمْ مُلُوْكَكُمْ۔

أبو نعيم فى الحلية ٢ / ٣٨٩

ترجمہ: "اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ (حدیث قدسی) میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں بادشاہوں کا مالک اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ (یعنی میرے قبضہ قدرت) میں ہیں لہٰذا جب میرے (اکثر) بندے میری اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں تو میں ان کے حق میں (ظالم) بادشاہوں کے دلوں کو (رحمت وشفقت کی طرف) پھیر دیتا ہوں اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حق میں (عادل ونرم خو) بادشاہوں کے دلوں کو (غضبناکی اور سخت گیری) کی طرف پھیر دیتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ (بادشاہ) ان کو سخت سزاؤں میں مبتلا کرتے ہیں، اس لئے (ایسی صورت میں) تم اپنے آپ کو ان بادشاہوں کے لئے بددعا کرنے میں مشغول نہ کرو بلکہ میری بارگاہ میں تضرع کر کے اپنے آپ کو (میرے) ذکر میں مشغول رکھو تاکہ میں تمہیں ان بادشاہوں کے شر سے محفوظ رکھوں"۔ اس روایت کو ابونعیم نے اپنی کتاب حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: قوله: ان الله تعالىٰ يقول ـــــ وملك الملوك:

"انا اللّٰه": علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ "ابوالنجم" کے اسلوب پر ہے۔ "اى أنا المعروف المشهور بالوحدانية أو المعبود" یعنی میں وہ ذات ہوں کہ جو وحدانیت اور اور عبادت کے مستحق ہونے کے وصف کے ساتھ معروف ومشہور ہوں۔

"لا اله الاّ أنا" یہ "مضمون جملہ" کیلئے حال مؤکدہ ہے۔

"مالك الملوك وملك الملوك": یہ افادہ تعمیم کیلئے ہے۔ یا صفت ثانی باب تکمیل وتمیم سے ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "ملك الملوك" کو "مالك الملوك" کے بعد ذکر کرنا بابِ ترقی سے ہے۔ کیونکہ "ملك" مالک سے بڑا اور عظیم ہوتا ہے۔ اور اس سے تصرف میں اقویٰ ہوتا ہے۔ کیونکہ مالک أعیان مملوکۃ میں متصرف ہوتا ہے۔ جبکہ "ملک" امر ونہی کے ذریعے مأمورین میں متصرف ہوتا ہے۔ اور بعض علماء کا قول ہے کہ "مالك" کا مفہوم زیادہ وسیع ہے۔ االلہ تعالیٰ) "مالك الطير والدواب والوحوش ومالك كل شئ" کہا جاتا ہے۔

جبکہ "ملك" صرف "ملك النّاس" میں مستعمل ہوتا ہے۔ البتہ اس میں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ یہ فرق ان دونوں کے حد ذاتی میں ہے۔ جیسا کہ "مالك يوم الدين" میں باعتبار قرآت اس کے حد ذاتی میں ہے۔ ورنہ اس میں کوئی عاقل شک

نہیں کرسکتا کہ ''مالك الملوك'' میں مبالغہ بنسبت ''ملك الملوك'' کے زیادہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ دوسرے کا اطلاق مخلوق پر بھی کیا جاتا ہے۔ جبکہ ''اول'' کا اطلاق صرف اللہ تعالیٰ پر ہی صحیح ہے۔ حاصل معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ جنس الملوک کے مالک ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ مالکوں کی طرح تصرف کرتے ہیں اور یہ دراصل اس آیت کریمہ سے ''اقتباس'' ہے: ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾[آل عمران:٢٦]

قوله: ''قلوب الملوك في يدي''

یہ جملہ مستأنفہ ہے لیکن علی سبیل البیان ہے تاکہ تصرف تام پر دلالت کرے۔

قوله: وان العباد اذا أطاعوني ......: ''وانَّ العباد'' اس میں ''واؤ'' فاء بمنزلہ تفصیلیہ کی منزلت پر ہے۔ اور ایک روایت میں ''فان العباد'' ہے۔

جب بندوں میں اکثر بندے میری اطاعت کرنے لگتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کے ظلم کو رحمت اور شفقت میں بدل دیتا ہوں۔

''النہایہ'' میں ہے ''رافة'' میں رحمت سے زیادہ ''رقت'' ہوتی ہے۔ اس کا استعمال کراہت وناپسندیدگی کے مواقع پر نہیں ہوتا۔ جبکہ مصلحت کے پیش نظر کراہت کے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس جملہ میں ''عليهم'' کو حذف کر کے شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب وہ اس پر صبر کریں گے تو ان کو ان کی ناراضگی اور تکلیف کوئی نقصان نہیں دے سکے گی۔

''**باسخطة**'' کراہت اور عدم رضاء کو کہتے ہیں۔

''**والنقمة**'' بکسر النون۔ کراہت وعقوبت کو کہتے ہیں۔

''صحاح'' میں ہے کہ ''نقمته اذا كرهته'' جب میں نے اس کو ناپسند کیا تو اس کا انتقام لے لیا۔ ''وانتقم اللّٰه منه'' اس وقت بولتے ہیں جب وہ سزا دے اور اس سے اسم ''النقمه'' آتا ہے۔ اسی معنی میں قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ میں پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے: ﴿ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ﴾[البروج:٨]

''**فساموهم**'': میم کے ضمہ کے ساتھ ہے ''سوم'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں تکلیف۔ مطلب یہ ہے کہ سخت قسم کا عذاب چکھا دیتے ہیں۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: [**يسومونكم سوء العذاب**]

''**فلا تشغلوا**'' جوہریؒ فرماتے ہیں کہ ''شغلت فلانًا فانا شاغلٌ'' میں نے فلاں کو مشغول کر دیا میں مشغول کرنے والا ہوا۔ اور ''أشغلته'' کہنا ردی لغت ہے اور ''القاموس'' میں ہے کہ ''شغله'' بروزن ''منعه'' ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ ''أشغله'' جید لغت ہے یا لغت قلیلہ ہے یا ردی لغت ہے ای: ''لا تستعملوا'' یعنی اپنے آپ کو ظالم بادشاہ کے خلاف بدعاء میں مصروف رکھو یعنی کہ تم ان کے موت یا ان کے معزول ہونے کی بددعا مت کرو۔ کیونکہ بعض مرتبہ بعد والا حکمران سابق حکمران سے زیادہ منحوس ہوتا ہے البتہ اپنے آپ کو میرے ذکر میں مشغول رکھو اور میرے علاوہ کو بھول جاؤ۔

''**والتضرع**'': یعنی میری طرف تضرع اور عاجزی کرو۔ اور مجھ پر توکل کرو تاکہ میں تمہاری طرف سے تمہارے

بادشاہوں کے "شر" کو کافی ہو جاؤں۔ اس لیے کہ جو اللہ کی طرف عاجزی کرتا ہے وہ اس کو نجات دیتا ہے اور جس نے اس پر توکل کیا اللہ تعالیٰ اس کے دینی اور دُنیاوی امور کو کافی ہو جائے گا۔

بَابُ مَا عَلَى الْوُلَاةِ مِنَ التَّيْسِيْرِ

حاکموں پر آسانی ونرمی کے واجب ہونے کا بیان

"الولاۃ" واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے "الوالی" کی جمع ہے اور اس سے مراد خلیفہ وحکمران ہے۔ "من" بیانیہ ہے اور مابعد "ما" کا بیان ہے اور "علی" وجوب کیلئے ہے۔ یعنی یہ باب ان امور کے بارے میں ہے جو حکام اور سلاطین پر لازم ہیں کہ رعایا کے فیصلوں اور معاملات میں وہ ان پر آسانیاں کریں۔

الفصل الاول:

امیر کیسا رویہ اپنائے

۳۷۲۲: عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا بَعَثَ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِهٖ فِیْ بَعْضِ اَمْرِهٖ قَالَ: بَشِّرُوْهُ، وَلَا تُنَفِّرُوْا وَيَسِّرُوْا، وَلَا تُعَسِّرُوْا. (متفق علیه)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۳ / ۱۳۵۸، الحديث رقم: (٦ /۱۷۳۲) وأبو داود فی السنن ٥ / ١٧٠، الحديث رقم: ٤٨٣٥، وأحمد فی المسند ٤ / ٣٩٩، وأخرجه البخاری عن أنس فی صحيحه ١ / ١٦٣، الحديث رقم: ٦٩، بنحوه

ترجمہ: "حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے کسی صحابیؓ کو اپنے کسی کام پر مامور کر کے (یعنی کسی جگہ کا حاکم بنا کر) بھیجتے تو ان کو یہ ہدایت فرماتے کہ لوگوں کو (طاعات وعبادات اور نیک کام کرنے پر اجر وثواب کی) بشارت دیتے رہنا اور ان کو (ان کے گناہوں پر) خدا کے عذاب سے (اتنا زیادہ) مت ڈرانا (کہ وہ رحمت خداوندی سے مایوس ہو جائیں) نیز (لوگوں کے ساتھ) آسانی کا برتاؤ کرنا (یعنی ان سے زکوٰۃ وغیرہ کی وصولی میں نرمی وآسانی کا طریقہ اختیار کرنا) اور (لوگوں سے زکوٰۃ وغیرہ کا مال واجب مقدار سے زیادہ وصول کر کے) ان کو دشواری وتنگی میں مبتلا نہ کرنا"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: بشروا ولا تنفروا:

"بشروا" اس میں دو احتمال ہیں:

① یہ خطاب ان مبعوث ہوئے صحابی اور ان کے اتباع کو تھا۔

② اس میں تعمیم ہے۔ یعنی خطاب میں کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ عام ہے یا ان کو خوشخبری دو کہ مختلف فتح ہوں تو تم کو ان سے

غنیمت کا مال ملے گا اور ان کو تنفر مت کرو۔ بایں طور کہ تم ان پر ظلم کر دیا ان کے ساتھ بدسلوکی اور سختی کے ساتھ پیش آؤ اور اس تشریح کی روشنی میں دونوں جملوں کے درمیان مطابقت بالکل واضح ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ "مقابلہ معنویہ" کے باب سے ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت یوں کہنا چاہیے تھا: "**بشروا ولا تنذروا واستأنسوا ولا تنفروا**" خوشخبری دو، ڈراؤ مت۔ ان کو مانوس کرو۔ تنفر مت کرو۔

ان دونوں کو جمع کر دیا تا کہ یہ بشارت اور انداز کو عام ہو جائے۔ اور استناس اور تنفیر کو عام ہو جائے۔ یہ محل نظر ہے کیونکہ "انذار" بھی اس آیت کریمہ کی وجہ سے مطلوب ہے: ﴿وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ﴾[الأنعام: ٥١] اور اس آیت کریمہ کی وجہ سے: ﴿وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ﴾[التوبة: ١٢٢] انذار اس لیے بھی ضروری ہے کہ امور سیاست وحکومت مجرد بشارت کے ساتھ سرانجام نہیں پا سکتے۔

تخریج: اس حدیث کو امام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

امیر عوام کو تسلی دے

٣٧٢٣: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَسَكِّنُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠ / ٥٢٤، الحديث رقم: ٦١٢٥، و مسلم في ٣ / ١٣٥٩، الحديث رقم: (٨ - ١٧٣٤) وأحمد في المسند ٣ / ١٣١

ترجمہ: "اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حاکموں اور عاملوں کے لئے) فرمایا "(لوگوں کے ساتھ) آسانی کا برتاؤ کرو (ان کو مشکلات اور سختیوں میں مبتلا نہ کرو) اور ان کو (خدا کی نعمتوں کی بشارت کے ذریعہ) تسکین و تسلی دو اور ان کو (خدا کے عذاب سے بہت زیادہ ڈرانے کے ذریعہ یا ان پر ایسے دشوار اور سخت بار ڈال کر کہ جو ان کو خدا کی نافرمانی پر مجبور کر دے) نفرت وخوف میں مبتلا نہ کرو"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: "**يسروا ولا تعسروا وسكنوا ولا تنفروا**"۔

"سکنوا": کاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔ تسکین مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔ "الجامع" کی روایت میں: "**وبشروا**" ہے۔

"**ولا تنفروا**" "صاحب النہایہ" لکھتے ہیں "**اي لا تكلفوهم بما يحملهم على النفور**" ان کو ایسی چیزوں کا مکلف نہ بناؤ جو ان کو نفرت پر ابھاریں۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

امراء آپس میں اختلاف نہ کریں

۳۷۲۴: وَعَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَدَّهُ اَبَا مُوْسٰى وَمُعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ، فَقَالَ: يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا، وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ١٠ / ٥٢٤، الحديث رقم: ٦١٢٤، و مسلم فی ٣ / ١٣٥٨، الحديث رقم: ١٧٣٣، وأحمد فی المسند ٤ / ٤١٢

ترجمہ: ''اور حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے دادا یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا اور ان سے فرمایا کہ آسانی کا برتاؤ کرو، مشکلات اور سختیوں میں مبتلا نہ کرو، بشارت دیتے رہو، خوف و مایوسی میں مبتلا نہ کرو، آپس میں اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرو اور آپس میں اختلاف نہ کرو''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: وعن أبي بردة ---- ابى اليمن:

''وعن ابی بردة'': اس کی بجائے ''ابن ابی بردة'' ہونا چاہئے تھا۔

معاذ سے مراد ''معاذ بن جبل ؓ'' ہیں۔ مصنف ؒ کے اسلوب کا ظاہری کا تقاضا یہ ہے کہ ''ابوموسیٰ'' ''ابو بردۃ'' کے دادا ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ ان کے والد ہیں۔ پس صحیح یہ تھا کہ ''عن عبدالله بن ابی بردة عن ابيه'' فرماتے۔ کہ نبی علیہ السلام نے ان کے دادا ابوموسیٰ کو بھیجا۔ اور ''جده'' کی ضمیر ''عبداللہ'' کی طرف راجع ہے۔ اسی طرح بخاری نے مسلم بن ابراہیم کے طریق سے روایت کیا ہے۔ اور ایک نسخہ میں ہے: ''عن ابن ابی بردة'' اس نسخہ پر کوئی اشکال ہی وارد نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے ذکر کیا ہے۔ کہ صحیح ''ابن ابی بردۃ'' ہے۔ جیسا کہ بخاریؒ نے روایت کیا ہے:

قال سعيد بن ابی بردة: سمعت أبي ـ قال: ''بعث البنی ابی ومعاذًا الی اليمن''

بعض علمائے کرام نے ''جامع الاصول'' سے نقل کیا ہے: بلال ابن أبي بردة بن أبي موسى الاشعری کان علی البصر ۃ کے حاکم تھے۔ اپنے والد وغیرہ سے حدیث سنی ہے اور ان سے حضرت قتادہ نے نقل کیا ہے۔ اور یہ قلیل الحدیث رواۃ میں سے ہیں۔

اور ظاہر یہ ہے کہ حضرت ابو بردۃ کے متعدد صاحبزادے تھے اور ان میں سے ہر ایک نے ''عن ابيه عن جده'' روایت کی ہے اور چونکہ ان میں سے ہر ایک ''ثقة'' راوی ہے اس لئے کسی روایت میں مطلق ''ابن'' آیا ہے تو اس ابن کے نام کی جہالت نقصان دہ نہیں ہے۔

قوله: يسرا ولا تعسر ......: ''وتطاوعا'' یعنی حکم میں دونوں متفق رہو اور کسی معاملہ میں دونوں اختلاف مت کرو اور یہ بات بظاہر اس پر دلالت کر رہی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے حکم کے ماتحت تھے۔ علامہ طیبیؒ (اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے) کہتے ہیں کہ دونوں اپنے احکام میں متفق رہو اور باہم اختلاف مت کرو۔ کیونکہ تم دونوں کا اختلاف کرنا تمہارے اتباع کے اختلاف کا باعث بنے گا جس کی وجہ سے ان میں دشمنی اور لڑائی شروع ہو جائے گی۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ تینوں احادیث عدم حرج اور عدم تنگی کے معنی کی تائید کر رہی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ماجعل عليكم فى الدّين من حرج﴾ [الحج: ۷۸]

''من حرج''مفعول اوّل ہے۔ اور''فی الدین''مفعول ثانی ہے۔ اور''من کی زیادتی استغراق کیلئے ہے۔

''علیکم''''ماقبل'' کے متعلق ہے اس کو بوجہ اختصاص مقدم کیا گیا ہے۔ گویا کہ یوں کہا گیا ہے:''وسع الله عليكم دينكم يا امة محمد بنى الرحمة خاصة''اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ سلف صالحین اوّلین کے فعل کو متکلفین کی رائے پر ترجیح ہے۔

شیخ محی الدین النووی نے''الروضة''میں''الشرح الکبیر'' سے نقل کیا ہے کہ کسی مجتہد کیلئے یہ شرط نہیں ہے کہ اس کا مذہب مدوّن ہو۔ اور اب جب مذاہب کی تدوین ہوگئی ہے تو کیا کسی مقلد کیلئے دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونا جائز ہے یا نہیں؟

اگر ہم یہ کہیں کہ''اعلم'' کی طلب میں اس پر اجتہاد لازم ہے۔ اور اس کو ظن غالب ہے کہ مذہب ثانی''اعلم'' ہے تو منتقلی مذہب جائز ہونی چاہیے بلکہ واجب ہے۔ اور اگر ہم اس کو تخییر دیں تو اس صورت میں بھی جائز ہونا چاہیے۔ جیسا کہ کسی نے قبلہ کے بارے میں کچھ دنوں تک اس کی تقلید کی اور پھر کچھ دنوں بعد دوسرے کی۔ اگر اس نے کچھ مسائل میں کسی ایک کی تقلید کی اور کچھ مسائل میں کسی دوسرے کی تقلید کی اور ان کے نزدیک دونوں مجتہد برابر ہوں تو ہم اس کو اس بات کا اختیار دیتے ہیں لیکن اصولیین نے اس بات سے منع کیا ہے۔ علامہ حناطی نے ابواسحاق سے اس بارے میں نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہر مذہب میں سے اہون اور آسان چیز کو اختیار کرے گا تو وہ فاسق کہلائے گا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ فاسق نہیں ہوگا اور اس ترجیح کو امام مالکؒ کے قول کی تائید حاصل ہے

تائید بایں طور حاصل ہے کہ جب رشید نے مدینہ سے عراق جانے کا ارادہ کیا تو امام مالکؒ سے کہا کہ آپ کو چاہیے کہ میرے ساتھ چلئے۔ اس لئے کہ میں نے عزم کیا ہے کہ میں لوگوں کو''موطا'' پر جمع کروں۔ جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو قرآن مجید پر جمع کیا۔ امام مالکؒ نے کہا کہ لوگوں کو موطا پر جمع کرنے کیلئے آپ کے پاس کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مختلف بلاد و امصار میں پھیل چکے ہیں اور احادیثیں بیان کی ہیں چنانچہ ہر شہر والوں کے پاس علم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:''اختلاف امتی رحمة''۔

عہد شکنی کی مذمت

۳۷۲۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْغَادِرَ يُنْصَبُ لَهُ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ: هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ. (متفق علیه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ١٠ / ٥٦٣' الحديث رقم: ٦١٧٨' و مسلم فى ٣ / ١٣٦٠' الحديث رقم: (١٠ ـ ١٧٣٥) وأبو داود فى السنن ٣ / ١٨٨' الحديث رقم: ٢٧٥٦' والترمذى فى ٤ / ١٢٢' الحديث رقم: ١٥٨١' وابن ماجه فى ٢ / ٩٥٩' الحديث رقم: ٢٨٧٢' والدارمى فى ٢ / ٣٢٣' الحديث رقم: ٢٥٤٢'

وأحمد فی المسند ۱ / ۴۱۱

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن عہد شکنی (کرنے والے کے لئے یعنی اس کی فضیحت و رسوائی کے لئے) ایک نشان کھڑا کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی کی نشانی ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قولہ: ان الغادر ينصب له لواء ....:**

''**القادر**'' کا مطلب ہے: **ناقض العهد والوفاء**۔ قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ ''غدر'' اصل میں ترک الوفاء کو کہتے ہیں اور یہ عام ہے خواہ کوئی شخص اپنے عہد کو توڑے یا اپنی امان کو توڑے۔

"**ينصب له لواء**'' اس عہد شکنی کو رسوا کرنے کیلئے اس کیلئے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا۔ جو اس کے دھوکہ کے مطابق ہوگا۔ "**فيقال هذه**'' اور ایک روایت میں ''**الا**'' حرف تنبیہ کی زیادتی بھی ہے۔ اس میں اسم اشارہ کو مؤنث لایا گیا ہے کیونکہ ''لواء'' ''رایۃ'' کے معنی میں ہے ''خبر'' کی رعایت رکھی گئی ہے۔

''**وهی ''غدرة فلان بن فلان''**

تخریج: اس حدیث کو امام مالک' ابوداؤد اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اس کی علامت ہے، یا یہ اس کا نتیجہ ہے، یا یہ اس کا انجام ہے، اس لیے کہ یہ سر عام صریح فضیحت اور رسوائی ہے۔

عہد شکن کی آخرت میں رسوائی

۳۷۲۶ : وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُعْرَفُ بِهِ۔

(متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٢٥٣' الحديث رقم : ٣١٨٦' و مسلم فی ٣ / ١٣٦١' الحديث رقم : (١٤ - ١٣٧٣٧) وأحمد فی المسند ٣ / ٢٧٠)

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لئے ایک جھنڈا (مقرر) ہوگا جس کے ذریعہ وہ پہچانا جائے گا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قولہ: لكل غادر لواء يوم القيامة:**

اور ایک نسخہ میں ہے: ''**ان لكل غادرٍ لواء يوم القيامة**''۔

احمد و مسلم نے ابن مسعود سے، مسلم نے ابن عمرؓ سے اور احمد و ابوداؤد طیالسیؒ نے حضرت انسؓ سے اس طرح نقل کیا ہے: ''**ان لكل غادر لواء يوم القيامة يعرف به عند استه**''۔

امراء کی عہد شکن بدترین عہد شکن ہے

۳۷۲۷: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ عِنْدَ اِسْتِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُرْفَعُ لَهٗ بِقَدْرِ غَدْرِهٖ اَلَا وَلَا غَادِرَ اَعْظَمُ غَدْرًا مِنْ اَمِیْرِ عَامَّةٍ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۳۶۱ الحدیث رقم: (۱۵ ۔ ۱۷۳۸)

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن ہر عہد شکن (کی رسوائی وفضیحت کی تشہیر) کے لئے اس کے مقعد کے قریب ایک علامت ہوگی اور ایک روایت میں یوں ہے کہ ''قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لئے ایک جھنڈا ہوگا جو اس کی عہد شکنی کے بقدر بلند کیا جائے گا (یعنی اس کی جتنی زیادہ عہد شکنی ہوگی اسی قدر وہ جھنڈا بلند کیا جائے گا اور اس کی تشہیر زیادہ ہوگی) خبردار! کوئی عہد شکن، عہد شکنی کے اعتبار سے امامِ عام (یعنی حکمران وقت) سے بڑا نہیں (یعنی حکمران کی عہد شکنی سب سے بڑی عہد شکنی ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: لکل غادر لواء عند استه یوم القیامة:

است: ہمزہ وصل اور سکون سین کے ساتھ ہے۔ اور اس سے مراد ''پیٹھ پیچھے'' ہے۔ اور ''أست'' دبر کو کہتے ہیں۔

یہ جھنڈا اس لئے بلند کیا جائے گا تا کہ اس کو ''علی رؤس الأشهاد'' ذلیل اور رسوا کیا جائے۔ ''عند استه'' الفاظ میں استخفاف اور اس کے اس کام کی اہانت مقصود ہے۔ اور یا اس لئے کہ عزت کا جھنڈا چہرے کے سامنے گاڑا جاتا ہے۔ اس کی مناسبت سے ذلت کا جھنڈا اس کے بالمقابل گاڑنا ہے۔

''شرح مسلم'' میں ہے کہ ''لواء'' اس بڑے جھنڈے کو کہتے ہیں، کہ جس کو صرف ''جیش الحرب'' اور ''صاحب دعوۃ الجیش'' اٹھاتا ہے اور لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ وہ جھنڈا ہوتا ہے جو جنگ میں صاحب الجیش کی پہچان ہوتی ہے۔

علامہ عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ ''رایة'' بمعنی ''لواء'' ہے۔ یہ وہ جھنڈا ہے جو جنگ میں صاحب الجیش کی پہچان ہو، اور بسا اوقات اس کو ''امیر الجیش'' پکڑتا ہے اور بسا اوقات ''مقدم العسکر'' کے پاس ہوتا ہے۔ اہل لغت کی ایک بڑی جماعت نے ان دونوں کے مترادف ہونے کی تصریح کی ہے۔

قوله: ''لکل غادر لواء یوم القیامة یرفع له بقدر غدره'':

یعنی طولاً وعرضاً اس کے غدر کے کم وکیف کے مطابق ہوگا۔

''الا'' تنبیہ کیلئے ہے۔

قوله: ''ولا غادر اعظم غدرًا من امیر عامةٍ'':

یہاں مضاف محذوف ہے۔ أی من غدر امیر عامة۔

''امیر عامه'' سے مراد امور کا والی ہے۔ یعنی وہ امیر جو بغیر کسی استحقاق کے صرف عوام کے آگے کرنے سے بر سر مصب آیا ہوا اور اہل حل وعقد کی طرف سے کوئی مشورہ نہ لیا گیا ہوا امام کو سب سے عہد شکن اس لیے کہا گیا ہے کہ اس نے عہد مشروع کو توڑا ہے۔ اس لئے کہ ولایت کی تعیین کو خواص کی رائے سے ہوتی ہے شخص متولی ہو جاتا ہے۔ اور مستحق ولایت سے اس کو روک لیا ہے۔ تو اس کے ساتھ اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کو توڑا۔ اور عام مسلمانوں کے عہد کو بھی توڑا کیونکہ اس نے ان کے امام کے خلاف خروج کیا ہے اور ان کے جان و مال پر غلبہ حاصل کیا ہے۔

امام نووی کہتے ہیں کہ اس میں غدر خصوصاً امیر عامہ کے غدر کی حرمت کی تغلیظ کا بیان ہے۔ کیونکہ اس کے غدر کا ضرر خلق کثیر کو پہنچا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ حدیث غادر کی مذمت کے بارے میں وارد ہے کہ رعایا نے اس کو جو امانت سونپی تھی اور اس امیر نے اس امانت پر محافظت کے التزام کا اقرار کیا تھا۔ پس جب اس نے ان کے ساتھ خیانت کی اور ان پر شفقت و رحمت کو ترک کر دیا' تو اس نے اپنے عہد کے ساتھ غداری کی اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد رعایا کو امام کے ساتھ غدر کی ممانعت ہو' تا کہ رعایا کے درمیان باہم اتحاد و اتفاق رہے اور ایسی صورتحال پیش نہ آئے کہ جس کی وجہ سے کوئی فتنہ فساد برپا ہو۔ اور پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

الفصل الثانی:

امیر اور رعایا کے درمیان حجاب کا بیان

۳۷۲۸: عَنْ عَمْرِوبْنِ مُرَّةَ' اَنَّهٗ قَالَ لِمُعَاوِيَةَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ شَيْئًا مِنْ اَمْرِالْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ اِحْتَجَبَ اللّٰهُ دُوْنَ حَاجَتِهٖ وَخَلَّتِهٖ وَفَقْرِهٖ' فَجَعَلَ مُعَاوِيَةُ رَجُلًا عَلٰى حَوَائِجِ النَّاسِ (رواه ابوداود والترمذی. وفی رواية لَهٗ وَلِاَحْمَدَ) اَغْلَقَ اللّٰهُ لَهٗ اَبْوَابَ السَّمَاءِ دُوْنَ خَلَّتِهٖ وَحَاجَتِهٖ وَمَسْكَنَتِهٖ۔

أخرجه ابو داود فی السنن ۳ / ۳۵۷' الحديث رقم : ۲۹۴۸' والترمذی فی ۳ / ٦۱۹' الحديث رقم : ۱۳۳۲' وأحمد فی المسند ٤ / ۲۳۱

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی کام کا ولی و حاکم بنایا اور اس نے (مسلمانوں کی حاجت' عرضداشت اور محتاجگی کو پورا کرنے سے حجاب کیا (یعنی اس کی ضرورت وحاجت کو پورا نہیں کیا) تو اللہ تعالیٰ اس (والی وحاکم) کی حاجت و عرضداشت اور محتاجگی سے حجاب فرمائے گا (یعنی اس کو اس کے مطلوب سے دور رکھے گا اور اس کی دعا قبول نہیں کرے گا)'' حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (یہ حدیث سن کر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ایک شخص کو (اس کام) پر مقرر کر دیا (کہ وہ لوگوں کی ضروریات پر نظر رکھے اور ان کی حاجتوں کو پورا کرتا رہے)۔ (ابوداؤد' ترمذی) اور ترمذی کی ایک روایت میں اور احمد کی روایت

میں یوں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اس (والی حاکم) کی حاجت' عرضداشت اور محتاجگی پر آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے''۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن مرة۔ عمرو بن مرہ کی کنیت ابو مریم ہے۔از روئے قبیلہ جہنی ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ ''ازدی'' ہیں۔اکثر غزوات میں شریک ہوئے ہیں۔شام میں قیام فرمایا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں وفات پائی۔ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔''مرۃ'' میں میم مضموم اور راء مشدد ہے۔

تشریح:قوله:میمن ولاه الله شيئا... وخلته فقرته:

اس کی تائید طبرانی کی روایت سے بھی ہوتی ہے،جو حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

''من ولى شيئاً من امور المسلمين لم ينظر اللّٰه فى حاجته حتّٰى ينظر فى حوائجهم

جو کوئی شخص مسلمانوں کے کسی امر کا والی بنا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کا خیال نہیں رکھے گا جب تک کہ وہ رعایا کی ضروریات کا خیال نہ رکھے''

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ''**احتجاب الوالى**'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو اپنے پاس آنے سے روک دے کہ وہ اس کے سامنے اپنی ضروریات پیش کریں اور اس پر ان کا پورا کرنا مشکل ہو جائے۔اور ''احتجاب اللہ'' یہ ہے کہ وہ اس کی دعاء کو قبول نہ کرے اور اس کی امیدوں کو خاک میں ملا دے۔

حاجۃ ،خُلّت اور فقر میں فرق:

حاجت وہ ہے کہ انسان جس کا اہتمام کرے اگر چہ وہ حد ضرورت تک نہ پہنچا ہو۔اس طور پر کہ اگر وہ حاصل نہیں ہوا خلل واقع ہو جائیگا۔

''خلة'' بھی اسی طرح ہے یہ ''خلل'' سے ماخوذ ہے۔بسا اوقات یہ حد اضطرار کو بھی پہنچ جاتا ہے کہ اگر اس نے نہ پایا تو وہ زندگی نہ گزار پائے گا۔''**فقو**'' اس اضطرار کو کہتے ہیں جس کے بغیر گذران ممکن نہ ہو۔یہ ''**فقار**'' سے ماخوذ ہے۔گویا کہ فقر نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ دیا۔چنانچہ 'فقیر' کی تفسیر کی جاتی ہے کہ وہ شخص کہ جس کے پاس سرے سے کوئی چیز ہی نہ ہو۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر سے پناہ مانگی ہے۔اھ۔زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہ الفاظ متقاربہ ہیں۔اور یہاں پر اس کو تاکید و مبالغہ کیلئے ذکر کیا ہے۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کی ضرورت و حاجت پوری کرنے سے چھپ گیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ساتھ ایسا ہی کرے گا۔جیسا کہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ شاید یہ وجہ زیادہ راجح ہے۔یعنی قیامت کے روز کے ساتھ تقیید زیادہ ارجح ہے۔اس لیے کہ ''**حاجته وخلته وفقره**'' کا اسلوب ''ترقی'' والا ہے۔اس میں ملاوک وسلاطین کی شان میں ترقی ہے۔ملوک اور سلاطین کی

کامیابی کے دروازے بند ہوں گے۔اور یہ آخرت میں ہی ہوگا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے یہ بتایا ہے کہ: ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾[المطففين-١٥] یہ سب ان پر تغلیظ اور تشدید کیلئے ہوگا۔اور جب مقسطین کی جزاء قیامت کے روز یہ ہوگی کہ وہ رحمٰن کے داہنے طرف نور کے منبروں پر ہوں گے۔تو ''قاسطین'' کی جزاء یہ ہوگی کہ ان کو اپنے رب سے دوری ہوگی اور وہ اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے اور ناکام ونامراد ہوں گے اس کی تائید اگلی حدیث سے بھی ہوتی۔امام احمدؒ کی روایت میں ہے:

''اغلق الله ابواب السّمآء دون خلته وحاجته ومسكنته''۔

الفصل الثالث:

رعایا سے حجاب کی مذمت

٣٧٢٩:عَنْ اَبِى الشَّمَّاخِ الْاَزْدِيِّ، عَنِ ابْنِ عَمٍّ لَهُ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ اَتٰى مُعَاوِيَةَ، فَدَخَلَ عَلَيْهِ، فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ: مَنْ وَلِيَ مِنْ اَمْرِ النَّاسِ شَيْئًا ثُمَّ اَغْلَقَ بَابَهُ دُوْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَوِالْمَظْلُوْمِ اَوْذِى الْحَاجَةِ اَغْلَقَ اللّٰهُ دُوْنَهُ اَبْوَابَ رَحْمَتِهِ عِنْدَ حَاجَتِهِ وَفَقْرِهِ اَفْقَرَمَا يَكُوْنُ اِلَيْهِ۔

أخرجه البيهقي في شعب الإيمان ٦ / ٢١، الحديث رقم: ٧٣٨٤

ترجمہ:''حضرت ابوشماخ ازدی سے روایت ہے کہ ان کے چچا زاد بھائی جو نبی کریم ﷺ کے ایک صحابیؓ تھے (ایک دن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور جب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہنے لگے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کو لوگوں کے کسی کام کا والی بنایا گیا اور اس نے مسلمانوں پر یا کسی مظلوم پر یا کسی حاجت مند پر اپنے دروازے بند رکھے (یعنی ان کو ان کی اپنی حاجت وضرورت کے وقت اپنے پاس نہ آنے دیا یا اس کی حاجت کو پورا نہ کیا) تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی ضرورت وحاجت اور محتاجگی کے وقت جب کہ وہ اس کی طرف بہت زیادہ حاجت مند محتاج ہوگا اپنی رحمت کے دروازے بند رکھے گا (یعنی اگر وہ کسی وقت اپنی دنیا یا اپنی عقبیٰ کے بارے میں اللہ کی بارگاہ میں اپنی حاجت وضرورت کا اظہار کرے گا) تو اللہ تعالیٰ اس کی اس حاجت وضرورت کو پورا نہیں کرے گا یا اگر وہ دنیا میں کسی مخلوق سے اپنی کسی احتیاج کا اظہار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس حاجت وضرورت کو بھی پورا نہیں ہونے دے گا)۔''

تشریح: قوله:عن ابى الشماخ۔۔۔۔ أوذى الحاجة:

''اصحاب رسول الله ﷺ''ایک نسخہ میں ''اصحاب النبی ﷺ'' ہے۔

ولی: واؤ کا ضمہ اور لام مشدد مکسور ہے۔اور ایک نسخہ میں مجرد سے ہے، واؤ کے فتحہ، لام کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ

ہے۔

''من أمر النّاس'': اس میں لام تعریف ''استغراق جنس'' کیلئے ہے۔ لہٰذا ''الناس'' میں مسلم، ذمی اور معاہد سارے شامل ہیں۔

''ثم أغلق بابه'': یہ احتجاب اور نصب حاجب سے عبارت ہے۔ یا کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ اپنے در پر آنے والے محتاج لوگوں کے مقصود کو پورا نہیں کرتا حالانکہ مسلمان کو روکا نہیں جا سکتا۔

دون المسلمين أولمظلوم أوذى الحاجة: ایک نسخہ صحیحہ میں ہے ''**دون مسكينا والمظلوم وذى الحاجة**'' ہے یہ حدیث سابق کے زیادہ مناسب ہے اور اس پر دال ہے کہ ان روایات میں ''أو'' تنویع تفصیل کیلئے ہے اور یہ مطلق ہے۔ چاہے مظلوم ہو یا ضرورت مند ہو۔ یا کوئی اور ہو۔ وہ ظلم اور زیادہ ضرورت کی وجہ سے ہی داخل ہوتا ہے۔

قوله:''افقر'' حال ہے۔ أى احوج أوقات يكون مفتقرا اليه و محتاجا لديه۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ پہلے یہ گذر چکا ہے کہ ''ما'' مصدریہ ہے اور ''وقت'' مقدر ہے۔ اور ''افقر'' یہ ''فقرہ'' کے مضاف الیہ سے حال ہے' اور یہ جائز ہے کیونکہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔ اور یہ افتقار کلی صرف قیامت کے دن ہی ہوگا۔ جیسا کہ حدیث سابق میں گذر چکا ہے۔

امیر کے لئے چند ہدایات

۳۷۳۰:وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ' اَنَّهٗ كَانَ اِذَا بَعَثَ عُمَّالَهٗ شَرَطَ عَلَيْهِمْ: اَنْ لَا تَرْكَبُوْا بِرْذَوْنًا' وَلَا تَاْكُلُوْا نَقِيًّا وَلَا تَلْبَسُوْا رَقِيْقًا' وَلَا تُغْلِقُوْا اَبْوَابَكُمْ دُوْنَ حَوَائِجِ النَّاسِ' فَاِنْ فَعَلْتُمْ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ فَقَدْ حَلَّتْ بِكُمُ الْعُقُوْبَةُ ثُمَّ يُشَيِّعُهُمْ۔ (رواهما البيهقى فى شعب الايمان)

أخرجه البيهقى فى شعب الإيمان ٦ / ٢٤' الحديث رقم : ٧٣٩٤

ترجمہ: ''اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ عمال (حکام) کو روانہ کرتے تو ان پر یہ شرط قائم کر لیتے (یعنی ان کو یہ ہدایات دیتے) کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا' میدہ و باریک آٹے کی روٹی وغیرہ نہ کھانا' باریک کپڑے نہ پہننا اور لوگوں کی حاجت و ضرورت کے وقت ان پر اپنے دروازے بند نہ کرنا (یاد رکھو!) اگر تم نے ان میں سے کوئی چیز اختیار کی تو تم دنیا کے مستحق ہو جاؤ گے' اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو (کچھ دور تک) چھوڑنے جاتے۔ یہ دونوں حدیثیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں''۔ (بیہقی)

تشریح: قوله:انه كام اذا بعث۔۔۔۔برذونا:

''**عمال**'' عین کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ ''عامل'' کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد حکام و سلاطین ہیں۔

''**أن لا تركبوا**'': بصیغہ، خطاب ہے حکایت لفظیہ ہے۔

''**برذونًا**'': ''باء'' کے کسرہ ''راء'' کے سکون اور ''ذال'' کے فتح کے ساتھ ہے۔ ''برذون'' ترکی گھوڑے کو کہتے ہیں۔

''المغرب'' میں ہے کہ ''برذون'' ترکی النسل گھوڑے کو کہتے ہیں اور اس کی جمع ''براذین'' آتی ہے اور اس کے برعکس ''عراب'' آتا ہے۔ ''برذون'' کی تانیث ''برذونة'' آتی ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ جب ''رکوب براذین'' کے حکم کی علت خیلاء اور تکبر ٹھہرا تو ''رکوب عراب'' سے نہی بطریق اولیٰ ہوگی۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ خیلاء اور تکبر اس فضیلت کے تخیل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے انسان کو اپنا نفس اچھا دکھلائی دیتا ہے۔ اور ''الخيل'' بھی اسی سے ماخوذ ہے کیا گیا ہے کہ جو بھی شخص گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اپنے نفس میں تخیل کی کیفیت کو ضرور پاتا ہے۔

قوله: ''ولا تأكلوا نقيًا''

نقی اس آٹے کو کہتے ہیں کہ جس کو چھانی سے کئی بار چھانا گیا ہو۔ ''قوله: فان فعلتم شيئا من ذلك فقد حلّت بكم العقة الخ''

تم کو دنیا و آخرت میں سزا ہوگی۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ رکوب برذون سے نہی دراصل تکبر سے نہی ہے۔ اور أكل نقی'' اور لبس رقیق سے نہی دراصل ''تنعم'' سے نہی ہے اور بے اعتدالی اور احتجاب سے نہی دراصل اس بات سے نہی ہے کہ حکمران لوگوں کی حاجات سے چھپ کر بیٹھ نہ جائے۔ اور بجائے ان کی حوائج کے حل کرنے کے اپنے آپ کے ساتھ مشغول نہ ہو جائے۔

''ثم يشيعهم'': یہ دراصل جملہ شرطیہ پر عطف ہے۔ مشایعت مستحب ہے۔ جیسا کہ امام حاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' فرماتے ہیں:

مشى مع الغزاة رسول الله صلى الله عليه وسلم الى بقيع الفرقد حين
وجهم ثم قال انطلقوا على اسم الله اللهم أعنهم۔

باب العمل في القضاء والخوف منه

منصب قضاء کی انجام دہی اور اس سے ڈرنے کا بیان

''الخوف'' کا عطف ''العمل'' پر ہے۔ اور ''منه'' کی ضمیر ''قضاء'' کی طرف راجع ہے۔

الفصل الاول:

قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے

۳۷۳۱: عَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ

اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانٌ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٣ / ١٣٦' الحديث رقم: ٧١٥٨' و مسلم في ٣ / ١٣٤٢' الحديث رقم: (١٦ - ١٧١٧) والترمذي في السنن ٣ / ٦٢٠' الحديث رقم: ١٣٣٤' والنسائي في ٨ / ٢٤٧' الحديث رقم: ٥٤٢١' وابن ماجه في ٢ / ٧٧٦' الحديث رقم: ٢٣١٦' وأحمد في المسند ٥ / ٣٦

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''کوئی حاکم وقاضی غصہ کی حالت میں' دو آدمیوں (کے نزاعی معاملے) میں فیصلہ نہ کرے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: لايقضين حكم ....:

مظہرؒ کہتے ہیں کہ حاکم کو غصہ کی حالت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ غصہ اس کو اجتہاد اور غور وفکر سے منع کر دیتا ہے اور اسی طرح سخت گرمی، سخت سردی، بھوک، پیاس اور مرض کی حالت میں بھی فیصلہ نہ کرے۔ اگر ان احوال میں اس نے فیصلہ صادر کیا' تو نافذ ہو جائے گا، اگرچہ کراہت کے ساتھ ہوگا۔

قاضی فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کرے

۳۷۳۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو' وَ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ وَاَصَابَ فَلَهُ اَجْرَانِ' وَاِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ وَ اَخْطَاَ فَلَهُ اَجْرٌ وَاحِدٌ.

(متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٣ / ٣١٨' الحديث رقم: ٧٣٥٢' و مسلم في ٣ / ١٣٤٢' الحديث رقم: ١٥ / ١٧١٦' والترمذي في السنن ٣ / ٦١٥' الحديث رقم: ١٣٣٦' والنسائي في ٨ / ٢٢٣' الحديث رقم: ٥٣٨١

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی حاکم فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرے (یعنی غور وفکر کے ذریعہ حکم وفیصلہ دے) اور پھر اس کا وہ حکم وفیصلہ صحیح (یعنی کتاب وسنت کے موافق) ہو تو اس کو دو اجر ملیں گے (ایک اجر تو اجتہاد کرنے کا اور دوسرا اجر صحیح فیصلہ کرنے کا) اور جب اس نے کوئی حکم وفیصلہ کرتے وقت اجتہاد کیا لیکن (نتیجہ اخذ کرنے میں) چوک گیا (یعنی صحیح حکم تک پہنچنے میں خطا کر گیا) تو اس کو ایک اجر ملے گا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ''اذا حكم الحاكم ۔۔۔فله جران:

''فاجتهد'' یہ شرط پر عطف ہے۔ ''اراد الحكم'' کی تاویل پر

''فأصاب'': اس کا عطف ''فاجتهد'' پر ہے اور ایک نسخہ صحیحہ میں ''بالواؤ'' منقول ہے۔

فله أجران: یہ جملہ شرط کی جزا ہے اس کا اجتہاد اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہو گیا تو اس کو دو اجر ملیں گے: ایک اجتہاد کا اور ایک فیصلہ کی صحت کا اجر۔

قوله: واذا حكم فاجتهد ......:

''فأخطأ'': اور ایک نسخہ میں ''وأخطاء'' ہے۔

علامہ خطابیؒ کہتے ہیں کہ مخطیؔ کو اس کے اجتہاد پر اجر اس لئے ملتا ہے کہ اس کا اجتہاد بھی طلب حق کیلئے ہوتا ہے، اس کا اجتہاد عبادت ہے' اور خطاء پر اجر نہیں ملتا بلکہ اس سے صرف گناہ ساقط ہوتا ہے اور یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو کہ شرائط اجتہاد کا جامع ہو، اصول سے واقف ہو، وجوہ قیاس سے باخبر ہو۔ پس جو شخص اجتہاد کا اہل نہ ہو تو وہ متکلّف ہے اور اس کی خطاء پر کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا بلکہ اس پر گناہ کا خدشہ ہے۔ اور اس پر آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی دلالت کر رہا ہے:

''**القضاة ثلاثة: واحد في الجنه واثنان في النّار**''

لیکن یہ اجتہاد ان فروعی مسائل کے بارے میں ہے کہ جو مختلف وجوہ کا احتمال رکھتے ہوں۔ برخلاف ان اصول کے جو کہ ارکان شریعت ہیں' یا وہ **امهات الأحكام** ہیں کہ جو مرعدو مختلف وجوہ کا احتمال نہیں رکھتے' اور اس میں تاٴویل کی کوئی گنجائش نہ ہو اس لئے کہ اگر کوئی شخص اس میں خطا کر گیا تو وہ خطا میں غیر معذور ہوگا، اور اس بارے میں اس کا حکم مردود ہوگا۔ (حاصل یہ کہ خطأ اجتہادی صرف انہی مسائل ومعاملات میں ہوگی جو اجتہاد کا محل ہوں منصوص مسائل اور قطعی احکام میں نہیں۔)

امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اختلافی مسائل میں ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے یا مصیب کوئی ایک ہوتا ہے۔ مصیب وہ شخص ہے کہ جس کا حکم اللہ تعالیٰ کے امر کے موافق ہو جائے، اور دوسرا مخطی ہوگا۔ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کے ہاں ثانی ہے۔ کیونکہ اسی کو مخطی کہا گیا ہے' اور اگر وہ مصیب ہوتا تو اس کو مخطی نہ کہا جاتا۔ اور یہ محمول ہے اس پر کہ جو نص میں خطا کر جائے یا اس چیز میں اجتہاد کرے کہ جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ اور جو علماء قولِ اول کی طرف گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مخطی کیلئے اجر کا تعین کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ ''**مصیب**'' نہ ہوتا تو اس کیلئے کوئی اجر نہ ہوتا۔ لیکن یہ اجر اس شخص کے لئے ہے کہ جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو۔ اور جو شخص اجتہاد کا اہل نہ ہو تو اس کے لئے کوئی حکم اور فیصلہ کرنا حلال و جائز نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا حکم نافذ العمل ہوگا۔ چاہے وہ موافقت اختیار کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ اس کی اصابت بھی محض اتفاقاً ہے۔ لہٰذا تمام احکام میں وہ عاصی اور گنہگار رہوگا۔ اھ اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ان احکام کے بارے میں کہ جن کا بیان نصوص یعنی قرآن وسنت اور اجماع میں نہ پایا جاتا ہو (یہی ہے)۔ پس اس کے لئے سوائے قیاس کے کوئی امکان نہیں ہے۔ چنانچہ یہ شخص ''متحری قبلہ'' کی طرح ہوگا۔ چونکہ وہ مصیب ہے اگرچہ وہ خطا کرے۔

(وراوه احمد، والنسائي، وابوداوٗد، وابن ماجه عن عمرو بن العاص وامد والستة عن ابى هريرةؓ)

الفصل الثّاني:

قاضی بننا کیسا ہے؟

۳۷۳۳: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ

فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ (رواه احمد والترمذی وابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٥' الحديث رقم : ٣٥٧٢' والترمذی فی ٣ / ٦١٤' الحديث رقم : ١٣٣٢٥' وابن ماجه فی ٢ / ٧٧٤' الحديث رقم : ٣٢٠٨' وأحمد فی المسند ٢ / ٢٣٠

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص لوگوں کا قاضی مقرر کردیا گیا (گویا) اس کو بغیر چھری کے ذبح کردیا گیا''۔ (احمد' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: قوله: ''من جعل ''قاضيا بين الناس ......:

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس میں کئی توجیہات کا احتمال ہے:

① قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد بغیر کسی چیز کے قتل ہے۔ جیسا کہ گلا گھونٹنے، تغریق واحراق اور طعام وشراب۔ اس لئے کہ یہ قتل قتل بالسکین سے زیادہ صعب اور سخت ہے۔ کیونکہ اس میں مزید تعذیب ہے اور امتداد مدت ہے۔

② عرف میں ذبح عام طور پر چھری کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو اس کو غیر کی طرف معدول کردیا۔ تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ اس سے مراد اس کے دین کی ہلاکت کا خدشہ ہے، نہ کہ اس کی بدنی ہلاکت کا۔ یہ صاحب الجامع کا قول ہے۔

③ تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دونوں ذبحوں میں بڑا تفاوت اور بُعد ہے۔ اس لئے کہ چھری کے ساتھ ذبح ہونا ایک ساعت کی ذلت ومشقت ہے۔ جبکہ یہ بغیر سکین کے ذبح ہونا پوری عمر کی ذلت ومشقت ہے۔ کیونکہ اس کے بعد قیامت کے روز بھی ندامت اور ذلت ہوگی۔

④ اشرفؒ کہتے ہیں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ جس کو قاضی بنایا گیا ہے اس کو چاہیے کہ وہ تمام دواعی خبیثہ اور نفسانی شہوات ماردے۔ تو گویا کہ وہ بغیر چھری کے ذبح کردیا گیا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس معنی مراد پر قضاء ایک مرغوب چیز ہے اور اس پر ابھارنا چاہیے۔ اور پہلی دونوں توجیہات سے مقصود اس کی حرص سے ڈرانا اور متنبہ کرنا ہے۔ تاکہ ان خطرات سے انسان اپنے آپ کو بچا کر رکھے۔

مظہر کہتے ہیں کہ قضاء بہت ہی خطرناک چیز ہے، اس کا ضرر بھی بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ بہت ہی کم قاضی خصمین کے درمیان عدل وانصاف کرتے ہیں۔ کیونکہ نفس اس کی طرف مائل ہوتا ہے جس کو وہ پسند کرتا ہے یا اس کی خدمت کرتا ہے۔ یا جس کے پاس کوئی ایسا منصب ہو کہ اس کے جاہ ومقام سے ڈرتا ہو یا اس کی سلطنت کا خوف وخطرہ ہو۔ اور بسا اوقات قاضی رشوت کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور یہی سب بڑی اور خطرناک بیماری ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

عہدہ قضا میں اللہ کی مدد ونصرت کا بیان

۳۷۳۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتَغَى الْقَضَاءَ وَسَأَلَ وُكِّلَ اِلٰى نَفْسِهٖ، وَمَنْ اُكْرِهَ عَلَيْهِ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مَلَكًا يُسَدِّدُهٗ. (رواه الترمذی ابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود في السنن ٤ / ٨' الحديث رقم: ٣٥٧٨' والترمذي في ٣ / ٦١٤' الحديث رقم: ١٣٢٤' وابن ماجه في ٢ / ٧٧٤' الحديث رقم: ٢٣٠٩

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص (اپنے دل میں) منصب قضا کی طلب و خواہش کرے اور پھر (سربراہ مملکت سے) اس کا مطالبہ کرے (یہاں تک کہ اس کے مطالبہ پر اس کو قاضی بنا دیا جائے) تو وہ منصب اس کے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے (یعنی اس کو اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق حاصل نہیں ہوتی) اور جس کو (اس کی طلب و خواہش کے بغیر) زبردستی اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتے کو نازل فرما دیتا ہے جو اس کو (گفتار و کردار میں) راست و درست رکھتا ہے''۔ (ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: قوله: **من ابتغى القضاء وسأل وكل الى نفسه** ''من ابتغى'' جس نے اپنے نفس میں منصب قضاء کو طلب کیا یعنی اس حکومت کو کہ جو امارت کو شامل ہو اور اس کا مطالبہ لوگوں سے بھی کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس نے اس میں سفارشی بھی مانگے تو ایسے شخص کو اس کے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اس اُمر پر اس کی اعانت و مدد نہیں کی جاتی اور اللہ تعالیٰ اس کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔ اور جو کوئی اس کو بحکم مجبوری اختیار کرے یا اس کو متعین کیا گیا ہو اور اس کا اعتقاد یہ ہو کہ خیر اور بھلائی اس میں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند و اختیار کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ نازل کر دیتا ہے جو اس کو صحیح اور نیکی پر ابھارتا ہے، اس کی مدد کرتا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''ابتغى'' اور ''سأل'' کو جمع کیا۔ اس کی حرص کے اظہار کیلئے۔ کیونکہ بالطبع انسان کا نفس حب ریاست اور لوگوں میں ایک بلند و اعلیٰ مقام کی طرف میلان رکھتا ہے۔ جو اس سے رک گیا وہ ان آفات سے محفوظ و سالم رہا اور جس نے خواہشات کی اتباع کی' قضاء کو مانگا تو وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے جواز کا راستہ صرف اس کا اکراہ اور بامر مجبوری ہے۔ اور اکراہ میں خواہشات نفسانی کا قلع قمع ہے۔ اس وقت اس کو صحیح راستے کی توفیق مل جاتی ہے' اسی کو دیکھ کر کسی کہنے والے نے کہا کہ ''جس کو قاضی بنایا گیا تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے دواعی خبیثہ اور شہوات نفسانی کو مار دے''۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید ''دار قطنی بیہقی اور طبرانی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے امّ سلمہ سے مرفوعاً روایت کی ہے:

''**من ابتلى بالقضآء بين المسلمين فليعدل بينهم في لحظه واشارته ومقعده ومجلسه**''۔

''جس کو قضاء بین المسلمین میں مبتلا کر دیا جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ ان کے درمیان اپنے لحظہ اشارہ اور اٹھک بیٹھک میں بھی عدل کرے''۔

طبرانی وبیہقیؒ کی ایک اور روایت میں یوں ہے:

''**من ابتلى بالقضاء بين المسلمين فلا يرفع صوته على احد الخصمين مالا يرفع على الآخر**''۔

قاضیوں کی تین قسمیں

۳۷۳۵: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ: وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَاثْنَانِ فِي النَّارِ، فَاَمَّا الَّذِیْ فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰی بِهٖ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ، وَ رَجُلٌ قَضٰی لِلنَّاسِ عَلٰی جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ (رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود في السنن ٤ / ٥، الحديث رقم: ٣٥٧٣، والترمذي في ٣ / ٦١٣، الحديث رقم: ١٣٢٢، وابن ماجه في ٢ / ٧٧٦، الحديث رقم: ٢٣١٥

ترجمہ: ''اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک جنتی اور دو دوزخی ہیں۔ جنتی قاضی تو وہ ہے جس نے حق کو جانا (یعنی یہ جانا کہ حق اس بات میں ہے) اور پھر حق ہی کے مطابق فیصلہ کیا اور جس نے حق کو جانا مگر (اس کے باوجود) اپنے حکم و فیصلہ میں ظلم کیا (یعنی اس نے دیدہ و دانستہ حق کو پامال کیا) تو وہ دوزخی ہے اسی طرح جس شخص نے اپنی جہالت کی وجہ سے لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا تو وہ بھی دوزخی ہے (کیونکہ اس نے حق بات تک پہنچنے میں کوتاہی اور تقصیر کی)''۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: ''القضاة ثلاثة واحد في الجنة ......:

ثلاثة'': تمیز محذوف ہے۔ أي ثلاثة انواع۔

طیبیؒ کہتے ہیں ''فرجل عرف الحق'' کو ''فأما الذي في الجنة'' کے ساتھ ملایا اور اس میں ظاہراً اداتِ تفصیل کو ترک کر دیا۔ اس لئے کہ دونوں قسم کے شخصوں کو ایک لڑی میں نہ پرویا جائے۔ اور یہ جو ہم نے ''ظاہرًا'' کہا ہے اس لئے کہ تقدیری عبارت یوں ہوگی ''فأما الّذي في النّار فرجلٌ......''۔

جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ ......﴾ [آل عمران: ۷] ''تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تا کہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ لگائیں حالانکہ مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے پروردگا کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں''۔ یہاں اصل عبارت یوں ہے: ''فأما الرّاسخون فيقولون'' یہ فصیح و بلیغ کلام ہے۔ اور ''فرجلٌ'' کی فاء ''لمّا'' کا جواب ہے۔ اور ''فقضٰی'' میں فاء مسبّب ہے اور مسبّب صفت رجل ہے۔ اور ''فجار'' کی فاء ''فقضٰی'' کی فاء کی طرح ہے۔ لیکن برعکس ہے۔ یعنی عرفان الحق تو قضاء حق کا سبب ہے لیکن اس نے اس کو برعکس کر دیا۔ اور اس نے عرفان الحق کو جور و ظلم کا سبب بنا دیا۔ جیسا کہ یہ قول تعالیٰ ہے۔ ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ [الواقعة۔ ۸۲] یعنی تم اپنے رزق کے شکر کو جھوٹ بنا دیتے ہو۔ اور یہ موجب تصدیق ہے۔

''فهو في النّار'' رجل کی خبر ہے اور ''اما'' مقدر کا جواب ہے۔ اس شرط پر کہ مبتدا نکرہ موصوفہ ہے۔ اور ''علی جهلٍ''

قضٰی کے فاعل سے حال ہے۔''ای قضٰی للنّاس جاھلاً''۔

''جامع صغیر'' میں ہے:

القضاة ثلاثة: اثنان فی النّار وواحد فی الجنة۔ رجل علم الحق فقضٰی به فهو فی الجنّة، ورجل قضٰی للنّاس علی جهل فهو فی النار، ورجل عرف الحق فجار فی الحكم فهو اس حدیث کو اصحاب سنن اربعہ اور حاکم نے حضرت بریدہ سے نقل کیا ہے اور اس کو امام طبرانی نے ابن عمر سے یوں روایت کیا ہے: القضاة ثصاثة قاضیان فی النار وقاض فی الجنة۔ قاض قضی بالهوی فهو فی النار' وقاض قضی بغیر علم فهو النار فی النار، و قاضٍ قضٰی بالحق فهو فی الجنة''۔

امام حاکم نے حضرت بریدہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: قاضیان فی النار وقاضٍ فی الجنّة، قاضٍ عرف الحق فقضٰی به فهو فی الجنّة۔ وقاضٍ عرف الحق فجار متعمدًا او قضٰی بغیر علمٍ فهما فی النّار''۔

[الجامع الصغیر ۲/ ۳۸۵، لاحدیث رقم ۶۱۸۹ و ۱۱۹۰]

طلبِ قضاء کے جواز کا بیان

۳۷۳۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَلَبَ قَضَآءَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰی يَنَالَهٗ، ثُمَّ غَلَبَ عَدْلُهٗ جَوْرَهٗ، فَلَهُ الْجَنَّةُ، وَمَنْ غَلَبَ جَوْرُهٗ عَدْلَهٗ فَلَهُ النَّارُ ۔ (رواه ابو داود)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٧' الحدیث رقم: ٣٥٧٥

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے مسلمانوں کے منصب قضاء کا مطالبہ کیا یہاں تک کہ اس نے اس منصب کو حاصل بھی کر لیا اور پھر (اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں) اس کا عدل وانصاف ظلم پر غالب رہا تو وہ جنت کا مستحق ہوگا اور جس شخص کا ظلم اس کے عدل وانصاف پر غالب رہا تو وہ دوزخ کا مستحق ہوگا''۔ (سنن ابوداؤد)

تشریح: قوله: من طلب قضاء المسلمین۔۔۔فله الجنة:

جس کسی نے قضاء بین المسلمین کو طلب کیا یہاں تک کہ اس کو منصب قضاء پر فائز کر دیا گیا اور پھر اس کا عدل اس کے جور و ظلم پر غالب آ گیا اس طور پر کہ اس کو حکم اور فیصلہ میں ظلم و جبر سے روک دیا، تو اس کو جنت ملے گی۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہاں پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ''حتی'' غایۃ طلب کیلئے ہے۔ اور ''حتی'' تدرج کیلئے ہے۔ تو اس سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس نے طلب اور کوشش میں مبالغہ کیا یہاں تک کہ اس نے منصب کو پالیا تو اس قسم کا شخص تو اپنے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور ایسے شخص پر وہ فرشتہ نہیں اترتا۔ جو اس کو غلطیوں سے روک دے تو اس صورت میں کیسے اس کا ''عدل'' اس کے ''جور'' پر غالب آ سکتا ہے۔ حالانکہ حدیث سابق میں کہا ہے کہ: ''من ابتغی القضآء وسأل و کل الٰی نفسه'' تو ان دونوں روایات میں تطبیق اور جمع کیسے ممکن ہے؟

تو اس کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ طالب دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک آدمی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی تائید اور مدد اس کے ساتھ شامل حال ہو اور اس کو الہام بھی ہوتا ہو۔جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ ہیں۔ جب وہ اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے تو اس قسم کا شخص ''موکول الی نفسه'' نہیں ہوتا، اور وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور اسی قسم کے شخص کا عدل اس کے جور پر غالب آتا ہے۔اور ایک آدمی اس طرح نہیں ہوتا اور وہ ایسا آدمی ہوتا ہے کہ جس کا ظلم اس کے عدل پر غالب آتا ہے۔ اور یہ شخص موکول الی نفسه'' ہوتا ہے۔اور یہی معنی اگلے جملہ (ومن غلب جوره......) کا ہے۔

قوله: ''ومن غلب جوره عدله فله النار'' :

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس تاویل میں کئی توجیہات ہیں:

① تورپشتی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ دونوں صیغوں میں غلبہ سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کو روک دے۔پس وہ اپنے حکم میں ظلم وجود نہ کرے۔یعنی اول میں اور نہ عدل کرے یعنی ثانی میں۔ میں کہتا ہوں کہ ثانی کو تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ جس کا ظلم اس کے عدل کی نسبت زیادہ ہو جائے' تو اس کے لئے بھی جہنم کی آگ ہے۔تو اس سے بطریقہ اولیٰ یہ بات سمجھی جائے گی۔کہ جو سرے سے عدل ہی نہ کرے تو وہ تو آگ ہی میں ہوگا۔ چنانچہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی طرف اشارہ ہے۔''قاضٍ فی الجنّة وقاضیان فی النّار'' اور جو محتاج تاویل ہے وہ اوّل ہی ہے لہٰذا اس پر خوب غور کرو۔

② مظہرؒ نے فرمایا ہے کہ جس کا عدل قوی ہو جائے اس طور پر کہ اس سے کوئی ظلم وجور صادر ہی نہ ہو۔میں کہتا ہوں کہ تو عین وجہ اوّل ہے۔

③ قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کی فطری پیدائش اس بات پر ہوتی ہے کہ خیر وشر کی قدرت رکھتا ہے۔اور عدل وظلم پر بھی۔پھر اس کے سامنے کچھ داخلی دواعی اور خارجی اسباب ایسے پیدا ہو جاتے ہیں۔جو آپس میں متعارض ہوں تو وہ اس کو ایک دفعہ اس کو جذب کر لیتا ہے اور کبھی اس دوسرے کو یہاں تک کہ ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو جاتے ہیں۔یہاں تک کہ ایک چیز دوسری پر غالب آجاتی ہے۔اور دوسرا مغلوب ہو جاتا ہے۔تو وہ بالکلیۃ اس سے القاء کرتے ہیں۔اور ''علی ما یدعوه الیه'' پر مستقر ہو جاتا ہے۔پس کسی حاکم اگر توفیق ہو جائے۔ یہاں تک کہ اسباب عدل غالب آجاتے ہیں اور ان دواعی عدل کے ساتھ قائم ہو تو وہ ایک ایسا بشر بن جاتا ہے کہ جو عدل کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ۔شغوف ہوتا ہے اور عما ینافی سے متحاشی ہوتا ہے۔تو وہ اس کے ذریعے جنت پالیتا ہے اور اگر اس کی حالت اس کے برخلاف ہو جائے۔تو وہ لوگوں کے درمیان ظلم وناانصافی سے فیصلہ کرتا ہے۔تو وہ اس کی نحوست کی وجہ سے آگ جہنم کا مستحق ٹھہر جاتا ہے۔

اور یہ تمام تفصیل اور توجیہات قول اوّل کی ہیں۔اس سے غافل مت ہو۔

البتہ ہاں اس کا ایک دوسرا معنی بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے عدل وجود سے مراد حکم اور فیصلہ کی درستگی اور غلطی ہے۔اس کے اجتہاد کے مطابق۔کہ جس میں کتاب سنت یا اجماع سے کوئی نص نہ ہو۔جیسا کہ انہوں نے مفتی اور مدرس کے حق میں کیا ہے۔

اور اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے:

''انَّ اللّٰہ مع القاضی مالم یحف عمدًا۔

۳۷۲۷: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَهٗ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ: كَيْفَ تَقْضِيْ اِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَآءٌ؟ قَالَ: اَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، قَالَ: فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟ قَالَ: فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: اَجْتَهِدُ رَأْيِيْ وَلَا آلُوْ قَالَ: فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى صَدْرِهٖ، وَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا يَرْضٰى بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ (رواه الترمذی وابوداود والدارمی)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ١٨، الحديث رقم: ٣٥٩٢، والترمذی فی ٣ / ٦١٦، الحديث رقم: ١٣٢٧، والدارمی فی ١ / ٧٢، الحديث رقم: ١٦٨، وأحمد فی المسند ٥ / ٢٣٠

ترجمہ: ''اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان (معاذ رضی اللہ عنہ) کو (قاضی و حاکم بنا کر) یمن بھیجا تو ان سے (بطور امتحان) پوچھا کہ جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوگا تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ''میں کتاب اللہ (قرآن کریم) کے موافق فیصلہ کروں گا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہیں وہ مسئلہ (صراحتاً) کتاب اللہ میں نہ ملا؟'' انہوں نے عرض کیا: ''پھر میں سنت رسول اللہ ﷺ (یعنی حدیث نبوی ﷺ) کے موافق فیصلہ کروں گا'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر تمہیں وہ مسئلہ سنت رسول اللہ (ﷺ) میں بھی نہ ملا؟ انہوں نے عرض کیا: تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور (اپنے اجتہاد و حقیقت رسی میں) کوتاہی نہیں کروں گا''۔ وہ (معاذ رضی اللہ عنہ یا وہ راوی جنہوں نے یہ حدیث معاذ سے روایت کی ہے) کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) اپنا دست مبارک معاذ رضی اللہ عنہ کے سینے پر مارا (تا کہ اس کی برکت سے وہ اپنی بات پر ثابت قدم رہیں اور ان کے علم میں اضافہ ہو اور فرمایا) ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں، جس نے رسول اللہ (ﷺ) کے قاصد (یعنی معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق عطا کی جس سے اس (اللہ) کے رسول (ﷺ) راضی ہوتے ہیں''۔ (ترمذی، ابوداؤد، داری)

تشریح: قوله: اجتهد أی ولا آلو:

''اجتهد'' یعنی میں ان واقعات کا حکم قیاس کے ذریعے معلوم کروں گا ان مسائل پر قیاس کر کے جن میں کوئی نص آئی ہو۔ اور ان میں ان مسائل کی طرح حکم اور فیصلہ کروں گا کہ جب ان دونوں (منصوص علیہ) (غیر منصوص علیہ) کے درمیان مشابہت ہو۔

''آلو'': ''آلی یالو'' سے متکلم کا صیغہ ہے مدہ کے ساتھ اور معنی ہے: میں اس میں کوئی کمی نہیں کروں گا۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''أجتهد رأی'' میں مبالغہ ہے۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ ''الجهد'' طاقت اور قوت کو کہتے ہیں اور مشقت کو بھی کہتے ہیں، اور ''اجتهاد'' کا معنی ہوتا

ہے کہ بذلِ طاقت اور تحمل مشقت کے ساتھ اخذ نفس کہا جاتا ہے: ''جهدت رأی و اجتهدت''مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اس میں فکر وتدبر کے ساتھ تھکا دیا۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ اس رائی سے مراد وہ نہیں ہے کہ جو اس کے نفس کی جانب سے ہو۔اور یا بغیر کتاب وسنت کے اصل کے اس کو برداشت کیا جائے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو کتاب وسنت کے معنی کی طرف لے جایا جائے قیاس کے ذریعے سے اور اس میں ''اثبات الحکم بالقیاس'' ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ جب میں اس مسئلہ میں کہ جس کا میں ارادہ رکھتا ہوں اور اس مسئلہ میں کہ جس میں کتاب یا سنت سے کوئی نص آتی ہو' کے درمیان مشابہت دیکھتا ہوں تو میں ان دونوں سے اخذ شدہ حکم کو لگاتا ہوں۔مثال کے طور پر گندم میں تحریم ربا کی صریح نص آئی۔ جبکہ خربوزہ کے بارے میں تحریم ربا کے سلسلے میں کوئی نص نہیں آئی تو امام شافعیؒ نے خربوزہ کو گندم پر قیاس کرلیا۔ کیونکہ دونوں اشیاء کے درمیان مطعومیت کی علت مشترکہ پائی جارہی تھی۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے جصّ (جونہ) کو بُرّ (گندم) پر قیاس کیا۔ کیونکہ دونوں میں کیلیت کی علت مشترکہ موجود تھی۔قوله: قال: فضرب رسول الله ﷺ علی صدره ......: اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے سینے پر مارا۔ یہ قول حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ہے یا راوی کا ہے؟ دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔اور ممکن ہے کہ ''صدره'' سے مراد ''صدری'' ہو۔بطریق لتفات' یا بر سبیل التجرید ہو۔

''لما یرضٰی به''یعنی کہ جس طریق صواب کی تمنا رسول اللہ ﷺ کر رہے ہیں اور جس کی تمنا کر رہے تھے۔علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی رائے کا استصواب بھی ہے اور یہی اس قول کا مطلب ہے: ''کلُّ مجتهدٍ مصیبٌ'' اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ جب مجتہد کو تحری میں خطا ہو جائے اور استنباط میں اس نے اپنی خوب کوشش کی ہو' تو وہ اس کی وجہ سے اجر کا مستحق ٹھہرتا ہے اور یہ اصل میں اصلِ اجتہاد کی طرف نظر کرتے ہوئے ہے۔

جب وہ جزئیات کی طرف نظر کرتا ہے تو وہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو وہ ان مسائل میں سے کسی مسئلہ میں مصیب ہوگا اور یا خطاء پر ہوگا۔ جب مصیب ہوگا' تو اس کیلئے دو اجر ہوں گے۔ ایک اجر اصل رائے کی وجہ سے اور دوسرا اجر درست رائے اختیار کرنے کے اعتبار سے اور جب مجتہد خطاء ہو جائے تو اصل کے اعتبار سے اس کو ایک ہی اجر ملے گا اور باعتبار الخطاء اس پر کوئی دار و گیر نہیں۔

فیصلہ کرنے کا ایک سنہری اصول

۳۷۳۸ :وَعَنْ عَلِيٍّ، قَالَ: بَعَثَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْيَمَنِ قَاضِيًا، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! تُرْسِلُنِي وَاَنَا حَدِيْثُ السِّنِّ وَلَا عِلْمَ لِي بِالْقَضَاءِ، فَقَالَ: اِنَّ اللّٰهَ سَيَهْدِي قَلْبَكَ وَيُثَبِّتُ لِسَانَكَ، اِذَا تَقَاضٰى اِلَيْكَ رَجُلَانِ فَلَا تَقْضِ لِلْاَوَّلِ حَتّٰى تَسْمَعَ كَلَامَ الْاٰخَرِ، فَاِنَّهُ اَحْرٰى اَنْ يَتَبَيَّنَ لَكَ الْقَضَاءُ قَالَ فَمَا شَكَكْتُ فِي قَضَاءٍ بَعْدُ، (وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اُمِّ سَلَمَةَ) اِنَّمَا اَقْضِيْ بَيْنَكُمْ بِرَأْيِيْ فِيْ (بَابِ الْاَقْضِيَةِ وَالشَّهَادَاتِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى)۔ (رواه الترمذی و ابوداود و ابن ماجة)

أخرجه ابوداود في السنن ٤ / ١١، الحديث رقم: ٣٥٨١، والترمذي في ٣ / ٦١٨، الحديث رقم: ١٣٣١، وابن ماجه في ٢ / ٧٧٤، الحديث رقم: ٢٣١٠، وأحمد في المسند ١ / ٨٣

ترجمہ: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ (جب) رسول اللہ ﷺ نے مجھے قاضی بنا کر یمن بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھ نوجوان کو (قاضی بنا کر) بھیج رہے ہیں (میں اپنی کم عمری کی وجہ سے ناتجربہ کار بھی ہوں) اور مجھے کو (منصب قضا کی ذمہ داریوں کا پوری طرح علم بھی نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (تم اس بارے میں کچھ فکر نہ کرو) عنقریب اللہ تمہارے دل کو (فہم وفراست کی) ہدایت عطا کرے گا اور تمہاری زبان کو (صحیح اور برحق حکم وفیصلہ کرنے پر) ثابت رکھے گا۔ (پھر آنحضرت ﷺ نے منصب قضاء کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلہ میں یہ تعلیم وہدایت دی کہ جب تمہارے پاس دو آدمی اپنا مقدمہ لے کر آئیں تو تم پہلے آدمی (یعنی مدعی) کے حق میں اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ کرنا جب تک کہ دوسرے آدمی (یعنی مدعا علیہ) کا بیان نہ سن لو کیونکہ یہ زیادہ مناسب ہے کہ تمہارے لئے فیصلہ کرنا واضح ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کی اس مبارک دعا کی برکت سے اور آپ ﷺ کی اس ہدایت وتعلیم پر عمل کرنے کے بعد) میں کسی بھی مقدمہ کا فیصلہ کرنے میں شک میل میں نہیں ہوا''۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: يا رسول الله ترسلني ---- وثبت قلبك:

''ترسلنی'' اس میں عبارت کا تفنن ہے۔ اور تقدیر یہ ہے۔ ''أترسلنی'' اور حال یہ ہے کہ میں کم عمر ہوں اور قلیل التجربہ ہوں اور میرے پاس قضاء کا علم کامل بھی تو نہیں ہے۔ یہ اصل میں تعلل نہیں تھا، بلکہ مقصود اس سے مدد کا طلب کرنا تھا۔

بے شک اللہ تعالیٰ تیرے دل کو فہم عطاء کر دے گا، اور تیری زبان کو حکم وفیصلہ پر ثابت قدم کرے گا۔ اور اس کی نظیر ''موسیٰ و ہارون علیہما السلام'' کا واقعہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اذهب الى فرعون انه طغٰى ''(تو ان دونوں نے جو جواب دیا قرآن نے اس کو یوں بیان کیا ہے:) ''قالا: ربنا اتنا نخاف آن يوط علينا آو ان يطغٰى قال لا تخافا انني معكما واسمع و آرٰى﴾ [طٰہ:۴۰]

اور ممکن ہے کہ یہ اشارہ صوفیہ کے طریق سے ہو۔ یعنی مرتبہ حضور ﷺ کو تمام بلند مناصب اور مراتب سنیہ پر ترجیح دیتا ہے۔ اور اسی لئے جب سلطان محمود نے تمام مناصب کو اپنے غلام خاص ایاز پر پیش کر دیا تو وہ اس کے قبول سے رک گیا اور ملازمة الخواص کو على وجه الخلوص اختیار کرلیا۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد قطعاً نفی علم نہیں ہے۔ اور اس نے ارادہ کیا۔ کہ خصماء کے درمیان سماع مدافعت کا تجربہ نہیں کیا۔ اور خصمین میں سے ہر ایک کے دفع کلام کی کیفیت کا پتہ نہیں ہوتا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس قول ''سيهدى قلبك'' میں سین ایسا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ﴾ [الصافات:۹۹] اس لئے ان دونوں میں ''سین'' فعل کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے وقوع کے زمان کے تنفیس کیلئے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب حضرت علیؓ کو قاضی بنا کر بھیجا تو اس وقت وہ کتاب وسنت کے عالم تھے جیسا کہ حضرت

معاذ بن جبلؓ تھے۔اور یہ قول ''أنا حديث السِّن'' قلت تجارب کی وجہ سے استعمال فکر اور اجتہاد رائے کے استعمال سے اعتزار تھا۔اس لئے جواب دیا:''سيهدى قلبك''یعنی اللہ تعالیٰ تیری راہنمائی کردے گا اس قیاس کی طرف کہ جس کا محل دل ہے تو تیرا سینہ کھل جائے گا اور تیری زبان ثابت قدم ہے۔تو اس وقت تم صرف حق کے ساتھ فیصلہ کرو گے اور اگلے کلام کے پیش نظر مظہرؒ کا قول زیادہ اُوفق اور اُظہر ہے۔قوله:اذا تقاضٰى رجلان ......:یعنی جب تیرے پاس دو آدمی اپنا جھگڑا لے کر آئے۔تو پہلے کیلئے فیصلہ نہ کرو۔(یعنی مدعی کیلئے)۔یہاں تک کہ تم دوسرے کی کلام سن لو۔اس لئے کہ استنباط اور تمیز حق من الباطل ممکن نہیں ہوتا۔کسی ایک کے کلام سننے سے۔تو اس کا یہ قول''اذا تقاضٰى''مقدمہ بلا ارشاد ہے۔

خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے۔کہ حاکم غائب کے خلاف فیصلہ نہ کرے اور یہ اس وجہ سے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع کر دیا۔اس بات سے کہ متخاصمین میں سے کسی ایک کیلئے فیصلہ کرے۔جیسا کہ وہ حاضر اور موجود ہوں۔یہاں تک کہ وہ دوسرے کا کلام سن لے۔تو غائب میں اُولیٰ بالمنع ہے۔اور یہ اس وجہ سے کہ غائب کے پاس ایسی دلیل اور حجت کا امکان ہے جو دوسرے کے دعویٰ کو باطل کردے اور اس کی حجت کو ختم کردے۔

اشرفؒ کہتے ہیں کہ شاید اس غائب سے مراد وہ غائب ہے جو محل حکم سے غائب ہو۔نہ کہ وہ غائب جو مسافت سفر تک ہو۔اس لئے کہ غائب الی مسافة القصر کے خلاف فیصلہ امام شافعیؒ کے ہاں جائز ہے۔

''فانّه'':یعنی یہ جو کیفیت قضاء کا تذکرہ ہوا۔یہ زیادہ اُولی اور محقق ہے۔کہ تمہارے سامنے قضاء صاف بیان ہو جائے۔تو فرماتے ہیں کہ اس کے بعد یعنی آپ علیہ السلام کی دعاء اور تعلیم کے بعد میں نے کسی فیصلہ میں شک نہیں کیا۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ جزریؒ کے مطابق حضرت علیؓ کو''أقضاهم''کہہ دیا۔حضرت سعد بن جبیرؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''عليٌّ أقضانا و آبى بن كعب ؤنا''۔

اور ہم مسلمہؒ کی مرفوع حدیث کو بھی ذکر کریں گے۔''انّما أقضى بينكم برأى''''الأقضيه والشهادات''اس لئے کہ یہ اس محل کے زیادہ انسب ہے۔

الفصل الثّالث:

قضاء کی نزاکت کا بیان

۳۷۳۹:عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:مَا مِنْ حَاكِمٍ يَحْكُمُ بَيْنَ النَّاسِ اِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَلَكٌ اٰخِذٌ بِقَفَاهُ ثُمَّ يَرْفَعُ رَاسَهُ اِلَى السَّمَاءِ فَاِنْ قَالَ:اَلْقِهِ اَلْقَاهُ فِيْ مَهْوَاةٍ اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا۔

أخرجه ابن ماجه في السنن ٢ / ٧٧٥ الحديث رقم: ٢٣١١، وأحمد في المسند ١ / ٤٣٠، وأخرجه البيهقي في الشعب ٦ / ٧٤ الحديث رقم: ٧٥٣٣

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''جو حاکم بھی لوگوں کے درمیان فیصلہ نافذ کرتا ہے قیامت کے دن (احکم الحاکمین کی بارگاہ میں) اس حال میں پیش ہوگا کہ ایک فرشتہ اس کی گدی پکڑے ہوگا۔ پھر وہ فرشتہ اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے (کھڑا رہے گا) یہاں تک کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم دے گا کہ اس کو (دوزخ میں) پھینک دو تو وہ اس کو چالیس سال کی مسافت کے بقدر (گہرے) گڑھے میں پھینک دیگا''۔(احمد، ابن ماجہ، بیہقی اور شعب الایمان)

تشریح: قوله:مامن حاكم يحكم بين الناس ......:

''ما من حاكمٍ'': مِنْ زائدہ ہے اور استغراق کیلئے ہے اور''حاکم'' نکرہ فی سیاق النفی بھی ہے۔ لہٰذا یہ ہر عادل اور ظالم کو شامل ہے۔''آخذٌ'' یہ صیغہ اسم فاعل کا ہے۔ خریف:''النہایۃ'' میں ہے کہ''الخريف''فصول سنہ کا وہ معروف زمانہ ہے جو گرمی اور سردی کے درمیان ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد چالیس سال کا زمانہ ہے۔ اس لئے کہ خریف سال میں ایک ہی دفعہ آتا ہے۔

''أربعين'' مجرور ہے۔ کیونکہ یہ''مهواة'' کی صفت ہے۔ گڑھا اتنا گہرا ہوگا اس کی گہرائی کو اَربعین سے کنایہ کر دیا۔ کیونکہ اس سے مراد اس کی تحدید نہیں ہے بلکہ عمق اور گہرائی میں مبالغہ مقصود ہے۔ طیبیؒ۔ اور ایک نسخہ میں اضافت کے ساتھ ہے۔

اور''مغرب'' میں لکھا ہے کہ مہواۃ دو پہاڑیوں کے درمیان والی جگہ کو کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ "مهواة هوّة" سے ماخوذ ہے اور ہوہ گڑھے کو کہتے ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت میں اَربعین خریفاً اضافت کے ساتھ ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ: وملك آخذ بقضاه ثم يرفع رأسه اس پر دلالت کر رہا ہے کہ قاضی اس فرشتہ کے ہاتھ میں مقہور اور عاجز ولاچار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴾ [یٰسین:۸] ''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک (پھنسے ہوئے ہیں) تو ان کے سر الل (اٹھائے) رہے ہیں''

''فان قال'': فاء تفصیلیہ ہے اور''ان'' شرطیہ ہے جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ بات اسی کے ساتھ مخصوص ہے، کسی اور سے نہیں کہی جائے گی بلکہ دوسرے لوگوں کا حال اس کے برعکس ہوگا۔ اور اس کے حق میں تو یہ کیا جائے گا:''أدخله الجنّة'' تو معنی یہ ہوگا:''وان قال أدخله الجنّة ادخلها'' یہ حدیث اصل میں حدیث ابی امامہ کی طرح ہے۔ جو کہ کتاب الامارۃ والقضاء کی فصل ثالث میں گذر گئی ہے:''ما من رجلٍ يلي امر عشرةٍ''۔

فما فوق ذالك الاّ آتاه اللّٰه عزوجل مغلولاً يوم القيامة يدہٗ الٰى عنقه فكذبرہٗ او أوبقه اثمه۔''

بعض کا کہنا ہے کہ''یرفع'' کی ضمیر''حاکم'' کی طرف راجع ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ''ملك'' کی طرف راجع ہے۔

یہ حدیث جامع صغیر میں ان الفاظ کے ساتھ ہے:''ما من حاكمٍ يحكم بين الناس الاّ يحشر يوم القيامة وملك آخذ بقفاه حتي يقفه علٰى جهنم ثم يرفع رأسه الى اللّٰه فان قال ... علي القه القاه في مهواة أربعين خريفًا''۔

اور یہ حدیث ہماری تشریح پر صریح حجت ہے۔

قیامت کے دن قاضی کیا تمنا کرے گا

۳۷۴۰: وَعَنْ عَآئِشَةَ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَأتِيَنَّ عَلَى الْقَاضِي الْعَدْلِ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يَتَمَنّٰى اَنَّهٗ لَمْ يَقْضِ بَيْنَ اثْنَيْنِ فِيْ تَمْرَةٍ قَطُّ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٦ / ٥٧

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن (جب حاکموں، سرداروں اور قانون و انصاف کے ذمہ داروں سے سخت مواخذہ ہو رہا ہوگا تو) عادل و منصف قاضی کے لئے بھی ایک ایسا لمحہ آئے گا جس میں وہ اس بات کی خواہش کرے گا کہ کاش اس نے دو آدمیوں کے درمیان ایک کھجور کے (بھی) مقدمہ کا فیصلہ نہ کیا ہوتا''۔ (احمد)

تشریح: قوله:ليأتين على القاضى العدل يوم القيامة ......:

القاضى العدل: ''العدل'' میں کئی احتمال ہیں:

① یہاں پر ''عدل'' بمعنی عادل ہے۔ کیونکہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے۔

② اس سے مراد مبالغہ ہے۔

③ یہاں پر مضاف مقدر ہے۔ ''أى ذل العدل''۔

''يوم القيامة'': رفع کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ بھی آیا ہے۔ تقدیر یہ ہوگی: ''يأتين اتيان أوزمان''۔ اس کی تائید جامع صغیر کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ بعض کا کہنا ہے کہ ''يوم القيامة'' ''ليأتين'' کے لئے فاعل ہے اور ''يتمنى'' مجرور سے حال ہے۔ لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہ ''فاعل'' سے حال ہے اور راجع محذوف ہے۔ ''اى يتمنى فيه'' اور یہ بھی جائز ہے کہ ''يوم القيامة'' ظرفیت کی بناء پر منصوب ہو۔ عبارت یہ ہوگی: ''يأتين عليه يوم القيامة من البلاء ما يتمنى أنه لم يقض'' اس صورت میں فاعل ''يتمنى'' ہوگا ''أن'' مصدریہ کی تقدیر کے ساتھ۔ سبب کی تعبیر مسبّب سے کی جاتی ہے۔ کیونکہ بلاء تمنی کا سبب ہے۔ اور'' بالعدل "التمرة'' کی قید ''ممانزل من البلاء'' میں موجود معنی میں مبالغہ کی تتمیم اور تکمیل کیلئے ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام دارقطنی نے بھی روایت کیا ہے۔

اللہ کی معیت اور قاضی

۳۷۴۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْقَاضِيْ مَالَمْ يَجُرْ، فَاِذَا جَارَ تَخَلّٰى عَنْهُ، وَ لَزِمَهُ الشَّيْطَانُ (رواه الترمذى وابن ماجة وفى رواية) فَاِذَا جَارَ وَ

كِلَهٗ اِلٰى نَفْسِهٖ۔

أخرجه الترمذى فى ٣ / ٦١٨، الحديث رقم: ١٣٣٠، وأخرجه ابن ماجه فى ٢ / ٧٧٥، الحديث رقم: ٢٣١٢

ترجمه: ''اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قاضی کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار نہیں کرتا (یعنی حق تعالیٰ کی توفیق و تائید اس کے ساتھ شامل حال ہوتی ہے) لیکن جب وہ ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے الگ ہو جاتا ہے (یعنی اس کے اوپر سے حق تعالیٰ کی تائید و توفیق کا سایہ دور ہو جاتا ہے اور شیطان اس کے ساتھ لگ جاتا ہے (یعنی اس کا ساتھی بن جاتا ہے جس کے بعد گناہ اس کا لازمی جزو بن جاتے ہیں)۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ قاضی جب ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو (اللہ تعالیٰ) اس کے کام کو اس کے سپرد کر دیتا ہے (یعنی اس کو اپنی توفیق و تائید سے محروم کر دیتا ہے''۔

تشریح: قوله ان الله مع القاضى مالم يجر......:

اللّٰہمع القاضى: اور ایک نسخہ میں ''انّ اللّٰه مع القاضى'' ہے۔

جامع صغیر کی روایت میں ہے: ''تبرأ اللّٰه منه''۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام حاکم و بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

و كله'': کاف کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

اور طبرانی کی روایت جو ابن مسعودؓ سے ہے، اور احمد کی روایت جو معقل بن یسارؓ سے ہے اس طرح ہے:

''ان اللّٰه تعالٰى مع القاضى مالم يحف عمدًا''۔

قاضی کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں

۳۷۴۲: وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ مُسْلِمًا وَيَهُوْدِيًّا اخْتَصَمَا اِلٰى عُمَرَ فَرَاَى الْحَقَّ لِلْيَهُوْدِيِّ فَقَضٰى لَهٗ عُمَرُ بِهٖ، فَقَالَ لَهُ الْيَهُوْدِيُّ: وَاللّٰهِ لَقَدْ قَضَيْتَ بِالْحَقِّ، فَضَرَبَهٗ عُمَرُ بِالدُّرَّةِ، وَقَالَ: وَمَا يُدْرِيْكَ؟ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ: وَاللّٰهِ اِنَّا نَجِدُ فِي التَّوْرَاةِ اَنَّهٗ لَيْسَ قَاضٍ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ اِلَّا كَانَ عَنْ يَمِيْنِهٖ مَلَكٌ وَعَنْ شِمَالِهٖ مَلَكٌ يُسَدِّدَانِهٖ وَيُوَفِّقَانِهٖ لِلْحَقِّ مَادَامَ مَعَ الْحَقِّ، فَاِذَاتَرَكَ الْحَقَّ عَرَجَا وَتَرَكَاهُ.

(رواه مالك)

أخرجه مالك فى الموطأ ٢ / ٧١٩، الحديث رقم: ٢ من كتاب الأقضية

ترجمه: ''اور حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک مسلمان اور ایک یہودی اپنا جھگڑا لے کر حاضر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (قضیہ کی تحقیق کے بعد) یہ دیکھا کہ یہودی حق پر ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس (یہودی) کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس یہودی

نے (اپنے حق میں فیصلہ سن کر) ان سے عرض کیا: ''خدا کی قسم! آپ نے حق کے مطابق فیصلہ دیا ہے (یا یہ کہ آپ نے حق تعالیٰ کی توفیق و تائید سے منصفانہ فیصلہ دیا ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (یہ سن کر) اس کے ایک درہ مارا اور فرمایا تجھے کیسے علم ہوا کہ میں نے حق کی مطابق فیصلہ دیا ہے؟ یہودی نے کہا: ''خدا کی قسم! ہم تورات میں (یہ لکھا ہوا) پاتے ہیں کہ جو بھی قاضی حق کے مطابق فیصلہ دیتا ہے اس کے دائیں جانب اور بائیں جانب ایک ایک فرشتہ ہوتا ہے وہ دونوں فرشتے اس کو تقویت پہنچاتے ہیں اور جب تک وہ حق پر رہتا ہے اس کو حق کی توفیق دیتے ہیں اور جب قاضی حق کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ دونوں فرشتے آسمان پر چلے جاتے ہیں اور اس کو چھوڑ دیتے ہیں''۔ (مالک)

تشریح: قوله: ان مسلماو یهودیا اختهما ......:

مسلمان اور یہودی دونوں اپنا مقدمہ لے کر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آ گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے حق یہودی کا سمجھا اس لئے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا' تو اس پر یہودی نے کہا بخدا! تم نے حق فیصلہ کر دیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کی توفیق کے ساتھ اور تم اس شخص کی طرف مائل نہیں ہوئے جو تیرے دین پر تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو کوڑا مارا۔

''درہ'' شد کے ساتھ ہے۔ اور یہ آلہ ضرب ہے۔ اس کو امام نوویؒ نے تہذیب الاسماء میں اسی طرح ضبط کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے اس پر کوڑا اٹھایا تھا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت عمرؓ نے اس کو کیوں مارا؟ حالانکہ وہ ضرب کا مستحق نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے سچ کہا تھا۔ اور یہودی کا یہ کہنا: و الله انا نجد فی التوراة و ما یه ریك کے ساتھ کیا مناسبت رکھتا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے اس کو ایسا نہیں مارا کہ جس سے اس کو زخم کا نشان پڑ گیا ہو بلکہ صرف اصابت کی غرض سے مارا تھا۔ جیسا کہ لوگوں میں مذاق کے طور پر ہوتا رہتا ہے۔ اور جواب کی تطبیق یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ حق سے دوسری طرف مائل ہو جاتے اور وہ مسلمان کے حق میں یہودی کے خلاف فیصلہ صادر کرتے تو اس وقت وہ ''مسدو'' نہ ہوتے۔ جب حضرت عمرؓ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا تو اس نے ان کی تسدید، ثبات قدم و عدم میلان عن الحق کو پہچان لیا بغیر کسی تغییر کے کہ یہ موفق ہے اور مسدد ہے۔

قضاء کی سنگینی کا بیان

٣٧٤٣ وَعَنِ ابْنِ مَوْهَبٍ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ لِابْنِ عُمَرَ: اقْضِ بَيْنَ النَّاسِ، قَالَ: اَوَتُعَافِيْنِيْ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ؟ قَالَ: مَا تَكْرَهُ مِنْ ذَالِكَ وَقَدْ كَانَ اَبُوْكَ يَقْضِيْ؟ قَالَ: لِاَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ كَانَ قَاضِيًا فَقَضٰى بِالْعَدْلِ فَبِالْحَرِيِّ اَنْ يَنْقَلِبَ مِنْهُ كَفَافًا، فَمَا رَاجَعَهُ بَعْدَ ذٰلِكَ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٣ ٦١٢ الحدیث رقم: ١٣٢٢

ترجمہ: ''اور حضرت ابن موہب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے (اپنے زمانہ

خلافت میں) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ ''لوگوں کے قاضی بن جاؤ (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں منصب قضا کی پیش کش کی) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ''امیر المؤمنین! کیا مجھے اس (منصب) سے معاف نہیں فرما دیتے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تم اس منصب کو کیوں ناپسند کرتے ہو؟ حالانکہ تمہارے والد (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) تو (اپنے دور خلافت کے علاوہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں) قضاء کا کام کرتے تھے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جو شخص منصب قضاء پر فائز ہو اور وہ انصاف سے فیصلے کرے تو بڑے مقدر کی بات ہے کہ وہ اس منصب سے برابر سرابر جدا رہے (یعنی نہ نقصان پہنچائے نہ فائدہ' نہ ثواب پائے نہ عذاب)۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: اقض بين الناس۔۔۔۔ ان يقلب منه كفافا:

روایت ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمرؓ سے فرمایا کہ لوگوں کے درمیان منصب قضاء کو تم قبول کرلو۔ (یعنی قاضی بن جاؤ) تو انہوں نے فرمایا کہ اے امیر المؤمنین کیا آپ مجھ پر رحم فرمائیں گے۔ اور مجھے عافیت دیں گے؟ یہ دراصل **علی سبیل الدُّعا** مہربانی اور رحم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اس میں کیا چیز ناپسند کرتے ہو حالانکہ آپ کے والد لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے' تو انہوں نے کہا' کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ''**من كان قاضياً**......۔

''**فقضٰى بالعدل**'' یہ جملہ عطف علی الشرط ہے۔

''**فبالحرى أن ينقلب منه كفافاً**'' زیادہ مناسب اور اولیٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے برابر سرابر نکل جائے۔ یعنی اس سے خلاصی حال کرلے۔ یہ جواب شرط ہے۔ کہا جاتا ہے: **فلان تحرى بكذا وحر بكذا فبالحرى أن يكون كذا أى جدير وخليقٌ**''۔

پس ''حری'' اگر اسم فاعل ہو تو یہ مبتداء بنے گا۔ اور اس کی خبر ''**أن ينقلب**'' بنے گا۔ اور باء زائدہ ہوگا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''**بحسبك درهم**''۔

''**والجدير كونه منقلباً منه كفافاً**'' اور اگر اس ''حری'' کو مصدر مان لیں۔ تو یہ خبر ہوگی اور مبتداء اس کے بعد ہوگا۔ اور ''باء'' محذوف کے ساتھ متعلق ہوگا۔ ''**اى كونه، منقلباً ثابتاً بالاستحقاق**''۔ یہ علامہ طیبیؒ کی تحقیق ہے۔

ایک نسخہ میں ''**أن ينقلب**'' کی جگہ ''**أن يَنْفَلِت**'' آیا ہے۔ یعنی اس سے برابر سرابر خلاص ہو جائے کہ ان سے اس کو کچھ ملے گا اور نہ اس پر کچھ آئے گا یعنی نہ اس کو ثواب ملے اور نہ ہی سزا۔

''صاحب النہایہ'' نے کہا ہے۔ اور عمرؓ کی حدیث میں آیا ہے:

''**ودَّت أنّي سلحت من الخلافة كفافاً لا عليَّ ولالِيْ**'' میری خواہش ہے کہ میں خلافت اس طرح محفوظ ہو جاؤں کہ میرے لئے کچھ ہو اور نہ میرے اوپر کچھ ہو۔ اور ''کفاف'' اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو زائد نہ بقدر الحاجت ہو۔

یہ منصوب علی الحال ہے۔

بعض نے مطلب بیان کیا ہے۔ ''مکفوفًا عنی شرّها'' یعنی میں اس کے شر سے محفوظ رہ جاؤں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ کہ نہ وہ مجھ سے کچھ حاصل کرے اور نہ میں اس سے کچھ حاصل کروں۔ یعنی وہ مجھ سے رک جائے اور میں اس سے رک جاؤں۔ علامہ طیبیؒ نے اس کا معنی یہ کہا ہے کہ وہ قضاء سے بچ جائے اور قضاء اس سے بچ جائے۔

اس میں بھی کوئی خفاء نہیں ہے کہ دوسرے معنی کا تقاضا یہ ہے کہ ''کفاف'' کاف کے کسرہ کے ساتھ ہو۔ اور ''کافہ'' سے مصدر ہو۔ یعنی ''کفاف و مکاففةً''۔

طیبیؒ فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص منصب قضاء پر فائز ہو جائے اور وہ حق کی تلاش میں خوب کوشش کرے اور اس میں اپنی جدوجہد اور کوشش کو بھرپور طریقے سے لگائے تو یہ زیادہ مناسب ہے کہ اس کو ثواب بھی نہ ملے اور نہ ہی اس کو عذاب اور سزا ملے۔ جب رہنا ہی ہو تو اس کی ''قبولیت'' میں کیا فائدہ ہے۔ اور اس کے معنی میں ایک شعر بھی ہے۔

علٰی أننی راضٍ بأن أحمل الهوٰی ☆ وأخلص منه لا علیّ و لا لیا

قوله: ''فما راجعه'':

یعنی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کوئی جواب نہ دیا۔ اور دوبارہ مطالبہ نہ کیا اور جو مطالبہ کیا تھا اس کو واپس لے لیا۔

منصب قضا کو رد کرنے کا بیان

۳۷۴۴: وَفِیْ رِوَایَةِ رَزِیْنٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ لِعُثْمَانَ: یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! لَا اَقْضِیْ بَیْنَ رَجُلَیْنِ، قَالَ: فَاِنَّ اَبَاکَ کَانَ یَقْضِیْ فَقَالَ: اِنَّ اَبِیْ لَوْ اَشْکَلَ عَلَیْهِ شَیْءٌ سَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَلَوْ اَشْکَلَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَیْءٌ سَالَ جِبْرِیْلَ عَلَیْهِ السَّلَامُ، وَ اِنِّیْ لَا اَجِدُ مَنْ اَسَالُهٗ، وَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَقَدْ عَاذَ بِعَظِیْمٍ، وَسَمِعْتُهٗ یَقُوْلُ: مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَاَعِیْذُوْهُ، وَاِنِّیْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تَجْعَلَنِیْ قَاضِیًا فَاَعْفَاهُ، وَقَالَ: لَا تُخْبِرْ اَحَدًا۔

رواہ رزین

ترجمہ: اور رزین کی روایت میں جو انہوں نے حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے یہ الفاظ ہیں کہ ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ''اے امیر المؤمنین میں (تو) دو آدمیوں کے درمیان بھی کوئی حکم و فیصلہ نہیں کروں گا (چہ جائیکہ میں بہت زیادہ لوگوں کا قاضی بنوں)''۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارے والد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) تو لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ''میرے والد کو اگر کوئی دشواری پیش آتی تھی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا کرتے تھے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی دشواری پیش آتی تو

آپ ﷺ جبرئیل علیہ السلام سے پوچھ لیا کرتے تھے جب کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں پاتا جس سے میں دریافت کرلیا کروں اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی اس نے بڑی ذات کی پناہ مانگی''۔ نیز میں نے آپ ﷺ کو یہ (بھی) ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذریعہ پناہ طلب کرے' اس کو پناہ دو''۔ لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کے ذریعے اس بات سے پناہ طلب کرتا ہوں کہ آپ مجھے قاضی مقرر کریں''۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو معاف کیا' لیکن ان سے فرمایا کہ (کسی) اور کو آگاہ نہ کرنا (کہ وہ منصب قضا قبول نہ کرے ورنہ لوگ عام طور پر اس منصب کو قبول کرنے سے گریز کرنے لگیں گے اور نظام حکومت معطل ہو کر رہ جائے گا)۔''

تشریح: قوله:''لا أقضي بين رجلين'':

یہ جملہ اس امر بالقضاء کے جواب میں ہے کہ میں دو آدمیوں کے مابین فیصلہ نہیں کروں گا۔

ان ابی لو أشكل عليه شي سأل رسول الله ﷺ: حدیث کا ظاہر یہ بتلا رہا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ کی زندگی میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مسلک یہ تھا کہ مجتہد کیلئے کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں، (دوسرا مجتہد) چاہے وہ خلیفہ ہو یا غیر خلیفہ ہو۔

''**من عاذ بالله فقد عاذ بعظيم**'' اور ''جامع صغیر'' میں ہے: ''**من عاذ بالله فقد عاذ بمعان**''

''**فأعفاه**'' یہ ''**عفاه**'' کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کو معاف کر دیا اور اس کو اجازت دے دی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کسی پر جبر و اکراہ نہیں کیا کرتے۔ اور بعض اصول مصححہ میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''**لا تُخبر**'' یعنی تم کسی کو یہ مت بتلاؤ جو باتیں تم نے کہی ہیں کیونکہ اس سے منصب قضاء کا باب مسدود ہو کر رہ جائے گا۔ اور کچھ غریب احادیث بھی ہیں جو ''ذم القضاء'' کے بارے میں آتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

عج حجر الى الله تعالٰى فقال: الهي و سيدى عبد تك كذا و كذا سنة ثم جعلتني في كنيف۔ فقال: أو ما ترضٰى ان عدلت بك عن مجالس القضاء۔

ایک پتھر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر فریاد کرنے لگا اور بولا: اے میرے اللہ اے میرے آقا! میں نے اتنے اتنے سال تیری عبادت کی۔ پھر بھی تو نے مجھے ایک پائخانہ کی بنیاد میں لگوا دیا۔ تو للہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ میں نے تم کو مجالس قضاء سے دور رکھا ہے۔ اس حدیث کو امام سیوطیؒ نے جامع صغیر میں ذکر کیا ہے۔ [الجامع الصغیر ۲/۳۳۰، الحدیث رقم ۵۳۹۶]

بَابُ رِزْقِ الْوُلَاةِ وَهَدَايَاهُمْ

حکام کو تنخواہ اور ہدایا و تحائف دینے کا بیان

''رزق الولاة'' میں اضافة المصدر الى الفاعل ہے۔ یہ ترکیب آپ علیہ السلام کے اس ارشاد پر مبنی ہے: ''من

استعملناه على عملٍ فرزقناه رزقًا'' یہ حدیث عنقریب آگے آئے گی۔
واضح رہے کہ''رزق''اور''عطاء''میں فرق ہے، کہ عطاء وہ مال ہوتا ہے جو فوجی کو بیت المال سے سال میں ایک یا دو مرتبہ دیا جاتا ہے۔اور''رزق''تنخواہ کو کہتے ہیں جو ہر مہینہ اس کو دی جاتی ہے۔

الفصل الاول :

۳۷۴۵:عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:مَا اُعْطِيْكُمْ وَلَا اَمْنَعُكُمْ' اَنَا قَاسِمٌ اَضَعُ حَيْثُ اُمِرْتُ . (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٢١٧' الحديث رقم : ٣١١٧

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''میں نہ تو تمہیں عطا کرتا ہوں اور نہ تم سے روکتا ہوں' میں تو صرف بانٹنے والا ہوں کہ جس جگہ مجھے رکھنے کا حکم دیا جاتا ہے میں وہاں رکھ دیتا ہوں''۔(بخاری)

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس وقت ارشاد فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اموال کو تقسیم فرما رہے تھے تا کہ تقسیم میں تفاضل کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کے دلوں میں کچھ شک وشبہ واقع نہ ہو۔

قولہ:میں تم میں سے کسی کو کچھ عطاء کرتا ہوں تو اس وجہ سے نہیں کہ میرا دل اس کی طرف مائل ہوتا ہے' اور نہ ہی کسی سے اس وجہ سے روکتا ہوں کہ میرا دل اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہاں دونوں فعلوں کو صیغۂ مضارع کے ساتھ ذکر کیا' ماضی کو ذکر نہیں کیا تا کہ ہر حال اور زمان میں اس کے استمرار پر دلالت ہو جائے اور یہی اس اگلے جملہ کا مطلب ہے:''أنا قاسم أضع''میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور میں منع وعطا کو وہاں رکھتا ہوں جہاں مجھے حکم دیا جائے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ''أنا قاسم'' کا جملہ کلام سابق کیلئے بطور بیان ہے اور فاعل معنوی کی تقدیم کی وجہ سے اس میں ''اختصاص'' کا معنی پیدا ہو گیا ہے۔جیسا کہ آپ کہتے ہیں:''أنا كفيت سهمَكَ''اور اگر یہ اختصاص نہ مانا جائے تو اس جملہ کا بیان ہونا صحیح نہیں ہوگا۔کیونکہ اس جملہ کا پھر معنی اس طرح بنے گا''جو کچھ میں تم کو دیتا ہوں' وہ میں نے تم کو نہیں دیتا اور جو کچھ میں تم سے روکتا ہوں اس کو میں نہیں روکتا۔کیونکہ معطی اور مانع تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔اور میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں۔میں تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کے حکم سے تقسیم کروں گا۔اور وہاں پر صرف کروں گا جہاں مجھے حکم دے دیا گیا تو اس صورت میں''أضع حيث أمرتُ''بیان کیلئے بیان ہوگا۔اور اس میں اس شخص کے خلاف حجت بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ''أنا عارفٌ'' اختصاص کا فائدہ نہیں دیتا۔اس لئے کہ یہ''أنا عرفت''فعل کی طرح نہیں ہے۔

دراصل حدیث شریف میں اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف التفات ہے:﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ﴾

[التوبہ:۵۸]

امام حاکمؒ نے ابوہریرہ سے روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: ''أنا أبو القاسم ألله يعطي وأنا أقسمُ''۔

[أخرجه الحاكم في المستدرك ٢/٦٤]

اللہ کے مال میں ناحق تصرف کرنے کا بیان

٣٧٤٦: وَعَنْ خَوْلَةَ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ رِجَالاً يَتَخَوَّضُوْنَ فِيْ مَالِ اللّٰهِ بِغَيْرِ حَقٍّ، فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحة ٦ / ٢١٧، الحديث رقم: ٣١١٨

ترجمہ: ''اور حضرت خولہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' کچھ لوگ اللہ کے مال میں ناحق تصرف کرتے ہیں (یعنی زکوٰۃ، غنیمت اور بیت المال کے مال میں امام وحکمران کی اجازت کے بغیر تصرف کرتے ہیں اور اپنے حق اور اپنی محنت سے زیادہ وصول کرتے ہیں) قیامت کے دن ان کے لئے (جہنم کی) آگ ہے۔'' (بخاری)

راویٔ حدیث:

خولہ بنت ثامر۔ یہ خولہ بنت ثامر انصاریہ ہیں۔ ان کی حدیث اہل مدینہ میں زیادہ ہے۔ ان سے نعمان بن ابی العیاش زرقی نے روایت کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خولہ قیس بن مالک بن الخبار کی بیٹی ہیں اور ثامر قیس کا لقب ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ دونوں علیحدہ علیحدہ عورتیں ہیں۔

تشریح: قوله: ان رجالا يتخو ضون في ......: ''رجالاً'' میں عموما ہے عمال وغیر عمال دونوں کو شامل ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ ''خوض'' پانی میں داخل ہونے کو کہتے ہیں اور اس میں گذرنا۔ لیکن عام امور کیلئے اس سے استعارہ لیا جاتا ہے اور اکثر افعال مذمومہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ آیت کریمہ ہے: ﴿ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ [الانعام: ۹۱] اور باب تفعل کی خاصیت مبالغہ ہے۔ یعنی بیت المال کے اموال زکوٰۃ، خراج، جزیہ اور مال غنیمت وغیرہ میں تصرف کرتے ہیں اور امام وقت سے اجازت لئے بغیر ان اموال میں اپنے استحقاق اور کام کی اجرت سے زیادہ لیتے ہیں۔

''فلهم النّار يوم القيامه'' یہ ''انّ'' کی خبر ہے۔ اور اس پر فاء کو اس لئے داخل کیا ہے کہ اس کا اسم نکرہ موصوفہ ہے۔

امیر کا وظیفہ بیت المال کے ذمہ ہے

٣٧٤٧: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا اسْتُخْلِفَ اَبُوْبَكْرٍ قَالَ: لَقَدْ عَلِمَ قَوْمِيْ اَنَّ حِرْفَتِيْ لَمْ تَكُنْ تَعْجِزُ عَنْ مُؤْنَةِ اَهْلِيْ، وَشُغِلْتُ بِاَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ، فَسَيَاكُلُ اٰلُ اَبِيْ بَكْرٍ مِنْ هٰذَا الْمَالِ، وَيَحْتَرِفُ لِلْمُسْلِمِيْنَ فِيْهِ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤ / ٣٠٣، الحديث رقم: ٢٠٧٠

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ ''میری قوم کے لوگ (یعنی مسلمان) جانتے ہیں کہ میرا کاروبار میرے اہل وعیال کے اخراجات کے لئے کافی تھا' اب مجھے مسلمانوں کے معاملات کے حوالے سے مشغول کر دیا گیا ہے (اور اس کی وجہ سے اپنا کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا) تو ابوبکر کے اہل وعیال بیت المال کے مال سے ضروریات پوری کریں گے اور ابوبکر (اس بیت المال کی آمدنی میں اضافہ کر کے اور اس کی حفاظت کر کے اور اس کو مسلمانوں کی ضروریات و دیگر مصارف میں اس کو خرچ کر کے مسلمانوں کی خدمت کرے گا''۔ (بخاری)

تشریح: ''**استخلف**'': یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ''لما'' قال کیلئے ظرف ہے۔ یہ دراصل اپنے اہل وعیال پر جو انفاق بیت المال سے کیا کرتے تھے' اس کا عذر پیش کر رہے ہیں کہ میری قوم کو معلوم ہے۔ ''النہایہ'' میں ہے کہ حرفت وصناعت دراصل کسب کی صورتیں ہیں۔

''**لم تکن تعجز**'' ''القاموس'' میں ہے کہ معجز، ضعف اور کمزوری کو کہتے ہیں۔

''**بأمر المسلمین**'' اور دوسرے نسخہ میں ''**بأمور المسلمین**'' ہے۔

''**فسیأکل آل أبی بکر**'' : ''آل ابی بکر'' میں التفات ہے۔

''**من ھذا المال**'': اس ''**حاضر فی الذھن**'' مال کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے بیت المال کا مال ہے۔

''**یحترف**'' سے مراد تصرف ہے۔ ''**حرفۃ**'' مادہ سے متعلق فعل لانا اس لئے ہے تا کہ ماقبل سے مشاکلت ہو جائے۔ چونکہ ماقبل میں انّ **حرفتی** کے الفاظ آئے ہیں۔

شمنیؒ کہتے ہیں کہ حدیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے حاکم وقت بیت المال میں سے اتنا مال لے سکتا ہے جو اس کی ضروریات کو کفایت کر جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کپڑے کے تاجر تھے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ غلہ بیچتے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کھجور وگندم کا کاروبار کیا کرتے تھے، اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ عطر کے تاجر تھے۔ اھ۔

بہترین تجارت کپڑے کی ہے۔ اور پھر عطر کی ہے۔ اور حدیث ابوسعید میں سند ضعیف کے ساتھ آیا ہے۔

''**لو اتجر اھل الجنّۃ لا تجر وا فی البر ولو اتجر اھل النّار لا تجروا فی الصوفِ**'':

اگر اہل جنت تجارت کرتے تو وہ کپڑے کی تجارت کرتے اور اگر اہل جہنم تجارت کرتے تو وہ اون کا کاروبار کرتے۔'' (اس روایت کو ابومنصور نے مسند الفردوس میں روایت کیا ہے)۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ ''**لقد علم**'' میں لام قسمیہ ہے۔ یعنی میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ بات مسلمانوں کے درمیان مشہور ومعروف ہے کہ میں کسب کرتا ہوں اور اپنے اہل وعیال کے نفقہ کیلئے تجارت کیا کرتا ہوں، اور میرا کسب اس سے عاجز نہیں ہے چنانچہ کلام ان کی طرف سے تمہید اور اعتذار ہے۔ اس قدر مال کہ جتنا اس کے اہل بیت کو کافی ہو جائے۔ اور ''**فسیأکل**'' میں فاء کو لائے اس لئے کہ فاء نتیجہ ہے۔ اور آل ابی بکر سے مراد ان کے اہل وعیال ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ان کی اپنی ذات ہو اور ''سیاق وکلام'' بھی اس بات پر دال ہے کہ آل ابی بکر سے مراد ان کی اپنی ذات ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے اپنے لیے دو مد غلّہ اور بطور سالن کے زیتون وغیرہ گرمی میں ازار اور چادر، سردی کیلئے ایک جبہ، ایک سواری جو سفر وحضر میں ان کی حاجت وضرورت کیلئے کافی ہو مقرر فرمائی تھی۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ عامل جس مال میں کام کر رہا ہے اس سے اتنا مال لے سکتا ہے جو اس کے عمل اور کام کے برابر ہو جب اس کے اوپر ایسا کوئی امام مقرر نہ ہو جو اس کیلئے ایک خاص قسم کی اجرت اور مزدوری کا تقرر کرے۔

اُجرت سے زائد مال لینا

الفصل الثانی:

۳۷۴۸: وَعَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَرَزَقْنٰهُ رِزْقًا فَمَا اَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُوْلٌ ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۳۵۳' الحديث رقم: ۲۹۴۳

ترجمہ: ''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کو ہم نے کسی کام پر مقرر کیا۔ پھر ہم نے اس کو رزق دیا (یعنی اس کے اس کام کی اجرت وتنخواہ مقرر کر دی) اس کے بعد اگر وہ (اپنی تنخواہ سے زائد) کچھ وصول کرے گا تو یہ (مال غنیمت میں) خیانت ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: من اسعملناه على عمل ......:

''فما أخذ بعد ذلك'': یہ شرط ہے ''ما'' موصولہ ہے اور عائد محذوف ہے۔ ''فهو غلولٌ'' یہ (جملہ) خبر ہے۔ یہاں ''فاء'' کو ذکر کیا، اس لئے کہ ''ما'' موصولہ معنی شرط کو متضمن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ موصوفہ ہو۔

''غلول: (بضم العين واللام)'' غنیمت اور مال فے میں خیانت کو کہتے ہیں۔

عامل کی اجرت کا بیان

۳۷۴۹: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ: عَمِلْتُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَمَّلَنِيْ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۳۵۳' الحديث رقم: ۲۵۴۴' والنسائي في السنن ۵ / ۱۰۲' الحديث رقم: ۲۶۰۴' وأحمد في المسند ۱ / ۵۲

ترجمہ: ''اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں (آپؐ کے حکم سے امارت کا کوئی) کام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (اس کام کی) اُجرت عطا فرمائی۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قوله: عملت على عهد رسول الله ﷺ......: ''عملتُ''

''فعملنی'' یہ تشدید میم کے ساتھ ہے چنانچہ تو انہوں نے مجھے اجرت' عمالہ یعنی مزدوری دی۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یعنی مجھے میرا "عمالہ" اور میرے عمل کی اجرت دی۔ اور اسی طرح "أعملني" بھی ہے اور بسا اوقات "عملني" بمعنی "ولاني" "وامرني" بھی استعمال ہوتا ہے۔ اھ۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ پہلی توجیہ اور معنی ہی اولیٰ ہے۔ کہ تقدیری عبارت یہ ہوگی کہ میں نے مسلمانوں کے امور اور مصالح میں سے کوئی عمل سرانجام دیا تو انہوں نے مجھے میری مزدوری دے دی۔ اور دوسرا معنی اس بات کے زیادہ مناسب نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ نے معنی لغوی کا مراد لیا ہے۔ دوسری توجیہ کے طور پر ذکر نہیں کیا کہ جس پر کوئی اعتراض وارد ہو جائے۔ اگر یہ معنی بھی مراد لیا جائے تو بھی اس میں کوئی محذور نہیں ہے۔ پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ میں نے عمل کیا تو آپ نے اس کو اچھا جانا تو پھر مجھے ایک اور عمل حوالے کر دیا زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث اعطاء عمالۃ کے بارے میں خاموش ہے تو فی الجملہ یہ بھی باب کے مناسب ہوگا۔ اور "القاموس" میں کہا ہے: "**عمل فلانٌ عليهم**" (واللہ اعلم بالصواب)

خیانت کا اُخروی انجام

۳۷۵۰: وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ: بَعَثَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْيَمَنِ، فَلَمَّا سِرْتُ اَرْسَلَ فِيْ آثَرِيْ فَرُدِدْتُ، فَقَالَ: اَتَدْرِيْ لِمَ بَعَثْتُ اِلَيْكَ: تُصِيْبَنَّ شَيْئًا بِغَيْرِ اِذْنِيْ فَاِنَّهٗ غُلُوْلٌ، وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لِهٰذَا دَعَوْتُكَ، فَامْضِ لِعَمَلِكَ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذيغ في السنن ۳ / ۶۲۱، الحديث رقم: ۱۳۳۵

ترجمہ: "اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (عامل بنا کر) یمن کی طرف بھیجا (جب میں یمن جانے کے لئے روانہ ہوا (اور کچھ دور چلا گیا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پیچھے (قاصد) بھیج کر مجھے واپس بلا لیا میں لوٹ کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم جانتے ہو، میں نے تمہیں بلانے کے لئے (آدمی) کیوں بھیجا تھا؟ (میں نے یہ آگاہی دینے کے لئے تمہیں بلایا ہے کہ) تم (اپنی مدت ملازمت کے دوران) میری اجازت کے بغیر کچھ نہ لینا کیونکہ (اگر تم میری اجازت کے بغیر کوئی چیز لو گے تو) یہ خیانت ہوگی اور جو شخص خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن وہ چیز لے کر آئے گا جس میں اس نے خیانت کی ہے۔ یہی کہنے کے لئے میں نے تمہیں بلایا تھا، اب تم اپنے کام پر جاؤ"۔ (ترمذی)

تشریح: **قوله: فلما سرت ارسل في اثري ......:**

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "اثر الشیٔ" اس چیز کے حصول کو کہتے ہیں جو اس کے وجود پر دلالت کرتی ہو اور اس وجہ سے اس راستے کو بھی "اثر" کہتے ہیں کہ جس سے کسی کے راستے پر چلنے کا پتہ چلایا جائے۔

أَثر: ہمزہ اور ثاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ، نیز ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ۔

"**فرددتُ**" یہ صیغہ مجہول ہے۔

"**لا تصيبن**": یہاں کچھ کلام مقدر ہے: "**بعثت اليك لاوصيك وأقول لك لا تصيبن**"۔

''ومن يغلل يأت بما غلَّ يوم القيامه'': طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''ماغل'' سے مراد وہی ہے جو اس حدیث میں بیان ہوا: ''لا ألفين احدكم يحبئى يوم القيامة علٰى رقبته بعير له رغاء''۔

عامل کے لئے کتنا مال جائز ہے؟

۳۷۵۱: وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ كَانَ لَنَا عَامِلاً فَلْيَكْتَسِبْ زَوْجَةً، فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ خَادِمٌ فَلْيَكْتَسِبْ خَادِمًا، فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ مَسْكَنٌ فَلْيَكْتَسِبْ مَسْكَنًا (وَفِيْ رِوَايَةٍ) مَنِ اتَّخَذَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَهُوَ غَالٌّ . (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داود فى السنن ۳ / ۳۵٤، الحديث رقم: ۲۹٤۵، وأحمد فى المسند ٤ / ۲۲۹

ترجمہ: ''اور حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص ہمارا (یعنی مسلمانوں کا) عامل (کسی جگہ کا حاکم وکارپرداز) بنا (اگر اس کے بیوی نہ ہو تو بیت المال میں سے مہر کی ادائیگی کر کے) اس کو چاہئے کہ وہ ایک بیوی بیاہ لے۔ اگر اس کے پاس کوئی خادم (غلام ولونڈی) نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ ایک خادم خرید لے اور اگر اس کا کوئی گھر نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ایک گھر خرید لے''۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اگر وہ اس کے علاوہ کچھ حاصل کرے گا تو وہ خیانت کرنے والا ہوگا''۔ (ابوداود)

تشریح: قوله: من كان لناعا ملا ......: مظہرؒ کہتے ہیں کہ اس کیلئے بیت المال کے اس مال میں سے جو اس کے تصرف میں ہے، اپنی بیوی کا مہر اس کا نان نفقہ لینا جائز ہے اور اسی طرح ہر اس چیز کیلئے جو اس کیلئے ضروری ہو، لیکن بغیر اسراف اور عیش پرستی کے۔ اگر اس نے بقدر ضرورت سے زیادہ لیا تو وہ اس پر حرام ہے۔

عامل کی خیانت کی مذمت

۳۷۵۲: وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ عَمِيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَيُّهَا النَّاسُ! مَنْ عُمِّلَ مِنْكُمْ لَنَا عَلٰى عَمَلٍ، فَكَتَمَنَا مِنْهُ مَخِيطًا فَمَا فَوْقَهُ، فَهُوَ غَالٌّ يَاتِيْ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اقْبَلْ عَنِّي عَمَلَكَ قَالَ: وَمَا ذَاكَ؟ قَالَ: سَمِعْتُكَ تَقُوْلُ كَذَا وَكَذَا قَالَ: وَاَنَا اَقُوْلُ ذٰلِكَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَلْيَأْتِ بِقَلِيْلِهٖ وَكَثِيْرِهٖ، فَمَا اُوْتِيَ مِنْهُ اَخَذَهُ وَمَا نُهِيَ عَنْهُ انْتَهٰى۔ (رواه مسلم وابوداود وَاللَّفظ لَهٗ)

أخرجه مسلم فى صحيحه ۳ / ۱٤٦۵، الحديث رقم: (۳۰، ۱۸۳۳) وأبو داود فى السنن ٤ / ۱۰، الحديث رقم: ۳۵۸۱، وأحمد فى المسند ٤ / ۱۹۲

ترجمہ: ''اور حضرت عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! تم میں سے جس شخص کو کسی کام کا عامل مقرر کیا جائے (یعنی جس کو ہم کسی

خدمت مثلاً زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے پر مامور کریں) اور وہ اپنے اس کام کے حاصل (آمدنی) میں سے سوئی کے برابر یا اس سے زائد ہم سے پوشیدہ رکھے (یعنی وہ جو کچھ وصول کرے' اس میں سے ہماری اجازت اور ہمارے علم کے بغیر تھوڑا یا بہت لے لے) تو وہ خیانت کرنے والا ہے اور وہ قیامت کے دن اس (خیانت کی ہوئی چیز) کو لے کر آئے گا''۔ (یہ سن کر) ایک انصاری شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگے کہ ''یارسول اللہ! آپ نے (زکوٰۃ وصول کرنے کا) جو کام میرے سپرد کیا ہے وہ مجھ سے واپس لے لیجئے''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''یہ کیوں؟'' اس نے عرض کیا کہ میں نے جو آپ ﷺ کو اس اس طرح فرماتے ہوئے سنا ہے (یعنی آپ ﷺ نے اس کام کے سلسلے میں جو وعید بیان فرمائی ہے اس کی وجہ سے میں بہت خوفزدہ ہو گیا ہوں کیونکہ یہ کام لغزش سے خالی نہیں ہے۔ اگر میں کسی لغزش میں مبتلا ہو گیا تو قیامت کے دن کیا جواب دوں گا؟) آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں' میں پھر یہی کہتا ہوں کہ ہم جس شخص کو عامل مقرر کریں اس کو چاہئے کہ وہ جو کچھ وصول کرے' خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ سب ہمارے سامنے پیش کر دے اور اس میں سے اس کو (اس کی اجرت' تنخواہ کے طور پر) جس قدر دیا جائے وہ اس کو لے لے اور جس چیز سے اس کو روک دیا جائے اس سے باز رہے (اب اس واضح ہدایت وتنبیہ کے بعد جو شخص اس کام کو انجام دے سکے وہ اس کی ذمہ داری قبول کرے اور جو شخص ان شرائط کے ساتھ اس ذمہ داری کی انجام دہی میں اپنے کو معذور سمجھے وہ اس کی ذمہ داری کو قبول نہ کرے'')۔ (مسلم' ابوداؤد) الفاظ ابوداؤد کے ہیں''۔

تشریح: قوله: **یا یها الناس من عمل منکم** ......: ''**عمل**'': عین کے ضمہ اور تشدید میم کے ساتھ ہے۔

''**فکتمنا**'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر فاء تعقیب کیلئے ہے جو ترقی کا فائدہ دے رہی ہے۔ ''**ای مخیطا فما فوق المخیط فی الحقارة**''۔

اس کی مثال یہ آیت ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ [البقرة:۲۶]

قیامت کے روز اس سوئی یا جو کچھ اس نے خیانت کی تھی اس کو لے کر آئے گا درانحالیکہ وہ چیز اس کی گردن پر ہوگی' تاکہ اس کو **علی رؤس الأشهاد** لوگوں کے درمیان رسوا کیا جائے۔

''**وما ذاك**'' یہ اشارہ **ما فی الذهن** کی طرف ہے۔

یہ ماقبل کی تاکید ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''**من استعملناه**'' ماقبل معنی کی مزید تکریر وتبیین کے لئے ہے۔ یعنی میں یہ بات کہتا ہوں اور میں اس سے رجوع نہیں کرتا۔

فما أوتی منه ......: جو استطاعت رکھے۔ تو یہ عمل کرے۔ اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو۔ تو اس کو ترک کرنا چاہیے۔

عرضِ مرتب:

حدیث کو فصل اول میں ذکر کرنا چاہئے تھا کیونکہ یہ روایت مسلم شریف کی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت

۳۷۵۳: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيْ ۔

(رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود في السنن ٤ / ٩ الحديث رقم : ٣٥٨٠، والترمذى فى ٣ / ٦٢٣، الحديث رقم : ١٣٣٧، وابن ماجه فى ٢ / ٧٧٥، الحديث رقم : ٢٣١٣، وأحمد فى المسند ٢ / ١٦٤

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے اور رشوت وصول کرنے والے (دونوں) پر لعنت فرمائی ہے''۔ ابوداؤد، ابن ماجہ۔

تشریح: اور ''رشوت'' کا اصل میں ''رشاء'' سے ماخوذ ہے۔ وہ چیز جس کے ذریعے پانی تک پہنچا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رشوت وہ مال ہے جو حق کے ابطال یا احقاق باطل کیلئے دیا جائے۔ البتہ وہ مال جو اس لئے دیا جائے تا کہ حق تک پہنچا جائے یا اس کے ذریعے سے اپنے نفس سے ظلم کو دور کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اسی طرح ''آخذ'' یعنی جب وہ اس لئے لے تا کہ وہ صاحب الحق کی اصابت میں سعی وکوشش کرے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ قضاۃ اور ولاۃ کے علاوہ میں ہو تب کیونکہ حق کو مستحق تک پہنچانا اور پھر ظالم کو مظلوم سے دفع کرنا تو ایسے امور ہیں جو ان پر واجب اور لازم ہیں تو اس پر کچھ لینا ان کیلئے جائز نہیں ہے۔ ابن الملک نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور یہ امام خطابی کے قول سے مأخوذ ہے'' مگر ''وکذا الآخذ'' کیونکہ یہ بظاہر فصل ثالث کی حدیث اوّل کے منافی ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ روی کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حبشہ کی سرزمین میں کسی چیز کے سلسلے میں روک دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے دو دراہم دیئے تو تب ان کا راستہ خالی چھوڑا گیا۔

۳۷۵۴: رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْهُ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ ۔

أخرجه التمذى فى السنن ٣ / ٦٢٢، الحديث رقم : ١٣٣٦

ترجمہ: ''ترمذی نے اس کو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔''

تخریج: اور ''جامع صغیر'' میں ہے: ''لعن اللّٰه الراشي والمرتشي في الحكم'' اس حدیث کو احمد، ترمذی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ [الجامع الصغیر ۲/ ۴۴۵، الحدیث رقم ۷۲۵۴]

رشوت طے کرانے پر اللہ کی لعنت

۳۷۵۵: وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ ثَوْبَانَ) وَزَادَ: وَالرَّائِشَ يَعْنِي الَّذِيْ يَمْشِيْ بَيْنَهُمَا ۔

أخرجه احمد في المسند ٥ / ٢٧٩، والبيهقى فى شعب الإيمان ٤ / ٣٩٠، الحديث رقم : ٥٥٠٢

ترجمہ: اور احمد نے اور بیہقیؒ نے اس روایت کو شعب الایمان میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ نیز بیہقیؒ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے رائش یعنی وہ شخص جو رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے کے درمیان واسطہ و ذریعہ بنتا ہے پر بھی لعنت فرمائی ہے''۔

تشریح: جامع صغیر میں ہے کہ امام احمدؒ نے حضرت ثوبانؓ سے روایت کیا ہے:

''لَعن اللّٰہ الراشي والمرتشي والرائش الّذی یمشي بینھما''۔ [الجامع الصغیر ۲/۴۴۵ الحدیث رقم ۷۲۵۵] یعنی وہ شخص مراد ہے جو فریقین کے درمیان بھاگ دوڑ کرے اور ساز باز کرے (قالہ ابن الاثیر) اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ان کے درمیان ''مصلح'' ہو۔

مال کس کے لئے اچھا؟

۳۷۵۶: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: اَرْسَلَ اِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنِ اجْمَعْ عَلَيْكَ سِلَاحَكَ وَثِيَابَكَ، ثُمَّ ائْتِنِيْ، قَالَ فَاَتَيْتُهٗ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ، فَقَالَ: يَا عَمْرُو! اِنِّيْ اَرْسَلْتُ اِلَيْكَ لِاَبْعَثَكَ فِيْ وَجْهٍ يُسَلِّمُكَ اللّٰهُ، وَ يُغَنِّمُكَ، وَاَزْعَبُ لَكَ زَعْبَةً مِنَ الْمَالِ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَاكَانَتْ هِجْرَتِيْ لِلْمَالِ وَمَاكَانَتْ اِلَّا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ، قَالَ: نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ

رواه فی شرح السنة وروى احمد نحوه روايته قال: نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔

أخرجه البغوی فی شرح السنة ١٠ / ٩١، الحديث رقم: ٢٤٩٥، وأحمد فی المسند ٤ / ١٩٧

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص کے ذریعہ میرے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اپنے ہتھیاروں اور اپنے کپڑوں کو اکٹھا کر لو (یعنی سفر کی تیاری کر لو) اور پھر میرے پاس حاضر ہو۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں (آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق سفر کی تیاری کر کے) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ ﷺ اس وقت وضو فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ نے (مجھے دیکھ کر فرمایا) کہ اے عمرو! میں نے تمہارے پاس پیغام بھیج کر اس لئے بلایا ہے کہ میں تمہیں ایک مہم پر (یعنی کسی جگہ کا حاکم یا عامل بنا کر) روانہ کروں' اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت و سلامتی کے ساتھ رکھے' تمہیں مال غنیمت عطا فرمائے اور میں بھی تمہیں کچھ مال عطا کروں''۔ میں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! میرا ہجرت کرنا (یعنی میرا ایمان قبول کرنا اور اپنا وطن چھوڑ کر آپ ﷺ کے پاس آ جانا) مال کی خاطر نہیں تھا بلکہ (میرا ایمان قبول کرنا خالصتاً للہ تھا اور) میری ہجرت صرف اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی و رضا) کیلئے تھی''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نیک بخت آدمی کیلئے پاکیزہ مال اچھی چیز ہے''۔ (شرح السنۃ) امام احمدؒ نے بھی اس طرح کی روایت نقل کی ہے اور ان کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ نیک مرد کے لئے پاکیزہ مال اچھی چیز ہے۔

تشریح: قوله: ارسل الى رسول الله ﷺ ...... زعبة من المال:

''أن أجمَعَ'': أن مصدریہ ہے یا تفسیر یہ ہے۔ کیونکہ ارسال میں قول کا معنی بھی پایا جا رہا ہے۔ أى أرسل الى قائلا: اجمع ''عليك سلاحك وثيابك'': ''سلاح'' کو مقدم کیا تاکہ سفر کا علم ہو جائے اور اس معاملے کے مہتم بالشان ہونے کا بھی علم ہو جائے۔

''وهو يتوضأ فقال! ''يا عمرو'': یہ دلالت کر رہا ہے کہ وضوء کے درمیان دینی باتیں کرنا جائز ہے۔

''انى أرسلت اليك لأبعثك'' اس کلام میں ''تفنّن'' ہے۔

ارعب: زاء معجمہ اور عین مہملہ کے ساتھ۔ أى قطع أو أدفع۔

''أرغب'' یہ منصوب ہے ''ابعثك'' پر عطف ہونے کی بناء پر۔ اور ایک نسخہ میں ''رفع'' کے ساتھ ہے۔ ای'' وأنا أرغب''۔

''زعبةً'': زاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ قطعةً و دفعةً۔

قوله: نعما مالمال الصالح ......:

نعما: نون کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ، اور عین کو کسرہ دینا اور ''اخلاس'' دونوں درست ہیں۔

''قال نعما'' أى نعم شيئاً'' علامہ رضی فرماتے ہیں کہ اس ''ما'' کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ''ما'' کافہ ہے۔ اس نے ''نعم'' کو جملہ پر داخل ہونے کے قابل بنا دیا ہے جیسا کہ ''طالما'' اور ''قلما'' ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس میں ''بعد'' ہے کیونکہ فعل کو اس کی قوت اور طاقت کی وجہ سے عمل سے روکا نہیں جا سکتا۔ اور یہ بات تو صرف حروف میں ہوتی ہے۔ اور ''طالما'' اور ''قلما'' میں ''ما مصدریہ'' ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ''نعم'' عدم تصرف کی وجہ سے حروف کے مشابہ ہو گیا۔ لیکن اضمار مبتدا و خبر میں تکلف کا محتاج ہو گا۔

ان جیسی مثالوں میں امام فراء و ابوعلیؒ کہتے ہیں کہ یہ ''ما'' موصولہ ہے بمعنیٰ ''الّذى'' ''نعم'' کا فاعل ہے اور اس کا قلت وقوع اس کو ضعیف کر دیتا ہے جو ''نعم'' کا صریحی فاعل ہے۔ اور ''نعما هى'' میں مکمل صلہ کو حذف کرنا لازم آتا ہے۔ اس لئے کہ ''هى'' ''مخصوص بالمدح ہے۔ أى'' نعم الذى فعله الصدقات''۔

امام سیبویہؒ اور امام کسائیؒ کا قول ہے کہ ''ما'' معرفہ تامہ بمعنیٰ ''الشى'' ہے۔ لہٰذا ''نعماهى'' کا معنی ہوگا۔ ''نعم الشئ هى'' اور ''ما'' ہی فاعل ہوگا۔ بلکہ ''ما'' بمعنیٰ شئ ہوگا۔ چاہے موصولہ یا غیر موصوفہ ہو۔ اور علامہ زمخشریؒ اور فارسیؒ فرماتے ہیں کہ ''ما'' نکرہ ممیّزۃ ہے اور محلاً منصوب ہے پھر یا تو موصوفہ بالجملہ ہوگا جیسا کہ ''نعما يعظكم به'' ہے یا غیر موصوفہ ہوگا۔ جیسا کہ ''فنعما هى'' ہے۔ اھ۔ ''بالمال الصالح'' ۔ علامہ ابن جنیؒ فرماتے ہیں کہ '' نعما'' میں ''ما'' منصوبہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اور تقدیر ''نعم شيئاً'' ہوگی۔ أى ''نعم شيئا المال الصالح'' اور ''باء'' زائدہ ہوگی۔ جیسا کہ ''كفى باللّٰه'' میں ہے۔ یا عبارت اس طرح ہوگی: ''نعم الشئ المال الحلال''۔

''للرجل الصالح'' رجل صالح سے مراد وہ شخص ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ''ما'' نہ موصولہ ہے اور نہ ہی موصوفہ ہے کیونکہ پہلے کی تعیین صلہ کے ساتھ ہوگئی اور دوسرے کی

صفت کے ساتھ۔ پہلے اجمال ہے پھر ''تبیین'' ہے۔''نعما رجل''میں''ما''بمنزلہ تعریف جنس ہوگا۔ کیونکہ جب وہ اولاً مجملاً سنتا ہے تو سامع کو ہر طرح کا خیال گزرتا ہے۔ پھر جب وہ بیان کرتا ہے تو اس کے ذہن میں خصوصی طور پر پختہ ہوتا ہے اور وہ اس بات کو دل کی گہرائی سے قبول کرتا ہے۔ اس میں ''مال صالح'' کی عظیم مدح اور تعریف ہے۔ اور ''صلاح'' فساد کی ضد ہے اور اکثر استعمال بطور فعل کے ہوتا ہے اور قرآن مجید میں اس کے مقابلے میں بسا اوقات ''فساد'' کا لفظ استعمال ہوا اور بسا اوقات ''سیئہ'' جیسا کہ آیت کریمہ ہے:[خلطوا عملاً صالحًا و آخر سيئًا] طرح آیت ہے:﴿ولا تفسدوا في الأرض بعد اصلاحها﴾[الاعراف: ٤٠] خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب کوئی چیز قابل انتفاع ہو تو وہ صالح ہے۔ اور اس کے برعکس ہو تو وہ 'فساد' ہوگا۔ اور ''رجل صالح'' وہ ہے کہ جو خیر اور بھلائی کو جانے اور پھر اس پر عمل بھی کرے۔ اور ''مال صالح'' وہ ہے جو حلال ذرائع سے کمایا جائے اور اس کو بھلائی کی جگہوں میں خرچ کیا جائے۔

اور امام احمدؒ کی ایک روایت میں اس طرح ہے:''نعم المال الصالح للرجل الصالح''۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے 'ما'' زائدہ کا فہ والے قول کی تائید ہوتی ہے۔

الفصل الثالث:

سفارش پر ہدیہ لینے کا بیان

٣٧٥٧:عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ' اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَةً فَاَهْدَى لَهٗ هَدِيَّةً عَلَيْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰى بَابًا عَظِيْمًا مِنْ اَبْوَابِ الرِّبَا . (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داود في السنن ٣ / ٨١٠' الحديث رقم: ٣٥٤١

ترجمہ:''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''جس شخص نے (کسی بادشاہ وحاکم سے) کسی (شخص مثلاً زید) کی سفارش کی اور اس (زید) نے اس (سفارش کرنے والے) کے پاس سفارش کے عوض کوئی چیز بطور ہدیہ وتحفہ بھیجی اور سفارش کرنے والے نے اس تحفہ کو قبول کرلیا تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہوگیا''۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله:من شفع لاحد دفاعة ......:''فأهدى له هدية'':ایک نسخہ میں 'فأھدیٰ' صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور ''ہدیۃ'' مرفوع ہے۔

ایک نسخہ میں 'ربا'' کی جگہ 'الرياء'' کا لفظ ہے۔ لیکن یہ تصحیف ہے۔

بَابُ الْاَقْضِيَةِ وَالشَّهَادَاتِ

قضایا اور شہادتوں کا بیان

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''أقضيه'' یا قضایا ان امور ومعاملات کو کہتے ہیں جو حاکم کے پاس لے جائے جاتے ہیں۔ زہریؒ فرماتے ہیں کہ ''قضآء'' اصل میں کسی چیز کو مضبوط کرنے اور اس سے فارغ ہونے کو کہتے ہیں۔ ''قضآء'' کسی حکم کو جاری کرنے کو کہتے ہیں اور اسی معنی میں یہ آیت کریمہ بھی ہے: ﴿ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [الاسراء:٤] اور حاکم کو قاضی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ احکام جاری کرتا ہے اور اس کو مضبوط کرتا ہے۔ ''قضٰی'' بمعنیٰ ''اوجب'' ہوگا۔ ''قاضی'' کی وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ وہ حکم کو لازم اور واجب کر دیتا ہے اور اس کو ''حاکم'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے اور ''حکمت'' کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ نفس کو اس کی خواہشات سے روکتی ہے۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ شہود، شہادۃ اور مشاہدۃ اصل میں ''حضور مع الشهادة'' کو کہتے ہیں۔ چاہے بالنظر یا بالبصيرة'' ہو (یعنی کسی ایک حاسہ کے ذریعہ ادراک کو کہتے ہیں چنانچہ مشاہدہ سن کر بھی ہوسکتا ہے اور آنکھ سے دیکھ کر بھی ہوسکتا ہے) اور ''شهدت'' ''علم'' کا قائم مقام ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: شهد الله كذا۔ اللہ کو اس کا علم ہے اور یہ لفظ یوں استعمال ہوتا ہے: ''تقام الشهادة''۔ (شہادت قائم کرنا)

اور کہا جاتا ہے: ''أشهد بكذا'' اور حاکم شاہد سے اس کہنے سے راضی نہیں ہوتا کہ وہ کہہ دے۔ ''اعلم'' بلکہ اس کو ضرورت ہوتی ہے کہ ''اشهد'' کہے۔

''مغرب'' میں ہے کہ ''شهادة'' کسی چیز کی صحت کے بارے میں مشاہدہ سے خبر دینے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ''شهد عند الحاكم لفلان على فلان بكذا شهادة کسی کے حق میں کسی کے خلاف کسی بات کی گواہی قاضی کے ہاں دینا) فهو شاهد، '' گواہ'' اس کی جمع شهود اشهاد آتی ہے۔ شہادت کے ایک معنیٰ ''اللہ کی راہ میں موت'' بھی ہیں اس اعتبار سے اللہ کی راہ میں مرجانے والے شخص کو ''شهيد'' کہتے ہیں۔ اس کی جمع '' شهداء'' آتی ہے۔

الفصل الاول:

دعویٰ کرنے کا بیان

۳۷۵۸: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالَهُمْ، وَلٰكِنَّ الْيَمِيْنَ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ رواه مسلم وفى شرحه للنووى اَنَّهٗ قَالَ وَجَاءَ فِيْ رِوَايَةِ الْبَيْهَقِيِّ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ اَوْصَحِيْحٍ زِيَادَةٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا : لٰكِنَّ الْبَيِّنَةَ عَلٰى

الْمُدَّعِي وَالْيَمِينُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٨ / ٤٥٥٢، الحديث رقم: ٤٥٥٢، و مسلم في ٣ / ١٣٣٦، الحديث رقم ١ / ١٧١١

ترجمه: ''حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر لوگوں کو محض ان کے دعویٰ کی بنیاد پر) دیا جائے (یعنی اگر مدعی سے نہ تو گواہ طلب کئے جائیں اور نہ مدعا علیہ سے تصدیق کی جائے بلکہ محض اس کے دعویٰ پر اس کا ازقسم مال و جان مدعا کو دے دیا جائے) تو لوگ اپنے آدمیوں کے خون اور اپنے مال کا (جھوٹا) دعویٰ کرنے لگیں (لہٰذا صرف مدعی کا بلا گواہی کے بیان معتبر نہیں ہے) لیکن قسم کھانا مدعا علیہ پر لازم ہے (مسلم) اور نوویؒ نے اپنی کتاب شرح مسلم میں لکھا ہے کہ بیہقی کی روایت میں جو حسن یا صحیح اسناد سے منقول ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (مذکورہ بالا حدیث میں بطریق مرفوع ان الفاظ کا اضافہ بھی منقول ہے کہ ''گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور قسم اس شخص کے ذمہ ہے جو انکار کرے۔ (یعنی مدعا علیہ)۔''

تشریح: قوله: لويعطى الناس۔۔۔رجال وأموالهم:

''لو يعطى الناس'' یہ مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

''المغرب'' میں ہے کہ ''بينه'' حجت اور دلیل کو کہتے ہیں۔ اور یہ ''بينونة'' یا ''بيان'' سے ''فعلية'' کے وزن پر ہے۔

''دماء رجالٍ واموالهم'' بعض نے اس کا معنی کیا ہے کہ لوگ لوگوں کے اموال لیتے جائیں گے اور لوگوں کے ناحق خون بہائیں گے۔ یہاں پر دعویٰ کو اخذ کی جگہ پر رکھ لیا کیونکہ دعویٰ اخذ کا سبب ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مدعی علیہ کا مال لینا ممتنع ہے کیونکہ مجرد دعویٰ کے ساتھ مدعی کو نہیں دیا جا سکتا۔ تو اس صورت میں ''لو'' کا معنی صحیح ہوگا۔ جملہ متقدمہ نے مجرد دعویٰ کے ساتھ اعطاء کی نفی کر دی۔ مابعد کلام یہ فائدہ دے رہا ہے کہ ''بينه'' مدعی پر ہے۔ اور بغیر حجت کے عدم سماع دعویٰ کا وہم ہو رہا تھا' اس کلام کے ذریعہ اس کا استدراک کر دیا۔

قوله: ولكن اليمن على المرعى عليه: ولكن ''تشدید کے ساتھ ہے۔ اور یمین منصوب ہے اور ایک نسخہ میں لکن تخفیف کے ساتھ اور یمین رفع کے ساتھ ہے۔

اگر قاضی نے مدعی کے مطالبہ کے بغیر مدعی علیہ سے حلف لیا اور پھر مدعی نے تحلیف کا مطالبہ کر لیا تو اس کا یہ مطالبہ جائز ہے۔

یہ عام حکم ہے البتہ اس سے حدود اور لعان وغیرہ کو خاص کر دیا گیا ہے: لکن بینہ دونوں صورتوں میں مدعی پر ہوگا۔ اور یمین دونوں صورتوں میں منکر پر ہوگی۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث احکام شرع کے قواعد میں سے ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی انسان کے قول کو مجرد دعویٰ کے ساتھ قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ بینہ اور مدعی علیہ کی تصدیق کا محتاج ہوگا۔ اگر وہ مدعی علیہ سے یمین کا مطالبہ کرے تو اس کو حق حاصل ہے۔ آپ علیہ السلام نے اس کی حکمت بھی بیان کر دی کہ اگر لوگوں کو مجرد دعویٰ کے ساتھ ان کا مدعی دیا جانے لگا۔ تو وہ دوسرے لوگوں کے خون اور اموال پر دعویٰ کریں گے، اس کو مباح سمجھا جائے گا اور مدعی علیہ کو اپنا مال اور خون محفوظ رکھنا ممکن نہیں

ہوگا اور اس حدیث میں امام شافعیؒ اور جمہور کی دلیل ہے کہ یمین ہر مدعی علیہ کی طرف متوجہ ہوگی چاہے اس کے اور مدعی کے درمیان اختلاط ہو یا نہ ہو۔

امام مالکؒ ان کے اصحاب، فقہائے سبعہ اور فقہائے مدینہ کا قول ہے کہ یمین صرف اس وقت مدعی علیہ کی طرف متوجہ ہو کی جب اس کے اور مدعی علیہ کے درمیان اختلاط ہو تا کہ بے وقوف لوگ عقلمندوں اور اہل فضل کو ایک دن میں بار بار ان کی تحلیف سے ذلیل اور رسوانہ کرتے پھریں لہٰذا اس مفسدہ کو دفع کرنے کیلئے ''اختلاط'' کو شرط کر قرار دیا۔ البتہ ''اختلاط'' کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ دراصل یہ اس کے معاملہ اور اس کے مداینہ کو ایک گواہ یا دو گواہوں کے ذریعے معرفت حاصل ہو اور بعض نے کہا ہے کہ شبہہ کافی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس جیسا دعویٰ اس کے مثل کے ساتھ اس کے لائق ہو۔ اور جمہور کی دلیل یہ حدیث ہے۔ اور جہاں تک شرط کا تعلق ہے تو اس کی اصل کتاب وسنت رہا اجماع کسی میں نہیں ہے۔

الجامع الصغیر میں ہے کہ اس حدیث کو امام احمدؒ شیخین اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ (الجامع الصغیر ۲/ ۴۵۹ الحدیث رقم ۷۴۹۵)

۳۷۵۹: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنِ صَبْرٍ وَهُوَ فِيْهَا فَاجِرٌ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَ ذٰلِكَ: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلاً اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَةِ . (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٨ / ٢١٢، الحديث رقم : ٤٥٤٩، و مسلم فی ١ / ١٢٢ الحديث رقم : (٢٢٠ ـ ١٣٨) والترمذی فی السنن ٥ / ٢١٦، الحديث رقم : ٣٠١٢، وابن ماجه فی ٢ / ٧٧٨، الحديث رقم : ٢٣٢٣

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص کسی چیز پر مقید ہو کر (یعنی حاکم کی مجلس میں محبوس ہو کر) قسم کھائے اور وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہو اور اس قسم کے ذریعہ اس کا مقصد کسی مسلمان شخص کا مال حاصل کرنا ہو تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا''۔ چنانچہ اس ارشاد کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت (آخر تک) نازل کی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلاً ...... (بخاری ومسلم)

تشریح: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلاً اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۷۷) ''یقیناً جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض حقیر یا قلیل قیمت وصول کرتے ہیں ان لوگوں کو تھوڑا سا حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہیں ملے گا اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ ان سے (لطف کا) کلام فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف (نظر محبت سے دیکھیں گے اور نہ (ان کے گناہوں کو معاف کر کے) ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا''۔

قوله: من حلف على يمين...... وهو عليه غضبان: ''یمین صبر النہایۃ'' میں ہے کہ حلف یمین ہی کو کہتے ہیں۔ یہاں دونوں کا ذکر فرمانا تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔ امام نوویؒ کہتے ہیں کہ ''یمین صبر'' اضافت کے ساتھ ہے۔ یعنی حکم کو لازم کردیا اور

حالف کو اس پر روک دیا اور حکم کی جہت سے حالف پر لازم ہے۔اس یمین کو''مصبورۃ'' بھی کہتے ہیں۔اگر چہ فی الحقیقت اس کا صاحب مصبور ہوتا ہے کیونکہ وہ اسی کی وجہ سے ہی تو ''صبر کرتا'' ہے۔یعنی اپنے آپ کو روکتا ہے اس کی صفت صبر کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اس کی اضافت مجازاً کی ہے۔اھ۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ''صبر'' حبس کو کہتے ہیں ''اور یمین صبر'' سے مراد یہ ہے کہ سلطان اس آدمی کو روکے رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ پر حلف اٹھائے اور یہ حکم حاکم کی وجہ سے اس صاحب یمین کیلئے لازم ہے۔

اور ''علی'' بمعنی باء ہے اور مراد محلوف علیہ ہے حلف کی وجہ سے اس کو ''محلوف علیہ'' کی جگہ رکھا ہے۔اس تاویل پر اس کو مجازاً ''مصبورہ'' کہتے ہیں۔بعض علماء کا قول ہے کہ ''یمین صبر'' یہ ہے کہ جس میں وہ کذب عمداً بولتا ہے اور مسلمان کے مال ہڑپ کرنے کا ارادہ باقاعدہ رکھتا ہے۔گویا کہ وہ نفس کو اس یمین پر روکتا اور بند کرتا' اور مجبور کرتا ہے۔ظاہراً یہی مراد ہے۔

''وهو فيها'' فاجر'' یہاں ''فاجر'' کاذب کے معنی میں ہے اور جملہ حالیہ ہے۔ایک روایت میں بغیر واؤ کے آیا ہے۔

''مال مسلم'': اس کے معنی میں ''مال ذمی'' بھی آتا ہے۔اس کے مفہوم مخالف کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جھوٹی شہادت فجور کی ایک قسم ہے۔

ويقتطع حال ہے ''فاجر کی ضمیر مستتر سے، جو اس مبتدا کی طرف راجع ہے۔یہ حال مؤکدہ ہے اور اس کی شناعت کی منظر کشی کر رہا ہے۔

اور یہی معنی ''یمین غموس'' کا ہے۔کیونکہ اس جرم کا مرتکب، زیادتی اور تجاوز میں اس کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے' اس طور پر کہ وہ ایک حرمت کے بعد دوسری حرمت کا ارتکاب کرتا ہے۔مثال کے طور پر:

① ایک یہ کہ وہ ایسا مال حاصل کرتا ہے' جو اس کا حق نہیں ہے۔② وہ حرمت اسلام کو پامال کرتا ہے ③ تیسری حرمت یہ ہے کہ وہ یمین فاجرہ پر اقدام کرتا ہے۔

''لقى الله يوم القيامة'' ایک روایت میں ''لقى الله'' آیا ہے۔

''وهو عليه غضبان'': اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے اعراض کرے گا اور اس کی طرف رحمت اور عنایت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔

غضبان: مبالغہ کا صیغہ ہے۔اور غیر منصرف ہے

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ اس سے انتقام لے گا کیونکہ جب ''غضب'' کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کیا جائے، تو وہ اس کی انتہا اور غایت پر محمول ہوتا ہے۔

''اولئك لا خلاق لهم'' یعنی ان لوگوں کیلئے خیر کا کوئی حصہ نہیں ہے جو قیامت کے روز ان کو سرور اور فرحت بخشے' اور نہ ہی ان کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت کریں گے جو ان کو فائدہ دے اور نہ ہی ان کو گناہوں سے پاک کیا جائے گا اور اسی لیے فرمایا: [ولهم عذابٌ اليمٌ] اس آیت میں سخت اور بڑی تہدید اور دھمکی ہے۔

قسم کے ذریعہ مسلمان کا حق غصب کرنا

۳۷۶۰: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ بِيَمِيْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ: وَاِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيْرًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: وَاِنْ كَانَ قَضِيْبًا مِنْ اَرَاكٍ. (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ١ / ١٢٢' الحديث رقم: (٢١٨ - ١٣٧) والنسائی فی السنن ٨ / ٢٤٦' الحديث رقم: ٥٤١٩' والدارمی فی ٢ / ٣٤٥' الحديث رقم: ٢٦٠٣' و مالك فی الموطأ ٢ / ٧٢٧' الحديث رقم: ١١' من كتاب الأقضية وأحمد فی المسند ٥ / ٢٦٠

ترجمہ: ''اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے اپنی (جھوٹی) قسم کے ذریعہ کسی مسلمان شخص کا حق چھینا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آگ کو واجب کیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا''۔ ایک شخص نے (یہ سن کر) آپ ﷺ سے عرض کیا ''یا رسول اللہؐ! اگر چہ وہ حق کوئی معمولی ہی چیز ہو''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(ہاں) اگر چہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ (یعنی مسواک) ہی کیوں نہ ہو''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: من اقتطع حق امر ......:** اس حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ ''حق'' کا دائرہ اطلاق مال سے وسیع ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ''**حق امری مسلم**'' میں وہ شخص بھی داخل ہے جو ایسی شے پر قسم اٹھائے جو مال نہ ہو۔ جیسا کہ **جلد میتہ** گوبر لید وغیرہ اور اسی طرح وہ تمام حقوق جو کہ مال نہیں ہیں۔ جیسا کہ حق قذف ہے یا متعدد بیویوں کے درمیان تقسیم کا حق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

فقد اوجب اللّٰه: اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہے طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تابید پر دلالت کر رہا ہے۔ بایں طور کہ ''**أوجب اللّٰه عليه النار**'' میں احتمال تھا کہ کسی نہ کسی وقت جہنم سے نکل آئے گا لیکن **و حرم عليه الجنة** فرما کر اس احتمال کی نفی فرما دی اور بعض علماء نے اس کی تاویل میں دو توجیہات ذکر کی ہیں: ① یہ اس کے مستحل پر محمول ہے جب وہ اس پر مر بھی جائے۔ ② وہ اس کی وجہ سے وہ آگ کا مستحق ٹھہر گیا۔ البتہ عفو و درگزر اب بھی ممکن ہے۔ اور اول وھلہ میں فائزین کے ساتھ دخول جنت اس پر حرام ہے۔

حق امری مسلم: آپ علیہ السلام نے اس کو ''**مسلم**'' کے ساتھ مقید کیا ہے لیکن یہ حق ذمی کی عدم تحریم پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ اس عظیم گناہ کا مرتکب اس قطعیت شان کا مستحق ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کیونکہ اخوت اسلام تقاضا کرتی ہے کہ اس کے حقوق اور تمام جوانب کی رعایت رکھی جائے۔ چاہے اس کا فائدہ یا نقصان ہو۔ قصہ مختصر یہ کہ ''مسلم'' کی قید نہ بے فائدہ ہے، نا احترازی ہے، بلکہ اپنے اندر بہت ساری حکمتیں لئے ہوئے ہے۔

دوسرے کا حق آگ کا ٹکڑا ہے

۳۷۶۱: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ، وَاِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ، فَاَقْضِيْ لَهٗ عَلٰى نَحْوِمَا اَسْمَعُ مِنْهُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِيْهِ فَلَا يَأْخُذَنَّهٗ، فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ١٢ / ٣٣٩، الحدیث رقم: ٦٩٦٧، و مسلم فی ٣ / ١٣٣٧، الحدیث رقم: (٤ / ١٧١٣) وأبو داود فی السنن ٤ / ١٢، الحدیث رقم: ٣٥٨٢، والترمذی فی ٣ / ٦٢٤، الحدیث رقم: ١٣٣٩، والنسائی فی ٨ / ٢٣٣، الحدیث رقم: ٥٤٠١، وابن ماجه فی ٢ / ٧٧، الحدیث رقم: ٢٣١٧، وأحمد فی المسند ٦ / ٢٩٠

ترجمہ: ''اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے مقدمات (جھگڑے) لے کر میرے پاس آتے ہو ممکن ہے تم میں کوئی شخص اپنے دلائل دوسرے سے زیادہ فصیح و بلیغ انداز میں پیش کرے اور میں اس کا (مدلل) بیان سن کر اسی کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ لہٰذا وہ شخص کہ میں جس کے حق میں کسی ایسی چیز کا فیصلہ کروں جو حقیقت میں اس کے بھائی مسلمان کی ہو اس چیز کو نہ لے کیونکہ (ایسی صورت میں گویا) میں اس کے حق میں آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کروں گا''۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: انما أنا بشر وانكم تخصمون لدى:** تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آغاز کلام میں ''انما انا بشرٌ'' فرمانا اس بات پر متنبہ کرنے کیلئے فرمایا کہ سہو اور نسیان انسان سے کوئی مستبعد چیز نہیں ہے اور وضع بشری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ امور کے صرف ظواہر کا ادراک کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس کی تخلیق ایسے ہوئی ہے کہ وہ ایسی قضایا سے محفوظ نہیں ہے کہ جو اشیاء کی حقیقت کو چھپالیں۔ انسان کچھ سن لیتا ہے تو اس کے وہم میں یہ بات آجاتی ہے کہ اس نے سچ کہا ہے حالانکہ وہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اگر میں تقاضائے بشریہ کے مطابق چھوڑ دیا جاؤں اور میری تائید وحی آسمانی کے ساتھ نہ ہو تو مجھ پر بھی حالت طاری ہوجائے جو تمام لوگوں پر طاری ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کیا نبی علیہ السلام اپنے اقوال و افعال میں محفوظ نہیں تھے۔ اور کیا تمام احوال میں معصوم نہیں تھے؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ ان کی عصمت تو ان چیزوں میں ثابت ہے جن کو گناہ شمار کیا جاتا ہے اور وہ اس کو قصداً کریں اور وہ اس کا ارادہ کریں اور یہ جس کی بات ہم کر رہے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کا مکلّف نہیں بنایا ہے جس میں وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ سوائے اس کے کہ نبی کو بھی اس چیز کا مکلّف بنایا ہے جس چیز کا دوسروں کو بھی مکلّف بنایا ہے اور وہ ہے اجتہاد اس کی دلیل ام سلمہ کی حدیث ہے جو متعدد طریقوں سے مروی ہے: ''انا اقضی بینکم برالی فیما لم ینزل علیَّ''۔

''**ولعل بعضكم ان يكون الحن بحجة من بعضٍ**'': طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''لعل'' کی خبر پر لفظ'' انّ'' کو زائد کر دیا گیا تا کہ ''عسٰی'' کے مشابہ ہو جائے۔ ''ألحن'' یہ ''لحن'' سے اسم تفضیل ہے۔ از باب ''فوح'' ہے۔ جب اس کو اس طرح سمجھائے کہ اس طرح کوئی اور نہ سمجھا سکتا ہو۔ یعنی وہ فصیح وفطین ہوتو یہ شخص اپنے کلام کو اس طرح مزین کر کے پیش کرتا ہے کہ میں اس کو اس دعویٰ میں سچا اور صادق خیال کرتا ہوں تو اس کی وجہ سے میں اس کی دلیل کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہوں۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ ''لحن'' کلام کو عام طریقے سے نکال کر دوسری طرف پھیرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ بذریعہ ازالہ رب ہو خواہ تصحیف کے ساتھ ہو یہ مذموم ہے۔ یہ اکثر الاستعمال ہے۔ اگر چہ یہ بات اور کلام کو تصریح سے پھیرنا اور اس کو ایک اور معنی تعریض وغیرہ کی طرف لے جانا یہ بلاغت کے اعتبار سے محمود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے: ''**وخیرا الاحادیث ما کان لحناً**''۔ بہترین باتیں وہ ہیں جو فصیح ہوں۔'' اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: [**ولتعرفنهم فی لحن القول**]۔

اور اسی معنی میں یہ حدیث ہے: ''**ألحن بحجته**'' یعنی کلام کے اعتبار سے زیادہ فصیح اور ابین ہو اور دلیل پر زیادہ قادر ہو۔

مسائل مستنبطہ: ① احکام جزئیہ میں خطا ممکن ہے، اگر چہ قواعد شرعیہ میں یہ خطا ممکن نہیں ہے۔

② امام نوویؒ کہتے ہیں اس حدیث میں حالت بشریہ پر تنبیہ ہے۔ اور یہ کہ غیب اور باطن امور کو بشر نہیں جانتا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی چیز پر مطلع کر دے۔ کیونکہ امور احکام کے سلسلے میں اس پر وہ چیزیں ممکن ہیں جو کہ اس کے غیر پر ممکن ہیں۔ اور یہ کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ظاہر حال کے مطابق ہوگا۔ یا یمین کے ساتھ اگر چہ اس میں بھی یہ امکان ہوگا کہ ظاہر اس کے خلاف ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اس کلام کی طرح ہے: ''**أمرت أن أقاتل النّاس۔۔۔۔وحسابهم علی اللّٰه**''۔

(أخرجه النجاری فی صحیحه ۱/۸۵ الحدیث رقم ۲۵، و مسلم فی ۱/۵۳، الحدیث رقم ۳٦۔۲۲)

اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے۔ تو نبی علیہ السلام کو خصمین کے باطن امور پر مطلع کر دے تو اس وقت شہادت یا یمین کی حاجت کے بغیر یقین نفس کے ساتھ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو آپ کے اقوال وافعال واحکام میں آپ کی اتباع اور اقتداء کا حکم دیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے حکم کو ان پر لازم کیا ہے تا کہ یہ امت کیلئے نمونہ بن جائیں، اور ان کیلئے احکام ظاہرہ کی بخوشی اطاعت کرنا ممکن ہو قطع نظر اس کے کہ باطن کا معاملہ کیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کا ظاہر تو یہ بتلا رہا ہے کہ آپ علیہ السلام سے ظاہر میں ایسا حکم صادر ہوا ہے' جو باطن کے مخالف ہے جبکہ اصولیین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ احکام میں آپ علیہ السلام کو خطا پر برقرار نہیں رکھا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث اور اصول میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی مراد وہ حکم ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد سے ثابت ہو۔ البتہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس اجتہاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطا واقع ہو جائے؟ تو اس میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء اس کے امکان کے قائل ہیں۔ (یعنی اس اجتہاد میں خطا ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ جو حدیث میں ہے تو اس میں اجتہاد نہیں ہے کیونکہ آپ نے فیصلہ بینة یا یمین کے ذریعے کیا ہے۔ اگر اس میں خلاف باطن کچھ واقع ہو جائے تو اس حکم کو خطأ نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ حکم صحیح ہے۔ جس کا ان کو مکلّف بنایا گیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کیا گیا ہے۔

اگر یہ دونوں گواہ جھوٹے ہوں یا اس طرح کوئی اور بات ہو تو یہ تقصیر ان گواہوں کی طرف سے ہے۔ جہاں تک حاکم کی بات ہے، تو اس کیلئے اس میں کوئی ملامت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے اس پر کوئی عتاب ہوگا۔ بخلاف اس صورت کے کہ اگر حاکم سے اجتہاد میں غلطی ہو جائے

یہ دلیل ہے کہ حاکم کا حکم کسی حرام کو حلال نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جب جھوٹا گواہ کسی انسان کیلئے مال کی جھوٹی گواہی دے دے اور حاکم اس کی بناء پر کوئی فیصلہ کردے تو محکوم لہ کیلئے یہ مال جائز نہیں ہے۔ اگر کسی انسان کے خلاف قتل کی گواہی دے دے تو ولی کیلئے اس کا قتل حلال نہیں ہے جب کہ ان گواہوں کے جھوٹ کا اس کو علم ہو۔ اگر گواہ نے اس پر گواہی دی کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے تو جس کو ان کے جھوٹ کا پتہ ہو اس کیلئے اس (عورت) کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اسی کی طرف اس قول کے ذریعہ اشارہ کیا ہے: ''**فمن قضيت**'' یعنی اگر کسی کے لئے ظاہری دلیل کی بناء پر فیصلہ سنایا جائے، جو باطن کے خلاف ہو تو وہ اس شئی کو نہ لے کیونکہ یہ ایسی چیز لے گا جو اس کو آگ کی طرف لے جائے گی مسبّب ''**قطعة من النّار**'' کو سبب کی جگہ پر رکھ لیا اور سبب ''**ما حكم به له**'' ہے۔

① جامع صغیر کے الفاظ یہ ہیں: ''**فمن قضيت له بحق مسلم فانما هى قطعة من النّار فليأخذها أو يتركها**'' اس کو امام مالکؒ، احمد اور اصحاب صحاح ستہ نے امّ سلمہؓ سے روایت کیا ہے۔

② مسلم کی ایک روایت جو کہ رافع بن خریج سے مروی ہے کہ الفاظ یہ ہیں: ''**انّما أنا بشرٌ اذا امرتكم بشئً من دينكم فخذوابه واذا امرتكم بشئً من رأى فانّما أنا بشرٌ**''۔

''میں یقیناً ایک بشر ہوں۔ جب میں تم کو تمہارے دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو لو۔ اور جب تم کو اپنی رائے میں سے کسی چیز کا حکم کروں تو میں یقیناً ایک بشر ہوں''۔

احمد اور ابن ماجہ نے حضرت طلحہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

''**انّما أنا بشرٌ مثلكم وان الظّنّ يخطئ ويصيب ،ولكن ما قلت لكم قال الله فلن اكذب على الله**''۔

میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اور بے شک گمان غلط بھی ہوتا ہے اور صحیح بھی ہوتا ہے لیکن جب میں تم کو کہہ دوں کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے'' تو میں ہرگز اللہ تعالیٰ پر جھوٹ نہیں بولوں گا''۔

جھگڑالو آدمی بدترین شخص ہے

۳۷۶۲: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَبْغَضَ الرِّجَالِ اِلَى اللّٰهِ الْاَ لَدُّ الْخَصِمُ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ٥ / ١٠٦، الحديث رقم : ٢٤٥٧، و مسلم فى ٤ / ٢٠٥٤، الحديث رقم : ٥ / ٢٦٦٨، والترمذى فى ٥ / ١٩٨، الحديث رقم : ٢٩٧٦، ونسائى فى ٨ / ٢٤٧، الحديث رقم : ٥٤٢٣، وأحمد فى المسند ٦ / ٥٥

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں بدترین اور مبغوض ترین شخص وہ ہے جو بہت زیادہ جھگڑالو ہو''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''انَّ ابغض الرجال : ایک روایت میں''أبغضُ الرجال'' آیا ہے۔(یعنی بغیر''ان'' کے ہے)
تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں''الد'' **شديد الحصومة** کو کہتے ہیں۔ **الخصم**: صاد کے کسرہ کے ساتھ ہے۔گردن کا بیرونی حصے اور سخت جھگڑالو کو کہتے ہیں۔''ألد'' ''لديد'' سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ اس کو اس کے ارادہ سے پھیرنا ممکن نہیں ہوتا۔یعنی جھگڑا اور خصومت اس کی عادت سی بن جاتی ہے۔تو ''الد''شدت پر دال ہے۔اور **الخصم** کثرت پر دال ہے۔
طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس وقت ہوگا جب''ألد'' کو''خصومت'' کے ساتھ مقید کرلیا جائے تاکہ تکرار لازم نہ آئے لیکن جب اس کو اس کے اصل پر رکھا جائے تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ فی نفسہ سخت ہوتا ہے اور خصومت میں بلیغ وفصیح ہوتا ہے اس صورت میں تکرار لازم نہیں آئے گا۔اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:**وهو ألد الخصام**۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں شدید الجدال اور''ألد'' کی اضافت''اضافت فِیۃ'' ہے۔(یعنی ظرفیہ)۔یا خصام کو''ألد'' سے تعبیر کرنا بطور مبالغہ کے ہے
اس کو ترمذیؒ اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

عرضِ مرتب:

صاحب تخریج کا کہنا ہے کہ یہ روایت ابن ماجہ میں مذکور نہیں ہے۔البتہ نسائی میں موجود ہے۔اھ
ایک روایت میں جس کو'' **تمام عن معاذ**'' کے طریق سے نقل کیا گیا ہے' یہ الفاظ آئے ہیں:
''**ابغض الخلق الی الله من آمَنَ ثم كَفَرَ**''
عقیلی، اور دیلمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یوں روایت کیا ہے:
''**أبغض العباد الى الله من كان ثوباه خيرًا من عمله أن تكون ثيابه ثياب الانبيآء وعمله عمل الجبارين**''۔
اللہ کے مبغوض ترین بندے وہ ہیں کہ جن کے کپڑے ان کے عمل سے بہتر ہوں۔اس طور پر اس کے کپڑے تو انبیاء کے کپڑوں کی طرح ہوں اور اس کا عمل جبارین اور ظالموں کے عمل کی طرح ہو۔

ایک گواہ کی بنیاد پر فیصلہ

۳۷۶۳:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ' اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَضٰی بِیَمِیْنٍ وَشَاھِدٍ۔ (رواہ مسلم)
أخرجه مسلم فی الصحيح ٣ / ١٣٣٧' الحديث رقم : ١٧١٢' وأبو داود فی السنن ٤' ٣٣' الحديث رقم : ٣٦٠٨' وابن ماجه فی ٢ / ٧٩٣' الحديث رقم : ٢٣٧٠' وأحمد فی المسند ١ / ٣١٥

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے (ایک مقدمہ میں) ایک قسم اور ایک گواہ پر فیصلہ صادر فرمایا''۔ (صحیح مسلم)

تشریح: آپ علیہ السلام نے اس قضیہ میں مدعی علیہ کی یمین اور مدعی کے ایک گواہ کے ذریعے سے فیصلہ فرمایا۔ ممکن ہے یہ قضیہ ان احکامات میں سے ہو کہ جس میں ایک گواہ کافی ہو۔ پس واؤ ''او'' کے معنی میں تنویع کیلئے ہوگا۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ مدعی کے پاس ایک گواہ تھا آپ علیہ السلام نے حلف کا حکم دیا تا کہ یہ حلف شاہد ثانی کے قائم مقام ہو جائے۔ جب اس نے حلف اٹھایا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کیلئے اس کے دعویٰ کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ یہی قول امام شافعی، مالک اور امام احمد کا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ شاہد اور یمین کے ذریعے فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب یہ دعویٰ کا تعلق اموال سے ہو اگر دعویٰ غیر اموال میں ہو تو بالاتفاق اس میں شاہد اور یمین کے ذریعہ فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی توجیہہ ان لوگوں کے ہاں جن کے ہاں یمین اور شاہد واحد کے ساتھ فیصلہ جائز نہیں ہے' یہ ہے کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ نے مدعی علیہ کی یمین کے ساتھ اس وقت فیصلہ کیا ہو' جب مدعی صرف ایک گواہ قائم کر سکا' یا وہ تمام بینہ کے قیام سے عاجز آ گیا ہو اور یہ تاویل اس لئے ہے کہ صحابہ نے صفت قضاء کو حدیث میں بیان نہیں کیا ہے۔ اور ابن عباسؓ سے ایک اور طریق سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے یمین اور شاہد کے ساتھ فیصلہ کیا ہے۔ اس روایت سے اس احتمال کو تقویت ملتی ہے۔ قرآن مجید کے اس حکم کو ترک نہیں کیا جا سکتا:

﴿ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ ﴾ [البقرة:٢٨٢]

توقیفی حکم اس پر وارد ہوا تو انہوں نے جائز نہیں سمجھا کہ وہ اس سے کم دلیل پر فیصلہ کرے۔ مگر یہ صرف دلیل قطعی ہو۔ اسی طرح انہوں نے علقمہ بن وائل کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔ جو ابن عباسؓ کی اس حدیث کے بعد آ رہی ہے ذالك۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کیا صحةً و نصًا اس حدیث سے زیادہ کوئی قطعی حدیث آتی؟ اس کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد میں کسی قسم کا کوئی طعن نہیں ہے۔ اس کی صحت کے بارے میں اہل معرفت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اھ۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ اس حدیث کی صحت سے اچھی طرح واقف ہیں اور شیخ نے اس حدیث کی اسناد میں تو طعن نہیں کیا۔ ان کا کلام تو اس بارے میں ہے کہ یہ دلیل ظنی ہے اور دلیل ظنی کسی دلیل قطعی کی معارض نہیں بن سکتی ہے۔ احتمال کی موجودگی میں تو اور بھی قابل استدلال نہیں ہے۔

شیخ محی الدین فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں بہت ساری احادیث آئی ہیں جو حضرت علی، ابن عباس، زید بن ثابت، ابوہریرہ، عمارۃ بن حزم اور بن عبادۃ، عبداللہ بن عمرو، اور مغیرۃ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہیں۔ جو صحابہ و تابعین میں سے جمہور علماء کی دلیل اور حجت ہے۔ اھ۔

لیکن اس میں بھی کوئی خفاء نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں شیخ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا جواب نہیں بن سکتیں۔ کیونکہ صحابہ و تابعین سے نقول میں اختلاف ہے۔ لہٰذا یہ کتاب اللہ کا معارض بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

فرماتے ہیں کہ جہاں تک ظاہر النص کی بات ہے تو ''قضی'' باء و لام اور علیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اور سببیت کیلئے مستعمل ہے۔ چنانچہ اگر آپ یہ مطلب بیان کرتے ہیں: **قضى للمدعى على المدعى عليه بسبب البينة واليمين** بینة اور یمین کے سبب سے مدعی کے حق میں مدعی علیہ کے خلاف فیصلہ کر دیا گیا۔ یہ مفہوم بالکل درست ہے اور اگر آپ اس کا

مطلب یہ بیان کرتے ہیں: قضى للمدعى على المدعى عليه بسبب يمينه و شاهد المدعى۔ یعنی مدعی کے لئے مدعی علیہ کے خلاف فیصلہ یمین اور مدعی کے شاہد کے سبب سے واقع ہوا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ یہ معنی جانتے ہیں اور اس مبنی کے قائل ہیں لیکن وہ مدعی کے حق میں نص کی نفی کررہے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں یہ کہ یہ قول ''ألك بينة''؟ میں تنکیر شیوع کیلئے ہے۔ ''اى الك بينة مّا''؟ اس کا مطلب نہیں تھا کہ میرے پاس اصلاً کوئی بینہ نہیں ہے۔ تو اس سے مطلوب پر کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جب مدعی کے پاس ایک گواہ ہو تو مدعی سے نہیں کہا جاتا کہ: ''فلك يمينه'' بلکہ یہ کہا جاتا کہ ''فعليك اليمين''

میں کہتا ہوں کہ یہ ان کی غفلت ہے۔ کیونکہ شاہد واحد پر بینہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر اس کا اطلاق اس پر ہوتا تو پھر تو یہ کہا جاتا: الك شاهدٌ اور اس لئے بھی کہ اس حدیث: ''البينة على المدعى و اليمين على من انكر'' میں بینہ اور یمین میں ''الف لام'' استغراق کیلئے ہے۔

یعنی گواہ مدعی کے ذمہ ہے۔ جبکہ تمام قسم منکر کے ذمے ہے۔

جھوٹی قسم کا وبال

۳۷۶۴: وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلٍ، عَنْ اَبِيْهِ، قَالَ جَاءَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَمَوْتٍ وَرَجُلٌ مِنْ كِنْدَةَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ هٰذَا غَلَبَنِيْ عَلٰى اَرْضٍ لِيْ، فَقَالَ الْكِنْدِيُّ: هِيَ اَرْضِيْ وَفِيْ يَدِيْ لَيْسَ لَهٗ فِيْهَا حَقٌّ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْحَضْرَمِيِّ: اَلَكَ بَيِّنَةٌ قَالَ: لَا قَالَ فَلَكَ يَمِيْنُهٗ، قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ الرَّجُلَ فَاجِرٌ لَا يُبَالِيْ عَلٰى مَا حَلَفَ عَلَيْهِ، وَلَيْسَ يَتَوَرَّعُ مِنْ شَيْءٍ قَالَ: لَيْسَ لَكَ مِنْهُ اِلَّا ذٰلِكَ، فَانْطَلَقَ لِيَحْلِفَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اَدْبَرَ لَئِنْ حَلَفَ عَلٰى مَالِهٖ لِيَأْكُلَهٗ ظُلْمًا لَيَلْقَيَنَّ اللّٰهَ وَهُوَ عَنْهُ مُعْرِضٌ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١ / ١٢٣، الحديث رقم: (٢٢٣، ١٣٩) والترمذى فى ٣ / ٢٦٥، الحديث رقم: ١٣٤٠

ترجمہ: ''اور حضرت علقمہ بن وائل رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حضر موت کا رہنے والا اور ایک شخص کندہ کا' دونوں حاضر ہوئے۔ حضرمی (یعنی حضر موت کے رہنے والے) نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! اس شخص نے میری زمین پر قبضہ کرلیا ہے''۔ کندی نے کہا کہ ''وہ میری زمین ہے اور میرے ہاتھ (یعنی میرے قبضے) میں ہے' اس شخص کا اس زمین پر کوئی حق نہیں ہے''۔ نبی کریم ﷺ نے (دونوں فریق کا بیان سن کر) حضرمی سے فرمایا کہ ''کیا تمہارے پاس گواہ ہیں؟'' اس نے کہا کہ ''نہیں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تو ''اب تمہارے دعویٰ کا دارومدار اس (مدعا علیہ) کی قسم پر ہے' اگر یہ قسم کھانے سے انکار کردے گا تو تمہارا دعویٰ تسلیم کرلیا جائے گا اور اگر اس نے قسم کھالی تو تمہارا دعویٰ باطل کردیا جائے

گا)''۔اس (حضرمی) نے کہا کہ ''یا رسول اللہ! یہ شخص تو فاجر (جھوٹا) ہے اس نے جس چیز پر قسم کھائی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ اس بات کی اس کو کوئی پرواہ نہیں) اور اس کو کسی چیز سے پرہیز نہیں''۔آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا (بہرحال) تمہارے لئے اس شخص کی طرف سے سوائے اس (قسم) کے اور کچھ نہیں ہے''۔(یہ سن کر) وہ (کندی) شخص قسم کھانے کے لئے چلا اور جب اس نے پیٹھ پھیری تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''اگر یہ شخص اس (حضرمی) کے مال پر قسم کھائے گا تا کہ اس کا مال زبردستی ہضم کر جائے تو (روزِ قیامت) اللہ تعالیٰ سے اس حال مین ملاقات کرے گا کہ وہ (اللہ) اس سے اعراض فرمائے گا''۔(مسلم)

تشریح: **قوله: جاء رجل من حضرموت ......:**

''حضر'': میں ضاد ساکن ہے اور ''موت'': میں میم اور تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے حضرموت یمن کا ایک علاقہ ہے۔یمن کا ایک قبیلہ ہے۔

ما حلف عليه: فاجر کیلئے صفت کاشفہ ہے۔

''**ليس لك منه الاّ ذالك**'': ایک نسخہ میں ''**الاّ ذاك**'' ہے اور مشار الیہ ''مذکور'' ہے۔

وهو عنه معرض: طیبیؒ کہتے ہیں یہ عراض اس کی ''**استهانة**'' اس پر غصہ اور رحمت سے دوری سے مجاز ہے۔جیسا کہ یہ آیت ہے: ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾[آل عمران: ۷۷]

''**وغلبني على ارضٍ لي**'': امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں ''**على ارضٍ لأبي**'' آیا ہے۔

فوائدِ حدیث:

① صاحب الید (قبضہ والا) اجنبی مدعی سے اولیٰ ہوتا ہے۔
② مدعی علیہ اقرار نہ کرے تو اس پر یمین لازم ہوتی ہے۔
③ بینہ قضاء پر مقدم ہے اور صاحب ید کیلئے بغیر یمین کے فیصلہ کیا جائے گا۔
④ فاجر مدعی علیہ کی یمین عادل شخص کی طرح ہے۔اور اس کے ذریعہ سے یمین کا مطالبہ ساقط ہو جائے گا۔
⑤ مخاصمت کے وقت خصمین میں سے کوئی دوسرے کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ ظالم فاجر وغیرہ ہے۔تو یہ اس کا احتمال رکھتا ہے۔(یعنی عین ممکن ہے کہ وہ شخص واقعی ظالم وفاجر وغیرہ ہو۔از مرتب)
⑥ وارث جب مورث کے لئے کسی شی کا دعویٰ کرے اور حاکم کو یہ معلوم ہو کہ اس کا مورث مر چکا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی وارث نہیں ہے تو اس کیلئے نہ فیصلہ کرنا جائز ہے اور دعویٰ کے وقت اس کو اس پر بینہ پیش کرنے کا مکلّف نہیں بنایا جائے گا۔

اور موضع دلالت یہ قول ہے: ''**غلبني على ارضٍ لي كانت لأبي**'' تو اس نے اقرار کرلیا کہ یہ اس کے باپ کی تھی۔اگر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ اکیلا اس کا وارث ہے تو آپؐ اس سے اس کے وارث ہونے پر بینہ کا مطالبہ کرتے اور اس پر بھی بینہ طلب کرتے کہ خصم کے خلاف اپنے دعویٰ میں حق بجانب ہے۔اس حدیث کا تتمہ ابوداؤد کی روایت میں آئے گا۔

ناحق دعویٰ کا بیان

۳۷۶۵ :وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنِ ادَّعٰى مَا لَيْسَ لَهٗ فَلَيْسَ مِنَّا وَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱ / ۷۹' الحدیث رقم : (۱۱۲' ـ ۶۱) وابن ماجه فی ۲ / ۷۷۷' الحدیث رقم : ۲۳۱۹

ترجمہ:''اورحضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشادفرماتے ہوئے سنا ''جوشخص کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس کی (ملکیت) نہیں ہے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے اور اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے''۔(مسلم)

تشریح: قوله: من ادعى ماليس له ......:

واضح رہے کہ یہ دعویٰ ''متعمدًا'' کی قید کے ساتھ مقید ہے۔

فليس منا: یعنی وہ ہم اہل جنت کے معاشرے میں سے نہیں ہوگا۔''**فليتبوا مقعده من النّار**'': بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ امر بمعنی خبر ہے۔

بہترین گواہ کون ہے

۳۷۶۶ :وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ' ؟اَلَّذِىْ يَاْتِىْ بِشَهَادَتِهٖ قَبْلَ اَنْ يُسْاَلَهَا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۳۴٤' الحدیث رقم : (۱۹ ـ ۱۷۱۹) وأخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ۲۱' الحدیث رقم : ۳۵۹٦' والترمذی فی ٤ / ٤۷۲' الحدیث رقم : ۲۲۹۵' وابن مالك فی ۲ / ۷۲۰' الحدیث رقم : ۳ من كتاب الأقضية' وأحمد فی المسند ٥ / ۱۹۳

ترجمہ:''اور زید بن خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''کیا میں تمہیں بہترین گواہوں کے بارے میں نہ بتادوں؟ (تو سنو کہ) بہترین گواہ وہ ہے جو گواہی طلب کئے جانے سے پہلے گواہی دے دے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ألاأخبركم بخير الشهداء ......:

الشهداء: یہاں پر''شاھدٌ'' کی جمع ہے۔

''**أن يسألها**'': مجہول کا صیغہ ہے۔یعنی شہادت اور گواہی کے مطالبہ سے پہلے وہ گواہی لے کر آئے گا۔

امام نووی ؒ فرماتے ہیں کہ اس میں دو تاویلیں ہیں: پہلی تاویل: امام نووی ؒ فرماتے ہیں سب سے اَصح اور مشہور تاویل امام

مالک اور اصحاب شوافع کی ہے کہ یہ اس شخص پر محمول ہے کہ جس کے پاس کسی انسان کے حق کی شہادت ہو اور وہ انسان یہ نہ جانتا ہو کہ وہ شاہد ہے۔تو یہ شاہد اس کے پاس جاتا ہے اور اس کو بتلا دیتا ہے کہ یہ اس کا گواہ ہے کیونکہ یہ چیز اس کے پاس اس کی امانت ہے۔

دوسری تأویل: یہ شہادۃ حسبہ پر محمول ہے حقوق آدمیین کے علاوہ میں جیسا کہ طلاق، عتق، وقف، وصایا عامہ اور حدود وغیرہ۔ پس جس کسی کو اس قسم کے بارے میں علم ہو تو اس پر واجب ہے قاضی کو اس کی خبر دے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**وأقيموا الشهادة لله**﴾ [طلاق:۲]

تیسری تاویل: یہ گواہی کے مطالبہ کے بعد اداء شہادت میں مبالغہ پر کہ محمول ہے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''**الجواد يعطى قبل السؤال**'' سخی آدمی سوال سے پہلے دیتا ہے۔یعنی وہ فوراً سوال کے بعد بغیر توقف کے دیتا ہے۔

یہ حدیث دوسری حدیث معارض نہیں ۔جیسا کہ آپ علیہ السلام کا قول ہے: ''**يشهدون ولا تشهدون**'' ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ یہ محمول ہے اس پر کہ جس کے پاس شہادت ہو لیکن اس سے شہادت کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو اور وہ اس کا علم رکھتا ہو تو مطالبہ سے پہلے وہ گواہی دیتا ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ اس سے مراد جھوٹا گواہ ہے کہ وہ اس چیز پر گواہی دیتا ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے گواہی طلب کی جاتی ہے۔اور بقول بعض اس کو شاہد بنایا گیا ہو حالانکہ وہ اہل شہادت میں سے نہیں ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام مالک احمد اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

طبرانی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: ''**خير الشهادة ما شهد بها صاحبها قبل ان يُسألها**''۔

ابن ماجہ نے اس طرح نقل کیا ہے: ''**خير الشهود من أدّى شهادته قبل ان يسألها**''۔

جھوٹی قسم اور جھوٹی گواہی کے بارے میں ایک پیشینگوئی

۳۷۶۷:وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ يَجِيْءُ قَوْمٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ اَحَدِهِمْ يَمِيْنَهُ، وَيَمِيْنُهُ شَهَادَتَهُ . (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۷ / ۳، الحديث رقم : ۳۶۵۱، و مسلم في ٤ / ۱۹٦٤، الحديث رقم : (۲۱۲ - ۲۵۳۳) والترمذي في سلنن ٤ / ٦ الحديث رقم : ۲۳۰۳، وابن ماجه في ۲ / ۷۹۱، الحديث رقم : ۲۳٦۲، وأحمد في المسند ۱ / ٤٤۲

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سب سے بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم) پھر وہ جو ان سے متصل ہیں (یعنی تابعین) اور پھر وہ لوگ جو ان سے متصل ہیں (یعنی تبع تابعین) اور پھر (آخر میں) ایسے لوگ پیدا ہوں گے کہ ان میں سے کسی کی گواہی اس کی قسم پر اور اس کی قسم اس کی گواہی پر سبقت لے جائے گی''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: خير الناس قرني:

''النہایہ'' میں ہے کہ ''قرن'' ہر زمانے کے لوگوں کو کہتے ہیں۔ اور یہ ہر زمانہ کے متوسط عمروں والے لوگ ہیں۔ یہ لفظ ''اقتران'' سے ماخوذ ہے گویا کہ وہ مقدار جس میں اس زمانے کے لوگ عمروں اور احوال میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اھ۔

قرن کتنے عرصہ پر مشتمل زمانہ کو کہتے ہیں' اس میں متعدد اقوال ہیں: ① تیس سال ② چالیس سال ③ ساٹھ سال ④ ستر سال ⑤ اسی سال ⑥ سو سال۔ روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: ''عش قرناً'' تو وہ سو سال زندہ رہا۔ اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔

''قرنی'' سے مراد ''صحابہ'' ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو آپ علیہ السلام کے زمانہ میں زندہ تھا۔

قوله: ثم الذين يلونهم ......:

''**ثم الّذين يلونهم**'': وہ لوگ جو خیر اور بھلائی میں ان کے قریب ہیں جیسا کہ تابعین ہیں۔ اور تبع تابعین ہیں

''**ثم يجيئ قوم**'': ایک روایت میں ''اقوامٌ'' کا لفظ آیا ہے۔

''**تسبق شهادة أحدهم يمينه ويمينه شهادته**'': اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

پہلا مطلب: یہ دراصل جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم سے کنایہ ہے۔

دوسرا مطلب: قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو شہادت (گواہی) دینے پر حرص رکھتے ہیں اور اس کی ترویج کا شوق رکھتے ہیں اور جس چیز پر گواہی دیتے ہیں اس پر قسم بھی اٹھاتے ہیں۔ کبھی گواہی دینے سے پہلے قسم اٹھالیتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس کرتے ہیں۔

تیسرا مطلب: مظہرؒ کہتے ہیں کہ اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ یہ یمین اور شہادت میں تیزی کی بات ہو کہ انسان دونوں پر حریص ہوتا ہے، اور اس میں جلدی کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو پتہ نہیں چلتا کہ کس چیز سے ابتداء کرے۔ گویا کہ دین کی کم غوری سے اس کی شہادت یمین سے پہلے ہوتی ہے اور یمین شہادت سے پہلے۔ اس کا ایسا کرنا درحقیقت دین کر پروانہ کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ مالکیہؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ وہ شہادت رد ہوگی جس کے ساتھ یمین وحلف ہو۔ جبکہ جمہور علماء عدم رد کے قائل ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

طبرانیؒ کے الفاظ یہ ہیں: ''**خير النّاس قرني ثم الثاني ثم الثالث ثم يجيئ قومٌ لا خير فيهم**''

بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر دوسرے زمانے کے لوگ پھر تیسرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر ایک ایسی قوم آئے گی، جس میں کوئی بھلائی نہیں ہوگی۔

حاکم نے اپنی مستدرک میں جعدہ بن ہبیرہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

''**خير النّاس قرني الّذي أنا فيهم ثم الّذين يلونهم ثم الّذين يلونهم والاخرون اراذل**'' اور مسلمؒ کی ایک روایت

میں ہے: ''خير النّاس قرنى الّذى أنا فيه ،ثم الثانى، ثم الثالث''۔

قسم اُٹھانے کے لئے قرعہ اندازی کا بیان

۳۷۶۸:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ، اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلٰی قَوْمٍ الْيَمِيْنَ، فَاَسْرَعُوْا، فَاَمَرَ اَنْ يُسْهَمَ بَيْنَهُمْ فِی الْيَمِيْنِ اَيُّهُمْ يَحْلِفُ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاى فى صحيحه ٥ / ٣٣٧، الحديث رقم : ٢٦٧٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں پر قسم کو پیش کیا (یعنی ان سے کہا کہ قسم کھاؤ کہ مدعی کا دعویٰ صحیح نہیں ہے) چنانچہ ان لوگوں نے (قسم کھانے میں) جلدی دکھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''قسم کھانے کے لئے ان لوگوں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے کہ ان میں سے کون شخص قسم کھائے''۔

(بخاری)

تشریح: مظہرؒ کہتے ہیں صورت مسئلہ یہ ہے کہ جب دو آدمی کسی تیسرے آدمی کے ہاتھ میں موجود مال کا دعویٰ کریں اور ان دونوں کے پاس کوئی بینہ نہ ہو، یا یہ کہ دونوں کے پاس گواہ ہوں اور ثالث یہ کہہ دے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ مال تم دونوں کا ہے یا تمہارے علاوہ کسی اور شخص کا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ ان دونوں دعوے داروں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے جس کیلئے قرعہ نکل آئے گا وہ قسم اٹھائے گا۔اور فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے گا اور یہی بات حضرت علیؓ نے فرمائی ہے۔

امام شافعیؒ کے ہاں تیسرے شخص کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ وہ مال دونوں مدعیوں کے درمیان نصف نصف کر دیا جائے گا۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے قول کے مطابق امام احمد اور ایک قول امام شافعی کا بھی ہے۔اور ان کے دوسرے قول میں اور وہ امام ابوحنیفہؒ کا بھی قول ہے کہ اس کو یمین کے ساتھ دونوں دعوے داروں میں نصف نصف کر دیا جائے گا اور ان کے ایک اور قول کے مطابق اس کو ثالث کے پاس رہنے دیا جائے گا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ امّ سلمہؓ کی آنے والی حدیث امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اتباع کے قول کی تائید کرتی ہے۔واللہ اعلم۔

الفصل الثّانی:

بیّنہ کون پیش کرے؟

۳۷۶۹:عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ، اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:اَلْبَيِّنَةُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰی مُدَّعٰی عَلَيْهِ ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذى فى السنن ٣ / ٢٢٦ الحديث رقم : ١٣٤١

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشادفرمایا: ''گواہ مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ ہے''۔

تخریج: اس حدیث کو امام بیہقی اور ابن عساکر نے اس طرح روایت کیا ہے:

''البينة على المدعى واليمين على من انكر الّا فى القسامة''۔

بغیر دلیل کے دعویٰ کرنے کا بیان

۳۷۷۰: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا اِلَيْهِ فِيْ مَوَارِيْثَ لَمْ تَكُنْ لَهُمَا بَيِّنَةٌ اِلَّا دَعْوَاهُمَا، فَقَالَ: مَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِيْهِ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ، فَقَالَ الرَّجُلَانِ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا :يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! حَقِّي هٰذَا لِصَاحِبِيْ، فَقَالَ: لَا وَلٰكِنْ اِذْهَبَا فَاقْتَسِمَا وَتَوَخَّيَا الْحَقَّ، ثُمَّ اسْتَهِمَا ثُمَّ لِيُحَلِّلْ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْكُمَا صَاحِبَهٗ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) **قَالَ اِنَّمَا اَقْضِيْ بَيْنَكُمَا بِرَأْيِ فِيْمَا لَمْ يُنْزَلْ عَلَيَّ فِيْهِ**۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داود فى السنن ٤ / ١٤، الحديث رقم: ٣٥٨٤، وأحمد فى المسند ٦ / ٢٣٠

ترجمہ: ''اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ سے دو آدمیوں کے قضیہ کے بارے میں نقل کرتی ہیں کہ جنہوں نے میراث کے بارے میں آپ ﷺ کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش کیا اور ان دونوں میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہیں تھا بلکہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ تھا (یعنی ان میں سے ایک شخص نے دربار رسالت میں دعویٰ کیا کہ فلاں چیز میری ہے جو مجھے میراث میں ملی ہے اور دوسرے شخص نے بھی اسی چیز کے بارے میں یہی دعویٰ کیا اور دونوں میں سے کوئی بھی اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے گواہ نہیں رکھتا تھا) آپ ﷺ نے (ان دونوں کے جواب سن کر) فرمایا ''(یادرکھو) میں جس شخص کے لئے کسی ایسی چیز کا فیصلہ کردوں جو اس کے بھائی کا حق ہو تو میں اس کو (جہنم کی) آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔ (یعنی اگر مثلاً مدعی نے کسی ایسی چیز کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہے جس کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ چیز اس کی ملکیت میں نہیں ہے بلکہ واقعتاً مدعا علیہ کی مِلک ہے لیکن اس نے جھوٹے گواہوں یا جھوٹی قسم کے ذریعہ اپنا دعویٰ ثابت کر دیا اور میں نے ظاہری قانون کے مطابق اس کی گواہیوں اور قسم پر اعتبار کر کے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا اور وہ چیز اس کو دلوادی تو اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ چیز اس کے حق میں آگ کا ایک ٹکڑا ثابت ہوگی یعنی اس کو دوزخ کی آگ کا حقدار بنائے گی)۔ ان دونوں میں سے ہر ایک نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! میرا حق میرے ساتھی (یعنی فریق مخالف) کے لئے ہے (میں اپنا دعویٰ ترک کرتا ہوں)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''نہیں! (یہ کیسے ممکن ہے کہ چیز ایک ہو اور اس کے حق دار دو ہوں) بلکہ تم دونوں جاؤ اس چیز کو (آدھوں آدھ) تقسیم کرلو اور اپنا اپنا حق لے لو (یعنی تقسیم میں عدل و ایمانداری کو اختیار کرو) اور (یہ طریقہ اختیار کرو کہ) پہلے اس چیز کے دو حصے کرلو (اور اگر یہ تنازعہ ہو کہ ان دونوں حصوں میں سے کون سا حصہ کس کو ملے تو) پھر دونوں قرعہ اندازی کرو (تاکہ طے ہو جائے کہ ان دونوں حصوں میں کون سا حصہ کس شخص کو ملے گا اس طرح تم

دونوں میں سے ہر ایک اس حصہ کو لے لے جس پر اس کا قرعہ نکلا ہے) اور پھر تم میں سے ہر ایک اپنا (وہ) حق اپنے ساتھی کے لئے حلال قرار دے (جو اس کی طرف سے چلا گیا ہو) اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تم دونوں کے درمیان یہ فیصلہ اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے کر رہا ہوں۔ اس معاملہ میں مجھ پر وحی نازل نہیں ہوئی''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: عن النبیؐ فی رجلین۔۔۔الادعوا هما:

''مواریث'': موروث کی جمع ہے۔ یعنی سامان میں دونوں نے دعویٰ کر دیا۔

''الاَّ دعواهما'': یہاں پر الاَّ بمعنیٰ ''غیر'' ہے۔ یا استثناء منقطع ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ تعلیق بالمحال کے باب سے ہے اور مبالغہ مقصود ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے: ﴿ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی ﴾ [الدخان: ۵٦] مطلب یہ کہ سوائے دعویٰ کے ان کے پاس کوئی دلیل اور بینہ نہیں تھا اور یہ بات تو معلوم ہے کہ دعویٰ بینہ نہیں ہوتا تو اس سے لازم آیا کہ دونوں کے پاس کبھی بھی بینہ نہیں تھا۔

قوله: فقال: من قضیت له بشئٍ من حق اخیه فانما اقطع له قطعة من النار......'': اس پر دونوں آدمیوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میرا حق میرے ساتھ کو دے دیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک چیز مستقل طور پر دو آدمیوں کی ہو۔ تم دونوں جاؤ اور اس کو اشتراک کی بنیاد پر آپس میں تقسیم کرو، البتہ تقسیم میں عدل وانصاف سے کام لو اور ''متنازع فیہ'' کو دو حصوں میں نصف نصف کر دو۔ پھر اگر دونوں کے تعین میں تمہارے درمیان کوئی تنازع ہو جائے، تو اس کیلئے قرعہ ڈال دو، اور پھر ہر ایک وہ حصہ لے لے جس کے بارے میں اس کا قرعہ نکل آیا ہو۔ اور پھر تم میں سے ہر ایک **ما بقی** دوسرے کیلئے حلال اور بخشش کر دے۔ یہ فیصلہ دراصل ورع اور تقویٰ کے قبیل سے تھا۔ فتویٰ اور فیصلہ کے باب میں سے نہیں ''مقدار حق کے تعین میں خیر کی طلب کا ارادہ کرو''۔ یہ اس بات پر دال ہے کہ صلح صرف شئ معلوم میں ہی ٹھیک اور درست ہوتی ہے اور خیر طلب کرنا ظن کا فائدہ دیتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ قرعہ کو شامل کر لیا تاکہ حق قوی ہو جائے اور قرعہ بینہ کی ایک نوع ہے اور پھر تحلیل کا حکم دیا تاکہ ان دونوں کی جدائی براءت اور طیب نفس کے ساتھ ہو۔ براءت مجہولہ ہمارے ہاں صحیح اور درست ہے اس حدیث میں مذکور صورتحال احتیاط پر محمول ہے۔ واللہ اعلم۔

لم ینزل علی فیه'': یہ ''انزال'' سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اس میں دو اور توجیہات بھی ممکن ہیں۔

اور اس کی مؤید روایات پہلے گزر چکی ہیں۔ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ اجتہاد (بھی) فرمایا کرتے تھے۔

جس کا قبضہ اُسی کی چیز

۳۷۷۱: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ رَجُلَیْنِ تَدَاعَیَا دَابَّةً فَاَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا الْبَیِّنَةَ اِنَّهَا دَابَّتُهٗ نَتَجَهَا فَقَضٰی بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِلَّذِیْ فِیْ یَدِهٖ۔ (رواه فی شرح السنة)

أخرجه البغوی فی شرح السنة ١٠ / ١٠١' الحديث رقم : ٢٥٠٤' و الدارطنی فی السنن ٤ / ٩٠' الحديث رقم : ٢١

ترجمہ: ''اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے (دربارِ رسالت میں) ایک جانور کے بارے میں دعویٰ کیا اور ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے گواہ پیش کئے کہ یہ جانور اس کا (یعنی میرا) ہے اور (میں نے) اس جانور کو جنوایا ہے (یعنی میں نے ہی اس کی ماں سے نر کو جفتی کروائی جس کے نتیجہ میں یہ جانور پیدا ہوا اور اس طرح اس کے پیدا ہونے کا میں ہی سبب بنا گویا ان دونوں میں سے ہر ایک نے یہی دعویٰ کیا) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس جانور کے بارے میں اس شخص کے حق میں فیصلہ فرمایا' جس کے وہ قبضے میں تھا''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله: ان رجلين تداعيا دابة ......:

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دال ہے کہ **ذو الید** کا بینہ اس کے غیر کے بینہ پر مقدم ہوا کرتا ہے لیکن بظاہر یہ بات نتاج کی صورت میں ہے۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ جب دو آدمی کسی جانور یا کسی اور چیز پر دعویٰ کریں اور وہ چیز ان میں سے کسی ایک کے قبضہ میں ہو تو وہ صاحب الید کی ہوگی اور اس پر وہ قسم اٹھائے گا الا یہ کہ دوسرا اس پر بینہ قائم کرے تو پھر اس کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ اگر ایک نے بینہ قائم کر دی تو پھر صاحب الید کے بینہ کو ترجیح دی جائے گی۔ جبکہ اصحاب ابی حنیفہ کا قول یہ ہے کہ ذوالید کے بینہ کو نہیں سنا جائے گا بلکہ وہ خارجی شخص کا ہوگا۔ سوائے دعویٰ نتاج کے کہ جب ہر ایک یہ دعویٰ کرے کہ یہ آدمی اس جانور کا مالک بنا ہے اس کے نتاج کی وجہ سے اور اس دعویٰ پر بینہ بھی قائم کر دی تو پھر صاحب الید کے حق میں فیصلہ ہوگا اور اگر وہ چیز دونوں کے قبضہ میں ہو اور دونوں دعوے دار ہوں تو پھر دونوں کو حلف دیا جائے گا اور یہ ان دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائے گی چونکہ دونوں ہی صاحب قبضہ ہیں اور اسی طرح جب ہر ایک بینہ قائم کرے تو تب بھی یہی معاملہ ہوگا۔

بغیر بینہ کے قاضی فیصلہ کیسے کرے؟

٣٧٧٢: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ اَنَّ رَجُلَیْنِ ادَّعَیَا بَعِیْرًا عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَبَعَثَ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا شَاهِدَیْنِ، فَقَسَمَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَهُمَا نِصْفَیْنِ (رواه ابوداود وفی رواية له وللنسائی وابن ماجة) اَنَّ رَجُلَیْنِ اِدَّعَیَا بَعِیْرًا لَیْسَتْ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا بَیِّنَةٌ، فَجَعَلَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَهُمَا۔

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٣٧' الحديث رقم : ٣٦١٥' والنسائی فی ٨ / ٢٤٨' الحديث رقم : ٥٤٢٤' وابن ماجه فی ٢ / ٧٨٠' الحديث رقم : ٢٣٣٠

ترجمہ: ''اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعویٰ کیا (یعنی ہر ایک نے کہا کہ یہ اونٹ میرا ہے) اور پھر ان دونوں میں سے ہر ایک نے

اپنے (اپنے دعویٰ کے ثبوت میں) دو دو گواہ پیش کئے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹ کو ان دونوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا''۔ (ابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک اور روایت نیز نسائی و ابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے کہ دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعویٰ کیا لیکن ان دونوں میں سے کسی کے پاس گواہ نہیں تھا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹ کو دونوں کا مشترکہ حق قرار دیا (یعنی اس اونٹ کو ان دونوں کے درمیان تقسیم فرما دیا۔)''۔

(ابوداؤد)

تشریح: قوله: ان رجلين ادعيا ۔۔۔ بينهما نصفين:

خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں شبہ ہے کہ یہ اونٹ دونوں کے قبضہ میں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کسی تیسرے کے قبضہ میں ہو اور وہ (فریق مقدمہ) نہیں تھا۔

یہ امکان بھی ہے کہ قصہ ایک ہی ہو اور یہ بھی کہ متعدد ہوں۔ مگر جب شہادتیں متعارض ہو جائیں تو وہ ساقط ہو جاتی ہیں تو وہ ایسے ہو گئے گویا کہ ان کے پاس بینہ نہ ہو تو تب اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان میں سے کسی ایک کا بینہ ایسا نہیں تھا کہ جس کو دوسرے پر ترجیح دی جائے۔

''فجعله النبی ﷺ بينهما'':

ابن الملک کہتے ہیں کہ یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اگر دو آدمی کسی چیز کا دعویٰ کریں اور کسی ایک کے پاس گواہ نہ ہوں، یا دونوں کے پاس گواہ ہوں اور ''مدعی بہٖ'' دونوں کے قبضہ میں ہو، یا کسی ایک کے قبضہ میں بھی نہ ہو۔ (بلکہ رجل ثالث کے قبضہ میں ہو) تو یہ چیز ان دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگی۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ مطلق ہے اس کو اس مقید پر محمول کیا جائے گا جو آگے آ رہا ہے: **''استهما على اليمين''**۔

یمین میں قرعہ اندازی کا بیان

۳۷۷۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا فِي دَابَّةٍ وَلَيْسَ لَهُمَا بَيِّنَةٌ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اسْتَهِمَا عَلَى الْيَمِيْنِ۔ (رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبو داود فی السنن ٤ / ٤٠، الحديث رقم: ٣٦١٨، وابن ماجه فی ٢ / ٧٨٦، الحديث رقم: ٢٣٤٦، وأحمد فی المسند ٢ / ٢٨٩

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے ایک جانور کے بارے میں جھگڑا کیا (کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اس جانور کو اپنی ملکیت کہتا تھا) اور ان دونوں کے پاس کوئی گواہ نہیں تھا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''قسم کھانے پر قرعہ ڈال لو۔ (یعنی جس کے نام قرعہ نکل آئے قسم کھا کر کہے کہ یہ جانور میرا ہے اسی کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے گا)۔''۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: یہ حدیث (مفہوم کے اعتبار سے) فصل اوّل کی طرح ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ نصفین پر قرعہ

ڈالا ہو اور قرعہ کے ساتھ ہر ایک سے اس پر یمین بھی لی گئی ہو۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائیؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

حلف کیسے لیا جائے؟

۳۷۷۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ حَلَّفَهٗ: اِحْلِفْ بِاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ مَالَهٗ عِنْدَكَ شَیْءٌ یَعْنِیْ لِلْمُدَّعِیِّ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٤١' الحديث رقم: ٣٦٢٠

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک قضیہ میں) نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے ارشاد فرمایا جس سے قسم لینے کا ارادہ تھا کہ تم اس بات پر اللہ کی قسم کھاؤ جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اس شخص یعنی مدعی کا تم پر کوئی حق نہیں ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''حلفه'': تشدید لام کے ساتھ ہے۔

جھوٹی قسم کی مذمت

۳۷۷۵: وَعَنِ الْاَشْعَثِ بْنِ قَیْسٍ قَالَ: کَانَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ رَجُلٍ مِنَ الْیَھُوْدِ اَرْضٌ' فَجحجَدَنِیْ' فَقَدَّمْتُهٗ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ' فَقَالَ: اَلَكَ بَیِّنَةٌ؟ قُلْتُ: لَا قَالَ لِلْیَھُوْدِیِّ: اِحْلِفْ قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اِذَنْ یَحْلِفُ وَیَذْھَبُ بِمَالِیْ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ الآیة۔ (رواہ ابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٤١' الحديث رقم: ٣٦٢١' والترمذی فی ٥ / ٢٠٨' الحديث رقم: ٢٩٩٦' وابن ماجه فی ٢ / ٧٧٨' الحديث رقم: ٢٣٢٢' وأحمد فی المسند ٥ / ٢١١

ترجمہ: ''اور حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ''ایک زمین میرے اور ایک یہودی کے درمیان مشترک تھی لیکن یہودی نے (اس زمین پر) میرے حصے (کو تسلیم کرنے) سے انکار کر دیا' چنانچہ میں اس کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گیا اور اپنا معاملہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تمہارے پاس گواہ ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''نہیں'' آپ ﷺ نے یہودی سے فرمایا کہ ''تم قسم کھاؤ'' میں نے یہ (سن کر) عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! یہ تو قسم کھالے گا اور میرا مال لے جائے گا''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اسی طرح کے ایک قضیہ کے سلسلے میں جس کا ذکر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں گزر چکا ہے) یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ...... ''یقیناً وہ لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو معمولی سی قیمت کے عوض بیچ دیتے ہیں''۔ اس روایت کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے''۔ شرح السنہ میں ہے کہ اس سے یہ بات ثابت

ہوتی ہے کہ کافر بھی خصومات میں قسم اٹھائے گا جیسا کہ مسلمان حلف اٹھاتا ہے۔

راویٔ حدیث:

اشعث بن قیس۔ یہ ''اشعث'' قیس بن معدیکرب کے بیٹے ہیں۔ان کی کنیت ''ابومحمد کندی'' ہے۔جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ ''کندہ'' کا وفد آیا ہے تو اس کے ساتھ رئیس وفد ہو کر آئے تھے۔یہ واقعہ ۱۰ھ کا ہے۔یہ قبولِ اسلام سے قبل اپنے قبیلہ کے بہت معزز اور ممتاز شخص تھے اسلام میں بھی بہت وجیہہ و باوقار شخص تھے۔جب حضور انور ﷺ کی وفات ہوئی تو یہ اسلام سے پھر گئے تھے۔پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں مشرف باسلام ہو گئے اور کوفہ میں رہ کر ۴۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔امام شافعیؒ کے نزدیک ان کا شمار صحابہ میں ہے اور ہمارے نزدیک تابعین میں شمار ہوگا' کیونکہ ہمارے ہاں ارتداد کی وجہ سے شرف صحابیت زائل ہو جاتا ہے۔

تشریح: طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت کے نزول کی اس قول:''**اذن یحلف ویذهب بما لی؟**'' کے ساتھ کیا مطابقت ہے۔؟ میں کہتا ہوں کہ اس میں دو توجیہات ممکن ہیں:

① گویا کہ اشعث بن قیس سے یہ کہا گیا ہے: تمہیں صرف اتنا حق حاصل ہے کہ اس سے قسم لے لو اور اگر اس نے جھوٹ بولا تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔

② ممکن ہے کہ اس آیت سے یہودی کو تورات میں مذکور اس کے مثل کسی وعید کی یاد دلانا مقصود ہو۔

سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک ''**ویذهب بمالی**'' تک ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اکثر نسخ مصابیح میں اس حدیث کے آخر میں ''**صح او صحیح**'' مذکور ہے جبکہ سنن ابی داؤد ابن ماجہ اور شرح السنہ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

جھوٹی قسم اُٹھانے کا اُخروی انجام

۳۷۷۶: وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلاً مِنْ كِنْدَةَ وَ رَجُلاً مِنْ حَضْرَمُوْتَ اخْتَصَمَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اَرْضٍ مِنَ الْيَمَنِ فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَرْضِيْ اِغْتَصَبَنِيْهَا اَبُوْ هٰذَا وَهِيَ فِيْ يَدِهٖ قَالَ هَلْ لَّكَ بَيِّنَةٌ؟ قَالَ: لَا وَلٰكِنْ اُحَلِّفُهٗ وَاللّٰهِ مَا يَعْلَمُ اَنَّهَا اَرْضِيْ اِغْتَصَبَنِيْهَا اَبُوْهُ فَتَهَيَّاَ الْكِنْدِيُّ لِلْيَمِيْنِ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَقْطَعُ اَحَدٌ مَالاً بِيَمِيْنٍ اِلَّا لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ اَجْذَمُ فَقَالَ الْكِنْدِيُّ: هِيَ اَرْضُهٗ . (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داود في السنن ٤ / ٤٢، الحديث رقم: ٣٦٢٢، وأحمد في المسند ٥ / ٢١٢

ترجمہ: ''اور حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ کندہ کا ایک شخص اور حضر موت کا ایک شخص

دونوں یمن کی ایک زمین کے بارے میں اپنا قضیہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرمی نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! اس شخص کے باپ نے میری زمین مجھ سے چھین لی تھی اور اب وہ اس کے قبضہ میں ہے (میں آپ ﷺ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری وہ زمین مجھ کو واپس دلوائی جائے) آپ ﷺ نے حضرمی سے فرمایا کہ ''کیا تمہارے پاس گواہ ہے (جو گواہی دے سکیں کہ وہ زمین واقعتاً تمہاری تھی؟) اس نے عرض کیا کہ ''نہیں! لیکن میں اس سے خدا کی قسم کھلوا کر یہ اقرار کراؤں گا کہ وہ نہیں جانتا کہ وہ زمین میری (حضرمی کی) ہے جس کو اس کے باپ نے مجھ سے چھین لیا ہے''۔ چنانچہ وہ (کندی) قسم کھانے کے لئے تیار ہو گیا (اور جب قسم کھانے چلا) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''(یاد رکھو) جو بھی شخص (جھوٹی) قسم کھا کر کسی کا مال حاصل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے (روزِ قیامت) اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ شخص ''اجذم'' ہوگا (یعنی اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا یا اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ کندی نے یہ (سن کر) عرض کیا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ) وہ زمین اسی شخص کی ہے''۔

(ابوداؤد)

تشریح: **قوله:يارسول الله ان أرضي۔۔۔۔ فتهيأ الكندی لليمين:**

''**اغتصبينعا ابو هذا**'' اور ایک نسخہ میں ہے۔''**اغتصبها ابوه**''۔

''**قال**'': اور ایک نسخہ میں ''**فقال**'' ہے۔'' **احلفه**'': لام تشدید کے ساتھ ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: ''**والله مايعلم**''

کہ یہ محلوف بہ ہے۔ یعنی اس لفظ پر قسم اٹھاؤ۔ جملہ قسمیہ مصدر (یعنی مفعول مطلق) ہونے کی بناء پر محلاً منصوب۔ ای ''**احلف هذا الحلف**''۔''**انها ارضي**'' تصحیح شدہ نسخ میں ''انّھا'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں بکسرہ الہمزہ ہے۔ لیکن بظاہر یہ کاتب کے قلم کا سہو ہے۔

''**اغتصبينعا**'' اور ایک نسخہ میں ''**اغتصبها ابوه**'' ہے۔

قوله:الا لعي وهو اجذم: اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں:

① وہ مقطوع الید ہوگا۔

② مقطوع البرکۃ ہوگا۔

③ حرکۃ اور حجۃ نہیں ہوگی۔

④ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ''اجذم'' کا مطلب یہ ہے کہ ''مقطوع الحجۃ'' ہوگا۔ یعنی اس کے پاس زبان نہیں ہوگی کہ جس سے وہ بات کر سکے، اور نہ ہی اس کے پاس کوئی حجت ہوگی جو اس کے لئے مسلمان کا مال ظلماً کھانے سے عذر بن جائے جبکہ وہ اپنے حلف میں جھوٹا ہو۔

جھوٹی قسم اُٹھانا سب سے بڑا ہے

۳۷۷۷:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اُنَيْسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ مِنْ اَكْبَرِ الْكَبَائِرِ الشِّرْكَ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقَ الْوَالِدَيْنِ وَالْيَمِيْنَ الْغَمُوْسَ وَمَا حَلَفَ حَالِفٌ بِاللّٰهِ يَمِيْنَ صَبْرٍ فَاَدْخَلَ فِيْهَا مِثْلَ جَنَاحِ بَعُوْضَةٍ اِلَّا جُعِلَتْ نُكْتَةً فِيْ قَلْبِهٖ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

(رواه الترمذی وقال : هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥ / ٢٢٠، الحديث رقم : ٣٠٢٠، وأحمد فی المسند ٣ / ٤٩٥

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بڑے گناہوں میں سب سے بڑے گناہ یہ ہیں: ① اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ② والدین کی نافرمانی کرنا ③ اور جھوٹی قسم کھانا (یاد رکھو) جس شخص نے بھی اللہ کی مضبوط قسم کھائی اور اس قسم میں مچھر کے پر کے برابر (یعنی تھوڑا سا) بھی جھوٹ شامل کیا تو اس کے دل میں قیامت تک کے لئے ایک نکتہ لگا دیا جاتا ہے (جس کا وبال آخرت میں ظاہر ہوگا)'' (ترمذی) اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله:''انّ من أكبر الكبائر الشرك''۔

شرک سے مراد مطلق کفر ہے۔کفر کو شرک سے تعبیر کیا کیونکہ کافروں میں غالب چیز شرک ہی ہے۔''من'' زائدہ ہے۔ان نحویوں کے مذہب پر جو اس کو کلام مثبت میں جائز سمجھتے ہیں۔جیسا کہ امام اخفشؒ وغیرہ یا ''من'' معطوف و معطوف علیہ کے مجموعہ پر داخل ہے۔ورنہ شرک تو خود اکبر الکبائر ہے۔نہ کہ من جملہ اس میں ہے۔

قوله:''وعقوق الوالدين'':''شرک'' پر عطف ہے۔اس سے مراد ان دونوں میں سے کسی ایک کی مخالفت ہے۔اس نہج پر کہ عام طور پر ولد سے اس جیسی چیز کا احتمال نہیں ہوتا۔

''واليمين الغموس''''یعنی گزری ہوئی چیز پر عمداً و قصداً جھوٹی قسم اٹھانا۔اور اس کو ''غموس'' اس لئے کہتے ہیں کہ یہ یمین ''صاحب یمین'' کو گناہ میں ڈبو دیتی ہے۔اور ''فعول'' کا وزن مبالغہ کیلئے ہوتا ہے۔''النہایہ'' میں ہے کہ اس سے مراد وہ جھوٹی قسم ہے کہ جس کے ذریعے سے حالف دوسرے کا مال ہڑپ کر جاتا ہے۔

قوله:ماحلف حايف ......:

مثل ''جناح بعوضة'' اس سے مراد کم از کم مقدار ہے۔یعنی بالکل تھوڑا سا جھوٹ یا تھوڑی سی خیانت کر دیتا ہے۔(اور اس چیز میں سے جو کہ اس کا ظاہر اس کے باطن کے خلاف ہو۔کیونکہ یمین مستحلف کی نیت پر ہوتی ہے۔) مگر یہ قسم اس کے دل پر ایک ایسا کالا سا نقطہ بنا دیتی ہے جو تلوار یا شیشے میں میل کچیل اور داغ کے مشابہ ہوتا ہو۔اور یہ نقطہ روز قیامت تک رہے گا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ (یہاں اس الیٰ کی) ''انتهاء'' کا معنی یہ ہے کہ اس چھوٹے سے نقطہ کا اثر اس پر قیامت تک ہوگا، اس کے بعد اس پر اس کی سزا اور وبال کا ترتب ہوگا۔یہ اس تھوڑے سے جھوٹ اور خیانت کا نقصان ہے۔جب یہ بالکلیہ خیانت اور

جھوٹ ہوگا تو اس کا کتنا بڑا عذاب ہوگا۔

یہاں پر آپ علیہ السلام نے تین چیزیں ذکر کی ہیں۔اور آخری چیز کو ''وعید'' کے ساتھ مختص کیا ہے۔ یہ بات بتلانے کیلئے کہ یہ بھی اس میں سے ہے یہ بھی اکبرالکبائر میں داخل ہے تاکہ لوگ اس کو حقیر سمجھنے سے بچیں۔ کیونکہ عام طور پر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ کبائر میں سے نہیں ہے۔اور خریم بن فالک کی روایت میں تو اس کو شرک کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے:

''عدلت شهادة الزور بالاشراك بالله''۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔

جھوٹی قسم اُٹھانے والا جہنمی ہے

۳۷۷۸: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَحْلِفُ اَحَدٌ عِنْدَ مِنْبَرِيْ هٰذَا عَلٰى يَمِيْنٍ اٰثِمَةٍ وَلَوْعَلٰى سِوَاكٍ اَخْضَرَ اِلَّا تَبَوَّاَ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ' اَوْوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ۔

(رواه مالك وابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ٥٦٧' الحديث رقم: ٣٢٤٦' وابن ماجه فى ٢ / ٧٧٩' الحديث رقم: ٢٣٢٥' و مالك فى الموطا ٢ / ٧٢٧' الحديث رقم: ١٠

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو بھی شخص میرے اس منبر کے پاس جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ (دوزخ کی) آگ میں اپنا ٹھکانہ تیار کرتا ہے۔ یا یہ فرمایا کہ اس کے لئے دوزخ کی آگ واجب ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ (جھوٹی قسم) ایک سبز مسواک کے لئے کیوں نہ ہو''۔ (مالک' ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: قوله: **''لا يحلف احد عند منبرى هٰذا على ليمين آئمة''**

ممکن ہے کہ ''ھذا'' کی قید سے ''منبر مکہ'' سے احتراز مقصود ہو (یعنی یہاں اس کا وبال یہ ہے اور اگر مکہ میں یہ حلف اٹھایا تو خود سوچ لو اس کا وبال کیا ہوگا۔)

''آثمة'' سے مراد ''یمین کاذبة'' ہے۔اس کو ''آثمة'' اس لئے کہہ دیا تاکہ اس میں توسع ہو جائے۔ اس طور پر کہ اس کے صاحب کے وصف کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا۔ای ''ذات اثم''۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ یہاں پر ''حلف'' کو ''عند المنبر'' کے ساتھ مقید کر دیا گیا تاکہ اس یمین کی تغلیظ میں شدت آجائے اس کی تعظیم اور شرف کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ تو ''یمین آثمہ'' جہاں کہیں بھی ہوگی قابل سخط ہوگی۔ جبکہ مقامات متبرکہ میں اس کے گناہ میں مزید اضافہ ہوگا۔

تورپشتی کہتے ہیں جو منبر کو قابل تغلیظ سمجھتے ہیں اس کی وجہ ان کے نزدیک تو ظاہر ہے۔ لیکن جو لوگ ازمنہ اور امکنہ کو وجہ تغلیظ نہیں خیال کرتے ان کے نزدیک یہاں پر منبر کا ذکر اس لئے کیا ہے اس زمانہ میں لوگ فیصلے اور قسمیں مسجد میں اٹھاتے تھے اور مسجد میں دائیں جانب کو بیٹھتے تھے اور وہاں پر (جانب یمین) منبر اقضیہ کا محل تھا۔ تو حدیث کو ''علی ما کان'' پر ذکر دیا اور

میں اس تأویل کو حسن خیال کرتا ہوں۔ہم اس سے عدول کو درست خیال کرتے ہیں تا کہ اس کا محتاج نہ ہو جائے کہ کوئی اور چیز ''حلف باللّٰہ'' کے برابر ہے اور یمین آثمہ تو ''سخط اللّٰہ'' کا موجب ہے اور اس کی ناراضگی کا سبب ہے۔اس صفت کے ساتھ یعنی بیان ہو جائے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ پہلے قول کی تائید کیلئے یہ کہنا کافی ہے کہ اولاً منبر کو اسم اشارہ کے ساتھ بیان کرنا ثانیاً اس کی اضافت کرنا' یہ صرف تعظیم کیلئے ہے اور یہ بتانا ہے کہ ''تغلیظ یمین''میں مکان کو دخل ہے۔

قوله:''ولو على سواك اخضر......''

یہ معنی ''تحقیر'' کیلئے بطور تتمہ ہے۔کیونکہ مسواک کو خشک ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

''او وجبت له النّار'': یہ راوی کی طرف سے شک ہے۔یا ''او'' تنویع کیلئے ہے۔اس طور پر کہ اوّل وعید ''فاجر'' کیلئے ہے اور ثانی وعید ''کافر'' کیلئے ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس محلوف علیہ جیسی چیز جس کو عموماً قابل یمین شمار ہی نہیں کیا جاتا بلکہ عرف میں اس کو لغو خیال کیا جاتا ہے' اور اس کا مواخذہ بھی نہیں کیا جاتا' جب اس مکان رفیع کی وجہ سے اس پر یہ وعید شدید ہے۔تو جو (محلوف علیہ اور مکان) اس سے بڑھ کر ہو تو اس پر کیا وعید ہوگی؟ حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ ''ایمان''یعنی قسمیں مکان و زمان کے اعتبار سے مغلظہ بنتی ہیں نہ کہ محلوف علیہ کے اعتبار سے اگر چہ محلوف علیہ عظیم تر ہو۔

جھوٹی قسم شرک کے برابر ہے

۳۷۷۹:وَعَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ: صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبْحِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَامَ قَائِمًا' فَقَالَ: عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْإِشْرَاكِ بِاللّٰهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ' ثُمَّ قَرَأَ: ﴿فَاجْتَنِبُوْا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ﴾ ۔ (رواه ابو داود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود في السنن ٤ / ٢٣' الحديث رقم: ٣٥٩٩' وابن ماجه ٢ / ٧٩٤' الحديث رقم: ٢٣٧٢

ترجمه:''اور حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو (صحابہؓ سے خطاب کرنے کے لئے) کھڑے ہوئے اور تین مرتبہ یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ ''جھوٹی گواہی کو اللہ تعالیٰ سے شرک کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے''۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور دلیل) یہ آیت تلاوت فرمائی :(جس کا ترجمہ یہ ہے)'' پلیدی (بتوں کی پرستش) سے بچو اور جھوٹ بولنے سے اجتناب کرو کیونکہ تم باطل سے حق کی طرف رجوع کرنے والے ہو نہ کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہو۔اس روایت کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

راوئ حدیث:

خریم بن الاخرم۔ یہ خریم ''اخرم'' کے بیٹے اور ''شداد بن عمرو بن فاتک اسدی'' کے پوتے ہیں۔لیکن یہ اپنے دادا کی طرف نسبت کر دیئے جاتے ہیں اور ان کو ''خریم بن فاتک'' کہہ دیا جاتا ہے۔ان کا شمار شامیوں میں ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک کوفیوں میں۔ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔''خریم'' میں خائے معجمہ مضموم' رائے مہملہ مفتوح اور یاء ساکن ہے۔اور ''فاتک'' میں فاء الف اور تائے مثناۃ فوقانی مکسور ہے۔(کذا قال ابن اثیر فی الجامع)

تشریح: قوله:فلما انصرف قام قائما:

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ اسم فاعل مصدر کا قائم مقام بنایا گیا ہے۔اور علم معانی میں یہ بات مقرر ہے کہ ظاہری معنی سے کسی اور معنی کی طرف عدول کرنے میں لازماً کوئی نقطہ ہوا کرتا ہے۔جب مصدر کو اسم فاعل کی جگہ پر رکھ دیا گیا گویا کہ اس کا معنی ایک جیسی مجسم کے ہو گیا ایک ذات میں تبدیل ہو گیا اور اگر اس کے عکس پر معنی بر عکس ہوگا۔اور آپ علیہ السلام کے قیام کو ''قائمًا'' کہا' اسناد مجازی کی بناء پر جیسا کہ کہا جاتا ہے:''نهاره صائم وليله قائمٌ'' اور یہ ''ما قام له'' کی عظمت شان اور مضبوطی پر دال ہے۔

قوله: عدلت شهادة الزور......: جھوٹی گواہی کو ''اشراك بالله'' کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔اس لئے کہ شرک اللہ تعالیٰ پر ایسا جھوٹ ہے جو جائز نہیں ہے اور ''شهادة الزور'' بندے پر ایسا جھوٹ ہے جو جائز نہیں ہے۔ان دونوں کا کوئی وجود ہی نہیں۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''زور'' ''ازورار'' سے ماخوذ ہے ''انحراف'' اور ''قول زور'' کو شرک اس لئے کہا کہ شرک بھی ''زور'' کے باب میں سے ہے۔کیونکہ مشرک یہ خیال کرتا ہے کہ بت عبادت کے مستحق ہیں۔

''ثلاث مرّاتٍ'': آپؐ نے یہ باتیں تین مرتبہ ارشاد فرمائیں یہ تکرار وعید میں مزید مبالغہ اور تاکید کیلئے ہے۔

فاجتنبوا الرجس من الأوثان: ''من'' بیانیہ ہے۔''نجس'' سے مراد اصنام ہے۔''واجتنبوا قول الزور'' جھوٹی بات شہادت زور کو بھی شامل ہے۔علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ''قول الزور'' کا عطف ''عبادة الاوثان'' پر کیا گیا ہے۔اور فعل (اجتناب) کو مکرر ذکر فرمایا کہ یہ دونوں باتیں رجس میں سے ہیں کہ جس سے اجتناب واجب اور لازم ہے۔گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ''عبادۃ الاوثان'' سے اجتناب کرو کیونکہ وہ گندگی کی جڑ ہے۔اور جھوٹ سے پرہیز کرو اور اس میں کسی چیز کے قریب مت ہونا۔کیونکہ وہ قباحت اور گندگی میں اس کے مثل ہے۔اور جب یہ از قبیل ''عبادة الأوثان'' ہو تو اس کے بارے میں کیا خیال وگمان ہے؟ ''أوثان'' کو رجس قرار دینا بطور تشبیہ کے ہے۔یعنی جیسے تم بالطبع گندگی سے نفرت کرتے ہو اس سے اجتناب کرتے ہو تم پر لازم ہے کہ ''رجس'' کے مشابہ چیزوں سے بھی بھرپور نفرت اور اجتناب کرو۔اگلے الفاظ سے اسی معنی کی مزید تقریر ثابت ہو رہی ہے

''حنفاء اللّٰه'' یہ فاعل سے حال مؤکدہ ہے۔

''غير مشركين به'': اس بات پر دلالت کرنے کیلئے ذکر کیا کہ قول زور اور اشراک باللہ میں کوئی فرق نہیں ہے اور

دونوں اس گندگی اور رجس میں برابر ہیں جن سے اجتناب واجب و لازم ہے۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی رعایت اللہ تعالیٰ کے حق کے برابر اور معادل ہے۔

"حنفاء": "حنیف" کی جمع ہے۔وہ شخص جو باطل سے حق کی طرف مائل ہو۔اور بعض نے اس کا معنی "مسلمین" بیان کیا ہے۔پس اس صورت میں "غیر مشرکین" اس کیلئے بیان اور تاکید واقع ہوگا۔

۳۷۸۰: وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ عَنْ اَیْمَنِ بْنِ خُرَیْمٍ اِلَّا اَنَّ ابْنَ مَاجَةَ لَمْ یَذْکُرِ الْقِرَاءَ ةَ۔

أخرجه الترمذى فى السنن ٤ / ٤٧٥' الحديث رقم: ٢٣٠٠' وأحمد فى المسند ٤ / ٣٢١

ترجمہ: نیز اس روایت کو احمد و ترمذی نے بھی ایمن بن خریم سے نقل کیا ہے۔مگر ابن ماجہ سے آیت مبارکہ کی تلاوت کا ذکر نہیں کیا"۔ برخلاف ائمہ ثلاثہ کے کہ انہوں نے اس کو ذکر کیا ہے۔)

تشریح: "ایمن" ایسر کی ضد ہے۔

کس کی گواہی معتبر نہیں

۳۷۸۱: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ' وَلَا مَجْلُوْدٍ حَدًّا وَلَا ذِیْ غِمْرٍ عَلٰی اَخِیْهِ' وَلَا ظَنِیْنٍ فِیْ وَلَاءٍ' وَلَا قَرَابَةٍ' وَلَا الْقَانِعِ مَعَ اَهْلِ الْبُیُوْتِ. (رواه الترمذى وقال هذا حديث غريب ويزيدبن زياد الدمشقى الراوى منكر الحديث)

أخرجه الترمذى فى سنن ٤ / ٤٧٣' الحديث رقم: ٢٢٩٨

ترجمہ: "اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "ان لوگوں کی گواہی جائز و معتبر نہیں: ① خیانت کرنے والے مرد اور خیانت کرنے والی عورت ② جس شخص پر تہمت کی حد جاری کی گئی ہو ③ دشمن' جو اپنے (مسلمان) بھائی کے خلاف ہو ④ وہ شخص جو ولاء کے بارے میں متہم ہو ⑤ وہ شخص جو قرابت کے بارے میں متہم ہو۔ ⑥ وہ شخص جو کسی ایک گھر کا کفیل ہو"۔ (ترمذی)

اسنادی حیثیت

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے وجہ غرابت یہ ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی یزید بن زیاد دمشقی "منکر الحدیث" ہے۔

تشریح: قوله: لاتجوز شهادة خائن ولا خائنة:

"لا تجوز: (یہ صیغہ تانیث کے ساتھ ہے۔جبکہ صیغہ مذکر کے ساتھ بھی جائز ہے) مراد وہ ہیں کہ جو لوگوں کی امانات میں خیانت کرنے میں مشہور ہوں نہ کہ ان چیزوں میں کہ جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں "احکام دین" میں سے امانت کے طور پر دیتے ہوں۔

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ اس سے مراد "اعم" ہو۔یعنی وہ شخص جو امانت میں خیانت کرے۔چاہے احکام

دین میں ہو یا لوگوں کے اموال میں ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ﴾ [الانفال:۲۷] تو ''خائن'' سے مراد ''فاسق'' ہے۔ یعنی وہ شخص جو کبیرہ گناہ کرے، یا صغائر پر اصرار کرے۔

قوله: ''ولا مجلود حدًا''۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ وہ شخص مراد ہے جس کو حد قذف میں کوڑے لگے ہوں۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ ''مجلود حدًا'' کو علیحدہ سے ذکر کرنا۔ اور اس پر عطف کرنا اس کی جنایت کے بڑا ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ حکم زانی غیر محصن' قاذف اور شرابی سب کو شامل ہے۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ جب کسی کو حد قذف لگ جائے، تو توبہ کے بعد بھی اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ البتہ کوڑوں کی سزا جاری ہونے سے پہلے اس کی گواہی معتبر اور مقبول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا﴾ [النور:٤] ''اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں''۔

صاحب المدارک فرماتے ہیں: شہادت کو موضع نفی میں نکرہ ذکر فرمایا ہے جو ہر شہادت کو شامل ہے۔ اس کی شہادت کا قبول نہ ہونا ہمارے نزدیک اس کی حد کا حصہ ہے۔ جبکہ امام شافعیؒ کے ہاں اس کی شہادت نفس قذف کی وجہ سے مردود ہوگی۔

ہمارے ہاں (حنفیہ کے ہاں) شرط کی جزاء رمی، جلد اور اس کی شہادت کا تأبیداً مردود ہونا ہے اور ﴿واولٓئك هم الفاسقون﴾ [الشوری:٤] یہ کلام مستأنفہ ہے اور محل ''جزاء شرط'' میں شامل و داخل نہیں ہے۔ گویا کہ یہ حکایت حال ہے یعنی ان پر سزا جاری کے بعد، اللہ کے ہاں یہ لوگ فاسق ہیں۔

اور یہ قول تعالیٰ: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا﴾ [النور۔۵] یہاں سے مراد حد قذف ہے۔ یہ ''فاسقین'' سے استثناء ہے۔ اور اس پر یہ آیت دال ہے: [فان الله غفور رحيمٌ]۔ ان کے گناہ بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا۔ مظہرؒ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ علماء کا قول ہے کہ قذف بھی جملہ فسوق میں سے ہے۔ اس کا تعلق اقامت حد کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ اگر اس نے توبہ کی تو اس کی شہادت قبول ہوگی چاہے اس کو کوڑے لگے یا نہ لگے ہوں۔ اور اگر توبہ نہ کی تو اس کی شہادت قبول نہیں ہوگی چاہے اس کو کوڑے لگے ہوں یا نہ لگے ہوں۔

قوله: ''ولا ذی غمرٍ علی اخيه'':

یعنی کسی غصے اور دشمنی رکھنے والے کی شہادت دشمن کے خلاف قبول نہیں ہوگی۔ یعنی دشمن کی شہادت دشمن کے خلاف قبول نہیں ہوگی۔ خواہ وہ اس کا نسبی بھائی ہو۔ خواہ وہ اجنبی شخص ہو۔ ''علی اخيه'' کی تعبیر اختیار کرنے میں درحقیقت اس کے دل کو نرم کرنا مقصود ہے اور اس کے فعل کی قباحت بیان کرنے کے لئے ہے۔

قوله: ''ولا ظنين فی ولاء ولا قرابةٍ'': اس کی شہادت کو اس لئے مردود کہا کیونکہ اس نے اپنے نفس سے وثوق کی نفی کر دی اور مظہرؒ کہتے ہیں کہ جس نے کہا کہ میں فلاں شخص کا آزاد کردہ ہوں حالانکہ وہ اس میں جھوٹا ہو۔ اس طور پر کہ لوگ اس کو

متہم سمجھتے ہوں تو اس کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ فاسق ہے۔ معتق سے ولاء کو قطع کرنا اور غیر معتق کیلئے ولاء کو ثابت کرنا گناہ کبیرہ ہے اور کبیرہ کا مرتکب فاسق ہے۔ اور اسی طرح ''ظنین فی القرابة'' بھی ہے۔ اور یہ کہنا بھی اسی قبیل سے ہے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں اور فلاں کا نسبی بھائی ہوں جبکہ لوگ اس کو اس دعویٰ میں جھوٹا سمجھتے ہوں۔

قوله: ''ولا القانع مع اهل البیت'':

مظہرؒ کہتے ہیں کہ ''قانع'' اس سائل کو کہتے ہیں جو ادنیٰ قوت پر صبر کرتا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی شخص کے نفقہ میں ہو۔ جیسا کہ خادم اور تابع ہوتا ہے۔ اس کی شہادت اس کیلئے قبول نہیں ہوگی کیونکہ وہ اس شہادت کے ذریعے اپنے نفس کو نفع دے گا۔ بایں طور کہ مشہود لہ کو جو مال حاصل ہوا ہے اس کا نفع تو شاہد کی طرف لوٹے گا۔ کیونکہ وہ اس کے نفقہ میں سے کھائے گا۔ اسی طرح اس شخص کی شہادت بھی قبول نہیں ہوگی جو شہادت کے ساتھ اپنے نفس کو نفع پہنچائے۔ جیسا کہ والد اپنی اولاد کیلئے گواہی دے یا اولاد والد کے لئے گواہی دے' یا غریم (قرض خواہ) مال کی گواہی دے کسی مفلس کیلئے اور میاں بیوی کی گواہی ایک دوسرے کیلئے قبول کی جائے گی برخلاف امام ابوحنیفہؒ اور احمدؒ کے اور اسی طرح بھائی کی گواہی بھائی کے حق میں بھی قبول ہوگی برخلاف امام مالکؒ کے۔

''شرح نخبۃ الفکر'' میں ''حدیث منکر'' کی تعریف یہ ذکر کی ہے: **منأو کثرب غفلته أوظهر فسقه فحدیثه منکر۔**

جامع صغیر میں ہے: ''**لا تجوز شهادة ذی الظنة ولا ذی الحنة**'' یعنی تہمت اور عداوت والے شخص کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔

اس حدیث کو امام کو حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت کیا ہے۔ ''ظنۃ'' ''**بکسر ظاء**'' تہمت کو کہتے ہیں۔

کس کی گواہی کس کے لئے معتبر نہیں

۳۷۸۲: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ، وَلَا خَائِنَةٍ، وَلَازَانٍ، وَلَا زَانِيَةٍ، وَلَاذِيْ غِمْرٍ عَلٰى اَخِيْهِ، وَرَدَّ شَهَادَةَ الْقَانِعِ لِاَهْلِ الْبَيْتِ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٢٤، الحدیث رقم : ٣٦٠٠، وابن ماجه فی ٢ / ٧٩٢، الحدیث رقم : ٢٣٦٦، وأحمد فی المسند ٢ / ١٨١

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور ان کے والد اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نہ تو خیانت کرنے والے مرد اور خیانت کرنے والی عورت کی گواہی جائز ہے اور نہ زنا کرنے والے مرد اور زنا کرنے والی عورت کی گواہی جائز ہے''۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنی رکھنے والے شخص کی اپنے بھائی کے بارے میں گواہی جائز نہیں رکھی۔ (ایک مقدمہ میں) خاندان کے زیر کفالت شخص کی اس خاندان کے بارے میں گواہی کو رد کر دیا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ:''لا تجوز شهادة خائن ولا خائنةٍ ولا زانٍ ولا زانية'':
اس میں تخصیص بعداز تعمیم ہے اگر خیانت سے معنی اعم مرادلیا جائے اور یہی معنی زیادہ ظاہر ہے۔

قولہ:''ورد شهادة القانع لآهل البيت'':
طیبیؒ کہتے ہیں کہ حدیث سابق میں ''مع'' لام کے معنی میں ہے۔''قانع'' سے حال واقع ہوگا۔اور عامل الشہادۃ ہے۔معنی کے اعتبار سے عبارت یوں ہوگی: **لاتجور شهادة القانع مقارنة لأهل البيت** اور یہ بھی جائز ہے کہ ''قانع'' صلہ واقع ہو''ال'' موصولہ ہو۔اور شہادۃ کا صلہ محذوف ہو۔ای **''لا يجوز شهادة الّذى يقنع مع اهل البيت لهم''**۔

بدوی کی شہادت کا بیان

۳۷۸۳:وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ بَدْوِيٍّ عَلٰى صَاحِبِ قَرْيَةٍ۔ (رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٢٦' الحديث رقم : ٣٦٠٢' وابن ماجه فی ٢ / ٧٩٣' الحديث رقم : ٢٣٦٧

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''بستی میں رہنے والے کے (حق میں یا) اس کے خلاف جنگل میں رہنے والے کی گواہی جائز نہیں ہوگی''۔

(ابوداؤد،ابن ماجہ)

تشریح: قولہ:''لا تجوز شهادة بدوى على صاحب قربةٍ'':
اس کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں:
پہلی وجہ: بدوی شخص عام طور پر جاہل اور گمراہ ہوتا ہے۔
دوسری وجہ: کہا گیا ہے کہ اس وجہ سے کہ ان دونوں کے درمیان عداوت ہے۔اور عداوت اس سبب سے ہوتی ہے کہ وہ غیر اہل قریہ میں سے ہے۔ہاں اگر اس کے حق میں شہادت ہو تو قبول ہوگی۔
تیسری وجہ: امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ بدوی کی شہادت اس لئے قبول نہیں کی جاتی کیونکہ وہ احکام شریعت سے ناواقف ہوتے ہیں اور ادائے شہادت کی کیفیت سے بھی ناواقف ہوتے ہیں ان پر نسیان کا غلبہ ہوتا ہے۔اگر اداء شہادت بغیر زیادت ونقصان کے اس کو معلوم ہو اور یہ کہ وہ عادل ہو، اہل قبول الشہادہ میں سے ہو تو اس کی شہادت جائز ہے۔برخلاف امام مالکؒ کے۔
چوتھی وجہ: طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ اگر عدم قبول شہادت کی علّت احکام شرع سے جہالت ہے۔تو پھر صاحب قریہ کی تخصیص کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔لہٰذا اس کی توجیہ وہی ہے کہ جو تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے کہ ان دونوں کے درمیان بعد کی تہمت ہے۔اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شہادت کو ''علٰی'' کے ساتھ متعدی کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کے حق میں گواہی دے تو مقبول ہوگی۔بعض نے کہا ہے کہ پھر بھی جائز نہیں ہے۔کیونکہ اقامت شہادت کے وقت بستی والے کا ملنا مشکل ہوتا ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

مقدمہ میں ہوشیاری برتنے کا بیان

۳۷۸۴: وَعَنْ عَوْفِ ابْنِ مَالِكٍ، اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بَيْنَ رَجُلَيْنِ، فَقَالَ الْمَقْضِیُّ عَلَيْهِ لَمَّا اَدْبَرَ حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَلُوْمُ عَلَى الْعَجْزِ وَلٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ، فَاِذَا غَلَبَكَ اَمْرٌ فَقُلْ: حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. (رواه ابوداود)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٤٤، الحديث رقم: ٣٦٢٧، وأحمد فی المسند ٦ / ٢٥

ترجمہ: ''اور حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے دو شخصوں کے درمیان ایک مقدمہ کا فیصلہ فرمایا (جو ایک شخص کے خلاف اور دوسرے شخص کے حق میں تھا)۔ چنانچہ مقدمہ کا فیصلہ جس شخص کے خلاف ہوا تھا اس نے (مجلس نبوی ﷺ سے اٹھ کر) واپس جاتے ہوئے کہا: مجھ کو میرا اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نادانی و عجز پر ملامت فرماتا ہے، تم کو احتیاط لازم ہے۔ اگر تم پر کوئی مصیبت غالب آ جائے تو پڑھو: حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہو''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله:** ''حسبی اللّٰه ونعم الوكيل'':

یعنی میرے معاملات میں اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے۔ اور تفویض امور میں وہ بہترین کارساز ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کر دیا کہ مدعی نے اس سے مال باطل طریقے سے لے لیا ہے۔ **قوله: ان اللّٰه تعالٰی یلوم علی الفجر** ......: نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ امور میں تقصیر و تعاون پر ملامت کرتا ہے۔ تم کو ان کے اسباب میں احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا چاہیے۔ لیکن تیقظ اور حزم پر تعریف کرتا ہے۔ لہٰذا تم عاجز نہ بنو اور ''حسبی اللّٰه'' کہتے رہو اور ہوشیار و عقلمند بن جاؤ۔

آپ ﷺ نے اشہاد میں تقصیر پر اس کو عتاب کا نشانہ بنایا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ ''استدراك من العجز'' ہے اور ''الکیس'' سے مراد امور میں تیقظ اور ہوشیاری ہے اور یہ اس موقع پر کہنا چاہیے جب اس کے حصول کی امید ہو۔ چنانچہ عجز کو ''الکیس'' کے متضاد معنی اور باعث تقصیر اور غفلت پر محمول کیا جائے گا۔ یعنی تمہیں چاہیے کہ اپنے معاملہ میں ہوشیاری اور عقلمندی سے کام لو اور اس میں تقصیر مت کرو۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے جب تم فیصلہ کروانے کیلئے حاضر ہوئے تھے تو اس وقت بینہ قائم کرتے۔ تم اس وقت بینہ پیش کرنے پر قادر تھے اور جب اس سے عاجز آ گئے تو ''حسبی اللّٰه'' کہتے ہو۔ تمام تر احتیاط کر چکنے کے بعد تمہیں ''حسبی اللّٰه'' کہنا چاہیے تھا اور جب بینہ کے حصول کیلئے کوئی طریقہ میسر نہ ہوتا تو اس میں معذور شمار ہوتے چنانچہ اس وقت یہ کہنا چاہیے: ''حسبی اللّٰه ونعم الوکيل''۔

متہم شخص کو قید کرنے کا بیان

۳۷۸۵: وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ، اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَبَسَ رَجُلًا فِیْ

تُهْمَةٍ (رواه ابوداود وزاد الترمذی والنسائی) ثُمَّ خَلّٰى عَنْهُ - (ابوداود)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ٤٦' الحديث رقم : ٣٦٣٠' والترمذی فی ٤ / ٢٠' الحديث رقم : ١٤١٧' والنسائی فی ٨ / ٦٧' الحديث رقم : ٤٨٧٦

ترجمہ: ''اور حضرت بہز بن حکیم اپنے والد (حکم) سے اور وہ ان کے دادا (معاویہ قشیری) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو تہمت کی بنا پر قید کر دیا تھا''۔ (ابوداؤد اور ترمذی ونسائی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ پھر آپ ﷺ نے اس کو رہا کر دیا۔

تشریح: قوله: ''أن النبی حبس رجلاً فی تهمةٍ ......''۔

اس شخص کو قید کرنے کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس نے جھوٹ بولا تھا یا اس پر کسی نے گناہ یا دَین کا دعویٰ کیا تھا۔ نبی علیہ السلام نے مدعی علیہ کو روک دیا تا کہ بینہ کے ذریعے صدق دعویٰ معلوم ہو جائے۔ پھر جب مدعی نے بینہ قائم نہیں کیا تو آپؐ نے مدعی علیہ کو رہا کر دیا۔

یہ حدیث اس بات پر دال ہے کہ ''حبس'' بھی احکام شرع میں سے ہے۔

الفصل الثالث:

فریقین میں برابری کا بیان

٣٧٨٦ :عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ: قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ الْخَصْمَيْنِ يُقْعَدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَكَمِ - (رواه احمد وابوداود)

أخرجه ابو داود فی السنن ٤ / ١٦' الحديث رقم : ٣٥٨٨

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمان (عدالتی ضابطہ) جاری فرمایا کہ دونوں خصم (یعنی مدعی اور مدعا علیہ) حاکم کے روبرو بٹھائے جائیں''۔ (احمد' ابوداؤد)

تشریح: قوله: قضى رسول الله ﷺ: یہاں لفظ قضی ''حکم'' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اور ''أوجب'' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔

''أن الخصمين يقعدان بين يدی الحاكم'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ قاضی پر خصمین کے درمیان برابری سے زیادہ نازک' ذمہ داری اور مشقت والی چیز کوئی اور نہیں ہے۔

کِتَابُ الْجِهَاد

جہاد کا بیان

شرح الالفاظ: ''جھاد'' جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔اس کے لغوی معنی ہیں' مشقت تکلیف اور بوجھ شریعت میں اس سے مراد کفار کے ساتھ لڑائی میں اپنی طاقت کو خرچ کرنا ہے۔ چاہے جان پیش کر کے ہو، مالی معاونت کے ذریعہ ہو' یا رائے اور مشورہ کے ساتھ ہو' یا مسلمانوں کے لشکر میں اضافہ کی غرض سے شرکت ہو' یا اس کے علاوہ کوئی بھی کوشش جو کفار کے خلاف ہو۔

مغرب میں لکھا ہے: ''**جھدہ**'' اپنی طاقت سے بڑھ کر اٹھانا۔ ''جہاد مصدر ہے۔ ''**جاھدت العدوّ**'' کا معنی ہے انتہائی مشقت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنا اپنے مدمقابل کو ہٹانے کیلئے اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کرنا۔ ''جہاد' کا لفظ کفار کے ساتھ قتال کے معنی میں غالب ہو گیا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاد سے مراد کفار کو دین حق کی طرف بلانا ہے۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کریں' تو ان سے لڑائی (کہ اس موقع پر لڑائی کرنا ہی جہاد ہے)

''جہاد کی فضیلت'':

جہاد کی فضیلت بہت زیادہ ہے اور کیوں نہ ہو کہ اس عمل میں محبوب ترین چیز (جان) کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اور اپنے اوپر عظیم مشقتوں کو ڈالا جاتا ہے۔ انسان اس کے ذریعے اللہ کی رضا اور قرب چاہتا ہے اور سب سے زیادہ مشقت یہ ہے کہ اپنے نفس کو طاعات پر مقصور کرنا نشاط میں اور اپنے آپ کو ہمیشہ سستی سے دور رکھنا اور اپنی خواہشات سے پرہیز کرنا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ سے واپسی کے موقع پر فرمایا:

''**رجعنا من الجھا الاصغر الی الجھا الاکبر**'' ''ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے اور اس پر یہ بھی دلالت کر رہا ہے کہ آپ نے جہاد کی فضیلت کو اپنے وقت پر نماز پڑھنے سے مؤخر کر دیا۔

ابن مسعودؓ کی روایت ہے، فرماتے ہیں: میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! کون سا عمل افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نماز کو اپنے وقت پر پڑھنا۔ پوچھا: پھر کونسا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ میں نے کہا: پھر کون سے عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ راوی کا بیان ہے اگر میں اور زیادہ پوچھتا تو اور زیادہ بتلا دیتے۔ (بخاری)

حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ایمان کے بعد افضل ترین عمل جہاد کو قرار دیا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا'' کہا گیا کہ پھر کون سے عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنا۔ پوچھا گیا: پھر کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حج مقبول۔ (یہ مسلم اور بخاری دونوں کی روایت ہے)۔

اگر چہ ان دونوں روایتوں میں ظاہری اعتبار سے تضاد ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائل کی حالت کا اعتبار کر کے آپ ﷺ نے اسی طرح جواب دے دیا کہ جب سائل میں اتنی طاقت اور استعداد تھی کہ جہاد اس کے لائق ہو اس کو جہاد افضل ترین عمل بتلایا' اور کسی اور کو کوئی اور عمل بتلا دیا۔ لیکن اس میں بھی نظر ہے' اس لئے کہ پچھلی حدیث میں گزرا' کہ نماز کو اپنے اوقات پر پڑھنا افضل عمل ہے''۔ نماز کو اپنے وقت پر پڑھنا فرائض میں سے ہے۔ فرائض کی ادائیگی پر ہمیشگی کرنا اور نفس کو اس کی ادائیگی پر لگا رکھنا بلاشبہ افضل ترین عمل ہے۔

دوسرے اس وجہ سے بھی کہ نماز اپنے وقت پر پڑھنا ہمیشہ فرض عین ہے اور یہ فریضہ مکرر بھی ہے' یعنی دن میں پانچ مرتبہ اس کا حکم ہے' جب کہ جہاد میں ایسا نہیں ہے۔ نہ وہ ہر وقت فرض عین ہوتا ہے اور نہ نماز کی طرح مکرر ہوتا ہے۔

تیسرے اس وجہ سے بھی کہ جہاد کی فرضیت تو اس لئے ہے کہ ایمان لایا جائے، نماز کی اقامت ہو۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد مقصود اصلی نہ ہوا اور یہ حسن لغیرہ ہوا، برخلاف نماز کے کہ وہ تو بذات خود حسن ہے اور یہی مقصود بھی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی تصریح کی ہے۔ معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک لمبی حدیث ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**والذی نفس محمد بیده ماشجت وجه ولا اغبرت قدم فی عمل یبتغی به درجات الآ خرة بعد الصلاة المفوضة کجهاد فی سبیل الله**''۔

''کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ کوئی چہرہ زخمی نہیں ہوا اور نہ کوئی قدم غبار آلود ہوتا ہے کسی عمل میں کہ انسان اس کے ذریعے درجات آخرت کی بلندی چاہتا ہے نماز مفروضہ کے بعد قتال فی سبیل اللہ کے عمل کی طرح''۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

''فرضیتِ جہاد'':

جہاد (عمومی حالات میں) فرض کفایہ ہے۔ اس کی فرضیت قرآن مجید سے ثابت ہے۔ (اس کی فرضیت پر متعدد آیات دلالت کرتی ہیں) ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة:۵] ''مشرکین کو تم جہاں پاؤ قتل کرو۔ ② ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ [الانفال: ۳۹] اور ان سے قتال کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین صرف اللہ کیلئے ہو جائے۔

۴ ﴿کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم﴾ تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہوتا ہے"۔

۴ ﴿وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلو نکم کافۃ﴾ [توبہ ٣٦:]

۵ ﴿انفروا خفافًا وثقالاً﴾ [التوبہ:٤] نکلو (اللہ کے راستے میں) ہلکے ہو کہ بوجھل۔

اسی طرح احادیث سے بھی فرضیت جہاد کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

أمرت ان أقاتل الناس حتی یقولو الا الہ الا اللہ

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ یہ کلمہ پڑھ لیں: "لا الہ الا اللہ"۔ ان روایات سے ان لوگوں کے قول کی تردید ہوگئی کہ جو جہاد کی فرضیت کے قائل نہیں ہیں۔ جیسا کہ امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کہتے ہیں کہ جہاد فرض نہیں ہے اور یہ امر ہے ایسا ندب اور استحباب کیلئے ہے اور اسی طرح وہ اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ﴾ [البقرہ: ١٨٠] "تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب نزدیک معلوم ہونے لگے"۔

اس آیت میں وصیت کا حکم استحباباً ہے اور یہی عدم فرضیت حضرت ابن عمرؓ سے بھی منقول ہے۔

اگر "عدم فرضیت" کی یہ روایت صحیح ہو تو ہم کہتے ہیں کہ یہ عدم فرضیت فرض عین پر محمول ہے اور اس کے ہم بھی قائل ہیں۔ یعنی مطلق فرضیت کی نفی نہیں ہے بلکہ فرض عین ہونے کی نفی ہے اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔:

الجهاد ماضٍ الی یوم القیامۃ "جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

یہ اس کے وجوب کی دلیل ہے اور یہ کہ جہاد منسوخ نہیں ہوگا۔ یہ اس وجہ سے کہ خبر واحد تو کسی چیز کی فرضیت کا فائدہ نہیں دیتی۔

صاحب ایضاح کا کہنا صحیح نہیں ہے کہ "جب خبر واحد کی تائید کتاب اور اجماع سے حاصل ہو جائے تو اس "خبر واحد" کے ذریعے فرضیت ثابت ہو جاتی ہے" بلکہ مفید تو وہ کتاب اور اجماع ہے البتہ حدیث ان دونوں (کتاب و اجماع) کے موافق آئی ہے۔ ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"الجهاد ماض منذ بعثنی اللہ الی ان یقاتل آخر امتی الدجال لایبطلہ جور جائر و لا عدل عادل"۔

جہاد جاری ہے جب سے مجھے اللہ تعالیٰ نے بعثت دی ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا کہ میرا آخری امتی دجال سے قتال کرے گا۔ اس کو کسی ظالم کا ظلم باطل نہیں کرسکتا اور نہ کسی عادل کا عدل اس کو ختم کرسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امت کا اس بات پر اجماع کہ "جہاد قیامت تک جاری رہے گا" منسوخ نہیں ہوسکتا اور نبی کریم ﷺ کے بعد نسخ کا تصور ہی نہیں ہے اور اس بات کا بھی کوئی قائل نہیں ہے کہ آخری امتی کے دجّال سے لڑائی کرنے سے وجوب جہاد ختم ہو جائے گا۔

جہاد فرض کفایہ اس وجہ سے ہے کہ جہاد کا مقصد صرف مکلفین کو آزمانا نہیں ہے، بلکہ مکلفین کو ابھارنا بھی ہے اور مؤمنین سے کفار کے شر کو دفع کرنا بھی ہے۔ اس کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ [الانفال: ٣٩] "ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کیلئے ہو جائے"۔ جب یہ مقصد بعض کے ذریعے حاصل ہو جائے تو دوسروں سے فرضیت ساقط ہو جائے گی۔

اس لئے کہ مقصد حاصل ہوگیا۔ جیسا کہ نمازِ جنازہ ہے۔ جس کا مقصد میت کے حق کو ادا کرنا اور اس کے ساتھ بھلائی کرنی ہے۔ جب بعض لوگ اس کو ادا کرتے ہیں، تو دوسروں سے وہ فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔

ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ جہاد فرض عین ہے۔ ان کا استدلال بھی انہی دلائل سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ ان جیسے دلائل کے ذریعہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ فرض عین ہوتی ہے۔

ہم جواب دیتے ہیں ہاں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا بشرطیکہ یہ آیت نہ ہوتی: ﴿ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾[النساء: ۹۵،۹٦] ''مؤمنین میں سے گھر بیٹھنے والے، (سوائے عذر والوں کے) اور جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے جو اپنی اموال اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فضیلت دی ہے۔ ان لوگوں کو جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں۔ ایک درجہ اور سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اچھا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو گھر بیٹھنے والوں پر فضیلت دی ہے بڑے اجر کے اعتبار سے''۔

دوسری وجہ فرض عین نہ ہونے کی یہ ہے کہ اگر جہاد فرض عین ہوتا تو تمام لوگ اس میں مشغول ہو جاتے۔ تو زراعت اور تجارات کے ذریعے حاصل ہونے والا معاش معطل ہو جاتا نیز ذرائع جہاد کا معدوم ہونا لازم آتا۔ مثلاً گھوڑے، اسلحہ اور خوراک۔ فرض عین ہونے سے اس کا ترک لازم آئے گا کیونکہ سارے لوگ عاجز ہو جائیں گے۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد فرض عین ہونے کی صورت میں ممکن ہے کہ تمام لوگ ایک ہی دفعہ میں شہروں سے نکل جائیں۔ جبکہ فرض کفایہ ہونے کی صورت میں یہ لازم نہیں آتا۔

جہاد کی فرضیت حج کی طرح ہے کہ وہ بھی سب پر فرض ہے ہر ایک پر لازم ہے کہ وہ نکلے لیکن ایک دفعہ میں ایک گروہ نکلے، دوسری دفعہ میں دوسرا گروہ نکلے، کام اسی طرح جاری رہے گا اور اس سے معاش کا تعطل بھی لازم نہ آئے گا اور اس فرض کفایہ کی علت یہ آیت ہے: [لا يستوى القاعدون] (مکمل آیت اوپر گزر چکی)

جہاد اس وقت تک فرض کفایہ ہے جب تک نفیر عام نہ ہو۔ اگر نفیر عام ہو جائے کہ کفار مسلمانوں کی مملکت پر حملہ آور ہو جائیں تو اس صورت میں یہ فرض عین ہو جائے گا۔ چاہے اعلان کرنے والا عادل ہو یا فاسق ہو۔ اس صورت میں اس شہر کے تمام لوگوں پر جہاد کیلئے نکلنا ضروری ہوگا۔ اسی طرح جوان کے قریب نہ ہو۔ اگر مذکورہ شہر کے لوگ جوابی کارروائی کیلئے کافی نہ ہوں، یا وہ سست روی کا مظاہرہ کریں اور نافرمانی کریں تو اسی طرح ہوتے ہوتے تمام مشرق و مغرب کے تمام اہل اسلام پر فرض ہو جائے گا۔ جیسا کہ میت کی تجہیز و تکفین اور اس کی نماز جنازہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے اہل محلّہ پر واجب ہے۔ اگر وہ نہ کریں اور اس سے عاجز ہوں۔ تو پھر ان کے شہر والوں پر واجب ہے اور اسی طرح ہوتے ہوتے دور تک سلسلہ چلا جائے گا۔

اس کے فرض ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب جنگ دوام اختیار کر جائے اور اور دور دور تک جن کو بھی اس کی خبر پہنچے ان پر واجب ہے اگر ایسا نہ ہو تو اس سے ''تکلیف مالا یطاق'' لازم آئے گی اور اس بات دلیل یہ آیت کریمہ ہے: [انفروا خفافاً وثقالاً] ہے۔

① بعض لوگ اس آیت کا معنی یہ بیان کرتے ہیں: "رکباناً ومشاۃً" ۔نکلو چاہے سوار ہو کر یا پیدل چل کر۔
② بعض اس کا معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ جوان ہو کہ بوڑھے۔
③ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو۔
④ بعض کہتے ہیں کہ چاہے غنی ہو یا فقیر ہو۔اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہو سکتی ہے ان تمام مذکورہ حالات میں نکلو۔اس کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر کوئی بھی معذور نہ ہو تو سارے نکلو۔تو یہ پھر فرض عین ہونے کا فائدہ دے گا۔لیکن یہ تفسیر محل نظر ہے۔اس لئے کہ جہاد ان سب لوگوں پر فرض کفایہ ہے جو آیت مذکورہ کی تفسیر میں بیان ہوئے ہیں اس سے فرض عین ہونا ثابت نہیں ہوگا حق بات یہ ہے کہ یہ آیت اور اس سے پہلی تمام مذکورہ آیات صرف وجوب کا فائدہ دیتی ہیں پھر اس آیت سابقہ سے اس کا "کفایہ" ہونا معلوم ہوا اور فرض عین ہونا اجماع سے ثابت ہے۔کیونکہ جہاد مجبوروں اور مظلوموں کی مدد کرنا ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاد واجب ہے جب کہ کچھ لوگوں کو چھوڑنے کی گنجائش ہو ہاں اگر ضرورت سب کی ہو تو فرض عین ہوگا اس کیلئے استطاعت بھی ضروری ہے لہٰذا ایسا مریض جہاد کیلئے نہیں نکلے گا جو خروج پر قادر نہ ہو۔البتہ جو شخص خروج پر تو قادر ہو لیکن دفاع پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کو نکلنا چاہیے تا کہ مسلمانوں کی جماعت میں کثرت ہو جائے۔کیونکہ اس کثرت کی وجہ سے کافروں پر مسلمانوں کی دہشت بیٹھے گی اور وہ مسلمانوں سے مرعوب ہوں گے۔

الفصل الاول:

مجاہد کے لئے جنت میں سو درجے ہیں

٣٧٨٧:عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَقَامَ الصَّلَاةَ وَصَامَ رَمَضَانَ كَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰهِ اَنْ یُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ جَاهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ جَلَسَ فِیْ اَرْضِهِ الَّتِیْ وُلِدَ فِیْهَا قَالُوْا اَفَلَا نُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ اَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَا بَیْنَ الدَّرَجَتَیْنِ كَمَا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَسْاَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَاِنَّهٗ اَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَاَعْلَی الْجَنَّةِ وَفَوْقَهٗ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ وَمِنْهُ تَفَجَّرُ اَنْهَارُ الْجَنَّةِ .

(رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه باب درجات المجاهدین ٦ /١١، الحدیث رقم ٢٧٩٠، وأحمد فی المسند ٢/٣٣٥

ترجمہ:"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لایا (یعنی شریعت پر ایمان لایا) اور نماز قائم کی اور رمضان کے روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ پر (از راہ فضل و کرم بحسب اپنے وعدے کے) حق ہے کہ وہ اس شخص کو جنت میں داخل کرے خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد

کرے (اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اور خواہ ہجرت کرے) اور خواہ اپنی پیدائش کی سرزمین میں بیٹھا رہے (یعنی نہ جہاد کرے اور نہ ہجرت کرے)'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ سن کر عرض کیا'' کیا لوگوں کو ہم یہ خوشخبری نہ سنا دیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (لیکن جہاد کرنے والے کی یہ فضیلت بھی سن لو کہ) جنت میں سو درجے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کر رکھا ہے اور ان کے دو درجوں کا درمیانی فاصلہ (اتنا ہے جتنا) آسمان اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔ لہٰذا جب تم اللہ سے (جہاد پر درجۂ عالی) کا سوال کرو تو فردوس یعنی (جنت کا بلند درجہ) کا سوال کرو کیونکہ وہ (فردوس) اوسط جنت ہے (یعنی جنت کے تمام درجات میں سب سے بہتر و افضل ہے) اور سب سے بلند جنت ہے اور اسکے اوپر خدا کا عرش ہے (گویا وہ عرش الٰہی کے سایہ میں ہے) اور وہیں سے جنت کی نہریں بہتی ہیں (یعنی جو چار چیزیں جنت کی نہروں کی اصل ہیں جیسے پانی، دودھ، شراب اور شہد وہ جنت الفردوس ہی سے جاری ہوتی ہیں)۔'' (بخاری)

تشریح: قوله: من امن بالله ورسوله:

اس سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں پر مجملاً وتفصیلاً ایمان لانا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کی طرف سے لے کر آئے قولہ: ''وأقام الصلاۃ وصام رمضان''۔

ان دونوں عبادتوں کو اس وجہ سے خاص طور پر ذکر کیا تا کہ ان کی عظمت شان پر تنبیہ ہو جائے اور چونکہ ان کی ادائیگی طبائع پر گراں گزرتی ہے ان دونوں عبادتوں پر ابھارا ہے اور جس نے ان دونوں عبادتوں کی رعایت رکھی۔ باوجودیکہ دونوں عبادتیں بڑی مشکل ہیں وہ اس دیگر عبادات کو کبھی بھی نہیں چھوڑے گا۔ ممکن ہے کہ یہ حدیث زکوٰۃ اور حج کی فرضیت سے پہلے بیان ہوئی ہو۔ اس وجہ سے زکوٰۃ اور حج کا تذکرہ نہیں کیا۔ یا اس وجہ سے کہ ''زکوٰۃ و حج'' صرف اغنیاء کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جبکہ سابقہ دونوں عبادتیں تمام لوگوں سے متعلق ہیں۔

قوله: كان حقا على الله ان يدخله الجنة:

اس دخول سے مراد دخولِ اولی ہے، ورنہ مطلق دخول کیلئے صرف ایمان ہی کافی ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد رفع درجات ہے۔ گویا کہ لازم کو ذکر کر کے ملزوم مراد ہے۔ اس لئے کہ رفع درجات دخول کو مستلزم ہے۔ اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ دخول محض اللہ کے فضل سے ہوگا اور رفع درجات اعمال کے ذریعے ہوگا۔ **جاهد في سبيل الله:** ایک روایت میں ''هاجر'' کا لفظ آیا ہے۔

''**أو جلس في ارضه التي ولد فيها**'': یعنی وہ نہ جہاد کرے اور نہ ہجرت کرے اور ان دونوں کو برابر سطح پر ذکر کرنا دلالت کرتا ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کی یہ عبارت اس بات پر دال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی۔ اس لئے کہ فتح مکہ سے پہلے ہجرت ہر مؤمن کیلئے فرض تھی۔

قوله: قالوا أفلا نبشر به الناس ...... و على الجنة:

''قالوا: افلا نبشر الناس؟ قال: انّ فی الجنّة: ایک نسخہ میں یہ اضافہ ہے:''أفلا نبشر به'' ہے۔امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''قالوا'' کے ایک قائل حضرت معاذ بن جبلؓ ہیں۔جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے اور اس کے بعد یہ اضافہ ہے: ''ذر النّاس یعملون فان فی الجنة ''مائة درجة۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد یہ اضافہ نقل کیا ہے:''لو أن العالمین اجتمعوا فی احدا هن لو سعتهم''۔ اگر تمام عالم اس کے ایک درجہ میں جمع ہو جائے تو وہ ان کو کافی ہو جائے گی۔(اشارہ ہے کہ ایک درجہ بھی اتنا عظیم الشان ہوگا)۔

''أعدها اللّٰه للمجاهدین فی سبیل اللّٰه'':اس سے مراد مجاہدین یا حجاج کرام ہیں۔یا اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی جانوں کو رضائے الٰہی کیلئے مشقت میں ڈالا۔

''ما بین الدرجتین کما بین السمآء والأرض''۔حدیث میں وارد ہے:دو درجوں کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔

''فسلوه'':اس کو دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے: ① ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔② نقل کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہے۔

''أوسط الجنة'':امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:سب سے اعدل،سب سے وسیع،سب سے بہتر۔

''وأعلی الجنة'':بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ اس بات پر دال ہے کہ آسمان مدور (گول) ہے۔اس لئے کہ وسط اسی وقت اعلیٰ وافضل ہوتا ہے جب وہ چیز مدوّر ہو۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اعلیٰ اور اوسط کو جمع کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس میں ایک سے حسی معنی مراد ہے اور دوسرے سے معنوی۔اس لئے کہ کسی بھی چیز کا وسط افضل اور بہترین ہوا کرتا ہے اور وسط شیٔ افضل وخیار اس لئے ہوتا ہے کہ اطراف کی طرف نقصان جلدی پہنچتا ہے جبکہ وسط محفوظ ہوتا ہے۔امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: كانت هی الوسط المحمی فاكتنفت بها الحوادث حتی أصبحت طرفا۔

قولہ:''وفوقه عرش الرحمٰن''عرش اس جنت الفردوس کی چھت ہے کیونکہ عرش اس کے اوپر ہے۔

''فوق'':اس کے اعراب کے بارے میں دو قول ہیں:پہلا قول یہ ہے کہ یہ''فوق'' کی نصب کے ساتھ ہے۔دوسرا قول ہے کہ رفع کے ساتھ ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصیلی نے اس کو''قاف'' کے ضمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے اور اس کا معنی ہے اعلیٰ جبکہ جمہور نے اس کو منصوب علی الظرف قرار دیا ہے۔

قوله:''ومنه تفجر انهار الجنة'' جنت الفردوس سے جنت کی نہریں بہتی ہیں۔جنت کی اصل نہریں چار ہیں جن میں پانی،دودھ،شراب اور شہد بہتا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث باب اور اس حدیث میں جمع کیسے ممکن ہوگا:؟ کہ جنت میں سو درجے ہیں اور ہر دو

درجوں کا درمیانی فاصلہ آسمان وزمین کے فاصلہ جتنا ہے اور فردوس اس کا اعلیٰ درجہ ہے۔ مذکورہ حدیث میں فردوس کو ایک علیحدہ جنت شمار کیا گیا ہے جبکہ دوسری حدیث کے مطابق فردوس جنت کے ایک اعلیٰ درجہ کا نام ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ایک جواب یہ دیتے ہیں کہ اس حدیث کے مطلق کو اس مقید پر محمول کریں گے تو اعتراض رفع ہو جائے گا اور یہ احتمال بھی ہے کہ مجاہدین کیلئے ایک عمومی درجہ ہے اور درجات ان کے جہاد میں مراتب کے اعتبار سے ہوں گے۔ تو اس صورت میں فردوس اس مجاہد کیلئے ہے کہ جو جہاد کا حق ادا کر دے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں احتمال ہے کہ درجات اپنے ظاہری حسی معنی پر محمول یعنی محسوس طور پر درجات مراد ہیں۔ جیسا کہ اہل غرف (بالا خانوں والے) کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایسے بلند نظر آئیں گے جیسا کہ ستارہ آسمان پر بلند نظر آتا ہے۔

اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ درجات معنوی معنی پر محمول ہوں اور مراد اس سے نعمتوں کی کثرت ہے کہ جن کا خیال انسان کے دل پر نہیں گزرا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مسلم کی شرح میں ذکر کیا ہے۔

۳۷۸۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْقَانِتِ بِآيَاتِ اللّٰهِ لَا يَفْتُرُ مِنْ صِيَامٍ وَلَا صَلَاةٍ حَتّٰى يَرْجِعَ الْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه کتاب الجهاد' باب افضل الناس مؤمن مجاهد ٦ /٦ رقم ٢٧٨٧ و مسلم فی ١٤٩٨/٣ الحدیث رقم (١١٠-١٨٧٨) و مالك فی الموطا ٢ /٤٤٣' الحدیث رقم ١ من کتاب الجهاد۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو روزہ دار ہے (نماز میں) قیام کرتا ہے (نماز اور طاعت وعبادات میں) منہمک رہنے والا اور اللہ کی آیتوں (یعنی قرآن کریم) کی تلاوت کرنے والا جو روزہ رکھنے اور نماز قائم کرنے (یعنی عبادات میں منہمک رہنے) سے کبھی کوتاہی نہیں کرتا' یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا (اپنے گھر) واپس آجائے'' (یا دوبارہ جہاد کیلئے چل جائے)۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: مثل المجاهد......بایاب الله:

''القائم'': اس کے دو معنی ہیں:

① نماز، اطاعت خداوندی اور عبادت کو قائم کرنے والا۔

② اس سے مراد یہ ہے کہ جو کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے نہ کہ بیٹھ کر۔

''القانت بآیات الله'' وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو پڑھتا ہے۔ شارح فرماتے ہیں کہ ''قانت'' سے مراد یہ ہے کہ وہ نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں احادیث میں قنوت کئی معانی کیلئے مستعمل ہے۔ مثلاً ① طاعت، ② خشوع، ③ نماز،

④دعاء، ⑤عبادت، ⑥قیام، ⑦طویل قیام اور ⑧سکوت۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہاں پر ''قانت'' سے مراد ''قائم'' ہو۔ اس صورت میں ''باء'' کا تعلق ''قائم'' کے ساتھ ایسا ہوگا جیسا کہ اس قول میں ''باء'' کا تعلق ماقبل کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ ''قام بالأمر ''اذا اجد فيه وتجلد له اس صورت میں معنی ہوگا کہ وہ ان چیزوں کو قائم کرتا ہے جو اس پر واجب ہیں۔ بایں طور کہ قرآن پاک کی معرفت میں اپنی بھرپور طاقت صرف کرے اور جو اس کے حکم کو بجالائے اور اس چیز سے رکے جس سے روکا گیا ہے۔

اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے طول قیام مراد لیا جائے۔ اس صورت میں ''باء'' قائم کا تابع ہوگا۔ تو معنی یہ ہوگا وہ نمازی جو نماز میں لمبا قیام کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ نماز میں زیادہ قراءت کرتا ہے۔ اس توجیہ کی تائید اس حدیث کے اگلے ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے۔ قوله: ''لا يفتر من صيامٍ ولا صلٰوةٍ ......:

''لا يفتر'': باب ''نصر'' سے ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجاہد کی حالت کو روزہ دار اور نمازی کی حالت کے ساتھ کس وجہ سے تشبیہ دی ہے؟

جواب یہ ہے کہ مشابہت حصول ثواب میں ہے۔ یعنی کہ ہر حرکت اور سکون کے بدلے میں ہر زمانہ اور ہر وقت میں ثواب ملے گا۔ اس لئے کہ صائم اور قائم سے مراد وہ ہے جو دن یا رات کے کسی بھی وقت میں وہ اپنی نماز اور اپنے روزہ سے غافل نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ ایسے مجاہد کی مشابہت جو اجر و ثواب میں کوئی لمحہ بھی ضائع نہیں کرتا، چاہے وہ کھڑا ہو یا سویا ہوا ہو، دشمن سے لڑائی کر رہا ہو یا نہ، اس روزہ دار اور نمازی کے ساتھ ہے جو روزہ اور نماز سے کسی بھی وقت غافل نہیں ہوتا اور اُکتاتا نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ تشبیہ کے اس نوع سے ہے کہ جس میں ''مشبہ بہ'' مفروض ہو، محقق اور ثابت نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس خاص نوع کو بیان کیا گیا ہے: ﴿ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... ﴾[التوبة: ۱۲۰] ''یہ اس لئے کہ انہیں خدا کی راہ میں جو تکلیف پہنچتی ہے پیاس کی یا محنت کی یا بھوک کی یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں کہ کافروں کو غصہ آئے یا دشمنوں سے کوئی چیز لیتے ہیں تو ہر بات پر ان کے لئے عمل صالح لکھا جاتا ہے کچھ شک نہیں کہ خدا نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عن ابی هريرة قيل: يا رسول الله ما يعدل الجهاد في سبيل الله قال: لا تستطيعونه۔

''فأعادوا عليه مرتين أو ثلاثًا كل ذلك يقول: ''لا تستطيعونه'' ثم قال مثل المجاهد في سبيل الله كمثل الصائم القائم بآيات الله لا يفتر من صلاته ولا صيامه حتى يرجع المجاهد في سبيل الله۔

(حدیث کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے)

جامع صغیر میں یہ روایت یوں منقول ہے:

''مثل المجاهد في سبيل الله كمثل الصائم القائم الدائم الذى لا يفتر من صيامٍ ولا صدقة حتى

يرجع وتوكل الله تعالى للمجاهد فى سبيله ان توفاه ان يدخله الجنة اويرجعه سالمًا مع أجر أو غنيمةٍ"۔

اس حدیث کومسلم اور بخاری کے علاوہ ترمذی اور نسائیؒ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

اللہ مجاہد کا ضامن ہے

۳۷۸۹:وَعَنْهُ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :انْتَدَبَ اللّٰهُ لِمَنْ خَرَجَ فِىْ سَبِيْلِهٖ لَا يُخْرِجُهُ اِلَّا اِيْمَانٌ بِىْ وَتَصْدِيْقٌ بِرُسُلِىْ اَنْ اَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِيْمَةٍ اَوْاُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ

(متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه كتاب الايمان' باب الجهاد من الايمان ١٩٢/١' الحديث رقم ٣٦' و مسلم فى ٣ / ١٤٩٥' الحديث رقم (١٠٣ ـ ١٨٧٦) والنسائى فى السنن ٨ / ١١٩' الحديث رقم ٥٠٢٩' والدارمى فى ٢ / ٢٦٣' الحديث رقم ٢٣٩١' و مالك فى الموطا ٢ / ٤٤٣' الحديث رقم ٢ من كتاب الجهاد' وأحمد فى المسند ١١٧/٢۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) جو شخص اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلا اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہو گیا' اس کو (جہاد کے لئے) مجھ پر اس کے ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق کے علاوہ اور کسی چیز نے نہیں نکالا (یعنی اس کا جہاد میں جانا دکھاوے وسنانے کے لئے یا دنیا میں کسی طلب وخواہش کے پیش نظر نہیں' بلکہ وہ محض میری رضا وخوشنودی طلب کرنے کے لئے نکلا ہے) تو میں اس کو (یا تو بغیر مالِ غنیمت کے محض) آخرت کے اجر وثواب کے ساتھ یا مالِ غنیمت کے ساتھ واپس کروں گا اور یا (اگر شہید ہو گیا تو) میں اس کو (بغیر حساب کتاب کے سب سے پہلے جنت میں جانے والوں کے ساتھ' جنت میں داخل کروں گا (یا اس کی موت کے بعد ہی قیامت کے دن سے بھی پہلے جنت میں داخل کروں گا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں)۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح:قوله:انتدب الله لمن خرج فى سبيله وتصديق برسلى:

''**لا يخرجه**'':یہ جملہ حال ہے۔

''**الّا ايمان بى وتصديق برسلى**'':اس جملے میں التفات ہے۔ پہلے جملے میں غائب کا صیغہ ذکر کیا اور یہاں پر متکلم کا صیغہ ذکر کیا۔ لفظ''رسل''جمع لانے میں یہ اشارہ ہے کہ ایک رسول کی تصدیق سب کی تصدیق ہوا کرتی ہے، یا جمع کا لفظ تعظیماً ذکر کیا اس لئے کہ رسول سب کا قائم مقام ہوتا ہے۔''**الّا ايمانٌ بى**''یہ رفع کے ساتھ منقول ہے۔

قوله:أن أرجعه بما قال ......:

''ارجع'' : ہمزہ کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔
''من أجر'' ''من'' : بیان کیلئے ہے۔ مطلب یہ کہ اگر غنیمت کچھ بھی نہ ملے پھر بھی اُجر تو ملے گا ہی۔
''أو غنيمةٍ'' یہاں پر ''أو'' تنویع کیلئے ہے۔
'أو ادخله الجنة'': یہاں پر ''أو'' عاطفہ ہے۔ اس کا عطف ''ارجعه'' جملہ پر ہے۔
صاحب نہایہ نے ذکر کیا ہے انتدب أى أجابه الى غفر انه کہا جاتا ہے۔ ''ندبته فانتدب اى بغيته ودعوته فأجاب''۔
علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض طرق میں ''تضمن الله'' ہے۔ جبکہ بعض میں ''تكفل الله'' مروی ہے۔ دونوں الفاظ نسق کلام ''انتدب الله'' کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں اور سب صحیح ہیں۔
علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''أن ارجع'' یہ جملہ ''انتدب'' کے ساتھ متعلق ہے۔ اس طور پر کہ ''أن'' مصدریہ سے پہلے حرف جار ''باء'' محذوف ہے اور انتدب تکفل کے معنی کو متضمن ہے۔ ای: ''تكفل الله بأن يرجعه''۔ ''فأرجعه'' یہ اللہ تعالیٰ کے قول کی حکایت ہے اور ''انتدب'' اشبہ و ابلغ ہے اس لئے کہ ''انتداب'' (قبول کرنا) داعی کے دعوت کے بعد ہوا کرتا ہے۔ فی سبیل اللہ جہاد کیلئے نکلنے والے مجاہد کی مثال کو استعارہ تمثیلیہ کے ذریعے واضح فرمایا جو کسی ایسے داعی کی دعوت پر نکلا ہو جو دعوت محض اللہ ہی کیلئے دیتا ہے، دین کے دشمنوں کے خلاف اللہ کی مدد و نصرت کیلئے، اجر و ثواب کے حصول کیلئے اور مال غنیمت پانے کیلئے اس کو دعوت دیتا ہے۔
اور مجاہد فی سبیل اللہ کا کوئی مقصد نہیں ہوتا سوائے تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ کے کہ اسکے ذریعہ عالی درجات حاصل ہو جائیں۔ وہ نصرت و مغفرت طلب کرنے کیلئے جہاد میں پیش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خواہش کی وجہ سے اسکو قبول فرمالیتا ہے اور اور اللہ نے دو بھلائیوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے۔
وہ اُجر اور غنیمت کے ساتھ صحیح سلامت لوٹے گا۔ یا یہ کہ وہ شہادت کا عالی مرتبہ پا کر جنت میں پہنچ جائے گا۔
''نال'': یہاں پر ماضی کا صیغہ اس وجہ سے لائے کہ ماضی میں تحقق اور ثبوت ہوا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اس کا حصول متحقق اور یقینی ہے۔
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلم شریف کے تمام نسخوں میں ''ايمانا وتصديقا'' نصب کے ساتھ منقول ہے اور منصوب مفعول لہ ہونے کی بناء پر ہے۔ یعنی عبارت یوں ہوگی۔: لايخرجه مخرج ولا يحركه المحرك ''الا ايماناً وتصديقًا''۔
علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ رفع کی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں مستثنیٰ منہ اعم تمام الفاعل ہے ای لايخرجه مخرج ولا يحركه محرك الايمان و تصديق اور نصب کی تقدیر پر مستثنیٰ منہ ''اعم عام المفعول'' ہے۔ أى لا يخرجه المخرج ولا يحركه المحرك بشيء من الاشياء الا ايمان والتصديق۔ ''رفع ونصب'' آسکتے ہیں۔
رفع کی صورت میں معنی عام نکالنے والی چیز اس کو نہیں نکالتی اور حرکت دینے والی کوئی چیز اس کو حرکت نہیں دیتی۔ مگر وہ چیز

صرف اور صرف ایمان ہی ہے۔

اور ''نصب'' کی صورت میں معنی ہوگا نکالنے والی کوئی چیز اس کو نہیں نکالتی اور حرکت دینے والی کوئی چیز اس کو حرکت نہیں دیتی۔اشیاء میں سے کسی بھی شئی کیلئے سوائے ایمان وتصدیق کیلئے۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کلام میں اضمار ہے۔ای ''**انتدب الله لمن خرج فی سبیله قائلاً لا یخرجه الا ایمان بی**''۔میں کہتا ہوں پس یہ قول کا مقولہ ہوا۔حالانکہ وہ لفظ ''اللہ'' سے حال ہے۔لیکن واضح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً اللہ تعالیٰ کے کلام کو بالمعنی نقل کیا ہے پھر اس کے نظم کی نقل کی طرف لوٹے گویا کہ یوں فرمایا: ''**انتدبت لمن خرج فی سبیلی**......''

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ زیادہ موافق بات یہ ہے کہ اس میں التفات ہے۔اگر یہ کہا جاتا ''**الا ایمان به**'' تو یہ ظاہر ہوتا اور اضمار کی ضرورت نہ پڑتی۔اس سے عدول کیا اور ''**أن ارجعة**'' سے جار محذوف ہے۔ای۔''**اجاب الله دعاء ہ بان قال: امّا أن ارجعه بما نال من أجرٍ أو غنیمةٍ**''۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ''اَوْ'' اور ''واوٗ'' دونوں کے ساتھ منقول ہے اور جو روایت ''واوٗ'' کے ساتھ نقل ہے معنی کے لحاظ سے، زیادہ درست روایت ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ محل نظر ہے اس لئے کہ یہ لازم نہیں کہ مجاہد واپس نہیں ہوگا، مگر اجر اور غنیمت دونوں کے ساتھ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔بعض دفعہ تو اجر اور غنیمت دونوں کا حصول ہوتا ہے بعض دفعہ غنیمت حاصل نہیں ہوتی۔اس وجہ سے ''اَوْ'' کے ساتھ ہی اصل ہے اور ''واوٗ'' کے ساتھ منقول روایت میں واوٗ کو ''اَوْ'' کے معنی پر محمول کیا جائے گا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ مجاہد اپنے گھر واپس آئے گا جو کچھ بھی حاصل ہو جائے۔اگر غنیمت نہ ملے تو صرف اجر کے ساتھ لوٹے گا۔اگر غنیمت پالی تو اجر اور غنیمت دونوں کے ساتھ واپس لوٹے گا۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ''اَوْ'' بھی ''واوٗ'' کے معنی میں ہے۔**أی من أجر و غنیمة** چونکہ ابوداؤد کی روایت میں بھی ''وْ'' کے ساتھ ہے اور اسی طرح صحیح مسلم کی روایت میں ہے جو یحییٰ بن عیسیٰ سے منقول ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں ''اَوْ'' ''واوٗ'' کے معنی میں بھی وارد ہوا ہے۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔:﴿ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴾ [المرسلات:٦] (کذا ذکرہ الیطبی)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اَوْ'' کے ''واوٗ'' کے معنی میں ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔کلام تو اس روایت میں ''اَوْ'' کو ''واوٗ'' کے معنی میں لینے میں ہے اور پیش کردہ مذکورہ بالا مثال کوئی منصوص بات نہیں ہے کہ ''او'' ''واوٗ'' کے معنی میں ہے۔بلکہ بظاہر وہاں بھی ''او'' تنویع کیلئے ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''**او غنیمة**'' اس جملہ کا عطف ہے ''**أجر**'' پر اور ''**ادخله**'' کا عطف ''**ارجعه**'' پر ہے۔ اس صورت میں یہ ''ان'' کا صلہ ہوگا اور تقدیری عبارت یوں ہو جائے گی: ''**أن الله تعالیٰ اجاب الخارج فی سبیله اما بأن یرجعه الیٰ مسکنه مع اجر بلاغنیمةٍ أو أجر مع غنیمةٍ واما أن یتشهد فیدخله الجنة**''۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ادخله الجنة" کے بارے میں احتمال ہے کہ اس کو موت کے وقت ہی جنت میں داخل فرمادیں۔ جیسا کہ اللہ کا شہداء کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿أحياء عند ربهم يرزقون﴾[آل عمران:۲۹] کہ شہداء اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے"۔

یا اس دخول سے مراد دخولی اولی ہے جو کہ سابقین مقربین کے ساتھ ہوگا اور بغیر حساب کتاب کے ہوگا۔ اس صورت میں یہ شہادت اس کے گناہوں کیلئے کفارہ ہوگی۔

مجاہد کی تمنا کا بیان

۳۷۹۰: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَوْلَا اَنَّ رِجَالًا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا تَطِيْبُ اَنْفُسُهُمْ اَنْ يَتَخَلَّفُوْا عَنِّیْ وَلَا اَجِدُمَا اَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْزُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰی ثُمَّ اُقْتَلَ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه كتاب الجهاد' باب تمنى الشهادة ٦ / ١٦' الحديث رقم ٢٧٩٧' و مسلم فى ٣ / ١٤٩٧' الحديث رقم (١٠٦ ـ ١٨٧٦) والنسائى فى السنن ٦ / ٣٢' الحديث رقم رقم ٣١٥٢' وابن ماجه فى السنن ٢ / ٩٢٠' الحديث رقم ٢٧٥٣' وأحمد فى المسند ٢ / ٢٧٣

ترجمہ: "اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مجھے یہ خوف ولحاظ نہ ہوتا کہ بہت سے (وہ) مسلمان (جو مفلس ونادار ہیں) اپنے بارے میں اس بات سے خوش نہیں ہوں گے کہ وہ مجھ سے پیچھے (اور مجھ سے جدا رہیں) اور میرے پاس کوئی ایسی سواری بھی دستیاب نہیں جس پر ان سب کو سوار کردوں تو میں اللہ کی راہ میں جانے والے کسی بھی لشکر سے پیچھے نہ رہتا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری خواہش وتمنا تو یہی ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں (یعنی بار بار زندہ کیا جاؤں اور بار بار قتل کیا جاؤں تا کہ ہر بار نیا ثواب پاؤں)"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: والذی نفسی بیده لولا ......:

"**لَوَدِدت**": "دال" کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

"**ان أقتل**": یہ مجہول کا صیغہ ہے۔

"**أحيي**": یہ احیاء سے ہے مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ارشاد فرمائے ہیں اور چوتھی مرتبہ "ثم أقتل" پر کلام ختم کیا۔ (پھر "ثم احیا" نہیں کہا)۔ اس کے ترک میں بہت مبالغہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے ذیل میں چند فوائد ذکر کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں

۱ چوتھی مرتبہ "ثم احیا" نہ لانے میں جہاد وشہادت بھلائی وشہادت کی تمنا کی فضیلت بتلانی مقصود ہے اوران بھلائیوں کی تمنا کی فضیلت ہے جو عادۃً ممکن نہیں ہوتیں۔

۲ اس سے یہ بات بھی ثابت ہورہی ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے نہ کہ فرض عین۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس دوسری بات میں ذرا تامل ہے اس وجہ سے کہ جہاد بعض اوقات فرض عین ہوجاتا ہے۔

۳ اس سے یہ بات بھی ثابت ہورہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں پر کتنے شفیق اور رحمدل تھے اوراسی نرمی اور شفقت کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ وہ کام بھی چھوڑ دیتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھے اور جب مصالح کا آپس میں تعارض آجائے تو ان میں سے سب سے زیادہ اہم کو اختیار کیا جائے گا۔

سوال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت اور شہادت کی تمنا کیسے کی حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پتہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہید نہیں ہونگے۔

جواب: تمنا کسی چیز کے وقوع کو مستلزم نہیں ہے کہ لازماً وہ واقع بھی ہو۔

پہرہ کی فضیلت

۳۷۹۱: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه كتاب الجهاد' باب فضل رباط يوم' ٦ / ٨٥' الحديث رقم ٢٨٩٢

ترجمہ: "اور حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ کی راہ میں ایک دن کا مورچہ بند رہنا دنیا اور جو کچھ اس میں موجود ہے سے بہتر ہے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: "**رباط يوم فی سبيل الله خير من الدنيا وما عليها**": ایک روایت میں "**وما عليها**" کی جگہ "**وما فيها**" وارد ہے۔

اس حدیث کا ایک مطلب یہ ہے کہ جہاد کا ایک دن اس تمام مال سے بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جہاد کے اس ایک دن کا بدلہ دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔

"**رباط**": راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے ایسی جگہ ٹھہرنا جہاں پر دشمن کے حملہ کا خطرہ ہے اور ٹھہرنے میں نیت یہ ہو کہ اس دشمن کو اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے ہٹائے گا۔

تخریج: امام بخاری امام احمد بن حنبل اور ترمذی نے اس پر کچھ اضافہ کے ساتھ یوں نقل کیا ہے: "**وموضع سوط أحدكم من الجنة خير من الدنيا وما عليها، والروحة أو الغدوة يروحها العبد فی سبيل الله خير من الدنيا وما عليها**"۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمرو سے اس نقل کیا ہے: "**رباط يوم خير من صيام شهر وقيامه**"۔

امام ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت عثمانؓ سے روایت یوں نقل کی ہے:
''رباط يوم في سبيل الله خير من ألف يوم فيما سواه من المنازل''۔
④ طبرانی نے حضرت ابودرداء سے یوں نقل کیا ہے: ''رباط شهر خير من صيام دهر ومن مات مرابطًا في سبيل الله امن الفزع الأكبر۔ وغدى عليه رزقه وريح من الجنة ويجرى عليه أجر المرابط حتى يبعثه الله''۔

ایک صبح، ایک شام کی فضیلت

۳۷۹۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ : قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَغَدْوَةٌ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا . (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه كتاب الرقاق' باب مثل الدنيا في الآخرة ١١ / ٢٣٢' الحديث رقم ٦٤١٥' و مسلم في ٣ / ١٥٠٠' الحديث رقم (١١٣ ـ ١٨٨١) و أحمد في المسند ٥ / ٣٣٩

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''راہ الٰہی میں ایک صبح یا شام گزارنا (شرکت جہاد کی غرض سے) جانا دنیا اور جو کچھ اس میں موجود ہے سے بہتر ہے''۔ (بخاری ومسلم)

قوله: لغدوة في سبيل الله اور روحة ......:

''لَغدوۃ'': لام کے فتحہ غین کے ساتھ ہے۔ ''غدوۃ'' کا معنی ہے دن کے اوّل حصہ میں جانا۔
''روحۃ'': راء کے فتحہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ ہے۔ دن کے آخری حصہ میں جانے کو ''روحۃ'' کہتے ہیں اور یہاں لفظ ''أو'' شک کیلئے نہیں ہے بلکہ تنویع کیلئے ہے۔
یہ بات جان لینی چاہیے کہ ''غدوۃ'' پر لام ابتداء کیلئے ہے، یا قسم کیلئے ہے اور دونوں صورتوں میں معنی یہ ہوگا کہ دن کے ابتداء میں یا دن کے آخری حصہ میں اللہ کے راستہ میں جانا دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے اس لئے کہ یہ نعمتیں فانی ہیں زائل ہو جائیں گی اور آخرت کی نعمتیں کامل ہیں، اور باقی رہنے والی ہیں۔
ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس قدر ثواب بہتر ہے اس ثواب سے جو اس کو حاصل ہوگا کہ جس کو اگر ساری دنیا مل جاتی اور وہ اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتا میں خرچ کر ڈالے اس سے جو ثواب ملے گا۔ اس سے اس جہاد کا ثواب بہتر ہے۔
توضیح و تخریج: جامع صغیر میں یہ اضافہ ہے:
ولقاب قوس أحدكم أو موضع قده في الجنة خير من الدنيا وما فيها۔ ولو اطلعت امرأة من نساء أهل الحنة الى الأرض لملأت ما بينهما ريحًا ولا ضاء ت ما بينهما لنصيفها على رأسها خير ميں الدنيا وما فيها''۔
''تم میں سے کسی کی کمان کی لمبائی یا انسانی قد جتنی جگہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے اور اگر جنت کی عورتوں میں سے کوئی عورت زمین کی طرف جھانک لے تو یہ زمین خوشبو سے بھر جائے اور اس پوری زمین کو روشنی سے بھر دے اور اس کے سر کی اوڑھنی

دنیاو مافیہا سے بہتر ہے۔''

اس روایت کو امام احمد بن حنبل، امام بخاری و مسلم اور ترمذی و ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

''قِد'': قاف کے کسرہ کے ساتھ بمعنی ''وتر القوس'' (کمان کی تانت) النصیف: الخمار نصف المقنعه۔

دورانِ پہرہ وفات پانے کا ثواب

۳۷۹۳: وَعَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَ قِيَامِهٖ، وَإِنْ مَاتَ جَرٰى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُهٗ وَأُجْرِيَ رِزْقُهٗ وَاَمِنَ الْفَتَّانَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه كتاب الامارة، باب فضل الرباط ٣ / ١٥٢٠، الحديث رقم (١٦٣ ـ ١٩١٣) والنسائى فى السنن ٦ / ٣٩، الحديث رقم ٣١٦٧، وأحمد فى المسند ٥ / ٤٤٠

ترجمہ: ''اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ کے راستے (یعنی) جہاد میں ایک دن اور ایک رات چوکیداری کی خدمت انجام دینا ایک مہینے کے روزے اور شب بیداری سے بہتر ہے اور اگر وہ چوکیدار (اس خدمت کی انجام دہی کے دوران) مر جائے تو اس کے اس عمل کا ثواب کہ جس پر وہ (اپنی زندگی میں) عامل تھا، جاری رہتا ہے (یعنی اپنی زندگی میں وہ جس نیک عمل پر عامل تھا اس کا ثواب اس کو مرنے کے بعد بھی ہمیشہ کیلئے پہنچتا رہے گا) اور اس کیلئے (جنت کے طعام و شراب سے) اس کا رزق جاری کر دیا جاتا ہے اور وہ (شیطان یا دجال کے مکر و فریب یا قبر میں عذاب کے فرشتے کے) فتنے سے محفوظ رہتا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ''رباط يوم وليلة فى سبيل الله خير من صيام شهر وقيامة:''۔

اس میں لف نشر مرتب ہے۔ پہلے یوم کہا تو اس کیلئے صیام شہر مناسب ہے اور ''وليلة'' کے ساتھ ''قیام رمضان'' مناسب ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''رباط'' راء کے کسرہ اور باء بلا تشدید کے ساتھ ہے اور معنی اس کا یہ ہے: مسلمانوں اور کفار کے درمیان جگہ کو مسلمانوں کی کافروں سے حفاظت کیلئے لازم پکڑنا۔

بعض علماء شارحین فرماتے ہیں ''الرباط المرابط'' اس کا معنی ہے کہ لشکر والے اپنے گھوڑوں کو اپنی سرحدوں پر اور وہ لوگ اپنی سرحدوں پر باندھیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کیلئے تیار ہو اور گھات لگائے ہوئے ہو لیکن پھر اس کے معنی میں وسعت آگئی اور اس کا اطلاق گھوڑے کو دشمن کے خلاف لڑائی کیلئے تیار کرنے پر ہونے لگا اور اس حدیث میں دونوں معنوں کا احتمال موجود ہے۔ گویا کہ پہلا معنی اس آیت کریمہ سے اخذ کیا گیا ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ......﴾ [الانفال: ٦٠] ''اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لئے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں اور ان کے سوا

اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے ہیبت بیٹھی رہے گی اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائیگا۔ اور تمہارا ذرا نقصان نہ کیا جائیگا۔''

اور اس پر اس آیت کا اطلاق بھی دلالت کرتا ہے:﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾[آل عمران۔ ۲۰۰]:''اے ایمان والو خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لیے مستعد رہو''۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:''**من احتبس فرسًا في سبيل الله ايمانًا بالله وتصديقًا بوعده فان شبعه وريه وروثه وبوله في ميزانه يوم القيامة**''۔

اور کتاب''النہایہ'' میں ہے کہ''رباط''اصل میں کہا جاتا ہے دشمن کے خلاف جنگ کیلئے کمر بستہ رہنے' گھوڑے کو باندھنے اور اس کو تیار کرنے کو اور''**مرابطة**'' کہا جاتا ہے کہ دونوں گروہ اپنے گھوڑوں کو سرحد پر باندھیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کیلئے تیار ہو اور سرحدوں پر قیام کو''رباط'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ''رباط''باب مفاعلہ کا مصدر ہوگا۔

''**المقدمة**''میں لکھا ہے کہ جہاد کیلئے سرحد پر کسی جگہ ہمیشہ قیام کرنے کو''رباط'' کہا جاتا ہے اور اصل معنی''حبس'' ہے۔ گویا کہ پہرہ دار اپنے آپ کو طاعت پر روکے رکھتا ہے۔ اس میدان جہاد میں اور''ثغر''سرحد کو کہا جاتا ہے۔

قوله: وان مات جرى عليه رزقه:''**جرى عليه عمله**'':اس''عمل''سے قبل مضاف محذوف ہے۔ **اى ثواب عمله**۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ فضیلت صرف''مرابط''کے ساتھ خاص ہے اور اس فضیلت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ مسلم کے علاوہ کی حدیث میں صراحتاً آیا ہے: **كل ميت يختم على عمله الا المرابط، فانه ينمى له عمله الى يوم القيامة**۔

''**وأجرى عليه**''یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''**جرى عليه عمله**'' ایسا ہے جیسا کہ **جرى عليه القضاء**۔ معنی یہ ہوگا کہ موت کے بعد اس کو عمل کی قدرت دی جائے گی۔ جیسا کہ موت سے پہلے قدرت تھی یہاں''جرى''''قدر''کے معنی میں ہے اور اسی طرح کی فضیلت مریض کے بارے میں ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

''**ان العبد اذا كان على طريقة حسنة من العبادة ثم مرض قيل للملك الموكل به اكتب له مثل عمله اذا كان طليقًا**''اھ۔

اور اسی طرح مسافر اور شیخ فانی کے بارے میں وارد ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''**وأجرى عليه رزقه**'' یہ اشارہ ہے۔ قرآن کی اس آیت کی طرح ﴿**فيرزقون**﴾ [آل عمران: ۲۹] یہ بھی مجہول کا صیغہ ہے۔

''**قوله: وامن الفتان**''

فتّان: فاء کے فتحہ اور تاء کی تشدید کے ساتھ مروی ہے۔

''فتان'' سے کیا مراد ہے؟اس بارے میں مختلف اقوال ہیں:

① اس سے مراد عذاب قبر،اوراس کی آزمائش ہےاوراس معنی کی تائید فصل ثانی کی حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔

② ''فتان'' سے قبر کے وہ ملائکہ مراد ہیں جو میت سے سوال کرتے ہیں اور پھر اس کو عذاب دیتے ہیں۔

③ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ''دجال'' ہے۔

④ بعض کہتے ہیں کہ اس سے ''شیطان'' مراد ہے۔اس لئے کہ شیطان انسان کو دھوکہ دے کر فتنہ میں ڈال دیتا ہے اور اس کے گناہوں کو خوبصورت شکل میں پیش کرتا ہے۔ایک نسخہ میں ''فتان'' کی جگہ فاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔یعنی ''فتان'' منقول ہے۔

ہمارے علماء میں سے مشکوۃ کے ایک شارح فرماتے ہیں کہ ''فتان'' ''فاتن'' کی جمع ہے۔اس سے مراد جلانے والی آگ ہے یا ''زبانیہ'' فرشتے ہیں جو کفار کو عذاب دیتے ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علمائے لغت نے ''أمن'' کو دو طرح سے نقل کیا ہے۔:

① ہمزہ کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ (أَمِنَ) ہے۔② ہمزہ کے ضمہ اور ''واؤ'' کے اثبات کے ساتھ ہے (أُوْمِنَ) اور ''فتان'' اکثر علماء کے ہاں ''فاء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ ''فاتن'' کی جمع ہے اور طبرانی نے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور سنن ابی داؤد میں ہے: ''وامن من فتنة القبر'' کہ قبر کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ''فتان'' فتحہ کے ساتھ روایت ہو تو جو توجیہہ پہلے کی گئی وہی ہوگی۔یعنی اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قبر میں میت کو سوال و جواب کے فتنہ میں ڈال دیتے ہیں اور پھر اس کو عذاب دیتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کا ارشاد ہے: ''فيقض له اعمى أصم''۔اگر یہ ضمہ کے ساتھ ہو تو اولیٰ یہ ہے کہ اس کو فتنہ کی انواع پر محمول کیا جائے مثلاً: ① دفنانے کے بعد قبر کا تنگ ہونا۔② منکر نکیر کے سوال و جواب ③ عذاب قبر ④ اس کے بعد قیامت کی مشکلات و مصائب۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طبرانی نے یہ اضافہ کیا ہے: ''وبعث يوم القيامة شهيدًا'' کہ قیامت کے دن ''شہید'' اٹھے گا۔

اور اسی طرح طبرانی نے ثقات کی سند کے ساتھ حدیث مرفوع نقل کی ہے: ''من مات مرابطًا امن من الفزع الأكبر''۔جو پہرہ دیتے مر گیا تو وہ بڑی گھبراہٹ سے محفوظ رہے گا۔

اور ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں: ''وبعثه الله يوم القيامة آمنًا من الفزع''۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ان صلاة المرابط تعدل خمسمائة صلاة ونفقة الدينار والدرهم منه افضل من سبعمائة دينار ينفقه في غيره''۔

''بے شک مرابط کی نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور اس کا دینار اور درہم کو خرچ کرنا۔سات سو دینار کے خرچ سے

افضل ہے جو وہ اس کے علاوہ میں خرچ کرتا ہے'' اور اسی طرح اس کی فضیلت میں بہت زیادہ احادیث وارد ہیں۔

مشائخ نے اختلاف کیا ہے کہ ''رباط'' کہاں متحقق ہوگا اس لئے کہ ہر جگہ ''رباط'' متحقق نہیں ہوا کرتا۔ ''نوازل'' میں ہے کہ وہ ایسی جگہ پر جہاں اس کے ورے اسلام نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر اس سے کم میں رباط کو ثابت کیا جائے تو پھر تو تمام مسلمان اپنے اپنے بلاد میں ''مرابط'' ہیں۔ رباط کے مذکورہ بالا تحقیق کی تائید معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے:

''من حرس من وراء المسلمين فى سبيل الله تبارك وتعالٰى متطوعًا لا يأخذه سلطان لم ير النار بعينه الاّ تحلة القسم''۔ ''فان الله تعالٰى يقول ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ [مریم:۷۱] رواه ابو يعلى اور اس کے علاوہ کئی احادیث ایسی ہیں کہ جس میں سوائے ''حراسہ فی سبیل اللہ'' کے کچھ وارد نہیں ہے اور ہم اس مقدمہ کو بخاری کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **''تعس عبد الدينار وعبدالدرهم وعبد الخمصة''۔**

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: **''وعبد القطيفة ان اعطى رضى ،وان لم يعط سخط تعس وانتكس ، واذا شيك فلا انتعش طوبى لعبد اخذ بحنان فرسه فى سبيل الله أشعث رأسه مغبرة قدماه وان كان فى الحراسة كان فى الحراسة وان كان فى الساقة كان فى السَّاقة ، ان استأذن لم يؤذن له وان شفع لم يشفع''۔**

غبار کی فضیلت

۳۷۹۴:وَعَنْ اَبِىْ عَبْسٍ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ۔ (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه كتاب الجهاد' ٦ / ٢٩' الحديث رقم ٢٨١١' والترمذى فى السنن ٤ / ١٤٦' الحديث رقم ١٦٣٢' والنسائى فى ٦ / ١٤' الحديث رقم ٣١١٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابو عبس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی راہ میں غبار آلود ہونے والے قدموں کو (جہنم کی) آگ نہیں چھوتی''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

ابو عبس بن عبد الرحمٰن بن جبیر۔ ابو عبس بن عبد الرحمٰن جبیر انصاری وحارثی ہیں۔ ان کا نام بہ نسبت ان کی کنیت کے زیادہ مشہور ہے۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ ان سے عبایہ بن رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔ مدینہ میں ۳۴ھ میں وفات پائی جنت البقیع میں دفن ہوئے اور ستر سال کی عمر ہوئی۔

''عبس'' عین مہملہ کے زبر' بائے موحدہ غیر مشدد اور سین مہملہ کے ساتھ ہے۔ ''عبایہ'' میں عین کا زبر اور بائے موحدہ غیر مشدد اور آخر میں دو نقطوں والی یاء ہے۔

تشریح: قوله:''ما اغبرت قدما عبدٍ:فی سبیل اللّٰه'':
مستملی کی روایت میں ''اغبرتا'' ہے۔اس کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔اس صورت میں یہ ''أكلوني البراغيث'' کے قبیل سے ہوگا۔

''سبیل اللہ'' درحقیقت ہر اس راستے کو کہا جاتا ہے جس میں اس کی رضا اور خوشنودی کو طلب کیا جائے تو اس صورت میں یہ طلب علم کے راستے، نماز بہ جماعت میں حاضری، مریض کی عیادت اور جنازہ میں حاضری وغیرہ سب کو شامل ہوگا لیکن جب اس کو مطلقاً بولا جائے تو اس سے ''جہاد کا راستہ'' مراد لیا جاتا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ عندالاطلاق اس کو ''سبیل الحج'' پر محمول کیا جائے گا اس حدیث کی وجہ سے:''ان رجلاً جعل بعيرًا له فی سبيل اللّٰه فأمره صلی الله عليه وسلم ان يحمل عليه الحاج''۔

اور اسی وجہ سے زکوٰۃ کے مصرف میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:﴿ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰه﴾[النور۔۲۲] میں علماء کا اختلاف ہے کے تحت کہ اس سے غازی مراد ہیں اور یہی قول امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے یا اس سے حاجی مراد ہیں اور یہی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

قوله:''فتمسه النار'': فتمسه منصوب ہے۔اور مطلب یہ ہوگا ان المس منتف بوجود دالغبار المذكور قبل عدم الاغيرار أی عدم الجهاد فيما اذا كان فرض عين سبب للمس لأن سببية الكل تستلزم سببية الجزء امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے تصریح کی ہے بعض کا کہنا ہے کہ یہ کلام تعلیق بالمحال کے باب سے ہے۔

''أی:ليس فی شأن المجاهد سبب للمس الا أن يفرض أن جهاده سبب له، وهو ليس بسبب له فالاغبرار ليس سببًا له''۔

برماوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''ای أن الاغبرار المترتب عليه المس منتف انتفاء المس فقط''۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''فتمسه النار'' مسبّب ہے اغبرت کیلئے،اور فائدہ اس کا یہ ہے کہ غیر مذکور کا حصول محال ہے۔لہٰذا جب غبار کا قدموں کو چھو جانا اس شخص کو آگ کے چھونے سے دافع ہے تو اس شخص کا جہاد کرنا، محنت مشقت کرنا، نفس جیسی نفیس چیز کو جہاد میں جھونک دینا قتل کرنا اور مقتول ہونا اس کا کیا عالم ہوگا!

مجاہد اور اس کا مقتول کافر

۳۷۹۵:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :لَا يَجْتَمِعُ كَا فِرٌ وَقَاتِلُهٗ فِی النَّارِ اَبَدًا۔ (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحيح كتاب الامارة' باب من قتل كافراً' ۳ / ۱۵۰۵' الحديث رقم (۱۳۰ ـ ۱۹۸۱) و أبو داوٗد فی السنن ۳ / ۱۷' الحديث رقم ۲٤۹۵

ترجمه:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''کافر اور اس کا قاتل

(مسلمان) کبھی بھی دوزخ میں یکجا نہیں ہو سکتے''۔ (مسلم)

تشریح: ''لا یجتمع کافر و قاتله فی النّار'' شرح مسلم میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں دو احتمال ہیں۔ایک احتمال یہ ہے کہ یہ فضیلت اس شخص کے ساتھ خاص ہو کہ جس نے کسی کافر کو جہاد میں قتل کیا علاوہ کچھ اور ہوگا تو یہ قتل اس مجاہد کے گناہوں سے کفارہ کا سبب ہوگا۔اس طور پر کہ اس کو گناہوں پر سزا نہیں ہوگی اور دوسرا یہ کہ اس کا عذاب بغیر آگ کے یا یہ کہ اس کو کفار کے علاوہ کسی اور جگہ میں سزا ہوگی۔ بہرکیف ان دونوں ادراک عذاب یکساں نہیں ہوگا۔امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی توجیہ زیادہ مناسب ہے اور یہاں کنایہ تلویحیہ ہے کہ دونوں کے اجتماع کی نفی مراد ہے۔تو اس سے دونوں میں مساوات کی نفی لازم آتی ہے۔جس سے یہ بات لازم آئی کہ مجاہد کبھی بھی آگ میں داخل نہیں ہوگا۔اس لئے کہ اگر وہ آگ میں داخل ہوا تب تو وہ کافر کے برابر ہو گیا اور اس توجیہہ کی تائید نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:''**ولا یجتمع علٰی عبد غبار فی سبیل اللّٰه ودخان جهنّم**'' کسی انسان پر اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کی وجہ سے غبار اور جہنم کا دھواں جمع نہیں ہوگا اور ایک روایت میں ہے:''**فی منخری مسلم**''۔

وقوله'' أبدًا'' أبدًا قط کے معنی میں ہے۔قط ماضی کیلئے آتا ہے اور''عوض'' مستقبل کیلئے ہوتا ہے۔مستقبل کو بمنزلہ ماضی کے قرار دیتے ہوئے۔جوہری لکھتے ہیں:''**یقال: لا أفعله أبد الأبد وأبد الأبدین کما یقال: دهر الدهرین وعوض العائضین**'' اور مقام اس کا مقتضی ہے چونکہ یہ جہاد کی ترغیب وتحریض ہے اور اسی کی طرح یہ ارشاد گرامی ہے:''**ما اغبرت قد ماعبد فی سبیل اللّٰه فتمسه النار**''۔

مجاہد بہترین آدمی ہے

۳۷۹۶:وَعَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ خَيْرِ مَعَاشِ النَّاسِ لَهُمْ رَجُلٌ مُمْسِكٌ عِنَانَ فَرَسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَطِيْرُ عَلٰى مَتْنِهٖ كُلَّمَا سَمِعَ هَيْعَةً اَوْفَزْعَةً طَارَعَلَيْهِ يَبْتَغِي الْقَتْلَ وَالْمَوْتَ مَظَانَّهٗ اَوْرَجُلٌ فِيْ غُنَيْمَةٍ فِي رَاْسِ شَعَفَةٍ مِنْ هٰذِهِ الشَّعَفِ اَوْ بَطْنِ وَادٍ مِنْ هٰذِهِ الْاَوْدِيَةِ يُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَيُؤْتِي الزَّكٰوةَ وَيَعْبُدُ رَبَّهٗ حَتّٰى يَأْتِيَهُ الْيَقِيْنُ لَيْسَ مِنَ النَّاسِ اِلَّا فِيْ خَيْرٍ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه کتاب الامارة' باب فضل الجهاد' ۳ / ۱۵۰۳' الحدیث رقم (۱۲۵ ـ ۱۸۸۹) وابن ماجه فی السنن ۲ / ۱۳۱۶' الحدیث رقم ۳۹۷۷

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''انسانی زندگی میں بہترین زندگی اس شخص کی ہے جو اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑتا ہے اور جب کسی کی خوفزدہ آواز یا کسی کے فریاد کرنے کی آواز سنتا ہے تو (تیزی سے) گھوڑے کی پشت پر سوار ہو جائے اور (اس خوفزدہ یا فریاد کرنے والے کی آواز کی طرف دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے اور اپنی) موت کو یا اس جگہ کو ممکنہ جگہ سے تلاش کرتا پھرتا ہے (یعنی جب وہ کسی کی خوفزدہ چیخ وپکار یا فریاد و مدد چاہنے کی آواز سنے تو عجلت کے ساتھ چل پڑے اور اس آواز کو تلاش کرتا پھرے تا

کہ موقع پر پہنچ کر فریاد کرنے والے کی مدد کرے اور اس بات سے نہ ڈرے کہ کہیں میری جان پر نہ بن جائے اور مجھے اپنی ہی زندگی سے ہاتھ نہ دھونا پڑے) یا بہترین زندگی اس شخص کی ہے جو اپنی کچھ بکریوں کے ساتھ ان پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا ان وادیوں میں سے کسی ایک وادی میں پھرتا ہے اور (اگر نماز کا وقت ہو تو) نماز قائم کرتا ہے اور (اگر وہ بکریاں حد نصاب کو پہنچتی ہیں تو) ان کی زکوۃ ادا کرتا ہے اور پروردگار کی عبادت و بندگی میں مشغول رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو موت آجائے اور یہ شخص انسانوں سے خیر و بھلائی پر ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''معاش'' کا معنی ہے وہ چیزیں جن کے ذریعے زندگی گزاری جاتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''**عاش الرجل معاشاً و معيشا و ما يعاش به فيقال له: معاش و معيش**'' اور حدیث شریف میں ان دونوں معنوں کی گنجائش ہے۔

''**رجل**'' یہ ابتداء کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کا مضاف حذف ہوا ہے اور مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنایا گیا ہے۔ ''**أی معاش رجلٍ**'' **هذا شأنه خير معاش النّاس**''۔ (یعنی اس شخص کی زندگی بہترین ہے کہ جس کی یہ مذکورہ حالت ہو)

''**لهم**'' **أی معاش الناس الكائن لهم لا عليهم** ۔ (یہ منفعت کیلئے ہے معنی ہے کہ ان تمام لوگوں کی زندگی جو ان سب کیلئے نافع ہو ان سب میں بہترین زندگی اس شخص کی ہوگی۔ ''**يطير على متنه**''۔ یہ طیران الطائر سے استعارہ ہے۔ ''**كلما سمع هيعة**''۔ لفظ ''**هيعة**'' ھاء کے فتحہ اور باء کے سکون کے ساتھ ہے اور مطلب اس کا ہے ڈراؤنی چیخ، **هاع يهيع اذاجبن** سے ماخوذ ہے۔

''**أو فزعة**'' یہاں پر ''**أو**'' تنویع کیلئے ہے۔ ایک دفعہ مدد طلب کرنا۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''**فزعة**'' کی تفسیر استغاثہ کے ساتھ کی گئی ہے۔ ''**فزع**'' بمعنی ''استغاث'' سے ماخوذ ہے اور اصل میں ''**فزع**'' شدت خوف کو کہا جاتا ہے۔

''**طار عليه**'' اس گھوڑے پر جلدی سے سوار ہوتا ہے اور گھوڑے کو اس خوف اور آواز کی جگہ تک دوڑاتا ہوا پہنچ جاتا ہے۔ ''**يبتغى القتل و الموت مظانه**'': ''**مظانه**'' ''**الموت**'' سے بدل اشتمال ہے اور اکثر کی رائے ہے کہ یہ ظرف ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اس مجاہد کی حالت بیان کر رہا ہے۔ یا ''**طار**'' کے فاعل سے حال ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ موت یا قتل کی پرواہ نہیں کرتا اور نہ اس سے احتراز کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس کو اس جگہ تلاش کرتا ہے جہاں اس کا خیال ہوتا ہے کہ یہاں پر ہوگی اور ''**مظان**'' ''**مظنة**'' کی جمع ہے۔ ''گمان کی جگہ'' جہاں کسی چیز کے وجود کا یقین ہو یا گمان ہو۔

''**مظانه**'' میں واحد کی ضمیر لانے کی دو وجہ ہیں: ① حاصل اور مقصود ایک ہی چیز ہے۔ ② اقرب کی طرف ضمیر کے اعادہ پر اکتفا کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کی اس آیت میں ہے۔ **والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها فى سبيل الله** [التوبة: ٣٤] ترجمہ: ''اور غایت حرص سے جو لوگ سونا چاندی جمع کر کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے''۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات میں ''**او الموت**'' آیا ہے۔ یعنی لہٰذا مفرد لانا یا تو قیاس کی وجہ سے ہیں

کیونکہ قیاس کا تقاضا یہی تھا۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''واؤ'' او کے معنی میں ہو۔اس سے تمام روایات جمع ہو جائیں گی۔

قوله: '' **شَعَفَةٍ**'' **من هذه الشعف** ''**شعف**''۔عین اور شین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔مراد اس سے پہاڑ کی چوٹی ہے۔

''**ومن هذه الشعف**'' اس سے کوئی معہود پہاڑ کی چوٹی مراد نہیں ہے بلکہ جنس مراد ہے۔

''**ويعبد ربه**'' یہ تقسیم بعد تخصیص ہے۔''**حتى يأتيه اليقين**''''یقین'' سے مراد ''موت'' ہے اور اس کو یقین اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے وقوع میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موت ایسا یقین ہے جو شک کے مشابہ ہے۔

''**ليس من الناس الا فی خير**''

مراد یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک افضل ہے اور یا یہ ثانی بہتر ہے۔یہی بات اقرب ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں جگہوں میں ''**هذه**'' (یعنی **هذه الشعف** اور **هذه الأوديه**) لائے۔ان کی حقارت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں ہے:﴿**وما هذاه الحياة الدنيا**﴾ [العنكبوت۔٦٤]

''**غنيمة**'' بھی تصغیر کے ساتھ لائے۔اس آدمی کی قناعت کا وصف بیان کر رہے ہیں کہ وہ ایک حقیر سی جگہ میں رہتا ہے اور ادنیٰ رزق کے ساتھ گزارہ کر رہا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے بچاتا ہے اور لوگوں کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے اور رب ذوالجلال کی عبادت میں مگن رہتا ہے۔یہاں تک کہ اس کے پاس موت آجاتی ہے اور موت کو ''یقین'' کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا ہے تاکہ اس کو مزید تسلی ہو جائے۔اس لئے کہ موت کے ذکر سے ان تمام لذات اور شہوات کی مذمت کرنی ہے جو انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں اور اس کو رب کی عبادت سے غافل کرتی ہیں۔جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی۔جب آپ کو کفار کی طرف سے سخت اذیتیں پہنچیں:﴿ **وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ**﴾ [الحج:٩٧-٩٩] :''اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں''۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کی دلیل ہے جو گوشہ نشینی کی زندگی کو مخالطت پر ترجیح دیتے ہیں۔لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے سے افضل گردانتے ہیں۔اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کا قول ہے کہ ''مخالطت'' کی زندگی ''اعتزال'' سے افضل ہے۔بشرطیکہ وہ اس مخالطت کی زندگی میں فتنوں سے محفوظ رہنے کی امید رکھتا ہو۔

زہدان طریقت کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ اعتزال افضل ہے۔انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔جمہور علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث فتن اور جنگوں کے زمانہ پر محمول ہے۔یا اس شخص کیلئے ہے کہ اس کے شر سے لوگ محفوظ نہ رہیں اور یہ شخص لوگوں کی تکالیف پر صبر نہ کر سکے۔انبیاء علیہم السلام جمہور صحابہ رضوان اللہ علیہم،علماء وزہاد طریقت اختلاط کی زندگی گزارتے تھے اور اختلاط کی زندگی کے منافع بھی حاصل کرتے۔جیسا کہ نماز جمعہ میں شرکت،نماز باجماعت میں شرکت،جنائز میں شرکت مریضوں کی عیادت اور ذکر کے حلقوں میں شرکت وغیرہ۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معاش کو خاص طور پر ذکر کرنے میں زبردست تلمیح ہے۔ اس لئے کہ اہل دنیا کے ہاں عیش متعارف نفسانی خواہشات اور لذات کا حصول ہے اور شہوات انسانیہ میں انہماک ہے۔ جیسا کہ بیابان کو مفازۃ اور منجاۃ کہا جاتا ہے۔ (حالانکہ اس کا نام مهکلة ہونا چاہیے اور اسی طرح ''لدیغ'' ڈسے ہوئے کو ''سلیم'' کہتے ہیں۔ یہ تفاؤلاً کہتے ہیں اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی طرف اشارہ ہے۔

''اللهم لا عيش الا عيش الأخرة''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی بھی زندگی زیادہ لذات والی، زیادہ چاہت والی اور زیادہ خوشگوار نہیں ہو سکتی اس سے کہ جس میں انسان اپنے رب کی طاعت اور بندگی کرتا ہے، اور اس کو اس سے اتنی راحت ہوتی ہے اس کی زندگی کی مشقتیں ختم ہو جاتی ہیں بلکہ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جب وہ اس حالت کو کھو بیٹھتا تو وہ اس پر بڑا گراں گزرتا ہے۔ حتی کہ اپنے جان و مال کی ہلاکت سے بھی زیادہ شاق گزرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''ارحنا يا بلال'' ''اے بلال! ہمیں راحت پہنچاؤ اور ایک موقع آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''وجعل قرة عيني في الصّلوٰة'' (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے)۔ علاوہ ازیں اس حدیث میں دنیاوی زندگی اور عیش کی مذمت ہے۔

بہر کیف حدیث کا حاصل مسلمان کو دشمنان دین کے خلاف جہاد پر ابھارنا ہے اور اپنے نفس اور شیطان کی مخالفت پر تیار کرنا ہے اور دنیا کی ختم ہونے والی لذات کے حصول سے اعراض اور کنارہ کشی ہے۔

مجاہد کی معاونت کا بیان

۳۷۹۷: وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ خَالِدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَدْ غَزَا وَمَنْ خَلَفَ غَازِيًا فِيْ اَهْلِهٖ فَقَدْ غَزَا . (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه كتاب الجهاد، باب من جهز غازيا ٦ / ٤٩، الحديث رقم ٢٨٤٣، و مسلم في ٣ / ١٥٠٧، الحديث رقم (١٣٥ ـ ١٨٩٥) و أبو داود في السنن ٣ / ٢٥، الحديث رقم ٢٥٠٩، والنسائي في ٦ / ٤٦، الحديث رقم ٣١٨٠، وابن ماجه ٢ / ٩٢٢، الحديث رقم ٢٧٥٩، وأحمد في المسند ٤ / ١١٥،

ترجمہ: ''اور حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو سامان (جہاد) مہیا کیا اس نے (گویا) جہاد (ہی) کیا (یعنی وہ بھی جہاد کرنے والوں کے حکم میں داخل ہے اور جہاد کے ثواب میں شریک ہے) اور جو شخص کسی غازی ومجاہد کے اہل وعیال کے لئے نائب و خلیفہ بنا (یعنی جو شخص کسی غازی ومجاہد کے جہاد میں چلے جانے کے بعد اس کے اہل وعیال کا خدمت گزار ہوا اور نگہبان بنا اس نے بھی گویا) جہاد ہی کیا'' ۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: خلفه في اهله۔ جب وہ اہل خانہ کے اصلاح احوال اور اس کے جملہ امور کی حفاظت میں اس کا قائم مقام بن جائے۔ مطلب یہ کہ جو کوئی شخص کسی غازی کے امور میں اس کا نائب بنا کہ

وہ اس کی غیوبت کے زمانہ میں اس کے اہل وعیال کی ضرورت کا خیال رکھے تو وہ اس غازی کے ساتھ ثواب میں شریک ہوگیا۔ اس لئے کہ غازی کو جہاد کیلئے فارغ کرنا اور اس کو جہاد میں مشغول کرنے کا سبب یہ خلیفہ بنا ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعًا یوں مروی ہے:

من جهر غازيا حتى يستقل كان له مثل اجره حتى يموت اويرجع۔

مجاہد کے اہل خانہ کی عزت وحرمت کا بیان

۳۷۹۸:وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :حُرْمَةُ نِسَاءِ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ كَحُرْمَةِ اُمَّهَاتِهِمْ، وَمَا مِنْ رَجُلٍ مِنَ الْقَاعِدِيْنَ يَخْلُفُ رَجُلاً مِنَ الْمُجَاهِدِيْنَ فِى اَهْلِهٖ فَيَخُوْنُهٗ فِيْهِم اِلاَّ وُقِفَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَأْخُذُ مِنْ عَمَلِهٖ مَا شَاءَ فَمَا ظَنُّكُمْ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه كتاب الامارة، باب حرمة النساء المجاهدين، ۳ / ۱۵۰۸، الحديث رقم (۱۳۹، ۱۸۹۷)، و أبو داود فی السنن ۳ / ۱۷، الحديث رقم ۲۴۹۶، والنسائی فی ۶ / ۵، الحديث رقم ۲۴۹۶، وأحمد فی المسند ۵ / ۳۵۵

ترجمہ: ''اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجاہدین کی عورتوں کی عزت وحرمت (گھروں میں) بیٹھنے والوں (یعنی جہاد کے لئے نہ جانے والوں) پر اسی طرح لازم ہے کہ جس طرح کہ ان کی ماؤں کی عزت وحرمت ان پر لازم ہے (یعنی جو لوگ کسی وجہ سے جہاد پر نہیں جا سکتے ہیں اور اپنے گھروں میں رہ گئے ہیں ان کو چاہئے کہ جو لوگ جہاد میں گئے ہوں ان مسلمانوں کی عورتوں کی عزت وآبرو میں خیانت نہ کریں اور ان کی طرف نظر بد سے نہ دیکھیں بلکہ ان کو اپنے حق میں ایسا حرام جانیں گویا وہ ان کی مائیں ہیں) لہٰذا (یاد رکھو) بیٹھنے والوں (یعنی جہاد میں نہ جانے والوں) میں سے جو شخص کسی مجاہد کا اس کے اہل وعیال (یعنی اس کی بیوی اور لونڈیوں یا دوسرے قرابت داروں) کے لئے نائب وخلیفہ بنا (یعنی ان کا نگران بنا) اور پھر اس نے اس (مجاہد) کے اہل وعیال (کی عزت وآبرو) میں خیانت کی تو اس کو قیامت کے دن (اس مجاہد کے سامنے) کھڑا کیا جائے گا اور وہ اس کے (نیک) اعمال میں سے جس قدر چاہے گا لے لے گا'' ایسی حالت میں تمہارا کیا گمان ہے؟ (کہ کیا وہ اس کی کوئی نیکی چھوڑے گا؟)۔ (مسلم)

تشریح: قوله:''حرمة نساء المجاهدين على القاعدين كحرمة امهاتهم'':

اس جملہ میں مبالغہ کے ساتھ اس مفہوم کو بیان کرنا مقصود ہے کہ مجاہدین کی عورتوں سے اجتناب کیا جائے اور ان کے حقوق کا خاص خیال رکھا جائے۔

''قوله:وما من رجل من القاعد من يخلف رجلا من المجاهدين فی أهله ......''

''اھل'': اس سے مراد اس کی بیوی ہے یا اس کی لونڈی ہے یا اس کے گھر میں جو بھی اس کا قرابت دار ہے وہ مراد ہے۔

''فيخونه فيهم'' اصل مقصود یوں کہنا ہے:فایخون الرجل فیهن وأهلیهن یوں اس میں تغلیب ہے۔
امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مفعول کی ضمیر''رجلاً'' کی طرف راجع ہے اور فیهم کی ضمیر''اہل'' کی طرف راجع ہے۔ (یہاں مفرد کی جگہ جمع کی ضمیر لانا یا یہ کہ ضمیر جمع مؤنث کی جگہ ضمیر جمع مذکر کو لانا) اس کے اہل کی تعظیم اور بزرگی شان کا اظہار ہے۔جیسا کہ شاعر کا یہ قول ہے:

''وان شئت حرمت النسآء سواکم''۔

خلاصہ کلام یہ کہ مجاہدین کی عورتیں ہی ان میں سے ہیں جن کی رعایت اور ان کی عزت ضروری ہے اور اسی معنی کی طرف آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اس قول کے ذریعہ اشارہ فرمایا:''کحرمة امهاتهم''۔
''وقف'' مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔''وقوف'' سے ماخوذ ہے۔''له'' کے ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں: ① ای للرجل ② ای لأجل مافعل من سوء الخلافة للغازی۔
اور جامع صغیر میں اس روایت کے ساتھ یہ زیادتی بھی منقول ہے
فقیل له: قد خلفك فی أهلك فخد من حسناته ما شئت کہ اس مجاہد سے کہا جائے گا کہ یہی وہ شخص ہے جو تیرے اہل میں تیرا خلیفہ بنا تھا۔تم اس کی نیکیوں میں سے جتنی چاہو لے لو۔تو وہ مجاہد اس کے اعمال سے جو چاہے گا، لے لے گا۔
''فما ظنکم'' امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ اس مجاہد کو اس کی نیکیاں لیتے ہوئے کتنی رغبت اور شوق ہوگا۔جس کثرت سے وہ مجاہد اس کی نیکیاں لے گا۔اس کی کوئی بھی نیکی نہیں رہے گی۔
مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ای ما ظنكم بالله مع هذه الخيانة ؟هل تشكون فی هذاه المحازاة ام لا؟ مطلب یہ کہ تم اللہ کے بارے میں کیا گمان رکھتے ہو کہ وہ اس عظیم خیانت کا کیا بدلہ اور سزا دیں گے۔یعنی کیا تم اس سزا و جزاء کے بارے میں شک کرتے ہو یا نہیں۔یعنی جب تم نے اس چیز کی سچائی کو جان لیا جو کچھ میں کہتا ہوں تو مجاہدین کی عورتوں کے ساتھ خیانت کرنے سے بچو۔
علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے۔جس کو اللہ تعالیٰ یہ مقام دیں گے اور اس کو اس فضیلت سے نوازیں گے اور بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ کرامت اور عزت ہوگی۔

فی سبیل اللہ سواری فراہم کرنے کا بیان

۳۷۹۹ :وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ بِنَاقَةٍ مَخْطُوْمَةٍ فَقَالَ : هٰذِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُ مِائَةِ نَا قَةٍ كُلُّهَا مَخْطُوْمَةٌ .

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه كتاب الامارة'باب فضل الصدقة فی سبيل الله' ۳ / ۱۵۰۵' الحديث رقم ۱۳۲ - ۱۸۹۲) والنسائی فی السنن ٦ / ٤٩' الحديث رقم ۳۱۸۷' والدارمی فی ۲ / ۲٦۸' الحديث رقم ۲٤۰۲'

وأحمد فی المسند ٥ / ٢٧٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (دربار نبوت میں) ایک شخص نکیل والی اونٹنی لے کر حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ یہ اللہ کی راہ کے لئے ہے (یعنی میں اس اونٹنی کو اللہ کی رضا کے لئے جہاد میں پیش کرتا ہوں)۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(میں تمہاری اس پیشکش کو بہ تحسین قبول کرتا ہوں اور تمہیں یہ بشارت دیتا ہوں کہ) اس کے بدلے قیامت کے دن تمہیں سات سو اونٹنیاں عطا کی جائیں گی اور سب اونٹنیاں نکیل والی ہونگی''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: جاء رجل بناقة مخطومة**: (یہ ''باء'' جارہ ''فی'' کے معنی میں ہے) ''**ای فیها خطام**''۔ **خطام** کا معنی ''زمام'' کے قریب ہے۔ یہ شرح مسلم میں ہے اور النہایہ میں منقول ہے: ''**خطام البعیر**'' اسی رسّی کو کہتے ہیں جو کھجور کی چھال یا بالوں یا اون سے بنائی جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف میں حلقہ بنا کر پھر اس سے دوسری طرف کو باندھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ حلقہ نما بن جاتی ہے۔ پھر اس کو اونٹ کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر اس کو اس کی ناک پر دوہرا کر دیا جاتا ہے اور اونٹ کی ناک میں جو باریک سی رسّی ڈالی جاتی ہے اس کو ''زمام'' کہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: ''**لا زمام**'' ۔ اس سے مراد وہ عمل ہے کہ بنی اسرائیل کے عبادت گزار لوگ اپنی ناک کے ساتھ کرتے تھے۔ اس سے منع کیا۔ وہ عمل یہ تھا کہ ناک میں سوراخ کرتے تاکہ اس کو آگے سے کھینچا جا سکے اور ''**خطم**'' اصل میں ''ناک'' کو کہتے ہیں اور ''**خِطام**'' بروزن کتاب ہے۔ وہ چیز جس کے ذریعے اونٹ کو تابع کیا جاتا ہے اور ''**خطم البعیر**'' سے مراد اونٹ کے سر میں مہار ڈالنا ہے۔ **قوله**: ''**فقال هذه فی سبیل الله ......**''۔

یعنی یہ اللہ کے راستے میں صدقہ ہے (''هذه'' کی خبر محذوف ہے۔) **أی هذه صدقة**

قوله: ''**فقال رسول اللهﷺ: الك بها یوم القیامة سبع مائة ناقة کلها مخطومة**''۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس ایک اونٹنی کا اجر اس کو اتنا ملے گا جتنا کہ اس کو سات سو اونٹنیاں جہاد کے علاوہ دوسرے کاموں میں صدقہ کرنے سے ملتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جنت میں اس کو سات سو اونٹنیاں ملے گی ان پر یہ سواری کرے گا جہاں چاہے گا سیر و تفریح کرے گا۔ جیسا کہ جنت کے گھوڑوں کے بارے میں آیا ہے۔

مجاہد کو بھیجنے کا ثواب

٣٨٠٠: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: بَعَثَ بَعْثًا اِلٰی بَنِیْ لَحْیَانَ مِنْ هُذَیْلٍ فَقَالَ لِیَنْبَعِثْ مِنْ کُلِّ رَجُلَیْنِ اَحَدُ هُمَا وَالْاَجْرُ بَیْنَهُمَا (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه کتاب الامارة، باب فضل اعانة المغازی، ٣ / ٥٠٧، الحدیث رقم (١٣٧ ـ ١٨٩٦)

وأحمد فی المسند ٣ / ٤٩

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ ہذیل کی ایک شاخ بنولحیان کی طرف (جہاد کے لئے) ایک لشکر روانہ (کرنے کا ارادہ) فرمایا تو حکم دیا کہ ہر دو شخصوں میں ایک شخص جہاد میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہو (یعنی ہر قبیلے میں سے آدھے آدمی جہاد میں جائیں اور آدھے آدمی رہ جائیں تا کہ وہ جہاد میں جانے والوں کے اہل وعیال کی خبر گیری کریں) اور جہاد کا ثواب دونوں (یعنی نمازی وقاعد) کو برابر ملے گا''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: **وعن أبي سعيد** ......: اور ایک نسخہ میں ''**الخدری رضی الله عنه**'' (بھی) ہے۔

''**الی بنی لحیان: من هذیل** 'لحیان' لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھنے سے زیادہ فصیح ہے۔

''**هذیل**'': تصغیر کے ساتھ ہے۔

ینبعث من کل رجلین احد هما والأجر بینهما: اور جہاد کا ثواب غازی وقاعد دونوں کو ملے گا۔

اسلام قیامت تک رہے گا

۳۸۰۱: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَنْ يَبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه کتاب الامارة، باب لا تزال طائفة، ۳ / ۱۵۲۴، الحدیث رقم (۱۷۲ ـ ۱۹۲۲)

ترجمہ: ''اور حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا اور مسلمانوں میں سے ایک نہ ایک جماعت اس کی (یعنی دین کی حفاظت) خاطر قیامت (قائم ہونے کے قریب) تک لڑتی رہے گی (یعنی روئے زمین جہاد سے خالی نہیں رہے گی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں (دین کے تحفظ کی خاطر) ہمیشہ جہاد ہوتا رہے گا''۔ (مسلم)

تشریح: ''**لن یبرح**'': یہ لایزال کے معنی میں ہے یعنی ہمیشہ ایسا ہوگا۔

''**قوله: هذالدین قائمًا یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة**''

''**یقاتل**'': مذکر کے صیغہ کے ساتھ ہے اور تانیث کے ساتھ ''**تقاتل**'' بھی جائز ہے۔ اس کا فاعل کیونکہ ''**عصابة**'' لفظاً مؤنث ہے۔

''**عصابةٌ**'': عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس سے مراد جماعت ہے۔ معنی یہ ہے کہ روئے زمین کبھی بھی جہاد سے خالی نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ اس پر جہاد جاری رہے گا۔ اگر ایک جگہ میں نہ ہو تو دوسری جگہ ضرور ہوگا۔

حتی تقوم الساعة: ای یقرب قیامها یہاں تک کہ قیامت قریب آ جائے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**یقاتل**'' جملہ مستانفہ ہے ماقبل جملہ کا بیان ہے اور ''**یقاتل**'' کو ''**علی**'' کے ساتھ متعدی کیا ہے۔ کیونکہ ''**یظاهر**'' کے معنی کو متضمن ہے مطلب یہ ہوا کہ جہاد کی وجہ سے وہ گروہ ہمیشہ دشمنان دین پر غالب رہے گا۔ یعنی

یہ دین اس گروہ کے جہاد کی وجہ سے قائم ودائم رہے گا اور میرا گمان یہی ہے کہ اس سے مراد شام کا طائفہ منصورہ ہے اور ایک نسخہ میں ''بالمغرب'' کا اضافہ ہے۔ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں غالب گمان یہی ہے کہ اس سے وہ طائفہ مراد ہے جو روم میں ہے اللہ ان کی مدد ونصرت فرمائے اور ان کے اعداء کو ذلیل ورسوا فرمائے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک حدیث میں آیا ہے **لا یزال أهل المغرب ظاهرین علی الحق حتی تقوم الساعة** کہ اہل مغرب حق پر رہیں گے یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس طائفہ سے مراد اہل شام اور اس کے آس پاس کے علاقے والے ہیں۔ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں اشکال ہے۔ اس لئے کہ اہل مغرب رومیوں وغیرہ میں سے ہیں کفار کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ اللہ ان کی مدد کرے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس **طائفة** سے مراد **علی التعیین** کوئی جماعت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ جماعت ہے جو عمل جہاد میں مشغول ہو۔ اس لئے کہ ماوراء النہر میں بھی کئی ایسے گروہ ہیں جو کفار سے لڑ رہے ہیں۔ اللہ ان کو تقویت دے اور ہماری طرف سے مجاہدین کو بہترین بدلے عطا کرے کہ فرض کفایہ کی انجام دہی میں مشغول ہیں اللہ ان کو توفیق عطا فرمائے اور اپنی عنایت ان پر متوجہ فرمائے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں کھلا معجزہ ہے اس لئے کہ یہ وصف جہاد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے لے کر اب تک اس امت میں موجود ہے اور یہ ہمیشہ رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے اور یہ اس بات کے منافی نہیں کہ یہ ''خبر'' امر اور تقاضے کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾[الحجر:۹] کہ ہم اس بات کے وجوباً مامور ہیں کہ قرآن پاک کو قراءت متواترہ کے ساتھ حفظ کریں۔ یہ ہم پر فرض کفایہ ہے۔

اس روایت کو ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔ اسی معنی کی ایک اور حدیث ہے: **لا تزال طائفة من أمتی ظاهرین حتی یأ تی أمر الله وهم ظاهرون**۔ اس حدیث کو شیخین نے حضرت مغیرہ سے روایت کیا اور ایک حدیث میں ہے:

''**لا تزال طائفة من أمتی قوامة علی أمر الله لا یضرها من خالفها**''۔ اس روایت کو ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

اور ایک اور حدیث ہے: ''**لا تزال طائفة من أمتی ظاهرین علی الحق حتی تقوم الساعة** ''۔ اس کو حاکم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام احادیث علماء کو بھی شامل ہیں یہاں تک کہ بعض علماء نے کہا کہ اس جماعت سے مراد حدیث کی خدمت کرنے والے علماء اور محدثین ہیں۔ واللہ اعلم۔

زخمی ہونے کا ثواب

۳۸۰۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :لَا یُکْلَمُ اَحَدٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ یُکْلَمُ فِیْ سَبِیْلِهٖ اِلَّا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَجُرْحُهٗ یَثْعَبُ دَمًا، اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالرِّیْحُ الْمِسْكُ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخارى فى صحيحه كتاب الجهاد' باب من يجرح فى سبيل الله عزوجل' ٦ / ٢٠' الحديث رقم ٢٨٠٣' و مسلم فى ٣ / ١٤٩٦' الحديث رقم (١٠٥ ـ ١٨٧٦) والترمذى فى السنن ٤ / ١٥٨' الحديث رقم ١٦٥٦' والنسائى فى ٦ / ٢٨' الحديث رقم ٣١٤٧' وابن ماجه فى ٢ / ٩٣٤' الحديث رقم ٢٧٩٥' والدارمى فى ٢ / ٢٧٥' الحديث رقم ٢٤٠٦' و مالك فى الموطا ٢ / ٤٦١' الحديث رقم ٢٩' فى كتاب الجهاد وأحمد فى المسند ٢ / ٢٤٣

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص خدا کی راہ (یعنی جہاد) میں زخمی کیا جاتا ہے اور خدا اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ میں زخمی کیا جاتا ہے تو وہ مجاہد قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا اور اس خون کا رنگ خون کے رنگ جیسا ہوگا اور اس کی بو مشک کی بو کے مثل ہوگی''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: لا يكلم أحد في سبيل الله** :''**لا يكلم**'' یہ مجہول کا صیغہ ہے۔''**كلم**'' سے ماخوذ ہے۔''زخم'' کو کہتے ہیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چاہے وہ صاحب جرح اس زخم اور چوٹ کی وجہ سے مرجائے یا نہ مرے۔ بلکہ زندہ بچ جائے جیسا کہ ترمذی شریف کی روایت سے متضاد ہوتا ہے۔

''**والله أعلم بمن يكلم في سبيله**'' مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کے درمیان واقع یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور معترض فیہ کے معنی کی تاکید وتقریر کیلئے ہے۔ اس کلام سے مجروح فی سبیل اللہ کی عظمت شان بیان کرنا مقصود ہے اور معنی اس کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس شخص کی عظمت شان کو بخوبی جانتے ہیں کہ کس کو راہ جہاد میں زخم لگ رہا ہے اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: **قالت رب انى وضعتها انثى والله اعلم بما وضعت وليس الذكر كالأنثى** [آل عمران : ٣٦] ترجمہ:''(حسرت سے) کہنے لگیں کہ میرے پروردگار میں نے تو وہ حمل لڑکی جنی حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں اس کو جو انہوں نے جنی اور (وہ) لڑکا (جو انہوں نے چاہا تھا) اس لڑکی کے برابر نہیں''۔

''**والله اعلم بما وضعت**'' یہ جملہ حضرت مریم علیہا السلام کے کلام میں بطور معترضہ ہے۔ اس مولود کی عظمت شان کو بیان کر رہا ہے، اس بچی کو عطا ہونے قدر ومنزلت پر واضح انداز میں روشنی ڈالے بغیر اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس چیز کو بہتر جانتے ہیں جو اس نے جنا ہے اور اس کے ساتھ جو عظیم امور متعلق ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جملہ انہوں اپنے آپ کو ریاء وسمعہ سے بچاؤ کے تتمہ کے طور پر ذکر کیا ہو۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ظاہر تو یہی ہے اور پہلی توجیہ اسی صورت میں چل سکتی ہے کہ جب اسے ''**وضعت**'' صیغۂ غائب کی قراءت کی نظیر قرار دیا جائے، صیغۂ متکلم کی قراءت پر درست نہیں۔ جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تنبیہ ہے اس بات پر کہ جہاد اور غزوہ میں اخلاص ضرور ہونا چاہیے اور یہ مذکورہ ثواب یہ اس مجاہد کیلئے ہوگا کہ جس نے اپنی نیت خالص کی ہوگی اور یہ نیت کی کہ اللہ کا کلمہ اور اس کا دین بلند وبالا ہو جائے اور یہ فضیلت

اگر چہ ظاہراً ان لوگوں کیلئے ہے کہ جو کفار کے ساتھ جہاد اور قتال کرے لیکن اس میں وہ شخص بھی داخل ہے کہ جس کو باغیوں یا ڈاکوؤں کے ساتھ لڑائی میں زخم آئے یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ کرتے ہوئے زخم آجائے۔ وہ سب اس فضیلت میں داخل ہیں۔

''**وجرحه يثعب**'': جرجیم کے ضمہ کے ساتھ ہے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''یثعب'' ثاء کے سکون اور عین کے فتح کے ساتھ ہے اور شرح مسلم میں ہے **ای یجری منفجرًا ای کثیرا** ۔ یہ معنی ایک دوسری روایت کے اعتبار سے ہیں جس میں ''**يتفجر**'' کے الفاظ ہیں۔

لون الدم: مسلم کے ایک نسخہ میں ''**لون دم**'' کے الفاظ ہیں۔ا

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے اس طرح آنے میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ساتھ کا گواہ بھی ہو اور اس بات کا شاہد ہو کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنی جان تک کو خرچ کر ڈالا۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ ''**ثعبت الماء فجرته فانثعب**'' یہاں پر اس فعل کی اضافت جرح کی طرف ہے۔ کیونکہ جرح خون کے بہنے کا سبب بنا ہے اس وجہ سے یہ ''اضافۃ الفعل الی السبب'' ہے۔ ''**ودمًا**'' یہ مفعول ہے اور اگر اس سے ''تمیز'' کا مراد ہوتی تو پھر عبارت یوں ہونی چاہیے تھی: ''**يتعب دمًا**'' یا ''**يثعب**'' مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہوتا۔ لیکن مجھے یہ روایت کہیں نہیں ملی (اس لئے یہ مفعول ہی ہے)۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**يثعب**'' کا متعدی جوہری سے منقول ہے اور صاحب النہایہ کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لازم مستعمل ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اس کی تفسیر ''**يجرى**'' کے ساتھ کی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ ایک دوسری حدیث میں ''**يشخب دمًا**'' آیا ہے اور ''**شخب**'' سیلان کو کہتے ہیں اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی قبیل سے ہوگا: ﴿ اَعۡيُنَهُمۡ تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ﴾ [المائدہ: ۸۳] حالانکہ بظاہر یوں کہنا چاہئے: **ان الدمع يفيض من'' العين''** کہ آنسو آنکھوں سے بہہ گئے۔ چنانچہ یہاں پر عین (آنکھ) کو ''**فائضه**'' مبالغۃً کہا ہے۔ اسی طرح زخم سے خون بہتا ہے، زخم نہیں بہتا۔ لیکن بطور مبالغہ یہاں پر بھی کہہ دیا کہ زخم بہتا ہے اھ صاحب قاموس کے کلام سے شیخ کی تائید ہوتی ہے: **ثعب الماء والدم كمنع فجره فانثعب**۔

لیکن ''تاج العرس'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے۔ دستور اللغۃ میں اسی طرح ہے ''**ثعب الدم**'' اس کا معنی یہ کہا ہے سال وأسال کہ خون بہا، خون بہایا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''المشارق'' میں ہے: ''**ثعب**'' **تفجر وكذلك قوله: يثعب** ......۔ گویا کہ شیخ کو پتہ نہیں چلا کہ یہ لازم بھی مستعمل ہے۔ جیسا کہ وہ متعدی کے قائل ہیں۔

اور ''**يشخب**'' والی حدیث ان پر کوئی حجت نہیں ہے۔

شہید کی جنت میں کیا تمنا ہو گی؟

۳۸۰۳:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :مَا مِنْ اَحَدٍ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ اَنْ يَّرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا وَلَهٗ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا الشَّهِيْدُ يَتَمَنّٰى اَنْ يَّرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلُ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ . (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه كتاب الجهاد' تمنى المجاهد' ٦ / ٢٢' الحديث رقم ٢٨١٧' و مسلم فى ٣ / ١٤٩٨' الحديث رقم (١٠٩ ـ ١٨٧٧) والدارمى فى السنن ٤ / ١٥١' الحديث رقم ١٦٤٣' والنسائى فى ٦/٣٦' الحديث رقم ٣١٦٠' والترمذى فى ٢ / ٢٧١' الحديث رقم ٢١٠٩' وأحمد فى المسند ٣ / ١٣١

ترجمہ: ''اور انسؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا: ''جنت میں داخل ہونے والا کوئی شخص بھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس چلا جائے اور (جنت کی نعمتوں کے عوض دنیا کی تمام) چیزوں کو قبول کر لے سوائے شہید کے' وہ یہ آرزو کریگا کہ وہ دنیا میں واپس چلا جائے اور دس بار راہِ الٰہی میں شہید ہو کیونکہ وہ شہادت کی عظمت وثواب کو جانتا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ''ما من احدٍ يدخل الجنة......الاالشهيدة'': ''یدخل'' معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے اور مجہول کے صیغہ کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

''وله ما فى الأرض من شئ'': اور مسلم کی روایت میں ''وان له'' ہے۔

علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''وله'' کا عطف ''ان يرجع'' پر جائز ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہوگا جو بھی شخص جنت میں داخل ہوگا وہ اس خواہش کا اظہار نہیں کرے گا کہ وہ دوبارہ دنیا میں لوٹ جائے اور نہ اس بات کو پسند کرے گا کہ اس جنت کے عوض میں اس کو پوری دنیا مل جائے۔

''وله مافى الأرض '': یہ جملہ حالیہ ہے۔ أى وكونه حالا وہ جنتی رجوع الى الدنیا کو پسند نہیں کرے گا درآنحالیکہ وہ دنیا کے بہت ساز وسامان، باغات، اور زمینوں اور غلاموں کا مالک تھا۔ (پھر بھی رجوع کو پسند نہیں کریگا) اور ظاہراً یہ دوسرا معنی زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے کہ ''من شئ'' بیان ہے ''ما فى الأرض'' کا۔ اس صورت میں یہ استغراق کا فائدہ بھی دیگا۔

''الّا الشهيد'': ''شہید'' رفع کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ ''من احدٍ'' سے بدل ہوگا۔ جبکہ بعض نسخوں میں نصب کے ساتھ ذکر ہے۔ اس صورت میں یہ مستثنیٰ ہوگا۔

قوله:يستمى ان يرجع ......:

''فيقتل عشر مرات'': ''عشر مرّات'' سے مراد کوئی متعین عدد نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کثرت مراد ہے۔

''لما يرى من الكرامة'': اس کرامت سے مراد ''كرامة الشهادة'' ہے۔ یعنی اس شہادت کی وجہ سے اس کو زبردست نعمتوں اور لذتوں سے نوازا جائے گا اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ دنیا کی کسی چیز کی خواہش نہیں کرے گا سوائے شہادت کے۔ شہادت کی تمنا دیناوی خواہشات میں سے نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ کلام یہ اس قبیل سے ہوگا جیسا کہ

اس شعر میں ہے:

''ولا عيب فيهم غير ان سيوفهم''

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا تار کر کند پڑ چکی ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

شہداء کی روحوں کا بیان

۳۸۰۴: وَعَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ سَأَلْنَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ الْاٰيَةَ قَالَ: اِنَّا قَدْ سَأَلْنَا عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَقَالَ اَرْوَاحُهُمْ فِيْ اَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ لَهَا قَنَادِيْلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ ثُمَّ تَاْوِيْ اِلٰى تِلْكَ الْقَنَادِيْلِ فَاطَّلَعَ اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ اِطِّلَاعَةً فَقَالَ هَلْ تَشْتَهُوْنَ شَيْئًا؟ قَالُوْا: اَيَّ شَيْءٍ نَشْتَهِيْ وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْنَا، فَفَعَلَ ذٰلِكَ بِهِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَلَمَّا رَاَوْا اَنَّهُمْ لَنْ يُتْرَكُوْا مِنْ اَنْ يُسْاَلُوْا قَالُوْا: يَا رَبِّ نُرِيْدُ اَنْ تَرُدَّ اَرْوَاحَنَا فِيْ اَجْسَادِنَا حَتّٰى نُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِكَ مَرَّةً اُخْرٰى فَلَمَّا رَاٰى اَنْ لَيْسَ لَهُمْ حَاجَةٌ تُرِكُوْا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه كتاب الامارة، باب ارواح الشهداء، الحديث رقم (۱۲۱ - ۱۸۸۷) وأخرجه الترمذي في السنن ٥ / ۲۱٥، الحديث رقم ۳۰۱۱، والدارمي في ۲ / ۲۷۱، الحديث رقم ۲٤۱۰

ترجمہ: ''اور حضرت مسروق رحمہ اللہ (تابعی) کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کریمہ کی تفسیر پوچھی۔ یعنی اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والوں کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور انہیں ان کے پروردگار کے پاس رزق دیا جاتا ہے، تو انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کریمہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (ان شہداء) کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہیں۔ ان کے (رہنے) کے لئے عرش الٰہی کے نیچے (گھونسلوں کے مثل) قندیلیں لٹکائی گئی ہیں وہ (روحیں) جنت میں جہاں ان کا جی چاہتا ہے سیر و تفریح کرتی ہیں (اور میوے کھاتی ہیں) پھر ان قندیلوں میں جا کر بسیرا کرتی ہیں، تب پروردگاران (شہداء) کی طرف دیکھ کر فرماتا ہے کہ ''کیا تم کو کسی چیز کی خواہش ہے؟'' وہ عرض کرتے ہیں کہ ''ہم کس چیز کی خواہش کریں ہم جنت میں سے جہاں سے ہمارا جی چاہتا ہے میوے کھاتے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ تین مرتبہ یہی معاملہ فرمائے گا (یعنی تین بار ان سے یہی سوال کرے گا) اور جب وہ دیکھیں گے کہ انہیں پوچھے بغیر چھوڑا نہیں جائے گا۔ (یعنی جب وہ یہ جانتے ہیں کہ پروردگار کی مراد یہ ہے کہ ہم کسی خواہش کا اظہار کریں) تو وہ عرض کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے پروردگار! ہماری بس یہی خواہش ہے کہ تو ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں واپس لوٹا دے (اور ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے) تا کہ ہم ایک بار پھر تیری راہ میں مارے جائیں)''۔ جب اللہ

تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ ان کی کوئی (متعین) خواہش وحاجت نہیں ہے تو ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ ان سے پوچھنا چھوڑ دیتا ہے''۔ (کیونکہ انہوں نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے اس کو پورا کرنا اللہ کے ارادہ اور مصلحت کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کو پہلی ہی بار میں جو عظیم ثواب اور عظیم اجر ملا ہے اور اسی وجہ سے ان کی کوئی حاجت و خواہش نہیں ہے اگر وہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں تو وہی اجر وانعام انہیں دوبارہ بھی عطا کیا جائے گا اور اس کی انہیں حاجت ہی نہیں ہے کیونکہ شہید کا اجر وثواب ایک ہی ہے جو انہیں حاصل ہے)۔ (مسلم)

تشریح: قوله:سألنا عبد الله بن مسعود...... فقال:

''تحسبن'' مخاطب کا صیغہ ہے۔ سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ جبکہ ایک روایت میں غائب کے صیغہ کے ساتھ مذکور ہے لیکن سین کے فتحہ کے ساتھ۔

''قتلوا'': یہ مجرد مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ایک قراءت میں ''قُتِلُوْا'' باب تفعیل سے ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس جملے ''انا قد سألنا عن ذلك'' سے یہ حدیث مرفوع کے درجہ کو پہنچ گئی۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسؤول اور مجیب (جس سے سوال کیا گیا اور جس نے جواب دیا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور قرینہ حال بھی اسی پر دلالت کررہا ہے۔ اس لئے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال واکتشاف ہی کرتا ہے (کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں اپنی طرف سے اظہار نہیں کرتا) اور خاص کر جب کہ ایسی آیت ہو کہ جو متشابہات میں سے ہو اور پھر وہ بھی برزخی زندگی سے متعلق ہو۔ اس لئے کہ وہ تو صرف غیبی علم ہے اور اس کی معرفت وحی کے بغیر کیسے کسی کو ہوسکتی ہے اور اسی قرینہ کی وجہ سے صحابی نے اضمار سے کام لیا باوجودیکہ ماقبل میں ذکر موجود نہیں تھا۔

اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی جلالت شان بھی اس بات کے منافی ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور سے دریافت کیا ہوگا۔ واللہ اعلم

قوله:''أرواحهم في أجواف طير خضر''

یعنی اب ان کی ارواح ان کے اجسام سے نکل گئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سبز پرندوں کی ہیئت پر پرندوں کو وجود بخشا۔ وہ ارواح ان اجسام میں رہتی ہیں اور یہ اجسام گویا کہ شہداء کے اجسام کا بدل ہیں اور اسی بات کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے: ﴿أحياءٌ عند ربهم﴾ (ترجمہ اوپر گزر چکا ہے) یعنی وہ شہداء اس کے ذریعے من چاہی حسی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور اس کی طرف اس آیت کریمہ سے راہنمائی ملتی ہے:

﴿فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ [آل عمران: ۱۷۰]

طیر: ''طائر'' کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق واحد پر ہوتا ہے۔

''خُضرٍ'': خاء کے ضمہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ ہے ''اخضر'' کی جمع ہے۔

''لها'' میں ھاء ضمیر کے دو مرجع ہوسکتے ہیں:

① اس کا مرجع طیر ہے۔
② اس کا مرجع ''اَرواح'' ہوسکتا ہے اور دونوں احتمال صحیح ہیں۔

قوله: فاطلع اليهم ربهم اطلاعةً:

''**فاطلع**'': طاء کی تشدید کے ساتھ ہے یہاں اس سے مراد تجلی فرمانا ہے۔

اطلاعةً'': یہ فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ اس کا یہ اطلاع پانا ہمارے اطلاع پانے کی طرح نہیں ہوگا جیسا کہ ہم اشیاء پر مطلع ہوتے ہیں۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**فاطلع**'' کو ''**على**'' کے بجائے ''**الى**'' کے ساتھ متعدی کیا۔ حالانکہ ''**على**'' کے ساتھ متعدی کرنا چاہئے تھا ''**الى**'' کے ساتھ متعدی کرنا ''انتہاء'' کے معنی کو متضمن ہونے کی وجہ سے ہے۔

''**ففعل ذلك ثلاث مرّات**'': ''**ذلك**'' اشارہ اسی اطاعت کی طرف ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ان کو جھانکنا اور پھر ان سے تین مرتبہ یہ پوچھنا کہ تمہاری کیا خواہش ہے، کیا چاہتے ہو، یہ لطف وکرم اور ان کی فضیلت میں مزید اضافہ سے مجاز ہے۔ (یعنی یہ حقیقت پر محمول نہیں ہے)۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حقیقت پر محمول کرنے سے کوئی چیز بھی مانع نہیں ہے، یہ حقیقت پر ہی محمول ہے خصوصاً جب کہ حقیقت مراد لینے میں کوئی مانع اور صارف بھی موجود نہیں ہے۔

قوله: ''فلما رأوا انهم لن يتركوا......'' من أن يسألو

''**لن يتركوا**'': بصیغہ مجہول ہے۔

''**ان يسألوا**'': یہ معروف کا صیغہ ہے اور ''**من**'' زائدہ ہے۔ اس لئے کہ یہ نفی کے سیاق میں ہے اور جملہ ''**ان يسألوا**'' ''**لن يتركوا**'' کے نائب فاعل سے بدل ہے۔ **أى لن يترك سوالهم**۔

''**نريد ان ترد أروحنا فى آجساد نا**'': یعنی اجسام دنیاوی میں لوٹا دے۔

''**حتى نقتل**'': بصیغہ مجہول ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ان کی کوئی تمنا باقی رہے گی اور نہ کوئی مطلوب باقی رہے گا سوائے اس کے کہ وہ دوبارہ دنیا میں چلے جائیں اور دوبارہ شہید ہوجائیں۔ اس لئے کہ شہادت کی وجہ سے ملنے والی عزت وشرافت کو دیکھ چکے ہوں گے۔

''**فلما رأى** ''**أى علم الله علما تنجيز يا مطابقا لما علم علما غيبياً تعليقيا**۔

''**ان ليس لهم حاجة**'': کہ ان کی کوئی خاص حاجت نہیں ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف سوال کیا۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے کوئی بڑی نعمت نہیں ہے۔ تو اس وقت ان جنتیوں نے اس کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں رؤیت باری تعالیٰ کیلئے مناسب حال کمال استعداد کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے اس طلب دیدار کو پھیر دیا۔ تا کہ جس وقت ان میں اس کی استعداد حاصل ہو اس وقت یہ لوگ اس کا مطالبہ کریں۔

سوال: جنتیوں نے کہا ''**نريد ان ترد ارواحنا في أجسادنا**'' اگر یہ اس لئے تھا کہ ان نعمتوں کو حاصل کریں۔ تو وہ تو حاصل ہو چکی ہیں۔ دوبارہ جانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر کسی اور مقصد کیلئے ہو تو پھر انہوں نے اس خواہش کا اظہار پہلے کیوں نہیں کیا؟

جواب: اس کا یہ ہے کہ ہو سکتا ہے اس کلام سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں کے موجب شکر کا قیام ہو۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث ان کی حالت کی تمثیل ہے کہ ان کو خوشی اور سعادت نصیب ہوگی۔ ان کی مہربانی اور خون کے مشابہ ہیں اور ان کا مختلف قسم کے خواہشات سے لذت حاصل کرنا اور جنت میں رہنا جہاں چاہیں گے اور ان کا اللہ تعالیٰ کے قریب ہونا۔ اور ان کا **ملا الأعلى** میں پہنچنا جو رحمٰن کے عرش کے اردگرد ہے۔ اس چیز کے ساتھ کہ جب وہ سبز پرندوں کے پیٹ میں ہوں گے۔ جنت میں سیر کریں گے جہاں چاہیں گے اور کہ عرش کے ساتھ لٹکی قنادیل میں بسیرا کریں گے اور ان کی اس حالت کی مشابہت تمام لذتوں کے حصول میں اور تمام مطالبات کے حصول میں اس شخص کی حالت کے ساتھ ہوگی۔ جس پر مبالغہ اور تسلسل کے ساتھ اس کا رب اس پر فضل اور مہربانی کریں گے اور اس پر اتنا شفقت کریں گے کہ بندے اس سے اس مطلوب اور مقصود کو مانگے اور یہ کہ وہ بندے اس سے مسلسل یہ مانگے اور اس کا سوال کرے۔ اس طور پر کہ وہ بندے دیکھ لیں گے کہ سوال کے بغیر کوئی چھٹکارہ نہیں ہے۔ سو جب وہ جان لیں گے کہ وہ اس دنیا میں دوبارہ آ کر اللہ تعالیٰ کے راستے ایک دفعہ پھر قتل کئے جائیں اور باقی حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح مسلم میں ہے کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: شہداء کی روحوں کو سبز پرندوں کے قالب میں کیسے ڈالا جائے گا اس میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس میں قیاس آرائی اور عقل کی گنجائش نہیں ہے جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے کہ روح مؤمن یا شہید کے جسم سے نکلنے والی روح قنادیل میں ڈالے۔ یا پرندوں کے قالب دے۔ یا جس قسم کی صورت میں اللہ چاہیں ڈال دیں۔ یہ بات اس کی قدرت سے کوئی مستبعد نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ مسلم کہ روح بھی جسم ہے تو یہ بات محال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے کسی حصہ کو پرندہ کی صورت عطا کر دے۔ یا اس کو عرش رحمٰن کے نیچے موجود قنادیل میں رہنے والے پرندوں کے پوٹوں میں ڈال دیں۔

روح کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔

بہت سے اصحاب معانی اور علمائے باطن اور متکلمین کا کہنا ہے کہ روح ایسی چیز ہے جس کی حقیقت کا ادراک کسی کو نہیں ہے اور نہ اس کا وصف بیان کرنا صحیح ہے۔ یہ ان اشیاء میں سے ہے کہ جن کے متعلق بندوں کو کچھ علم نہیں ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: ﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّي ﴾ [الاسراء: ۸۵] ''کہہ دیجئے اے پیغمبر! کہ روح میرے پروردگار کا حکم ہے''۔

ہمارے اکثر شیوخ کا کہنا ہے۔**ھو الحیاۃ** یعنی روح زندگی کا نام ہے۔
اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ روح ایک لطیف جسم ہے جو مادی جسم کے ساتھ خلط ملط ہوتا ہے۔جسم کی کی زندگی اسی کے ذریعہ سے ہے اور تعالیٰ کی یہ عادت جاری ہے کہ جب روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو جسم پر موت طاری ہو جاتی ہے
اس حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث کا تعلق لوگوں نے تناسخ (آوا گون) اور انتقال روح کے عقیدہ کے ساتھ جوڑا ہے۔کہ ان کو اچھی اشکال اور جسموں میں ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے اور قبیح شکل میں جنم بوئی دراصل اس کو عذاب دینا مقصود ہے اور انہوں نے خیال کیا ہے کہ یہی ثواب اور سزا ہے۔حالانکہ یہ عقیدہ بالکل باطل اور مردود ہے۔جتنے ادیان سابقہ ہیں یہ عقیدہ ان میں کسی کے مطابق نہیں ہے کہ تمام ادیان میں حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا عقیدہ موجود ہے۔
ایک اور حدیث میں ہے:"**حتی یرجعه اللّٰہ الٰی جسده یوم بعثة الأجساد**"۔
یہاں تک کہ اللہ ان کو ان کے جسم کی طرف لوٹائیں گے جس دن تمام اجساد و اجسام کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔
ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ جن لوگوں نے آوا گون کا عقیدہ ثابت کیا ہے۔وہ اس حدیث کے بھی مخالف ہے۔جیسا کہ وہ اس آیت کریمہ کے مخالف ہے:﴿ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ﴾ [الفجر: ۲۹] "میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ"۔
اور شرح عقائد کے بعض حواشی میں یہ بات مذکور ہے کہ تناسخ اور آوا گون کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ روحیں اسی عالم دنیا میں مختلف قالبوں میں لوٹائی جائیں گے۔چونکہ کہ یہ عقیدہ رکھنے والے آخرت، جنت اور دوزخ کے منکر ہیں۔اس لیے اس سبب سے وہ کافر ہیں۔اھ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت مخلوق ہے اور موجود بھی ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے اور یہ وہی جنت ہے جس سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا تھا اور آخرت میں مؤمن اسی میں عیش و عشرت کریں گے اور اس حدیث سے معلوم ہوا مردوں کو ثواب اور سزا دینا ثابت ہے۔قیامت سے پہلے اور یہ کہ روحیں باقی رہیں گی ان پر کبھی فنا نہیں آئے گی۔نیکوکار تو نعمتوں کے مزے لوٹیں گے اور بدکار عذاب کا مزا چکھیں گے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے اور اسی کے متعلق قرآن مجید کی آیات و آثار ہیں۔بخلاف فرقہ مبتدعۃ کے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:﴿اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾[غافر۔٤٦] "کہ وہ آگ ہے کہ جس پر (کفار) کو صبح و شام پیش کیا جائے گا اور جس دن قیامت قائم ہوگی کہا جائے گا فرعون والوں کو سخت اور شدید عذاب میں داخل کرو۔"
تخریج:اس حدیث کو اسی طرح ترمذی،نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

۳۸۰۵:وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :قَامَ فِیْهِمْ فَذَكَرَ لَهُمْ اَنَّ الْجِهَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْاِیْمَانَ بِاللّٰهِ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !اَرَاَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ

سَبِيْلِ يُكَفَّرُ عَنِّي خَطَايَایَ؟ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :نَعَمْ وَاِنْ قُتِلْتَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَيْفَ قُلْتَ فَقَالَ اَرَاَيْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَيُكَفِّرُعَنِّي خَطَايَایَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :نَعَمْ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ اِلَّا الدَّيْنَ فَاِنَّ جِبْرِيْلَ قَالَ لِيْ ذٰلِكَ .

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه كتاب الامارة' باب من قتل في سبيل الله' ۳ / ۱۵۰۱' الحديث رقم (۱۱۷ ـ ۱۸۸۵) والترمذي في السنن ٤ / ۱۸٤' الحديث رقم ۱۷۱۲' والنسائي في ٦ / ۳٤' الحديث رقم ۳۱۵٦' و مالك في الموطا ۲ / ٤٦۱' الحديث رقم ۳۱ من كتاب الجهاد' وأحمد في المسند ٥ / ۳۰٤

ترجمہ:''اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے انہیں وعظ ونصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا بہترین اعمال میں سے ہے''۔(یہ سن کر) ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا کہ''یا رسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں تو کیا میرے گناہ بخش دیئے جائیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ہاں بشرطیکہ تم اللہ کی راہ میں اس حال میں قتل کئے جاؤ کہ تم (سختیوں) پر صبر کرنے والے ہو' ثواب کے طالب ہو آگے بڑھنے والے ہو اور (بزدلی کے باعث) پیچھے ہٹنے والے نہ ہو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ''تم نے کیا کہا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ''مجھے یہ بتائیں کہ اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں تو کیا میرے گناہ بخش دیئے جائیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''ہاں! بشرطیکہ تم صبر کرنے والے ہو' ثواب کے طالب ہو (دشمن کے مقابلے میں) آگے بڑھنے والے ہو اور (بزدلی کے باعث) پیچھے ہٹنے والے نہ ہو۔ مگر دین (یعنی وہ قرض معاف نہیں ہوگا جس کی ادائیگی کی نیت ہی نہ ہو) اور مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے یہی فرمایا ہے''۔(مسلم)

تشریح: **قوله:''فذكر لهم ان الجهاد في سبيل الله والايمان بالله أفضل الأعمال''**:

یہاں پر واؤ مطلق جمع کیلئے ہے اور شاید اس میں اشارہ ہو کہ جہاد مع ایمان تمام اعمال قلبی وبدنی سے افضل ہے

اشکال: دوسری احادیث میں تو نماز کو''افضل الاعمال'' کہا گیا ہے۔

جواب: دونوں کی حیثیتیں مختلف ہیں۔نماز اس لئے افضل ہے کہ اس پر مداومت ہے۔یعنی نماز ہمیشہ اور ہر حالت میں پڑھنی ہے اور جہاد اس وجہ سے افضل الاعمال ہے کہ اس میں مشقت ہے اور اس وجہ سے بھی کہ جہاد نماز کو مستلزم ہے۔اگر جہاد میں نماز ہی نہ ہو تو اس کی کوئی فضیلت ہی نہیں ہے۔

قوله :أرأيت ان قتلت في سبيل الله يكفر عني خطا ياي۔

''یکفر'': مذکر مجہول کا صیغہ ہے اور تانیث کے ساتھ بھی جائز ہے اور ایک نسخہ میں مذکر معروف کا صیغہ ہے۔بہرکیف ان تمام صورتوں میں استفہام مقدر ہے۔

قوله:''نعم ان قتلت فی سبیل اللّٰه وانت صابر محتسب مقبل غیر مدبر'':

''صابر'' سے مراد یہ ہے کہ جزع فزع نہ کی جائے۔

''محتسب'': سے مراد یہ ہے کہ اجروثواب کی طلب ہو۔ ریاء کاری اور شہرت کیلئے نہ ہو۔

''غیر مدبر'': یہ'' مقبل'' کی تاکید ہے کہ دشمن سے سینہ تان کرلڑے پیٹھ پھیر کر نہ بھاگے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''غیر مدبر'' احتراز ہے اس شخص سے جو کہ کسی وقت آگے بڑھ کرلڑے اور کسی وقت پیٹھ پھیر جائے اور محتسب سے مراد یہ ہے کہ کا یہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو۔ اگر وہ عصبیت (قومی یا لسانی) کیلئے لڑے یا غنیمت کے حصول کیلئے جہاد کرے یا اس قسم کا کوئی اور منفعت دنیاوی مقصود ہو تو اس کو اس جہاد کا کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

قوله:''ثم قال رسول اللّٰه ﷺ کیف قلت؟ فقال أرایت''ان قتلت فی سبیل اللّٰه''......:

①أی قلت أریت② کیف قلت ، أعد الوقل والسؤال ۔ فقال: أرا أیت۔

ایکفر'': یہاں پر ہمزہ استفہام کے ساتھ ہے

''**وانت صابر**'': یہ جملہ حالیہ ہے۔ **أی نعم ان قتلت والحال أنك صابر**۔ آپ ﷺ نے اس کو جواب دیا کہ ہاں کیوں نہیں۔ آپ کے گناہ معاف ہوجائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ صابر ہوں۔ صبر کرنے والے ہوں اور ثواب کی امید۔

''**الا الدین**'' یہ استثناء منقطع ہے۔ لیکن متصل بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی وہ دین جس کی ادائیگی کی نیت ہی نہ کی گئی ہو۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''دین'' سے مراد وہ ''دین'' ہے کہ جس کا تعلق حقوق العباد میں سے ہو۔ اس لئے کہ دائن، جانی، غاصب، خائن اور سارق سے زیادہ احق بالوعید نہیں ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تنبیہ ہے کہ بندوں کے تمام حقوق کا خیال رکھا جائے اور اس بات پر بھی کہ جہاد، شہادت اور اس جیسے اور نیک اعمال حقوق العباد کو معاف نہیں کرا سکیں گے۔ اس سے صرف حقوق اللہ کی معافی ہوگی۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی بات ہے۔ لیکن سمندر میں شہید ہونے والا اس سے بھی مستثنیٰ ہے اس لئے کہ اس کے تمام گناہوں کی بخشش ہوجاتی ہے حتیٰ کہ ''دین'' کی بھی جیسا کہ حدیث میں وارد ہے اور حدیث میں یہ بھی وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ سمندر کے شہداء کے روحوں کو خود قبض کریں گے۔ یہ معاملہ ملک الموت کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ **فان جبریل قال لی ذلك:**

''**ذلك**'' سے اشارہ ''**الا الدین**'' کی طرف ہے۔

سوال: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے اس صحابی رضی اللہ عنہ سے دوبارہ پوچھا ''**کیف قلت**'' حالانکہ آپ ﷺ کو اس کا سوال معلوم ہوگیا تھا اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کا جواب بھی رحمت فرما چکے تھے؟

جواب: اس کا یہ ہے کہ تاکہ سائل سے دوبارہ پوچھ کر اس کو یہ جواب دیا جائے اور اس کے ساتھ **الاَّ الدین** کو متعلق کیا جاسکے استدراکاً کہ جبرائیل علیہ السلام نے ابھی اس کی خبر دی ہے۔ اس لئے کہ یہ تو جبرئیل کے بتلانے کے بعد کہا۔

مجاہد کے قرضہ کا بیان

۳۸۰۶: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ الْقَتْلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُكَفِّرُ كُلَّ شَیْءٍ اِلاَّ الدَّيْنَ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه كتاب الامارة' باب من قتل فی سبيل الله كفرت خطاياه' إلا الدّين' ۳ / ۱۵۰۲' الحديث رقم (۱۲۰ ۔ ۱۸۸۶)

ترجمه: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی راہ (یعنی جہاد میں) قتل کیا جانا' قرض کے علاوہ ہر چیز کا کفارہ ہے''۔ (مسلم)

تشریح: ''قوله: القتل فی سبیل الله یکفر کل شئ'':

''القتل '' یہ مصدر بمعنی مفعول ہے اور ''تکفیر'' کا یہاں مطلب یہ کہ یہ شہادت مقتول کے تمام گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتی ہے اور اس کی وجہ سے شہید کی تمام خطائیں معاف ہو جاتی ہیں اور جامع صغیر میں ''کل شی ء'' کی جگہ ''کل خطیئة'' کا لفظ آیا ہے۔

''الاَّ الدين'': اور حقوق العباد بھی دین کے زمرے میں آتے ہیں۔

توضیح وتخریج: اس حدیث کو ترمذیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور طبرانی اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اور ان کے الفاظ یہ ہیں ''القتل فی سبيل اللهِ يكفر الذنوب كلها الا الأمانة'' کہ شہادت فی سبیل اللہ تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے مگر امانت کو نہیں معاف کرتی'' اور امانت سے مراد امانت صلوة، امانت صوم امانت حدیث ہو سکتے ہیں اور سب امانتوں سے سخت امانت ''ودائع'' ہیں۔ چنانچہ دَین سے مراد دین کے واجبات شرعیہ ہیں۔ چاہے ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے ہو)۔

اللہ تعالیٰ ہنستا ہے

۳۸۰۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ يَضْحَكُ اللّٰهُ تَعَالٰى رَجُلَيْنِ : يَقْتُلُ اَحَدُهُمَا الْاٰخَرَ يَدْخُلَانِ الْجَنَّةَ' يُقَاتِلُ هٰذَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلُ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَى الْقَاتِلِ فَيُسْتَشْهَدُ . (متفق عليه)

اخرجه مسلم فی صحيحه كتاب الجهاد' باب الكافر يقتل الصحيح ٦ / ٣٩' الحديث رقم ٢٨٢٦' و مسلم فی ٣ / ١٥٠٤' الحديث رقم (١٢٨ ۔ ٣١٦٦) والنسائی فی السنن ٦ / ٣٨' الحديث رقم ٣١٦٦' و مالك فی الموطا ٢ / ٤٦٠' الحديث رقم ٢٨' من كتاب الجهاد' وأحمد فی المسند ٢ / ٤٦٤

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ان دو شخصوں کی جانب (دیکھ کر) مسکراتا ہے (یعنی ان سے راضی ہو جاتا ہے اور اپنی رحمت کے ساتھ ان پر متوجہ ہوتا

ہے) ان میں سے ایک شخص دوسرے کو قتل کر دیتا ہے اور وہ دونوں (یعنی قاتل اور مقتول) جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص راہِ الٰہی میں جہاد کرتا ہے اور اس کو قتل کر دیا جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ قاتل کی توبہ کو قبول فرماتا ہے (اور وہ اسلام قبول کر لیتا ہے) اس کو بھی شہید کر دیا جاتا ہے۔ (لہٰذا خاتمہ بالایمان سعادت شہادت کے باعث) اس کو بھی جنت میں داخل کیا جاتا ہے)۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: يضحك الله تعالى الى رجلين: أي يرضى مقبلا:** امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ضحک'' کو ''الی'' کے ساتھ متعدی کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ انبساط و اقبال کے معنی کو متضمن ہے اور یہ اس قول سے ماخوذ ہے: ''ضحكت الى فلان'' یہ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی کسی کی طرف کشادہ روئی کے ساتھ متوجہ ہو اور اس شخص سے راضی ہو۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''ضحک'' سے اس کے ملائکہ کا ضحک مراد ہے۔ مطلب یہ کہ وہ فرشتے جو انسان کی روح قبض کرتے ہیں وہ بندے کی روح خندہ پیشانی کے ساتھ قبض کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''قتل السلطان فلانًا''۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بادشاہ کسی کے قتل کا حکم دے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ ''ضَحك'' صفات متشابہات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ تشبیہ سے منزہ ہے اور اس کا علم اسی کے سپرد ہے۔

قوله: يقتل احهما الا خر ......:

يقاتل هذا فى سبيل الله : جملہ مستانفہ مبینہ ہے۔

سچے دِل سے شہادت مانگنے کا بیان

۳۸۰۸: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَاِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه كتاب الامارة، باب استحباب طلب الشهادة، ۳ / ۱۵۱۷، الحديث رقم (۱۵۷ - ۱۹۰۹) و أبو داود فى السنن ۲/۱۷۹، الحديث رقم ۱۵۲۰، والترمذى فى ٤ / ۱۵۷، الحديث رقم ۱٦۵۳، والنسائى فى ٦ / ۳۷، الحديث رقم ۳۱٦۲، وابن ماجه فى ۲ / ۹۳۵، الحديث رقم ۲۷۹۷، والدارمى فى ۲ / ۲۷۰، الحديث رقم ۲٤۰۷

ترجمہ: ''اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص صدق دل (یعنی طلب صادق کے جذبے سے) اللہ تعالیٰ سے شہادت کا سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کے درجہ پر پہنچاتا ہے اگرچہ وہ اپنے بستر پر مرے (یعنی وہ صدق نیت اور طلب صادق کی وجہ سے شہیدوں جیسا رتبہ پاتا ہے)۔'' (مسلم)

تشریح: ''**بلغه**'' لام کے تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی باب تفعیل سے ہے۔ **قوله: من سأل الله الشهادة...... وان مات على فراشه:**

''**فراش**'' فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہے: **ولو مات غير شهيد۔**

شہید کا مقام

۳۸۰۹ :وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ الرُّبَيِّعَ بِنْتَ الْبَرَاءِ وَهِيَ اُمُّ حَارِثَةَ بْنِ سُرَاقَةَ اَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَقَالَتْ :يَا نَبِيَّ اللّٰهِ !اَلَا تُحَدِّثُنِي عَنْ حَارِثَةَ' وَكَانَ قُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ' اَصَابَهُ سَهْمٌ غَرْبٌ' فَاِنْ كَانَ فِي الْجَنَّةِ صَبَرْتُ' وَاِنْ كَانَ غَيْرَذٰلِكَ اِجْتَهَدْتُ عَلَيْهِ فِي الْبُكَاءِ. فَقَالَ :يَا اُمَّ حَارِثَةَ' اِنَّها جِنَانٌ فِي الْجَنَّةِ' وَاِنَّ ابْنَكِ اَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْاَ عْلٰى ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه کتاب الجهاد' باب من اتاه سهم غرب' ٦ / ٢٥' الحدیث رقم ٢٨٠٩' والترمذی فی السنن ٥ / ٣٠٦' الحدیث رقم ٣١٧٤' وأحمد فی المسند ٣ / ١٢٤

ترجمہ:''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (میری پھوپھی) حضرت ربیع بنت براء رضی اللہ عنہا جو حضرت حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کرنے لگیں کہ (رسول اللہ! کیا آپ مجھ سے میرے بیٹے حارثہ کے متعلق بیان نہیں کریں گے؟ (یعنی اللہ جل شانہ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟) اور وہ بدر کے دن (یعنی جنگ بدر میں) شہید کر دیئے گئے تھے اور ان کو نامعلوم تیر لگا تھا (جس کا چلانے والا معلوم نہ ہوا کہ کون تھا) اگر وہ جنت میں ہے تو میں صبر کروں گی اور اگر وہ کسی اور جگہ ہے تو میں رونے کی کوشش کروں گی (یعنی خوب روؤں گی جیسا کہ عورتوں کی عادت ہے)'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''اے امّ حارثہ! حقیقت یہ ہے کہ جنت میں بہت سے باغ ہیں اور تمہارا بیٹا فردوس اعلیٰ میں ہے (جو جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے)''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

حارثہ بن سراقہ ۔ یہ حارثہ' سراقہ انصاری کے بیٹے ہیں اور ربیع ان کی والدہ ہیں اور وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی پھوپھی ہیں۔ غزوۂ بدر میں شہید ہوئے اور یہ پہلے شخص ہیں جو انصار میں سے اس دن شہید ہوئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ان کی والدہ کا نام ''ربیع'' ہے اور وہ نام جو اسماء صحابہ میں ذکر کیا جاتا ہے وہ ''ربیع'' راء کے پیش بائے موحدہ کے فتحہ اور یائے تحتانی کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ مستعمل ہے۔

تشریح: ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ربیع بنت براء صحابیہ ہیں' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی پھوپھی ہیں اور ''براء'' سے مراد مشہور صحابی رسول ﷺ براء بن عازب رضی اللہ عنہ ہیں باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں۔ ربیع حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں اھ۔

عرض مرتب:

اس نام کی صحابیہ کا ذکر کتب اسماء الرجال میں موجود نہیں ہے۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی پھوپھی کا نام ربیع بنت نضر ہے' حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی والدہ بھی یہی ہیں اھ۔

قوله:ان الربيع بنت البراء۔۔۔ اصابه سهم غرب:

سهم غرب: کومرکب اضافی اور مرکب توصیفی بنا کر پڑھنا دونوں طرح درست ہے۔''غرب'' راء کے سکون کے ساتھ بھی ٹھیک ہے اور راء کے فتحہ کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ تیر جس کا چلانے والا معلوم نہ ہو اور بعض کا قول ہے کہ یہ معنی راء کے سکون کے ساتھ ہے اور فتحہ کے ساتھ یہ معنی ہوگا کہ جب وہ تیر مارا جائے، لیکن کسی اور کو لگ جائے۔ یہی بات ''النہایہ'' میں نقل ہے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ جب ان کو صفت موصوف بنا کر پڑھا جائے گا تو مطلب ہوگا وہ تیر جس کا چلانے والا معلوم نہ ہو اور اضافت کے ساتھ معنی یہ ہوگا کہ وہ تیر جو''غرب'' کے درخت سے بنایا گیا ہو۔

قوله:''فان کان فی الجنة......:

''**صبرت**'': میں رونے سے رک جاؤں اس نعمت کا شکر بجالانے کیلئے جو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔''**وان کان غیر ذلك**'' لفظ''**غیر**'' رفع کے ساتھ ہے۔لیکن بعض نسخوں میں نصب کے ساتھ ہے۔ یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ بعض نے''**کان**'' کو تامہ مانا ہے اس لئے وہ''**غیر**'' کو منصوب پڑھتے ہیں اور بعض نے''**کان**'' کو ناقصہ شمار کیا ہے۔اس لئے ''**غیر**'' کو مرفوع پڑھا ہے۔

''**انها**'' امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ ضمیر مبہم ہے اور اس کی خبر اس کی تفسیر کر رہی ہے۔جیسا کہ عرب کا یہ قول ہے:''**هی العرب تقول ماشاء ت**''۔یا ضمیر قصہ ہے اور مابعد جملہ اس کی خبر ہے۔

''**جنانٌ**'' : یہ تنوین تعظیم کیلئے ہے اور اس سے مراد جنت کے مختلف درجات ہیں۔جیسا کہ حدیث میں وارد ہے:''**انّ فی الجنة مائة درجة مابین کل درجتین کما بین السمآء والأرض والفردوس أعلاها**''۔حدیث باب کے اگلے جملہ:''**وانَّ ابنك اصاب الفردوس الأعلٰی**'' کا مطلب بھی یہی ہے۔

جنت کے طول وعرض کا بیان

۳۸۱۰:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ : اِنْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : وَاَصْحَابُهٗ حَتّٰى سَبَقُوْا الْمُشْرِكِيْنَ اِلٰى بَدْرٍ وَجَاءَ الْمُشْرِكُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قُوْمُوْا اِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ قَالَ عُمَيْرُبْنُ الْحُمَامِ بَخٍ بَخٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :مَا يَحْمِلُكَ عَلٰى قَوْلِكَ بَخٍ بَخٍ؟ قَالَ :لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا رَجَاءَ اَنْ اَكُوْنَ مِنْ اَهْلِهَا قَالَ :فَاِنَّكَ مِنْ اَهْلِهَا قَالَ فَاَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرَنِهٖ فَجَعَلَ يَاكُلُ مِنْهُنَّ ثُمَّ قَالَ لَئِنْ اَنَا حَيِيْتُ حَتّٰى اٰكُلَ تَمَرَاتِيْ اِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيْلَةٌ قَالَ فَرَمٰى بِمَا كَانَ مَعَهٗ مِنَ التَّمْرِ ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتّٰى قُتِلَ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه کتاب الامارة' باب ثبوت الجنة للشهید' ۳ . ۱۵۰۹' الحدیث رقم (۱۴۵ - ۱۹۰۱)

وأحمد فی المسند ۳ / ۱۳۷

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں (غزوہ بدر کے موقع پر) رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم (مدینہ سے) روانہ ہوئے اور یہاں تک کہ وہ مشرکین پہلے بدر (کے میدان جنگ) میں پہنچ گئے پھر (جب اسلامی مجاہدین کے پہنچنے کے بعد) مشرکین کا لشکر بھی پہنچ گیا اور (مقابلہ کی تیاری شروع ہوئی) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اس جنت کے راستے پر کھڑے ہو جاؤ' جس کا عرض زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہے' (ایک صحابی) حضرت عمیر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے (یہ ارشاد سن کر) کہا کہ ''بہت خوب! بہت خوب!'' رسول اللہؐ دریافت فرمایا! تمہیں بہت خوب بہت خوب کہنے پر کس چیز نے ابھارا؟ عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''یا رسول اللہ! اللہ کی قسم میں نے یہ الفاظ (اظہار تعجب یا کسی اور مطلب سے نہیں کہے بلکہ میں نے درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ اپنی) اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ میں بھی جنتی بنوں''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس میں کوئی شک نہیں تم جنتی ہو''۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ نے (سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ بشارت سن کر) اپنے ترکش سے کچھ کھجوریں نکالیں اور ان کو کھانا شروع کیا اور پھر کہنے لگے کہ اگر میں ان (ساری کھجوروں کو کھانے تک زندہ رہا تو زندگی طویل ہوگی' چنانچہ انہوں نے ان کھجوروں کو جو ان کے پاس تھیں پھینک دیا اور کفار سے لڑنے لگے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: انطلق رسول الله ﷺ ---عرضها السماوات والارض۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''بدر'' آب گاہ کا نام ہے۔ اس کو مذکر و مؤنث دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''بدر کا کنواں'' ایک آدمی کا تھا جس کو ''بدر'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے ''یوم بدر'' ہے۔

''**فقال رسول الله ﷺ: قوموا الى جنةٍ**'': یعنی اس عمل کیلئے اٹھو جو جنت میں دخول کا سبب بنے۔ یا اس سے مراد مبالغہ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: ''**الجنة تحت ظلال السيوف**'' اس کو حاکم نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

''**عرضها السموات والأرض**'' یہ تشبیہ بلیغ ہے۔ یعنی اس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کی طرح ہے۔ جیسا کہ ایک اور آیت میں یہی مضمون آیا ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''قوموا'' کو ''الی'' کے ساتھ متعدی کیا۔ ''مسارعۃ'' (جلدی) کے معنی مراد ہیں۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس قول میں بھی آیا ہے: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ﴾ [آل عمران: ۱۳۳]

''اور دوڑو مغفرت کی طرف جو تمہارے پروردگار کی جانب سے ہو اور جنت کی طرف''۔

اور جنت کا وصف ''عرض'' کے ساتھ بیان کرنا بطور مبالغہ کے ہے اور ''عرض'' کو ذکر کیا طول کو ذکر نہیں کیا تا کہ اس بات پر دلالت ہو جائے جب اس جنت کا عرض اتنا ہے کہ تو اس کے طول کا کیا حال ہوگا۔ (کیونکہ ہر چیز کی لمبائی اس کی چوڑائی سے زیادہ ہوا کرتی ہے)

''قال عمیر بن الحمام:'''' عمیر'' تصغیر کے ساتھ ہے۔'' الحمام'' حاء کے ضمہ اور میم کے تخفیف کے ساتھ ہے۔ ان کے والد کا نام ابن اجدع الانصاری تھا جو قبیلہ بنی سلمہ سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے شہید انصاری یہی تھے ان کو خالد بن اعلم نے قتل کیا تھا۔

''بخ بخ'': یہ کلمہ باء کے فتحہ اور خاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں دونوں کلموں کو تنوین کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور یہ کلمہ مدح اور خوشی کے موقع پر بولا جاتا ہے اور مبالغہ کیلئے اس کو مکرر لایا جاتا ہے۔ یہ مبنی ہے۔ اگر ملا کر پڑھا جائے تو جر اور تنوین کے ساتھ پڑھا جائے گا یعنی ''بخٍ بخٍ'' اور بعض دفعہ اس کو شد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ جبکہ اصحاب حدیث اس کو وصل اور وقف دونوں صورتوں میں سکون کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ بعض حضرات نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

''قاموس'' میں ہے کہ ''بخ'' کا مطلب ہے عظم الأمر عظیم الشان معاملہ ہے۔ یہ کلمہ بغیر تکرار کے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کلمہ کو مکرر کیا جائے تو اس صورت میں اوّل کو تنوین کے ساتھ اور دوسرے کو سکون کے ساتھ پڑھیں گے یہ کلمہ رضاء ورغبت مدح وفخر کے موقع پر کہا جاتا ہے۔ دونوں کلموں کو سکون کے ساتھ بھی پڑھتے ہیں۔ تنوین کے ساتھ اور دونوں کو شد کے ساتھ بھی پڑھتے ہیں۔ **قوله: قال: لا والله ...... فانك من أهلها:**

''لا والله یا رسول الله'' بعض کا قول ہے کہ عمیرؓ نے سمجھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ گمان کیا کہ شاید یہ کلمہ عمیر کے منہ سے بغیر نیت وارادہ کے نکلا ہے اور اس شخص کے مشابہ سمجھا کہ جو مزاح سے یوں کہتا ہو۔ اس وجہ سے انہوں نے یکدم اپنے آپ سے اس کی نفی کر دی۔

''ما قلت ذالك الا رجآء ان اكون من اهلها'' ''رجآء'' تنوین کے بغیر ہے جب کہ ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ''رجاء'' کے ساتھ تاء بھی ہے۔ لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: ''الا'' رجآء ۃ'' اکثر معتمد نسخوں میں مد اور تاء کے ساتھ منقول ہے اور بعض میں ''رجآء'' بغیر تنوین کے نقل ہے اور بعض نسخوں میں تنوین کے ساتھ ہے لیکن آخر میں تاء نہیں ہے۔ یہ تمام نسخے صحیح ومعروف ہیں۔

''أن أكون من أهلها'': کلام مقدر سے استثناء ہے۔ بعض نے اس توجیہہ کو اولیٰ قرار دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب یہ فرمایا: **قوموا الى الجنة......** ''تو حضرت عمیرؓ نے اس معاملہ کی تفخیم وتعظیم کی خاطر ''بخ بخ'' کے الفاظ ارشاد فرمائے، چنانچہ حضور ﷺ کے اگلے جملہ کا مطلب یہ ہوا: ''**ما حملك على هذا التعظيم اخوفا قلت هذا ام رجآءً ؟ فقال: لابل رجاء أن اكون من أهلها۔**

''**فانك من أهلها**'': اس میں دو احتمال ہیں:

① یہ دعا ہے آپ ﷺ نے اس صحابیؓ کو دعا دی۔

② یہ خبر ہے کہ آپ اہل جنت میں سے ہیں۔

قوله: ''فأخرج تمرات من قرنه فجعل''

''**تمرات**'': تاء، میم اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں ''**تميرات**'' تصغیر کے ساتھ منقول ہے۔ اس سے

اس کی قلت کا اظہار ہے۔

''قرنه'' قاف اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

''جعل'' یہاں افعال شروع میں سے ہے۔

''لئن أنا حييت ''۔''حييت'' حاء کے فتحہ اور یاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔''لئن'' میں لام قسم کیلئے ہے۔''ان'' شرطیہ ہے اور''أنا''فعل مضمر کا فاعل ہے جس کی وضاحت بعد والا فعل کر رہا ہے۔

''انها لحياة طويلة'': یہ جواب قسم ہے اور جواب شرط کی جگہ اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

''فرمى بما كان معه'' یہ باء زائدہ ہے اور تعدیہ کی تقویت کیلئے ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں اصحاب معانی کے نزدیک یہاں لئن أنا حييت میں ضمیر منفصل کو اختصاص کے لئے مقدم کیا ہے اس ارشاد باری تعالیٰ کے طرز پر: ﴿ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ ﴾[الاسراء: ۱۰۰] گویا کہ انہوں نے اپنے جی میں یہ محسوس کیا کہ وہ زندگی کو موت پر ترجیح دے رہا ہے، تو انہوں نے اس کا انکار کیا اور''قوموا الى الجنة'' کے بلاوے کے جواب میں کہی۔

شہید کی قسمیں

۳۸۱۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تَعُدُّوْنَ الشَّهِيْدَ فِيْكُمْ ؟ قَالُوْ :يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ قَالَ :اِنَّ شُهَدَاءَ اُمَّتِیْ اِذًا لَقَلِيْلٌ مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ مَاتَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِی الطَّاعُوْنِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِی الْبَطْنِ فَهُوَ شَهِيْدٌ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۳ / ۱۵۲۱، كتاب الامارة، باب بيان الشهداء، الحديث رقم (۱۶۵ ـ ۱۹۱۵)

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ رضی اللہ عنہم) سے پوچھا کہ تم اپنے آپ میں سے کس کو شہید شمار کرتے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! جو شخص اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس صورت میں میری امت کے شہید کم ہوں گے' جو شخص اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے وہ تو (حقیقی شہید ہے) لیکن جو شخص اللہ کی راہ (یعنی جہاد میں بغیر قتل وقتال کے خود اپنی موت سے) فوت ہو جائے وہ بھی شہید ہے' جو شخص طاعون کے مرض مین مرے وہ بھی شہید ہے اور جو شخص پیٹ کی بیماری (یعنی استسقاء اور اسہال وغیرہ) میں مرے وہ بھی شہید ہے (یعنی یہ سب بھی حقیقی شہداء کے درجات وثواب میں ہیں)۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: ماتعددون الشهيد فيكم:

''تعدون'': دال کے تشدید کے ساتھ ہے۔

''الشهيد فيكم'' بعض کا قول ہے کہ معنوی اور عملی دونوں لحاظ سے عد''ظن'' کے ساتھ ملحق ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن

الملک بھی اس کے قائل ہیں۔لہٰذا شہید "تعدون" کا مفعول اول اور "ما" استفہامیہ اس کا مفعول ثانی ہے اور وصف کے بارے میں سوال ہے کہ تمہارے خیال میں کون سی صفت کی بناء پر مرتبہ شہادت کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تورپشتی ﷫ فرماتے ہیں کہ "ما" استفہامیہ ہے۔"ما" کے ذریعہ کسی چیز کی جنس اور نوع نیز کسی جنس اور نوع کی صفات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور بسا اوقات "ما" استفہامیہ کے ذریعے اشخاص ناطقہ (ذوی القعول) کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ یہاں پر مقصود مؤمن کی اس حالت کے بارے میں پوچھنا ہے جس کی وجہ سے مؤمن مرتبہ شہادت پر فائز ہوتا ہے۔

کلمہ "ما" کے ساتھ سوال کیا تاکہ اس کے وصف اور معنی مراد پر مکمل دلالت ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ "من" کا قائم مقام بھی ہے۔"**من قتل فی سبیل اللّٰہ فھو شھید**"۔

علامہ طیبی ﷫ کا قول ہے کہ "ما" کے ذریعے یہاں اس شخص کے وصف کے بارے میں سوال ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب اور عزت حاصل ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿**والشھداء عند ربھم**﴾ [الحدید۔۷۹] ترجمہ: "اور شہید ہیں اپنے رب کی نزدیک" آپ ﷺ کا سوال اس صورت کو بھی شامل تھا جو آپؐ نے بطور جواب کے ارشاد فرمائی۔ صحابہ کا جواب آپ علیہ السلام کے سوال کے مطابق نہ تھا اس لئے آپ ﷺ نے ان کے جواب کو رد کرتے ہوئے فرمایا: "**انّ شھداء أمتی اذًا لقلیل**"۔ اگر ایسا ہو تو میری امت کے شہداء کی تعداد بہت کم ہو گی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے گمان کے مطابق یہی کہنا کافی تھا کہ "**من قتل فی سبیل اللّٰہ فھو شھید**" لیکن اطناب سے کام لیا اور خبر پر "فاء" داخل کی تاکہ دلالت کرے کہ موصول کا صلہ خبر کی علت ہے۔ تو انہوں نے ایک عام حکم کو خاص کر دیا زیادہ واضح بات یہ ہے کہ سوال عام تھا شہداء کی تمام اصناف کو شامل تھا۔ حقیقی ہو و حکمی شہداء دونوں کو شامل تھا اور اسی عموم کی طرف "**تعدون**" سے بھی اشارہ ملتا ہے۔ جب انہوں نے شہادت کو صرف حقیقی کے ساتھ محصور کر دیا تو آپ ﷺ نے اگلا جملہ ارشاد فرمایا: قولہ: "**انّ شھداء امتی اذًا لقلیل** "**من قتل فی سبیل اللّٰہ فھو شھید**"۔

ایسی حقیقت ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ (لیکن صرف اسی میں محصور نہیں ہے۔ بلکہ شہداء اور بھی ہیں)۔ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا: "**ومن مات فی سبیل اللّٰہ فھو شھید**"۔ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں مرجائے وہ بھی شہید ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ یہ شہید حکمی ہوگا حقیقی نہیں ہوگا۔ اس آیت کریمہ کی بناء پر: ﴿وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ﴾

"اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اسکو موت آ پکڑے تب بھی اسکا ثواب ثابت ہوگیا اللہ کے ذمہ" اور اسی طرح حدیث شریف ہے: "**انما الأعمال بالنیات**" اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ایک حدیث میں ہے: **نیة المؤمن خیر من عمله**۔ مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ اس مضمون کی ایک اور حدیث اس سے پہلے گزر چکی ہے:

"**من سأل اللّٰہ الشھادة بصدق بلغه اللّٰہ منازل الشھداء وان مات علٰی فراشه**"۔

قوله: "**ومن مات فی الطاعون فھو شھید**":

جو طاعون کی وجہ سے مر جائے وہ بھی شہید ہے۔ حدیث میں ہے کہ طاعون سے مرنے والا جنات کا مقتول ہوتا ہے۔

قوله: "ومن مات في البطن فهو شهيد":

شرح مسلم شریف میں ہے کہ "مبطون" سے مراد وہ شخص ہے جو پیٹ کی بیماری "اسہال" میں مبتلا ہو۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مبطون سے مراد استسقاء اور انتفاخ بطن کا مریض ہے۔

بعض کا قول ہے کہ اس سے کوئی خاص مرض مراد نہیں ہے۔ بلکہ پیٹ کا مرض مطلقاً مراد ہے اس کو شہید شاید اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ حاضر قلب ہو کر مرتا ہے۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شہید "**فعیل**" کے وزن پر ہے اور "**مفعول**" کے معنی میں ہے۔ اس وجہ سے کہ ملائکہ اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں اور اس کو کامیابی اور کرامت و عزت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ یا "فاعل" کے معنی میں ہے اس لئے کہ وہ اپنے رب سے ملتا ہے اور اس کے پاس حاضر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: [**والشهداء عند ربهم**] [الحدید:۱۹] یا یہ "**شهادة**" (گواہی) سے ماخوذ ہے۔ کہ اس نے صدق دل سے ایمان قبول کیا اور اطاعت و فرمانبرداری میں اخلاص کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جان تک کو اللہ کے راستے میں خرچ کر دیا۔ یا یہ کہ جب انبیائے کرام علیہم السلام قیامت کے دن اپنی امتوں کے خلاف گواہی دیں گے تو یہ لوگ ان کی اس گواہی میں اتباع کریں گے۔

طاعون اور پیٹ کی بیماری میں مرنے والے کو 'مقتول فی سبیل اللہ' کے ساتھ ملحق کیا ہے۔ کیونکہ ان میں بعض چیزوں میں مشارکت پائی جاتی ہے۔ ایک مشارکت کرامت میں ہے، کہ دونوں کو اللہ کی طرف عزت نصیب ہو گی اس تکلیف کی وجہ سے جو اس نے اس مرض میں برداشت کی ہے۔ تمام احکام اور فضائل میں مشارکت نہیں ہے۔

شیخ المشائخ حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے شہداء حکمیہ کی تمام انواع و اقسام کو اپنی کتاب میں جمع کیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

① **الغريق**۔ (سمندر میں غرق ہونے والا۔)

② **الحريق**۔ (آگ میں جلنے والا)۔

③ **المهدوم**۔ (وہ شخص جو کنویں میں گر کر مرے یا جس پر دیوار گر پڑے اور اس سے اس کی موت واقع ہو جائے)۔

④ **الغريب** (پردیسی مسافر)۔

⑤ **المرابط**۔ (سرحد پر پہرہ دیتے ہوئے جو شخص مر جائے)۔

⑥ جو شخص جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات کو مر جائے وغیرہ۔

اور مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ بعض انواع ثواب شہداء کے ساتھ شریک ہوں گے کہ جن کے مستحق شہداء ہوں گے۔ لیکن تمام انواع فضائل میں مساوات مراد نہیں ہے۔

توضیح وتخریج: طبرانی نے "الکبیر" میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

"**ان النبي ﷺ قال: "ما تعدون الشهيد فيكم "؟ قالوا: الذي يقتل في سبيل الله قال: ان شهداء امتي**

اذًا لقليل القتل في سبيل الله شهادة ، والطاعون شهادة، والنفسآء شهادة، والحرق شهادة، والغرق شهادة، والسل شهادة، والطن شهادة۔

مجاہد کا دُنیوی اور اُخروی اَجر

۳۸۱۲:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :مَا مِنْ غَازِيَةٍ اَوْسَرِيَّةٍ تَغْزُوْفَتَغْنَمَ وَتَسْلَمَ اِلاَّ كَانُوْا قَدْ تَعَجَّلُوْا ثُلُثَىْ اُجُوْرِهِمْ وَمَامِنْ غَازِيَةٍ اَوْسَرِيَّةٍ تُخْفِقُ وَتُصَابُ اِلاَّ تَمَّ اُجُوْرُهُمْ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٣ / ١٥١٥ كتاب الامارة، باب بيان قدر ثواب من غزا فغنم ومن لم يغنم، الحديث رقم (١٥٤ ـ ١٩٠٦) وأبو داود في السنن ٣ / ١٨، الحديث رقم ٢٤٩٧

ترجمه:''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''جو جماعت یا جولشکر جہاد کرتا ہے اور مالِ غنیمت لے کر صحیح وسالم واپس آتا ہے تو اس نے اپنے ثواب میں سے دوتہائی حصہ جلد (یعنی دنیا میں) پالیا جس لشکر نے جہاد کیا (اور نہ صرف یہ کہ اس کو مال غنیمت نہیں ملا بلکہ) اس جماعت ولشکر کے لوگ زخمی کئے گئے یا شہید کردیئے گئے تو ان کو مکمل اجروثواب ملتا ہے''۔(مسلم)

تشریح: قوله:مامن غازنة ۔۔۔ثلثى اجورهم:''غازية'' مراد لشکر کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے یا پوری جماعت ہے جو جہاد کررہی ہو۔

''او سرية'':یہ''او'' تنویع کیلئے ہے یا راوی کی طرف سے شک ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے''غازية'' کا لفظ ارشاد فرمایا تھا۔یا ''سرية'' فرمایا تھا۔''سرية'' یہ ایسی جماعت جس میں چار سو آدمی شامل ہوں۔

غازیہ اور''سریہ'' دونوں کوذکر کیا،اس میں اشارہ ہے کہ یہ حکم قلیل وکثیر سب کو شامل ہے۔

''ثلثى'':اس کو دوطرح پڑھ سکتے ہیں لام کے ضمہ کے ساتھ اور سکون کے ساتھ۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے کفار کے ساتھ جہاد کیا اور سالم گھر لوٹ آیا تو اس نے جلدی کی اور اپنا دوثلث اجر حاصل کرلیا اور وہ دوثلث صحیح سلامت لوٹنا اور دنیا میں غنیمت کا حصول ہے اور ایک ثلث اجر باقی رہ گیا جس کو وہ آخرت میں حاصل کرے گا۔اس وجہ سے کہ اس نے اپنے جہاد سے اللہ کے دشمنوں کے ساتھ لڑنے کا قصد کیا تھا۔

قوله:ومام ''ومن غازية أو سرية تخفق ......''۔''تخفق'':اخفاق کا معنی ہے جہاد کے بعد کچھ بھی غنیمت ہاتھ نہ آیا۔

''وتصاب الاتم أجورهم'':یہ اصابت عام ہے۔چاہے اس کو کوئی زخم آئے یا قتل ہوجائے یا اس پر کوئی اور مصیبت آجائے۔قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص جہاد میں شریک ہوکر شہید ہوگیا یا اس کو جہاد میں زخم آیا اور زندہ واپس لوٹا لیکن غنیمت اس کے ہاتھ نہیں لگی تو اس کا اجر مکمل طور پر باقی ہے۔دنیا میں اس کو کچھ بھی نہ مل سکا اس لئے آخرت میں اس کو اس کا کُل اجر ملے گا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''تعجلوا'' سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ہر غازی کو اس کے جہاد کا ثواب ملے گا۔ بس جو شخص سلامتی کے ساتھ مال غنیمت حاصل کر کے لوٹا تو اس نے اس دنیا میں اپنے ثواب، کے دوثلث حاصل کر لئے آخرت کے ثواب کے بدلے میں اور لفظ ''تعجل ولم یغنم'' سے اسی بات کی طرف اشارہ ملتا ہے اور جو شخص شہید ہو جائے بغیر غنیمت حاصل کئے تو اس کو اس کا پورا اجر وثواب ملے گا اس طور پر کہ اس کو اس دنیا میں کچھ بھی نہ ملا۔ باقی پھر دوقسم کے لوگ رہ گئے۔ ایک وہ شخص جو جہاد سے صحیح سلامت لوٹا لیکن اس کو غنیمت بھی نہیں ملی تو اس نے ایک ثلث ثواب اس دنیا میں حاصل کر لیا اور باقی دو ثلث اجر اس کو آخرت میں ملیں گے۔

اور دوسرا وہ جو زخمی ہو کر واپس لوٹا، تو اس کو اس کے زخم کے مطابق اجر وثواب ملے گا۔ اس لئے کہ [انّ اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین] ترجمہ: ''یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے''

اور یہ بھی ممکن ہے کہ رجوع سالمًا سے مراد یہ ہو کہ وہ زندہ واپس لوٹے اس صورت میں جرح اور زخم کے موافق تقسیم ثواب کی ضرورت واحتیاج بھی نہیں رہے گی۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غازی جب غنیمت کے ساتھ صحیح وسلامت لوٹا تو اس کو جہاد کے ثمرات میں ذو چیزیں مل گئیں اور دخول جنت باقی رہ گیا۔ پس یہ بات صحیح ہوگئی کہ اس نے دوثلث اجر دنیا میں حاصل کر لیا۔ اس بناء پر سلامتی اور غنیمت کا حصول اجر جہاد کے اجزاء میں سے ہے۔ اھ

سلامتی کا اجزاء ثواب میں سے ہونا محل بحث ہے الا یہ کہ یوں کہا جائے دراصل غازی کے جہاد میں جانے سے تین اشیاء مقصود ہوتی ہیں: ① شہادت۔ ② غنیمت کا حصول۔ ③ سلامتی۔

حدیث میں ''تغنم'' کے بعد تسلم کا لفظ قید واقعی ہے۔ اس لئے کہ غنیمت کا وجود ''تسلم'' کے وجود کو لازم ہے اسی وجہ سے ایک حدیث میں ''تسلم'' کا لفظ محذوف ہے جس کو امام احمد بن حنبل، مسلم وابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابن عمروؓ سے منقول ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

''ما من غازیة تغزو فی سبیل اللّٰہ فیصیبون الغنیمة الا تعجلوا ثلثی اجرھم من الاخرة ویبقی لھم الثلث، فان لم یصیبوا غنیمة تم لھم اجرھم''۔

''کوئی بھی جماعت جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے اور اس کو غنیمت مل جائے تو ان کو آخرت کے اجر کا دوثلث مل گیا اور ایک ثلث باقی رہا اور اگر غنیمت حاصل نہ کر سکے تو ان کیلئے پورا اجر ہے''۔

جہاد کا ارادہ نہ کرنے کا وبال

۳۸۱۳: وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَ لَمْ یُحَدِّ ثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۵۱۷' کتاب الامارة' باب ذم من مات ولم یغز' الحدیث رقم (۱۸۵ ـ ۱۹۱۰)

و أبو داوٗد فی السنن ۳ / ۲۲' الحدیث رقم ۲۵۰۲' والنسائی فی ٦ / ۸' الحدیث رقم ۳۰۹۷

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص (مؤمن) مر گیا اور اس نے جہاد نہ کیا اور نہ اس کے دل میں جہاد کرنے کا خیال گزرا وہ نفاق کی موت مرا''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: ''من مات ولم یغزو لم یحدث به نفسه''**:

ایک نسخہ میں لفظ ''غزو'' واؤ کے ساتھ (**لم یغزو**) ہے۔ یہ ایک ضعیف لغت ہے۔

''**لم یحدث**'': باب تفعیل سے ہے۔ دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔

''**به**'': یہ ضمیر غزو کی طرف راجح ہے۔

''**نفسه**'': نصب کے ساتھ ہے کیونکہ ''**یحدث**'' کا مفعول بہ ہے۔ یا منصوب **بنزع الخافض** ''ہے۔ **ای فی نفسه**۔ (یعنی حرف جر ''**فی**'' یہاں محذوف ہے) اور ایک نسخہ میں فاعل ہونے کی بناء پر رفع کے ساتھ ہے اور معنی یہ ہوگا کہ نہ جہاد کا عزم کیا اور نہ مجاہد بننے کی تمنا کی کہ اے کاش میں مجاہد ہوتا۔

بعض کا قول ہے کہ ''**لم یحدث**'' کا معنی ہے کہ نہ اس نے خروج فی الجہاد کا ارادہ کیا اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس نے آلات جہاد تیار نہیں کئے اور اگر ارادہ کیا ہوتا تو اس کی علامت یہ ہوتی کہ اس نے آلات جہاد کو تیار کر رکھا ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **ولو ارادوا الخروج لأعدوا له عدة** اگر وہ جہاد میں نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کیلئے اس کی تیاری کرتے۔ اس کی تائید اگلے جملہ سے بھی ہوتی ہے۔

قوله: ''مات علی شعبة من نفاق'':

یعنی نفاق کے اقسام میں یہ بھی ایک قسم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اس حالت پر مرا کہ نہ اس نے جہاد کیا اور نہ اس کا ارادہ کیا تو اس نے ان منافقین سے تشبہ اختیار کیا جو جہاد سے پیچھے رہ جانے والے تھے اور جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے تو وہ ان ہی میں سے ہوگا۔

بعض کا قول ہے کہ یہ نبی ﷺ کے زمانہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ لیکن زیادہ واضح بات یہی ہے کہ یہ عام ہے اور ہر مؤمن پر واجب ہے کہ وہ جہاد کی نیت کرے، چاہے فرض کفایہ کے طریق سے ہو، یا فرض عین ہونے کے طریق سے ہو جب نفیر عام ہو جائے اس کے ظاہر سے استدلال کیا ہے جو جہاد کو مطلقاً فرض عین سمجھتے ہیں۔

امام نووی ؒ کی شرح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ زمانہ نبوی ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا۔ لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن المبارک ؒ کے اس قول میں بہر حال یہ احتمال موجود ہے اور ان کے علاوہ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ عام ہے۔ (زمانہ نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا) اور مراد سے یہ ہے کہ جس نے ایسا کیا وہ اس وصف میں منافقین متخلفین کے مشابہ ہو گیا۔ اس لئے کہ جہاد کا ترک، نفاق کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس انسان نے کسی نیکی یا عبادت کی نیت کی اور پھر اس عبادت کے کرنے سے پہلے مر گیا تو اس پر مذمت نہیں ہے۔ بخلاف اس شخص کہ جو بغیر نیت کے مر جائے۔

ہمارے اصحاب نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ جس شخص کو اول وقت میں نماز کا موقع مل گیا اور اس نے اس نیت سے نماز کو مؤخر کر دیا کہ آخری وقت میں اس کو ادا کر لے گا، اور اس سے پہلے وہ مر گیا یا اسی طرح حج کو مؤخر کر دیا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ دونوں شخص گنہگار رہوں گے اور بعض کا قول ہے کہ ان کو کوئی گناہ نہیں ملے گا اور بعض کا قول ہے کہ حج میں گنہگار رہوگا، جبکہ نماز میں گنہگار نہیں ہوگا اھ آخری قول ہمارے مذہب احناف کے موافق ہے۔

۳۸۱۴: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ : فَقَالَ : الرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ، وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُهٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ! قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٢٧ کتاب الجهاد، باب من قاتل لتکون کلمة الله، الحدیث رقم ٢٨١٠، و مسلم فی ٣ / ١٥١٢، الحدیث رقم (١٤٩ ـ ١٩٠١) وأبو داود فی السنن ٣ / ٣١، الحدیث رقم ٢٥١٧، والنسائی فی ٦ / ٢٣، الحدیث رقم ٣١٣٦، وابن ماجه فی ٢ / ٩٣١، الحدیث رقم ٢٧٨٣، وأحمد فی المسند ٤ / ٤٥٣

ترجمہ: ''اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ ایک تو وہ شخص ہے جو مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے ایک وہ شخص ہے جو ذکر یعنی شہرت (کہ جس کو سمعہ کہتے ہیں) کی خاطر جنگ کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو اس لئے جنگ کرتا ہے تا کہ اس کا مرتبہ دیکھا جائے (یعنی اپنی شجاعت و بہادری دکھانے کے لئے جنگ کرتا ہے کہ جس کو ریا کہتے ہیں) تو ان (تینوں) میں کون اللہ کی راہ میں مقبول ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس لئے جنگ کرے تا کہ اللہ کا دین سر بلند ہو حقیقت میں وہی اللہ کی راہ میں مقبول ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: الرجل یقاتل للمغنم۔۔فمن فی سبیل الله:

''الرَّجل'': جنس رجل مراد ہے۔

''یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر'': النہایہ میں اس کا مطلب یوں لکھا ہے کہ تا کہ لوگوں میں اس کا تذکرہ شجاعت کے وصف کے ساتھ کیا جائے۔

''والرجل یقاتل لیری''

''لیری'': مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ (جانا جائے یا دیکھا جائے)۔ ''مکانه'': اس سے مراد اس کا رتبہ شجاعت کا ہے۔

اور ایک نسخہ میں ''لیری'' معروف کے صیغہ کے ساتھ نقل ہے اور اسی بناء پر ''مکانه'' منصوب ہے۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ باب افعال سے ہے۔ اگر اس کو صیغہ معروف کے ساتھ پڑھا جائے تو اس وقت اس کا فاعل وہ ضمیر ہے جو ''الرجل'' کی طرف راجع ہے اور مفعول ثانی محذوف ہوگا۔

''یقاتل ذلك الرجل لیری هو مکانه'' اس لئے لڑتا ہے تا کہ وہ لوگوں کو اپنی شجاعت و بہادری کا مقام دکھلا دے کہ

میں اتنا زیادہ بہادر وشجاع ہوں۔ اس بناء پر ''يقاتل للذكر '' اوراس میں فرق یہ ہوگا کہ اوّل شخص شہرت کیلئے لڑتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو ریاء کاری کیلئے لڑتا ہے۔

اگر ''لیری '' کو مجہول پڑھا جائے تو ''الرجل '' کی طرف عائد ضمیر فاعل کے قائم مقام ہوگی اور مکانہ مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ اسلئے جہاد کرتا ہے تا کہ اس کو اس کا جنت کا مقام دکھلا دیا جائے۔ یعنی وہ اس لئے لڑتا ہے تا کہ جنت حاصل کر لے، اس لئے نہیں لڑتا کہ اعلائے کلمۃ اللہ ہو یا اس کے دین کی مدد ونصرت ہو۔ اس بات کی تائید آپ ﷺ کے اگلے جملہ سے ہوتی ہے: قوله: ''فمن في سبيل الله؟ قال: ''من قاتل لتكون كلمة اللّٰه'' هي العليا فهو في سبيل اللّٰه'''' اس کلمہ سے مراد کلمہ توحید ہے اور وہ ہے کلمہ طیبہ لا اله الاّ اللّٰه۔

یعنی اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہ ہو۔ بلکہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود ہو۔ لیکن بظاہر جنت کا ارادہ اعلائے کلمۃ اللہ کے ارادہ کے مزاحم ومتضاد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے (ایک دوسرے موقع پر) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قوموا الٰى جنّة'' جیسا کہ پہلے یہ حدیث گزر چکی ہے۔ لہٰذا دونوں سے ایک ہی مراد ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ''لیری '' کا نائب فاعل ضمیر ہے اور مکانہ مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ مفعول ثانی نائب فاعل ہے اور یہی بات بخاری کے ایک نسخہ میں اور ''جامع الاصول'' میں بھی رفع کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ اى ليرى الناس منزلته في سبيل الله۔

لیکن ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اشرف کی اس بات پر مبنی ہے کہ ''مكانه'' منصوب ہے نا کہ رفع پر لہٰذا علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے کلام کو رد کر کے یہ کہنا کہ ''یہ بات غیر صحیح ہے''۔ خود غیر صحیح ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ ''سمعة'' اور ''رياء'' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ''المغرب'' میں ہے: يقال ''فعل ذلك سمعة ليريه الناس'''' ''سمعة'' اور ''رياء'' میں باہم اتحاد ہے۔ ورنہ اس لغت میں فرق ضرور کرتے اور اسی طرح حدیث شریف میں ہے: ''من سمع الناس بعلمه سمع اللّٰه أسامع خلقه وحقره وصغره ونوه اللّٰه لريائه وبلائه أسماع خلقه فيفتضح''۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اشرف ؒ کا کلام تحقیق اصل اور (باریک بینی) پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ''رياء'''' رؤية'' سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ ''سمع''، ''سمعة '' کا مأخذ ہے۔ ہاں دونوں لفظوں میں توسع ہے۔ ایک کا اطلاق دوسرے پر اور دوسرے کا اطلاق پہلے پر ہوتا ہے اور بسا اوقات دونوں کو یکجا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''رياءً وسمعةً''۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ زیادہ واضح بات یہی ہو کہ ذکر سے مراد ''سمعة '' ہو اور ''رؤية '' سے مراد علم اللہ وغیرہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [آل عمران ۱٤۲]

''ہاں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے

تم میں سے جہاد کیا ہو اور نہ ان کو دیکھا جو ثابت قدم رہے''۔

یعنی تم میں سے بعض مجاہدین وہ ہیں کہ جو غنیمت اور ذکر وشہرت کیلئے لڑتے ہیں اور ایک مجاہد جو صابر بھی ہوتا ہے وہ اپنی ساری توانائی کو فی سبیل اللہ خرچ کر ڈالتا ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طیبی رحمہ اللہ کی یہ بات ظاہر بھی نہیں ہے چہ جائے کہ اظہر ہو۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے یہاں پر''رؤية ''سے مراد قیامت کے دن مؤمنین کا اس شخص کے منزلت ومقام کو دیکھنا ہو جو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں حاصل ہوگا۔ جیسا کہ عنقریب فصل ثالث میں حدیث فضالہ میں یہی بات آئے گی:

''ان الشهداء اربعة! رجل جيد الايمان لقى العدو فصدق الله حتى قتل فذلك الذى يرفع الناس اليه أعينهم يوم القيامة''۔

ایک شخص نے مجاہدین کے احوال کے بارے میں پوچھا کہ بعض غنیمت کیلئے لڑتے ہیں بعض ذکر اور فخر وریاء کیلئے لڑتے ہیں۔ بعض اس لئے تا کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں قسم ثالث کو کنایہ کر کے یوں فرمایا: **''من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا''۔**

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف اور اس کے فعل کے شکر کے طور پر یوں فرمایا۔ ورنہ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ **''من يقاتل ليرى مكانه''** لیکن یہ نہیں کہا۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ عدول کی یہ وجہ نہیں ہے بلکہ عدول کی وجہ یہ ہے کہ **''من يقاتل ليرى مكانه''** مبہم ہے۔ یہ اپنے مقصود پر نہ تو صراحۃً دلالت کر رہا ہے اور نہ ہی کنایۃً اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اس وجہ سے اس جملہ سے عدول کر کے **''من قاتل لتكون كلمة الله''** کہا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر''مكان'' اصل میں''مكانة'' کی جگہ پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿اعْمَلُوا عَلَى مَكَانَتِكُم﴾[هود : ۱۲۱] ''الكشاف'' میں ہے کہ ''مكانة ''مصدر ہے کہا جاتا ہے: **''مكن مكانةً اذا تمكن أبلغ التمكن''** اور بمعنی مکان بھی مستعمل ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: **''مكان ومكانة ومقام ومقامة''**۔ لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا: **اعملوا على تمكنكم من أمركم، وأقصى استطاعتكم وامكانكم، أو اعملوا على جهتكم وحالكم التى أنتم عليها''**۔ کلمۃ اللہ دین حق سے عبارت ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت دی ہے اور لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اس کو مضبوطی سے تھامیں، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو''**كلمة الله**'' کہا گیا ہے اور''**كلمة الله**''، ''**تكون**'' کا اسم ہے اور''**هى**'' کی ضمیر فصل کیلئے ہے۔''**العليا**'' اس کی خبر ہے۔ یہ اسلوب کلام مفید اختصاص ہے۔ گویا معنوی تقدیر یوں ہے: **''لم يقاتل لغرض من الأغراض الا لاظهار الدين''** مطلب یہ ہوگا کہ وہ کسی اور غرض کیلئے نہیں لڑا سوائے اس کے کہ دین کا غلبہ ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

بوجہ عذر جہاد میں شریک نہ ہو سکنے والے کا ثواب

۳۸۱۵:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجَعَ مِنْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَدَنَا مِنَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ : اِنَّ بِاالْمَدِيْنَةِ اَقْوَامًا مَا سِرْتُمْ مَسِيْرًا وَلَا قَطَعْتُمْ وَادِيًا اِلَّا كَانُوْا مَعَكُمْ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) اِلَّا شَرِكُوْكُمْ فِي الْاَجْرِ قَالُوْا:يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَهُمْ بِالْمَدِيْنَةِ ؟ قَالَ :وَهُمْ بِالْمَدِيْنَةِ حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ.

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۸۱۵' كتاب المغازی' ۸ / ۱۲۶' الحديث رقم ٤٤٢٣' وابن ماجه فی ۲ /۹۲۳' الحديث رقم ۲۷٦٤

ترجمہ:''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک سے واپسی پر مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا کہ مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں (جو اس سفر جہاد میں بظاہر تو تمہارے ساتھ نہیں تھے لیکن) کہ تم نے ایسا کوئی راستہ طے نہیں کیا اور کسی ایسی وادی و جنگل کو عبور نہیں کیا جس میں وہ تمہارے ساتھ نہ رہے ہوں (یعنی ان کے جسم تو ان کے گھروں میں تھے لیکن ان کی دعائیں ان کے دل اور ان کی ہمتیں تمہارے ساتھ تھیں) اور ایک روایت میں الا کانوا معکم یعنی جس میں وہ تمہارے ساتھ نہ رہے ہوں کے بجائے یہ ہے کہ جس اجر وثواب میں وہ تمہارے شریک ہوں۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اور وہ لوگ مدینہ ہی میں ہیں؟ (یعنی جب کہ وہ ہمارے ساتھ جہاد میں نہیں گئے اور اپنے گھروں میں موجود رہے پھر وہ ہمارے ساتھ کیسے رہے اور ہمارے اجر وثواب میں کیسے شریک ہوئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: (ہاں) وہ مدینہ میں ہیں (لیکن اس کے باوجود وہ اجر وثواب میں تمہارے شریک ہیں) کیونکہ ان کے عذر نے ان کو روک رکھا تھا (یعنی وہ اپنے اعذار کے سبب سے تمہارے ساتھ جہاد میں شامل نہیں ہو سکے)۔(بخاری)

تشریح: **قوله:رجع من غزوة تبوك۔۔۔الا شركوكم فی الاجر:**

''تبوك'':ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے۔یہ شام اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔

''ان بالمدينة اقوامًا'' یہاں أقوام سے مراد لوگوں کی جماعتیں ہیں جو کہ جہاد کی تمنا رکھتی ہیں اور جہاد میں نکلنے پر آمادہ ہیں لیکن ان کو مانع درپیش ہے جس کی وجہ سے وہ نہیں جا سکتے۔

''مسيرًا'': مصدر ہے''سیر'' بمعنی''چلنا'' یا اسم مکان ہے۔

''ولا قطعتم واديًا''وادی کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ وادی کو پار کرنا بنسبت دوسری جگہوں کے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور تخصیص کی دوسری وجہ''استيفاء'' کے معنی پر دلالت ہے۔

'' كانوا معكم'' با لجسم مراد نہیں ہے بلکہ ان کے دل تمہارے ساتھ ہوتے ہیں ان کی نیک تمنائیں اور دعائیں تمہارے ساتھ ہوتی ہیں اور نیت کی وجہ سے وہ تمہارے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

شر کو ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور قاموس میں ہے: ''شركة في البيع والميراث كعلمه يشركه بالكسر والمعنى شاركوكم''۔

''في الاجر'' اجر میں تو وہ برابر کے شریک ہیں البتہ زیادہ عمل زیادہ ثواب کا مقتضی ہے۔

''قوله: وهم بالمدينة حبسهم العذر'':

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ معذورین جو جہاد سے پیچھے رہ جاتے ہیں مجاہدین کے ساتھ اجر و ثواب میں شریک ہیں۔ لیکن اس بات پر کوئی دلالت نہیں کر رہی کہ وہ اجر و ثواب میں برابر کے شریک ہیں اور اس استواء کی نفی پر قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ دلیل ہے:

﴿ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً﴾ [النساء:٩٥]

:''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے''۔

اور یہ آیت بھی اس کی دلیل ہے: ﴿ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾[النساء۔٩٥]۔

ترجمہ ''اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اجر عظیم دیا ہے'' اى على غير الا ضراء أو فضل الله المجا هدين على القاعدين والاضراء درجة وهى الغنيمة و نصرة دين الله تعالىٰ فى الدنيا و فضل الله المجاهدين عليهم درجات فى العقبىٰ۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے بھلائی کے کاموں میں نیت کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے کہ جس نے کسی جہاد کی نیت کی یا کسی اور طاعت و نیکی کی نیت کی لیکن عذر کی بنا پر نہ جا سکا تو اس کو اس کی نیت کا ثواب حاصل ہو گیا اور جب کبھی بھی اس کے فوت ہونے پر افسوس کرے گا یا یہ تمنا کرے کہ کاش میں اس میں شریک ہوتا تو اس کو اتنا زیادہ ثواب ملے گا۔

٣٨١٦: وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ جَابِرٍ ۔

ترجمہ: اور مسلم نے اس روایت کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے''۔

اخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ٥١٨، الحديث رقم (١٥٩ ـ ١٩١١) وابن ماجه ٢ / ٩٢٣، الحديث رقم ٢٧٦٥، وأحمد فى المسند ٣ / ٣٠٠

٣٨١٧: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ : جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فَاسْتَأْذَنَهُ فِي الْجِهَادِ. فَقَالَ : اَحَيٌّ وَالِدٰكَ؟ قَالَ : نَعَمْ قَالَ : فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ (متفق عليه وفى رواية) فَارْجِعْ اِلٰى وَالِدَيْكَ فَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ١٤٠، الحديث رقم ٣٠٠٤، و مسلم كتاب الامارة، باب ثواب من حبسه، ٤ / ١٩٧٥، الحديث رقم ٥ / ٢٥٤٦، و أبو داود فى السنن ٣ / ٣٨، الحديث رقم ٢٥٢٩، والترمذى ٤ / ١٦٤، الحديث رقم ١٦٧١، والنسائى فى ٦ / ١٠، الحديث رقم ٣٠١٣، وأحمد فى المسند ٢ / ١٨٨

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد میں جانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے ماں باپ حیات ہیں؟ اس نے عرض کیا: ہاں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر تم انہیں کے درمیان رہ کر جہاد کرو (یعنی پوری محنت وتندہی کے ساتھ انکی خدمت کرو کہ تمہارے حق میں یہی جہاد ہے)''۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ تو پھر تم اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان کی صحبت کو بہتر بناؤ (یعنی ان کی خدمت اور ان کے حقوق کی ادائیگی اچھی طرح کرو)۔

تشریح: **قوله: قال ففيهما فجاهد**: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ''**ففيهما**''''**فجاهد**'' کے متعلق ہے اور اختصاص کی غرض سے جار ومجرور کو مقدم کیا ہے اور پہلی فاء شرط محذوف کی جزاء ہے اور فاء ثانیہ جزائیہ ہے۔ کیونکہ کلام شرط کے معنی کو متضمن ہے۔ پوری عبارت یوں بنے گی:''**اذا كان الأمر كما قلت فاختص المجاهدة في خدمة الوالدين**'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ﴿**فاياى فاعبدون**﴾ [العنکبوت: ٥٦] ترجمہ:''سو خالص میری ہی عبادت کرو''۔

''مطلب یہ کہ جب تم کسی ایک سرزمین پر میں میری لئے عبادت وبندگی کو خاص نہ کرسکو تو کسی اور جگہ میں خالص کردو''۔ یہاں پر بھی شرط کو حذف کردیا ہے اور اس کے عوض میں مفعول کو مقدم کردیا تاکہ ضمناً اختصاص کا فائدہ دے۔

''**فجاهد**'':''**فاخدمهما**'' کی جگہ''**جاهد**'' فرمایا اس لئے کہ کلام جہاد کے بارے میں چل رہا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جہاد اپنے عام معنی میں ہو کہ جہاد اکبر واصغر کو شامل ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿**والذين جاهدوا فينا لتهدينهم سبلنا**﴾ [العنکبوت: ٦٩]۔ ترجمہ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو اپنے (قرب وثواب یعنی جنت کے) راستے ضرور دکھاوینگے''

''**فارجع الى والديك فأحسن صحبتهما**''

شرح السنہ میں ہے کہ یہ حکم نفلی جہاد کے بارے میں ہے کہ جب والدین مسلمان ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر نفلی جہاد میں نہیں جایا جاسکتا۔ اگر جہاد فرض عین ہو چکا ہو تو اس صورت میں ان دونوں کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ منع کریں گے تو گنہگار رہوں گے اور جہاد کے لئے چلا جائے اور اگر والدین غیر مسلم ہوں تو اس صورت میں جہاد میں جانے کیلئے ان کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے جہاد خواہ فرض ہو یا نفلی ہو اور اسی طرح مثلاً حج، عمرہ، زیارت کے لئے نہیں نکلے گا جب والدین مسلمان ہوں۔ یہاں تک کہ نفلی روزہ بھی ان کی اجازت کے بغیر نہیں رکھے گا اگر وہ ناپسند کریں خواہ والد والدہ دونوں مسلمان ہوں، یا کوئی ایک ہو لیکن اجازت ضروری ہے علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ ان دونوں کی اطاعت فرض ہے اور جہاد اس پر فرض ہوا نہیں ہے۔

اور سنن ابی داؤد میں روایت اس طرح ہے۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ میں آپ سے ہجرت پر بیعت کرنے آیا ہوں اور میں اپنے والدین کو روتے ہوئے چھوڑ کر آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا واپس

چلے جاؤ اور ان کو ہنساؤ جیسے تم ان کو رولایا ہے۔

اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یمن سے ہجرت کر کے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ یمن میں تیرا کا کوئی ہے؟ اس نے کہا کہ میرے والدین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ان دونوں نے تجھے اجازت دی ہے اس نے کہا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واپس جاؤ اور ان سے اجازت طلب کرو۔ اگر دونوں نے تجھے اجازت دے دی تو جہاد کرنا ورنہ ان سے بھلائی کے ساتھ برتاؤ کرو۔

جہاد کیلئے طلب کئے جانے کا بیان

۳۸۱۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ يَوْمَ الْفَتْحِ: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ وَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا (متفق عليه)

اخرجه في صحيحه كتاب الجهاد' باب فضل الجهاد' ٦ / ٣' الحديث رقم ٢٧٨٣' و مسلم في ٢ / ٩٨٦' الحديث رقم (٤٤٥ ، ١٣٥٣) وأبو داود في السنن ٣ / ٨' الحديث رقم ٢٤٨٠' والترمذي في ٤ / ١٢٦' الحديث رقم : ١٥٩٠' والنسائي في ٧ / ١٤٦' الحديث رقم ٤١٧٠' وابن ماجه في ٢ / ٩٢٦' الحديث رقم : ١٥٩٠' والدارمي في ٢ / ٣١٢' الحديث رقم : ٢٥١٢' وأحمد في المسند ١ / ٢٥٥

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا: اب فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت باقی ہے۔ لہٰذا جب تم کو (جہاد کے لئے) نکالنے کے لئے کہا جائے تو تم سب فوراً نکل جاؤ۔ (کیونکہ نفیر عام کے موقع پر جہاد میں جانا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی ہر ایک پر ضروری ہے''۔) (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ''لا هجرة بعد الفتح''

یہاں ہجرت سے مراد ہجرت مفروضہ ہے۔ یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت فرض نہیں ہے جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے: ''عن مجاشع بن مسعود ای ''من مكة الى المدينة'' اور اب ہجرت مندوبہ باقی ہے۔ کسی بھی ایسی جگہ سے ہجرت کرنا جہاں نیکیوں کو چھوڑا جاتا ہو اور منکر عام ہوں یا اس جگہ سے ہجرت کرنا جہاں ہر شخص گناہ میں مبتلا ہو۔ وہاں سے ہجرت مستحب ہے۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہجرت دو قسموں پر تھی پہلی یہ کہ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کی جائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا تا کہ دین کو بچا سکیں مشرکین کی تکالیف سے چھٹکارا ہو اور فتنہ وآزمائش میں نہ پڑیں۔

— اور دوسرا معنی یہ ہے کہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت۔

ایک وقت تھا مسلمان مدینہ میں اقلیت میں ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور بھی تھے اس وقت ہر مسلمان پر نبی کریم ﷺ کی طرف ہجرت فرض ہوتی چاہے وہ مسلمان جہاں کہیں پر ہو۔ (صرف مکہ سے مدینہ نہیں) تاکہ نبی کی اعانت ہوسکے اگر کوئی حادثہ پیش آجائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ دین کے احکامات میں سمجھ بوجھ حاصل ہوجائے اور پھر وہ دوسری اقوام کو دین اور اس کے احکام سکھا سکے۔ لیکن جب مکہ فتح ہوگیا، اور اہل مکہ اسلام لے آئے، تو نبی ﷺ اور اس کے صحابہؓ اس سے بے نیاز ہوگئے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو زیادہ بڑا خوف وڈر اہل مکہ سے تھا۔ لیکن جب وہ مسلمان ہوگئے تو مسلمانوں کیلئے اپنے گھروں میں سکون کے ساتھ رہنا ممکن ہوگیا۔ پھر اس وقت مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم اپنے اپنے وطن میں رہو لیکن جہاد کی نیت دل میں رکھو اور نبی ﷺ کے ارشاد گرامی "ولكن جهاد ونية" کا مطلب یہی ہے۔ **قوله: ولكن جهاد ونية**...... یعنی قصد جہاد واخلاص عمل پہلے کی طرح اب بھی باقی ہے۔

"استنفرتم": مجہول کے صیغے کے ساتھ ہے۔

"فانفروا" فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

یعنی جب جہاد فرض عین ہو اور تمہیں نفیر عام کے ساتھ نکلنے کیلئے کہا جائے تو پھر نکلو۔

یا یہ معنی ہے کہ جب تمہیں دشمن کے ساتھ لڑائی کی طرف بلایا جائے تو چل پڑو۔ اس صورت میں یہ امر فرض کفایہ پر محمول ہوگا۔ حاصل معنی یہ ہوا کہ وہ ہجرت جس میں وطن کو چھوڑ کر مدینہ آنا فرض عین تھا اب ختم ہے۔ مگر یہ کہ جہاد کی وجہ سے ترک وطن یا نیک نیتی کی وجہ سے ترک وطن یا دار الکفر بدعت، جہالت، فتنوں کی وجہ سے ترک وطن یا طلب علم کی وجہ سے ترک وطن، سو وہ اب بھی باقی ہے، منسوخ نہیں ہوا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وطن کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے چھوڑنا یہی وہ ہجرت ہے جو معتبر ہے اور اس کے کرنے والوں کو باقی تمام لوگوں پر جو ایک ظاہری امتیاز وفضیلت حاصل تھی وہ تو ختم ہوچکی ہے لیکن خالص نیت کے ساتھ وطن کو چھوڑنا اللہ تعالیٰ کیلئے جیسا کہ طلب علم کے لئے ہجرت، دار الکفر سے اپنے دین کو بچانے کی خاطر بھاگنا، ان جگہوں کو چھوڑنا جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قیام نہ ہو، بیت اللہ کی زیارت کیلئے وطن کو چھوڑنا، رسول اللہ ﷺ کے حرم کیلئے، مسجد اقصیٰ وغیرہ کیلئے، یا جہاد کیلئے وطن کو چھوڑنا ان ساری قسموں کا ترک وطن رہتی دنیا تک قائم ودائم رہے گا یہ ہجرت اب بھی باقی ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خیر اور بھلائی کا حصول جو ہجرت کی وجہ سے تھا وہ تو فتح مکہ کے ساتھ ہی ختم ہوگیا ہے۔ لیکن خیر کو جہاد اور اخلاص نیت کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے اس حدیث میں اعمال خیر کی نیت پر ابھارا گیا ہے اور یہ کہ اس پر ثواب ملے گا۔ "واذا استنفرتم" کا مطلب یہ ہے کہ جب امام تمہیں جہاد میں نکلنے کیلئے طلب کرے تو تم اس کے ساتھ نکلو۔ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جہاد فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے۔ جب اتنے لوگ اس کو کریں کہ جن سے کفایت ہوسکتی ہو تو باقی لوگوں سے حرج ساقط ہوجاتا ہے اور اگر سب لوگ اس کو چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے۔ اھ۔

یہ محل نظر ہے، کیونکہ اس میں کوئی دلالت نہیں ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے بلکہ اس کا ظاہر تو اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ

جہاد فرض عین ہے۔اس لئے یہاں پر''فلینفر بعضکم''نہیں کہا ہے۔اگر ایسا کہہ بھی دیتے تو تب بھی یہ صراحۃً جہاد کے فرض عین ہونے کی نفی پر دلالت کرتا اس لئے کہ اس صورت میں اس سے مراد یہ ہوتا کہ سارے لوگ اکھٹے (ایک ساتھ ہو کر) ہو کر نہ نکلیں۔اس لئے کہ اس سے لوگ ضائع ہو جائیں گے شہر اجڑ جائیں گے اور معاد کا علم فوت ہو جائے گا۔جیسا کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:[فلولا نفر من كل فرقة منهم ليفقهوا في الدين] ترجمہ:''سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے تا کہ (یہ) باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں''اس کی تحقیق محقق ابن الہمام کے کلام میں پہلے گزر چکی ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر''استنفار''کو جہاد کے ساتھ خاص کیا ہے لیکن اس کو عموم پر حمل کرنا بھی ممکن ہے۔ **أي اذا استنفر تم الى الجهاد فانفروا، واذا استنفر تم الى طلب العلم وشبهه فا نفروا** (یعنی جب تمہیں جہاد میں نکلنے کیلئے کہا جائے تو نکلو اور جب تمہیں طلب علم یا اس جیسے کسی اور کار خیر کیلئے نکلنے کا کہا جائے تو بھی نکلو۔)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾[التوبة۔۱۲۲]

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''استنفار''صرف جہاد کے ساتھ ہی خاص ہے۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے: ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾[التوبة:٤١] کہ اللہ کے راستے میں نکلو، ہلکے ہو یا بوجھل ہو اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو''۔

یہ آیت مذکورہ سے استدلال اس آیت کے شان نزول اور اس کے معنی سے غفلت کا نتیجہ ہے۔اس لئے کہ وہ تو مجاہدین کے اوصاف کے بیان کے بعد فرمائی گئی ہے:[وما كان المؤمنون لينفروا كافّةً]۔جب مسلمانوں نے اس خروج کا ارادہ کر لیا تو اللہ نے فرمایا:[فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفةٌ] اس سے مراد جہاد کیلئے نکلنا ہے۔

''لیتفقھوا''تا کہ باقی لوگ تفقہ حاصل کریں۔یا اس سے مراد اس گروہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیلئے نکلنے پر ابھارنا ہے اور اس کو ترغیب دینا مقصود ہے کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور جہاد وغیرہ کے ساتھ متعلق احکامات کو سیکھتے رہیں۔**ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذدون**۔

الفصل الثانی:

مجاہدین ہمیشہ غالب رہیں گے

٣٨١٩:وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:لَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِي يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ عَلٰى مَنْ نَاوَأَهُمْ حَتّٰى يُقَاتِلَ اٰخِرُهُمُ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ۔

(رواه ابوداود)

— اخرجه أبو داود في السنن كتاب الجهاد، باب في دوام الجهاد، ٣ / ١١، الحديث رقم ٢٤٨٤، وأحمد في

المسند ٤ / ٤٢٩

ترجمہ: ''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری امت کی کوئی نہ کوئی جماعت ہمیشہ حق (کی حمایت وحفاظت) کے لئے جنگ میں مشغول رہے گی اور جو بھی شخص اس جماعت سے دشمنی کرے گا وہ اس پر غالب رہے گی' یہاں تک کہ اس امت کا آخری شخص مسیح دجال سے جنگ کرے گا''۔

(ابوداؤد)

تشریح: قوله: لاتزال طائفة...... علي من ناوهم:

''ظاهرين'': اس کے دومطلب ہو سکتے ہیں ① وہ لوگ غالب ومنصور ہوں گے۔ ② وہ مشہور ومعروف ہوں گے۔

''علی من ناوا هم'' علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ (اس کا مطلب یہ بیان) فرماتے ہیں کہ یہ گروہ اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔ مناواة "معاداة" ''(دشمنی) کو کہتے ہیں۔ یہ اصل میں ہمزہ کے ساتھ ''نوء'' سے مشتق ہے اور ''نوء'' کے معنی النهوض (جلدی سے حملہ کرنا)۔ بعض دفعہ ہمزہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس لفظ کو عام طور پر ''معاداة'' (دشمن ہونا) کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ دشمنوں میں سے ہر ایک دوسرے کو قتل کرنے کیلئے جلدی سے دوسرے پر حملہ کرتا ہے۔

اور ''شرح مسلم'' میں ہے کہ یہ لفظ واؤ کے بعد ہمزہ کے ساتھ ہے۔ ''ناء اليهم وناؤ واااليه'' سے ماخوذ ہے۔ ای نهضوا للقتال یعنی وہ قتال کیلئے جلدی سے کھڑے ہوگئے، تیار ہوگئے صاحب النہایہ لکھتے ہیں: النواء والمناواة: المعاداة اور صاحب قاموس لکھتے ہیں: ناء نهض بجهد ومشقة، وناواه منا واة فاخره وعادا''۔ اھ۔ لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ حدیث میں اس لفظ کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا جائے۔ کثرت نسخ کو نہ دیکھا جائے اس کو ضبط نہیں کیا اور رسم الخط بلاشبہ ایک ہی ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی فصل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اس جیسی حدیث کو اگر اہل شام کے طائفہ منصورہ پر محمول کیا جائے تو اولیٰ ہے۔ اھ

اولیٰ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ طائفہ جہت شام سے آئے گا تا کہ اس کی مراد میں اہل روم بھی داخل ہو جائیں اس لئے کہ اس زمانے میں اس عظیم فریضہ کا حق انہوں نے ادا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے اور ان کے کمینے دشمنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ذلیل ورسوا کرے۔

قوله: ''حتى يقاتل آخرهم المسيح الدجال'':

اس طائفہ کے آخری لوگوں سے مراد مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان دونوں کے پیروکار ہیں۔

دجال کو قتل کریں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب وہ آسمان سے بیت المقدس کے یعنی دمشق کے مشرقی طرف ایک سفید منارے پر اتریں گے۔ جس وقت اس نے مسلمانوں کا محاصرہ کیا ہوا ہوگا، اور ان محصورین میں حضرت مہدی بھی ہوں گے اور اس کے قتل کے بعد جہاد باقی نہیں رہے گا اور جہاں تک بات ہے یاجوج ماجوج کے خلاف جہاد کی تو مسلمانوں کے خلاف ان کو قدرت وطاقت ہی حاصل نہیں ہوگی اور جب اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دیں گے تو روئے زمین پر اس کے بعد کوئی کافر نہیں رہے گا جب تک عیسیٰ علیہ السلام زمین پر زندہ رہیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد اور جس نے کافر بننا چاہا تو وہ کافر ہو جائے گا

اور مسلمانوں کی موت ایک اچھی ہوا کے ساتھ واقع ہو جائے گی اور کفار باقی رہ جائیں گے۔اس وقت تک قیامت واقع نہ ہوگی جب تک زمین پر کوئی اللہ کہنے والا ہوگا بعض احادیث میں آیا ہے۔جیسا کہ حاکم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

''لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق حتى تقوم السّاعة'' کہ میری امت میں سے ہمیشہ ایک گروہ ایسا ہوگا جوحق پر ہوگا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے''۔

یہ حدیث قرب قیامت پر محمول ہے اس لئے کہ خروج دجال قیامت کی علامات میں سے ہے۔اس کی مکمل تفصیل حدیثِ دجال میں آئے گی ان شاءاللہ۔

۳۸۲۰:وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :مَنْ لَّمْ یَغْزُ وَ لَمْ یُجَهِّزْ غَازِیًا اَوْ یَخْلُفْ غَازِیًا فِیْ اَهْلِهٖ بِخَیْرٍ اَصَابَهُ اللّٰهُ بِقَارِعَةٍ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن كتاب الجهاد' باب من جهز غازيا ۳ / ۲۲' الحديث رقم ۲۵۰۳' وابن ماجه في ۲ / ۹۲۳' الحديث رقم ۲۷۶۲' والدارمي في ۲ / ۲۷۵' الحديث رقم ۲۴۱۸.

ترجمہ:''اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے نہ تو (بنفس خود) جہاد کیا اور نہ کسی مجاہد کا سامان تیار کیا اور نہ کسی غازی کے (جہاد میں ہونے کے دوران اس کے) اہل وعیال کے حق میں (بھلائی کے ساتھ) اس کا نائب بنا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سے پہلے کسی سخت مصیبت میں گرفتار کرے گا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله:من لم يغزولم بجهر غازيا......:

''يخلف'': یہ فاء کے جزم اور لام کے ضمہ کے ساتھ ہے اور جزم''لم'' نافیہ کی وجہ سے ہے۔

''غازيًا في اهله'': ظاہراً یہ لگتا ہے کہ یہاں پر''او'' تنویع کیلئے ہے یہ اشارہ کرنے کیلئے کہ معطوف اور ماقبل کا ایک ہی رتبہ ہے یعنی جہاد حکمی ہے۔

''بخيرٍ'': یہ آخری جملے کیلئے قید ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ''یخلف''کے متعلق ہے اور اس کے فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے۔اس قید کو اس وجہ سے ذکر فرمایا کہ بعض دفعہ اس دیکھ بھال میں خیانت کا ارادہ ہوتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ ان سب جملوں کیلئے قید واقع ہو رہا ہو اور مراد اس سے خیر کی نیت ہو جس کو اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں''أو يخلف'' کا عطف''يجهز'' پر ہے اور جازم کا اعادہ اس لئے نہیں کیا تاکہ اس کے استقلال کا توہم نہ ہو اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کو سامان مہیا کرنا اور غازی کے اہل وعیال میں خیر کے ساتھ رہنا بنفس نفیس جہاد میں شریک ہونے کے برابر نہیں ہے اس جملہ کا جواب شرط یہ ہے:''اصابه الله بقارعةٍ''''باء''تعدیہ کیلئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایسی مصیبت ہوگی جو اس کو ہلاک و برباد کر دے گی۔اسی لئے قیامت کو''قارعة'' کا نام ہے۔

فائدہ :اگر اس حدیث اور ماقبل کو جمع کر کے یوں فرما دیتے:''رواهما أبو داود'' تو مختصر ہو جاتا جیسا کہ مصنف کی عادت ہے۔

امام ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

من لقي الله بغير أثر من جهاد لقي الله وفيه تلمة

''ثلمة'' ثا مثلثہ کے ضمہ کے ساتھ بمعنی عیب ونقص۔

۳۸۲۱: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : جَاهِدُوْا الْمُشْرِكِیْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ ۔ (رواه ابوداد والنسائي والدارمي)

اخرجه ابو داود في السنن ۳ / ۲۲ والنسائي في السنن ٦ / ۷' الحديث رقم: ۳۰۹٦' والدارمي' كتاب الجهاد' باب في جهاد المشركين۔في ۲ / ۲۸۰' الحديث رقم ۲٤۳۱' وأحمد في المسند ۳ / ۱۲٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مشرکین (یعنی دشمنانِ اسلام) سے تم اپنے مال' اپنی جان اور اپنی زبان کے ذریعہ جہاد کرو''۔ (ابوداؤد' نسائی' دارمی)

تشریح: قوله: ''جاهدو المشركين ......''۔

اس کا ظاہر حرم، اشہر حرم اور ابتداء بالقتال سب کو شامل ہے۔ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کفار سے لڑنا واجب ہے جو عرب کے مشرکین میں سے ہوں اور ابھی تک اسلام نہ لائے ہوں یا غیر مسلم ہوں اور غیر مشرکین میں سے ہوں لیکن وہ جزیہ ادا نہ کرتے ہوں۔ اگر چہ وہ جنگ کی ابتداء ہم سے نہ کریں پھر بھی ان سے لڑنا واجب ہے۔ اس لئے کہ دلائل ان کی طرف سے ابتداء کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ برخلاف حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کے کہ وہ اس کو ان کی طرف سے ابتداء اور زمانۂ خاص کے ساتھ مقید مانتے ہیں جیسا کہ اشہر حرم وغیرہ ہیں۔ برخلاف عطاء کے کہ وہ اس کو اس زمانۂ خاص کے ساتھ مقید مانتے ہیں۔ لیکن حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے یہ بات بعید ہے اور ان کا استدلال اس آیت سے ہے: ﴿**فان قاتلو كم فاقتلوهم فانه لا يخفى عليه**﴾ [البقرة۔ ۱۹۱] اس لئے کہ ان آیت کا نسخ اس پر مخفی نہیں ہے اور صحیحین میں آپ ﷺ کی صریح حدیث ہے:

''أمرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا: لا اله الاّ اللّٰه''۔

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ اس کلمہ کا اقرار نہ کرلیں''۔

ادنیٰ تأمل سے بھی اس حدیث سے ان سے جنگ کی ابتداء واجب معلوم ہوتی ہے اور نبی ﷺ نے ذی الحجہ کے آخری دس دنوں سے لے کر محرم کے آخر تک یا ایک مہینہ تک اہل طائف کا محاصرہ کئے رکھا اور اشہر حرم میں جنگ کی حرمت پر اس آیت سے نسخ کا حکم لگایا گیا ہے: ﴿ **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ** ﴾ [التوبة۔ ۵] ''تم مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو'' اور یہ مطلب مبنی ہے کہ لفظ ''حیث'' کو زمان کے لئے مانا جائے۔ ''حیث'' بکثرت زمان میں ہے۔

قوله: جاهدو المشركين باموالكم وانفسكم والسنتكم

بذات خود بھی اس میں شرکت کرو اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دو۔

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زبان سے جہاد کرو کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مذمت بیان کرو' عیب جوئی کرو، ان کے بتوں اور دین باطل کو برا بھلا کہو اور یہ کہ ان کو قتل اور گرفتاری وغیرہ کی دھمکی کے ذریعہ ڈراؤ۔

یہاں اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہ تو قرآن پاک کے حکم کے خلاف ہے:
﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾[الأنعام۔ ۱۰۸]
ترجمہ: ''ان لوگوں کو برا بھلا مت کہو کہ جو اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارتے ہیں اس لئے کہ وہ اللہ کو برا بھلا کہیں گے دشمنی کی وجہ سے، لاعلمی میں''۔

جواب یہ ہے کہ ابتداء میں مسلمان ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا کرتے تھے تو ان کو اس سے روک دیا گیا تا کہ مسلمانوں کا ان کو برا بھلا کہنا سبب نہ بن جائے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے کا۔ یہاں پر نہی ''فعل معلل'' پر وارد ہے۔ اس لئے جب ان کو برا بھلا کہنا اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے کا سبب نہ بنے تو (یہ برا بھلا کہنا) جائز ہے۔ اھ

یہ محل نظر ہے کیونکہ یہ تو ایک غالب سبب ہے اور یہ بات کہ مسلمانوں کا گالی دینا اللہ کو گالی دینے کا سبب نہ بنے، یہ ایک امر موہوم ہے۔ اس لئے نہی خود بخود متعین ہوگئی۔ مزید یہ کہ شرعی احکام امور غالبیہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہاں استواء اور احتمال کی صورت میں نہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ہاں یہ بات ممکن ہے کہ یہ نہی اس بات پر وارد ہو کہ ابتداء مؤمنین کی طرف سے ہو۔ اس لئے کہ بسا اوقات یہ گالی اللہ کو برا بھلا کہلوانے کا سبب بنتی ہے جب ابتداء ان کی طرف سے ہو تو تب ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ خوف ان کفار کے بارے میں ہے کہ جن پر جہل اور بے وقوفی عام و غالب ہو۔ چونکہ ان کی اکثریت تو اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتی ہے اور یہ کہتے ہیں: [هٰؤلاء شفعاء نا عند اللّٰه ۔ ولئن سألتهم من خلق السمٰوٰت والأرض ليقولن اللّٰه]

تخریج: اس حدیث کو اسی طرح امام احمد، ابن حبان اور حاکمؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

جنت مجاہد کی میراث ہے

۳۸۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :اَفْشُوْا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوْا الطَّعَامَ وَاضْرِبُوْا الْهَامَ تُوْرَثُوْا الْجِنَانَ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

اخرجه فی الترمذی کتاب الاطعمه' باب ما جاء فی فضل اطعام الطعام' ٤ / ٢٥٢' الحدیث رقم : ١٨٥٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سلام کو عام کرو (یعنی ہر آشنا و ناآشنا کو سلام کرو) اور (غریب ومحتاج لوگوں کو) کھانا کھلاؤ اور کفار کی گردنیں مارو' جنت کے وارث بنائے جاؤ گے۔ (ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام اس ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قوله: فسوا السلام:
''افشوا'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔
''السَّلام'' یہ امر وجوب کیلئے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ استحباب کیلئے ہو۔ اس صورت میں اس سے مراد ''سلام'' سلام

کے جواب کی فرضیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشادگرامی سے مفہوم ہوگی: ﴿ وَإِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَا﴾ [النساء:٨٦]

اور یہ ایسی سنت ہے جو فریضہ سے افضل ہے۔ یہ مسئلہ غرائب میں سے ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''افشاء السّلام'' سے مراد یہ ہے کہ اس کا اظہار کیا جائے بآواز بلند کیا جائے۔ یا یہ کہ اس کو پھیلایا جائے اس طور پر کہ آپ کو جو بھی نظر آئے اسے سلام کریں۔ چاہے آپ اس کو پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں اھ اور ظاہراً دوسرا معنی زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ عدم اظہار اور عدم رفع الصوت کی صورت میں سلام نہیں کہلاتا چہ جائے کہ وہ افشاء سلام بن جائے۔ ''قوله: اطعموا الطعام'': کھانا کھلاؤ اس لئے کہ کھانا کھلانا عزت والوں کا شیوہ ہے۔ خصوصاً فقراء، مساکین اور یتیموں کو کھانا کھلانا۔

''قوله: واضربوا الهام تور ثوا الجنان:

''هام'': ''هامه'' کی جمع ہے میم کی تخفیف کے ساتھ ہے اور ''سر'' کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ کفار کے سروں کو کاٹو! اور یہ دراصل جہاد سے کنایہ ہے۔

''تورثوا'' ''ایراث'' سے مجہول کا صیغہ ہے۔

'الجنان'': یہ جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں ان عظیم خصلتوں کے اختیار کرنے پر جنتوں میں نعمتوں کے باغات دیئے جائیں گے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿ وتلك الجنة التی او رثتموها بما كنتم تعملون﴾ [الزخرف-٧٢]

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ضرب الهام'' سے مراد جہاد ہے اور مجاہدین کے ان افعال پر چونکہ جنت حاصل ہوتی ہے تو گویا کہ وہ ان اعمال کے بدولت جنت کے وارث ہو گئے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں اشارہ ہے کہ مجاہدات کو اختیار کیا جائے اور شہوات کو ترک کر دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ ان ناپسندیدہ تکلیفات میں سے ہیں جو انسان کو بلند مرتبے اور پاکیزہ پھلوں کا وارث بنا دیتی ہے۔

مجاہد کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی جس کا رشتہ داروں میں سے کوئی فوت ہو جائے اور اس کو میراث کچھ مل جائے جو اس کے غیروں کو نہیں ملتی اور اسی وجہ سے صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے: ''حفت الجنة بالمكاره'' ''وحفت النّار بالشهوات۔

''أفسوا السلام تسلموا''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اپنی تاریخ میں اور ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں اور ابن حبان و بیہقی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے: ''أفشوا السلام بينكم تحابوا''

اس روایت کو حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے: ''أفشو السّلام فان لله تعالٰى رضا''
اس کو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''أوسط'' میں نقل کیا ہے۔
اور ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الکامل'' میں اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے: ''أفشوا السّلام......''۔

اور ابن ماجہ کی روایت حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ نقل ہے:
''افشوا السّلام واطعموا الطعام وكونوا اخوانًا كما امركم الله تعالٰى''
اور طبرانی نے حضرت ابوامامہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:
''أفش السّلام وابذل الطعام واستحيى من الله تعالٰى كما تستح رجلاً أى من رهطك ذاهيئةٍ ولتحسن خلقك واذا أسأت فأحسن فان الحسنات يذهبن السيئات''۔

مجاہد پہرہ دار کا اجر و ثواب

۳۸۲۳: عَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ كُلُّ مَيِّتٍ يُخْتَمُ عَلٰى عَمَلِهٖ اِلَّا الَّذِىْ مَاتَ مُرَابِطًا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَاِنَّهٗ يُنْمٰى لَهٗ عَمَلُهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ يَاْمَنُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ۔

(رواه الترمذى وابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن كتاب فضائل الجهاد، باب ما جاء فى فضل، ۳ / ۲۰، الحديث رقم: ۲۵۰۰، والترمذى فى السنن ٤ / ١٤٢، الحديث رقم ١٦٢١، وأحمد فى المسند ٦ / ٢٠

ترجمہ: ''اور حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر میت اپنے عمل پر اختتام پذیر ہوتی ہے (یعنی ہر شخص کا عمل اس کی زندگی تک رہتا ہے مرنے کے بعد اس کا عمل اس طور پر باقی نہیں رہتا کہ اس کو نیا ثواب ملتا رہے) سوائے اس شخص کے جو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں پاسبانی کرتا ہوا مر گیا تو اس کے لئے اس کا عمل قیامت کے دن تک بڑھا دیا جاتا ہے اور وہ قبر کے فتنہ و عذاب سے مامون رہتا ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: ''قوله: فانه ينمى له عمله الٰى يوم القيامة'':
وجہ اس کی یہ ہے کہ اس (شہید) نے شمنان دین کے خلاف اپنی جان کو اس چیز پر قربان کر دیا جس کا نفع مسلمانوں کی طرف لوٹتا ہے اور وہ نفع ہے دین کا احیاء۔

قوله: ''ويأمن فتنة القبر'':
اس اجر کے ساتھ ساتھ اس کو قبر کے عذاب سے بھی امن دیا جاتا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز ہو جاتا ہے جیسا کہ ''مسلم شریف'' کی حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:——

''اذا مات الانسان انقطع عمله الاّ من ثلاثۃٍ :الاّ من صدقة جارية أو علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله''۔

''جب انسان مرجاتا ہے اس کے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں مگر تین اعمال منقطع نہیں ہوتے۔(ان کا ثواب برابر ملتا ہے) ① صدقہ جاریہ ہو ② یا علم نافع ہو اور ③ ایسی اولاد چھوڑی ہو جو اس کیلئے دعا کرتی ہو۔''

۳۸۲۴:ورواه الدارمی عن عُقبةَ بن عامرٍ۔

اخرجه الدارمی فی السنن ٢ / ٢٨٧' الحديث رقم ٢٤٢٥

ترجمہ:''اوردارمی نے اس روایت کوعقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے''۔

تشریح: جامع صغیر میں اس طرح منقول ہے:''ويأمن من فتان القبر''۔

اس روایت کوامام احمد ٔابوداؤداورترمذی نے''فضالہ'' سے نقل کیا ہے اور ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اورامام احمد نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تھوڑی دیر جہاد کرنے کی فضیلت

۳۸۲۵:وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :مَنْ قَاتَلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَوَاقَ نَاقَةٍ فَقَدْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ' وَمَنْ جُرِحَ جُرْحًا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ نُكِبَ نُكْبَةً فَاِنَّهَا تَجِیْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاَغْزَرِ مَا كَانَتْ' لَوْنُهَا الزَّعْفَرَانُ وَرِيْحُهَا الْمِسْكُ' وَمَنْ خَرَجَ بِهٖ خُرَاجٌ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنَّ عَلَيْهِ طَابَعَ الشُّهَدَاءِ۔ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی)

اخرجه أبو داود فی السنن ٣ / ٤٦ كتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فيمن يكلم' الحديث رقم ٢٥٤١' والترمذی فی السنن ٤ / ١٥٨' الحديث رقم ١٦٥٧' والنسائی فی ٦ / ٢٥' الحديث رقم ٣١٤١' وابن ماجه فی ٢ / ٩٣٣' الحديث رقم ٢٧٩٢' والدارمی فی ٢ / ٢٦٥' الحديث رقم ٢٣٩٤' وأحمد فی المسند ٥ / ٢٣٠

ترجمہ:''اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اللہ کی راہ میں اونٹنی کے فواق کے بقدر (یعنی تھوڑی دیر کے لئے) بھی جہاد کیا' اس کے لئے (ابتداءً) ہی جنت واجب ہوگئی اور جو شخص اللہ کی راہ (جہاد) میں ہتھیاروں سے زخمی ہوا یا وہ کسی زخم کی تکلیف میں مبتلا ہوا تو وہ زخمی قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا جیسا کہ وہ دنیا میں تھا (یعنی وہ شخص قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا وہ زخم زیادہ تازہ حالت میں ہوگا) اور اس زخم کا رنگ زعفران جیسا اور اس کی بومشک جیسی ہوگی اور جس شخص کے (بدن میں) اللہ کی راہ (جہاد) میں پھوڑا نکلا تو (قیامت کے دن) اس (پھوڑے یا پھوڑے والے) پر شہیدوں کی مہر ہوگی (یعنی اس شخص کے ساتھ شہیدوں کی علامت ہوگی تا کہ پہچانا جائے کہ اس شخص نے دین کی سربلندی وحفاظت کے لئے جدوجہد کی تھی چنانچہ اس کو وہی اجر وانعام دیا جائے گا جو مجاہدین اسلام کو ملے

گا)۔''۔

تشریح: قوله:من قاتل فی سبیل الله ۔۔وجبت الجنة:

''فواق ناقۃٍ'':فواق دراصل فاء کے فتحہ اورضمہ دونوں کے ساتھ نقل ہے'دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کو کہتے ہیں۔

''الفائق''میں ہے کہ اصل میں''فواق'' کہتے ہیں دوہنے کے بعد دودھ کا تھنوں میں آنا اور''فواق''اس وجہ سے کہتے ہیں کیونکہ دودھ اوپر سے اترتا ہے۔اھ۔

''فواق ناقة'' کے معنی میں دواحتمال ہیں۔

ایک یہ کہ صبح کے درمیانی حصہ سے عشاء تک کا وقت مراد ہو۔کیونکہ اکثر انہی دواوقات میں اونٹنی وغیرہ کا دودھ دوہا جاتا ہے۔دوسرے یہ کہ اس سے مرادظرف ہے کہ تھنوں سے دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کو کہا جاتا ہے۔اس لئے کہ پہلے اس سے تھوڑا دودھ دوہا جاتا ہے پھر تھوڑی دیر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کے اس بچہ کو دودھ پلایا جاتا ہے تا کہ دودھ اتر آئے۔پھر دوبارہ اس کو دوہا جاتا ہے اور یہی آخری معنی ترغیب فی الجہاد کے زیادہ مناسب ہے۔یعنی جس نے ایک لحہ کیلئے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اس کے لئے یہ اجر ہے۔

''فقد وجبت له الجنة'':ابتداءًاس کے لئے جنت واجب ہوگئی یا یہ کہ وہ جنت کا مستحق بن گیا۔

قوله:ومن جرح جرحا فی سبیل الله...... فانهاتجی یوم القیامة:

''جُرِح'':مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

''جرحًا'':جیم کے ضمہ اورفتحہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔یہ مصدر ہے۔

''فی سبیل الله'':(جارمجرورمحذوف کے ساتھ مل کر''جرحا'' کی صفت ہے)أی جراحة کائنة ۔

''او نکب'':مجہول کا صیغہ ہے اور''اَوْ'' تنویع کیلئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ اس کو جہاد میں کوئی حادثہ پیش آیا اور اس کو دشمن کے علاوہ کسی اور سے زخم آگیا اور بعض کا قول ہے کہ''جرح''اور''نکبة'' دونوں ایک ہی چیز ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس میں فرق ہے۔''جرح''اس زخم کو کہتے ہیں جو کفار کے فعل سے آئے اور''النکبة''اس زخم کو کہتے ہیں کہ جو اپنی سواری سے گر جانے یا اس کو اپنا اسلحہ وغیرہ لگ جانے سے پیش آئے۔ملاعلی قاری رحمۃ اللہ نے اسی دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے اور حضور ﷺ سے منقول ہے:

''هل انت الا اصبع دمیت وفی سبیل الله مالقیت''۔

''النہایہ''میں ہے:**نکبت اصبعه۔ ای نالتها الحجارة والنکبة ما یصیب الانسان من الحوادث ۔**

''فانها'':اس کی ضمیر''النکبة'' کی طرف راجع ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلے دو چیزیں گزری ہیں۔''الجرح والنکبة''۔''نکبة''ہراس زخم کو کہتے ہیں کہ جو پتھر لگنے سے آئے اور یہاں پر ضمیر کو''نکبة'' کی طرف لوٹایا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ اگر اتنے چھوٹے زخم سے انسان کو اتنا بڑا مقام ملتا ہے تو تیر اور تلوار کے گھاؤ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے اور اسی کی نظیر اور مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول

ہے: ﴿والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها﴾[التوبة:۳٤]
یا یہ کہا جائے کہ ضمیر کو مفرد لائے ہیں۔ اس وجہ سے کہ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے اور وہ ہے وہ مصیبت جو اللہ کی راہ میں پیش آئی ہے۔

قوله: ''كأغزر ما كانت'':

أی كأكثر أوقات أكوانها فی الدنيا۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کاف'' زائدہ ہے ''ما'' مصدریہ ہے اور ''وقت'' مقدر ہے۔ أی: **حينئذٍ تكون غزارة دمه أبلغ من سائر أوقاته ۔اھ۔**

لیکن زیادہ واضح یہ ہے کہ یہ کاف زائدہ نہیں ہے اور مراد یہ ہے کہ ''جراحة'' اور ''نكبة'' دونوں قیامت کے دن اس سے زیادہ ہوں گے جتنے وہ دنیا میں تھے۔

قوله: ''لونها الزعفران، وريحها المسك'': ان دونوں میں تشبیہ بلیغ ہے۔ **قوله: ''ومن خرج به ......'':**
یہاں پر ''باء'' الصاق کے لئے ہے۔ **اى ظهر به** ''خراج'' خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ پھوڑا، پھنسی وغیرہ۔
''**عليه**'': ضمیر کا مرجع دو چیزیں ہوسکتی ہیں: ① نفس خراج مراد ہے۔ ② اس سے مراد صاحب الخراج والقرح ہے۔
''**طابع الشهداء**'': ''طابع'' ''باء'' کے فتحہ کے اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے اور اس سے مراد مہر یعنی علامت شہداء ہے۔ تاکہ اس بات کا پتہ چلے کہ اس نے اعلاء دین کیلئے کوشش کی ہے اور اس کو مجاہدین کا بدلہ دیا جائے گا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قرینہ اور ماقبل کے دونوں قرینوں کی نسبت مبالغہ میں ترقی ہے۔ ان مصائب میں جو مجاہد کو اللہ کے راستے میں مشکلات میں سے پیش آتی ہیں۔ یعنی کبھی دشمن کی طرف سے کبھی کسی اور طرف سے اور بسا اوقات اپنی طرف سے بھی۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

من قاتل فی سبيل الله فواق ناقةٍ حرم الله علی وجهه النار۔

۳۸۲٦: وَعَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ اَنْفَقَ نَفَقَةً فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كُتِبُ لَهٗ بِسَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی' كتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی فضل النفقة فی سبيل الله' الحديث رقم: ١٦٢٥' والنسائی فی ٦ / ٤٩' الحديث رقم ٣١٨٦' وأحمد فی المسند ٤ / ٣٤٥

ترجمہ: ''اور حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں اپنے مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کیا (خواہ چھوٹی چیز' خواہ بڑی چیز) اس کے لئے سات سو گنا ثواب لکھ دیا جاتا ہے''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ''كتب له سبعمائة ضعف'':
اس کو اس نفقہ کا سات سو گنا زیادہ اجر ملے گا اور یہ تو اقل موعود ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی بڑھائے گا جس کیلئے چاہے۔

تخریج: اس روایت کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور حاکم نے بھی نقل کیا ہے۔

بہترین صدقہ کون سا ہے؟

۳۸۲۷: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَفْضَلُ الصَّدَقَاتِ ظِلُّ فُسْطَاطٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمِنْحَةُ خَادِمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ' اَوْ طَرُوْقَةُ فَحْلٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی' ٤ / ١٤٤ کتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی فضل الخدمة' الحديث رقم ١٦٢٧ وأحمد فی المسند ٥ / ٢٧٠

ترجمہ: ''اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی راہ میں (کسی مجاہد' حاجی یا علم دین کے طالب کو) خیمہ کا سایہ دینا اللہ کی راہ میں خادم دینا اور اللہ کی راہ میں اونٹنی دینا (جو نر کی جفتی کے قابل ہو) سب سے افضل صدقہ ہے۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: افضل الصدقات ظل فسطاط سبیل الله:

''فسطاط'': ''فاء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کسرہ بھی پڑھا ہے۔ ''خیمہ'' خواہ بڑا ہو یا چھوٹا۔

اور ''الفائق'' میں ہے: ضرب من الابنية فی السفر دون السرادق ''اور ''التهذيب'' میں ہے کہ ''فسطاط'' بالوں سے بنائے گئے گھر کو کہتے ہیں اور اس میں چھ لغات ہیں: تین فاء کے ضمہ کے ساتھ، اور تین فاء کے کسرہ کے ساتھ ہیں۔

فسطاط، فستاط، فساط ''فاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ضمہ کی لغت ''اجود'' ہے۔

''فی سبیل الله'': یہ عام ہے۔ چاہے وہ یہ غازی کو دے یا حاجی کو دے، یا اس کے علاوہ کسی اور نیک کام میں دے، یا کسی کو عاریۃً دے دے یا کسی کو سائے کیلئے اپنے خیمہ میں شریک کرلے سب اس میں داخل ہیں۔

قوله ومنحه خادم فی سبیل الله: ''منحة'' میم کے کسرہ کے ساتھ ہے اور الجامع کی روایت: ''أو منحة خادم'' ہے اور مراد یہ ہے کہ چاہے اس کو اس کی ملکیت میں دے دے یا اس کو عاریۃً دے دے۔ اس سے خود اپنی خدمت کیلئے رکھے گئے خادم کا حکم بطریق اولیٰ معلوم ہو رہا ہے۔

''قوله: فی سبیل الله''

''طروقة'': طاء کے فتحہ اور ''راء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

''طروقة الفحل'' وہ اونٹنی جو اتنی عمر کو پہنچ چکی ہو کہ نر کے ساتھ جفتی کے قابل ہو اور اس قید کو ذکر کرنا افضل کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح اگر منحة کو ملکیت کے ساتھ مقید کر دیا جائے۔

اور ''النہایہ'' میں ہے کہ ''منحة اللبن'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کو اونٹنی دے دے یا بکری دے تاکہ وہ اس کے دودھ سے کچھ عرصہ فائدہ اٹھاتا رہے اور اس کے بعد اس کو لوٹا دے۔ بسا اوقات ''منحة'' کا لفظ مطلقاً هبه پر بھی بولا جاتا ہے، قرض اور عاریت پر نہیں بولا جاتا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''أو طروقة فحل'' کا عطف ''منحة خادم'' پر ہے۔ مضاف کو حذف کر دیا اور مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام کر دیا گیا۔ یعنی ''منحة ناقةٍ'' اور بظاہر یوں کہنا چاہئے تھا:
''منحة فسطاط'' جیسا کہ ''الغریبین'' میں ہے۔ سایہ کو اس کی جگہ ذکر کیا اس لئے کہ اسکی غایت منفعت مقصود سایہ کا حصول ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو ترمذی اور احمد نے عدی بن حاتمؓ سے روایت کیا ہے اور طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''أفضل الصدقة المنح ان تمنح الدرهم او ظهر الدابة''۔

اللہ کے راستہ کا گرد و غبار اور جہنم کا دھواں

۳۸۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :لَا يَلِجُ النَّارَ مَنْ بَكٰى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِى الضَّرْعِ وَلَا يَجْتَمِعُ عَلٰى عَبْدٍ غُبَارٌ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ فِىْ مَنْخِرَىْ مُسْلِمٍ اَبَدًا (وَفِىْ اُخْرٰى لَهٗ) فِىْ جَوْفِ عَبْدٍ اَبَدًا وَلَا يَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَ الْاِيْمَانُ فِىْ قَلْبِ عَبْدٍ اَبَدًا . (رواه الترمذی وزاد النسائی فی اخری)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٧٤ كتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی فضل الغبار' الحديث رقم: ١٦٣٣' والنسائی فی ٦ / ١٢' الحديث رقم ٣١٠٧' وابن ماجه فی ٢ / ٩٢٧' الحديث رقم ٢٧٧٤' وأحمد فی المسند ٢ / ٥٠٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ شخص دوزخ میں نہیں جائے گا جس نے اللہ کے خوف کی وجہ سے گریہ وزاری کی ہو یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس نہ چلا جائے اور کسی بندے میں اللہ کی راہ کا گرد و غبار اور دوزخ کا دھواں جمع نہیں ہو سکتے (یعنی جس مسلمان کا جسم خدا کی راہ یعنی جہاد میں غبار آلود ہوا اس کو دوزخ کا دھواں چھو بھی نہیں سکتا۔ حاصل یہ کہ مجاہد دوزخ میں نہیں جائے گا۔) (ترمذی) اور نسائی نے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ اور کسی مسلمان (کی ناک) کے دونوں نتھنوں میں (خدا کی راہ کا غبار اور دوزخ کا دھواں) کبھی بھی کس ع نہیں ہو سکتے اور نسائی ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ بندے کے پیٹ میں خدا کی راہ کا گرد و غبار اور دوزخ کا دھواں کبھی بھی جمع نہیں ہو سکتے اور کسی بندے کے دل میں (کامل) ایمان اور بخل کبھی بھی جمع نہیں ہو سکتے''۔

تشریح: ''قوله: لایلج النار من بکی من خشية الله حتی یعود اللبن فی الضرع:''
اس لئے کہ خشیت میں غالب یہ ہے کہ طاعات کو بجا لایا جائے اور معصیت سے اجتناب کیا جائے۔
''حتی یعود اللبن فی الضرع'': یہ ''تعليق بالمحال'' کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:
﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الاعراف: ٤٠]

قوله :"ولا یجتمع علی عبد غبار فی سبیل اللّٰه دوخان جهنم": گویا کہ یہ دونوں ضدین ہیں جن کا اجتماع محال ہے جس طرح دنیا اور آخرت بھی ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔

تخریج: اس روایت کو نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

"منخری": "میم" کے فتحہ اور خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور یہی زیادہ صحیح اور فصیح ہے۔

"الصحاح" میں ہے کہ "منخر" سے مراد ناک کا سوراخ ہے اور بعض دفعہ "منخر" کے "میم" کو بھی "خاء" کی وجہ سے اتباعاً کسرہ دیا جاتا ہے۔ "القاموس" میں ہے کہ "المنخر" میم اور خاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ' دونوں کے کسرہ کے ساتھ اور دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسا کہ "مجلس" ہے۔ ناک کا سوراخ۔

الضیاء میں لکھتے ہیں **بحقیقته موضع النخر وهومد النفس فی الخیاشیم**

اور مطلب یہ بنے گا کہ مسلمان کی ناک کے سوراخوں میں غبار اور جہنم کا دھواں جمع نہیں ہو سکتا۔

قوله:"فی جوف عبدٍ أبدًا":

یعنی اس میں غبار کا داخل ہونا۔ دخول غبار دخان جہنم کے امتناع کا سبب بنے گا۔ وگرنہ اجتماع نقیضین لازم آئے گا۔

قوله :ولا یجتمع الشح و الایمان فی قلب عبدا بداً:

یعنی وہ بخل جو واجب کو روک دے یا ظلم کا سبب بن جائے، ایسا بخل اور ایمان کامل ایک جگہ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

کشاف میں لکھا ہے کہ "الشح" کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ بمعنی "لوم" (ملامت) ہے اور یہ انسان کے نفس کا منع کرنے پر حریص و بخیل ہونا بسا اوقات اس کی اضافت "نفس" کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے: ﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [التغابن:١٦]۔ اس لئے کہ یہ "شح" اس کی طبیعت بن چکی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ [الاسراء۔۱۰۰] اور بعض علماء نے کہا ہے کہ منسوخ آیات میں سے ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

لو کان لابن آدم وادیان من ذهبٍ لا بتغی ثالثًا ولن یملأ جوف ابن آدم الا التراب ویتوب اللّٰه علٰی من تاب۔ اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری چاہے گا اور ابن آدم کے پیٹ کو تو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی توجہ قبول کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔

اور بخل کہتے ہیں: **المنع نفسه**: اس کا معنی ہے اپنے نفس کو روکنا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں "بخل" "شح" سے اعم ہوگا۔ اس لئے کہ بعض دفعہ بخل پایا جاتا ہے لیکن وہاں "شح" نہیں ہوتا جبکہ اس کے برعکس نہیں ہو سکتا اور اسی کے مطابق "شرح السنہ" میں منقول ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔ آپؓ نے فرمایا: وہ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ میں سنتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**ومن یوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون**﴾ جبکہ میں ایک آدمی ہوں اور شح غریب کہ میرے ہاتھ سے کوئی چیز نہ نکل پائے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ وہ "شح" نہیں ہے جس کا ذکر اللہ

تعالیٰ نے کیا ہے۔"شح"تو دراصل یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی کا مال ظلماً کھائیں لیکن یہ تو بخل ہے اوبخل بدترین چیز ہے۔
ابن جبیر فرماتے ہیں کہ"شح"حرام کو اپنے مال میں شامل و داخل کرنے اور زکوٰۃ روکنے کو کہتے ہیں۔
امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اتقوا الشح ، فان الشح اهلك من كان قبلكم حملهم ان يسفكوا دمائهم ويستحلوا محارمهم۔

واضح رہے کہ درحقیقت انسان ان تین چیزوں سے عبارت ہے ① روح ② نفس ③ قلب ۔اس کی طرف شیخ الاسلام ابوحفص السہر وردی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے اور"قلب"کو"قلب"اسی لئے کہتے ہیں کہ کبھی تو یہ روح کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور اسی کی صفات کے ساتھ متصف ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے یہ روشن وکامیاب ہوجاتا ہے اور بعض دفعہ یہ نفس کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو یہ ظالم بن جاتا ہے۔پس جب یہ روح کی صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔تو روشن ہوجاتا ہے اور پھر یہ ایمان اور عمل صالح کا ٹھکانہ بن جاتا ہے۔جس سے یہ کامیاب ہوجاتا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[البقرۃ۔۵] جب یہ نفس کی صفات کے ساتھ متصف ہوتا ہے تو ظلم کرنے لگتا ہے اور بخل وشح کا ٹھکانہ بن جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ نامراد ہوجاتا ہے اور کامیاب نہیں ہوتا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ﴿وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[الحشر۔۹]۔تو پھر یہ ایک دل میں کیسے جمع ہوسکتے ہیں۔اھ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دل میں کامل طور جمع نہیں ہوسکتے اس لئے اس کے ساتھ ملنے والی چیز کبھی اس کے دل کو روح کی طرف مائل کردیتی ہے جس کی وجہ سے اس سے رذیل خصلتیں زائل ہوجاتی ہیں اور بسا اوقات یہ نفس کی طرف مائل ہوجاتا ہے جس سے اس میں دوبارہ ذمیم اور بری خصلتیں آجاتی ہیں اور بسا اوقات ایک ہی وقت میں دونوں طرف جولان ومیلان ہوتا ہے جیسا کہ آئینہ میں"جولان"دونوں طرف ہوتا ہے۔یعنی انطباع اور انعکاس دونوں ہوتے ہیں اور حدیث میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

ان القلوب بين أصبعين من أصابع الرحمن يقلبها كيف يشاء کہ دل"رحمٰن"کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں جیسے چاہتا ہے ان کو الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے۔اس کو ترمذی نے نقل کیا ہے۔

اور احمد بن حنبل کی ایک روایت میں ہے:

مثل القلوب كريشة بأرض فلاة يقلبها الرياح ظهر البطن دلوں کی مثال بے آب وگیاہ زمین میں پڑے ہوئے پر کی طرح ہے۔ہوا جیسے چاہے اس کو الٹ پلٹ کردیتی ہے اور اہل مشاہدہ کے ہاں یہ بات مشاہد ہے۔اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ فرمایا کرتے تھے:

"يا مقلب القلوب ثبت قلبي علٰى دينك"

اور دوسری حدیث میں ہے:

"لا تكلني الٰى نفسي طرفة (عين) فانك ان تكلني الى نفسي تكلني الٰى ضعف وعورة وذنب وخطيئة "۔مزید تفصیل کے لئے"احیاء العلوم"کی طرف رجوع کیا جائے"۔

۳۸۲۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَيْنَانِ لَا تَمَسُّهُمَا النَّارُ: عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٥٠، کتاب فضائل الجهاد، باب ما جاء فی فضل الحرس، الحديث رقم: ١٦٣٩۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دو آنکھیں ایسی ہیں جن کو دوزخ کی آگ چھو بھی نہ سکے گی ایک تو وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی ہو اور دوسری وہ آنکھ ہے جس نے اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں (کفار سے مجاہدین کی) نگہبانی کرتے ہوئے رات گزاری ہو''۔ (ترمذی)

تشریح: ''**عینان لا تمسهما النار**'' ایک روایت میں اس کے ساتھ لفظ ''ابدًا'' بھی ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان کو ادنیٰ مصیبت بھی نہیں پہنچے گی اور ایک روایت میں ''**لا تریان النار**'' کہ وہ آگ نہیں دیکھیں گی اور دوسری روایت ''ابدًا'' کی زیادتی ہے۔

''**عین بکت من خشية الله**''۔ یہ مرتبہ دراصل ان لوگوں کا ہے کہ جو نفس کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ چاہے وہ عالم ہوں یا غیر عالم ہوں۔

''**وعین باتت تحرس**'' اور دوسری روایت میں ''تکلأ'' ہے۔

''**فی سبيل الله**'' یہ ان لوگوں کا مقام ہے جو عبادت میں انتہائی کوشش کرتے ہیں اور عبادت عام ہے چاہے حج ہو، طلب علم ہو، جہاد ہو یا کوئی اور عبادت ہو۔ لیکن بظاہر یہ لگتا ہے کہ اس سے مراد مجاہدین کے لئے پہرہ داری کرنے والا ہے۔ تاکہ ان کو کفار سے محفوظ رکھے۔ جبکہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**عین بکت**'' اس شخص سے کنایہ ہے جو عالم بھی ہو، عابد بھی اور نفس کے ساتھ مجاہدہ بھی کرتا ہو اور دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے: **انما يخشى الله من عباده العلمآء** [فاطر۔۲۸]۔ کہ اس آیت کریمہ میں خشیت اور خوف کو علماء میں محصور کیا ہے، ان کے علاوہ کو نکالا ہے۔ چنانچہ یہاں پر ''**عینین**'' کے درمیان نسبت حاصل ہوگئی کہ ایک آنکھ وہ ہے کہ جو نفس اور شیطان کے ساتھ جہاد کرتی ہے اور ایک آنکھ وہ ہے کہ جو کفار کے ساتھ جہاد کرتی ہے اور خوف اور خشیت دو مترادف (معنی) الفاظ ہیں۔

امام غزالی ''احیاء العلوم'' میں فرماتے ہیں کہ ''خوف'' اللہ تعالیٰ کا کوڑا ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے بندوں کو علم و عمل پر مواظبت کرنے کیلئے چلاتا ہے۔ تاکہ وہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے قرب کا مقام حاصل کرلیں۔ اھ۔ لہٰذا ہر ایسا خوف جو مذکورہ فائدہ نہ دے وہ حقیقت میں خوف ہی نہیں ہے اور قول محقق ہے کہ خشیت خوف مع التعظیم خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم شامل ہو۔ مطلق خوف کو ''خشیت'' نہیں کہا جاتا اور اسی وجہ سے یہ خوف کے معنی سے ہے اور ایک شاذ قرأۃ میں اس سے تعظیم مراد لی گئی ہے۔ **انما يخشى الله من عباده العلمآء** [فاطر۔۲۸] اس میں لفظ ''**الله**'' مرفوع ہے اور ''**العلمآء**'' منصوب ہے)

اس کو ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور جامع صغیر میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے: ''**عین بکت فی جوف اللیل من خشية الله**'' اور تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ طبرانی اور ضیاء نے بھی یہ نقل کیا ہے۔ جیسا کہ ہم

نے اشارہ کیا۔

گھر میں ستّر سال تک نماز پڑھنا اور جہاد فی سبیل اللہ

۳۸۳۰:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ مَرَّرَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :بِشِعْبٍ فِيْهِ عُيَيْنَةٌ مِنْ مَاءٍ عُذْبَةٍ فَاَعْجَبَتْهُ فَقَالَ :لَوِاعْتَزَلْتُ النَّاسَ فَاَقَمْتُ فِیْ هٰذَاالشِّعْبِ فَذُكِرَذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَقَالَ :لَا تَفْعَلْ فَاِنَّ مَقَامَ اَحَدِكُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهٖ فِیْ بَيْتِهٖ سَبْعِيْنَ عَامًا' اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَاللّٰهُ لَكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ الْجَنَّةَ؟ اُغْزُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ قَاتَلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَوَاقَ نَاقَةٍ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٥٥' كتاب فضائل الجهاد' باب م اجاء فی فضل الغدو' الحديث رقم ١٦٥٠' وأحمد فی المسند ٢ / ٥٢٤۔

ترجمہ:''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک صحابیؓ پہاڑی کے درہ سے گزرے جس میں شیریں پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ان کو یہ چشمہ بہت اچھا لگا۔وہ کہنے لگے کہ کاش میں لوگوں سے علیحدگی اختیار کرلوں اور اس درے میں رہائش اختیار کرلوں؟ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان صحابی سے فرمایا) کہ تم ایسا نہ کرنا کیونکہ تم میں سے کسی شخص کا اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) قیام کرنا اس کا گھر میں ستّر سال نماز قائم کرنے سے بہتر ہے۔کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کامل طور پر بخش دے اور تمہیں جنت میں داخل کردے' خدا کی راہ میں جہاد کرو کیونکہ جس شخص نے خدا کی راہ میں اونٹنی کے فواق (یعنی اونٹنی کے تھن سے دومرتبہ دودھ نکالنے کے درمیانی وقفہ) کے بقدر (یعنی تھوڑی دیر کے لئے) بھی جہاد کیا اس کے لئے جنت واجب ہوگئی''۔(ترمذی)

تشریح قوله:مرر جل من أصحاب رسول الله ﷺ بشعب۔۔۔فأعجبته:

''شعب'':''شین'' کے کسرہ کے ساتھ ہے، پہاڑ کی گھاٹی، درہ، دو پہاڑوں کے درمیان کا کشادہ راستہ۔

''فيه عيينةٌ'':''عین'' کی تصغیر ہے۔پانی منبع چشمہ۔

''من ماءٍ'':علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''عيينة'' کی صفت ہے۔اس کی مدحت کیلئے لایا گیا ہے۔اس لئے کہ اس میں تنوین تنکیر پانی کی اس نوع پر دلالت کررہی ہے کہ ایسا صاف پانی جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور دل باغ باغ ہوجائے۔

''عذبة'':''عيينة'' کی صفت کی بناء پر''رفع'' کے ساتھ ہے اور جرجوار کی بناء پر''جر'' کے ساتھ بھی ہے۔ای عيينة او طيب ماؤها طيبة اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''عذبة'' دوسری صفت ہے اور یہ صفت ممیّز ہے۔اس کا ذائقہ چونکہ بہت بہترین اور خوشگوار تھا۔اسی وجہ سے اس آدمی کو بڑا اچھا لگا اور لوگوں سے جدا ہونے کی تمنا کی۔

''فاعجبته''یعنی اس آدمی کو وہ چشمہ اور اس کے ساتھ کا علاقہ پسند آ گیا قوله:فقال لواعترالت الناس فا فمت فی

هذا الشعب:۔

''لو اعتزلت الناس'': یہاں پر''لو''تمنی کیلئے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ''لو''''امتناعیہ''ہو۔

''فاقمت فی هذا الشعب''اس جملہ کا عطف''اعتزلت''پر ہے اور''لو''کا جوب محذوف ہے۔ای لکان خیرًا لی۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کئی نسخوں میں''فیه غیضة''کا لفظ پایا ہے یہ درست نہیں ہے اور نہ کسی روایت میں ہے۔قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر نسخوں میں''غیضة من ماءٍ''کا لفظ ہے۔اگر روایت صحیح ہوتو پھر معنی یہ بنے گا: ''غیضة کانت من ماء''یعنی پانی کا گڑھا۔''غاض الماء''سے مشتق ہے پانی زمین میں جذب ہونا۔اس لئے کہ وہ پانی کے جمع ہونے کی جگہ تھی جس میں درخت بھی ہوں اور اس کی جمع''غیاض''اور''أغیاض''آئی ہے۔

''فذکر''مجہول کے ساتھ ہے۔اس صورت میں''ذالك'':اس صحابی کی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اور ایک نسخہ میں''ذکر''صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔یعنی اس شخص نے اجازت طلب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات بذات خود بیان کردی۔

قولہ فقال:''لا تفعل''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے روک دیا۔اس لئے کہ وہ صاحب صحابیؓ تھے اور ان پر جہاد واجب تھا تو ان کا اپنے آپ کو ''نفل''کیلئے فارغ کرنا معصیت تھی۔اس لئے کہ اس سے''ترک واجب''لازم آتا تھا۔اھ۔یہ کلام ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی اتباع میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں جہاد سے فراغت کے بعد یہاں اقامت کا ارادہ کیا ہو جیسا کہ عابدوں اور زاہدوں کی شان ہو اکرتی ہے(کہ وہ عبادت کے لئے الگ تھلگ جگہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں)۔

قولہ:''فان مقام احدکم فی سبیل الله ۔۔۔سبعین عاما:''۔

مقام: میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔بمعنی قیام ہے اور ایک نسخہ میں ضمہ کے ساتھ آیا ہے۔یہ بمعنی اقامة ہے اور اس کا معنی ہوگا حاصل یہ ہے کہ تمہارا اللہ کے راستے میں قیام کرنا اور ثابت قدمی اور دوام کے ساتھ قتال میں شریک ہونا خاص طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے ہوئے اجر مذکور کا باعث ہوگا

''افضل من صلاته فی بیته''یہ جملہ اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ اس کی طلب (یعنی اعتزال من الناس) مفضول تھی حرام نہیں تھی۔

''سبعین عامًا'':اس سے مراد''تحدید''نہیں ہے بلکہ کثرت ہے۔لہٰذا یہ اس حدیث کا منافی نہیں ہے:''مقام الرجل فی الصف فی سبیل الله افضل عند الله من عبادة الرجل ستین سنة''۔

''آدمی کا اللہ کے راستے میں صف میں کھڑا ہونا ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔''

اس روایت کو حاکم نے عمران بن حصین سے نقل کیا ہے۔اور کہا ہے کہ یہ شرط بخاری پر ہے۔ابن عدی اور ابن عساکر نے

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے "قیام أحد كم" کے الفاظ نقل کیا ہے۔

قوله: ألا تحبون ان يغفر الله ......:

''الا'': لام کی تخفیف کے ساتھ تنبیہ کیلئے ہے۔

"أن يغفر الله لكم": مغفرت تامہ مراد ہے۔

''ويدخلكم الجنة: دخول سے مراد دخول اولی ہے۔

''اغزوا في سبيل الله'': یہاں پر اس امر سے مراد، دوام اور استمرار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں جہاد پر مداومت اور ہمیشگی اختیار کرو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں بھی استمرار مراد ہے: ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ﴾ [الاحزاب:١] اے نبی اللہ سے ڈرتے رہئے۔

ایک دن کے پہرے کا اجر وثواب

٣٨٣١: وَعَنْ عُثْمَانَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ يَوْمٍ فِيْهَا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ (رواه الترمذی والنسائی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٦٢، كتاب فضائل الجهاد، باب ما جاء فی فضل المرابط، الحديث رقم: ١٦٦٧، والنسائی فی ٦ / ٤٠، الحديث رقم ٣١٦٩، والدارمی فی ٢ / ٢٧٧، الحديث رقم ٢٤٢٤، وأحمد فی المسند ١ / ٦٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں (کفر کی سرحدوں پر) ایک دن کے لئے بھی نگہبانی کی خدمت کرنا ہزار دن تک مشغول رہنے سے افضل ہے''۔ (ترمذی ونسائی)

تشریح: اس حدیث کے درج ذیل مطلب پر ہو سکتے ہیں:

① یعنی ''رباط'' کے علاوہ دیگر کاموں میں مشغول ہونے سے بہتر ہے۔

② اللہ تعالیٰ کے راستے کے علاوہ کسی اور راستہ میں پہرہ سے بہتر ہے۔ لفظ ''سبیل'' کو مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

''من المنازل'' اس قید سے ''مجاہد فی المعرکہ'' کا حکم مخصوص ہے اور اس کے مستثنیٰ ہونے پر دلائل عقلیہ ونقلیہ دونوں موجود ہیں۔

یہ ''رباط'' (اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پاسبانی) کی اس تفسیر کے منافی نہیں ہے: ''انتظار الصلٰوة بعد الصلٰوة فی المساجد'' کہ اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''رباط'' قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''فذالکم الرباط فذالكم الرباط''۔ اس لئے کہ یہ رباط اس ''رباط فی المعرکه'' سے کم تر ہے بلکہ یہ مؤخر الذکر رباط ''رباط فی المعركة'' کے

مشابہ ہے۔اس لئے کہ یہی اصل ہے۔یا یہ کہ یہ رباط جہاد اکبر کیلئے ہے جیسا کہ وہ رباط جہاد اصغر کیلئے ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر ہے: ﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ [آل عمران۔۲۰۰] اس لئے کہ ''رباط فی المعرکۃ'' کا تذکرہ اور مفہوم اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ جس میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں کہ یہ جمع ہے اور اس پر الف لام استغراقی بھی داخل ہے۔اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ''مرابط'' افضل ہے ''مجاهد فی المعرکۃ'' اور ''منتظر الصلٰوۃ بعد الصلٰوۃ فی المسجد'' سے حالانکہ نماز کے منتظر شخص کے بارے میں فرمایا: ''فذالکم الرباط فذالکم الرباط''۔واضح رہے کہ ہم اس کی تشریح ماقبل میں ذکر کر چکے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس پر ''مرابطۃ'' فرض ہو اور امام نے اس کو متعین کر دیا ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور فرض عین کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کے علاوہ کوئی چیز یا حکم اس سے افضل ہے اسلئے کہ جو چیز متعین ومقرر ہو اس کے خلاف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اس لئے کہ فرض کو چھوڑ کر کسی اور چیز مشغول ہونا معصیت ہے۔

اس کو نسائی نے روایت کیا ہے اور اس سے پہلے بھی اس قسم کی روایتیں گزر چکی ہیں۔

جنت میں داخل ہونے والے پہلے تین افراد

۳۸۳۲:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :عُرِضَ عَلَيَّ اَوَّلُ ثَلَاثَةٍ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ: شَهِيْدٌ وَعَفِيْفٌ مُتَعَفِّفٌ وَعَبْدٌ اَحْسَنَ عِبَادَةَ اللّٰهِ وَنَصَحَ لِمَوَالِيْهِ . (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن' ٤ / ١٥١' كتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی ثواب الشهداء' الحديث رقم : ١٦٤٢' وأحمد فی المسند ٢ / ٤٢٥۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے سامنے سب سے پہلے وہ تین شخص پیش کئے گئے جو شروع ہی میں جنت میں داخل ہوں گے۔ان میں سے ایک شخص تو شہید ہے' دوسرا وہ شخص ہے جو عفت والا ہے۔(یعنی ایسا شخص جو حرام سے بچے اور سوال نہ کرے یعنی فسق و فجور سے بچے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے' طعام ولباس وغیرہ میں قناعت کرے) اور تیسرا شخص وہ غلام (یعنی مملوک) ہے جس نے اپنے اللہ کی بھی اچھی اطاعت وعبادت کی اور اپنے مالکوں سے بھی خیر خواہی کی۔''(ترمذی)

تشریح: قوله:عرض علی أول ثلاثة يدخلون الجنة'':

''یدخلون'':بصیغۂ فعل معروف ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کو مجہول پڑھا جائے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہاں پر ''اوّل جو کہ ''افعل'' کا وزن ہے اس کی اضافت نکرہ کی طرف ہے تا کہ استغراق کا فائدہ حاصل ہو جائے اور اس کا مطلب یہ بنے گا کہ جنت میں داخل ہونے والے تین کے یہ تین داخل ہوں گے۔

اور ''استغراق'' کا فائدہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہ یہاں پر نکرہ کی صفت ہے۔یعنی نکرہ مستغرقہ کی صفت ہے۔اس

لئے کہ نکرہ موصوفہ عام ہوتا ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہوگا: **أول كل ممن يد خل الجنة ثلا ثة ثلاثة هؤ لاء الثلاثة** کہ ہر وہ گروہ جو جنت میں تین تین فرد ہو کر داخل ہوگا' ان سب میں پہلے داخل ہونے والے یہ تین ہوں گے اور اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ''ترتیب ذکری'' جملہ میں ''ترتیب وجودی'' کا فائدہ بھی دیتی ہے۔ اگر چہ یہ کوئی قطعی اور لازمی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ ''آیت وضوء'' میں ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''**ابدأوا بما بدأ اللّٰه به في ان الصفا والمروة من شعائر اللّٰه**''۔

اور ایک روایت میں لفظ ''ثلة'' بھی آیا ہے ثاء کے ضمہ کے ساتھ اور اس سے مراد گروہ ہے پھر جو جنت میں داخل ہوگا۔ ''**ثلاثة**'' رفع کے ساتھ بھی منقول ہے اور لفظ ''اوّل'' کا ضمہ مبنی ہونے کی وجہ سے ہوگا۔ جیسا کہ لفظ ''قبل اور بعدُ'' کا ضمہ ہے یہ ''عرض'' کیلئے ظرف ہوگا اور عبارت اس طرح ہوگی: ''**عرض علي اول اوقات العرض ثلاثة، أو ثلة يدخلون الجنة**''۔

قوله: شهيد

شہید کی وجہ تسمیہ:

''**شهيد**'' فعیل کے وزن پر اسم فاعل یا اسم مفعول کے معنی میں ہوگا۔ ''شہید'' کی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال ہیں:

① علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں **انما سمي الشهيد شهيدا لانه حيي فكان روحه شاهدة أي حاضرة** شہید کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے وہ زندہ ہوتا ہے گویا اس کی روح حاضر ہوتی ہے

② بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ''شہید'' بمعنی ''مشہود'' (جس کی گواہی دی گئی ہو) ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس کیلئے جنت کی گواہی دیتے ہیں۔

③ بعض کا قول ہے کہ خروج روح کے وقت وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو دیکھتا ہے جو اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے تیاری کی ہے۔

④ بعضوں نے کہا ہے کہ اس کیلئے ایمان کی گواہی دی جائے گی۔

⑤ بقول بعض شہید کو ''شہید'' اس وجہ سے کہتے ہیں کہ روز قیامت وہ رسولوں کی تبلیغ کی گواہی دے گا۔

قوله: صفيف متعفف:

''**عفيف**'': ان چیزوں سے رکتا ہو جو حلال نہیں ہیں۔

''**متعفف**'': وہ شخص لوگوں سے مانگنے سے بچتا ہو اور طعام لباس وغیرہ میں تھوڑے پر اکتفا کرتا ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ متعفف وہ شخص ہے جو ان چیزوں سے بچتا ہو جو اس کے شان کے لائق نہیں ہیں اور نفس وخواہشات کی مخالفت پر صبر کرنے والا ہو۔

قوله: وعبد ''أحسن عبادة اللّٰه ......''

حسن عبادت اس طرح ہوگی کہ شرائط وارکان کے ساتھ قائم کی جائے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی وہ اپنی عبادت کو خالص کرے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''**ان تعبد اللّٰه كأنك تراه**''۔ اھ یہ بات اس مقام کے لائق نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کے اس حق کو قائم کرے جو اس نے اس پر لازم کیا ہے۔

''ونصح لمواليه'': جو اپنے مولیٰ کیلئے بہتری چاہے اوران کے حقوق کوادا کرے۔
توضیح وتخریج: اس حدی کوامام احمدؒ بیہقی اور حاکمؒ نے یوں روایت کیا ہے:
''عرض علی أول ثلاثة يدخلون الجنة وأول ثلاثة يدخلون النار فأمّا أول ثلاثة يدخلون الجنة' فالشهيد، ومملوك أحسن عبادة ربه ونصح لسيده، وعفيف متعفف' واما اول ثلاثة يدخلون النار فأمير مسلط وذومروة من مال لا يؤدی حق الله فی ماله وفقير فجور''۔

کونسا جہاد افضل ہے؟

۳۸۳۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حُبْشِيّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سُئِلَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: طُوْلُ الْقِيَامِ' قِيْلَ: فَاَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: جُهْدُ الْمُقِلِّ قِيْلَ: فَاَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ هَجَرَمَاحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ قِيْلَ: فَاَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ جَاهَدَ الْمُشْرِكِيْنَ بِمَالِهٖ وَنَفْسِهٖ قِيْلَ: فَاَیُّ الْقَتْلِ اَشْرَفُ؟ قَالَ: مَنِ اُهْرِيْقَ دَمُهُ وَعُقِرَ جَوَادُهُ (رواه ابوداود وفی رواية النسائی) اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سُئِلَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ ؟ قَالَ: اِيْمَانٌ لَا شَكَّ فِيْهِ' وَجِهَادٌ لَا غُلُوْلَ فِيْهِ وَحَجَّةٌ مَبْرُوْرَةٌ قِيْلَ فَاَیُّ الصَّلَاةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: طُوْلُ الْقُنُوْتِ. (ثُمَّ اتَّفَقَا فِی الْبَاقِی)

اخرجه ابوداود فی السنن' ۲ / ۱٤٦' كتاب الصلاة' باب طول القيام' الحديث رقم ۱٤٤۹' والنسائی فی ٥ / ٥٨' الحديث رقم: ۲٥۲٦' وأحمد فی المسند ۳ / ٤۱۱

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ (نماز کے اعمال' ارکان) میں سے) کون سا عمل (رکن) افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: طویل قیام کرنا۔ پوچھا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مفلس ومحتاج اپنے فقر وافلاس کے باوجود محنت ومشقت کر کے نکالے۔ پوچھا گیا کہ کون سی ہجرت بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کی ہجرت جو اس چیز کو چھوڑ دے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی اگرچہ ہجرت کے معنی دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے جانا ہیں لیکن حرام چیزوں کو چھوڑ کر حلال چیزوں کو اختیار کرنا بھی ہجرت ہی کہلاتا ہے بلکہ موقع ومحل کی مناسبت کے لحاظ یہی ہجرت بہتر ہوتی ہے) پوچھا گیا کہ کون سا جہاد بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کا جہاد جس نے اپنے مال اور اپنی جان کے ذریعہ مشرکین سے جہاد کیا۔ پوچھا گیا (جہاد میں) کیسا قتل کیا جانا باعث شرف ہے؟ یعنی کونسا شہید افضل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کا مارا جانا جس کا خون بہایا جائے اور جس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹی جائیں (یعنی وہ شہید افضل ہے جو خود بھی قتل کیا جائے اور اس کا گھوڑا بھی مارا جائے)۔ ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں یوں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اعمال میں کون سا عمل افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ① وہ ایمان جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو۔ ② وہ جہاد جس میں حاصل شدہ مال غنیمت کے بارے میں کسی طرح کی

خیانت نہ کی گئی ہو⑤ اور حج مقبول۔ پھر پوچھا گیا کہ نماز (میں) کون سی (چیز) افضل ہے؟ فرمایا: قیام کو طویل کرنا۔ اس کے بعد حدیث کے الفاظ ابوداؤد ونسائی نے یکساں نقل کئے ہیں''۔

تشریح: قوله:''قال: طول القیام'':

طول قیام کو افضل اس لئے کہا کہ یہ کثرت قراءت اور طول عبادت پر مشتمل ہے۔ منقول ہے کہ طول سجود افضل ہے۔ اس کی وجہ فضیلت یہ ہے کہ یہ کمال سکون پر دلالت کرتا ہے جو قرب الٰہی کا موجب ہے۔

قوله: جهد المقل:

''**جهد**'': جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے اور''**المقل**'' لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔''**جهد المقل**'' کا مطلب ہو **اطاقة الفقير و مجهوده** یعنی فقیر کی طاقت اور اس کی مشقت اس لئے کہ وہ قلت مال کی وجہ سے مشقت میں ہوتا ہے اور اسی لئے منقول ہے: **سبق درهم مائة الف درهم. رجل له درهمان أخذ أحدهما فتصدق به و رجل له مال كثير فأخذ من عرضه مائة الف فتصدق بها** ایک درہم ایک لاکھ درہم پر سبقت لے گیا۔ ایک آدمی جس کے پاس دو درہم ہوں ان میں سے ایک کو صدقہ کردے اور ایک آدمی وہ ہے کہ جس کے پاس بہت زیادہ مال ہو، وہ اپنے مال میں سے ایک لاکھ صدقہ کردے۔

یہ روایت نسائیؒ نے حضرت ابودرداءؓ سے نقل کی ہے اور حاکم وابن حبان نے ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے

اور بعض نے کہا کہ''**جهد مقل**'' سے مراد یہ ہے کہ فقیر وہ مال صدقہ کرے جس کا وہ خود محتاج ہو۔ یہ مقید ہے اس فقیر کے ساتھ جو صبر پر قدرت رکھتا ہو اور اس کے کوئی اہل وعیال نہ ہوں کہ انفاق مال سے ان کے ضیاع کا خدشہ ہو۔

قوله: فای الهجرة افضل:

معنوی اعتبار سے اس کی تقدیری عبارت یوں ہوگی: ای''**فأی صاحب الهجرة افضل**''۔ کون سا مہاجر افضل ہوگا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:''**من هجر ما حرم الله عليه**'' یہ بھی ممکن ہے کہ ماقبل جملہ میں مضاف نہ مانا جائے بلکہ مابعد جملہ میں مان لیا جائے

قوله:''فأی الجهاد افضل؟ قال: من جاهد المشركين۔

بماله ونفسه أی هجرة من هجر بماله ونفسه''۔ یہ اس قدر فضیلت کی وجہ سے ہے کہ جہاد موقوف ہے مجاہدہ نفسی پر۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: **أفضل الهجاد أن يجاهد الرجل نفسه و هواه** ۔ اس کو بخاری ؒ نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے اور اسی وجہ سے اس کو''جہاد اکبر کا نام دیا ہے۔ یہ روایت اس حدیث کے منافی نہیں: **افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر** افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے اس لئے کہ وہ نفس پر زیادہ شاق ہوتا ہے۔ یا اس سے مراد افضلیت اضافی ہے کہ ایک لحاظ سے مجاہدہ نفس افضل ہے اور دوسرے لحاظ سے یہ افضل ہے۔ یا تقدیری عبارت یوں ہوگی''**من افضل الجهاد**'' یعنی کہ یہ بھی افضل جہاد میں سے ہے۔

قوله:''قيل فأی القتل اشرف؟ من اهريق دمه وعقر جواده:

''اھریق'': یہ لفظ ''ھاء'' کے سکون کے ساتھ ہے۔

اس کلام میں دو کنائے استعمال ہوئے ہیں۔ایک اس کے قتل کا کنایہ اور دوسرا اس کی سواری کے قتل کنایہ اس لئے کہ مجاہد جہاد میں یہی کچھ تو لے کر حاضر ہوتا ہے اپنی جان، اپنی سواری اور اپنا مال۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاید عبارت کے اسلوب میں تغیر ''فأی القتل أشرف'' اس کے غایت اہتمام کی وجہ سے ہو۔اس لئے کہ ''شرف'' کا معنی قدر و قیمت و رفعت ہے اور یہ اس لئے کہ شہید جو سب سے اعلیٰ وارفع درجہ حاصل کرے گا وہ دراصل فردوس اعلیٰ ہے اور یہ وہی شہید ہے کہ جس نے اپنے نفس، مال اور سواری کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر ڈالا اور گھوڑے کا کٹنا غایت شجاعت سے کنایہ ہے اور کنایہ ہے کہ جنگ میں اپنے گھوڑے کا نذرانہ پیش کئے بغیر یہ کامیابی ممکن نہیں۔

قوله: وفی روایة النسائی ۔۔۔ ایمان راشك فیه:

نسائی کی روایت میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ افضل عمل کون سا ہے۔فرمایا: ایسا ایمان کہ جس میں کوئی شک نہ ہو۔اس لئے کہ شک اور یقین کا اجتماع محال ہے۔

قوله: ''وجهاد لاغلول فیه''

''غلول'': غین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور مراد اس سے مال غنیمت میں خیانت کرنا ہے اور افضل اعمال کے بارے میں مختلف احادیث وارد ہیں اور شاید وہ سائل کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے ہیں یا یہ افضلیت اضافی مراد ہے۔ یا یہاں پر عبارت میں ''من'' محذوف مانا جائے۔أی مِنْ افضلها ۔

قوله: ''وحجة مبرورةٌ'': بخاری، مسلم اور مالک رحمہ اللہ علیہم وغیرہ کی روایت میں یوں ہے: ''**الحج المبرور لیس جزاء الا الجنّة**'' اور ''مبرور'' کی مراد میں اختلاف ہے۔امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

① اصح یہ ہے کہ مبرور وہ حج ہے کہ جس کے ساتھ کوئی گناہ نہ ہو
② بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ''حج مقبول'' ہے۔
③ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ حج ہے جس میں کوئی ریاء، نمائش گناہ اور فسق کی باتیں نہ ہوں۔
④ بعض نے کہا وہ جس کے بعد کوئی گناہ نہ ہو۔
⑤ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آدمی حج سے اس حال میں لوٹے کہ وہ دنیا سے بے زار ہو، اور آخرت میں رغبت رکھتا ہو۔

شہید کے لئے چھ انعامات

۳۸۳۴: وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : لِلشَّهِيْدِ عِنْدَ اللّٰهِ سِتُّ خِصَالٍ : يُغْفَرُ لَهٗ فِيْ اَوَّلِ دَفْعَةٍ، وَيُرٰى مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ، وَيُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَيَاْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْاَكْبَرِ، وَيُوْضَعُ عَلٰى رَأْسِهٖ تَاجُ الْوَقَارِ الْيَاقُوْتَةُ مِنْهَا خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا، وَيُزَوَّجُ

ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ زَوْجَةً مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ، وَيُشَفَّعُ فِيْ سَبْعِيْنَ مِنْ اَقْرِبَائِهٖ۔ (رواه الترمذی و ابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن فی ٤ / ١٦١ كتاب فضائل الجهاد، باب فی ثواب الشهيد، الحديث رقم ١٦٦٣، وابن ماجه فی ٢ / ٩٣٦، الحديث رقم: ٢٧٩٩

ترجمہ: ''اور حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حق تعالیٰ کے ہاں شہید کے لئے (ایسے) چھ (امتیازی) انعامات ہیں (جو شہید کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہیں): ① اس کو پہلی مرتبہ میں ہی (یعنی اس کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی) بخش دیا جاتا ہے۔ ② اس کو (جان نکلتے وقت ہی) جنت میں اپنا ٹھکانہ دکھا دیا جاتا ہے۔ ③ وہ قبر کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔ ④ وہ بڑی گھبراہٹ (یعنی آگ کے عذاب) سے مامون رہے گا۔ ⑤ اس کے سر پر عظمت و وقار کا تاج رکھا جائے گا ایک جس کا یاقوت دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہوگا۔ ⑥ اس کی شادی بڑی آنکھوں والی بہتر حوروں سے کرائی جائے گی اور اس کے عزیز و اقرباء میں سے ستر آدمیوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی''۔

تشریح: ''**یغفر**'': مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

''**فی اوّل دفعة**'': ''دال'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں دال کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ ''**دفعة من المطر**'' سے ماخوذ ہے اور دال کے فتحہ کے ساتھ ہو تو ''**مرة واحدة**'' کے معنی میں ہوگا یعنی اس کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

''**یری**'': ''یاء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ''**اراءة**'' سے ماخوذ ہے اور معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ''یاء'' کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔

''**مقعده**'': مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور مفعول اول نائب فاعل ہوگا۔ یا مفعول بہ ہونے کی بناء پر منصوب ہوگا اور اس کا فاعل ''یرٰی'' میں پوشیدہ ہے۔ ''**من الجنّة**'' یہ اس کے متعلق ہوگا۔ ''**ویری مقعده**'' کو جملہ ''**یغفر له**'' کیلئے عطف تفسیر پر محمول کرنا چاہئے تاکہ خصال ستہ پر اضافہ نہ ہو اور اس لئے بھی تاکہ اگلے جملہ سے تکرار لازم نہ آئے۔

اس لئے کہ ''**اجارة**'' مغفرت کو شامل ہے جب اس کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا۔ ''**ویجار من عذاب القبر**''۔ یعنی اس کو امن دیا جائے گا اور اس کی حفاظت کی جائے گی۔

قوله: ''ویأمن من الفزع الأکبر'':

اس میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿**لا یحزنهم الفزع الأکبر**﴾ (الانبیاء: ۱۰۳)

''**الفزع الأکبر**'' سے کیا مراد ہے؟

① بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد آگ کا عذاب ہے۔

② بعض نے کہا ہے کہ عذاب پر پیش کرنا ہے۔

③ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ وقت ہے کہ جس میں جہنمیوں کو جہنم میں دخول کا حکم دیا جائے گا۔

④ بعض نے کہا اس سے مراد موت کا ذبح کرنا ہے کہ جس کی وجہ سے کفار آگ سے خلاصی سے مایوس ہو جائیں گے
⑤ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ وقت ہے کہ جب آگ کو ان پر بند کر دیا جائے گا۔
⑥ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ''نفخۂ اخیرہ'' ہے اور دلیل یہ آیت مبارکہ ہے: ﴿یوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السموٰت وفی الأرض﴾ [النحل: ۸۷]

قوله:''ویوضع علی رأسه تاج الوقار......وما فیها''

'وقار'' سے مراد عزت ہے اور ''النھایہ'' میں ہے کہ اس سے مراد سونے جواہرات کا وہ تاج ہے جو بادشاہوں کیلئے بنایا جاتا ہے۔

''الیاقوتة منها'' ضمیر مؤنث باعتبار ''کلامۃ'' الرع ہیں ''تانیث'' اس لئے کہ اس سے مراد عزت وشرف کی علامت ہے۔ یا اس اعتبار مجموعہ کے ہے کہ یہ جواہرات وغیرہ کا مجموعہ ہوگا۔

قوله:ویزوح اثنتین وسبعین زوجة بن الحور العین:''

اس تقدیر سے اشارہ ہے کہ (۷۲) سے مراد ''تحدید'' ہے، تکثیر مراد نہیں ہے اور اس سے زیادہ ملنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

'' الحور العین '': اس سے مراد جنت کی عورتیں ہیں۔ اس کا واحد ''حوراء'' آئی ہے۔ ''حوراء'' وہ عورت جس کی آنکھ کا سفید حصہ انتہائی سفید اور سیاہ حصہ انتہائی سیاہ ہو اور ''عین'' ''عیناء'' کی جمع ہے۔ **واسعة العین** ''کشادہ آنکھ'' والی کو کہتے ہیں۔

'' یشفع '' ''فاء'' کے تشدید کے ساتھ ہے۔

قوله:ویشفع '' ''اقرباء'' سے مراد اس کے احباب واقارب ہیں۔

۳۸۳۵:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :مَنْ لَقِیَ اللّٰهَ بِغَیْرِ اَثَرٍ مِنْ جِهَادٍ لَقِیَ اللّٰهَ وَفِیْهِ ثُلْمَةٌ ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٦٢' کتاب فضائل الجهاد' باب فی فضل المرابط' الحدیث رقم ١٦٦٦ وابن ماجه فی ٢ / ٩٢٣' الحدیث رقم ٢٧٦٣

ترجمه:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا اس پر جہاد کا کوئی اثر نہیں ہوگا تو وہ گویا اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس میں نقص ہوگا۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: قوله:''من لقی اللّٰه بغیر اثر من جهادٍ''۔

''اثر'' ہمزہ اور ثاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس سے مراد کسی چیز کا وہ باقی حصہ ہے جو اس چیز پر دلالت کر رہا ہے یہ قاضی عیاض کا قول ہے اور یہاں پر اس سے مراد ''علامت'' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اس حال میں مر جائے کہ اس کے بدن پر جہاد کی کوئی علامت نہ ہو۔ مثلاً زخم، راستے کا گرد وغبار اور بدن کی تھکاوٹ، مال کا خرچ، یا اسباب واسلحہ کی تیاری وغیرہ۔ قوله:''لقی

الله و فية ثلمة''۔

''ثلمة'': ''ثاء'' کے ضمہ اور ''لام'' کے سکون کے ساتھ ہے۔اس سے مراد یہاں وہ خلل ونقصان ہے۔جو سعادت شہادۃ اور مجاہد نفس کی نسبت سے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حدیث اس شخص کے ساتھ مقید ہو کہ جس پر جہاد فرض ہو چکا ہو اور وہ اسباب جہاد کی تیاری شروع کئے بغیر مرجائے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''من جهاد'' ''اثر'' کی صفت ہے۔سیاق نفی میں نکرہ واقع ہے۔لہٰذا یہ جہاد کے تمام انواع واقسام کو شامل ہوگا: جہاد مع العدو، جہاد بالنفس والشیطان اوراسی طرح یہ اثر بھی اختلاف مجاہدہ کی بناء پر مختلف ہوگا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾[الفتح۔۲۹]

یہاں پر ''الثلمة'' نقصان کیلئے مستعار لیا گیا ہے اور یہ اصل میں استعمال ہوتا ہے (مثلاً دیوار کے رخنہ شگاف اور ،طوٹ پھوٹ کے لئے اور اس وجہ سے کہ ''اسلام'' کو عمارت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے: ''بنى الاسلام على خمس'' اس لئے اسلام میں ہر قسم کے نقصان کو بر سبیل ترشیح ''ثلمہ'' سے تعبیر کیا اور یہ ''عموم'' پر بھی دلالت کررہا ہے۔اس کی تائید حضرت ابوامامہ کی اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

۳۸۳۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَلشَّهِيْدُ لَا يَجِدُ اَلَمَ الْقَتْلِ اِلَّا كَمَا يَجِدُ اَحَدُكُمْ اَلَمَ الْقَرْصَةِ ۔ (رواه الترمذی و النسائی و الدارمی وقال الترمذی هذا حد يث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ' ٤ / ١٦٣ كتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی فضل المرابط' الحديث رقم : ١٦٦٨' والنسائی فی السنن : ٦ /٣٦' الحديث رقم : ٣١٦١' وابن ماجه فی ٢ / ٩٣٧' الحديث رقم ٢٨٠٢' والدارمی فی ٢ / ٢٧١' الحديث رقم : ٢٤٠٨' وأحمد فی المسند ٢ / ٢٩٧

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شہید اپنے قتل کی اتنی تکلیف بھی محسوس نہیں کرتا ہے جتنی تکلیف تم میں سے کوئی شخص چیونٹی کے کاٹنے پر محسوس کرتا ہے۔ (ترمذی' نسائی' دارمی) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

تشریح: قوله الشهيد لايجد ألم القتل الا كما يجد احدكم ......:

اس سے مراد ''شہید حقیقی'' ہے اور ''شہید حکمی'' بھی اسی معنی میں ہے۔

''لا يجد الم القتل'': اور ایک روایت میں ''مس القتل'' کا لفظ ہے۔اس سے مراد ''شدت موت'' ہے۔

الم القرصة'': اور ایک روایت میں ''مس القرصة'' ہے۔

''قرصة'': ''قاف'' کے فتحہ اور ''راء'' کے سکون ساتھ ہے اور ''مرة من القرص'' مراد ہے اور اس کا معنی ہے چیونٹی کا انسان کو ایک بار کاٹنا اور بعض نے کہا ہے کہ جلد کا کٹنا جیسا کہ ناخن وغیرہ کا کٹنا ہوتا ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''قرص'' کو لانا دفع تو ہم کیلئے ہے اس کی تکلیف اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ہر شہید کا معاملہ جدا

ہوتا ہے۔بعض شہدا کوتن من دھن وارنے میں لذت محسوس ہوتی ہے اورادات حصر کا مطلب ہے چٹکی بھرنا اور شہید دون شہید میں ہے۔جیسا کہ ''عمیر بن حمام'' کہ موت کی تمنا میں اس انداز سے بڑھے کہ کھجوریں بھی پھینک دیں اور جب حضرت خبیب انصاریؓ کوشہید کیا جانے لگا تو انہوں نے یہ اشعار کہے۔

''ولستُ ابالی حین أقتل مسلمًا ☆ علٰی أی شق کان للّٰہ مصرع
وذلك فی ذات الالٰه وان یشأ ☆ یبارك علی اوصال شلو ممزع

عرض مرتب:

ان کی شہادت کی تفصیل ان کے حالات (راویٔ حدیث) میں ملاحظہ فرمائیے۔

اللہ کے نزدیک پسندیدہ ترین دو قطروں کا بیان

۳۸۳۷: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَیْسَ شَیْءٌ اَحَبَّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ قَطْرَتَیْنِ وَاَثَرَیْنِ: قَطْرَةُ دُمُوْعٍ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَقَطْرَةُ دَمٍ یُهْرَاقُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، وَاَمَّا الْاَثَرَانِ: فَاَثَرٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاَثَرٌ فِیْ فَرِیْضَةٍ مِنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ ۔ (رواہ الترمذی وقال هذاحدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن' ٤ / ١٦٣' کتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی فضل المرابط' الحدیث رقم : ١٦٦٩

ترجمہ: ''اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کے نزدیک دو قطروں اور دو علامتوں سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں ہے: ایک قطرہ تو وہ جو اللہ کے خوف سے بہا ہو اور دوسرا قطرہ خون کا جو خدا کی راہ میں بہایا گیا ہو اور دو علامتوں میں سے ایک علامت تو وہ ہے جو اللہ کی راہ میں زخم یا چوٹ سے آئے اور دوسری علامت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کی ہوئی چیزوں میں سے ظاہر ہونے والا ہے۔(ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

تشریح: قوله:لیس شیء احب ......قطرہ دموع من خشیة الله:

''قطرة'' بدل ہونے کی بناء پر مجرور ہے اور مرفوع اور منصوب پڑھنا بھی جائز ہے ہو اقطرہ ہے۔

''من خشیة الله'': اور وہ رونا اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ڈر کی وجہ سے ہو۔یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی عظمت جو کہ اس کی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

قوله:وقطرة دم تهراق فی سبیل الله:

''تهراق'': صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ھاء کے سکون کے ساتھ اور صیغہ معروف کے ساتھ بھی منقول ہے اور بصیغہ تانیث ہے۔کیونکہ یہ ''قطرة'' کیلئے صفت بن رہا ہے اور ایک نسخہ میں صیغہ تذکیر کے ساتھ ہے۔اس صورت میں یہ ''دم'' کی صفت واقع

ہوگا۔

''فی سبیل اللّٰہ'': یہ اپنے عموم کی وجہ سے جہاد اور جہاد کے علاوہ تمام خیر کے راستوں کو شامل ہے۔

''دم'': اس کو مفرد اور ''دموع'' کو جمع ذکر کیا۔ اس وجہ سے کہ عموماً آنسو قطرہ قطرہ گرتا ہے۔ جبکہ خون ایسے نہیں گرتا۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''قطرۃ الدم'' سے مراد ''قطرات الدم'' ہیں۔ جب اس کی اضافت ''جمع'' کی طرف کی گئی تو سامع کے ذہن پر بھروسہ کر کے اس کو ''مفرد'' لایا۔

اور ''دم'' کو مفرد اور ''دموع'' کو جمع لانے میں یہ بات بتلانی مقصود تھی کہ ''اھراق الدّم'' کو ''تقاطر الدمع'' پر فضیلت ہے۔

قولہ: ''واما الأثران: فأثر فی سبیل اللّٰہ''

اس اثر سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے یعنی جہاد میں غبار کا لگنا یا زخم کا آجانا۔ یا ''طلب علم'' کے راستے میں دوات کی سیاہی وغیرہ مراد ہے۔

قولہ: ''وأثر فریضۃ ......''

جیسا کہ سردی کی وجہ سے وضوء کے باعث ہاتھ اور پاؤں کا پھٹ جانا سردیوں میں، اور گرمی میں اعضاء وضوء پر پانی کے قطرات کا رہ جانا اور گرمی کی وجہ سے پیشانی کا جلنا، روزہ میں ''منہ'' سے بدبو کا آنا اور حج میں پیروں کا غبار آلود ہونا۔

مجاہد اور بحری سفر

۳۸۳۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَرْكَبِ الْبَحْرَ اِلَّا حَاجًّا اَوْ مُعْتَمِرًا اَوْ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَاِنَّ تَحْتَ الْبَحْرِ نَارًا وَتَحْتَ النَّارِ بَحْرًا۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداود فی السنن، ۳ / ۱۳ كتاب الجهاد، باب فی ركوب البحر، الحديث رقم ۲۴۸۹

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم حج وعمرہ کے ارادہ سے یا اللہ کی راہ میں جہاد پر جانے کے علاوہ سمندر کا سفر نہ کرو کیونکہ سمندر کے نیچے آگ ہے اور آگ کے نیچے سمندر ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: ''لا ترکب البحر'' الاّ حاجًّا أو معتمرا أو غازیًا فی سبیل اللّٰہ۔

لا ترکب: فعل نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور یہ خطاب عام ہے اور بعض نسخوں میں صیغہ نفی کے ساتھ ہے۔ نہی کے معنی میں ہوگا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی عاقل شخص کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ہلاکت اور خطرات میں ڈالے۔ مگر ایک دینی حکم کی وجہ سے جس کی وجہ سے تقرب الی اللہ حاصل ہوتا ہے۔ اس میں اپنے نفس کو صحیح طریقے سے لگائے اور اس کو زندگی پر ترجیح دے۔ اس میں ان حضرات پر رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سمندر ترک حج کیلئے عذر

ہے اور صحیح بات وہ ہے جو فقیہ ابواللیث السمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے کہ جب غالب گمان سلامتی کا ہو تو حج فرض ہے۔ بصورت دیگر اس کو اختیار ہے کہ کرے یا نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾[بقرہ۔۱۹۵]

ترجمہ: ''اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو''

یعنی اپنے نفس کو ہلاکت میں مت ڈالو اس صورت پر محمول ہے کہ جب وہاں غرض شرعی مقصد اور حکم دینی نہ ہو۔ اسی وجہ سے قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ''**اى بالاسراف وتضيع وجه المعاش او بالكف عن الغزو والانفاق**'' کہ اسراف ضیاع معاش ترک جہاد وانفاق کے ذریعہ اپنے نفس کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ اس لئے کہ یہ دشمن کو قوت دے گا اور ان کو تمہاری ہلاکت پر مسلط کر دے گا اور اس بات کی تائید جو حضرت ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اہل سلام کو کثرت عطا کی ہے۔ ہم اپنے اہل وعیال اور اپنے مالوں کی طرف لوٹ آئے ہیں ہم یہیں رہیں گے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ یا امساک (جہاد سے رکنا) اور حب مال کی وجہ سے اپنے انفس کو ہلاکت میں ڈالو۔ اس لئے کہ یہ بھی ہلاکت ابدی کی طرف لے جاتا ہے۔

وقوله: ''فان تحت البحر نارًا وتحت النار بحرًا'':

اس سے مقصود سمندر کی ہولناکی اور اس کے سفر کے عظیم خطرات کو بتلانا ہے۔ اس لئے کہ سمندری سفر کرنے والا آفات مہلکہ کیلئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ آگ ہے سمندر کے ورے بھی سمندر ہے اگر ایک ہلاکت اس سے خطا کر جائے تو دوسری ہلاکت اس کو دبوچ لیتی ہے۔ اس کی ہلاکتوں کا ایک تانتا ہے اس ہلاکت سے کوئی مامون نہیں ہو سکتا اور حال ہی میں ہمارے زمانے میں ایک کشتی جل گئی تھی اور اس میں بہت زیادہ لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ بعض سمندر میں غرق ہو گئے اور بہت تھوڑے ہی اس سے نجات پا سکے اور وہ بھی شدید محنت کے بعد۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کی تائید اس حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے: ''**البحر من جهنم**'' جیسا کہ اس کو حاکم اور بیہقی نے ابویعلیٰ سے نقل کیا ہے اور اس آیت سے بھی اس کو تقویت ملتی ہے: ﴿ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴾[التكوير:٦] **أى أحميت وأوقدت أو ملئت بتفجير بعضها الى بعض حتى تعود بحرًا اوحدا و تصير نارا۔**

۳۸۳۹: وَعَنْ اُمِّ حَرَامٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْمَائِدُ فِى الْبَحْرِ الَّذِىْ يُصِيْبُهُ الْقَيْءُ لَهٗ اَجْرُ شَهِيْدٍ وَالْغَرِيْقُ لَهٗ اَجْرُ شَهِيْدَيْنِ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداود فى السنن ٣ / ١٥ كتاب الجهاد، باب فضل الغزو، الحديث رقم: ٢٤٩٣۔

ترجمہ: ''اور اُمّ حرام رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سمندر کے سفر میں جس شخص کا سر گھومنے لگے اور اس (کی وجہ سے اس) کو قے ہو تو اس کے لئے ایک شہید کا ثواب ہے اور جو شخص (سفر کے دوران دریا میں) ڈوب جائے تو اس کے لئے دو شہیدوں کا ثواب ہے''۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

ام حرام۔ یہ ''ام حرام ملحان بن خالد'' کی بیٹی ہیں۔قبیلہ ''بنی نجار'' سے ہیں یہ ''ام سلیم'' کی بہن ہیں۔یہ مشرف بہ اسلام ہوئیں اور آنحضور ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی۔آنحضور ﷺ دوپہر میں ان کے یہاں قیلولہ فرمایا کرتے تھے یہ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں۔سرزمین روم میں اپنے شوہر کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا۔ان کی قبر مقام قبرص میں ہے۔ان سے روایت حدیث ان کے بھانجے انس بن مالک اور ان کے شوہر عبادہ بن صامت نے کی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں ان کے صحیح نام پر سوائے کنیت کے اطلاع نہ پاسکا۔ان کی وفات حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئی۔حرام ''حلال'' کی ضد ہے۔''ملحان'' میم کے کسرہ لام کے سکون ہاء مہملہ اور نون کے ساتھ ہے۔

تشریح:**قوله:بالمائدفی البحر۔۔۔له أجر شهيد**

''**المائد**'': ''مائد'' اسم فاعل کا صیغہ ہے۔''**ماد يميد**'' سے سر چکرانا۔چکر آنا۔''مائد'' اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کو سمندری ہوا کی وجہ سے اور موجوں کی وجہ سے کشتی کے ہچکولوں کے باعث چکر آنا شروع ہو جائے۔

''**الَّذی يصيبه القیئ**'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اس کیلئے صفۃ مبینہ ہے، صفۃ مخصصہ نہیں ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو سمندر میں سفر کرے اور چکر آنے کی وجہ سے وہ مرجائے۔تو اس کیلئے شہید کا اجر ہے، اگر وہ اس پر کسی طاعت کیلئے سوار ہو۔جیسا کہ غزوہ، حج یا تحصیل علم ہے۔یا تجارت کیلئے سوار ہوا ہو بشرطیکہ ① کوئی اور راستہ نہ ہو۔ ② یہ کہ وہ مال بڑھانے کیلئے سفر تجارت نہ کر رہا ہو۔بلکہ ''**قوت لا يموت**'' کمانے کی غرض سے سفر کر رہا ہو۔

قوله:''والغريق له اجر شهيدين''

یعنی جو سمندر میں غرق ہو جائے۔ایک تو اطاعت کی وجہ سے اور دوسرا اجر غرق ہونے کی وجہ سے ملے گا اور ان دونوں میں سے ہر ایک شہادت کے حکم میں ہے۔

تخریج وتوضیح :طبرانی نے اس حدیث کو ''الکبیر'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: ''**للمائد اجر شهيد وللغريق اجر شهيدين**''۔

اللہ کے راستہ میں موت آجانے کا بیان

۳۸۴۰: وَعَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَ شْعَرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :مَنْ فَصَلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، فَمَاتَ، اَوْ قُتِلَ، اَوْ وَقَصَهُ فَرَسُهُ اَوْبَعِيْرُهُ، اَوْ لَدَغَتْهُ هَامَّةٌ، اَوْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ بِاَیِّ حَتْفٍ شَاءَ اللّٰهُ ، فَاِنَّهُ شَهِيْدٌ، وِاِنَّ لَهُ الْجَنَّةُ ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داود فی السنن ۳ / ۱۹ کتاب الجهاد، باب فیمن مات غازیًا الحدیث رقم: ۲۴۹۹

ترجمہ: ''اور حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے

سنا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی جہاد جیسے مقاصد میں) گھر سے نکلا اور (زخمی ہو جانے کی وجہ سے) مر گیا یا اس کو قتل کر دیا یا اس کے گھوڑے یا اس کے اونٹ نے اس کو کچل ڈالا یا کسی زہریلے جانور (جیسے سانپ وغیرہ) نے اس کو ڈس لیا یا اور کسی بیماری کی وجہ سے یا اچانک اللہ کی مرضی سے اپنے بستر پر فوت ہو گیا تو وہ ہر صورت میں شہید ہے (یعنی یا تو وہ حقیقی شہید ہے یا شہید کے حکم میں ہے) اور اس کیلئے جنت ہے (یعنی وہ ابتداء ہی میں شہداء وصالحین کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا)۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قوله:من فصل فی سبیل الله:

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس آیت کے قبیل سے ہے: ﴿فلما فصل طالوت بالجنود﴾[البقرة۔۱٤۹]

صاحب کشاف فرماتے ہیں: ''فصل عن موضع کذا'' ایک جگہ سے جدا ہونا۔ اسی طرح ''الفصل'' بھی ہے۔ جب وہ اس سے جدا ہو جائے اور اس سے تجاوز کر جائے اور اصل یہ ہے کہ ''فصل نفسه'' ہے۔ پھر اس کے مفعول کو اتنا زیادہ حذف کر دیا، جہاں تک یہ غیر متعدی کے حکم میں ہو گیا۔ جیسا کہ ''انفصل'' ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ''فصل عن البلد'' سے کنایہ ہے۔

''وقصه''۔ مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یعنی اس کو پچھاڑے اور اس کی گردن کو توڑ ڈالے۔

لدغته'': دال مہملہ اور غین معجمہ کے ساتھ ہے

''هامّة'': میم کی تشدید کے ساتھ ہے ''هامة'' اس جانور کو کہتے ہیں جس میں مہلک زہر ہو اور جس جانور میں زہر تو ہو لیکن مہلک نہ ہو تو اس جانور کو ''سامة'' کہتے ہیں جیسا کہ بچھو اور بھڑ ہے۔ (النہایہ)

حتف: حاء کے فتحہ اور تاء کے سکون کے ساتھ ہے۔

قوله:وان له الجنة:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ کلام،، جہاد فی سبیل اللہ کے سبب حاصل ہونے والی شہادت کی تقریر ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ اس شہید کیلئے اس کے بدلہ میں جنت ہے یہ اس آیت کی طرف بلیغ اشارہ ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾[التوبہ۔۱۱۱] ترجمہ: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی''

جہاد سے لوٹنا بھی جہاد ہے

۳۸۴۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :قَفْلَةٌ كَغَزْوَةٍ۔

(رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداود فی السنن' ۳ / ۱۲ کتاب الجهاد' باب فی فضل القفل' وأحمد فی المسند ۲ / ۱۷٤

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جہاد سے) لوٹ کر آنا بھی جہاد کے مانند ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله:''قفلة كغزوة''۔

''قفلة'':''قفول'' سے اسم مرۃ ہے۔لغت میں سفر سے لوٹنے کو کہتے ہیں۔

اس جملہ کے کئی مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① مجاہد کا اجر جہاد بعد اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹنے میں اتنا ہی ہے جتنا کہ جہاد کی طرف جانے میں تھا۔اس لئے کہ اس رجوع میں نفس کیلئے راحت ہے اس میں دوبارہ لوٹنے کی قوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے اہل وعیال کی حفاظت ہے اور اس کی نظیر یہ روایت ہے:''ان الحاج فی ضمان اللّٰه مقبلا و مدبرًا''۔

② اس کا ارادہ واپس اسی محاذ پر جانے کا ہوتا ہے اگرچہ دشمن سے اس کا آمنا سامنا نہ ہوا اور جنگ میں شریک نہ ہوا ہو اور لشکر جب واپس پلٹتے ہیں تو وہ بعض دفعہ اس طرح کرتے ہیں۔اس کی دوقسمیں ہیں۔

(ا) جب کوئی لشکر جہاد سے واپس لوٹتا ہے تو دو طرح سے کرتا ہے:

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ دشمن جب انہیں واپس لوٹتا ہوا دیکھتا ہے تو بے خوف ہو جاتا ہے۔چنانچہ جب لشکر''دار العدو'' میں پہنچتا ہے اور موقع غنیمت پاتا ہے تو ان پر قتل وغارت شروع کر دیتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ جب لشکر فتح یاب ہو کر لوٹتا ہے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ دشمن ہمارا پیچھا کرے گا۔

اور تیسری وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ سے اس قوم کے بارے میں پوچھا گیا جو دشمن کے خوف کی وجہ سے واپس ہوئے تھے۔جو کہ ان سے تعداد میں بڑھ کر تھی۔تو وہ اس وجہ سے لوٹے تھے تاکہ اپنے ساتھ اپنے ساتھیوں کی معقول تعداد میں اضافہ کر لیں اور پھر وہ دشمن پر حملہ کر دیتے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلی وجہ زیادہ قوی ہے اور وجہ ترجیح یہ ہے: **القفول انما یستعمل فی الرجوع عن الوجه الذی ذهب الیه لحاجة الی حیث توجه منه۔**

اس کی تائید جو آخری دو وجوہات میں''قفل'' کا جو معنی کیا گیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ غزوہ ہی ہے۔تو معنی اس کا یہ بنے گا کہ غازی کو واپس لوٹنے اور جنگی حربے کے طور پر لوٹنے دونوں پر ثواب ملے گا۔جیسا کہ اس کو دشمن کی طرف متوجہ ہونے اور ان سے لڑائی دونوں پر ثواب ملتا ہے۔اسلئے کہ''قفول'' کے حرکات غزوہ کے توابع میں سے ہیں۔تو لہٰذا یہ اس کے حکم میں ہوگا۔طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تشبیہ سے مقصود ناقص کو کامل کے ساتھ حکم میں ملانا ہوتا ہے۔یا دونوں کے درمیان مساوات (برابری) کے بیان کیلئے ہوتا ہے۔لہٰذا یہاں پر تنکیر یا تو تعظیم کیلئے ہے۔ **رب قفلة تساوی الغزوة** کہ بہت سارے رجوع کرنے والے غزوہ کے برابر ہیں۔ان مصالح کی وجہ سے جو پہلی صورت میں ذکر کی گئی ہیں۔بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ رجوع (قفلۃ) زیادہ اہم ہو غزوہ سے (مثلاً) جب لڑائی کرنے میں مسلمانوں کیلئے مصلحت نہ ہو اور''قفلة'' میں ان کیلئے مصلحت ہو۔جیسا کہ تیسری صورت میں بیان کر دیا گیا ہے اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ یہاں پر''قفله'' کو دوبارہ حملہ کرنے کیلئے مستعار لیا گیا ہو۔

مجاہد کو سامان جہاد فراہم کرنے کا دوہرا ثواب

۳۸۴۲:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :لِلْغَازِىْ اَجْرُهٗ وَلِلْجَاعِلِ اَجْرُهٗ وَاَجْرُ الْغَازِىْ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ٣٦ كتاب الجهاد باب الرخصة فى اخذ الجعائل الحديث رقم ٢٥٢٦ وأحمد فى المسند ٢ / ١٧٤۔

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''جہاد کرنے والے کے لئے اس کا اپنا ثواب ہے (یعنی مجاہد کے لئے جہاد کا جو مخصوص اجر ہے وہ اس کو پورا ملتا ہے) اور جاعل (یعنی جہاد پر تیار کرنے والے) کو اس کا اپنا اجر بھی ہے اور جہاد کرنے والے کا بھی''۔ (ابوداؤد)

تشریح:''**للجاعل اجره** '':اس سے مراد غازی کا مددگار ہے۔یا اس غازی کیلئے اسباب جہاد اور جن چیزوں کا وہ محتاج تھا وہ اشیاء فراہم کرنے والا۔

''**واجر الغازی**'':اس غازی کا ثواب بھی اس کو ملتا ہے جو اس دوسرے آدمی کی اُجرت کی وجہ سے جہاد کر رہا ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''جاعل''اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی غازی اور مجاہد کو''جعل''اجرت، جنگ کرنے کا وظیفہ دیتا ہے۔تاکہ وہ جہاد کرے یہ ہمارے ہاں صحیح ہے۔پس مجاہد کو اس کی سعی کا ثواب ملے گا اور''جاعل''کو دو اجر ملیں گے:ایک اجر اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال دینے کا اور دوسرا ثواب اس غازی کیلئے جہاد کا سبب بننے کی وجہ سے۔البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے منع کیا ہے اور اس مال کو واپس کرنا واجب قرار دیا ہے اگر مجاہد نے لیا ہو۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''علم المعانی''میں یہ بات مقرر ہے کہ جب معرفہ کا اعادہ کیا جائے تو دوسرا عین اول ہوتا ہے۔لہٰذا غازی اوّل سے مراد وہ شخص ہے جس کیلئے اجرت مقرر کی گئی ہو۔پس جس کسی نے غازی کیلئے اجرت کی شرط لگائی ہے۔اس کو اس مال کے خرچ کا اجر ملے گا جس کو اس نے بنایا ہے اور''**معجول له**''کے جہاد کا اجر و ثواب،اس لئے کہ وہ اس کے سبب حاصل ہوا ہے۔جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:''**من سنّ سنة حسنة فله اجرها**''۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بلکہ اس سلسلہ میں یہ حدیث زیادہ واضح ہے:''**الدّال علی الخیر کفاعله**''۔

''شرح السنۃ''میں لکھا ہے کہ اس میں''جاعل''کیلئے ترغیب ہے اور''**مجعول له**''کے لئے رخصت ہے۔البتہ جہاد پر اجرت لینے کے جواز کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔امام زہری ، امام مالک اور اصحاب ابی حنیفہ علیہم الرحمۃ اس میں رخصت کے قائل ہیں،اور بعض حضرات اس کے عدم جواز کے قائل ہیں۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر اس نے اجرت لے لی تو رد کرنا لازم ہے۔قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تقدیر پر حدیث کی تاویل اس طرح ہوگی کہ جاعل کو **المجهز الغازی والمعین له بیزل ما یحتاج الیه و یتمکن به من الغزو من غیر استئجار و شرط** پر محمول کریں۔ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے مذہب کی تائید اس بات سے ہوتی ہے اس کو غازی قرار دیں نہ کہ اجیر۔جیسا کہ آگے

حدیث میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔

اُجرت لے کر جہاد کرنے کا بیان

۳۸۴۳: وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ : سَتُفْتَحُ عَلَيْكُمُ الْاَمْصَارُ، وَسَتَكُوْنُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ، يُقْطَعُ عَلَيْكُمْ فِيْهَا بُعُوْثٌ فَيَكْرَهُ الرَّجُلُ الْبَعْثَ، فَيَتَخَلَّصُ مِنْ قَوْمِهٖ، ثُمَّ يَتَصَفَّحُ الْقَبَائِلَ يَعْرِضُ نَفْسَهٗ عَلَيْهِمْ، مَنْ اَكْفِيْهِ بَعْثَ كَذَا اَلَا وَ ذٰلِكَ الْاَجِيْرُ اِلٰى اٰخِرِ قَطْرَةٍ مِنْ دَمِهٖ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن، ٢ / ٣٥ كتاب الجهاد، باب فى الجعائل فى الغزو، الحديث رقم ٢٥٢٥، وأحمد فى المسند ٥ / ٤١٣

ترجمہ: ''اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب تمہارے لئے بڑے بڑے شہر فتح ہوں گے اور لشکر مجتمع ہوں گے جن میں تمہارے لئے فوجیں معین کی جائیں گی تو جو شخص امام (یعنی سربراہ مملکت) کی طرف سے اپنے آپ کو بلا معاوضہ فوج کے ساتھ جہاد میں بھیجے جانے کو ناپسند کرے گا تو وہ اپنی قوم سے نکل بھاگے گا تاکہ جہاد میں جانے سے بچ جائے اور پھر دوسرے قبیلوں کو تلاش کرتا پھرے گا اور ان کے سامنے اپنی خدمات پیش کرے گا اور کہے گا کہ کون شخص ہے جس کی جگہ میں لشکر میں شریک ہو جاؤں؟ (یعنی وہ کون ہے جو میری خدمات کو اجرت پر حاصل کرے اور مجھے نوکر رکھے تاکہ میں اس کی طرف سے لشکر میں جا کر لڑائی کی محنت و مشقت اپنے ذمہ لوں حاصل یہ کہ وہ شخص بغیر اجرت کے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جہاد میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ ایسے شخص کی مذمت فرماتے ہیں کہ) سن لو! ایسا شخص اپنے خون کے آخری قطرہ تک اجیر (مزدور) ہی رہے گا (یعنی ایسے شخص کو غازی یا مجاہد مت سمجھنا بلکہ وہ کرایہ کا ٹٹو ہوگا جو دوسروں کی طرف سے میدانِ جنگ میں لڑے گا یہاں تک کہ مارا بھی جائے گا۔)''۔

(ابوداؤد)

تشریح: **قوله: سمع النبی ﷺ یقول...... ویقطع ویقدر علیکم فیھا بعوث:**

''**سمع النبی ﷺ**'': اور ایک نسخہ میں ''نبی ﷺ'' کی جگہ ''رسول اللہ'' ﷺ آیا ہے۔

''**علیکم الأمصار**'' امصار بڑے شہروں کو کہتے ہیں اور ''امصار'' کو خاص کیا اس لئے کہ دیار کا دارومدار ان ہی پر ہوا کرتا ہے۔ ''ستکون'' یہ ''کان'' تامہ ہے۔ **ای مستوجد**۔

''**جنود**'': ''جند'' کی جمع ہے۔ اس سے مراد انصار و اعوان ہیں۔

''**مجندۃ**'' نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بمعنی مجتمعہ ''مجتمع'' اور ''اکٹھے'' اور ''النہایہ'' میں ہے: ''**مجموعه**'' جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ **الوف مؤلفة** ''وقناطیر مقنطرۃ''۔

''يقطع'': مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔
''ويقدر عليكم فيها بعوث'': ''ضمیر مؤنث'' کا مرجع ''الجنود'' ہے۔
''بعوث'': ''بعث'' کی جمع ہے۔لشکر کے معنی میں ہے۔مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اسلام ہر کونے میں پہنچے گا۔تو امامِ وقت اس بات کا محتاج ہوگا کہ وہ ہر جگہ اور ہر کونے میں ایک لشکر بھیجے تا کہ وہ اپنے قریب ترین کفار سے لڑائی کریں تا کہ کفار اس علاقے کے مسلمانوں پر غالب نہ آ جائیں۔
قوله: فيكر الرحل البعث ......:
''الأجير'': ''ذالك'' کے لئے خبر ہے۔یعنی یہ اجیر ''اجیر'' ہی ہے، غازی نہیں ہے۔اگر چہ وہ قتل ہو جائے۔
علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے کہ جو لڑائی میں صرف اس وجہ سے شرکت کرے کہ اس کی رغبت اس مال میں تھی درحقیقت جہاد میں اس کی کوئی رغبت نہیں تھی۔اسی لئے اس کو ''اجیر'' قرار دیا۔
ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کو بھی دیگر اجیروں کی طرح کو بھی دیگر جہاد کا کوئی ثواب نہیں ملے گا جب کہ اس کا ارادہ جہاد کا نہیں تھا۔بلکہ صرف اس اُجرت مشروط کا حصول تھا اور مراد اس سے جہاد ایسے شخص کے ثواب کی نفی میں مبالغہ ہے اور یہ بات مذہب ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید کرتی ہے۔

ملازم کے لئے مالِ غنیمت

۳۸۴۴: وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ قَالَ: اٰذَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْغَزْوِ وَاَنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ لَّيْسَ لِيْ خَادِمٌ فَالْتَمَسْتُ اَجِيْرًا يَكْفِيْنِيْ، فَوَجَدْتُّ رَجُلًا سَمَّيْتُ لَهُ ثَلَاثَةَ دَنَانِيْرَ فَلَمَّا حَضَرَتْ غَنِيْمَةٌ اَرَدْتُ اَنْ اُجْرِيَ لَهُ سَهْمَهُ، فَجِئْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرْتُ لَهُ فَقَالَ: مَا اَجِدُ لَهُ فِيْ غَزْوَتِهِ هٰذِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا دَنَانِيْرَهُ الَّتِيْ تَسَمّٰى. (رواه ابو داود)

اخرجه أبو داود فى السنن، ٣ / ٣٧ كتاب الجهاد، باب فى الرحل يغير و باجر، الحديث رقم ٢٥٢٧، وأحمد فى المسند ٤ / ٢٢٣

ترجمہ: ''اور حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جہاد پر جانے کا اعلان فرمایا تو چونکہ میں اس وقت عمر رسیدہ تھا میرے پاس کوئی خادم نہیں تھا اس لئے میں نے کوئی ایسا مزدور تلاش کیا جو دورانِ جہاد میری دیکھ بھال کر سکے چنانچہ مجھ کو ایک شخص مل گیا جس کی اجرت تین دینار میں نے متعین کر دی پھر (جہاد سے فراغت کے بعد) جب مالِ غنیمت آیا تو میں نے اس مالِ غنیمت میں سے اس شخص کا حصہ دینے کا ارادہ کیا اور (اس بارے میں مسئلہ دریافت کرنے کے لئے) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس صورت حال کو بیان کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں (شریعت کے حکم میں) اس شخص کے لئے اس جہاد کے تعلق سے دُنیا و آخرت میں مقررہ تین دینار کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں پاتا''۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله: آذن رسول الله ﷺ بالغرو ''وأنا شيخ كبير ليس لي خادمٌ''۔

''اذن'': یہ الف کے مد کے ساتھ ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ 'ليس لي خادمٌ''''شیخ '' کی صفت ہے اور مطلب یہ ہے کہ میرے پاس ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو جہاد میں میری خدمت کرتا اور میری معاونت کرتا اھ۔ بظاہر یہ 'انا'' کی خبر ثانی ہے اور بعض کے مذہب پر یہ مبتدا سے حال ہے۔ اگر یہ ''شیخ'' کی صفت ہوتی تو عبارت یوں ہوتی ''ليس له خادِمٌ''۔

قوله: فالتمست أجيرا...... ثلاثة دنا نير:

''سميت له ثلاثة دنانير'' جبکہ دوسرے نسخہ میں ''سمّی'' کا لفظ ہے۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ اس کیلئے تین دنانیر مقرر کردیے اور شاید یہ دنانیر کھانے پینے اور اس کے لوازمات کے علاوہ ہوں۔

قوله: وجئت النبي ﷺ فذكر ت له ......:

مجھے اس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں تردد ہوا۔ میں نے نبی ﷺ کے پاس آ کر یہ قصہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا اس کیلئے اس جہاد میں دنیا وآخرت میں سوائے ان متعین کردہ دنانیر ودراہم کے کچھ اور ہو۔ (یعنی یہی اس کا بدلہ ہے۔ آخرت میں کوئی اور ثواب نہیں ملے گا اور دنیا میں مال غنیمت میں سے حصہ نہیں ہوگا)۔

'' تسمّٰی '': مجہول کا صیغہ ہے اور یہاں صیغہ مضارع کا استعمال اس وجہ سے کیا ہے تا کہ حال ماضیہ کا استحضار ہوجائے اور اس کی اس حالت یعنی مال کی طرف میلان اور انجام سے اعراض کی قباحت بیان ہو۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ علماء نے اختلاف کیا ہے اس آدمی کے بارے میں جو اجرت پر عمل کرتا ہو سواریوں کی حفاظت کرتا ہے جب وہ جنگ میں حاضر ہوگیا اس کیلئے کوئی سہم ہوگا یا نہیں؟ بعض کا قول ہے کہ اس کیلئے حصہ نہیں ہے، چاہے اس نے قتال کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کو صرف اس کے عمل کی اجرت ملے گی۔ یہ قول امام اوزاعیؒ، اور امام اسحاقؒ کا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اسی کے مطابق ہے۔ امام مالکؒ اور احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کیلئے حصہ مقرر ہوگا اگر چہ اس نے قتال نہ کیا ہو۔ بشرطیکہ قتال کے وقت وہ لوگوں کے ساتھ ہو۔ ایک تیسرا قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ اس کو اجرت اور سہم کے درمیان اختیار ہوگا۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مجھے یہ قول ظاہر لگتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم کہ اگر وہ قتال کرے اور اس کی اجرت میں اس کے قتال کی شرط نہ لگائی گئی ہو تو اس کو اجرت اور سہم دونوں ملیں گے۔ اس لئے کہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں اور یہی ہمارے مذہب کے قاعدہ کا ظاہر ہے کہ اجرت اور اجر دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

مال کی خاطر جہاد کرنے کا بیان

۳۸۴۵: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! رَجُلٌ يُرِيْدُ الْجِهَادَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَهُوَ يَبْتَغِىْ عَرَضًا مِنْ عَرَضِ الدُّنْيَا. فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : لَا اَجْرَ لَهٗ ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ' ۳ / ۳۰ كتاب الجهاد ' باب في من يغز ويلتمس الدنيا ' الحديث رقم ۲۵۱۶ ' وأحمد في المسند ۲ / ۲۹۰

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حالانکہ وہ اس جہاد کے ذریعہ دنیا کے مال و اسباب کو تلاش کرتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس کے لئے کوئی اجر و ثواب نہیں ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: رجل يريد الجهاد۔۔۔من عرض الدينا:**

''**رجل يريد الجهاد**'': ایک نسخہ صحیحہ میں ''فی سبیل اللہ'' کا اضافہ بھی نقل کیا گیا ہے۔

وهو: یہ جملہ ''رجلٌ'' سے حال ہے۔

''**انه يبتغي عرضًا**'' ''عرض'' راء کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ بعض نے دونوں میں فرق کیا ہے کہ ''عرض'' راء کے فتحہ کے ساتھ مال کو کہتے ہیں، چاہے قلیل ہو یا کثیر ہو اور ''عرض''، راء کے سکون کے ساتھ ہو تو سامان ہے۔ یہاں پر دونوں جائز ہیں۔ دراہم اور دنانیر کے علاوہ ہر چیز عرض ہی ہے۔ وہ جہاد میں شرکت پر کچھ مطالبہ کر رہا ہو۔

قوله: ''**لا اجر له**'': اگر اس کی نیت اللہ کیلئے جہاد کی نہیں تھی۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ کیلئے جہاد ہو اور غنیمت کے حصول کی نیت ہو تو بلاشبہ اس کو اجر ملے گا۔ ہاں یہ بات ہے کہ اس کا اجر و ثواب اس آدمی کے اجر و ثواب سے کم ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ کیلئے جہاد کیا ہو اور غنیمت کے حصول کی نیت نہ کی ہو۔ اور دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا﴾

[آل عمران۔۱۵۲]

ترجمہ: ''ہم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا چاہتے تھے'' بعض تم میں سے دنیا کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس آیت میں ''الدنیا'' سے مراد مال غنیمت ہے۔

''**ومنكم من يريد الأخرة**'' کہ بعض تم میں سے ایسے ہیں کہ جو آخرت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یعنی صرف اجر و ثواب کی نیت رکھتے ہیں اور ایک حدیث میں گزرا ہے کہ غازی اجر اور غنیمت دونوں کے ساتھ لوٹتا ہے

رواه ابو داود: اختصار کا تقاضا تھا کہ آٹھوں احادیث باب کو ذکر کرنے کے بعد ''رواها ابو داؤد'' فرما دیتے، جیسا کہ مصنف علیہ الرحمۃ کی عادت شریفہ ہے۔

۳۸۴۶: **وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَلْغَزْوُ غَزْوَانِ : فَاَمَّا مَنِ ابْتَغَى وَجْهَ اللّٰهِ وَاَطَاعَ الْإِمَامَ وَاَنْفَقَ الْكَرِيْمَةَ وَيَاسَرَ الشَّرِيْكَ وَاجْتَنَبَ الْفَسَادَ فَإِنَّ نَوْمَهُ وَنَبْهَهُ اَجْرٌ كُلُّهُ وَاَمَّا مَنْ غَزَا فَخْرًا وَ رِيَاءً وَ سُمْعَةً وَعَصَى الْإِ مَامَ وَ اَفْسَدَ فِي الْاَرْضِ فَإِنَّهُ لَمْ يَرْجِعْ بِالْكِفَافِ** ۔ (رواه مالك وابوداود والنسائي)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۳۰، الحديث رقم ۲۵۱۵، وأخرجه النسائي فى السنن ٦ / ٤٩، الحديث رقم ۳۱۸۸، والدارمي في ۲ / ۲۷٤، الحديث رقم ۲٤۱۷، و مالك فى الموطا ۲ / ۲٦٦، الحديث رقم ٤۳، وأحمد فى المسند ٥ / ۲۳٤

ترجمہ: ''اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جہاد دو قسم کا ہوتا ہے: چنانچہ

جس شخص نے مولیٰ کی خوشنودی طلب کرنے کی خاطر جہاد میں شرکت کی' امام (یعنی سربراہ مملکت اور قانون حکومت اسلامی) کی بجاآوری کی اور عمدہ چیز خدا کی راہ میں صرف کی اور اپنے ساتھی کے ساتھ اچھا معاملہ رکھا اور فتنہ وفساد کرنے سے پرہیز کرتا رہا (یعنی لوٹ مار کرنے ویرانی پھیلانے اور خیانت کرنے کے ذریعہ حدود شریعت سے تجاوز نہیں کیا) تو اس کا سونا اور اس کا جاگنا سب کچھ اجر وثواب کا باعث ہے اور جس شخص نے فخر وریا کے لئے (یعنی ناموری اور دکھانے سنانے کے لئے) جہاد کیا' امام کی نافرمانی کی اور روئے زمین پر فتنہ وفساد برپا کیا تو وہ کوئی اجر وثواب لے کر واپس نہیں آئے گا (یعنی اس طرح کے جہاد سے نہ تو اس کے گناہ بخشے جائیں گے اور نہ اس کو کوئی ثواب ملے گا۔)''۔ (مالک' ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله: الغزو غزوان۔۔۔ اجر كله:

''**الغزو**'': اس سے مراد جنس ہے نہ کہ غزوہ معہود۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غزوہ کی دو قسمیں ہیں:

①غزو علی ما ينبغي۔ ②غزو لا علی ما ينبغي۔

یہاں کلام میں اقتصار ہے، ''غزاۃ'' کے ذکر سے استغناء برتا، ان کی قسموں کو شمار کیا ہے اور ان کے احوال احکام کو بیان کیا ہے اور ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک کو مفصل طریقے سے بیان کیا ہے۔ ''**فأما من ابتغی وجه الله**''۔ یعنی وہ شخص جس نے اپنے مولیٰ تبارک وتعالیٰ کی رضامندی چاہی اور ایک روایت میں ہے **فأما من غزا ابتغاء وجه الله** ''**وأطاع الامام**'' اس غزوہ میں اس نے امام کی اطاعت کی اور جیسا امام نے کہا ویسا اس کو بجالایا۔

''**وانفق الكريمة**'': یعنی اپنے مال کا چنیدہ حصہ خرچ کیا اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا۔ یہاں پر ''تاء'' معنی وصفیت کو اسمیت کی طرف پھیرنے کیلئے ہے۔

''**وياسرا لشريك**'': یعنی اپنے ساتھی کے ساتھ انتہائی سہولت کا معاملہ کیا اور اس کے ساتھ یُسر والا معاملہ کیا اور اس کے خرچہ کی کفایت اٹھائی۔

''**واجتنب الفساد**'': یعنی مشروع سے تجاوز کرنے سے بچا۔ بے جا قتل وضرب لوٹ مار سے بچا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی وجہ سے: ﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾[البقرۃ۔٦٠] ''اور حد (اعتدال) سے مت نکلو فساد (وفتنہ) کرتے ہوئے سرزمین میں'' تم اس زمین میں فساد مت مچاؤ اس حال میں کہ تمہارا ارادہ زمین میں فسا کا ہو۔ بلکہ فساد اس غرض سے مچاؤ کہ تمہاری نیت شہروں اور بندوں کی اصلاح کی ہو۔

نبهه: بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ اور ایک صحیح نسخہ میں اس کے سکون کے ساتھ ہے۔ اس سے مراد حالت بیداری ہے اور انہی دونوں کے معنی میں ہے اس کا غفلت میں ہونا ذکر کرنا، کھانا پینا اور اس کی حرکت اور سکون سب کو شامل ہے۔

''**أجر**'': یعنی اس کے یہ تمام کام باعث اجر وثواب ہوں گے۔

''**كله**'': یہ ''مبتدا'' ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور اس کی خبر مقدم ہے اور جملہ ''ان'' کی خبر بنے گی۔ اس کو ''اجر'' سے تعبیر

کرنا بطور مبالغہ کے ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں: ''رجل عدلٌ'' یا یہ معنی ہوگا کہ یہ تمام امور اجر کے مقتضی ہیں اور باعث ثواب ہیں۔

اور ایک نسخہ میں ''کلّه'' منصوب ہے۔ اس بناء پر کہ یہ اسم ان کیلئے تاکید ہے اگرچہ خبر کے بعد آیا ہو۔ اھ۔ ''کلہ'' کو ان کے اسم کی تاکید قرار دینا محل نظر ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ''کلہ'' تمام اجر کیلئے بطور تاکید ہو اور معنی یہ ہوگا کہ اس خبر کے اجراء کے لئے جو کہ اس حکم کو محیط ہو۔ اس لئے کہ تاکید کا فائدہ تب ہی ظاہر ہوسکتا ہے جب خبر کو اس پر واقع نہ کیا گیا ہو۔ مناسب بات ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہو: ''أعنی کله'' پاس یہ جملہ مؤکدہ ہوگا اور معنی یہ ہوگا: ''کل من ذالك اجرٌ'' اور اسلوب بیان اس بات کو بتلا رہا ہے کہ اجر کو نوم اور بیداری پر محمول کرنے میں زیادہ مبالغہ ہوگا اور مبالغہ اس میں ہوگا کہ دونوں مستقل طور پر علیحدہ چیزیں شمار کی جائیں۔

قولہ: ''وأما من غزا فخرًا...... وافسد فی الارض:

فخرًا: أی مجاحرة او للفخر النہایہ میں ''فخر'' کا معنی لکھا ہے کہ عظمت، شرف اور بڑائی کا دعویٰ کرنا فخر کہلاتا ہے اور اسی سے یہ حدیث مبارک ہے: ''أنا سید ولد آدم ولا فخر''۔ یعنی میں یہ بات فخر یہ نہیں کرتا، لیکن اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس کی نعمت کے اظہار کے طور پر کہتا ہوں۔

''ورياء وسمعة'': تاکہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس کی شجاعت و بہادری کا چرچہ سنیں۔

''وعصی الامام'': یعنی امام کے امر و نہی میں اس کی نافرمانی کی۔

''وأفسد فی الأرض'': یعنی زمین میں کھیتی اور نسل کی ہلاکت کی صورت میں فساد کا قصد کیا جبکہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

''کفاف'': کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں کسرہ کے ساتھ منقول ہے۔ چنانچہ قاموس میں ہے: ''كفاف الشیٔ كسحاب مثلثلة، ومن الرزق ما كف عن الناس وكفاف الشیٔ بالكسر خياره ۔ اه۔'' لفظ ''کفاف'' بروزن سحاب ہے۔ مثلثۃ الحرکات ہے اور ''کفاف'' رزق کی اتنی مقدار کو کہا جاتا ہے جو (لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے) روک دے اور کاف کے کسرہ کے ساتھ ہو تو مطلب ہوگا بہترین اور عمدہ ترین چیز۔

''النہایہ'' میں ہے کہ ''کفاف'' چیز کی اتنی مقدار جو اضافی نہ ہو، بلکہ بقدر حاجت ہو۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ای لم یر جع بالثواب کہ وہ ثواب کے ساتھ نہیں لوٹا۔ یہ ''کفاف الشیٔ'' سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز یا رزق کا بہترین حصہ یعنی وہ کسی خیر کے ساتھ نہیں لوٹا یا اس ثواب کے ساتھ نہیں لوٹا جو اس کو قیامت کے دن مستغنی کردے۔ پس ان کے پہلے قول سے اشارہ ہے کہ کفاف ''کاف'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور دوسرے قول سے یہ اشارہ ہو رہا ہے کہ وہ کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاد سے برابر سرابر نہیں لوٹا بایں طور کہ نہ اس کیلئے کوئی اجر و ثواب ہو اور نہ اس پر کوئی گناہ ہو بلکہ اس کا گناہ اس سے زیادہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے اللہ کیلئے جہاد نہیں کیا اور زمین میں فساد پھیلایا کہا

جاتا ہے:''دعني كفافًا'' مجھے برابر سرابر چھوڑ دو یعنی آپ مجھ سے رک جائیں اور میں آپ سے رک جاؤں اور یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے کاف کے کسرہ پر اکتفاء کیا ہے اور اس سے باب مفاعلہ کا مصدر مراد لیا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہی صحیح ہے۔ اس لئے کہ ''کفاف'' کا اس مذکورہ معنی پر ہونا تقاضا کرتا ہے کہ اس کو ثواب بھی ہو اور گناہ بھی ہو اور اس کا گناہ اس کے ثواب پر زیادہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وددتُّ أني سلمت من الخلافة كفافا لا علي ولا لي'' اور ''مرائی'' یعنی ریاکار مفسد کو کوئی ثواب نہیں ملتا۔

امام غزالیؒ اس ریاءکار کے بارے میں فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہیں چاہتا ہو بلکہ فخر و ریاء اور نام کیلئے عمل کر رہا ہو کہ ''اس کی عبادت باطل ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور اس کا قصد و ارادہ عبادت کا نہیں ہے۔ پھر صرف اس کی عبادت کے بطلان پر اکتفاء نہیں کیا حتی کہ یہ کہا جاتا کہ وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ وہ عبادت سے پہلے تھا بلکہ وہ ریاء و سمعہ کی وجہ سے گناہ گار ہو جائے گا۔ اھ۔

اور یہ بات بھی مخفی نہیں ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اس ریاءکار کے بارے میں ہے جو اللہ کی رضا نہ چاہتا ہو اور حدیث میں اس بات پر کوئی دلالت نہیں ہے۔ پس یہ ممکن ہے کہ یہ شخص ان لوگوں میں سے ہو کہ جس نے عبادت میں دونوں نیتوں کو جمع کیا ہو اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''منہاج العابدین'' میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ ''ریاء'' کی دو قسمیں ہیں:

① ریاء محض۔ ② ریاء تخلیط۔

ریاء محض: وہ ہے کہ جس سے صرف دنیا کے نفع کا ارادہ ہو نہ کہ آخرت کا اور ''ریاء تخلیط'' یہ ہے کہ وہ ان دونوں (دنیا و آخرت) کو جمع کرے۔ پس یہاں بھی ان دونوں میں سے کوئی ایک ہے اور جہاں تک دونوں کی تاثیر کی بات ہے۔ اخلاص عمل یہ ہے کہ وہ اس فعل کو مقبول اور بھرپور اُجر بنا دے۔ اس سلسلہ کلام میں امام غزالی آگے چل کر فرماتے ہیں کہ راجح یہ ہے کہ ریاء کی تاثیر یہ ہے کہ ثواب میں کمی واقع ہوتی ہے اور قبولیت ختم ہو جاتی ہے واللہ اعلم بالصواب۔

اور ''عین العلم'' میں فرمایا ہے کہ فحش ترین ریاء یہ ہے کہ ثواب کی نیت بالکل ہی نہ کریں۔ پھر ریاء کا وہ درجہ ہے جس میں دونوں نیتیں ہوں اور ریاء غالب ہو وہ بھی اس کے قریب قریب ہے۔ پھر ریاء کا وہ درجہ ہے جس میں دونوں نیتیں برابر ہوں تو اس میں امید یہی ہے۔ نہ اس کو ثواب ہوگا اور نہ اس پر کوئی گناہ ہوگا اور پھر ریاء کا وہ درجہ ہے کہ جس میں نیت ثواب کو ترجیح حاصل ہو اور غالب گمان یہ ہے کہ اس میں نقصان عمل ہے نہ کہ بطلان عمل۔ یا ثواب یعنی دونوں نیتوں کے موافق ہوگا اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قرب اس کی طرف میلان سے ہوگا اور اللہ تعالیٰ سے بعد اس کو بھولنے اور اعراض کی وجہ سے ہوگا اور یہ جو حدیث میں آیا ہے :أنا أغنى الأغنياء عن الشرك کہ میں شرک سے یعنی ریاءکاری سے مستغنی ہوں۔ یہ ریاء کے پہلے درجہ پر محمول ہے اور وہ یہ ہے کہ سرے سے ثواب کا ارادہ ہی نہ ہو اور احیاء العلوم میں ہے کہ یہ اس صورت پر محمول ہے کہ جس میں دونوں نیتیں برابر ہوں یا ریاء کو ترجیح حاصل ہو۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قول ''فأمّا من ابتغى وجه الله'' اور اس قول ''وأما من غزا'' میں مضاف ماننا ضروری ہے۔ جس کی تقدیری عبارت یوں ہوگی: ''فأما غزو من ابتغى'' ''وأما غزو من غزا'' تقسیم کا مورد یہی دو قسمیں

ہیں۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تقدیر پر خبر کا مبتدا پر حمل درست نہیں پس مناسب یہ ہے کہ ''غزوہ'' کو مقدر مانا جائے۔ یعنی عبارت یوں ہوگی: ''الغزو غزوان: ''غزو من ابتغی وجه الله وغزو من لم یبتغ'' واما من ابتغی وجه الله فحکمه كذا واما من غزا فخرًا فحكمه كذا''۔ پس اس صورت میں یہ بات ''الجمع مع التفريق'' یا والتقسیم کے باب سے ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا ﴾

ان دونوں آیتوں میں تفریق کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ تقسیم اس پر دلالت کر رہی ہے اور یہی قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مطلب ہے۔ پس کلام میں اقتصار کیا اور صرف ''غزاۃ'' کے ذکر پر اقتصار کرتے ہوئے باقی کے ذکر سے استغناء برتا۔

مجاہد کس حال میں اُٹھایا جائے گا؟

۳۸۴۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّهٗ قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْجِهَادِ فَقَالَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اِنْ قَاتَلْتَ صَابِرًا مُحْتَسِبًا بَعَثَكَ اللّٰهُ صَابِرًا مُحْتَسِبًا وَ اِنْ قَاتَلْتَ مُرَائِيًا مُكَاثِرًا بَعَثَكَ اللّٰهُ مُرَائِيًا مُكَاثِرًا يَاعَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَلٰى اَيِّ حَالٍ قَاتَلْتَ اَوْقُتِلْتَ بَعَثَكَ اللّٰهُ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ

(رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ' ۳ / ۳۲ کتاب الجهاد' باب من قاتل لتكون كلمة الله هی العلیا' الحدیث رقم ۲۵۳۹

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے جہاد کے بارے میں بتائیے (کہ کس طرح کا جہاد موجب ثواب ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے عبداللہ بن عمرو! اگر تم اس حال میں قتال کرو کہ صبر کرنے والے اور ثواب کی امید رکھنے والے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں (قیامت کے دن) صبر کرنے والا اور ثواب کی امید رکھنے والا بنا اٹھائے گا (یعنی تم جس طرح ان صفات کے ساتھ جہاد کرو گے اور ان صفات پر مرو گے اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں ان صفات کے ساتھ اٹھائے گا اور تمہیں ان کا ثواب عطا فرمائے گا)۔ (جیسا کہ ایک روایت میں ہے: كَمَا تَعِيْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَكَمَا تَمُوْتُوْنَ تُحْشَرُوْنَ یعنی تم جس حالت میں جیتے ہو اسی حالت میں مرو گے اور جس حالت پر مرو گے اسی حالت میں اٹھائے جاؤ گے) اور اگر تم ریاکاری کی نیت سے اور اپنا زور جتلانے کے لئے قتال کرو گے (یعنی اگر تم لوگوں میں یہ فخر کرنے کے لئے لڑو گے کہ میں مال اور طاقت اور لشکر کے اعتبار سے تم سے بڑھ کر ہوں اور جہاد کے حکم کی اتباع تم سے زیادہ کرنے والا ہوں) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ریاکاری کرنے والا اور زور جتلانے والا اٹھائے گا (یعنی میدان حشر میں تمہارے بارے میں اعلان کیا جائے گا کہ یہ شخص کون ہے جو ریاکاری کی نیت سے اور فخر کرنے اور زیادہ مال و منال حاصل کرنے کے

لئے لڑا تھا) اے عبداللہ بن عمرو یادرکھو! تم جس حال میں لڑو گے یا جس حال میں قتل کئے جاؤ گے اللہ تعالیٰ تمہیں (قیامت کے دن) اسی حال میں اٹھائے گا''۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله: أخبر نی عن الهجاد...بعثك الله صابر امحتبا:

یعنی جہاد کی فضیلت وتفصیل بتایئے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سوال مطلق ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان صحابی نے جہاد کی حقیقت، اس کے ثواب اور اس کے عنداللہ تعالیٰ مقبول و یا غیر مقبول ہونے کے بارے میں پوچھا ہو جواب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تیسری چیز کے متعلق پوچھا ہوگا۔

''**یا عبد اللّٰہ بن عمرو**'': ممکن ہے اس نداء سے مراد آپ ؓ کی خصوصیت ہو' ان کو مکمل طور پر اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے کہا ہو۔

''**ان قاتلت صابرًا محتسبًا**'' ''**صابر اصّحتبا**'' یہ دونوں حال معنی میں مترادف ہیں۔ یا ان دونوں احوال متداخلہ ہیں۔

''**بعثك اللّٰه تعالٰی صابرًا محتسبًا**'': یعنی ان دونوں صفات کے ساتھ متصف اٹھائے گا۔جیسا کہ روایت میں ہے:

كما تعيشون تموتون و كما تموتون تحشرون

کہ جیسے زندگی گزارو گے ویسے ہی مرو گے، اور جیسے مرو گے اسی حالت میں اٹھائے جاؤ گے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**صابرًا محتسبًا**'' کا جزاء (جواب شرط) میں اعادہ کیا ہے' تا کہ ان دونوں کو نکرہ لانا اس بات کا فائدہ دے کہ اس کا اجر وثواب اتنا زیادہ ہوگا جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ای ''**بعثك اللّٰه صابرًا كاملاً فيه**'' یعنی بغیر حساب واحتساب کے تم کو پورا پورا اجر دیا جائے گا'' **محتسبا**'' یعنی کہ وہ مخلص ہو اور انتہائی درجے کا ہو راضی ومرضی ہو، اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔

قوله: ''وان قائلت مرائيًا'': ''بعثك اللّٰه مرائيًا مكاثرًا''۔

یعنی نیت اعمال میں دکھلاوہ ہو، مکاثرہ مال زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کی

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**تكاثر**'' سے مراد کثرت کے حصول میں مقابلہ کرنا اور اس پر فخر کرنا ہے اور بعض دفعہ یہ مقابلہ کثرت نفوس واموال میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ﴾ [الحدید۔ ۲۰]

ترجمہ: ''اور احوال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے' چنانچہ آدمی غنیمت کیلئے جہاد کرتا ہے اور مال کو زیادہ کرنے کیلئے جہاد کرتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ فخر کریں اور اس کے یار و مددگار زیادہ ہوں اور تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اس کا دین غالب ہو۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**مكاثر**'' کا مطلب فخر کرنے والا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ میں تم سے مال وتعداد کے لحاظ سے زیادہ ہو۔ یعنی تو نے جہاد اس لئے کیا تا کہ یہ کہا جائے کہ تو لشکر و شجاعت کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ یعنی قیامت کے دن تمہیں پکارا جائے گا کہ اس آدمی نے جہاد فخر اور ریاء کیلئے کیا ہے نہ کہ اپنے

اعمال سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے۔

قولہ:''یا عبداللّٰہ بن عمرو قاتلت او قتلت، بعثك اللّٰہ علی تلك الحال''۔

اس ندا میں تنبیہ ہے کہ تم بیدار مغز رہو، مدبر و مفکر ہو۔جس نیت سے جہاد کرو گے اسی طرح اور اسی حالت پر اٹھائے جاؤ گے اور اسی طرح بقیہ اعمال کا بھی حال ہے۔

معزول کرنے کا بیان

۳۸۴۸:وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَعَجَزْتُمْ اِذَا بَعَثْتُ رَجُلًا فَلَمْ يَمْضِ لِاَمْرِيْ اَنْ تَجْعَلُوْا مَكَانَهُ مَنْ يَمْضِيْ لِاَمْرِيْ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۲ / ۹٤ كتاب الجهاد باب في الطاعة الحديث رقم ۲۵۳۷ وأحمد في المسند ٤ / ۱۱۰

ترجمہ:''اور حضرت عقبہ بن مالک ؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم اس سے عاجز ہو کہ جب میں کسی شخص کو (تمہارا امیر و حاکم بنا کر) بھیجوں اور وہ میرے حکم کو پورا نہ کرے (یعنی وہ میرے کسی حکم یا میری کسی ممانعت کی مخالفت کرے) تو تم اس کو معزول کر دو اور اس کی جگہ کسی ایسے شخص کو مقرر کر دو جو میری جانب سے تفویض کردہ کام کو انجام دے''۔ (ابوداؤد) اور حضرت فضالہ کی روایت والمجاہد من جاہد نفسہٗ کتاب الایمان میں نقل کی جا چکی۔

راویٔ حدیث:

عقبہ بن مالک رضی اللہ عنہما: مؤلف رحمہ اللہ نے اسماء الرجال میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

تشریح: **''عجزتم''**:''جیم'' کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔

''وأن تجعلوا مكانه من يمضي لأمري'':یہ کلام (بتاویل مصدر کے)''آعجزتم'' کے لئے مفعول ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب میں کسی کو حکم دوں کہ کسی کام کیلئے جاؤ اور وہ نہ جائے تو تم (اس کام کیلئے) اس کی جگہ پر کسی اور کو مقرر کر دو اور جب میں کسی کو امیر بنا کر بھیجوں اور وہ میرے حکم کی فرمانبرداری نہ کرے اور میری نافرمانی کرے تو تم اس کو معزول کر دو۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس کو معزول کر دو اور اس کی جگہ پر کسی اور کو امیر بنا دو جو میرے حکم کی تعمیل کرے اور اسی طرح جب کوئی امیر اپنی رعایا پر ظلم کرے اور ان کی حفاظت کا حق ادا نہ کرے تو اس رعایا کیلئے جائز ہے کہ وہ اس کو معزول کر دے اور اس کی جگہ پر کسی اور کو قائم کر دے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے کہ جب اس کی معزولی میں فتنہ اور خون خرابے کا اندیشہ نہ ہو۔اگر اس کا اندیشہ ہو اور وہ ان کے اموال میں ظالم ہو تو پھر اس کی مخالفت جائز نہیں ہے اور اگر وہ ناحق خون بہاتا ہو تو دیکھا جائے اگر اس کا قتل کم نقصان دہ ہو اس سے کہ وہ اس عمل پر باقی رہے تو پھر لوگوں کیلئے اس کا اور اس

کے متعصب حامیوں کو قتل کرنا جائز ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو پھر اس کو معزول کرنا جائز نہیں ہے۔

الفصل الثالث:

جہاد کی صف میں کھڑے ہونے کا ثواب

۳۸۴۹: عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فِي سَرِيَّةٍ فَمَرَّ رَجُلٌ بِغَارٍ فِيْهِ شَيْءٌ مِنْ مَاءٍ وَبَقْلٍ، فَحَدَّثَ نَفْسَهٗ بِاَنْ يُقِيْمَ فِيْهِ، وَيَتَخَلّٰى مِنَ الدُّنْيَا، فَاسْتَاْذَنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فِيْ ذٰلِكَ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنِّي لَمْ اُبْعَثْ بِالْيَهُوْدِيَّةِ وَلَا بِالنَّصْرَانِيَّةِ وَلٰكِنِّيْ بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ، وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَغَدْوَةٌ اَوْ رَوْحَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَافِيْهَا وَلَمُقَامُ اَحَدِكُمْ فِي الصَّفِّ خَيْرٌ مِنْ صَلَاتِهٖ سِتِّيْنَ سَنَةً۔ (رواه احمد)

اخرجه أحمد فی المسند ٥ / ٢٦٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک لشکر میں حاضر ہوئے' دورانِ سفر جب ہم میں سے اہل سرقہ ایک شخص ایک ایسے غار (وادی) کے پاس سے گزرا جس میں (کچھ) پانی اور سبزہ تھا تو اس نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس غار میں سکونت پذیر ہو جائے۔۔ چنانچہ اس نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یاد رکھو! نہ تو میں دین یہودیت دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہوں اور نہ دین عیسائیت دے کر (کہ میں تم لوگوں کو رہبانیت کی تعلیم دوں اور بیجا مشقت و تکلیف میں مبتلا کروں اور لوگوں کے ساتھ رہن سہن اور لذاتِ دنیا سے مطلقاً کنارہ کشی اختیار کرنے کی اجازت دوں) بلکہ مجھے تو دین حنیفیہ دے کر بھیجا گیا ہے جو کہ آسان دین ہے (جس میں نہ تو انسانیت عامہ کے لئے بیجا تکلیف و حرج ہے اور نہ زائد از ضرورت مشقت و محنت ہے) قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! اللہ کے راستے میں صبح کا کچھ حصہ یا شام کا کچھ حصہ لگا دینا دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سے بہتر ہے اور تم میں سے کسی کا (جہاد کی) صف میں کھڑا ہونا (اور ثابت قدم رہنا) اس کی ساٹھ سال کی (تنہا پڑھی جانے والی) نماز سے بہتر ہے''۔ (احمد)

تشریح: قولہ: خرجنا مع رسول اللہ ﷺ فی سریۃ'

''سریۃ'': سین کے فتحہ اور ''راء'' کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ ہے۔ لشکر کے ایک چھوٹے ٹکڑے کو ''سریہ'' کہتے ہیں۔ کم از کم چار سو آدمی ہوتے ہیں جن کو دشمن کی طرف بھیجا جائے۔ ''سریہ'' نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل سریہ) لشکر کا خلاصہ اور ان کے پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ''سری'' سے ماخوذ ہے یہ نفیس (عمدہ) چیز کو کہتے ہیں اور '' المغرب ''میں ہے:

سری باللیل ۔ یسری باب ضرب یضرب سے ہے۔اس کے معنی ہیں وہ رات کو چلا اور اسی سے ''سریة'' ہے جو کہ ''سرایا'' کا واحد ہے۔اس لئے کہ یہ بھی خفیہ طور پر چلتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''اسراء'' سے ماخوذ ہو۔اس وجہ سے کہ یہ بھی چنیدہ جماعت ہوتی ہے۔اس کی تعداد کی حد میں کوئی نص موجود نہیں ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے سیر میں لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''سریة'' نو یا اس سے زائد افراد پر مشتمل جماعت کو کہتے ہیں۔تین یا چار یا اس جیسی تعداد پر مشتمل آدمیوں کی جماعت کو ''طلیعة'' کہتے ہیں۔نہ کہ سریة۔

اور یہ جو روایت میں ہے ''ان رسول اللّٰہ ﷺ بعث انیساً وحدہ سریة ''کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''انیس'' کو اکیلا بھیجا سریہ بنا کر اس کے مخالف ہے۔سید جمال الدین نے روضۃ الاحباب میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سیر اور محدثین کی رائے میں ''غزوة'' اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود شرکت کی ہو اور اس کے علاوہ جنگ کو ''بعث'' اور ''سریة'' کہتے ہیں اور اس وجہ سے ابو امامہ کے قول پر اشکال ہوتا ہے خرجنا مع رسول ﷺ فی سریة، ہاں اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہمراہ ''تشیع'' (یعنی ان کو رخصت کرنے) کیلئے گئے تھے۔یا یہ کہ ''سریة'' سے مراد اس کے معنی لغوی ہوں اور لغت میں ایک طائفہ قلیلہ یعنی (چھوٹی جماعت) کو کہتے ہیں اور (اُخص معنی مراد ہوں یعنی وہ جماعت جو کھلم کھلا نکلے، یا اس میں تجرید ہو بایں طور کہ ''خفیہ'' سے تجرید کر لی گئی ہے۔

'' قوله:فمر رجل بغار......ويتخلی من الدنيا:

فیه شی من ماء'':اتنا پانی تھا مالک کے وضو اور اس کے پینے کیلئے کافی تھا اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ پانی جاری تھا یا نہیں تھا۔

''وبقل'': نسخوں میں جر اور رفع دونوں کے ساتھ منقول ہے۔جر کی صورت میں ''ماء'' پر عطف ہوگا۔رفع کی صورت میں ''شیٔ'' پر عطف ہوگا۔

''فحدث نفسه'':''نفسه'' میں تجرید ہے، یا یہ کلام ''حدث فی نفسه '' کے معنی میں ہے کہ اس نے اپنے دل میں بات کہی کہ جہاد کے بعد یہاں مقیم ہو جائے گا یا جہاد سے پہلے اپنی سوچ اور جذبات کے مطابق کسی وقت یہاں اقامت اختیار کرے گا۔

''ويتخلی من الدُّنيا''یعنی اہل دنیا اور متعلقات دنیا سے کنارہ کش ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے سب سے الگ ہو جائے گا۔چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے یہاں سے گذر کر جاتے ہوئے یا آتے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی۔

''لم ابعث'': یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔یعنی نہ مجھے بھیجا گیا اور نہ ہی مجھے حکم دیا گیا ہے۔

''باليهودية والنصرانية''ان ملتوں میں بہت سے امور شاقہ ہیں۔جیسا کہ رہبانیت ہے۔جبکہ اس کا ثمرہ اس راستے پر چل کر کم ہی ملتا ہے۔

''ولكنی بعثت بالحنفية''یعنی اس ملت کے ساتھ بھیجا گیا ہوں جو استقامت وتوحید کے راستے پر گامزن ہے۔

''السمحة'': یعنی'' آسان مطلب یہ ہوا کہ یہ ملت ایسی ہے کہ جس میں حرج اور مشقت زائد نہیں اس کی منفعت غیر کی طرف

متعدی ہے جیسا کہ جہاد، جمعہ، جماعت، مریض کی عیادت، جنازہ میں حاضری، تعلیم تعلم اور کمال کا حصول۔ اس لئے کہ علماء اولیاء ہی درحقیقت انبیاء کے ورثاء ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عطف مابعد کے ماقبل سے مخالفت کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسا کہ قاعدہ مقرر ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا مجھے رہبانیت شاقہ کے ساتھ نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے ایک یکسو دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ''یہودیت اور نصرانیت'' رہبانیت شاقہ کے قائم مقام ہے۔

قوله: ''لغدوةٌ او روحة فی سبیل الله خیر من الدّنیا وما فیها'':

''فی سبیل الله'': اس سے مراد جہاد، حج، علم ہیں یا اطاعت اور عبادت کے تمام طرق مراد ہیں اور یہاں پر ''او'' تنویع کیلئے ہے۔ **''غدوة''**: اس کا معنی ہے دن کے ابتدائی حصے میں ایک بار جانا

''الروحة'': دن کے آخری حصہ یا رات کے ابتدائی حصے میں ایک بار جانے کو کہتے ہیں۔

اور شاید یہ قید باعتبار غالب کے ہو۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات عیاں ہے کہ ''غدوة او روحة'' دن اور ''شام'' کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ ہر لمحہ اور ہر وہ ساعت (گھڑی) جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں گزرے وہ ''دنیا و مافیہا'' سے بفرض محال وہ اس کا مالک ہو بہتر ہے اور اس کی نعمتوں کا تصور دل میں لے آئے اس لئے کہ دنیا زائل ہونے والی ہے جبکہ آخرت کی نعمتیں سدا باقی رہیں گی اور بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر وہ اس کا مالک بن جائے اور اس کو ''امور اخرویہ'' میں خرچ کر ڈالے۔ (یعنی لغدوة اور وحة فی سبیل الله خیر من الدنیا وما فیها لو ملکها و انفقها فی أمور الا خرة)

قوله ''مقام فی الصف خیر من صلاتة ستین سنة:

''مقام'': یہ لفظ ''میم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

''ستین سنةً'': اس سے مراد تکثیر ہے۔ (نہ کہ خاص تعداد)۔ لہٰذا جن روایات میں ''سبعین'' کا لفظ ہے یہ روایت اس کی نفی نہیں کرتی۔

جیسی نیت ویسا ثواب

۳۸۵۰: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ غَزَافِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَمْ يَنْوِ اِلَّا عِقَالًا فَلَهُ مَانَوٰى۔ (رواہ النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ' کتاب الجهاد' باب بیان النیته۔٦ / ٢٤' الحدیث رقم ٣١٣٨' والدارمی فی ٢ / ٢٧٤' الحدیث رقم ٢٤١٦' وأحمد فی المسند ٥ / ٣١٥

ترجمہ: ''اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے ایک رسّی (کے بھی حصول) کی نیت سے اللہ کی راہ میں جہاد (کا ارادہ) کیا تو اس کو وہی چیز حاصل ہوگی جس کی اس

نے نیت کی ہے''۔ (نسائی)

تشریح: قوله: من غزا في سبيل الله ''ولم ينوا لا عقالاً......'':

''عقالا'' ''عین'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ چھوٹی رسّی کو کہا جاتا ہے جس سے اونٹ وغیرہ کو باندھا جاتا ہے تا کہ وہ بھاگ نہ سکے۔

''فله ما نوی'': علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غنیمت سے طمع قطع کرنے میں مبالغہ ہے۔ یہ جہاد صرف خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ کسی بھی دنیاوی غرض کے ساتھ ملا ہوا نہ ہو۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''انما لامری مانویٰ'' اھ۔

یہ بات پہلے گزری ہے کہ یہ کمال ہے ورنہ تو غنیمت کے ارادے کے ساتھ بھی جہاد جائز ہے۔ لیکن کسی شئ معین کی خصوصیت کے ساتھ نہیں اور یہ بات بھی پہلے گذر چکی ہے کہ ''ریاء مختلط'' سے کسی عمل کا ثواب کلی طور پر باطل نہیں ہوتا۔

جہاد بلندیٔ درجات کا باعث ہے

۳۸۵۱: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ فَعَجِبَ لَهَا اَبُوْسَعِيْدٍ فَقَالَ: اَعِدْهَا عَلَيَّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فَاَعَادَهَا عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ وَاُخْرٰى يَرْفَعُ اللّٰهُ بِهَا الْعَبْدَ مِائَةَ دَرَجَةٍ فِي الْجَنَّةِ مَابَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ قَالَ: وَمَا هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ! اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ! اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه' ۳ / ۱۵۰۱ کتاب الامارة' باب بیان ما اعده الله تعالی' الحدیث رقم (۱۱٦' ۔ ۱۸۸٤) والنسائی فی ٦ / ۱۹' الحدیث رقم ۳۱۳۱

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین (برحق) ہونے پر اور محمد کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا (یعنی دل سے ان سب کو مانا) تو اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے ان کلمات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ان کلمات کو دوبارہ ارشاد فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے دوبارہ یہی کلمات ارشاد فرمائے اور پھر فرمایا کہ ایک چیز اور ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کو جنت کے سو درجے کی بلندی پر پہنچاتا ہے اور ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ (وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا)''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: من رضی بالله ـــ وجبت له الجنة:

'' من رضی بالله ربًّا'': یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر اس طریقے سے راضی ہوا۔ جیسا کہ قدر اور قضاء پر رضا کا تقاضا ہے کہ اچھی بری میٹھی کڑوی تقدیر جیسی بھی ہو اس پر ایمان لائے اور اسکے شرائع اور احکامات یعنی اوامر و نواہی پر راضی ہو۔

''وبمحمد رسولاً'': یعنی محمد ﷺ کی اس رسالت پر راضی ہو جس کے ساتھ ان کو بھیجا گیا ہے۔ ان کے اقوال، افعال اوراحوال میں اتباع کر کے۔ جن کو شریعت، طریقت اور حقیقت کہتے ہیں۔

وجبت له الجنة: اس کے وقوع کے تحقق میں مبالغہ کیلئے۔ یا یہ بتانے کیلئے کہ اس کو دنیا میں جنت حاصل ہو جائے گی وہ اس طرح کہ وہ غیر اللہ سے بے گانہ ہوگا اور ''مولیٰ'' کے ساتھ حضور نصیب ہوگا اور اس معنی کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ ہے: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ [الرحمن۔٤٦] یعنی ایک جنت دنیاوی ہے اور دوسری اخروی جنت ہے۔

قوله: ''فعجب لها'' ابو سعيد: ان کلمات کی وجہ سے یا اس قضیہ کی وجہ سے ابو سعیدؓ کو تعجب ہوا۔

''قوله: ثم قال: و أخرى كمابين السماء ولارض'': یعنی ایک اور باعث تعجب کلمہ یا فائدہ یا قضیہ یہ ہے۔:

''يرفع الله بها العبد مائة درجة في الجنّة '......'' پہلی بات کی طرح یہ دوسری بات بھی قابل رغبت ہے۔

''قوله: الجهاد في سبيل الله، الجهاد في سبيل الله ......''

تین مرتبہ فرمایا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا عطف لوازم اسلام پر کیا ہے۔ اس لئے کہ عطف کلام میں مغایرت کا تقاضا کرتا ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اخریٰ'' موصوف محذوف کی صفت ہے اور وہ موصوف مبتداء ہے اور یہ ''يرفع الله'' اس کی خبر ہے۔ یا (لفظ ''اُخریٰ'') ''فعل مضمر'' کی بناء پر منصوب ہے۔ ای ''ألا أبشرك بشارة اخرىٰ'' اور ''يرفع الله'' صفت یا حال بن رہا ہے اور بعض نے کہا ہے: هناك خصلة أخرى۔ (بظاہر یہ ''اخری'' کے موصوف محذوف کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم از مرتب) کہ یہاں پر ایک اور خصلت ہے اور اس اسلوب میں امر جہاد کی عظمت شان مقصود ہے۔ اس لئے کہ ''من رضى الله ربا و بالاسلام ديناً'' یہ عام ہے اور ان تمام احکامات پر مشتمل ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یا جن سے روکا ہے اور ان میں سے ایک جہاد بھی ہے اور اسی طرح جہاد کی عظمت شان کا نکتہ اگلے جملہ کا ابہام بھی ہے۔ کہ پہلے ''اخریٰ'' کے ذریعہ ابہام پیدا کیا پھر بشارت کی صورت میں اس کا ابراز فرمادیا۔ تا کہ اس کے بارے میں پوچھا جائے اور اس کے مناسب حال وہ جواب دیا جائے جو جواب دیا جانا چاہیے۔ اس لئے کہ ''ابہام'' کے بعد تبیین نفس میں زیادہ اثر کرتی ہے اور اسی طرح اس کا تین مرتبہ تکرار (بھی جہاد کی عظمت شان کا بیان ہے)۔

اس حدیث کی نظیر یہ ارشاد باری ہے: ﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ﴾ الى قوله ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الصف: ۱۰ تا ۱۳] ''مؤمنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دی۔ (وہ یہ کہ) خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں داخل کرے گا یہ بڑی کامیابی ہیاور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح (عن) قریب ہوگی اور مؤمنو کو (اس کی) خوشخبری سنادو''۔

علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ حدیث میں وارد ہے: ''من انفق زوجين في سبيل

اللّٰہ دعاہ کل من خزنۃ الجنۃ'' اور یہ اجر وثواب کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر ہے۔
عرض مرتب: اس روایت سے بظاہر اشکال ہوتا ہے ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی اس مخصوص صورت کا ثواب تو بظاہر ''جہاد فی سبیل اللہ'' سے بھی زیادہ ہے۔ اھ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ قاعدہ مقرر ہے کہ وہ حکم جو اثقل پر مترتب ہو۔ مقدم ہوتا ہے اس حکم سے جو اخف پر مترتب ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ''سبیل اللّٰہ'' جہاد سے زیادہ اعم ہے۔ پس یہ بھی اس میں داخل ہے۔ یا یہ کہ ''زوجین'' سے مراد ''راکب'' اور ''مرکوب'' ہو اور انفاق سے مراد ان دونوں کی ہلاکت ہے۔ پس اس طرح دونوں حدیثیں معنی کے لحاظ سے آپس میں قریب قریب ہو جائیں گی اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ اجر وثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل ہے۔ اس میں یہ بات ممکن ہے کہ وہ اگر چاہے تو عمل قلیل کو اجر جزیل سے نواز دے اور اس کو بزرگ مرتبہ عطاء کر دے۔ لہٰذا ان تکلفات کی کیا حاجت اھ۔ دونوں حدیثوں سعدم منافات کوئی مخفی نہیں ہے۔ پس یہ سوال سرے سے ہی ساقط ہے۔

جنت کے دروازے تلواروں کے سائے تلے ہیں

۳۸۵۲: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَبْوَابَ الْجَنَّةِ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ فَقَامَ رَجُلٌ رَثُّ الْهَيْئَةِ فَقَالَ: يَا اَبَا مُوْسٰى اَنْتَ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ هٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ. فَرَجَعَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ فَقَالَ: اَقْرَاُ عَلَيْكُمُ السَّلَامَ ثُمَّ كَسَرَ جَفْنَ سَيْفِهٖ فَاَلْقَاهُ ثُمَّ مَشٰى بِسَيْفِهٖ اِلَى الْعَدُوِّ فَضَرَبَ بِهٖ حَتّٰى قُتِلَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۳ / ۱۵۱۱ الحدیث رقم ۱۴۶ ـ ۱۹۰۲ والترمذی فی ٤ / ۱۵۹ الحدیث رقم ۱٦٥۹ وأحمد فی المسند ٤ / ٤۹٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک مجلس میں) یہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت کے دروازے تلواروں کے سائے تلے ہیں (یہ سن کر) ایک خستہ حال شخص کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا کہ ابوموسیٰ! کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے (یعنی آپ ﷺ سے تمہارا یہ سننا جزم ویقین کے طور پر ہے؟) انہوں نے کہا ہاں (یہ سنتے ہی) وہ شخص اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ میں تمہیں (آخری) سلام کرتا ہوں اور پھر اس نے اپنی تلوار کا نیام توڑ کر پھینک دیا (یعنی اس کے ذریعہ اس نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ اب میں لوٹ کر نہیں آؤں گا) پھر اپنی تلوار لے کر دشمنوں کی طرف روانہ ہوا اور اس کے ذریعہ لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا''۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: ''ان ابواب الجنۃ تحت ظلال السیوف'':
یعنی مجاہد کا قتال میں اس طور پر ہونا کہ دشمن کی تلواریں اس کے اوپر ہوں اس کے جنت میں جانے کا سبب ہے گویا کہ اس کے دروازے اس کے ساتھ ساتھ ہیں یا سیوف سے مراد مجاہدین کی تلواریں ہیں۔ یہ جنگ میں دشمن کے قریب ہونے سے کنایہ

ہے۔اس لئے کہ جہاد میں عام طور پر بطور اسلحہ تلوار ہی زیادہ استعمال ہوتی ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''تحت ظلال السیوف'' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تلواریں بے نیام ہوں گی اور پھر یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ تلواریں مجاہدین کے سروں کے اوپر ہوں گی جیسا کہ سائبان ہوتا ہے اور معرکوں میں تلواریں تلواروں سے ٹکراتی ہیں اور ضربوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔اور یہ کہ وہ ''اعلاء کلمة اللّٰه'' اور دین قویم کی نصرت کیلئے ہوتی ہے۔ جو اس صاحب سیف کیلئے جنت کے تمام دروازے کھلنے کا موجب ہے اور اس کو پکارا جائے گا کہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے اور اس تعبیر میں از روئے کرامت و شرافت کے زیادہ مبالغہ ہے۔بنسبت اس تعبیر کے جو اس حدیث میں ہے اس کا اس سے ابلغ ہونا اہل بلاغت کے نزدیک محل نظر ہے۔اس لئے کہ بات خفاء نہیں کہ نفس شی کا کسی شی کے سایہ ہونا زیادہ ابلغ ہے۔اس بات سے کہ اس کے دروازے کے اس کے سایہ تلے ہوں۔ چونکہ یہ دلالت کرتا ہے کہ وہ دخول کا محتاج ہوگا۔ برخلاف پہلی صورت کے کہ وہ دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے قرب کے کمال کی وجہ سے اس میں واقع ہے۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاد اور معرکہ قتال میں حاضری جنت کا راستہ ہے اور اس میں داخلہ کا سبب ہے۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ بات بالکل اسی طرح ہے۔ یہ مبالغہ منافی نہیں ہے کہ وہ حالت جہاد میں گویا کہ جنت میں ہے۔جیسا کہ اس کی طرف اشارہ گزرا ہے۔

قوله: فقام رجل رث الهيئة:

''النهایه'' میں لکھتے ہیں: **متاع رث أی خلق بال** (گھر کا بوسیدہ وردی سامان)

''**قوله: ثم کسر جفن سیفه** ......''

''**جفن**'': جیم کے فتحہ اور ''فاء'' کے سکون کے ساتھ ہے اور اس سے مراد ''**غلاف السیف**'' (نیام) ہے۔

''**فألقاه**'': اس میں اشارہ ہے کہ میں عقبی کی طرف متوجہ ہو چکنے کے بعد دنیا کی طرف واپس نہیں آنا چاہتا۔

''**رواه مسلم**'' ان دونوں حدیثوں کو جمع کر کے یوں کہنا بھی ممکن تھا کہ ان دونوں کو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

شہداء کی روحیں اور سیر و سیاحت

۳۸۵۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : قَالَ لِاَصْحَابِهٖ: اِنَّهٗ لَمَّا اُصِيبَ اِخْوَانُكُمْ يَوْمَ اُحُدٍ جَعَلَ اللّٰهُ اَرْوَاحَهُمْ فِيْ جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ، تَرِدُ اَنْهَارَ الْجَنَّةِ، تَأْكُلُ مِنْ ثِمَارِهَا، وَتَاوِيْ اِلٰى قَنَادِيْلَ مِنْ ذَهَبٍ مُعَلَّقَةٍ فِيْ ظِلِّ الْعَرْشِ فَلَمَّا وَجَدُوْا طِيْبَ مَأْكَلِهِمْ وَمَشْرَبِهِمْ وَ مَقِيْلِهِمْ قَالُوْا: مَنْ يُبَلِّغُ اِخْوَانَنَا عَنَّا اَنَّنَا اَحْيَاءٌ فِي الْجَنَّةِ، لِئَلَّا يَزْهَدُوْا فِي الْجَنَّةِ وَلَا يَنْكُلُوْا عِنْدَ الْحَرْبِ فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : اَنَا اُبَلِّغُهُمْ عَنْكُمْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَةِ (رواه ابو داود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۳۲، الحدیث رقم ۲۵۲۰، وأحمد فی المسند ۱ / ۲۶۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا: جب تمہارے بھائی غزوۂ احد میں شہید کر دیئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں منتقل کر دیا' چنانچہ وہ روحیں (ان پرندوں کے پیٹ میں) جنت کی نہروں (یعنی پانی' دودھ' شہد اور شراب طہور وغیرہ کی نہروں) پر آتی ہیں وہاں کے میوے کھاتی ہیں اور پھر ان سونے کی قندیلوں میں جا کر بسیرا کرتی ہیں جو عرش کے سایہ میں لٹکی ہوئی ہیں۔ تو جب ان ارواح نے اپنے کھانے پینے اور اپنے بسیرے کی لطف اندوزی کو پایا تو کہنے لگیں کہ کون ہے جو ہماری طرف سے ہمارے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچا دے کہ ہم جنت میں زندہ ہیں (اور حق تعالیٰ کی ایسی ایسی عظیم نعمتوں سے لطف اندوز ہیں) تا کہ وہ جنت کو حاصل کرنے میں رغبت کا اظہار کریں اور لڑائی (جہاد) میں سستی و کسالت کو اختیار نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے (ان کی یہ بات سن کر) فرمایا (گھبراؤ نہیں) میں تمہاری طرف سے ان کو پیغام پہنچاؤں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: اللہ کی راہ میں قتل کیے جانے والوں کو مردہ خیال مت کرو' بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کے پروردگار کے ہاں سے ان کو رزق عطا کیا جاتا ہے...... آخر تک''۔

تشریح: **قوله: انه لما أصيب اخوانكم...... ومشربهم وما كلهم:**

''**انّه**'': یہ ضمیر شان ہے۔

جعل الله أرواحهم في جوف طير خضر: یعنی سبز رنگ کے ایسے پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی جو روح سے خالی ہوں گے۔ جیسا کہ پرندہ کی تصویر روح سے خالی ہوتی ہے، یہ ارواح شہداء مختلف لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس میں ان لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں کہ عذاب برزخی اور اس کی نعمتیں صرف روحانی ہوں گی۔

''**تأكل من ثمارها**'': یہ جملہ مستانفہ بھی ہوسکتا ہے۔ حال بھی ہوسکتا ما قبل سے بدل بھی واقع ہوسکتا ہے۔

''**مأكلهم ومشربهم ومقيلهم**'': ''**مقيلهم**'' میم کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے اس سے مراد ان کا ٹھکانہ ہے۔ یہ تینوں الفاظ مصادر میمیہ ہیں اور یہ بھی کوئی بعید نہیں ہے کہ اس سے مراد مکان یا زمان ہو۔ ''**مقيل**'' اصل میں اس مکان کو کہتے ہیں جس کو دو پہر اور نیند کے وقت آرام گاہ بنایا جاتا ہے۔ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ نعمتوں اور عیش سے کنایہ ہے۔ اس لئے کہ عیش والے لوگ اس دنیا میں نعمتوں کی زندگی گزارتے ہیں اھ وفيه ما لا يخفى **قوله: ''قالوا من يبلغ اخواننا عنا......''**

''**قالو**'': ''**لما**'' کا جواب ہے۔

''**يبلغ**'': باب تفعیل سے ہے' لام کی تشدید کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں لام کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ (یعنی باب افعال سے ہے)

''**ولا ينكلوا**'': ''کاف'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

''**ولا تحسبنّ**'': یہ خطاب کا صیغہ ہے۔ سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ منقول ہے اور ایک روایت میں غائب کے صیغہ کے ساتھ اور سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

''قتلوا'': یہ تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ منقول ہے۔
''فی سبیل اللّٰہ امواتاً'': یہ مفعول ثانی ہے۔
''بل احیاء'': (احیاء مبتدا محذوف کی خبر ہے) أی بل هم أحیاء یعنی یہ شہداء درحقیقت زندہ ہیں اور ایک نسخہ میں اس کے ساتھ ''عند ربهم یرزقون'' بھی آیا ہے۔ یعنی ان کو ثمرات جنت میں سے رزق دیا جاتا ہے اور یہ آیت آخر تک یوں ہے: ﴿ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ... يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۷۰۔۱۷۱] ''جو کچھ خدا نے ان کو اپنے فضل سے بخش رکھا ہے اس میں خوش ہیں اور جو لوگ ان سے پیچھے رہ گئے اور (شہید ہو کر) ان میں شامل نہیں ہو سکے ان کی نسبت خوشیاں منا رہے ہیں (قیامت کے دن) ان کو بھی نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گیا اور خدا کے انعامات اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں اور اس سے کہ خدا مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا''۔

مؤمنین کی اقسام کا بیان

۳۸۵۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ اِلْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْمُؤْمِنُوْنَ فِي الدُّنْيَا عَلٰى ثَلَاثَةِ اَجْزَاءٍ: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْ يَاْمَنُهُ النَّاسُ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ الَّذِيْ اِذَا اَشْرَفَ عَلٰى طَمَعٍ تَرَكَهٗ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواہ احمد)

اخرجه أحمد فی المسند ۳ / ۸

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دنیا میں تین قسم کے مؤمن ہیں: ایک تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہوئے نیز انہوں نے اپنی جانوں اور اپنے اموال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا (یعنی مؤمنین کی یہ وہ جماعت ہے جس نے اپنے ایمان کو کامل اور اپنے نفس کو مہذب پاکیزہ بنایا اور اس کے ساتھ ہی مخلوق خدا کی فلاح و بہبود اور ان کی پاکیزگی کے لئے بھی جدوجہد کی اور یہی وہ جماعت ہے جو مرتبہ کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ و اشرف ہے)۔ (دوسرا مؤمن) وہ شخص ہے جس سے لوگوں کے اموال اور ان کی جانیں محفوظ ہیں (یعنی اگرچہ اس نے مخلوق خدا کی فلاح و بہبود کے لئے جدوجہد نہیں کی لیکن اس کے ذریعہ لوگوں کو کسی طرح کا نقصان وضرر بھی نہیں پہنچا) نیز نہ تو اس نے اختلاط رکھا اور نہ طمع وحرص میں مبتلا ہوا) اور پھر (تیسرا مؤمن) وہ شخص ہے کہ جب اس کے دل میں لالچ پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی خاطر اس لالچ کو ترک کردے''۔ (احمد)

تشریح: ''قوله: المؤمنون فی الدنیا علی ثلاثة اجزاء:

''اجزاء'': اس سے مراد اصناف واقسام ہیں اور یہی لفظ ''اجزاء المرکبات'' کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ سکنجبین وغیرہ ہے۔ اس کو ''اجزاء'' اس لئے کہہ دیا اس لئے ان کے درمیان اختلاف ہے، جو ظاہر میں متمیز نہیں (یعنی ان کے درمیان

ایک مشترک چیز پائی جاتی ہے جس میں ظاہر میں کوئی فرق نہیں ہوتا اگر چہ اندرونی لحاظ سے وہ مختلف ہوتی ہے)۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اجزاء'' کو ''اجزاء'' اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ''اعیان'' میں تجزی کو قبول کرتے ہیں۔ پس محبت اور ہمدردی میں مسلمانوں کوایک نفس کی طرح قرار دیا۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں ان کو ایک ہاتھ قرار دیا گیا ہے: ''هم يدٌ على من سواهم''۔

''قوله: الذين آمنوا بالله ورسوله ثم لم يرتابو...... في سبيل الله'': (''الذين'' خبر ہے مبتدا محذوف کی یا اس کے برعکس ہے) أي منها أو أحدها أو أولها الذين۔

''ثم'' کے ذریعہ عطف کیا تا کہ ایمان کے بعد شک وشبہ کی تردید کردے اگر چہ وہ شک ایک لمحہ کیلئے کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے اور تقدم ارتیاب ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یا یہ معنی ہے کہ انہوں نے شک نہیں کیا اس طور پر کہ انہوں نے مقتضائے ایمان پر عمل کیا اور اوامر ونواہی میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اس لئے ''مقسم بہ'' یہی مؤمنین کاملین ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ثم لم يرتابوا'' میں جو ''ثم'' استعمال ہوا ہے۔ وہ اس قول ربانی کی طرح ہے: ﴿انَّ الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا﴾ [فصلت: ۳۰] ترجمہ: ''جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) مستقیم رہے'' یہ تراخی کیلئے ہے۔ اس لئے کہ ثابت قدم رہنا اور شک وشبہ نہ کرنا اشرف وابلغ ہے مجرد ایمان اور عمل صالح سے۔

قوله: ''والَّذي يأمنه الناس على اموالهم وانفسهم''

یہاں پر ''الّذي'' کو مفرد لانا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ ایسے لوگ بندوں میں بہت کم پائے جاتے ہیں اور اسی طرح اگلا جملہ ہے:

''ثم الذي اذا أشرف على طمع تركه لله عز وجلَّ'' بظاہر یہاں پر ''ثم'' ترقی کیلئے ہے اور یہ بتانے کیلئے ہے کہ یہ جزء ماقبل سے زیادہ افضل ہے۔ اور اسی طرح ہر متاخر متقدم کے وصف پر بھی مشتمل ہوتا ہے زیادتی کے ساتھ۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ثمَّ'' رتبہ میں تراخی کیلئے بھی ہے اور ''الطمع'' سے مراد نفس کا اپنی خواہشات کی طرف مائل ہونا ہے۔ پھر وہ اس نفسانی خواہش کو ''اتباع حق'' پر ترجیح دیتا ہے۔ پس اس کا ترک انتہا درجہ کا مجاہدہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وأما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوىٰ فان الجنَّة هي المأوىٰ]۔

بظاہر یہاں پر ''طمع'' سے مراد مال وجاہ کی طرف میلان اور جھکاؤ ہے۔ اگر چہ (جائز) مباح طریقے سے ہو۔ اس لئے کہ اس کا ترک ''ارباب وصال'' کے ہاں کمال ہے۔

دُنیا میں لوٹنے کی تمنا کون مسلمان کرے گا؟

۳۸۵۵: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ عَمِیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَامِنْ نَفْسٍ مُسْلِمَةٍ يَقْبِضُهَا رَبُّهَا تُحِبُّ اَنْ تَرْجِعَ اِلَيْكُمْ وَ اَنَّ لَهَا الدُّ نيَا وَمَا فِيْهَا غَيْرُ الشَّهِيْدِ. قَالَ ابْنُ اَبِیْ

عَمِيْرَةَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :لَاَنْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ لِيْ اَهْلُ الْوَبَرِ وَالْمَدَرِ۔ (رواه والنسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ٦ / ٣٣' كتاب الجهاد-الحديث رقم ٣١٥٣' وأحمد فی المسند ٤ / ٢١٦

ترجمه: ''اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہید کے علاوہ اور ایسا کوئی مسلمان شخص نہیں ہے جو اپنے پروردگار کی طرف سے اپنی روح قبض کئے جانے کے بعد اس بات کو پسند کرے کہ وہ لوٹ کر تمہارے پاس آئے اور دنیا و مافیہا کی چیزوں کو حاصل کرے (یعنی شہید حق تعالیٰ کے ہاں پہنچنے کے بعد جب شہادت کے عظیم مرتبہ کی سعادتوں اور عظمتوں کو دیکھتا ہے تو پروردگار سے اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ وہ لوٹ کر دوبارہ دنیا میں آئے اور اللہ کی راہ میں پھر مارا جائے) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم! میرا خدا کی راہ میں مارا جانا میرے نزدیک اس چیز سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ خیمے والے اور حویلیوں والے میرے (مملوک ومحکوم) ہوں''۔ (نسائی)

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن ابی عمیرة۔ یہ عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ ''مدنی'' ہیں اور بعض نے کہا ''قرشی'' ہیں۔ ان کی حدیث میں اضطراب بتلایا جاتا ہے۔ صحابہ میں یہ قوی الحافظہ نہیں ہیں۔ یہ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے اور یہ شامی ہیں۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ''عمیرہ'' عین مہملہ کے زبر اور میم کے زیر کے ساتھ ہے۔ آخر میں رائے مہملہ ہے۔

تشریح: قوله: ''ما من نفس مسلمة يقبضها ربهما تحب أن ترجع اليكم وأن لها الدنيا وما فيها غير الشهيد''۔

بعض علماء اکابر فرماتے ہیں کہ نفوس کو حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی وفات دیتے ہیں اور ملک الموت کی طرف یہ نسبت مجازی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بعض لوگوں کی خصوصیت ہو (کہ ان کی روح اللہ تعالیٰ ہی قبض کرتے ہوں)۔

''تحب'': یہ ''ما'' کی خبر ہے۔

''ان'': ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور دوسرے نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف ''أن يرجع'' پر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حال واقع ہو رہا ہو اگر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ منقول ہو۔ ''غير الشهيد'' یہ ''تحب'' کے فاعل سے بدل ہے۔ اھ اور ایک نسخہ میں لفظ ''غیر'' منصوب ہے بناء بر استثناء۔

قوله: لان أقتل فی سبيل الله أحب الی من أن يكون لی أهل الوبر والمدر۔

''لأن اقتل'': یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ (اور ''أن'' مصدریہ ہے) ای لكونی مقتولاً۔

''الوبر والمدر'': یہ دونوں لفظ بروزن ''قلم'' ہیں

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''أهل الوبر'' سے مراد دیہات کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خیمے عام طور

پراون کے ہوتے ہیں اور ''اهل المدر'' سے مراد اہل قری وامصار ہیں اور (اهل الوبر و المدر) سے ''دنیاومافیہا'' ہے۔ اس میں تغلیب ہے کہ یہاں عقلاء کو غیر عقلاء پر غلبہ دیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گذرا ہے۔ جیسا کہ اس قول ربانی میں ایک قول یہی ہے: ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الفاتحہ۔١]

محبت کی نسبت آپ ﷺ کے پاکیزہ نفس کی طرف کی اور اس سے مراد آپ ﷺ غیر ہے آپ ﷺ کے قول کی وجہ سے ۔اھ اور اس میں بھی کوئی بعد نہیں ہے کہ یہ اسناد اپنی حقیقت پر ہواور آپ ﷺ کو اس کی کی تمنا ومحبت اور کی وجہ سے کو زیادہ ثواب واجر ملے۔

جنت میں کون لوگ ہوں گے؟

٣٨٥٦:وَعَنْ حَسْنَاءَ بِنْتِ مُعَاوِيَةَ قَالَتْ :حَدَّثَنَا عَمِّيْ، قَالَ :قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : مَنْ فِي الْجَنَّةِ؟ قَالَ النَّبِيُّ فِي الْجَنَّةِ، وَالشَّهِيْدُ فِي الْجَنَّةِ، وَالْمَوْلُوْدُ فِي الْجَنَّةِ وَالْوَئِيْدُ فِي الْجَنَّةِ ۔

(رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ٣٣ كتاب الجهاد، باب فى فضل الشهادة، الحديث رقم ٥ / ٥٨، وأحمد فى المسند ٥ / ٥٨

ترجمہ: ''اور حضرت حسناء بنت معاویہ (ابن سلیم) رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ سے میرے چچا (حضرت اسلم بن سلیم رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا (کہ ایک دن) میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ جنت میں کون کون لوگ ہوں گے؟ تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں نبی ہوں گے، جنت میں شہید ہوں گے، جنت میں بچے ہوں گے اور جنت میں وہ ہوں گے جن کو زندہ درگور کر دیا گیا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله:النبى من فى الجنة یہاں پر نبی سے مراد جنس انبیاء ہے۔

قوله :الشهيد فى الجنة:

''الشهيد'': یہاں اس سے مراد مؤمن ہے دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [الحدید: ١٩] ''اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں حاصل یہ ہے کہ یہاں شہید عام ہے۔ خواہ شہید حقیقی ہو یا شہید حکمی ہو۔ (دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔)

قوله:''والمولود فى الجنّة'':

خطابیؒ فرماتے ہیں اس سے مراد ''طفل'' ''سقط'' اور ہر وہ شخص ہے۔ جس نے ''حنث'' یعنی گناہ کو نہ پایا ہو۔

قوله:''والوئيدفى الجنّة ''

جس کو زمین میں زندہ درگور کیا گیا ہو۔ دراصل مشرکین ''بچیوں'' کو زندہ دفناتے تھے اور ان میں سے بعض لوگ بھوک اور

افلاس کی وجہ سے بیٹیوں کو بھی زندہ گاڑ دیتے تھے۔اس کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہاں "مولود" سے مراد "قريب الولادة" کی جنس ہے۔ چاہے وہ کفار کی اولاد میں سے ہو یا کسی اور کی اولاد میں سے ہو اور "وئید" بمعنی "مؤود" وہ بچی جو زندہ درگور کردی گئی ہو۔

انفاق فی سبیل اللہ کا اجر وثواب

۳۸۵۷ :وَعَنْ عَلِيٍّ وَاَبِيْ الدَّرْدَاءِ وَاَبِيْ هُرَيْرَةَ وَاُمَامَةَ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، وَجَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ، وَعِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ كُلُّهُمْ يُحَدِّثُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَنَّهُ قَالَ: مَنْ اَرْسَلَ نَفَقَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَقَامَ فِيْ بَيْتِهٖ فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ دِرْهَمٍ. وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَنْفَقَ فِيْ وَجْهِهٖ ذٰلِكَ، فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ :وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ۔ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲ / ۹۲۲ كتاب الجهاد، باب فضل النفقة فی سبيل الله، الحديث رقم ۲۷۶۱

ترجمہ: "اور حضرت علی، حضرت ابو درداء، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو امامہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اللہ کی راہ میں خرچہ (یعنی جہاد میں روپیہ پیسہ اور سامان و اسباب) بھیجا اور خود اپنے گھر میں بیٹھا رہا (یعنی جہاد میں خود شریک نہیں ہوا بلکہ روپے پیسے اور سامان سے جہاد میں مدد کی) تو اس کے لئے ہر درہم کے عوض سات سو درہم کا اجر و ثواب ہے اور جس شخص نے بذاتِ خود اللہ کی راہ میں جہاد بھی کیا اور جہاد میں روپیہ پیسہ اور مال بھی خرچ کیا (یعنی لڑائی میں خود شریک بھی ہوا اور مالی مدد بھی پہنچائی) تو اس کے لئے ہر درہم کے عوض سات لاکھ درہم کا ثواب ہے (کیونکہ اس نے اپنے نفس کو بھی مشقت و دکھ میں مبتلا کیا اور اپنا مال بھی خرچ کیا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت (بطور استشہاد یا اعتضاد کے) تلاوت فرمائی: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ "یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے ثواب میں اور اضافہ کرتا ہے"۔ (ابن ماجہ)

قوله: "كلهم يحدّث......":

یہاں پر لفظ "یحدث" لفظ "کل" کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد لایا ہے۔ای "یحدثون"۔

"وأقام فی بيته فله بكل درهم سبعمائة درهم" یہ دراصل اس آیت سے اقتباس ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾[البقرة ۲۶۱] "جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانے کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بال کے اندر سو دانے ہوں۔

"ومن غزا بنفسه فی سبيل الله وانفق فی وجهه ذالك" یعنی اس جہت میں کہ جس کا اس نے قصد کیا ہے اور وہ

جہاد ہی ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أی فی جهته وقصده "فأينما تولوا فثمَّ وجه الله"۔ یعنی جس جہت میں خرچ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اس کو پسند کیا ہے۔ یہ زیادہ اجر وثواب اس لئے ہے کہ اس میں جسمانی تھکاوٹ اور انفاق مال دونوں جمع ہیں

واللّٰه يضاعف لمن يشآ: بطور دلیل کے کہ یہ مذکور ثواب "اقل" موعود ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے کئی گناہ بڑھاتا ہے۔

شہداء کی چار قسمیں

۳۸۵۸:عَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ :سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَقُوْلُ الشُّهَدَاءُ اَرْبَعَةٌ :رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْاِ يْمَانِ لَقِىَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ اَعْيُنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ هٰكَذَا وَرَفَعَ رَأْسَهٗ حَتّٰى سَقَطَتْ قَلَنْسُوَتُهٗ فَمَا اَدْرِىْ اَقَلَنْسُوَةُ عُمَرَ اَرَادَ اَمْ قَلَنْسُوَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْاِيْمَانِ لَقِىَ الْعَدُوَّ كَاَنَّمَا ضُرِبَ جِلْدُهٗ بِشَوْكِ طَلْحٍ مِنَ الْجُبْنِ اَتَاهُ سَهْمٌ غَرْبٍ فَقَتَلَهٗ فَهُوَ فِى الدَّرَجَةِ الثَّانِيَةِ' وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلاً صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا لَقِىَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَالِكَ فِى الدَّرَجَةِ الثَّالِثَةِ' وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ اَسْرَفَ عَلٰى نَفْسِهٖ لَقِىَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَالِكَ فِى الدَّرَجَةِ الرَّابِعَةِ ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی' فی السنن ٤ / ١٥٢ کتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی فضل الشهداء عندالله' الحدیث ١٦٤٤۔

ترجمہ: "اور حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ شہداء کی چار اقسام ہیں: ایک تو وہ شخص جو کامل الایمان مسلمان تھا اور جب (کافر) دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے اللہ تعالیٰ کو (اپنا عمل) سچ کر دکھایا یہاں تک کہ (لڑتے لڑتے) قتل کر دیا گیا تو یہ وہ شخص ہے جس کی طرف قیامت کے دن لوگ اس طرح اپنی آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھیں گے (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنا سر اٹھایا یہاں تک کہ ان کی ٹوپی گر پڑی۔ حدیث کے وہ راوی جنہوں نے اس روایت کو حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ ان کی مراد اس سے عمرؓ کی ٹوپی تھی یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی تھی۔ (یعنی انہوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سر اٹھا کر دکھلایا تو ان کی ٹوپی گری تھی یا انہوں نے روایت حدیث کے وقت یہ بتلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی گری تھی بہرکیف حاصل یہ کہ قیامت کے دن یہ شخص اتنا عالی مرتبہ ہوگا کہ لوگ (یعنی عام مؤمنین) اس کی طرف اچک اچک کر دیکھیں گے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوسرا وہ شخص جو جید الایمان مؤمن تھا اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے ایسا نظر آنے لگا جیسے اس کے بدن میں طلح

یعنی خاردار درخت کے کانٹے چبھوئے جا رہے ہیں (یعنی یہ اس شخص کے خوف کی وجہ سے تھر تھر کانپنے اور دہشت سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جانے کی کیفیت کو کنایۃً بیان کیا گیا ہے) اور پھر ایک نامعلوم تیر آتا ہے اور اس کو قتل کر دیتا ہے تو یہ شخص پہلے شخص کی بہ نسبت دوسرے درجہ کا ہے اور تیسرا شخص وہ مؤمن تھا جس نے کچھ اچھے اور کچھ برے اعمال کئے تھے اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے اللہ تعالیٰ کو (اپنا عمل) سچ کر دکھایا یہاں تک کہ لڑتے لڑتے قتل کر دیا گیا تو یہ شخص تیسرے درجہ کا ہے اور چوتھا شخص وہ مسلمان ہے جس نے اپنی جان پر بہت اسراف کیا تھا (یعنی جس نے بہت زیادہ گناہ کئے تھے) اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے اللہ کو (اپنا عمل) سچ کر دکھایا یہاں تک کہ لڑتے لڑتے قتل کر دیا گیا تو یہ شخص چوتھے درجہ کا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

تشریح: قولہ: ''**رجل مؤمن جید الایمان۔۔۔حتی قتل**'': یعنی خالص اور کامل ایمان والا ہو۔ یعنی عمل صالح کرتا ہو اور یہی ظاہر ہے۔

''**فصدق اللّٰه حتی قتل** ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو اپنی شجاعت اور بہادری کے ساتھ، سچ کر دکھایا اور ایک نسخہ میں ''صاد"صدق" کی تشدید کے ساتھ ہے۔ **أی صدقه فیما وعد علی الشهادة**

''قتل'' صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ **أی حتی قاتل الی ان استشهد** حتی کہ قتال کرتے کرتے شہید کر دیا گیا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین کے اوصاف بیان کئے ہیں جو اللہ کی خاطر لڑتے ہیں اور پھر میدان جہاد میں صبر کے ساتھ ساتھ ثواب کی امید بھی رکھتے ہیں۔ یہ آدمی اپنے فعل کے ساتھ کوشش کرتا رہا اور صبر و احتساب کے ساتھ لڑتا رہا۔ گویا کہ اس نے اپنے فعل کے ساتھ اللہ کی تصدیق کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ﴾

[الأحزاب ۔۲۳]

''کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے وعدہ کیا تھا اس میں سچے اترے''۔

"**قوله: فذلك الذی یرفع الناس الیه اعینهم یوم القیامة هکذا......**''

قولہ: یہ ''**یرفع**'' کیلئے مفعول مطلق ہے۔ یعنی **یرفع رفعًا مثل رفع رأسی هکذا کما نشاهدون** ''**سقطت قلنسوته**'': ''**قلنسوة**'': قاف اور لام کے فتحہ نون کے سکون اور سین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ قول رفعت منزلت سے کنایۃ ہے۔

قولہ: ''**فما أدری أقلنسوة عمر أراد أم قلنسوة النبی ﷺ**:''

یہ قول فضالہؓ سے نچلے راوی کا ہے کہ ''**حتی سقطت**'' فضالہ کا کلام ہے یعنی مجھے یہ معلوم نہیں کہ حضرت عمرؓ کی ٹوپی مراد ہے یا سرور کائنات ﷺ کی ٹوپی کا گرنا مراد ہے۔ یا ''عمر'' کا کلام ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں (''ام'' کی بجائے) ''او'' آیا ہے اور **قلنسوه** کا اعادہ کلام میں فصل آجانے کی وجہ سے ہے۔

قولہ: ''**ورجل مؤمن جید الایمان......فهو فی الدرجة الثانية**'':

یہ مؤمن پہلے والے سے رتبہ شجاعت میں کم ہے۔

''طلح'': طاء کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔''ببول'' کے درخت کو کہتے ہیں۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ کنایہ ہے اس سے کہ انسان کے رونگٹے خوف اور ڈر کی وجہ سے کھڑے ہوجاتے ہیں فرائص و اعضاء کا خوف کی وجہ سے کانپنا سے کنایہ ہے۔

عرض مرتب:

صاحب ''مصباح اللغات'' لکھتے ہیں: الفریصة: باری پہلو اور مونڈے یا پستان اور مونڈھے کے درمیان کا گوشت جو خوف کے وقت اچھلنے لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ارتعدت فریصه یعنی بہت گھبرایا۔ ج فریص و فراص۔اھ۔

''من الجبن'': یہ بیان تشبیہ ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہاں پر''من'' تعلیلیہ ہے اور ''جبن'' شجاعت اور بہادری کی ضد ہے اور یہ دونوں خصلتیں انسان میں قدرتی طور پر موجود ہوتی ہیں اور اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اچھی طبیعتیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی نعمتوں میں سے ہیں۔ جس کے ذریعے سے انسان کا درجہ اور مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔

''سهم غرب'': مرکب توصیفی ہے اور ترکیب اضافی بھی جائز ہے۔''غرب'' وہ تیر جس کا پھینکنے والا معلوم نہ ہو۔

''فقتله'' یہ نسبت مجازی ہے۔

حدیث سے یہ بات ظاہر ہورہی ہے کہ قوی مومن اللہ کو زیادہ محبوب ہے مومن ضعیف سے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے:''ورجلٌ مؤمن خلط عملاً صالحًا و آخر سيئًا'' یہاں پر''واؤ'' بمعنیٰ''باء'' ہے۔ یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہے۔ جیسا کہ''بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ'' نے اپنی تفسیر میں اس آیت کی تفسیر کے تحت ذکر کیا ہے:﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ﴾[التوبة۔ ۱۰۲]

قوله:''ورجلٌ مؤمن اسرف علٰى نفسه۔۔۔فذلك فى الدرحمة الثالثة''

یعنی کثرت معاصی کے ذریعہ اپنے اوپر ظلم کیا اور اس میں معتزلۃ پر رد صریح ہے۔

حتى قتل'': یعنی وہ وصف شجاعت کے ساتھ متصف ہو، جو سے **فصدق الله** مفہوم ہو رہا ہے:

''قوله: رجل ںؤمن اسرف على نفسه.....فذاك فى الدرجة الرابعة''

اور ایک نسخہ میں''فذالك'' ہے اور یہی مراتب کے زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ اس کا ماقبل اسم اشارہ''ذاك'' آیا ہے جو درجۂ متوسط ہے اور اس کے ماقبل میں''هو'' آیا ہے۔ اس لئے کہ وہ قریب کے مناسب ہے اور اس کا ماقبل''ذالك'' کے زیادہ مناسب ہے۔ وہ کہ''عبد معنوی'' کے لیے جس کو ہر ایک نہیں پہنچ سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں مقرر ہے: [**ذالك الكتاب**]

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''ثانی'' اور اوّل'' میں فرق ہے باوجود یکہ دونوں بہترین ایمان والے ہیں۔ پہلے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان کی تصدیق کی چونکہ اس میں شجاعت ہے اور اس دوسرے شخص نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنا

خون دل دیا، اور بزدلی کی وجہ سے تصدیق کا وہ درجہ حاصل نہ کر سکا۔

دوسرے اور چوتھے درجہ میں فرق یہ ہے کہ دوسرا جید الایمان والا ہے لیکن اپنے فعل کے ساتھ اس کی تصدیق نہیں کر رہا ہے اور چوتھا اس کے برعکس ہے۔ پس اس کا ''درحة رابعة'' میں واقع ہونا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان اور اخلاص سے کوئی چیز خالی نہیں ہوتی اور یہ کہ تمام اعمال کا دارومدار اخلاص پر ہے۔ اھ یہ بات محل نظر ہے کہ اس حدیث کی اخلاص پر کوئی دلالت نہیں ہے۔ اگر چہ اختصاص کے تمام مراتب میں اس کا اعتبار ہے۔

بلکہ پہلے دونوں میں فرق شجاعت اور جبن کا ہے۔ اگر چہ دونوں ایمان اور صلاح عمل میں متفق ہیں اور پھر تیسرا درجہ ''**مخلط**'' کا ہے اور چوتھا درجہ ''**مسرف**'' کا ہے۔ اگر چہ یہ دونوں ایمان کے ساتھ متفق ہیں اور شاید طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''**مخلط**'' وہ شخص لیا ہے جو دنیا اور آخرت کی نیت کو جمع کرے اور مسرف سے مراد وہ شخص لیا ہے۔ جو اپنے جہاد سے غنیمت، ریاء اور ناموری کا ارادہ کرے۔

''جامع صغیر'' کی روایت میں **فما أدری** الخ کے الفاظ نہیں ہیں۔

مقتولین کی قسمیں

۳۸۵۹: وَعَنْ عُتْبَةَ بْنِ عَبْدِ السُّلَمِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْقَتْلٰى ثَلَاثَةٌ مُؤْمِنٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِذَا لَقِيَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى يُقْتَلَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فِيْهِ فَذَالِكَ الشَّهِيْدُ الْمُمْتَحَنُ فِيْ خَيْمَةِ اللّٰهِ تَحْتَ عَرْشِهٖ لَا يَفْضُلُهُ النَّبِيُّوْنَ اِلَّا بِدَرَجَةِ النُّبُوَّةِ، وَمُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِذَا لَقِيَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى يُقْتَلَ. قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهِ: مُمَصْمِصَةٌ مَحَتْ ذُنُوْبَهٗ وَخَطَايَاهُ اِنَّ السَّيْفَ مَحَّاءٌ لِلْخَطَايَا وَاُدْخِلَ مِنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَ، وَمُنَافِقٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فَاِذَا لَقِيَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى يُقْتَلَ فَذَاكَ فِي النَّارِ وَاِنَّ السَّيْفَ لَا يَمْحُوا النِّفَاقَ۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲ / ۲۷۲، الحدیث رقم ۲۴۱۱

ترجمہ: ''اور حضرت عتبہ بن عبدالسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شہداء کی تین اقسام ہیں: ایک تو وہ (کامل) مؤمن جس نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کیا چنانچہ جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی (تو وہ پوری بہادری اور شجاعت) کے ساتھ لڑا یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص (کی جلالت شان) کے بارے میں فرمایا کہ یہ وہ شہید ہے جس کو (جہاد کی مشقتوں اور مصائب پر صبر کرنے کی) آزمائش میں مبتلا کیا گیا یہ شہید آخرت میں عرش الٰہی کے نیچے اللہ کے خیمے میں ہوگا (یعنی اس کو حق تعالیٰ کا کمال قرب اور اس کے حضور میں درجۂ خاص حاصل ہوگا) اور انبیاء اس سے صرف درجۂ نبوت میں زیادہ ہوں گے اور دوسرا شخص وہ مؤمن ہے جس نے کچھ نیک اعمال کئے ہوں گے اور کچھ گناہ کیے ہوں گے۔ چنانچہ اس نے اپنی

جان اور اپنے مال کے ذریعہ خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو (پوری بہادری اور شجاعت کے ساتھ) لڑا یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا کہ شہادت اس کو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے اس کے گناہوں اور خطاؤں کو مٹانے والی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تلوار خطاؤں کو بہت زیادہ مٹانے والی ہے یہ وہ شہید ہے کہ جس دروازے سے جانا چاہے گا جنت میں داخل کیا جائے گا اور تیسرا شخص منافق ہے کہ (اگرچہ) اس نے بھی اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کیا اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو (خوب) لڑا یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا (لیکن) یہ شخص دوزخ میں جائے گا کیونکہ تلوار نفاق کو نہیں مٹاتی''۔ (دارمی)

تشریح: **قوله: القتلى ثلاثة: القتلى۔۔۔الابدرجة النبوة:**

''قتیل'' کی جمع ہے۔

ثلاثة: (کی تمیز محذوف ہے۔ **أى ثلاثة: اصناف۔**

''**مؤمن**'': (مبتدا محذوف کی خبر ہے۔) **اى أحد هم مؤمن كامل صالح فى العمل**

''**جاهد**'' ایک نسخہ میں ماضی کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ''اسم فاعل'' کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہاں پر قتلی کی طرف ''مؤمن'' کی نسبت ''مایؤول'' کے اعتبار سے ہے۔

''**فاذا لقى العدوّ قاتل حتى يقتل**'' اور یہاں پر ماضی سے مضارع کی طرف عدول کی وجہ یہ ہے کہ ''حال'' اور ''حسن مآل'' کا استحضار ہو جائے۔

''**فذلك الشهيد الممتحن**'' یعنی جس کا سینہ کھلا ہوا ہے اللہ نے اس کے دل کے تقویٰ کا امتحان لے لیا ہے۔

''**فى خيمة الله تحت عرشه**'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ''**الشهيد**'' **ذالك** کی خبر ہو اور ''ممتحن'' شہید کی صفت ہو اور ''**فى خيمة الله**'' خبر ثانی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''**شهيد**'' ''**ذالك**'' کی صفت واقع ہو اور اسی طرح ''**الممتحن**'' بھی **ذالك** کی صفت ہو اور ''**فى خيمة الله**'' اس کی خبر ہو۔ ممتحن ''مجرب'' کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: **امتحن فلان لأ مر كذا جرب له**

''**لا يفضله النبيون الا بدرجة النبوة**'': اس لئے کہ اس نے علم اور عمل کو جمع کیا اور ''سعادت شہادت'' کا اضافہ بھی ہے اور انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے اعمال صالحہ (طاعت وعبادت) میں ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور یہ جملہ معطوفین کے درمیان ''معترضہ'' ہے **قوله: ومؤمن خلط عملا......وخطاياه:**

لقى العدو: اذا نسخوں میں اسی طرح ہے اور بظاہر یہ ''**فاذا**'' ہے۔

''**ممصمصة**'': یہ دوہرے ''صاد'' کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ضاد معجمہ کے ساتھ ہے۔ یعنی اور ''قاموس'' میں ہے: ''**المصمصة**'' زبان کے کنارے کے ساتھ منہ میں کلی کرنا اور ''**مصمصة الذنوب**'' گناہوں سے پاک صاف کرنا اور ''**مضمضة**'' منہ میں پانی کو حرکت دینا۔

اور ''فائق'' میں ہے کہ ''مصمصة'' گناہوں کی گندگی سے پاک کرنا عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: اور ''مصمصت الاناء بالماء'' جب آپ اس کو حرکت دیں یہاں تک کہ وہ طاہر ہو جائے اور اسی سے ''مصمصة الفم'' ہے۔ منہ کو پانی کی تحریک کے ساتھ دھونا' جیسا کہ مضمضة ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ جب ''صاد'' غیر معجمہ کے ساتھ ہو تو معنی ہے ''منہ کے بعض حصہ کو صاف کرنا'' اور جب ''ضاد'' معجمہ کے ساتھ ہو تو معنی ہے پورے منہ کو صاف کرنا اور اس کو مؤنث اس لئے ذکر کیا ہے' کیونکہ یہ ''شهادة'' کے معنی میں ہے۔ یا اس سے مراد ''خصلة مصمصة'' ہے۔ صفت کو موصوف کے قائم مقام کر دیا ہے۔

قوله: ''ان الشيف محاء'':

''محاء'': مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ''زیادہ مٹانے والا''۔

''خطايا'' سے مراد صغائر ہیں اور کبائر مشیت کے تحت ہیں۔ لیکن ''صحیح مسلم'' میں حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے:

''القتل فی سبيل الله يكفر كل خطيئة الا الدين''

قوله: ''وأدخل من اى ابواب الجنة شآء'' یہ اس کی تعظیم اور اکرام کیلئے ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''قال النبی ﷺ'' کے درمیان کلام میں دو مرتبہ کہنے کی وجہ غایت احتیاط ہے۔ تاکہ کلام نبوی ان کی روایت کے ساتھ ملتبس نہ ہو جائے۔ مقولہ کی عظمت شان کے اہتمام کا اظہار ہے اھ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں معترضہ جملے راوی کی طرف سے ہیں، یعنی راوی کا ادراج ہیں۔

اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں عطفوں کے درمیان یہ جملہ ان دونوں کے علو مرتبہ کو بیان کرنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے یا ان دونوں مقام کے تفاوت کو بیان کرنے کے لئے فرمایا تھا اور اسی وجہ سے اسے اس قول کے بعد ''ومنافق'' یعنی ان قتلیٰ میں سے ایک منافق ہوگا۔

''**قوله: ومنا فق جاهد بنفسه...... فذاك فى النَّار**'': وگرنہ سب قتل ہونے تک وصف مقاتلہ میں مشترک تھے۔ پس دونوں کے درمیان امتیاز ضروری ہے تاکہ کلام کا مقصد حاصل ہو۔

قوله: ''انَّ السَّيف لايمحو النفاق:''

یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس میں تعلیل کے معنی ہیں اور ایک نسخہ میں ''انَّ'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ حدیث مبارکہ کا یہ آخری جملہ ایسا ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**ان الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر**''۔ اس حدیث کو طبرانی نے عمرو بن النعمان بن مقرن سے روایت کیا ہے۔ اور ایک روایت میں ''ابن عمرؓ'' سے اس طرح منقول ہے:

''انَّ الله ليؤيد الاسلام برجال ماهم من اهله''

جبکہ نسائی، ابن حبان نے حضرت انسؓ سے اور احمد اور طبرانی نے اس حدیث کو ابی بکرۃ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

''انَّ الله يؤيد هذا الدين بأقوام لا خلاف له''۔

اللہ کے راستہ میں ایک رات کی پہرہ داری کا ثواب

۳۸۶۰: وَعَنِ ابْنِ عَائِذٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فِیْ جَنَازَةِ رَجُلٍ فَلَمَّا وُضِعَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: لَا تُصَلِّ عَلَيْهِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَإِنَّهٗ رَجُلٌ فَاجِرٌ. فَالْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِلَى النَّاسِ، فَقَالَ: هَلْ رَآهُ اَحَدٌ مِنْكُمْ عَلٰى عَمَلِ الْإِسْلَامِ؟ فَقَالَ رَجُلٌ نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! حَرَسَ لَيْلَةً فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. فَصَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَحَثٰى عَلَيْهِ التُّرَابَ، وَقَالَ: اَصْحَابُكَ يَظُنُّوْنَ اَنَّكَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ، وَاَنَا اَشْهَدُ اَنَّكَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ. وَقَالَ: يَا عُمَرُ! اِنَّكَ لَا تُسْئَالُ عَنْ اَعْمَالِ النَّاسِ وَلٰكِنْ تُسْئَالُ عَنِ الْفِطْرَةِ. رواه البيهقى فى شعب الايمان

اخرجه البيهقى فى شعب الإيمان ٤ / ٤٣، الحديث رقم: ٤٢٩٧

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عائذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ ایک شخص کے جنازے کے ساتھ چلے (تا کہ اس کی نماز ادا کریں) جب جنازہ رکھا گیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اس جنازے کی نماز نہ پڑھیے کیونکہ یہ ایک فاسق شخص تھا۔ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ کیا تم میں سے کسی شخص نے اس کو اسلام کا کوئی کام کرتے دیکھا ہے؟ (یعنی اگر تم میں سے کسی نے اس کو اپنی زندگی میں کوئی ایسا عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے جو حقیقی اسلام پر دلالت کرے تو وہ مجھے بتائے) ایک شخص نے عرض کیا ''ہاں'' یا رسول اللہ! اس شخص نے ایک رات اللہ کی راہ (یعنی جہاد میں) پاسبانی کی خدمت انجام دی تھی''۔ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے اس جنازہ کی نماز پڑھی اور (تدفین کے وقت اس کے قبر پر) مٹی ڈالی اور (گویا میت کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ تیرے (سب یا بعض) ساتھیوں کا (غلبۂ خوف کی وجہ سے) تو یہ گمان ہے کہ تو دوزخی ہے اور میں (اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے حسن ظن کی بنیاد پر) اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ تو جنتی ہے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے عمر! تم سے لوگوں کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ تم سے عقیدہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اس روایت کو بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: خرج رسول الله ﷺ فی جنازة رجل......وحثی علیه التراب:

''جنازہ'': جیم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہوسکتا ہے۔

''فلما وضع'': یہ ضمیر نعش یا میت کی طرف راجع ہے (جو سیاق سے سمجھ میں آ رہا ہے)

''فانه رجلٌ فاجرٌ'': یعنی منافق ہے یا فاسق ہے۔ منع اس لئے کیا تا کہ اس جیسے لوگوں کیلئے زجر کا باعث ہو اور اس جیسے اعمال سے رک جائیں۔

''نعم یا رسول الله حرس لیلة فی سبیل الله'': یعنی اور اس عمل میں باعث ریاء کوئی چیز نہیں تھی بلکہ خالص اللہ کے لئے تھا۔

وحثى عليه التراب ''":یعنی آپ نے اپنے دستِ اقدس کے ساتھ ایک یا دو دفعہ مٹی ڈالی۔ اپنی امت کو اعمال اسلام پر ترغیب دینے کیلئے اور عام مخلوق پر رحمت کے اظہار کے لئے۔

''مغرب'' میں ہے: ''حثيت التراب وحثوته'' جب مٹی کو مٹھی میں لے اور اس پر اس کو پھینک دیں۔ ''حثا'' کو ''یاء'' اور ''الف'' دونوں کے ساتھ لکھنا جائز ہے۔

''قوله: يا عمر انك ......:

لا تسأل '': یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں لفظ ''في الاسلام'' کی زیادتی ہے۔ یعنی ان کے اسلام اور ایمان کے بارے میں تم سے نہیں پوچھا جائے گا۔

''ولكن تسأل عن الفطرة'': ''فطرت'' سے مراد دین کے شعائر ہیں جو اسلام پر دال ہوا کرتے ہیں اور یقین وایمان کی علامات کے بارے میں اور اس سے مقصود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس طرح کے اقدام سے روکنا تھا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہاں ''فطرة'' سے مراد اسلام اور خیر کے تمام اعمال مراد ہیں۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''كل مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه''۔

مطلب یہ کہ اے عمر تجھے اور تجھ جیسے لوگوں کو اس طرح کے مواقع پر ''موتٰی'' کے اعمال شر نہیں بتانے چاہیں بلکہ اپنے مردوں کا تذکرہ خیر اور بھلائی کے ساتھ کرو۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''اذكروا موتاكم بالخير''۔

''لا تخبر'' کی جگہ ''لا تسأل'' کہا تاکہ کوئی اور شخص بھی یہ بات نہ پوچھ سکے اور ''لا تخبر'' سے کلی طور پر سوال کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اس لئے اس سے اعمال شر کی خبر دینے کی بھی نفی ہوتی ہے اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اعمال خیر'' کے بارے میں پوچھا اور فرمایا: ''هل راه احد على عمل الاسلام'' اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اس پہرہ داری کے عمل کی وجہ سے اس کے لئے جنت کی بشارت اور گواہی دی، اور اسی ایک عمل پر اکتفاء کر لیا باقی اعمال صالحہ کے بارے میں نہیں پوچھا چونکہ ''فطرة'' کو ''اعمال سیئہ'' پر ترجیح حاصل ہے۔ اھ

امام طیبیؒ کے ظاہر کلام سے یوں لگتا ہے کہ ''لاتسئل'' دونوں جگہ بصیغہ معروف ہے یہ معنوی اعتبار سے تو بالکل واضح ہے۔ مبنیٰ کے اعتبار سے اللہ ہی جانتا ہے۔

بَابُ اِعْدَادِ اٰلَةِ الْجِهَادِ

سامان جہاد کی تیاری کا بیان

الفصل الاول :

''قوت تیراندازی میں ہے''

۳۸۶۱:عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۵۲۲ کتاب الامارة، باب فضل الرمی، الحدیث رقم (۱۶۷ ـ ۱۹۱۷) وأبو داود فی السنن ۳ / ۱۹، الحدیث رقم ۲۵۱۴ والترمذی فی ۵ / ۲۵۲، الحدیث رقم ۳۰۸۳، وابن ماجه فی ۲ / ۹۴۰، الحدیث رقم ۲۸۱۳، والدارمی فی ۲ / ۲۶۹، الحدیث رقم ۲۴۰۴، وأحمد فی المسند ٤ / ۱۵۷

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جہاں تک ممکن ہو تم (کافروں سے جنگ کرنے کے لئے) اپنی طاقت وقوت کو تیار رکھو۔ سن لو! بلاشبہ قوت سے مقصود تیر اندازی ہے۔ سن لو! بلاشبہ قوت سے مقصود تیر اندازی ہے۔ سن لو! بلاشبہ قوت سے مقصود تیر اندازی ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ''واعدوا لهم ما استطعتم من قوّة'':

صاحب ''الکشاف'' نے کہا ہے کہ ''قوۃ'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے میدان جنگ میں قوت حاصل ہو۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ما استطعتم'' میں ''ما'' موصولہ ہے اور ''عائد'' محذوف ہے۔

من قوّة: ''مِنْ'' بیانیہ ہے۔ پس یہاں پر مراد نفس قوت اور طاقت کی تیاری ہے۔

اس بیان میں اشارہ ہے کہ یہ تیاری کوشش اور تسلسل کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور جنگ کی تیاری یا اس کے اسباب کی تیاری میں جو چیزیں کوشش کی زیادہ محتاج ہیں وہ کمان اور تیر اندازی ہیں۔ اور اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''قوۃ'' کی تفسیر ''رمی'' (تیر اندازی) کے ساتھ کئی مرتبہ بیان کی ہے۔ قوله: ''الا ان القوة الرمی''

الا: یہ تنبیہ اور خبردار کرنے کے لئے ہے۔

اس جملہ کو تین مرتبہ مکرر کیا۔ تاکید کی زیادتی کیلئے۔ یا احوال ثلاثہ یعنی قلت، کثرت اور ان دونوں کی درمیانی حالت، کی طرف اشارہ ہے یہ مشق ان تینوں حالتوں میں مفید ہے۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں اور اس کے بعد آنے والی احادیث میں تیراندازی اور تیراندازی میں مقابلہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور ان کو جہاد کی نیت سے اختیار کرنا اور مراد اس سے قتال کی تمرین اور اعضاء کی مشق کرنا ہے۔

نیزہ بازی کا بیان

۳۸۶۲: وَعَنْهُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :سَتُفْتَحُ عَلَيْكُمُ الرُّوْمُ، وَيَكْفِيكُمُ اللّٰهُ، فَلَا يَعْجَزْ اَحَدُكُمْ اَنْ يَلْهُوَ بِاَسْهُمِهٖ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٣ / ١٥٢٢ كتاب الامارة، باب فضل الرمی، الحديث رقم (١٦٨ ـ ١٩١٨) والترمذی فی السنن ٥ / ٢٥٢، الحديث رقم ٣٠٨٣، وأحمد فی المسند ٤ / ١٥٧

ترجمہ: ''اور حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب تمہارے لئے روم کو فتح کر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ تمہیں اہل روم (ان کی شرانگیزیوں سے) سے کفایت کرے گا۔ لہٰذا خبردار! تم میں سے کوئی شخص اپنے تیروں کے ساتھ مشغول رہنے میں سستی نہ کرے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ''ستفتح عليكم الروم ......'':

یعنی اللہ تعالیٰ کی فتح اور نصرت تمہیں دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے شر اور قہر سے تمہارے لیے اپنی قوت کے ساتھ کافی ہو جائے گا۔ لیکن تمہارا ثواب اور اجر تمہاری کوشش اور کسب پر مرتب ہوں گے۔

''فلا يعجز'': یہ نہی کا صیغہ ہے اور دوسرے نسخہ میں فعل نفی کے ساتھ ہے اور شرح مسلم میں ''**يعجز**'' جیم کے کسرہ کے ساتھ منقول ہے اور ایک لغت میں جیم کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔

یعنی اہل الروم وغیرہ کے ساتھ جہاد کی نیت سے تیاری کرتا رہے اور تیراندازی کی مشق جاری رکھے۔

تخریج: ''جامع صغیر'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل ہے:

''**ستفتح عليكم ارضون ويكفيكم الله فلا يعجز احدكم ان يلهو باسهمه**'' اور کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور امام مسلم رحمہ اللہ نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ''اہل الروم'' کی اکثر جنگیں تیروں کے ساتھ ہوتی ہیں اور تم تیراندازی کو سیکھتے ہوتا کہ اہل روم کے ساتھ لڑائی اور جنگ کرنا ممکن ہو اور یوں تمہیں فتح نصیب ہو جائے اور اللہ تعالیٰ تم سے ''اہل لرروم'' کے شر اور برائی دفع اور ختم کر دیں۔ لیکن ''روم'' جب فتح ہو جائے تو پھر تیراندازی کے مقابلے اور اس کی تعلیم کو یہ کہہ کر مت چھوڑ دینا کہ اب ہم تیروں کے ساتھ لڑائی کے محتاج نہیں رہے، بلکہ مسلسل تم اس کو سیکھتے رہو اور اس پر ہمیشگی کرو۔ اس لئے کہ ''رمی'' ایسی چیز ہے جس کی ضرورت ہمیشہ پڑتی ہے۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ اس کا مطلب یہ فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم میں سے کوئی ''**تعلّم رمی**'' سے عاجز آجائے یہاں تک کہ جب فتح روم کا وقت قریب آجائے جو تمہارے لئے فتح ممکن ہو جائے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ''**تعلّم الرمی**''

پر ابھارنا اور تحریض ہے اور معنی یہ ہے کہ تیر اندازی کرتے رہنا چاہئے، یہ کوئی ممنوع کھیل نہیں ہے۔
طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوسری توجیہ زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ "فلا یعجز" میں "فاء" سببیہ ہے۔ گویا کہ یوں کہا گیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ قریب زمانے میں تمہیں فتح روم دے گا اور وہ لوگ تیر انداز ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ان کے شر سے تیر اندازی کے ذریعے سے کافی ہو جائے گا۔ پس اس وقت تم میں سے کوئی تیر اندازی سے عاجز نہ آئے یعنی تمہیں چاہیے کہ تم اس میں مقابلے کرو اور اس کی خوب مشق کرو اور اس پر مضبوطی سے عمل کرو یہاں تک کہ جب "اہل روم" کے ساتھ تمہاری لڑائی مسلسل ہو۔ تو یہ تمہارے لئے فتح میں مدد و معاون ہو رمی کو "لہو" کے پیرائے میں ذکر فرمایا تا کہ تعلّم اور مقابلہ کی طرف میلان ہو جائے۔

تیر اندازی چھوڑنے کی مذمت

۳۸۶۳: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ ثُمَّ تَرَكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا اَوْقَدْ عَصٰى ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۵۲۳ كتاب الأمارة' باب فضل الرمی والحث علیه' و ذم من علمه ثم نسیه' الحديث رقم (۱۶۹ ۔ ۱۹۱۹) وابن ماجه فی ۲ / ۹٤۰' الحديث رقم ۲۸۱٤

ترجمہ: "اور حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو ترک کر دیا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے یا (فرمایا) اس نے نافرمانی کی"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: "من علّم الرمی ثم ترکه، فلیس منّا": یعنی یہ شخص ہمارے ساتھ نہ ملے گا اور نہ ہی ہمارے زمرہ میں شمار ہوگا اور تیر اندازی سیکھ کر چھوڑ دینے والے شخص کے بارے میں وعید زیادہ سخت ہے اس شخص سے جس نے یہ تیر اندازی نہ سیکھی ہو۔ اس لئے کہ یہ ان کے زمرہ میں داخل ہی نہیں ہوا جبکہ یہ شخص پہلے داخل ہوا۔ پھر نکل گیا۔ گویا کہ اس نے اس میں کوئی نقصان دیکھا اور اس کا مذاق اڑایا یہ اس عظیم نعمت کی ناقدری اور ناشکری ہے۔ (طیبی)

قوله: "أو قد عصٰی":
بظاہر یہ "راوی" کی طرف سے شک کا اظہار ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ "اَوْ" تنویع کے لئے ہو۔ اس طور پر کہ پہلے کو ہم محمول کریں گے۔ اس پر کہ اس نے اس کو سستی اور کم ہمتی کی وجہ سے ترک کیا۔ جب کہ دوسرا اس پر محمول ہوگا کہ اس نے اس کو (تیر اندازی) کو ناقص اور اہانت سمجھ کر ترک کیا۔

تیر اندازی سنت اسمٰعیل ہے

۳۸۶۴: وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَوْمٍ مِنْ اَسْلَمَ يَتَنَاضَلُوْنَ بِالسُّوْقِ فَقَالَ: اِرْمُوْا بَنِيْ اِسْمَاعِيْلَ فَاِنَّ اَبَاكُمْ كَانَ رَامِيًا وَاَنَا مَعَ بَنِيْ فُلَانٍ لِاَ حَدِ

الْفَرِيْقَيْنِ فَاَمْسَكُوْا بِاَيْدِيْهِمْ فَقَالَ :مَالَكُمْ قَالُوْا كَيْفَ نَرْمِى وَاَنْتَ مَعَ بَنِىْ فُلَانٍ؟ قَالَ اُرْمُوْاوَاَنَا مَعَكُمْ كُلِّكُمْ . (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٥٣٧ کتاب المناقب' باب نسبة الیمن الی اسماعیل' الحدیث رقم ٣٥٠٧

ترجمہ:''اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ بنی اسلم لوگوں کے پاس تشریف لائے اور وہ لوگ (اس وقت) بازار میں آپس میں تیراندازی (کی مشق) کر رہے تھے۔آنحضرت ﷺ نے (ان کو اس حالت میں دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور) فرمایا کہ اے اولاد اسماعیل! (یعنی اے عربو) تیراندازی کرو' (اور مداومت اختیار کرو) کیونکہ تمہارے باپ (حضرت اسماعیل علیہ السلام) تیرانداز تھے اور میں (بھی) فلاں قبیلے کے ساتھ ہوں (یعنی اس وقت بنی اسلم کے جو دو فریق آپس میں تیراندازی کی مشق کر رہے تھے آپ ﷺ نے ان میں سے ایک کا نام لے کر فرمایا کہ اس مشق میں میں اس فریق کی طرف ہوں) لیکن انہوں نے (یعنی دوسرے فریق نے) ہاتھ روک لئے (یعنی جب آپ ﷺ ایک فریق کی طرف ہو گئے تو مقابل فریق نے تیراندازی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا؟ (یعنی تم نے تیراندازی کیوں بند کر دی؟) انہوں نے کہا کہ ہم اس صورت میں کیسے تیراندازی کر سکتے ہیں جب کہ آپ ﷺ فلاں (فریق) کے ساتھ ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اچھا) تم تیراندازی کرو میں تم سب کے ساتھ ہوں''۔ (بخاری)

تشریح: **قوله:خرج رسول الله ﷺ علی قوم ......:**

''سوق'': یہ لفظ سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''السُّوق'' ساق کی جمع ہے۔یہاں پر استعارہ کے طور پر تیروں کے لئے مستعمل ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دراصل ''مشی'' سے کنایہ ہے۔یعنی یہ لوگ پیدل چل رہے تھے' سوار نہیں تھے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ ''سین'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔جگہ کا نام ہے اور ''باء'' ''فی'' کے معنی میں ہے۔

''**بنی اسمٰعیل**'': یاء حرف نداء محذوف ہے یعنی یا بنی اسماعیل!

کان رامیاً'': یعنی ایک عظیم تیرانداز تھا یا تیراندازی کا موجد تھا۔

''**وأنا مع بنی فلان**'' یہ بناء علی العادة فرمایا، اس لئے کہ تیراندازوں میں سے جو بھی وہاں موجود ہوگا وہ کسی کے ساتھ تو ہوگا۔

''**لأحد الفریقین**'': ''**فقال**'' کے متعلق ہے۔

''**بأیدیهم**'' یہاں ''باء'' زائدہ ہے۔

''**قالوا**'': اور ایک نسخہ میں ''**فقالوا**'' ہے۔

''**و کیف نرمی وانت مع بنی فلان؟**'': یعنی آپ کی معیت اور نصرت دوسرے کے ساتھ ہے۔

انا معکم کلکم: ''کلکم'' مجرور ہے۔ضمیر مجرور کی تائید ہے۔

نشانہ ہدف پر لگنے کا بیان

۳۸۶۵:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ : كَانَ اَبُوْطَلْحَةَ يَتَتَرَّسُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتُرْسٍ وَاحِدٍ وَ كَانَ اَبُوْطَلْحَةَ حَسَنَ الرَّمْيِ فَكَانَ اِذَا رَمٰى تَشَرَّفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَنْظُرُ اِلٰى مَوْضِعِ نَبْلِهٖ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٩٣ کتاب الجهاد' باب المجن' الحدیث رقم ٢٩٠٢ وأحمد فی المسند ٣/ ٢٨٦

ترجمہ:''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ (میدان جنگ میں) ایک ڈھال کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کا بچاؤ کررہے تھے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ایک بہترین تیرانداز تھے چنانچہ (وہ دشمنوں پر بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ تیراندازی بھی کررہے تھے اور آنحضرت ﷺ کی حفاظت بھی) جب وہ تیر پھینکتے تو نبی کریم ﷺ (ابوطلحہؓ کے تیر پر) نگاہ رکھتے تھے اور آپ ﷺ تیر گرنے کی جگہ کو دیکھتے تھے۔''۔(بخاری)

تشریح: **قوله: کان ابو طلحة یترس** ......:

''**یتترس مع النبی ﷺ بترس واحد**'': یہ جملہ قرب کرنے پر دلالت کرتا ہے کہ ابوطلحہ کو آپؐ کا کس قدر قرب حاصل تھا۔

تشرف:''**استشراف**'' ماتھے پر ہاتھ رکھنے کو کہتے ہیں اور اس شخص کی طرح دیکھے جو سورج سے بچاؤ کے لیے ہاتھ کا سائبان بنالے یہاں تک کہ وہ چیز ظاہر ہوجائے۔ اسی طرح ''النہایہ'' میں منقول ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''فکان'' میں ''فاء'' سببیۃ کا ہے۔ ابوطلحہ اچھے تیرانداز تھے جس کی وجہ سے آپ ﷺ اپنی نظر کو اس کے تیر پر رکھتے تاکہ پتہ چلے کہ تیر کس کو لگا ہے؟ اور نبی ﷺ اس لئے بھی تیر دیکھتے تھے تاکہ صحیح جگہ پر لگے۔

گھوڑے کی پیشانی کی فضیلت

۳۸۶۶:وَعَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَلْبَرَكَةُ فِيْ نَوَاصِى الْخَيْلِ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٥٤ کتاب الجهاد' باب الخیل معقود' الحدیث رقم ٢٨٥١ و مسلم فی ٤ / ١٤٩٤' الحدیث رقم (١٠٠ ـ ١٨٧٤) والنسائی فی السنن ٦ / ٢٢١' الحدیث رقم ٣٥٧١' وأحمد فی المسند ٣ / ١١٤

ترجمہ:''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گھوڑوں کی پیشانیوں میں برکت ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: برکت کو گھوڑوں میں اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ ان کے ذریعے جہاد جیسا عظیم عمل کیا جاتا ہے جس میں دنیا وآخرت کی بھلائی اور خیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے: ﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ﴾[الانفال۔۶۰] ''اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لئے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے ہیبت بیٹھی رہے گی اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائیگا۔ اور تمہارا ذرا نقصان نہ کیا جائیگا۔''

گھوڑے کی پیشانی میں اَجر وغنیمت ہے

۳۸۶۷: وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَلْوِىْ نَاصِيَةَ فَرَسٍ بِاَصْبَعِهٖ وَهُوَيَقُوْلُ الْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ بِنَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ' الْاَجْرُ وَ الْغَنِيْمَةُ۔

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۳ / ۱۴۹۳' كتاب الامارة' باب فضيلة الخيل وأن الخير معقود بنواصيها' الحديث رقم(۹۷ ۔ ۱۸۷۲) والنسائى فى السنن ٦ / ۲۲۱ الحديث رقم ۳۵۷۲

ترجمہ: ''اور حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک گھوڑے کی پیشانی کے بالوں کو اپنی انگلی سے بل دیتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ گھوڑے (وہ جانور ہیں) جن کی پیشانیوں میں قیامت کے دن تک کے لئے خیر و بھلائی باندھ دی گئی ہے (کیونکہ گھوڑوں کے ذریعہ جہاد کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے جس میں دنیا وآخرت کی خیر و بھلائی ہے' جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہاد میں) آخرت کا ثواب ملتا ہے اور دنیا کا مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔'' (صحیح مسلم)

تشریح: قوله: رأيت رسول اللهؐ فرس باصبعه:

''رايت رسول الله'' اور ایک نسخہ میں ''النبیؐ'' ہے۔

''ناصية فرسه باصبعه'' علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ناصية سے وہ بال مراد ہیں جو چہرہ پر لٹکے رہتے ہیں۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''الناصية'' جمیع ذات فرس سے کنایہ ہے کہا جاتا ہے۔ فلان مبارك الناصية ومبارك الغرة أى مبارك الذات'' پس اس صورت میں یہ مجاز ہوگا۔ جزء بول کر کل مراد ہے۔ جیسا کہ گردن اور سر بول کر مراد پورا جسم لیا جاتا ہے۔

قوله: يقول والخيل معقود بنواصيها ......:

''الخيل'': جنس خیل مراد ہے۔

''معقود بنو اصيها'' یہاں پر''باء''فی کے معنی میں ہے۔
یعنی یہ اس کیلئے لازم ہے گویا کہ وہ اس میں بندھے ہوئے ہیں۔
''الی یوم القيامة'': یعنی مراد قرب قیامت ہے۔''شرح السنۃ'' میں لکھا ہے کہ اس میں جہاد کیلئے گھوڑا رکھنے کی ترغیب ہے اور یہ کہ جہاد کبھی ختم نہیں ہوگا۔
''الأجر والغنيمة'': یہ دونوں''خیر'' کی تفسیر ہیں۔ پس یا تو دونوں''خیر'' سے بدل ہیں۔ یا مبتدأ محذوف کی خبر ہیں۔ اس صورت میں عبارت یوں ہوگی۔''هو الأجر والغنيمة''۔
اور حدیث سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے کمایا ہوا مال بہترین اور برکت والا مال ہے۔

روایات باب

''جامع صغیر'' میں روایت اس طرح ہے
''الخيل معقود فى نواصيها الخير الى يوم القيامة'' اس کو مالک، احمد، بخاری و مسلم، نسائی اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے طریق سے نقل کیا ہے۔ احمد، شیخین، نسائی، اور ابن ماجہ نے عروۃ بن الجعد کے طریق سے روایت کیا ہے۔ جبکہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انسؓ کے طریق سے روایت کیا ہے۔
مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے طریق سے نقل کیا ہے۔ احمد بن حنبل نے حضرت ابوذر کے طریق سے اور طبرانی نے سوادۃ بن الربیع، نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو کبشہ کے طریق سے نقل کیا ہے۔
طبرانی نے''الأوسط'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس لفظ کے ساتھ نقل کیا ہے:
''الخير معقود بنواصى الخيل الى يوم القيامة والمنفق على الخيل كالباسط كفه بالنفقة لا يقبضها''
احمد، شیخین، نسائی اور ترمذی نے عروۃ البارقی سے اس طرح نقل کیا ہے:
''الخيل معقود بنو اصيها الخير الى يوم القيامة الأجر والغنم''۔ ایک دوسرے طریق سے احمد، مسلم اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جریر سے روایت کیا ہے۔
طبرانی کی الاوسط میں روایت اس طرح ہے:
''الخيل معقود فى نواصيها الخير واليمن الى يوم القيامة واهلها معانون عليها قلدوها ولا تقلدوها الأوتار''۔
طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کی الکبیر میں روایت اس طرح ہے:
''الخيل معقود بنو اصيها الخير والنبل الى يوم القيامة واهلها معانون عليها والمنفق عليها كباسط يده فى صدقته وابوالها واوراثها لاهلها عند الله يوم القيامة من مسك الجنّة''۔اھ۔

فائدہ: یہ حدیث متواتر ہے، یا متواتر کے قریب قریب ہے، لہٰذا مشہور ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔

فی سبیل اللہ گھوڑا پالنے کا ثواب

۳۸۶۸:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَبَسَ فَرَسًا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِيْمَانًا بِاللّٰهِ وَتَصْدِيْقًا بِوَعْدِهٖ فَاِنَّ شِبْعَهٗ وَرِيَّهٗ وَرَوْثَهٗ وَبَوْلَهٗ فِیْ مِيْزَانِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٥٧ کتاب الجهاد، باب من احتبس فرساً، الحدیث رقم ٢٨٥٣، والنسائی فی ٦ / ٢٢٥، الحدیث رقم ٣٥٨٢، وأحمد فی المسند ٢ / ٣٧٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کے وعدے کو سچا جاننے کی وجہ سے خدا کی راہ میں (کام لینے کے لئے اپنے گھر) گھوڑا باندھا تو اس گھوڑے کی سیری و سیرابی (یعنی اس نے دنیا میں جو کچھ کھایا اور پیا ہے وہ) اور اس کی لید اور اس کا پیشاب قیامت کے دن اس کے ترازو میں ہوں گے (یعنی اس شخص کے اعمال کی ترازو میں تولے جائیں گے)''۔

(بخاری)

تشریح: **قوله:من احتبس فرسا ......:**

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''حسبته و احتبس'' کبھی متعدی بنفسہ ہوتے ہیں اور کبھی غیر متعدی استعمال ہوتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ گھوڑے کو اپنے پاس کسی دینی غرض مثلاً جہاد وغیرہ سے روکے رکھا:

''**ایماناً باللّٰه**'': یہ مفعول لہ ہے۔ مطلب یہ کہ اس گھوڑے کو خالص اللہ کیلئے اور اس کے حکم کی بجا آوری کی وجہ سے باندھے رکھا۔

''**وتصدیقًا بوعده**'': یہ عبارت ہے اس ثواب سے جو احتباس اور تلخیص پر مرتب ہوتا ہے۔ یعنی اس نے اس کو بجا آوری اور ثواب کی امید سے روکا اور یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے احتباس پر ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ پس جس نے روکا۔ پس گویا کہ اس نے یوں کہا ہے: ''**صدقتك فیما وعدتنی**'' میں آپ کی تصدیق کی اس وعدہ میں جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے۔

شبعه: ''شین'' کے کسرہ اور ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

''**ریه**'': راہ کے کسرہ اور ''یاء'' مشدد کے ساتھ ہے۔

دربارِ نبوی میں گھوڑوں کی پسندیدگی کا معیار

۳۸۶۹:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَكْرَهُ الشِّكَالَ فِی الْخَيْلِ ـ وَالشِّكَالُ:اَنْ يَّكُوْنَ الْفَرَسُ فِیْ رِجْلِهِ الْيُمْنٰى بَيَاضٌ، وَفِیْ يَدِهِ الْيُسْرٰى اَوْفِیْ يَدِهِ الْيُمْنٰى وَرِجْلِهِ الْيُسْرٰى ـ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱٤۹٤ کتاب الامارة' باب ما یکره من صفات الخیل' الحدیث رقم (۱۰۲ ـ ۱۸۷۵) و أبو داود فی السنن ۳ / ٤۸' الحدیث رقم ۲٥٤۷' والترمذی فی ٤ / ۱۷۷ الحدیث رقم ۱٦۹۸' والنسائی فی ٦ / ۲۱۹' الحدیث رقم ۳٥٦۷' و ابن ماجه فی ۲ / ۹۳۳ الحدیث رقم ۲۷۹۰' وأحمد فی المسند ۲ / ۲٥۰۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے میں شکال کو ناپسند فرماتے تھے اور شکال یہ ہے کہ گھوڑے کے دائیں پاؤں اور بائیں ہاتھ پر سفیدی ہو یا دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں پر سفیدی ہو''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: کان رسول اللهؐ یکره الشکال فی الخیل:**

الشکال: شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

فی الخیل: ''جامع صغیر'' میں ''من الخیل'' ہے۔

قوله: والشکال ان یکون الفرس ......:

یہاں پر ''او'' تنویع و تقسیم کیلئے ہے اور بہ ظاہر یہ کلام راوی کا اپنا لگتا ہے۔ یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ نہیں ہیں۔ وگرنہ تو مقصود میں نص ہوتا اور پھر ''شکال'' کی تفسیر میں کوئی اشکال بھی نہ ہوتا اور وجہ کراہت شارع ہی جانتا ہے۔

① گھوڑے کے دائیں پاؤں اور بائیں ہاتھ میں سفیدی ہو۔

② یا دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں میں سفیدی ہو۔

③ ابوعبید اور جمہور اہل اللغت کا قول یہ ہے کہ جس کے تین پاؤں (سفید نشان والے) ہوں اور ایک (یعنی خالی از نشان) ہو۔ جانور کے اس پائے بند کے مشابہ ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ گھوڑے کو باندھا جاتا ہے اور وہ عام طور پر تین پاؤں میں ہوتا ہے۔

④ ابوعبید فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ شکال کی صورت یہ ہوتی ہے کہ تین پاؤں میں سفید نشان نہ ہو صرف ایک پاؤں میں یہ سفید نشان ہو۔

⑤ اور ابن درید فرماتے ہیں کہ شکال اس کو کہتے ہیں کہ جس کے ہاتھ اور پاؤں کے ایک جانب میں ہو اور اگر وہ مخالف جانب میں ہو تو اس کو شکال مخالف کہتے ہیں۔

⑥ قاضی عیاض اور ابوعمر و مطرز کہتے ہیں کہ بعض دفعہ دائیں پاؤں اور دائیں ہاتھ کی سفیدی کو شکال کہتے ہیں۔

⑦ اور بعض دفعہ بائیں پاؤں اور بائیں ہاتھ کی سفیدی کو شکال کہتے ہیں۔

⑧ بعض لوگ اس کو شکال کہتے ہیں جن کی اگلی ٹانگیں سفید ہو۔

⑨ بعض لوگ شکال اس کو کہتے ہیں کہ جس کے دو پاؤں اور ایک ہاتھ سفید ہو۔

⑩ بعض نے کہا ہے کہ جس گھوڑے کے دونوں ہاتھ اور ایک پاؤں سفید ہو۔ اس کو ''شکال'' کہتے ہیں۔

اور کرامت کی وجہ بعض لوگوں نے یہ لکھی ہے کہ اس قسم کے گھوڑوں پر تجربہ کیا گیا۔ لیکن ان میں کوئی نجات نہیں نکلی۔ بعض کا

کہنا ہے کہ یہ کراہت تفائل پر مبنی ہے، چونکہ یہ مشکول کے مشابہ ہے

عرضِ مرتب:

مشکول کے ایک معنی یہ ہیں وہ گھوڑا جو پائے بند سے بندھا ہوا ہو۔ یہاں بظاہر یہی معنی مراد ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب اس سفید نشان کے ساتھ کالے نشان بھی ہوں تو چونکہ شکال کا شبہ زائل ہوگیا اس لئے کراہت بھی زائل ہو جائے گی۔

گھوڑوں کے درمیاں مقابلہ کرانے کا بیان

۳۸۷۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِيْ اُضْمِرَتْ مِنَ الْحَفْيَاءِ وَاَمَدُهَا ثَنِيَّةُ الْوَدَاعِ وَبَيْنَهُمَا سِتَّةُ اَمْيَالٍ وَسَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِيْ لَمْ تُضْمَرْ مِنَ الثَّنِيَّةِ اِلٰى مَسْجِدِ بَنِيْ زُرَيْقٍ وَبَيْنَهُمَا مِيْلٌ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ٧١ كتاب الصلاة' باب هل يقال مسجد بنى فلان' الحديث رقم : ٢٨٦٨' و مسلم فى ٣ / ١٤٩١' الحديث رقم (٩٥ ـ ١٨٧٠) و أبو داود فى السنن ٣ / ٦٤' الحديث رقم ٢٥٧٥' و النسائى فى ٦ / ٢٢٦' الحديث رقم ٣٥٨٤' والدامى فى ٢ / ٢٧٩' الحديث رقم ٢٤٢٩' و مالك فى الموطا ٢ / ٤٦٧' الحديث رقم ٤٥' من كتاب الجهاد۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھریرے گھوڑوں کے درمیان حفیاء مقام سے ثنیۃ الوداع کے درمیان مسابقت گھوڑ دوڑ کرائی ہے اور ان دونوں مقامات (یعنی حفیاء اور ثنیۃ الوداع) کے درمیان چھ میل کا فاصلہ ہے اور جو گھوڑے چھومیرے نہیں تھے ان کے درمیان ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک مسابقت کرائی اور ان دونوں مقامات (یعنی ثنیۃ الوداع اور مسجد بنی زریق) کا درمیانی فاصلہ ایک میل ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله:ان رسول اللہ سابق بین الخیل ...... وبینهماا سته امیال:**

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اضمار یہ ہے کہ گھوڑے کو اتنا چارہ کھلایا جائے جس سے وہ خوب موٹا اور طاقت ور بن جائے پھر اس کے چارے کو اس کی خوراک کی مقدار سے کم کر دیا جائے اور اس کو ایک کمرے میں بند کر دیا جائے اور اس پر جُل لپیٹ دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ گرم ہو جاتا ہے اور اس سے پسینہ بہنے لگتا ہے پھر جب اس کا پسینہ خشک ہو جائے تو اس کا گوشت کم ہو جاتا ہے اور بھاگنے میں وہ قوی ہو جاتا ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''ضمر'' لاغری اور کم گوشت والے جانور کو کہا جاتا ہے اور یہاں ''اضمار'' سے مراد ''تضمیر'' ہے۔ تضمیر یہ ہے کہ گھوڑے کو اتنا چارہ کھلایا جائے کہ جس سے وہ خوب موٹا ہو جائے اور پھر رفتہ رفتہ کمی کرتے ہوئے قوت لا یموت دی جاتی ہے۔ یہ کام چالیس دن میں ہوتا ہے اور بعض دفعہ عرب اس پر چراغ روشن کر دیتے ہیں اور اس کو باندھتے ہیں یہاں تک کہ اس کے نیچے سے پسینہ نکل جاتا ہے جس سے اس کا ڈھیلا گوشت ختم ہو جاتا ہے اور بقیہ گوشت سخت ہو جاتا ہے۔

مدت تضمیر کو "مضمار" کہتے ہیں اور جس جگہ میں یہ "فعل تضمیر" کیا جاتا ہے اس کو بھی "مضمار" کہتے ہیں۔ کلام عرب میں تضمیر باب تفعیل سے معروف ہے ہے۔ بعض رواہ نے "تضمیر" کی جگہ "اضمار" ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ دونوں ابواب سے مستعمل ہے۔

"قاموس" میں لکھا ہے: "الضمر" ضاد کے ضمہ کے ساتھ یا ضاد و میم دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے اس کے معنی ہیں لاغری اور پیٹ کا اندر کی طرف گھس جانا "خیل" کی تضمیر کیلئے مستعمل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں لغات منقول ہیں۔

"الحفیاء": حاء کے فتحہ فاء کے سکون کے ساتھ۔ الف ممدودہ اور مقصورہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ ایک جگہ کا نام ہے۔ "من" ابتداء غایت کیلئے ہے۔ أمد:: انتہائے غایت کو کہتے ہیں۔

"ثنية الوداع": "ثنیۃ" کی اضافت "وداع" کی طرف کی گئی ہے اس لئے کہ یہ مقام وداع تھا۔ "قاموس" میں لکھا ہے: "الثنية" گھاٹی گھاٹی والا راستہ پہاڑ، پہاڑی راستہ پہاڑ کی طرف جانے والے راستہ۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "تضمیر شدہ" گھوڑوں کیلئے انتہائی جگہ دور رکھی اس لئے کہ وہ بہ نسبت دوسرے گھوڑوں کے قوی اور طاقت ور ہوتے ہیں اور اس حدیث سے گھوڑ دوڑ کے مقابلے کا جواز بھی نکلتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُونٹنی کا بیان

۳۸۷۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَتْ نَاقَةٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تُسَمَّى الْعَضْبَاءُ وَكَانَتْ لَا تُسْبَقُ، فَجَاءَ اَعْرَابِيٌّ عَلٰى قَعُوْدٍ لَّهٗ، فَسَبَقَهَا فَاشْتَدَّ ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَّا يَرْتَفِعَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا وَضَعَهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٧٣ كتاب الجهاد، باب ناقة النبی صلی الله عليه وسلم، الحديث رقم ٢٨٧٢، و أبو داود فی السنن ٥ / ١٥، الحديث رقم ٤٨٠٢، والنسائی فی ٦ / ٢٢٨، الحديث رقم ٣٥٩٢، وأحمد فی المسند ٣ / ١٠٣

ترجمہ: "اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا اور وہ کبھی پیچھے نہیں رہتی تھی (یعنی اس کا جب اونٹ سے بھی دوڑ میں مقابلہ ہوتا اس کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتی تھی) لیکن (ایک دن) ایک دیہاتی اپنے اونٹ پر آیا اور (جب اس نے عضباء سے اپنا اونٹ دوڑایا تو) اس کا اونٹ آگے نکل گیا یہ بات مسلمانوں پر سخت ناگوار گزری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ کا یہ ایک ثابت شدہ دستور ہے کہ دُنیا کی جس چیز کو بھی عروج ملتا ہے اللہ اس کو پست کر دیتا ہے"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: كانت ناقة لرسول الله صلی اللہ علیہ وسلم تسمى العضباء وكانت لا تسبق:

"عضباء": کان کٹی یا کان پھٹی اونٹنی کو کہتے ہیں۔ اس اونٹنی کا نام "قصواء" تھا یا کوئی اور نام تھا۔ (سیوطی) جبکہ "النہایہ" میں ہے کہ "عضباء" اس کا نام تھا۔ عضباء وہ اونٹنی جس کے کان پھٹے ہوئے ہوں۔ اس اونٹنی کے کان پھٹے ہوئے

نہیں تھے۔بعض نے کہا ہے۔وہ ''مشقوقة الأذن'' تھی۔علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''نا قة عضبآء'' وہ اونٹنی ہے جس کی اگلی ٹانگیں چھوٹی ہوں۔

'' لا تسبق '':قوله:فجاء اعرامى على فقال ...... :یہ مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

قعود :قاف کے فتحہ اور عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔اس کمزور اور لاغر اونٹ کو کہتے ہیں جس پر ایک ہی بیٹھ سکتا ہو۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''قعود'' اس اونٹ کو کہتے ہیں کہ جس پر سواری ممکن ہو اور کم از کم عمر اس کی دو سال ہو۔چھ سال تک ''قعود'' کہلاتا ہے اور پھر وہ ''جمل'' بن جاتا ہے۔

''من الدنيا'': جامع صغیر کی روایت میں ''من امر الدنيا'' کے الفاظ ہیں۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''على الله'' ''حقا'' کے متعلق ہے۔''وان لا يرتفع'' انّ کی خبر ہے اور ''أن'' مصدریہ ہے۔ پس اس صورت میں یہ (یعنی خبر) معرفہ ہوگی اور اسم نکرہ ہوگا یہ باب ''قلب'' میں سے ہے معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہوگی: ان عدم الارتفاع حق على الله۔ یہ کلام اہل عرب کے اس قول کے مشابہ ہے: كان مزاجها عسل اور ''على الله'' حقًّا کی صفت بھی واقع ہو سکتی ہے۔یعنی ''حقًّا ثابتًا واجبًا على الله''

فائدہ :اس حدیث اور سابقہ حدیث سے گھوڑ دوڑ مقابلے کا جواز نکلتا ہے۔

الفصل الثانی:

تیر ایک، جنتی تین

۳۸۷۲:عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُدْخِلُ بِالسَّهْمِ الْوَاحِدِ ثَلَاثَةَ نَفَرٍ الْجَنَّةَ صَانِعَهُ يَحْتَسِبُ فِيْ صَنْعَتِهِ الْخَيْرَ وَالرامِيَ بِهٖ مُنَبِّلَهٗ فَارْمُوْا وَارْكَبُوْا وَاَنْ تَرْمُوْا اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ تَرْكَبُوْا' كُلُّ شَيْءٍ يَلْهُوْبِهِ الرَّجُلُ بَاطِلٌ اِلَّا رَمْيَهٗ بِقَوْسِهٖ وَتَادِيْبُهٗ فَرَسَهٗ وَمُلَاعَبَتُهٗ امْرَاَتَهٗ فَاِنَّهُنَّ مِنَ الْحَقِّ (رواه الترمذى' وابن ماجة' وزاد ابوداود' والدارمى) وَمَنْ تَرَكَ الرَّمْيَ بَعْدَ مَاعَلِمَهٗ رَغْبَةً عَنْهُ فَاِنَّهٗ نِعْمَةٌ تَرَكَهَا اَوْقَالَ :كَفَرَهَا۔

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۲۸ كتاب فضائل الجهاد' باب فى فضل الرمى' الحديث رقم : ۲۵۱۳' والترمذى فى ٤ / ۱٤۹' الحديث رقم ۱٦۳۷' والنسائى فى ٦ / ۲۲۲' الحديث رقم ۳۵۷۸' وابن ماجه فى ۲ / ۹٤۰' الحديث رقم ۲۸۱۱' والدارمى فى ۲ / ۲٦۹' الحديث رقم ۲٤۰۵' وأحمد فى المسند ٤ / ۱٤٤

ترجمہ:''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ (کفار پر چلائے جانے والے) ایک تیر کے بدلے تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا: ایک تو اس تیر کے بنانے والے کو جب کہ وہ اپنے روزگار کے ساتھ) ثواب کی بھی امید رکھے (یعنی جب وہ تیر بنائے تو اپنے

روزگار کے ساتھ ثواب کی نیت بھی رکھے کہ میں یہ تیر جہاد میں کام آنے کے لئے بنا رہا ہوں دوسرے) جہاد میں تیر چلانے والے کو اور (تیسرے) تیر دینے والے کو (یعنی وہ شخص جو تیرانداز کے ہاتھ میں اپنا یا اسی کا تیر دے اور خواہ پہلے ہی دے یا نشانے پر سے اٹھا کر دے) لہٰذا تم تیراندازی کرو اور گھوڑوں پر سواری کرو (یعنی تیراندازی اور گھڑ سواری کی مشق کرو) اور تمہارا تیراندازی کرنا میرے نزدیک گھڑ سواری کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے اور یاد رکھو! جس چیز کو انسان لہو ولعب (یعنی محض کھیل اور تفریح) کے طور پر اختیار کرے وہ باطل اور ناروا ہے مگر اپنی کمان سے تیر اندازی کرنا اپنے گھوڑے کو تربیت دینا اور اپنی زوجہ کے ساتھ کھیل کود کرنا یہ سب چیزیں حق ہیں۔ (ترمذی' ابن ماجہ) ابوداؤد اور دارمی نے (اپنی روایت میں) یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ اور جو شخص تیراندازی سیکھنے کے بعد اس کو رغبت نہ ہونے کی بناء پر ترک کر دے تو وہ (تیراندازی) ایک نعمت تھی جس کو اس نے ترک کر دیا یا یہ فرمایا کہ اس نے اس نعمت کی ناشکری کی۔''

تشریح: قوله: ان الله تعالٰى يدخل۔۔۔ومنبله: ''منبله'': باء کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ یعنی تیر پکڑوانے والا۔ تیر دینے والا۔ چاہے وہ معطی کی ملکیت ہو یا رامی کی ملکیت ہو اور ''النہایہ'' میں ہے کہا جاتا ہے: ''نبلت الرجل'' جب آپ اس کو تیر دیں تاکہ وہ اس کے ساتھ کسی کو مارے اور اسی طرح ''أنبلته'' بھی ہے۔

ابوعمر وزاہد کا قول ہے کہ ''نبّلته''، ''انبلته'' اور نبلته' تینوں لغات ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ''مُنْبَّلُ'' سے مراد وہ شخص ہو جو ''ھدف'' سے تیر کو واپس اٹھا کر پھینکنے والے کو دیتا ہے اس کو ''ابن الملک'' نے اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس صورت میں ضمیر منصوب رامی کی طرف راجح ہے۔ اھ یہ محل نظر ہے۔

''قوله: رموا، واركبوا'':

یعنی صرف پیادہ یا رمی پر اکتفاء مت کرو' بلکہ رمی اور رکوب دونوں کرو۔ یا یہ معنی ہوگا کہ اس فضیلت کو جان لو اور ''رمی'' سیکھو اور رکوب سیکھو یعنی گھوڑے کو سدھارنا اور اس پر مشق کرنا۔ جیسا کہ حدیث کا آخر حصہ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اركبوا'' کا عطف مغایرت پر دلالت کر رہا ہے اور یہ کہ ''رامی'' پیدل یا سوار بھی ہوسکتا ہے اور سوار نیزہ مارنے والا بھی ہوسکتا ہے۔ **قوله: ''وان ترموا احب الى من ان تركبوا''**: مطلب یہ ہے کہ مجھے ''رمی باسھم'' ''طعن بالرمح'' سے زیادہ محبوب ہے۔ اھ۔

اس کا زیادہ واضح مطلب یہ ہے کہ تیراندازی کی مشق اور اس کا سیکھنا تادیب فرس اور اس پر تمرین رکوب سے زیادہ افضل ہے۔ اس لئے کہ اس میں تکبر اور بڑائی ہوتی ہے اور دوسرا اس لئے کہ رمی میں نفع عام ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس آیت میں مقدم کیا ہے: ﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ﴾ [الانفال۔ ٦٠] اگرچہ حدیث میں تعلّم رمح پر کوئی دلالت نہیں ہے اور ہماری ذکر کردہ بات کی تاکید سابقہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

قوله: ''كل شئ يلهو به الرجل......فانهن من الحق:

یعنی جس کے ساتھ وہ مشغول ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔

''الاّ رميه بقوسه'': یہ احتراز ہے رمی بالجبر اور رمی بالخشب سے۔

''وتأديبه فرسه'': یعنی اپنے گھوڑے کو جہاد کی نیت سے سدھانا یہ چیزیں لہو باطل میں سے نہیں ہیں کہ جس پر ثواب کامل کا ترتب ہی نہیں ہوتا۔ اس کے حکم میں ہر وہ چیز شامل ہے جو حق پر چلنے میں مدد کرے۔ یعنی اس کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا۔ جب وہ امور مباحہ میں سے ہو۔ جیسا کہ آدمیوں کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ یا گھوڑ دوڑ یا اونٹ دوڑ کا مقابلہ ہو اور اسی طرح بدن کو قوت پہنچانے کے ارادے سے پیدل چلنا اور دماغ کو تروتازہ رکھنا اور ''سماع'' بشرطیکہ آلات محرمہ کے ساتھ نہ ہو۔

قوله: وزاد ابو داود والدارمی ......:

ابوداؤد اور دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یہ زیادتی بھی نقل کی ہے: ''فانه نعمةٌ'' یہ دراصل ''جواب شرط مقدر'' کی علّت ہے۔
عبارت یوں ہوگی: ''فليس منا اوقد عصٰى فانه اى الرمى نعمة''

''أوقال'': یعنی ''ترك'' کی جگہ پر کچھ اور کہا ہے۔ یہ راوی کا شک ہے۔

''كفرها'' یعنی اس نعمت کو پوشیدہ رکھا۔ یا اس کے شکر کے بجائے ناشکری کی۔

اور جامع صغیر میں روایت یوں ہے: من ترك الرمى بعد ما علمه رغبةً عنه فانها نعمة كفرها''۔

یہ حدیث طبرانی نے عقبہ کے طریق سے نقل کی ہے۔

اللہ کے راستہ میں تیراندازی اور بڑھاپے کا بیان

۳۸۷۳: وَعَنْ اَبِىْ نَجِيْحِ السُّلَمِيِّ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ : مَنْ بَلَغَ بِسَهْمٍ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَلَهٗ دَرَجَةٌ فِى الْجَنَّةِ وَمَنْ رَمٰى بِسَهْمٍ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَلَهٗ عِدْلُ مُحَرَّرٍ، وَمَنْ شَابَ شَيْبَةً فِى الْاِسْلَامِ كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رَوَاهُ الْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبُ الْاِيْمَانِ وَرَوٰى اَبُوْدَاوُدَ الْفَصْلَ الْاَوَّلَ وَالنِّسَائِىُّ الْاَوَّلَ وَالثَّانِى وَالتِّرْمِذِىُّ الثَّانِىَ وَالثَّالِثَ وَفِىْ رِوَايَتِهِمَا) **مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (بَدَلَ) فِى الْاِسْلَامِ۔**

اخرجه أبو داود فى السنن ٤ / ٢٧٤، كتاب العتق، باب اى الرقاب افضل، الحديث رقم ٣٩٦٥، والترمذى فى ٤ / ١٤٩، الحديث رقم ١٦٣٨، والنسائى فى ٦ / ٢٦، الحديث رقم ٣١٤٣، وأحمد فى المسند ٤ / ٣٨٦، والبيهقى فى شعب الإيمان ٤ / ٦٨، الحديث رقم ٤٣٤١۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابونجیح اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں ایک تیر (نشانے پر) پہنچایا (یعنی اس نے تیر چلا کر کافر کو مار ڈالا تو) اس کے لئے جنت میں ایک بڑا درجہ ہے اور جس شخص نے اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) تیر پھینکا (خواہ وہ کافر کو لگا ہو یا نہ لگا ہو) تو وہ اس کے لئے ایک بردہ (غلام یا لونڈی) آزاد کرنے کے برابر ہے اور جو شخص اسلام (کی حالت) میں بوڑھا ہو گیا (اور مر گیا) تو وہ قیامت کے دن اس کے لئے نور ہوگا۔ (اس روایت کو بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے) ابوداؤد

نے (روایت کا صرف) پہلا جزو (یعنی: مَنْ بَلَغَ بِسَهْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَلَهٗ دَرَجَةٌ فِي الْجَنَّةِ نقل کیا ہے) نسائی نے پہلا اور دوسرا جزو (کہ جن میں تیراندازی کی فضیلت بیان کی گئی ہے) نقل کیا ہے اور ترمذی نے دوسرا اور تیسرا جز نقل کیا ہے۔ نیز بیہقی اور ترمذی کی روایت میں "فی الاسلام" (یعنی اسلام کی حالت میں) کی بجائے "فی سبیل اللہ" (یعنی "اللہ کی راہ میں") ہے۔

تشریح: قوله: من بلغ......

بلغ: تخفیف کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ ہے

"فهوله عدل محرر:

محرر": عین کے کسرہ کے ساتھ۔

یعنی اس کو غلام آزاد کرنے والے کی طرح ثواب و اجر ملے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہوگا کہ جو شخص غزوہ یعنی میدان جنگ میں تیر ساتھ لئے پہنچا اور ایک تیر بھی نہیں پھینکا۔ تو اس کو ثواب ملے گا۔

"بلغ" اس کو "تخفیف" کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں "باء" تعدیہ کے لئے ہے، اور "تشدید" کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں "ملابست" کے لئے ہوگا۔

قوله: "ومن شاب شيبةً في الاسلام" "كانت له نورًا يوم القيامة":

یہ عام ہے چاہے جہاد میں ہو یا غیر جہاد ہو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سفید بال نوچنا ممنوع ہے مکروہ نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کے بال زیادہ سفید نہیں تھے چونکہ آپ ﷺ کو عورتیں بہت زیادہ محبوب تھیں اور عورتیں بالطبع بوڑھاپے کو ناپسند کرتی ہیں۔ حکایت: ایک دفع ابو یزید نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ تو فرمایا: "**ظهر الشيب ولمّ يذهب العيب وما ادرىٰ مافي الغيب**" بڑھاپا ظاہر ہوگیا عیب نہیں ختم ہوا اور میں نہیں جانتا کہ عیب میں کیا ہے۔

قوله: "وفي روايتهما"۔

ضمیر کا مرجع نسائی اور ترمذی کو قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ وہ قریب محل میں مذکور ہیں۔ اس لئے کہ نسائیؒ نے تیسری بات کو ذکر نہیں کیا۔ پس مراد بیہقیؒ اور ترمذی کی روایت ہوگی۔

"**ومن شاب شيبة في سبيل الله**": اس پر اشکال ہے کہ بیہقی کی روایت میں "**في الاسلام**" ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بیہقی اور ترمذی کی روایت میں (یعنی دونوں میں سے کسی ایک کی روایت میں) یا یہ کہ دونوں کی روایت میں "**في الاسلام**" کی جگہ پر "**في سبيل الله**" کا لفظ آیا ہے۔ "**في الاسلام**" کی جگہ پر۔ یا **رواه البيهقي** کا مطلب یہ ہے کہ بیہقی نے اس روایت کو مکمل ذکر کیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ الفاظ کیا ہیں اور "**وفي روايتهما**" ان کے الفاظ کی تحقیق ہے اور گویا کہ صاحب المصابیح پر اعتراض ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوسری روایت "**من شاب شيبةً في سبيل الله**" اس مقام کے زیادہ مناسب ہے

اور مطلب یہ ہوگا کہ جس شخص نے مجاہدہ میں خوب ممارست حاصل کی یہاں تک کہ اس کے بالوں کی طاقت ختم ہوگئی تو اس کیلئے بے انتہا اور نا قابل بیان اجر وثواب ہے۔ چنانچہ نور کو خصوصی طور پر ذکر فرمانا اس کو نکرہ لانا اس پر دلالت کر رہا ہے اور جس راوی نے ''في سبيل الله'' کی جگہ پر ''في الاسلام'' کے الفاظ نقل کئے ہیں اس نے عام سے خاص کا ارادہ کیا ہے۔ یا جہاد ہی کو اسلام کا نام دے دیا اس لئے کہ جہاد اسلام کا ستون اور اس کے کوہان کی چوٹی ہے۔ اھ۔ یہ مفاہیم صحیح مانے جاسکتے ہیں بشرطیکہ آنحضرتؐ نے ایک ہی سلسلہ کلام میں یہ تینوں امورا کھٹے ذکر فرمائے ہوں۔

وگرنہ بظاہر یہ جملے کلام منفصل لگتے ہیں کہ جس کو راوی نے اپنی روایت میں ''اجمالی'' طور پر بیان کیا ہے۔ چنانچہ ''جامع صغیر'' میں ان تینوں امور کو متفرق طور پر ذکر فرمانا اس پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''من رمى بسهم في سبيل الله فهوله عدل محرر'' اس کو ترمذی، نسائی اور حاکم نے ابونجیح سے روایت کیا ہے۔

''من شاب شيبة في الاسلام كانت له نورا يوم القيامة'' اس کو ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کعب بن مرۃ سے روایت کیا ہے۔ [الجامع الصغیر ۲/۵۳۰ الحدیث رقم ۸۷۶۳]

مسابقت کا بیان

۳۸۷۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا سَبَقَ اِلَّا فِیْ نَصْلٍ اَوْخُفٍّ اَوْحَافِرٍ۔ (رواه الترمذی وابو داود والنسائی)

اخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ٦٣ كتاب الجهاد، باب ما جاء فى الرهان، ٣ / ٦٣، الحديث رقم ٢٥٧٤، والترمذى فى ٤ / ١٧٨، الحديث رقم ١٧٠٠، والنسائى فى ٦ / ٢٢٦، الحديث رقم ٣٥٨٥، وابن ماجه ٢ / ٩٦٠، الحديث رقم ٢٨٧٨، وأحمد فى المسند ٢ / ٤٧٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مسابقت کا انعام صرف تین چیزوں (یعنی) تیر چلانے، اونٹ دوڑانے اور گھوڑ دوڑ میں جائز ہے''۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: قوله: لاسبق الا في نصل ......:

''سبق'': سین اور باء دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں ''باء'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ ''النہایہ'' میں ہے کہ ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ وہ مال جو سابقہ گھوڑ دوڑ مقابلے پر بطور رہن کے مقرر کیا جاتا ہے اور سکون کے ساتھ ہو تو مصدر ہے۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روایت فصیحہ باء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور معنی ہوگا ''مقابلے پر مال لینا''۔

اور طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں تینوں جگہ مضاف مقدر ہے۔ ای ذی نصل وذی خف وذی حافر''۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ذو نصل'' سے مراد تیر اندازی ہے اور ''ذو خف'' سے مراد اونٹ اور ہاتھی وغیرہ ہے اور ذو حافر سے مراد گھوڑا، گدھا اور خچر وغیرہ ہے اور پورے جملے کا مطلب یوں ہوگا کہ کسی مقابلے پر مال لینا جائز نہیں ہے مگر ان پر لینا جائز ہے اور بعض نے دوڑ کے مقابلہ اور پتھر پھینکنے کو بھی اسی میں شامل کیا ہے۔ سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ پتھر پھینکنے کے

مقابلے پر مال لینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے
''شرح السنة'' میں لکھا ہے کہ خیل کے حکم میں گدھا اور خچر بھی داخل ہے، اور ابل کے حکم میں ہاتھی بھی داخل ہے۔ اس لئے کہ ہاتھی ''قتال'' میں اونٹ سے زیادہ کام آتے ہیں اور بعض نے ان کے ساتھ ساتھ ''دوڑ'' اور جانور پر سوار ہو کر مقابلہ بھی اسی حکم میں شامل کیا ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ''مناضلہ'' پر اس شخص کے لئے جو تیر کو نشانے پر لگائے مال لینا مباح ہے۔ اونٹ اور گھوڑ دوڑ مقابلے میں جیتنے والے کیلئے بھی جائز ہے۔ اور یہ بات ''اہل علم'' کی ایک بڑی جماعت نے کہی ہے۔ اس لئے کہ یہ دشمن کے ساتھ قتال کی تیاری ہے، اور اس پر انعام مقرر کرنا جہاد کی ترغیب میں شامل ہے۔
سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: گھوڑ دوڑ پر مقابلہ پر مال لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے بشرطیکہ اس میں کوئی ''محلّل'' داخل ہو اور پرندوں کا مقابلہ، کبوتر وغیرہ، اور طرح کے دوسرے کام جو جہاد کی تیاری میں کام نہیں آتے اور نہ ہی اس سے جہاد پر کوئی قوت وطاقت حاصل ہوتی ہے تو اس پر مال لینا ''قمار'' محض ہوگا۔ جو کہ ''منهی عنه'' ہے۔
تخریج: ''جامع صغیر'' کے الفاظ یوں ہے: ''لا سبق الا فی خف او حافر او نصل'' اس کو امام احمدؒ نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

دو گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا شامل کرنا

۳۸۷۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ اَدْخَلَ فَرَسًا بَيْنَ فَرَسَيْنِ فَاِنْ كَانَ يَاْمَنُ اَنْ يُسْبَقَ فَلَا خَيْرَ فِيْهِ' فَاِنْ كَانَ لَا يَاْمَنُ اَنْ يُّسْبَقَ فَلَا بَاْسَ بِهٖ (رواه فی شرح السنة وفی روایة ابی داود) قَالَ: مَنْ اَدْخَلَ فَرَسًا بَيْنَ فَرَسَيْنِ يَعْنِی وَهُوَ لَا يَاْمَنُ اَنْ يُّسْبَقَ فَلَيْسَ بِقِمَارٍ وَ مَنْ اَدْخَلَ فَرَسًا بَيْنَ فَرَسَيْنِ وَقَدْ اٰمَنَ اَنْ يُّسْبَقَ فَهُوَ قِمَارٌ۔

اخرجه البغوی فی شرح السنة ١٠ / ٣٩٦' الحديث رقم ٢٦٥٤' وأبو داود فی السنن ٣ / ٦٦ كتاب الجهاد' باب فی المحلل' الحديث رقم ٢٥٧٩' وابن ماجه فی ٢ / ٩٦٠' الحديث رقم ٢٨٧٦' وأحمد فی المسند ٢ / ٥٠٥

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جس نے (مسابقت کے لئے) دو گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا شامل کیا تو اگر اس کو یقین ہے کہ وہ (یعنی اس کا گھوڑا) سبقت لے جائے گا تو اس میں بھلائی نہیں ہے اور اگر یہ یقین نہیں ہے کہ وہ آگے نکل جائے گا تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں''۔ (شرح السنة) اور ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دو گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا شامل کر دیا (یعنی جس کے بارے میں اس کو یہ یقین نہیں کہ اگر وہ آگے نکل جائے گا تو یہ قمار (جوا) نہیں ہے اور اگر جس شخص نے دو گھوڑوں کے درمیان اپنا (ایسا) گھوڑا شامل کر دیا جس کے بارے میں یہ یقین ہے کہ وہ آگے نکل جائے گا تو یہ قمار (جوا) ہے''۔

تشریح: قوله: ''من ادخل فرسًا۔۔۔فلابأس به:''

"بين فرسين" اور ایک نسخہ میں "بين الفرسين" ہے۔

علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں "محلل" کی طرف اشارہ ہے اور محلل وہ ہے جو عقد کو حلال کر دے اور ان دونوں کا ثالث بن جائے۔ (یعنی محلل ثالث کو مقرر کر دے)۔

"كان يؤمن": یہ مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اور اسی طرح "ان يسبق" بھی مجہول ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ بات پہلے سے معروف و معلوم ہو کہ یہ گھوڑا سابق ہوگا مسبوق نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس صورت کے کہ جس میں یہ بات معلوم نہ ہو کہ کون سا گھوڑا جیتے گا؟

اور ابوداؤد کی روایت میں اس طرح ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ روایۃ بالمعنی ہے۔

"فليس بقمار" یہ لفظ قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

قوله: ومن أدخل فرسًا بين فرسين...... وقد أمن ان يسبق فهو قمار":

"مصابیح" کے دوسرے نسخوں میں "ان يسبق" چاروں مقامات پر صیغہ معلوم کے ساتھ منقول ہیں۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات جان لو کہ (محلل کو شریک کرنے کے جواز کی شرط یہ ہے کہ) محلل بھی فریقین کے گھوڑوں کی طرح کے گھوڑے پر سوار ہو۔ یا فریقین کے گھوڑوں کے قریب قریب ہو۔ پس اگر محلل کا گھوڑا تیز رفتار اور عمدہ ہو اور وہ جانتا ہو کہ فریقین کے گھوڑے اس سے سبقت نہیں لے جا سکتے تو یہ جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا وجود عدم وجود کی طرح ہوگا اور اگر وہ یہ نہ جانتا ہو کہ یقینی طور پر اس کا گھوڑا ان دونوں سے آگے نکلے گا یا یہ کہ اس کا گھوڑا مسبوق ہوگا۔ تو پھر جائز ہے (خلاصہ یہ کہ محلل کا گھوڑا قوت میں اور دوڑنے میں فریقین کے گھوڑوں جتنا قوی ہو، نہ اتنا مریل ہو کہ اس کا ہارنا یقینی ہو اور نہ اتنا تیز رفتار ہو کہ اس کا جیت جانا یقینی ہو۔ از مرتب)

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ: اس مقابلے میں اگر مال امام کی جانب سے ہو یا لوگوں میں سے کسی ایک جانب سے ہو اور اس میں یہ شرط ہو کہ یہ گھوڑ سواروں میں سے "مسابق" ہی کو ملے گا اور مال معلوم ہو تو یہ جائز ہے اور جو سبقت لے جائے گا وہ اس مال کا مستحق ٹھہرے گا اور اگر یہ مال گھوڑ سواروں کی جانب سے ہو اس طور پر کہ ایک دوسرے سے یہ کہدے کہ اگر تیرا گھوڑا میرے گھوڑے سے سبقت لے گیا تو تیرے لئے میرے ذمہ اتنی رقم لازم ہوگی اور اگر میں تم سے سبقت لے گیا تو میرے لئے تیرے ذمہ کچھ بھی لازم نہیں ہوگا تو یہ بھی جائز ہے اور جو سبقت لے گیا وہ مشروط کا مستحق اور حقدار ہوگا۔

اور اگر مال ان میں سے ہر ایک جانب سے ہو اس طور پر کہ اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اگر میں تم سے سبقت لے گیا تو میرے لئے تیرے ذمہ اتنا مال لازم ہوگا اور اگر تو مجھ سے سبقت لے گیا تو تیرے لئے میرے ذمہ اتنا مال لازم ہوگا تو یہ شرط جائز نہیں ہے۔ اگر محلل سبقت لے گیا تو وہ دونوں جانب کا مال لے لے گا اور اگر وہ مسبوق ٹھہرا تو اس پر کوئی چیز لازم نہیں ہوگی اور اس کو محلل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ سابق کیلئے مال لینے کو جائز اور حلال کر دیتا ہے۔ پس محلل ہی کی وجہ سے یہ عقد قمار (جوا) سے نکل گیا۔ اس لئے کہ قمار کی صورت میں آدمی نفع و نقصان میں متردد ہوتا ہے۔ پس جب وہ اس میں داخل ہو گیا۔ تو اس سے یہ معنی نکل گیا۔

اگر محلل اول آیا اور پھر دونوں ایک ساتھ آئے یا ایک دوسرے کے بعد آئے تو وہ انعام محلل کو ملے گا اور اگر وہ دونوں ایک ساتھ آئے اور محلل ان دونوں کے بعد آیا تو کسی کیلئے کوئی چیز لازم نہیں ہوگی اور اگر ان میں سے کوئی ایک پہلے آیا۔ پھر محلل اور پھر دوسرا آیا چاہے ایک ساتھ یا ایک دوسرے کے بعد تو سابق اپنے انعام کو محفوظ کر لے گا اور دوسرے کا حصہ بھی وہی لے لے گا اور اگر محلل اور ان دونوں میں سے کوئی ایک، ایک ساتھ پھر دوسرا دوسرے نمبر پر آ گیا تو دونوں ''سابقان'' اپنے اپنے مسبق کو لے لیں گے۔

جلب اور جنب کا بیان

۳۸۷۶: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : لَا جَلَبَ، وَلَا جَنَبَ (زَادَ يَحْيٰى فِي حَدِيْثِهٖ) فِي الرِّهَانِ (رواه ابوداود والنسائی ورواه الترمذی مَعَ زِيَادَةٍ فِي بَابِ الْغَصَبِ۔)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ٦٧ كتاب الجهاد، باب فی الحلب علی الخيل، الحديث رقم ۲۵۸۱، والترمذی فی ۳ / ۳٤۰، الحديث رقم ۱۱۲۳، والنسائی فی ٦ / ۲۲۸، الحديث رقم ۳۵۹۱، وأحمد فی المسند ٤ / ٤۳۹

ترجمہ: ''اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''نہ جلب (جائز) ہے اور نہ جنب اور (ایک راوی) یحییٰ نے اپنی روایت میں لفظ ''فی الرھان'' کا اضافہ کیا ہے (یعنی ان کی روایت میں یہ ہے کہ رہان یعنی گھوڑوں کی شرط و مسابقت میں نہ جلب جائز ہے اور نہ جنب) اس روایت کو ابوداؤد و نسائی نے نقل کیا ہے۔ نیز ترمذی نے بھی اس روایت کو کچھ زیادت (الفاظ و معانی) کے ساتھ ''باب الغصب'' میں نقل کیا''۔

تشریح: قوله: لاجلب ولا جنب ......:

جلب: جیم اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ گھوڑے پر چیخنا پکارنا اور معنی اس کا یہ ہے کہ گھوڑے پر اس مقصد کیلئے آواز نہ دی جائے کہ وہ زیادہ تیز رفتار ہو جائے۔

جنب: جیم و نون کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ جب سوار کو اپنے مسبوق ہونے کا خطرہ ہو تو وہ اپنی سواری کے پہلو میں ایک دوسرا گھوڑا ملا لے (ابن الملک)

اور ''النہایہ'' میں ہے۔ جلب زکاۃ میں بھی ہوتا ہے جس کا مطلب ماقبل گذر چکا ہے اور دوڑ میں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ سوار اپنے گھوڑے کے پیچھے ایک اور آدمی کو لگا لیتا ہے۔ اور جنب ''سباق'' میں یہ ہے کہ آدمی مسبوق گھوڑے کے پہلو میں دوسرا گھوڑا ملا لیتا ہے، جب اس کی سواری تھک جاتی ہے تو وہ ساتھ ملے ہوئے گھوڑے پر چلا جاتا ہے۔

''فی الرھان'' علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ ''فی الرھان'' کے الفاظ حضرت قتادۃ رضی اللہ عنہ کا ادراج ہیں۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس حدیث کو دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ایک سند میں جس میں نہ یحییٰ بن

خلف ہے اور نہ ہی یہ زیادتی ہے۔ اور دوسری سند میں یحییٰ بن خلف بھی ہے اور یہ زیادتی بھی ہے اور جو مصابیح میں مذکور حدیث میں ''فی الرهان'' کا اضافہ یہ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ممکن ہے یہ تفسیر اس حدیث کا جس میں یہ زیادتی نہیں ہے اور ایک شارح رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ یہ کسی راوی کا کلام ہے۔ ''رهان'' اور'' ومراهنة'' گھوڑوں پر مقابلے کو کہتے ہیں۔ اس کو صاحب قاموس نے ذکر کیا ہے۔

ترمذی نے اس حدیث میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے: ''ولا شغار فی الاسلام "ومن انتهب نهبة فليس منّا'' اور شغار یہ ہے کہ کسی کے ساتھ اپنی بہن یا بیٹی کا اس شرط پر نکاح کرنا کہ وہ بھی اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح بغیر مہر کے اس سے کردے۔ جامع صغیر کی روایت اس طرح ہے: ''لا جلب ولا جنب ولا شغار فی الاسلام'' اس کو نسائی اور ضیاء نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

بہترین گھوڑا

۳۸۷۷: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ عِنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ خَيْرُ الْخَيْلِ الْاَدْهَمُ الْاَقْرَحُ الْاَرْثَمُ، ثُمَّ الْاَقْرَحُ الْمُحَجَّلُ طُلُقُ الْيَمِيْنِ، فَاِنْ لَمْ يَكُنْ اَدْهَمَ، فَكُمَيْتٌ عَلٰى هٰذِهِ الشِّيَةِ . (رواه الترمذى والدارمى)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤ / ١٧٦ كتاب الجهاد، باب ما يستحب من الخيل، الحديث رقم ١٦٩٦، وابن ماجه فى ٢ / ٩٣٣، الحديث رقم ٢٧٨٩، والدارمى ٢ / ٢٧٨، الحديث رقم ٢٤٢٨، وأحمد فى المسند ٥ / ٣٠٠

ترجمه: ''اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بہترین گھوڑا وہ ہے جو انتہائی سیاہ ہو جس کی پیشانی پر تھوڑی سی سفیدی ہو اور ناک کی جانب سفیدی ہو پھر وہ گھوڑا بہتر ہے جس کی پیشانی پر تھوڑی سی سفیدی ہو اور ہاتھ پاؤں (یعنی تین پاؤں) سفید ہوں لیکن دائیں ٹانگ سفید نہ ہو (یعنی گھوڑے کے رنگ کی ہو) اور اگر سیاہ گھوڑا نہ ہو تو پھر اسی قسم کا کمیت بھی بہتر گھوڑا ہے''۔ (ترمذی، دارمی)

تشریح: قوله: خير الخيل لادهم الاقرح الارثم :الأدهم: بہترین گھوڑا وہ ہے جو رنگت میں سخت سیاہ ہو، اس کے چہرہ پر تھوڑی سی سفیدی ہو اگر چہ ایک درہم کی مقدار کے برابر ہو اور اس کا اوپر والا ہونٹ سفید ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی ناک کا کنارہ سفید ہو۔

قوله: ثم الاقرح المعجل طلق اليمين:

''المحجل'': تحجیل گھوڑے کی ٹانگوں میں سفید سفید داغوں کو کہتے ہیں۔ یا تین پاؤں میں سفیدی ہو۔ یا اس کی ٹانگوں میں سفیدی ہو۔ کم ہو یا زیادہ۔ لیکن ٹخنوں سے کم نہ ہو اور گھٹنوں سے متجاوز نہ ہو۔

''طلق اليمين'': طاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ وہ گھوڑا جس کی ٹانگوں میں سفیدی نہ ہو۔

قوله: فكميت على هذه الشبة:

''فكميت'' یہ تصغیر کا صیغہ ہے۔ وہ گھوڑا جس کے کان کالے ہوں اور باقی سرخ ہو۔

اور علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''کمیت'' مذکر و مؤنث دونوں کیلئے مستعمل ہے اور وہ اس سرخی کو کہتے ہیں۔جس میں گرد و غبار جذب ہوتا ہے۔خلیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو مصغر اس لئے لائے کہ سیاہ اور سرخ کے درمیان ہوتا ہے۔اس میں کوئی ایک رنگ خالص نہیں ہوتا پس تصغیر سے یہ ارادہ کیا ہے کہ یہ ان دونوں کے قریب تر ہیں۔

الشية: شین کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔علامت ونشانی کو کہتے ہیں اور اصل میں ہر اس رنگ کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے اکثر رنگ کے مخالف ہو اور یہ ''ھاء'' اس واؤ کے عوض میں ہے جو ابتداء سے حذف ہے اور ہمزہ کے ساتھ پڑھنا غلطی ہے اور یہ اشارہ ہے ''اقرح ارثم'' کی طرف پھر محجل کی طرف ہے۔

تخریج وتوضیح: اور جامع صغیر میں یہ روایت اس طرح ہے:

''خير الخيل الأدهم الأقرح الأرثم المحجل ثلاث طلق اليمين''۔[الجامع الصغیر۲/۲۴۴الحدیث رقم ۴۰۰۴]

اس روایت کو امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا ہے۔

سفید پیشانی والے گھوڑے کی اہمیت کا بیان

۳۸۷۸:وَعَنْ اَبِیْ وَهَبِ الْجُشَمِیِّ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :عَلَيْكُمْ بِكُلِّ كُمَيْتٍ اَغَرَّ مُحَجَّلٍ اَوْاَشْقَرَ اَغَرَّ مُحَجَّلٍ اَوْاَدْهَمَ اَغَرَّ مُحَجَّلٍ ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

اخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ٤٧ كتاب الجهاد' باب ما يستحب من الوان الخيل' الحديث رقم ٢٥٤٣' والنسائى فى ٦ / ٢١٨' الحديث رقم ٣٥٦٥' وأحمد فى المسند ٤ / ٣٤٥

ترجمہ:''اور حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے لئے ایسے گھوڑے لازم ہیں جو سرخ سیاہی مائل اور سیاہ کانوں والے ہوں اور ان کی پیشانی اور پاؤں سفید ہوں یا وہ گھوڑا جو سرخ رنگ کا ہو اس کی پیشانی اور پاؤں سفید ہوں یا وہ گھوڑا سیاہ رنگ کا ہو اور اس کی پیشانی اور پاؤں سفید ہوں''۔ (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله:عليكم بكل كميت ....:

''عليكم'':اسم فعل بمعنی ''الزموا'' ہے۔

كميت أغر :یعنی جس کے چہرہ میں سفیدی ہو۔

اشقر: شقرة اصل میں خالص سرخی کو کہتے ہیں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''الفرق بين الكميت والأشقر بقترة تعلوا الحمرة وبسواد العرف والذنب فى الكميت''۔

''أغر محجل او ادهم اغر محجل'':یہاں ''او'' دونوں جگہوں ''تنویع'' کے لئے ہے۔بظاہر ''ترتیب'' بھی مراد ہے۔

گھوڑوں کی برکت

۳۸۷۹ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يُمْنُ الْخَيْلِ فِى الشُّقْرِ۔

(رواه الترمذى وابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ٤٨ كتاب الجهاد' باب ما يستحب من الخيل' الحديث رقم ۲٥٤٥' والترمذى فى ٤ / ۱۷٦' الحديث رقم ۱٦۹٥' وأحمد فى المسند ۱ / ۳۷۲

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''گھوڑوں برکت سرخ رنگ کے گھوڑوں میں ہوتی ہے''۔ (ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: شقر :''اشقر'' کی جمع ہے۔''مشقر'' میں شین پر ضمہ ہے۔سرخ رنگ کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔

فائدہ : جامع صغیر کی روایت میں ''فی شقرھا'' ہے۔

گھوڑے کے بالوں کی تراش خراش کا بیان

۳۸۸۰:وَعَنْ عُتْبَةَ بْنِ عَبْدِ السُّلَمِيّ' اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: لَا تَقُصُّوْا نَوَاصِيَ الْخَيْلِ' وَلَا مَعَارِفَهَا' وَلَا اَذْنَابَهَا. فَاِنَّ اَذْنَا بَهَا مَذَابُّهَا' وَمَعَارِفَهَا دِفَاءُ هَا' وَنَوَاصِيْهَا مَعْقُوْدٌ فِيْهَا الْخَيْرُ ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ٤۷'كتاب الجهاد' باب فى كراهية جز نواصى' الحديث رقم ۲٥٤۲' وأحمد فى المسند ٤ / ۱۸٤

ترجمہ: ''اور حضرت عتبہ بن عبد سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''گھوڑوں کی پیشانی کے بال' ان کی ایال (گردن کے بال) اور ان کی دموں کو نہ کاٹو کیونکہ ان کی دمیں ان کے مورچھل ہیں (کہ جن کو وہ ہلا ہلا کر مکھیوں اور کیڑوں کو اڑاتے ہیں) اور ان کی ایالیں انہیں گرم رکھتی ہیں اور ان کی پیشانی کے بالوں میں بھلائی بندھی ہوئی ہے''۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله: لاتقصوا نواصی الخیل ......:

لا تقصوا'': قصّ سے ماخوذ ہے۔قصّ کاٹنے کو کہتے ہیں۔''**نواصی الخیل**'' مقدم الرأس کے بال مراد ہیں۔

''**معارفها**'': قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''عرف'' کی جمع علیٰ خلاف القیاس ہے۔گردن کے بالوں کو کہتے ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ ''معرفۃ'' کی جمع ہے۔''معرفہ'' عرف کے اگنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔''**اعراف**'' پر اس کا اطلاق کرنا مجازا ہے۔

''**معارفها**'' یہ منصوب ہے۔اس کا عطف آذنابها پر ہے اور مبتداء ہونے کی بناء پر مرفوع بھی منقول ہے۔

''دفاؤها'': یہ ''دال'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ مراد وہ چادر ہے جس سے وہ گرمی حاصل کرتا ہے۔
نواصیها: اس کو بھی دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

گھوڑوں کو کیسے رکھا جائے

۳۸۸۱ :وَعَنْ اَبِیْ وَهْبٍ الْجُشَمِيِّ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِرْتَبِطُوْا الْخَيْلَ وَامْسَحُوْا بِنَوَاصِيْهَا وَاَعْجَازِهَا' اَوْ قَالَ :اَكْفَالِهَا وَ قَلِّدُوْهَا وَ لَاتُقَلِّدُوْهَا الْاَوْتَارَ ـ

(رواه ابوداود والنسائی)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۵۳ كتاب الجهاد' باب فی اكرام الخيل' الحديث رقم ۲۵۵۳' والنسائی فی ۶ / ۲۱۸' الحديث رقم ۳۵۶۵' وأحمد فی المسند ٤ / ١٤٥

ترجمہ: ''اور حضرت وہب جشمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''گھوڑوں کو باندھ رکھو' (یعنی انہیں پالنے کی غرض سے رکھو) ان کی پیشانیوں اور ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا کرو یا (**اعجازها** کی جگہ) **اکفالها** فرمایا (اور دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی پیٹھ) ان کی گردن میں قلادہ (پٹا) ڈالو لیکن ان کی گردن میں (کمان کی) تانت نہ ڈالو''۔ (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله: **ارتبطوا الخيل**...... أوقال: اکفالها: ''**ارتبطوا الخيل**'': یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے [**ومن رباط الخيل**] باب افتعال سے ذکر کرنا مبالغہ کے لئے ہے۔

''**وامسحوا بنو اصيها**'' اس پر رحم کرنے اور اس کو صاف کرنے کیلئے۔

''**وأعجازها**۔ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ عجز کی جمع ہے۔ چوپائے کی سرین کا پچھلا حصہ۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مسح سے مراد ''**تنظيف عن الغبار**'' ہے۔ قوله: **قلدوها ولا تقلدوها الاوتار**: ''**وقلدوها**'' اس کی گردن میں ''قلائد'' کو لازم کرو۔ جیسا کہ گردنوں میں ہار ہوتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ گھوڑے کی گردن میں جو کچھ تم چاہو ڈال لیا کرو۔

''**ولا تقلدوها الأوتار**'': ''اوتار'' یہ ''وتر'' کی جمع ہے۔ اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① اس کی گردن میں کمانوں کے تانت (دھاگہ) مت ڈالو۔ کیونکہ اس سے اس کا گلا گھٹ جائے گا۔ اس لئے بسا اوقات گھوڑا درختوں کو کھاتا ہے۔ یا اپنی گردن کو اس کے ساتھ ملتا ہے۔ کہیں تانت آپس میں الجھ جائے گا جس سے اس کا گلا دب جائے گا۔

② بعض نے کہا ہے کہ ''اوتار'' سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ گھوڑے کے گلے (گردن) میں کمان کی تانت ڈالنے سے نظر اور مصیبت دفع ہو جاتی ہے۔ گویا یہ اس کے لئے بمنزلہ تعویذ ہے۔ پس اس سے ان کو منع کر دیا گیا اور ان کو بتلا دیا کہ یہ نہ کوئی مصیبت رفع کر سکتی ہے اور نہ خوف وڈر کو دور کر سکتا ہے۔

۵ ''النہایہ'' میں اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ اس کی گردن میں دین کی سربلندی اور مسلمانوں کی دفاع کیلئے رسی ڈالو اور جاہلیت کے وہ اوتار مت ڈالو جو تمہارے درمیان تھے۔ مراد خون اور بدلہ ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان گھوڑوں پر تم اپنے خون کا بدلہ چکانے کیلئے مت سوار ہو۔

گھوڑی پر گدھا چھوڑنے کا بیان

۳۸۸۲:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدًا مَامُوْرًا مَا اخْتَصَّنَا دُوْنَ النَّاسِ بِشَيْءٍ اِلَّا بِثَلَاثٍ اَمَرَنَا اَنْ نُسْبِغَ الْوُضُوْءَ وَاَنْ لَانَأْكُلَ الصَّدَقَةَ وَاَنْ لَّا تُنْزِيَ حِمَارًا عَلٰى فَرَسٍ - (رواه البخاري والنسائي)

اخرجه أبو داود في السنن ١ / ٥٠٧ كتاب الجهاد' باب ما جاء في كراهية ان تنزى الحمر' الحديث رقم ٨٠٨' والترمذي في السنن ٤ / ١٧٨' الحديث رقم ١٧٠١' والنسائي في ٦ / ٢٢٤' الحديث رقم ٣٥٨١' وأحمد في المسند ١ / ٢٢٥

ترجمه: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مامور بندے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو (یعنی اپنے اہل بیت کو) دوسرے لوگوں سے الگ کر کے تین باتوں کے علاوہ اور کسی بات کا مخصوص طور پر حکم نہیں دیا اور وہ (تین باتیں جن کا خاص طور پر اہل بیت کو حکم دیا) یہ ہیں کہ ① ہم وضو کو پورا کریں ② ہم صدقہ کا مال نہ کھائیں ③ ہم گھوڑیوں پر گدھے نہ چھوڑے''۔ (ترمذی ونسائی)

تشریح: **قوله:'' كان رسول اللّٰه عبدًا مأمورًا''**

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ اوامر دیئے گئے اور کچھ نواہی دیئے گئے۔ یا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں کہ وہ اپنی امت کو جس چیز کا چاہیں حکم دیں اور ان کو جس چیز سے چاہیں روک دیں۔

اور قاضی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ معنی کیا ہے کہ آپ کی اطاعت کی جائے، کسی بھی حکم میں آپ پر ترجیح نہیں ہوگی اور نہ کوئی حاکم اپنی چاہت کے مطابق فیصلہ کر کے کہ جس کیلئے چاہے حکم کر دے۔

اصح یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ رسالت پر مامور تھے اور دلیل اس آیت کا عموم ہے: **[یاایها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك]**۔

قوله:''أمرنا ان نسبغ الوضوء'':

نسبغ: نون کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یعنی ہم اعضاء وضوء کو مکمل طور پر دھوئیں

مغرب میں لکھا ہے کہ ہمارے لئے اسباغ الوضوء وجوبی ہے جب کہ عام لوگوں کیلئے ''اسباغ الوضوء'' مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔

قوله:''وان لا ننزی حمارًا علی فرسٍ'':

"تنزی": آخر میں یاء ہے اور بعض نسخوں میں ہمزہ کے ساتھ ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ گدھے کو گھوڑے پر چڑھانا۔ یعنی ان سے وطی کرانا اور شاید یہ نہی ان کی نسبت سے تحریم کیلئے ہے۔ قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "أمرنا" بظاہر "خصال" کی تفصیل ہے اور چاہیے یہ کہ یہ امر ایجابی ہو ورنہ تو اس میں اختصاص نہ ہوگا۔ اس لئے کہ "اسباغ الوضوء" عام لوگوں کیلئے مندوب و مستحب ہے اور "انزاء الحمار علی الفرس" آنے والی حدیث کی وجہ سے مطلقاً مکروہ ہے اور سبب کراہت "قطع نسل" ہے اور یہاں پر ادنیٰ کا خیر کے ساتھ استبدال ہے اور یہ مکروہ ہے اور اس لئے کہ "خچر" لڑائی اور بھاگنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی وجہ سے "غنیمت" میں اس کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ معلق کیا ہے کہ وہ صدقہ نہیں کھائیں گے۔ حالانکہ وہ واجب ہے۔ پس اس کا قرین بھی اس طرح ہونا چاہیے۔ (یعنی استبدال الأدنٰی بالخیر) وگرنہ تو ایک لفظ کا استعمال دو معانی مختلفہ میں لازم ہوگا۔ الاّ یہ کہ "صدقہ" کی تفسیر تطوّع کے ساتھ ہو۔ یا یہ کہ یہاں پر امر "ایجاب وندب" میں مشترک ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں ہیں مگر ان چیزوں میں حث اور مبالغہ کے ساتھ۔

اور اس حدیث میں اہل تشیع کے اس خیال پر بلیغ رد ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کو علوم مخصوصہ کے ساتھ خاص کیا ہے اور اس کی نظیر وہ حدیث ہے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جب آپؓ سے پوچھا گیا: "**هل عندكم شئ ليس فى القرآن**" تو آپؓ نے یہ جواب دیا:

"**والّذى خلق الجنة وبرأ النسمة ما عندنا الا ما فى القرآن الا فهمًا يعطى الرجل فى كتابه وما فى الصحيفه**" (کہ اس ذات کی قسم جس نے جنت کو پیدا کیا ہے اور جان کو پیدا کیا۔ ہمارے پاس وہی علم ہے جو قرآن میں ہے۔ مگر وہ سمجھ جو ایک آدمی کو اس کی کتاب میں دی جاتی ہے اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے)۔

گدھے کو گھوڑی پر چھوڑنا ناسمجھوں کا کام

۳۸۸۳: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اُهْدِيَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَغْلَةٌ فَرَكِبَهَا فَقَالَ عَلِيٌّ: لَوْحَمَلْنَا الْحَمِيْرَ عَلَى الْخَيْلِ فَكَانَتْ لَنَا مِثْلُ هٰذِهٖ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ الَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ - (رواه ابوداود والنسائی)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۵۸، كتاب الخيل، الحديث رقم ۲۵۶۵، والنسائى فى ۶ / ۲۲۴، الحديث رقم ۳۵۸۰، وأحمد فى المسند ۱ / ۱۰۰

ترجمہ: "اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک موقع) پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خچر بطور ہدیہ پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سوار ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ "اگر ہم گھوڑیوں پر گدھے چھوڑیں تو ہمیں (بھی) ایسے خچر مل جائیں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ (سن کر) فرمایا: "یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو علم نہیں رکھتے"۔ (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: قوله: أهديت لرسول اللهﷺ۔۔مثل هذه:"مثل هذه": اور ایک نسخہ میں "**مثل ذالك**" ہے(اس صورت میں)مشارالیہ "مرکوب" ہے

فكانت لنا: اس کا عطف "**حملنا**" پر ہے اور "**لو**" کا جواب مقدر ہے۔یعنی اگر ہم ایسا کرلیں تو یہ بہتر ہے یا "او" یہاں پر تمنّی کے لئے ہے۔

قوله:"انما يفعل ذالك الّذين لا يعلمون"۔

یعنی انزاء الفرس علی الفرس اس سے بہتر ہے اس لئے کہ اس میں کئی قسم کے منافع اور فائدے ہیں۔

"**لا يعلمون**": یعنی وہ احکام شریعت سے واقف نہیں ہیں۔یا وہ ان چیزوں کی طرف رہنمائی نہیں پاتے جوان کے لئے زیادہ اولی اور انفع ہو۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "**لا يعلمون**" مطلق ہے۔اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث سابق کی دلالت کی وجہ سے مفعول مقدر ہو۔یعنی "**لا يعلمون كراهيته وعليته**" وہ اس کی کراہت اور علّت کو نہیں جانتے اور یہ بھی احتمال ہے کہ کچھ بھی مقدر نہ مانا جائے اور مبالغہ مراد ہو یعنی وہ لوگ اہل معرفت میں سے نہیں ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ یہ حکمت سے بعید ہے یا تغییر لخلق اللہ ہے۔

اور مظہرؒ کا میلان اس کی کراہت کی طرف ہے۔جیسا کہ انہوں نے کہا ہے "**انزاء الحمار على الفرس**" جائز ہے۔ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "خچر" پر سواری کی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمتوں میں سے شمار کیا ہے اور اپنے بندوں پر احسان جتلایا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿**والخيل والبغال والحمير لتركبوها وزينة**﴾[النحل:۸] طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "**انزاء الحمار على الفرس**" تو جائز نہیں البتہ ان پر سواری کرنا اور ان سے تزین کرنا جائز ہے۔جیسا کہ تصویر ہے کہ تصویر بنانا حرام ہے،البتہ اس کو بچھونے اور قالین وغیرہ میں استعمال کرنا مباح اور جائز ہے۔البتہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی پیش کردہ یہ نظیر بھی محل نظر ہے۔

رسول اللہ کی تلوار کا بیان

۳۸۸۴:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ :كَانَتْ قَبِيْعَةُ سَيفِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فِضَّةٍ

(رواه الترمذی وابوداود والنسائی والدارمی)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ٦٨ کتاب الجهاد، باب فی السیف، الحدیث رقم ۲۵۸۳، والترمذی فی ٤ / ۱۷۳، الحدیث رقم ۱٦۹۱، والنسائی فی ۸ / ۲۱۹، الحدیث رقم ٥۳۷٤، والدارمی فی ۲ / ۲۹۲ الحدیث رقم ۲٤٥۷

ترجمہ: "اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کے قبضے کی ٹوپی چاندی کی تھی"۔

(ترمذی،ابوداؤد،نسائی،دارمی)

تشریح: قوله: كانت قبيعة سيف رسول اللهﷺ ......:"قبيعة":اس سے مراد "**قبضة السيف**" ہے۔

"النہایہ" میں لکھا ہے کہ "**قبيعة**" وہ چیز ہے جو تلوار کے دستے کے سر پر لگی ہوتی ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ یہ تلوار کے دونوں

دھاروں کے نیچے لگا ہوتا ہے۔

''قاموس'' میں ہے کہ ''قبیعة'' بروزن ''سفینة'' ہے۔تلوار کے دستے پر جو لوہا یا چاندی لگائی جاتی ہے اس کو ''قبیعة'' کہتے ہیں۔یہی بات علامہ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کی ہے۔

''شرح السنۃ'' میں لکھا ہے کہ اس سے تلوار پر تھوڑی سی چاندی کے ملمع کا جواز نکلتا ہے۔البتہ لگام اور زینوں پر سونا چاندی چڑھانے میں اختلاف ہے۔بعض نے اس کو ''تلوار'' کی طرح جائز رکھا ہے اور بعض نے اس کو حرام کہا ہے اس لئے کہ یہ ''جانور'' کی زینت ہے اور اسی طرح جنگ کی چھری اور قلمدان پر تھوڑی سی چاندی لگانے میں بھی اختلاف ہے۔البتہ ''تحلیة بالذهب'' تمام صورتوں میں حرام ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار میں سونا چاندی کا بیان

۳۸۸۵: وَعَنْ هُوْدِ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ جَدِّهٖ مَزِيْدَةَ قَالَ: دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلٰى سَيْفِهٖ ذَهَبٌ وَفِضَّةٌ (رواه الترمذی وقال: هذاحديث غريب)

اخرجه أبو داود في السنن ٤ / ١٧٣ كتاب الجهاد، باب ما جاء في السيوف ف حليتها، الحديث رقم: ١٦٩٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت عود بن عبداللہ بن سعد اپنے دادا سے جن کا نام مزیدہ تھا روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح (مکہ) کے دن (مکہ میں) داخل ہوئے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو تلوار تھی اس پر سونے اور چاندی (کا کام) تھا''۔(ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

راویٔ حدیث:

ھود بن عبداللہ۔یہ ''ھود'' ہیں۔عبداللہ بن سعد کے بیٹے ہیں اور ''بصری'' ہیں۔اپنے دادا ''مزیدہ'' اور ''سعید بن وہب'' سے روایت کی۔یہ دونوں صحابی ہیں اور ان سے طالب ابن حجیر نے روایت کی ہے۔ھود: ''ھاء'' کے ضمہ اور ''واؤ'' کے سکون کے ساتھ ہے۔جیسا کہ ''المغنی'' میں لکھا ہے اور ''الأذھار'' میں امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ راوی ھوذۃ بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ہے۔(ھاء کے فتحہ اور زال اور تاء کے ساتھ ہے)۔یہ بعض نسخ مصابیح میں بھی ہے۔لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔بلکہ اصل نام بغیر تاء کے ''ھود'' ہی ہے۔''مزیدة'' میم کے فتحہ اور ''زاء'' کے کسرہ کے اور ''یاء'' کے سکون کے ساتھ ہے۔بروزن ''کبیرة'' ہے۔یہ بات ''التقریب'' میں مذکور ہے اور ایک نسخہ میں میم اور یاء کے فتحہ کے ساتھ بروزن ''مسعدة'' ہے۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں ھود بن عبداللہ بن سعد البصری ہے۔اپنے دادا مزید اور معبد بن وصب۔دونوں صحابی سے روایت نقل کرتا ہے اور ان سے طالب بن حجیر نے بھی روایت کی ہے اور اس کو صحابہ کے ''فصل میم'' میں ذکر کیا ہے۔یعنی مزیدة بن جابر العبدی۔اس کو بصرین میں سے شمار کیا ہے۔

اسنادی حیثیت:

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ مزیدۃ کی حدیث قابل حجت نہیں ہے۔اس لئے اس کی سند قابل اعتبار نہیں ہے اور صاحب الاستیعاب نے ان کی حدیث کو ذکر کیا ہے اور کہا ہے:''اسنادہ لیس بالقوی'' یہ سند قوی نہیں ہے۔

زرہ پہننے کا بیان

۳۸۸۶:وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَلَيْهِ يَوْمَ اُحُدٍ دِرْعَانِ قَدْ ظَاهَرَ بَيْنَهُمَا ۔ (رواہ ابوداود وابن ماجۃ)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۷۱ کتاب الجهاد' باب لبس الدروع' الحديث رقم ۲۵۹۰' وابن ماجه فی ۲ / ۹۳۸' الحديث رقم ۲۸۰۶' وأحمد فی المسند ۳ / ۲۹۳

ترجمہ:''اور حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے دن نبی کریم ﷺ (کے جسم مبارک) پر دو زر ہیں تھیں آپ ﷺ نے ایک (زرہ) دوسری (زرہ) پر پہن رکھیں تھیں''۔(ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: قولہ:''درعان قدظاهر بينهما''

ایک زرہ دوسری زرہ کے اوپر پہنی ہوئی تھی۔'' **تظاهر**'' کے معنی ہیں: تعاون وتساعد اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مجاہدہ کے اسباب میں مبالغہ جائز ہے اور یہ توکل اور امور مقدر کی تسلیم کے منافی نہیں ہے۔

حضور کے جھنڈوں کا بیان

۳۸۸۷:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ رَايَةُ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَوْدَاءَ وَلِوَاؤُهُ اَبْيَضَ ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ۱٦۹ ' کتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی الروایات' الحديث رقم : ۱٦۸۱ وابن ماجه فی ۲ / ۹٤۱' الحديث رقم ۲۸۱۸۔

ترجمہ:''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کا بڑا جھنڈا سیاہ رنگ کا تھا اور چھوٹا جھنڈا سفید رنگ کا تھا''۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: كانت راية نبی الله سوداء ......:

''**راية نبی الله**'':اور بعض نسخوں میں ''سوداء'' کا لفظ ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیاہ رنگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سیاہی غالب تھی دور سے وہ سیاہ دکھائی دیتا تھا، نہ کہ وہ خالص سیاہ رنگ کا تھا جیسا کہ اگلی حدیث میں آئے گا کہ دھاری دار تھا''ولواؤہ أبيض'' یہ کان کی خبر ہونے کی وجہ

سے منصوب ہے اور خبریت کی بناء پر اس کا رفع بھی جائز ہے
''النہایہ'' میں ہے کہ ''الراية'' بڑے جھنڈے کو کہتے ہیں اور آپ ﷺ کے جھنڈے کا نام ''عقاب'' تھا۔ کہا جاتا ہے:
''ربيت الراية اى ركزتها'' یعنی میں نے جھنڈے کو گاڑ دیا۔ اس کا ''الف'' اصل میں ''یاء'' تھا
''المغرب'' میں ہے: ''لواء'' جیش کی علامت اور ان کا جھنڈا ہے جو ''راية'' سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ جس کو نیزہ سے لپیٹ دیا جاتا ہے اور اس کو ''ام الحروب'' بھی کہتے ہیں۔ یہ ''لواء'' سے بڑا ہوتا ہے۔
زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اگرچہ عرب اس کو ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ جبکہ ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ اور اصمعی رحمۃ اللہ علیہ نے ''راية'' میں ہمزہ کا انکار کیا ہے۔
اور تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''رایہ'' اس جھنڈے کو کہتے ہیں کہ جس کو جنگ کا امیر اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھتا ہے اور اس پر لڑائی ہوتی ہے اور لڑائی کو اس کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ جبکہ ''لواء'' امیر جنگ کی علامت اور نشانی ہوتی ہے وہ جہاں کا رخ کرتا ہے یہ جھنڈا اس کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔
''شرح مسلم'' میں ہے کہ ''راية'' چھوٹے جھنڈے کو کہتے ہیں جبکہ ''لواء'' بڑے جھنڈے کو کہتے ہیں اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قول کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: **''بيدى لواء الحمد وآدم ومن دونه تحت لوائى يوم القيامة''**۔ (أخرجه الترمذى فى السنن ٥/٥٤٨ الحديث رقم ٣٦١٥)

حضور ﷺ کے چھوٹے جھنڈے کی ہیئت کا بیان

۳۸۸۸: وَعَنْ مُوْسٰى بْنِ عُبَيْدَةَ مَوْلٰى مُحَمَّدِ بْنِ الْقَاسِمِ قَالَ بَعَثَنِىْ مُحَمَّدُ بْنُ الْقَاسِمِ اِلَى الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ لِيَسْأَلَهٗ عَنْ رَايَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَانَتْ سَوْدَاءَ مُرَبَّعَةً مِنْ نَمِرَةٍ۔

(رواه احمد والترمذى وابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ٧١ كتاب الجهاد' باب فى الرايات' الحديث رقم ٢٥٩١' والترمذى ٤ / ١٨٩' الحديث رقم ١٦٨٠' وأحمد فى المسند ٤ / ٢٩٧

ترجمہ: ''اور حضرت موسیٰ بن عبیدہؒ جو حضرت محمد بن قاسم (تابعی) کے آزاد کردہ غلام تھے کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت محمد بن قاسم نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے حضرت براء بن عازب (صحابی) کے پاس بھیجا۔ چنانچہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (آپ ﷺ کا) جھنڈا سیاہ رنگ کا تھا اس کا کپڑا چوکور اور نمرہ کی طرح تھا''۔ (احمد' ترمذی' ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

موسیٰ بن عبیدۃ۔ یہ موسیٰ ہیں عبیدہ کے بیٹے اور ''ربذی'' ہیں۔ انہوں نے محمد بن کعب اور محمد بن ابراہیم سے اور ان سے شعبہ و عبید اللہ بن موسیٰ اور علی نے روایت کی۔ محدثین ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ۱۵۳ھ میں وفات پائی۔ ''عبیدہ'' تصغیر کے ساتھ

ہے۔

مرتب عرض کرتا ہے واضح رہے کہ مرقات میں ''زیدی'' ہے اور ''الاکمال'' میں ''ربذی'' ہے۔ الاکمال کے محشی لکھتے ہیں کہ پاکستانی نسخوں میں ''زیدی'' ہے یہ تحریف ہے۔ اھ۔

تشریح: **قوله: كانت سوداء مربعة من نمرة:** ''نمرة'': نون کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ اون کی چادر ہوتی تھی جس میں سفید اور کالی لکیریں ہوتی تھیں اس چادر کو اعرابی پہنتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کو ''نمرة'' کہتے ہیں۔ اس کو ''عباء'' بھی کہتے ہیں۔

فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے جھنڈے کا بیان

۳۸۸۹: وَعَنْ جَابِرٍ، اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: دَخَلَ مَكَّةَ وَلِوَاؤُهُ اَبْيَضُ۔

(رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۷۲ كتاب فضائل الجهاد، بابفی الرايات والألوية، الحديث رقم: ۲۵۹۲، والترمذی فی ٤ / ۱٦۸، الحديث رقم: ۱٦۷۹، وابن ماجه فی ۲ / ۹٤۱، الحديث رقم ۲۸۱۷، والنسائی فی ٥ / ۲۰۰، الحديث رقم: ۲۸٦٦

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (فتح مکہ کے دن) مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا سفید رنگ کا تھا''۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

الفصل الثالث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھوڑے انتہائی محبوب تھے

۳۸۹۰: عَنْ اَنَسٍ قَالَ: لَمْ يَكُنْ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بَعْدَ النِّسَاءِ مِنَ الْخَيْلِ. (رواه النسائی)

النسائی، كتاب الخيل۔

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں (یعنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن) کے بعد گھوڑوں سے زیادہ محبوب و پسندیدہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی''۔ (نسائی)

تشریح: **قوله: لم يكن شی احب الی رسول اللهؐ ''بعد النسآء من الخيل'':**

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ذکر ''خیل'' غزوہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے کنایہ ہے اور خیل کو ''النساء'' کے ساتھ ذکر کرنا تکمیل کے ارادہ سے ہے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے۔

''حبّب الی الطيب والنسآء وجعل قرة عينی فی الصّلٰوة''۔

اس لئے کہ جب آپ ﷺ نے یہ بات بتلادی کہ آپ ﷺ کو عورتیں اور گھوڑے، بندوں کی مصلحت کی وجہ سے محبوب ہیں۔ جیسا کی حدیث استغفار میں بھی یہ بات گزری ہے۔ تو آپؓ نے دل میں یہ بات محسوس کی کہ یہ وصف اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ آپ ﷺ امور عالیہ کے بجائے خواتین کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھتے ہیں۔

''من الخیل'': فرمایا کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ لڑائی میں پہل کرنے والے ہیں اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد میں پہل کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں یہ بات مکمل فرمائی ہے: ''وجعل قرۃ عینی فی الصّلوٰۃ'' پس آپ ﷺ نے بتلادیا کہ آپ ﷺ اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنے والے ہیں۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کو چار ہزار آدمیوں جتنی جماع کی طاقت وقوت دی گئی تھی۔ پس اس بناء پر آپ ﷺ ان سے سب سے زیادہ صبر کرنے والے ہیں اور ان کے اجتماع سے نہایت طریقے سے رکنے والے ہیں۔

غیر مسلموں کے تیار کردہ ہتھیاروں کا بیان

۳۸۹۱: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: كَانَتْ بِيَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْسٌ عَرَبِيَّةٌ فَرَاٰى رَجُلًا بِيَدِهٖ قَوْسٌ فَارِسِيَّةٌ قَالَ: مَاهٰذِهٖ؟ اَلْقِهَا' وَعَلَيْكُمْ بِهٰذِهٖ وَ اَشْبَاهِهَا وَرِمَاحِ الْقَنَا' فَاِنَّهَا يُؤَيِّدُ اللّٰهُ لَكُمْ بِهَا فِي الدِّيْنِ وَيُمَكِّنُ لَكُمْ فِي الْبِلَادِ . (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲ / ۹۳۹' كتاب الجهاد' باب السلاح' الحديث رقم ۲۸۱۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ (کسی میدان میں یا ویسے ہی کسی موقع پر) رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں عربی کمان تھی' جب آپ ﷺ نے ایک شخص (صحابی) کے ہاتھ میں فارسی (عجمی) کمان دیکھی تو فرمایا کہ ''یہ کیا ہے؟'' اس کو پھینک دو تم پر ایسی (کمان) یا اس کے مثل (کمان) لازم ہے۔ نیز تمہیں کامل نیزے رکھنے لازم ہیں' یقیناً ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دین (کو سربلند کرنے) میں تمہاری مدد کرے گا اور (دشمنوں کے) شہروں میں تمہیں جمادے گا''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: رماح القنا: قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ قناۃ کی جمع ہے اور مراد اس سے کامل نیزے ہیں۔

''فانّھا'' یہ ضمیر قصہ ہے۔

قولہ: فانھا یؤید اللہ لکم بھا ''فی الدین ولیمکن لکم فی البلاد''۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''انّ'' کا اسم ضمیر قصہ ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ [فانھا لا تعمی الأبصار] اس صحابیؓ نے عجمی قوس پر زور اس لئے دیا۔ کیونکہ اس نے سمجھا کہ یہ قوس زیادہ قوی زیادہ سخت اور زیادہ دور تک مار کرنے والا ہے۔ بنسبت قوس عربی کے۔ پس اس نے اس قوس فارسی کو قوس عربی پر ترجیح دی۔ اس خیال سے کہ یہ جنگوں اور فتح میں زیادہ مدد و معاون ثابت ہوگی۔ آپ ﷺ نے اس کی راہنمائی کی کہ آپ کا یہ خیال اور گمان درست نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہی دین میں تمہاری نصرت و مدد فرماتے ہیں اور تمہیں شہروں میں اپنی مدد سے بساتا ہے۔ نہ کہ تمہاری مدد اور تمہارے اعداد کی مدد وقوت

ہے۔

''قاموس'' میں ہے کہ لفظ قوس مؤنث اور مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ ذوالقوس حاجب بن زرارۃ اس قحط میں کسریٰ کے پاس آیا جوان کو آپ ﷺ کی بددعاء سے پہنچا تھا۔ اپنی قوم کے لئے اجازت مانگ رہا تھا کہ وہ اس کے ملک کے کسی کونے میں رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کو شفا مل جائے۔ پس اس پر کسریٰ نے کہا کہ تم عرب معاشرے والے بڑے غدار اور لالچی ہو جب تمہیں اجازت دی جائے گی تو تم شہروں میں فساد مچاؤ گے اور بندوں پر ظلم کرنے لگو گے تو حاجب نے کہا کہ میں بادشاہ کو ضمانت دیتا ہوں کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ تو کسری نے کہا کہ مجھے کوئی شخص اس بات کی ضمانت دے گا کہ تم اس کو پورا کرو گے؟ تو حاجب نے کہا کہ میں اپنا کمان تمہارے پاس بطور رہن کے رکھتا ہوں۔ اس سے کسریٰ کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ ہنس پڑے۔ کسریٰ نے کہا کہ وہ اس کو اس کے حوالے کبھی بھی نہیں کرے گا۔ پس اس سے قوس کو قبول کر لیا اور ان کو اجازت دے دی۔

اس وقت حاجب مر چکا تھا۔ چنانچہ اس کا بیٹا عطارد۔ اپنے باپ کا کمان مانگنے کیلئے کسریٰ کے پاس گیا۔ پس کسریٰ نے اس کو کمان واپس کر دیا اور اس کو ایک جبہ پہنایا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس نے وہ جبہ آپ ﷺ کو ہدیہ کر دیا۔ آپ ﷺ نے وہ جبہ قبول نہیں فرمایا چنانچہ اس نے جبہ ایک یہودی کو چار ہزار درہم کے عوض فروخت کر دیا۔

عرضِ مرتب:

یہ قصہ صاحب قاموس نے لفظ ''قوس'' کی تحقیق کے بعد ''ذوالقوس'' کے تحت ذکر کیا ہے واضح رہے کہ مرقات میں وہ جبہ ہدیہ کرنے اور اس کو فروخت کرنے کا ذکر ہے۔ جبکہ قاموس میں ہے کہ آپؐ نے وہ جبہ قبول نہیں فرمایا تھا۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ قاموس کی عبارت کے مطابق کیا ہے۔ اھ۔

بَابُ اٰدَابِ السَّفَرِ

آدابِ سفر کا بیان

اس باب میں سفر کے آداب کا بیان ہے، سفر خواہ جہاد کا ہو، خواہ حج کیلئے ہو، خواہ کسی اور غرض کے لئے ہو۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ:

جمعرات کو سفر کرنے کا بیان

۳۸۹۲: عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ وَكَانَ يُحِبُّ اَنْ يَّخْرُجَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاري في صحيحه ٦ / ١١٣' كتاب الجهاد' باب من اراد غزوة' الحديث ٢٩٥٠' و ابو داود السنن ٣ / ٧٩' الحديث رقم ٢٦٠٥' أخرجه في الدارمي في ٢ / ٢٨٣' الحديث رقم ٢٤٣٦' وأحمد في المسند ٣ / ٤٥٥ - ٤٥٦

ترجمہ: ''حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے جمعرات کے دن روانہ ہوئے اور آپ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے کہ (جہاد یا سفر کے لئے) جمعرات کے دن روانہ ہوں''۔

(بخاری)

تشریح: قوله: ان النبيؐ خرج يوم الخميس ....:

''تبوك'': علمیت اور وزن فعل کی بناء پر غیر منصرف ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں ''منصرف'' استعمال ہوا ہے۔ اس طور پر کہ یہ ''فعول'' کا وزن ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے یہ لفظ ''بوك'' سے مشتق ہے۔ النہایہ کے مطابق تبوک ''تثوير الماء بعودٍ'' سے ماخوذ ہے۔ زمین کو لکڑی سے کریدنا تا کہ وہاں سے پانی نکالا جائے اور اسی وجہ سے اس کا نام ''غزوہ تبوک'' رکھا گیا۔ شام میں ایک جگہ کا نام ہے اس کے اور مدینہ کے درمیان ایک مہینہ کی مسافت ہے۔ یہ غزوہ ۹ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ آپ ﷺ کے غزوات میں سے آخری غزوہ یہی تھا۔

''و كان يحب أن يخرج'' ''الجامع'' کی روایت میں ''اذا غزا'' ہے۔

''يحب الخميس''۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی بس پسندیدگی کی کئی وجوہات ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دن بڑا بابرکت ہے۔ اس دن بندوں کے اعمال اللہ کے حضور پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ ﷺ کے اسفار اللہ کیلئے ہوتے تھے، اللہ کے دین کے

دوسری اور اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لئے ہوتے تھے پس آپ ﷺ نے یہ پسند کیا کہ اس روز آپ ﷺ کا ایک نیک عمل اوپر اٹھایا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ عدد کے اعتبار سے اس دن ہفتہ مکمل ہو جاتا ہے۔

تیسری توجیہہ یہ ہے کہ آپؐ نکلنے میں لفظ ''خمیس'' سے فال لیتے تھے۔ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ اچھے نام سے ''فال'' لیتے تھے۔ چنانچہ خمیس جیش کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے پانچ حصے ہوتے ہیں: ① مقدمہ۔ ② قلب۔ ③ میمنہ۔ ④ میسرہ۔ ⑤ ساقہ۔

آپ ﷺ نے اس میں ایک اچھی فال دیکھا۔ اللہ کی حفاظت اور اللہ تعالیٰ کا اس لشکر کی حمایت اور لشکر کی حفاظت کے ساتھ احاطہ کرنا۔ گھیراؤ کرنا، قاضی رحمہ اللہ نے اضافہ کیا ہے کہ ''خمیس'' سے آپ ﷺ یہ فال لیتے تھے کہ آپ ﷺ کو دشمن کے لشکر پر کامیابی حاصل ہو جائے گی اور ان پر قابو پالیں گے۔ وگرنہ بیٹھ جاتے اور یا اس وجہ سے کہ اس میں غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

رات کو تنہا سفر کرنے کا بیان

۳۸۹۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَوْيَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي

الْوَحْدَةِ مَا اَعْلَمُ مَا سَارَ رَاكِبٌ بِلَيْلٍ وَحْدَهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٣٧ باب السیر وحده' الحدیث رقم ٢٩٩٨' وابن ماجه فی السنن ٢ / ١٢٣٩' الحدیث رقم ٣٧٦٨' وأحمد فی المسند ٢ / ٢٣

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر لوگ اس چیز کو جو تنہا سفر کرنے سے پیش آتی ہے اس قدر جان لیں جتنا میں جانتا ہوں تو کوئی سوار رات میں کبھی تنہا سفر (کرنے کی ہمت) نہ کرے''۔ (بخاری)

تشریح: طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ما "فی الوحدة" میں ''ما'' استفہامیہ ہے۔ یعنی ''علم'' کو ''عمل'' سے معلق کر دیا ہے اور ''ما أعلم'' میں ''ما'' موصولہ ہے۔ ''ما أعلم'' یہاں دونوں جگہوں پر ''ما'' موصولہ ہے اور دوسرے مقام کا ''ما'' پہلے ''ما'' سے بدل ہے۔ اور ''ماسار بليل وحده'' میں ''ما'' نافیہ ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں دینی نقصان ہے اس لئے کہ اس کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنے کیلئے کوئی نہیں ہوگا اور دنیاوی نقصان یہ ہے کہ ضرورت وحاجت میں اس کا کوئی مددگار اور معاون نہیں ہوگا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ کہنا چاہیے تھا ''ما سار أحد وحده'' لیکن اس ''سیر'' کو ''راکب'' اور ''لیل'' کے ساتھ مقید کر دیا اس لئے کہ رات کو خطرات زیادہ ہوتے ہیں: اندھیرے میں شر زیادہ پھوٹتا ہے اور اس سے بچنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: ''الليل أخفى للويل'' رات ہلاکت کیلئے زیادہ خفیہ (پوشیدہ) ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: ''أعذر الليل''۔ جب رات اندھیری ہو جائے تو اس میں خوف زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ مسافر سوار ہو: تو اس کو خوف لاحق ہوتا ہے اور سواری بھی چھوٹی سی چیز سے بھاگ جاتی ہے۔ برخلاف سوار کے اور یہ بھی ممکن ہے کہ راکب کے ساتھ سیر کو مقید کرنا یہ بتانے کیلئے کہ ''راجل'' (پیادہ پا) تو بطریق اولیٰ ممنوع ہوگا اور اس لئے بھی تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ ''وحدت'' کا اطلاق راکب پر نہیں ہوتا۔

تخریج: اسی طرح احمد رحمۃ اللہ علیہ، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کو اس لفظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

''لو يعلم الناس من الفحوة ما أعلم'' یہ حدیث جامع الصغیر میں بھی ہے۔

قافلہ کے ساتھ کتا اور گھنٹی ہونے کا بیان

۳۸۹۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيْهَا كَلْبٌ وَلَا جَرَسٌ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٣ / ١٦٧٢' کتاب اللباس' باب کراهة الکلب' الحدیث رقم: (١٠٣ ـ ٢١١٣) و أبو داود فی السنن ٣ / ٥٣' الحدیث رقم ٢٥٥٥' و الترمذی فی ٤ / ١٧٩' الحدیث رقم ١٧٠٣' والدارمی فی ٢ / ٣٧٤' الحدیث رقم ٢٦٧٦' وأحمد فی المسند ٢ / ٢٦٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس قافلہ کے ساتھ (رحمت کے) فرشتے نہیں ہوتے جس میں کتا اور گھنٹی ہو''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: لاتصحب الملائكه ......:

''رفقة'': ''راء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ایسی جماعت جو ایک دوسرے کا ساتھی ہو۔ ''قاموس'' کے مطابق راء پر تینوں حرکتیں پڑھنا درست ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''راء'' کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

''**فيها كلب**'': اس وعید سے شکار اور حفاظت کا کتا مستثنیٰ ہے۔

''**ولا جرس**'': یہاں پر ''تکرارِ لا'' تاکید کیلئے ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا عطف ''**فيها كلب**'' پر بھی جائز ہے اگر چہ وہ ''کلام مثبت'' ہے چونکہ سیاق نفی میں مذکور ہے۔

''مغرب'' میں لکھا ہے کہ ''جرس'' جیم اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ وہ چیز جو جانور کی گردن میں لٹکائی جاتی ہے اور اس سے آواز نکلتی ہے

نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ''**عدم مصاحبة الملائكة مع الجرس**'' میں حکمت یہ ہے کہ یہ دراصل ''ناقوس'' کے مشابہ ہے۔ اس کی آواز کی کراہت کی وجہ سے ممنوع ہے اور اس کی تائید اگلے جملہ ''**مزا مير الشيطان**'' سے بھی ہوتی ہے اور ہمارا مذہب یہی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے اور اس کراہت سے مراد ''کراہت تنزیہ'' ہے۔ متقدمین علمائے شام کی ایک جماعت یہ کہتی ہے جرس کبیر مکروہ ہے، صغیر میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اھ

بعض علماء کہتے ہیں ''**جرس الدواب**'' اس وقت مکروہ اور ممنوع ہے جب اس کو بطور لہو لٹکایا جائے۔ کسی منفعت کے پیش نظر لٹکائی جائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

''شرح السنۃ'' میں روایت ہے کہ ایک لونڈی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی جس کے پاؤں میں گھونگھرو تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے (موجودین سے) فرمایا فرشتوں کو جدا کرنے والی چیز کو نکال باہر کرو۔

ایک روایت میں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے زبیر کے پاؤں میں گھنٹیاں کاٹ دی تھیں اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے کہ ہر یہ جرس (گھنٹی) کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد وابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

گھنٹی شیطان کا باجہ ہے

۳۸۹۵: وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْجَرَسُ مَزَامِيْرُ الشَّيْطَانِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۳ / ۱۶۷۲، كتاب اللباس، باب كراهة الكلب والجرس فى السفر، الحديث (۱۰٤ - ۱۲۱٤) وأبو داود فى السنن ۳ / ٥٤ الحديث رقم: ۲٥٥٦، وأحمد فى المسند ۲ / ۳۷۲

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جرس (یعنی گھنگرو اور گھنٹی) شیطان کے مزامیر (یعنی شیطانی باجے) ہیں''۔ (مسلم)

تشریح: قوله:''الجرس مزامير الشيطان'':

یہاں پر ''مفرد'' (الجرس) کی خبر (مزامیر) جمع ذکر فرمائی ہے۔ اس لئے کہ جنس جرس مراد ہے۔ یا اس وجہ سے کہ گھنٹی کی آواز منقطع نہیں ہوتی جب بھی اس کو ''معلق بہ'' کے ذریعے حرکت دی جاتی ہے۔ خاص طور پر سفر میں برخلاف ''مزامیر متعارفہ'' کے کہ اس میں ایسا (یعنی آواز کا تسلسل) نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے: ''معى جياعًا''

یہاں پر مفرد کی صفت جمع لائی گئی ہے۔ تا کہ یہ بات معلوم ہو کہ ''آنت'' کا ہر ہر جزء سخت بھوک کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے۔ ''جرس'' کی اضافت ''شیطان'' کی طرف اس لئے فرمائی کہ اس کی آواز انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور فکر سے مسلسل غافل رکھتی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

کمان کی تانت کا قلادہ ڈالنے کی ممانعت

۳۸۹۶: وَعَنْ اَبِىْ بَشِيْرٍ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّهٗ كَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ بَعْضِ اَسْفَارِهٖ فَاَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا لَا تُبْقَيَنَّ فِىْ رَقَبَةِ بَعِيْرٍ قَلَادَةٌ مِنْ وَتَرٍ اَوْ قَلَادَةٌ اِلَّا قُطِعَتْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ١٤١' كتاب الجهاد' باب ما قيل فى الجرس' الحديث رقم ٣٠٠٥' و مسلم فى ٣ / ١٦٧٢' الحديث رقم (١٠٥ ـ ٢١١٥) و أبو داود فى السنن ٣ / ٥٢' الحديث رقم ٢٥٥٢' و مالك فى الموطا ٢ / ٩٣٧' الحديث رقم ٣٩' من كتاب صفة النبى صلى الله عليه وسلم' وأحمد فى المسند ٥ / ٢١٦

ترجمه: ''اور حضرت ابو بشیر انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کسی سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو (وہ بیان کرتے ہیں کہ اس سفر کے موقع پر) رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو (قافلہ کے اندر اس حکم کا اعلان کرنے کے لئے) بھیجا کہ کسی اونٹ کی گردن میں (کمان کی) تانت کے قلادہ (پٹے) کو باقی نہ رکھا جائے یا فرمایا کہ قلادہ کو باقی نہ رکھا جائے بلکہ کاٹ ڈالا جائے''۔ (بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

ابو بشیر۔ یہ ''ابو بشیر قیس'' ہیں' عبید انصاری مازنی کے بیٹے ہیں۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ ان کے صحیح نام پر واقفیت نہیں ہو سکی اور کسی ایسے شخص نے جو قابل وثوق واعتماد ہو ان کا نام نہیں بتایا اور ابن مندہ نے کتاب الکنی میں ان کا ذکر کیا ہے مگر نام نہیں لکھا۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔ واقعہ حرہ کے بعد انتقال ہوا۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ ''بشیر'' میں بائے موحدہ مفتوح اور شین معجمہ مکسور ہے۔ مرقاۃ میں ''مزنی'' ہے اور عبید کی بجائے ''عبید اللہ'' ہے۔

تشریح: قوله: لاتبقين في رقبة بغير ......:

''لا تبقين'': ''تاء'' کے ضمہ اور قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مجہول مؤکد بہ نون ثقلیہ ہے۔ ''ابقاء'' سے مشتق ہے اور ایک نسخہ میں بصیغہ معروف کی منقول ہے۔ ''بقاء'' سے مشتق ہے۔

''قلادة'': قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نائب فاعل ہے یا فاعل ہے۔ وتر بروزن قلم ، اُوتار کا واحد ہے۔

''أو قلادة'': یہ راوی کو شک ہے کہ ''من وتر'' کی قید ہے یا نہیں؟

''الا قطعت'': اس کے قطع کا حکم اس لئے دیا کیونکہ ''گھنٹیاں'' اس کے ساتھ باندھی جاتی ہیں۔ جبکہ وہ شیطان کی بانسریاں ہیں اور رحمت کے ملائکہ کے آنے سے مانع ہے۔ یا اس لئے تا کہ دشمن کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ اس طرح وہ ان کو ایڑ لگانے سے روک دے گا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''لا تبقين'' یا تو ''رسولاً'' کی صفت ہے۔ أی أرسل رسولا ينادی فی الناس بهذا یا یہ ''أرسل'' کے فاعل سے حال ہے۔ پہلا معنی ہی واضح اور راجح ہے اور استثناء کا معنی بھی اسی وقت صحیح بنے گا جب ''لا تبقين'' کی تفسیر ''لا تتركن'' کے ساتھ کی جائے۔ استثناء مفرغ ہے اور مستثنیٰ منہ ''أعم عام الاحوال'' ہے

''شرح السنۃ'' میں لکھا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ''قطع القلائد'' کی تأویل یہ کی ہے کہ یہ لوگ نظر کی وجہ سے جانوروں اور بکریوں کے گلوں میں کمان کے تانت اور قلائد اس لئے لٹکاتے تھے اور اس سے یہ فال لیتے تھے کہ یہ جانور آفات اور مصائب سے محفوظ رہیں گے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع فرمایا کہ یہ چیزیں گھنٹیاں اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلہ کو رد نہیں کر سکتیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ''قطع القلائد'' کا حکم اس لئے دیا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ گھنٹیاں لٹکاتے تھے۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محمد بن الحسن وغیرہ کا قول ہے کہ جانوروں کی گردنوں میں کمانوں کے تانت مت ڈالو کا حکم اس حکمت کے پیش نظر ہے کہ ہوسکتا ہے یہ انکے گلوں کو تنگ کر دیں۔ جس سے ان کا گلا گھونٹ جائے اور اسکی تفصیل پہلے گذر چکی ہے کہ بسا اوقات اونٹ درختوں کے پتے کھاتے ہیں اور کبھی اس کے ساتھ اپنی گردن کو ملتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ لٹک کر مر جائیں۔

دورانِ سفر جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کا بیان

۳۸۹۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا سَافَرْتُمْ فِی الْخِصْبِ فَاَعْطُوْا الْاِبِلَ حَقَّهَا مِنَ الْاَرْضِ وَاِذَا سَافَرْتُمْ فِی السَّنَةِ فَاَسْرِعُوْا عَلَیْهَا السَّیْرَ وَاِذَا عَرَّسْتُمْ بِاللَّیْلِ فَاجْتَنِبُوْا الطَّرِیْقَ فَاِنَّهَا طُرُقُ الدَّوَابِّ وَمَاْوٰی الْهَوَامِّ بِاللَّیْلِ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) اِذَا سَافَرْتُمْ فِی السَّنَةِ فَبَادِرُوْا بِهَا نِقْیَهَا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۵۲۵، کتاب الامارة، باب مراعاة مصلحة الدواب الحدیث رقم (۱۷۸ - ۱۹۲۶) وأخرجه ابو داود فی السنن ۳ / ۶۰، الحدیث ۲۵۶۹، والترمذی فی سننه ۵ / ۶۳۲ الحدیث رقم

۲۸۵۸، وأحمد في المسند ۲ / ۳۷۸

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم سرسبز و شاداب زمین میں (اونٹوں پر) سفر کرو تو ان اونٹوں کو زمین سے ان کا حق دو (یعنی ان کو گھاس کھانے کا موقع دو بایں طور کہ سفر کے دوران ان کو تھوڑی دیر کے لئے چرنے کے لئے چھوڑ دیا کرو تا کہ وہ پیٹ بھر کر چریں اور تیز چلیں) اور جب تم قحط سالی کے زمانے میں سفر کرو تو ان پر جلدی سفر کرو (یعنی سفر کے دوران راستہ میں تاخیر نہ کرو تا کہ اونٹ پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے ضعف و نقاہت میں مبتلا ہونے سے پہلے تمہیں منزل مقصود پر پہنچا دیں) نیز جب تم کہیں رات میں پڑاؤ ڈالو تو راستے (پر پڑاؤ ڈالنے) سے اجتناب کرو۔ وہ رات کے وقت چوپائے کے چلنے کی جگہ اور زہریلے جانوروں کا مسکن ہے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب تم قحط سالی کے زمانے میں (اونٹوں پر) سفر کرو تو تیزی کے ساتھ سفر طے کرو جب کہ اونٹوں میں گودا (یعنی بدن کی طاقت) موجود ہو''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: واذا عرستم باليل...... وماوى الهوام بالليل:**

''**عرس**'': راء'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ ''**باللّيل**'' میں ''تجرید'' ہے۔ کیونکہ تعریس رات کے آخری حصہ میں قیام ہی کو کہتے ہیں۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ ''**أعرس القوم**'' کا مطلب ہے کہ قوم نے آرام اور استراحت کے لئے رات کے آخری حصہ میں قیام کیا۔ یہ اس کے اکثری معنی ہیں یہاں پر اس سے مراد مطلق ''لیل'' میں قیام ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کی بیان کردہ علّت اس پر دال ہے۔

''**ومأوى الهوام بالليل**''

''**هوام**'': میم کی تشدید کے ساتھ، ''**هامة**'' کی جمع ہے۔ ہر زہریلی چیز کو کہتے ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تعریس رات کے آخری حصہ میں آرام کے لئے پڑاؤ ڈالنے کو کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رات یا دن کے کسی بھی حصہ اور لمحہ میں پڑاؤ کو کہتے ہیں۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ حشرات الارض اور زہریلے جانور وغیرہ رات کو راستوں میں گری ہوئی کھانے پینے کی چیزیں کھانے کے لئے نکل آتے ہیں۔

قوله: ''وفي روايةٍ: ''اذا سافرتم في السنة فبادروا بها نقيها'' :

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ''نقب'' کو باء موحدة کے ساتھ روایت کیا ہے ضمیر کا مرجع ''الأرض'' اور ''نقب'' کی تفسیر ''طریق'' بیان کی ہے لیکن یہ بات بے بنیاد ہے اور یہ ان تصحیفات میں سے ہے جس میں ایک عالم پھسل جاتا ہے۔ جاہل کا تو کیا ہی کہنا۔

اشرفؒ فرماتے ہیں ''الصحاح'' میں لکھا ہے کہ **نقبَ البعير**'' (قاف کے کسرہ کے ساتھ) کا معنی ہے ''اونٹ کا گھسے ہوئے کھر والا ہونا اور انقبهم الرجل آدمی کا گھسے ہوئے کھر والے اونٹ کا مالک بننا'' ''**ونقب الخف الملبوس**'': پہنے ہوئے موزے کا پھٹا ہوا ہونا۔ پس ممکن ہے کہ یہ لفظ اس مذکورہ معنی پر محمول ہو۔ تو اس صورت میں یہ ''تصحیف'' نہیں ہوگی۔ اھ لیکن چونکہ روایتاً یہ ضبط ثابت نہیں اس لئے تصحیف کا قول اپنی جگہ برقرار ہے۔

شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ''نقی'' نون کے کسرہ اور قاف کے سکون کے ساتھ بمعنی ''فخ'' (گودا، مغز)

ترکیبی احتمالات:

اور بظاہر ''نقیها'' بناءِ مفعولیت ''بادروا'' منصوب ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں تینوں احتمال ہیں:

پہلا احتمال: منصوب ہو مفعول بہ ہونے کی بناء پر ''بها'' اس سے حال ہے۔ ''ای بادروا نقیها الی المقصد ملتبسًا بها''۔ یا ''فاعل'' سے حال ہو۔ ای ملتبس بها' اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ باءِ سببیہ ہو۔ أی بادروا بسبب سیرها نقیها' اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ''باء'' استعانت کے لئے ہو۔ ای ''بادروا نقیها مستعینین بسیرها'۔

دوسرا احتمال: مرفوع ہو ظرف کیلئے فاعل ہوگا اور ظرف حال واقع ہو ای بادروا الی المقصد ملتبسا بها نقیها اور یا مرفوع ہو۔ مبتداء ہونے کی بناء پر اور جار و مجرور اس کی خبر بنے اور جملہ حال ہو۔ جیسا کہ یہ قول ہے: ''فوہ الی فیّ''۔

تیسرا احتمال مجرور ہے ضمیر مجرور سے بدل واقع ہو اور معنی یہ بنے گا: ''سارعوا بنقیها الی المقصد باقیة النقی'' اور ''جار و مجرور'' حال واقع ہوگا۔

دورانِ سفر حاجت مند کی ضرورت پوری کرنے کا بیان

۳۸۹۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ، قَالَ: بَیْنَمَا نَحْنُ فِیْ سَفَرٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَ رَجُلٌ عَلٰی رَاحِلَةٍ فَجَعَلَ یَضْرِبُ یَمِیْنًا وَشِمَالاً فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ کَانَ مَعَهٗ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْیَعُدْ بِهٖ عَلٰی مَنْ لَا ظَهْرَ لَهٗ وَمَنْ کَانَ لَهٗ فَضْلُ زَادٍ فَلْیَعُدْ بِهٖ عَلٰی مَنْ لَا زَادَ لَهٗ قَالَ: فَذَکَرَ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ حَتّٰی رَاَیْنَا اَنَّهٗ لَا حَقَّ لِاَحَدٍ مِنَّا فِیْ فَضْلٍ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۳۵۴' کتاب اللقطه' باب استحباب المواساة' الحدیث رقم: (۱۸ ـ ۱۷۲۸) وأبو داود فی السنن ۲ / ۳۰۵' الحدیث رقم ۱۶۶۳' وأحمد فی المسند ۳ / ۳۴

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر جب کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اس دوران ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک (کمزور) سواری پر حاضر ہوا اور اونٹ کو دائیں بائیں پھیرنے موڑنے لگا' چنانچہ یہ (دیکھ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس شخص کے پاس (اپنی ضرورت سے) زائد سواری ہو اس کو چاہئے کہ وہ اس شخص کو عنایت کر دے جس کے پاس کوئی سواری نہیں ہے اور جس شخص کے پاس (اپنی اور اپنے جانور کی ضرورت سے) زائد زادِ راہ (یعنی کھانے پینے کا سامان) ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ زادِ راہ اس شخص کو عنایت کر دے جس کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے''۔ راوی (ابوسعید خدری) کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال اور چیزوں کی اقسام کو ذکر کیا (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چیزوں کا نام لے کر فرمایا کہ جس کے پاس فلاں چیز اور فلاں چیز (جیسے کپڑا وغیرہ اپنی حاجت سے) زائد ہو تو اس کو اس شخص پر خرچ کیا جانا چاہئے جس کے پاس وہ چیز نہ ہو یہاں تک کہ (آپ کی ترغیب و نصیحت سے) ہمیں احساس ہو گیا کہ ہم میں سے کسی کا اپنی

اس چیز پر کوئی حق نہیں ہے جو اس کے پاس اس کی ضرورت سے زائد ہے (بلکہ اس چیز کا حقیقی مستحق وہ شخص ہے جو اس وقت اس چیز سے محروم ہے)۔'' (مسلم) قوله: بينما نحق في سفر......ليمنا ومتمالا:

تشریح: ''اذا جآء رجلٌ'': اور نسخہ صحیحہ میں ''اذاجآءہ رجلٌ'' ہے۔

''فجعل'' افعال شروع کے معنی میں ہے۔

''یضرب یمیناً وشمالاً'': وہ آدمی اس سواری کو اپنے دائیں اور بائیں گھمانے لگا کیونکہ وہ چلنے سے عاجز تھی اور بعض نے کہا ہے کہ وہ سوار اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے اپنی آنکھوں کو دائیں بائیں گھما گھما کر دیکھ رہا تھا۔

قوله: من كان فضل ظهر۔۔۔منلا لادله:

''فليعد به علٰى من لا زاد له'': آپؐ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا اور شاید کہ آپ ﷺ کو اطلاع ہوئی کہ یہ قلت زاد کی وجہ سے تھکا ہوا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ''تتميما'' ارشاد فرمایا ہو۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ تھکاوٹ کی وجہ سے دائیں بائیں گر رہا تھا اس لئے کہ اس کی سواری بہت کمزور ہوگئی تھی وہ اس پر سوار ہونے کی قدرت نہیں رکھتا تھا اس لئے وہ پیدل چلنے لگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی سواری تو قوی تھی لیکن اس پر اس کا کھانا اور دوسرا سامان زیادہ لدا ہوا تھا۔ اس لئے وہ سوار ہونے پر قادر نہ ہوا۔ پس اس وجہ سے آپ ﷺ نے اس کیلئے لشکر میں سے ایک اضافی سواری طلب کی۔ جو ضرورت اور حاجت سے زائد تھی۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس توجیہہ میں اشکال ہے۔ اس لئے کہ ''علٰى راحلته'' رجل کی صفت ہے ای راكبٌ عليها اور ''فجعل'' کا عطف بذریعہ حرف تعقیب ''جاء'' پر ہے۔ الا یہ کہ اس کا عطف کلام محذوف پر قرار دیا جائے۔ اس صورت میں عبارت یوں ہوگی۔ ''فنزل فجعل يمشى''

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ تقدیر مانی جائے چونکہ زیادہ واضح ہے ''حامل متاعه علٰى راحلته'' یا یہ کہ ''علٰى'' ''مع'' کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ قرآن کی اس آیت میں استعمال ہوا ہے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ [البقرة۔۱۷۷] طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بہتر توجیہہ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہاں پر ''یضرب'' دراصل یلتفت سے کنایہ ومجاز ہے نہ کہ یمشی سے۔ توجیہہ کی بناء پر دوسرا احتمال ساقط ہو جائے گا جس کا یہ مقام انکار کر رہا ہے۔ اس کی تائید ''صحیح مسلم'' کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ بعض نسخوں میں اسی طرح ہے: ''جآء رجلٌ علٰى راحلةٍ فجعل يضرب بصره يميناً وشمالاً'' اور بعض نسخوں میں ''يصرف يميناً وشمالاً'' ہے۔ اس میں ''بصره'' کا لفظ نہیں ہے۔ جبکہ بعض جگہ ''یضرب'' کا لفظ ہے اور معنی یہ ہوگا۔ کہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس چیز کے لئے جو اس کی اس ضرورت کو پورا کرے۔

اس حدیث میں صدقہ اور ایثار وقربانی کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ کہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے ان کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہئے ان کی حاجت پوری کرنے کی کوشش کر کے ان کو سوال سے بچانا چاہئے۔ اگرچہ اس کے پاس سواری ہو اور لباس زیب تن ہو۔ یا اپنے وطن میں مالدار آدمی ہو تو اس حالت میں اس کو ''زکاۃ'' بھی

دی جا سکتی ہے۔

”قوله: فذكر من اصناف المال ......“

اصناف مال: اس سے مراد کپڑا، جوتے، مشکیزہ، پانی، خیمہ اور نقدی وغیرہ ہیں۔

سفر ایک عذاب ہے

۳۸۹۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ يَمْنَعُ اَحَدَكُمْ نَوْمَهُ وَطَعَامَهُ وَشَرَابَهُ فَاِذَا قَضٰى نَهْمَتَهُ مِنْ وَجْهِهٖ فَلْيُعَجِّلْ اِلٰى اَهْلِهٖ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٦ / ١٣٩، كتاب الاطعمه، باب ذكر الطعام، الحديث رقم: ٣٠٠١، و مسم في ٣ / ١٥٢٦، الحديث رقم (١٧٩ ـ ١٩٢٧) وابن ماجه في ٢ / ٩٦٢، الحديث رقم ٢٨٨٢، والدارمي في ٢ / ٣٧٢، الحديث رقم ٢٦٧٠، و مالك في الموطا ٢ / ٩٨١، الحديث رقم ٣٩، من كتاب الاستئذان، أخرجه احمد في المسند ٢ / ٤٩٦

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے جو تم میں سے ہر ایک کو نہ تو (آرام و راحت سے) سونے دیتا ہے اور نہ (ڈھنگ سے) کھانے پینے دیتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص (کہیں سفر میں جائے اور) اپنے سفر کی غرض کو پورا کر لے (یعنی جس مقصد کیلئے سفر کیا ہے وہ مقصد پورا ہو جائے) تو اس کو چاہیے کہ اپنے اہل و عیال کے پاس واپس آنے میں جلدی کرے“۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: السفر قطعة من العذاب:

”السّفر“: اس سے کوئی خاص سفر مراد نہیں بلکہ جنس مراد ہے۔

”قطعة من العذاب“: یعنی جہنم کے عذاب کی قسم اور نوع ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴾[المدثر ـ ۱۷] ترمذی، ابن حبان، حاکم اور احمد نے حضرت ابو سعید الخدری سے ایک حدیث روایت کی ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

الصعود جبل من نار يتصعد فيه الكافر سبعين خريفًا ثم يهوى فيه كذالك ابدًا:

صعود آگ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر ایک کافر ستر سال تک چڑھے گا پھر وہ ہمیشہ اس میں گرتا رہے گا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سفر کو عذاب کا ٹکڑا اس وجہ سے کہا کیونکہ سفر میں مشقت، تھکاوٹ، گرمی اور سردی کی تکلیف، ڈر، خوف اپنے گھر والوں اور ساتھیوں سے جدائی سہنا پڑتی ہے، زندگی سخت ہو جاتی ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عوام میں بطور حدیث کے یہ جملہ مشہور ہے ”أن السفر قطعةٌ من السقر“ اصل کے اعتبار سے یہ ثابت نہیں ہے اور شاید یہ روایت بالمعنیٰ ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم **السفر قطعة من العذاب** نہ فرماتے: تو میں اس کو الٹ کر یوں کہتا: **”السّقر قطعة من السّفر“** (جہنم سفر کا ایک ٹکڑا ہے)۔ لیکن بظاہر یہ

بات صحیح نہیں ہے

ولاً علاً تو اس لئے کہ یہ مبالغہ میں زیادتی ہے۔

ثانیاً اس میں ''صعود'' کا معنی مقصود فوت ہو جاتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ ہر سفر ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بعض سفر بالکل برعکس ہوتے ہیں

قوله:يمنع أحدكم نومه وطعامه وشرابه الخ

یہ جملہ مستانفہ مبیّنہ ہے۔ یا ماقبل سے حال ہے۔

نهمته: نون کے فتحہ اور ''ھاء'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ ضرورت وحاجت کو کہتے ہیں۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''نهمة'' کا معنی ہے۔ **بلوغ الهمة فی شیء** کہا جاتا ہے:''**وقد نهم بكذا فهو منهوم**''یعنی وہ فلاں چیز کا بہت مشتاق ہے۔

''**من وجهه**'': طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ''**من وجهه**'' ''**قضٰی**'' کے ساتھ متعلق ہے۔

''**فليعجل**'': ''جیم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ ہے۔ ''قاموس'' میں ہے کہ **عجل بروزن فرح** مجرد سے ہے۔ ''جلدی کرنا''۔ ''تیزی کرنا''۔ **وعجّل تعجيلاً از باب تفعيل بمعنی ''مبادرة''** (جلدی کرنا، سبقت کرنا، پہل کرنا، کسی سے آگے نکل جانا)

''**الٰی اهله**'': اس سے اس کا شہر مراد ہے۔ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اس میں اقامت کی ترغیب ہے۔ تاکہ جمعہ جماعت پنجگانہ فوت نہ ہو اور اہل وقرابت داروں کے حقوق ضائع نہ ہوں اور یہ اسفار غیر واجبہ میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی طرف نہیں دیکھتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں''**فاذا قضٰی نهمته فليعجل الٰی اهله**''اس میں اس سفر کی طرف اشارہ ہے جس میں اس کی حاجت ہو اور اس کی تجارت کا فائدہ ہو، یا سفر واجب جیسا کہ سفر حج یا سفر غزوہ سے واپس آرہا ہو۔

لیکن بظاہر ''نهمة'' مطلقاً حاجت وضرورت کے معنی میں ہے۔ یہ حکم عام ہے۔ اس کی تائید حاکم اور بیہقی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت ہے:

''**اذا قضٰی احدكم حجه فليعجل الٰی اهله فانه اعظم لأجره**''۔ [الحاكم فی المستدرك ٤٧٧/١]

''جب تم میں سے کوئی اپنا حج مکمل کر لے تو وہ اپنے اہل کی طرف جلدی کرے ۔ اس لئے کہ یہ اجر کے اعتبار سے بڑھ کر ہے''۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ یہ حدیث زانی کو جلاوطن کرنے کی دلیل ہے چوں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النور۔ ۲] اور تغریب بھی جلد (کوڑے مارنا) کی طرح عذاب ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ بے شک تغریب (جلاوطنی) بھی عذاب ہے لیکن کلام اس میں ہے کہ وہ مراد ہے یا نہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ ''حد'' کا حصہ ہے یا سیاست پر محمول ہے۔

توضیح وتخریج: ''جامع صغیر'' میں یہ الفاظ ہیں: ''**فليعجل الرجوع الٰی اهله**''۔

سفر سے واپسی پر بچوں کے ساتھ شفقت کا بیان

۳۹۰۰:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ تُلُقِّیَ بِصِبْيَانِ اَهْلِ بَيْتِهٖ، وَاِنَّهٗ قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ، فَسُبِقَ بِیْ اِلَيْهِ فَحَمَلَنِیْ بَيْنَ يَدَيْهِ، ثُمَّ جِیْءَ بِاَحَدِ ابْنَیْ فَاطِمَةَ فَاَرْدَفَهٗ خَلْفَهٗ قَالَ :فَاُدْخِلْنَا الْمَدِيْنَةَ ثَلَاثَةً عَلٰى دَابَّةٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٤ / ٨٨٥، كتاب فضائل الصحابه، باب فضائل عبدالله بن جعفر رضی الله عنه، الحديث رقم (٦٦ ـ ٢٤٢٨) وأخرجه أبو داود فی السنن ٣ / ٥٩، الحديث رقم ٢٥٦٦، وابن ماجه فی السنن ٢ / ١٣٤٠، الحديث رقم ٣٧٧٣، وأحمد فی المسند ١ / ٢٠٣

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ سفر سے تشریف لاتے تو آپ ﷺ کے اہل بیت کے بچوں کے ذریعہ آپ ﷺ کا خیر مقدم کیا جاتا (یعنی آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے آپ ﷺ کے چچاؤں کے بچوں کو آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا جاتا) چنانچہ (ایک روز) آپ ﷺ جب سفر سے واپس تشریف لائے (اور مدینہ کے قریب پہنچے) تو مجھ کو آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا' آپ ﷺ نے مجھے اپنے آگے سوار کرلیا۔ پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دونوں بیٹوں میں سے ایک بیٹے (یعنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ) کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے ان کو اپنے پیچھے سوار کرلیا۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں کہ پھر (اس طرح ہم تینوں ایک جانور پر (سوار) مدینہ میں داخل ہوئے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: كان رسول الله ﷺ اذا قدم من سفر ......:

''تلقی'': ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ ایک نسخہ باب تفعیل سے مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔

''وانه'': ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

''فسبق'': یہ ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔

''فأدخلنا'': صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ''ثلاثة'': امام طیبی رحمہ اللہ نے اس کو ''حال موطئہ'' قرار دیا ہے۔ ای ثلاثة كائنة۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: [لسانًا عربيًا]

عورت کو سواری کے پچھلے حصہ پر بٹھایا جائے

۳۹۰۱:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّهٗ اَقْبَلَ هُوَ وَ اَبُوْ طَلْحَةَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :صَفِيَّةُ مُرْدِفُهَا عَلٰى رَاحِلَتِهٖ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ، ١٠ / ٥٦٩، كتاب الادب، باب جعلنی الله فداك، الحديث رقم ٦١٨٥، و مسلم فی صحيحه ٢ / ٩٨٠، الحديث رقم (٤٢٩، ١٣٤٥)

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ (انس رضی اللہ عنہ) اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (خیبر کے سفر سے) واپس آئے تو اس موقع پر (آپ ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: **انه اقبل هو وابو طلحه ......:**

''**ومع النبي صفيّة**'': اس عبارت میں ''تفنن'' ہے۔ ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر ذکر کیا تا کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ ضمیر کا مرجع ابو طلحہ یا انسؓ ہے اور ضمیر مستتر کی تاکید اس لئے لائی گئی ہے تا کہ اسم ظاہر کا اس پر عطف صحیح ہو سکے۔

''**مع النبي**'' ''**اقبل**'' کیلئے ظرف ہے، یا اس سے حال ہے۔ **أي ''مصاحبين للنبي''** اور ''**مردفها**'' یہ ''**النبي**'' سے حال ہے **أي جاعل صفية مردفها** اور اس کا عامل ظرف کا متعلق ہے۔ گویا کہ وہ سفر سے اس ہیئت اور حالت پر واپس آئے اور اسی طرح ''شرح السنۃ'' میں تصریح ہے: **عن انس قال: اقبلنا من خيبر وبعض نساء النبي ﷺ رديفه**''۔

رسول اللہ ﷺ سفر سے واپسی پر گھر کس وقت تشریف لائے تھے

۳۹۰۲: وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَطْرُقُ اَهْلَهُ لَيْلًا وَكَانَ لَا يَدْخُلُ اِلَّا غُدْوَةً اَوْ عَشِيَّةً۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳ / ۶۱۹' كتاب العمرة' باب الدخول بالعشي' الحديث رقم: ۱۸۰۰ و مسلم في ۳ / ۱۵۲۷' الحديث رقم (۱۸۰ ـ ۱۹۲۸)

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کے پاس (سفر سے) رات کے وقت واپس نہیں آیا کرتے تھے بلکہ دن کے ابتدائی حصہ میں (یعنی صبح کے وقت) یا آخری حصہ میں (یعنی شام کے وقت گھر میں) داخل ہوا کرتے تھے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''قوله: **كان رسول الله لا يطرق**'' ''**اهله ليلاً:**

لا طرق: راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اس میں تجرید ہوئی ہے۔ ''النہایہ'' میں ہے کہ ''**الطروق**'' **طرق** سے ماخوذ ہے۔ یہ کھٹکھٹانے کو کہتے ہیں اور رات کو آنے والے کو ''طارق'' کہتے ہیں کیونکہ وہ دروازہ کھٹکھٹانے کا محتاج ہوتا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ممکن ہے کہ یہ ''**الطارق**'' سے ماخوذ ہو۔ طارق ستارے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی رات کو ظاہر ہوتا ہے اور نظر آتا ہے۔

قوله: وكان لايدخل الاغدوة اوعشية:

''**غدوة**'': غین کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ نقل ہے اور ایک نسخہ میں غین اور دال، دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

''القاموس'' میں ہے کہ ''**الغدوة**'' (بالضم) صبح سویرے یا صلاۃ الفجر اور طلوع شمس کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں۔

''النہایہ'' میں ہے کہ ''**الغدو**'' دن کے ابتدائی حصہ میں چلنے کو کہتے ہیں اور ''**الغدوة**'' اس سے اسم مرۃ ہے۔ اور ''**الغدوة**'' (بالضم) صلوٰۃ الصبح اور طلوع الشمس کے مابین وقت کو کہا جاتا ہے۔

''عشية'': ''النہایہ'' میں لکھا ہے کہ ''عشی'' کا اطلاق زوال کے بعد سے مغرب تک کے وقت پر ہوتا ہے اور ''القاموس'' میں ہے کہ ''العشی'' اور ''العشية'' دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''العشية'' سے مراد ''رات'' نہیں ہے اس لئے کہ ''لیلاً'' کا لفظ صراحتاً مذکور ہے، بلکہ یہاں اس سے مراد نماز عصر کے بعد کا وقت ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: [وعشیا وحین تظهرون] صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ ''عشیًا'' سے مراد ''صلاة العصر'' اور ''تظهرون'' سے مراد ''صلاة الظهر'' ہے۔ اھ واضح رہے کہ ''صاحب کشاف'' نے آیت کے معنی مرادی کو واضح کیا ہے اس میں موجودہ قرینہ ''تظهرون'' سے نہ کہ یہ اسکی تفسیر لغوی ہے۔

طویل عرصہ کے بعد گھر واپسی کس وقت آئے

۳۹۰۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اَطَالَ اَحَدُكُمُ الْغَيْبَةَ فَلَا يَطْرُقْ اَهْلَهُ لَيْلاً۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ك۹ / ۳۳۹ تاب النكاح' باب لا يطرق اهله ليلا' الحديث رقم ٢٥٤٤' و مسلم فی ٣ / ٥٢٨' الحديث رقم (١٨٣ ـ ٧١٥) و أبو داود فی السنن ٣ / ٢١٨' الحديث رقم ٢٧٧٦' والترمذی فی ٥ / ٦٢' الحديث رقم ٢٧١٢' والدارمی فی ٢ / ٣٥٦' الحديث رقم ٢٦٣١' وأحمد فی المسند ٣ / ٣٠٢

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی طویل عرصہ کے لئے (اپنے گھر والوں سے) غائب رہے (یعنی اس کو سفر میں زیادہ دن لگ جائیں) تو وہ (سفر سے واپسی کے وقت) اپنے اہل خانہ کے پاس رات کے وقت داخل نہ ہو''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''شرح السنة'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نہی کے بعد دو آدمی رات کو گھر آئے تو ان دونوں نے اپنی بیوی کے ساتھ دوسرے آدمی کو پایا۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔

طویل عرصہ کے بعد اہل خانہ کے پاس کب لوٹے

۳۹۰۴: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلْتَ لَيْلاً فَلَا تَدْخُلْ عَلٰى اَهْلِكَ حَتّٰى تَسْتَحِدَّ الْمُغِيْبَةُ وَتَمْتَشِطَ الشَّعِثَةُ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٩ / ٣٤١ كتاب النكاح' الحديث رقم ٥٢٤٦' و مسلم فی ٣ / ١٥٢٧' الحديث رقم (١٨٢' ٧١٥) وأبو داود فی السنن ٣ / ٢١٨' الحديث رقم ٢٧٧٨' والدارمی فی ٢ / ١٩٧' الحديث رقم ٢٢١٦' وأحمد فی المسند ٣ / ١٠٣

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم (سفر سے واپسی پر اپنے شہر و آبادی میں) رات کے وقت پہنچو تو اپنے (گھر والوں پر) (گھر میں) داخل نہ ہو یہاں تک کہ وہ عورت جس کا

خاوند غائب رہا ہے وہ زیر ناف بالوں کو صاف کر لے اور وہ بیوی کہ جس کے بال پراگندہ ہوں کنگھی چوٹی نہ کر لے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: اذا خلت ليلا فلا تدخل ......:

''حتى تستحد المغيبة'': میم کے ضمہ اور غین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ تا کہ وہ عورت جس کا شوہر غائب رہا ہے۔ تا کہ شوہر کی اس سے ملاقات اچھے انداز سے ہو اور اسی وجہ سے اگلا جملہ فرمایا۔

''وتمتشط الشعثة'': شین کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بکھرے بالوں میں کنگھی کر سکے تا کہ آنے والا اس کے برے منظر سے بچ سکے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''استحداد'' زیر ناف بالوں کے حلق کو کہتے ہیں۔ '' أغابت المرأة'' اس وقت کہا جاتا ہے جب شوہر کئی عرصہ غائب رہے۔ ''مغيبة'' بالھاء ہے اور شاذ و نادر بغیر ھاء کے بھی آجاتا ہے۔ یہاں ''استحداد'' سے مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے زیر ناف بالوں کو معتاد طریقے سے صاف کر سکے یعنی عورتیں اکثر زیر ناف کو نوچ کر یا بال صفا پوڈر استعمال کرتی ہیں۔ یہاں لوہے کا استعمال مراد نہیں ہے۔ چونکہ کہ عورتوں کے لئے اس کا استعمال مستحسن نہیں ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تمام امور اس شخص کیلئے مکروہ ہیں جس نے سفر میں طویل مدت گزاری ہو۔ البتہ جو شخص زمانہ قلیل کے بعد اپنے گھر رات کو آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ ''اذا طال الرجل الغيبة'' کے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے۔

اور اسی طرح جب وہ کسی بڑے قافلے یا بڑے لشکر میں ہو اور ان کے آنے کے بارے میں مشہور ہو جائے اور اس کے اہل خانہ کو اس کی واپسی کا علم ہو تو پھر رات کو آنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ حرج رفع ہو گیا جس کی وجہ سے آنا ممنوع تھا۔ اس لئے کہ اس سے مراد ''تیاری'' ہے اور وہ حاصل ہو گئی۔ اھ لیکن دروازہ کھٹکھٹانا اور جواب کا انتظار پھر بھی ضروری ہے۔

سفر سے واپسی پر ضیافت کا بیان

۳۹۰۵ : وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا (قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ نَحَرَ جَزُوْرًا اَوْ) بَقَرَةً۔

(رواه البخاری ومسلم)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ١٩٤ كتاب الجهاد' باب الطعام عند القدوم' الحديث رقم : ٣٠٨٩' وأحمد فی المسند ٣ / ٣٠١'

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب (ہجرت کے بعد یا کسی غزوہ کے بعد) مدینہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ یا گائیں ذبح کیں''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما قدم المدينة ......:

''نحر جزورًا'': ''النہایہ'' میں ہے کہ ''جزور'' جیم کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ''الجزور'' قربانی کے

اونٹ کو کہتے ہیں یہ لفظ مؤنث ہے مذکر و مؤنث دونوں پر ''جزور'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر اس سے مراد نر اونٹ ہو تو تب بھی اس کو مؤنث ہی استعمال کریں گے هذا الجزور ۔

''أو بقرة'': یہ شک راوی کی طرف سے ہے۔ یہ سنت ہے کہ سفر سے آنے والا اپنی گنجائش کے مطابق دعوت کرے۔ (طیبی)

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ سفر سے واپسی کے بعد ضیافت کا اہتمام کرنا مسنون ہے۔

سفر سے واپسی پر سنت نبوی

۳۹۰۶: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْدَمُ مِنْ سَفَرٍ اِلَّا نَهَارًا فِي الضُّحٰى فَاِذَا قَدِمَ بَدَاَ بِالْمَسْجِدِ فَصَلّٰى فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِ لِلنَّاسِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ١٩٣' كتاب الجهاد' باب الصلاة اذا قدم من سفر' الحديث رقم: ٣٠٨٨' و مسلم فى ١ / ٤٩٦' الحديث رقم (٧٤ ـ ٧١٦) وأبو داود فى السنن ٣ / ٢٢٠' الحديث رقم ٢٧٨١' والنسائى فى ٢ / ٥٣' الحديث رقم ٧٣١

ترجمہ: ''اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کے وقت کے علاوہ اور کسی وقت سفر سے واپس نہیں آیا کرتے تھے' چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم (سفر سے) واپس آتے تو پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے اور وہاں (بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد یا چاشت کی) دو رکعت نماز ادا کرتے اور پھر لوگوں (سے ملاقات کرنے) کے لئے وہاں تشریف رکھتے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''قوله:ثم جلس فيه للنّاس'':

لوگوں کی باتیں سننے ان کے سوالات و جوابات اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے کی غرض سے بیٹھا کرتے تھے اور یہی حدیث بعینہٖ ''باب المساجد'' میں گذر چکی ہے۔

طبرانی اور حاکم نے ابی ثعلبۃ سے اس طرح نقل کیا ہے:

''أنه ﷺ كان اذا قدم من سفر بدا بالمسجد فصلّٰى فيه ركعتين۔ ثم يثنى بفاطمة ثم يأتى ازواجه ''۔

'' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد میں جاتے وہاں پر دو رکعت پڑھتے۔ پھر تھوڑی دیر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رکتے پھر اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس تشریف لاتے''

سفر سے واپسی پر دو رکعت نماز پڑھنے کا بیان

۳۹۰۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فِيْ سَفَرٍ' فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ قَالَ: لِيْ اُدْخُلِ الْمَسْجِدَ' فَصَلِّ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٩٣‘ الحدیث رقم ٣٠٨٧‘ و مسلم فی ١ / ٤٩٦‘ الحدیث رقم (٧٢ ـ ٧١٥)

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں (ایک) سفر میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا' چنانچہ جب ہم مدینہ واپس آئے تو آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ''مسجد میں داخل ہو جاؤ اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرو''۔ (بخاری)

تشریح: اس حدیث سے مسافر کا مسجد میں داخل ہونا اور اس میں دو رکعت ادا کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ اس عمل کا مسنون ہونا قولاً اور فعلاً دونوں طریقے سے ثابت ہیں۔ اس عمل میں ''شعائر اللہ'' کی تعظیم کا اظہار ہے اور اشارہ ہے کہ مسجد اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے ایک گھر ہے، اور (یعنی مسجد) اس کی زیارت کرنے والا دراصل اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا ہے۔

الفصل الثانی:

سفر جہاد اور سفر تجارت کا آغاز صبح کے وقت کرنے کا بیان

٣٩٠٨:عَنْ صَخْرِ بْنِ وَدَاعَةَ الْغَامِدِيِّ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِأُمَّتِيْ فِيْ بُكُوْرِهَا وَكَانَ إِذَا بَعَثَ سَرِيَّةً اَوْجَيْشًا بَعَثَهُمْ مِنْ اَوَّلِ النَّهَارِ وَكَانَ صَخْرٌ تَاجِرًا فَكَانَ يَبْعَثُ تِجَارَتَهُ اَوَّلَ النَّهَارِ فَاَثْرٰى وَكَثُرَ مَالُهُ۔ (رواه الترمذی وابوداود والدارمی)

اخرجه أبو داود فی السنن ٣ / ٥١٧‘ الحدیث رقم ٦٢٠٦‘ والترمذی كتاب البیوع‘ باب ما جاء فی التكبیر‘ الحدیث رقم ٢١٢‘ وابن ماجه فی ٢ / ٧٥٢‘ الحدیث رقم ٢٢٣٦‘ والدارمی فی ٢ / ٣٥٣‘ الحدیث رقم ٢٤٣٥‘ وأحمد فی المسند ٣ / ٤١٦

ترجمہ: ''حضرت صخر بن وداعہ الغامدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا (یعنی یوں دعا فرمائی) ''اے اللہ! میری امت کے لئے دن کے ابتدائی حصہ میں برکت عطا فرما' (یعنی اگر میری امت کے لوگ دن کے ابتدائی حصہ (صبح) میں طلب علم میں مشغول ہوں یا اپنے ذریعہ معاش میں مصروف ہوں یا سفر وغیرہ کریں تو اس میں انہیں برکت عطا فرما''۔) چنانچہ آپ ﷺ جب کوئی چھوٹا' بڑا لشکر روانہ فرماتے تو اس کو دن کے ابتدائی حصہ میں روانہ فرماتے اور صخر رضی اللہ عنہ جو ایک تاجر (سوداگر) تھے۔ وہ (اس دعا کی برکت حاصل کرنے کے پیش نظر) اپنا تجارتی مال دن کے ابتدائی حصہ میں روانہ کرتے تھے' چنانچہ وہ مال دار ہوئے اور ان کے مال میں بہت اضافہ ہوا''۔ (ترمذی' ابوداؤد' دارمی)

تشریح: '' صخر بن وداعة '': وداعۃ واؤ کے فتحہ کے ساتھ منقول ہے۔

قوله:اللّٰهم بارك لأمتی فی بكورها'':

یعنی ان کے صبح اور دن کے ابتدائی حصہ میں اس میں خیر اور بھلائی کو زیادہ کردے اور یہ اضافت ادنیٰ ملابست کی وجہ سے ہے اور یہ طلب علم، سفر اور کسب معاش وغیرہ سب کو شامل ہے۔

قوله:"وكان اذا بعث سريّة اوجيشًا بعثهم من اول النهار:

یہاں پر"او" تنویع کے لئے ہے۔ جیش اور سریۃ میں باہم فرق پہلے گزر چکا ہے۔

قوله:"وكان صخرًا تاجرًا......" اس میں تجرید ہے یا التفات ہے اور زیادہ واضح یہ ہے کہ یہ اس راوی کا کلام ہے جس نے یہ حدیث صخر سے سنی تھی۔

"وكثر ماله" اس کا عطف "اثرای" پر ہے یہ عطف تفسیری ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دن کے ابتدائی حصہ میں سفر کرنا مسنون ہے اور حضرت صخرؓ اس سنت کی رعایت رکھتے تھے۔ وہ تاجر تھے اور اپنا مال تجارت دن کے ابتدائی حصہ میں سفر پر بھیجتے۔ سنت کی اس رعایت کی برکت سے انکا مال زیادہ ہوگیا۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء ضرور بہ ضرور قبول ہوتی ہے، کبھی رد نہیں ہوتی۔

ابن ماجہ کی ایک روایت میں جو حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے یہ الفاظ آئے ہیں:

"اللهم بارك لأمتي في بكورها يوم الخميس"۔

رات کے وقت سفر کرنے کا بیان

۳۹۰۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : عَلَيْكُمْ بِالدُّلْجَةِ، فَاِنَّ الْاَرْضَ تُطْوٰى بِاللَّيْلِ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ٦١ كتاب الجهاد، باب في الدلجه، الحديث رقم ۲۵۷۱، وأحمد في المسند ۳ / ۳۰۵

ترجمہ: "اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم رات کے وقت سفر کرنا اپنے لئے لازم سمجھو کیونکہ رات کے وقت زمین لپیٹ دی جاتی ہے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله:"عليكم بالدلجة":**

یہ "ادلج" کا اسم ہے۔ دال کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ **"أدلج القوم"** (از باب افعال) رات کے ابتدائی حصہ میں سفر کرنا، بعض نے "ادلج" کا معنی "پوری رات چلنا" بتایا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ معنی اس اگلے جملہ کو سامنے رکھتے ہوئے مراد لئے ہیں: قولہ: **"فان الأرض تطوى بالليل"**

تطوی: مجہول کے صیغہ کے ساتھ "رات میں مسافت طے کرنا"

مظہر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ **"الدلجة"** **"ادلجوا"** کا اسم ہے۔ "رات کے آخری حصے میں چلنا"۔ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ صرف دن کو چلنے پر قناعت و اکتفاء مت کرو بلکہ رات کو بھی چلو۔ اس لئے کہ یہ آسان ہوتا ہے اس طور پر کہ چلنے

والے کا خیال ہوتا ہے کہ اس نے تھوڑی مسافت طے کی ہے حالانکہ وہ بہت طویل فاصلے طے کر چکا ہوتا ہے۔

ایک سوار ایک شیطان۔۔۔

۳۹۱۰:وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرَّاكِبُ شَيْطَانٌ وَالرَّاكِبَانِ شَيْطَانَانِ وَالثَّلَاثَةُ رَكْبٌ۔ (رواه مالك والترمذى وابوداود والنسائى)

اخرجه أبو داود فى السنن' ۳ / ۸۰' الحديث رقم ۲۶۰۷' والترمذى فى ٤ / ۱٦٦' الحديث ۱٦٧٤' و مالك بن انس' الموطا' كتاب الاستيذان' باب ما جاء فى الوحدة فى السفر' ۲ / ۱۸٦

ترجمه:''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''تنہا سوار ایک شیطان ہے'دو سوار دو شیطان ہیں اور تین سوار'ایک قافلہ ہیں''۔

(مالک'ترمذی'ابوداؤد'نسائی)

تشریح: **قوله:الراكب شيطان**:

اس لئے کہ جماعت بھی فوت ہوتی ہے'زندگی مشکل ہو جاتی ہے'ضرورت کے وقت مدد نہیں ہوتی اور موت کے امکان کے وقت کوئی معاونت کا امکان نہیں ہوتا۔

قوله:''**والراكبا شيطانان**''اس لئے کہ بسا اوقات ان میں سے ایک بیمار ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے اور دوسرا مجبور ہوتا ہے۔وہ اس کی مدد نہیں کر سکتا۔

"**قوله و الثلاثة ركب**"

رکب:راء کے فتحہ اور کاف کے سکون کے ساتھ ہے اور مراد اس سے جماعت ہے۔حدیث میں آیا ہے:

''**يدالله على الجماعة**''[أخر جه الترمذى فى النسس ٤/٤٠٥، الحديث رقم ٢١٦٦ و ٢١٦٧] **ولفظه يد الله مع الجماعة ولفظ الجامع الصغير يد الله على الجماعة** [٢/ ٥٨٩ الحديث رقم ١٠٠٠٤]

''النہایہ''میں ہے کہ''**الركب**''اسماء جمع میں سے ایک اسم ہے۔جیسا کہ "**نفر**"اور"**رهط**" ہے اور اسی وجہ سے اس کی تصغیر علی لفظہ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ''راکب'' کی جمع ہے جیسا کہ''**صحب**'' ''**صاحب**'' کی جمع ہے۔اگر ایسا ہوتا تو اس کی تصغیر''**رو يكبون**" آتی جیسا کہ "**صحب**"کی تصغیر''**صويحبون**''آتی ہے۔''**الراكب**"اصل میں''اونٹ سوار''کو کہتے ہیں لیکن پھر توسعاً ہر جانور کے سوار کو''راکب'' کہا جانے لگا۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اکیلے سفر کرنا ممنوع ہے،اور اسی طرح دو آدمیوں کا سفر کرنا بھی ممنوع ہے اور جس نے بھی اس''**منهى عنه**'' کا ارتکاب کیا تو اس نے شیطان کی اطاعت و فرمانبرداری کی اور جس نے شیطان کی اطاعت کی تو گویا کہ وہ خود شیطان ہی ہوا اور اس وجہ سے اس شیطان کا اطلاق کیا گیا ہے۔

''شرح السنۃ''میں ہے کہ حدیث کا مطلب جو حضرت سعید بن المسیب سے مرسلاً مروی ہے:شیطان ایک اور دو آدمیوں

کا ارادہ کرتا ہے جب وہ تین ہوتے ہیں تو وہ ان کو گمراہ نہیں کر سکتا۔[أخرجه مالك فى المؤطا ۹۷۸/۲ الحديث رقم ۳۶]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے انہوں نے اکیلے سفر کرنے والے شخص کے بارے میں فرمایا:

تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ مر جائے تو اس کی خبر گیری کون کرے گا۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکیلا سفر کرنے والا اگر مر جائے تو کوئی اس کے غسل، دفن اور تجہیز کا انتظام کرنے والا نہ ہوگا اور نہ کوئی اس کی آخری وصیت کو سننے والا ہوگا اور اس کا ''ترکہ کی خبر'' اس کو کون کرے گا اور اہل وعیال کے اس کی موت کی خبر اس کے اہل خانہ کو کیسے ہوگی؟ اس کے اٹھانے میں (لے جانے پر) اس کی اعانت ومدد کون کرے گا لیکن اگر وہ تین ہوں گے وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے اور باری باری بوجھ اٹھائیں گے اور باری باری چوکیداری بھی کریں گے اور نماز باجماعت ادا کریں گے۔ وغیرہ۔

امیر سفر مقرر کرنے کا بیان

۳۹۱۱: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَ ثَلَاثَةٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَ هُمْ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۸۱ كتاب الجهاد، باب فى القوم يسافرون، الحديث رقم ۲۶۰۸

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر (سفر میں تین اشخاص ہوں تو ان کو چاہیے کہ اپنے میں سے کسی (افضل شخص) کو اپنا امیر (یعنی امیر سفر) مقرر کر لیا کریں۔''

(ابو داؤد)

تشریح: **قوله اذا كان ثلاثة ......:**

مراد یہ ہے کہ جب ایک جماعت ہو۔ جمع کے اقل افراد تین ہیں اور اسی طرح جب وہ دو ہوں (تو بھی ایک کو امیر بنا لینا چاہئے)۔ یہاں تین پر اقتصار اس لئے کیا کیونکہ پہلے گزر کے درمیان اتفاق رہے کہ دو شیطان ہوتے ہیں۔

''**فليؤمرو احدهم**'': ''شرح السنة'' میں لکھا ہے کہ اس کا حکم ان کو اس لئے دیا ہے تا کہ ان کے درمیان اتفاق رہے کوئی اختلاف واقع نہ ہو کہ جس سے وہ اکتا جائیں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ دو آدمی جب اپنے درمیان کسی معاملے میں کسی کو ''حکم'' مقرر کر دیں اور وہ حکم ان کے درمیان برحق فیصلہ کرے تو اس کا حکم نافذ ہوگا۔

اس حدیث کو احمد، مسلم اور نسائی نے ابوسعیدؓ سے یوں روایت کیا ہے:

وان كانوا ثلاثة فليؤمهم احدهم واحقهم بالامامة اقرؤهم

''جب وہ تین ہوں تو اپنے میں سے افضل شخص ان کو امامت کرائے اور ان میں امامت کا زیادہ حقدار ان میں سے بڑا قاری ہے۔'' [أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۶۴ الحديث رقم (۲۸۹-۶۷۲) واحمد فی المسند ۳/۳۴]

اور مسند بزار میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے یوں منقول ہے:

''اذا سافرتم فليؤمكم اقرؤكم وان كان اصغركم واذا أمكم فهو أميركم''۔

[كشف الأستار ٢/٢٦٦، الحديث رقم ١٦٧١]

سفر کے ساتھیوں کی بہترین تعداد کا بیان

٣٩١٢:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :خَيْرُ الصَّحَابَةِ اَرْبَعَةٌ وَخَيْرُ السَّرَايَا اَرْبَعُمِائَةٍ وَخَيْرُ الْجُيُوْشِ اَرْبَعَةُ الآفٍ وَلَنْ يُغْلَبَ عَشَرَ اَلْفًا مِنْ قِلَّةٍ۔

(رواه الترمذی وابوداود والدارمی وقال الترمذی هذا حديث غريب)

اخرجه أبو داود فی السنن ٣ / ٨٢' الحديث رقم ٢٦١١' والترمذی فی ٤ / ٥٠' الحديث رقم ١٥٥٥' والدارمی' كتاب السير' باب فی خير الاصحاب ٢ / ٢٨٤' الحديث رقم ٢٤٣٨

ترجمه: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''(کسی سفر کے) بہترین ساتھی اور رفقاء وہ ہیں جو (کم سے کم) چار کی تعداد میں ہوں' چھوٹے لشکروں میں بہترین لشکر چار سو (مجاہدین) کا ہے اور بڑے لشکروں میں بہترین لشکر بارہ ہزار (مجاہدین) کا ہے اور بارہ ہزار (مجاہدین) کا لشکر کم ہونے کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے''۔(ترمذی'ابوداؤد'دارمی)

اسنادی حیثیت :امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔**قوله: خير الصحابة اربعة۔**

تشریح: ''**صحابة**'':''**صاحب**'' کی جمع ہے۔اس کے علاوہ کسی بھی ''**فاعل**'' کے وزن کی جمع ''**فعالة**'' کے وزن پر نہیں آتی (النہایہ)

''**أربعة**'':یعنی جو تین سے زائد ہوں۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سفر کے ساتھی چار ہوں تو وہ تین سے بہتر ہیں۔اس میں متعدد فوائد ہیں:

پہلا فائدہ: کہ اگر تین ہوں گے اور ان میں سے ایک بیمار پڑ گیا اور ان دو میں سے ایک اپنی وصیت کا ارادہ کرے تو وہاں ایسا شخص نہیں ہوگا جو اس وصیت کے اجراء پر گواہی دے۔مگر ایک آدمی باقی ہوگا تو یہ کافی نہیں ہے۔اگر وہ چار ہوں گے تو پھر دو آدمیوں کی شہادت کافی ہوگی۔

دوسرا فائدہ: جب جماعت کے شرکاء زیادہ ہوں گے تو ان میں سے بعض بعض کی بطریق اتم معاونت و مدد کر سکیں گے۔

تیسرا فائدہ: بڑی جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی افضل ہے۔پس پانچ آدمی چار سے بہتر ہیں۔افراد کثیرہ پر مشتمل جماعت اپنے سے کم افراد پر مشتمل جماعت سے بہتر ہے۔

چوتھا فائدہ: امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ مسافر کے پاس عام طور سے سامان ہوتا ہے جس کی حفاظت کا محتاج ہوتا ہے۔بعض ضروریات کیلئے آگے پیچھے بھی جانا پڑتا ہے اور اگر تین ہوں گے تو ایک آدمی ادھر اُدھر کے کام کرے گا۔چنانچہ یہ ''کارکن'' بغیر کسی رفیق کے ہوگا اور تنہا آدمی کو خطرہ بھی ہوتا ہے اور اس اکیلے پن کی وجہ سے دلی گھٹن بھی ہوتی ہے اور اگر کسی کام کی غرض

سے دو افراد چلے جائیں گے تو سامان کے پاس اکیلا آدمی رہ جائے گا۔

قوله: ولن يغلب عشر الغامن قلة:

''يغلب'': مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے چاروں جملوں میں چار کا عدد آیا ہے اور بارہ بھی چار کا ضعف ہے۔ (اضعاف ہیں) اس سے قوت اور شدت کی طرف اشارہ ہے۔ ان (چاروں) کی سختی اور قوت کو عمارت کے ستون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

''من قلّة'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر مغلوب ہو گئے تو یہ مغلوبیت کسی قلّت کی بناء پر نہیں ہوگی۔ بلکہ کسی اور وجہ سے مغلوب ہوں گے۔ یہ کم نہیں ہوں گے اور دشمن بے شمار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان اثلاث میں ہر ایک لشکر کا مقابلہ میمنہ، یا میسرۃ یا قلب کے ساتھ ہو۔ تو وہ اس کو کافی ہونا چاہیے اور اس لئے کہ بڑے لشکر میں لڑنے والے ان کے بعض ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ سارے لڑنے والے ہیں اور اسی سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یوم حنین کے موقع پر کہا تھا جبکہ یوم حنین کے موقع پر صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد بارہ ہزار تھی ''آج ہم قلت اور کمی کی وجہ سے ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے، وہ اعجاب کی وجہ سے مغلوب ہو گئے۔

﴿إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا﴾ [التوبة۔ ۲۵] دس ہزار اہل مدینہ سے تھے اور دو ہزار فتح مکہ والوں میں سے تھے تخریج وتوضیح: اور جامع کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''**ولا تهزم اثنا عشر الفًا من قلةٍ**''۔

دورانِ سفر ضعیف کی رعایت کا بیان

۳۹۱۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَلَّفُ فِي الْمَسِيْرِ فَيُزْجِي الضَّعِيْفَ، وَيُرْدِفُ وَ يَدْعُوْ لَهُمْ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۱۰۰ كتاب الجهاد، باب في الزوم الساقة، الحديث رقم ۲۶۳۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سفر کے دوران) چلتے وقت (تواضع وانکسار کی وجہ سے اور دوسروں کی مدد وخبر گیری کے پیش نظر قافلے سے) پیچھے رہا کرتے تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمزور (کی سواری) کو ہانکا کرتے تھے (تاکہ وہ ہمراہیوں کے ساتھ مل جائے) اور (جو کمزور وضعیف شخص سواری سے محروم ہونے کی وجہ سے پیدل چلتا ہوتا) اس کو اپنے (ساتھ سوار پر) پیچھے سوار کر لیتے اور ان (قافلہ والوں) کے لئے دعا کرتے رہتے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: كان رسول اللهؐ يتخلف في الميسر ......:**

''فيزجي'': ''یاء'' کے ضمہ ''زاء'' کے سکون اور ''جیم'' کے کسرہ ساتھ ہے۔

''يردف'': ''ارداف'' باب افعال سے ہے۔

دورانِ سفر پڑاؤ ڈالنے کا بیان

۳۹۱۴: وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ قَالَ : كَانَ النَّاسُ اِذَا نَزَلُوْا مَنْزِلاً تَفَرَّقُوْا فِی الشِّعَابِ وَالْاَوْدِيَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ :اِنَّ تَفَرُّقَكُمْ فِیْ هٰذِهِ الشِّعَابِ وَالْاَوْدِيَةِ اِنَّمَا ذٰلِكُمْ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَلَمْ يَنْزِلُوْا بَعْدَ ذٰلِكَ مَنْزِلاً اِلاَّ انْضَمَّ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ، حَتّٰى يُقَالَ لَوْ بُسِطَ عَلَيْهِمْ ثَوْبٌ لَعَمَّهُمْ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ٣ / ٩٤، کتاب الجهاد، باب ما یؤمر من انضمام العسکر، الحدیث رقم ٢٦٢٨، وأحمد فی المسند ٤ / ١٩٣

ترجمہ: ''اور حضرت ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (پہلے عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ) لوگ (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم) جب کسی منزل پر پڑاؤ ڈالتے تو الگ الگ ہو کر پہاڑی دروں اور وادیوں میں پھیل جاتے تھے (یعنی کوئی کہیں اترتا اور کوئی کہیں) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس طریقہ کو ختم کرنے کے لئے فرمایا) کہ سمجھ لو تمہارا اس طرح ان دروں اور وادیوں میں الگ الگ ہو کر پڑاؤ ڈالنا محض شیطان کی طرف سے ہے (یعنی یہ شیطان کے فریب کے سبب سے ہے کہ وہ تمہیں الگ الگ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دشمن تم پر قابو پالے اور تمہیں نقصان و آزار پہنچائے)۔ اس (ارشاد کے) بعد لوگ جب بھی کسی منزل پر پڑاؤ ڈالتے تو آپس میں اتنا مل کر بیٹھتے کہ کہا جانے لگا کہ اگر ان سب پر ایک ہی کپڑا دیا جائے تو وہ سب کو ڈھانک لے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: كان الناس اذا نزلوا منزلا۔۔۔انما ذلكم من الشيطان:**

الشعاب: شین کے کسرہ کے ساتھ، ''شعب'' کی جمع ہے۔ ''شعب'' راستہ کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ پہاڑ میں بنے ہوئے راستہ کو کہتے ہیں۔

''**الأودية**'': ''وادی'' کی جمع ہے۔ دو پہاڑیوں کے درمیان میں پانی بہنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

ذلكم: کا مشار الیہ ''تفرق'' ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں (من الشیطان) ''انّ'' کی خبر کی جگہ پر آیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ﴾ [آل عمران: ١٥٥]

اور اس کی ترکیب ''باب الترديد للتعليق'' کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

لو مسها حجر مسته سراء

ای لو مسها حجر لسرته''۔ پس یہاں پر ''أنّ'' کی زیادتی تاکید اور طول کلام کے لئے ہے اور ''ما'' کافہ ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہوگی: ''**أن تفرقكم فی هذه الشعاب ذالكم من الشيطان**''۔

قوله: فلم ينزلوا بعد ذلك ......:

''**بسط**'': یہ مجہول کا صیغہ ہے۔

سفر میں رُفقاء کے ساتھ حسن سلوک کا بیان

۳۹۱۵:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ :كُنَّا يَوْمَ بَدْرٍ، كُلُّ ثَلَاثَةٍ عَلٰى بَعِيْرٍ، كَانَ اَبُوْ لُبَابَةَ وَعَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ زَمِيْلَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ :فَكَانَتْ اِذَا جَاءَ تْ عُقْبَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَا :نَحْنُ نَمْشِيْ عَنْكَ قَالَ :مَا اَنْتُمَا بِاَقْوٰى مِنِّي وَمَا اَنَا بِاَغْنٰى عَنِ الْاَجْرِ مِنْكُمَا۔

(رواه فی شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ١١ / ٣٥، الحديث رقم ٢٦٨٦، وأحمد فی المسند ١ / ٤٢٢

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بدر کے دن (یعنی جنگ بدر کے موقع پر ہماری یہ حالت تھی کہ) ہم میں سے ہر تین آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے'' (یعنی تین تین آدمیوں میں ایک اونٹ تھا کہ وہ تینوں باری باری ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے) اور ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے (اونٹ میں) شریک سفر تھے! حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ (صورت حال یہ تھی کہ) جب (اس اونٹ پر) رسول اللہ ﷺ کے (پیدل چلنے کی) باری آتی تو ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ عرض کرتے کہ آپ ﷺ کے بدلے ہم پیدل چلیں گے۔ (آپ ﷺ اونٹ پر ہی سوار رہیں) لیکن آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے کہ ''نہ تو تم (اس دنیا کی) مجھ سے زیادہ طاقت رکھتے ہو (کہ بس تم پیدل چلنے کی طاقت رکھتے ہو اور میں پیدل نہیں چل سکتا) اور نہ (آخرت کا) زیادہ ثواب حاصل کرنے میں تم سے بے نیاز ہوں (یعنی میں آخرت کے اجروثواب کا تم سے کم محتاج نہیں ہوں)۔''۔(شرح السنۃ)

تشریح: قوله: كنايوم بدر۔۔۔زميلى رسول اللهؐ

''زمیلی رسول اللّٰہ''، ''النہایہ'' میں ہے کہ زمیل سے مراد وہ ردیف ہے۔جس کو سوار کرایا جائے۔اس طور پر کہ آپ خود بھی اس پر سوار ہوں۔(کہا جاتا ہے) ''وقد زاملنی عادلنی'' وہ میرے پیچھے سوار ہوا اور ''زمیل'' رفیق (ساتھی) کو بھی کہتے ہیں۔

بعض شراح نے لکھا ہے کہ یہ دونوں آپ ﷺ کے ساتھ بار برداری کے اونٹ پر سوار تھے اور ''زاملة'' اس اونٹ کو کہتے ہیں جس پر مسافر اپنا کھانا اور سامان وغیرہ رکھتا ہے۔اھ

زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ''زمیل'' اس شخص کو کہتے ہیں جو آپ کے ساتھ ایک جانور پر باری باری سوار ہو اور یہ معنی مابعد کے قرینہ کی وجہ سے اَصح (معلوم ہوتا) ہے۔

قوله:و كانت اذا جاء عقبة ......:

''فکانت'' میں ضمیر مستر ''ضمیر قصہ'' ہے اور ایک نسخہ میں ''کان'' ہے۔ اس صورت میں یہ ''ضمیر شان'' ہوگی ''اذا جاء ت'' جبکہ ایک نسخہ میں ''اذا جآء'' ہے۔

''عقبة: عین کے ضمہ اور قاف کے سکون کے ساتھ ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں ''مشی'' استغناء کے معنی کو متضمن ہے۔ مطلب یہ کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چلنے سے مستغنی کر دیتے ہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلہ میں ہم پیدل چلتے ہیں۔

اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی تواضع وانکساری کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ کس قدر محبت فرماتے تھے اور اللہ کی طرف محتاجی کا بیان بھی ہے۔

سواری کے ساتھ حسن سلوک

۳۹۱۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَتَّخِذُوْا ظُهُوْرَ دَوَابِّكُمْ مَنَابِرَ، فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِنَّمَا سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُبَلِّغَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ، وَجَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فَعَلَيْهَا فَاقْضُوْا حَاجَاتِكُمْ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۵۹، کتاب الجهاد، باب الوقوف علی الدابة، الحدیث رقم ۲۵۶۷۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جانوروں کی پشت کو منبر نہ بناؤ (کہ ان پر سوار ہو کر ان کو روک کر باتیں کرنے لگو) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو محض اس لئے تمہارے لئے مسخر کیا ہے کہ وہ تمہیں ان شہروں اور علاقوں تک پہنچا دیں جہاں تم (پیدل چلنے کے ذریعہ) جانی مشقت ومحنت کے ساتھ ہی پہنچ سکتے تھے (یعنی جانوروں سے مقصود ان پر سواری کرنا اور ان کے ذریعہ اپنے مقصد کو حاصل کرنا ہے لہٰذا ان کو ایذا پہنچانا جائز نہیں ہے) اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہارے لئے (اسی غرض سے) پیدا کیا ہے لہٰذا تم اس پر اپنے کاموں اور اپنی حاجتوں کو پورا کرو''۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''**قوله: لاتتخذوا ظهور دوابكم منابر ...... الا بشق الانفس:**

یعنی ان کی پیٹھوں پر مت بیٹھو جبکہ وہ جانور کھڑے ہوں اور تم ان پر بیع وشراء وغیرہ کرتے رہو۔ بلکہ تم ان جانوروں سے نیچے اتر کر اپنی ضروریات کو پورا کرو۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''منابر'' کنایہ ہے جانور کھڑے ہونے سے۔ اس لئے کہ لوگ منبروں پر خطبہ کھڑے ہو کر دیتے ہیں اھ قیام سے مراد ''وقوف'' ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی ایسی ضرورت ہو جو زمین پر اتر کر پوری نہ ہو سکتی ہو تو ''**وقوف علی الراحلة**'' جائز ہے۔ نہی کا حکم صرف انہی صورتوں میں ہے کہ جب سواری کا بلاوجہ تھکنا لازم آتا ہو۔

اور حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عرفہ کے دن جانور کی پیٹھ پر وقوف سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ''**قیام علی الأقدام**'' کی بھی رخصت ہے۔

''لتبلغکم'': لام کے تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ منقول ہے۔

قولہ:'' وجعل لکم الارض فعلیھافاقضوا حاجاتکم '':

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں فاء بیان سبب کے لئے ہے اور دوسری فاء تعقیب کیلئے ہے۔ جب ایسا ہو کہ تمہیں ضرورت اور حاجت پیش آئے تو اپنی حاجات کو زمین پر اتر کر پوری کرلیا کرو اور ''فاقضوا حاجاتکم '' جملہ مقدرہ کیلئے تفسیر ہے۔

اس میں ''تخصیص'' کے ساتھ تاکید ہے اور ''حاجات'' کو جمع ذکر فرمایا اور پھر اس کی اضافت تمام مخاطبین کی طرف کردی تاکہ عموم کا فائدہ حاصل ہو جائے۔ مطلب یہ کہ اپنی مختلف قسم کی حاجات پوری کرنے کیلئے زمین کو خاص کرو اور ان مقامات تک پہنچانے کیلئے جن تک پہنچنا تمہارے لئے مشقت اور تکلیف کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ تمہیں جانور کافی ہوں گے۔

دورانِ سفر سواری کی راحت کا بیان

۳۹۱۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا اِذَا نَزَلْنَا مَنْزِلاً لاَ نُسَبِّحُ حَتّٰى نَحُلَّ الرِّحَالَ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۵۱ كتاب الجهاد، باب نزول المنازل، الحديث رقم ۲۵۵۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب ہم (دوران سفر یا سفر کے بعد) کسی منزل پر پڑاؤ ڈالتے تو اس وقت تک نفل نماز نہ ادا کرتے تھے جب تک کہ جانوروں (سے سامان) کا بوجھ نہ اتار لیتے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: '' نحل '': یہ لفظ نون کے فتحہ اور حاء کے ضم کے ساتھ ہے۔

اونٹوں کی پیٹھ سے بوجھ کو اتار دیتے تھے۔ ان پر شفقت اور نرمی کرتے ہوئے۔ ایسا کرنا دل جمعی کا سبب بھی ہے اور ایک نسخہ میں ''نحل'' صیغہ مجہول کے ساتھ مذکر و مؤنث دونوں طرح منقول ہے اور ''رحال'' پر رفع فاعلیت کا ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''التسبیح'' سے مراد صلاۃ الضحیٰ ہے اور مطلب یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ نماز کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ وہ نماز ادا نہ کرے وہ کے باوجود جانوروں سے سامان اتار کر انہیں راحت نہ پہنچا رہے ہے۔

سواری کے اگلے حصہ پر بیٹھنے کا حقدار کون؟

۳۹۱۸: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ: بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِيْ اِذَا جَاءَهُ رَجُلٌ مَعَهُ حِمَارٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ارْكَبْ وَتَأَخَّرَ الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا، اَنْتَ اَحَقُّ بِصَدْرِ دَابَّتِكَ، اِلَّا اَنْ تَجْعَلَهٗ لِيْ قَالَ: جَعَلْتُهٗ لَكَ فَرَكِبَ۔ (رواہ الترمذی وابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۶۲، الحديث رقم ۲۵۷۲، والترمذی، كتاب الادب، باب ما جاء ان الرجل، الحديث رقم ۲۷۷۳، و أحمد فی المسند ۵ / ۳۵۲

ترجمہ: ''اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک سفر میں) پیدل راستہ طے کر رہے تھے کہ اس دوران اچانک ایک شخص اپنے گدھے کے ساتھ (یعنی اس پر سوار) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ ''یا

رسول اللہ! (میرے گدھے پر) سوار ہو جایئے" اور (یہ کہہ کر) وہ شخص (گدھے کی پشت پر) پیچھے سرک گیا (تا کہ آپ ﷺ آگے بیٹھ جائیں) لیکن آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں (میں آگے نہیں بیٹھوں گا) کیونکہ (اپنی سواری کے) جانور پر آگے بیٹھنے کے تم ہی مستحق ہو مگر یہ کہ تم مجھے اس کا حقدار بنا دو (یعنی اگر چہ اس شخص کا پیچھے سرکنا اسی لئے تھا کہ گویا اس نے آپ ﷺ کو آگے بٹھانے کا حقدار بنا دیا تھا مگر آپ ﷺ نے کمال احتیاط کے پیش نظر اس پر واضح کیا کہ میں تمہاری سواری پر آگے اسی وقت بیٹھ سکتا ہوں جب کہ تم صریح الفاظ میں مجھ سے آگے بیٹھنے کے لئے کہو) اس شخص نے کہا کہ (میں صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ) آپ ﷺ کو میں نے اس کا حقدار بنا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ (اس کے اگلے حصہ پر) سوار ہو گئے"۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: قوله: "وتأخر الرجل"

اسکے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① وہ شخص گدھے کی پشت کی طرف سرک گیا۔

② وہ آدمی اپنے گدھے سے اتر کر پیچھے ہو گیا۔ آپ ﷺ کا ادب کرتے ہوئے۔ اس صورت میں یہ "تأخر" "تخلية" سے کنایہ ہوگا۔

قوله: "انت احق بصدر دابتك ......"۔

"صدر" سے مراد جانور کی گردن کے ساتھ ملا ہوا پیٹھ کا اگلا حصہ ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر "لا" کا فعل محذوف ہے **أی لا ارکب وحدی او لا أرکب فی الصدر** اور "**آنت حق**" نہ بیٹھنے کی علت ہے کہ میں اس طرح نہیں بیٹھتا کہ تم پیچھے ہو جاؤ۔ اس وجہ سے کہ تم آگے بیٹھنے کے زیادہ حقدار ہو۔ ہاں اس صورت میں بیٹھ سکتا ہوں کہ اگر تم صراحت کے ساتھ یہ کہہ دو کہ اگلے حصہ کو میں نے تمہارے لئے خاص کر دیا ہے۔

فوائد حدیث:

① اس حدیث سے آپ ﷺ کے انصاف آپ ﷺ کی تواضع وانکساری کا پتہ چلتا ہے۔

② آپ ﷺ حق کا اظہار فرمایا کرتے تھے اگر چہ وہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو چنانچہ آپ ﷺ نے پیچھے بیٹھنے پر رضا مندی ظاہر کی۔ حالانکہ غالب گمان یہی تھا کہ وہ پیچھے بیٹھنے پر راضی تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب تک اس نے صراحتاً نہیں کہا آپ ﷺ نہیں بیٹھے۔

شیطانی اُونٹوں، اور شیطانی گھروں کا بیان

۳۹۱۹: **وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِىْ هِنْدٍ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَكُوْنُ اِبِلٌ لِلشَّيَاطِيْنِ، وَبُيُوْتٌ لِلشَّيَاطِيْنِ، فَاَمَّا اِبِلُ الشَّيَاطِيْنِ فَقَدْ رَاَيْتُهَا! يَخْرُجُ اَحَدُكُمْ بِنَجِيْبَاتٍ مَعَهٗ قَدْ اَسْمَنَهَا، فَلَا يَعْلُوْا بَعِيْرًا مِنْهَا وَيَمُرُّ بِاَخِيْهِ قَدِ انْقَطَعَ بِهٖ فَلَا يَحْمِلُهٗ، وَاَمَّا بُيُوْتُ**

الشَّيَاطِيْنِ فَلَمْ اَرَهَا. كَانَ سَعِيْدٌ يَقُوْلُ: لَا اُرَاهَا اِلَّا هٰذِهِ الْاَ قْفَاصَ الَّتِىْ يَسْتُرُ النَّاسُ بِالدِّيْبَاجِ۔

(رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ٦٠ كتاب الجهاد' باب فى الجنائب' الحديث رقم ٢٥٦٨۔

ترجمہ: ''اور حضرت سعید بن ابو ہند (تابعی) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا (کچھ) اونٹ شیطان کے لئے ہوتے ہیں اور (کچھ) گھر شیطانوں کے لئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو اونٹ شیطانوں کے لئے ہوتے ہیں ان کو میں نے دیکھا ہے (جیسے) تم میں سے کوئی شخص عمدہ قسم کی اونٹنیوں کو لے کر نکلتا ہے جن کو اس نے خوب فربہ کیا ہوتا ہے لیکن وہ ان میں سے کسی اونٹ پر سوار نہیں ہوتا اور جب (کسی سفر میں) اپنے اس مسلمان بھائی کے ساتھ راستہ طے کرتا ہے جو (اپنی کمزوری اور سواری سے محرومی کی وجہ سے) چلتے چلتے تھک گیا ہے تو اس کو (بھی) اس اونٹ پر سوار نہیں کرتا اور جو گھر شیطانوں کے لئے ہوتے ہیں ان کو میں نے نہیں دیکھا''۔ حدیث کے راوی حضرت سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ گھر (جو شیطانوں کے لئے ہوتے ہیں) پنجے ہیں جن کو لوگ ریشمی کپڑوں (کے پردوں) سے ڈھانکتے ہیں''۔ (ابوداؤد)

راوئ حدیث:

سعید بن ابی ہند۔ یہ سعید بن ابی ہند ''سمرہ'' کے آزاد کردہ ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری' ابو ہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور نافع بن عمر جمعی روایت کرتے ہیں۔ یہ مشہور ثقہ راوی ہیں۔

قوله: يكون اهل للشياطين وبيوت للشطين:

تشریح: ''تکون'': صیغہ تانیث کے ساتھ ہے، اور دوسرے نسخہ میں صیغہ تذکیر کے ساتھ ہے۔

''ابل الشیاطین'': ان اونٹوں سے مراد وہ اونٹ ہیں جن کو تفاخر و تکاثر کیلئے تیار کیا گیا ہو اور اس سے کوئی امر مشروع مقصود نہ ہو اور نہ وہ اونٹ مراد ہیں جس کو کسی ایسی جگہ میں استعمال کیا جائے جس میں مقصود قربت ہو۔

''وبیوت للشیاطین'': (اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں) ایسے گھر ہوں گے جو بقدر حاجت و ضرورت سے زائد ہوں گے۔

② اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے گھر ہوں گے جو مال حرام سے بنائے گئے ہوں گے۔ جو مکان ریاکاری کے لئے تعمیر کئے گئے ہوں آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی یہیں تک ہے اگلا کلام راوی کا ہے۔

قوله: فأمل اهل الشاطين...... فلايحمله:

''یخرج احدکم'': یہ ''جملہ مستانفہ بیانیہ'' ہے۔

''نجیبات'': ''نجیبة'' کی جمع ہے۔ ''عمدہ اونٹنی'' کو کہتے ہیں اور ''النہایہ'' میں ہے ''النجیب'' مضبوط اور طاقتور

اونٹ کو کہتے ہیں جو ہلکا اور تیز رفتار ہو۔

''قد انقطع به'': یہ صیغہ مجہول کا ہے۔ اس سے ''انقطاع سیر'' مراد ہے۔ ضمیر ''للرجل منقطع'' کی طرف راجح ہے اور ''بہ'' اس کا نائب فاعل ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔

اور یہ اس لئے کہ جانور تو ''انتفاع'' کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ تا کہ اس سے سواری کا فائدہ اٹھایا جا سکے اور اس پر سامان لادا جائے۔ پس جب اس پر بوجھ نہ لاد سکے۔ اس طور پر کہ وہ راستے میں تھک جائے۔ پس اس نے شیطان کی اطاعت وفرمانبرداری کی۔ منع انتفاع میں۔ پس گویا کہ یہ اونٹ ''شیطان'' کا ہوا۔

قوله: ''وأما بيوت الشياطين فلم ارها'': حضرت ابو ہریرہؓ کا کلام یہیں تک تھا۔ اگلا کلام حضرت سعیدؒ کا ہے۔

قوله: كان سعيد يقول لاألا ها ......:

سعید بن ابی ہند تابعی ہیں جو اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں۔

''لا أراها'' یہ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ای لا أظنها اور ایک نسخہ میں ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ أی لا أعلمها۔

''يستر'': ایک نسخہ میں لفظ ''يسترها'' ہے۔

یعنی ریشم وغیرہ کے عمدہ کپڑوں کے ساتھ ڈھانپتے ہیں اور بظاہر یہ نہی بالذات نہیں ہے بلکہ اس ریشم کے ساتھ پردہ لٹکانا اور فخر وریاء کے لئے ایسے پردے ہوادج پر لٹکانا ممنوع ہیں۔

قاضی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ صحابی نے اس نوع کے اونٹ کی قسم کو متعین کر دیا کہ وہ ''نجيبات'' ہے۔ یعنی موٹے تازے اونٹ ہیں جن کو آدمی اپنے ساتھ سفر میں لے جاتا ہے لیکن وہ اس پر سوار نہیں ہوتا اور نہ ہی سامان اٹھانے کیلئے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر وہ اپنے ایک مسلمان بھائی کے پاس سے گزرتا ہے جو کمزوری اور عجز کی وجہ سے اپنا سفر جاری رکھنے سے قاصر ہے لیکن یہ اس کو اپنے اونٹ پر سوار نہیں کراتا اور تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان ''بیوت'' کی نوع کو بیان کر دیا اور اس سے مراد ریشم کے ساتھ مزین کجاوے ہیں۔ جن کو اکثر ''متکبرین'' لوگ اپنے سفر میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ اھ

عرضِ مرتب:

اشرفؒ کے کلام کا حاصل ہے کہ ''فلم أرها'' تک سارا کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے م۔ ملا علی قاری نے یہاں کافی طویل کلام کیا ہے۔ اس کا خلاصہ اتنا ہی ہے جو اشرفؒ کے حوالہ سے ذکر کیا۔

راستہ کو تنگ کرنا

٣٩٢٠: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَضَيَّقَ النَّاسُ الْمَنَازِلَ وَقَطَعُوا الطَّرِيْقَ، فَبَعَثَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنَادِيًا يُنَادِىْ فِى النَّاسِ: اِنَّ مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلاً اَوْقَطَعَ طَرِيْقًا فَلَا جِهَادَ لَهٗ. (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ٣ / ٩٥، كتاب الجهاد، باب ما يؤمر من انضمام العسكر ‘ الحديث رقم ٢٦٢٩،

وأحمد فی المسند ٣ / ٤٤١

ترجمه: ''اور حضرت سہل بن معاذ اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ''ایک مرتبہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں گئے (اور منزل پر قیام کیا) تو لوگوں نے (اس) منزل کی (ساری جگہوں) کو تنگ کر دیا اور راستہ کو کاٹ دیا (یعنی بعض لوگوں نے بلا ضرورت یا ضرورت سے زیادہ جگہوں پر قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو تو جگہ کی تنگی ہوگئی اس طرح راستہ بھی تنگ ہو گیا جس سے آنے جانے والوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ (یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے ایک منادی کرنے والے کو لوگوں کے درمیان بھیج کر یہ اعلان کرایا کہ ''جس شخص نے منزل کی (جگہوں) کو تنگ کیا یا راستے کو کاٹا تو (لوگوں کو ضرر و تکلیف پہنچانے کی وجہ سے) اس کا کوئی جہاد (یعنی کامل جہاد) نہیں (یعنی اس کو جہاد کا اجر و ثواب نہیں دیا جائے گا۔'' (ابوداؤد)

تشریح: **قوله:غزوه نامع النبیؐ** ......:

''**نبی الله** ﷺ'': دوسرے نسخہ میں ''**رسول الله** ﷺ'' ہے۔

''**ینادی فی الناس**'': یہ حال ہے۔ یا جملہ مستانفہ ہے۔

''**ان**'': ہمزہ کے فتحہ ساتھ ہے۔ البتہ کسرہ بھی جائز ہے۔

توضیح و تخریج: اور ''جامع صغیر'' میں یہ زیادتی ہے: **او آذی مؤمناً** اور فرمایا کہ اس کو ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

سفر سے واپسی پر گھر میں داخل ہونے کا بہترین وقت

٣٩٢١: **وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :اِنَّ اَحْسَنَ مَا دَخَلَ الرَّجُلُ اَهْلَهُ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ اَوَّلُ الَّيْلِ۔** (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن' ٣ / ٢١٨ كتاب الجهاد' باب فی الطروق' الحديث رقم ٢٧٧٧۔

ترجمه: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سفر سے واپس آنے والے مرد کے لئے اپنے گھر والوں کے پاس پہنچنے کا بہترین وقت رات کا ابتدائی حصہ ہے''۔

(ابوداؤد)

تشریح: واضح رہے کہ روایات باب باہم متعارض ہیں ماقبل میں حضرت جابرؓ کی روایت گذری: **اذا طال أحد كم الغيبة فلا يطرق أهله ليلاً** اور حدیث باب آپ کے سامنے ہے پہلی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت اہل خانہ کے پاس نہ آئے اور اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفر سے واپس لوٹنے والے شخص کیلئے اپنے اہل خانہ کے پاس آنے کا بہترین وقت رات کا ابتدائی حصہ ہے۔ اس تعارض کے کئی جواب دیئے گئے ہیں۔

الفصل الثالث:

دورانِ سفر آرام کرنے کا بیان

۳۹۲۲: عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ فِیْ سَفَرٍ فَعَرَّسَ بِلَيْلٍ اِضْطَجَعَ عَلٰی يَمِيْنِهٖ وَاِذَا عَرَّسَ قُبَيْلَ الصُّبْحِ نَصَبَ ذِرَاعَهٗ وَوَضَعَ رَأْسَهٗ عَلٰی كَفِّهٖ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱ / ۴۷۶، الحديث رقم (۳۱۳ ـ ۶۸۳) وأحمد فی المسند ۵ / ۳۰۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر میں ہوتے تو (کسی جگہ پر) رات کے آخری حصہ میں (یعنی طلوع سحر سے پہلے) پڑاؤ ڈالتے اور دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے (تاکہ جسم کو راحت ہو جائے) اور جب صبح (یعنی طلوع فجر) سے کچھ پہلے پڑاؤ ڈالتے تو اپنا (داہنا) ہاتھ کھڑا کر کے اس کی ہتھیلی پر اپنا سر رکھ کر لیٹ جاتے (یعنی کچھ دیر کے لئے اس انداز میں آرام فرماتے تاکہ نیند غالب نہ آ جائے''۔) (مسلم)

توضیح و تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ، ابن حبان اور حاکمؒ نے حضرت ابوقتادہؓ سے اس طرح روایت کیا ہے:

تشریح: ''كان اذا عرّس وعليه ليل توسّد يمينه واذا عرس قبل الصبح وضع رأسه علٰى كفه اليمنٰى واقام ساعده''۔ (الحاكم فی المستدرک ۱/۴۴۵)

سفر جہاد کے ثواب کا بیان

۳۹۲۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: بَعَثَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ فِیْ سَرِيَّةٍ، فَوَافَقَ ذٰلِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَغَدَا اَصْحَابُهٗ، وَقَالَ: اَتَخَلَّفُ وَاُصَلِّیْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ اَلْحَقُهُمْ، فَلَمَّا صَلّٰی مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰهُ، فَقَالَ: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَغْدُوَ مَعَ اَصْحَابِكَ؟ فَقَالَ: اَرَدْتُّ اَنْ اُصَلِّیَ مَعَكَ ثُمَّ اَلْحَقَهُمْ فَقَالَ: لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَا اَدْرَكْتَ فَضْلَ غَدْوَتِهِمْ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲ / ۴۰۵، الحديث رقم ۵۲۷، وأحمد فی المسند ۱ / ۲۲۴

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو (جہاد) کے لئے ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ روانہ کیا، اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا (جس میں) آپ ﷺ نے ان کو جہاد میں جانے کا حکم دیا تھا) چنانچہ ان کے ساتھی (یعنی لشکر کے لوگ) صبح کے وقت روانہ ہو گئے لیکن عبداللہ نے (اپنے دل میں سوچا یا کسی ساتھی سے) کہا کہ ''میں بعد میں روانہ ہوں گا میں (پہلے یہاں مدینہ میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کروں گا پھر لشکر والوں سے جا ملوں گا۔ جب عبداللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جمعہ کی نماز ادا

کر چکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا (کہ وہ ابھی یہاں ہی موجود ہیں) تو فرمایا کہ تمہیں صبح کے وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانے سے کس چیز نے روکا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ چاہا کہ میں (جمعہ کی) نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کروں اور پھر اپنے ساتھیوں سے جاملوں"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا "اگر تم روئے زمین پر موجود ساری چیزوں کو بھی خرچ کردو تو صبح کے وقت جانے والے اپنے ساتھیوں کے برابر ثواب حاصل نہیں کر سکتے"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: بعث النبیؐ عبد الله بن رواحة ......:

" **الحقهم** ": نصب کے ساتھ نقل ہے۔

" **غدوتهم** ": غین کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بظاہر اس طرح کہنا چاہیے تھا: **غدو تهم أفضل من صلاتك هذه** کہ ان کا جانا آپ کی اس نماز کے پڑھنے سے افضل و بہتر ہے۔ اس عدول کا مقصود مبالغہ میں زیادتی ہے گویا کہ اس طرح کہا گیا: **لا يوازيها شئ من الخيرات** کہ کوئی بھی بھلائی اس کا موازنہ نہیں کرسکتی۔ چونکہ تاخیر سے بسا اوقات بہت ساری مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ایک حدیث میں آیا ہے: "**لغدوة في سبيل الله او روحة خير من الدنيا وما فيها**"۔

چیتے کی کھال اور ملائکہ کی مصاحبت

۳۹۲۴: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيْهَا جِلْدُ نَمِرٍ۔** (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ٤ / ٣٧٢ كتاب اللباس، باب في جلود النمر، الحديث رقم ٤١٣٠۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس قافلے میں چیتے کی کھال ہو اس کے ساتھ (رحمت کے) فرشتے نہیں ہوتے (یعنی چیتے کی کھال پر سوار کو بیٹھنا یا اس کو استعمال کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس سے تکبر کی شان پیدا ہوتی ہے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: "**رفقة**": "قاموس" میں ہے کہ "رفقة" کی راء پر تینوں حرکات درست ہیں۔

"**نمر**": نون کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

"النہایہ" میں ہے کہ چیتے کی جلد پر بیٹھنے سے منع کیا۔ (اس ممانعت کے کئی اسباب ہیں۔)

① کہ اس کے استعمال میں زینت و تکبر ہے۔

② یہ عجمیوں کی زینت و لباس ہے۔

③ اس کے بال بعض ائمہ کرام کے ہاں دباغت کو قبول نہیں کرتے۔ چوں کہ ان کا شکار نہایت ہی مشکل کام ہے اس لئے ان کی کھال عام طور پر ان کے مرنے کے بعد ہی اتاری جاتی ہے۔

فائدہ:ابن ماجہ نے ابوریحانہؓ سے نقل کیا ہے:

''أنه علیه الصلٰوۃ والسلام نهی عن رکوب النمور''بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد معروف جانور ہیں۔

دورانِ سفر خدمت کی فضیلت کا بیان

۳۹۲۵:وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيِّدُ الْقَوْمِ فِی السَّفَرِ خَادِمُهُمْ فَمَنْ سَبَقَهُمْ بِخِدْمَةٍ لَمْ يَسْبِقُوْهُ بِعَمَلٍ اِلَّا الشَّهَادَةَ۔ رواہ البیهقی فی شعب الا یما ن

اخرجه البیهقی فی شعب الإیمان ٦ / ٣٣٤' الحدیث رقم ٨٤٠٧

ترجمہ:''اور حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جماعت کا امیر وسردار سفر کے دوران ان کا خادم ہے۔لہٰذا جو شخص ان (سفر کرنے والوں) کی خدمت میں سبقت لے گیا تو اس کے مقابلہ میں کوئی شخص شہادت کے علاوہ اور کسی عمل کے ذریعہ سبقت نہیں لے جا سکتا''۔(بیہقی)

تشریح: قوله:''سيد القوم فی السّفر خادمهم'':طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

پہلا مطلب:سردار کو ایسا ہونا چاہیے،اس لئے کہ سردار پر قوم کی مصالح کا خیال اور ان کے اموال ظاہری و باطنی کی رعایت رکھنا واجب ہے۔

حکایت:عبداللہ المروزی سے منقول ہے کہ ایک دن''ابوعلی رباطی''ان کے رفیق سفر ہوئے تو آپ نے ابوعلی سے کہا:آپ امیر ہیں یا میں؟ تو انہوں نے کہا کہ تم امیر ہو۔چنانچہ اس وقت سے انہوں نے اپنا توشہ اور ابوعلی کا ساز وسامان اپنی کمر پر مسلسل اٹھائے رکھا۔دوران سفر رات کو بارش ہوئی تو عبداللہ پوری رات اپنے ساتھی کے سر پر چادر تانے کھڑے رہے کہ کہیں ابوعلی بھیگ نہ جائیں اور جب کبھی بھی وہ ان کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتے کہ ایسا مت کرو۔تو عبداللہ جواب میں کہتے کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ''امارت''تمہارے حوالہ ہے؟ تو اب تم میرے خلاف فیصلہ مت کرو۔یہاں تک کہ ابوعلی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ کاش میں مر جاتا لیکن ان کو امیر نہ بناتا۔

دوسرا مطلب:اس میں خبر دی گئی ہے کہ جو شخص قوم کی خدمت کرے گا اگرچہ بظاہر وہ ان میں سب سے ادنیٰ شخص ہو لیکن درحقیقت سردار وہی ہے اور اس کو اپنے اس عمل کی وجہ سے ثواب بھی دیا جائے گا۔ثواب کا بیان اگلے جملہ میں آ رہا ہے۔

قوله:''فمن سبقهم بخدمةٍ لم یسبقوہ بعمل الا الشهادہ'':

یہ اس لئے ہے کہ وہ بواسطہ خدمت ان کے تمام اعمال خیر میں ان کا شریک ہے۔

توضیح وتخریج:اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابوقتادہ سے اور خطیب نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح نقل کیا ہے:

''سید القوم خادمهم''البتہ ابونعیم نے''اربعین صوفیہ''میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اتنا اضافہ نقل کیا ہے:

''وساقیهم اخرهم شرابًا''اس کو امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے''جامع صغیر''میں بھی ذکر کیا ہے۔

بَابُ الْكِتَابِ اِلَى الْكُفَّارِ وَدُعَائِهِمْ اِلَى الْاِسْلَامِ

کفار کو خطوط لکھنے اور ان کو اسلام کی دعوت دینے کا بیان

''الکتاب'' مصدر ہے۔''مکاتبة ''یا''مکتوب'' کے معنی میں ہے۔روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''بادشاہ روم'' کی طرف خط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا گیا کہ اہل روم صرف مہر شدہ خط پڑھتے ہیں۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی مہر بنوائی اس میں تین نقش تھے:''محمد''۔''رسول''''اللہ''۔

پھراس کے بعد سے خطوط پر یہی مہر ثبت فرمانے لگے اہل روم صرف مہر شدہ خطوط پڑھتے تھے کہ کہیں راز کھل نہ جائیں اور یہ شدت اہتمام اس وجہ سے بھی تھا تا کہ ان کے پیش آمدہ حالات کو کوئی نہ جان سکے۔

منقول ہے:(كَرَامَةُ الْكِتَابِ خَتْمُهُ)''خط کی عزت اس کی مہر سے کی جاتی ہے''۔

امام طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

ختم کتا ب السلطان و القضاة سنة متبعة

''بادشاہ اور قاضی کا تحریر'' مہر لگانا سنت متبعہ ہے'' اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت فعلی ہے۔

الفصل الاول :

قیصر روم کی طرف مکتوب نبوی

۳۹۲۶:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَتَبَ اِلٰی قَيْصَرَ يَدْعُوْهُ اِلَى الْاِسْلَامِ وَبَعَثَ بِكِتَابِهٖ اِلَيْهِ دِحْيَةَ الْكَلْبِیَّ، وَاَمَرَهٗ اَنْ يَدْفَعَهٗ اِلٰی عَظِيْمِ بُصْرٰی لِيَدْفَعَهٗ اِلٰی قَيْصَرَ، فَاِذَا فِيْهِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰی هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی، اَمَّا بَعْدُ، فَاِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِدَاعِيَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ وَاَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، وَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْاَرِيْسِيِّيْنَ وَ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (متفق علیه وفی روایة مسلم) قَالَ :مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَقَالَ اِثْمُ الْيَرِيْسِيِّيْنَ وَقَالَ:بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ۔ (رواه البخاری ومسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١ / ٣١، کتاب بدؤ الوحی، باب٦، الحدیث رقم ٧ و مسلم فی ٣ / ١٣٩٣،

الحدیث رقم (٧٤ ـ ١٧٧٣) وأحمد فی المسند ١ / ٢٦٣

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم (یعنی روم کے بادشاہ) کوایک گرامی نامہ لکھا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اسلام کی دعوت دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وہ گرامی نامہ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ (صحابی) کے ہاتھ روانہ فرمایا اوران کو یہ حکم دیا کہ وہ اس گرامی نامہ کو بصریٰ کے حاکم کے پاس پہنچادیں تا کہ وہ حاکم بصریٰ اس کو قیصر کے پاس پہنچادیں۔اس گرامی نامہ میں یہ لکھا تھا۔بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ محمد کی جانب سے جو خدا کا بندہ خاص اور رسول ہے۔ ہرقل کے نام جو روم کا حکمران اعلیٰ ہے۔اس پر سلامتی ہو (جو قبولیت اسلام اور اپنے نیک کردار واعمال کے ذریعہ) ہدایت کا پیرو ہے۔ بعدازاں میں آپ کو اسلام کلمہ شہادت کی دعوت دیتا ہوں آپ اسلام قبول کرلیجئے' (دنیا کے اور آخرت کے عذاب سے) محفوظ و مامون رہیں گے آپ مسلمان ہو جایئے اللہ تعالیٰ آپ کو دوبار اجر عطا فرمائے گا (کہ ایک اجر تو اپنے نبی علیہ السلام پر ایمان لانے کا اور ایک اجر مجھ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کا) اور اگر آپ منہ پھیریں گے (یعنی اسلام قبول نہیں کریں گے) تو آپ کو واضح رہنا چاہئے کہ اس انکار واعراض کی وجہ سے آپ پر صرف اپنے ہی گناہ کا وبال نہیں ہوگا بلکہ آپ کے ملک والوں اور آپ کی رعایا کا گناہ (بھی) آپ پر ہوگا (کیونکہ آپ کے اسلام نہ لانے سے وہ بھی کفر میں مبتلا رہیں گے اس لئے ان کی گمراہی کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر ہوگی) اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں اور مشترک ہے (یعنی اس کلمہ اور دین میں ہمارے اور تمہارے رسولوں اور کتابوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور وہ کلمہ ودین یہ ہے) کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا رب نہ بنائے (جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنالیا ہے) پس اگر وہ (اہل کتاب اس بات کو قبول کرنے سے) روگردانی کریں تو (اے مؤمنو) تم یہ اعلان کرادو کہ (اے کافرو!) گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں''۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک اور روایت میں مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ کی جگہ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰہِ ہے اور اِثْمُ الْاَرِیْسِیِیْنَ کی جگہ اِثْمُ الْیَرِیْسِیِّیْنَ ہے اور بِدَاعِیَۃِ الْاِسْلَامِ کی جگہ بِدِعَایَۃِ الْاِسْلَامِ ہے۔

تشریح: قولہ: ان النبیؐ کتب الی قیصر بداعیة الی الاسلام:

''قیصر'': غیر منصرف ہے۔روم کے تمام بادشاہوں کا لقب تھا اور ''کسریٰ'' فارس کے بادشاہ ''نجاشی'' حبشہ کے بادشاہ، ''خاقان'' ترک کے بادشاہ ''فرعون'' قبطیوں کے بادشاہ، ''عزیز'' مصر کے بادشاہ، اور ''تبع'' حمیر کے بادشاہ کا لقب تھا۔اس کو امام نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

''**یدعوه الی الاسلام**'': یہ جملہ مستانفہ ہے۔یا حال ہے۔

قولہ: ''وبعث بکتابہ الیہ دحیة الکلبی'':

''دحیہ'' کی تحقیق ''دحیة'' دال کے کسرہ حاء مہملہ کے سکون اور یاء کے ساتھ منقول ہے۔اکثر اصحاب حدیث اور اہل لغت اسی طرح روایت کرتے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ یہ دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔البتہ ''شرح مسلم'' میں ہے کہ ''دحیة'' میں دال کے کسرہ اور فتحہ دونوں ساتھ مشہور لغتیں ہیں۔البتہ راجح میں اختلاف ہے۔علامہ ابن السکیت رحمہ اللہ وغیرہ کا دعویٰ ہے

کہ یہ لفظ بالکسر ہے۔اس کے علاوہ صحیح نہیں ہے۔جبکہ ابو حاتم السجستانی رحمۃ اللہ علیہ کا دعویٰ بالفتح کا ہے اور المغنی میں ''دحية'' دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔جبکہ ابن ماکولا کے ہاں فتح کے ساتھ ہے۔یہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور ''القاموس'' میں بھی کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ منقول ہیں۔

قوله:مائره ان يدفعه۔۔۔الى هر قل عظيم الروم:

''**عظیم بصری**'': یہ لفظ باء کے ضم اور ''ص'' کے سکون اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور مراد اس سے اس کا امیر ہے۔ اس شہر کا نام ''حوران'' تھا۔یہ قلعوں والا شہر تھا۔شام اور حجاز کے درمیان خشکی کے قریب واقع تھا۔

فاذا فيه: ''**فاذا**'' یہ اذا مفاجاۃ کیلئے ہے اور فیہ کی ضمیر ''کتاب'' کی طرف راجع ہے۔

من محمد: اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① یہ خط محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔② محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سلام ہو۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**من محمد**'' فعل محذوف ''صدر'' کے ساتھ متعلق ہے۔ای صدر مِنْ محمدٍ۔

''**عبد الله**'' لفظ محمد کی صفت ہے۔یا لفظ محمد سے بدل ہے۔لیکن عطف بیان کہنا درست نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مشہور ہے۔بنسبت ''عبداللہ'' کے۔

''**عبدالله ورسوله**'' دونوں کو جمع فرمایا چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمال عبودیت اور جمال رسالت دونوں کے ساتھ متصف ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامل اور مکمل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کو اس ذات کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں جن کی عبادت کیلئے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔نیز تعریض ہے کہ نصاریٰ نے اپنے دین اور نبیوں کے بارے میں غلو سے کام لیا۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ **بسم الله** اور مکتوب عنہ کے نام سے شروع کرنا خط وکتابت کے آداب میں سے ہے۔ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے: ﴿**انه من سليمان وانه بسم الله الرحمٰن الرحيم**﴾ [النحل: ۳۰] اور ''واؤ'' مطلق جمع کیلئے ہے۔بعض نے کہا ہے کہ ''**انه من سليمان**'' خط کا عنوان جبکہ ''**بسملة**'' خط کے اندر داخل تھا۔

''**هرقل**'': ''ھاء'' کے کسرہ، راء کے فتحہ اور قاف کے سکون کے ساتھ ہے غیر منصرف ہے اور ایک نسخہ میں دونوں کے کسرہ کے ساتھ ہے۔مؤخر الذکر ضبط کو علامہ جوہری نے اپنی صحاح میں ذکر کیا ہے۔لیکن پہلا زیادہ مشہور و معروف ہے۔علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کے کہنے کے مطابق۔ہرقل اس زمانہ کے روم کے بادشاہ کا نام تھا اور ''قیصر'' روم کے تمام بادشاہوں کا لقب تھا اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

''**عظيم الروم**'': ہرقل کا بدل ہے۔یا عطف بیان ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''**ملك الروم**'' نہیں لکھا کہ اس بات کا تقاضا یہ تھا کہ بادشاہت ہمارے سپرد کر دی جائے، چونکہ وہ دین کی وجہ سے اس بادشاہت سے معزول ہے۔البتہ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم'' نے اس کی بے اکرامی بھی نہیں کی، کہ اس کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

قوله:لا سلام''على من اتبع الهدٰى'':

یعنی جس نے اسلام اور دیانت کی اتباع کی۔ یہ کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے اقتباس ہے: والسلام علی من اتبع الهدیٰ] اس میں اشارہ ہے کہ غیر مسلم کو ابتداء بالسّلام تو جائز نہیں ہے۔ البتہ کنایۃً سلام جائز ہے۔

قوله: أما بعد۔۔۔اجرك مرتين: ''أمّا بعد'' یہاں مضاف الیہ محذوف ہے؛ أی بعد اليسملة و السلام علی من اتبع الهدیٰ۔

''فانی أدعوك بداعية الاسلام'': داعية مصدر ہے۔ دعوة کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ ''عافية'' اور ''عاقبة'' ہے۔

اور یہ کلمہ شہادت ہے۔ جس کی طرف ملت کافرہ کو دعوت دی جاتی ہے۔

''أسلم'': ''اسلام'' مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔

''تسلم'': ''سلامة'' سے ماخوذ ہے۔ یعنی تم برے عقائد و اعمال اور اخلاق رذیلہ سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

''یؤتك الله أجرك مرتين'': ایک اجر تو مذہب نصرانیت کا ملے گا کہ میری بعثت سے پہلے یہ مذہب حق تھا اور دوسرا اجر میرے اوپر ایمان لانے کی وجہ سے ملے گا۔

''مرتين'' کو ''تسلم'' کے ساتھ متعلق کرنا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں یہ تنازع فعلین کے قبیل سے ہوگا اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ایک دفعہ آپ اس دنیا میں قتل یا جزیہ دینے سے بچ جائیں گے اور دوسری دفعہ آخرت کے عذاب سے محفوظ ہو جاؤ گے اور ''اسلم'' کا تکرار مبالغہ کیلئے ہے اور یہ آپ ﷺ کی اس پر شفقت کا اظہار ہے اور یہ کہ آپ ﷺ اس کے اسلام لانے کے کتنے حریص ہیں۔ کیونکہ اس کا قبول اسلام بہت ساری مخلوق کے اسلام لانے کا سبب بنے گا اور اس سے بہت بڑا نفع ہوگا۔

قوله: وان ثوليت فعليك اثم الاريسيين:

''الأريسين'': یہ لفظ ''ہمزہ'' کے فتحہ اور ''راء'' کے کسرہ اور سین مسکور کے ساتھ ہے۔ یعنی تیرے متبعین کے اعراض کی پاداش میں تجھ کو بھی گناہ ہوگا اور اس کا مفہوم مخالف یہ نکلتا ہے کہ اگر جو اور تیرے متبعین اسلام لے آئیں تو تجھ کو تیرے ساتھیوں کے اسلام کا ثواب بھی ملے گا۔

حاصل معنی یہ ہے کہ آپ کو آپ کے متبعین کے گناہوں کا وبال بھی ہوگا۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے آپ کا اتباع کیا۔ آپ کے کفر پر استمرار اور اصرار کی وجہ سے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لفظ ''أريسين'' کے ضبط میں کئی اقوال ہیں۔

① سین کے بعد دو یاء ہیں۔

② سین کے بعد ایک یاء ہے اور دونوں اقوال کے مطابق ہمزہ پر فتح اور راء مخففہ پر کسرہ ہے۔

③ یہ لفظ ہمزہ مسکور اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے اور سین کے بعد ایک یاء ہے۔ مسلم کی دوسری اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی روایت میں لفظ ''اليريسيين'' ہے۔ ابتداء میں یاء مفتوحہ اور سین کے بعد دو یاؤں کے ساتھ۔ اس کے معنی مرادی میں

اختلاف ہے۔

اصح اور مشہور قول یہ ہے کہ اس سے مراد کاشت کار اور زمیندار ہیں اور معنی یہ ہوگا کہ آپ کو آپ کی رعایا کا گناہ بھی ہوگا جنہوں نے آپ کی اتباع کی اور آپ کے حکم کی بجا آوری کی۔ اس پر اس تمام رعایا کو تنبیہ کی ہے۔ اس لئے کہ وہی لوگ زیادہ غالب تھے اور اس لئے کہ وہ اتباع میں جلدی کرنے والے تھے۔ جب وہ اسلام لائے گا تو وہ بھی اسلام لے آئیں گے، اور اگر وہ اس سے رکا رہا تو وہ بھی اسلام لانے سے رکے رہیں گے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے کہ ''**النّاس علي دين ملوكهم**'' لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں اور بیہقی کی دلائل النبوۃ کی روایت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ ''**عليك اثم الأركارين**''

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں۔ یعنی وہ لوگ ہیں جو اپنے ''رئیس'' (کاشکار) کا اتباع کرتے ہیں ''**أروسية**'' اس کی طرف منسوب ہے۔ قاموس میں لکھا ہے **الأريسي، والا ريس كجليس و سكيت الاكار و كسكيت الأمير**۔

قوله: يأهل الكتاب۔۔۔بيننا وبينكم: ''**يا اهل الكتاب**'' دونوں اہل کتاب (نصاریٰ و یہود) اور ان کے قائم مقام لوگوں کو شامل ہے۔

''**تعالوا**'': لام کے فتحہ کے ساتھ، ''**التعالي**'' سے امر کا صیغہ ہے اور اصل میں یہ وہ شخص کہتا ہے جو بلند جگہ پر ہو۔ اس شخص سے جو کہ اس سے نیچے مقام اور جگہ پر ہو۔ پھر یہ لفظ تعمیم و توسع کے ساتھ استعمال ہونے لگا اور ایک قراءت شاذہ میں لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

كلمة: ''**الكلمة**'' کا اطلاق جملہ مفیدہ پر کیا جاتا ہے۔ یہاں مابعد جملہ اس کی تفسیر ہے۔ **قوله: الا نعبد الا الله۔۔۔من دون الله :**

''**سواءٍ**'': ''استوائ'' سے مصدر ہے اور اس کا معنی مستقیم اور سیدھا ہے۔ ایسا کلمہ ہے جس میں کسی بھی رسول اکسی بھی آسمانی کتاب کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ''**أن لا نعبد الا اللّٰه**'': اس سے پہلے ''ھی'' مقدر ہے۔

''**ولا نشرك به شيئاً**'': مطلب اس کا یہ ہے کہ عبادت کے استحقاق میں ہم اس کے ساتھ اس کے غیر کو شریک نہیں کریں گے اور نہ اس کے علاوہ کسی کو عبادت کا اہل سمجھیں گے۔

''**ولا يتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللّٰه**'' اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نہ عزیر علیہ السلام کو اور نہ ہی مسیح ابن مریم کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہیں گے اور نہ ہی ان چیزوں میں ''احبار'' کا اتباع کریں گے۔ جو انہوں نے حلال اور حرام بنانے میں اپنی طرف سے ایجاد کی ہیں۔ اس لئے کہ وہ سب ہماری طرح کے بشر ہیں۔

قوله: فان تولوا......بانا مسلمون:

''**فقولوا**'': یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دونوں کو ہے۔

''**اشهدوا**'': یہ خطاب کفار کو ہے یعنی اے کفار تم اس بات پر گواہ رہو۔

''بانا مسلمون'': یعنی کہ تمہارے خلاف حجت قائم ہوگئی۔ پس تم اس بات کا اعتراف کرلو کہ تم تو مسلمان نہیں ہوئے ہم مسلمان ہوگئے ہیں۔

قوله: وفی روایة مسلم: ''من محمد رسول اللہ ﷺ......:

وقال: ''اثم الیریسیین'' ہمزہ کی جگہ پر یاء مفتوحہ ہے۔ میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بخاری کی روایت میں بھی ''یریسین'' ہے۔

وقال: بدعایة الاسلام :علامہ میرک کہتے ہیں کہ یہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے اور مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ''بدعایة الاسلام'' ہے جیسا کہ شیخ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس خط میں کئی قسم کے قواعد وفوائد ہیں:

① ایک آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ''سلام علی من اتبع الهدیٰ'' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مذہب کی دلیل ہے کہ کافر کو ابتداً سلام نہیں کرنا چاہئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میرا خیال ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

② ''کفار'' کو قتال سے پہلے اسلام کی طرف بلانا واجب ہے، اور ان تک اسلام کی دعوت پہنچنے سے پہلے ان سے لڑائی اور قتال کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ائمہ کرام میں سے ابن الہمام رحمہ اللہ نے اس بات کو ذکر کیا ہے۔

اس لئے کہ نبی ﷺ نے لشکروں کے امراء کو اس کا حکم کیا ہے۔ چنانچہ سلیمان بن بریدہ کی آنے والی حدیث میں بھی یہ حکم مذکور ہے اور اس باب میں بہت سی احادیث منقول ہیں اور اس حکم میں مشہور ہے اور اس لئے کہ دعوت کے ذریعے سے وہ جان لیں گے کہ ہم ان کے ساتھ ان کے اموال لینے اور اہل وعیال کو قیدی بنانے پر لڑ رہے ہیں۔ پس بسا اوقات وہ بغیر قتال کے مقصود کو قبول کرلیں گے۔ پس اس واسطے پہلے اعلان ضروری ہے۔

عبدالرزاق نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، عن ابی نجیح، عن ابیہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ کے طریق نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی قوم سے اس وقت تک قتال نہیں کیا جب تک کہ ان کو اسلام کی دعوت نہیں دی اور اس کو حاکم نے نقل کیا ہے اور اس روایت کی باقاعدہ تصحیح بھی کی ہے۔

البتہ ''المحیط'' میں ہے کہ دعوت کا پہنچانا حقیقتاً ہو یا حکماً ہو ضروری ہے۔ اگر مشرق ومغرب میں یہ بات پھیل جائے کہ مسلمان ان کو کسی چیز کی دعوت دے رہے ہیں اور کسی چیز پر ان کے ساتھ قتال کر رہے ہیں تو اس دعوت کا ظہور اس کے بلوغ کے قائم مقام ہو جائے گا اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اللہ کے بہت سے شہروں میں بسنے والے لوگوں کو اس حکم کا شعور ہی نہیں ہے تو واجب ہے کہ دارومدار اس بات پر ہو کہ وہ لوگ یہ خیال کریں کہ ان کو دعوت نہیں پہنچی ہے۔ پس جب ان کو دعوت پہنچ جائے تو پھر دعوت واجب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مستحب ہے۔ واجب نہیں ہے۔ اس لئے کہ صحیحین میں ابن عوف سے یہ روایت منقول ہے۔

ابن عوفؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت نافع کو خط لکھا کہ قتال سے پہلے دعوت کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے مجھے جواب میں لکھا کہ ابتدائے اسلام میں یہ دعوت واجب تھی۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ''بنی مصطلق'' پر حملہ کیا۔ اس حال میں کہ وہ بے خبر تھے ان کے جانور کنوؤں پر پانی پی رہے تھے تو ان کے لڑنے والوں کو قتل کیا گیا اور ان کی عورتوں کو قیدی بنا لیا اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنت الحارث بھی اسی معرکہ میں قید ہو کر آئی تھیں۔ یہ بات مجھے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتلائی ہے اور وہ بذات خود اس لشکر میں شریک تھے۔

اور استحباب کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات تکرار سے مقصود حاصل ہوتا ہے۔ اس سے ضرر ختم ہو جاتا ہے اور یہ استحباب اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ اس میں کوئی ضرر نہ ہو ضرر مثلاً یہ کہ اگر یہ پتہ چل جائے تو کہ وہ لوگ دعوت کی وجہ سے تیاری کر لیں گے، یا حیلہ بازی کریں گے یا قلعوں میں محصور ہو جائیں گے (تو اس صورت میں دعوت مستحب نہ ہوگی) اور اس باب میں غالب گمان علم حقیقی کی طرح ہے۔ بلکہ یہی مراد ہے اس لئے کہ حقیقت پر مطلع ہونا متعذر ہے۔

③ خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ نے صرف حضرت دحیہ کو یہ خط دے کر بھیجا ہے۔

④ کسی بھی کلام کو ''بسملة'' سے شروع کرنے کا استحباب نکلتا ہے۔ اگرچہ مبعوث الیہ (جس کی طرف خط بھیجا جا رہا ہو)۔ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

⑤ دشمن کے ملک کی طرف ایک آیت یا دو یا اس جیسی اور مقدس چیز کے ساتھ سفر کرنے کا جواز ہے۔ نہی ''مسافرة بالقرآن'' اس بات پر محمول ہے کہ جب قرآن کریم کا کفار کے ناپاک ہاتھوں میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

⑥ اس سے اس بات کا جواز بھی نکلتا ہے کہ ایک آیت یا تھوڑی سی آیتوں کا غیر قرآن کے ساتھ محدث (بے وضوء) اور کافر کا مس کرنا جائز ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام باتیں اس وقت ہیں جب ''تعالوا'' سے مراد قرآن کے الفاظ ہوں۔ لیکن بظاہر یہ نقل بالمعنی ہے اور اس سے آیت کی تلاوت کا قصد وارادہ نہیں کیا گیا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اول آیت سے ''قل'' کو حذف کر دیا ہے اور ہماری بات کی تائید قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات سے ہوتی ہے جو انہوں نے ''المواھب'' میں ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ نے اس آیت کو اس کے نزول سے پہلے لکھا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ تو اس کے الفاظ اس کے موافق تھے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ آیت ''وفد نجران'' کے قصہ میں نازل ہوئی ہے اور ان کا واقعہ ۹ھ کا ہے۔ جبکہ ''ابوسفیان'' کا یہ واقع ۶ھ سے پہلے کا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ''یہود'' کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ آیت دو دفعہ نازل ہوئی ہو۔ لیکن یہ بات بہت بعید ہے۔

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ لوگوں کے درمیان خط وکتابت میں یہ سنت ہے کہ وہ اپنی ذات سے ابتداء کریں۔ پس مثلاً یوں لکھیں: من زید الی عمرو''۔ چاہے اس سے خط کی ابتداء مقصود ہو یا خط کا عنوان مطلوب ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ [النمل۔ ۳۰] اور بعض نے کہا ہے کہ خطوط کے عنوان میں ''الی فلانٍ'' لکھنا بھی صحیح ہے۔ ''لفلان'' نہیں لکھنا چاہیے اس لئے کہ وہ خط اس کی طرف ہوتا ہے اس کے لئے نہیں ہوتا۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بسا اوقات "لام" "الیٰ" کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اس قول باری میں ہے: ﴿بأن ربك أوحى لها﴾[الزلزلة۔ ۵] "بلقیس" کا یہ قول: انه من سليمان...... "اس بات پر نص نہیں ہے کہ یہ خط یا عنوان سلیمان علیہ السلام کی طرف سے تھا۔ اس لیے کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آغاز "بسملة" سے اور اختتام "سلیمان" پر اس لئے کہ واؤ مطلق جمع کے لئے آتا ہے۔ تعظیم اور مدح میں افراط سے کام نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "الى هرقل عظيم الروم" فرمایا "ملك الروم" نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ اس کا کوئی ملک نہیں تھا اور نہ کسی اور کیلئے ثابت ہے دین اسلام کے حکم کی وجہ سے اور نہ کسی کی سلطنت ہے مگر جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی بنائیں۔ یا جس کو اجازت مرحمت فرمائیں اور کفار کے تصرفات کا نفاذ ان چیزوں میں ہوگا۔ جو ضرورت کے درجہ کی ہوں۔

اور یہاں پر صرف "ہرقل" کہنے پر بھی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس میں ایک نوع کی لطافت پیدا کی اور فرمایا "عظم الروم" یعنی وہ شخص کہ اہل روم جس کی عزت کرتے ہیں اور اس کو مقتدا مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی ایسے اس شخص کو نرم بات کہنے کا حکم دیا ہے جس کو اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فقولا له قولاً لينا﴾[طه۔ ٤٤] اس خط سے بلاغت ایجاز اور خوبصورت الفاظ کے استعمال کا استحباب نکلتا ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام نہایت ہی ایجاز و بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدیع "تجنیس" بھی ہے۔

"تسلم": دنیا کی رسوائی و ذلت سے امن و سلامتی کو شامل ہے اور دنیاوی ذلت و رسوائی جنگ میں قیدی ہو جائے اور قتل ہونے اور اموال اور گھروں کے لٹ جانے وغیرہ سب کو شامل ہے اور آخرت کے عذاب سے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جو شخص گمراہی اور منع ہدایہ کا سبب ہوگا اس کو سب سے زیادہ گناہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وليحملن آثقالهم و أثقالاً مع آثقالهم﴾[العنکبوت۔ ۱۳] وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے

حدیث سے خطبوں اور خطوط میں "اما بعد" کے استعمال کا استحباب بھی معلوم ہوتا ہے۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ "عبد" کو "رسول" پر مقدم کرنا اس بات پر دال ہے کہ عبودیت و بندگی اللہ تعالیٰ کے قرب کا قریب ترین راستہ ہے۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے قرب کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے کیونکہ تمام بندے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾

[الذاريات۔ ۵۶]

اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے مخلوقات میں سب سے افضل ہستی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿واعبد ربك حتى يأتيك اليقين﴾ [الحجر۔ ۹۹] یہاں "یقین" سے مراد باجماع مفسرین "موت" ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تقدیم میں نصاریٰ کے اس دعویٰ پر تعریض مقصود ہے جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الوہیت کا کیا ہے باوجودیکہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: [انی عبدالله آتانی الکتاب وجعلنی نبیا] اس حدیث کی مزید تفصیلات "باب علامات النبوة" میں آئیں گی۔

مکتوبِ نبوی بنام کسریٰ

۳۹۲۷:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :بَعَثَ بِكِتَابِهِ اِلٰى كِسْرٰى مَعَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حُذَافَةَ السَّهْمِيِّ' فَاَمَرَهُ اَنْ يَدْفَعَهُ اِلٰى عَظِيْمِ الْبَحْرَيْنِ' فَدَفَعَهُ عَظِيْمُ الْبَحْرَيْنِ اِلٰى كِسْرٰى فَلَمَّا قَرَاَ مَزَّقَهُ قَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ :فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَنْ يُمَزَّقُوْا كُلَّ مُمَزَّقٍ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸ / ۱۲٦ كتاب المغازی'باب كتاب النبی صلی الله علیه وسلم الی كسریٰ' الحديث رقم ٤٤٢٤'وأحمد فی المسند ۱ / ۴۳

ترجمہ:''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسریٰ کے نام گرامی نامہ عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ کیا (جو تقریباً اسی مضمون پر مشتمل تھا جو قیصر کو بھیجا گیا تھا) اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اس گرامی نامہ کو بحرین کے حاکم کو دے دیں تا کہ بحرین کا حاکم اس کو کسریٰ تک پہنچا دے۔ (چنانچہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ گرامی نامہ کو بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے اور) بحرین کے حاکم نے اس کو کسریٰ کے پاس پہنچا دیا جب کسریٰ نے وہ نامۂ مبارک پڑھا تو بجائے اس پر عمل کرنے کے اس کو پھاڑ ڈالا۔ (حدیث کے ایک راوی) ابن مسیب کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کسریٰ اور اس کی رعایا کے لئے یہ بددعا فرمائی کہ وہ پارہ پارہ کر دیئے جائیں بالکل پارہ پارہ''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن جزء۔ یہ عبداللہ ہیں جن کی کنیت ''ابو حارث سہمی'' ہے مصر میں قیام تھا۔ بدر میں شریک ہوئے۔ ان سے ایک جماعت مصریوں کی روایت کرتی ہے۔ ۸۵ھ میں مصر میں وفات پائی۔ ''جزء'' میں جیم مفتوح زاے معجمہ ساکن اور آخر میں ہمزہ ہے۔

تشریح:قوله:ان رسول الله بعث بكتابه ۔۔۔الی كسریٰ:

''**کسریٰ**'': کاف کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے، اور راء پر فتحہ ہے۔ اس سے مراد فارس کا بادشاہ ہے اور ''خسرو'' اس کا معّرب ہے۔ وسیع وعریض ملک کے بادشاہ کو کہتے ہیں۔ یہی بات ''قاموس'' میں ہے۔

''**البحرين**'': بصرہ کے قریب ساحل سمندر پر واقع ایک شہر کا نام ہے۔

''**فدفعه عظيم البحرين الى كسرٰى**'' تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''فدفعه'' کا فاء کئی مقدرات پر معطوف ہے۔ عبارت یوں ہوگی: ''**فذهب الى عظيم البحرين فدفعه اليه ثم بعثه العظيم الى كسرٰى فدفعه اليه**''۔

''**فلما قرأ**'': ایک نسخہ میں ضمیر مفعول کے ساتھ نقل ہے یعنی ''قرأه'' ہے۔

''**قال ابن المسيب**'' بخاری رحمہ اللہ میں ہے کہ ''راوی رحمہ اللہ'' نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ابن المسیب رحمہ اللہ نے یہ کہا تھا ''**فدعا عليهم**'' کہ آپ ﷺ نے اس کے لئے اور ان کیلئے جنہوں نے اس کو اس تمزیق کتاب پر ابھارا تھا بددعا فرمائی۔''

ان يمزقوا كل ممزق''۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو مکمل طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور اس کو ہر طریقہ سے بکھیر دے اور لفظ ''ممزق'' بھی ''تمزیق'' کی طرح مصدر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کو پھاڑنے والے بد بخت کا نام ''ابرویز بن ہرمز بن انوشروان'' تھا۔ اس کو اس کے بیٹے ''شہرویہ'' نے قتل کیا تھا لیکن وہ بھی اس کے قتل کے بعد صرف چھ مہینے ہی زندہ رہ سکا کہتے ہیں کہ جب ابرویز کو اپنی ہلاکت اور پکڑ کا یقین ہو گیا تو اس نے اپنے دواخانہ کو کھولا اور ''زہر'' کی بوتل پر لکھ لیا۔ ''الدواء النافع للجماع'' اس کا بیٹا اس کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی ہلاکت میں حیلہ سے کام لیا۔ جب اس نے اپنے باپ کو قتل کیا۔ تو اس نے دواخانہ کھولا۔ تو اس نے اس بوتل کو دیکھا۔ تو اس کو پی گیا۔ چنانچہ اس زہر سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

بعض کا خیال ہے کہ وہ اپنے باپ کے قتل کرنے پر افسوس کی وجہ سے مر گیا۔ اس بددعاء کے بعد ان کا کوئی بھی حکم اور امر صحیح طریقہ سے نافذ نہ رہا، بلکہ لوگوں نے ان سے منہ پھیر لیا، ان کی سرزمین اور بادشاہت ختم ہو گئی، اور ان پر نحوست چھا گئی، یہاں تک کہ ان کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ اھ

عجمی ملک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتح ہوئے۔ اس وقت ان کا بادشاہ یزدجرد بن شہریار بن شیرویہ بن ابرویز تھا۔ حضرت حسین بن علیؓ نے ''یزجرد'' کی بیٹی سے شادی کی تھی۔

''مواہب'' میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کو خط میں یوں لکھا تھا: ''بسم اللّٰه الرحمٰن۔

من محمد رسول اللّٰه الٰى كسرٰى عظيم فارس،

سلام علٰى من اتبع الهدٰى واٰمن باللّٰه ورسوله، وشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لا شريك له۔ وان محمدًا عبده ورسوله۔

ادعوك بدعاية اللّٰه فانى رسول اللّٰه الى النّاس كلهم لينذر من كان حيًّا ويحق القول على الكافرين۔ أسلم تسلم فان توليت فعليك اثم المجوس''۔

جب اس کو یہ خط پڑھ کر سنایا گیا۔ تو اس نے خط پھاڑ دیا۔ چنانچہ جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے اپنی بادشاہت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ خط حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ لیکن صحیح بات وہی ہے۔ جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے۔

ابو عبید نے ''کتاب الاموال'' میں عمر بن اسحاق کی مرسل روایت اس طرح نقل کی ہے:

قال : كتب رسول اللّٰهﷺ الٰى كسرٰى وقيصر فأما كسرٰى فلما قرء الكتاب مزقه ، واما قيصر فلما قرأ الكتاب طواه ثم رفعه فقال رسول اللّٰهﷺ :أمّا هؤلاء فيمزقون واما هؤلاءِ فسيكون لهم بقية ''

مروی ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''کسریٰ'' کے جواب کا پتہ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مزق ملكه'' اور جب ہرقل کا جواب آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ثبت ملكه''۔

حکایت: ''فتح الباری'' میں سیف الدین المنصوری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ غرب کے بادشاہ کے پاس منصور بادشاہ کی طرف سے ہدیہ لے کر آئے۔ تو غرب کے بادشاہ نے وہ ہدیہ فرنج کے بادشاہ کی طرف کسی سفارش میں بھیجے۔ تو اس نے اس کو قبول کیا اور اس کا بڑا اکرام کیا اور یہ کہا کہ میں تمہیں ایک عظیم تحفہ دوں گا۔ چنانچہ اس نے ایک صندوق نکالا۔ جس کو سونے کے ساتھ ملمع کیا گیا تھا۔ اس میں سے سونے کا ایک قلم دان نکالا اور اس میں سے ایک خط نکالا جس کے اکثر حروف مٹ چکے تھے۔ اس خط پر ریشم چپکایا ہوا تھا اس نے کہا کہ یہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمارے دادا کی طرف لکھا ہوا خط ہے۔ ہم اس وقت سے اب تک مسلسل اس کے وارث بنتے چلے آرہے ہیں، ہمیں ہمارے آباء واجداد نے یہ وصیت کی ہے کہ جب تک یہ خط ہمارے پاس رہے گا اس وقت تک بادشاہت ہمارے درمیان ہی رہے گی۔ اس لئے ہم اس کی نہایت حفاظت وتعظیم کرتے ہیں اور اس کو نصارٰی سے چھپاتے ہیں۔ تا کہ بادشاہت اور حکومت ہمارے ہی درمیان قائم رہے۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قیصر نے قبولیت اسلام کا ارادہ کیا تھا لیکن اہل روم نے اس کی موافقت نہ کی اور اس کو اس کی بادشاہت اور حکومت کے بارے میں خوف زدہ کر دیا اس لئے وہ اسلام لانے سے رک گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کس بادشاہ کو خط لکھا؟

۳۹۲۸: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : کَتَبَ اِلٰی کِسْرٰی وَاِلٰی قَیْصَرَ وَاِلَی النَّجَاشِیِّ وَاِلٰی کُلِّ جَبَّارٍ یَدْعُوْھُمْ اِلَی اللّٰہِ وَلَیْسَ بِالنَّجَاشِیِّ الَّذِیْ صَلّٰی عَلَیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۳۹۷ کتاب الجهاد والسیر' باب تامیر الامام الامراء' الحدیث رقم ۱۷۷۴' والترمذی فی السنن ۵ / ٦٤' الحدیث رقم ۲۷۱٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (فارس یعنی ایران کے بادشاہ) کسریٰ (روم کے بادشاہ) قیصر اور (حبش کے بادشاہ) نجاشی اور ہر متکبر ومقتدر بادشاہ کو خطوط لکھے جن میں انہیں اللہ (یعنی دین اسلام) کی طرف بلایا گیا تھا اور یہ نجاشی (کہ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خط بھیجا تھا) وہ نجاشی نہیں ہے جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (مدینہ میں غائبانہ) نماز جنازہ پڑھی تھی''۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسری۔۔یدعوهم الی الله :

''کتب الی کسریٰ والی قیصر'': اعادہ عامل، افادہ استقلال ہے۔

''النجاشی'' یاء کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے اور بعض لوگ یاء کے کسرہ کو افصح مانتے ہیں۔ حبشہ کے بادشاہ کا نام ''اصحمہ'' تھا۔ (قاموس)

''مواہب'' میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس بادشاہِ مصر، اسکندریہ، منذر بن ساوی، عمان کے بادشاہ والی یمامہ، حارث بن ابی شمر، اھل جرباواذرج، اہل وج اکیدر کی طرف خطوط لکھے۔

قوله:"وليس بالنجاشى الذى صلى عليه النبى ﷺ":

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی نجاشی ہے جس کی نماز جنازہ آپ ﷺ نے پڑھی تھی۔لیکن یہ راوی کا وہم ہے اس لئے کہ دو نجاشی گزرے ہیں اور دونوں ہی مسلمان تھے۔

۳۹۲۹:وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَّرَ اَمِيْرًا عَلٰى جَيْشٍ اَوْ سَرِيَّةٍ اَوْصَاهُ فِىْ خَاصَّتِهٖ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَمَنْ مَعَهٗ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا ثُمَّ قَالَ اُغْزُوْا بِاسْمِ اللّٰهِ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ' قَاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ ' اُغْزُوْا' فَلَا تَغُلُّوْا' وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَاِذَا لَقِيْتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَادْعُهُمْ اِلٰى ثَلَاثِ خِصَالٍ اَوْ خِلَالٍ' فَاَيَّتُهُنَّ مَا اَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ' وَكُفَّ عَنْهُمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ فَاِنْ اَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ' وَكُفَّ عَنْهُمْ' ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ اِلٰى دَارِالْمُهَاجِرِيْنَ وَاَخْبِرْهُمْ اَنَّهُمْ اِنْ فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَلَهُمْ مَالِلْمُهَاجِرِيْنَ' وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِيْنَ' فَاِنْ اَبَوْا اَنْ يَّتَحَوَّلُوْا مِنْهَا' فَاَخْبِرْهُمْ اَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ كَاَعْرَابِ الْمُسْلِمِيْنَ' يَجْرِىْ عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللّٰهِ الَّذِىْ يَجْرِىْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ' وَلَا يَكُوْنُ لَهُمْ فِى الْغَنِيْمَةِ وَالْفَىْءِ شَىْءٌ' اِلَّا اَنْ يُّجَاهِدُوْا مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ' فَاِنْ هُمْ اَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ فَاِنْ هُمْ اَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ' وَكُفَّ عَنْهُمْ فَاِنْ هُمْ اَبَوْا فَا سْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَقَاتِلْهُمْ' وَاِذَا حَاصَرْتَ اَهْلَ حِصْنٍ فَاَرَادُوْكَ اَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهٖ وَلَا تَجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهٖ' وَلٰكِنِ اجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّتَكَ وَذِمَّةَ اَصْحَابِكَ فَاِنَّكُمْ اَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَمَكُمْ وَذِمَمَ اَصْحَابِكُمْ اَهْوَنُ مِنْ اَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ رَسُوْلِهٖ وَاِنْ حَاصَرْتَ اَهْلَ حِصْنٍ فَاَرَادُوْكَ اَنْ تُنْزِلَهُمْ عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ فَلَا تُنْزِلْهُمْ عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَنْزِلْهُمْ عَلٰى حُكْمِكَ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِىْ اَتُصِيْبُ حُكْمَ اللّٰهِ فِيْهِمْ اَمْ لَا ۔

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٣٩٧' كتاب الجهاد والسير' باب تامير الامام الامراء' الحديث رقم (٧٥ ـ ١٧٧٤) والترمذى فى السنن ٥ / ٦٤' الحديث رقم ٢٧١٦

ترجمہ:"اور حضرت سلیمان بن بریدہ اپنے والد (حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی شخص کو کسی چھوٹے یا بڑے لشکر کا امیر مقرر فرماتے تو خاص طور پر اس کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی اور اس کے ساتھ (جہاد میں) جانے والے مسلمانوں کے متعلق اس کو نیکی و بھلائی کرنے کی نصیحت فرماتے (کہ مجاہدین کا جو لشکر تمہاری کمان میں جا رہا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ خیر و بھلائی کا معاملہ کرنا اور ان کے حق میں حسن سلوک و احسان اور نرمی و ملاطفت کا رویہ اختیار کرنا) اور اس کے بعد یہ فرماتے کہ خدا کا نام لے کر خدا کی راہ میں جہاد کرو۔(یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے اور اس کے دین کا جھنڈا سر بلند کرنے کی غرض

سے اسلام دشمن طاقتوں سے جنگ کرو) اس شخص کے خلاف قتال کرو جس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے جہاد کرو' (غنیمت کے مال میں) خیانت نہ کرنا' عہد شکنی نہ کرنا' مثلہ نہ کرنا (یعنی کسی کے اعضاء جسم جیسے ناک کان وغیرہ نہ کاٹنا) اور بچوں کو قتل نہ کرنا اور (اے امیر لشکر!) جب تم اپنے مشرک دشمنوں کے سامنے پہنچو تو پہلے ان کو تین چیزوں کی دعوت دو (حدیث کے راوی اپنے شک کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ثلث خصال کے بجائے) ثلث خلال فرمایا (خصال اور خلال دونوں کے ایک ہی معنی ہیں) ان تین چیزوں میں سے وہ مشرک جس چیز کو اختیار کر لیں اور اپنے لئے پسند کر لیں۔ تم اس کو ان سے قبول کر لو اور ان سے (قتال کرنے سے) باز آ جاؤ۔ (یعنی ان تین چیزوں میں سے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ) ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں تو تم بھی اس کو قبول کر لو اور ان سے (جنگ کرنے سے) باز رہو (پھر وہ اسلام قبول کر لیں تو) ان کو اپنے ملک سے (یعنی دارالحرب سے) مہاجرین کے ملک (یعنی دارالاسلام) کو منتقل ہو جانے (یعنی ہجرت کرنے) کی دعوت دو اور ان کو یہ بتا دو کہ ایسا کریں گے (یعنی ہجرت کر کے دارالاسلام آ جائیں گے) تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مہاجرین کو حاصل ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مہاجرین پر عائد ہیں' اگر وہ وہاں سے منتقل ہونے سے انکار کریں تو ان کو بتا دو کہ ایسی صورت میں وہ دیہاتی مسلمانوں کی مانند ہوں گے اور ان پر خدا کا ایسا حکم جاری کیا جائے گا جو تمام مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے (یعنی نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا واجب ہونا اور قصاص و دیت جیسے احکام کا نافذ ہونا) اور غنیمت وفئی کے مال میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا البتہ اس وقت حصہ ملے گا جب کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر جہاد کریں اور اگر وہ (اسلام کی دعوت قبول نہ کریں اور مسلمان ہونے سے) انکار کریں تو دوسری چیز یہ ہے کہ ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو اگر وہ جزیہ دینا قبول کریں تو تم بھی اس کو قبول کر لو اور ان سے (جنگ کرنے) سے باز رہو اور اگر وہ جزیہ دینے سے انکار کریں تو تیسری چیز یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر کے ان سے جنگ کا آغاز کر دو اور جب تم کسی قلعہ یا بستی کے لوگوں یعنی دشمن کا محاصرہ کرو اور وہ قلعہ یا بستی والے تم سے اللہ اور اس کے نبی ﷺ کا عہد امان لینا چاہیں تو تم ان کو اللہ اور اس کے نبی ﷺ کی طرف سے امان دینے کا عہد نہ کرنا البتہ اپنے اور اپنے مجاہدین ساتھیوں کی طرف سے عہد امان دے دینا کیونکہ اگر تم اپنے اپنے ساتھیوں کے دیئے ہوئے عہد امان کو توڑ دو گے تو یہ اللہ اور اس کے رسول کے عہد امان کو توڑنے سے زیادہ آسان ہوگا اور جب تم کسی قلعہ کے لوگوں کا محاصرہ کرو اور وہ قلعہ والے تم سے اللہ کے حکم پر اپنا محاصرہ اٹھا لینے کی درخواست کریں تو تم اللہ کے حکم پر ان کا محاصرہ نہ چھوڑنا بلکہ اپنے حکم پر ان کا محاصرہ چھوڑنا کیونکہ تمہیں یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ تم ان کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اللہ کے حکم تک پہنچ گئے ہو یا نہیں (یعنی تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ تم نے ان کا محاصرہ چھوڑ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ خدا کے نزدیک صحیح بھی ہے یا نہیں اور اس کے حکم کے مطابق بھی ہے یا نہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم سے غلطی ہو جائے جیسا کہ مجتہد کی شان ہے کہ وہ صحیح حکم تک بھی پہنچ جاتا ہے اور خطا میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے"۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

سلیمان بن بریدۃ۔ یہ سلیمان بن بریدہ ''اسلمی'' ہیں۔ یہ اپنے والد اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے علقمہ رضی اللہ عنہ وغیرہ روایت نقل کرتے ہیں۔ ۱۰۵ھ میں وفات ہوئی۔ یہ صحابی زادہ ہیں۔ بظاہر یہاں بریدہ سے ''حصیب'' مراد ہیں۔

تشریح: أمر: از باب تفعیل ماضی معروف کا صیغہ ہے۔

''**بتقوی اللّٰہ**'': یہ أوصاہ کے متعلق ہے۔

''**ومن معہ**'': اس کا عطف ''**علی خاصتہ**'' پر ہے۔

''**خیرًا**'': منصوب بنزع الخافض ہے۔ ای بخیرٍ۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''من'' محل جر میں ہے اور ''**باب العطف علی عاملین مختلفین**'' کے قبیل سے ہے۔ گویا کہ یوں کہا ہے: **أوصی بتقوی اللّٰہ فی خاصۃ نفسہ و أوصی بخیر فی من معہ من المسلمین**۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امیر کو خاص طور پر اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتے اور ان کی معیت میں موجود مسلمانوں کو بھلائی کی وصیت کرتے۔ امیر کو خصوصی طور پر تقویٰ کی نصیحت فرمانا، اور مسلمانوں کو خیر کی وصیت فرمانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امیر پیش آمدہ معاملات میں اپنے نفس پر سختی کریں اور اپنے ساتھ موجود مسلمانوں پر آسانی اور نرمی کا معاملہ کریں۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے:

''**یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا**''

قولہ: ثم قال اغزوا۔۔۔ولا تقتلوا ولیدا: ''**اغزوا بسم اللّٰہ**'': (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے) **أی مستعینین بذکرہ اللّٰہ تعالیٰ** کے ذکر سے مدد اور اعانت کے ساتھ جہاد کرو۔

''**فی سبیل اللّٰہ**'': یعنی مقصود صرف اور صرف اس کی رضامندی اور اعلاءِ دین ہو۔ ''**قاتلوا من کفر باللّٰہ**'' یہ جملہ دراصل ''**اغزوا**'' کے لئے توضیح ہے

''**فلا تغلوا**'' ''فاء'' کے ساتھ ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں ''واؤ'' کے ساتھ ہے۔ ''غین'' کے ضمہ اور ''لام'' کے تشدید کے ساتھ ہے۔

''**ولا تغدروا**'': دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

پہلا مطلب یہ ہے کہ عہد اور وعدہ کو مت توڑو۔

دوسرا مطلب بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ ''**دعوۃ الی الاسلام**'' سے پہلے ان کے ساتھ جنگ نہ کرو۔

''**ولا تمثلوا**'': ''تاء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ایک نسخہ میں باب تفعیل سے ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''التہذیب'' میں یہ ہے۔ ''مثل به وتمثل كقتل اذا قطع أطرافه'' مثلہ اس طرح قتل کرنا کہ اس کے اعضاء کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ ''الفائق'' میں ہے کہ مثلہ یہ ہے کہ چہرہ کو سیاہ کر دیا جائے، یا ناک وغیرہ کاٹی جائے۔

صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ وہ مثلہ جو قصہ عرینین میں مروی ہے وہ نہی متأخر کے سبب منسوخ ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رویت کیا ہے کہ ''ما خطبنا رسول الله ﷺ بعد ذالك خطبة الا ونهٰى فيها عن المثلة''۔ ترجمہ: اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ نہیں دیا، مگر اس میں مثلہ سے منع فرمایا۔

صحیح مسلم کی روایت میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں کو پھوڑا کیونکہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھیں نکالی تھیں۔ اس کی مکمل تحقیق ''شرح ابن الہمام'' میں ملاحظہ فرمایئے۔

''ولا تقتلوا وليدًا'': ولیدًا سے مراد چھوٹا بچہ ہے۔ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بچے اور مجنوں کو بھی قتل کیا جائے گا جو حالت قتال میں ہو، اور اسی طرح وہ بچہ جو بادشاہ ہو، اور بادشاہ معتو کو بھی قتل کیا جائے گا اس لئے کہ بادشاہ کے قتل میں ان کے شان وشوکت ودبدبہ کا توڑ ہے۔

قوله: ''واذا لقيت عدوك من المشركين۔۔۔وكف عنهم'' یہ خطاب ''امیر جیش'' کو ہے اور یہ اس آیت کی نظیر ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ [الطلاق: ۱]

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام باب تلوین الخطاب سے ہے۔ پہلے عمومی خطاب فرمایا جس میں امیر دخول اولی کے طور پر داخل ہوگا۔ پھر خطاب کو اس کے ساتھ خاص کر دیا اور دوسرے لوگ اس میں ''على سبيل التبعية'' داخل ہو گئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: [يايها النبى اذا طلقتم] یہاں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ''نداء'' کے ساتھ خاص کر دیا۔

''خصالٍ'': ''خلالٍ'' یہ راوی کا شک ہے۔ ''خصال'' اور ''خلالٍ'' دونوں بروزن ''کرام'' ہیں خصال یہ خصلة کی جمع ہے اور ''خلال'' خلة کی جمع ہے اور دونوں کا معنی ایک ہے۔

''فأيتهن'' یہ رفع کے ساتھ ہے اور ضمیر ''خصال'' کی طرف راجع ہے۔

''ما اجابوك'': ''ما'' زائدہ ہے۔ ''فاقبل منهم'' شرط کی جزاء ہے۔

''كفّ'': کاف کے ''ضمہ'' اور ''فاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ فاء کا ضمہ اور کسرہ بھی جائز ہے۔

''ثم ادعهم الى الاسلام'': علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''صحیح مسلم'' کے تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ادعهم'' کی روایت ہی صحیح ہے، یعنی ''ثمّ'' نہیں ہے۔ ''کتاب ابی عبید'' اور سنن ابی داؤد وغیرہ کے نسخوں میں اسقاط ثمّ کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ ''خصال'' ''ثلاثة'' کی تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں پر ''ثمّ'' زائدہ ہے۔ افتتاح کلام میں واقع ہوا ہے۔ یعنی اگلی بات کا ابتدائیہ ہے۔

قوله: ثم ادعهم الى النحول...... ماعلى المهافرين:

التحول'': ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو کہتے ہیں۔

"**ثم ادعهم ...... الی دار المهاجرین**": یہ حکم پہلی خصلت کے توابع میں سے ہے۔بعض نے کہا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہجرت ارکان اسلام میں سے تھی۔

ان فعلوا ذلك: اسکا مشار الیہ "تحول" ہے۔

"**فلهم ما للمهاجرین**": یعنی جو ثواب اور مال فئی مہاجرین کو ملے گا وہ ان کو بھی ملے گا۔ مال فی میں ان کا استحقاق حضورؐ کے زمانہ میں تھا اور اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان مہاجرین پر اس وقت سے فرما دیتے تھے جب سے وہ جہاد میں نکلتے جس وقت بھی ان کو امام جہاد کا حکم کرتا۔ چاہے دوسرے مسلمان کفار کے مقابلے کیلئے کافی ہوتے یا نہ ہوتے برخلاف غیر مہاجرین کے کہ جب دوسرے مسلمان کفار کے مقابلے میں کفایت کرتے تو ان پر اس وقت خروج الی الجہاد واجب ہی نہ ہوتا تھا۔

"**یجری**": یہ مجہول کا صیغہ ہے اور ایک نسخہ میں معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

قوله: فان هم ابوا

"**ما أضمر عامله علی شریطة التفسیر**" کی قبیل سے ہے اور مبالغہ کا فائدہ دے رہا ہے۔

"**فسلهم**" ہمزہ اور نقل دونوں کے ساتھ ہے۔

فوائد حدیث:

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کئی فوائد پر مشتمل ہے:

① مال فئی اور مال غنیمت ان مستحقین صدقات اعراب کو نہیں دیئے جائیں گے جنہوں نے ہجرت نہیں کی اگرچہ وہ فقراء اور مساکین ہوں۔

② ان اہل فئی اور اہل غنیمت کو کوئی اور صدقہ بھی نہیں دیا جائے گا۔

البتہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں مال حکم کے لحاظ سے برابر ہیں۔ان میں سے ہر دونوں قسموں کے لوگوں کو دینا جائز ہے۔

③ یہ حدیث امام مالک، امام اوزاعی اور ان فقہاءؒ کا مستدل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہر کافر سے جزیہ لینا جائز ہے۔ چاہے عربی ہو یا عجمی ہو۔ کتابی یا غیر کتابی ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین عرب اور مجوسِ عرب کے علاوہ دنیا کے تمام کفار سے جزیہ لیا جائے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب اور مجوسیوں سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا، چاہے یہ عربی ہوں یا عجمی ہوں۔ان کا استدلال آیت کے مفہوم اور اس حدیث سے ہے: "**سنوا بهم سنة اهل الكتاب**" اس حدیث کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد "اہل کتاب" ہیں۔ اس لئے کہ "مشرک" کا اطلاق اھل کتاب اور غیر اھل کتاب دونوں پر ہوتا ہے اور صحابہ کے ہاں اس کی تخصیص معلوم ہوتی ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے کہ جب وہ لوگ مرتد بھی نہ ہوں، اور نہ ہی مشرکین عرب ہوں۔ اس لئے کہ ان لوگوں سے یا تو اسلام قبول کیا جائے گا، یا تلوار کے ساتھ لڑائی ہوگی۔ کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔

قوله: فان هم اجابوك...... و كف عنهم ''الہدایۃ'' میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے جزیہ اس لئے دیا تا کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اوران کے اموال ہمارے اموال کی طرح ہو جائیں۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں بہت ساری احادیث ہیں۔ بلکہ یہ مسئلہ ضروریات دین میں سے ہے اور حضرت علی کی حدیث کا بھی یہی مفہوم ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علیؓ کی اس حدیث کو اپنی مسند میں یوں نقل کیا ہے:

''**أخبرنا محمد بن الحسن الشيباني، انبأنا قيس بن الربيع للأسدی عن ابان بن ثعلب عن الحسين بن ميحون عن ابی الجنوب قال۔ قال علی** رضی اللہ عنہ: ''**من كانت له ذمتنا فدمه كدمنا و ديته كديتنا**''' **وضعف الطبرانی ابا الجنوب۔**

''**ولكن اجعل لهم ذمتك وذمة اصحابك فانكم**'': صحیح مسلم، کتاب الحمیدی، جامع الاصول کے مطابق یہ لفظ صیغۂ خطاب کے ساتھ ہے اور مصابیح کے مطابق صیغہ غائب کے ساتھ ہے۔یعنی ''**فانّهم**'' ہے۔

''**ان تخفروا**'': یہاں پر بظاہر ''أن'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔جیسا کہ مصابیح کے نسخوں میں ہے اور ''أن'' اپنے صلہ کے ساتھ مل کر تأویل مصدر ہو کر ضمیر مخاطب سے بدل واقع ہوگا اور ''ان'' کی خبر یہ کلام ہے: ''**أهون من أن تخفروا ذمة الله وذمة رسوله**''۔ایک نسخہ میں ''ان'' ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ (یعنی ان شرطیہ) ہے۔لیکن یہ بظاہر مشکل ہے۔

اسی طرح ''**الخلاصة**'' میں ہے اور ''اشکال'' کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہاں پر ''اهون'' سے پہلے ''ھو'' مقدر ماننا ہوگا۔اس میں ''فاء'' کا آنا ضروری ہوتا ہے۔اس اشکال کا دفع کرنا اس طرح ممکن ہے کہ اس کو ''شاذ'' پر محمول کیا جائے۔جیسا کہ یہ قول ہے:

''**من يفعل الحسنات الله يشكرها**''۔

چنانچہ مطلب یہ ہوا: ''**أنهم لو نقضوا عهد الله ورسوله لم تدرما تصنع لهم حتى يؤذن لكم بوحی ونحوه فيهم**''۔اگر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کو توڑا۔تو تم نہیں جانتے کہ تم ان کے ساتھ کیا کریں۔یہاں تک کہ تمہیں وحی وغیرہ کے ذریعے حکم بتا دیا جائے اور بسا اوقات مہبط وحی سے دور ہونے کی وجہ سے آپ کیلئے حکم پر اطلاع پانا متعذر رہو گا۔برخلاف اس صورت کے کہ جب وہ تمہارے عہد کو توڑیں۔اس لئے کہ ان کے حق میں آپ مصلحت کے مطابق جو مناسب سمجھیں فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کو قتل کیا جائے یا ان سے جزلہ لیا جائے، یا ان کو غلام بنایا جائے

قوله: ''ولكن انزلهم على حكمك فانك لا تدری: انصيب حكم الله فيهم أم لا؟'':

ابن ہمام نے ایک روایت کے مطابق یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے۔: ''**ثم اقضوا فيهم بعد ماشئتم**''۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**فلا تجعل لهم ذمة الله**'' نہی تنزیہی ہے۔اس لئے کہ بعض وہ لوگ جو اس کے حق کو نہیں جانتے۔مثلاً دیہاتی اور لشکر کے اکثر لوگ اس کو توڑ دیتے ہیں اور اس کی حرمت کا خیال نہیں کرتے اور اسی طرح ''**فلا تنزلهم على حكم الله**'' نہی تنزیہی پر محمول ہے۔یہ حدیث اس شخص کیلئے دلیل ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہر مجتہد راہ راست پر نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے صحیح قول کسی ایک کا ہوتا ہے اور وہی ''**نفس الأمر**'' میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہوتا ہے اور جو کہتا ہے کہ

ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے۔ وہ اس کے معنی بتاتے ہیں کہ آپ اس سے مامون نہیں کہ جو فیصلہ آپ نے کیا ہے، وحی اس کے برعکس نازل ہو جیسا کہ ''بنو قریظة'' کے بارے میں سعد بن معاذ کے فیصلہ کے وقت آپؐ نے فرمایا تھا: ''لقد حکمت فیهم بحکم الله''اور یہ معنی آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد منتفی ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا: ''کلٌّ مجتهد مصیب''معتزلہ اور بعض اہل السنّت کا بھی یہی مسلک ہے۔

تخریج وتوضیح :

اصحاب سنن اربعہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اگرچہ ان کے الفاظ آپس میں مختلف ہیں۔

جنگ کی ابتدا سورج ڈھلنے کے بعد کی جائے

۳۹۳۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ بَعْضِ اَیَّامِهِ الَّتِیْ لَقِیَ فِیْهَا الْعَدُوَّ، اِنْتَظَرَ حَتّٰی مَالَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ قَامَ فِی النَّاسِ فَقَالَ یَا اَیُّهَا النَّاسُ! لَا تَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ وَاسْاَلُوا اللّٰهَ الْعَافِیَةَ، فَاِذَا لَقِیْتُمْ فَاصْبِرُوْا، وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ، ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ وَمُجْرِیَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اِهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْهِمْ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٢٠، کتاب الجهاد، باب کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا لم یقاتل، الحدیث رقم ٢٩٦٥ و مسلم فی صحیحه ٣ / ١٣٦٢، الحدیث رقم (٢٠ ـ ١٧٤٢) وأبو داود فی السنن ٣ / ٩٥، الحدیث رقم ٢٦٣١

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنے دنوں میں سے ایک دن جب کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم دشمن کے مقابلہ پر تھے (یعنی جہاد کے موقع پر میدان جنگ میں تھے) زوالِ آفتاب تک جنگ شروع ہونے کا انتظار کرتے رہے پھر جب سورج ڈھل گیا تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے لوگوں کے سامنے (خطبہ دینے کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! تم اپنے دشمن سے مقابلہ کی آرزو نہ کرو (یعنی یہ نہ چاہو کہ کفار سے قتل وقتال کا بازار گرم ہو کیونکہ یہ چاہنا گویا ابتلاء ومصیبت کی خواہش کرنا ہے جو ممنوع ہے) بلکہ اللہ تعالیٰ سے امن وعافیت کا سوال کرو، ہاں جب دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو پھر (پوری بہادری کے ساتھ) ڈٹ جاؤ اور صبر واستقامت سے کام لو اور اس بات کو جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے (یعنی تم جنت کے بالکل قریب ہو) اس کے بعد آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ دعا فرمائی اے اللہ! کتاب کو نازل فرمانے والے، بادلوں کو چلانے والے اور کفار کی جماعت کو شکست دینے والے ان دشمنوں کو شکست دے اور ہم کو ان پر فتح عطا فرما''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ان رسول اللهؐ فی بعض ایامه...... فاذا لقیم فاصبروا:

''فقال: ''یأیها النّاس'': خطاب میں ''مؤمنون'' سے ''الناس'' کی طرف عدول فرمایا تاکہ منافقین کو بھی عام ہو جائے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر دشمن سے مقابلہ کی آرزو کرنے سے اس لئے منع کر دیا گیا کیونکہ اس میں ایک قسم کا اعجاب وتکبر نفس پر توکل اور قوت پر بھروسہ ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ جزم اور احتیاط کے مخالف ہے اور بعض نے اس نہی کا محمل یہ بتایا ہے کہ جب قتال کی مصلحت میں شک ہو اور اس سے ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہو۔ ورنہ قتال توکل کا کل فضیلت اور اطاعت ہی ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

قوله:"واعلموا ان الجنّة تحت ظلال السيوف":

مجاہد کا اس طور پر ہونا کہ اس کے اوپر دشمن کی تلواریں ہوں یہ جنت کے حصول کا سبب ہے۔ یا اس سے مراد "مجاہدین" کی تلواریں ہیں اور "سیوف" کا ذکر اس لئے کر دیا کیونکہ یہ جنگ کے اکثر اسباب والات میں سے ہوتا ہے۔

اور "النہایہ" میں ہے کہ یہ "جہاد" میں ضرب کے قرب سے کنایہ ہے۔ یہاں تک کہ اس پر تلوار اوپر آجاتی ہے اور اس کا سایہ اس پر ہو جاتا ہے۔ "ظل" سے مراد وہ سایہ ہے جو آپ کے اور سورج کے درمیان حائل چیز سے حاصل ہوتا ہے۔ چاہے وہ حائل چیز جو بھی ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ "ظل" خاص ہے صبح سے زوال شمس تک کے سائے کو ظل کہتے ہیں اور اس کے بعد والے سائے کو "فی" کہتے ہیں۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ومعنی اللہ کا ثواب وجزاء ہے اور جنت کی طرف لے جانے والا سبب "ضرب بالسیوف" ہے اور مجاہدین کا اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنا ہے۔ پس جہاد صدق نیت سے کرو اور ثابت قدم رہو۔

قوله:ثم قال اللهم منزل الكتاب ......:"اللهم منزل الكتاب": جنس کتاب مراد ہے یا قرآن مراد ہے۔

"وهازم الأحزاب": "أحزاب" سے مراد کفار سابقہ کی تمام اصناف ہیں۔ جیسا کہ قوم نوح، ثمود اور قوم عاد وغیرہ ہیں۔

"وانصرنا عليهم" اس جہاد میں بنفس نفیس شریک ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے غزوہ کا اجر ثابت ہو جائے۔

۳۹۳۱: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَانَ اِذَا غَزَا بِنَا قَوْمًا لَمْ يَكُنْ يَغْزُوْ بِنَا حَتّٰى يُصْبِحَ وَيَنْظُرَ اِلَيْهِمْ فَاِنْ سَمِعَ اَذَانًا كَفَّ عَنْهُمْ، وَاِنْ لَمْ يَسْمَعْ اَذَانًا أَغَارَ عَلَيْهِمْ قَالَ: فَخَرَجْنَا اِلٰى خَيْبَرَ فَانْتَهَيْنَا اِلَيْهِمْ لَيْلاً فَلَمَّا اَصْبَحَ وَلَمْ يَسْمَعْ اَذَانًا رَكِبَ وَرَكِبْتُ خَلْفَ اَبِیْ طَلْحَةَ وَاِنَّ قَدَمَیَّ لَتَمَسُّ قَدَمَ نَبِیِّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: فَخَرَجُوْا اِلَيْنَا بِمَكَاتِلِهِمْ وَمَسَاحِيْهِم فَلَمَّا رَاَوُا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا: مُحَمَّدٌ وَاللّٰهِ مُحَمَّدٌ وَالْخَمِيْسُ. فَلَجَؤُا اِلَی الْحِصْنِ فَلَمَّا رَآهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ! اَللّٰهُ اَكْبَرُ! خَرِبَتْ خَيْبَرُ اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ۔ (متفق عليه)

— اخرجه البخاری فی صحيحه ۲ / ۸۹، كتاب الاذان، باب ما يحقن بالاذان من الدماء الحديث رقم ۶۱۰، و

مسلم فی صحیح ٣ / ١٤٢٦' الحدیث رقم (١٢٠ ـ ١٣٦٥) والترمذی فی السنن ٤ / ١٠٢' الحدیث رقم ١٥٥٠' والنسائی فی ١ / ٢٧١' الحدیث رقم ٥٤٧' و مالك فی المؤطا ٢ / ٤٦٨' الحدیث رقم ٤٨' من کتاب الجهاد' وأحمد فی المسند ٣ / ٢٦٣

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ ہمارے ساتھ کسی (دشمن) قوم سے جہاد کرتے (یعنی جب جہاد کے موقع پر کسی ایسی دشمن آبادی پر حملہ آور ہونے کا ارادہ فرماتے جس کے حالات کا علم نہیں ہوتا اور ہم لوگ آپ ﷺ کے ہمراہ شریک جہاد ہوتے) تو جب تک صبح نہ ہو جاتی' ہمارے ساتھ ان کے ساتھ جہاد شروع نہ فرماتے۔ (پھر جب صبح ہو جاتی) تو ان (دشمنوں کی آبادی اور ان کے ٹھکانوں) پر نظر ڈالتے (تاکہ مشاہدہ یا قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کون لوگ ہیں) اگر (ان کی طرف سے) اذان کی آواز سنتے تو ان سے (جنگ کرنے سے) باز رہتے اور اگر اذان کی آواز نہیں سنتے (اور اس پر قرینہ سے یہ ثابت ہو جاتا کہ (ان لوگوں میں مسلمان نہیں ہیں) تو ان پر حملہ کر دیتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ چنانچہ جب ہم (آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کے لئے) خیبر روانہ ہوئے تو ان (کی سرحدوں) پر رات کے وقت پہنچے' جب صبح ہو گئی اور (ان کی طرف سے) اذان کی آواز سنائی نہ دی تو آپ ﷺ سواری پر سوار ہوئے اور میں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی سواری پر ان کے پیچھے سوار ہوا اور (ہماری سواری آپ ﷺ کی سواری کے اتنے قریب تھی کہ) میرے پاؤں آنحضرت ﷺ کے قدم مبارک کے ساتھ لگتے تھے' حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب صبح ہونے پر خیبر والے (ہماری آمد سے بے خبر اپنے کھیتوں میں جانے کے لئے) اپنے پھاوڑے تھیلے (یعنی کھیتی باڑی کا سامان) لئے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے اور ہماری طرف آئے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو (چیخ چیخ کر) کہنے لگے' محمد آ گئے' خدا کی قسم محمد اور ان کا لشکر آ گئے' یہ کہتے ہوئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے' جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس طرح بھاگتے ہوئے دیکھا تو (گویا اس کو ان کی شکست سے تعبیر کرتے ہوئے اور از راہ تفاول) فرمایا ''اللہ بہت بڑا ہے' اللہ بہت بڑا ہے' خیبر برباد ہو گیا' اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بھی ہم (مسلمانوں کی جماعت یا انبیاء) کسی قوم کے میدان میں (جنگ کے لئے) اترتے ہیں تو اس ڈرائی گئی قوم کی صبح بڑی خراب ہو جاتی ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: ''اذا غزابنا قومًا ''لم یکن یغزوبنا''** یہاں پر باء مصاحبت کے معنی میں ہے۔ **ای اذا غذونا وھو معنا** یعنی جب ہم جنگ کرتے اور نبی کریم ﷺ ہمارے ساتھ ہوتے۔

قوله: یغزوء: ''واؤ'' کے ساتھ ہے اور یہ جملہ ''خبر'' ہے۔ **''أی لم یکن غازیًا بنا''** علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **''لم یکن یغزبنا''** ''مصابیح'' میں اسی طرح منقول ہے۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ''واؤ'' کاتب کے قلم سے ساقط ہوا ہے اور اصل میں اس واؤ کا اثبات ہی ہے۔ اگر اس کو ''اغتراء'' سے مان لیا جائے ''یلھینا'' کے وزن پر، تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس کا معنی ہوگا کہ وہ ہمیں ''جہاد'' کیلئے ابھارتے۔ البتہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس کا معنی ہے: **لم ملنا الیه ولم محملنا علیه** یہ معانی مجازی ہوں گے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ضروری ہے کہ ''جملہ ثانی'' کو عین اوّل قرار دیا

جائے۔اس لئے کہ معنی یہ ہیں:''اذا أراد الغزو بنا لم يغز بنا''۔

اور قاموس میں لکھا ہے:''غزا العدوّ'' کا معنی ہوگا کہ قوم دشمن سے لڑنے کیلئے چلی اور''أغزا'' کا معنی ہوگا کہ ان کو لڑائی پر ابھارا جیسا کہ''غزاہ'' ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس کا لغوی معنی ہے،مجازی نہیں ہے۔جیسا کہ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور ثانی کو عین اول بنایا جائے،تو یہ مناسبات لفظیہ پر محمول ہوگا،معنوی رعایت کے بغیر۔اگر چہ یہ بھی ساتھ ہی حاصل ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ معنی یہ ہوگا کہ جب وہ غزوہ کا ارادہ کرتے تو اس وقت ہمیں اس پر نہیں ابھارا بلکہ ہمیں مہلت دیتے حتی کہ ہم مکمل تیاری کر لیتے۔قتال کرنے میں مصلحت سمجھتے۔تو ابھارتے ورنہ نہیں۔جیسا کہ اس پر اگلا جملہ دلالت کر رہا ہے:

قوله:''حتى يصبح...... غار عليهم وينظر:

یعنی ان کے احوال میں تأمل،اوران کے افعال سے ان کے عقائد پر استدلال کرتے۔

فان سمع أذانا : كف عنهم قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حملہ کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے اس ڈر سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں کوئی مؤمن بھی ہو اور بے خبری میں اس پر بھی حملہ ہو جائے۔علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ اذان دین اسلام کا شعار ہے جس کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔پس اگر کسی شہر والے اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اذان کو چھوڑ دیا جائے تو بادشاہ وقت کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کے خلاف لڑے۔اھ ہمارے ائمہ میں سے یہی قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

قوله:''وان قدمى لتمس قدم بنى الله'':

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں،ابوطلحہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی اونٹ پر سوار تھے اور ظاہر ہے کہ **مس قدم** کمال قرب سے کنایہ ہے۔اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے۔

قوله:فحر جوا الينا۔۔فلجووا الى الحض:

''**مكاتلهم**'':میم کے کسرہ کے ساتھ ''**مكتل**'' کی جمع ہے اور اس سے مراد بڑا ٹوکرا ہے۔

''**مساحيهم**'':یہ''**مسحاة**'' کی جمع ہے۔میم زائد ہے اس کے ذریعے سے زمین کے اوپر سے مٹی ہٹائی جاتی ہے۔ بیلچہ اور پھاوڑا وغیرہ مراد ہے۔

''**محمد**'':دوسرا لفظ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے لفظ محمد کی تاکید ہے۔

''**والخميس**'' واو بمعنی''مع'' ہے۔(تورپشتی)علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دراصل''**الخميس**'' کا''محمد''پر عطف ہے اور یہ بطور مفعول معہ منصوب ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلے لفظ پر عطف ہے،خمیس حال ہے اور خبر مقدر ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ ہے۔اس کے مفعول معہ ہونے میں اشکال ہے۔الا یہ کہ یہ تقدیر نکالی جائے:''**وصل محمد والخميس**''۔

لشکر کو ''خمیس'' کہنے کی وجہ

① لشکر کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

①قدمه۔②الساقة ۔③الميمنة۔ ④الميسرة۔ ⑤القلب۔

④ غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

قوله:الله اكبر الخ الله أكبر'':

اللہ اکبر: اللہ زیادہ عزت والا اور غالب ہے۔ دوسرا لفظ ''اللّٰه أكبر '' پہلے ''اللہ اکبر'' کی تأ کید ہے۔ یا پہلے سے مراد دنیا اور دوسرے میں مراد عقبیٰ ہے۔

''خربت خيبر '' یہ جملہ خبریہ ہے۔ یا دعائیہ ہے۔

انااذا نزلنا اس سے مراد اہل اسلام ہیں یا اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کا گروہ ہے۔

''اذا نزلنا بساحة قوم'': علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مستأ نفہ ہے۔ خیبر کے خراب ہونے کی وجہ کا بیان ہے اور ''اللّٰه اكبر اللّٰه اكبر '' میں تعجب کا معنی ہے۔ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے میدانوں میں مسلمانوں کے قبضہ اور اترنے کو ان کے ڈرائے جانے کے بعد مقدر فرما دیا پھر انہوں نے صبح کی اس حال میں کہ وہ اس بات سے غافل تھے۔

شرح مسلم میں ہے کہ '' الساحته'' سے مراد ''فضاء'' ہے اور اصل میں فصا منازل کے درمیان کو کہتے ہیں۔

''فساء صباح المنذرين'':''المنذرين ''ذال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس سے مراد کفار ہیں اور عہد اور جنس دونوں کیلئے ہوسکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا تو اللہ کے عذاب کی وجہ سے ان کی صبح بری ہوئی اور یہ عذاب ان پر حملہ اور قتل کی صورت میں نازل ہوا ہے اور دراصل اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اقتباس ہے:

[أفبعذابنا يستعجلون فاذا نزل بساحتهم فساء صباح المنذرين][الصفت:۱۷۶،۱۷۷] بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ صحن میں اترنے والے عذاب کو حملہ آور لشکر کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ ''نزل '' کا فاعل ضمیر مستر ہے جو عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور بعضوں نے اس سے مراد رسول لیا ایک قرات میں ''نزل'' پڑھا گیا ہے جار مجرور کی طرف اسناد کرتے ہوئے اور لام جنس کے لئے ہے۔ ''صباح '' کو نزول عذاب کیلئے مستعار لیا گیا ہے اور مستعار منہ شب خون مارنے والے لشکر کی صبح ہے لشکروں کے حملے اور غارت گری زیادہ تر صبح کے وقت ہوتی تھی اس لئے انہوں نے غارت گری کو ''صباح'' سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ کسی اور وقت میں واقع ہوئی ہو۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ دشمن کے ساتھ لڑائی کے وقت تکبیر کہنا مستحب ہے اور اس جیسے واقعات میں قرآن سے استشہاد جائز ہے۔ اس کے کئی نظائر ہیں۔ جیسا کہ فتح مکہ اور بتوں کے توڑنے کے وقت فرمایا: ''جآء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقًا'' محاورات اور لغو باتوں میں ضرب الامثال کے طور پر قرآنی آیات کے استعمال کرنے کو علماء نے مکروہ سمجھا ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے اس شخص کے کفر کی تصریح کی ہے جو کلام اللہ کو اپنے کلام میں اس طور پر استعمال کرتا ہے کہ ''يٰحيٰى خذ الكتاب بقوة''۔ یہ کفر ہے۔

جہاں تک بات ہے بتوں کے توڑنے کے وقت ''جآء الحق وزهق الباطل'' فرمانے کی تو یہ استشہاد کے قبیل سے نہیں

بلکہ امتثال کے باب سے ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وقل جآء الحق وزهق الباطل] اور یہ آیت بھی اسی طرح ہے: [وقل رب زدنی علمًا] بلکہ یہ کہنا مستحب ہے۔

عرضِ مرتب:

اس موضوع پر علامہ سیوطیؒ کا ایک رسالہ "رفع الباس و كشف الالتباس فی ضرب المثل من القرآن والا قتباس" بھی ہے، اہل علم کیلئے اس کا مطالعہ انتہائی مفید ہے۔ یہ رسالہ "الحاوی للفتاوی" کی جلد اول کا حصہ ہے۔

۳۹۳۲: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ شَهِدْتُ الْقِتَالَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اِذَا لَمْ يُقَاتِلُ الْقِتَالَ اَوَّلَ النَّهَارِ اِنْتَظَرَ، حَتّٰى تَهُبَّ الْاَرْوَاحُ وَتَحْضُرَ الصَّلَاةُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۶ / ۲۵۸، كتاب الجزيه، باب الجزية و الموادعة، الحديث رقم ۳۱۶۰۔

ترجمہ: "اور حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا ہوں، چنانچہ اگر (کسی دن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت جنگ شروع نہ فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہوائیں چلنے کا انتظار فرماتے اور (ظہر کی) نماز کا وقت ہو جائے"۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

نعمان بن عمرو بن مقرن۔ یہ نعمان "عمرو بن مقرن" کے بیٹے مزنی ہیں۔ لوگ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ وہ "مزینہ" کے چار سو آدمیوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اولاً بصرہ میں رہے۔ پھر کوفہ منتقل ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے "نہاوند" کے عامل تھے۔ ۲۱ھ میں "نہاوند" کو فتح کر کے اسی دن شہید ہوئے۔ ان سے معقل بن یسار، محمد بن سیرین وغیرہ نے روایت کی ہے۔ "مقرن" میں میم پر پیش، قاف پر زبر اور راء پر تشدید کسرہ اور آخر میں نون ہے۔

الفصل الثانی:

۳۹۳۳: عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ شَهِدْتُّ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اِذَا لَمْ يُقَاتِلْ اَوَّلَ النَّهَارِ اِنْتَظَرَ، حَتّٰى تَزُوْلَ الشَّمْسُ، وَتَهُبَّ الرِّيَاحُ، وَيَنْزِلَ النَّصْرُ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۱۳، كتاب الجهاد، باب ای وقت يستحب اللقاء، الحديث رقم ۲۶۵۵، والترمذی فی ۴ / ۱۳۷، الحديث رقم ۱۶۱۳، وأحمد فی المسند ۵ / ۴۴۴

ترجمہ: "حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ (لڑائیوں میں) شریک ہوا ہوں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر دن کے ابتدائی حصہ میں (یعنی صبح کے وقت) جنگ کی ابتداء نہ کرتے تو اس وقت تک (جنگ کی ابتداء کرنے کا) انتظار کرتے جب تک کہ سورج نہ ڈھل جاتا، ہوا نہ چلنے لگتی اور نصرت (یعنی فتح کی ہوا)

نازل نہ ہو جاتی' (یا نصرت نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ظہر کی نماز کے بعد مجاہدین اسلام کے لئے مسلمانوں کی دعا کی برکت سے فتح کے آثار ظاہر نہ ہو جاتے)''۔(ابوداؤد)

تشریح: قال :شهدت: ایک نسخہ صحیحہ میں'' القتال'' کا لفظ بھی ہے۔

و کان:اور ایک نسخہ میں''فکان'' ہے۔

۳۹۳۴:وَعَنْ قَتَادَةَ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ :غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَانَ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ اَمْسَكَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتْ قَاتَلَ، فَإِذَا انْتَصَفَ النَّهَارُ اَمْسَكَ حَتّٰى تَزُوْلَ الشَّمْسُ فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ قَاتَلَ حَتّٰى الْعَصْرِ، ثُمَّ اَمْسَكَ حَتّٰى يُصَلِّيَ الْعَصْرَ، ثُمَّ يُقَاتِلُ قَالَ قَتَادَةُ : كَانَ يُقَالُ عِنْدَ ذٰلِكَ تَهِيْجُ رِيَاحُ النَّصْرِ وَيَدْعُوْ الْمُؤْمِنُوْنَ لِجُيُوْشِهِمْ فِي صَلَاتِهِمْ ۔(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٣٦ كتاب السير' باب ما جاء فی الساعة التی يستحب فيها القتال ' الحديث رقم ١٦١٢۔

ترجمہ:''اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ'حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ساتھ جہاد کیا ہے' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم طلوع فجر کے بعد اس وقت تک (جنگ شروع کرنے سے) رکے رہتے جب تک کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے فارغ نہ ہو جاتے اور سورج طلوع نہ ہو جاتا) پھر جب سورج طلوع ہو جاتا تو جنگ شروع کر دیتے اور جب دوپہر ہو جاتی (یعنی شرعی دوپہر کہ وہ چاشت کا وقت ہے جو دوپہر کے قریب ہوتا ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم (جنگ سے) رک جاتے۔ یہاں تک کہ سورج ڈھل جاتا پھر جب سورج ڈھل جاتا (اور ظہر کی نماز پڑھ لیتے) تو عصر تک جنگ کرتے اور پھر (جنگ سے) رک جاتے یہاں تک کہ عصر کی نماز پڑھ لیتے پھر جنگ میں مشغول ہو جاتے''۔قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کہا جاتا تھا (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جنگی نظام الاوقات کی حکمت کے بارے میں کہا کرتے تھے) کہ یہ اس وجہ سے تھا کہ ان اوقات میں فتح و نصرت کی ہوائیں چلتی ہیں اور مسلمان اپنی نماز میں اپنے لشکروں کے لئے (فتح و کامرانی کی) دعائیں کرتے ہیں (یعنی نماز کے بعد دعائیں مانگتے ہیں یا نماز کے دوران ہی دعائیں کرتے ہیں جیسا کہ قنوت پڑھنے کے سلسلہ میں احادیث منقول ہیں)۔''(ترمذی)

تشریح: قوله غزوت مع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ثم یقاتل:''غزوت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اور ایک نسخہ میں''مع رسول الله'' ہے۔

فکان اذال طلع الفجر: طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر فاء تفصیلیہ ہے۔اس لئے کہ آپ کا یہ قول''غزوت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' اجمال پر مشتمل ہے۔جس کے بعد اس کو مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

''حتی تزول الشمس'' اس نہار سے مراد نہار عرفی ہے۔تقدیری عبارت یوں ہوگی:''حتی تزول ویصلی الظهر''۔

''قاتل حتی العصر'': ''حتی'' بمعنیٰ ''الٰی'' ہے۔
''ثم أمسك حتی یصلی العصر ثم یقاتل: اور شاید یہ تب ہوتا ہوگا جب آپ ﷺ خود قتال کی ابتداء کرتے تھے۔ صلوۃ الخوف غلبہ کفار پر محمول ہے۔

قوله: قال قتادة كان يقال ......:

''قال قتادة كان يقال'': ایک نسخہ میں ''يقول'' ہے۔ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کے زوالِ شمس تک قتال سے رکے رہنے میں حکمت اور مصلحت یہ تھی کہ اس وقت مدد کی ہوائیں چلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نُصِرت بالصباء''۔
''ویدعو المؤمنون لجیوشهم فی صلاتهم'' یعنی نماز سے فراغت کے بعد اوقات نماز میں دعاء کرتے۔ یا مراد یہ ہے کہ اثنائے صلوٰۃ میں قنوت نازلہ پڑھتے۔
علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ آپ ﷺ کا اوقات مذکورہ میں قتال کو چھوڑنا اس وجہ سے تھا کہ وہ ان اوقات میں نمازوں میں مشغول ہو جاتے تھے۔ سوائے عصر کی نماز کے بعد۔ چونکہ یہ وقت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس لئے کہ اس وقت میں کسی نبی کو اللہ کی خصوصی مدد و نصرت حاصل ہوئی تھی نبی کریم ﷺ نے فرمایا:
''غزا نبی من الانبیآء عدنا من القریة صلاة العصر اوقریباً من ذالك فقال للشمس انك مأمورةٌ وانا مأمورٌ اللهم احسبها علینا فحسب حتی فتح علیه''۔ (رواه البخاری عن أبی هریرة)
''آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ایک نبی نے جہاد کیا۔ جب وہ ایک گاؤں کے قریب پہنچے تو اس وقت عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ یا قریب تھا۔ تو اس نبی نے سورج سے فرمایا کہ تو بھی مامور ہے اور میں بھی مامور ہوں۔ (اور پھر یہ دعا مانگی) یا اللہ! اس سورج کو ہم پر روک دے۔ پس سورج رکا رہا۔ یہاں کہ اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو فتح دے دی۔
اور شاید اسی راز کی وجہ سے حدیث میں اس وقت کو فعل مضارع کے ساتھ ذکر کیا۔ جبکہ دیگر اوقات کو بصیغہء ماضی ذکر کیا تاکہ سامع کے ذہن میں یہ حالت مستحضر ہو جائے۔ اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے کہ اس وقت میں گھمسان کی جنگ ہوا کرتی تھی۔

۳۹۳۵: وَعَنْ عِصَامٍ الْمُزَنِيِّ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَقَالَ: اِذَا رَأَيْتُمْ مَسْجِدًا اَوْسَمِعْتُمْ مُؤَذِّنًا فَلَا تَقْتُلُوْا اَحَدًا۔ (رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۹۸، الحدیث رقم ۲۶۳۵، والترمذی ٤ / ۱۰۲، کتاب السیر، باب النهی عن الإغارة إذا رأی مسجدا وسمع أذانا، الحدیث رقم ۱۵٤۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت عصام مزنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں (جہاد کے لئے) ایک چھوٹے لشکر میں روانہ کیا اور فرمایا کہ ''جب (کسی جگہ) تم کوئی مسجد دیکھو یا مؤذن کو (اذان دیتے) سنو تو وہاں کسی کو قتل نہ کرو''۔ (ترمذی، ابوداود)

راویٔ حدیث:

عصام مزنی۔ یہ عصام مزنی ہیں ان کو آنحضور ﷺ سے صحبت وروایت دونوں میسر ہیں۔ یہ بہت کم حدیث بیان کرنے والے صحابہ میں سے ہیں۔ ان کی حدیث ''باب الجہاد'' میں ہے جس کی تخریج امام ترمذی اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے کی ہے لیکن ان دونوں نے حدیث کو ان کی طرف منسوب نہیں کیا۔

تشریح: قوله: اذا رأيتم مسجدا أو سمعتم مؤذنا''......:

۔ مطلب یہ کہ جب تمہارے سامنے شعائر اسلام کی کوئی علامت تحقیقی طور پر ظاہر ہوجائے، چاہے وہ علامت فعلی ہو یا قولی ہو، تم کسی کو قتل مت کرو یہاں تک کہ تم مؤمن کو کافر سے جدا نہ کرلو۔

الفصل الثالث:

خالد بن ولید کا خط اہل فارس کے نام

۳۹۳۶: عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ قَالَ : كَتَبَ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ اِلٰى اَهْلِ فَارِسٍ :بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ اِلٰى رُسْتَمَ وَمِهْرَانَ فِيْ مَلَاءِ فَارِسٍ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اَمَّا بَعْدُ، فَاِنَّا نَدْعُوْكُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ، فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَاَعْطُوْا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَاَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَاِنَّ مَعِيَ قَوْمًا يُحِبُّوْنَ الْقَتْلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَا يُحِبُّ فَارِسُ الْخَمْرَ، وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔

(رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوى شرح السنة۔

ترجمہ: ''حضرت ابووائل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اہل فارس یعنی ایران کے لوگوں (یعنی ان کے بادشاہوں اور سرداروں) کو یہ خط بھیجا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ خالد بن ولید کی طرف سے رستم و مہران کے نام جو زعماء ایران میں سے ہیں اس شخص پر سلامتی ہو جو حق وہدایت کی پیروی کرے۔ بعدازاں! واضح ہو کہ ہم (یعنی مسلمان) تمہیں اسلام (قبول کرنے) کی دعوت دیتے ہیں' اگر تم نے (اسلام قبول کرنے سے) انکار کیا تو اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کرو اس حال میں کہ تم ذلیل ورسوا ہو اور اگر تم اس (جزیہ ادا کرنے) سے (بھی) انکار کرو گے تو تمہیں آگاہ ہوجانا چاہئے کہ ہلاکت وپشیمانی تمہارا مقدر بن چکی ہے کیونکہ) بلاشک وشبہ میرے ساتھ ایسی قوم ہے جو اللہ کی راہ میں خون بہانے کو (یا خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کردینے کو) اسی طرح پسند کرتے ہیں جس طرح ایران کے لوگ شراب کو پسند کرتے ہیں اور سلامتی ہو اس پر جو حق وہدایت کی پیروی کرے''۔ (یعنی جس طرح تم ایران والوں کو شراب کے نشہ میں کیف وسرور حاصل ہوتا ہے اسی طرح میری جماعت کے لوگوں کو قتل وقتال میں سرمستی وسرشاری حاصل ہوتی ہے یا ان کو جان لینے اور جان دینے میں وہی خوشی اور وہی لذت حاصل ہوتی ہے جو تم

شراب پینے میں محسوس کرتے ہو)۔ (شرح السنۃ)

راویٔ حدیث:

ابو وائل۔ ابو وائل کا نام شقیق ہے۔ سلمہ کے صاحبزادے ہیں۔ اسدی وکوفی ہیں۔ زمانہ جاہلیت واسلام دونوں پائے آنحضرت ﷺ کو پایا لیکن آپ ﷺ کو دیکھا نہیں، نہ آپ ﷺ سے کوئی حدیث سنی۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعث سے قبل میری عمر دس سال تھی۔ میں اپنے خاندان کی بکریاں جنگل میں چراتا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بہت سے حضرات سے (جن میں عمر بن الخطاب، ابن مسعود رضی اللہ عنہما شامل ہیں) روایت کرتے ہیں۔ یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بڑے شاگردوں میں سے ان کے خاص شاگرد تھے۔ حدیث بکثرت نقل کرتے ہیں۔ یہ ثقہ (قابل اعتماد) اور ثبت (اپنی روایت پر قائم رہنے والے) حجتہ ہیں۔ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں وفات پائی۔

تشریح: قوله: كتب خالد بن الوليد۔۔۔وانتم صاغرون: ''رستم'' راء کے ضمہ، سین کے سکون اور ''تاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

''مهران'': میم کے کسرہ اور فتح کے ساتھ منقول ہے۔

عرضِ مرتب:

یہ اصل میں ''ماہ ران'' تھا۔ اھ

''في ملا فارس'': یہ دونوں مجروروں (یعنی الی أهل فارس، اور الی رستم) سے حال ہے۔ ای كائنين في زمرة أكابر فارس'' اور اشرف کہتے ہیں کہ ''ملأ'' قوم کے سردار اور ان کے آگے کے لوگوں کو کہتے ہیں۔

''تدعوكم الى الاسلام، فان ابيتم فأعطوا الجزية عن يدٍ'' عن يد: ضمیر سے حال ہے۔ أي عن يد مؤاتية بمعنى منقادين أو عن يدكم بمعنى مسلمين بأيد يكم غير باعثين بأيدى غير كم یعنی اپنے ہاتھوں سے حوالے کر دو کسی اور کے ہاتھ نہ بھیجو۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس حالت میں دو کہ جب تم غنی اور مالدار ہو اس لئے کہ فقیر سے نہیں لیا جائے گا۔ ''جزیہ'' سے حال ہے۔ أي نقدا مسلمة عن يد الى يد جس کا معنی یہ بنے گا کہ نقدی کی حالت میں دو۔ جو ہاتھ در ہاتھ ہو یا اس وجہ سے دو کہ ہم نے تم پر انعام واحسان کیا ہے۔ اس لئے کہ تمہیں جزیہ کے بدلے باقی رکھنا بڑی نعمت واحسان ہے۔

''وأنتم صاغرون'' ضمیر سے حال ثانی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ ذمی سے جزیہ ضرور لیا جائے گا اور اس کی گردن پہ (ہنٹر وغیرہ) مارا جائے۔ (بیضاوی)

حضرت خالد بن ولیدؓ کے کلام میں آیت قرآن سے اقتباس ہے اور اس کی تفسیر وتشریح ہے۔ اس لئے کہ یہ جزیہ ان کی طرف سے قبول اسلام پر دلالت نہیں کرتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اس لئے یہ بات ذکر نہ کی ہو کہ یہ بالکل واضح ہے۔

قوله: فان أبيتم فان معنى قوما۔۔۔فارس الخمر:

القتل: بمصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی وہ قتل ہونے کو پسند کرتے ہیں۔

''یحب'': بصیغہء مذکر ومؤنث دونوں قتل طرح درست ہے۔

شراب کی کڑواہٹ کے باوجود اس سے محبت کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں شراب میں کچھ حسی لذتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کیلئے قتل ہونے میں لذتیں ہیں۔ اگرچہ طبعًا مکروہ لگتا ہے مگر اہل اسلام کے دلوں میں اس سے محبت ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسی حسی اور معنوی لذتیں ہیں جو باقی رہیں گی۔ اس طرح دونوں (شراب وقتل) میں وجہ شبہ واضح ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ ''خالد'' یوں کہتے لڑائی کیلئے تیار ہو جاؤ۔ اس کی جگہ فرمایا کہ بے شک میرے پاس ایسی ایسی قوم ہے اور مسلمانوں کی موت اور ملاقات کو تشبیہ دی اہل فارس کا خمر کے ساتھ محبت کی اور تشبیہ کی غرض ان کی دلیری اور بہادری بتلانا ہے کہ یہ لوگ سخت جنگجو ہیں۔

فوارس لا یملون المنایا ☆ اذا دارت رحی الحرب الزبون

جبکہ ان اہل فارس میں شجاعت نامی کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو لہو اور طرب میں مشغول رہتے ہیں۔ جیسا کہ عورتیں ہوتی ہیں۔

فخرت بأن لك مأكولاً و لبسًا

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ شجاعت ان کی طبیعت میں ایسی داخل ہے کہ اس کے نہ ہونے کی صورت میں وہ موت کو پسند کرتے ہیں۔ جیسا کہ اہل فارس ''خمر'' کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ ان کو خون کی گرمی پر ابھارتی ہے اور ان کی شجاعت کو قوت دیتی ہے۔ اس صورت میں تعریض ہے کہ (اہل فارس) کی بہادری عارضی ہے، طبعی اور خلقی نہیں ہے۔

قوله: ''والسّلام علٰی من اتبع الهدٰی'' :

پہلا سلام ابتدائی تھا اور یہ سلام اختتامی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اول وآخر سلام اس پر ہو جو ظاہراً اور باطناً اتباع ہدایت کرے۔

بَابُ الْقِتَالِ فِي الْجِهَادِ

جہاد میں لڑنے کا بیان

اس باب میں قتال پر ابھارنے اور ترغیب دینے کا بیان ہوگا، اور یہ کہ کفار کے ساتھ جہاد کرنے میں ثواب عظیم ہے۔

الفصل الاول:

خلوصِ نیت کے ساتھ لڑنے والے مجاہد کا مقام

۳۹۳۷: عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ أُحُدٍ: أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ، فَأَيْنَ أَنَا؟ قَالَ: فِي الْجَنَّةِ۔ فَأَلْقَى تَمَرَاتٍ فِي يَدِهٖ، ثُمَّ قَاتَلَ حَتّٰى قُتِلَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۷ / ۳۵٤ كتاب المغازي، باب غزوه احد، الحديث رقم ٤٠٤٦، و مسلم في ۳ / ۱۵۰۹، الحديث رقم (٤٣ ـ ۱۸۹۹) والنسائي في السنن ٦ / ٤٤، الحديث رقم ۳۱۵٤، وأحمد في المسند ۳ / ۳۰۸

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ احد کی جنگ کے دن (میدان جنگ میں) ایک شخص نبی کریم ﷺ سے عرض کرنے لگا کہ ''آپ بتائیے! اگر میں قتل کیا جاؤں (یعنی دشمنانِ اسلام سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں) تو میں کہاں ہوں گا؟ (یعنی جنت میں جاؤں گا یا دوزخ میں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں (یہ سنتے ہی) اس شخص نے (جنت میں پہنچ جانے کی تمنا میں مرتبۂ شہادت جلد سے جلد حاصل کرنے کے لئے) وہ کھجوریں پھینک دیں جو (کھانے کے لئے) اس کے ہاتھ میں تھیں اور لڑائی میں مشغول ہو گیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا''۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: ''یہ شخص ''عمیر بن حمام'' نہیں تھے۔ جیسا کہ پہلے گذرا ہے۔ اس لئے کہ وہ تو غزوہ ''بدر'' میں شہید ہو گئے تھے۔

جہاد میں ''توریہ'' کا بیان

۳۹۳۸: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرِيْدُ غَزْوَةً إِلَّا وَرّٰى بِغَيْرِهَا، حَتّٰى كَانَتْ تِلْكَ الْغَزْوَةُ يَعْنِيْ غَزْوَةَ تَبُوْكَ غَزَاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَرٍّ شَدِيْدٍ، وَاسْتَقْبَلَ سَفَرًا بَعِيْدًا وَمَفَازًا وَعَدُوًّا كَثِيْرًا، فَجَلّٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ أَمْرَهُمْ لِيَتَأَهَّبُوْا أُهْبَةَ غَزْوِهِمْ، فَأَخْبَرَهُمْ بِوَجْهِهِ الَّذِيْ يُرِيْدُ۔ (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ۸ / ۱۱۳ كتاب المغازي، حديث كعب بن مالك، الحديث رقم ٤٤١٨، و مسلم

فی ٤ / ٢١٢٠' الحديث رقم (٥٣ ـ ٧٦٩) وأحمد فی المسند ٣ / ٤٥٦

ترجمہ: ''حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی غزوہ (یعنی جہاد کرنے) کا ارادہ کرتے تو اس کے بجائے دوسرے کا توریہ فرماتے یہاں تک کہ یہ غزوہ یعنی غزوۂ تبوک واقع ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک سخت ترین گرمی میں لڑا' آپ ﷺ کو اس سفر میں دور دراز کے سفر' بے آب و گیاہ راستوں اور دشمن کی کثیر تعداد کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے (جب اس غزوے کا ارادہ فرمایا تو) مسلمانوں کے لئے ان کے معاملہ کو واضح کر دیا (اور اس غزوے کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور پریشانیوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا) تا کہ وہ لوگ (جنگ کے لئے) اچھی طرح تیار ہو جائیں اور (اپنے سامان جہاد کو درست کر لیں!) نیز آپ ﷺ نے ان (صحابہ رضی اللہ عنہم) کو ان راستوں اور مقامات کے بارے میں بھی بتا دیا تھا جن کو آپ ﷺ (تبوک پہنچنے کے لئے) اختیار کرنا چاہتے تھے''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: لكن رسول الله ﷺ ۔۔۔ الاوری بغيرها:

''النہایہ'' میں ہے کہ **ورّی بغیرہ**: چھپانا اور کنایہ میں بات کرنا اور یہ وہم دینا کہ وہ کسی اور چیز کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ اصل میں ''وراء'' سے ہے۔ جس کا مطلب ہے **القی البیان وراء ظهره**' بیان کو پس پشت ڈالنا۔

ابن الملک کہتے ہیں کہ اس کو کسی اور بات سے چھپانا اور یہ ظاہر کرنا کہ آپ ﷺ کسی اور چیز کا ارادہ رکھتے ہیں تا کہ دشمن کو غفلت میں رکھا جائے اور ان کے جاسوس سے محفوظ رہا جائے آپ ﷺ کا یہ توریہ تعریض کے طور پر تھا۔ مثلاً آپ ﷺ کا ارادہ مکہ والوں سے جہاد کا ہوتا اور لوگوں سے خیبر کے حالات پوچھتے اس کے راستوں کے متعلق پوچھ لیتے۔ صراحۃً یوں نہ فرماتے تھے کہ میں فلانی جگہ والوں کے ساتھ غزوہ کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ جھوٹ جائز نہیں ہے۔

قوله: حتی کانت تلك الغزوة ......:

''**غزاها رسول الله ﷺ فی حرٍ شديد**'': یہ جملہ مستانفہ ہے اور علت کو بیان کر رہا ہے۔

توضیح وتخریج:

امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت متفق علیہ ہے لیکن یہ الفاظ بخاری رحمہ اللہ کے ہیں۔

جنگ ایک دھوکہ

۳۹۳۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ١٥٨ ' كتاب الجهاد' باب الحرب خدعة' الحديث رقم ٣٠٣٠' و مسلم فی ٣ / ١٣٦١' الحديث رقم (٥٣ ـ ٧٦٩) وأحمد فی المسند ٣ / ٤٥٦

ترجمہ: ''اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنگ مکر و فریب (کا نام) ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله:الحرب خدعة:خدعة:''خاء'' کےفتحہ کےساتھ اصح ہے۔البتہ''خاء'' کےضمہ کےساتھ مشہور ہے اورکسرہ بھی جائز ہے۔''قاموس'' میں ہے:الحرب خدعة مثلثة ۔اس پر تینوں حرکات جائز ہیں۔تینوں طرح روایت کیا گیا ہے۔

مختصرالنہایہ للسیوطی میں ہے کہ خاء کے فتحہ وضمہ اوردال کے سکون کے ساتھ ہے اورضمہ کی صورت دال کے فتحہ کے ساتھ بھی منقول ہے۔

پہلے کا معنی یہ ہوگا کہ جنگ کا معاملہ ایک دھوکہ کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جب مقابل ایک دفعہ دھوکہ دے دیتا ہے تو اس کیلئے پھر کوئی معافی نہیں ہے۔ یہ روایت دیگر تمام روایات سے افصح واضح ہے۔دوسری صورت میں یہ''خداع'' سے اسم ہوگا۔

اور تیسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جنگ لوگوں کو دھوکہ دیتی ہے،ان کو ماردیتی ہے اوران کے ساتھ کوئی وفا نہیں کرتی ۔جیسا کہ کہا جاتا ہے: فلان رجل لعبة و ضحكة۔یہ اس آدمی کے بارے میں کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ ہنستا ہو اوراس کے ساتھ بہت زیادہ کھیل کود کیا جاتا ہو۔

عیاضؒ ''الشارق'' میں لکھتے ہیں: قوله:الحرب خدعة اور صحیحین کے اکثر رواۃ نے اسی طرح نقل کیا ہے اوراصیلی نے ''خدعة'' ضبط کیا ہے اورابوذر کا کہنا ہے کہ نبی کریم کی لغت میں "خدعة" (خائے معجمہ کے) فتحہ کے ساتھ ہے اوراصمعی وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں اور یونس نے اس میں دونوں صورتیں نقل کی ہیں اور تیسری صورت خاء کے ضمہ اوردال کے فتحہ کے ساتھ ہے اور چوتھی لغت دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے اور جنگ کے دھوکہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کا معاملہ ایک دھوکہ کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔چنانچہ آدمی جنگ میں دھوکہ کھا جاتا ہے اس کے قدم پھسل جاتے ہیں اس کے پاس تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوتی گویا کہ آپ ﷺ نے اس پر متنبہ کیا کہ اس سے بچنا چاہیے۔

جن حضرات نے خاء کو ضمہ اوردال فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے گویا کہ انہوں نے اس فعل کو حرب کی طرف منسوب کیا ہے کہ جو اس سے بےخوف و مامون ہوتا ہے۔جنگ اس شخص کو دھوکہ دے جاتی ہے

دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں یہ''خادع'' کی جمع ہوگی اور مطلب یہ ہوگا کہ اہل حرب ایسے ہوتے ہیں ان سے مامون نہیں رہنا چاہئے گویا کہ اصل ارشاد گرامی یوں ہے:اهل الحرب خدعة ۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں''خدعة'' تین طرح روایت کیا گیا ہے:

① خاء کے فتحہ اوردال کے سکون کے ساتھ کہ جنگ ایک دھوکہ ہے۔جو دھوکہ دے گیا کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔

② خاء کے ضمہ اوردال کے سکون کے ساتھ کہ اکثر و بیشتر جنگ مکروفریب ہے۔

③ خاء کے ضمہ اوردال کے فتحہ کے ساتھ کہ جنگ انسان کو بہت ہی دھوکہ دیتی ہے کہ انسان کے طرح طرح کے خیال اور تمنائیں ہوتی ہیں لیکن جب وہ میدان جنگ میں اترتا ہے تو اپنی آرزوؤں کے برعکس پاتا ہے اوراصل میں''خدع'' کسی معاملے کا اظہار کرنا اوراس کے خلاف کو چھپائے رکھنا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں فصیح ترین لغت۔ خاء کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ ہے اور یہی نبی کریم ﷺ کی لغت ہے اور علمائے امت اس بات پر متفق ہیں کہ جنگ میں کفار کے ساتھ دھوکہ جائز ہے۔ خواہ جیسے بھی ہو۔ مگر اس وقت جائز نہیں ہے جب اس میں عہد و پیمان کا نقض ہو حدیث شریف میں ہے کہ تین چیزوں میں جھوٹ بولنا جائز ہے۔

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنگ میں تعریض کے طور پر جھوٹ بولنا جائز ہے' اگر چہ حقیقت میں جائز نہیں ہے۔ لیکن ظاہر میں حقیقت کذب بھی جائز ہے۔ لیکن تعریض پر عمل کرنا افضل اور اولیٰ ہے۔

روایات باب:

① اس حدیث کو شیخین نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

(أخرجه البخاري فی ۱۵۸/۶، الحدیث رقم ۳۰۲۹، ومسلم فی ۱۳۶۲/۳، الحدیث رقم (۱۸-۱۷۴۰)

② اس حدیث کو امام احمد نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ (احمد فی المسند ۲۲۴/۳)

③ امام ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔

(أخرجه ابن ماجه فی السنن ۹۴۵/۲ الحدیث رقم ۲۸۳۳ عن عائشة والحدیث ۲۸۳۴ عن ابن عباس)

⑤ امام بزار نے یہ حدیث حسینؓ سے نقل کی ہے۔ (أخرجه فی کشف الأستار عن الحسن ۲۸۸/۲، الحدیث رقم ۱۷۲۵)

⑥ امام طبرانیؒ نے حضرت حسنؓ، زیدؓ بن ثابت، نواسؓ بن سمعان سے روایت کی ہے

⑦ الجامع الصغیر میں بھی اسی طرح منقول ہے (الجامع الصغیر ۲۳۲/۱، الحدیث رقم ۳۸۱۲)

جہاد میں خواتین کی شرکت

۳۹۴۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ : کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَغْزُوْ بِاُمِّ سُلَیْمٍ وَنِسْوَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ مَعَهٗ اِذَا غَزَا یَسْقِیْنَ الْمَاءَ وَیُدَاوِیْنَ الْجَرْحٰی ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۳۳٤' کتاب الجهاد والسیر' باب غزوة الرجال' الحدیث رقم (۱۳۵-۱۸۱۰) و أبو داود فی السنن ۳ / ۳۹' الحدیث رقم ۲۵۳۱' والترمذی فی ٤ / ۱۱۸' الحدیث رقم ۱۵۷۵

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب (صحابہ کے ہمراہ) جہاد میں تشریف لے جاتے تو اپنے ساتھ اُم سلیم رضی اللہ عنہا اور انصار کی دوسری عورتوں کو بھی لے جاتے' وہ عورتیں (غازیانِ اسلام کو) پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور ان کا علاج کرتیں''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: کان رسول الله ﷺ یغزو۔۔۔نعه:

''معه'' یہ مع ''معنی مصاحبت کی'' تاکید کیلئے ہے اور ایک نسخہ میں ''رفع'' کے ساتھ بھی منقول ہے۔ پس اس صورت میں یہ جملہ حالیہ ہوگا۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ ''جر'' کے ساتھ روایت ہو اور ''ام سلیم'' پر عطف ہو۔ تو پھر ''معه'' کہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ''ام سلیم'' کی باء بھی اس معنی میں ہے۔ پس یہ مبتداء ہونے کی بناء پر مرفوع ہے

اور ''معه'' اس کی خبر ہے اور یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله: اذا غزا مع اصحابه ....:

''یسقین'': یہ لفظ ''یاء'' کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ منقول ہے اور ایک نسخہ میں ''فیسقین'' ہے۔ پس اس صورت میں ''اذا'' ظرفیت کے لئے ہوگا۔ بمعنی ''مع'' اور پہلی صورت میں یہ شرطیہ ہوگا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ علاج معالجہ وہ اپنے محارم اور شوہروں کا کرتی تھیں اور دوسرے لوگوں کا علاج معالجہ اس نوعیت کا کرتی تھیں کہ ان کے جسم کو نہ چھوتی تھیں' کیونکہ جسم کو مس کرنا صرف موضع حاجت میں ہی جائز اور درست ہے۔ علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ مداوات اور پانی پلانے کے لئے بوڑھی عورتوں کو ساتھ لے جایا جائے اور اگر زیادہ ضرورت پڑے تو پھر لونڈیوں کو نکالا جائے، اور حرائر عورتوں کو چھوڑا جائے۔ البتہ ''قتال'' میں براہ راست شریک نہ ہوں اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کی کمزوری پر استدلال ہوگا۔ البتہ ضرورت کے وقت یہ بھی جائز ہوگا۔ چنانچہ ''ام سلیم'' نے حنین میں بہت لڑائی کی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس پر برقرار رکھا۔ جیسا کہ فرمایا کہ یہ عورت فلاں مرد سے بہتر ہے۔ یعنی فلاں شکست خوردہ مفرور سے بہتر ہے۔

جہاد میں خواتین کے اُمور

۳۹۴۱: وَعَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ' اَخْلُفُهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ فَاَصْنَعُ لَهُمُ الطَّعَامَ وَاُدَاوِيْ الْجَرْحٰى وَاَقُوْمُ عَلَى الْمَرْضٰى۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٤٤٧' كتاب الجهاد والسير' باب النساء الغازيات' الحديث رقم (١٤٢ ـ ١٨١٢) وابن ماجه فى ٢ / ٩٥٢' الحديث رقم ٢٨٥٦' والدارمى فى ٢ / ٢٧٦ ' الحديث رقم ٢٣٢٥' وأحمد فى المسند ٦ / ٤٠٧

ترجمه: ''اور حضرت اُم عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں شریک ہوئی ہوں۔ میں (میدان جنگ میں) ان (مجاہدین) کے پیچھے ان کے ڈیروں میں رہا کرتی تھی (جہاد میں) ان کے لئے کھانا پکاتی' زخمیوں کی مرہم پٹی اور ان کا علاج کرتی اور بیماروں کی دیکھ بھال (اور خدمت) کیا کرتی تھی''۔ (مسلم)

عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی ممانعت

۳۹۴۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ١٤٨' كتاب الجهاد باب قتل الصبيان' الحديث رقم ٣٠١٥ و مسلم فى ٣ /

١٣٦٤' الحديث رقم (٢٥ ـ ١٧٤٤) و أبو داود فى السنن ٣ / ١٢١' الحديث رقم ٢٢٦٨' والترمذى فى ٤ / ١١٦' الحديث رقم ١٥٦٩' وابن ماجه فى ٢ / ٩٤٧' الحديث رقم ٢٥٤١' و مالك فى المؤطا ٢ / ٢٤٧' الحديث رقم ٩' وأحمد فى المسند ٢ / ٢٢

ترجمه: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دورانِ جنگ) عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تخریج اصحاب صحاح ستہ میں سوائے امام نسائی رحمہ اللہ کے سب نے کی ہے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میدان جنگ میں ایک عورت مقتولہ پائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں اور عورتوں کے قتل سے منع فرمادیا۔

فرماتے ہیں کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا بالا جماع حرام ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے جب یزید بن ابی سفیان کو شام کی طرف بھیجا تو اس کو یہ وصیت کی کہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو مت قتل کرنا۔

اور فرمایا لیکن ان میں سے جو بھی لڑائی کریں ان کے ساتھ لڑو۔ یعنی مجنون، بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور راھبوں کو نہیں قتل کیا جائے گا مگر یہ کہ یہ حالت قتال میں ہوں۔ اس صورت میں ان کو قتل کیا جائے گا۔ البتہ عورتیں اور راہب جب لڑائی کریں تو ان کو قید کرنے کے بعد قتل کیا جائے گا اور ملکہ اگر چہ لڑائی نہ بھی کرے تب بھی اس کو قتل کیا جائے گا اور اسی طرح اگر بچہ یا معتوہ بادشاہ ہو تو ان کو بھی قتل کیا جائے گا۔ اس لئے کہ ان کے قتل میں ان کی شان وشوکت ٹوٹ جائے گی۔

مشرکین کے اہل خانہ کے احکام

۳۹۴۳: وَعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَهْلِ الدِّيَارِ يُبَيَّتُوْنَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَيُصَابُ مِنْ نِسَائِهِمْ وَذَرَارِيهِمْ قَالَ: هُمْ مِنْهُمْ (وَفِي رِوَايَةٍ) هُمْ مِنْ اٰبَآئِهِمْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ١٤٦' كتاب الجهاد' باب اهل الدار' الحديث رقم ٣٠١٢ و مسلم فى ٣ / ١٣٦٤' الحديث رقم (٢٦ ـ ١٧٤٥) وأخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ١٢٣' الحديث رقم ٢٦٧٢' والترمذى فى ٤ / ١١٦' الحديث رقم ١٥٧٠' وابن ماجه فى ٢ / ٩٤٧' الحديث رقم ٢٨٣٩

ترجمه: ''اور حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھروں میں رہنے والے ان مشرکین کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اگر ان پر شب خون مارا جائے اور اس کے نتیجے میں ان کی عورتیں اور بچے مارے جائیں (تو کیا حکم ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کے جواب میں) فرمایا کہ ''وہ بھی انہیں میں سے ہیں'' اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ اپنے آباء کے تابع ہیں''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''اهل الديار'': اور ایک نسخہ میں ''أهل الدار'' ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ''اهل الديار'' سے مراد ہر وہ قبیلہ ہے جو کسی محلّہ میں یکجا ہو کر رہتا ہو۔
''يبيتون'': مجہول کا صیغہ ہے۔ ''اهل الدار'' سے حال ہے۔
''من المشركين'' ''منْ'' بیانیہ ہے۔ حال ثانی ہے۔ (ذکرہ الطیبیؒ)
''النھایہ'' میں اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ رات کے وقت دشمن پر حملہ کرنا جب کہ بے خبر ہو اور ''بیات'' کا مطلب ہے ''شب خون'' رات کے وقت کا حملہ۔
''وذراريهم'': شرح مسلم میں ہے کہ لفظ ''ذراری'' کو مشدد پڑھنا افصح ہے۔ اس کا اطلاق عورتوں پر اور بچوں ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد بچے ہیں۔ لڑکے ہو یا لڑکیاں ہوں۔
''هُم مِنهم'': یعنی یہ عورتیں اور بچے ان مردوں کے حکم میں ہیں۔ جب تک کہ وہ (مسلمان) ان میں فرق نہ کر سکیں۔ نہ نہی تشخص پر محمول ہے۔
ابن ہمامؒ فرماتے ہیں ایک روایت میں **هم من ابائهم** کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا دفع تعارض کیلئے اس کو سوال کے مورد پر محمول کیا جائے گا مزید فرماتے ہیں: **وذلك أن فيه ضرورة عدم العلم والقصد الى الصغار بأنفسهم، لأن التبييت يكون معه ذلك، والتبييت هوَ المسمى فى عرفنا بالكسية وما الظن الا أن حرمة قتل النساء والصبيان اجماع۔**
اور بعض نے کہا ہے کہ (**هم منهم**) اس سے مراد عورتوں اور بچوں کو قید کرنا ہے۔
قاضیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو قید کیا جائے گا اور ان کو غلام بنایا جائے گا جیسا کہ اگر یہ دن کو آتے ہیں اور جبراً لڑائی شروع کر دیتے ہیں تو ان کو پکڑا جائے گا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر بغیر قصداً و ارادہ کے رات کی تاریکی میں کوئی قتل ہو جاتا ہے تو اس کا کوئی گناہ نہیں ہے ان کا خون ہدر ہوگا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی کافر ہیں اور جہاں ان کے قتل سے احتراز اور بچنے کی بات ہے۔ تو وہ اس وقت ہے جب قصداً ان کو قتل کیا جائے اور اسی وجہ سے اگر مسلمانوں میں سے کسی نے ان کی عورتوں اور بچوں پر ترس کیا تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔
علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں۔ کہ ان پر تیر اندازی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگرچہ ان میں کوئی مسلمان قید ہو۔ یا تاجر ہو۔ اگرچہ یہ تیر مسلمان قیدیوں اور ان کے بچوں کو لگ جائیں۔ خواہ نتیجتاً یہ معلوم ہو کہ نہ ہو۔ ان پر اگر تیر اندازی کی تو مسلمانوں کو شکست ہوگی۔ لیکن بہر حال مسلمانوں پر تیر اندازی کا قصد نہ کیا جائے۔ الّا یہ کہ ان پر تیر اندازی سے رکنے میں مسلمانوں کی شکست لازم آتی ہو۔ امام حسن بن زیادؒ کا یہی قول ہے۔ چنانچہ اگر تیر اندازی کی وجہ سے اور کوئی مسلمان جاں بحق ہو گیا تو حسن بن زیادؒ کے نزدیک اس کی دیت کے بارے میں دو قول ہیں۔ دلائل بسط کے ساتھ شرح میں ملاحظہ فرمائیے۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب امام کوئی شہر فتح کرے اور یہ معلوم ہو کہ اس شہر میں ذمی یا مسلمان ہیں۔ تو کسی کو بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ چونکہ ہر شخص کے بارے میں یہ احتمال ہے کہ وہ مسلمان ہے یا ذمی ہے مگر وہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک شخص نے نکل کر تعارض کیا تو اس کا خون حلال ہے۔ چونکہ ممکن ہے کہ یہی معارض وہ ہو۔ چنانچہ باقی لوگوں کے بارے میں شک ہے۔

برخلاف پہلی حالت کے۔ چونکہ اس میں یہ بات یقینی ہے کہ وہ ذمی ہے یا مسلمان ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کافر بوڑھے کے بارے میں اگر رائے ہو تو قتل کردیا جائے وگرنہ ان کے بارے میں اور رھبان کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کا مذہب اصح یہ ہے کہ ان کو قتل کردیا جائے۔ کافروں کی اولاد کا دنیاوی حکم، ان کے آباء والا ہے۔

کفار کی املاک کو نذر آتش کرنے کا بیان

٣٩٤٤: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطَعَ نَخْلَ بَنِي النَّضِيْرِ وَحَرَّقَ، وَلَهَا يَقُوْلُ حَسَّانٌ :

وَهَانَ عَلٰى سَرَاةِ بَنِيْ لُؤَيٍّ ☆ حَرِيْقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيْرٌ

وَفِيْ ذٰلِكَ نَزَلَتْ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٧ / كتاب المغازي، باب حديث بني النضير، الحديث رقم ٤٠٣١ و مسلم في ٣ / ١٣٦٥، الحديث رقم (٣٠ ـ ١٧٤٦) و أبو داود في السنن ٣ / ٨٧، الحديث رقم ٢٦١٥، والترمذي في ٤ / ١٠٣، الحديث رقم ١٥٥٢، وابن ماجه في ٢ / ٩٤٨، الحديث رقم ٢٨٤٤، والدارمي في ٢ / ٢٩٢، الحديث رقم ٢٤٦٩، وأحمد في المسند ٢ / ٨

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی نضیر کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹا اور ان کو جلا دیا، اسی کے بارے میں دربار رسالت کے صحابی شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ شعر کہا:

وَهَانَ عَلٰى سَرَاةِ بَنِيْ لُؤَيٍّ ☆ حَرِيْقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيْرٌ

''بنی لوی'' کے سرداروں کے لئے پھیلے ہوئے بویرہ پر (کھجوروں کے درختوں) کو جلا ڈالنا آسان ہوگیا''۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

''تم نے کھجور کے درخت پر سے جو کچھ کاٹا یا جو کچھ اس کی جڑ پر کھڑا ہوا چھوڑ دیا (یعنی جو کچھ نہیں کاٹا) یہ سب خدا کے حکم سے ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: ان رسول اللهؐ قطع ......: ''وحرق'': ''راءً'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ (''قطع'' اور ''حرق'' کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف مجازی ہے۔ ازمرتب) مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کھجوروں کے درخت کاٹنے اور پھر اس کو جلانے کا حکم دیا۔

''لها'': یہ ضمیر قصہ ہے یا اس کا مرجع ''النخلة'' ہو۔

سراۃ: ''سری'' کی جمع ہے۔سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔''بنو لؤی'' سے مراد قریش کے سردار اور شرفاء ہیں۔

''حریق'' یہ ''ھان'' کا فاعل ہے اور بمعنی مفعول یعنی ''محروق'' ہے۔

بویرہ اس جگہ کا نام ہے جہاں بنونضیر کے باغات تھے اور ''مستطیر'' کا مطلب ہے پھیلی ہوئی آگ۔

تحریق نخل وقطع کے بارے میں یہ آیت اتری ہے:

''او ترکتموھا'': ''ھا'' ضمیر ''ما'' موصولہ کی طرف راجع ہے اور ضمیر مؤنث اس لئے لائی گئی ہے کہ یہ ''لینة'' کی تفسیر کررہی ہے۔

تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے کہ جب آپ ﷺ نے ان کی کھجوروں کو کاٹنے اور ان کو جلانے کا حکم دیا۔ تو ان یہودیوں نے کہا کہ اے محمد! آپ زمین میں فساد سے منع کرتے ہیں ہے۔ آپ ﷺ خود ان کھجور کے درختوں کو کیوں کاٹتے اور جلاتے ہیں؟ اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ اس سے استدلال کیا ہے کہ کفار کے گھروں کو منہدم کرنا اور ان کے درختوں کو کاٹنا جائز ہے تا کہ ان کو مزید غصہ دلایا جائے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو "اللینة "مذکور ہے اس سے مراد ''عجوة'' کے علاوہ کھجور کی تمام قسمیں اور انواع ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر اچھی قسم کی کھجوریں ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ تمام قسم کی کھجوریں مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ تمام قسم کے درخت مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مدینہ میں ایک سو بیس قسم کی کھجوریں ہیں اس آیت سے کفار کے درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا جواز ملتا ہے اور یہی جمہور کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جائز ہے کیونکہ اس سے مقصود و مطلوب اللہ کے دشمنوں کو رسوا کرنا اور ان کی شان وشوکت کو توڑنا ہے۔ پس جتنا ممکن ہو کہ فساد زرع کیا جائے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ اس کے بغیر ان پر قابو پانا ممکن نہیں لیکن اگر یہ ظاہر ہو کہ وہ مغلوب ہو رہے ہیں اور فتح یقینی ہے تو پھر درختوں کو کاٹنا وغیرہ مکروہ ہے، اسلئے کہ پھر یہ افساد بغیر حاجت کے ہوگا اور افساد تو صرف محل حاجت میں ہی جائز ہے۔

عورتوں اور بچوں کو قیدی بنانے کا بیان

۳۹۴۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَوْنٍ اَنَّ نَافِعًا كَتَبَ اِلَيْهِ يُخْبِرُهٗ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ اَخْبَرَهٗ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَغَارَ عَلٰى بَنِي الْمُصْطَلِقِ غَارِّيْنَ فِي نَعَمِهِمْ بِالْمُرَيْسِيْعِ فَقَتَلَ الْمُقَاتِلَةَ وَسَبَى الذُّرِّيَّةَ۔

(متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥ / ١٧٥، كتاب العتق، باب من ملك من العرب رقيقًا، الحديث رقم: ٢٥٤١، و مسلم في ٣ / ١٣٥٦، الحديث رقم (١ / ١٧٣٠) وأبو داود في السنن ٣ / ٩٧، الحديث رقم ٢٦٣٣، وأحمد في المسند ٢ / ٣١

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام)

حضرت نافع رحمہ اللہ نے ان (عبداللہ بن عون رحمہ اللہ) کو ایک خط بھیجا جس میں حضرت نافع رحمہ اللہ نے ان کو باخبر کیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان (نافع رحمہ اللہ) سے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق پر اس وقت حملہ کیا تھا جب وہ مریسیع مقام میں اپنے مویشیوں کے درمیان غافل پڑے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لڑنے والوں کو قتل کر دیا اور ان کے بچوں کو قیدی بنالیا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:عن عبد الله بن عون ان نافع ......:

عون: اس نسخہ'' میں یہ ''نون'' کے ساتھ ہے یعنی ''عون'' ہے اور دوسرے نسخہ میں ''فاء'' کے ساتھ ہے، یعنی ''عوف'' ہے

المصطلق: بروزن منتقم آخر میں قاف ہے۔

''**غارين**'': راء مشدد کے ساتھ ہے، بنوالمصطلق سے حال واقع ہو رہا ہے۔ بمعنی **غافلين**۔

نعمهم: بروزن ''قلم'' اور متعلق محذوف ہے۔ **أي كائنين في مواشيهم**

''**بالمريسيع**'': تصغیر ہے اور گھاٹی میں بنوالمصطلق کے پانی کا نام ہے جو کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔

''**المقاتلة**'': یہ لفظ ''تاء'' کے کسرہ کے ساتھ ''**مقاتل**'' کی جمع ہے اور جمع کیلئے آخر میں تاء لائے ہیں۔ بظاہر'' **مقاتلة**'' واحد کا صیغہ ہے اور اس کا اطلاق جمع پر کیا گیا ہے اور یہاں اس سے مراد ہر وہ عاقل بالغ مرد ہے جو لڑنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ (ابن الملک)

''**وسبى الذرية**'': ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے کفار کو قتل کرنے اور ان کے اموال کو قبضہ میں لینے کا جواز نکلتا ہے غافل ہوں

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیحین میں ابن عون سے اس طرح روایت ہے کہ فرماتے ہیں

میں نے حضرت نافع سے پوچھا کہ مجھے قتال سے پہلے کی دعاء بتلا دیں۔ جس پر انہوں نے مجھے لکھا کہ ابتدائے اسلام میں حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی المصطلق پر ایسے وقت پر حملہ کیا کہ وہ ہم سے بے خبر تھے۔ ان کے جانور پانی پی رہے تھے۔ اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لڑنے والوں کو قتل کیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا۔ حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا بھی اسی دن مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں تھیں۔ ناطع نے بتلایا کہ یہ بات مجھے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بتلائی ہے وہ اس لشکر میں تھے۔

جنگی حکمت عملی کا بیان

۳۹۴۶: وَعَنْ اَبِیْ اُسَیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ لَنَا يَوْمَ بَدْرٍ حِيْنَ صَفَفْنَا لِقُرَيْشٍ وَصَفُّوْا لَنَا اِذَا اَكْثَبُوْكُمْ فَعَلَيْكُمْ بِالنَّبْلِ (وَفِیْ رِوَايَةٍ) اِذَا اَكْثَبُوْكُمْ فَارْمُوْهُمْ وَاسْتَبِقُوْا نَبْلَكُمْ (رواه البخاری وحديث سعد) هَلْ تُنْصَرُوْنَ (سَنَذْكُرُ فِیْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَاءِ وَحَدِيْثُ الْبَرَاءِ) بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: رَهْطًا (فِیْ بَابِ الْمُعْجِزَاتِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى)۔

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٩١، كتاب الجهاد، باب التحريض على الرمی، الحديث رقم ٢٩٠٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے دن ہمیں ارشاد فرمایا جب کہ ہم قریش کے خلاف اور قریش مکہ ہمارے خلاف صف آراء ہو گئے کہ ''جب وہ (دشمن یعنی قریش مکہ) تمہارے (اتنے) قریب آ جائیں (کہ تمہارے تیر ان تک پہنچ سکیں) تو ان پر تیر اندازی کرو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) ان دشمنوں پر اس وقت تیر اندازی کرو۔ جب وہ تمہارے قریب آ جائیں اور اپنے تیروں کو باقی رکھو (یعنی اپنے سب تیر ختم نہ کر ڈالو بلکہ ان کو احتیاط کے ساتھ استعمال کر کے کچھ باقی بھی رکھو تا کہ دشمن تمہارے نہتے ہونے کا فائدہ اٹھا کر تم پر غالب نہ آ جائے''۔ (بخاری) اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی روایت: **هَلْ تُنْصَرُوْنَ** ''باب فضل الفقراء'' میں اور حضرت براء رضی اللہ عنہ کی روایت: **بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِهْطًا** ''باب المعجزات'' میں ہم ان شاء اللہ ذکر کریں گے''۔

تشریح: قوله: اذا كثبوكم فعليكم بالنبل:

''بالنبل'': نون کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس سے مراد وہ عربی تیر ہے جو زیادہ لمبا نہیں ہوتا ہے اور ایک روایت میں یہ لفظ بغیر ہمزہ کے وارد ہے۔

اكثبوكم: کثب بھی قرب اور نزدیکی کو کہتے ہیں اور ''اكثبوكم'' میں ہمزہ تعدیہ کے لئے ہے اسی وجہ سے اس کو ضمیر کی طرف متعدی کیا ہے۔

قوله: وفى روايت اية اذا كثبوكم ......:

''**وفى روايةٍ**'': اس میں دو احتمال ہیں:

ایک یہ کہ اس سے مراد بخاری کی ایک دوسری روایت ہو۔ دوسرا یہ کہ بخاری کے علاوہ کوئی اور کتاب ہو۔

''**اذا اكثبوكم فارموهم**'': یعنی جب تم ان کے قریب ہو جاؤ تو پھر تیر اندازی کرنا تیر چلانے میں جلدی مت کرو کہ تم دور سے ان کو مارنے لگ جاؤ۔ اس لئے کہ اس سے بسا اوقات تیر بغیر نشانے کے لگ جاتے ہیں اور یوں تیر ضائع ہو جاتے ہیں۔

''**واستبقو نبلكم**'': ابن الملک ؒ فرماتے ہیں کہ یہ ''بقاء'' سے باب استفعال ہے۔ برخلاف اس آیت کے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ [البقرة-۱۴۸] کہ یہ سبق سے باب افتعال ہے۔

مظہر ؒ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ تم تمام تیر ان کو مت مارو اس لئے کہ اگر تم نے ان پر تمام تیر پھینک دیئے تو تم بغیر تیروں کے رہ جاؤ گے۔

الفصل الثانی:

جنگ کے انتظامات کے جائزہ کا بیان

۳۹۴۷:عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ :عَبَّانَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :بِبَدْرٍ لَیْلاً ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه کتاب المغازی' باب ۱۰' ح ۳۹۸۷' والترمذی فی السنن ٤ / ۱٦۷' الحدیث رقم ۱٦۷۷

ترجمه:''حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بدر میں ہمیں رات کے وقت ہی تیار فرمادیا تھا''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله:عبانا النبی ''عبأنا'': یہ لفظ الف کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں ہمزہ کے ساتھ ہے۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ بلا ہمزہ اور ہمزہ کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔کہا جاتا ہے:**عبأت الجیش وعبیتم تعبیة و تعبئة أی لهیاتهم فی موا ضعهم و ألبستهم السلاح** (اسلحہ پہنانا) **أی رتینا وهیأ باللحرب** (لشکر کو جنگ کے لئے مرتب کیا اپنے اپنے مقاموں پر جمایا) اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے تیاری کر لی۔یعنی ہم نے اسلحہ وغیرہ پہن لیا ترتیبات طے ہوگئیں اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے

صاحب قاموس لکھتے ہیں:**عبأ المتاع و الأمر کمنع هیأه** (تیار کرنا) **والجیش جهزه کعباء تعبئة فیها (هذا فی المهموز واما فی المعتل فقال:تعبیة الجیش تهیئته فی مواضعه** (مقام پر جمانا،بٹھانا،مقرر کرنا) موقع محل کی مناسبت سے یہاں معتل سے ہونا زیادہ مناسب ہے۔

''**النبی ﷺ**'':اور ایک نسخہ صحیحہ میں ''**رسول اللّٰه ﷺ**'' کے الفاظ ہیں۔

یعنی مقام بدر میں رات کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صفیں درست کرلیں،اور ہم میں سے ہر ایک کو اس جگہ پر کھڑا کر دیا جو رات میں اس کیلئے مناسب تھی تا کہ اگلے دن وہ اپنی جگہ پر صحیح رہے۔

خفیہ علامت کا بیان

۳۹۴۸:وَعَنِ الْمُهَلَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :اِنْ بَیَّتَکُمُ الْعَدُوُّ فَلْیَکُنْ شِعَارُکُمْ :حٰمٓ لَایُنْصَرُوْنَ۔ (رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۷٤' الحدیث رقم : ۲۵۹۷' والترمذی' کتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء فی الصف' فی ٤ / ۱۷۰ الحدیث رقم ۱٦۷۷۔

ترجمه:''اور حضرت مہلب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے (غزوۂ خندق میں) ہم سے فرمایا کہ اگر

دشمن تم پر شب خون مارے تو تمہاری (یعنی مسلمانوں کی) علامت ''حٰم لَا یُنْصَرُوْنَ'' کے الفاظ ہونے چاہئیں''۔

(ترمذی، ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

مہلب بن ابی صفرۃ۔ یہ ''مہلب'' ہیں۔ ''ابوصفرہ'' کے بیٹے ہیں۔ ''ازدی'' ہیں۔ خوارج کے ساتھ ان کے مخصوص مقامات اور مشہور لڑائیاں منقول ہیں۔ انہوں نے سمرہ اور ابن عمرؓ سے حدیث کی سماعت کی۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں ملک خراسان کے مقام مروالروذ میں ۸۳ھ میں وفات پائی۔ بصرہ کے تابعین میں پہلے طبقہ کے تابعی ہیں۔

تشریح: قوله: ان بيتكم العدو ......:

شعار: شین کے کسرہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور قاموس میں ہے: ''الشعار ككتاب''۔ شعار بروزن ''کتاب'' ہے۔ اس سے مراد وہ علامت اور نشانی ہے جس کے ذریعے جنگوں میں پہچان ہوتی ہے۔ ''شعار'' حالت رفع میں ہے اور ایک نسخہ میں منصوب بھی ہے۔ ''حم'': یہ لفظ فتح اور امالہ دونوں کے ساتھ ہے۔

''لا ينصرون'': یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اس میں ''دعاء'' کا بھی احتمال ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ''خبر'' ہو۔ علامہ قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یعنی تمہاری وہ علامت جس کے ذریعے تم اپنے ساتھیوں کو پہچان سکو وہ یہ کلام یعنی ''حم'' ہے اور شعار اصل میں اس علامت کو کہتے ہیں جو اس لیے مقرر کی جاتی ہے کہ اس شخص علامت کے ذریعہ کوئی شخص اپنے ساتھیوں کو پہنچان سکے۔ ''حم لا ینصرون'' کا معنی ہے: بفضل السور المفتتحة بحم و منزلتها من الله لا ينصرون۔

کہا گیا ہے کہ حوامیم سبعہ کی بڑی شان وارد ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب میں ''آل حم'' میں پڑا تو میں ریاضتوں میں پڑ گیا۔ پس آپ ﷺ نے ان کی عظمت شان کیلئے اس پر متنبہ فرمایا اور اس کی منزلت کو بیان کیا کہ اس کی برکت کی وجہ سے مسلمان غالب ہوں گے۔ نزول برکت و نصرت ہوگا اور دشمنوں پر رسوائی نازل ہوگی۔ پس آپ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ ''حم'' کہنا۔

''وقال: لا ينصرون'': یہ جملہ مستأنفہ ہے سوال مقدر کا جواب ہے اور شاید اس سائل کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ جس نے پوچھا کہ جب میں اس کلمہ کو پڑھوں گا تو پھر کیا ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کفار کی مدد نہیں ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ ''حم'' اللہ کے اسماء میں سے ایک نام ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ ان کی مذمت کر۔ اھ۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اسماء باری تعالیٰ میں یہ نام ثابت نہیں ہے۔

اور اس لئے بھی یہ اللہ کے اسماء میں سے نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ کے تمام اسماء فصیح ہیں حمد وثناء پر دلالت کررہے ہیں، جب کہ ''حم'' دوحرفی ہے اور معجمہ ہے۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاید قائل کی اس سے مراد یہ ہو کہ اس کے حروف اللہ کے اسماء پر دال ہیں۔ جیسا کہ حمید، حي، ملک اور المقتدر وغیرہ بایں طور کہ ان میں سے ہر اسم ''حم'' کے حروف میں سے کسی حرف کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ پس

جوکوئی اس حرف کوذکر کرے گا گویا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا نام لے لیا''المعالم''میں حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ''حم''اللہ کے بڑے اوراعظم ناموں میں سے ہے۔عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حرف''حاء''سے اللہ کے یہ اسماء شروع ہوتے ہیں: حلیم،حمید،حی،حکیم،حنان۔اورمیم سے یہ اسماء شروع ہوتے ہیں: ملک، مجید،منّان''۔

اورامام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ''حم''حاء کے ضمہ اورمیم کی تشدید کے ساتھ ہے اور مطلب ہے: **قضی ماهو کائن** اگر یہ اسم ہوتا جیسا کہ دوسرے اسماء ہیں تو یہ بھی ان کی طرح معرب پڑھا جاتا جیسا کہ شاعر نے اس شعر میں سورہ کا نام بنا کراس کو معرب پڑھا ہے۔

یذکر لی حم والرمع شاجر ☆ فهو تلا حامیم قبل التقدم

اس کوغیر منصرف علیت اورتانیث کی وجہ سے پڑھا ہے۔لیکن ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام محل نظر ہے۔اس لئے کہ شاعر نے اس کووزن شعری کی ضرورت کی بناء پر معرب پڑھا ہے۔قرآن مجید میں یہ لفظ میم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے ساکنین کی بناء پراورمنصوب بھی پڑھا گیا ہے۔اس سے پہلے قرأ فعل محذوف ہوگا غیر منصرف یا تو ترکیب کی وجہ سے ہے،یا معرفہ اورتانیث کی بناء پر ہے یا یہ کہ یہ عجمہ کے وزن پر ہے جیسا کہ قابیل اور ہابیل ہے اورفرماتے ہیں کہ اس قول کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف بھی کی گئی ہے۔اگر یہ بات صحیح ہوتو پھراس کی توجیہہ یہ کہہ کر ممکن ہے کہ ''حامیم''سے مراد''منزل حامیم''ہواوروہ اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک ہے۔مضاف کوحذف کیااورمضاف الیہ کواس کا قائم مقام بنادیا گیا۔اس پراعراب حکائی جاری ہوگیا''حم''بن گیا۔اس تاویل کی بناء پر یہ اللہ کے اسماء میں سے ہوگا۔لیکن ماقبل میں یہ گزرا کہ یہ اسم اعظم ہے،یہ اس تاویل کا انکار ہے۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ابن کیسان نحوی کے بارے میں یہ بات پہنچی کہ انہوں نے ابوالعباس احمد بن یحییٰ سے اس بارے میں پوچھا۔تو انہوں نے کہا کہ یہ خبر ہے اوراگر یہ بمعنی''دعاء''ہوتا تو''لا ینصرون''مجزوم ہوتا۔گویا کہ یوں کہا گیا ہے۔''واللّٰہ لا ینصرون''

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ اس وقوع کی خبر ہوجیسا کہ آپ کہتے ہیں:''رحمك الله ویهدیك''لیکن یہ نہی کے معنی میں ہے۔جیسا کہ یہ آیت ہے:﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾[البقرۃ۔۸۳] الکشاف میں لکھتے ہیں یہاں پر لا تعبدونَ یہ خبر نہی کے معنی میں ہے اور یہ نہی صریح نہی سے زیادہ بلیغ وفصیح ہے۔

علامہ سید جمال الدینؒ نے''روضۃ الأحباب''میں لکھا ہے کہ اس وقت مہاجرین کا شعار''یاخیل اللّٰہ''تھا۔دونوں میں جمع اس طرح ممکن ہے کہ''حم لا یتنصرون'' انصار کے ساتھ خاص ہواور''یا خیل''عام ہو۔

جنگ میں خفیہ علامت مقرر کرنے کا بیان

۳۹۴۹: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ :كَانَ شِعَارُ الْمُهَاجِرِيْنَ :عَبْدُ اللّٰهِ وَشِعَارُ الْاَنْصَارِ :عَبْدُالرَّحْمٰنِ

(رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۷۳' الحديث رقم ۲۵۹۵' والترمذي' كتاب فضائل الجهاد' باب ما جاء في الشعار' الحديث رقم ۱۶۸۲۔

ترجمہ:''اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (کسی اور غزوے میں) مہاجرین کی علامت لفظ 'عبداللہ'' تھی اور انصار کی علامت ''عبدالرحمٰن'' تھی۔ (ابوداؤد)

تشریح: یعنی مہاجرین کا شعار ''عبداللہ'' تھا اور انصار کا شعار ''عبدالرحمٰن'' تھا۔ ان دونوں کے شعار علیحدہ بتلانے سے مقصود ان کی منزلت و مقام کا فرق بتلانا ہے اور ممکن ہے کہ یہ کسی دوسرے غزوہ میں ہوا ہو۔

شب خون مارنے کا بیان

۳۹۵۰: وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ :غَزَوْنَا مَعَ اَبِيْ بَكْرٍ فِيْ زَمَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فَبَيَّتْنَاهُمْ نَقْتُلُهُمْ' وَكَانَ شِعَارُنَا تِلْكَ اللَّيْلَةِ :اَمِتْ اَمِتْ ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۱۰۰' الحديث رقم ۲٦۳۸' وأحمد في المسند ٤ / ٤٦ ' الدارمي' كتاب السير في الشعار۔

ترجمہ:''اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہم نے (ایک مرتبہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ (یعنی ان کی سربراہی میں) جہاد کیا' چنانچہ ہم نے ان (دشمنوں) پر شب خون مارا اور ان کو قتل کیا اور اس رات میں ہماری شناختی علامت امت امت کے الفاظ تھے (ان الفاظ کے معنی ہیں ''اے اللہ! دشمنوں کو مار دے)''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: فبيتنا هم نقتلهم** ......:

''**نقتلهم**'': یہ جملہ مستانفہ مفسرہ ہے' یا حال ہے۔

وكان شعارنا: مرفوع ہے

''**أمت أمت**'': یہ تکرار تاکید لفظی ہے۔ یا یہ بتانا مقصود ہے کہ اس لفظ کو مکرر کہا جاتا تھا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کلام کا مخاطب اللہ تعالیٰ ہے اس لئے کہ وہی مارنے والا ہے۔ پس اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ''اے ہمارے مددگار اس دشمن کو مار ڈال''

شرح السنہ میں ''یا منصور أمت'' کے الفاظ ہیں۔ اس صورت میں مخاطب ہر مقاتل ہوگا۔

لڑائی کے وقت شور شرابا کا بیان

۳۹۵۱: وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عُبَادٍ قَالَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُوْنَ الصَّوْتَ عِنْدَ الْقِتَالِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۱۳، کتاب الجهاد، باب فیما یؤمر به من الصمت، الحدیث رقم ۲۶۵۶۔

ترجمه: ''اور حضرت قیس بن عباد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم (میدان جنگ میں) لڑائی کے وقت (اللہ کا ذکر کرنے کے علاوہ) آواز کے (شور وشغب) کو ناپسند کرتے تھے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''کان اصحاب النبی ﷺ'': اور ایک نسخہ میں ''أصحاب رسول اللّٰہ ﷺ'' ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لڑائی لڑنے والے چار مقاصد کے لئے آوازیں بلند کرتے ہیں:

① اس لئے آوازیں بلند کرتے ہیں تا کہ اپنی عظمت اور بڑھائی دشمن کو بتلائیں۔

② یا اس لیے کہ ہماری تعداد بہت زیادہ ہے اس وجہ سے آوازیں زیادہ ہیں۔

③ یا اس لئے تا کہ دشمن خوف زدہ ہو جائے۔

④ یا اپنی شجاعت اور بہادری کو ظاہر کرنے کیلئے یوں کہے کہ میں بہادر ہوں اور جنگ کا طلبگار ہوں۔

صحابہؓ اُن آوازوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لئے کہ آوازوں کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوتا اور وہ ذکر اللہ میں آوازیں بلند کرتے تھے اس لئے کہ اس سے دنیا وآخرت کی کامیابی ملتی ہے۔

جنگ میں بوڑھوں کو قتل کرنے کا بیان

۳۹۵۲: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اُقْتُلُوْا شُيُوْخَ الْمُشْرِكِيْنَ، وَاسْتَحْيُوْا شَرْخَهُمْ اَىْ صِبْيَانَهُمْ۔ (رواه الترمذی وابو داود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۲۲، الحدیث رقم ۲۶۷۰، والترمذی ٤ / ۱۲۳ کتاب السیر، باب ما جاء فی النزول علی الحکم، الحدیث رقم ۱۵۸۳ وأحمد فی المسند ٥ / ۱۲

ترجمه: ''اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مشرکین (یعنی دشمنوں) کے بڑی عمر والے لوگوں کو قتل کرو اور چھوٹی عمر والوں یعنی ان (دشمنوں) کے بچوں کو زندہ رہنے رکھو''۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: قوله: ''اقتلوا شیوخ المشرکین''

یہاں ''شیوخ'' ''صبیان'' کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شیخ فانی کو قتل نہیں کیا جائے گا مگر اس صورت میں جب وہ صاحب رائے ہو۔

قوله: واستحیوا شرخهم ......:

شرخھم: یہ شین کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔

ای صبیانھم'': یہ تفسیر کسی صحابی کی ہے۔ یا رواۃ میں کسی نے کی ہے اور اس کی تائید ''النہایہ'' کی اس عبارت سے ہوتی ہے: ''شرخ الصغار الذین لم یدرکوا'' کہ شرخ سے مراد وہ چھوٹے ہیں جو ابھی تک بلوغت کو نہ پہنچے ہوں اور استحیاء کی تفسیر ''استرقاق'' کے ساتھ کرنا توسعاً اور مجازاً ہے۔ اس وجہ سے کہ ان کو زندہ چھوڑنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ ان کو غلام اور خادم بنایا جائے۔ اس سے مراد ''ھرمی'' نہیں ہے اس لئے کہ اس کو قیدی بنا کر خدمت وغیرہ کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''شیوخ'' سے مراد وہ مرد اور جوان ہیں جو مضبوط ہوں اور قتال پر طاقت اور قدرت رکھتے ہوں۔ جبکہ شرخ سے مراد وہ جوان مرد ہیں جو مضبوط ہوں اور خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''شرخ'' ابتدائی جوانی کو کہتے ہیں، یہ لفظ واحد، تثنیہ اور جمع سب کے لئے برابر استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''رجل صوم، رجلان صوم رجال صوم۔ وامراۃ صوم، وامرأ تان صوم، ونسوۃ صوم'' بعض نے کہا ہے کہ ''شرخ'' جمع ہے۔ جیسا کہ صاحب کی جمع ''صحب'' ہے۔ راکب کی جمع رکب ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: صاحب القاموس نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''شرخ'' کی تفسیر ''صبیان'' اس لئے کی ہے تاکہ یہ ''شیوخ'' کے مقابلے میں آجائے۔ پس شیوخ سے مراد نوجوان اور طاقت والے مرد ہیں تو اس طرح تقابل صحیح ہوگا۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''شیوخ'' میں ایک دوسری توجیہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ان لوگوں کو باقی رکھنا خدمت وغیرہ کیلئے مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے دلوں میں عصبیت ہوگی اور کفر پر استمرار تمام عمر رہا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ ان میں مکروفریب زیادہ ہوتا ہے اور ان کی دخل اندازی اور ان کے بچے بھی فساد فی الدین سے محفوظ نہیں ہوں گے۔ یا یہ لوگ اسلام پر داغ ہوں گے اور اس تاول پر حدیث کو محمول کیا جائے یہ زیادہ اولیٰ ہے تاکہ یہ اس حدیث انسؓ کی مخالف نہ ہو جائے جو اس باب میں وارد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم شیخ فانی کو قتل مت کرو۔ یہ بھی کہا ہے کہ ''صبیانھم'' متن حدیث نہیں ہے اور نہ ہی کلام صحابی میں سے ہے۔ پس شاید کسی راوی نے اس کو بعض طرق حدیث میں درج کیا ہو۔ (یعنی ادراج راوی ہے)۔ پس مؤلف نے ذکر کر دیا اور بظاہر یہ زیادتی مؤلف کی طرف سے لگتی ہے۔

ملا علی قاری نے اس بات کو رد کیا ہے کہ اگر یہ زیادتی مؤلف کی طرف سے ہوتی تو آخر میں وہ یہ کیسے کہتے کہ ''رواہ الترمذی وابو داؤد'' لیکن شیخ کے کلام کی تائید اس بات سے ہو رہی ہے کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو بغیر تفسیر کے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کو احمد، ابوداؤد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

غارت اور نذرِ آتش کا بیان

٣٩٥٣: وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ: حَدَّثَنِیْ اُسَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَهِدَ اِلَيْهِ قَالَ: اَغِرْ عَلٰى اُبْنٰى صَبَاحًا وَحَرِّقْ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۸۸' کتاب الجهاد ' باب فی الحرق فی بلاد العدو' الحدیث رقم ۲٦١٦ وابن ماجه فی ۲ / ۹٤۸' الحدیث رقم ۲۸٤۳' وأحمد فی المسند ٥ / ۲۰٥

ترجمه: ''اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان (اسامہ رضی اللہ عنہ) کو (ایک لشکر کا امیر بنا کر جہاد کے لئے بھیجا تو) یہ ہدایت وتاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ ''تم اُبنٰی پر صبح کے وقت حملہ کر دینا اور (دشمن کے گھر' بار کھیت کھلیان' اور درخت و باغات کو) جلا ڈالنا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: کان عهد الیه قال اغر ......:**

''**قال**'': اپنے ماقبل ''**عهد**'' کی تفسیر کر رہا ہے۔

''**اغر**'' ''**اغارة**'' سے امر ہے' ہمزہ کے فتحہ اور غین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

بعض نے کہا کہ یہ ''**الغزو**'' سے امر کا صیغہ ہے، ہمزہ اور زاء دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ لفظ ''**علی**'' خود اس کے غیر صحیح ہونے پر دلالت کر رہا ہے اور بعض نے اس کو ہمزہ کے فتحہ غین کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ''**غرة**'' سے نقل کیا ہے یہ تصحیف ہے۔

''**ابنی**'' ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ فلسطین کے ایک علاقے کا نام ہے جو عسقلان اور رملہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کو ''**یبنی**'' بھی کہا جاتا ہے۔ (النہایہ)

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے، ''**جهینة**'' کے ایک شہر کا نام ہے اور بعض نے ''ہمزہ'' کی جگہ پر لام پڑھا ہے۔ لیکن یہ نہیں صحیح ہے۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔

''**صباحًا**'': مطلب یہ ہے کہ ان پر اچانک حملہ کرو اس حالت میں کہ وہ بے خبر ہوں اور انہوں نے تیاری نہ کی ہو۔

''**وحرّق**'': امر کا صیغہ ہے۔ اور ایک روایت میں ''**ثم حرّق**'' کا لفظ آیا ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب خلیفہ اور امام واپسی کا ارادہ کریں اور ان کے ساتھ اہل حرب کے مال مویشی ہوں لیکن وہ دار اسلام منتقل کرنے پر قادر نہ ہوں تو ان کو ذبح کر کے جلا دیں۔ ان کو بغیر ذبح کے قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ امام مالکؒ سے بھی مروی ہے کیونکہ یہ ایک طرح کا مثلہ ہے۔

حضرت جعفر بن ابی طالب نے اپنے گھوڑے کو اس طرح قتل کیا تھا وہ اس وجہ سے تھا کہ ان کو خیال ہوا کہ شاید ہم فتح حاصل نہیں کر سکیں پس خوف حق ہوا کہ مشرکین اس گھوڑے کو حاصل کر لیں گے، وقت کی تنگی کے باعث ذبح کرنا ممکن نہ ہوا۔ یا شاید اس وقت تک مثلہ کے نسخ کا حکم نہیں آیا تھا۔ یا شاید حکم آچکا ہو لیکن ان کو علم نہیں تھا۔ یا ان کو مثلہ کی ممانعت کا علم تھا لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا گھوڑا کافروں کے ہاتھ لگے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد فرماتے ہیں کہ اس کو چھوڑ دے گا اس لیے کہ نبی ﷺ نے بکری کو کھانے کے مقصد کے علاوہ کے لئے ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے

اس کو اپنا قول کہا ہے۔ امام مالکؒ نے اس کو ''مؤطا'' میں ذکر کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث ''منع ذبح الشاة'' اس صورت پر محمول ہے کہ جب مسلمانوں کو فتح کا یقین ہو جائے اور اس علاقے کے دارالاسلام بننے کا یقین ہو جائے تو اس صورت میں یہ ذبح کرنا جائز نہیں ہے اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا تھا اور اس بات کو ہم نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ جب مسلمانوں کو فتح کا یقین ہو جائے۔ تو پھر وہ نہ درختوں کو جلائیں اور نہ کھیتوں کو اجاڑیں اور نہ ہی گھروں کو مسمار کریں، اس لئے کہ اس صورت میں یہ مسلمانوں کے مال کا ضیاع تصور ہوگا جو کہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ حدیث مذکور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بھی یہی قول ہے کہ اس وقت مت جلاؤ۔ حالانکہ ان کو آپ ﷺ کے اس فرمان اور ارشاد کا پتہ تھا۔ ''أغر علی ابنی صباحًا ثم حرق''۔

دوسری بات یہ ہے کہ غرض اکل کے لئے یہ جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مقصد صحیح اور غرض صحیح ہے اور ان کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کو ختم کرنے کے علاوہ کونسا غرض اور مقصد زیادہ صحیح ہو سکتا ہے اور جلانے کا مقصد بھی یہی ہے تا کہ کفار اس سے منفعت حاصل نہ کریں اور یہ ایسا ہوگا جیسا کہ گھروں کو مسمار کرنا ہے اور اس عظیم غرض کیلئے تحریق جائز ہے۔ برخلاف اس تحریق کے جو قبل الذبح ہو کہ وہ منہی عنہ ہے اور اس بارے میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''ان وجدتم فلانًا وفلانًا فاحر قوهما بالنار''

راوی فرماتے ہیں کہ جب ہم باہر نکل آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بلایا اور ارشاد فرمایا ''ان وجدتم فلانًا وفلانًا فاقتلوهما ولا تحرقوهما فانه لا يعذب بها الا اللّٰه'' اس روایت کو مسند بزار میں نقل کیا ہے۔ دونوں آدمیوں کے نام ھبار بن الاسود اور نافع بن عبدالقیس بتلائے ہیں اور اس کا سبب یہ ذکر کیا ہے کہ ان دونوں نے حضرت زینب بنت رسول اللہ ﷺ کو ڈرایا اور دھمکایا تھا جب وہ رسول اللہ ﷺ سے ملنے کیلئے نکلی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپؓ کا حمل گرا دیا۔ یہ بڑا مشہور قصہ ہے۔

بخاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زنادقہ کو زندہ جلایا تھا۔ جب یہ بات ابن عباس کو پہنچی تو انہوں نے کہا کہ اگر میں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا، اس لئے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے: ''لا تعذبوا بعذاب اللّٰه'' اور ان کے قتل کے بارے میں یہ حدیث ہے: ''من بدّل دينه فاقتلوه''۔

اور مسند بزار میں حضرت عثمان بن حبان سے ایک روایت منقول ہے فرماتے ہیں کہ میں ام درداء رضی اللہ عنہا کے پاس تھا۔ میں نے ایک پسو پکڑا اور آگ میں پھینک دیا۔ تو وہ کہنے لگیں کہ میں نے ابودرداء سے یہ سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آگ کا عذاب صرف آگ کا رب ہی دے سکتا ہے۔

فتاویٰ اولوالجی میں ہے کہ عورتوں اور بچوں کو ایک ویران جگہ میں چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ بھوک سے نڈھال ہو کر مر جائیں۔ تا کہ وہ ہم پر دوبارہ حملہ نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ عورتوں ہی سے نسل پھیلتی ہے اور بچے بڑے ہو کر ہم پر حملہ کریں گے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس طرح قتل کرنا زیادہ شدید ہے۔ بنسبت اس قتل کے کہ جس سے آپ ﷺ نے منع کیا ہے۔ منع اس وجہ سے ہے کہ اس میں تعذیب ہے۔ مزید یہ کہ پکڑنے کے بعد یہ لوگ قیدی بن جائیں گے اور نبی ﷺ نے

قیدیوں کے ساتھ اچھائی اور بھلائی کرنے کی وصیت فرمائی ہے۔

ابن اسحاق نے بنیہ بن وھب جو کہ بنی عبدالدال کا بھائی ہے نے بتایا کہ جب رسول اللہ ﷺ ان قیدیوں کے پاس آئے تو ان کو اپنے صحابہ میں تقسیم کر دیا اور فرمایا کہ ان قیدیوں کے ساتھ بھلائی والا معاملہ کرو۔ ابوعزیر کہتے ہیں کہ میں انصار کی ایک جماعت میں تھا جب وہ مجھے بدر سے قیدی بنا کر لے گئے۔ جب وہ ان کے پاس صبح یا رات کا کھانا لاتے تو میرے لئے خصوصی طور پر روٹی ہوتی اور مجھے کھجور کھلاتے رسول اللہ ﷺ کی وصیت کی وجہ سے۔ بلکہ اگر کسی آدمی کے ہاتھ میں روٹی کا کوئی ٹکڑا نہ بھی آتا تو وہ مجھے ضرور دیتے۔ فرماتے ہیں کہ میں حیاء کی وجہ سے ان میں سے کسی کو دے دیتا۔ پس وہ اس کو دے دیتا جو اس کو اپنے پاس رو کے رکھتا۔ پس جب اتنا خیال رکھتے ہیں تو یہ کیسے ممکن اور جائز ہو سکتا ہے کہ وہ ان کو بھوکا ماردیں۔ الّا یہ کہ اشیاء خوراک کی تنگی ہو تو ایسی حالت میں ان کو بھوکا چھوڑنا مجبوری ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غارت گری دعوت کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس حدیث کو اس حالت پر محمول کیا جائے گا کہ ان کو پہلے دعوت پہنچ چکی ہو۔ لہٰذا اسی سابقہ پر اکتفاء کر لیا۔

تیر تلوار سے حملہ کا بیان

۳۹۵۴: وَعَنْ اَبِیْ اُسَیْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَوْمَ بَدْرٍ: اِذَا اَکْثَبُوْکُمْ فَارْمُوْهُمْ، وَلَا تَسُلُّوا السُّیُوْفَ حَتّٰی یَغْشَوْکُمْ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۱۱ کتاب الجهاد، باب فی سل السیوف، الحدیث رقم ۲٦٦٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابواسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر کے دن (مجاہدین اسلام سے) فرمایا کہ (میدان جنگ میں) جب کفار (یعنی دشمن) تمہارے بالکل قریب آجائیں تو ان پر تیر اندازی کرنا اور تلوار اس وقت تک نیام سے نہ نکالنا جب تک کہ وہ تمہارے بالکل قریب نہ پہنچ جائیں''۔ (یعنی تمہاری تلواریں ان تک پہنچ سکیں)۔ (ابوداؤد)

اللغات:

لاتسلوا: سین کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔

یغشو: شین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

عورت اور مزدور کو قتل کرنے کی مذمت

۳۹۵۵: وَعَنْ رِبَاحِ بْنِ الرَّبِیْعِ قَالَ: کُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ غَزْوَةٍ فَرَاٰی النَّاسَ مُجْتَمِعِیْنَ عَلٰی شَیْءٍ، فَبَعَثَ رَجُلًا فَقَالَ: اُنْظُرْ عَلٰی مَا اجْتَمَعَ هٰؤُلَاءِ فَجَاءَ، فَقَالَ: عَلٰی امْرَاَةٍ قَتِیْلٍ فَقَالَ: مَا کَانَتْ هٰذِهٖ لِتُقَاتِلَ وَعَلَی الْمُقَدَّمَةِ خَالِدُ بْنُ الْوَلِیْدِ، فَبَعَثَ رَجُلًا فَقَالَ: قُلْ

لِخَالِدٍ :لَا تَقْتُلِ امْرَأَةً وَلَا عَسِيفًا ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۱۲۱، كتاب الجهاد، باب فى قتل النساء، الحديث رقم ۲۶۶۹، وأحمد فى المسند ۳ / ٤٨٨

ترجمہ:''اور حضرت رباح بن ربیع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (میدانِ جنگ میں) تھے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ کچھ لوگ (ایک جگہ) کسی چیز کے گرد جمع ہو رہے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا اور فرمایا کہ وہاں جا کر دیکھو لوگ کس چیز کے گرد جمع ہو رہے ہیں، اس شخص نے واپس آ کر عرض کیا کہ ایک مقتولہ (کی نعش) کے پاس جمع ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ عورت تو نہیں لڑ رہی تھی (پھر اس کو کیوں قتل کر دیا گیا؟) لشکر کی اگلی صفوں کی کمان حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی، آپ ﷺ نے پھر ایک شخص کو ان کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ خالد (رضی اللہ عنہ) سے کہہ دو کہ ''کسی عورت اور مزدور کو قتل نہ کرو''۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

رباح بن الربیع۔ یہ ''رباح بن الربیع اسیدی'' کاتب ہیں۔ رائے مہملہ کے فتحہ اور حائے موحدہ کے ساتھ ہے ایک نسخہ میں رائے مہملہ مکسور اور ہائے تحتیہ کے ساتھ ہے۔ ربیع میں رائے مہملہ مفتوح اور ہائے موحدہ مکسور ہے صاحب مغنی نے بھی اس طرح دونوں ضبط ذکر فرماتے ہیں۔ التقریب میں لکھا ہے کہ رباح بن ربیع اسدی حنظلہ کے بھائی ہیں۔ ''رباح'' کو رائے مہملہ کے کسرہ اور یائے تحتیہ کے ساتھ بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ صحابی ہیں ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے۔

''وعن رباح ''ایک نسخہ میں ''راء'' کے فتحہ اور بائے موحدہ کے ساتھ ہے اور دوسرے میں راء کے کسرہ اور یائے تحتیہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **قوله: كنا مع رسول الله ﷺ فى غزوة** ......:

''قتیل '': ''امراة '' کی صفت ہے۔

لتقاتل: خبر کان پر داخل یہ لام تاکید نفی کیلئے ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں بھی لام اسی قبیل سے ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾[آل عمران:۱۷۹]

المقدمة: دال کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔

جنگ میں عسیف کی علامت شاہد یہ ہوتی تھی کہ وہ بغیر اسلحہ کے ہوتا تھا۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں بھی روایت کیا ہے۔

اور ایک روایت میں یوں الفاظ ہیں: ''**هاه ما كانت هذه تقاتل ؟**''

اسی طرح مغیرہ ابن عبدالرحمٰن اور ابن جریج نے ابوالزناد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ''صحیح علی شرط الشیخین'' ہے

''هاه'': کلمہ زجر ہے اور ھائے ثانیہ سکون کے لئے ہے۔ (كذا حققه ابن الهمام)

جہاد کے زرّیں اصول

۳۹۵۶: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :اِنْطَلِقُوْا بِسْمِ اللّٰهِ وَبِا للّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ' لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا ' وَلَا طِفْلًا صَغِيْرًا ' وَلَا امْرَاَةً ' وَلَا تَغُلُّوْا ' وَضُمُّوْا غَنَائِمَكُمْ ' وَاَصْلِحُوْا ' وَاَحْسِنُوْا ' فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۸٦' كتاب الجهاد' باب في دعاء المشركين' الحديث رقم ۲٦۱٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین کو (جہاد کے لئے روانہ کرتے وقت) فرمایا ''اللہ کا نام لے کر' اللہ کی تائید و توفیق کے ساتھ اور اللہ کے رسول ﷺ کے دین پر' یہاں سے کوچ کرو! (یاد رکھو) شیخ فانی (یعنی بڈھے کھوسٹ) کو قتل نہ کرنا اور چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا اور (مالِ غنیمت میں) خیانت نہ کرنا' مال غنیمت کو جمع کرنا' آپس میں صلح صفائی رکھنا اور آپس میں (ایک دوسرے کے ساتھ) نیکی و بھلائی کرتے رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکی اور بھلائی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے''۔ (اصلحوا کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تم مجاہدین اپنے آپس کے تنازعات کو ختم کر کے ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ سے رہنا یا یہ معنی ہیں کہ اگر تم مصلحت دیکھو تو دشمن سے صلح کر لینا اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اپنے دینی اور دنیاوی معاملات کو ٹھیک ٹھاک رکھنا)

(ابوداؤد)

تشریح: قوله: انطلقوا بسم الله وبالله و على ملة رسول الله :

قال: انطلقوا باسم اللّٰہ'': ای متبركين باسم الله مستعينين أوبالله ثابتين یہ احوال متداخلہ بھی ہو سکتے ہیں اور احوال مترادفہ بھی ہو سکتے ہیں۔

قوله: ''لا تقتلوا شيخًا فانيًا و لا طفلاً صغيرًا و لا امرأة'':

یعنی تم اس شیخ فانی کو مت قتل کرو جو صاحب رائے نہ ہو، یا براہ راست لڑنے والا نہ ہو۔ یہ بات صحیح ہے کہ آپ ﷺ نے زید بن صمہ کے قتل کا حکم دیا تھا حالانکہ اس کی عمر اس وقت ایک سو بیس سال یا اس سے زیادہ تھی۔ اس کو جیش ہوازن میں صاحب رائے ہونے کی وجہ سے لایا گیا تھا۔ اس کو ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

اور بظاہر ''صغیرًا'' یہ ''طفلاً'' سے بدل یا بیان ہے۔ یعنی ایسا بچہ جو بالغ نہ ہو اور وہ بچہ اس سے مستثنیٰ ہے کہ جو بادشاہ ہو یا بنفسہ لڑ رہا ہو اور اس عورت کو بھی مت قتل کرو جو لڑنے والی بھی نہ ہو اور نہ ہی ملکہ ہو، اور نہ جنگی امور میں رائے رکھنے والی ہو۔

قوله: ان الله يحب المحسنين :اپنے درمیان حسن سلوک سے پیش آیا کرو۔ اس لئے کہ اللہ حسن سلوک کرنے والوں کو ثواب اور عزت سے نوازتے ہیں۔

اسنادی حیثیت: علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں خالد بن العزرؒ نامی راوی ضعیف ہے۔ ابن معینؒ

فرماتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں ہے اور اس حدیث کا جو ماقبل حدیث کے ساتھ تعارض ہے۔ ماقبل حدیث ''اقتلوا شیوخ المشرکین'' اس حدیث سے زیادہ ضعیف ہے اور اکثر اصولیین کے نزدیک اس میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات لازم ہے کہ شیخ غیر فانی کی تخصیص کی جائے اور وہ شیخ فانی جس کو قتل نہیں کیا جاتا سے مراد وہ ہے کہ جو نہ قتال پر قادر ہو، نہ ہی مدد کیلئے آواز لگانے پر قادر ہو اور نہ ہی جماع پر قادر ہو۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے بھی لڑنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات ''الذخیرہ'' میں مذکور ہے۔

اور شیخ ابوبکر الرازی نے ''کتاب المرتد'' میں لکھا ہے کہ شیخ فانی کامل العقل ہو تو اس کو قتل کیا جائے گا اور اسی طرح کا شیخ فانی جب مرتد ہو جائے تو اس کو بھی قتل کریں گے اور جس شیخ فانی کو قتل نہیں کیا جاتا اس سے مراد وہ شخص ہے۔ جس کی عقل زائل ہو چکی ہو اور عقلاء ممیزین کی حدود سے نکل گیا ہو۔ بس اس صورت میں یہ بمنزلہ مجنون ہو گا جس کو قتل نہیں کیا جائے گا اگر چہ وہ مرتد بھی ہو جائے۔ اس طرح اس شخص کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا کہ جس کا دایاں ہاتھ کٹا ہوا ہو یا وہ جس کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کٹا ہوا ہو۔

''السیر الکبیر'' میں ہے کہ راہب کو اس کے گرجا میں قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کنیسہ والوں کو قتل کیا جائے گا جو لوگوں سے مخالطت نہیں رکھتے۔ اگر وہ لوگوں کے ساتھ مخالطت رکھتے ہوں تو پھر ان کو قتل کیا جائے گا جس طرح کے پادری کا حکم ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں یحییٰ بن سعید سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب ابوبکرؓ جہاد کیلئے لشکروں کو شام کی طرف بھیجنے لگے تو یزید بن ابی سفیان کو رخصت کرنے نکلے۔ تو فرمایا کہ میں تم کو دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں:

① بچے کو قتل مت کرنا۔ ② عورت کو قتل نہ کرنا۔ ③ شیخ فانی کو قتل مت کرنا۔ ④ پھل دار درخت مت کاٹنا۔ ⑤ کسی بکری کو قتل مت کرنا۔ ⑥ گائے کو ذبح مت کرنا مگر کھانے کی نیت سے اور جلانا مت۔ ⑦ عمارتوں کو منہدم مت کرنا ⑧ تفرقہ بازی مت کرنا۔ ⑨ بزدل مت بننا ⑩ مالِ غنیمت میں مت خیانت کرنا

مبارزت کا بیان

۳۹۵۷:وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ بَدْرٍ تَقَدَّمَ عُتْبَةُ بْنُ رَبِيعَةَ وَتَبِعَهُ ابْنُهُ وَاَخُوْهُ فَنَادٰى مَنْ يُبَارِزُ فَانْتَدَبَ لَهُ شَبَابٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ :مَنْ اَنْتُمْ! فَاَخْبَرُوْهُ فَقَالَ :لَا حَاجَةَ لَنَا فِيكُمْ اِنَّمَا اَرَدْنَا بَنِى عَمِّنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قُمْ يَا حَمْزَةُ! قُمْ يَا عَلِيُّ! قُمْ يَا عُبَيْدَةَ بْنُ الْحَارِثِ فَاَقْبَلَ حَمْزَةُ اِلٰى عُتْبَةَ وَاَقْبَلْتُ اِلٰى شَيْبَةَ وَاخْتَلَفَ بَيْنَ عُبَيْدَةَ وَالْوَلِيْدِ ضَرْبَتَانِ فَاَثْخَنَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ ثُمَّ مِلْنَا عَلَى الْوَلِيْدِ فَقَتَلْنَاهُ وَاحْتَمَلْنَا عُبَيْدَةَ۔ (رواه احمد وابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۱۱۹ '' كتاب الجهاد' باب فى المبارزة' الحديث ۲٦٦٥ وأحمد فى المسند ۱ / ۱۱۱

ترجمہ: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ جب معرکۂ بدر کا دن تھا (اور میدان جنگ میں مجاہدین اسلام اور کفار مکہ ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہو گئے) تو (کفار مکہ میں سے) عقبہ ابن ربیعہ (لڑنے کے لئے صف

میں سے نکل کر) آگے بڑھا اس کے پیچھے اس کا بیٹا (یعنی ولید بن عتبہ) اور اس کا بھائی (یعنی شیبہ بن ربیعہ) بھی آ گیا' عتبہ نے پکار کر کہا ''کون ہے جو (ہمارے مقابلہ پر) لڑنے کے لئے میدان میں آئے؟ (مجاہدین اسلام کی جانب سے) اس کی للکار کا جواب انصار کے کئی جوانوں نے دیا (یعنی وہ عتبہ اور اس کے ساتھیوں سے لڑنے کے لئے صف میں سے نکل کر میدان میں آئے) عتبہ نے (ان کو دیکھا تو) پوچھا کہ ''تم کون ہو؟'' ان جوانوں نے عتبہ کو بتایا کہ ہم (مدینہ کے) انصار ہیں۔ عتبہ نے کہا کہ ''ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں (یعنی ہم تمہارے ساتھ لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے) بلکہ ہم تو اپنے چچا کے بیٹوں (یعنی مکہ سے ہجرت کر کے چلے جانے والے قریشی مسلمانوں) سے لڑنا چاہتے ہیں''۔ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے (اپنی صف کی طرف مخاطب ہو کر) فرمایا ''حمزہ! کھڑے ہو جاؤ' علی! کھڑے ہو جاؤ' عبیدہ بن حارث! کھڑے ہو جاؤ (اور آگے بڑھ کر ان نشۂ طاقت کے سرمستوں کا سر غرور و تکبر کچل دو) چنانچہ حمزہ رضی اللہ عنہ عتبہ کے مقابلہ پر گئے (اور اس کو قتل کر ڈالا) میں (یعنی علی رضی اللہ عنہ) شیبہ کے مقابلہ پر گیا (اور اس کو قتل کر ڈالا) اور عبیدہ رضی اللہ عنہ اور ولید کے درمیان دو سخت وار ہوئے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے مقابل کو زخمی اور نڈھال کر دیا' پھر ہم نے ولید پر حملہ کیا اور اس کو مار ڈالا اور عبیدہ رضی اللہ عنہ کو (جو ولید کے وار سے سخت زخمی ہو گئے تھے معرکہ کے میدان سے) اٹھا لائے''۔ (احمد' ابوداؤد)

تشریح: قوله: لما كان يوم بدر۔۔۔شباب من الانصار:

کان: تامہ ہے بمعنی وجد۔

لقاموس میں ''شباب'' ''شاب'' کی جمع ہے اور ایک نسخہ میں ''شُبَّانٌ'' کا لفظ آیا ہے۔

قوله: قم يا حمزة...... اقبلة الى شيبة:

سنن ابی داؤد اور شرح السنۃ کی روایت کے الفاظ حسب متن ہیں جبکہ مصابیح کے بعض نسخوں میں اس طرح آیا ہے:

''فأقبل حمزه الى عتبة فقتله و اقبلت الى شيبه فقتلته''۔

قوله: و اختلف بين عبيدة ......:

ہمارے نسخہ میں ''واختلف'' ہے بعض نسخوں میں فاختلف'' ہے۔ معروف و مجہول دونوں طرح منقول ہے۔

'' ملنا '': ''المیل'' سے ہے' میم کے کسرہ کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں ''صِلْنَا'' ہے یہ ''الصولة'' سے ہے' صاد کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ اس سے کفار کے ساتھ جہاد میں جلدی کی اباحت معلوم ہو رہی ہے۔ امام کی اجازت کے بعد اس کے جواز سے علماء نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ جب امام کی طرف سے اجازت نہ ہو تو اس کے جواز میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ امام شافعی مالک، احمد اور اسحٰق کا مسلک یہی ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں اس کی مدد نہیں کر رہے تھے بلکہ ''مبارزت'' ہوتی ہی اسی طرح ہے۔ حافظ ابن حجر العسقلانی نے فرمایا ہے کہ یہ اصح الروایات ہے۔ کتب سیر کی روایت میں یوں ہے کہ ولید نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کیا اور یہی مشہور ہے اور یہی اس مقام

کے لائق ہے۔اس لئے کہ عبیدہ اور شیبہ بڑی عمر کے تھے، برخلاف حضرت علیؓ اور ولید کے کہ وہ دونوں نوجوان تھے۔
طبرانی نے اسناد حسن کے ساتھ حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ میں نے اور حمزہ نے ولید کے مقابلہ میں عبیدۃ بن الحارث کی مدد کی۔
لیکن اس جلدی کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں ہم پر کوئی طعن نہیں کیا۔

میدانِ جہاد سے بھاگنے کا بیان

۳۹۵۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَحَاصَ النَّاسُ حَيْصَةً فَاَتَيْنَا الْمَدِيْنَةَ فَاخْتَفَيْنَا بِهَا وَقُلْنَا هَلَكْنَا ثُمَّ اَتَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَحْنُ الْفَرَّارُوْنَ قَالَ بَلْ اَنْتُمُ الْعَكَّارُوْنَ وَاَنَا فِئَتُكُمْ (رواه الترمذی وفی رواية ابی داود نحوه) وَقَالَ لَا بَلْ اَنْتُمُ الْعَكَّارُوْنَ قَالَ: فَدَنَوْنَا فَتَقَبَّلْنَا يَدَهُ فَقَالَ: اَنَا فِئَةُ الْمُسْلِمِيْنَ (وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثُ اُمَيَّةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ:) كَانَ يَسْتَفْتِحُ (وَحَدِيْثَ اَبِى الدَّرْدَاءِ) اَبْغُوْنِى فِيْ ضُعَفَائِكُمْ (فِيْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَآءِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى)۔

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۰۶' الحديث رقم ۲٦٤۷' جامع الترمذی' كتاب الجهاد' باب ما جاء فی الضرار من الزحف' الحديث رقم ۱۷۱٦' وأحمد فی المسند ۲ / ۱۱۱

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (کسی جگہ جہاد کے لئے) ہمیں ایک لشکر میں روانہ کیا (وہاں پہنچ کر ہمارے لشکر کے) لوگ (میدانِ جنگ سے) بھاگ کھڑے ہوئے' چنانچہ ہم مدینہ واپس آئے تو (مارے شرم وندامت کے اپنے گھروں میں) چھپ کر بیٹھ گئے اور ہم نے (آپس میں اپنے دل میں) کہا کہ (دشمنوں کے مقابلہ سے بھاگ کر ہم نے جو گناہ کیا ہے اس کی وجہ سے گویا) ہم تو ہلاک ہو گئے پھر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم تو (میدان چھوڑ کر) بھاگ آنے والے لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''نہیں بلکہ تم دوبارہ حملہ کرنے والے لوگ ہو اور میں تمہاری جماعت ہوں''۔ (ترمذی) اور ابوداؤد نے ایسی روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ ''نہیں'' بلکہ تم دوبارہ حملہ کرنے والے لوگ ہو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں (جب ہم نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کوئی جواب طلب کرنے یا کوئی سرزنش کرنے کے بجائے اس شفقت آمیز انداز میں ہماری ہمت بڑھائی ہے تو فرط عقیدت ومحبت سے) ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کا بوسہ لیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں مسلمانوں کی جماعت ہوں''۔ ہم امیہ بن عبداللہ سے مروی حدیث (كان يستفتح) اور ابودرداء سے مروی حدیث: ''الغونی فی ضعفائكم'' باب فضل الفقراء میں ان شاءاللہ ذکر کریں گے۔

تشریح: قوله: فحاص الناس حيصة:

''فحاص الناس حيصة'': قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ''الناس'' سے مراد مسلمان ہوں تو مطلب یہ ہوگا:

فمالوا ميلة یعنی حاصوا حيصة "حیص" سے بمعنی "میل" ہوگا اور اگر "الناس" سے مراد "دشمن" ہیں۔تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا: حملوا علينا حملة و جالوا جيلة فا نهر منا دشمن نے ہم پر حملہ کیا جس وجہ سے ہم شکست کھا گئے اور بھاگنے لگے"۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴾[النساء۔۱۲۱]

"محیص" بھاگنے کی جگہ مقام ہے اور دوسرے معنی کی تائید جوہری کے اس قول سے بھی ہوتی ہے: حاص عنه اى عدل" اور "الفائق" میں ہے کہ "حاص حيصة اى انحرف واهزم"۔"اس نے انحراف کیا اور شکست کھا گیا"۔

اور ایک روایت میں "حاء" کی جگہ پر "جیم" اور "صاد" کی جگہ پر "ضاد" آیا ہے۔ أى فجاض جس کا معنی لکھا ہے: "الحيدودة حذرًا"۔ڈر کے مارے بھاگنا۔

اور "النہایہ" میں ہے کہ "فحاض المسلون حيضة اى جالوا جولة يطلبون الفرار "یعنی کہ مسلمانوں نے ایسی چال کھیلی کہ جس کے ذریعے وہ بھاگنا چاہ رہے تھے۔

قوله: فاختفينا بها......وأنا فتكم:

"هلكنا": صحابہ کرامؓ کا گمان تھا کہ وہ بھاگنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔کیونکہ جنگ سے بھاگنا گناہ ہے۔مبنیٰ اس احتمال کا یہ تھا کہ مطلق فرار ہی گناہ کبیرہ ہے۔حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔

"وانا فئتكم": "النہایہ" میں ہے کہ اصل میں "فئة" کا اطلاق لوگوں کی ایک جماعت پر ہوتا ہے اور "طائفة" اس جماعت کو کہتے ہیں جو لشکر کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے۔ کہ اگر اگلوں میں کوئی خوف کی کیفیت ہو یا شکست ہو تو وہ ان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔"الفائق" میں ہے کہ آپ ﷺ نے "انا فئتكم" سے اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ ﴾ [الانفال:۱۶] یعنی آپ ﷺ نے اس جملہ کے ذریعے ان کے فرار کے عذر کی تمہید باندھی تم میری طرف آتے ہو پس تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

"شرح السنہ" میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص تین آدمیوں سے بھاگا تو وہ نہیں بھاگا اور جو دو سے بھاگا تو وہ حقیقت میں بھاگا ہے اور لشکر سے بھاگنا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور جو دو آدمیوں سے بھاگے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ فرار میں اشارہ کے ساتھ نماز پڑھے اس لئے کہ یہ عاصی ہے جیسا کہ قاطع الطریق ہوتا ہے۔اھ یہ حکم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مقتضی پر تفریع ہے۔

الفصل الثالث:

بھاری اسلحہ نصب کرنے اور سنگباری کا بیان

۳۹۵۹: عَنْ ثَوْبَانَ بْنِ يَزِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَصَبَ الْمَنْجَنِيْقَ عَلٰى اَهْلِ الطَّائِفِ۔

رواه الترمذی مرسلاً۔

ترجمه:''اور حضرت ثوبان بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل طائف کے مقابلہ پر منجنیق نصب کی۔

اسنادی حیثیت: اس روایت کو ترمذی نے بطریق ارسال نقل کیا ہے''۔

راویٔ حدیث:

ثور بن یزید۔ درست بات یہ ہے کہ صحیح نام ''ثور بن یزید ہے۔ چونکہ ابن الہمامؒ کی شرح، مغنی کی اسماء الرجال عسقلانی کی تحریر المسنۃ'' ترمذی کے اصل نسخہ میں اسی طرح ہے۔ تقریب اور'' کاشف'' سے بھی یہی مقدم ہو رہا ہے۔ بلکہ ثوبان بن یزید کا ذکر نہ صحابہ میں ہے اور نہ تابعین میں ہے مؤلف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ثور بن یزید کلاعی شامی ''حمص'' کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے خالد بن معدان سے حدیث کو سنا اور ان سے سفیان ثوری اور یحییٰ بن سعید نے حدیث کو نقل کیا ہے۔ ان کی وفات ۱۵۵ میں ہوئی۔ ان کا ذکر'' باب الملاحم'' میں آیا ہے۔ اھ لیکن باب الملاحم میں ہمیں ان کی کوئی روایت نہیں ملی۔ ہاں باب اشراط الساعہ میں ثوبان کی ایک حدیث ذکر کی ہے۔ ثوبان کے ساتھ ابن یزید نہیں ہے اور بلا شبہ ان ثوبان سے مراد رسول اللہ ﷺ کے غلام ہیں' اسی وجہ سے حدیث کے آخر میں'' مرسلاً'' نہیں کہا۔

تشریح: قوله: **ان النبیؐ نصب المنجنیق** ...... : **المنجینق** میم کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ، اور جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ معرّب ہے جس کے ذریعے پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ فارسی میں اس کا نام'' **جیر نیك**'' ہے۔ **ای ما أجونی**۔ (کذا فی القاموس)

'' **اهل الطائف** '' اس سے مراد بنو ثقیف کے شہر ہیں۔ اس کی پہلی بستی ''لقیم'' اور آخری بستی ''رھط'' ہے۔

وادیٔ طائف کی وجہ تسمیہ

① وادی طوفان میں پانی پھرتی رہی۔

② حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کو لے کر بیت اللہ شریف پھرا گئے۔

③ پہلے یہ علاقہ شام میں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی دعاء کی وجہ سے اس کو حجاز کی طرف منتقل کر دیا۔ ''القاموس'' میں اسی طرح ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اس کو 'معضلاً'' ذکر کیا ہے۔ چونکہ سند یوں ہے: **قال قتیبة** ''**حدثنا وکیع عن رجل عن ثور بن یزید الحدیث**''۔ میں نے وکیع سے پوچھا کہ یہ آدمی کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ تمہارا ساتھی عمرو بن ہارون ہے اور ابو داؤدؒ نے اس کو مراسیل میں حضرت مکحول سے مرسلاً ذکر کیا ہے۔ اور ابن سعدؒ نے اس کو 'طبقات' میں ذکر کیا ہے اور اس میں ''**اربعین یوما**'' کا اضافہ نقل کیا ہے اور علامہ واقدی نے اس کو 'المغازی' میں ذکر کیا ہے اور یہ ذکر کیا ہے کہ منجنیق نصب کرنے کی تجویز حضرت سلمان فارسیؓ نے دی تھی۔

بَابُ حُكْمِ الْأُسَرَاءِ

قیدیوں کے احکام کا بیان

''اسلك''،ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ اور سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔'' أسیر'' کی جمع ہے۔

الفصل الاول:

زنجیروں میں جکڑے جنتی

۳۹۶۰: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :عَجِبَ اللّٰهُ مِنْ قَوْمٍ يُدْخَلُوْنَ الْجَنَّةَ فِي السَّلَاسِلِ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) يُقَادُوْنَ اِلَى الْجَنَّةِ بِا لسَّلَاسِلِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٤٥' كتاب الجهاد' باب الاساری فی السلاسل' الحدیث رقم ٣٠١٠' وأبو داود فی السنن ٣ / ١٢٧' الحدیث رقم ٢٦٧٧' وأحمد فی المسند ٢ / ٣٠٢.

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس قوم پر تعجب کرتا ہے (یعنی ان لوگوں سے خوش ہوتا ہے) جن کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت میں داخل کیا جائے گا'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے خوش ہوتا ہے) جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لے جائے جاتے ہیں''۔ (بخاری)

تشریح: قوله:''عجب اللهمن قوم يدخلون الجنة فی السلاسل'':''يدخلون'': مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اور یہی اس مقام کے مناسب ہے اور ایک نسخہ میں معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

فی السلاسل:''يدخلون'' کی ضمیر فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے اور معنی اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ قید کر کے لائے گئے اور غصہ اور قہر کی وجہ سے ان کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ پھر یہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان نصیب فرمایا۔ اس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پس یہاں دخول فی الاسلام کو دخول فی الجنة کی جگہ پر ذکر فرمایا چونکہ یہ ان کے جنت میں دخول کا سبب بنا ہے۔

قوله:''یقادون الی الجنة بالسلاسل'':یقادون اس کا مطلب ہے''یجرون گھسنا

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ بات کئی دفعہ گزر چکی ہے کہ جب بندوں کی صفات کا ذکر مطلقاً اللہ تعالیٰ پر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ان صفات کی غایات ہوتی ہیں۔ پس غایت تعجب اور استبشار کسی چیز پر خوشی کا اظہار کرنا ہے اور اس کی عظمت شان بتلانا ہے۔ چنانچہ اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی شان کو اونچا کیا ہے کہ جن کو قیدی بنا کر زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور پھر وہ

اسلام میں داخل ہوجاتے ہیں، اس طرح وہ اہل جنت میں سے ہوجاتے ہیں اور اللہ ان سے راضی ہوجاتا ہے۔ یہاں ان مؤمنین کو محل تعجب میں ذکر فرمایا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ''سلاسل'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے ان کو قتل و غارت، اور اہل وعیال کے قید و بند سے دخول في الاسلام کی طرف لے جایا جاتا ہے جو کہ دخول جنت کا سبب ہے۔ پس مسبب کو سبب کے قائم مقام کر دیا۔

ایک احتمال یہ ہے (کہ جو بعینہٖ نقل کیا جارہا ہے:) **و يحتمل أن يكون المرادبها جذبات الحق التى يجذب بها خاصة عباده من الضلالة الى الهدى ، ومن الهبوط فى مها وى الطبيعة الى الروج بالا رجات الطى الى حنة المأوى۔**

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلاسل کے معنی میں وہ تمام امور شامل ہیں جو نفس پر گراں ہیں۔ جیسا کہ فقر مرض تمام بدنی مصائب مشکلات اور نفسانی خواہشات کی فوتگی اس لیے کہ ان چیزوں کی فوتگی اس کو آخرت کے بلند درجات کی طرف کھینچتی ہے اور اسی قبیل سے بچوں کا قراءت وکتابت کو ناپسند کرنا بھی ہے۔

روایات باب:

جامع صغیر میں ہے:

''عجب ربنا من قوم يقادون الى الجنة فى السلاسل''۔

اس حدیث کو احمد، بخاری اور ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

اور طبرانیؒ کی روایت میں ابوامامہ، ابونعیم اور ابوہریرہؓ سے یوں مروی ہے:

''عجبت لأقوام الى الجنّة فى السلاسل وهم كا رهون''۔

جاسوس کو قتل کرنے کا بیان

۳۹۶۱:وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ :اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَيْنٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَهُوَ فِيْ سَفَرٍ، فَجَلَسَ عِنْدَ اَصْحَابِهٖ يَتَحَدَّثُ، ثُمَّ انْفَتَلَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اُطْلُبُوْهُ وَاقْتُلُوْهُ فَقَتَلْتُهٗ فَنَفَّلَنِيْ سَلَبَهٗ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ١٦٧' كتاب الجهاد' باب الحربى اذا دخل' الحديث رقم ٣٠٥١ و مسلم فى ٣ / ١٣٧٤' الحديث رقم (٤٥ ـ ١٧٥٤) وأبو داود السنن ٣ / ١١٢' الحديث رقم ٢٦٥٣' وابن ماجه فى ٢ / ٩٤٦' الحديث رقم ٢٨٣٦' وأحمد فى المسند ٤ / ٥١

ترجمہ: ''اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) مشرکین (دشمن) کا ایک جاسوس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے دوران تھے' چنانچہ اس جاسوس نے (ٹوہ لینے کے لئے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس بیٹھ کر باتیں کیں اور پھر چلا گیا' (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کے

بارے میں معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس کو تلاش کرو اور قتل کر ڈالو'' چنانچہ میں نے اس کو (ڈھونڈ نکالا اور) قتل کر ڈالا' آنحضرت ﷺ نے اس کا سامان واسباب مجھے مرحمت فرمایا''۔ (بخاری ومسلم)

''عین'' کی وجہ تسمیہ:

تشریح: قوله: أتی عينٌ من المشركين و هو سفر'':

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جاسوس کو ''عین'' اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا سارا کام آنکھ کے ذریعے ہوتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ وہ رؤیت شدت اہتمام کے ساتھ کرتا ہے اور اس میں انتہائی مستغرق ہوتا ہے گویا کہ اس کا سارا بدن ''عین'' آنکھ بن جاتا ہے۔

''وهو في سفر فجلس'': یہ جملہ حال ہے۔

قوله: فقتلته فنفلني سلبه:

''سلب'' سے مراد مقتول کے کپڑے اور اسلحہ وغیرہ ہے۔

''سلب'' کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ چیزیں اس سے اتاری جاتی ہیں۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ سلب مقتول کی سواری ،زین، آلات اس کے جانور پر لدا ہوا مال اور سونا چاندی وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں سلب میں شامل ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفل سے مراد وہ چیز ہے جو کسی آدمی کو اس کے خاص کارنامے کی وجہ سے دی جاتی ہے اور مال غنیمت کے علاوہ ہوتا ہے۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ اس میں دلیل ہے کہ اہل حرب میں سے جو شخص بھی بغیر امان لئے دار اسلام میں داخل ہوگا اس کو قتل کرنا جائز ہے اور اہل ذمہ میں سے کسی کی کفار کیلئے جاسوسی کرنا یہ ان کی طرف سے نقض عہد کے لئے کافی ہے اور اگر یہ کام مسلمان نے کیا تو اس کا قتل حرام ہے، البتہ اس کو تعزیری سزا دی جائے گی۔ اگر اس نے جہالت حال کا دعویٰ کیا تو اس سے درگزر کیا جائے گا۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور یہ دلیل ہے کہ سلب قاتل کا حق ہے۔

علامہ بن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ تنفیل سے مراد امام کا فارس کو اس کے مقررہ سہم (حصہ) سے زیادہ دینا ہے اور'' نافلة'' اس عبادت کو کہتے ہیں جو زائد علی الفرض ہو اور بیٹے کے بیٹے کو بھی ''نافلة'' کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے، نفّله تنفيلا و نفلهٗ' اس میں دو لغتیں ہیں۔ یعنی باب تفعیل اور مجرد دونوں سے ہیں۔ امام کے لئے مستحب ہے کہ وہ تنفیل کے ذریعے لوگوں کو قتال پر ابھارے اور یہ اعلان کرے کہ جس نے کسی کو قتل کیا تو اس کو اس کا سلب ملے گا اور ''سریہ'' سے کہے کہ میں نے تمہارے لئے خمس کے بعد نصف یا ربع مقرر کیا ہے۔

جاسوس کو قتل کرنے پر انعام دینے کا انعام

۳۹۶۲: وَعَنْهُ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَوَازِنَ، فَبَيْنَا نَحْنُ نَتَضَحّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْجَآءَ رَجُلٌ عَلٰى جَمَلٍ اَحْمَرَفَاَنَاخَهٗ وَجَعَلَ يَنْظُرُ وَفِيْنَا

ضَعْفَةٌ وَرِقَّةٌ مِنَ الظَّهْرِ، وَبَعْضُنَا مُشَاةٌ، اِذْ خَرَجَ يَشْتَدُّ، فَاَتٰى جَمَلَهٗ، فَاَثَارَهٗ، فَاشْتَدَّ بِهِ الْجَمَلُ، فَخَرَجْتُ اَشْتَدُّ حَتّٰى اَخَذْتُ بِخِطَامِ الْجَمَلِ، فَاَنَخْتُهٗ ثُمَّ اخْتَرَطْتُ سَيْفِيْ فَضَرَبْتُ رَأْسَ الرَّجُلِ، ثُمَّ جِئْتُ بِالْجَمَلِ اَقُوْدُهٗ وَعَلَيْهِ رَحْلُهٗ وَسِلَاحُهٗ، فَاسْتَقْبَلَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ، فَقَالَ: مَنْ قَتَلَ الرَّجُلَ؟ قَالُوْا: ابْنُ الْاَكْوَعِ قَالَ: لَهٗ سَلَبُهٗ اَجْمَعُ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٦٨ كتاب الجهاد، باب الحربی اذا دخل، الحديث رقم ٣٠٥١، و مسلم فی صحیحه ٣ / ١٣٧٤، الحديث رقم (٤٥ ـ ١٧٥٤) وأبو داود فی السنن ٣ / ١١٢، الحديث رقم ٢٦٥٤

ترجمہ: ''اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (قبیلہ قیس کی ایک شاخ) ہوازن کے خلاف جہاد کیا۔ اسی دوران کہ ہم چاشت کے وقت رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ دوپہر کا کھانا تناول کر رہے تھے، اچانک ایک شخص جو (دشمن کا جاسوس تھا اور) سرخ اونٹ پر سوار تھا آیا، اس نے اونٹ کو بٹھا دیا اور (اِدھر اُدھر) دیکھنے لگا (یعنی وہ ہماری حالت و کیفیت کی جاسوسی کرنے لگا) اس وقت ہم (اپنی خستہ حالی اور پیادہ پائی کی وجہ سے) بہت کمزور تھے، ہمارے پاس سواریوں کی کمی تھی اور ہم میں سے بعض لوگ پیدل تھے۔ چنانچہ (جب اس شخص نے ہماری اس کمزوری کا اندازہ لگا لیا کہ ہم سواریوں کی کمی اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے سخت پریشان اور کمزور ہیں تو دشمن کو اس کی اطلاع دینے کے لئے) وہ اچانک (ہمارے درمیان سے) تیزی سے نکلا اور اپنے اونٹ کے پاس پہنچ کر (اس پر سوار ہونے کے بعد) اس کو کھڑا کیا اور وہ اونٹ اس کو لے کر تیزی سے دوڑنے لگا، میں (نے جب یہ صورت حال دیکھی تو) میں بھی اپنے لوگوں کے درمیان سے تیزی سے نکلا اور (اس شخص کے پیچھے) دوڑا یہاں تک کہ میں نے (اس کو جا لیا اور) اونٹ کی مہار پکڑ لی اور اس کو بٹھا دیا اور پھر اپنی تلوار سونت کر اس شخص کے سر پر (بھرپور) وار کیا (جس سے اس کا کام تمام ہو گیا) اس کے بعد اونٹ کو، جس پر اس شخص کا سامان اور اس کے ہتھیار تھے، کھینچتا ہوا لایا، رسول اللہ ﷺ اور دوسرے لوگوں نے میرا استقبال کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس شخص کو کس نے قتل کیا ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ''سلمہ بن اکوع نے'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس سارے سامان کے حقدار یہی (سلمہ رضی اللہ عنہ) ہیں''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: غزونا مع رسول ﷺ ۔۔۔ وبعضنا مشاة:

ھوازن: ھوازن ایک قبیلہ کا نام ہے جو تیر اندازی میں مشہور تھا۔ ان کے تیر خطا نہیں جاتے تھے اور یہ لوگ حنین میں تھے۔ حنین طائف کے قریب عرفہ کے پیچھے ایک جگہ کا نام ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ مکہ سے تین رات کی مسافت پر ہے۔

یہ غزوہ ہفتہ کے دن پیش آیا۔ شوال کی چھ راتیں گذر چکی تھیں۔ اس وقت آپ فتح مکہ سے فارغ ہوئے تھے۔

''نتضحی'' اصل میں ''الضحاء'' سے ماخوذ ہے ''ضحآء'' مد اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ دن پھیل جانے کے وقت کو ''الضحاء'' کہتے ہیں یہ بات شرح مسلم میں مذکور ہے۔ ''النہایہ'' میں ہے کہ عرب اپنے کجاووں میں سفر کرتے تھے جب وہ زمین کے کسی ایسے حصہ سے گذرتے جہاں گھاس اور پانی وغیرہ ہوتا۔ تو ان میں سے کوئی کہتا: ''ألاضحوا رویدًا'' یعنی اونٹوں

پرنرمی کروتا کہ یہ اس چراگاہ سے کچھ چرلیں پھر ”تضحیة “ کو ”رفق“ کی جگہ استعمال کیا جانے لگا تا کہ جب اونٹ اپنی منزلوں کو پہنچیں تو سیر ہو چکے ہوں۔ پھر اس میں توسع آ گیا یہاں تک کہ ہر اس شخص کے لئے بولا جانے لگا جو چاشت کے وقت کھاتا ہے۔هو يتضحّى یعنی وہ اس وقت کھاتا ہے جیسا کہ وہ صبح یا شام کو کھاتا ہے اور بعض نے اس کا معنی لکھا ہے کہ ”ہم چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے“

”ضعفة“”عین“ کے سکون اور فتحہ دونوں طرح ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح ہے اور مشہور ضاد کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے اس کا مطلب ہے تپلی حالت کمزوری اور دوسری صورت عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ ”ضعيفٌ“ کی جمع ہے اور بعض نسخوں میں ”ھاء“ کے حذف کے ساتھ ہے۔(یعنی ”ضعف“ ہے)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے قول کی تائید کرتا ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلے توجیہ کی تائید اس کے معطوف ورفة عليه من الظهر سے ہوتی ہے۔

”رقة“:راء کے کسرہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔

”الظهر“: ”ظاء“ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔”رقة“کی صفت ہے أی رقة حاصلة من قلة المركوب۔

”وبعضنا مشاةٌ“:یہ ”ماشٍ“ کی جمع ہے۔گویا کہ یہ عطف بیان ہے۔

قوله:اذ خرج يشتد ......:

”فاشتد“:اور ایک نسخہ میں ”واؤ“ کے ساتھ ہے یعنی:واشتد۔

”فخرجت“:اور ایک نسخہ میں ”واؤ“ عاطفہ کے ساتھ ہے۔یعنی وخرجت۔

”خطام“: خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

والناس:”الناس“ رفع کے ساتھ ہے۔

قیدیوں کے سلسلہ میں ”حکم“ کا بیان

۳۹۶۳:وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ِالْخُدْرِیّ قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ بَنُوْ قُرَیْظَةَ عَلٰی حُکْمِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ، بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ عَلٰی حِمَارٍ فَلَمَّا دَنَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِ کُمْ فَجَآءَ فَجَلَسَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :اِنَّ هٰؤُلَاءِ نَزَلُوْا عَلٰی حُکْمِكَ قَالَ :فَاِنِّی اَحْکُمُ اَنْ تُقْتَلَ الْمُقَاتِلَةُ، وَاَنْ تُسْبَی الذُّرِّیَّةُ قَالَ لَقَدْ حَکَمْتَ فِیْهِمْ بِحُکْمِ الْمَلِكِ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) بِحُکْمِ اللّٰهِ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٦٥، كتاب الجهاد، باب اذا نزل العدو على احكم رجل، الحديث رقم ٣٠٤٣، و مسلم ٣ / ١٣٨٨، الحديث رقم (٦٤ ـ ١٧٦٩) وأحمد فی المسند ٣ / ٢٢

ترجمہ:”اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب (مدینہ میں آباد) بنو قریظہ (کے یہودی)

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر راضی ہو گئے (یعنی وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو فیصلہ کریں گے ہم اس کو تسلیم کرلیں گے) تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بلانے کے لئے ایک آدمی کو بھیجا' سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ایک گدھے پر سوار ہو کر آئے اور جب وہ قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے (حاضرین سے) کہا کہ ''تم لوگ اپنے سردار (کی تعظیم یا ان کی مدد'') کے لئے کھڑے ہو جاؤ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (آپ ﷺ کے قریب) آ کر بیٹھ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے (ان کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ ''یہ لوگ (یعنی بنو قریظہ کے یہودی) تمہارے فیصلے کو ماننے پر راضی ہیں''۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ''میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ ان (یہودیوں) میں سے جو لوگ لڑنے (کی صلاحیت رکھنے) والے ہیں ان کو قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے''۔ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا: ''تم نے ان کے بارے میں بادشاہ (یعنی اللہ) کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''قوله: لما نزلت بنو يظلة على حكم سعد بن معاذ...... على حمار''

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت سعدؓ کے حکم پر اس وقت اترے کہ جب حضرت ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا اور محاصرہ کئے ہوئے پچیس دن گذر چکے تھے۔ محاصرہ نے ان کو تنگ کر دیا تھا ان کے دلوں میں رعب متمکن ہو چکا تھا چونکہ یہ لوگ ''قبیلہ'' اوس کے حلیف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت سعد بن معاذؓ ان کا خیال رکھیں گے اور ان کے لئے تعصب اور قوم پرستی سے کام لیں گے۔ آپؐ کے اسلام کا انکار کیا اور اس کے دین کی قوت نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے علاوہ کوئی فیصلہ صادر کریں گے۔ یہ واقعہ شوال ۵ ہجری میں پیش آیا جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو توڑا اور مشرکین کے لشکروں کی موافقت اور حمایت کی۔

روایت ہے کہ جب مشرکین مدینہ سے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ مؤمنین کو ان کے شر سے کافی ہو گیا تو اس دن ظہر کے وقت حضرت جبرئیل امین حضرت ﷺ کے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا کہ اے محمد تم نے اسلحہ رکھ دیا حالانکہ فرشتوں نے ابھی تک اسلحہ نہیں اتارا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بنو قریظہ کی طرف جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ ان کے پاس عصر کے وقت تک پہنچ جاؤ۔

''بعث'' یہ ''لما'' کا جواب ہے۔

قوله: ''قال رسول الله ﷺ: ''قوموا الى سيدكم'':

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ اہل فضل کا اکرام کرنا چاہیے، اور جب وہ تشریف لائیں تو ان کے لئے کھڑا ہونا چاہیے۔ جمہور علما نے اس سے دلیل پکڑی ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ قیام قیام منہی عنہ میں سے نہیں ہے۔ قیام منہی عنہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اس شخص کے لئے کھڑے ہوں جو خود بیٹھا ہوا ہے۔ اور جب تک وہ شخص بیٹھا رہے گا یہ لوگ مسلسل کھڑے ہی رہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ قیام تعظیم کے لئے نہیں تھا بلکہ دراصل یہ قیام ان کو سواری پر سے اتارنے میں اعانت کیلئے تھا کیونکہ ان کو تکلیف تھی، اگر اس سے مراد ''قیام توقیر'' ہوتا تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کہتے کہ ''قوموا لسیّدکم'' اپنے سردار کی عزت کیلئے کھڑے ہو جاؤ۔ عبارت یوں ہو قوموا متو جهين الى سيد كم کہ اپنے سردار کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔ لیکن پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔ اس لئے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تعظیماً رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کیلئے کھڑے نہیں ہوتے تھے، چونکہ نبی کریم اس قیام کو ناپسند فرماتے تھے۔

''قوله:ان هولاء نزلوا على حكمك'':

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس ''حکم'' کو حضرت سعد کے حوالے اس لئے کیا کہ قبیلہ اوس والوں نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے معافی طلب کی تھی' اس لیے کہ یہ ان کے حلیف تھے۔ چنانچہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان سے کہا کہ تم اس پر راضی ہو جاؤ گے کہ تمہارے بارے میں تم ہی میں سے کوئی شخص فیصلہ کرے۔ تو وہ اس پر راضی ہو گئے۔

قوله:فاني أحكم ان تقتل المقاتلة ......'':

مقاتلة سے مراد وہ لوگ ہیں جو قتال کے قبل ہوں اگر چہ وہ اصحاب رائے نہ ہوں۔

''قوله:لقد حكمت فيهم بحكم الملك'':

''الملك'' سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی تائید دوسری روایت کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: ''بحكم الله'' یا اس سے وہ (فرشتہ) مراد ہے کہ جس نے یہ صحیح فیصلہ دل میں القاء کیا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ روایت مشہورہ میں ''ملك'' بکسر اللام وارد ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بعض نے صحیح البخاری میں اس کو لام کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ اگر فتحہ کو صحیح مانا جائے تو اس سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ یعنی اس حکم کے مطابق جس کو جبرئیل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔

فائدہ: اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے مسلمانوں اہم کے معاملات میں کسی کو حکم بنانا جائز ہے اور اس اجماع کی مخالفت سوائے خوارج کے کسی نے نہیں کی ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں ''تحکیم'' کا انکار کیا تھا۔

② جب کوئی حاکم عادل کسی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کر دے تو اس کا حکم ماننا لازم ہوتا ہے، اور اس حکم سے رجوع نہ امام کیلئے جائز ہے اور نہ ہی عوام الناس کے لئے جائز ہے۔

قیدی کو باندھنے کا حکم

۳۹۶۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْلًا قِبَلَ نَجْدٍ فَجَاءَ تْ بِرَجُلٍ مِنْ بَنِیْ حَنِیْفَةَ یُقَالُ لَهٗ: ثُمَامَةُ بْنُ اُثَالٍ، سَیِّدُ اَهْلِ الْیَمَامَةِ، فَرَبَطُوْهُ بِسَارِیَةٍ مِنْ سَوَارِیِ الْمَسْجِدِ، فَخَرَجَ اِلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: مَا ذَا عِنْدَكَ یَا ثُمَامَةُ فَقَالَ

عِنْدِیْ يَا مُحَمَّدُ! خَيْرٌ، اِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَادَمٍ وَاِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَا كِرٍ وَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ تُعْطَ مِنْهُ مَا شِئْتَ، فَتَرَكَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى كَانَ الْغَدُ فَقَالَ لَهُ مَا عِنْدَكَ يَا ثُمَامَةُ؟ فَقَالَ: عِنْدِیْ مَا قُلْتُ لَكَ، اِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَا كِرٍ وَاِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَادَمٍ وَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ تُعْطَ مِنْهُ مَاشِئْتَ، فَتَرَكَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَتّٰى كَانَ بَعْدَ الْغَدِ فَقَالَ لَهُ مَا عِنْدَكَ يَا ثُمَامَةُ ؟ فَقَالَ عِنْدِیْ مَا قُلْتُ لَكَ اِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَاكِرٍ، وَاِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَا دَمٍ وَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ تُعْطَ مِنْهُ مَا شِئْتَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَطْلِقُوْا ثُمَامَةَ، فَانْطَلَقَ اِلٰى نَخْلٍ قَرِيْبٍ مِنَ الْمَسْجِدِ، فَا غْتَسَلَ، ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَقَالَ: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، يَا مُحَمَّدُ! وَاللّٰهِ مَاكَانَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ وَجْهٌ اَبْغَضَ اِلَیَّ مِنْ وَجْهِكَ فَقَدْ اَصْبَحَ وَجْهُكَ اَحَبَّ الْوُجُوْهِ كُلِّهَا اِلَیَّ، وَاللّٰهِ مَاكَانَ مِنْ دِيْنٍ اَبْغَضَ اِلَیَّ مِنْ دِيْنِكَ فَاَصْبَحَ دِيْنُكَ اَحَبَّ الدِّيْنِ كُلِّهٖ اِلَیَّ وَاللّٰهِ مَاكَانَ مِنْ بَلَدٍ اَبْغَضَ اِلَیَّ، مِنْ بَلَدِكَ فَاَصْبَحَ بَلَدُكَ اَحَبَّ الْبِلَادِ كُلِّهَا اِلَیَّ وَاِنَّ خَيْلَكَ ۔اَخَذَ تْنِی وَاَنَا اُرِيْدُ الْعُمْرَةَ فَمَاذَا تَرٰى؟ فَبَشَّرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ، وَاَمَرَهٗ اَنْ يَعْتَمِرَ، فَلَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ، قَالَ لَهُ قَائِلٌ: اَصَبَوْتَ؟ فَقَالَ : لَا، وَلٰكِنِّی اَسْلَمْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا وَاللّٰهِ لَا يَاتِيْكُمْ مِنَ الْيَمَامَةِ حَبَّةُ حِنْطَةٍ حَتّٰى يَأْ ذَنَ فِيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (رواه مسلم واختصره البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸ / ۸۷، کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفة، الحدیث رقم ٤٣٧٢ و مسلم فی ٣ / ١٣٨٦، الحدیث رقم (٥٩ ـ ١٧٦٤) و أبو داود فی السنن ٣ / ١٢٩، الحدیث رقم ٢٦٧٩

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (٦ ھ میں) ایک لشکر کو (جہاد کے لئے) نجد کی طرف روانہ کیا' لشکر کے لوگ (قبیلہ) بنو حنیفہ کے ایک شخص کو پکڑ کر (مدینہ) لائے جس کا نام ثمامہ بن اثال تھا اور جو یمامہ شہر کے لوگوں کا سردار تھا' اس شخص کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا (تا کہ وہ بھاگ نہ سکے) رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لائے اور اس سے پوچھا کہ ''اے ثمامہ! تمہارے پاس (کہنے سننے کو) کیا ہے؟ (یعنی بتاؤ تمہارا کیا حال ہے؟ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح کا سلوک کروں گا؟) ثمامہ نے کہا کہ ''اے محمد! میرے پاس بھلائی ہی بھلائی ہے یا میرے پاس بہت مال ہے' اگر آپ (مجھ کو) قتل کریں گے تو ایک خون والے شخص کو قتل کریں گے (جو قتل ہی کئے جانے کا مستحق ہے' ان الفاظ کے ذریعہ گویا ثمامہ نے اپنی تقصیر کا اعتراف و اقرار کیا' یا اس کے ان الفاظ کا یہ مطلب تھا کہ اگر آپ مجھے قتل کر دیں گے تو ایک ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کا خون رائیگاں نہیں جائے گا کیونکہ میری قوم میرا خون معاف نہیں کرے گی بلکہ آپ سے بدلہ لے گی' اس صورت میں اس نے گویا اپنی امارت اور اپنی ریاست و وجاہت کا دعویٰ کیا) اور اگر آپ (مجھے باعزت

رہائی دے کر میرے ساتھ) اچھا سلوک کریں گے تو ایک شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے جو شکر گزار و قدر دان ہے (یعنی میں بھی اس اچھے سلوک کا آپ کو بدلہ دوں گا) اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو طلب کیجئے' جتنا مال چاہیں گے دیا جائے گا''۔ (یہ باتیں سن کر) آپ ﷺ نے اس کو (اس کے حال پر) چھوڑ دیا جب دوسرا دن آیا تو آپ ﷺ نے پھر اس سے پوچھا کہ (کہو ثمامہ! تمہارے پاس (کہنے سننے کو) کیا ہے؟'' اس نے کہا کہ ''میرے پاس وہی چیز ہے جو میں کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ اچھا سلوک کریں گے تو ایک ایسے شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے جو شکر گزار و قدر دان ہے' اگر آپ قتل کریں گے تو ایک خون والے شخص کو قتل کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو طلب کیجئے جتنا مال چاہیں گے دیا جائے گا''۔ آپ ﷺ نے (اس دن بھی یہ سن کر) اس کو (اس کے حال پر چھوڑ دیا اور جب تیسرا دن آیا تو آپ نے پھر اس سے پوچھا کہ کہو ثمامہ تمہارے پاس کیا ہے؟'' اس نے کہا کہ ''میرے پاس وہی چیز ہے جو میں کہہ چکا ہوں کہ ''اگر آپ اچھا سلوک کریں گے تو ایک ایسے شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے جو شکر گزار و قدر دان ہے' اگر قتل کریں گے تو ایک خون والے شخص کو قتل کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو طلب کیجئے جتنا مال چاہیں گے دیا جائے گا' رسول اللہ ﷺ نے (یہ سن کر) حکم دیا کہ ''ثمامہ کو رہا کر دیا جائے''۔ چنانچہ (صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے رہا کر دیا۔ رہائی پانے کے بعد کچھ کہے سنے بغیر) وہ کھجوروں کے ان درختوں (کے جھنڈ) میں چلا گیا جو مسجد نبوی ﷺ کے قریب تھے اور (وہاں) سے نہا دھو کر پھر مسجد نبوی ﷺ میں آیا اور (آپ ﷺ کے سامنے) کہا یعنی میں (سچے دل کے اعتراف و اقرار کے ساتھ) گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور (پھر کہنے لگا کہ) اے محمد (ﷺ) خدا کی قسم! میرے نزدیک روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ مبغوض کوئی چہرہ نہیں تھا (یعنی مجھے آپ کی ذات سے جتنی زیادہ نفرت تھی اتنی نفرت اور کسی ذات سے نہیں تھی) لیکن اب آپ کا چہرۂ مبارک میرے نزدیک (دنیا کے) سارے چہروں سے زیادہ پیارا ہے' خدا کی قسم! میرے نزدیک آپ کے دین سے زیادہ مبغوض کوئی دین نہیں تھا لیکن اب آپ کا دین میرے نزدیک سارے دینوں سے زیادہ پیارا ہے اور خدا کی قسم! میرے نزدیک آپ کے شہر (یعنی مدینہ) سے زیادہ نفرت انگیز کوئی شہر نہیں تھا لیکن اب میرے نزدیک آپ ﷺ کا شہر یعنی مدینہ' (دنیا کے) سارے شہروں سے زیادہ پیارا ہے۔ پھر (اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ) آپ ﷺ کے لشکر نے مجھے اس وقت گرفتار کیا تھا جب کہ میں عمرہ (کرنے کے لئے مکہ جانے) کا ارادہ کر رہا تھا تو اب آپ ﷺ مجھ کو کیا حکم دیتے ہیں (آیا میں عمرہ کے لئے مکہ جاؤں یا نہیں؟) رسول اللہ ﷺ نے (پہلے تو) اس کو بشارت دی (کہ اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے تمہیں شرف و عظمت انسانیت حاصل ہوگئی ہے اور تمہارے پہلے سارے گناہ بخش دیئے گئے ہیں) اور پھر ان کو عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ثمامہ جب (عمرہ کرنے کے لئے) مکہ پہنچے تو کسی کہنے والے نے ان سے کہا کہ ''تم تو بے دین ہو گئے ہو۔'' ثمامہ نے جواب دیا کہ ''نہیں! میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (یعنی ہاتھ پر) اسلام قبول کیا ہے' (میں بے دین نہیں ہوا ہوں) اور (یاد رکھو!) خدا کی قسم! اب یمامہ سے تم کو گیہوں کا ایک دانہ بھی نہیں بھیجا جائے گا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت عنایت نہ فرما دیں''۔ (مسلم) اس روایت کو بخاری

نے بھی اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله:بعث رسول الله ﷺ خيلاً قبل نجد :

یہاں مضاف محذوف ہے۔ای فرسان الخیل'' ایک حدیث میں''یا خیل الله ار کبی '' کے الفاظ ہیں۔جس کا مطلب ہے'' فرسان الخیل ''یا جماعت کو''خیل'' کہا گیا کہ جماعت کو بھی خیل کہتے ہیں۔اس لیے کہ خیل کے بغیر لشکر کی تکمیل نہیں ہوتی۔جیسا کہ''ربیئہ''(فوج کا دیدبان)کو''عین''(جاسوس) کہا جاتا ہے۔

''قبل '': قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔یعنی جانب،طرف

''النجد'':''القاموس'' میں مذکور ہے کہ''النجد '' جیم کے ضمہ کے ساتھ منقول ہے۔ یہ لفظ مذکر ہے اور''غور '' علاقے کے مخالف جانب کو''نجد '' کا علاقہ کہتے ہیں۔''غور'' کے بالائی کو''تہامہ'' کہتے ہیں۔جس میں''یمن'' بھی شامل ہے اور نچلے علاقے میں عراق اور شام کے علاقے واقع ہیں اور حجاز کی طرف سے پہلا علاقہ''ذات عرق'' آتا ہے۔

قوله:فجاء ت برجل...... من سواری المسجد:

ثمامة بن أثال: دونوں الفاظ کے پہلے حرف پر ضمہ ہے، یہ اہل یمامۃ کے سردار تھے اور''القاموس'' میں ہے''یمامہ'' خشک علاقہ ہے اور یہ نام ایک لڑکی کی طرف منسوب ہے جس کا نام''زرقاء'' تھا۔وہ کسی بھی سوار کو تین دن کے مسافت سے دیکھ لیتی تھی۔حجاز کے اکثر کھجور کے درخت اس کے نام سے منسوب ہیں''مسیلمہ کذاب'' نے نبوت کا دعویٰ بھی یہیں کیا تھا۔مکہ کے مشرقی جانب میں بصرہ سے تقریباً سولہ مرحلہ کے فاصلہ پر ہے اور کوفہ سے بھی اتنا ہی فاصلہ بنتا ہے اور اس کی طرف نسبت کر کے ''یمامی'' کہا جاتا ہے۔

قوله:ماذا عندك يا ثمامة:

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس''ما''میں دو احتمالات ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ''ما '' استفہامیہ ہو اور''ذا'' موصول ہو اور''عندك ''اس کا صلہ ہو اس کا مطلب یہ بنے گا کہ تیرا کیا خیال ہے کہ میں تیرے ساتھ کیا معاملہ کرونگا،معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہوگی۔''ما الّذی استقر عندك من الظنّ فیما افعل بك''۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ''ماذا''ای شیءٍ'' کے معنی میں ہو۔اس صورت میں یہ مبتدا بن جائے گا اور''عندك''اس کی خبر بنے گی۔

''فقال:''عندی یا محمد خیرٌ'':

اس لئے کہ آپ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ جو ظلم کریں۔بلکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو احسان و انعام کرتے ہیں۔

قوله:''ان تقتل تقتل ذادمٍ وان تنعم تنعم علی شاکرٍ'':

یہ کلام،''خیرٌ'' کی تفصیل کر رہا ہے۔اس لیے کہ جب فعل شرط کو جزاء میں مکرر لایا جائے،تو وہ اس کام کی فقاہت پر دلالت کرتا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ذادم'' میں کئی توجیہات ہیں:

پہلی توجیہہ: اگر آپ نے قتل کیا تو آپ ایسے خون والے کو قتل کریں گے کہ جس کے خون کا موقع ہے، جس سے قاتل کا دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور قاتل کو اس کی ریاست اور فضل کی وجہ سے پہچانا جائے گا کہ یہ فلاں شخص کا قاتل ہے اور اس کو حذف اس لئے کیا کیونکہ وہ اپنے عرف کی وجہ سے اس معنیٰ کو سمجھتے تھے۔

دوسری توجیہہ: آپ اس شخص کو قتل کریں گے کہ جس کا خون مطلوب ہے۔ جس کی وجہ سے وہ قتل کا مستحق ہے۔ لہٰذا آپؐ پر اس کے قتل کی وجہ سے کوئی ملامت نہیں ہوگی۔

تیسری توجیہہ: اصل میں ''دم'' نہیں ہے بلکہ ''ذال'' معجمہ کے ساتھ ہے۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے: ''**تقتل ذا ذمّ**'' اور میم مشدد ہے۔ جس کا مطلب ہے ''**ذا دمام و حرمةٍ فی قومه**'' یعنی آپ اس شخص کو قتل کریں گے جو اپنی قوم میں احترام اور طاقت والا ہے۔ ''سنن ابی داؤد'' کے بعض راویوں نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ لیکن قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ توجیہہ ضعیف ہے اس لیے کہ اس سے معنی الٹ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا احترام اس کے قتل سے مانع ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس توجیہہ کی تصحیح اس طرح ممکن ہے کہ اس کو پہلی توجیہہ پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ کہ آپ ایک عزت منداور بڑے شخص کو قتل کریں گے جس کے قتل پر قاتل قابل فخر ہوگا۔ برخلاف اس صورت کے کہ جب آپ کسی حقیر اور ذلیل شخص کو قتل کریں۔ اس لئے کہ اس کے قتل میں کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ ہی قاتل اس کے قتل پر فخر کرے گا اور نہ ہی اس کے جذبات ٹھنڈے ہوں گے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری توجیہہ کو اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ اس نے یہ معنی کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''**المعنى ان تقتل تقتل من توجه عليه افضل بما اصابه من دم**'' آپ اس شخص کو قتل کریں گے جس پر اس کے خون بہانے کی وجہ سے قتل واجب ہو گیا ہے۔ اس کو ایک اہم توجیہہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس توجیہہ میں اور اس قول ''**و ان تنعم تنعم علی شاکرٍ**'' میں مشاکلت پائی جاتی ہے۔ **قوله: وان كت تريد المال۔۔۔ اطلقوا ثمامة:**

''**فسل**'': ہمزہ کے ساتھ اور بغیر ہمزہ کے دونوں طرح منقول ہے۔

''**تعط منه**'': ''**تعط**'' مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ''**منهٗ**'' اس قول ''**ما شئت**'' کا بیان ہے۔

حتى كا ن الغد،: بعض نسخوں میں لفظ ''**غد**'' نصب کے ساتھ ہے۔

حتى كان بعد الغد: طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**کان**'' فعل ناقص کا ''اسم'' اس کے اندر ''**ھُو**'' ضمیر ہے۔ جس کا مرجع حکماً مذکور ہے۔ ای ''**حتی کان ماھو علیه ثمامة بعد الغد**''

علامہ اشرفؒ فرماتے ہیں کہ پہلے دن ثمامہ نے اپنے کلام میں قتل کو مقدم کیا اور انعام واحسان کو مؤخر کیا۔ جبکہ دوسرے اور تیسرے دن ان کو قتل پر مقدم کیا۔ یعنی قتل کا ذکر درمیان میں کیا۔ اس سے اس کی ذہانت اور عقل مندی ظاہر ہوتی ہے۔ ثمامہ نے یہ اس وجہ سے کیا کہ جب اس نے پہلے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب کو دیکھا تو اس وقت قتل کو مقدم کیا تا کہ آپؐ کو تسلی ہو۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل نہیں کیا۔ تو اس کو امید پیدا ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر احسان وانعام فرمائیں گے اس وجہ سے اس نے دوسرے اور تیسرے دن ''**ان تنعم**'' کو ''**ان تقتل**'' پر مقدم کیا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ جب ''ثمامہ'' نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظلم کی نفی کردی اور دیکھا کہ وہ قتل کا مستحق ہے تو اس نے قتل کو مقدم کیا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف وکرم اور احسان کو دیکھا تو اس نے قتل کو مؤخر کیا اور رحم وکرم طلب کرنے کیلئے یہ طریقہ زیادہ انسب ہے۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [المائدۃ:۱۱۸] ''اگر تو انکو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر بخش دے تو (تیری مہربانی ہے) بیشک تو غالب (اور) حکمت والا ہے۔''

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی ایک اور توجیہ ممکن ہے۔ وہ یہ کہ مجرم کے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور اس کے بعد وہ عفو اور معافی طلب کرے۔ اس وجہ سے ثمامہ نے پہلے دن قتل کو مقدم کیا اور اسی بنیاد پر ''عفو'' کو طلب کیا اور گناہ کو وہ بھولا نہیں۔ اس لئے بعد میں اس کا ذکر بھی کر دیا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ پہلے دن اس پر خوف غالب تھا اور دوسرے تیسرے دن اس پر امید غالب تھے اور برتن کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہی اس سے چھلکتا ہے اور اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کو بطور نظیر پیش کرنے کی وجہ بھی سمجھ میں آرہی ہے۔ اس لیے کہ وہ مقام ایسا تھا جہاں خوف کا غلبہ تھا۔ آپ اللہ کے اس ارشاد کی طرف نہیں دیکھتے [**یوم تأتی کل نفس تجادل عن نفسها**] یہاں تک کہ اس دن سارے انبیائے کہہ دیں گے: ''**نفسی نفسی**'' پھر ان کو شفاعت کرنے کا اختیار ملے گا۔ جن کو اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔

قولہ: ''فانطلق الٰی نخل قریب من المسجد'':

''نخل'': نون کے فتحہ اور خائے معجمہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ ایک نسخہ میں ''جیم'' کے ساتھ (نجل) وارد ہے۔ تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بخاری اور مسلم کے نسخوں میں ''**نخل**'' ہی آیا ہے اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: ''**انطلق الٰی نخل فیه ماء فاغتسل**'' ''ایک قریب باغ میں گئے۔ جس میں پانی تھا' وہاں پر غسل کیا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین فرماتے ہیں کہ اصل میں زیادہ صحیح ''**نجل**'' ہی ہے۔ کیونکہ یہ کم پانی کو کہتے ہیں اور بعض نے اس کا معنی جاری پانی کے ساتھ کیا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلی روایت یعنی ''**نخل**'' ہی زیادہ صحیح ہے، اس لئے کہ اکثر صحیح روایات میں اسی طرح ہی آیا ہے۔ لہٰذا اس سے عدول جائز نہیں ہے۔

قولہ: ''واللّٰه یا محمد! ...... فقد أصبح وجهك أحب الوجوه كلها الیّ'':

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''**أبغض**'' مرفوع اس لیے ہے کیونکہ ''**وجه**'' کی صفت واقع ہو رہا ہے اور (وجہ) ''**کان**'' فعل ناقص کا اسم ہے اور ''**علٰی وجه الأرض**'' اس کی خبر واقع ہو رہی ہے۔ اھ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''**احب الوجوه**'' قطعی طور پر ''**أصبح**'' کی خبر ہے اور اسی سے ماقبل کا تقابل کیا گیا ہے اور اس لئے بھی کہ مابعد دونوں جملوں میں ''**أبغض**''، ''**کان**'' کی خبر واقع ہو رہی ہے اور اس لیے بھی کہ ثمامہ نے ''**وجه**'' کے بارے ''**ابغضیت**'' کی خبر دی ہے۔ یہ نہیں کیا ہے کہ ان کا چہرہ زمین پر سب سے زیادہ مبغوض تھا۔ چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ ''**کان**'' کے اسم سے حال واقع ہو رہا

ہے۔تو ''علی وجه الأرض ''،''وجه'' کے لئے صفت واقع ہوگا پس اس کو مقدم کیا تو یہ حال بن گیا اس کو ممنوع قرار دینے کی صورت میں ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ظرف لغو ہے اہتمام کے پیش نظر اس کو مقدم کیا گیا ہے۔تاکہ ابتدائی حال ہی میں اس کے اہتمام کے عموم وشمول کو بتلادے۔جیسا کہ اس آیت میں ہے:﴿ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُه ﴾[الزمر۔٦٧]

قوله:وان خیلك اخذتنی ۔۔۔قال له قائل اصبوت؟

''وأنا ارید العمرة'':جملہ حالیہ واقع ہو رہا ہے۔

فبشره رسول الله ﷺ:یعنی رسول اللہ ﷺ نے اسلام قبول کرنے کے عظیم الشان فضائل سنائے کہ اسلام زمانہ اسلام سے پہلے کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے وغیرہ۔

''صبوتَ'' یہ ''صبوةٌ'' سے مشتق ہے۔''جہل'' کی طرف میلان کو کہتے ہیں۔یہی معنی بیہقی کی ''تاج المصادر'' میں لکھا ہے اور ایک نسخہ صحیحہ میں ''صبأتَ'' ہے۔یعنی ہمزہ کے ساتھ ''النهایه'' میں لکھا ہے کہ ''صبأ فلانٌ'' اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی ایک دین سے دوسرے دین کی طرف چلا جاتا ہے۔''الفائق'' میں بھی اسی طرح ہمزہ کے ساتھ مذکور ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''المشارق'' میں ''أصبوت'' ہے اور قریش ہمزہ نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ اس میں تسہیل کرتے تھے۔مطلب اس جملہ کا یہ ہے کہ تم اپنے دین سے نکل گئے ہو۔امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کتب ''اصول'' میں ''أصبوت'' ہی ہے۔کیونکہ یہ بھی ایک لغت ہے۔البتہ ''أصبأت'' بالہمزہ مشہور ہے۔اھ

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اصول پر اعتماد کرنا چاہیے اور اس کے ثبوت کے باوجود اس سے عدول جائز نہیں ہے۔ان کے اس قول ''هی لغة'' سے متبادر الی الذہن یہ ہوتا ہے کہ ''صبأت'' میں ایک لغت ہے۔حالانکہ مادۃ اور معنی دونوں اعتبار سے یہ غیر ظاہر ہے۔اور تعجب تو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی بات پر ہے کہ انہوں نے ''صبأت'' پر ہی اقتصار کیا ہے۔

قوله:''فقال:لا ، ولکنی اسلمت مع رسول الله ﷺ'':

اگر آپ اس پر یہ اعتراض کریں کہ ''ثمامه'' نے ''لا'' کیوں کہا۔حالانکہ وہ شرک سے توحید کی طرف تو جا چکے تھے؟اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جواب حکیمانہ اسلوب کے قبیل سے ہے۔گویا کہ اس نے یہ کہا کہ میں دین سے نہیں نکلا اس لئے کہ تم کسی دین پر نہیں ہو کہ میں اس سے نکل گیا ہوں۔ بلکہ میں نے ابتداء ہی سے اللہ تعالیٰ کے دین کو لیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیلئے اسلام لایا ہوں۔

اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ مع تو احداث مصاحبت کا تقاضا کرتا ہے،چوں کہ معیت کا معنی ''مصاحبة'' ہے جو کہ باب ''مفاعلة'' سے ہے۔جس میں فعل من الجانبین ہوتا ہے۔یعنی اشتراک فی الفعل ہوتا ہے۔جیسا کہ ''الصافات'' میں صاحب کشاف نے صراحتاً بیان کیا ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی بعید بات نہیں ہے اس لیے کہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی موافقت کی ہو۔ چنانچہ یہ آپ ﷺ کی طرف سے اس فعل (اسلام) پر دوام ہوگا اور ثمامۃ کی جانب سے ''استحداث'' ہوگا۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات عقلاً تو بعید نہیں ہے،البتہ نقلاً مستبعد ہے۔اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کو ثمامہ

ضرور نقل کرتے۔ یا کسی اور روایت میں اس کو نقل کرتے۔ البتہ معیت میں مشارکت فعل بھی کافی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ملکہ بلقیس کے اس قول میں ہے: [وأسلمت مع سليمان لله رب العلمين]۔

پہلے سوال کا جواب ''صباۃ'' کے نسخہ پر مبنی ہے۔ ''صبوت'' پر کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ''صبأت'' سے مراد یہ ہے کہ دین حق سے دین باطل کی طرف نکلے ہوں۔ سو اس کا جواب نفس الأمر کے مطابق نہیں ہے۔

قوله: ''والله لا يأتيكم من اليمامة حبة حنطةٍ حتي يأذن فيه رسول الله ﷺ'':

ولا والله : علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''لا'' نفی کا تقاضا کر رہا ہے اور ''واؤ'' کا اس پر عطف ہے۔ **اى لا أوافقكم في دينكم ولا أرفق بكم في هذه السنين المجدبه** مطلب یہ ہوگا کہ میں تمہارے دین میں تمہاری موافقت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس خشک سالی میں تم پر کوئی رحم کھاؤں گا۔

''الهدایہ'' میں ہے کہ اہل حرب کے ہاتھ اسلحہ نہیں بیچنا چاہیے جب وہ اُمن لے کر دار اسلام میں آئیں اور نہ ہی اس کو تیار کر کے تاجروں کے ساتھ دار الحرب بھیجنا چاہیے۔ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ اہل حرب کو اسلحہ بیچا جائے۔ یا اس کو اٹھا کران کی طرف لے جایا جائے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیر بیہقی، مسند بزار معجم طبرانی میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے یہ روایت معروف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کے زمانہ میں اہل حرب کے ہاتھوں اسلحہ بیچنے سے منع فرمایا ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں فرماتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اسی اسلحہ پر طعام کو بھی قیاس کیا جائے گا۔ یعنی طعام کو دار الحرب میں لے جانا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے وہ ہر چیز پر قوی اور طاقت ور ہوتے جائیں گے۔ اس لیے کہ مقصد ان کو کمزور کرنا ہے۔ مگر یہ کہ نقل طعام کو ہم نے نص کے ذریعے پہچان لیا۔ یعنی حدیث ثمامہ اور حدیث اسامہ کی رو سے نقل طعام کا جواز نکلتا ہے۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن اسحاق کے طریق سے نقل کیا ہے۔ جس میں ثمامہ کے اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے اور اس کے آخر میں بھی یہ قول ہے کہ کسی نے ثمامہ سے کہا ہے کہ ''صبوت'' تو اس کے جواب میں ثمامہ نے کہا:

''وايم الله الّذی نفس ثمامة بيده لا يأتيكم حبةٌ من اليمامة۔ وكانت قريب مكة حتي يأذن فيها محمد ﷺ۔ فانصرف الٰی بلده ومنع الحمل الی مكة حتي جهدت قريش، فكتبوا الٰی رسول الله ﷺ يسألونه بأرحامهم ان يكتب الٰی ثمامة يحمل اليهم الطعام ففعل رسول الله ﷺ''۔

''بخدا میں صابی نہیں ہوا ہوں۔ بلکہ میں اسلام لایا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہے اور اس پر ایمان لایا ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں ثمامہ کی جان ہے یمامہ سے تمہارے پاس ایک دانہ گندم بھی نہیں آئے گا۔ اس وقت تک کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت نہ دیں۔ پھر وہ اپنے شہر واپس چلے گئے اور مکہ کی جانب طعام لے جانے کو منع کر دیا۔ یہاں تک کہ قریش مشقت میں پڑ گئے۔ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رشتہ داری کا واسطہ دیا کہ آپ ''ثمامہ'' کو لکھیں کہ وہ ان کی طرف غلہ بھیج دیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔

ابن ہشام نے ''سیر'' کے آخر میں اس کو ذکر کیا ہے اور معمولی سا اضافہ بھی نقل کیا ہے:

قالو: ''أصبأتَ''؟ فقال: ''لا واللّٰه ولكنى اتبعتُ خير الدين دين محمد ﷺ. واللّٰه لا تصل اليكم حبة من اليمامة حتى يأذن فيها رسول اللّٰه ﷺ الٰى ان قال: فكتبوا الى رسول اللّٰه انّك تأمر بصلة الرحم وانّك قد قطعتَ أرحامنا. فكتب رسول اللّٰه ﷺ اليه أن يخلى بينهم وبين الحمل''۔

''شرح السنۃ'' میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ جواز نکلتا ہے کہ کافر پر احسان کرنا اور اس کو بغیر مال کے چھوڑنا بھی جائز ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قیدیوں پر بایں طور احسان کرنا جائز نہیں کہ ان سے بغیر کچھ لئے دارالحرب کی طرف چھوڑ دیا جائے۔ امام مالک بھی یہی فرماتے ہیں اور امام احمدؒ کا قول بھی یہی ہے۔ برخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ وہ اس کو امام کی رائے پر چھوڑتے ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے: ﴿ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾ [محمد:٥] کہ ان قیدیوں کو احسانًا بغیر فدیہ کے چھوڑ و۔ یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، دونوں ٹھیک ہیں۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے بدر کے قیدیوں کی ایک جماعت کو بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا تھا۔ جن میں سے ایک ''عاص بن ابی الربیع'' بھی تھے جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔ صاحب ہدایہ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اس آیت: فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً کا حکم اس آیت سے منسوخ ہو گیا ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [التوبۃ۔ ٥]۔ اس آیت کا تقاضا ہے احسان جائز نہیں ہے اور اس بارے میں آخری سورت یہی نازل ہوئی ہے جبکہ ''اُساریٰ بدر'' کا قصہ اس سے پہلے کا ہے۔

فوائد: امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:

① قیدی کو باندھنا اور اس کو قید رکھنا جائز ہے

② کافر کو مسجد میں داخل کرنا جائز ہے۔

③ جب کافر اسلام کا ارادہ کرے تو اس سے جلدی کرائی جائے گی۔ اس کو اغتسال کیلئے مؤخر نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ کوئی اس کو تاخیر کرنے کی اجازت دے۔

حنفیہ کا اس بارے میں مسلک یہ ہے کہ اگر اس پر زمانے شرک کی جنابت ہو تو اس پر غسل واجب ہوگا' چاہے اس نے غسل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ بعض حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر اس نے اسلام لانے سے پہلے غسل کیا ہو تو ادا ہو جائے گا اور اگر اس پر کوئی غسل جنابت نہ ہو تو پھر غسل مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔ البتہ امام احمدؒ اور دوسرے ائمہ کا قول ہے کہ اس پر غسل لازم ہے۔

اور آپ ﷺ تین دن تک ایک سوال مکرر فرماتے رہے تا کہ اس کی تألیف قلب ہو جائے اور ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمایا تا کہ اسلام لانے کی امید پیدا ہو جائے۔

جنگِ بدر کے قیدیوں کا بیان

٣٩٦٥: وَعَنْ جُبَيْرِبْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ اُسَارٰى بَدْرٍ لَوْكَانَ الْمُطْعِمُ

بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا ثُمَّ كَلَّمَنِيْ فِيْ هٰؤُلَاءِ النَّتْنٰى لَتَرَكْتُهُمْ لَهُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٢٣٧، کتاب فرض الخمیس، باب ما من النبی صلی الله علیه و سلم علی......

الحدیث رقم ٣١٣٩ و أبو داود فی السنن ٣ / ١٣٨، الحدیث رقم ٢٦٨٩، وأحمد فی المسند ٤ / ٨٠

ترجمہ: ''اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی حیات ہوتے پھر وہ مجھ سے ان ناپاک قیدیوں کے حق میں (یعنی ان کی رہائی کے بارے میں) سفارش کرتے تو میں ان (قیدیوں) کو ان (مطعم) کی سفارش پر رہا کر دیتا''۔ (بخاری)

تشریح: ''جبیر'': یہ اسم مصغر ہے۔ ''**مطعم**'' عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

قوله: هؤلاء النتنى الخ :

''نتنٰی'': اصل میں ''نتنٌ'' کی جمع ہے بمعنی ''منتن'' جیسا کہ ''زمن'' اور ''زمنٰی''۔ اور ان کو ''نتنٰی'' کہا ان کے کفر کی نجاست کی وجہ سے یا اس کا مشار الیہ قلیب بدر میں پڑی ہوئی ان کی لاشیں تھا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مطعم بن عدی بن نوفل عبد مناف یہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دادا کے چچازاد تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر احسان کیا تھا۔ جب رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم طائف سے واپس لوٹے تو انہوں نے مشرکین کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ہٹایا تھا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پسند کیا کہ اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کو اس کے اس احسان کا بدلہ چکا دیتے۔

اور اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کے بیٹے ''جبیر بن مطعم'' کی تالیف قلب کے لئے ایسا کہا ہو اور اس میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی عظمت شان کا تعریضاً بیان ہے اور ان کافروں کی حالت کی تحقیر ہے۔ اس طور پر کہ آپؐ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں اور ان کو ایک مشرک کی وجہ سے چھوڑ دیتے۔ جس کا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر احسان ہے۔ اھ۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ احسان کا بدلہ بڑھ کر دینا چاہیے، اور یہ کہ محال چیز کو فرض کرنا جائز ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر استدلال بھی کیا جا سکتا ہے کافر پر احسان کرنا جائز ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے شارح کے اس قول پر تعجب ہے کیونکہ اس سے ''منّ'' ثابت ہی نہیں ہو رہا۔ اس لئے کہ کلمۂ ''لو'' کی وجہ سے ایک چیز کے امتناع سے دوسری چیز کا امتناع لازم آتا ہے۔ یعنی یہ ''منّ'' کے امتناع کا فائدہ دے اور یہ بات اس شخص پر مخفی نہیں ہوگی کہ جس کو کلام عرب کے ساتھ ادنیٰ درجے کی بصیرت بھی ہو کہ اس ترکیب میں یہ خبر دینا ہے کہ ''مطعم'' اگر انکے بارے میں سفارش کرتے تو

اور یہ جو مناطقہ کی زبانوں پر مشہور ہے کہ (جملہ) ''شرطیہ'' وقوع کو لازم نہیں ہوتا۔ یہ اس وقت صحیح ہے جب یہ کلام (جملہ) شارع کے علاوہ کسی اور کا ہو۔

فوائد: حضرت جبیرؓ نے یہ حدیث اس وقت سنی ہے کہ جس وقت وہ کافر تھے اور اس وقت اس کو بیان کیا جب وہ اسلام لا چکے تھے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے اساریٰ بدر کے ساتھ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس لایا گیا تو میں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو مغرب کی نماز میں ''سورۃ طور'' پڑھتے ہوئے سنا میں اس وقت مسلمان نہیں ہوا تھا اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''لو کان **مطعم حیًّا**'' اور ایک

روایت میں ہے کہ میں نے آپ کو نماز مغرب میں سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا جب آپ اس آیت پر پہنچے:﴿ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ﴾ [طور:۳۶-۳۷] ”یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (نہیں) بلکہ یہ یقین نہیں رکھتے۔کیا ان کے پاس تمہارے پروردگار کے خزانے ہیں یا یہ (کہیں کے) داروغہ ہیں“ تو قریب تھا کہ میرا دل اڑ جاتا۔

جنگی قیدیوں کو رہا کرنے کا بیان

۳۹۶۲:وَعَنْ اَنَسٍ :اَنَّ ثَمَانِیْنَ رَجُلاً مِنْ اَهْلِ مَكَّةَ هَبَطُوْا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ جَبَلِ التَّنْعِیْمِ مُتَسَلِّحِیْنَ، یُرِیْدُوْنَ غِرَّةَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :وَاَصْحَابِهٖ، فَاَخَذَهُمْ سِلْمًا، فَاسْتَحْیَاهُمْ. وَفِیْ رِوَایَةٍ :فَاَعْتَقَهُمْ، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی :﴿وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ﴾ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱٤٤۲، کتاب الجهاد، باب قول الله تعالیٰ، وهو الذی کف ایدیکم......، الحدیث رقم (۱۳۳ ـ ۱۸۰۸) وأبو داود فی السنن ۳ / ۱۳۷، الحدیث رقم ۲٦۸۸، والترمذی فی ٥ / ۳٦۰، الحدیث رقم ۳۲٦٤، وأحمد فی المسند ۳ / ۱۲٤

ترجمہ:”اور حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے سال) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف مکہ کے اسی آدمی مسلح ہو کر لڑائی کرنے کے ارادے سے تنعیم کے پہاڑ سے اتر آئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (لڑائی کے بغیر) ان سب کو بے بس اور ذلیل کر کے گرفتار کر لیا اور پھر ان کو زندہ چھوڑ دیا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ”اور پھر ان کو رہا کر دیا‘ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (جس کا ترجمہ یہ ہے) اور وہ ذات ایسی ہے جس نے نواح مکہ میں ان (کفار) کے ہاتھ کو تمہارے خلاف اور تمہارے ہاتھ کو ان کے خلاف بند رکھا“۔(مسلم)

تشریح: **قوله:”ان ثمانین رجلا من اُهل مكةهبطوا علٰی رسول اللّٰه......استحیا هم:**

”**من جبل التّنعیم**“:”القاموس“ میں ہے کہ ”تنعیم“ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے تین یا چار میل کے فاصلے پر ہے اور بیت اللہ کے قریب ترین اطراف حِل میں سے ہے۔اس جگہ کو تنعیم اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے دائیں جانب تنعیم نامی ایک پہاڑی واقع ہے اور بائیں جانب ”ناعم“ نامی پہاڑی ہے اور ان دونوں پہاڑوں کے درمیان واقع وادی کا نام ”نعمان“ ہے۔

متسلحین: یہ حال ہے۔**ای حال كونهم لابسین السلاح من الدروع وغیرها ۔**

غِرَّۃ :”غرة“:غین کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔اس سے مراد غفلت ہے۔

سلمًا“:”سلم“ کو کئی طرح ضبط کیا گیا ہے:امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دو طرح ضبط کیا گیا ہے: ① سین اور لام کے فتح کے ساتھ۔② سین کے کسرہ و فتح اور لام کے سکون کے ساتھ۔

حمیدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''سلم'' کا معنی صلح ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اکثر نے اس کو اسی طرح ضبط کیا ہے۔ فرماتے ہیں پہلی روایت اولیٰ ہے۔ أی أسراهم یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قیدی بنایا۔ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے لام اور سین کے فتح کی لغت پر ہی جزم کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ''استسلام'' واغان ہے۔ اپنے آپ کو حوالہ کرنا تسلیم کرنا تابع کرنا۔

جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ ﴾(النساء۔ ۹۰)

''سلم'' سے مراد انقیاد ہے۔ یہ مصدر ہے جس کا اطلاق واحد، تثنیہ اور جمع سب پر ہوتا ہے۔

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ یہی معنی اس قضیہ کے زیادہ مشابہ اور مناسب ہے۔ اس لئے کہ ان کو صلحاً نہیں پکڑا گیا تھا۔ بلکہ قہراً پکڑا گیا تھا انہوں نے عاجز آ کر اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ لیکن دوسری توجیہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ قتال نہیں ہوا تھا بلکہ وہ اپنے دفاع اور نجات سے عاجز آ گئے تھے۔ وہ قیدی بننے پر راضی ہو گئے۔ گویا کہ انہوں نے اس پر صلح کر لی تھی۔

''فاستحیاهم'' یعنی ان کو زندہ رکھا۔ قتل نہیں کیا۔ اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ ﴾[الفتح۔ ۲۴]

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں الفت صلی اللہ علیہ وسلم رحمت نہ ڈالتا اور اللہ تعالیٰ ان کافروں کو ڈراتا اور ان کو مسلمانوں سے دور نہ کرتا تو ان کو یہ سلامتی حاصل نہ ہوتی۔

یہاں پر دونوں فعلوں کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف حصر کے طریق پر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[وهو الذی کف ایدیهم عنکم و ایدیکم عنهم] یعنی اللہ تعالیٰ ہی نے اس معاملہ میں روک تھام کی تا کہ سلامتی وامن سے رہو اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: [وما رمیت اذ رمیتَ ولکن اللّٰہ رمٰی] اور آیت میں اس جملہ کے ساتھ فصل لایا گیا ہے:

[و کان اللّٰہ بما یعملون بصیرًا] ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی نظیر اس قول کے ساتھ زیادہ انسب ہے: [فلم تقتلوهم ولکن اللّٰہ قتلهم]

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عکرمہ بن ابی جہل پانچ سو آدمیوں کو لے کر حدیبیہ کی طرف نکلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر پر امیر بنا کر بھیجا۔ پس انہوں نے عکرمہ کو شکست دی۔ یہاں تک کہ ان کو مکہ کی حدود (دیواروں) میں واپس داخل کر کے واپس لوٹ آئے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ روایت ابن جریر، طبری اور ابن ابی حاتم نے ابن ابی ابزی سے نقل کی ہے اور یہی تفسیر اللہ تعالیٰ کے اس قول [ببطن مکة] کے زیادہ مناسب ہے۔

سید معین الدین الصفوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس وقت تک خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اس دن وہ مشرکین کے جاسوس تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کے ذریعہ سے احسان فرمایا تھا بلکہ مسلمانوں کو کافروں سے مکہ میں لڑائی سے اور مسجد حرام کی حرمت سے محفوظ رکھا۔ الخ۔ (الحدیث)

اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے اور اس سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے استشہاد کیا ہے کہ مکۃ مکرمۃ عنوۃً فتح ہوا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات کمزور ہے۔ اس لئے کہ یہ سورت اس سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ لیکن اس بات کو رد کیا گیا ہے اس وجہ سے کہ مضارع کی جگہ ماضی کی تعبیر ذکر کی ہے تا کہ تحقق وقوع پر دلالت کرے۔ پس گویا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ تھا۔ اس پر اس حدیث کی وجہ سے اشکال وارد نہیں ہوتا اس لئے کہ اعتبار عموم الفاظ کا کیا جاتا ہے خصوص سبب کا نہیں ہوتا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کتب مغازی میں یہ بات مشہور ہے کہ عراق کا علاقہ عنوۃً فتح ہوا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غانمین کے درمیان اس کو تقسیم نہیں کیا۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے: [ما آفاء اللّٰہ علی رسولہ والّذین جآؤوا من بعدھم] اور ان کیلئے یہ احسان تھا اس وجہ سے خراج اور جزیہ کو ختم کر دیا تھا اور عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی اور آپ رضی اللہ عنہ کی مخالفت سوائے ایک چھوٹی سی جماعت کے کسی نے نہیں کی۔ جیسا کہ حضرت بلال اور سلمان رضی اللہ عنہما نے مخالفت کی تھی اور یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر چڑھ کر دعاء فرمائی: اللھم اکفنی بلالاً واصحابہ اے اللہ میرے لیے بلال اور اس کے ساتھیوں سے کافی ہوجا''۔

''المسبوط'' میں ہے کہ ان لوگوں کی تعریف نہیں کی گئی اور پشیمان ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی طرف رجوع کیا اور یہ بات اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اراضی کی تقسیم حتمی نہیں تھی مکہ عنوۃً فتح ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی زمین کو تقسیم نہیں کیا اور اسی لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مجرد فتح سے ہی زمین مسلمانوں کیلئے وقف ہو جاتی ہے وہ (یعنی امام مالک) اخبار و آثار کو زیادہ جاننے والے تھے اور فقہاء کا یہ دعویٰ کہ ''مکہ'' صلحاً فتح ہوا ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ دلائل اس دعویٰ کی نقیض پر وارد ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی طرف نہیں دیکھتے کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من دخل دار ابی سفیان فھو آمن، ومن اغلق بابہ علیہ فھو اٰمنٌ

''جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا اس کو امن ہے اور جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اس کو بھی امن ہے''۔

اگر مکہ صلحاً فتح ہوتا تو سارے کفار بغیر اس اعلان کے امن سے ہوتے اور اس اعلان کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ مزید یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ابن خطل'' کے قتل کا حکم دیا حالانکہ وہ کعبہ کے غلاف کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ تو پھر آپؐ نے کیوں حکم دیا؟ اور ان تمام باتوں سے زیادہ واضح بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو صحیحین میں منقول ہے: ''انّ اللّٰہ حرم مکۃ یوم خلق السمٰوٰت والأرض لا یسفك بھادمٌ فان احد تربص بقتال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فقولوا: انّ اذن لرسولہ ولم یأذن لکم''۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ ''بقتال رسول اللّٰہ'' اس بارے میں زیادہ صریح ہے کہ مکہ ''عنوۃً'' فتح ہوا ہے۔

جنگِ بدر کے مقتول کفار سرداروں کا حشر

۳۹۶۷: وَعَنْ قَتَادَةَ، قَالَ: ذَكَرَلَنَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ، عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ، اَنَّ نَبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

اَمَرَ يَوْمَ بَدْرٍ بِاَرْبَعَةٍ وَعِشْرِيْنَ رَجُلاً مِنْ صَنَادِيْدِ قُرَيْشٍ فَقُذِفُوْا فِيْ طَوِيٍّ مِنْ اَطْوَاءِ بَدْرٍ خَبِيْثٍ مُخْبِثٍ، وَكَانَ اِذَا ظَهَرَ عَلٰى قَوْمٍ اَقَامَ بِا لْعُرْصَةِ ثَلَاثَ لَيَالٍ، فَلَمَّا كَانَ بِبَدْرٍ الْيَوْمُ الثَّالِثُ اَمَرَ بِرَاحِلَتِهٖ فَشُدَّ عَلَيْهَا رَحْلُهَا ثُمَّ مَشٰى وَاتَّبَعَهُ اَصْحَابُهُ حَتّٰى قَامَ عَلٰى شَفَةِ الرَّكِيِّ، فَجَعَلَ يُنَادِيْهِمْ بِاَسْمَائِهِمْ وَاَسْمَاءِ اٰبَائِهِمْ: يَا فُلَانُ ابْنُ فُلَانٍ! وَيَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ! اَيَسُرُّكُمْ اَنَّكُمْ اَطَعْتُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ؟ فَاِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَاوَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَقَالَ عُمَرُ :يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !مَا نُكَلِّمُ مِنْ اَجْسَادٍ لَّااَرْوَاحَ لَهَا؟ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ مَا اَنْتُمْ بِاَ سْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْهُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ :مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهُمْ، وَلٰكِنْ لَا يُجِيْبُوْنَ (متفق عليه وزاد البخارى : قال قتادة:) اَحْيَاهُمُ اللّٰهُ حَتّٰى اَسْمَعَهُمْ قَوْلَهُ :تَوْبِيْخًا وَتَصْغِيْرًا وَنِقْمَةً وَحَسْرَةً وَنَدَمًا۔

احرجه البخارى فى صحيحه ٧ / ٣٠٠، كتاب المغازى، باب قتل ابى جهل، الحديث رقم ٣٩٧٦ و مسلم فى ٤ / ٢٢٠٤، الحديث رقم-٧٨ ـ ٢٨٧٥) وأحمد فى المسند ٣ / ١٤٥

ترجمہ: ''اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ہمارے سامنے یہ بیان کیا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے دن (مکہ کے) کفار قریش کے چوبیس (مقتولین) سرداروں کے متعلق حکم فرما(کہ ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے) چنانچہ ان کو (یعنی ان نعشوں کو) بدر کے ایک ایسے کنویں میں ڈال دیا گیا جو ناپاک تھا اور ناپاک کرنے والا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں کسی قوم (یعنی دشمنوں) پر غلبہ اور فتح پا لیتے تھے تو اس میدان جنگ میں تین راتیں قیام فرماتے تھے چنانچہ (اسی عادت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد بدر کے میدان جنگ میں بھی تین راتیں مقیم رہے اور) جب تین دن گزر گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری کے اونٹ پر کجاوہ باندھنے کا حکم دیا، چنانچہ کجاوہ باندھ دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے روانہ ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہو لئے (جب اس کنویں پر پہنچے جس میں سرداران قریش کی نعشیں ڈالی گئی تھیں تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں کے کنارے کھڑے ہو گئے اور ان سرداروں کو ان کے باپوں کا نام لے کر پکارنا شروع کیا کہ اے فلاں بن فلاں اور اے فلاں بن فلاں (اور پھر گویا ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ) اب تمہیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے؟ بلاشبہ ہمیں تو وہ چیز حاصل ہو گئی جس کا ہم سے ہمارے پروردگار نے سچا وعدہ کیا تھا (یعنی تمہارے مقابلہ پر ہماری فتح اور باطل طاقتوں پر ہمارے غلبہ کا) اور کیا تم نے بھی وہ چیز پا لی جس کا تم سے تمہارے پروردگار نے سچا وعدہ کیا تھا؟ یعنی تمہارے عذاب کا (مطلب یہ کہ ہم کو تو خدا کے وعدے کے مطابق فتح و کامیابی حاصل ہو گئی کیا تم کو بھی عذاب ملا جس سے تمہارے پروردگار نے تمہیں ڈرایا تھا؟ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سوال ازراہ توبیخ تھا)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے جسموں کو مخاطب کر

رہے ہیں جن میں روحیں نہیں ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے' ان (جسموں) سے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اس کو زیادہ سننے والے نہیں ہو' اور ایک روایت میں یوں ہے کہ تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو لیکن (فرق صرف اتنا ہے کہ تم جواب دینے پر قادر ہو اور) یہ جواب نہیں دے سکتے''۔ (بخاری و مسلم) بخاری نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے ان (سرداران قریش) کو (آپ ﷺ کے خطاب کے وقت) زندہ کر دیا تھا تاکہ وہ باعث توبیخ وتحقیر' انتقام وندامت ان کو آپ ﷺ کی بات سنا دے۔ جس سے (اسی دنیا میں آپ ﷺ کے سامنے) ان کو سرزنش ہو اور وہ ذلت وخواری' عذاب اور افسوس وپشیمانی کو محسوس کریں''۔

تشریح: قولہ: ان نبیٔ امر۔۔۔خبیث مخبث:

صنادید: ''صندید'' کی جمع ہے۔ اس سے مراد قریش کے اشراف وسردار ہیں۔ ہر بڑے اور غالب کو 'صندید'' کہتے ہیں۔ یہی بات ''النہایہ'' میں مذکور ہے۔ علامہ جوہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد شجاع اور بہادر ہوتا ہے۔ البتہ یہاں پر اس سے مراد ان کے اکابر ہیں۔

''فقذفوا'' مجہول کا صیغہ ہے۔

طوی: ایسا کنواں جس کے کنارے پتھروں کے ساتھ پختہ کئے گئے ہوں۔

''النہایہ'' میں ہے کہ (طی) اصل میں صفت کا صیغہ ہے اور فعیل ''مفعول'' کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع ''اطواء'' کے وزن پر لاتے ہیں۔ جیسا کہ ''شریف'' کی جمع ''اشراف'' آتی ہے۔ اگرچہ یہ صفت سے ''اسمیّت'' کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

''مخبِث'': باء موحدہ کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی یہ کنواں فاسد تو تھا ہی اب ان کے وقوع کی وجہ سے ''مفسد'' بھی بن گیا ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کہا جائے کہ ''طوی'' اور ''قلیب'' میں جمع کیسے ممکن ہے؟ اس لئے کہ ''قلیب'' اس کنویں کو کہتے ہیں کہ جس کے کنارے پختہ نہ کئے گئے ہوں۔ بعض راویات میں ''طوی'' کا لفظ ہے اور بعض میں ''قلیب'' ہے؟ اس کے جواب دیئے گئے ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ شاید راوی نے روایت بالمعنی کی ہو اور اس کو دونوں کے درمیان فرق کا علم نہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس صحابیؓ کا خیال ہو کہ یہ کنواں مطویہ ہے۔ حالانکہ وہ ''قلیب'' تھا۔ تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ بعض کو 'طوی'' میں پھینکا گیا ہو اور بعض کو'' قلیب'' میں پھینک دیا گیا ہو۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ حالت وصف کے اعتبار سے تو یہی اصل ہے لیکن بعد میں یہ مطلق کنویں کے لئے استعمال ہونے لگا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ اہل عرب کسی حقیقت مقیدہ پر کبھی ایسی حقیقت کا اطلاق کرتے ہیں جو حقیقت کسی قید کے ساتھ مقید نہیں ہوتی اور ایسا کلام میں توسع اور گنجائش کی وجہ سے کرتے ہیں جیسا کہ۔ ''المرسن'' اس ناک کو کہتے ہیں جس میں ''رسن'' (رسی) ہو اور بسا اوقات اس کا اطلاق انسان کی ناک پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ''المشفر'' اور

''جحفلة ''اونٹ اور گھوڑے کے ہونٹ کو کہتے ہیں لیکن بسا اوقات اس سے انسان کے ہونٹ مراد ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اسی کی دلیل ہے:﴿كأنه رؤس الشياطين﴾[الصافات۔٦٥]

قوله:''و كان اذا ظهر على قوم......اوعد كم ربكم حقا:''

ظہر سے مراد غلبہ اور فتح حاصل کرنا ہے۔

''أقام بالعرصة:''''عرصہ'' سے مراد میدان جہاد ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''عرصة'' سے مراد ہر ایسی وسیع و عریض جگہ ہے جہاں کوئی عمارت نہ ہو۔

فلما كان ببدر اليوم الثالث:''يوم الثالث'' نصب کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔نصب کی صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی: كان مقيما ببدا اور رفع کی صورت میں عبارت یوں ہوگی:وجد ببدر اليوم الثالث ۔یعنی اس صورت میں یہ'' کان ''تامہ ہوگا ۔

شفة:شین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ (القاموس) اور اس سے اس کنویں کا کنارہ مراد ہے جس میں قریش کے سرداروں کو پھینکا گیا تھا۔

''يا فلان بن فلان ويا فلان بن فلان'': ''فلاں''نون کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی درست ہے اور لفظ ''ابن منصوب ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ پکارا۔

''أيسر كم '':سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔یعنی کیا تمہیں خوشی نصیب ہوگئی۔

''حقا'':اس کا مطلب ہے ثابتا من غلبتنا عليكم

''فهل وجدتم ما عدكم ربكم حقًا'': یہ سوال توبیخ کیلئے ہے۔مظہر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا اب جب کہ تم عذاب چکھ چکے ہو اس بات کی تمنا کرتے ہو کہ تم مسلمان ہوتے ۔اس صورت میں یہ ہمزہ''تقریر'' کیلئے ہوگا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم اس بات پر غمزدہ ہو اور اس پر حسرت و افسوس کر رہے ہو کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت چھوڑی ؟ اور کیا تمہیں ہماری یہ بات یاد آتی ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا وہ اپنے دوستوں کی مدد فرمائے گا اور دشمنان دین کو رسوا کرے گا۔چنانچہ ہم نے تو اپنے رب کے وعدہ کو برحق پایا ہے۔

قوله:''فقال عمر!يا رسول الله!ما تكلم من أجسادلا أرواح لها؟'' :

''ما''مبتدا بمعنی''الّذين '' ہے اور''مِنْ''''ما'' کا بیان ہے اور''لا ارواح لها''اس کی خبر ہے۔مطلب یہ کہ اے اللہ کے رسول جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کیا ہے۔یہ تو اجسام بلا روح ہیں۔یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے جواب دیں گے۔

بعض کا قول ہے کہ''ما'' استفہامیہ ہے اور''مِنْ'' زائدہ ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوسرے قول کے مطابق اس میں''انکار'' کا معنی پایا جا رہا ہے اس لئے کہ استفہام میں بھی''نفی'' کے معنی ہیں اور پہلے قول کے مطابق''خبر''محذوف ہے۔

''اى الّذين تكلمهم لا يسمعون كلامك''

یا یہ کہ اخفش رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق ''مِنْ'' زائدہ ہے اور ''اجساد'' اس کی خبر ہے۔
اور یہ احتمال بھی ہے کہ ''تکلم'' ''تسأل'' کے معنی میں ہو اور ''مِنْ'' اس کا متعلق ہے۔ اس تقدیر پر کہ ''ما'' استفہامیہ ہے۔

قوله: ما أنتم بأسمع لما أقول منهم...... ولكن لايحجبون''۔

منهم: یہ ''اسمع'' کے متعلق ہے۔

سماعِ موتی:

امام نووی رحمہ اللہ کی شرح مسلم میں ہے کہ علامہ مازری فرماتے ہیں کہ مردہ سنتا ہے اور اس حدیث کے ظاہر سے استدلال کیا ہے۔ لیکن یہ محلِ نظر ہے اس لئے کہ یہ سماع صرف ان مردوں کے حق میں خاص ہے۔ لیکن علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس پر رد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے سماع کو عام سماعِ موتی پر محمول کیا جائے گا جن کا ذکر عذابِ قبر وغیرہ کے بارے میں وارد احادیث میں ہے اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ یا ان کے بعض اجزاء کو زندہ کر دیتے ہیں جس سے وہ اس کو سمجھتے ہیں اور اس کو اس وقت سنتے ہیں جس وقت اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اسی قول کو مختار کہا ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے ہدایہ کی ''شرح'' میں لکھا ہے جان لو کہ اکثر مشائخ حنفیہ رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ میت نہیں سنتی جیسا کہ کتاب الایمان میں اس کی تصریح ہے کہ اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ کسی سے بات نہیں کرے گا پس اس نے کسی میت (مردہ) سے تکلم کیا تو اس سے وہ حانث نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ اس پر منعقد ہوتی ہے جس میں فہم ہو اور جو سمجھ کے ساتھ جواب دے سکے۔ جبکہ ''میت'' کا معاملہ ایسا نہیں ملا قاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات اس بات پر مبنی ہوتی ہے کہ ''عرف'' میں یمین کا مبنی کیا ہے۔ لہٰذا اس سے ''حقیقت سماع'' کی نفی لازم نہیں آتی۔ جیسا کہ فقہ میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پس اس نے مچھلی کھالی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ''لحمًا طریًّا'' کہا ہے۔

البتہ اس حدیث کا علماء نے ایک جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی وجہ سے مسترد ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتی ہیں کہ یہ بات رسول اللہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے: [**وما أنت بمسمع من في القبور انك لا تسمع الموتٰى**] ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ متفق علیہ حدیث کو رد کرنا صحیح نہیں ہے جبکہ اس حدیث اور قرآن کے مابین کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس آیت میں ''موتی'' سے مراد کفار ہیں اور یہ ''نفی'' محمول ہے: نفی نفع پر واقع ہو رہی ہے نہ کہ مطلق سماع پر۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۸] قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿**لا تسمع الموتٰى**﴾ [النحل۔ ۸۰] جب یہ لوگ حق سمجھنے سے رک گئے تو اللہ نے ان کو سمجھایا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے سناتا ہے۔ یعنی اپنی ہدایت کی باتیں سناتا ہے اور اس کو اپنی آیات کے فہم اور نصیحت پکڑنے کی توفیق دیتا ہے اور **وما انت بمسمع من في القبور** میں ''ترشیح'' ہے ان لوگوں کی تمثیل ہے جو ''کفر'' پر اصرار کرتے ہوئے

مر گئے اور ایسی بات کو مبالغہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے کہ آپؐ ان کے ایمان لانے کے بارے میں ناامید ہو جائیں پس یہ آیت اس قبیل سے ہوگی۔

انّك لاتهدى من أحببْتَ ولكنّ اللّٰه يهدى من يشآء۔ لہٰذا جس کو چاہے اللہ سنادے گا اور جس کو چاہے نہیں سنائے گا۔

پھر فرمایا کہ شاید یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہو اور آپ ﷺ کا خاص معجزہ ہو اور کافروں کو مزید حسرت اور افسوس دلانا مقصود ہو اور یہی حضرت قتادة رضی اللہ عنہ کا بھی قول ہے۔ لیکن یہ بات بھی مردود ہے اس لیے کہ اختصاص کیلئے دلیل ضروری ہوتی ہے جبکہ یہاں اختصاص النبی ﷺ پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ سوال اور جواب خود اس کی نفی کر رہا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ضرب المثل کے قبیل سے ہو۔ لیکن آپ ﷺ کا جواب اس کی تردید کر رہا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی اس حدیث سے اشکال ہوتا ہے:

''**انّ الميّت يسمع قرع نعالهم اذا انصرفوا**''۔

''بے شک میت (مردہ) لوگوں کے جوتوں کی آہٹ بھی سنتا ہے جب وہ واپس جانے لگتے ہیں۔''

اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ علماء نے اس کو قبر میں ابتداءً رکھنے کے ساتھ خاص کیا ہے۔ تاکہ قرآن وحدیث میں باہم جمع ہو جائے اس لئے کہ ان دونوں آیات سے عدم سماع کا تحقق ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو ''موتی'' کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ بھی ایک قسم کا عدم سماع ہے''۔ اھ۔

لیکن جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں ایک قسم کا تناقض ہے۔ اس سے ''حدیث وقرآن'' میں جمع نہیں ہو رہا ہے۔ مزید یہ کہ آپ ﷺ سے اس بارے میں کوئی روایت بھی نہیں کہ جو اس کو ''أول أحوال الدفن'' کے ساتھ خاص کرتی ہو ''واللہ اعلم بالصواب''

قوله: "قال قتادة: "أحياهم اللّٰه حتّى أسمعهم قوله۔ توبيخًا وتحقيرًا ونقصةً"۔

علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کی بنیاد پر ''اختصاص النبی ﷺ'' کو اختیار کیا ہے۔ حالانکہ یہ قول جمہور ائمہ کے خلاف ہے۔ جیسا کہ کتاب ''شرح الصدور فی احوال القبور'' میں مفصلاً مذکور ہے۔

ہوازن کے جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک

۳۹۶۸: وَعَنْ مَرْوَانَ وَالْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ' اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَامَ حِيْنَ جَاءَهُ وَفْدُ هَوَازِنَ مُسْلِمِيْنَ فَسَأَلُوْهُ اَنْ يَرُدَّ اِلَيْهِم اَمْوَالَهُمْ' وَسَبْيَهُمْ فَقَالَ :فَاخْتَارُوْا اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ: اِمَّا السَّبْيَ' وَاِمَّا الْمَالَ قَالُوْا فَاِنَّا نَخْتَارُ سَبْيَنَا فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَاَثْنٰى عَلَى اللّٰهِ بِمَا هُوَ اَهْلُهُ' ثُمَّ قَالَ :اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ اِخْوَانَكُم قَدْ جَآءُوْا تَائِبِيْنَ' وَاِنِّى قَدْ رَأَيْتُ اَنْ اَرُدَّ اِلَيْهِمْ سَبْيَهُمْ فَمَنْ اَحَبَّ مِنْكُمْ اَنْ يُّطَيِّبَ ذٰلِكَ فَلْيَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ مِنْكُمْ اَنْ يَكُوْنَ عَلٰى حَظِّهِ حَتّٰى

نُعْطِيْهِ اِيَّاهُ مِنْ اَوَّلِ مَا يُفِيْءُ اللّٰهُ عَلَيْنَا فَلْيَفْعَلْ فَقَالَ النَّاسُ قَدْ طَيَّبْنَا ذٰلِكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ :رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِنَّا لَا نَدْرِىْ مَنْ اَذِنَ مِنْكُمْ مِمَّنْ لَمْ يَأْذَنْ فَارْجِعُوْا حَتّٰى يَرْفَعَ اِلَيْنَا عُرَفَاءُ كُمْ اَمْرَكُمْ فَرَجَعَ النَّاسُ فَكَلَّمَهُمْ عُرَفَاءُ هُمْ، ثُمَّ رَجَعُوْا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرُوْهُ اَنَّهُمْ قَدْ طَيَّبُوْا وَاَذِنُوْا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٤ / ٤٨٣، كتاب الوكالة، باب اذا وهب شيئاً لوكيل، الحديث رقم ٢٣٠٧ و أبو داود فی السنن ٣ / ١٤١، الحديث رقم ٦٢٩٣، وأحمد فی المسند ٤ / ٣٢٧

ترجمہ: ''اور حضرت مروان اور حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت (خطبہ ارشاد کرنے کے لئے منبر پر) کھڑے ہوئے جب قبیلہ ہوازن کے لوگ مسلمان ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ ﷺ سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کا مال اور ان کے قیدی ان کو واپس لوٹا دیئے جائیں' آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ دونوں چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کر لو یعنی یا تو قیدیوں کو رہا کرا لے جاؤ یا مال واپس لے لو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ''ہم اپنے قیدیوں کو رہا کرانا چاہتے ہیں'' تب رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے) یہ خطبہ ارشاد فرمایا پہلے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جس کا وہ مستحق ہے اور پھر فرمایا کہ امابعد! یہ (قبیلہ ہوازن کے لوگ) جو تمہارے (دینی یا نسبی) بھائی ہیں (اپنے کفر و شرک سے) توبہ کر کے (اور مسلمان ہو کر) تمہارے پاس آئے ہیں' میری رائے تو یہ ہے کہ ان کو ان کے قیدی واپس کر دوں' لہٰذا تم میں سے جو شخص خوشی کے ساتھ قیدیوں کو واپس کرنا چاہے تو وہ ایسا ہی کرے (یعنی اس کے پاس جو قیدی ہیں ان کو رہا کر کے اس کو واپس کر دے) اور جو شخص اپنے حصہ پر قائم رہنا چاہے یہاں تک کہ ہم ابن کو اس کا عوض اس پہلے آنے والے مال میں سے نہ دے دیں جو اللہ تعالیٰ ہمیں غنیمت کے طور پر عطا کرے تو وہ ایسا ہی کرے (یعنی جو شخص اپنے حصے کے قیدی کو بغیر معاوضہ کے' نہ دینا چاہے تو وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیا معاوضہ لے گا تا کہ ہم یہ انتظام کر دیں کہ اب کہیں سے سب سے پہلے جو مال غنیمت آئے اس میں سے اس کا وہ معاوضہ ادا کر دیا جائے) لوگوں نے (یعنی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم یا بلا امتیاز تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے) عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! ہم اس پر (یعنی قیدیوں کو واپس کر دینے پر) خوشی کے ساتھ آمادہ ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں (اس مجمع میں) یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم میں سے کس شخص نے اجازت دی اور کس شخص نے اجازت نہیں دی۔ لہٰذا تم سب لوگ (اپنے اپنے گھر) لوٹ جاؤ (اور اپنے خاندان و قبیلہ کے سرداروں سے اس بارے میں مشورہ کر لو) یہاں تک کہ تمہارے (وہ) سردار تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے تمہارا فیصلہ پیش کریں''۔ چنانچہ سب لوگ لوٹ کر چلے گئے اور جب ان کے سرداروں نے ان سے گفتگو کر لی تو وہ لوگ) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دوبارہ واپس آئے اور آپ ﷺ کو بتایا کہ وہ (قیدیوں کو واپس کر دینے پر) راضی ہیں انہوں نے (اس امر کی) اجازت دے دی ہے''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

مروان بن الحکم۔ یہ ''مروان'' ہیں۔ ''حکم'' کے بیٹے ہیں۔کنیت ''ابوعبدالملک'' ہے۔قریشی اموی ہیں ۔عمر بن عبد العزیز کے دادا ہیں۔مروان آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ ۲ھ میں پیدا ہوئے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غزوۂ خندق کے سال میں یا کسی اور سال پیدا ہوئے۔انہوں نے آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی زیارت نہیں کی کیونکہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ان کے والد کو طائف کی جانب جلاوطن کر دیا تھا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک یہ وہیں مقیم رہے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ واپس بلالیا۔یہ اپنے بیٹے کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے۔دمشق کے مقام پر ۶۵ھ میں وفات پائی۔کچھ صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔ان میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ان سے کچھ تابعین نے روایت کی جیسے عروہ بن زبیر اور علی بن الحسین رضی اللہ عنہم۔

تشریح:قوله:ان رسول اللهؐ قام حين جاء ة......فانا نختار سبينا:

''أن رسول الله قام'' یہی الفاظ کتاب الحمیدی، جامع الاصول اور شرح السنۃ وغیرہ میں ہیں۔جس کا معنی یہ ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وعظ ونصیحت کرنے کیلئے کھڑے ہوگئے۔جبکہ ''المصابیح'' کے بعض نسخوں میں یہ الفاظ ہیں ''قال'' ہے۔

حين جاء ه وفد هوازن مسلمين '':یعنی یہ وفد ہوازن اس کے بعد آئے تھے کہ جب مسلمانوں نے ان کے مالوں کو لوٹ لیا تھا اور ان کی اولاد کو قید کر کے اپنے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔بعض علماء کا قول ہے کہ یہ قیدی تقریباً سات ہزار تھے۔

فاختاروا:''الاختيار '' سے امر کا صیغہ ہے،اور فاء جزائیہ ہے۔یہ شرط محذوف کیلئے جزاء ہے۔مطلب یہ کہ اب جب تم مسلمان ہو کر آئے ہو تو تمہیں اختیار حاصل ہے۔دونوں میں سے کوئی ایک کو لے لو یا مال لو، یا قیدی واپس لو۔

''احدى الطائفتين اما السبى واما المال'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں پر مال کو ''طائفہ'' یا مجازاً کہا ہے اور یا تغلیباً کہا ہے۔ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہوسکتا ہے کہ مشاکلۃً کہا ہو۔''القاموس'' میں لکھا ہے کہ ''طائفة '' کا اطلاق ایک ٹکڑا پر ہوتا ہے۔ایک اور اس سے زائد حصہ کو الطائفہ کہتے ہیں۔یا یہ کہ ایک سے لے کر ہزار تک کو طائفہ کہتے ہیں۔

علامہ جوہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا طائفہ اس کے ٹکڑے اور ایک حصہ کو کہتے ہیں۔اس لئے اس میں کوئی مجاز نہیں ہے اور اس قول کی تائید امام راغبؒ کے اس کلام سے بھی ہوتی ہے کہ ''طواف'' کسی چیز کے اردگرد چلنے کو کہتے ہیں اور اسی سے ''الطائف'' ہے۔جو اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ گھر کے اردگرد پھرے اور اسی سے خیال اور حادثہ کیلئے بھی لفظ ''الطائف'' مستعار لیا گیا ہے اور ''الطائفة من الناس '' لوگوں کی ایک جماعت کو کہتے ہیں اور الطائفة من الشئ اس کے ٹکڑے اور حصہ کو کہتے ہیں۔

''قالوا:فانا نختار سبينا '':ان لوگوں نے قیدیوں کو ترجیح دی اس لئے کہ یہ مال سے زیادہ عزیز ہے۔کیونکہ اس میں عار ہے اور ضرب المثل ہے:''النار ولا العار''

قوله:''فقام رسول الله ﷺ قد جاء واتابين:''

اس کا اعادہ اس وجہ سے کیا کہ طویل فصل آ گیا تھا۔

قالَ ''أمَّا بعد اى بعد الثناء الجميل والحمد الجزيل ''یعنی اس ثناء جمیل اور حمد جزیل کے بعد فرمایا۔

''فان اخوانكم'':

نسبت سے ''اخوانكم'' ارشاد فرمایا یا نسبت نسبی کی وجہ سے ارشاد فرمایا۔

''وانى قد رأيتُ ان ارد اليهم سبيهم'': ''رأيت'' رائے سے ماخوذ ہے (یعنی میری رائے ہے)

قوله: ''فمن أحب منكم أن يطيب ذالك فليفعل''

''ذالك'': اس کا مشار الیہ یعنی (رد السبى) ''السّبى'' ہے۔

یطیب: میرک رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ سے نقل کیا ہے کہ ''یطیب'' طائے مہملہ کے فتحہ اور یائے تحتانیہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی جو کوئی اس کو طیب نفس کے ساتھ بغیر کسی عوض کے واپس کرے۔ تو وہ بلا عوض اس کو واپس کر دے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ذالك'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس رائے کی طرف اشارہ ہے۔ اى ''رد السبى'' یعنی ان قیدیوں کو واپس کرنا۔ اھ اس کا ظاہر یہ ہے کہ ''یطیب'' تخفیف کے ساتھ ہے۔

قوله: ''ومن أحب منكم ان يكون على حظه حتى نعطيه اياه ''من اوّل ما يفئى الله علينا فليفعل''

اور جو کوئی یہ پسند کرے کہ وہ اپنے حصہ پر مداومت کرے۔ تو وہ اس وقت تک انتظار کریں کہ ہم اس کو اس کا عوض دیں ہمیں اللہ تعالیٰ جو مال فئی دیں گے۔ اس سے پہلے اس کا حصہ دیں گے۔ تو وہ ایسا کرلے اور فئی اس مال کو کہتے ہیں کہ کافروں سے بغیر لڑائی کے لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ جزیہ اور خراج ہے۔

قوله: ''فقال رسول الله ﷺ ''انا لاندرى'' من اذن منكم ممن لم يأذن ......''

یعنی ہم بطریق استغراق اس بات کو نہیں جانتے کہ کس نے تم میں اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی ہے۔ یا رد کرنے پر کون راضی ہے اور کون ناخوش ہیں، ہم اس کو نہیں مانتے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان قیدیوں کو واپس لوٹانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اجازت اس لئے مانگی۔ کہ یہ اموال اور قیدی مجاہدین کی ملکیت بن چکے تھے اور ملک کی چیز اجازت کے بغیر واپس لوٹانا جائز نہیں ہے۔

''فارجعوا حتى يرفع الينا عرفاؤكم امركم'': طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''حتّى'' ثانیہ ''حتى'' اولیٰ کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ ''حتى'' اولیٰ کے بعد صیغہ استقبال کا ہے اور وہ بمعنی ''كى'' ہے اور جب کہ ''حتى ثانيه'' کے بعد فعل معنی حال میں ہے۔ لہٰذا اس ''حتى'' کے بعد فعل مرفوع ہوگا۔ جیسا کہ یہ قول ہے: ''شربت الابل حتى يجئ البعير'' تو یہ ''حتى'' ''الىٰ'' کے معنی میں ہے۔

جنگی قیدیوں کے تبادلہ کا بیان

۳۹۶۹: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ : كَانَ ثَقِيفُ حَلِيفًا لِبَنِي عَقِيلٍ فَاَسَرَتْ ثَقِيفٌ رَجُلَيْنِ مِنْ

اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَسَرَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلاً مِنْ بَنِيْ عَقِيْلٍ فَاَوْثَقُوْهُ فَطَرَحُوْهُ فِي الْحَرَّةِ فَمَرَّ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَنَادَاهُ يَا مُحَمَّدُ يَا مُحَمَّدُ فِيْمَ اُخِذْتُ قَالَ بِجَرِيْرَةِ حُلَفَائِكُمْ ثَقِيْفٍ فَتَرَكَهٗ وَمَضٰى فَنَادَاهُ يَا مُحَمَّدُ يَا مُحَمَّدُ فَرَحِمَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَجَعَ قَالَ مَا شَأْنُكَ قَالَ اِنِّيْ مُسْلِمٌ. فَقَالَ: لَوْ قُلْتَهَا وَاَنْتَ تَمْلِكُ اَمْرَكَ اَفْلَحْتَ كُلَّ الْفَلَاحِ قَالَ: فَفَدَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالرَّجُلَيْنِ الَّذَيْنِ اَسَرَتْهُمَا ثَقِيْفٌ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٢٦٢ كتاب النذر' باب لاوفاء لنذرٍ فى معصية الله' الحديث رقم ١٦٤١' وأبو داود فى السنن ٣ / ٦٠٩ الحديث رقم ٣٣١٦' وأحمد فى المسند ٤ / ٤٣٠

ترجمه: ''اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قبیلۂ ثقیف' بنوعقیل کا حلیف تھا' چنانچہ جب قبیلہ ثقیف کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے دو صحابیوں کو قید کر لیا تو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بنوعقیل کے ایک آدمی کو قید کر لیا اور اس کو مضبوطی سے باندھ کر حرہ (یعنی پتھریلی زمین) میں ڈال دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا گزر اس کے پاس سے ہوا تو اس (قیدی) نے آپ ﷺ کو پکارا: ''محمد! محمد! مجھے کس جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے؟'' آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اپنے حلیف قبیلۂ ثقیف (کے لوگوں کے جرم میں یعنی قبیلہ ثقیف کے لوگوں نے ہمارے دو مسلمانوں کو پکڑ لیا ہے' ان کے بدلے میں تمہیں پکڑ لیا گیا ہے''۔ (یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے اس کو اس کے حال پر (اس کی جگہ) چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئے' اس نے آنحضرت ﷺ کو پھر پکارا ''محمد! محمد! رسول اللہ ﷺ کو اس پر رحم آ گیا' آپ ﷺ اس کے پاس واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم ''کس حال میں ہو؟'' اس نے کہا کہ ''میں مسلمان ہوں'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (کاش) تم یہ بات اس وقت کہتے جب تم خود اپنے اختیار کے مالک تھے (یعنی جب کہ تم قید ہونے سے پہلے اپنے اوپر اختیار رکھتے تھے اور تم پر کوئی دباؤ نہیں تھا اگر اس وقت بطریق رغبت یہ کہتے کہ میں مسلمان ہوں) تو تم کامل کامیابی وفلاح پاتے (یعنی دنیا میں تو یہ نجات ملتی کہ قید نہ ہوتے اور آخرت میں دوزخ کے عذاب سے چھٹکارا پاتے)۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کو ان دونوں آدمیوں کے بدلے میں جن کو ثقیف نے قید کر رکھا تھا' رہا کر دیا''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: وعن عمران بن حصين۔۔۔فتركه ومضى:

''حصین'' صیغہ تصغیر کے ساتھ ہے۔

ثقیف: ایک نسخہ میں ''ثقیف'' تنوین کے ساتھ ہے۔ جبکہ دوسرے نسخہ میں بلاتنوین کے ہے۔ صاحب قاموس کا کہنا ہے کہ ثقیف ''امیر'' کی طرح ہے' یہ قبیلہ ہوازن کا جدامجد تھا۔

عقیل علامہ توربشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''عقیل'' صیغۂ تصغیر کے ساتھ ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا۔ اس کے لوگ ''ثقیف'' کے حلیف تھے۔ ''فأسرت ثقيف رجلين من اصحاب رسول الله ﷺ'': اور ایک نسخہ میں ''من اصحاب

النبی صلی اللہ علیہ وسلم"۔

یعنی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوعقیل میں سے ایک آدمی کو قیدی بنایا ان دو آدمیوں کے عوض جن کو ثقیف نے پکڑا تھا اور اس وقت عادت یہ تھی کہ حلیف کے جرم میں دوسرے حلیف کو پکڑا جاتا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل ان کی عادت کے مطابق کیا تھا۔ اس کو ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

"حرۃ" حائے مہملہ کے فتحہ اور راء کی تشدید کے ساتھ مدینہ کے پاس سیاہ پتھروں والے ایک علاقے کا نام ہے۔

فیم: دخول حرف جر کی وجہ سے ما استفہامیہ کے الف کو حذف کیا گیا ہے۔

حلفائکم ثقیف "ثقیف" "حلفائکم" سے بدل ہے۔

"الجریرۃ": اس سے مراد گناہ و جنایت ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنوثقیف کے درمیان عہد تھا جب انہوں نے عہد شکنی کی۔ تو اس عہد شکنی پر بنوعقیل نے ان کو کچھ برا بھلا نہیں کہا اور یہ لوگ بنوثقیف کے ساتھ عہد میں تھے تو ان کے نقض عہد کی وجہ سے گویا کہ یہ بھی نقض عہد کے شریک ہوئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے جرم کے بدلہ میں اس کو پکڑ لیا اور بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں نے تم کو اس لئے پکڑا ہے تا کہ تیرے ذریعہ تیرے حلیف ثقیف کو ان کے جرم کا بدلہ دیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ان دو مسلمان قیدیوں کا فدیہ قرار دیا تھا جن کو انہوں نے قیدی بنایا تھا۔

قولہ فرحمۃ رسول اللہ فرجع۔۔۔ افلحت کل الفلاح:

قال: انی مسلم: اس نے کہا کہ ابھی ابھی مسلمان ہوا ہوں۔ یا یہ کہ اس سے پہلے میں مسلمان ہوا تھا۔

"أفلحت کل الفلاح": آپ مکمل کامیابی حاصل کر لیتے۔ یعنی دنیا میں غلامی سے نجات حاصل کر لیتے اور آخرت میں آگ سے خلاصی کی صورت میں کامیابی حاصل ہو جاتی

علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دلیل ہے کہ کافر جب قیدی بن جائے اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں تو اس کے اس دعویٰ کو بغیر بین کے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر اس کے بعد اسلام لے آیا تو اس کا خون بہانا حرام ہو جائے گا البتہ اس کو غلام رکھنا جائز ہوگا اور اگر اس نے قیدی بننے کے بعد جزیہ کو قبول کیا تو اس کے قتل کی حرمت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض قتل کے جواز اور بعض عدم جوز کے قائل ہیں۔

اور شرح السنۃ" میں یہ اضافہ ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ قیدی کے اسلام لانے کے بعد اس سے فدیہ لینا جائز ہے۔ اس کا چھڑانا اور آزاد کرنا واجب نہیں ہے۔

"ہدایہ" میں ہے کہ اگر قیدی اسلام لے آیا اور وہ ابھی تک ہمارے قبضہ میں ہو تو اس سے فدیہ نہیں لیا جائے گا اس لئے کہ اس کا فائدہ نہیں ہوگا۔ مگر جب کہ وہ اپنے نفس کا مطالبہ کرے اور وہ اپنے اسلام پر مامون ہو تو یہ جائز ہے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو نقصان دیئے بغیر تخلیص کا فائدہ دے رہا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دارالحرب واپس کر دیا تھا۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا کہ یہ اپنی اس بات میں سچے نہیں ہیں یا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ خاص ہے۔

اور بعض کا قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو واپس کرنا اور اس کے عوض دو آدمیوں کو لینا اس کے اسلام کے منافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کے درمیان معاہدہ میں شرط ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قوله:''ففداه رسول الله ﷺ بالرجلين الذين اسرتهما ثقيف'':

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ نہیں کیا جائے گا۔ علامہ ابن ہمام ''فرماتے ہیں کہ یہ دراصل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دوروایتوں میں سے ایک روایت ہے۔ امام قدوری اور صاحب ہدایہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ قیدیوں کا قیدیوں کے ساتھ تبادلہ جائز ہے۔ جیسا کہ امام ابو یوسف امام محمد، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ مگر ان کے نزدیک قیدی عورتوں کے ساتھ تبادلہ جائز نہیں۔

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بچوں کے ساتھ تبادلہ کو منع کیا ہے اور یہ ''السیر الکبیر'' کی روایت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دوروایتوں میں سے یہ زیادہ واضح ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ قیدیوں کا تبادلہ قبل از تقسیم تو جائز ہے۔ لیکن بعد تقسیم جائز نہیں ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام صورتوں میں جائز ہے اور ''ہدایہ'' نے اس روایت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس میں دراصل کفر کی اعانت ہے۔ بایں طور کہ وہ ہم سے لڑائی کے لئے دوبارہ آجائے گا اور اس کے اس شر کو دفع کرنا مسلمان کے چھڑانے سے بہتر ہے۔ چونکہ جب وہ مسلمان ان کے ہاتھوں میں رہے گا۔ تو ایذاء صرف اسی ایک کو پہنچ رہی ہے اور اگر ہم اس قیدی کو واپس کریں گے تو اس قیدی کا نقصان مسلمانوں کی پوری جمعیت کو بھگتنا پڑے گا۔

دوسری روایت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ مسلمان کو چھڑانا کسب کافر سے اولیٰ ہے کیونکہ اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمان کی عزت وحرمت کافر سے بڑھ کر ہے اور جس ضرر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کو اس مسلمان کے فائدے سے دفع کیا جاسکتا ہے جو ان سے چھٹکارا حاصل کر کے آئے گا اس لئے کہ ایک شخص کا ضرر ہے اور اس کے ضرر ونقصان کو دوسرے کے فائدہ سے دفع کیا جاسکتا ہے۔ تو گویا یہ برابر سرابر ہوگیا۔ البتہ مسلمان کے چھڑانے کی فضیلت اور اس کو اللہ کی عبادت کا موقع فراہم کرنا یہ اضافی فضیلت ہے۔ جیسا کہ اس کو زیادہ ترجیح ہونی چاہیے اور پھر یہ کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے اور ابوداؤد اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمانوں کے کے بدلے ایک مشرک کو فدیہ میں دیا ہے۔

''انّ رسول الله ﷺ فدى رجلين من المسلمين برجل من المشركين''۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایاس بن سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ عن ابیہ سے بھی روایت نقل کی ہے: **''خرجنا مع ابی بکر أمره علينا رسول الله ﷺ الى ان قال! فلقينى رسول الله ﷺ فى السوق فقال: ''يا سلمة هب لى المراة لله ابوك'' اعنى اللتى كان ابو بكر نفله ايا ها فقلت : هى لك يا رسول الله! والله ما كشفت لها ثوبًا ففدى بها رسول الله ﷺ ناسًا من المسلمين كا نوا أسروا بمكة''۔**

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں ایک غزوہ میں نکلے۔ راوی نے واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بازار میں ملے۔ تو مجھے کہا کہ اے سلمہ! وہ عورت مجھے ھبہ کردو۔ یعنی جو عورت تمہیں ابوبکر صدیق

ﷺ نے نفل کے طور پر دی ہے۔ سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول وہ آپ کی ہوئی۔ بخدا میں نے ابھی تک اس کا ازار بند بھی نہیں کھولا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو ان مسلمانوں کے فدیہ میں دے دیا جن کو مکہ میں قید کیا گیا تھا۔ البتہ یہ روایت ان کی رائے کے خلاف ہے کیونکہ وہ عورت کو فدیہ میں دینے کے قائل نہیں ہیں۔ ملاعلی قاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے قائل نہ ہوں کہ ایک کو ایک کے بدلے میں دیا جائے۔ اگر ایک سے زائد کے بدلے میں ہوتو پھر جائز ہو۔

الفصل الثانی:

جنگی قیدی کو شرط پر رہا کرنے کا بیان

۳۹۷۰: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا بَعَثَ اَهْلُ مَكَّةَ فِيْ فِدَاءِ اُسَرَائِهِمْ بَعَثَتْ زَيْنَبُ فِيْ فِدَاءِ اَبِى الْعَاصِ بِمَالٍ وَبَعَثَتْ فِيْهِ بِقِلَادَةٍ لَهَا كَانَتْ عِنْدَ خَدِيْجَةَ اَدْ خَلَتْهَا بِهَا عَلٰى اَبِى الْعَاصِ فَلَمَّا رَآهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَقَّ لَهَا رِقَّةً شَدِيْدَةً وَقَالَ اِنْ رَاَيْتُمْ اَنْ تُطْلِقُوْا لَهَا اَسِيْرَهَا وَتَرُدُّوْا عَلَيْهَا الَّذِىْ لَهَا فَقَالُوْا نَعَمْ وَكَانَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَخَذَ عَلَيْهِ اَنْ يُّخَلِّىَ سَبِيْلَ زَيْنَبَ اِلَيْهِ وَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ وَرَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ كُوْنَا بِبَطْنِ يَأْجِجَ حَتّٰى تَمُرَّ بِكُمَا زَيْنَبُ فَتَصْحَبَاهَا حَتّٰى تَاْتِيَابِهَا۔ (رواہ احمد وابو داود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۱٤۰ کتاب الجهاد' باب فى فداء الاسير بالمال' ح ۲۶۹۲ و أحمد فى المسند ۶ / ۲۷۶

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب (جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کفار مکہ پر غلبہ اور فتح عطا فرمائی اور ان میں سے کچھ کفار تو قتل کر دیئے گئے اور کچھ قیدی بنا کر مدینہ لائے گئے اور پھر آپ ﷺ نے ان کی رہائی کے بدلے میں فدیہ طلب کیا تو) اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کی رہائی کا معاوضہ روانہ کیا (آپ ﷺ کی صاحبزادی) حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی (اپنے شوہر) ابوالعاص کی رہائی کے بدلے میں کچھ فدیہ بھیجا جس میں ان کا وہ ہار بھی تھا جو (پہلے) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اور اس کو انہوں نے ابوالعاص کے ساتھ زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقعہ پر ان کو (جہیز میں) دیا تھا' جب رسول اللہ ﷺ نے وہ ہار دیکھا چنانچہ جب نبی ﷺ نے وہ ہار دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ تو وہی ہار ہے۔ تو زینب رضی اللہ عنہا کی خاطر آپ ﷺ پر سخت رقت طاری ہوگئی (یعنی اس وقت اپنی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی غربت وتنہائی کا احساس کر کے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت کی یاد تازہ ہو جانے کی وجہ سے جن کے گلے میں وہ ہار رہتا تھا آپ ﷺ کا دل بھر آیا اور) آپ ﷺ نے (صحابہ رضی اللہ عنہم سے) فرمایا کہ ''اگر تم مناسب سمجھو تو زینب رضی اللہ عنہا کی خاطر اس کے قیدی

(ابوالعاص) کو (بغیر فدیہ کے) رہا کر دو اور اس (زینبؓ) کو اس کی (وہ سب) چیزیں (جو اس نے ابوالعاص کی رہائی کے لئے بھیجی ہیں) واپس کر دو"۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ بہتر ہے (ہم زینبؓ کا مال واپس کر کے ابوالعاص کو بلا معاوضہ رہا کر دیتے ہیں) چنانچہ (ابوالعاص کو رہا کر دیا گیا اور رہائی کے وقت) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالعاص سے یہ عہد و وعدہ لیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زینب رضی اللہ عنہا کے آنے کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالیں (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالعاص کو رہا کرتے وقت ان سے کہا کہ یہ پکا وعدہ کرو کہ مکہ پہنچ کر زینب رضی اللہ عنہا کو میرے پاس مدینہ آنے دو گے اور اس کا راستہ نہیں روکو گے) اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور انصار میں سے ایک شخص کو (مکہ) روانہ کیا اور ان سے کہا کہ تم لوگ بطن یاجج کے مقام پر ٹھہر جانا یہاں تک کہ زینب رضی اللہ عنہا (مکہ سے روانہ ہو کر) وہاں تمہارے پاس آئیں تو تم اس کے ساتھ ہو جانا اور (ان کو مدینہ) لے آنا"۔ (احمد، ابوداؤد)

تشریح: "**كانت عند خديجه ادخلتها بها على ابى العاص**"۔ یہ وہ ہار تھا جو کہ ابتداء حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا۔ انہوں نے حضرت زینبؓ کو ان کی شادی کے موقع پر پہنایا تھا۔

قوله: "وقال: "ان رأيتم ان تطلقوا لها اسيرها، وتردوا عليها الّذى لها":

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "رأیتم" کا مفعول ثانی اور جواب شرط دونوں محذوف ہیں۔ اصل عبارت ہوں ہوگی "ان رأيتم الاطلاق والرد حسناً فافعلوها"۔ (اگر تم اطلاق اُسیر اور فدیہ کی واپسی کو اچھا سمجھو تو ایسا کر لو)۔

علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت زینبؓ کی شادی ابوالعاص کے ساتھ بعثت سے پہلے ہوئی تھی۔

قوله: كونا ببطن يأجج ......:

يأجج: یاء کے فتحہ، ہمزہ کے سکون اور جیم اول کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں جیم ثانی کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ غیر منصرف "تنعیم" نامی جگہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے اور بعض کا قول ہے کہ مسجد عائشہ کے سامنے والی جگہ کا نام ہے۔ جبکہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "بطن" دراصل نچلی جگہ کو کہتے ہیں۔ بطن یأجج حرم شریف کے اردگرد وادیوں میں سے ایک وادی کا نام ہے۔

ابن الملکؒ لکھتے ہیں کہ اس میں نون، جیم اور حائے مہملہ کے بعد پھر جیم ہے اھ

"القاموس" میں فصل یاء باب جیم کے تحت لکھتے ہیں کہ "یاجج" الف کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ لفظ **يمنع ويضرب** ہے۔ ایک جگہ کا نام ہے اور اُجاج میں لکھا ہے امام سیبویہ فرماتے ہیں کہ یہ اسم "جعفر" کے ساتھ ملحق ہے۔ فصل ہمزہ، باب جیم کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ یسمع، ینصر اور یضرب کی طرح ہے مکہ میں واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ اھ اور فصل نون، باب حاء میں اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور المغنی میں حرف یاء کے تحت مذکور ہے کہ "بطن یأنج" جیم اور حائے مہملہ کے ساتھ، ایک جگہ کا نام ہے۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اس حدیث سے اس بات کا جواز نکلتا ہے کہ قیدی پر بغیر فدیہ کے احسان درست ہے۔

امیر المسلمین امن کے زمانہ میں ایک اجنبی عورت کے ساتھ دو یا اس سے زائد آدمیوں کو بھیج سکتا ہے بشرطیکہ فتنہ کا

خدشہ نہ ہو۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ استدلال ثانی محل نظر ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ ایک محرم مرد ہو یا کچھ ثقہ عورتیں بھی ہوں اور یہ واقعہ تو بغیر محرم کے سفر سے نہی سے پہلے کے زمانہ کا ہے اور پہلے استدلال کا جواب ماقبل میں گذر چکا ہے۔

کافر قیدیوں کو مال کے بدلے واپس کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مشہور قول کے مطابق یہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ ہم پر دوبارہ حملہ کرسکتا ہے۔ لیکن ''السیر الکبیر'' میں ہے کہ مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہو تو ان قیدیوں کو کافروں سے مال لے کر چھوڑا جاسکتا ہے اور استدلال اساریٰ بدر سے کیا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت مسلمانوں کو مال کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے بدر میں اساریٰ کو مال کے فدیہ کے عوض چھوڑ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں قرآن میں عتاب کی آیتیں نازل فرمائیں: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ﴾ [الانفال۔ ٦٧] ''پیغمبر کو شایان نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے۔ اور خدا غالب حکمت والا ہے۔''

''یثخن'' کا معنی مفسرین نے ''قتل'' کیا ہے۔ یعنی اللہ کے دشمنوں کو قتل کریں یہاں تک کہ اس زمین سے فنا ہو جائیں [تریدون عرض الدنیا واللّٰہ یرید الأخرۃ] (تم دنیا کے سامان چاہتے ہو۔ جبکہ اللہ آخرت کو چاہتا ہے) اور یہ آیت نازل ہوئی [لولا کتاب من اللّٰہ سبق] اور کتاب اللہ میں یہ بات ہوئی تھی کہ نہی سے پہلے اللہ تعالیٰ کسی کو عذاب نہیں دیا کرتے۔ اس لئے کہ ابھی تک اس نے تمہیں اس سے روکا نہیں تھا۔

[لمسکم فیما اخذتم عذابٌ عظیم] کہ نہی سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیتا اس نے اس سے تمہیں منع نہیں کیا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو تم پر سخت عذاب نازل ہوتا۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان غنیمتوں کو تمہارے لئے رحمت بنا کر حلال کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ [الانفال۔ ٦٩] اور ''ماغنتم'' عام ہے۔ یہ مجموعہ کو شامل ہے کہ وہ غنیمت جو تم نے میدان جنگ میں لی۔ یا ان کے قیدیوں سے رہائی کے بدلے لی۔ سب کو شامل ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ صرف غنیمت کو شامل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فدیہ بھی تو غنیمت ہے؟ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اگر اس کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر یہ مقید ہے اس کے ساتھ کہ یہ اس وقت درست ہے جب اس سے مسلمانوں کو کوئی ضرر لاحق نہ ہو۔ جبکہ ان کے رد میں محاربین کی کثرت ہو جائے گی اور وہ بھی ایک دنیاوی غرض کی وجہ سے اور تفسیر ''الکشاف'' وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تھا جبکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدیہ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ ہوگا اور اس امید پر کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔

راوی فرماتے ہیں ہے کہ جب مسلمانوں نے فدیہ لے لیا تو آیت عتاب نازل ہوئی۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رو رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تو فرمایا کہ میں تمہارے ان ساتھیوں پر رو رہا ہوں کہ انہوں نے فدیہ لے لیا ہے۔ ان کا عذاب میرے اوپر اس درخت سے بھی زیادہ قریب

پیش کیا گیا تھا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لو نزل من السمآء عذاب ما نجا منه الا عمر و سعد بن معاذ''۔

''اگر آسمان سے کوئی عذاب نازل ہوتا۔ تو اس سے عمر اور سعد بن معاذ کے علاوہ کوئی بھی نہ بچتا۔''

اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے کہا تھا: کان اثخان فی القتل أحب'' (واللّٰه اعلم بذالك)۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

''الاصابة'' میں ہے کہ ابوالعاص سے مراد ربیع بن عبدالعزیٰ بن عبدشمس بن عبدمناف ہے۔ ان کی ماں کا نام ہالہ بنت خویلد ہے۔ زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوالعاص بن الربیع کے نکاح میں تھیں۔ حضرت زینب نے ہجرت کی۔ جبکہ ابوالعاص اپنے دین پر قائم رہا اور اس پر اتفاق ہے کہ ابوالعاص ایک دفعہ شام کی طرف تجارت کی غرض سے نکلے تھے۔ جب مدینہ کے قریب آئے تو بعض مسلمانوں نے اس کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا کہ ان سے مال ومتاع کو لوٹ کر ان کو قتل کر دیں۔ چنانچہ یہ بات حضرت زینبؓ کو پہنچی۔ تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! کیا مسلمانوں کا عہد ایک نہیں ہوتا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیوں نہیں۔ تو زینبؓ کہنے لگیں کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ میں نے ابوالعاص کو امان دی ہے۔ جب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو وہ بغیر اسلحہ کے نکلے اور ابوالعاص سے کہا کہ تم قریش کے ایک معزز آدمی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھی ہو۔ تو کیا تم یہ چاہو گے کہ تم اسلام لے آؤ اور ان اموال کو تم غنیمت کے طور پر لے لو؟ تو انہوں نے کہا۔ یہ تم مجھے بری چیز کا حکم دے رہے ہو یہ کہہ کر وہ چل پڑے یہاں تک کہ مکہ پہنچ کر ہر حقدار کو اس کا حق دیا۔ پھر کھڑے ہو کر فرمایا: اے اہل مکہ! میں نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر کہا کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں''۔ چنانچہ پھر ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو ان کے پہلے نکاح کے ساتھ ہی ان کے حوالے کر دیا۔

جنگی قیدیوں کے ساتھ مختلف طرح کا سلوک کرنا

۳۹۷۱: وَعَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اَسَرَاَهْلَ بَدْرٍ قَتَلَ عُقْبَةُ بْنَ اَبِىْ مُعَيْطٍ وَالنَّضْرَ بْنَ الْحَارِثِ وَمَنَّ عَلٰى اَبِىْ عَزَّةَ الْجُمَحِىِّ۔ (رواه فى شرح السنة)

اخرجه البغوى فى شرح السنة ١١ / ٧٨، الحديث رقم ٢٧١١، البيهقى، السنن الكبرىٰ، كتاب السير۔

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر (کی جنگ میں مجاہدین اسلام کے خلاف لڑنے) والوں (میں سے جن کفار) کو قید کیا تھا ان میں سے عقبہ بن ابومعیط اور نضر بن حارث کو قتل کیا اور ابوعزہ پر (بلا معاوضہ رہا کر کے) احسان کیا''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله: ان رسول اللّٰه لما اسراهل بدر'' ''قتل عقبة بن ابى معيط والنضر بن الحارث''

ایک نسخہ میں ''اسر'' صیغۂ مجہول کے ساتھ آیا ہے۔

''ہدایہ'' میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان قیدیوں کے بارے میں اختیار تھا کہ فدیہ لے لیں یا ان کو قتل کر دیں۔ آپؐ نے ان کو قتل

کردیا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یعنی جب انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی قیدیوں کو قتل کیا ہے۔ اس لئے عقبہ بن ابی معیط وغیرہ کے قتل میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کے قتل میں فساد کا مادہ بالکلیہ ختم ہو گیا اور اگر چاہتے تو اس کو غلام بنا لیتے۔ اس لئے کہ اس میں ان کے شر کا دفعیہ ہے نیز اس میں اہل اسلام کی فوری مصلحت ہے۔ اس لیے کہ ہم کہتے ہیں غازیوں میں سے کسی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ بذات خود کسی قیدی کو قتل کرے اس لئے کہ اس میں امام کی رائے معتبر ہوتی ہے اور اگر امام چاہے تو ان کو آزاد چھوڑ دے۔ جیسا کہ ہم نے واضح کیا کہ حضرت عمر نے اہل سواد (عراق) کے بارے میں ایسا ہی کیا تھا۔ مگر عرب مشرک قیدی اور کسی بھی مرتد کو بغیر قتل کے نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس لئے کہ ان سے نہ جزیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی ان کو غلام بنایا جائے گا۔ بلکہ دو باتیں ہیں یا تو اسلام لائیں گے اور یا تلوار کے گھاٹ اتار دیئے جائیں اگر قیدیوں نے قید ہونے کے بعد اسلام قبول کیا تو ہم ان کو قتل نہیں کریں گے۔ لیکن (اسلام لانے کے باوجود) ان کو غلام بنانا جائز ہے اس لئے کہ اسلام رقیت کی نفی نہیں کرتا۔ اس کے اس کفر اصلی کی سزا کے طور پر۔ کیونکہ اسلام انعقاد سبب ملک کے بعد پایا جارہا ہے اور سبب ملک یہ ہے حربی پر استیلا پایا گیا ہے برخلاف مشرکین عرب پر استیلا پائے جانے کے (ان کا حکم پچھلی سطروں میں مسطور ہو چکا ہے) برخلاف اس صورت کے کہ وہ پکڑنے سے پہلے اسلام لے آئے تو ان کو غلام نہیں بنایا جائے گا وہ آزاد ہوں گے اس لئے کہ سبب ملک کے انعقاد سے پہلے وہ اسلام لے آئے ہیں۔

قوله: ''ومنّ علٰی أبی عزة الجمحی'':

یہ جمحی اصل میں جمح بن عمرو کی طرف منسوب ہے۔ ''عزة'' عین مہملہ کے فتحہ اور زاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور ''جمی'' جیم کے ضمہ اور میم کے فتحہ اور حاء مہملہ کے ساتھ ہے۔ احسان اس طور پر کیا کہ اس کو آزاد چھوڑ دیا اور اس سے پہلے یہ گذر چکا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے۔

قوله: ''رواه فی شرح السنة''

اصح نسخہ میں اسی طرح ہے اور ایک نسخہ میں یوں ہے: **''رواه الشافعی** رحمۃ اللہ علیہ **وابن اسحاق فی سیرته''** اور ایک نسخہ میں حدیث کی ابتداء میں بیاض ہے اور آخر میں ''**رواه**'' کے بعد بھی بیاض ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک جنگی قیدی کی فکر

۳۹۷۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اَرَادَ قَتْلَ عُقْبَةَ بْنِ اَبِیْ مُعَيْطٍ قَالَ مَنْ لِلصِّبْيَةِ قَالَ النَّارُ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه أبو داود في المتن ٣ / ١٣٥، كتاب الجهاد، باب في قتل الاسير صبراً، ح ٢٦٨٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عقبہ بن ابو معیط کو قتل

کرنے کا ارادہ کیا تو (اس نے) کہا کہ (میرے) بچوں کو کون پالے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آگ''۔
(ابوداؤد)

تشریح: قوله: من للصبية؟

قوله: للصبية ''صيبة: صاد مہملہ کے کسرہ اور بائے موحدہ کے سکون کے ساتھ ہے یہ ''صبی'' کی جمع ہے اس کی جمع قیاسا ''صبوۃ'' آنی چاہیے جیسا کہ ''فتية''۔ **من للصبية** کا مطلب ہے کہ میرے بچوں کا کفیل کون ہوگا۔ ان کی تربیت کون کرے گا؟ ان کا بوجھ کون برداشت کرے گا؟ جبکہ آپ ﷺ ان کے کفیل اور ذمہ دار کو قتل کر رہے ہیں۔

قوله: قال النبی ﷺ: ''النّار'':

اس میں دو احتمال ہیں:

① یہ ''نار'' ان کے ضیاع اور ہلاکت سے عبارت ہے۔

② آپ ﷺ نے اس کو جواب علی اُسلوب الحکیم دیا کہ تمہارے لئے آگ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنی فکر کرو اور اپنے لئے تیار کردہ آگ کی فکر کرو۔ بچوں کے معاملے کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ ان کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے کہ زمین پر بسنے والے ہر ذی روح کے رزق کی ذمہ داری صرف اللہ پر ہے۔ اس توجیہ کو امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ پہلی توجیہ زیادہ مناسب اور واضح ہے۔ کیونکہ اگر یہ کہنا ہوتا تو آگ کی جگہ پر اللہ تعالیٰ کا نام لیتے کہ **من للصبية** کے جواب میں ''قال'' اللہ فرمائے۔

غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آسمانی فیصلہ

۳۹۷۳: وَعَنْ عَلِيٍّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنَّ جِبْرِيْلَ هَبَطَ عَلَيْهِ فَقَالَ لَهٗ خَيِّرْهُمْ يَعْنِي اَصْحَابَكَ فِيْ اُسَا رٰى بَدْرٍ الْقَتْلَ اَوِالْفِدَاءَ عَلٰى اَنْ يُّقْتَلَ مِنْهُمْ قَابِلاً مِثْلُهُمْ قَالُوْا الْفِدَاءَ وَيُقْتَلُ مِنَّا ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١١٤' کتاب السير' باب ما جاء فی قتل الاساریٰ' الحديث رقم ١٥٦٧۔

ترجمه: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ رسول اللہ ﷺ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے اور عرض کرنے لگے کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں اختیار دے دیجئے کہ خواہ وہ ان قیدیوں کو قتل کر دیں یا ان سے فدیہ لے لیں (یعنی مال لے کر ان کو آزاد کر دیں) لیکن فدیہ لینے کی صورت میں آئندہ سال ان (صحابہ رضی اللہ عنہم) کے اتنے (یعنی ستر) آدمی مارے جائیں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے (اس اختیار کو سن کر) عرض کیا کہ ''ہم فدیہ لینے کو اور اپنے ستر آدمیوں کے قتل کئے جانے کو قبول کرتے ہیں''۔ (ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے''۔ **قوله: ان جبريل هبط عليه...... قابلا**

مثلهم:

تشریح: ''هبط:هبوط'' بمعنی نزول ہے۔

یعنی اصحابك'': یہ ''خبرهم'' کی ضمیر کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر حضرت علیؓ کی طرف سے ہے۔ یا بعد کے راویوں میں سے کسی کی طرف سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبران سے کہہ دو کہ تمہیں بدر کے قیدیوں کے بارے میں اختیار ہے۔

''القتل او الفداء علٰی أن یقتل منهم قابلاً مثلهم'': یہاں ''القتل'' اور ''الفداء'' دونوں منصوب ہیں۔ عبارت یوں ہوگی: ''فاختاروا القتل او الفداء'' مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں اس میں اختیار ہے کہ تم ان قیدیوں کو قتل کرو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور یا یہ کہ تم ان سے رہائی کے بدلے فدیہ لے لو۔ اس شرط پر کہ اگلے سال تم میں سے اتنوں کو ہی قتل کیا جائے گا ''قابلاً'': اس سے مراد آنے والا سال ہے۔ اس سے مراد وہ سال ہے جس میں غزوہ احد وقوع پذیر ہوا تھا۔

''مثلهم'': یعنی جتنی تعداد کو تم آزاد کردو گے۔ کفار کو اتنی ہی کامیابی ہوگی۔ اس دن کفار کی طرف سے ستر کو گرفتار کیا گیا تھا۔

''قوله:قالوا: الفداء ویقتل منّا'': یعنی ہم نے فدیہ لینے کو اختیار کرلیا ہے۔ ''یقتل'' اضمارِ ''أن'' کی وجہ سے منصوب ہے۔ کیونکہ اس کا عطف ''الفداء'' پر ہورہا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے فدیہ کو اختیار کیا ہے اور اس بات کو کہ احد میں ہم میں سے بھی اتنے ہی لوگوں کو قتل کیا جائے اور ایک نسخہ میں یہ دونوں (یعنی ''الفداء'' اور ''یقتل'' ''رفع'' کے ساتھ ہیں (اس صورت میں ''الفداء'] مبتدا محذوف کی خبر ہوگا اور ''یقتل'' سے پہلے کچھ بھی مقدر نہ ہوگا' ای اختیار نا الفداء و یقتل ہمارا اختیار فدیہ لینا ہے اور ہم میں سے بعض کو قتل کرنا ہے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُم ...... ﴾[آل عمران :۱٦٥] ''(بھلا یہ) کیا (بات ہے کہ) جب (احد کے دن کفار کے ہاتھ سے) تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو چند مصیبت تمہارے ہاتھ سے ان پر پڑ چکی ہے تو تم چلا اٹھے کہ (ہائے) آفت (ہم پر) کہاں سے آپڑی کہہ دو کہ یہ تمہاری ہی شامت اعمال ہے (کہ تم نے پیغمبر کے حکم کے خلاف کیا) خدا ہر چیز پر قادر ہے'' ان مسلمانوں نے فدیہ کو ئی وجہ سے ترجیح دی۔

① اُسارٰی بدر کے اسلام میں رغبت کی وجہ سے ② اگلے سال مرتبہ شہادت کے حصول کیلئے۔ اُسارٰی بدر پر شفقت رحمت کی وجہ سے کیونکہ ان کے ساتھ ان کی قرابت داری بھی تھی۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہ حدیث بہت مشکل ہے اس لئے کہ قرآن کی صریح آیت کے مخالف ہے اور احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے کہ اسارٰی بدر کے فدیہ کے بارے میں یہ مسلمانوں کی اپنی رائے تھی جس پر عتاب نازل ہوا تھا۔ اگر اس میں مسلمانوں وحی سماوی کی وجہ سے کو اختیار دیا گیا ہوتا۔ تو پھر ان پر عتاب کیوں کر ہوتا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: [ما کان لنبی ان یکون له أسرٰی][لمسکم فیما أخذتم] عذاب عظیم اور اللہ تعالیٰ نے اس معاقبت کو بھی ظاہر کردیا کہ ''احد'' میں مسلمانوں میں سے ستر افراد شہید ہوں گے اور یہ آیت اتری: ﴿ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُم ...... ﴾[آل عمران :۱٦٥] ''(بھلا یہ) کیا (بات ہے کہ) جب (احد کے دن کفار کے ہاتھ سے) تم

پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو چند مصیبت تمہارے ہاتھ سے ان پر پڑ چکی ہے تو تم چلا اٹھے کہ (ہائے) آفت (ہم پر) کہاں سے آپڑی کہہ دو کہ یہ تمہاری ہی شامت اعمال ہے (کہ تم نے پیغمبر کے حکم کے خلاف کیا) خدا ہر چیز پر قادر ہے''

اس تاویل کو صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے۔ شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے شان نزول میں جبرئیل امین کے نزول کا تذکرہ کیا ہو اور رواۃ میں سے کسی پر یہ معاملہ مشتبہ ہو گیا ہو۔ مزید یہ ہے کہ اس حدیث میں یحییٰ بن ابی زکریا بن ابی زائدہ متفرد ہیں انہوں نے حضرت سفیان سے اس کو نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ اس کو کسی نے بھی نقل نہیں کیا ہے اور سماعت میں بعض دفع انسان غلطی کر جاتا ہے۔ انسان سے بھول بھی ہو جاتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث ان سے متصلاً روایت ہے جبکہ ان کے علاوہ سے مرسلاً مروی ہے اور یہ بھی ایک مانع ہے

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث اور آیت قرآنی میں کوئی منافات نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ حدیث میں یہ تخییر امتحان و آزمائش کے طور پر ہو۔ اللہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس طرح چاہے بندوں کا امتحان لے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے ذریعے امتحان لیا تھا:

﴿ يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ﴾ [الاحزاب ـ ۲۸] ''اے نبی! آپ اپنی بیبیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیا کی زندگی (کا عیش) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ مال و متاع (دنیوی) دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں'' اور اسی طرح لوگوں کو سحر کی تعلیم دے کر اس آیت کے ذریعے امتحان لیا: ﴿وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾ [البقرۃ:۱۰۲] ''اور وہ دونوں کسی کو نہ بتلاتے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک امتحان ہے سو تو کہیں کافر مت بن جائیو''۔

ان لوگوں کو ان دو فرشتوں کے ذریعے آزمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش کو کفر اور ایمان کے درمیان دائر فرما دیا۔ اس طور پر کہ جو اس کو سیکھے گا وہ اس تعلّم سے کافر ہو جائے گا اور ترک تعلّم سحر سے مؤمن رہے گا اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا امتحان لیا ہو، دو کاموں میں اختیار دے کر اور اس کے ساتھ حضرت جبرئیل کو بھیجا کہ کیا یہ مسلمان اس چیز کو اختیار کر رہے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے اور وہ قتل ہے۔ یا یہ لوگ قبول فدیہ کی صورت میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ جب انہوں نے اس فدیہ کو اختیار کیا تو ان پر عتاب ہوا: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ﴾ [الانفال:۶۷]

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ جواب غیر مقبول ہے۔ اس لئے کہ یہ معلول و مدخول ہے۔ چونکہ جب تخییر صحیح ہے۔ تو پھر عتاب جائز نہیں چہ جائیکہ تعذ و تعزیر جائز ہو اور جہاں تک بات ہے امہات المؤمنین کو اختیار دینے کی تو اس میں بہت فرق ہے چوں کہ اگر وہ دنیا کو اختیار کرتیں تو نہ آخرت عذاب نہ ہوتا نہ دنیا عذاب ہوتا۔ بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی وجہ سے وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت سے محروم ہو جائیں گی اس ادنیٰ اور حقیر چیز کو اختیار کرنے کی وجہ سے اور تعلیم سحر کے بارے میں ہم مانتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے امتحان اور آزمائش تھی لیکن اس میں کسی کو اختیار حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر

میں بتلایا ہے: [فمن شآء فليؤمن ومن شآء فليكفر] کہ یہ امر تہدید ہے امر تخییر نہیں ہے اور اسی وجہ سے جب یہ کہا أم يؤثرون العاجلة تو جب انہوں نے اس کو اختیار کیا تو ان پر عتاب ہوا: ﴿ما كان لنبي﴾ [الکھف۔۲۹] کیونکہ یہ بڑی جرات ہے۔ اور عظیم جنایت ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے فدیہ کو اس لئے اختیار کیا تا کہ کفر کے خلاف طاقت حاصل ہو، رشتہ داروں پر شفقت کریں۔ اس امید پر کہ وہ لوگ ایمان لائیں گے یا ان کی اولاد میں ایسا شخص آئے گا جو ایمان لائے گا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ان کی طرف سے اجتہاد تھا۔ جو آپ ﷺ کے رائے کی موافق ہو گیا تھا اور اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد اللہ کے ہاں زیادہ صحیح واقع ہوا۔ یہ آیت موافقات عمر میں سے ہے۔

مسلم اور ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

''أنهم لما أسروا الأسارىٰ يوم بدر قال رسول الله ﷺ لأبى بكروعمر رضى الله عنهما ما تدرون فى هؤلاء الأسارىٰ'' فقال ابو بكر يا رسول الله! بنوا العم والعشرة ارى ان تأخذ منهم فدية فتكون لنا قوة على الكفار فعسى الله ان يهديهم الى الاسلام: فقال ﷺ ''ماترى يا ابن الخطاب؟ قلت: لا والله يا رسول الله! ما ارى الّذى رأى ابوبكر۔ ولكنى ارىٰ ان تمكننا فنضرب أعناقهم فان هؤلاء ائمة الكفر وصناديده، فهوى رسول الله ﷺ ما قال ابوبكر۔ ولم يهوِ ما قلت۔ فلما كان من الغد، فاذا رسول الله وابو بكر قاعدان يبكيان فقلت: يا رسول الله أخبرنى من اى شئ تبكى وصاحبك؟ فقال ابكى للذى عرض علىٰ اصحابك من اخذهم الفداء ،لقد عرض على عذابهم ادنىٰ من هذه الشجرة'' وانزل الله تعالىٰ هذه الأية'' اھ۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی مجتہد ہوتے ہیں۔ ان سے بھی کبھی کبھار غلطی ہو جاتی ہے لیکن اس غلطی پر برقرار نہیں رکھے جاتے اور اللہ کا یہ قول: كتاب من الله سبق یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا حکم لوح محفوظ میں پہلے سے ثابت نہ ہوتا اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ اجتہاد میں غلطی کرنے والے کو سزا نہیں دے گا یا یہ کہ اہل بدر کو سزا نہیں دے گا یا اس قوم کو سزا نہیں دے گا جن کو منہی عنہ کی تصریح نہ کی گئی ہو یا یہ کہ جو فدیہ انہوں نے لیا ہے وہ ان کیلئے حلال ہوگا۔ تو تم پر عذاب ہوتا۔ اھ

آیت اور حدیث کے درمیان جمع ممکن ہے۔ بایں طور کہ ابتداءً ان کی طرف سے اختیار فدیہ مطلقاً تھا پھر بعد میں اس میں تقیید آ گئی۔ واللہ اعلم بالصواب

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا: ثم ان الحديث روى عنه متصلاء وروى عن غيره مرسلا ، فكان ذلك مما يمنع القول بظاهره۔ محل بحث ہے۔ اس لئے کہ جب مرسل حدیث کی تائید کسی بھی حدیث ضعیف متصل سے ہو جائے تو اس میں ایک نوع کی قوت آ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حدیث حسن کے درجے میں شامل ہو جاتی ہے۔ پھر اس وقت یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ''فكان ذالك مما يمنع القول بظاهره''۔

میں کہتا ہوں کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اس حدیث کی اسناد میں اضطراب ہے، اور حدیث مضطرب ضعیف ہوتی ہے۔ اس

احتمال کی وجہ سے کہ اس میں سہو مرسل کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے اور موصل کی طرف سے بھی اس اعتبار سے اس کی سند میں ضعف آ گیا۔ ورنہ اس کے علاوہ حدیث مرسل جمہور علماء کے ہاں حجت ہے اور ''فکان ذالك'' میں اشارہ ان تمام باتوں کی طرف ہے جو ذکر کی گئی ہیں۔ یعنی اس حدیث کا آیت کے مخالف ہونا، حدیث کی سند کا منفرد ہونا اور اس میں ارسال کا ہونا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام ترمذی کا یہ قول کہ ''هٰذا حديث غريبٌ'' اس کی وجہ سے حدیث میں کوئی طعن نہیں آتا اس لئے کہ حدیث غریب بھی بسا اوقات صحیح بن جاتی ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں لیکن بسا اوقات ضعیف بھی بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں فی الجملۃ طعن کی صلاحیت ہے۔ ''واللہ اعلم بالصواب''۔

۳۹۷۴: وَعَنْ عَطِيَّةَ الْقُرَظِيِّ قَالَ كُنْتُ فِيْ سَبْيِ قُرَيْظَةَ عُرِضْنَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فَكَانُوْا يَنْظُرُوْنَ فَمَنْ اَنْبَتَ الشَّعْرَ قُتِلَ وَمَنْ لَمْ يُنْبِتْ لَمْ يُقْتَلْ فَكَشَفُوْا عَانَتِيْ فَوَجَدُوْهَا لَمْ تُنْبِتْ فَجَعَلُوْنِيْ فِي السَّبْيِ۔ (رواه ابوداود وابن ماجة والدارمی)

اخرجه أبو داود فی السنن ٤ / ٥٦١، الحديث رقم ٤٤٠٤ والترمذی فی ٤ / ١٢٣، الحديث رقم ١٥٨٤، والنسائی فی ٦ / ١٥٥، الحديث رقم ٤٣٢٩، وابن ماجه فی ٢ / ٨٤٩، الحديث رقم ٢٥٤١، والدارمی فی ٢ / ٢٩٤ كتاب السير، باب حد الصبی متى يقتل الحديث رقم ٢٤٦٤، وأحمد فی المسند ٤ / ٣٨٣

ترجمہ: ''اور حضرت عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بنو قریظہ کے (جو لوگ قیدی بنا کر لائے گئے تھے) ان قیدیوں میں سے میں بھی تھا، ہمیں نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم (نے یہ طریقہ اختیار کیا) کہ قیدیوں میں جو چھوٹی عمر والے تھے ان کے زیر ناف حصے کو کھول کھول کر دیکھ رہے تھے جس کے (زیر ناف حصے پر) بال اگ آئے تھے اس کو قتل کر دیا جاتا، کیونکہ زیر ناف حصے پر بال اگ آنا، بلوغ کی علامت ہے، لہٰذا ایسے شخص کو مسلمانوں سے لڑنے والا شمار کیا جاتا تھا) اور جس کے بال نہ اُگے ہوتے تھے اس کو قتل نہیں کیا جاتا تھا (کیونکہ اس کو ''ذریت'' یعنی بچوں میں شمار کیا جاتا تھا چنانچہ میرے زیر ناف حصے کو بھی کھولا گیا اور جب وہاں اُگے ہوئے بال نہیں پائے گئے تو مجھ کو قیدیوں ہی میں (زندہ) رکھا گیا''۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

راویٔ حدیث:

عطیۃ القرظی۔ عطیہ القرظی ''بنو قریظہ'' کے قیدیوں میں سے ہیں۔ یوں ہی کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کے باپ کے نام سے واقف نہیں ہوں۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کو دیکھا ہے اور آپ ﷺ کے ارشادات بھی سنے ہیں۔ ان سے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ ''القرظی'' ''قاف'' کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: ''عرضنا على النبی ﷺ فكانوا ينظرون فمن انبت الشعر قتل ومن لم ينبت فلم تقتل''۔ یعنی ہمیں نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اس موقع پر زیر ناف بالوں کو دیکھتے۔ جس کے بال اُگے ہوئے ہوتے اس کو قتل کر دیتے۔ کیونکہ زیر ناف بال اُگنا علامات بلوغ ہے یہ لوگ مقاتلین میں شمار ہوتے تھے اور جس کے بال نہ اگے ہوئے ہوتے اس کو قتل نہیں کرتے۔ اس لئے کہ یہ علامت عدم بلوغ کی سمجھی جاتی تھی۔

"الشعر": عین کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے حق میں انبات الشعر کا اعتبار ضرورت کی وجہ سے کیا۔ اس لئے کہ اگر ان سے احتلام کے بارے میں پوچھا جاتا یا ان کی عمر کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ صحیح بات نہ بتاتے۔ کیونکہ وہ اس صحیح بات میں ہلاکت کو دیکھ رہے تھے۔

اللہ کے آزاد کردہ

۳۹۷۵: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ خَرَجَ عُبْدَ انٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِىْ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ قَبْلَ الصُّلْحِ فَكَتَبَ اِلَيْهِ مَوَ الِيْهِمْ قَالُوْا يَا مُحَمَّدُ وَاللّٰهِ مَا خَرَجُوْا اِلَيْكَ رَغْبَةً فِىْ دِيْنِكَ وَاِنَّمَا خَرَجُوْا هَرَبًا مِنَ الرِّقِ فَقَالَ نَاسٌ صَدَقُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ رُدَّهُمْ اِلَيْهِمْ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ مَا اَرَاكُمْ تَنْتَهُوْنَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ حَتّٰى يَبْعَثَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ مَنْ يَّضْرِبُ رِقَابَكُمْ عَلٰى هٰذَا وَاَبٰى اَنْ يُّرَدَّهُمْ وَقَالَ هُمْ عُتَقَاءُ اللّٰهِ ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۱۴۸، كتاب الجهاد، باب في عبيد المشركين، الحديث رقم ۲۷۰۰۔

ترجمہ: "اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے دن (مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان) معاہدہ لکھے جانے سے قبل کچھ غلام (مکہ سے آ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے' ان کے مالکوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم!) خدا کی قسم! یہ غلام تمہارے پاس تمہارے دین میں رغبت رکھنے کی وجہ سے نہیں حاضر ہوئے ہیں بلکہ یہ لوگ غلامی (سے نجات پانے کی غرض) سے بھاگ کر آئے ہیں"۔ (جب صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے) چند لوگوں نے (یہ مکتوب دیکھا تو) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان کے مالکوں نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان (غلاموں) کو ان کے (یعنی مالکوں کے) پاس واپس بھیج دیجئے (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ "قریش والو! میں دیکھتا ہوں کہ تم (اپنی سرکشی اور نافرمانی سے) باز نہیں آ ؤ گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس شخص کو مسلط نہ کر دے جو تمہارے اس فیصلے (کہ ان غلاموں کو ان کے مالکوں کے پاس واپس بھیج دیا جائے اور اس طرح ان کے مسلمان ہو جانے کے بعد ان کو دارالحرب کے حوالے کر دیا جائے) کی بناء پر تمہاری گردن اڑا دے' اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غلاموں کو واپس لوٹانے سے انکار کر دیا واپسی کے مطالبہ کو رد کر دیا اور فرمایا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہیں"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: خرج عبد ان الی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ...... فغضب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم:

عبدان": "عبد" کی جمع ہے ایک نسخہ میں "عبدان" عین و باء دونوں کے کسرہ اور دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔

الحديبية: یاء ثانیہ کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ مروی ہے۔

موالیھم: یہاں ''موالیھم'' سے مراد ان قیدیوں کے سردار بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے آزاد کرانے والے بھی ہو سکتے ہیں۔

''من الرق'': وہ خوف رقیت وغلامی کا تھا۔ یا اس عبودیت وغلامی کے اثر سے جو کہ ''حق ولاء'' ہے۔

''صدقوا یا رسول اللّٰہ ردھم الیھم فغضب رسول اللّٰہ'': تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے غصہ ہوئے کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان قیدیوں کے بارے گمان اور تخمینہ سے کام لیا اور شریعت کے حکم کی مخالفت کی اور کفار کے حق میں گواہی دی کہ واقعی یہ لوگ غلامی کے ڈر سے نکلے ہیں' دین میں رغبت کی وجہ سے نہیں آئے ہیں۔ حالانکہ اسلام کا حکم یہ تھا کہ ان لوگوں کا خون محفوظ ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ دار الحرب سے دار اسلام کی طرف آئے ہیں اور اسلام کی وجہ سے یہ اب آزاد ہیں ان کو کفار کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ان اولیا (کفار) کا تعاون کرنا ظلم وتعدی پر تعاون ہوگا۔

قولہ: وقال ما أراکم تنتھون یا معشر قریش۔۔۔علی ھذا:

وقال: اور ایک نسخہ میں ''فقال'' ہے۔ ''أراکم'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے أی ما أعلمکم اور ایک نسخہ میں ''ما أریکم'' ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے ای ما أخلنکم یعنی میں تمہارے بارے میں خیال نہیں کرتا کہ تم لوگ اس عصبیت سے رک جاؤ گے۔ یا اس قسم کے حکم یعنی ردّ سے رک جاؤ گے۔

''حتی یبعث اللّٰہ علیکم من یضرب رقابکم علی ھذا'': یہ اشارہ ''تعصب'' یا ''حکم بالرد'' کی طرف راجح ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں عظیم تہدید ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے باز آنے کی نفی کر دی اور مرد اسکا ملزوم ہے ای انتھاء ، ھم جیسا کہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: ﴿أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ﴾ [یونس:۱۸] یعنی اس چیز کی خبر دے رہے ہو کہ جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ ہی اس کا علم اللہ کے پاس ہے۔

قولہ: ''وابٰی ان یردھم وقال: ''ھم عتقاء اللّٰہ'': امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا عطف ''وقال ما اریکم'' پر ہے اور ان دونوں جملوں کے درمیان راوی کا قول ہے جو جملہ معترضہ ہے اور بر سبیل تاکید واقع ہوا ہے۔

الفصل الثالث:

۳۹۷۶: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : خَالِدَ بْنَ الْوَلِيْدِ اِلٰى بَنِيْ جَذِيْمَةَ فَدَعَاهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ فَلَمْ يُحْسِنُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا اَسْلَمْنَا فَجَعَلُوْا يَقُوْلُوْنَ صَبَأْنَا صَبَأْنَا فَجَعَلَ خَالِدٌ يَقْتُلُ وَيَأْسِرُ وَدَفَعَ اِلٰى كُلِّ رَجُلٍ مِنَّا اَسِيْرَهُ حَتّٰى اِذَا كَانَ يَوْمٌ اَمَرَ خَالِدٌ اَنْ يَقْتُلَ كُلُّ رَجُلٍ مِنَّا اَسِيْرَهُ فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَا اَقْتُلُ اَسِيْرِيْ وَلَا يَقْتُلُ رَجُلٌ مِّنْ اَصْحَابِيْ اَسِيْرَهُ حَتّٰى قَدِمْنَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَذَكَرْنَاهُ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَبْرَأُ اِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ مَرَّتَيْنِ۔

(رواہ البخاری)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۳ / ۱۸۱' کتاب المغازی' باب بعث النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم خالد بن الولید'

الحديث رقم ٤٣٣٩ وأحمد في المسند ٢ / ١٥١

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو (ایک قبیلہ) بنی جذیمہ کی طرف بھیجا' آپؓ نے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی' ان لوگوں نے (اضطراب و سراسیمگی کے عالم میں) یہ واضح طور پر نہیں کہا کہ ہم اسلام لائے (یعنی وہ اپنی زبانوں سے اسلام کا کلمہ پوری طرح ادا نہیں کر سکے) بلکہ انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ صبانا صبانا یعنی ہم نے اپنا دین چھوڑ دیا' ہم نے اپنا دین چھوڑ دیا''۔ خالد رضی اللہ عنہ نے (جب ان کی زبان سے یہ سنا تو) ان (کے بعض لوگوں) کو قتل کر دیا اور (بعض کو) گرفتار کر دیا اور پھر انہوں نے ہم (لوگ جو ان کے ساتھ تھے ان) میں سے ہر شخص کو اس کا قیدی سپرد کر دیا (یعنی جو لوگ قیدی بنائے گئے ان کو ہمارے درمیان تقسیم کر کے ایک ایک قیدی ہر ایک کے حوالے کر دیا اور یہ حکم دیا کہ ہم ان قیدیوں کی اس وقت تک حفاظت و نگرانی کریں جب تک کہ ہمیں ان کو قتل کر دینے کا حکم نہ دیا جائے) چنانچہ جب ایک (وہ) دن آیا (جس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان قیدیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا) تو انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے قیدی کو قتل کر دے (یہ حکم سن کر) میں (یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما) نے کہا کہ ''خدا کی قسم! میں اپنے قیدی کو قتل نہیں کروں گا اور نہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی شخص اپنے قیدی کو قتل کرے گا (بلکہ ہم لوگ اپنے قیدیوں کو اس وقت تک اپنی حفاظت میں رکھیں گے) جب تک کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچ جائیں اور اس بارے میں کوئی آخری حکم حاصل نہ کریں چنانچہ ہم نے اپنے قیدیوں کو اپنی حفاظت میں رکھا) یہاں تک کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پورا واقعہ بیان کیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (واقعہ کی تفصیل سن کر) اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے یہ کہا کہ ''اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا ہے میں تیرے حضور اس سے اپنی بیزاری و بے رضائی کا اظہار کرتا ہوں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ دو مرتبہ ارشاد فرمائے''۔ (بخاری)

تشریح: **قوله: بعث النبي ﷺ خالد بن الوليد۔۔۔منا أسيره:**

جذيمة'': ''حذیمۃ'' جیم کے فتحہ اور ذال کے کسرہ کے ساتھ اور یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔

قوله: ''فدعاهم الى الاسلام فلم يحسنوا ان يقولوا: اسلمنا''۔ یعنی خالد بن الولید نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو وہ ''اسلمنا'' صحیح طریقے سے ادا نہ کر سکے۔ کیونکہ اس کی ادائیگی پر وہ کما حقہ قادر نہیں تھے۔ ان میں سے ہر ایک یہ کہنا شروع ہو گیا کہ ہم اپنے دین سے دین اسلام کی طرف نکل آئے۔

قوله: ''حتى اذا كان يوم'': اس دن کی تعین نہیں کی۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہاں پر ''کان'' تامہ ہے اور اس کا ''مغیا'' محذوف ہے۔ عبارت یوں ہوگی: **اى دفع الينا الأسير و امرنا بحفظه الى يوم يأمرنا بقتله**'' یعنی ہم میں سے ہر ایک کو اپنے حصہ کا غلام دیا اور اس دن تک اس کی حفاظت کا حکم دیا کہ جس دن وہ ہمیں اس کے قتل کا حکم دیں گے۔ پس جب وہ دن آیا تو ہمیں اپنے اپنے اسیروں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔

قوله: ''حتى قدمنا على النبي ﷺ''

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مغیا بھی محذوف ہے اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: ''**ولا يقتل رجل منا اسيره بل يحفظه حتى نقدم الى رسول الله**'' ۔

قوله: ''فرفع يديه فقال: اللهم انى ابرأ اليك مما صنع خالد'':

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پر ''ابرا'' کو ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی کیا ہے۔ یہ ''یُنھی'' کے معنیٰ کو متضمن ہے۔ ای **أنهى اليك برائتى و عدم رضائى من فعل خالد**۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: **أحمد اليك فلانا** اسی طرح ایک حدیث میں ہے: **أحمد الله اليك أى اشكره منهيا اليك و معلما لديك** ۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ پر ناراضگی کا اظہار اس لئے کیا کہ انہوں نے اس بارے میں جلد بازی کی اور اس معاملہ میں تدبر کا دامن چھوڑ دیا۔ کہ ان لوگوں کی ''صبأنا'' سے کیا مراد ہے۔ اس لئے کہ ''صبأ'' کا معنیٰ تو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف خروج کا ہے اور اسی وجہ سے مشرکین مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''صابی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے دین کی مخالفت کی تھی۔ لہٰذا ان کے اس ''صبانا'' میں یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ہم اپنے دین سے دوسرے دین کی طرف نکلے ہیں۔ جو اسلام کے علاوہ ہے۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت وغیرہ۔ اس لئے جب انہوں نے صراحت کے ساتھ ''انتقال من الدين الى الاسلام'' نہیں کیا۔ تو حضرت خالد بن الولیدؓ نے ان میں قتل کو جاری کیا۔ اس لئے کہ ''صبأنا'' کہنے کی وجہ سے ''حقن الدم'' کے شرائط نہیں پائے گئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت خالدؓ نے گمان کیا ہو کہ شاید ان لوگوں نے ''اسلام'' کے نام سے عدول کیا ہے۔ بظاہر استلام اور انقیاد کہنے کو عار سمجھنے کی بناء پر۔ (رواہ البخاری)

بَابُ الْاَمَانِ

امان دینے کا بیان

الفصل الاول:

عورت کا امان دینا

۳۹۷۷: عَنْ اُمِّ هَانِئٍ بِنْتِ اَبِیْ طَالِبٍ قَالَتْ ذَهَبْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَامَ الْفَتْحِ فَوَجَدْتُّهٗ يَغْتَسِلُ وَفَاطِمَةُ ابْنَتُهٗ تَسْتُرُهٗ بِثَوْبٍ فَسَلَّمْتُ فَقَالَ مَنْ هٰذِهٖ فَقُلْتُ اَنَا اُمُّ هَانِئٍ بِنْتِ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ مَرْحَبًا بِاُمِّ هَانِئٍ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهٖ قَامَ فَصَلّٰى ثَمَانِیَ رَكَعَاتٍ مُلْتَحِفًا فِیْ ثَوْبٍ ثُمَّ انْصَرَفَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ زَعَمَ ابْنُ اُمِّیْ عَلِیٌّ اَنَّهٗ قَاتِلٌ رَجُلًا اَجَرْتُهٗ فُلَانَ بْنَ هُبَيْرَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَدْ اَجَرْنَا مَنْ اَجَرْتِ يَا اُمَّ هَانِئٍ قَالَتْ اُمُّ هَانِئٍ وَذٰلِكَ

ضُحيً (متفق عليه وفی رواية للترمذی) قَالَتْ اَجَرْتُ رَجُلَيْنِ مِنْ اَحْمَائِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَدْ اَمَّنَّا مَنْ اَمَنْتِ ـ

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٢٧٣' كتاب الجزيه' باب امان النساء' الحديث رقم ٣١٧١ و مسلم فی ١ / ٤٩٨' الحديث رقم ٨٢ / ٣٣٦ وأبو داود فی السنن ٢ / ٦٣' الحديث رقم ١٢٩٠' والدارمی فی ١ / ٤٠٢' الحديث رقم ١٤٥٣' و مالك فی المؤطا ١ / ١٥٢ الحديث رقم ٢٨

ترجمه: ''حضرت ام ہانی بنت ابو طالب رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ فتح مکہ کے سال (یعنی فتح مکہ کے موقع پر) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی' میں نے آپ ﷺ کو اس وقت غسل کرتے ہوئے پایا اور آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کپڑے سے آپ ﷺ کا پردہ کئے ہوئے تھیں۔ میں نے سلام عرض کیا' آپ ﷺ نے پوچھا ''کون ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''میں' ام ہانی بنت ابو طالب!'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ام ہانی کو خوش آمدید!'' پھر جب آپ ﷺ غسل سے فارغ ہوئے تو جسم پر کپڑا لپیٹے ہوئے کھڑے ہوئے اور (نماز چاشت کی) آٹھ رکعتیں ادا کیں اور جب نماز ادا کر چکے تو میں نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! میری ماں کے بیٹے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے شخص کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس کو میں نے اپنے گھر میں پناہ دی ہے یعنی فلاں شخص کو جو ہبیرہ کا بیٹا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اُم ہانی جس کو تم نے پناہ دی ہے (گویا) اس کو ہم نے پناہ دی ہے''۔ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ یہ واقعہ چاشت کے وقت کا ہے'' (متفق علیہ) اور ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا نے (آپ ﷺ سے) عرض کیا کہ ''میں نے دو آدمیوں کو پناہ دی ہے جو میرے خاوند کے رشتہ دار ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ہم نے اُس شخص کو امان دی جس کو تم نے امان دی''۔

تشریح: قوله: مرحبا بام هانی

''مرحب'' کشادہ جگہ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی جگہ جس میں کوئی تنگی نہ ہو۔ یہ کلمہ اکرام کیلئے بولا جاتا ہے اور (اس طرح کے موقع پر) اس تکلم کرنا سنت ہے۔

''مرحباً بأم هانی'': اس ''باء'' میں کئی احتمالات ہیں:

ایک احتمال یہ ہے کہ فاعل پر باء زائدہ ہو اور عبارت یوں ہوگی: ''انت ام هانی مرحباً''۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ''باء'' تعدیہ کے لئے ہو اور عبارت اس طرح ہوگی۔ ''أتی اللّٰه بأم هانی مرحباً'' اور مرحباً مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے۔

قوله: فلما فرغ من غلبه...... وذلك ضحی: ''من غسله'': ایک نسخہ میں غین کے ضمہ کے ساتھ اور دوسرے میں غین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

زعم ابن أمی علی'': ''علی'' بدل ہے۔ یا عطف بیان ہے۔ صرف ''ام'' پر اقتصار کیا' اس لیے کہ یہ زیادہ شفقت اور

رحمت کا اظہار کر رہا ہے اور اسی طرح ہارون علیہ السلام نے بھی حضرت موسیٰ سے کہا تھا: [يا ابن أم]

"أجرته" رجلاً کی صفت ہے۔ یہ لفظ اصل میں "اجورته" تھا۔ تو واؤ کی حرکت جیم کی طرف نقل کی گئی اور پھر وہ الف سے بدل گیا اور پھر اس "واؤ" کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔

ترمذی نے "شمائل" میں ذکر کیا ہے:

یہ حدیث عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے سوائے ام ہانی کے کسی نے نہیں بتایا کہ آپ ﷺ نے چاشت کی نماز پڑھی ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ فتح مکہ کے روز آپ ﷺ اس کے گھر میں داخل ہوئے آپ ﷺ نے غسل فرمایا، پھر آپ ﷺ نے آٹھ رکعت نماز ادا کی اور میں نے آپ کو کبھی اس سے ہلکی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ سوائے اس کے کہ آپ اس میں رکوع اور سجدہ کو مکمل کرتے تھے۔

ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہے۔ اس لئے کہ حدیث ترمذی اس پر دال ہے کہ یہ غسل ام ہانی کے گھر میں تھا۔ برخلاف پہلی حدیث کے کہ یہ غسل آپ نے اپنے گھر میں کیا تھا۔ یا حضرت فاطمہ کے گھر فرمایا تھا۔ مگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ میں نے ان کو پایا کہ وہ میرے گھر میں غسل فرما رہے تھے۔ یا یہ کہ اس کو تعدد واقعہ پر محمول کیا جائے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

قوله: أجرت رجلين من احمائى ......:

"أحماء": اصل میں "حمو" کی جمع ہے۔ شوہر کے قریبی عزیزوں بھائی وغیرہ کو کہتے ہیں۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ازرقی رحمہ اللہ نے امام واقدی کے طریق سے اس طرح نقل کیا ہے:

عن ابى ذئب عن المقبرى عن ابى مرة مولٰى عقيل عن ام هانىء بنت ابى طالب قالت: ذهبت الى رسول الله ﷺ فقلت يا رسول الله! انى اجرتُ حموين لى من المشركين فأراد هٰذا ان يقتلهما فقال ﷺ: ماكان له ذالك"۔

اور جن کو ام ہانی نے امان دی تھی ان کے نام یہ ہیں: ① عبداللہ بن ابی ربیعۃ بن مغیرۃ۔ ② حارث بن ہشام بن مغیرۃ۔ دونوں مخزومی تھے۔

"فلاناً ابن هبيرة" اکثر روایات میں اسی طرح آیا ہے۔ علامہ ابن اثیر (جامع الاصول میں) کہتے ہیں کہ یہ روایت اسی طرح بخاری، مسلم اور موطا میں بھی آئی ہے۔ ان میں سے کسی نے اس کا نام نہیں ذکر کیا ہے۔ اس کا نام "حارث بن ہشام بن المغیرۃ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم" تھا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کے شوہر کے بیٹوں میں سے کوئی تھا۔ جو خود ان سے تھا یا کسی اور بیوی سے تھا۔ ان کے شوہر کا نام ھبیرۃ بن وھب بن عمر بن عائذ بن عمران بن مخزوم تھا اور یہی زیادہ درست ہے۔ اس لئے کہ "فلان ابن هبيرة" کے الفاظ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

الفصل الثانی:

۳۹۷۸:عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ اِنَّ الْمَرْاَةَ لَتَاخُذُ لِلْقَوْمِ يَعْنِی تَجِيرُ عَلَی الْمُسْلِمِينَ ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٢٠ 'کتاب السير' باب ما جاء فی امان العبد والمرأة' الحديث رقم ١٥٧٩۔

ترجمه:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''بلاشبہ عورت کسی قوم کے لئے (عہد) لیتی ہے یعنی وہ مسلمانوں کی طرف سے (کفار کو) پناہ دے سکتی ہے''۔(ترمذی)

تشریح: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے''باب أما ن المرأة'' کا ترجمۃ الباب قائم کیا ہے۔(اور پھر روایت بیان کی ہے)

''حدثنا يحيٰی بن أكثم الٰی ابی هريرةؓ عن النبی ﷺ قال:ان المرأة لتأخذ للقوم''،اوراس حدیث کے آخر میں کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

اورامام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب''العلل الکبریٰ'' میں نقل کیا ہے کہ میں نے محمد بن اسمٰعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا۔توانہوں نے کہا:''هو حديث صحيح''۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے یہ روایت اس طرح نقل کی ہے:

حدثنا عثمان بن أبی شيبة عن سفيان بن عيينة ،عن منصور ،عن ابراهيم ،عن الأسود ،عن عائشة قالت: ان كانت المرأة تجير علی المؤمنين'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عورت بھی مسلمانوں کی طرف سے امان دے سکتی ہے۔

طبرانی کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضرت زینب بنت رسول اللہ ﷺ نے اپنے شوہر ابوالعاص کو امان دی تھی اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ''مسلمانوں کا ادنیٰ ترین شخص بھی امان دے سکتا ہے۔''

امان دینے کے بعد قتل کرنے کی مذمت

۳۹۷۹:وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الْحَمِقِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَقُوْلُ مَنْ اَمَّنَ رَجُلًا عَلٰی نَفْسِهٖ فَقَتَلَهٗ اُعْطِیَ لِوَاءَ الْغَدْرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه فی شرح السنة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ٢ / ٨٩٦' كتاب الديات' باب من امن رجلا' الحديث رقم ٢٦٨٨ وأحمد فی المسند ٥ / ٢٢٣

ترجمه:''اور حضرت عمرو بن حمق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص کسی کو اس کی جان کی امان دے اور پھر اس کو قتل کر ڈالے تو قیامت کے دن اس کو عہد شکنی کا جھنڈا (بطور علامت) دیا جائیگا''۔(شرح السنۃ)

راوئ حدیث:

عمرو بن حمق۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ خزاعی میں اوران کی صحابیت ثابت ہے۔ان سے جبیر بن نفیر، رفاعہ بن شداد وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں۔۱۰ کو موصل میں شہید کردیئے گئے۔حمق: حاء کے ''فتحہ'' اور ''میم'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔عمرو بن حمق خزاعی صحابی رسول ہیں۔ان سے جبیر بن نفیراور رفاعہ بن شداد رضی اللہ عنہم وغیرہ روایت کرتے ہیں۔موصل میں ۵۱ھ کے اندر قتل کردیئے گئے۔''حمق'' میں حائے مہملہ مفتوح اور میم مکسور ہے۔

تشریح: اس کو قیامت کے روز علی رؤس الأشهاد یہ جھنڈا دینا، اس کی رسوائی سے کنایہ ہے۔شرح ابن ہمام میں مذکور ہے کہ غدر ہر چیز میں ممنوع اور حرام ہے۔جیسا کہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہ بن عمرو بن العاص کی یہ روایت نقل کی ہے: **أربع خصال من كانت فيه كان منافقًا خالصًا: من اذا حدث كذب واذا وعد اخلف، واذا عاهد غدر، واذا خاصم فجر**''۔

چار خصلتیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا۔وہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرتے تو خلاف ورزی کرے، جب عہد کرے تو غداری کرے اور جب لڑائی کرے تو گالیاں بکے۔

(البخاری فی صحیحه ۱/ ۸۹، الحدیث رقم ۳۴، و مسلم فی ۱/ ۷۸، الحدیث رقم (۱۰۶-۵۸)

عہد و پیماں کی پاسداری

۳۹۸۰: وَعَنْ سُلَيْمِ بْنِ عَامِرٍ قَالَ كَانَ بَيْنَ مُعَاوِيَةَ وَبَيْنَ الرُّوْمِ عَهْدٌ وَكَانَ يَسِيْرُ نَحْوَ بِلَادِهِمْ حَتّٰى اِذَا انْقَضَى الْعَهْدُ اَغَارَ عَلَيْهِمْ فَجَاءَ رَجُلٌ عَلٰى فَرَسٍ اَوْ بِرْذُوْنٍ وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَفَاءٌ لَا غَدْرَ فَنَظَرُوْا فَاِذَا هُوَ عَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ فَسَاَلَهٗ مُعَاوِيَةُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ مَنْ كَانَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحُلَّنَّ عَهْدًا وَلَا يَشُدَّنَّهٗ حَتّٰى يَمْضِيَ اَمَدُهٗ اَوْ يَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ قَالَ فَرَجَعَ مُعَاوِيَةُ بِالنَّاسِ۔ (رواہ الترمذی وابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۹۰' کتاب الجهاد' باب فی الامام ان یکون بینه وبین العدو' ح ۲۷۵۹ والترمذی فی ٤ / ۱۲۱' الحدیث رقم ۱۵۸۰

ترجمہ: ''اور حضرت سلیم بن عامر (تابعی) کہتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور رومیوں کے درمیان (یہ) معاہدہ ہوا تھا کہ (اتنے دنوں تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے) اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (اس معاہدہ کے زمانہ میں) ان کے (یعنی رومیوں کے) شہروں میں گشت (کر کے حالات کا اندازہ) لگایا کرتے تھے تا کہ جب معاہدہ کی مدت گزر جائے تو وہ ان (رومیوں) پر اچانک حملہ کریں اور (ان کے ٹھکانوں کو تخت و تاراج کر دیں جب کہ اگر وہ گشت کے ذریعہ ان کے حالات اور ٹھکانوں کا جائزہ لینے کی بجائے اطمینان کے ساتھ اپنے کیمپ

میں پڑے رہتے اور پھر معاہدہ کی مدت ختم ہونے پر حملہ کرتے تو ان رومیوں کے چوکنا ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ جنگی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا پھر (انہی دنوں میں جب کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے لشکر والوں کے ساتھ رومیوں کے شہر میں پھر رہے تھے) ایک شخص عربی یاتر کی گھوڑے پر سوار یہ کہتے ہوئے آیا کہ ''اللہ اکبر' اللہ اکبر وفا کو ملحوظ رکھو اور بدعہدی کو اختیار نہ کرو (یعنی تم پر معاہدہ کو پورا کرنا لازم ہے نہ کہ تم معاہدہ کی خلاف ورزی کرو گویا انہوں نے یہ واضح کیا کہ تم لوگ معاہدہ کے زمانے میں دشمنوں کے شہروں میں گشت لگاتے پھرتے ہو تو یہ اپنے عہد کی پاسداری کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ عہد شکنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کے حکم میں داخل ہے) جب لوگوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص (ایک صحابیؓ) حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں' حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے اس بات کو پوچھا (کہ رومیوں کے شہروں میں ہمارا پھرنا' عہد شکنی کے مترادف کیسے ہے؟) تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جس شخص کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ عہد شکنی نہ کرے اور نہ اسے منعقد کرے۔ یہاں تک کہ اس معاہدہ کی مدت گزر جائے یا وہ ان کو باخبر کر کے برابری کی بنیاد پر اپنا عہد توڑ دے (یعنی اس معاہدہ کے خلاف کرنا یا تو اس صورت میں جائز ہے جب کہ اس معاہدہ کی مدت ختم ہوگئی ہو یا اس صورت میں جائز ہے جب کہ کسی مجبوری یا مصلحت کی بناء پر مدت کے دوران ہی معاہدہ توڑنا ضروری ہوگیا ہو اور فریق مخالف کو پہلے سے آگاہ کر دیا گیا ہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا ہم اس کو توڑتے ہیں' اب ہم اور تم دونوں برابر ہیں کہ جس کی (جو مرضی ہو کرے) حدیث کے راوی حضرت سلیم بن عامر کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ' (حضرت ابن عبسہؓ کی یہ بات اور آپ ﷺ کی یہ حدیث سن کر) اپنے لوگوں کے ساتھ (رومیوں کے شہر سے اپنے کیمپ میں) واپس لوٹ آئے''۔ (ترمذی' ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

سلیم بن عامر: ''سلیم'' صیغۂ تصغیر کے ساتھ ہے۔ تابعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ **قوله: كان بين معاوية وبين الروم۔۔۔وفاء لاغدر:**

تشریح: أغار: ایک روایت میں ''أغار'' کی جگہ ''غزاهم'' کے الفاظ آئے ہیں۔

''فرسٍ أو برزون'': علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''فرس' سے مراد عربی گھوڑا ہے اور ''برذون'' سے مراد ترکی گھوڑا ہے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر: اس موقع پر اللہ اکبر کہنا خصوصاً مکرر لانا تعجب اور تھا استبعاد کی وجہ سے

''غدر'': رفع کے ساتھ ہے اس لئے کہ لا عاطفہ ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہوگی: **''الواجب عليك وفاء لا غدر''** کہ اے معاویہ تم پر ایفائے عہد واجب ہے غداری نہیں ہونی چاہیے۔

اور ایک نسخہ میں '' غدر'' فتح کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ ''لا'' نفی جنس کیلئے ہوگا۔ اس صورت میں یہ خبر نہی کے معنی میں ہوگی جیسا کہ اللہ کا یہ قول ہے: ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ [البقرة۔۲]

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ضرورت کی وجہ سے یہاں پر اختصار کیا گیا ہے۔ ضیق مقام کی وجہ سے کلام میں حذف کر دیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ اور امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات بعید ہے کہ وہ غدر کا ارتکاب کریں۔

قوله:فنظر واذا هو عمرو بن عبسة:

''عَبَسَة'': عین، باء اور سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ عمرو بن عبسہ نے اس کو ناپسند اس وجہ سے کیا کہ جب انہوں نے ان کے ساتھ ایک وقت تک معاہدہ کیا تھا اور وہ اپنے وطن میں مقیم تھے۔ تو انقضاء مدت مقررہ کے بعد چلنا چاہئے تھا چونکہ یہ معاہدہ کا حصہ تھا کہ وہ اس مدت میں ان پر حملہ نہیں کریں اس لئے جب ایام معاہدہ کے اندر اندر دھاوا بول دیا تو یہ ایقاع اس متوقع وقت سے پہلے ہوا۔ عمرو بن عبسہ نے اس کو ''غدر'' شمار کیا ہے۔ ہاں اگر اہل معاہدہ نے معاہدہ توڑا۔ اس طور پر کہ ان کی طرف سے کوئی خیانت نظر آنے لگی۔ تو پھر ان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔

قوله:''من كان بينه وبين قوم عهد فلا يحلن عهدًا ولا يشدنه'':

دراصل ''**لا يشدنه**'' کو عدم تغییر کے لئے بطور مبالغہ کے ذکر کیا ہے اور ایک روایت میں ہے: ''**فيشده ولا يحله**'' کہ اس کو مضبوط تو کریں لیکن اس کو توڑیں مت۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ عہد میں عدم تغییر اور تبدیلی سے عبارت ہے۔ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اس عہد کو نہ تو توڑنا جائز ہے اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی کوئی زیادتی جائز ہے۔ لیکن یہ محل ''نظر'' ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ معاہدہ کرنے والا معاہدہ کو بغیر نقض کے چھوڑے۔

قوله:''حتى يمضى أمده او ينبذ اليهم على سواء'' یہاں تک کہ وہ مدت گزر جائے یا ان سے خیانت کا اندیشہ ہو تو کہ وہ اپنے اپنے عہد کو واپس کر دیں اس طور پر کہ وہ ان کو خبر دے دیں کہ ہم نے معاہدہ توڑ دیا ہے تاکہ طرفین نقض عہد میں برابر ہو جائیں کسی کی طرف سے بھی عہد شکنی نہ ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ [الأنفال۔۵۸] اگر تمہیں کسی قوم کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو تو ان کی طرف برابری کی بنیاد پر ان کا معاہدہ پھینک دو۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**علٰى سواءٍ**'' حال ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ ان کو بتلا دیں کہ وہ ان کے ساتھ جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں اور صلح ختم ہے۔ اس طرح اس علم میں دونوں فریق برابر ہو جائیں گے۔

قوله:''فرجع معاويه بالنّاس'':

یہاں پر ''باء'' تعدیہ کیلئے ہے۔ اس لئے کہ ''رجع'' لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ آیت دلیل ہیں: ﴿ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ ﴾ [التوبة۔۸۳] **اى فذهب بهم**۔ لیکن یہاں ''باء'' کا مصاحبت کے لئے ہونا زیادہ واضح ہے۔ **اى فرجع معهم**۔

ایفائے عہد کا ایک واقعہ

۳۹۸۱: وَعَنْ اَبِىْ رَافِعٍ قَالَ بَعَثَنِىْ قُرَيْشٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَلَمَّا رَاَيْتُ

رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اُلْقِيَ فِيْ قَلْبِيْ الْاِسْلَامُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي وَاللّٰهِ لَا اَرْجِعُ اِلَيْهِمْ اَبَدًا قَالَ اِنِّي لَا اَخِيْسُ بِالْعَهْدِ وَلَا اَحْبِسُ الْبُرُدَ وَلٰكِنْ اِرْجِعْ فَاِنْ كَانَ فِيْ نَفْسِكَ الَّذِيْ فِيْ نَفْسِكَ الْاٰنَ فَارْجِعْ قَالَ فَذَهَبْتُ ثُمَّ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَاَسْلَمْتُ۔

(رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۸۹' کتاب الجهاد' باب فی الامام یستجن به' الحدیث رقم ۲۷۵۸ وأحمد فی المسند ۶ /۸

ترجمہ: ''اور حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے موقع پر) کفار قریش نے مجھے (اپنا قاصد بنا کر) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو (بے اختیار) میرے دل میں اسلام (کی صداقت وحقانیت) ڈال دی گئی' میں نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! میں اب کبھی بھی ان (کفار قریش) کے پاس واپس نہیں جاؤں گا' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نہ تو عہد کو توڑا کرتا ہوں اور نہ قاصدوں کو روکا کرتا ہوں' البتہ تم (اب تو) واپس چلے جاؤ' اگر تمہارے دل میں وہ چیز (یعنی اسلام) قائم رہے جو اس وقت تمہارے دل میں موجود ہے تو پھر (میرے پاس) لوٹ آنا''۔ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (آپ ﷺ کے حکم کے مطابق میں (مکہ) واپس ہو گیا اور پھر آپ ﷺ کی خدمت میں آ گیا اور اسلام قبول کر لیا (یعنی اپنے اسلام کا اعلان کر دیا)''۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

اَبِی رافع: مؤلف کتاب نے اسماء الرجال میں ان کا نام ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ صرف ''اسلم'' ذکر کیا ہے۔ یہ نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں اور ان پر ان کی کنیت غالب آ گئی۔ یہ قبطی تھے۔ یہ حضرت عباس کے غلام تھے۔ چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ کو ہبہ کر دیا۔ جب نبی ﷺ کو حضرت عباسؓ کے اسلام کی خوشخبری دی گئی تو آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ ''اسلم'' اسلام ''بدر'' سے پہلے لائے تھے۔ شاید یہ وہی ہوں۔ لیکن سیاق حدیث اس کا انکار کرتا ہے۔ ''واللہ اُعلم بالصواب''۔

عرضِ مرتب:

ہمارے نسخہ میں دونوں کے حالات مذکور ہیں مؤلف نے صراحتاً لکھا ہے ابورافع اور اسلم ایک ہی صاحب ہیں ابورافع کا نام اسلم تھا۔ ملا علی قاریؒ کے صنیع سے لگتا ہے۔ کہ ابورفع اور اسلم دو علیحدہ علیحدہ اشخاص ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

قوله: بعثنى قريس الى رسول الله ...لا ارجع اليهم أبدا:

''اُلقی'': صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ یعنی نفس ایمان داخل ہو گیا یا اس سے مراد ایمان واسلام کی محبت ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی زیارت کرتے ہی اسلام ان کے دل میں گھر کر گیا تھا اور انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

لو لم تكن فيه آيات مبينة ☆ كانت بداهة تنبيك عن خبر

''اگر آپ ﷺ میں کوئی واضح نشانیاں (معجزات وغیرہ) نہ بھی ہوتیں تو آپؐ کو ایک مرتبہ بداہۃً دیکھنا بھی ایک خبر دے دیتا''۔

یہ الفاظ ان کی فراست وسعت نظری اور اصابت نظری پر دال ہیں اور اس پر کہ اگر کسی نے صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات کو صحیح نظر سے دیکھا تو اس نظر بدیہی سے بھی وہ ایمان لے آئے گا اگرچہ معجزات اور واضح نشانیوں کو نہ بھی دیکھا جائے۔

''**واللّٰہ لا أرجعُ الیهم**'': یہ جملہ دراصل ان کے دل میں ایمان گھر کرنے سے کنایہ ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے اس کو قسم کے ساتھ مؤکد کرتے ہوئے آخر میں یہ کہا۔''ابدًا۔

قوله لا أخيس با لعهد:

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عہد (اگرچہ کفار کے ساتھ ہو) کا ایسا خیال رکھا جائے۔ جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ **لأحبس البرد**: بأ اور راء دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے راء کو ساکن بھی پڑھ سکتے ہیں ''برید'' کی جمع ہے۔''رسول، پیغام رسان'' آپ ﷺ نے اس کو نہیں روکا کیونکہ پیغام رسانی کا تقاضا یہی تھا کہ ان کے مدعا کے مطابق ان کو جواب دیا جائے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں پر ''عہد'' سے مراد عادت جاریہ ہے۔ جو لوگوں میں متعارف ہیں۔ عادت جاریہ یہ ہے کہ ایلچیوں کے ساتھ برے طریقے سے پیش نہیں آیا جاتا۔ چنانچہ اگلی روایت بھی دال ہے:''**اما واللّٰہ لو لا أن الرسل لا تقتل**'' آپ ﷺ نے جملہ کی ابتداء لفظ''اَمَا'' کے ساتھ کی ہے جو کہ قسم کے شروعات میں سے ہے۔ پھر اس کے بعد ایسے الفاظ لائے ہیں کہ جو اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اس فعل کا ارتکاب عظیم جرائم میں سے ہے۔ لہٰذا اس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔

''**ولکن ارجع**'' کلام مقدر سے استدراک کیلئے ہے۔ **ای لا تقم ههنا وتظهر الاسلام ولكن ارجع**

قوله:لكن ارجع فان كان فی نفسك الّذی فی نفسك الآن فارجع''۔

اگر تمہارے دل میں یہ بات ثابت رہے جواب تمہارے دل میں ہے۔ تو پھر کفار سے ہمارے پاس واپس آجانا اور پھر اسلام لے آنا۔ اس لئے کہ اگر میں نے ابھی تمہارا اسلام قبول کر لیا اور میں نے تم کو ان کے پاس واپس نہ کیا۔ تو میں ''غادر'' ہو جاؤں گا۔ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کی طرف سے قبول اسلام یہ کوئی غدر نہیں ہے اور نہ ہی یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کو نہ روکنا غدر ہو۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلام کو ظاہر نہ کرے اور ان کی طرف واپس لوٹ جائیں۔ اس لئے کہ تمہیں یہاں روکنا مشکل ہے۔ اس لئے یہی زیادہ مناسب وارفق ہے کہ اس کے بعد حق کی طرف حق طریقے سے واپس لوٹ آنا۔

ایلچی کو قتل کرنے کی ممانعت

۳۹۸۲:وَعَنْ نُعَيْمِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ لِرَجُلَيْنِ جَاءَ مِنْ عِنْدِ

مُسَيْلَمَةَ اَمَّا وَاللّٰهِ لَوْلَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ اَعْنَاقَكُمَا۔ (رواه احمد وابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۱۹۱، كتاب الجهاد، باب فى الرسل، الحديث رقم ۲۷۶۱ و أحمد فى المسند ۳ / ۴۸۷

ترجمه: ''اور حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں آدمیوں سے ارشاد فرمایا جو مسیلمہ کے پاس سے آئے تھے کہ ''یاد رکھو! خدا کی قسم اگر قاصد کو قتل کرنا مارنا شرعی طور پر ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا''۔ (احمد، ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

نعیم بن مسعود۔ یہ نعیم۔ مسعود کے بیٹے اور اشجعی ہیں۔ ''نعیم'' تصغیر کے ساتھ ہے۔ ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور غزوۂ خندق کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے۔ انہوں نے ہی ''بنو قریظہ'' اور ابوسفیان بن حرب میں اختلاف پیدا کیا تھا۔ اس وقت ابوسفیان احزاب مشرکین کے سردار تھے۔ انہوں نے ہی مشرکین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناکام واپس کیا تھا۔ ان کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ مدینہ میں رہتے تھے۔ ان کے بیٹے سلمہ نے ان سے روایت کی۔ علقمہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انتقال فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ نہیں بلکہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پہنچنے سے قبل قتل کیے گئے۔ ان سے ان کا بیٹے مسلمہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله: اما والله لو لاان الرسل لاتقتل ......:

توربشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے کہا۔ کہ وہ جیسے تبلیغ رسالت پر مامور تھے اسی طرح وہ یہاں سے جواب لے جانے پر بھی مامور تھے تو ان پر دونوں باتوں کی رعایت لازم ہے اگر وہ اس کو چھوڑ دیں گے تو اس کو غدر کہا جائے گا۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں غدر سے سب سے زیادہ دور تھے اور دوسری بات یہ کہ ایلچی کے آنے جانے میں ایک بڑی مصلحت اور حکمت ہے۔ اگر ان کو روکنا جائز ہو یا ان کے ساتھ کسی برے طریقے سے تعرض جائز ہو تو یہ بات فریقین کے درمیان باہمی روابط کے انقطاع کا زبردست سبب بنے گا اور اس میں بڑے فساد اور فتنہ کا خطرہ ہے۔ جو کسی بھی عقلمند سے پوشیدہ نہیں ہے۔

''لضربت أعناقكما'' اس لئے ارشاد فرمایا کیونکہ ان دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے ''نشهد أن مسيلمة رسول الله'' (کہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ کہ مسیلمہ اللہ کے رسول ہے) (نعوذ باللہ) اور بعض نے کہا ہے کہ ایلچی کے قتل کا عدم جواز قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے: ﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ ﴾ [التوبة۔ ۶]۔ (اگر مشرکوں میں سے کوئی آپ سے امان طلب تو اس کو امان دے دیں) اور وفد میں آنے والا بھی مستجیر کی طرح ہے۔

زمانہ جاہلیت کی قسم پورا کرنے کا بیان

۳۹۸۳: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ فِيْ خُطْبَتِهٖ اَوْفُوْا بِحَلْفِ الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّهٗ لَا يَزِيْدُهٗ يَعْنِى الْاِسْلَامَ اِلَّا شِدَّةً وَلَا تُحْدِثُوْا حِلْفًا فِي الْاِسْلَامِ

(رواه الترمذی) مِنْ طَرِيْقِ حُسَيْنِ بْنِ ذَكْوَانَ عَنْ عَمْرٍو وَقَالَ حَسَنٌ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١٤٢، كتاب السير، باب ما جاء فی الخلف، الحديث رقم ١٥٨٥ وأحمد فی المسند ٢ / ٢١٣

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک دن) اپنے خطبہ کے دوران یہ ارشاد فرمایا کہ ''زمانۂ جاہلیت کی قسم کو پورا کرو' کیونکہ وہ (یعنی اسلام) اس قسم کو زیادہ مضبوط کرتا ہے (مطلب یہ ہے کہ اپنے قسم اور اپنے عہد کو پورا کرنا اسلام میں کہیں زیادہ ضروری ہے اس اعتبار سے اسلامی احکام اور ایفاء عہد وحلف میں کوئی تضاد نہیں ہے) اور اسلام میں حلف یعنی قسموں اور نئے معاہدوں کو رواج نہ دو'۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسین بن ذکوان کی سند سے بروایت حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے

اسنادی حیثیت:

امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے''۔

تشریح: **قوله: ''أوفوا بحلف الجاهلية''**: ''حلف: حاء کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں حاء کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ کہ تم دور جاہلیت کے ان عقود عہود اور قسموں کو پورا کرو۔ جو تم نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کیلئے اٹھائی تھیں۔

اس آیت کی وجہ سے: ﴿ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ [المائدہ۔۱] لیکن یہ تعاون نیکی اور تقویٰ کے ساتھ مقید ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [المائدۃ۔۲] ترجمہ: ''تم ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی پر تعاون مت کرو''۔

قوله: ''فانه لا يزيده يعنى الاسلام الاّ شدةً''

يزيد: کا فاعل ضمیر مستتر ہے۔ جس کو راوی نے ''الاسلام'' کے ساتھ واضح کیا ہے۔ **ای لا يزيد الاسلام الحلف الاشدة**۔ اس لئے کہ جس نے مضبوط اور طاقتور بچانے والی کو پکڑا تو وہ کمزور بچانے والی ذات سے مستغنی ہوگیا۔

''النہایہ'' میں لکھا ہے کہ اصل میں ''حلف'' اس معاہدہ کو کہتے ہیں جو کہ اتفاق اور باہمی تعاون پر کیا گیا ہو۔ پس زمانہ جاہلیت کا جو حلف کسی فتنہ اور قبائل کے درمیان قتل وقتال پر مبنی ہو تو اس قسم کی قسم سے اسلام میں منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ''**لا حلف فی الاسلام**'' اور زمانہ جاہلیت کا جو حلف اس پر مبنی ہو کہ مظلوم کی مدد کریں گے اور صلہ رحمی کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو اسی قسم کی قسم کے بارے میں یہ ارشاد ہوا ہے: ''**ایما حَلْفٍ کان فی الجاهلية لم يزده الاسلام الاّ شدّةً**''۔

قوله: ''ولا تحدثوا حلفًا فی الاسلام'':

یعنی اسلام لانے کے بعد اس کو تبدیل مت کرو۔ اس میں اختراعات مت کرو اس لئے کہ وجوب تعاون کے سلسلے میں یہی کافی ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ تنوین تنکر دو باتوں کا احتمال رکھتی ہے:

① یہ جنس کیلئے ہو۔عبارت یوں ہوگی: ''لا تحدثوا حلفًا ما'' ② یہ نوع کے لئے ہو۔
ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ دوسرا احتمال زیادہ واضح ہے اور مظہرؒ کا قول بھی اسی کی تائید کر رہا ہے کہ اگر تم نے زمانۂ جاہلیت میں یہ قسم اٹھائی ہے کہ تم میں سے بعض بعض کی اعانت کریں گے اور بعض بعض کے وارث بنیں گے۔لہٰذا اب جب تم اسلام لا چکے ہو تو ان کو پورا کرلو۔اس لئے کہ اسلام تمہیں ایفائے عہد پر برانگیختہ کرتا ہے۔لیکن اس کے ذریعے اسلام کی مخالفت مت کرو اس طور پر کہ تم میں سے بعض بعض کے وارث بنیں گے۔چونکہ وراثت رشتہ داری کی وجہ سے آتی ہے معاہدہ کی وجہ سے نہیں۔
''رواہ'' کے بعد اصل میں بیاض ہے۔اگرچہ علامہ جزریؒ نے اپنی صحیح میں اس کے ساتھ اس عبارت کا الحاق کیا ہے:
رواه الترمذی من طريق ابن ذكوان عن عمرو وقال حسن ۔
قوله: وذكر حديث علیؓ ''المسلمون تتكافأ'' ''تتكا فأ'': بصیغہ تذکیر و تانیث ہر طرح مروی ہے یہ ایک طویل حدیث ہے

عرض مرتب:

یہ حدیث ماقبل میں گذر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کتاب القصاص ،فصل ثانی کی ۳۰ ویں حدیث ، یعنی حدیث۔ ۳۴۷۵۔یعنی تکرار کی وجہ سے ہم نے اس کو ساقط کردیا۔
علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آزاد مسلمان مرد یا آزاد مسلمان عورت کسی کافر کو یا کسی جماعت کو یا کسی شہر یا گاؤں والوں کو امان دے دیں تو ان کا امان دینا صحیح ہے اور کسی بھی مسلمان کے لئے ان کے ساتھ لڑائی جائز نہیں ہے اور اس بارے میں اصل اصول یہی حدیث ہے اور ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ کی حدیث ذکر کی ہے: قال: ''**قال رسول الله ﷺ ''المسلمون تتكافأ دماؤهم''**۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شریف آدمی کی دیت وضع کی دیت پر زیادہ نہیں کیا جائے گا اور ان کے ادنیٰ اور اعلیٰ کا ذمہ برابر ہوگا۔اگر ادنیٰ نے کسی کی ذمہ داری لی تو اس کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ابن ماجہ کے الفاظ اس طرح ہیں: ''**ويجير عليهم اقصاهم وهم يدٌ علٰى من سواهم**'' گویا کہ مسلمان اپنے علاوہ کے ساتھ ایک آلہ کی طرح ہیں۔یعنی باہمی تعاون کے اعتبار سے ایک عضو کی طرح ہیں۔اس پر البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس غلام کا امان دینا صحیح نہیں ہے۔جس پر آقا کی طرف سے معاملات پر پابندی ہو۔مگر یہ کہ اس کا مولیٰ اس کو قتال کی اجازت دے دے۔امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے اور حدیث مذکورہ ذیل کے مطلق ہونے کی وجہ سے امام مالک اور احمد بھی یہی فرماتے ہیں اور ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی روایت بھی یہی ہے: ''**ويسعى بذمتهم ادناهم**''۔
عبدالرزاق نے روایت نقل کی ہے:
''حدّثنا معمر بن عاصم بن سليمان عن فضيل بن يزيد الرقاشي قال: شهدت قرية من قرى فارس يقال لها شاهرتا، فحاصرناها شهرًا حتّى اذا كنّا ذات يوم وطمعنا أن نصبحم انصرفنا عنهم عند المقيل، فتخلف عبد منا فاستأمنوه فكتب اليهم أمانًا ثم رمٰى به اليهم ۔ فلما رجعنا اليهم خرجوا الينا في ثيابهم

ووضعوا أسلحتهم فقلنا: ماشأنكم؟ فقالوا: أمنتمونا وأخرجوا اليهم السهم فيها كتاب بأمانهم فقلنا: هذا عبدٌ لا يقدر على شئ، قالوا: لا ندرى عبدكم من حركم، فقد خرجنا بأمان فكتبنا الٰى عمر فكتب: ان العبد المسلم من المسلمين وامانه امانهم۔ ورواه ابن ابى شيبة وزاد: فأجاز عمر أمانه۔ والحديث جيّدٌ''۔

سلیمان بن یزید الرقاشی فرماتے ہیں کہ میں فارس کے ایک گاؤں میں تھا۔ جس کو''شاھرتا'' کہتے ہیں۔ ہم نے ایک مہینہ تک اس کا محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک دن آیا اور ہم نے طمع کی کہ ہم صبح کے وقت آئیں گے قیلولہ کے وقت ہم وہاں سے واپس لوٹ آئے ہم میں سے ایک غلام پیچھے رہ گیا۔ اس شہر والوں نے اس سے اَمان طلب کیا تو اس غلام نے ان کی طرف امان لکھ بھیجا جب ہم (اگلے دن) ان کی طرف واپس لوٹے تو وہ ہماری طرف اپنے (عام روزمرہ کے) کپڑوں میں نکلے اور انہوں نے اسلحہ رکھ دیا۔ ہم نے کہا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ تم نے ہمیں امان دے دیا ہے اور ہمیں وہ تیر نکال کر دیا جس میں ان کا امان لکھا ہوا تھا۔ ہم نے کہا کہ یہ تو ایک غلام ہے۔ جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے غلام اور آزاد کو نہیں جانتے۔ ہم تو امان کی وجہ سے باہر نکلے ہیں ہم نے یہ بات عمر رضی اللہ عنہ کو لکھی۔ تو انہوں نے لکھا کہ بے شک مسلمان غلام اور آزاد کی امان برابر ہے اور اس کو ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا اور اتنا اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کے امان کو برقرار رکھا اور کہا ہے کہ یہ حدیث جید ہے اور فضل بن یزید رقاشی کی توثیق ابن معین نے کی ہے۔ صاحب ہدایہ نے ابوموسیٰ الاشعری کے طریق سے روایت نقل کی ہے: ''امان العبد امان'' یہ حدیث معروف نہیں۔ فرمایا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مالک رحمۃ اللہ علیہ نے سحون کی روایت سے دلیل پکڑی ہے جو کہ شرح ابن ہمام میں بسط کے ساتھ مذکور ہے اگر بچے نے امان دی جو نہ اسلام کو سمجھتا ہو اور نہ اس کو بیان کر سکتا ہو تو باجماع ائمہ اَربعہ یہ صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ مجنون اگرچہ عقل مند ہو لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس پر قتال کی پابندی لگائی گئی ہو۔ تو یہ ہمارے اصحاب اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان اختلافی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ صحیح نہیں ہے البتہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں صحیح ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کا بھی ایک قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ اس کا قول معتبر نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کی طلاق اور عتاق درست نہیں ہے اور اگر وہ ماذون فی القتال ہو تو بالاتفاق صحیح ہے۔

الفصل الثّالث:

مسیلمہ کذاب کے ایلچی

۳۹۸۴: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ ابْنُ النَّوَاحَةِ وَابْنُ اُثَالٍ رَسُوْلَا مُسَيْلَمَةَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَقَالَ لَهُمَا اَتَشْهَدَانِ اَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَا نَشْهَدُ اَنَّ مُسَيْلَمَةَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لَوْ كُنْتُ قَاتِلًا رَسُوْلًا لَقَتَلْتُكُمَا قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَمَضَتِ السُّنَّةُ اَنَّ الرَّسُوْلَ لَا يُقْتَلُ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد بن حنبل فى المسند ١ / ٣٨٤

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مسیلمہ (مدعی نبوت) کے دو قاصد ابن نواحہ اور ابن اثال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا کہ ''کیا تم دونوں اس حقیقت کی گواہی دیتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں؟'' ان دونوں نے کہا کہ ''نہیں (بلکہ) ہم اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ خدا کا رسول ہے''۔ نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ''میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا اگر میں قاصدوں اور ایلچیوں کو قتل کرنے والا ہوتا تو یقیناً میں تم دونوں کو بھی قتل کر دیتا''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (آپ ﷺ کے اس ارشاد گرامی کے پیش نظر) پھر یہ سنت جاری ہو گئی (یعنی یہ ضابطہ قرار پایا) کہ کسی قاصد و ایلچی کو قتل نہ کیا جائے خواہ وہ کتنی ہی غیر مناسب بات کیوں نہ کرے اور قتل ہی کا سزاوار کیوں نہ ہو''۔ (احمد)

راویٔ حدیث:

ابن النواحۃ۔ اس کا نام ''عبداللہ'' ہے۔ یہ وہی ہے جو اپنے دوست ''ابن اثال'' کے ساتھ ''مسیلمہ کذاب'' کے پاس سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ دونوں کا ذکر ''باب الامان'' میں ہے۔ ابن نواحہ ''مسیلمہ کذاب'' کے قتل کے بعد مسلمانوں میں اس طرح روپوش ہو گیا کہ لوگ اس کو مسلمان سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ''یمن'' سے امدادی فوج میں کوفہ بھیج دیا گیا۔ یہ شخص اپنی قوم ''بنی حنیفہ'' کا امام تھا۔ چنانچہ حارثہ بن مضرب نے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف شہادت دی کہ یہ لوگ گاؤں کی مسجد میں وہ چیزیں ایک دوسرے کو پڑھا رہے تھے جس کو مسیلمہ نے جھوٹ موٹ بنا لیا تھا اور اس کا دعویٰ کیا تھا کہ یہ خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔ اس زمانہ میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں معلم اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے دست راست تھے۔ یہ سرکش جماعت ان کے سامنے حاضر کی گئی۔ انہوں نے اس کی سرکشی کو صاف طور پر پہچان لیا اور ان سے توبہ کرائی گئی۔ انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کر لی گئی' لیکن ''ابن النواحہ'' کی معذرت قبول نہیں ہوئی کیونکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو تو شام کے علاقہ میں جلاوطن کر دیا اور ان کے اندرونی احوال کو خدا کے سپرد کر دیا گیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ان کا عقیدہ وہی ہے جو پہلے تھا تو شام کا طاعون ان کو ہلاک کر دے گا ورنہ اب توبہ کرنے کے بعد ہمیں ان کو سزا دینے کا کوئی حق نہیں رہا' لیکن ابن النواحہ کے بارے میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ قتل کرنے پر مصر رہے۔ کیونکہ یہ زندیق اور زندقہ کا مبلغ تھا۔ چنانچہ ان کے حکم سے ''قرظہ بن کعب'' نے اُس کو سر بازار قتل کر دیا۔ ''النَّواحۃ'': یہ لفظ نون کے فتحہ اور واؤ کے تشدید کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''اُثال'': یہ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

قولہ: جاء ابن النواحۃ...... الی النبیؐ:

''الی النبی ﷺ'' اس کے متعلق کی بابت تین ترکیبی احتمال ہیں

① یہ جآء کے ساتھ متعلق ہے۔ ② ''رسولا'' کے ساتھ متعلق ہے۔ ③ اس میں تنازع فعلین کا احتمال ہے۔ پہلا احتمال زیادہ واضح ہے۔

''قوله فقال لهما: أتشهد أنّي رسول الله ﷺ'' گویا کہ آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت کا ارادہ کیا لیکن اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ اس وقت مسلمان ہوں۔

''فقالا'': اور ایک نسخہ میں ''قالا'' ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں ''لا'' کی زیادتی بھی ہے۔ ''لو کنت'' ایک نسخہ میں یہ واؤ کے ساتھ ہے۔ ای ولو کنتُ۔

''نشهد أنّ مسیلمة رسول الله ﷺ'': ان الفاظ کے ساتھ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ لوگ ''مسیلمہ'' کے اتباع میں سے ہیں۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ جواب نہ سوال کے مطابق ہے اور نہ ہی نفس الامر کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ میں نے بھی رسالت کا دعویٰ کیا ہے اور اس کو معجزہ کے ساتھ سچ کر دکھلایا ہے۔ تو تم دونوں اس کا اقرار کرلوان کا یہ کہنا۔ ''نشهد'' اس معنی کی تردید ہے گویا کہ انہوں نے اس بات کا انکار کیا۔ کہ نبوت کو معجزات کے ذریعے ثابت کیا جاتا ہے۔ ان کا جواب احمقانہ اُسلوب پر مشتمل ہے۔

قوله: ''امنتُ بالله :

ورسله: بظاہر اس سے مراد یہ ہے کہ اس مضاف سے مراد جنس ہے۔ اس کی تائید ایک دوسرے نسخہ سے بھی ہوتی ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ ''امنتُ بالله وبی'' بلکہ یہ کہا: ''ورسوله''۔ یعنی جس نے بھی رسالت کا دعویٰ کیا اور اس کو معجزہ سے ثابت بھی کیا میں اس پر ایمان لاتا ہوں خواہ جو کوئی بھی ہو۔ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اب جو بھی شخص کسی مدعی رسالت سے یہ کہے کہ ''تم کوئی معجزہ دکھاؤ'' تو اس نے کفر کیا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گویا کہ انہوں نے اس بات کا انتظار کیا کہ آپ ﷺ مسیلمہ کو رسالت میں شریک کریں۔ آپ ﷺ نے اپنے اس قول ''ورسوله'' کے ساتھ اس کی نفی کردی۔ اھ مطلب یہ کہ وہ کہاں اور رسالت کہاں گویا کہ آپ ﷺ کا کلام اسلوب حکیم میں سے ہے اھ۔ یہ بات محل بحث ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اس کا ارادہ کیا ہوتا تو وہ ہمارے نبی ﷺ کی رسالت کا بھی اقرار کرتے۔ (واللہ اعلم)۔

رسولاً: یہاں رسول سے مراد وہ شخص ہے جو امان لے کر کسی کی طرف سے خبر لایا ہو۔

قوله: عبد الله : اس سے مراد عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جو کہ اس حدیث کے راوی چونکہ جب ''عبداللہ'' کو مطلقاً بولا جاتا ہے تو اس سے مراد ''عبداللہ من مسعد'' ہی ہوتے ہیں۔

قوله: ''فمضت السُّنة ان الرّسول لا یقتل'':

طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اب تک تو یہ بات عادت ورواج تھی کہ ایلچیوں کو قتل نہیں کیا جاتا، اب سے یہ میری سنت ہے۔

بَابُ الْقِسْمَةِ الْغَنَائِمِ وَالْغُلُوْلِ فِيْهَا

مالِ غنیمت کی تقسیم اوراس میں خیانت کرنے کا بیان

''مغرب'' میں لکھا ہے کہ غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو مشرکین سے لڑائی کے دوران ان سے بزور شمشیر لیا جائے غنیمت ''نفل'' سے عام ہے اور ''فئی'' غنیمت سے بھی عام ہے۔ اس لئے کہ ''مال فَی'' ہر اس مال کو کہتے ہیں جو مشرکوں سے مسلمانوں کی ملکیت میں آئے۔

علامہ ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ کا فرماتے ہیں: ''**الغنيم فيء ،والجزية فيء، ومال اهل الصلح فيء والخراج فئي لأن ذالك كله مما افآء الله على المسلمين من المشركين**''۔ کہ فی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو مشرکین سے حاصل ہو چاہے وہ غنیمت کی شکل میں ہو، جزیہ ہو، یا صلح کے نتیجہ میں بصورت مال خراج ہو، اس لئے کہ ان میں سے ہر چیز **مما أفاء الله على المسلمين من المشركين** کا مصداق ہے۔

فقہاء کے نزدیک فی ہر اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کا لینا ان کے اموال میں سے مسلمانوں کے لئے حلال ہو۔ اس کو طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کفار سے قتال کے ذریعے جو کچھ مال وغیرہ لیا جائے اس کو ''غنیمة'' کہتے ہیں اور جو کچھ بغیر قتال کے لیا جائے اس کو ''فئی'' کہتے ہیں جیسا کہ جزیہ اور خراج ہے۔

الفصل الاول :

مالِ غنیمت امت محمدیہ کی خصوصیت

٣٩٨٥:عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ فَلَمْ تَحِلَّ الْغَنَائِمُ لِاَحَدٍ مِنْ قَبْلِنَا ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ رَاٰى ضَعْفَنَا وَعِجْزَنَا فَطَيَّبَهَا لَنَا ـ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٢٢٠' كتاب فرض الخمس' باب قول النبی صلى الله عليه وسلم احلت لكم الغنائم' الحديث رقم ٣١٢٤ و مسلم فی ٣ / ١٣٦٦' الحديث رقم (٣٢ ـ ١٧٤٧) وأحمد فی المسند ٢ / ٣١٧

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''پس مال غنیمت ہم سے پہلے کسی (امت کے لئے حلال نہیں تھا' جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں (مالی طور پر) کمزور و عاجز دیکھا تو اس (مال غنیمت) کو ہمارے لئے حلال قرار دیا''۔

تشریح: قوله: '' **فلم تحل الغنائم لأحدٍ قبلنا** '': اور ایک نسخہ میں (بغیر فاء) ''لم'' ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا

ہے کہ یہ "فاء" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سابق پر عطف ہے "فصل ثالث" میں یہی حدیث تفصیل کے ساتھ آئے گی مظہر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اشارہ تحلیل غنائم کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غنائم کو ہمارے لئے حلال کر دیا ہے۔

جس کو خبر نے واضح کر دیا۔ وہ یہ کہ حلت کو برقرار رکھا۔ جس کو ضعف اور عجز نے واجب اور لازم کیا تھا۔ لیکن مظہر رحمہ اللہ کا کلام زیادہ اظہر ہے کہتے ہیں کہ پچھلی امتیں جب جہاد کرتیں تو وہ اموال غنیمت کو ایک جگہ جمع کر لیتے اگر آسمان کی طرف سے آگ آتی اور اس کو جلا دیتی تو وہ سمجھ لیتے کہ ان کا جہاد قبول ہو گیا ہے۔ بصورت دیگر یہ جہاد مقبول نہیں ہوتا تھا ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: **فعلي تستمر ايضا لحال غزاة هذه الأمة** دوران جہاد کیلئے یہ حکم اس امت کے بارے میں اب بھی باقی ہے۔

مقتول سے چھینے ہوئے مال کا حقدار قاتل ہے

۳۹۸۶: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَامَ حُنَيْنٍ فَلَمَّا الْتَقَيْنَا كَانَتْ لِلْمُسْلِمِيْنَ جَوْلَةٌ فَرَاَيْتُ رَجُلاً مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَدْ عَلَا رَجُلاً مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَضَرَبْتُهٗ مِنْ وَّرَائِهٖ عَلٰى حَبْلِ عَاتِقِهٖ بِالسَّيْفِ فَقَطَعْتُ الدِّرْعَ وَاَقْبَلَ عَلَيَّ فَضَمَّنِيْ ضَمَّةً وَجَدْتُ مِنْهَا رِيْحَ الْمَوْتِ ثُمَّ اَدْرَكَهُ الْمَوْتُ فَاَرْسَلَنِيْ فَلَحِقْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَقُلْتُ مَابَالُ النَّاسِ قَالَ اَمْرُ اللّٰهِ ثُمَّ رَجَعُوْا وَجَلَسَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَقَالَ مَنْ قَتَلَ قَتِيْلاً لَهٗ عَلَيْهِ بَيِّنَةٌ فَلَهٗ سَلَبُهٗ فَقُلْتُ مَنْ يَّشْهَدُ لِيْ ثُمَّ جَلَسْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مِثْلَهٗ فَقُمْتُ مَنْ يَّشْهَدُ لِيْ ثُمَّ جَلَسْتُ ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مِثْلَهٗ فَقُلْتُ فَقَالَ مَالَكَ يَا اَبَا قَتَادَةَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ رَجُلٌ صَدَقَ وَسَلَبُهٗ عِنْدِيْ فَاَرْضِهٖ مِنِّيْ فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ لَا هَا اللّٰهِ اِذًا لَا يَعْمِدُ اِلٰى اَسَدٍ مِنْ اُسْدِ اللّٰهِ يُقَاتِلُ عَنِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَيُعْطِيْكَ سَلَبَهٗ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: صَدَقَ فَاَعْطِهٖ فَاَعْطَانِيْهِ فَابْتَعْتُ بِهٖ مَخْرَفًا فِيْ بَنِيْ سَلِمَةَ فَاِنَّهٗ لَاَوَّلُ مَالٍ تَاَثَّلْتُهٗ فِي الْاِسْلَامِ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸ / ۳٤ کتاب المغازی' باب قول الله تعالی' الحدیث رقم ٤٣٢١ و مسلم فی ٣ / ١٣٧٠ الحدیث رقم (٤١ ـ ١٧٥١) و أبو داود فی السنن ٣ / ١٥٩ الحدیث رقم ٢٧١٧' والترمذی فی ٤ / ١١١ الحدیث رقم ١٥٦٢ و مالك فی الموطا ٢ / ٤٥٤ الحدیث رقم ١٨ من کتاب الجهاد۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (فتح مکہ کے بعد) غزوۂ حنین کے سال ہم (جہاد کے لئے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئے' جب کافروں سے ہمارا مقابلہ ہوا تو (کچھ دیر کے لئے) مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا' میں نے دیکھا کہ ایک مشرک ایک مسلمان پر غالب آ گیا ہے' میں نے اس کے پیچھے سے اس کی گردن کی رگ پر تلوار کا (بھرپور) وار کر کے اس کی زرہ کاٹ ڈالی' وہ مشرک میری جانب متوجہ ہوا اور اس نے اتنے زور سے مجھے دبایا کہ اس کی وجہ سے میں نے موت کا مزہ پالیا (یعنی میں مرنے کے قریب ہو گیا) پھر (میرے ایک اور

وار سے) موت نے اسے دبا لیا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا' (اس کے بعد میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے (کہ دشمن کے مقابلہ سے بھاگ رہے ہیں؟) انہوں نے کہا کہ اللہ کا حکم یہی ہے (یعنی یہ جو کچھ ہو رہا ہے قضا و قدر الٰہی کے مطابق ہو رہا ہے۔) پھر لوگ (اس عارضی پسپائی کے بعد دوبارہ لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں) واپس آ گئے اور نبی کریم ﷺ (ایک جگہ) تشریف فرما ہو گئے اور فرمایا کہ ''جس شخص نے کسی مقتول (یعنی دشمن) کو قتل کیا اور اس پر کوئی گواہ بھی ہو تو اس (مقتول) کا مکمل ساز و سامان اس (یعنی قاتل) کا ہوگا''۔ (یہ سن کر میں کھڑا ہوا اور ارادہ کیا کہ اس مشرک کو قتل کرنے کا واقعہ بیان کروں' لیکن (دل میں) میں نے کہا کہ ''میری گواہی کون شخص دے (کہ میں نے اس مشرک کو قتل کیا ہے) آخر میں بیٹھ گیا' نبی کریم ﷺ نے دوبارہ وہی بات ارشاد فرمائی کہ جس شخص نے کسی مقتول (یعنی دشمن) کو قتل کیا اور اس پر کوئی گواہ بھی ہو تو اس کو (مقتول) کا مکمل ساز و سامان عنایت کیا جائے گا میں نے پھر (کھڑے ہو کر اپنے واقعہ کو بیان کرنا چاہا لیکن میں نے دل میں) کہا کہ ''میری گواہی کون شخص دے گا؟ اور میں پھر بیٹھ گیا' نبی کریم ﷺ نے پھر (تیسری مرتبہ) وہی بات ارشاد فرمائی میں (جب اس مرتبہ بھی) کھڑا ہوا (لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ابوقتادہ! تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ (تم کسی غرض مند اور طالب حاجت کی طرح بار بار کھڑے ہوتے ہو اور بیٹھ جاتے ہو مگر زبان سے کچھ نہیں کہتے؟) تب میں نے آپ ﷺ کو بتایا (کہ میں نے فلاں مشرک کو قتل کیا ہے) ایک شخص نے (میری بات سن کر) کہا کہ ''اس نے سچ کہا ہے اور اس (مشرک) کا مال میرے پاس موجود ہے' آپ ﷺ ان کو میری طرف سے راضی کر دیجئے (کہ یہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں اور ان کو اس مشرک کے مال کے عوض کوئی اور چیز دے دی جائے یا ان کو اس بات پر رضامند کر دیجئے کہ یہ میرے ساتھ کسی اور طرح مصالحت کر لیں) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (یہ سن کر اس شخص سے) کہا کہ ''نہیں' اللہ کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا' (رسول اللہ ﷺ اس معاملہ میں (ابوقتادہ رضی اللہ عنہ) کی مرضی کے خلاف کوئی ارادہ نہیں کریں گے)۔ اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لئے (دشمن سے) لڑتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ﷺ اس کا ساز و سامان تمہیں عنایت فرما دیں؟ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ ''ابوبکر ٹھیک کہتے ہیں' تم ابو قتادہ کو اس مشرک (مقتول) کا مال دے دو۔ چنانچہ اس شخص نے اس (مقتول مشرک) کا مال مجھ کو دے دیا اور میں نے (بعد میں) اس مال کے ذریعہ قبیلہ بنو مسلمہ میں ایک باغ خریدا اور یہ سب سے پہلا مال تھا جو مجھے اسلام لانے کے بعد حاصل ہوا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: ''خرجنا مع النبی عام حنین ﷺ فلما القیفنا کانت للمسامین جوله''.

مع النبی ﷺ: ایک نسخہ میں (مع النبیؐ کے بجائے) ''مع رسول الله ﷺ'' ہے۔

حنین: القاموس میں ہے کہ ''حنین'' زبیر کے وزن پر ہے۔ مکہ اور طائف کے درمیان ایک علاقہ کا نام ہے۔ جب ہم اور مشرکین آپس میں لڑنا شروع ہوئے تو ابتداء میں مسلمانوں کو تھوڑی سی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ''جولة'': جیم کے فتحہ اور واؤ

کے سکون کے ساتھ۔ای هزیمة قلیلة اصل میں''جولان'' سے ہے۔گویا کہ یہ ایک دفعہ گھومنا ہے۔کہا جاتا ہے:''جال فی الحرب جولة ای دار''اوراس کی تفسیر حدیث شریف میں''هزیمة'' کے ساتھ کی گئی ہے اور یہاں پر ہزیمت کو''جولة'' کے ساتھ تعبیر کیا۔اس لئے کہ یہ دونوں الفاظ اضطراب وعدم استقرار میں مشترک ہے۔

اور''النہایہ'' میں لکھا ہے کہ''جال و اجتال''اذا ذهب وجاء جب وہ جائے اور آئے اور اسی سے''الجولان فی الحرب'' بھی ہے اور''جائل''اس کو کہتے ہیں جو اپنے مکان سے ہٹا ہوا ہو۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ صحابی کو لفظ ہزیمت ناگوار لگا۔اس لئے ہزیمت کو''جولة'' سے کنایہ تعبیر کیا اور جولة عدم استقرار کو کہتے ہیں اس کو ہزیمہ کے معنی میں استعمال کیا اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے کہ وہ (صحابہ رضی اللہ عنہم) اس حالت (ہزیمت) پر برقرار نہیں رہے۔(بلکہ شکست کو فتح میں تبدیل کیا۔)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ہزیمت دراصل لشکر میں بعض لوگوں کی ہوئی،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی معیت میں ایک طائفہ وہ مسلسل ڈٹے رہے۔اور اپنی جگہوں سے بھاگے نہیں ہیں اور اس بارے میں احادیث صحیحہ مشہور ہیں اور کسی نے بھی یہ روایت نہیں کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی جگہ پر شکست خوردہ ہوئے ہوں۔بلکہ اپنی جگہ پر ثابت قدم رہے ہیں اور تمام جنگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی ثابت ہے۔

"قوله:فضربته من ورائه علی حبل عاتقه بالسیف، فقطعت الدرع۔۔۔فارسلنی":

''عاتق'' تائے فوقانیہ کے کسرہ کے ساتھ اور''عاتق'' سے مراد گردن اور شانوں کا درمیانی حصہ ہے۔یعنی اور میری تلوار اس کی زرہ کو کاٹتے ہوئے اس کے جسم کو بھی زخمی کر گئی

وجدتُ منها ریح الموت'':یہ دراصل موت کے اثر سے استعارۃ ہے۔مطلب یہ کہ میں نے اس سے اتنی سختی محسوس کی جتنی سختی موت کی ہوتی ہے اور معنی یہ ہے کہ موت قریب آگئی۔

قوله:''فلحقت عمر بن الخطابؓ فقلت:ما بال النّاس قال:أمر اللّٰه'':

پہلا مطلب:لوگوں کو کیا ہوا کہ شکست کھا گئے وہ بولے کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔

دوسرا مطلب:شکست کے بعد مسلمانوں کا کیا حال ہوگا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم غالب ہے اور آخر کار مدد مؤمنین کی ہوگی۔

قوله:''وجلس النبی ﷺ فقال:''من قتل قتیلاً له علیه بینةٌ فله سلبه''۔

من قتل لفظ کا استعمال باعتبار مایؤول کے ہے۔جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں ہے:﴿ أَعْصِرُ خَمْرًا ﴾ [یوسف۔۳۶]

''سلب'' سین اور لام دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے یہ''فعل'' بمعنی''مفعول'' ہے (یعنی سلب بمعنی''مسلوب'' ہے) اور سلب سے مراد مقتول کے کپڑے،اسلحہ،سواری وغیرہ ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور لیث رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے۔کہ سلب صرف اس قاتل کو دیا جائے گا۔ جس کے پاس قتل کا کوئی بینہ ہو اور جس کے پاس بینہ نہ ہو تو اس کا قول مقبول نہیں ہوگا۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا قول مقبول ہوگا۔اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے کہنے کی وجہ سے دے دیا اور ان سے حلف بھی نہیں لیا۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس قاتل کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طریقے سے ہوگیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بینہ کی تصریح کی ہے لہٰذا کافی نہیں ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ وہ اس کے اقرار کی وجہ سے مستحق ٹھہرا تھا۔جس کے ہاتھ میں وہ مال تھا لیکن یہ ضعیف ہے۔اس لئے کہ مال تو صرف اس وقت فائدہ دے سکتا ہے کہ جب مال اس شخص کی طرف منسوب ہو جس کے قبضہ میں وہ ہو تو اس کے اقرار پر مؤاخذہ ہوتا ہے لیکن یہاں تو مال پورے لشکر کی طرف منسوب ہے۔

علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے کہ سلب قاتل کو ملے گا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سلب قاتل کا حق نہیں ہے جب تک کہ امام اس کو نفل کے طور پر نہ دے اور حدیث تنفیل پر محمول ہے تاکہ اس حدیث اور اس دوسری حدیث میں تطبیق ہو جائے۔**ليس لك من سلب قتيلك الا ما طابت به نفس اما مك**

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔امام مالک،اوزاعی،ثوری،احمدؒ وغیرہ کا مسلک ہے کہ قاتل سلب کا مستحق ہوگا چاہے امیر جیش نے اس سے پہلے اس کا اعلان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔وہ فرماتے ہیں کہ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ ہے اور یہی حکم شرعی ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ،امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اتباع فرماتے ہیں کہ قاتل صرف قتل کی وجہ سے سلب کا مستحق نہیں ہوگا۔الا یہ کہ جب امام پہلے سے اس کا اعلان کردے کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا تو اس کا سلب اس کو ملے گا۔انہوں نے اس کو مطلق جانا ہے اور یہ کہ یہ فرمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فتویٰ نہیں تھا اور نہ ہی یہ عام حکم تھا۔لیکن دوسرے علماء نے اس کو ضعیف کہا ہے۔اس لئے کہ یہ صریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان غزوہ سے فراغت کے بعد فرمایا تھا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کی تائید فصل ثانی میں مروی عوف بن مالک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔اس لیے کہ وہ مطلق ہے اور اصل عدم تقیید ہے۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات غزوہ سے فراغت کے بعد کہی تھی لیکن اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماقبل بات کے اعادہ کے لئے دوبارہ کہی ہو اور جہاں تک تعلق حدیث عوف کا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلب قاتل کو دیا تھا سو وہ بھی قابل تقیید ہے اور فصل ثانی میں موجود حضرت انسؓ کی یہ حدیث۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے روز فرمایا تھا:''**من قتل كافرًا فله سلبه**''۔اس دن ابوطلحہ نے بیس آدمیوں کو قتل کیا اور ان کی سلب لی تھی اس بارے میں صریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان ابتداءً فرمایا۔لہٰذا اس حدیث کے پیش نظر اس مطلق کو مقید کیا جائے گا اور آنے والی تکرار بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ افتاء و اخبار نہیں تھا بلکہ پہلے سے مقررہ حکم کا اجراء تھا۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر امیر لشکر نے یہ اعلان نہیں کیا کہ جس نے کسی کو قتل کیا اس کا سلب اس کو ملے گا تو پھر یہ سلب جملہ مال غنیمت میں شامل ہوگا۔اس میں حصہ کے لحاظ سے قاتل اور اس کے علاوہ غازی برابر ہوں گے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلب قاتل کا حق ہے جب وہ اس کا اہل ہو کہ اس کیلئے سہم مقرر کیا جائے اور یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں۔

قوله:''فقلتُ:من يشهد لي؟......وسلبا عندي فأرضه مني'':

میں نے اپنے جی میں کہا یا بلند آواز سے کہا''**من يشهد لي؟**'' اور ایک روایت میں ہے''**فقمتُ فقلتُ**'' کہ میں کھڑا

ہوا اور یہ کہا۔ میرے لیے کون گواہی دے گا کہ میں نے مشرکین میں سے ایک آدمی کو قتل کیا ہے تا کہ اس کا سلب مجھے مل جائے۔

فارضہ: یہ باب افعال سے ہے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول ابوقتادہ کو اس سلب کے عوض کچھ اور دے دیجئے تا کہ یہ سلب مجھے مل جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ میرے اور اس کے درمیان صلح کرا کے ان کو راضی کرا دیجئے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں پر''منْ'' ابتدائیہ ہے اور عبارت یوں ہوگی:''ارض أبا قتادة لأجلي ومن جهتي'' کہ ابوقتادہ کو میری طرف سے راضی کر دیجئے اس طرح کہ وہ مجھے یہ سلب ھبہ کر دیں۔ یا یہ کہ اس کے بدلے میں مجھ سے کوئی چھوٹی سی چیز لے لیں۔

قوله: فقال ابو بكرؓ:''لاها الله اذًا لَا يعْمِدُ أسدٌ مِّن أسدِ الله'':

یہاں پر لفظ''اللہ'' حالت جری میں ہے۔ عبارت اس طرح ہے:''لا واللّٰهِ''

''اذًا'' تنوین کے ساتھ ہے۔ (بظاہر یہ تنوین عوض ہے جو جملہ کے عوض میں آئی ہے۔ أى اذا صدق ابو قتادة ''لا يعمد'' میم کے کسرہ اور دال کے رفعہ کے ساتھ ہے

''أسد'': ہمزہ کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے، کہا گیا ہے کہ دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے''اُسُدٌ'' کی جمع ہے اور یہ جملہ''مقسم عليه'' کیلئے تفسیر ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ کا نبی ایسا نہیں کریں گے کہ ابوقتادہ کا حق باطل کر کے اس کا سلب تجھے دے دیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ صحیحین وغیرہ میں محدثین کرام کی تمام روایات میں''اذًا'' ذال سے پہلے الف کے ساتھ ہے البتہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ اور اہل عربیت نے اس کا انکار کیا ہے۔ اھ۔

اور طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر نحویوں اور اھل عربیت کا بہت طویل مقالہ نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی تقدیرات کے تعارضات اور تناقضات کو بھی ذکر کیا ہے۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دلیل ہے کہ یہ لفظ یمین شمار ہوگا۔

ہمارے اصحاب کہتے ہیں اگر کسی نے ان الفاظ سے یمین کی نیت کی تو یمین شمار ہوگا اور اگر نیت نہیں کی تو یمین شمار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ باب اَیمان میں متعارف نہیں ہے۔

قوله:''يقاتل عن الله ورسوله فيعطيك سلبه:

یعنی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خوشنودی و رضامندی کیلئے اور ان کے دین کی نصرت کیلئے لڑتا ہو۔ وہ قاتل تمہیں اپنا سلب دے دے یا نبی ﷺ کو اس کا کل سلب یا اس کا بعض حصہ تمہیں بلاوجہ دے دیں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''عن الله''میں دو صورتیں ممکن ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ''عن'' صلہ ہو۔ ای یصدر قتاله عن رضا الله ورسوله ای بسببهما جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:﴿ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ﴾[الکهف۔ ۸۲]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ حال واقع ہو''ای یقاتل ذاتًا عن دین اللّٰہ أعداء اللّٰہ ناصرًا لأولیائه''۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی یہ کیا ہے **یقاتل لنصرة دین اللّٰہ و شریعت رسوله لتکون کلمة اللّٰہ هی العلیا** کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی شریعت کی نصرت کیلئے لڑتا ہے۔ تا کہ اس کا دین غالب و بلند ہو جائے۔ اس سے صدیق اکبر کی فضیلت ثابت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں ان مرتبہ اور مقام بھی ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں فتوی دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق بھی کر دی اور یہ حضرت قتادہؓ کی منقبت پر بھی دلالت کر رہا ہے۔ بایں طور کہ اس کو صدیق اکبرؓ نے ان کو''أسد من اسد اللّٰہ''قرار دیا۔

قوله:''فأعطانیه فابتعت به محزفًا فی بنی سلمة''

''ابتاع'': اس کا معنی ہے خریدنا

''مخرفًا'': میم کے فتحہ، خاء معجمہ کے سکون اور راء کے فتحہ کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔''بستان'' باغ کو کہتے ہیں۔

قوله:''**فانه لأول مال تأثلته فی الاسلام**'': اور ایک نسخہ میں''**وانّه**'' ہے۔''**تأثلته**'' کا معنی ہے''میں نے اس کو جمع کیا۔''

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔ لیکن کلام اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عموم اوقات اور اموال کو بھی شامل ہے یا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نفل پر ابھارنا تھا جو ان واقعات کے ساتھ خاص ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم شرعی کے طور پر مقرر تھا۔ اس لئے کہ اس قول: **لانه انما بعث لذلك** میں یہی اصل ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ تنفیل بھی تو حکم شرعی ہے اور دلالت اس پر ہے کہ یہ حکم مخصوص تھا اور صاحب ہدایہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے''حبیب بن ابی سلمۃ'' سے فرمایا تھا کہ''**لیس لك من سلب قتیلك الا ما طابت به نفس امامك**''۔

یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول:''**من قتل قتیلاً فله سلبه**'' کے بارے میں موجود دو احتمالات میں سے ایک کی دلیل ہے اور وہ احتمال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں نفل کا اعلان کیا تھا اس کو عام شرعی حکم قرار نہیں دیا۔ اگر یہ حدیث صحیح ہو تو یہی بات''حسن'' ہے۔

لیکن اس کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں اس طرح نقل کیا ہے کہ حبیب بن ابی سلمۃ کو یہ خبر ملی کہ صاحب قبرص آذربیجان کے راستے پر نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کے ساتھ زمرد، یاقوت اور موتی وغیرہ بھی ہیں۔ حبیب اس کی طرف نکلے اس کو قتل کر دیا اور جو کچھ اس کے ساتھ تھا۔ وہ سب کچھ لے آئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اس میں سے خمس نکالنے کا ارادہ کیا۔ حبیب بن ابی سلمہ نے کہا کہ''**لا تحرمنی رزقا رزقنیه اللّٰہ**'' کہ تم مجھے اس رزق سے محروم مت کرو جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے''سلب'' کو قاتل کا حق قرار دیا ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا''**معاذ اللّٰہ یا حبیب!**'' اے حبیب

! اللہ کی پناہ۔ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''انّما للمرأ ما طابت به نفس امامه'' یہ روایت عمرو بن واقد کی وجہ سے معلول ہے۔

اور اسحاق بن راھویہ نے اس حدیث کو اس سند: **ثنابقيه بن الوليد حدثني رجل عن مكحول عن جنادة بن أمية** سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ ہم ''**دانفاء**'' نامی جگہ پر لشکر میں تھے اور حبیب بن سلمۃ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں تک اور پھر کہا کہ حبیب بن ابی سلمۃ سلب لے کر آئے۔ جو کہ ریشم، یاقوت اور زمرد سے لدے پانچ خچروں پر مشتمل تھا۔ حبیب کا ارادہ تھا کہ وہ یہ سارا سلب خود رکھ لیں اور ابوعبیدہ اس کو بعض حصہ دینے کا کہہ رہے تھے حبیب نے ابوعبیدہ سے کہا کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے: ''**من قتل قتيلاً فله سلبه**'' اس پر حضرت ابوعبیدہ نے کہا کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ بات ہمیشہ کیلئے نہیں کہی تھی۔ حضرت معاذؓ نے یہ بات سنی تو وہ ابوعبیدہ کے پاس آئے۔ جبکہ وہ حضرت حبیب اس کے ساتھ مخاصمت کر رہے تھے حضرت معاذ نے کہا **ألا تتقى و تأ خذ ما طابت به نفس امامك فان مالك الا ماطابت به نفس امامك** یہ کہنے کے بعد حضرت معاذ نے ان دونوں کو نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی یہی حدیث سنائی۔ چنانچہ وہ اس پر متفق ہو گئے اور اس کو خمس دے دیا جس کو حبیب نے ہزار دینار کے بدلے بیچ دیا۔ اس روایت میں ایک مجہول راوی ہے۔ لیکن اس کا ضعف نقصان کا باعث نہیں۔ اس لئے کہ ہم بھی دو محتمل معانی میں سے ایک کو اختیار کر رہے ہیں حدیث کے الفاظ دونوں معانی کا احتمال رکھتے ہیں اور اس کی تائید بخاری اور مسلم میں موجود عبدالرحمٰن بن عوف کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ بدر کے دن ابوجہل کے قتل کے بارے میں ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے معاذ بن عمرو بن الجموح اور معاذ بن عفراء کی تلواریں دیکھنے کے بعد فرمایا تھا: ''**كلا كما قتله**'' تم دونوں نے قتل کیا ہے۔ لیکن پھر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سُلب کا فیصلہ اکیلے معاذ بن عمرو بن الجموح کے بارے میں کیا اگر قاتل سلب کا مستحق ہوتا۔ تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم دونوں کیلئے فرماتے۔ مگر یہ کہ بیہقی نے اس کو رفع کیا ہے اور کہا ہے کہ غنیمت بدر تو نص قرآنی کی وجہ سے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کیلئے خاص تھی آپ جس کو چاہتے دے دیتے آپؐ نے ان حضرات کیلئے بھی حصہ مقرر کیا تھا جو اس جنگ میں شریک نہیں تھے۔ یہ آیت غنیمت واقعہ بدر کے بعد نازل ہوئی اور اس کے بعد آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سلب کا فیصلہ قاتل کیلئے کر دیا اور پھر یہی حکم قرار پایا۔ اھ لیکن ایسا نہیں تھا۔ ورنہ پھر تو آپؐ یوں کہتے۔ ''**السلب للقاتل**''۔ تاکہ اس پر استدلال صحیح اور درست ہو جائے۔

اور بعض دفعہ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ ارشاد بدر کے موقع پر بھی فرمایا تھا جس کی تخریج ابن مردویہ نے جس طریق سے کی ہے اس میں کلبی بھی ہے:

''**عن ابى صالح عن ابن عباس وعن عطاء بن عجلان عن عكرمة عن ابن عباس رضى اللّٰه عنهم اجمعين قال: قال عليه الصّلٰوة والسّلام يوم بدر: منْ قتل قتيلا فله سلبه**''

اس روایت کے آخر میں ہے: **قال: فأمر هم رسول الله ﷺ أن يوز عو اتلك الغنائم بينهم**

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حکم دیا کہ ان غنائم کو ان کے درمیان تقسیم کر دو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اس طرح کہنا اس کو شریعت کا ابدی حکم ثابت نہیں کرتا اور اگرچہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بدر کے موقع پر فرمایا تھا: ''**من قتل قتيلاً فله كذا و كذا**''

لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''كذا و كذا'' کے الفاظ نہیں ارشاد فرمائے تھے بلکہ راوی نے آپ ؐ کے ان مخصوص کلمات کو کنایہ کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ اس وقت وہاں دراہم و دنانیر نہیں تھے۔ یہ حال اس کے غیر معتاد ہونے کو بتلا رہا ہے اور مال بھی اس کی قلت یا معدوم ہونے کی وجہ سے تقاضا نہیں کرتا۔ تو غالب گمان یہ ہے کہ یہ راوی کا کنایہ ہے۔ سلب سے اور شئی ماخوذ سے کنایہ ہے۔ اس لئے کہ عادۃً سلب سے وہی کچھ مراد ہوتا ہے۔ جو میدان جنگ میں قاتل کے پاس ہو اور ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ ضعیف طریق سے مطلقاً مروی ہے۔ تو اس حدیث کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر فرمائی تھی۔ اس طرح صحیح کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر سلب قاتل کو دے دیا اور ''ماخوذ'' آخذ کو دے دیا۔ جس کا قبول کرنا واجب ہوگا۔ اس سلسلہ میں انتہائی بات یہ ہے کہ یہ عام حکم نہیں تھا۔ احادیث ضعیفہ باہم اس بات کی تائید کر رہی ہیں کہ یعنی (من قتل قتيلاً فله سلبه) کا حکم عام و مستمر نہیں تھا علاوہ ازیں اور جب ضعیف روایات کے طرق متعدد ہو جائیں۔ تو وہ حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں غالب گمان ہے کہ یہ ان تمام غزوات میں یہ حکم بطور تنفیل تھا۔

اور اس کی وضاحت ابوداؤد کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ ''كذا و كذا'' کے بعد فرمایا کہ جوان آگے بڑھے اور بوڑھوں نے جھنڈوں کو لازم پکڑ لیا جب اللہ تعالیٰ نے فتح دی۔ تو بوڑھوں نے کہا کہ ہم تمہارے لیے ''بند'' تھے۔ اگر تم شکست کھاتے تو ہمارے پاس آتے۔ لہٰذا تم اس مال غنیمت کو نہیں لے جاسکتے۔ جوانوں نے اس کا انکار کیا اور انہوں نے یہ کہا جعله رسول الله ﷺ لنا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ہمارے لئے خاص کیا ہے۔ پس ''جعله'' واضح کر رہا ہے کہ ''كذا و كذا'' کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلب کو قاتلین کا حق قرار دیا ہے۔

اور ماخوذ آخذین کا حق قرار دیا۔ مسلم اور ابوداؤد کی حدیث جو کہ عوف بن مالک الأشجعی سے مروی ہے اس بات کی واضح دلیل ہے جو ہم نے اس بارے میں کہا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں غزوہ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ کی سرکردگی میں نکلا اور اہل یمن میں سے ایک مددگار بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ ہم روم کے لشکروں کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ اس لشکر میں ایک رومی تھا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اس پر سونے کی زین تھی اور اسلحہ تھا۔ وہ مسلمانوں پر حملہ کرنے لگا اور میرا یہ مددگار ساتھی ایک درخت کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کے پاس سے وہ رومی گذرا تو اس نے اس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں جس سے وہ رومی گر پڑا۔ وہ مددی اس پر چڑھا اور اس کو قتل کر دیا۔ وہ اس کا گھوڑا اور اسلحہ لے گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دے دی۔ تو اس کے پاس خالد بن الولید ؓ نے ایک آدمی بھیجا۔ اس سے اس رومی کا سلب لے لیا۔ عوف کہتے ہیں کہ میں خالد ؓ کے پاس آیا۔ تو میں نے کہا کہ اے خالد! کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلب کا فیصلہ قاتل کے حق میں کیا ہے۔ یعنی تو خالد نے کہا۔ کیوں نہیں معلوم۔ لیکن میں نے اس سلب کو زیادہ سمجھا، اس لئے لے لیا ہے۔ میں نے کہا کہ اے خالد یا تو تم اس کو واپس کر دو۔ ورنہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلاؤں گا۔ خالد ؓ نے اس کو دینے سے انکار کیا عوف کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اکھٹے ہو کر گئے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس یمنی کا قصہ سنایا اور خالد ؓ نے جو کچھ کیا تھا اس کے بارے میں بتلایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد ؓ سے کہا کہ اے خالد جو کچھ تم نے لیا ہے وہ اس کو واپس دے دو۔

عوف کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے خالد! دور ہو۔ کیا میں نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا قضیہ

ہے؟ تو میں نے ان کو قصہ سنایا۔ تو رسول اللہ ﷺ کو غصہ آیا اور فرمایا کہ اے خالد اس کو واپس نہ کرو۔ کیا تم میرے امراء اور خلفاء کو اس طرح چھوڑو گے کہ تمہارے لئے اچھی چیزیں ہوں اور ان کیلئے بری چیزیں ہوں۔ تو اس حدیث میں دو باتیں ہیں۔

① اس میں اس شخص کے قول کی تردید ہے کہ جس نے یہ کہا ہے کہ حنین کے موقع کے علاوہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ کسی اور موقع پر نہیں فرمائے ہیں۔ یعنی ''مَنْ قتل قتیلاً فله سلبه''۔ اس لئے کہ غزوہ موتہ تو حنین سے پہلے پیش آیا ہے اور اس بات پر حضرت عوف اور حضرت خالد متفق ہیں کہ آپ ؐ نے سلب کو قاتل کا حق اس سے پہلے قرار دیا ہے۔

② آپ ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم دینے کے بعد منع فرمایا۔ تو یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ کہنا تنفیل کے طور پر تھا اور اس کا حکم بھی تنفیل کے طور ہے۔ کیونکہ اس کو امام کی رضامندی پر موقوف کر دیا۔ اگر یہ شریعت کا لازمی حکم ہوتا تو آپ اس کو مستحق سے نہ روکتے خطابیؒ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے خالد رضی اللہ عنہ کو منع کیا کہ ''عوف'' کو اس کا سلب نہ دو۔ عوف کو زجر کیا تا کہ لوگ امیر لشکر پر جرأت نہ کریں اور خالدؓ مجتہد تھے آپؐ نے ان کے حکم کو جاری کر دیا۔

اور یہ بات کہ ''نفع کثیر کیلئے ضرر یسیر کا تحمل کیا جائے گا''۔ غلط ہے اور یہ اس لئے کہ سلب اس کو نہیں ملتا جو جرأت کریں اور وہ تو عوف ہے۔ بلکہ وہ تو اس مددی کا حق تھا۔ تو ایک آدمی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور آپ ﷺ کا اس پر غصہ ہونا عوف پر زیادہ گراں گزرا۔ بنسبت اسکے کہ وہ سلب کو منع کرتے اور یہ بات زیادہ زجر کا باعث بنی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آپؐ نے ابتداءً اس کو پسند کیا کہ عوف کی شفاعت کو مددی کے حق میں قبول کریں۔ تنفیل کے بارے میں۔ لیکن جب اس پر غصہ آیا تو اس کی سفارش کو رد کر دیا۔ بایں طور کہ سلب دینے سے منع کر دیا۔ یہ منع اس وجہ سے نہیں تھا کہ آپ ﷺ کو غصہ آیا تھا یا سیاسۃً منع کر دیا۔ اس لئے کہ غصہ کی وجہ سے حقدار کے حق کو اس سے روکا نہیں جا سکتا اور یہ اس بات پر بھی دال ہے کہ یہ کوئی لازمی شرعی حکم نہیں تھا۔

مالِ غنیمت میں مجاہد اور گھوڑے کا حصہ

۳۹۸۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَسْهَمَ لِلرَّجُلِ وَلِفَرَسِهٖ ثَلَاثَةَ اَسْهُمٍ سَهْمًا لَهٗ وَسَهْمَيْنِ لِفَرَسِهٖ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٦٧' کتاب الجهاد' باب سهام الفرس' الحدیث رقم ٢٨٦٣ و مسلم فی ٣ / ١٣١٢' الحدیث رقم (٥٧ ـ ١٧٦٢) و أبو داود فی السنن ٣ / ١٧٢٠' الحدیث رقم ٢٧٣٣' والترمذی فی ٤ / ١٠٥' الحدیث رقم ١٥٥٤' وابن ماجه ٢ / ٩٥٢' الحدیث رقم ٢٨٥٤' والدارمی فی ٢ / ٢٩٧' الحدیث رقم ٢٤٧٢' وأحمد فی المسند ٢ / ٤١

ترجمه: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مال غنیمت میں سے) ایک شخص اور اس کے گھوڑے کے لئے تین حصے مقرر کئے یعنی ایک حصہ تو خود اس کا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''قوله: للرجل ولفرسه ثلاثة أسهم: سهمًا له وسهمين لفرسه'':

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''له'' میں لام تملیک کیلئے ہے۔ ای لأجل فرسه اور ''لفرسه'' میں ''لام'' سبب کیلئے ہے۔ یعنی اس کے گھوڑے کی وجہ سے۔

شرح السنہ میں لکھتے ہیں: لفنائه في الحرب اذمؤنة فرسه اذا كان معلوما تضاعف على مؤنه صاحبه۔
ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اکثر کا قول یہی ہے۔ گھوڑ سوار کو تین حصے ملیں گے اور پیدل کو ایک حصہ ملے گا۔
اور بعض کا قول ہے کہ فارس کو دو سہم ملیں گے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ ان کا استدلال احادیث حسان سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فارس کو دو سہام دیئے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے متیقن کو لے لیا اور مشکوک کو ترک کر دیا۔
تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔ احناف اس کے خلاف نہیں کرتے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر عمل کو اپنی رائے سے ترک نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ کا تعارض ہے کہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''للفارس سهمان وللراجل سهم'' کہ سوار کو دو سہام ملیں گے اور پیادہ پا کو ایک سہم ملے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع بن حارث کی حدیث کو بھی لیا ہے۔ ۃ
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں اختلاف ہے۔ ابن عباس، مجاہد، حسن بصری، ابن سیرین، عمر بن عبدالعزیز، امام مالک، اوزاعی، ثوری، شافعی، ابو یوسف، محمد، احمد، اسحاق، ابوعبید اور ابن جریر وغیرہ فرماتے ہیں کہ فارس کو تین سہام ملیں گے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فارس کو صرف دو سہام ملیں گے۔ ایک سہم اس کا اور ایک اس کے گھوڑے کا اور اس قول کو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا ہے۔ مگر وہی جو حضرت علی اور ابو یوسف سے روایت ہے۔
جمہور کا استدلال اس حدیث باب سے ہے اور یہ صریح ہے اور یہ حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفل کو بایں طور تقسیم کیا تھا کہ ''للفرس سهمين وللرجل سهمًا'' تو اس طرح اکثر روایات میں آیا ہے اور بعض میں اس طرح ہے: ''للفرس سهمين وللراجل سهمًا''۔ لفظ ''راجل'' الف کے ساتھ ہے اور بعض میں اس طرح ہے: للفارس سهمين'' یہاں پر نفل سے مراد لغوی غنیمت ہے۔ اس لئے کہ نفل لغت میں زائد اور عطیہ کو کہتے ہیں اور غنیمت بھی اللہ کی طرف سے ہے اور جس نے ''الف راجل'' روایت کیا ہے سو اس کا بھی احتمال ہے۔ لہٰذا اس کا حمل پہلے معنی پر متعین ہے تاکہ دونوں روایات جمع ہو جائیں۔
طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ جب اس بارے میں روایات میں تعارض آ گیا۔ یعنی ''فارس وفرس'' اور ''راجل ورجل'' تو اب چاہیے یہ کہ دونوں روایتوں میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دی جائے۔ اس وجہ سے کہ اس کے راوی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہیں اور اس وجہ سے کہ حدیثِ ثانی میں تاویل ممکن ہے۔ بایں طور کہ اس میں ''سهم'' سے مراد اجمالی حصہ ہو۔ کہ ایک اس کا اور ایک اس کے گھوڑے کا۔ تو یہ روایت اخرٰی کا بیان ہوگا اور حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کی وضاحت اگلی حدیث کر رہی ہے۔ ابن الاکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں أعطاني سهمين کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سہام دیئے۔ اس لئے ''سهم للفارس وسهم للراجل'' سے مساوات مراد نہیں ہے۔
علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور زفر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں فارس اور پیادہ پا کیلئے ایک ایک سہم ہے اور صاحبین کے نزدیک اور یہی قول اکثر اہل علم اور امام شافعی واحمد، اور مالک کا ہے کہ فارس کیلئے تین سہم ہیں اور راجل کیلئے ایک سہم ہے۔ جمہور کا استدلال حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ہے۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرس کیلئے دو سہام اور فارس کیلئے ایک سہم مقرر کیا ہے۔ یہ الفاظ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں اور اس حدیث کی تخریج اصحاب صحاح ستہ میں نسائی کے علاوہ سب نے کی ہے اور مسلم

شریف میں اس طرح ہے: ''قسّم النّفل للفرس سهمين وللراجل سهمًا'' آپ ﷺ نے نفل کو اس طرح تقسیم کیا کہ فرس کیلئے دو سہام اور راجل کے لئے ایک سہم دیا اور ایک روایت لفظ ''نفل'' کے سقوط کے ساتھ ہے۔

اور ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ''أسهم للرجل ولفرسه ثلاثة أسهمٍ سهم له وسهمان لفرسه''۔

ان تمام الفاظ سے ان لوگوں کے قول کا بطلان ہوتا ہے جنہوں نے ''راجل'' سے مراد ''رجالة'' لیا ہے اور ''خیل'' سے مراد ''فرسان'' لیا ہے۔ بلکہ بعض روایات میں اس طرح ہے۔

''قسم خيبر علٰى ثمانية عشر سهمًا۔ وكان الرجالة ألفًا واربعمائة والخيل ما ئتين۔

صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فارس کو بھی دو سہام دیئے اور راجل کو بھی دو سہام دیئے۔ یہ حدیث غریب ہے۔

اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں ابن عباس سے یوں نقل کیا ہے: قال: أسهم رسول الله ﷺ للفارس ثلاثة اسهم وللاراجل سهما لیکن اس بارے میں کئی احادیث ہیں ان میں سے ایک حدیث ابوداؤد میں مجمع کے طریق سے ہے اور ایک روایت معجم طبرانی میں مقداد بن عمرو کے طریق سے نقل ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ بدر کے روز ایک گھوڑے پر سوار تھے۔ جس کو ''سبحة'' کہتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو دو سہام دیئے ایک ان کے گھوڑے کیلئے اور ایک سوار کیلئے اور اسی طرح مسند واقدی میں ہے۔

واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''المغازی'' میں جعفر بن خارجہ سے نقل کیا ہے کہتے ہیں کہ زبیر بن العوام نے فرمایا کہ میں غزوہ بنو قریظہ میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر حاضر ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے میرے لئے ایک سہم مقرر کیا۔

ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں عروۃ عن عائشہؓ نقل کیا ہے' فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے بنوالمصطلق کے قیدیوں کو پکڑ لیا تو ان سے خمس نکالا۔ پھر اس کو مسلمانوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ فارس کو دو سہام اور راجل کو ایک سہم دیا اور ان میں سے ایک حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہے جس سے صاحب ہدایہ نے معارضہ کیا ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے۔

ابو اسامۃ اور ابن ہند کہتے ہیں کہ ہمیں عبداللہ نے نافع سے اور نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فارس کو دو سہام دیئے اور راجل کو ایک سہم دیا۔ اھ اور اسی کے طریق سے دارقطنی نے بھی روایت کیا ہے اور قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے شک کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یعنی ''فارس اور فرس'' میں شک کیا ہے کہ ان دونوں میں سے کیا الفاظ تھے اور ایک طریق میں لفظ ''فارس'' کو جزم کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کو دارقطنی نے اپنی کتاب ''الموتلف والمختلف'' میں روایت کیا ہے اور جب ابن عمرؓ کی حدیث میں تعارض ثابت ہو گیا بلکہ آنحضرت ﷺ کے فعل میں بھی تعارض ثابت ہو گیا ابن عمر کے روایتوں کو دیکھتے ہوئے تو ترجیح نفی بالاٴ صل کو حاصل ہوگی اور وہ عدم وجوب ہے۔ اس معنی میں کہ کروفر ایک ہے اور جنس ہے۔ تو دو فارس کیلئے ہو گئے اور ''راجل'' کیلئے ان میں سے ایک ہوگا اور (فارس) اس کو اس کے مال کا دوگنا ملے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ معارضہ تو فرع مساوات کے ترک کو لازم کر رہا ہے اور بخاری میں حدیث ابن عمرؓ ہے اصح اس کو ترجیح ہونی چاہیے۔ جواب یہ ہے کہ ہم نے پہلے کئی مرتبہ ذکر کیا ہے کہ ''بخاری میں حدیث کا ہونا دوسری کتابوں کے مقابلے میں اصح ہے اس مفروضہ کے ساتھ کہ اس کے

رجال بھی رجال الصحیح ہیں۔ یا اس میں وہ رجال ہیں جن سے بخاری نے نقل کیا ہے یہ تحکم محض ہے۔ ہم اس کے قائل نہیں ہیں'' اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ جمع بین الروایتین اولیٰ ہوا کرتا ہے۔ بنسبت اس کے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو باطل کر دیا جائے اور یہ یوں ممکن ہے کہ روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو تنفیل پر حمل کیا جائے اور اسی طرح حدیث احمد رحمہ اللہ کو بھی کہ جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک سہم جبکہ انکے گھوڑے کو دو سہام دیئے تھے اور اسی طرح حدیث جابر ہے کہتے ''**شهدت مع رسول الله غزاةً، فأعطى الفارس منّا ثلاثة اسهم واعطى الراجل سهمًا**'' بلکہ یہ حدیث اس بارے میں ظاہر ہے کہ یہ حکم کوئی امر مستمر نہیں تھا۔ ورنہ یوں فرماتے ''**كان عليه الصلوٰة والسّلا ونحوه**'' اس طرح لفظ ''**غزاة**'' ہے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی غزوات میں شرکت کی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس فعل کو ''**غزاة**'' کے ساتھ خاص کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ غزوہ میں ایسا نہیں ہوتا تھا اور حدیث سہل بن ابی حثمة میں ہے کہ انہوں نے غزوہ حنین میں شرکت کی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فرس کیلئے دو اور ان کیلئے ایک سہم مقرر کیا تھا۔ یہ اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ یہ کوئی امر مستمر تھا۔ جہاں تک بات ہے ابن ابی کبشہ کی اس روایت: ''**قال النبی ﷺ: انّي جعلت للفرس سهمين وللفارس سهمًا فمن نقصهما نقصه الله**'' کی تو یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ محمد بن عمران القسی کو اکثر لوگوں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اھ اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو یہ تنفیل پر محمول ہے۔ جیسا کہ اس پر آپ کا یہ قول دلالت کر رہا ہے: ''**انی جعلت على ما هو الظاهر والله آعلم بالسرائر والضمائر**''۔

کیا مالِ غنیمت میں عورت اور غلام کا حصہ ہے؟

۳۹۸۸: وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ هُرْمُزَ قَالَ كَتَبَ نَجْدَةُ الْحَرُوْرِيُّ اِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ يَسْأَلُهُ عَنِ الْعَبْدِ وَالْمَرْاَةِ يَحْضُرَانِ الْغَنَمَ هَلْ يُقْسَمُ لَهُمَا فَقَالَ لِيَزِيْدَ اُكْتُبْ اِلَيْهِ اَنَّهُ لَيْسَ لَهُمَا سَهْمٌ اِلَّا اَنْ يُحْذَيَا وَفِيْ رِوَايَةٍ كَتَبَ اِلَيْهِ ابْنُ عَبَّاسٍ اَنَّكَ كَتَبْتَ تَسْأَلُنِيْ هَلْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَغْزُوْا بِالنِّسَاءِ وَهَلْ كَانَ يَضْرِبُ لَهُنَّ بِسَهْمٍ فَقَدْ كَانَ يَغْزُوْا بِهِنَّ يُدَاوِيْنَ الْمَرْضٰى وَيُحْذَيْنَ مِنَ الْغَنِيْمَةِ وَاَمَّا السَّهْمُ فَلَمْ يُضْرَبْ لَهُنَّ بِسَهْمٍ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۳ / ۱۴۴۵ كتاب الجهاد، باب النساء الغازيات، الحديث رقم (۱۳۹ ـ ۱۸۱۲) و أبو داود فى ۳ / ۱۶۹ الحديث رقم ۲۷۲۷

ترجمه: ''اور حضرت یزید بن ہرمز کہتے ہیں کہ نجدہ حروری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے یہ مسئلہ معلوم کرنا چاہا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت اگر غلام اور عورت موجود ہوں تو کیا ان دونوں کے لئے (مالِ غنیمت میں سے) حصہ نکالا جائے گا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یزید سے (یعنی مجھ سے) فرمایا کہ تم (میری طرف سے) نجدہ کو یہ جواب لکھ دو کہ ان دونوں کا حصہ مقرر نہیں ہے البتہ (تقسیم کے وقت) ان کو کچھ دے دیا جائے'' اور ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس (نجدہ) کو یہ جواب لکھا

کہ ''تم نے خط لکھ کر مجھ سے یہ دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ جہاد میں عورتوں کو ساتھ لے جایا کرتے تھے؟ کیا ان کا حصہ (مالِ غنیمت میں) (مقرر کیا جاتا تھا؟ ہاں آپ ﷺ عورتوں کو جہاد میں لے جایا کرتے تھے۔ جو بیماروں کی دوا دارو کرتی تھیں (اور زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں) اور ان کو مال غنیمت میں سے یوں ہی کچھ دے دیا جاتا تھا جہاں تک (مالِ غنیمت میں) حصہ کا تعلق ہے تو ان کے لئے حصہ مقرر نہیں کیا گیا تھا''۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

یزید بن ہرمز۔ یہ یزید ہیں۔ ہرمز کے بیٹے ہیں۔ ہمدانی مدینی اور بنولیث کے آزاد کردہ ہیں۔ انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عمرو بن دینار اور زہری نے روایت کی۔ ''ھرمز'' میں ھاء اور میم دونوں مضموم ہیں۔ یہ غیر منصرف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ منصرف ہے۔

تشریح: قوله: كتب نجدة۔۔۔الأن يحذيا: ''نجدة'' ''نجدة'' نون کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ خوارج کا سردار تھا اور ''القاموس'' میں ہے کہ نجدۃ بن عامر الحنفی خارجی تھا۔

''الحروری'': یہ کوفہ کے پاس تھا۔ اس طرح اس کی طرف منسوب ہیں اس لئے کہ جب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا تو ان کا اجتماع یہیں ہوا تھا اور ''القاموس'' میں ہے کہ ''حروراء'' بروزن ''جلولاء'' ہے اور بعض دفعہ اس کو قصر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ یہ کوفہ کے پاس ایک گاؤں ہے۔ نسبت کے وقت مرد کے لیے ''حروری'' (عورت کے لئے) ''حرورية'' کہا جاتا ہے مراد نجدہ کے ساتھی ہیں۔

''اكتب الى انه'' ''انه'': یہ ضمیر ضمیر شان ہے۔ ''ليس لهما سهمٌ''

اور ایک روایت میں اس طرح ہے: ''ليس لهما شئٌ من الغنيمة الا أن يحذيا''۔

''يحذيا'' بصیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ یعنی ان کو تھوڑا سا دیا جائے۔ بعض نے کہا ہے یہ قلیل اتنا ہو کہ نصف سہم سے بھی کم ہو اور بعض نے کہا کہ سہم سے کم ہو اور یہی قول صحیح ہے۔ ''النھایۃ'' میں لکھتے ہیں: ایک حدیث میں ہے: ان لم يحذك من عطره علتك من ريحه۔ أى لم يعطك۔

قوله: ''وفى رواية كتب اليه ......'' ابوداؤد کی ایک روایت ہے۔ جیسا کہ اس کی تصریح علامہ ابن ہمام نے کی ہے۔

''انّك كتبت الى تسألنى هل كان رسول الله ﷺ يغزو بالنساء؟ آپ ان کو غزوات میں لے جاتے تھے۔

''يداوين'' یعنی وہ عورتیں ان زخمیوں کا علاج کیا کرتی تھیں اور غازیوں کو پانی پلاتی تھیں اور ان کے دوسرے امور سر انجام دیتی تھیں جیسا کہ اس سے پہلے ابن ہمام کے کلام میں گذرا ہے۔

''ويحذين من الغنيمة'': یعنی انکو غنیمت میں سے بھی حصہ دیتے تھے۔ یہ درحقیقت ہمارے مسلک کی تائید ہے۔

قوله: ''واما السهم فلم يضرب لهن بسهمٍ'':

البتہ جہاں تک سہم کی بات ہے تو آپ ﷺ نے ان کیلئے کوئی تقسیم نہیں کیا اور نہ ہی ان کیلئے کوئی حصہ متعین کیا ہے۔ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے فاما أن يضرب لهن بسهم فلا وقد كان يرضخ لهن کہ ان کیلئے کوئی سہم مقرر تھا

سوا ایسا نہیں تھا البتہ غنیمت میں سے کچھ حصہ (غیر مقررہ) دیا جاتا تھا۔

اس سے اس بات کا وہم ہوتا ہے کہ ابوداؤد کی روایت کو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ (اس لئے کہ یہ روایت دراصل ابوداؤد کی ہے)۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ اکثر اہل علم کا عمل اس پر ہے کہ بچوں عورتوں اور غلاموں کیلئے کوئی سہم نہیں ہوتا تھا۔ البتہ غنیمت میں سے کچھ تھوڑا بہت دیا جاتا تھا۔ اھ ''رضخ'' کا معنیٰ ''اعطاء القلیل'' کیا گیا ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غلام، عورت، بچے اور ذمی کو سہم نہیں دیا جاتا تھا۔ البتہ ان کو ''رضخ'' دیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ ''اعطاء'' میں رضخ کا اطلاق قلیل پر ہوتا ہے جبکہ کثیر پر سہم کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ تو رضخ اتنے مال کو کہتے ہیں جو کہ سہم کو نہ پہنچے بلکہ اس سے کم ہو۔

جتنا امام مناسب سمجھے۔ چاہے غلام آقا کی اجازت سے لڑا ہو یا اس کی اجازت کے بغیر اور ابوداؤد اور ترمذی نے ابولحم کے آزاد کردہ غلام عمیر سے روایت نقل کی ہے کہ میں اپنے سادات کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک ہوا ''**فأخبر انی مملوك فأمرلی بشیٔ**''۔ ان کو اس بات کی خبر دی گئی کہ میں تو غلام ہوں۔ تو انہوں نے میرے لئے (مال غنیمت) سے کچھ دینے کا حکم صادر فرمایا۔

ابوداؤد اور نسائی نے یہ روایت نقل کی ہے:

حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعِيدٍ وَغَيْرُهُ قَالَا أَخْبَرَنَا زَيْدُ بْنُ الْحُبَابِ قَالَ حَدَّثَنَا رَافِعُ بْنُ سَلَمَةَ بْنِ زِيَادٍ حَدَّثَنِي حَشْرَجُ بْنُ زِيَادٍ عَنْ جَدَّتِهِ أُمِّ أَبِيهِ أَنَّهَا خَرَجَتْ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ خَيْبَرَ سَادِسَ سِتِّ نِسْوَةٍ فَبَلَغَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَبَعَثَ إِلَيْنَا فَجِئْنَا فَرَأَيْنَا فِيهِ الْغَضَبَ فَقَالَ مَعَ مَنْ خَرَجْتُنَّ وَبِإِذْنِ مَنْ خَرَجْتُنَّ فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ خَرَجْنَا نَغْزِلُ الشَّعَرَ وَنُعِينُ بِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَعَنَا دَوَاءُ الْجَرْحَى وَنُنَاوِلُ السِّهَامَ وَنَسْقِي السَّوِيقَ فَقَالَ قُمْنَ حَتَّى إِذَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ خَيْبَرَ أَسْهَمَ لَنَا كَمَا أَسْهَمَ لِلرِّجَالِ قَالَ قُلْتُ لَهَا يَا جَدَّةُ وَمَا كَانَ ذَلِكَ قَالَتْ تَمْرًا۔

''ابراہیم بن سعید' زید بن حباب' رافع بن سلمہ بن زیاد' حضرت حشرج بن زیاد نے اپنی دادی اشجعیہ سے روایت کیا ہے کہ غزوۂ خیبر میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ نکلیں یہ کُل ملا کر چھ خواتین تھیں۔ اُمّ زیاد کہتی ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کو خبر ملی تو آپؐ نے ہم لوگوں کو بلا بھیجا ہم لوگ گئے آپؐ غصہ میں تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم کس کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئیں اور کس کی اجازت سے آئیں؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جہاد میں آئی ہیں اور بالوں کو بٹتی ہیں اور اس کے ذریعہ راہِ الٰہی میں امداد پہنچاتی ہیں اور ہمارے ساتھ زخمیوں کی دوا ہے اور ہم مجاہدین کو تیر (پکڑا) دیتی ہیں اور ان لوگوں کو ستو گھول کر پیش کرتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ یہاں تک کہ خیبر (کا قلعہ) فتح ہوا تو آپؐ نے ہم لوگوں کو بھی اسی طرح حصہ عنایت فرمایا کہ جس طرح مردوں کو عنایت فرمایا حشرج بن زیاد نے کہا کہ ان سے میں نے معلوم کیا (یعنی اپنی دادی سے) وہ کیا حصہ تھا؟ انہوں نے کہا کہ وہ کھجور تھی۔''

(ابوداؤد ج ۲' حدیث: ۲۷۲۹ ص: ۴۳۱' رحمانیہ)

حشوج بن زیاد کی دادی سے روایت ہے کہ وہ غزوۂ خیبر میں چھ عورتوں کے ساتھ نکلیں یہ بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو انہوں نے ہمارے پاس پیغام بھیجا آئیں تو ہم نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر غصہ کے اثرات کو دیکھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کس کے ساتھ اور کس کی اجازت سے نکلی ہو؟ ہم نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ہم نکلی ہیں تا کہ ہم بال کاتیں گی اور اللہ کے راستے میں مدد کریں اور ہمارے پاس زخمیوں کے علاج کیلئے دوا بھی ہے اور ہم تیر پکڑائیں گی اور ان کو ستو پلائیں گی آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح خیبر عطا فرمائی تو ہمارے لئے سہم مقرر کیا جیسا کہ مردوں کیلئے سہم مقرر کیا جاتا تھا۔

اور یہی امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند ضعیف ہے اور قابل استدلال نہیں ہے۔ ان کے علاوہ نے کہا ہے کہ یہ روایت رافع اور حسرج کی جہالت کی وجہ سے قابل حجت نہیں ہے، ضعیف ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تاویل کی ہے کہ ہوسکتا ہے آپ ﷺ نے اہل غنیمت کو خوش کرنے کیلئے ایسا کیا ہو۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دوسرے فرماتے ہیں کہ اس میں احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں کو اس خمس میں سے دیا ہو جو کہ آپ ﷺ کا خالص حق تھا اس میں کوئی اشکال نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تشبیہ اصل عطاء میں ہو اور روایہ کی مراد اس سہم سے وہ حصہ ہو ہمارے نزدیک ''رضخ'' غنیمت میں سے جو خمس کے اخراج سے پہلے نکالا جاتا ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد کا قول بھی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی ہے کہ ''رضخ'' خمس کے چوتھائی میں سے لیا جاتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول کے مطابق یہ خمس کے پانچواں حصہ میں سے لیا جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ خمس میں سے لیا جائے گا۔ غلام، بچے اور ذمی کو ''رضخ'' اس وقت دیا جائے گا جب یہ لڑائی میں شریک ہوں اور لڑائی کریں کیونکہ یہ لوگ لڑائی پر قادر ہیں۔ اگر یہ نہ لڑیں تو ان کو حصہ غنیمت میں سے نہیں دیا جائے گا۔ البتہ عورت کو قتال اور خدمت کی وجہ سے ''رضخ'' دیا جاتا ہے۔ اگر وہ خدمت کیلئے شریک ہوتی تب بھی ان کو حصہ دیا جائے گا۔ اگر چہ قتال نہ کیا ہو۔ کیونکہ حقیقت میں وہ ''قتال'' سے عاجز ہیں۔ ان کی یہ خدمت ہی قتال کے قائم مقام ہوگئی۔

سوار اور پیادہ پا کے حصوں کا بیان

۳۹۸۹: وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بِظَهْرِهٖ مَعَ رَبَاحٍ غُلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَاَنَا مَعَهُ فَلَمَّا اَصْبَحْنَا اِذَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ الْفَزَارِيُّ قَدْ اَغَارَ عَلٰى ظَهْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَقُمْتُ عَلٰى اَكَمَةٍ فَاسْتَقْبَلْتُ الْمَدِيْنَةَ فَنَادَيْتُ ثَلَاثًا يَا صَبَاحَاهُ ثُمَّ خَرَجْتُ فِيْ اٰثَارِ الْقَوْمِ اَرْمِيْهِمْ بِالنَّبْلِ وَاَرْتَجِزُ اَقُوْلُ اَنَا ابْنُ الْاَكْوَعِ وَالْيَوْمُ يَوْمُ الرُّضَّعِ فَمَازِلْتُ اَرْمِيْهِمْ وَاَعْقِرُبِهِمْ حَتّٰى مَاخَلَقَ اللّٰهُ مِنْ بَعِيْرٍ مِنْ ظَهْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِلَّاخَلَّفْتُهُ وَرَاءَ ظَهْرِيْ ثُمَّ اتَّبَعْتُهُمْ اَرْمِيْهِمْ حَتّٰى اَلْقَوْا اَكْثَرَمِنْ ثَلَاثِيْنَ بُرْدَةً وَثَلَاثِيْنَ رُمْحًا

يَسْتَخِفُّوْنَ وَلَايَطْرَحُوْنَ شَيْئًا اِلَّاجَعَلْتُ عَلَيْهِ آرَامًا مِنَ الْحِجَارَةِ يَعْرِفُهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَاَصْحَابُهُ حَتّٰى رَاَيْتُ فَوَارِسَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَلَحِقَ اَبُوْقَتَادَةَ فَارِسُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ فَقَتَلَهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خَيْرُ فُرْسَانِنَا الْيَوْمَ اَبُوْقَتَادَةَ وَخَيْرُ رُجَالَتِنَا سَلَمَةُ قَالَ ثُمَّ اَعْطَانِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَهْمَيْنِ سَهْمَ الفَارِسِ وَسَهْمَ الرَّاجِلِ فَجَمَعَهُمَالِىْ جَمِيْعًا ثُمَّ اَرْدَفَنِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَرَاءَهُ عَلَى الْعَضْبَاءِ رَاجِعِيْنَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۴۳۳ کتاب الجهاد، باب غزوه ذی قرد، الحدیث رقم (۱۳۲ ـ ۱۸۰۷) وأحمد فی المسند ٤ / ٥٢

ترجمہ: ''اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (مسلمانوں اور کفار قریش کے درمیان معاہدہ ہو جانے کے بعد حدیبیہ سے واپسی کے دوران میں) رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری کے اونٹ رباح کے ساتھ، جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے آگے روانہ کر دیئے میں بھی رباح کے ساتھ ہولیا (ہم دونوں نے رات میں ایک جگہ قیام کیا اور) جب صبح ہوئی تو ہمیں معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن فرازی نے (جو مسلمانوں کا ایک مشہور دشمن اور کافر تھا) رسول اللہ ﷺ کے اونٹوں پر چھاپہ مارا اور ان کو ہنکا کر لے گیا، میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور مدینہ کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ یا صباحاہ (یعنی خبردار! دشمن آ پہنچا) کہہ کر آواز بلند کی اور تیر اندازی کرتا ہوا اس قوم (یعنی عبدالرحمٰن اور اس کے ساتھیوں) کے نشانات قدم پر (یعنی ان کے پیچھے) چل پڑا اس وقت میری زبان پر (بلند آواز میں) رجز یعنی رزمیہ شعر تھے میں نے کہا انا ابن الاکوع والیوم یوم الرضع یعنی (اے دین کے دشمنو! کان کھول کر سن لو میں اکوع کا بیٹا ہوں آج کا دن برے لوگوں (یعنی دشمنانِ دین) کے ہلاک ہونے کا دن ہے! میں اسی طرح برابر تیر مارتا اور ان کی سواریوں کی کونچیں کاٹتا (آگے بڑھتا) رہا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے اونٹوں میں سے اللہ کا پیدا کیا ہوا ایسا کوئی اونٹ باقی نہیں بچا جس کو میں نے اپنے پیچھے نہ چھوڑ دیا ہو، میں تیر اندازی کرتا ہوا ان کا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا یہاں تک کہ انہوں نے ہلکا ہو جانے کی غرض سے اپنی تیس چادریں اور تیس کپڑے پھینک دیئے (یعنی وہ بھاگتے ہوئے اپنی چادریں اور اپنے کپڑے بھی پھینکتے جا رہے تھے تاکہ جسم ہلکا ہو جانے کی وجہ سے بھاگنے میں آسانی ہو) اور وہ جس چیز کو بھی پھینکتے میں اس پر نشان کے طور پر پتھر رکھ دیتا تھا تاکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ (اگر پیچھے سے آئیں تو) اس کو پہچان لیں یہاں تک کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سواروں کو (آتے) دیکھا اور پھر (یہ دیکھا کہ) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے (جنہیں رسول اللہ ﷺ کا سوار کہا جاتا تھا) عبدالرحمٰن کو جا لیا (جس نے آپ ﷺ کے اونٹوں کو ہنکا لے جانا چاہا تھا) اور اس کو قتل کر دیا۔ پھر (اس ہنگامہ کے ختم ہونے کے بعد) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''آج ہمارے سواروں میں سب سے بہترین سوار ابوقتادہ ہیں اور پیادوں میں سب سے بہترین پیادہ سلمہ بن اکوع ہیں''۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (جب ان کافروں

سے ہاتھ لگے ہوئے مال کو ہمارے درمیان تقسیم فرمایا تو) مجھ کو دو حصے دیئے' ایک حصہ گھڑسوار کا (کہ وہ بحسب اختلاف مسلک دو حصے ہیں یا تین حصے) اور ایک حصہ پیادہ کا'۔ آپ ﷺ نے دونوں حصے اکٹھے کر کے مجھے عطا فرمائے اور پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی اونٹنی عضباء پر مجھے اپنے پیچھے بٹھالیا اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله:" بعث رسول الله بظهره مع رباح غلام رسول الله ﷺ ":

ظهر: ''النہایہ'' میں مذکور ہے کہ ''ظہر'' اس اونٹ کو کہتے ہیں کہ جس پر سامان لادا جاتا ہو۔ اور اس پر سواری کی جاتی ہو۔ کہا جاتا ہے: عند فلاں ظهر ۔ أی ابل۔

''رباح'': یہ راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ نے ان کا نام ذکر نہیں کیا ہے۔

قوله:''فلما أصبحنا اذا عبدالرحمٰن الفزاری قد أغار علٰی ظهر رسول الله ﷺ'':

''اذا'' یہاں پر مفاجات کیلئے ہے

''فزاری'': فاء کے فتحہ اور زاء کے ساتھ ہے۔ علاوہ ازیں قاف مضموم کے ساتھ بھی مروی ہے

اکمة '': پہلے تینوں حروف مفتوح ہیں۔

''فاستقبلت المدینة فنادیتُ ثلاثًا یا صباحاه'': یہ کلمہ مدد طلب کرنے والا کہتا ہے۔ لیکن اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ غارت گری کیلئے آواز لگاتے ہیں۔ اس لئے کہ اہل عرب حملہ اکثر صبح کے وقت کیا کرتے تھے۔ تو مستغیث یہ کہتا تھا قد غشینا العدو اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کلمہ صبح کے وقت مقاتل کہا کرتے تھے کہ صبح کا وقت آگیا ہے اس لئے تم قتال کیلئے تیار رہو۔

قوله:''ثم خرجت فی آثار القوم أرمیهم بالنّبل...... والیوم یوم الرضع''۔

''ارتجر'': ''القاموس'' میں لکھا ہے کہ ''رجز'' شعر کی ایک قسم ہے۔ جس کا وزن چھ بار ''مستفعلن'' ہے۔ اس کو یہ نام اس کے اجزاء کے تقارب اور قلت حروف کی وجہ سے دیا گیا ہے البتہ امام خلیل نے اس کے شعر ہونے کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ اشعار کے انصاف و اثلاث ہیں اور اسی سے ''ارجوزہ'' ہے جس کے معنی ہیں بحر رجز کا قصیدہ رجز وارتجز ورجز به و رجزه أنشد أرجوزة ''رجز پڑھنا''

''اقول'': ''ارتجز'' سے بدل ہے۔ یا اس سے حال ہے۔ ای قائلاً۔

أنا ابن الأکوع ۔ والیوم یوم الرضع۔

''الا کوع'': یہاں شعر میں عین ساکن پڑھا گیا اور ایک نسخہ میں عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

''رضّع'': راضع کی جمع ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کمینوں کی ہلاکت کا دن۔ عرب کہتے ہیں۔ ''لئیم راضع''۔ ای رضیع اللوم فی بطن أمه ماں کے پیٹ میں کمینگی کا دودھ پینے والا اور بعض نے کہا ہے کہ اس لئے کہ وہ بکری اور اونٹنی کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتا ہے۔ تاکہ وہ سوال کو نہ سنے۔ ''ضیفان'' دودھ دھونے کی آواز کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے دن پتہ چلے گا کہ کس کو معزز عورت نے دودھ پلا کر بہادر کیا ہے۔ یا اس

کوکسی کمینی عورت نے دودھ پلایا ہے جس نے اس کو بزدل بنادیا۔اھ اور بعض نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ آج پتہ چلے گا کہ کس کو لڑائی بچپن سے سکھائی گئی ہے اور کس کو نہیں سکھائی گئی ہے۔یا یہ معنی ہے کہ اے کافرو! آج کے دن تم ہمارے ہاتھوں سے ہلاک ہوگے اس لئے کہ تم اتنے عاجز ہو جیسا کہ ہمارے ہاں دودھ پینے والے بچے ہوتے ہیں۔

قوله:''فما زلت أرميهم، وأعقربهم''أعقر بهم۔۔۔آرامامن الحجارة'':

(یہاں مضاف محذوف ہے)ای بعقر دوابهم

''حتّٰى ما خلق الله من بعير من ظهر رسول الله'' الاَّ خلفته وراء ظهرى''۔

یہاں''ما''نافیہ ہے۔''من ظہر''میں''من''بیانیہ ہے،اور''من بعیر''میں''من''زائدہ ہے۔تفخیم شان کے لئے لایا گیا ہے۔

''ثم اتبعتهم ارميهم، حتى القوا اكثر من ثلاثين بردة وثلاثين رمحًا ولا يطرحون شيئًا الاَّ جعلتُ عليه ارامًا من ال حجارة''۔الحجارة:خلفته:لام مشددہ کے ساتھ ہے

''وراء ظهرى'':اس میں تجرید ہے یا یہ برائے تاکید ہے۔''اتبعتهم'':اس میں پہلی تاء مشدد ہے۔

''بردةٌ'':دھاری دار چادر یا کالی چوکور چھوٹی چادر کو کہتے ہیں۔جسے اعرابی پہنتے ہیں۔

''يستخفون'':خاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔أی يطلبون الخفة بالقائها فى الفرار۔

''آرامًا''شروع میں مدّ ہے یہ''ارم'' بمعنی''علامت''کی جمع ہے۔جیسا کہ''عنبٌ''کی جمع''اعناب''آتی ہے۔چونکہ اس کے معنی''علامت''ہیں اس اعتبار سے''من الحجارة''میں تجرید ہے یا تاکید ہے۔

قوله:''يعرفها رسول الله ﷺ وأصحابه'':

''النہایۃ''میں ہے کہ جاہلیت کی ایک یہ عادت تھی کہ جب وہ راستے میں کوئی چیز پاتے اور اس کو ساتھ لے جانا اس وقت ممکن نہ ہوتا تو اس پر پتھر رکھ چھوڑ دیتے تا کہ وہ بعد میں اس کو پہچان لیں۔جب وہ واپس لوٹتے تو اس کو اٹھا لیتے تھے۔

قوله:''فقال رسول الله ﷺ ''خير فرساننا اليوم ابو قتادة وخير رجالتنا سلمة'':

''فرسان'':یہ فارس کی جمع ہے۔''گھوڑسوار''کو کہتے ہیں۔

''رجالتنا'':جیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔اور''راجل'' بمعنی''ماشی''کی جمع ہے۔(قاموس)اس کی نظیر''سيّارة''اور''نظّارةٌ''ہے جو کہ سائر اور ناظر کی جمع ہے۔

فوائد حدیث:

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں(اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد معلوم ہوئے:)

① شہادت کی فضیلت اور ابو قتادہ وسلمہ کی منقبت

② جو اچھا کام کریں ان کی تعریف کی جائے بشرطیکہ اس پر کسی مصلحت وحکمت کا ترتب ہو۔

③ قتال میں دشمن کے گھوڑوں کے پاؤں کا کاٹنا جائز ہے۔

④ جنگ میں رجزیہ اشعار پڑھنے جائز ہیں۔
⑤ جنگ میں یہ کہنا جائز ہے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں۔
⑥ امام کی اجازت کے بغیر مبارزت کی دعوت دینا جائز ہے۔
⑦ شہادت کی تمنا اور اپنے آپ کو موت کے خطرات میں ڈالنا جائز ہے۔

قوله: ''ثم اعطانی رسول الله ﷺ سهمین: سهم الفارس وسهم الراجل......'':

''**سهم الفارس**'': یہ تین ہیں یا دو ہیں۔ اس کا بیان گذر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے سوار اور پیدل یا دونوں کے سہام دے دیئے اور یہ اس لئے کہ اس غنیمت کا زیادہ تر حصہ حضرت سلمہؓ کی وجہ سے ملا تھا۔ اور امام کو یہ حق حاصل ہے کہ لوگوں کو رغبت دلانے کیلئے اس کو اس کے حصہ سے زیادہ دے جس کی کوشش جہاد میں زیادہ ہو۔ اور ''حضرت سلمہؓ'' کو کل مالِ غنیمت اس لئے نہیں دیا کیونکہ قتال سے پہلے آپ ﷺ نے نفل کا اعلان نہیں کیا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ اس لئے کہ جو آدمی جنگ کے ختم ہونے سے پہلے (جنگ) میں شریک ہونے کی نیت سے آئے تو وہ غنیمت میں بھی شریک ہوگا۔ اس غزوہ کو ''**غزوة ذات القرد**'' کہتے ہیں کیونکہ یہ مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ اور یہ واقعہ ٦ میں پیش آیا ہے۔ ''قرد'' قاف کے فتحہ اور راء کے ساتھ ہے۔

قوله: ''فجمعهما لی جمیعًا'':

یعنی یہ میری خصوصیات میں سے ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں حصوں کو اکٹھا کر کے مجھے دے دیا۔

خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت سلمہؓ کو صرف راجل کا حصہ دیا اس لئے کہ حضرت سلمہؓ اس جنگ میں پیادہ پا تھے۔ اور یہ زیادت نفل کے طور پر دی۔

''نفل'' کا بیان

٣٩٩٠: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُنَفِّلُ بَعْضَ مَنْ يَّبْعَثُ مِنَ السَّرَايَا لِاَنْفُسِهِمْ خَاصَّةً سِوٰى قِسْمَةِ عَامَّةِ الْجَيْشِ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٢٣٧' کتاب فرض الخمس' باب و من الدلیل' الحدیث رقم ٣١٣٥ و مسلم فی ٣ / ١٣٦٩' الحدیث رقم ١٧٥٠' وأبو داود فی السنن ٣ / ١٨٠' الحدیث رقم ٢٧٤٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جن لوگوں کو جہاد کے لئے بھیجتے تھے ان میں سے بعض لوگوں کے لئے عام لشکر والوں کی نسبت مخصوص طور پر کچھ زیادہ حصہ لگا دیا کرتے تھے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''**ینفل**'': فاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے ''مالِ غنیمت میں سے کچھ اضافی دینا۔''

یعنی ان لوگوں کو غنیمت کے حصہ میں سے کچھ حصہ زائد دیتے تھے۔ یہ حصہ لشکر کے عام مجاہدوں کے حصہ کے علاوہ ہوتا تھا۔

خمس اور نفل دینے کا بیان

۳۹۹۱:وَعَنْهُ قَالَ نَفَّلَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :نَفَلاً سِوٰى نَصِيْبِنَا مِنَ الْخُمُسِ فَاَصَابَنِىْ شَارِفٌ وَالشَّارِفُ الْمُسِنُّ الْكَبِيْرِ۔ (متفق عليه)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۳ / ۱۳۶۹ كتاب الجهاد' باب الانفال' الحديث رقم (۳۸ ـ ۱۷۵۰)

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں کو خمس مال میں سے ہمارے مقرر کردہ حصوں کے علاوہ بھی کچھ زیادہ عنایت فرمایا' چنانچہ میرے حصے میں ایک ''شارف'' آئی اور ''شارف'' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بوڑھی اور بڑی ہو''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''النہایہ'' میں ہے کہ ''نفل'' جب ''فاء'' کی حرکت کے ساتھ ہو تو ''غنیمت'' کو کہتے ہیں اور اس کی جمع ''انفال'' آتی ہے۔اور جب فاء کے سکون کے ساتھ ہو تو معنی ہوتا ہے ''زیادہ، زائد'' اور نفل نماز بھی اسی سے ماخوذ ہے اس لئے کہ وہ بھی فرائض سے زائد چیز ہوتی ہے۔

مالِ غنیمت کی ایک خاص صورت کا بیان

۳۹۹۲:وَعَنْهُ قَالَ ذَهَبَتْ فَرَسٌ لَهٗ فَاَخَذَهُ الْعَدُوُّ فَظَهَرَ عَلَيْهِمُ الْمُسْلِمُوْنَ فَرُدَّ عَلَيْهِ فِىْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَفِىْ رِوَايَةٍ اَبَقَ عَبْدٌ لَهٗ فَلَحِقَ بِالرُّوْمِ فَظَهَرَ عَلَيْهِمُ الْمُسْلِمُوْنَ فَرَدَّ عَلَيْهِ خَالِدُ ابْنُ الْوَلِيْدِ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ١٨٢ كتاب الجهاد' باب غزوة خيبر' الحديث رقم (٤٢٢٩ ـ ٣٠٦٧) وابن ماجه فى ٢ / ٩٤٩' الحديث رقم ٢٨٤٧۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ (ایک مرتبہ) ان کا گھوڑا بھاگ گیا جس کو دشمنوں (یعنی کافروں) نے پکڑ لیا' پھر جب مسلمان ان (دشمنوں) پر غالب آئے (اور ان کے مالِ غنیمت میں وہ گھوڑا بھی آیا) تو ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ان کا گھوڑا واپس کر دیا گیا (اور اس کو مالِ غنیمت میں شمار نہیں کیا گیا) یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کا ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ''ابن عمر رضی اللہ عنہما کا غلام بھاگ کر روم پہنچ گیا' پھر جب مسلمان رومیوں پر غالب آئے تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو (ان کا غلام) واپس کر دیا۔ یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے زمانے کے بعد کا ہے''۔ (بخاری)

تشریح: قوله:ذهبت فرس له ......في زمن رسول الله:

''القاموس'' میں ہے کہ ''فرس'' مذکر اور مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔لیکن ابن حاجب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں ''فرس'' کو ان اسماء میں شمار کیا ہے جن کی تانیث لازم ہے۔

''فردعليه'': جارومجرورکونائب فاعل بنایا جاسکتا ہے ایک نسخہ میں ''فردت عليه'' صیغہ تانیث کے ساتھ ہے۔

قوله:وفي رواية ابق عبد له الخ :

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عبد بق کے مالک نہیں بن سکتے۔ جب وہ اس کو پکڑیں گے مالک پر لوٹانا واجب ہے خواہ تقسیم ہوچکی ہو یا نہ ہوئی ہو ہمارا قول بھی یہی ہے۔

اور ''شرح السنة'' میں ہے کہ یہ دلیل ہے کہ جب کفار مسلمانوں کے مالوں کو محفوظ کرلیں اور ان پر قابض ہو جائیں تو وہ اس کے مالک نہیں بنتے اور جب مسلمان ان کے ہاتھوں سے وہ لے لیں تو پھر اس کو اصل مالکوں کی طرف واپس کرنا ضروری ہوگا۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ چاہے یہ تقسیم غنیمت سے پہلے ہو یا بعد از تقسیم ہو۔ برخلاف ایک جماعت کے کہ یہ بعد تقسیم ہو تو پھر واپس کرنا واجب نہیں ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان یا ذمی کا مسلمان غلام بھگوڑا ہو کر دارالحرب چلا جائے اور کفار اس کو پکڑلیں تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں وہ اس کے مالک نہیں ہوں گے۔ جبکہ صاحبین فرماتے ہیں کہ وہ کفار اس کے مالک ہوں جائیں گے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں لیکن اگر یہ مسلمان غلام مرتد ہو کہ کفار کے پاس چلا جائے تو بالاتفاق وہ اس کے مالک نہیں بنیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی اونٹ بدک کر ان کے پاس چلا جائے اور وہ اس کو قبضہ میں کرلیں تو وہ اس کے مالک بن جائیں گے۔ اور اسی پر یہ مسئلہ متفرع ہے کہ اگر کسی آدمی نے اونٹ کو خریدا۔ اور اس کو دارالاسلام لے گیا۔ تو اس کا مالک اس کو قیمت کے ساتھ لے گا اگر چاہے۔ اور اگر وہ ہمارے اموال پر غالب آجائیں اور اس کو اپنے گھر میں محفوظ کرلیں تو وہ اس کے مالک ہوجائیں گے۔ اور یہی قول امام مالک اور احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مجرد استیلاء سے وہ اس کے مالک بن جائیں گے۔ امام احمد کی اس میں دو روایتیں ہیں۔ اور دوسرا قول امام مالک کے قول کے موافق ہے ہمارا اور امام مالک کا قول ایک ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ اس کے مالک نہیں بنیں گے۔ ان کا استدلال اس روایت سے ہے جس کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے عمران بن حصین کی سند سے روایت کیا ہے۔ مشرکین نے مدینہ پر یلغار کی۔ اس لوٹ مار میں عضباء بھی ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ اور ایک مسلمان عورت کو بھی قید کرلیا۔ جب وہ کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے تو ان میدانوں میں اپنے اونٹنیوں کو آرام دیتے۔ ایک رات وہ لوگ سوئے ہوئے تھے کہ عورت کھڑی ہوگئی۔ وہ عورت جس اونٹ پر اپنا ہاتھ رکھتی وہ بلبلاتا یہاں تک کہ وہ عضباء کے پاس پہنچی وہ ایک پست قد اونٹنی تھی اس پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف چل پڑی۔ اور نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو نجات دے دی تو وہ اس اونٹنی کو ذبح کرے گی۔ جب وہ مدینہ آئی تو مسلمانوں نے اونٹنی کو پہچان لیا (کہ یہ تو عضباء ہے)۔ مسلمان اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ اس عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نذر کے متعلق بتایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **بئس ماجزيتها اوفديتها لا وفاء لنذر في معصية الله تعالىٰ ولا فيما لا يملك ابن آدم** تو نے برا بدلہ دیا یا تو نے برا فدیہ دیا۔ اس نذر کو پورا نہیں کیا جائے گا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو، یا اس چیز کی نذر ہو جس کا ابن آدم مالک نہ ہو''۔ اور ایک حدیث میں ہے: ''**فأخذ ناقته**'' کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کو لے لیا۔

جمہور کا استدلال اس آیت کریمہ سے ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ﴾ [الحشر-۸]

اللہ تعالیٰ نے مسلمان مہاجرین کو فقراء کہا۔ حالانکہ فقیر وہ ہوتا ہے کہ جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار ان کے اموال کے مالک بن گئے تھے جن کو مسلمانوں نے بوقت ہجرت چھوڑا تھا۔ اور اس شخص کو بھی فقیر نہیں کہہ سکتے جو مال کا مالک ہو لیکن وہ ایسی جگہ میں ہو جہاں وہ اپنے مال تک نہ پہنچ سکتا ہو۔ بلکہ یہ ابن سبیل ہے۔ اور اسی وجہ سے ''نص صدقہ'' میں ان پر عطف کیا گیا ہے۔ شارحین نے جس روایت سے استدلال کیا ہے وہ صحیحین میں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ سے کہا گیا کہ کل آپ ﷺ مکہ میں کس جگہ قیام کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''**هل ترك لنا عقيلٌ من منزلٍ** کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی جگہ چھوڑی ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا۔ **أتنزل بدارك؟ قال: ''هل ترك لنا عقيل من رباع''** کیا آپ اپنے گھر قیام کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے؟ اور یہ بات آپ ﷺ نے اس وجہ سے کہی کیونکہ عقیل نے اس پر قبضہ بحالت کفر کیا تھا لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث محض اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا۔ اور عقیل کا قبضہ اس مکان پر نہیں مکان قبضہ بایں طور تھا کہ وہ ابو طالب کے وارث بنے تھے۔ ابو طالب کی وفات کے وقت حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ مسلمان تھے۔ جبکہ عقیل اور طالب کافر تھے۔ اس لئے یہ دونوں اس گھر کے وارث بن گئے تھے۔ اس لئے کہ یہ گھر نبی ﷺ کے تھے جب انہوں نے وہاں سے ہجرت کی تو وہ کافر اس پر قابض ہو گئے۔ استیلاء کی وجہ سے ان گھروں کے مالک بن گئے۔

ابو داؤدؒ نے اپنی مراسیل میں تمیم بن طرفہ کے طریق سے روایت نقل کی ہے۔ راوی کہتا ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے شخص کے پاس اپنی اونٹنی پائی تو وہ دونوں اپنا معاملہ نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئے۔ مدعی نے اس پر بینہ قائم کی اور دوسرے نے اس بات پر بینہ قائم کیا کہ اس نے اس اونٹنی کو دشمن سے خریدا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

''**ان شئت ان تأخذ بالثمن الّذى اشتراها به فأنت احق والا فخل عن ناقته**''۔

اگر تم چاہو اس اونٹنی کو اس قیمت کے عوض لے لو جس پر اس شخص نے خریدہ ہے۔ تم اس کے زیادہ حقدار ہو۔ ورنہ بصورت دیگر اس کی اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو۔ اور حدیث مرسل ہمارے نزدیک بلکہ اکثر اہل علم رحمہم اللہ کے ہاں حجت ہے۔

طبرانیؒ نے اس کو اس سند کے ساتھ نقل کیا ہے: ''**عن تميم بن طرفة عن جابر بن سمرة**......'' اس کی سند میں ''**ليس زيات**'' ہے جو ضعیف ہے۔ اس حدیث کی تخریج دارقطنی اور بیہقی نے بھی اپنی سنن میں کی ہے۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ مال جس پر دشمن قبضہ کر لے اور مسلمان ان کفار سے واپس لے لیں۔ اگر صاحب شئی نے مال کی تقسیم سے پہلے اس کو پایا تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اور اگر بعد از تقسیم اس کو پایا تو پھر اگر وہ لینا چاہتا ہے تو ثمن ادا کر کے لے لے۔ لیکن یہ حدیث ''حسن بن عمارہ'' کی وجہ سے ضعیف ہے۔

دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

''**من وجد ماله فى الفىء قبل ان يقسم فهو له، ومن وجده بعد ماقسم فليس له شئٌ**''۔

ترجمہ: ''جس کسی نے اپنے مال کو مالِ غنیمت میں تقسیم سے پہلے پایا تو وہ اسی کا ہوگا۔ اور جس نے اپنے مال کو تقسیم غنیمت

کے بعد پایا۔تو اس کیلئے کچھ بھی نہیں ہے"۔اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروۃ کی وجہ سے اس حدیث کی تضعیف کی گئی ہے۔اس کی تخریج ایک اور طریق سے بھی کی لیکن اس کی سند میں "رشدین" ہے۔اور اس کی وجہ سے حدیث کو ضعیف ٹھہرایا گیا۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر سے مرفوعًا روایت کیا ہے:"**من ادرك ماله فى الفیء قبل ان يقسم فهو له، وان ادرك بعد ان يقسم فهو احق بالثمن**"۔لیکن اس میں بھی "لیس زیات" ہے جو کہ ضعیف ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جمہور نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا:"**من ادرك ما اخذ العدوّ قبل ان يقسم فهو له، وما قسم فلا حق له فيه الاّ بالقيمة**"اس روایت کو شعبیؒ نے عمرو سے اور عمرو نے رجاء بن حیوہ سے اور رجاء بن حیوۃ نے حضرت عمر سے مرسلاً نقل کیا ہے۔ان دونوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ کو نہیں پایا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ قبیصہ بن ذویب سے نقل کیا ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے فرمایا: اس مال کے بارے میں کو مشرکین لے جائیں اور پھر وہ مال مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے اور مسلمانوں میں سے اس کو صاحب مال پہچان لے اگرا س نے اس کو قبل تقسیم پایا تو اس کو ملے گا، اور اگر مال میں سہام جاری ہو گئے تو اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔انہوں نے "ابو عبیدہ" سے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ سلیمان بن یسار عن زید بن ثابت بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔اور حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

من اشترٰی مأ احرز العدوّ فهو جائز۔جس نے وہ چیز خریدی جس کو دشمن نے محفوظ کر لیا تھا' تو یہ جائز ہے۔

لیکن مجھے تعجب ان پر ہے کہ اس حکم کی اصل میں روایات کثیرہ کے ہوتے ہوئے بھی شک کرتا ہے اور کبھی وہ ارسال کی وجہ سے اس کو ضعیف گردانتا ہے۔کبھی اس وجہ سے کہ اس کے بعض طرق میں کلاّم ہے۔اس سے کم از کم ظن کا فائدہ تو حاصل ہو رہا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کا اتنا بڑا مجمع عمداً جھوٹ نہیں بول سکتا اور یہ بات بعید ہے کہ ان سب سے اس بارے میں غلطی ہوئی ہو اور یہ لوگ اس غلطی پر متفق ہو گئے ہیں۔بلکہ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ایک ضعیف راوی جو حدیث نقل کر رہا ہے اس حدیث کے ہم معنی کئی روایات ہوں تو اس کی یہ روایت عمدہ شمار ہوتی ہے اور یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ضعیف ہمیشہ غلطی کا التزام کرے گا۔ اور نہ لازم آتا ہے اس سے اکثر غلطی اور بھول ہو جاتی ہے اور "**حديث العضبآء**" کہ وہ بھی اس اونٹنی کو دارالحرب میں لے جانے سے پہلے کا تھا۔غور فرمایئے اس قول کی طرف کہ "**وكانوا اذا نزلوا منزلا**"......اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے ایسا کیا تھا جس وقت وہ راستے میں تھے۔اور اس سے اصل کی سابقہ دونوں حدیثوں کا حکم بھی معلوم ہوتا ہے۔واللہ سبحانه وتعالٰی أعلم۔

خیبر کے خمس کا ذکر

۳۹۹۳:وَعَنْ جُبَيْرِ ابْنِ مُطْعِمٍ قَالَ مَشَيْتُ اَنَا وَعُثْمَانُ بْنُ عَفَّانٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فَقُلْنَا اَعْطَيْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمُسِ خَيْبَرَ وَتَرَكْتَنَا وَنَحْنُ بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ مِنْكَ فَقَالَ اِنَّمَا بَنُوْهَاشِمٍ وَبَنُوْ الْمُطَّلِبِ شَيْءٌ وَاحِدٌ قَالَ جُبَيْرٌ وَلَمْ يَقْسِمِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :لِبَنِي عَبْدِ شَمْسٍ

وَبَنِی نَوْفِلٍ شَیْئًا۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷ / ٤٨٤ کتاب المغازی' باب غزوۀ خیبر' الحدیث رقم ٤٢٢٩۔

ترجمہ: ''اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خیبر کے خمس میں سے بنو مطلب کو حصہ دیا لیکن ہم کو نہیں دیا حالانکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اعتبار سے ہم سب ایک ہی درجے کے ہیں۔ کیونکہ ہم بھی تو ''بنو عبد مناف'' ہیں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا (میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا) کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہیں''۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بنو عبد شمس (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ) اور بنو نوفل (یعنی حضرت جبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ) کے درمیان کوئی چیز تقسیم نہیں کی''۔ (بخاری)

تشریح: **قوله: فقلنا: اعطیت بنی المطلب من خمس خیبر۔ وترکتنا ونحن بمنزلة واحدة منك'':**
یہ بات اس وجہ سے کہی کہ ہاشم، مطلب، نوفل، اور عبد شمس سارے عبد مناف کے بیٹے تھے۔ اور ''عبد مناف'' رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے جدّ رابع تھے۔ اور حضرت جبیرؓ کا تعلق بنو نوفل سے جبکہ عثمان بن عفانؓ کا تعلق بنو عبد شمس سے تھا اور نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ''بنو ہاشم'' میں سے تھے۔

قوله: فقال: ''انّما بنو هاشم وبنو المطلب شیٔ واحدٌ'':
مطلب یہ ہے کہ وہ ایک چیز کی طرح ہیں بایں طور کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے والے، باہم اتفاق سے رہنے والے اور باہم تعاون کرنے والے ہیں۔ ان میں جاہلیت میں بھی کوئی مخالفت نہیں تھی اور نہ ہی اسلام میں کوئی مخالفت ہے۔
اور ''شرح السنۃ'' میں ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اشارہ اس ''حلف'' (معاہدہ) کی طرف تھا جو جاہلیت میں بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کے درمیان ہوا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ قریش اور بنو کنانہ نے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کے خلاف معاہدہ کیا کہ وہ نہ ان (بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب) کے ساتھ نکاح کریں گے اور نہ ان کے ساتھ بیع وشراء کریں گے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ان کے (قریش و بنو کنانہ) حوالے نہ کر دیں۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے: **انما لم تفترق فی جاهلیة ولا فی اسلام** کہ نہ جاہلیت اور نہ ہی اسلام میں ان میں کوئی اختلاف تھا اور **یحی بن معین** "**سیی واحد**" کے الفاظ روایت کیا کرتے تھے۔ ''سِیّ'' سین مہملہ اور یائے تحتانیہ مشددہ کے ساتھ ہے بمعنی ''سواء'' کہا جاتا ہے **هذا سی هذا أی مثله ونظیره**۔ اور ان سب کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

قوله: ''قال جبیر ولم یقسم النبی ﷺ لبنی عبد شمس وبنی نوفل شیئًا'': نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بنو عبد شمس اور بنو نوفل کو کوئی چیز بھی نہیں دی اس لئے کہ ان کے اور بنو ہاشم کے درمیان کوئی موافقت نہیں تھی۔ بلکہ کھلم کھلا مخالفت تھی اس لئے ان کو خمس الخمس سے محروم کر دیا۔ حالانکہ وہ آپ کے ذوی القربیٰ میں سے بھی ہیں۔
اور اس بات کو جانئے۔ کہ اس آیت کریمہ: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ﴾ [الانفال۔ ٤١] اللہ

تعالیٰ کا ذکر تبرک کیلئے ہے اور اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی سہم ملے گا جیسا کہ اوروں کو سہم ملتا ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے لہٰذا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سہم ایک ہی ہے۔

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا سہم ثابت ہے جس کو تعمیر کعبہ میں خرچ کیا جائے گا اگر وہ خراب ہو وگرنہ نہیں اور پھر ہر مسجد پر خرچ کیا جائے گا۔ لیکن اس شہر کی مسجد میں جس میں خمس ثابت ہے۔ اھ لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ سلف صالحین نے پہلی تفسیر کو بیان کیا ہے۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ابی بن کعب اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی: [**واعلموا انما غنمتم من شئ فانّ للّٰه خمسه**] یعنی انّ کو بالکسر پڑھا اور فرمایا کہ [**ان للّٰه خمسه**] مفتاح کلام ہے۔ **للّٰه ما فی السمٰوٰت وما فی الأرض**۔

اس کے علاوہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سریہ کو بھیجتے اور وہ غنیمت کا خمس حاصل کر لیتے تو اس خمس کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اس قائل کے قول کے مطابق یہ چھ حصے ہو جائیں گے۔ اور اسی طرح حاکم نے حسن بن محمد بن علی بن الحنفیہ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: **هذا مفتاح کلام للّٰه الدنیا والآخرہ** کہ یہ افتتاح کلام کیلئے ہے اس لئے کہ دنیا و آخرت تو اللہ تعالیٰ کیلئے ہی ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے ساقط ہو گیا جیسا کہ ''**صفّی**'' ساقط ہو گیا اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حقدار رسالت کی وجہ سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی رسول نہیں ہے۔ اور ''**الصفی**'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت میں خصوصی طور اپنے لئے چن لیتے تھے مثلاً زرہ، تلوار اور لونڈی وغیرہ۔ یہ قبل از تقسیم اور قبل از اخراج خمس تھا۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار ذوالفقار کو اپنے لئے چنا تھا۔ یہ منبہ بن حجاج کی تلوار تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ تلوار منبہ کو قتل کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی اور جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ بنت حیی بن اخطب کو خیبر کی غنیمت میں سے چن لیا تھا۔ اس کو ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سہمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خلیفۃ المسلمین کو دیا جائے گا۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امامت و خلافت کی وجہ سے اس کے مستحق تھے، رسالت کی وجہ سے نہیں تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے خمس کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو اس کو چار حصوں میں تقسیم کرتے۔ اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ کو ختم فرما دیا، اس کی تقسیم نہیں ہوتی علاوہ ازیں یہ کسی سے منقول بھی نہیں ہے۔

حکم مشتق کے ساتھ معلق ہے۔ اور وہ رسول ہے۔ تو مبدا استحقاق علت ہوگا۔ اور وہ ''رسالت'' ہے۔

خلاصہ کلام:

حاصل کلام یہ ہوا کہ ہمارے ہاں خمس تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا:

(۱) ایک سہم یتامیٰ کا۔ (۲) ایک سہم مساکین کا۔ (۳) ایک سہم ابن سبیل کا۔

اور ذوی القربیٰ فقراء ابن سبیل میں داخل ہیں۔ ان کو غیر پر مقدم کیا جائے گا۔ اس لئے کہ غیر ذوی القربیٰ فقراء تو صدقات

وغیرہ لیتے رہتے ہیں اور آپ ﷺ کے ذوی القربیٰ کے لئے یہ حلال نہیں ہے۔ یہ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ذوی القربیٰ کے فقراء یتامیٰ کو سہم یتامیٰ میں داخل کیا جائے گا۔ نہ کہ ان کے اغنیاء میں۔

یتیم اس بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ نہ ہو۔

اور ذوی القربیٰ کے مساکین سہم مساکین میں داخل ہوں گے۔ اور ذوی القربیٰ کے ابناء السبیل فقراء ''ابناء السبیل'' میں داخل ہوں گے۔

اشکال:

اگر یہ کہا جائے کہ پھر تو یہاں سہم یتیم کو ذکر کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا استحقاق تو فقر و مسکنت کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ یتیم ہونے کی وجہ سے؟

جواب: اس کا فائدہ دفع تو ہم ہے۔ اور وہ یہ کہ یتیم غنیمت میں سے کسی حصہ کا بھی مستحق نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ غنیمت کا استحقاق تو جہاد کی وجہ سے ہے۔ اور یتیم تو صغیر ہوتا ہے وہ اس کا مستحق نہیں ٹھہرے گا۔ اور اسی طرح کا جواب شیخ ابو منصور کی تاویلات میں ذکر کیا گیا ہے۔

اشکال:

جب ذوی القربیٰ میں سے فقراء بھی فقر کی وجہ سے خمس کے مستحق ہیں تو ان کے ذکر کا قرآن میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: چونکہ بعض لوگوں کے اذھان اس طرف جاتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فقیر ذوی القربیٰ اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ کیونکہ خمس تو صدقہ کی قبیل سے ہے اور صدقہ ان کیلئے جائز و حلال نہیں ہے۔

اور ''التُحفة'' میں ہے کہ یہ تین ہمارے ہاں خمس کے مصارف ہیں نہ کہ یہ علیٰ سبیل الاستحقاق ''ان کو ملے گا یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی ایک صنف کو خمس دیا جائے تو بھی جائز ہے۔ جیسا کہ ''صدقات'' میں ہے۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ذوی القربیٰ کو خمس کا پانچواں حصہ دیا جائے گا۔ جس میں ان کے غنی اور فقیر برابر ہوں گے۔ اور یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ معاملہ امام کے حوالے ہے۔ اگر وہ چاہے تو ان کے درمیان تقسیم کردے اور اگر چاہے بعض کو حصہ دے: [اور بعض کو نہ دے۔ اور اگر چاہے تو ان کے علاوہ کو دے دے۔ اگر ان کا معاملہ ان سے زیادہ اہم ہو۔ اور ان کو اس طرح تقسیم کرے **للذكر مثل حظِّ الأنثيين**] (مرد کو عورت کے مقابلے میں دوگنا حصہ ملے گا) اور یہ بنو ہاشم اور بنو المطلب وغیرہ کیلئے ہوگا۔ ان کے علاوہ قرابت داروں کے لئے نہیں ہوگا اور ہم ان کے ساتھ اس معاملہ میں موافقت کرتے ہیں کہ یہاں ''قرابة'' سے مراد وہ ہے۔ جو بنو ہاشم اور بنو المطلب کے ساتھ خاص ہے۔ خلاف غنی ذوی القربیٰ کے دخول وعدم دخول میں ہے۔

مزنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ اور کم تر اور بہتر سب کو برابر دیا جائے گا۔ اور یہی اطلاق نص کا ظاہر ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے اطلاق سے استدلال کیا ہے: ﴿**ولذی القربٰی**﴾ [الانفال۔ ٤١]۔

آیت میں غنی وفقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔اور دوسرا یہ کہ یہ ایسے وصف کے ساتھ معلق ہے جو اس بات کو لازم کرتا ہے کہ ''مبدأ اشتقاق'' اس وصف کیلئے ''علت'' ہو۔اور اس میں کوئی تفصیل نہیں ہے۔ برخلاف یتامیٰ کے کہ وہ اس میں فقر کی شرط لگاتے ہیں حالانکہ وہ بھی مطلق ہے۔اور وہ اس لئے کہ اسم یتیم ''حاجة'' کا پتہ دے رہا ہے۔تو یہ اس ''فقر وحاجت'' کے معنی کے ساتھ مُقید ہوگا برخلاف ذوی القربیٰ کے۔اور پھر یہ کہ اس کی مناسبت معنی کی نفی نہیں ہوتی۔اس لئے کہ یہ بات بعید نہیں ہے کہ قرابت رسول اللہ ﷺ اس کرامت کے استحقاق کا موجب ہو۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ خلفاء راشدینؓ نے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔اور یہ ہمارے قول کے مطابق ہے۔اور وہی ہمارے لئے بطور قدوہ کے کافی ہے۔پھر یہ کہ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی طرف سے بھی نکیر نہیں آئی اس لحاظ سے یہ اجماع ہو گیا۔اس لئے کہ صحابہ سے رسول اللہ ﷺ کے خلاف ورزی کی امید نہیں کی جا سکتی۔اور بات رہی اس کے اثبات کی۔(تو ہم ثابت کر دیتے ہیں)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ روایت کیا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خمس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔اس طرح کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کیلئے ایک سہم ہوتا تھا۔ایک سہم ذوی القربیٰ کا تھا۔ایک سہم یتامیٰ کا تھا۔ایک سہم مساکین کا تھا۔اور ایک سہم ابن سبیل کا تھا۔پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ اس کو (خمس) تین حصوں میں تقسیم کیا کرتے تھے ایک سہم یتامیٰ کا، ایک مساکین کا اور ایک سہم ابن سبیل کا۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن خزیمہ عن یوسف بن عدی عن عبداللہ بن المبارک عن محمد ابن اسحاقؒ روایت کیا ہے کہ میں نے ابو جعفر یعنی محمد بن علیؓ سے پوچھا۔میں نے کہا کہ کیا تم نے علی بن ابی طالب کو دیکھا۔جب وہ عراق کے والی مقرر ہوئے۔تو انہوں نے اس شخص کو بلایا جس کے حوالے لوگوں کے معاملات تھے کہ انہوں نے ذوی القربیٰ کے سہم کا کیا کیا؟ تو انہوں نے کہا کہ میرے باپ ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے طریقہ پر چلے ہیں۔تو میں نے کہا کہ یہ کیسی بات ہے۔جب کہ تم کہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم وہ لوگ اپنی رائے سے کچھ نہ کرتے تھے۔تو میں نے کہا کہ پھر اس کو کس نے منع کیا؟ تو اس نے کہا اللہ کی قسم انہوں نے اس بات کو ناپسند جانا کہ یہ کہا جائے کہ وہ ابو بکر وعمر کی سیرت کے خلاف کر رہے ہیں

اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ خلفاء راشدین نے ایسا کیا ہے۔اور اسی سے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی کلبی سے تصحیح ہوتی ہے کہ اگرچہ کلبی محدثین کے ہاں ضعیف ہے مگر یہ کہ اس نے لوگوں کی موافقت کی ہے۔اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر کوئی اجماع نہیں ہے۔کیونکہ اہل بیت اس کے مخالف تھے۔لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب یہ حکم ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ نے اس پر عمل اس وجہ سے کیا تھا کیونکہ یہ فعل درست تھا تو پھر ان کیلئے یہ جائز نہیں تھا کہ ابو بکر وعمرؓ کے اجتہاد کی مخالفت کریں۔اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ حضرت علیؓ نے خلیفہ اول وثانی کی کئی ایسی چیزوں میں مخالفت کی ہے جو آپؓ کی رائے کے موافق نہیں تھے۔جیسا کہ امہات الاولاد کی بیع وغیرہ۔اور جب ان کی موافقت کی تو اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ان رائے کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حضرت علیؓ نے ان کی مخالفت کی ہے۔اور اسی سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال ختم ہو جاتا جو انہوں نے اس روایت سے کیا ہے: ''عن ابی جعفر محمد بن علی قال: کان رأی علی فی الخمس رأی اهل بیته''

راوی کہتا ہے کہ خمس کے بارے میں حضرت علیؓ کی رائے اہل بیت کی رائے کے مطابق تھی۔لیکن حضرت علی نے اس بات کو ناپسند کیا کہ وہ ان دونوں کی مخالفت کریں۔فرماتے ہیں کہ اہل بیت کے بغیر کوئی اجماع نہیں ہے۔لیکن ہم اس بات کو صحیح نہیں مانتے۔ آپ نے مخالفت اس وجہ سے نہیں کی۔کہ انہوں نے ان کی طرف ان کی مخالفت کرنا مناسب نہ سمجھا، یعنی مکروہ سمجھا۔حالانکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔جبکہ اس میں ان کے اعتقاد کے مطابق مستحقین کو ان کے حق سے روکنا ہے۔(حالانکہ ایسا وہ کب کر سکتے ہیں)۔تو پتہ چلا کہ حضرت علیؓ نے اس سے منع نہیں کیا مگر اس وجہ سے کہ اس نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا ہے۔اور آپؓ کے سامنے دلیل آ گئی ہے۔اور اسی طرح جو روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہ حضرت علیؓ اس کو (اس سے مراد اہل بیت کی موافقت اور ابوبکر وعمرؓ کی مخالفت) صحیح سمجھتے تھے۔وہ محمول ہے آپؓ کے پہلے قول پر جب وقت رجوع نہیں کیا تھا۔پھر انہوں نے رجوع کرلیا۔لیکن اگر حضرت علیؓ نے رجوع نہ بھی کیا ہوتو خلفائے راشدین کے قول کو لینا اولیٰ ہے۔جبکہ کسی کی طرف سے اس پر کوئی نکیر بھی نہ ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ جو کچھ تم نے ذکر کیا وہ درست ہے کہ ذوی القربیٰ اصل کے لحاظ سے کسی سہم کے مستحق نہیں تھے اس لئے کہ خلفاء راشدین نے ان کو نہیں دیا۔یہ قرآن وسنت کے مخالف ہے۔کیونکہ آپ ﷺ نے تو ان کو دیا تھا یہ بات بغیر کسی شک کے ثابت ہے۔اس اشکال کا جواب کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق یہ ہے کہ اصل میں دلیل اس پر دلالت کررہی ہے کہ یہ سہم ان (ذوی القربیٰ) کے فقراء کیلئے تھا۔یعنی ان میں سے جو فقیر تھے ان کیلئے یہ سہم ہوتا تھا۔

دلیل یہ ہے کہ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معجم میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔کہ نوفل بن حارث نے اپنے بیٹوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔تو آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ تم دونوں اپنے چچا کے پاس چلے جاؤ شاید وہ صدقات کے ذریعہ تمہاری اعانت اور مدد کرے وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ کو اپنی ضروریات کے بارے میں بتلایا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہل بیت کیلئے صدقات میں سے کچھ بھی جائز نہیں ہے اور نہ ہی لوگوں کے غسالت میں سے کچھ جائز ہے۔تمہارے لئے "خمس الخمس" میں سے اتنا جائز ہے کہ جو تم کو غنی کردے اور تمہاری ضروریات کو کفایت کرجائے۔

ابن ابی حاتم نے اپنے تفسیر میں یوں نقل کیا ہے: "**رغبت عن غسالة أيدى النّاس انّ لكم فى خمس الخمس ما يغنيكم**" اس کی سند حسن ہے۔یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس آیت کریمہ [**ولذى القربىٰ**] سے مراد ذوی القربیٰ فقراء ہیں۔تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فقراء کا استحقاق ہے۔اور وہ ایک مستقل مصرف ہیں۔لیکن خلفاء راشدین کا اس سے روکنا اس عقیدہ کی منافات کی دلیل ہے کہ خلفاء راشدین اس سے مطلقاً منع کیا کرتے تھے۔جیسا کہ ہم نے روایت کی کہ انہوں نے ذوی القربیٰ کو کچھ بھی نہیں دیا۔اور اس میں سے ان کے فقراء کو مستثنیٰ نہیں کیا۔اور اسی طرح یہ بات بھی اس اعتقاد کے منافی ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے ذوی القربیٰ اغنیاء کو بھی دیا ہے۔جیسا کہ مروی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عباسؓ کو دیا ہے۔حالانکہ ان کے پاس بیس غلام تھے جو تجارت کیا کرتے تھے۔

اور صاحب ہدایہ کے اس قول کہ جو آپ ﷺ نے ان کو مدد کیلئے دیا ہے اس سے سوال ثانی مندفع ہوجاتا ہے۔لیکن یہ ما قبل روایت کے ساتھ تناقض کو لازم ہے۔اس لئے کہ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ قرابت مستحقہ ہی ان کی نصرت تھی اور یہ بھی ان کے

فقیروں کے ساتھ خاص نہیں اور اغنیاء میں سے جو آپ ﷺ کے بعد بھی رہے ہیں جیسا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہے۔ تو اس وقت خلفاء پر واجب تھا کہ ان کو دے دیتے۔ لیکن یہ بات ماقبل کے مخالف ہے کہ جس میں کہا گیا تھا کہ ان کو کچھ بھی نہیں دیا ہے۔ بلکہ انہوں نے تقسیم کو تین حصوں میں منحصر کر دیا تھا۔ (یعنی سہام ہی تین تھے چہ جائیکہ ان کو دیتے)۔

لیکن اس پر اشکال پڑتا ہے اس چیز سے جو قول کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح میں آئے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذوی القربیٰ کے فقراء کو بھی ایک سہم دیا ہے۔ حالانکہ یہ بات معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو فقر کی بناء پر اعطاء کیا ہو۔ بلکہ اس بارے میں ابوداؤد میں سعید بن المسیب سے اس طرح مروی ہے کہ جبیر بن مطعم نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو عبد شمس کے لئے خمس میں سے کوئی حصہ مقرر نہیں کیا۔ اور نہ ہی بنو نوفل کو ''خمس'' میں سے کچھ دیا ہے۔ جیسا کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کو تقسیم کر کے دیا۔ اور فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خمس کو اس طرح تقسیم کرتے تھے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے تقسیم کیا ہے سوائے اس کے کہ ابوبکرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ''ذوی القربیٰ'' کو اس میں سے کچھ نہیں دیا۔ جیسا کہ نبی ﷺ ان کو دیتے تھے۔ اور جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد کے خلفاء ان کو دیتے تھے۔

ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں (علیؓ) حضرت عباسؓ، حضرت فاطمہؓ، اور زید بن حارثہؓ نبی ﷺ کے پاس جمع ہو گئے۔ تو میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر آپ ہمارا حق اس خمس میں سمجھتے ہیں ''جو کتاب اللہ'' میں ہے۔ تو اس کو اپنی زندگی میں تقسیم کر کے دے دیجئے۔ تا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی اس سلسلے میں ہمارے ساتھ نزاع نہ کرے۔ تو فرماتے ہیں رسول اللہ نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر میں نے اس کو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تقسیم کیا اور پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دور خلافت میں بھی ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آخری دور آیا کہ حضرت عمرؓ کے پاس زیادہ مال آیا تو انہوں نے ہمیں ہمارے حق سے محروم کر دیا۔ پھر اس کو میری طرف بھیجا۔ تو میں نے کہا کہ اس سال ہم پر دنیا کی فراوانی ہے۔ اور مسلمانوں کو اس کی حاجت ہے انہوں کو ان کا حق دے دو۔ انہوں نے وہ ان کو دے دیا۔ پھر عمر کے بعد اس کی طرف مجھے کسی نے دعوت نہیں دی۔ جب میں عمرؓ کے پاس سے نکلا تو میں حضرت عباس سے ملا۔ تو انہوں نے کہا کہ اے علی آج تو نے ہمیں اس چیز سے محروم کر دیا جو ہماری طرف نہیں لوٹے گی انہیں اس کا بہت افسوس تھا تو اس میں اعطاء کی تقیید فقراء کے ساتھ نہیں ہے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ حضرت عباس نے بھی لیا ہے۔ حالانکہ وہ فقیر، محتاج نہیں تھے۔ مزید یہ کہ اس حدیث کو حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف کہا ہے۔ اور کہا ہے کہ جبیر بن مطعمؓ کی حدیث میں یوں ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ذوی القربیٰ کو تقسیم کر کے نہیں دیا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ابوبکرؓ نے ان کیلئے تقسیم کر کے دے دیا تھا اور حدیث جبیر بن مطعم صحیح ہے جبکہ حدیث علیؓ صحیح نہیں ہے۔ اھ

جس بات پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ خلفاء راشدین نے ذوی القربیٰ کو نہیں دیا مصرف استحقاق کے بیان کی وجہ سے جیسا کہ مذہب ہے ورنہ تو ان کیلئے آپ ﷺ کے بعد ان سے روکنا جائز نہ ہوتا۔ اور اس طرح اگر ذوی القربیٰ کو زمانہ ء جاہلیت کی نصرت و موازرۃ کے ساتھ مقید کیا جائے تو وہ آپ ﷺ کے بعد بھی باقی رہے ہیں۔ تو واجب تھا کہ وہ ان کو ان کا حصہ دیتے۔ جب خلفاء راشدین نے ان کو نہیں دیا تو پتہ چلا کہ وہ مصارف خمس ہیں اور وہ بھی خمس کا ایک مصرف ہے یہاں تک کہ کسی ایک

صنف مصرف پر بھی اقتصار جائز ہے۔اس طور پر کہ مثلاً کل خمس ابن سبیل کو دے دے۔ یا یہ کہ کل خمس مساکین کو دے دے۔ یا یہ کہ کل خمس یتامیٰ کو دے دے۔ جیسا کہ ہم نے یہ ''تحفۃ'' کے حوالے سے بیان کیا ہے۔خلفاء راشدین کیلئے یہ بھی جائز تھا کہ وہ اس خمس کو ان کے علاوہ کو دے دیتے۔اور انہوں نے ان کو دیکھا کہ وہ مالدار ہو گئے ہیں۔اور ان کے علاوہ خمس کے مصارف کو زیادہ نفع آور سمجھا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم کہتے ہیں کہ بے شک ذوی القربیٰ کا مسکین بھی اس خمس کا ایک مصرف ہے۔تو پھر یہ چاہیے کہ ذوی القربیٰ کے فقراء کو اور فقراء پر مقدم کریں۔جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے۔اور یہ جو بات ہے کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کے علاوہ کیلئے نہیں ہے اس لئے کہ نصرت اور مدد کی وجہ سے وہ مصارف تھے۔

ابوداؤد میں سعید بن میسّب کے حوالے سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے جبیر بن مطعم نے خبر دی کہ جب خیبر کے دن ذوی القربیٰ کے سہم کو بنو ہاشم اور بنو المطلب میں تقسیم کیا گیا اور بنو نوفل اور بنو عبد شمس کو چھوڑ دیا تو میں (جبیر بن مطعم) اور عثمان بن عفان چلے۔ یہاں تک ہم نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس آئے۔ہم نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ہم بنو ہاشم کی فضیلت کا انکار نہیں کرتے۔ ہمارے بھائی بنو المطلب کو تو آپ نے دیا اور ہمیں آپ نے چھوڑ دیا۔حالانکہ ہم دونوں کی قرابت داری ایک ہی طرح کی ہے؟ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک ہم اور بنو عبد المطلب جاہلیت اور اسلام میں آپس میں اختلاف نہیں کرتے تھے۔ہم اور وہ ایک ہی چیز ہیں۔اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالا۔آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کے ساتھ اشارہ کیا کہ انہوں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی مدد کی تھی۔یعنی جاہلیت میں مدد کی تھی اس لئے کہ اس وقت کوئی لڑائی نہیں تھی۔اس سے اشارہ ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ شعب ابی طالب (گھاٹی) میں داخل ہوئے تھے۔جب قریش نے بنو ہاشم سے قطع تعلق کا معاہدہ کیا تھا کہ ان کے ساتھ نہ بیع وشراء کریں گے اور نہ ہی ان کے ساتھ نکاح کریں گے۔

سیرت کی کتابوں میں یہ قصہ مشہور ہے۔اور اسی وجہ سے ان کی اولاد اس حصہ کا مستحق ٹھہری باوجود یکہ مدد ونصرت ان لوگوں نے نہیں کی تھی (بلکہ ان کے آباء نے کی تھی) اور یہی اس مقام میں ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا خلاصہ ہے۔

لڑائی اور بغیر لڑائی فتح ہونے والے علاقوں کے خمس کا ذکر

۳۹۹۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :اَیُّمَا قَرْیَةٍ اَتَیْتُمُوْهَا وَاَقَمْتُمْ فِیْهَا فَسَهْمُكُمْ فِیْهَا وَاَیُّمَا قَرْیَةٍ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ خُمُسَهَا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ ثُمَّ هِیَ لَكُمْ .

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳ / ۱۳۷۶ کتاب الجهاد' باب حکم الفئی' الحدیث رقم (۴۷ ـ ۱۷۵۶) وأبو داود فی السنن ۳ / ۳۲۷' الحدیث رقم ۳۰۳۶' وأحمد فی المسند ۲ / ۳۱۷

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ''جس بستی میں تم (بغیر قتل و قتال کے) داخل ہو اور اس میں قیام کرو تو اس (کے مال) میں تمہارا حصہ ہے اور جو بستی خدا اور اس کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نافرمانی کرے تو اس (کے مال) کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے اور بقیہ تمہارا ہے''۔(مسلم)

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ "ایما قریة اتیتموها" وأقمتم فیها، فسهمكم فیها"
کوئی بھی ایسی بستی کہ جس میں تم بغیر قتال کے داخل ہوئے بایں طور کہ انہوں نے راستہ چھوڑ دیا یا انہوں نے اس پر صلح کر لی۔
اور تم نے وہاں قیام کیا تو تمہارا سہم اس میں مشترک ہے۔ یعنی یہ تمہارے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان مشترک ہے جو تم مسلمانوں کے ساتھ لشکر میں سے نہیں نکلے۔ اس لئے کہ اس قسم کا مال "مالِ فئی" ہوتا ہے اور مال فئی ان کے ساتھ خاص نہیں ہوتا جو جنگ کے لئے نکلے ہوں۔

قوله: "وایما قریة عصت الله ورسوله ......": یعنی وہ بستی کہ جس کے رہنے والوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔ اور پھر تم نے ان سے قتال کر کے مال حاصل کیا۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ مالِ غنیمت ہوگا۔ اس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کیلئے خمس نکالا جائے گا اور بقیہ کو جیش میں تقسیم کر دیا جائیگا۔ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مال فی ء سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اس سے خمس نکالا جائے گا۔ جیسا کہ مالِ غنیمت میں سے نکالا جاتا ہے۔ یہ حدیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف حجت ہے۔

ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں پہلے سے مراد وہ ہے جس کو لشکر فتح کریں اور اس لشکر میں نبی کریم ﷺ نہ ہوں تو وہ اہل جیش کا ہوگا۔ اور دوسرے سے مراد یہ ہے کہ جس میں نبی ﷺ شریک ہوں تو وہ خمس لیں گے اور باقی مال لشکر کا ہوگا۔

شرح مسلم نووی رحمۃ اللہ علیہ میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس میں احتمال ہے کہ پہلی سے مراد (فئی) وہ غنیمت ہو جس کو مسلمانوں نے بغیر گھوڑے دوڑائے حاصل کیا ہو، بلکہ اس بستی والوں نے ان کا راستہ چھوڑ دیا یا انہوں نے اس پر صلح کی ہو تو ان کا سہم اس میں ہوگا۔ جیسا کہ مال فی ء کا مصرف ہے۔ اور دوسرے سے مراد یہ ہے کہ جن کو مسلمانوں نے عنوۃً لیا ہو۔ وہ غنیمت ہوگا اس میں سے خمس نکالا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فی میں بھی خمس کو واجب کیا ہے۔ جیسا کہ باقی سب علماء نے خمس کو غنیمت میں لازم کیا ہے۔ سب علماء کرام کا کہنا ہے کہ مال فی میں کوئی خمس نہیں ہے۔

اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ بستی جس کے (لوگوں کے) ساتھ تم نے جہاد کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یا میں تمہارے درمیان میں نہ تھا اور تم نے غنیمت کو آپس میں تقسیم کر لیا تو تمہارا حصہ ان غنائم میں ہے۔ اور ہر وہ بستی جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی اور میں اس لڑائی میں بذات خود شریک ہوا تو میں اس سے خمس نکالوں گا اور پھر اس کو تم پر تقسیم کروں گا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے قول میں "ثم" تراخی اخبار کیلئے ہے۔ اور ضمیر "قریة" کی طرف راجع ہے۔ اور مراد اس سے قریۃ ومافیها ہے اور اسی وجہ سے یہ ضمیر "قریة" کی طرف راجع ہے۔ یعنی وہ بستی اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب کچھ خمس کے نکالنے کے بعد تمہارا ہے اور اس کے "مقاتلین" کا ذکر "عصت الله ورسوله" کے ذریعہ کنایۃً کیا تا کہ مخاطبین کی عظمت شان ظاہر ہو کہ للہ فی اللہ جہاد کرتے ہیں۔ جو ان سے لڑا اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔
علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب امام کسی شہر کو عنوۃً فتح کر لے تو اس کو اختیار ہے، اگر چاہے تو اس کو غانمین میں تقسیم

کردے اور اس بستی والوں کو غلام بنالے اور خمس نکالنے کے بعد ان کے اموال کو تقسیم کردے۔ اور اگر چاہے تو ان کے لڑنے والوں کو قتل کردے اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے زمینیں اموال، بچے وغیرہ ان کو تقسیم کردے۔ اور تقسیم شدہ زمینوں پر ''عشر'' لازم کر دے۔ اس لئے کہ یہ مسلمان کا ابتدائی وظیفہ ہے۔ اور اگر چاہے ان پر احسان کر کے ان کے غلاموں کو آزاد کردے اور ان کے اموال و اراضی کو واپس کردے اور لوگوں پر جزیہ مقرر کردے اور ان کی زمینوں پر خراج لازم کردے۔ قطع نظر اس کے کہ ان زمینوں کو کون سے پانی سے سیراب کرایا جاتا ہے کیا وہ عشر کا پانی ہے۔ جیسا کہ بارش چشموں، کنوؤں اور وادیوں کا پانی۔ یا وہ خراج کا پانی ہے جیسا کہ وہ نہریں جو کہ اہل عجم نے کھدوائی ہیں۔ اس لئے کہ کافر پر یہ ابتداءً لازم ہے۔ ان پر احسان کرنا بایں طور کہ نہ ان کو غلام بنایا جائے اور نہ ہی ان کی زمینوں پر قبضہ کیا تو یہ مکروہ ہے۔ ان کو اتنا مال دے دے جس کے ذریعے سے وہ کام کرسکیں اور اپنی جانوں پر خرچ کرسکیں اور زمینوں پر خرچ کرسکیں کہ اس سے پیداوار حاصل ہو جائے بصورت دیگر یہ تکلیف مالا یطاق ہوگا۔ ان پر احسان اس طور پر کرنا کہ ان کے جان و اموال کو چھوڑ دیا جائے اور زمین کو اپنے قبضہ میں لے لیا جائے یا یہ کہ مال اور زمین کو واپس نہ کریں بلکہ صرف جانی احسان کردیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو ضرر ہوگا کہ یہ لوگ دوبارہ مسلمانوں کے خلاف لڑائی کریں گے۔ ہاں امام کو یہ حق حاصل ہے ان کو آزاد رہنے دیا جائے البتہ ان کے پاس مال نہ ہو اور جزیہ مقرر کردے۔ جو کہ وہ امام کو ادا کریں گے اس طرح یہ لوگ فقراء بن جائیں گے اور اپنی کوشش و عمل سے کمائیں گے۔ اور امام کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ان کو غلام بنالے اور تقسیم اراضی کے مسئلہ میں استدلال آپ ﷺ کے عمل سے کیا ہے کہ آپ ﷺ نے اراضی خیبر کو انہی میں تقسیم کردیا تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

''عن زيد بن أسلم عن ابيه قال: قال عمرؓ: لولا آخر المسلمين ما فتحت بلدة ولا قرية الاّ قسمتها بين أهلها''۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پوری زمین کو تقسیم کردیا تھا۔

ابوداؤد میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اراضی خیبر کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا نصف زمین اہل خیبر کو دے دی اور نصف زمین ''نوائب'' کیلئے مختص کردی: اور اس نصف کے اٹھارہ سہام بنا کر مسلمانوں میں تقسیم کردیئے۔ اور اسی طرح محمد بن فضیل عن یحییٰ بن سعید عن بشیر بن یسار عن رجال من اصحاب النبی ﷺ کے طریق سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارض خیبر کو ۳۶ سہام میں تقسیم کیا تھا اور ہر سہم میں سو آدمی آئے یعنی ہر سو آدمیوں کو ایک سہم دیا۔

بیہقی کی روایت میں ہے کہ خیبر کا نصف رسول اللہ کا تھا۔ اور اسی میں سے نصف مسلمانوں کیلئے تھا یعنی ان وفود کے لئے جو آپ ﷺ کے پاس آتے رہے۔ یا مسلمانوں کی حاجات (ضروریات) پر اس کو خرچ کرتے رہے۔

حاصل یہ کہ اس نصف کا نصف مسلمانوں کی حاجات کیلئے تھا۔ اور ہم اس کو بیت المال کہہ سکتے ہیں۔

پھر ایک اور طریق سے یہ روایت ذکر کی ہے۔

جب یہ اموال رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھ آئے تو ان کے پاس عمّال نہیں تھے جو ان زمینوں میں کام کرنے رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو بلایا اور ان کے ساتھ معاملہ کیا۔

ابوعبید نے ''کتاب الأ موال'' میں اس روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ان یہودیوں کے ساتھ نصف پر معاہدہ کیا۔ کہ زمین کی پیداوار میں سے نصف یہودی لیں گے اور نصف مسلمانوں کو ملے گا۔ یہ معاہدہ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اسی طرح چلتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ آیا تو اس وقت مسلمانوں میں بھی ایسے عمال کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی۔ جو زمینوں میں کام کرنے سے واقف ہو چکے تو حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو شام کی طرف جلا وطن کر دیا اور اموال کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ البتہ اس بارے ''اصحاب المغازی'' کے مابین اختلاف ہے کہ پورا خیبر عنوۃً فتح ہوا تھا۔ یا یہ کہ بعض خیبر صلحاً فتح ہوا تھا۔ اور ابوعمر بن عبد البر نے پہلے موقف کو صحیح کہا ہے۔ (کہ پورا خیبر عنوۃً فتح ہوا تھا) جبکہ موسیٰ بن عقبہ نے زھری رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرا موقف نقل کیا ہے۔ ابن عبد البر نے اس کی کو غلط قرار دیا ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے اہل سواد کو برقرار رکھا تھا۔ اور ان کی زمینوں پر خراج لازم کیا تھا کہ ہر جریب زمین پر چاہے آباد ہو یا غیر آباد ہو، اس میں زمین والے نے عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو، ایک درہم اور ایک قفیز، انگور کے ایک جریب پر دس قفیز کھجور کے ایک جریب پر پانچ قفیز، مالداروں کے غلاموں پر سال میں اڑتالیس درہم ان سے کم والوں پر چوبیس دراہم اور ان پر جو کچھ بھی نہ پاتے ہوں بارہ دراہم لازم کئے۔ پہلے سال حضرت عمرؓ کے پاس آٹھ کروڑ دراہم لائے گئے۔ جبکہ دوسرے سال بارہ کروڑ چالیس لاکھ دراہم لائے گئے۔

اصحاب شوافع کے مشہور قول کے مطابق یہ عنوۃً فتح ہوا تھا اور غازیوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا زمین کو اہل خمس کے ساتھ خاص کیا گیا اور منقولی چیزیں غازیوں کو دے دی گئیں اور ان کے ہاں صحیح و مشہور یہ ہے کہ عمرؓ نے اس کو اصل خمس کے ساتھ خاص نہیں کیا تھا۔ لیکن انہوں نے غازیوں کی طیب خاطر چاہی اور واپس کرنے کو کہا۔ تو انہوں نے ان اہل زمین کو خراج کے بدلے واپس کر دی جس کی ادائیگی وہ سالانہ کریں گے۔ ابن شریح کہتے ہیں کہ اس کو اس کے اہل پر قسطوں پر بیچا تھا اور ''کتب المغازی'' میں مشہور یہ ہے کہ سواد عنوۃً فتح ہوا ہے۔ عمرؓ نے ان پر روزینہ (وظیفہ) مقرر کیا تھا اور اس کو غانمین میں تقسیم نہیں کیا تھا۔ اس آیت کریمہ سے حجت پکڑتے ہوئے: **[ما آفاء اللّٰہ علی رسولہ...... والّذین جآؤوا من بعدھم]**

یعنی غنیمت اللہ کیلئے، اس کے رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کیلئے اور ان کیلئے جو ان کے بعد آئیں گے۔ اور ان کیلئے بطور احسان اور وضع، خراج و جزیہ کے ذریعہ ہے۔ اور عمرؓ نے اس آیت کی تلاوت کی ان کی مخالفت صرف چھوٹی سی جماعت کے علاوہ کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ جیسا کہ حضرت بلالؓ اور سلمانؓ حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر دعاء کرتے ہوئے فرمایا اے اللہ میرے لئے بلالؓ اور انکے ساتھیوں کو کافی ہو جا۔

''المبسوط'' میں منقول ہے کہ انہوں نے تعریف نہیں کی۔ اس پر نادم ہوئے اور عمرؓ کی رائے کی طرف رجوع کر لیا یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ قسمت اراضی سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ مکہ ''عنوۃً'' فتح ہوا ہے اور نبی ﷺ نے اس کی زمین کو تقسیم نہیں کیا۔ اور اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ صرف فتح کرنے سے ہی زمین مسلمانوں کیلئے وقف نہیں ہو جاتی۔ یہ قول اخبار اور اثار کے زیادہ قریب ہے۔ اور پہلے یہ بات گذر چکی ہے کہ شافعیہ کے اس دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ مکہ صلحاً فتح ہوا تھا بلکہ اس دعویٰ کے نقیض پر دلیل قائم ہے۔

۳۹۹۵:وَعَنْ خَوْلَةَ الْاَنْصَارِيَةِ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَقُوْلُ اِنَّ رَجَالاً يَتَخَوَّضُوْنَ فِيْ مَالِ اللّٰهِ بِغَيْرِ حَقٍّ فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٣٣ كتاب فرض الخمس' باب٧' الحديث رقم ٢٨١٨' وأحمد فی المسند ٦ / ٤١٠۔

ترجمہ:''اور حضرت خولہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بعض لوگ اللہ کا مال یعنی غنیمت فئی اور زکوۃ کے مال) میں ناحق (یعنی بغیر کسی استحقاق کے) تصرف کرتے ہیں' لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے قیامت کے دن آگ ہے۔'' (بخاری)

تشریح: جو اللہ تعالیٰ کے مال، یعنی غنیمت، مال فئی اور زکاۃ وغیرہ میں بغیر استحقاق کے تصرف کرتے ہیں ان کیلئے آگ ہے۔ اگر اس کو حلال سمجھ کر کرتے ہیں تو ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہیں گے۔ ورنہ اس وقت تک جہنم کی آگ میں رہیں گے کہ جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

''یوم القیامة'' کے الفاظ میں اشارہ ہے۔ کہ وہ جہنم میں اس دن کے اختتام سے پہلے داخل ہو جائیں گے۔ یا اس سے مراد مطابق دار آخرت ہو۔

مالِ غنیمت میں خیانت کا بیان

۳۹۹٦:وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :ذَاتَ يَوْمٍ فَذَكَرَ الْغُلُوْلَ فَعَظَّمَهُ وَعَظَّمَ اَمْرَهُ ثُمَّ قَالَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ بَعِيْرٌ لَهُ رُغَاءٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْئُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ فَرَسٌ لَهُ حَمْحَمَةٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَغِثْنِي فَاَ قُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَ كُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ شَاةٌ لَهَا ثُغَاءٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَ قُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدا بْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ نَفْسٌ لَهَا صِيَاحٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَااُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْئُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ رِقَاعٌ تَخْفِقُ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَ كُمْ يَجِيْئُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ صَامِتٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِي فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ ۔ (متفق عليه وهذا لفظ مسلم وهو اتم)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ١٨٥ كتاب الجهاد' باب الغلول' الحديث رقم ٣٠٧٣ و مسلم فی صحيحه ٣ / ١٤٦١' الحديث رقم (٢٤ ـ ١٨٣١) وأحمد فی المسند ٢ / ٤٢٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور (اس خطبہ کے دوران) مالِ غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہت بڑا گناہ بتایا اور بڑی اہمیت کے ساتھ اس کو بیان فرمایا اور پھر فرمایا کہ ''خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر بلبلاتے ہوئے اونٹ کو لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے (یعنی جو شخص مالِ غنیمت میں سے مثلاً اونٹ کی خیانت کرے گا تو وہ شخص میدانِ حشر میں اس حالت میں پاؤں کہ اس کی گردن پر وہی اونٹ لادا ہوگا اور بلبلا رہا ہوگا) اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی (شفاعت) کیجئے اور میں (اس کے جواب میں) یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں (یعنی میں تمہیں اللہ کے عذاب سے چھٹکارا نہیں دلا سکتا) کیونکہ میں نے تمہیں (دنیا میں) شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے (اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی گردن پر ہنہناتے ہوئے گھوڑے کو لادے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں (اس کے جواب میں) یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تم تک شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے (یعنی تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ مالِ غنیمت میں خیانت یا کسی چیز میں ناحق تصرف بہت بڑا گناہ ہے) (اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی گردن پر ممیاتی ہوئی بکری لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں (اس کے جواب میں) یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے (اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی گردن پر کسی چیختے چلاتے ہوئے آدمی کو (یعنی اس غلام یا باندی کو جو اس نے غنیمت کے قیدیوں میں سے خیانت کر کے لیا ہو) لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں (اس کے جواب میں) یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے (اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی گردن پر لہراتے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں (اس کے جواب میں) یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (خبردار!) میں تم میں کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی گردن پر سونا چاندی لادے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں (اس کے جواب میں) یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے''۔ اس روایت کو (معنی و مضمون کے اعتبار سے) بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے' الفاظ مسلم کے ہیں جو بخاری کے الفاظ کی بہ نسبت پورے و مکمل ہیں''۔

تشریح: ''قام فینا رسول اللّٰہ ﷺ ذات یوم...... وعظم امرہ:''

''ذات'' مقحم (یعنی زائد) ہے۔

''فذكر الغلول:'' ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ ''غلول'' سے مراد غنیمت میں خیانت ہے۔ دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ ''غلول'' عام ہے ہر خیانت اور دھوکہ کو ''غلول'' کہتے ہیں۔

''فعظمه'': یہ ''فذكر'' پر عطف ہے۔ اور اس کیلئے تفسیر ہے۔

''وعظم امره'': یہ بھی ماقبل کیلئے عطف تفسیری ہے۔ جبکہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب بات کہی ہے کہ یہ ''فعظمه'' پر عطف ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں: 'اعجبني زيدٌ وكرمه زيدٌ اى كرم زيدٌ اور اسی طرح یہ اگلی آیت بھی ہے:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرۃ۔۹] اى ويخادعون الّذين امنوا۔ ''فذكر'' پر یہ عطف بھی اسی طریقے پر ہے۔ اھ اس کا محل نظر ہونا کسی پر مخفی نہیں۔

قوله: ''لا ألفين أحدكم يجئ يوم القيامة على رقبته بعيرله رغاءٌ'':

''لاالفين'': اى لا أجدن نہی زیادہ بلیغ ہے۔ ''يجئ يوم القيامة'': یہ حال ہے ''من أحدكم'' سے۔

''على رقبة'': ''یجیء'' کی ضمیر سے حال ہے ''بعیر'' ظرف کا فاعل ہے مطلب یہ ہے کہ یہ حالت انتہائی فضیح وشنیع ہے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ میں تمہیں اس شنیع اور بری حالت پر دیکھوں کہ تم بر سر عام ذلیل اور رسوا ہو جاؤ۔ اور اس تاویل پر فصل ثانی میں آنے والی عبادۃ بن الصامت کی حدیث بھی دلالت کر رہی ہے: ''فانه عارٌ على اهله يوم القيامة'' کہ قیامت کے دن یہ اس کے اہل کیلئے عار ہوگا۔

''له'': ضمیر ''بعير'' کی طرف راجع ہے۔

''رُغاء'': راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اونٹ کی آواز کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے (النہایہ) ''يقول'' ''يا رسول الله أغثني'' ''فأقول ''لا املك لك شيئاً'''' ''قد أبلغتك''

اغثني: ''اغاثة'' سے امر کا صیغہ ہے اور اس سے مراد شفاعت ہے۔ یعنی اے اللہ کے رسول میری شفاعت کیجئے۔

میں کہوں کہ میں تم سے اللہ کا کچھ بھی عذاب نہیں دفع کر سکتا۔ میں نے تم کو دعوت پہنچا دی۔ سو مؤمنین کے سامنے حجت قائم ہوگئی۔ اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [ما على الرسول الا البلاغ المبين] رسول اللہ پر تو صرف پہنچانا ہی ہے۔

''محمحه'' گھوڑے کی آواز کو کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مطلق صوت مراد ہو۔

''على رقبته شاة لها ثغاء'' یہ ''ثغاء'' بکری کی آواز کو کہتے ہیں۔

نفسٌ لها صياحٌ''۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''النّفس'' سے مراد وہ غلام ہے جس کو ''قیدیوں'' میں سے خیانت کر کے حاصل کیا گیا ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ناحق قتل ہوا ہو۔

قوله: ''رقاع تخفق'' ''رقاع'' راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ''رقعة'' کی جمع ہے۔ کپڑے کے پیوند کو کہتے ہیں۔ یعنی کپڑے کا وہ ٹکڑا جس کو اس نے غنیمت سے خیانت کر کے لیا ہو۔ یا یہ کہ اس نے ناحق لیا ہو یا اس کو بغیر استحقاق کے پہنا ہو۔ جیسا کہ جاھل صوفیاء کے پیوند لگے ہوئے کپڑے ہوتے ہیں۔

''تخفق''''فاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔وہ اضطراب وحرکت میں ہوگا جیسا کہ جھنڈ لہراتا ہے۔

قوله: ''علٰی رقبته صامت'':

''صامت''''ناطق'' کا متضاد ہے۔اور مراد اس سے سونا چاندی اوراس کے قائم مقام چیزیں ہیں۔

مالِ غنیمت میں خیانت

۳۹۹۷:وَعَنْهُ قَالَ اَهْدٰى رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :غُلَامًا يُقَالُ لَهٗ مِدْعَمٌ فَبَيْنَمَا مِدْعَمٌ يَحُطُّ رَحْلًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِذَا اَصَابَهٗ سَهْمٌ عَائِرٌ فَقَتَلَهٗ فَقَالَ النَّاسُ هَنِيْئًا لَهُ الْجَنَّةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَلَّا وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِىْ اَخَذَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَا نِمِ لَمْ تُصِبْهَا الْمَقَاسِمُ لَتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ النَّاسُ جَاءَ رَجُلٌ بِشِرَاكٍ اَوْشِرَاكَيْنِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَقَالَ شِرَاكٌ مِنْ نَارٍ اَوْشِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ. (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ١١ / ٥٩٢ كتاب الايمان والنذور، باب هل يدخل فى الايمان الحديث و مسلم فى ١ / ١٠٨، الحديث رقم (١٨٣ ـ ١١٥) و أبو داود فى السنن ٣ / ١٥٥) الحديث رقم ٢٧١١، والنسائى فى ٧ / ٢٤ الحديث رقم ٣٨٢٧و مالك فى الموطا ٢ / ٤٥٩، الحديث رقم ٢٥، من كتاب الجهاد۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدعم نامی ایک غلام بطور تحفہ پیش کیا (ایک دن غالبًا کسی میدان جنگ میں) وہ رسول اللہ ﷺ کا کجاوہ اتار رہا تھا کہ اچانک کسی نامعلوم شخص کا تیر آ کر اس کو لگا جس سے وہ ہلاک ہوگیا' لوگوں نے کہا (مدعم کو جنت مبارک ہو مدعم خوش قسمت رہا کہ آپ ﷺ کی خدمت کرتے ہوئے شہید ہوا اور جنت میں پہنچ گیا)۔(یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''نہیں! ایسا نہیں ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے' وہ چادر جس کو مدعم نے خیبر کے دن مالِ غنیمت میں سے اس کی تقسیم سے قبل لے لیا تھا' آگ بن کر مدعم پر شعلے برسا رہی ہے''۔ جب (ان) لوگوں نے (اس شدید وعید وتنبیہ کو) سنا (جنہوں نے مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کو سہل سمجھ لیا تھا اور یہ گمان کرلیا تھا کہ چھوٹی موٹی اور حقیر چیزوں کو لے لینے پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا تو وہ کانپ گئے اور انہوں نے مالِ غنیمت میں سے جو چھوٹی موٹی چیزیں لے لی تھیں ان کو لا لا کر واپس کرنے لگے یہاں تک کہ) ایک شخص ایک تسمہ یا دو تسمے (واپس کرنے کے لئے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا۔آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ ''یہ آگ کا ایک تسمہ ہے یا آگ کے دو تسمے ہیں (یعنی خیانت کی چیز ہر حالت میں دوزخ کا سزاوار کرے گی خواہ وہ کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو)''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ''اهدٰى رجلٌ لرسول اللّٰه ﷺ غلامًا ــــهنيًا له الجنة:

''عائر'':اس سے مراد یہ ہے کہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کس نے تیر پھینکا ہے۔

''فقال رسول الله ﷺ كلا'': یہ ''ردع'' کیلئے ہے۔یعنی ایسا نہیں ہے جیسا کہ تمہارا خیال ہے۔

''الشملة''۔مردوں کے اوڑھنے کی چادر

من المغانم'': ایک نسخہ میں ''من الغنائم'' ہے۔

''لم تصبها المقاسم'': ''ھا'' ضمیر کا مرجع ''شلمه'' اور ''غنائم'' دونوں ہو سکتے ہیں۔اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: پہلا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے تقسیم غنائم سے پہلے اس کو لے لیا۔

دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے اس کو تقسیم میں داخل کرنے سے پہلے لے لیا ہو۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ''اخذھا'' کے مفعول سے حال ہے۔ای ''اخذها غير مقسومةٍ او اخذها قبل القسمة'' اس لئے کہ یہ غلول ہے کیونکہ اس وقت یہ چادر غانمین کے درمیان مشترک تھی اب واپس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں رہا۔

قوله: ''لتشتعل عليه نارًا'': یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے معاف نہ کیا تو وہ آگ میں جائے گا۔اس کلام میں صحابہؓ کے کلام کی تردید ہے۔کہ وہ بغیر کوئی سزا بھگتے یقینی طور پر جنت میں جائے گا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ان الشملة'' صحابہ کے اس قول ''هنيئًا له بالجنة'' کا جواب ہے۔اس وجہ سے کہ انہوں نے قطعی طور پر (یقینی طور پر) کہہ دیا کہ اب وہ جنت میں داخل ہو گیا اور وہاں عیش کر رہا ہے۔نبی کریم ﷺ نے اپنے کلام کے آغاز میں ''کلاّ'' کو داخل کیا تا کہ ان کے حکم کی تردید ہو جائے۔مابعد کے حکم کو ثابت کیا جائے۔اور اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے۔جس میں ہے: ''انّی رأیتُه فی النار''

''نارًا'': تمیز ہے۔اور اس کلام میں مبالغہ ہے کہ وہ چادر شعلہ بن گئی اور پورے طور پر وہ آگ بن گئی جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: [واشتعل الرأس شيبًا]۔قوله: ''فلما سمع ذالك الناس جآء رجلٌ بشراك او بشراكين الى النبی ﷺ'':

جب ان لوگوں نے اس شدید وعید کو سنا جو غنیمت میں خیانت کو معمولی سمجھتے تھے۔یا یہ خیال کرتے تھے کہ یہ بھی ان حقیر گناہوں میں سے ہے جو قابل تسامح ہیں۔

قوله: ''فقال: شراكٌ من النّار......'':

مطلب یہ کہ اگر یہ آدمی اس کو واپس نہ کرتا تو یہ آگ کا تسمہ بن جاتا یا باعتبار ''ما کان'' یہ آگ کا تسمہ تھا۔

''أو شرا كان من نار'' ای يعذب بهما حال كونهما مجعو لين من النار أو بمقدار ها منها ان دونوں کے ذریعے اس کو عذاب دیا جائے گا اس حال میں کہ یہ تسمے آگ سے بنے ہوں گے۔یا ان دونوں کی مقدار کے بقدر عذاب دیا جائے گا۔اس میں سخت دھمکی ہے اس شخص کے حق میں جو ایسے مال سے کھاتا ہے جس کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کے حقوق وابستہ ہیں۔جیسا کہ وقف کا مال، بیت المال کا مال ہے۔اس لئے کہ اس کو حلال سمجھ کر توبہ کرنا یا ان عام حقوق کا مالک کو واپس کرنا متعذر یا مشکل ضرور ہے۔

فوائد حدیث:

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں تنبیہ ہے کہ خود ان تسموں کے ذریعے سے اس کو عذاب دیا جائے گا یہ چیزیں آگ کی بنی ہوں گی یا یہ کہ تسمے آگ کے عذاب کا سبب بنیں گے۔اس میں غلول کی حرمت کی شدت کا بیان ہے۔اور یہ کہ اس کی تحریم میں قلیل وکثیر برابر ہے۔اور یہ کہ ''غلول'' کی وجہ سے ''خائن فی الغنیمت'' (کو جہاد میں موت آجائے تو اس کی موت) پر شہادت کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔اھ۔

لیکن میں (ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ یہ آخری بات محل بحث ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے حدیث میں اس کی شہادت کی نفی پر کوئی دلالت نہیں پائی جارہی اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قتل ہوا ہے ۔جبکہ شہید کے بارے میں بالاجماع یہ شرط نہیں ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہ ہو یا اس پر دَین نہ ہو۔اور اس حدیث سے بلاضرورت قسم اٹھانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ حکم کی تاکید کیلئے ہے۔لہٰذا یہ قسم بلا فائدہ نہیں ہے اور حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس نے غلول کیا ہو اگر وہ اس کو واپس کرے تو اس کو قبول کیا جائے گا اور اس کے سامان کو جلایا نہیں جائے گا۔اور یہ حدیث: ''من غلّ فاحرقوا متاعه'' (جس نے غلول کیا اس کے سامان کو جلادو) ضعیف ہے۔ابن عبدالبر وغیرہ نے اس کی تضعیف بیان کی ہے۔امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر یہ صحیح ہو تو پھر یہ نسخ پر محمول ہے اھ

یہ محل نظر ہے چونکہ حدیث کی دلالت اس پر ہے کہ جو اس کو قبل از تقسیم واپس کردے۔اور بعد از تقسیم واپسی کے بارے میں کہ جب اس کو صاحب حق کے پاس پہنچانا متعذر ہو جائے۔متکلم فیہ ہے۔اور عنقریب حدیث میں آئے گا کہ ایک صاحب مالِ غنیمت تقسیم ہو چکنے کے بعد کچھ لے کر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کردیا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبول نہیں کیا۔(متفق علیہ)

مالِ غنیمت میں خیانت کا ایک واقعہ

۳۹۹۸:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ كَانَ عَلٰى ثَقَلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهٗ كِرْكِرَةُ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :هُوَ فِي النَّارِ فَذَهَبُوْا يَنْظُرُوْنَ فَوَجَدُوْا عَبَاءَةً قَدْ غَلَّهَا ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٨٧، كتاب الجهاد، باب القليل من الغلول، الحديث رقم ٣٠٧٤ وأخرجه ابن ماجه فی السنن ٢ / ٩٥٠، الحديث رقم ٢٨٤٩، وأحمد فی المسند ٢ / ١٦٠

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام کرکرہ تھا (کسی غزوے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی طرف سے سامان واسباب) کا نگران مقرر ہوا' اس کا انتقال ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''وہ (کرکرہ) دوزخی ہے''۔چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے (اس کے سامان کو) دیکھنا شروع کیا تو انہوں نے ایک کملی پائی جس کو اس نے (مالِ غنیمت میں سے خیانت کر کے) چوری کیا تھا''۔(بخاری)

تشریح: **قوله:كان علٰى ثقل النبی ﷺ رجل يقال له كركرة''**

''ثقل'': اس سے مراد سامان ہے''الفائق'' کے مطابق اس سے وہ سامان مراد ہے جس کو سواری پر رکھا جاتا ہے۔اور''المغرب'' میں ہے کہ ہر ذی خطر اور نفیس چیز کو''ثقل'' کہتے ہیں۔قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے سامان وغیرہ مراد ہے۔''القاموس'' میں ہے کہ''ثقل'' بروزن''عِنَبْ'' خفة کی ضد ہے۔اس سے مراد مسافر کا سامان ہے۔اور اثقال ''ثقل'' بکسر الثاء کی جمع ہے یہ متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے زمین کے خزانے مردے اور گناہ وغیرہ''کر کرۃ'': ہر دو کاف کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ منقول ہے۔(المغنی)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کاف اول پر فتحہ اور کسرہ دونوں ہے جبکہ کاف ثانی مکسور ہے۔ابن الملک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دونوں کاف کسرہ کے ساتھ ہیں۔

''عباء ۃ'': عین کے فتحہ اور مدّ کے ساتھ ہے ایک لمبی دھاری دار چادر۔اس میں ایک لغت''عباء ۃ'' بھی ہے یعنی عین کے فتحہ اور یائے تحتانیہ کے ساتھ ہے۔اور علامہ جوہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ''عباۃ'' اور''عباءۃ'' چادروں کی ایک قسم ہے۔

''القاموس'' میں باب الہمزہ کے تحت لکھتے ہیں کہ''عبا'' چادر کی ایک مشہور قسم ہے، جیسا کہ عباءۃ، اور باب الیاء میں لکھتے ہیں''عَبَایَة'' کہ یہ ایک مشہور قسم کی چادر ہے۔جیسا کہ''عبائة''

مالِ غنیمت میں ملنے والی کھانے پینے کی اشیاء کا بیان

۳۹۹۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نُصِيبُ فِيْ مَغَازِيْنَا الْعَسَلَ وَالْعِنَبَ فَنَأْكُلُهُ وَلَا نَرْفَعُهُ.

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٢٥٥ کتاب فرض الخمس' باب ما یصیب من الطعام' الحدیث رقم ٣١٥٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں غزوات میں شہد اور انگور ملتے تو ہم ان کو کھا لیتے تھے' انہیں اٹھا کر لے نہیں جاتے تھے'' (یعنی انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچاتے تھے)۔(بخاری)

تشریح: قوله: کنّا نصیب فی مغازینا العسل والعنب فنأکله ولا نرفعه''

''مغازی'': ''مغزٰی'' کی جمع ہے۔مصدر میمی ہے۔یا اسم زمان یا مکان ہے۔''غزا یغزو'' سے ماخوذ ہے۔ ''مغازینا'' اصل میں''مغاز ونا'' تھا واؤ کو یاء سے بدلا گیا۔اس لئے کہ واؤ ساکن ماقبل مکسور تھا۔

یہ ساری چیزیں مل جاتی تھیں یا ان میں سے بعض ہوتی تھیں تو ہم ان چیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تقسیم کی غرض سے نہیں لے جاتے تھے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ غازیوں کیلئے طعام کھانا جائز ہے اگرچہ تقسیم سے قبل ہو۔لیکن بقدر حاجت وضرورت جب تک کہ یہ لوگ دار الحرب میں ہیں روٹی، گوشت وغیرہ کھانا جائز ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس میں احتمال ہے کہ راوی یہ کہنا چاہتا ہو کہ ہم اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اجازت کی غرض سے نہیں لے جاتے تھے اس لئے کہ اس کے کھانے کی اجازت پہلے سے مل چکی تھی۔یا یہ کہ ہم اس کو ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ صاحب ہدایہ کے اس قول: ولا بأس بأن یعلف العکسر فی دار الحرب ویا کلوا حا

وجدوه من الطعام کے تحت لکھتے ہیں:

اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں جو کچھ ہے (دو حال سے خالی نہیں) یا وہ ماکولات میں سے ہو یا نہیں۔ اور جو چیزیں کھانے کی ہیں کہ یا تو بطور دوا استعمال ہوتی ہیں یا نہیں۔ دوسری چیز کا استعمال درست نہیں ہے سوائے اسلحہ اور سواری وغیرہ کے۔ جیسا کہ گھوڑا ہے۔ اس کا جواز صرف اس وقت ہے جب اس کی ضرورت پڑے مثلاً کسی کا گھوڑا میدان جنگ میں مر گیا یا اس کی تلوار ٹوٹ گئی تو اس وقت مالِ غنیمت میں سے ان اشیاء کا استعمال جائز ہے۔ اگر یہ ارادہ ہو کہ اس سے اپنے گھوڑے کو طاقتور کر دے یا اپنی تلوار میں اضافہ کریں تو تب اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ اگر ایسا کر لیا تو گنہگار ہوگا۔ لیکن ضیاع کی صورت میں ضامن نہیں ہوگا۔ جیسا کہ سوختنی لکڑی وغیرہ برخلاف گھاس کے کہ اس کے استعمال کا علی الشرکتہ سب استحقاق رکھتے ہیں۔ یہ چیز کسی بھی صورت میں کسی کے ساتھ بایں طور خاص نہیں ہوگی کہ جس سے اس سے ملکیت کا اثر استحقاق سے اضافی نظر آئے۔ برخلاف حالت ضرورت کے۔ اس لئے کہ حالت ضرورت رخصت کا سبب ہے۔ اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن جنگ کے بعد اس کو مالِ غنیمت میں واپس لوٹائے گا۔ اور اسی طرح کپڑا کا استعمال ہے کہ اگر اس کو سردی نقصان دے دے تو اس وقت استعمال کی اجازت ہے، لیکن حاجت پوری ہونے کے بعد واپس کرے گا۔ اگر واپس کرنے سے پہلے پہلے تلف ہو گیا تو اس پر کوئی ضمان نہیں ہوگا۔ لیکن اگر سب کو کپڑوں اور اسلحہ کی ضرورت پڑی تو اس کو اس وقت تقسیم کریں گے۔ برخلاف قیدیوں کے کہ ان کو تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ جب ان کی ضرورت پڑے اس لئے کہ یہ اصل ضرورت میں سے نہیں ہے۔

البتہ وہ اشیاء لینا کسی کے لئے بھی جائز نہیں جن سے علاج معالجہ کیا جاتا ہے اس طرح خوشبو اور تیل جو کھایا نہیں جاتا اس لئے کہ خارج از حاجت ہیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**ردوا الخيط والمخيط**'' (تم دھاگے اور سوئی کو واپس کیا کرو)۔ لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کسی کو کوئی ایسا مرض لاحق ہو گیا جس کی وجہ سے اس کو اس چیز کی ضرورت پڑ گئی تو اس کیلئے استعمال جائز ہے۔ جیسا کہ کپڑے کا پہننا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اعتبار حاجت وضرورت کا ہے۔ اور وہ اشیاء خورد نوش جس سے علاج نہیں کیا جاتا ان کا کھانا جائز ہے۔ چاہے وہ کھانے کیلئے تیار حالت میں ہوں جیسا کہ پکا ہوا گوشت روٹی، تل، شہد، خشک وتر میوہ جات، پیاز، جو، اور خوردنی تیل۔ مثلاً زیتون کا تیل وغیرہ۔ تو ان چیزوں کا کھانا اور بطور تیل ان کو استعمال کرنا دونوں جائز ہیں۔ اور اسی طرح وہ چیزیں جو فی الحال کھانے کیلئے تیار شدہ نہ ہوں البتہ کھائے جاتی ہوں مثلاً گائے، بکری وغیرہ تو ان کو ذبح کر کے کھایا جا سکتا ہے۔ (اور اسی طرح جانوروں کے کھروں کو تیل سے مالش کرنا) البتہ ان جانوروں کی کھالیں غنیمت میں واپس کی جائیں گی یہ عدم شرط از روئے استحسان کے ہے ''**السّیر الصغیر**'' میں کھانے میں بھی حاجت از روئے قیاس کو شرط قرار دیا ہے۔ جبکہ ''السیر الکبیر'' میں حاجت کی شرط کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ یہ عدم شرط از روئے استحسان ہے اور یہی ائمہ ثلاثہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں۔ البتہ ہر غنی (مالدار) اور فقیر کیلئے اس کو تناول کرنا جائز ہے۔ مگر تاجر کیلئے اور لشکر کے اس خادم کیلئے جو اجرت پر آیا ہو جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ایسا کر لیا تو ان پر ضمان نہیں ہوگا۔ اور اتنا لے گا جتنا کہ اس کو اور اس کے ساتھ آنے والے غلاموں، عورتوں اور بچوں کو کفایت کر جائے۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''خیبر'' کے موقع پر ارشاد فرمایا: ''كلوا واعلفوا ولا تحملوا'' (خود کھاؤ۔ جانوروں کو چارہ کھلاؤ اور اس کو اٹھا کر مت لے جاؤ۔)

امام واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ''مغازی'' میں ایک دوسری سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور بیہقی نے ''ہانی بن کلثوم'' سے اس طرح نقل کیا ہے کہ شام کے لشکر کے اُمیر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ بے شک ہم نے ایسی زمین کو فتح کر لیا ہے جس میں کھانے اور چارہ کی کثرت ہے۔ میں نے ناپسند سمجھا کہ میں ان میں سے کسی چیز کے بارے میں کوئی حکم دوں حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ چھوڑ دو وہ اس میں سے کھائیں اور جانوروں کو بھی کھلائیں اور جس کسی نے کوئی چیز سونے یا چاندی کے بدلے میں بیچی تو اس میں اللہ کیلئے خمس ہوگا۔ اور مسلمانوں کیلئے سہام ہوں گے۔

۴۰۰۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ اَصَبْتُ جِرَابًا مِنْ شَحْمٍ يَوْمَ خَيْبَرَ فَالْتَزَمْتُهُ فَقُلْتُ لَا اُعْطِي الْيَوْمَ اَحَدًا مِنْ هٰذَا شَيْئًا فَالْتَفَتُّ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَتَبَسَّمُ اِلَيَّ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٢٥٥ كتاب فرض الخمس' باب ما يصيب من الطعام' الحديث رقم ٣١٥٣ و مسلم فی ٣ / ١٣٩٣' الحديث رقم (٧٢ - ١٧٧٢) والنسائی فی السنن ٧ / ٢٣٦' الحديث رقم ٤٤٣٥' والدارمی فی ٢ / ٣٠٦' الحديث رقم ٢٥٠٠' وأحمد فی المسند ٥ / ٥٦

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ خیبر کے دن مجھ کو چربی سے بھری ہوئی ایک تھیلی ملی۔ میں نے اس کو اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا کہ آج میں اس چربی میں سے کسی کو کچھ نہیں دوں گا۔ پھر میں نے (پیچھے مڑ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ میری جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله :اصبت جرابامن شحم يوم خيبر

''جراب'' جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

''لطائف'' میں سے ہے کہ ''لا يفتح الجراب ولا يكسرا لقنديل'' لفظ ''جراب'' کو مفتوح نہ پڑھا جائے اور قندیل کو مسکور نہ پڑھا جائے ''القاموس'' میں ہے کہ ''جراب'' کو جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے گا، مفتوح نہیں پڑھا جائے گا یا یہ بھی کوئی لغت ہے اس کو قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

من تبعیضیہ ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ''مِنْ'' یہاں پر ''بیان'' کیلئے ہے۔ اور (محذوف کے متعلق ہو کر) ''جراب'' کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ اور عبارت اس طرح ہوگی ''جرابًا مملوءً من شحمٍ لا أعطی اليوم احدًا من هذا شيئًا''

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اليوم'' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس وقت حالت اضطراری میں تھے اور وہ اضطرار اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ اپنے نفس کو دوسروں پر ترجیح دینا چاہتے تھے۔ یہ ان میں سے نہیں تھا جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے: [ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة] اور اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔

قوله: ''فالتفت فاذا رسول اللّٰه ﷺ يتبسَّمُ اليَّ'':

علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے اس بات کا جواز معلوم ہورہا ہے کہ مالِ غنیمت میں سے کھانے کیلئے بقدر ضرورت لینا مجاہدین کے لئے جائز ہے۔اھ اور ماقبل میں گذر چکا ہے کہ تیل بھی اسی حکم میں ہے اور کبھی چراغ جلانے کیلئے چربی وغیرہ بھی ضرورت ہوتی ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے حربیوں کے طعام کی اباحت معلوم ہورہی ہے کہ وہ کھانا پینا درست ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ علماء کرام کا اجماع ہے کہ جب تک مسلمان دارالحرب میں ہیں اس وقت تک بقدرِ ضرورت کھا سکتے ہیں۔ علماء میں سے سوائے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے کسی نے امام سے اجازت لینے کی شرط نہیں لگائی ہے۔اور جمہور علماء کا موقف ہے کہ وہاں سے کوئی چیز اپنے ساتھ دارالاسلام نہیں لے جا سکتے۔اگر نکال کر لے گئے تو اس کو مالِ غنیمت میں لوٹانا ضروری ہے۔اور اس میں سے کوئی چیز دارالحرب میں بیچنا بھی جائز نہیں ہے۔اور بحالت جنگ ان کی سواریوں پر ہونا، اور ان کے کپڑے پہننا اور ان کے اسلحہ کو بغیر اجازت امام کے استعمال کرنا درست ہے۔البتہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اذن کو شرط قرار دیا ہے۔اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کے ذبیحہ کے شحوم (چربی) کو کھانا جائز ہے اگرچہ یہ ان پر حرام کی گئی تھی۔

الفصل الثانی:

مالِ غنیمت کا حلال ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے

۴۰۰۱:وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ اِنَّ اللّٰهَ فَضَّلَنِیْ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ اَوْ قَالَ فَضَّلَ اُمَّتِیْ عَلَى الْاُمَمِ وَاَحَلَّ لَنَا الْغَنَائِمَ ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن' کتاب السیر' باب ما جاء فی الغنیمة' الحدیثوقم ۱۵۵۳ و أحمد فی المسند ۵ / ۲۴۸

ترجمہ:''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو انبیاء پر فضیلت و بزرگی عطا فرمائی ہے یا یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کو دوسری امتوں پر فضیلت و بزرگی عطا فرمائی ہے اور مالِ غنیمت کو ہمارے لئے حلال قرار دیا ہے''۔(ترمذی)

تشریح: قوله:انَّ الله فضَّلني على الأنبيآء'':

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت وفوقیت دی ہے۔ اور ان میں بعض رسول بھی تھے اور دلیل یہ حدیث ہے:''آدم ومن دونه تحت لوائی یوم القیامة''

قوله:''فضل امتی علی الأمم:

قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ اس کی دلیل ہے:[کنتم خیر امة] اس امت کے بہترین امت ہونے سے لازم آتا ہے کہ اس امت کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب (رسولوں) سے بہترین ہو۔ بعض نے اس کا الٹ کہا ہے کہ خیریت امت خیریت

رسول ﷺ کی وجہ سے ہے۔اور اسی بات کی طرف ''صاحب بردہ'' نے اشارہ کیا ہے۔:

''لما دعا اللّٰه داعينا لدعوته ☆ بآفضل الرسل كنّا افضل الأمم''

قوله:''واحل لنا الغنائم'':

ہمارے لیے غنائم کا حلال ہونا یہ ہماری خصوصیات میں سے ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ اختصاص کی علّت افضلیت ہی ہے۔یہ کسی اور علّت کے منافی نہیں جیسا کہ وارد ہے۔''انّه احلهالنا لعجزنا وضعفنا''۔طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ''احل'' ''فضل'' پرعطف بطریق حصول ووجود کے ہے۔اور ثانی کے اول پر ترتب کو پرذہن سامع کے سپرد کر دیا ہے۔جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:[ولقد اتينا داؤد وسليمان علمًا وقالا الحمد للّٰه]

اور بہر دو تقدیر ''لنا'' تعظیم کیلئے ہے۔پہلی صورت میں تو ظاہر ہے۔اس لئے کہ واحد سے ضمیر جمع کی طرف عدول کرنا ''تعظیم'' کو بتلا رہا ہے۔اور دوسری تقدیر پر اس لئے کہ آپ ﷺ نے اپنے نفس زکیہ کو اس امت میں داخل کیا ہے۔آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی: ''ذالك بأن اللّٰه رأى ضعفنا وعجزنا'' ظاہر کرتا ہے درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاں اظہار ضعف و عجز کی بہت بڑی فضیلت ہے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یا یہ بتلانا ہے کہ فضیلت وہبی چیز ہوا کرتی ہے، کسبی نہیں ہوتی۔اور اللہ ضعیف کو ایسی جگہ سے رزق عطا کرتا ہے کہ قوی کو کو انتہائی تعجب ہوتا ہے۔''باب ثواب هذا الأمة'' کی پہلی حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے۔

۴۰۰۲:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَوْمَئِذٍ يَعْنِىْ يَوْمَ حُنَيْنٍ مَنْ قَتَلَ كَافِرًا فَلَهُ سَلَبُهُ فَقَتَلَ اَبُوْطَلْحَةَ يَوْمَئِذٍ عِشْرِيْنَ رَجُلاً وَاَخَذَ اَسْلَا بَهُمْ (رواه الدارمی)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۶۲ كتاب السير' باب من قتل قتيلاً فله سلبه الحديث رقم ۲۷۱۸' والدارمی فی ۲ / ۳۰۱' الحديث رقم ۲۸۸۴' وأحمد فی المسند ۳ / ۱۱۴

ترجمه: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس روز یعنی غزوۂ حنین کے دن ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی کافر (دشمن) کو قتل کیا' اس (مقتول) کا مال واسباب اسی (قاتل) کو ملے گا''۔چنانچہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس دن (دشمن کے) بیس آدمیوں کو قتل کیا اور ان کا سب مال واسباب حاصل کر لیا''۔(دارمی)

تشریح: قوله:قال:قال رسول يومئذيعنى يوم حنين:

مابعد جملہ تفسیر یہ ہے ''يومئذٍ'' کی تفسیر کر رہا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ''سلب'' قاتل کو ملے گا چاہے اس کا غنیمت میں حصہ ہو یا نہ ہو۔اور یہ ''بطریق تنفیل'' کے ہوگا۔اور اس پر ''فاءتعقیبیہ'' دلالت کر رہا ہے۔''ابوطلحہ'' سے مراد ام انسؓ کے شوہر ہیں۔

تخریج: علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور مسلم کی شرط پر ہے۔

''سلب'' میں خمس کا بیان

۴۰۰۳: وَعَنْ عَوْفِ ابْنِ مَالِكِ الْاَشْجَعِيِّ وَخَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : قَضٰى فِي السَّلَبِ لِلْقَاتِلِ وَلَمْ يُخَمِّسِ السَّلَبَ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱٦٥ كتاب الجهاد' باب فی السلب لا يخمس' الحديث رقم ۲۷۲۱ وأحمد فی المسند ٦ / ۲٦

ترجمہ: ''اور حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتول کے مال واسباب کے بارے میں حکم فرمایا کہ وہ قاتل کا حق ہے' نیز آپ ﷺ نے اس مال واسباب میں سے خمس نہیں نکالا (جیسا کہ مالِ غنیمت میں سے نکالتے تھے)''۔ (ابوداؤد)

۴۰۰۴: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ نَفَّلَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : يَوْمَ بَدْرٍ سَيْفَ اَبِيْ جَهْلٍ وَكَانَ قَتَلَهٗ . (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱٦٦ كتاب الجهاد' باب من اجاز علی جريح' الحديث رقم ۲۷۲۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر کے دن مجھ کو ابوجہل کی تلوار اضافی طور پر عطا فرمائی۔ اس کو (یعنی ابوجہل کو) انہوں نے (یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے) ہی قتل کیا تھا۔''

(ابوداؤد)

تشریح: قوله: نفلنی رسول الله ﷺ یوم بدر ....

''نفلنی'': یہ تشدید فاء کے ساتھ ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی تفصیل ''فصل ثالث'' میں آئے گی۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کو قتل کیا تھا یعنی اس کے سر کو جدا کیا تھا۔ جبکہ اس میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی۔ ورنہ درحقیقت تو اس کو دو انصاریوں (معاذ و معوذ رضی اللہ عنہما) نے قتل کیا تھا۔ یہ راوی کا کلام ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کا کلام ہو لیکن اس میں ''تجرید'' کی گئی ہو اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ کلام میں ''صفت التفات'' ہو۔

مالِ غنیمت سے غلام کو حصہ دینے کا بیان

۴۰۰۵: وَعَنْ عُمَيْرٍ مَوْلٰى اَبِي اللَّحْمِ قَالَ شَهِدْتُ خَيْبَرَ مَعَ سَادَتِيْ فَكَلَّمُوْا فِيَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : وَكَلَّمُوْهُ اَنِّيْ مَمْلُوْكٌ فَاَمَرَنِيْ فَقُلِّدْتُ سَيْفًا فَاِذَا اَنَا اَجُرُّهٗ فَاَمَرَلِيْ بِشَيْءٍ مِنْ خُرْثِيِّ الْمَتَاعِ وَعَرَضْتُ عَلَيْهِ رُقْيَةً كُنْتُ اَرْقِيْ بِهَا الْمَجَانِيْنَ فَاَمَرَنِيْ بِطَرْحِ بَعْضِهَا وَحَبْسِ بَعْضِهَا .

(رواہ الترمذی وابوداؤد الا ان روايته انتهت عند قوله المتاع)

اخرجه أبو داؤد فی السنن ۳ / ۱۷۱' الحديث رقم ۲۷۳۰' والترمذی فی ٤ / ۱۰۷' كتاب السير' باب هل

يسعم للعبد' الحديث رقم ١٥٥٧ وابن ماجه فى ٢ / ٩٥٢ الحديث رقم ٢٨٥٥' والدارمى فى ٢ / ٢٩٨' الحديث رقم ٢٤٧٥' وأحمد فى المسند ٥ / ٢٢٣

ترجمہ: ''اور حضرت عمیر رضی اللہ عنہ ابی اللحم رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے' کہتے ہیں کہ میں اپنے مالکوں کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک تھا (اس غزوہ کے لئے روانگی کے وقت) میرے مالکوں نے میرے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی (یعنی انہوں نے میری تعریف وتوصیف کی اور عرض کیا کہ میدان جنگ میں لڑنے کے لئے یا خدمت کی غرض سے عمیر رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے چلئے) نیز انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی بتایا کہ میں ایک مملوک (غلام) ہوں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (میرے مالکوں کی درخواست منظور فرمائی اور) میرے بارے میں حکم ارشاد فرمایا تو (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق) مجھے تلوار دے دی گئی (یعنی ایک تلوار میری گردن میں ڈال دی گئی) میں (جب چلتا تو صغر سنی کی وجہ سے یا اپنے کوتاہ قد ہونے کے سبب) اس تلوار کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چلتا' پھر (دشمن پر غلبہ حاصل کر لینے کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم شروع ہوئی تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مالِ غنیمت میں سے تھوڑا بہت مجھے بھی دیئے جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ نیز (ایک موقع پر) میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا وہ منتر پڑھ کر سنایا جو میں دیوانگی کے مریضوں پر پڑھا کرتا تھا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس کے بعض حصوں کو ترک کر دینے اور بعض حصوں کو باقی رکھنے کا حکم دیا۔ اس روایت کو ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤد کی روایت لفظ المتاع پر پوری ہوگئی ہے''۔

تشریح: قوله: وعن عمير مولى۔۔۔فكلموه انى مملوك:

''وكلموه انى مملوكٌ'' طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا عطف ''فكلموا فى'' پر ہے۔

''قلّدت'' یہ لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔

''فاذا انا اجره'': اذا ''مفاجاتیہ'' ہے۔

خیبر کے مالِ غنیمت کی تقسیم

۴۰۰۶: وَعَنْ مُجَمِّعِ بْنِ جَارِيَةَ قَالَ قُسِمَتْ خَيْبَرَ عَلَى اَهْلِ الْحُدَيْبِيَّةِ فَقَسَمَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ سَهْمًا وَكَانَ الْجَيْشُ اَلْفًا وَخَمْسَمِائَةٍ فِيْهِمْ ثَلَاثُمِائَةِ فَارِسٍ فَاَعْطَى الْفَارِسَ سَهْمَيْنِ وَالرَّاجِلَ سَهْمًا (رواه ابوداود وقال حديث ابن عمر اصح والعمل عليه واتى الوهم فى حديث مجمع) اَنَّهُ قَالَ ثَلَاثُ مِائَةِ فَارِسٍ وَاِنَّمَا كَانُوْا مِائَتَىْ فَارِسٍ۔

احرجه أبو داود فى السنن ٣ / ١٧٤' كتاب الجهاد' باب فيمن اسهم له سهماً' الحديث رقم ٢٧٣٦ وأحمد فى المسند ٣ / ٤٣٠

ترجمہ: ''اور حضرت مجمع بن جاریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ خیبر (میں حاصل شدہ مالِ غنیمت اور زمین) اہل

حدیبیہ میں (یعنی ان لوگوں کے درمیان جو حدیبیہ کی صلح میں شریک تھے) تقسیم کیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس (خیبر کے مالِ غنیمت اور زمین) کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم فرمایا اور (صلح حدیبیہ میں شریک) لشکر کی تعداد پندرہ سو آدمیوں پر مشتمل تھی جن میں تین سو گھڑ سوار تھے' آپ ﷺ نے سوار کو دو حصے دیئے اور پیادہ کو ایک۔ ابوداؤد نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس بارے میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت زیادہ صحیح ہے اور اسی پر اکثر ائمہ نے عمل کیا ہے' نیز مجمع رضی اللہ عنہ کی (اس روایت میں واہمہ واقع ہوا ہے کہ انہوں (مجمع رضی اللہ عنہ) نے کہا ہے کہ تین سو سوار تھے حالانکہ سواروں کی تعداد دو سو تھی''۔

راویٔ حدیث:

مجمع بن جاریۃ۔ یہ ''مجمع'' ہیں۔ جاریہ کے بیٹے ہیں۔ انصاری و مدنی ہیں۔ مسجد ضرار والے منافقین میں ان کے والد بھی داخل تھے۔ لیکن ''مجمع'' ٹھیک رہے۔ وہ قاری تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے نصف قرآن حاصل کیا تھا۔ ان سے ان کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن یزید وغیرہ نے روایت کی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں انتقال فرمایا۔ ''مجمع'' میں میم پر پیش اور جیم پر زبر اور دوسرا میم مشدد اور اس کے نیچے کسرہ اور آخر میں عین مہملہ ہے۔ دوسرے میم پر فتحہ پڑھنا بھی درست ہے۔ ''جاریۃ'' جیم کے ساتھ ہے۔ بعض نسخوں میں حائے مہملہ اور ثائے مثلثہ کے ساتھ (حارثہ) ہے' یہ تصحیف ہے' یا ضعیف ہے۔

تشریح: ''قال: "قسمت خيبر على أهل الحديبية:.....وللراجل سهما:**

الحدیبیۃ یاء کے تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سو شہسواروں کو دو سہام دیئے اس طرح باقی چودہ سہام رہ گئے۔ ہر سو پیدل پا کیلئے ایک سہام ہو گیا۔ اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔ اس کی تائید حضرت ابن عمرؓ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**للراجل سهم وللفارس سهمان**'' پیدل پا کے لئے ایک سہم اور سوار کے لئے دو سہام ہیں۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ ہر فارس کے لئے دو دو سہام ہیں۔ اس لئے کہ اس روایت کے مطابق پیادوں کی تعداد ۱۲۰۰ تھی اور ان کیلئے بارہ سہام تھے۔ ہر دو سو کے لئے ایک سہم تھا۔ اور گھوڑ سواروں کے لئے چھ سہام تھے،، ہر دو سو کیلئے دو سہام تھے۔ اس طرح اس کا مجموعہ ۱۸ سہام بن گیا۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فارس کے لئے تین سہام ہیں۔ تو بات قابل اشکال ہے اس لئے کہ اس حساب سے فرسان کے سہام نو بنیں گے اور پیدل پا کے ۱۲ سہام ہوں گے جس کا مجموعہ ۲۱ بنتا ہے، جبکہ کل سہام اٹھارہ تھے۔

قوله: ''**واتى الوهم فى حديث مجمع انه قال: "ثلاثمائة فارس وانما كانوا مائتى فارسٍ**'':

''فرسان'' کا حصہ چھ سہام بنتے ہیں اور پیدل پا کا تیرہ سہام بنتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات گذر گئی ہے کہ لشکر میں تعداد ۱۵۰۰ تھی۔ اس طرح اس کا مجموعہ بھی انیس بنتا ہے، اٹھارہ نہیں بنتا۔ یہ تقسیم تاویل کی محتاج ہے

بعض نے کہا ہے کہ اس میں سو غلام تھے، ان کے لئے حصہ مقرر نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ غلام کا کوئی سہم مقرر نہیں ہے بلکہ اس کو تھوڑا سا دے دیا جاتا ہے۔ یہی بات ہمارے بعض شراح نے ذکر کی ہے۔ اور اسی کو ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اٹھارہ سہام میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں سے چھ سہام اس لشکر کے گھوڑ سواروں کو دیے۔ اس طرح کہ ہر سو کے لئے دو سہام تھے اور باقی پیادوں کو دیئے جس کی تعداد بارہ سو تھی۔ اس طرح ہر ۱۰۰ (سو) کیلئے ایک سہم ہوا۔ چنانچہ پیدل پا کے لئے ایک سہم اور سوار کے لئے دو سہام ہو گئے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک مختار ہے۔ اس مسئلہ میں مشاہیر امت میں سے کسی نے بھی امام ابوحنیفہؒ کی تائید نہیں کی۔ حتی کہ قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نہیں کی ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابن عمرؓ سے یہ صحیح روایت منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی اور اس کے گھوڑے کیلئے تین حصے دے دیئے۔ ایک حصہ سوار کا تھا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے تھے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فارس کو تین سہام دیئے۔ اور اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جو صراحۃً دلالت کرے بلکہ ظاہر یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فارس کو دو سہام دیئے۔ اس لئے کہ جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ حساب اور تخمینہ مقتضی ہے۔ اس کے باوجود اس کو ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ اور اس کو اپنے دیوان میں ثابت کیا ہے اور کہا ہے: ''وهذا وهم وانما كانوا مائتي فارس۔'' یہ وہم ہے وہ تو دو سو سوار تھے۔'' اس طور پر غانمین کی مجموعی تعداد ۱۴۰۰ چودہ سو بنتی ہے۔ اور اس کی تائید اس قول سے بھی ہوتی ہے: ''قسمت خيبر على أهل الحديبية وهم كانوا الفًا واربعمائة على ما صحّ عن جابر والبراء بن عازب وسلمة بن الأكوع سے مروی صحیح احادیث میں منقول ہے۔ اس طرح راجل کو ایک سہم اور فارس کو تین سہام مل گئے۔ اس حساب کے تقاضے کے مطابق۔ اور عبداللہ بن عمر ابن حفص بن عاصم بن عمر بن الخطاب عن نافع عن ابن عمرؓ سے روی ہے:

قال رسول الله ﷺ: ''للفارس سهمان وللراجل سهمٌ''۔

یہ ہماری راویت کے متعارض نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو ان کے بھائی عبداللہ بن عمر بن حفص نے نافع عن ابن عمرؓ کے طریق سے روایت کیا ہے اور محدثین کے نزدیک بالاتفاق یہ اثبت اور احفظ ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو شیخین نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے۔ اور دونوں نے اس سے روایت کیا ہے۔ اور عبداللہ کی روایت کی طرف توجہ نہیں دی۔

جنگ کی ابتداء اور انتہاء میں نفل دینے کا بیان

۴۰۰۷: وَعَنْ حَبِيْبِ بْنِ مَسْلَمَةَ الْفِهْرِيِّ قَالَ شَهِدْتُّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَفَّلَ الرُّبُعَ فِي الْبَدْاَةِ وَالثُّلُثَ فِي الرَّجْعَةِ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۱۸۲، كتاب الجهاد، باب فيمن قال الخمس قبل النفل الحديث رقم ۲۷۵۰ وابن ماجه في ۲ / ۹۵۱، الحديث رقم ۲۸۵۳، وأحمد في المسند ۴ / ۱۶۰

ترجمہ: ''اور حضرت حبیب بن مسلمہ فہری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (کسی غزوے کے موقع پر) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس موجود تھا۔آپ ﷺ نے ابتداء میں (لڑنے والوں کو) مالِ غنیمت میں سے چوتھائی حصہ زائد عطا فرمایا اور واپسی کے وقت (لڑنے والوں کو) تہائی حصہ زائد عطا فرمایا''۔(ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

حبیب بن مسلمة ۔ یہ حبیب ''مسلمہ قریشی فہری'' کے بیٹے ہیں۔مسلمہ میں میم اور لام دونوں مفتوح ہیں۔ان کو ''حبیب الروم'' کہا جاتا تھا۔اس لئے کہ انہوں نے رومیوں کے ساتھ بہت زیادہ قتل وقتال کیا ہے۔یہ بڑے فاضل مستجاب الدعوات ہوئے ہیں۔شام میں ۴۲ھ میں وفات پائی۔ان سے ابن ملیکہ اور دوسرے حضرات محدثین نے روایت کی ہے۔فہری فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب لشکر کا ایک طائفہ واپس جانے لگے اور لشکر کے پہنچنے سے پہلے ان کا سامنا دشمن کے کسی گروہ کے ساتھ ہو جائے تو اس طائفہ کو اس غنیمت میں سے ''ربع'' ملے گا اور باقی تین چوتھائی میں تمام لشکر کو شریک کیا جائے گا اور اگر یہ لوگ غزوہ سے پہلے واپس ہوئے پھر لشکر کے اس طائفہ کو دشمن کے ایک طائفہ کا سامنا کرنا پڑا۔تو ان کو غنیمت کا ''ثلث'' ملے گا اس لئے کہ اس میں مشقت وخطرہ بہت زیادہ ہیں۔اور باقی ''ذوثلث'' میں پورے لشکر کو شریک کریں گے۔اس لئے کہ سفر غزوہ کی ابتداء میں پورے لشکر کا رخ ایک ہی طرف ہوتا ہے۔برخلاف واپسی کے کہ اس میں رخ ایک جانب نہیں ہوتا ابتداء میں اس طائفہ کو لشکر کی امداد پہنچنے کی امید ہوتی ہے۔

قبل از خمس ربع ،اور بعد از خمس ثلث دینے کا بیان

۴۰۰۸:وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَانَ يُنَفِّلُ الرُّبُعَ بَعْدَ الْخُمُسِ وَالثُّلُثَ بَعْدَ الْخُمُسِ اِذَا قَفَلَ . (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۸۳' الحدیث رقم ۲۷۴۹' والدارمی' کتاب السیر' باب النفل بعد الخمس ۲ / ۳۰۰' الحدیث رقم ۲۴۸۳' وأحمد فی المسند ۴ / ۱۶۰

ترجمہ:''اور حضرت حبیب بن مسلمہ فہری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (جنگ کی ابتدا میں) اسلامی لشکر کے واپس پہنچنے سے قبل لڑنے والے مجاہدین کو مالِ غنیمت میں سے خمس نکالنے کے بعد چوتھائی حصہ اضافی طور پر عنایت فرمایا کرتے تھے اور (لشکر کے) واپس آ جانے کی صورت میں (لڑنے والے مجاہدین کو) خمس نکلنے کے بعد تہائی حصہ اضافی طور پر عنایت فرمایا کرتے۔''۔(ابوداؤد)

تشریح:''اذا قفل ''معطوف کیلئے بطور قید کے ہے۔

عرضِ مرتب:

— اصل عبارت یوں ہے: کان ینفل الربع فی البدأۃ بعد أن یخرج الخمس و ینفل الثلث بعد الخمس اذا

قفل من الغزو اھ۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ماقبل حدیث کی طرح ہی ہے۔ سوائے اس کے کہ اس میں یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عطاء اخراج خمس سے پہلے ہوتی تھی یا بعد میں ہوتی تھی اس حدیث میں یہ وضاحت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غنیمت سے پہلے خمس نکال کر اس کو اپنے اہل افراد کو دے دیتے۔ پھر ماقبی کا ثلث اور ربع اصحاب بدأۃ اور اہل رجعت کو دے دیتے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''نفل'' اس زیادتی کو کہتے ہیں کہ جو امام لشکر کے بعض آدمیوں کو خصوصی طور پر دیتا ہے۔ ان کی مشقت کے پیش نظر تا کہ وہ (آئندہ) مزید کوشش کریں۔ اور ''تنفیل'' نفل دینے کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائے غزوہ میں ربع بطور نفل کے دیتے تھے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ یہ سفر غزوہ کی ابتداء میں ہوتا تھا کہ جب لشکر میں سے ایک گروہ اٹھتا اور دشمن کی طرف جلدی کرتا اور دشمن کے گروہ سے مڈبھیڑ کرتا جو کچھ یہ لوگ غنیمت میں حاصل کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس کا ربع دے دیتے اور باقی تین چوتھائی پورے لشکر کو حصہ دے دیتے۔ جب کہ واپسی پر اگر کوئی گروہ ایسا کرتا تو اس کو اس حاصل شدہ غنیمت کا ثلث بطور نفل کے دیتے اور باقی ''ثلثین'' میں پورے لشکر کو شامل کرتے۔ اس لئے کہ رجوع کے بعد کسی دشمن کے کسی گروہ سے لڑنے میں زیادہ مشقت اور خطرہ ہوتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ تنفیل کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اور ''بعد الخمس'' سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نفل اس اخماس اُربعہ میں سے دیتے تھے جو غانمین کا حصہ ہوتا تھا۔ اور یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ جبکہ سعید بن المسیب، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اور ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''نفل'' اس ''خمس'' سے دیتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سہم تھا۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی میں سے ان کو یہ حصہ دیتے تھے۔ اس کے مطابق ''بعد الخمس'' یا تو راوی کا وہم ہے۔ یا بعض رواۃ کی طرف سے زیادتی ہے۔ اور اس بات کی تائید اسی حدیث کے ایک مساوی حدیث سے بھی ہوتی ہے اس میں یہ زیادت موجود نہیں ہے ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس دروازہ کو کھولنا استنباط حکم ازمنی کو بند کر دیتا ہے اور حدیث میں اس کا نہ ہونا' اس کے کسی دوسرے میں وجود کے وہم پر کیسے دلالت کرتا ہے باوجودیکہ اثبات تقدم ہونا ہے ''نفی'' پر اور ''قید'' اور ''بیان'' مطلق اور مجمل کے لئے حکم ہوا کرتا ہے۔ اور یہ بات متفق علیہ ہے۔

ابو ثورؒ کہتے ہیں کہ نفل اصل غنیمت میں سے ہی دیا جائے گا۔ جیسا کہ ''سلب'' اصل غنیمت میں سے ہی دیا جاتا ہے۔

خمس سے پہلے نفل دینے کا بیان

۴۰۰۹: وَعَنْ اَبِی الْجُوَیْرِیَةَ الْجَرْمِیِّ قَالَ اَصَبْتُ بِاَرْضِ الرُّوْمِ جَرَّةً حَمْرَاءَ فِیْهَا دَنَانِیْرٌ فِیْ اِمْرَةِ مُعَاوِیَةَ وَعَلَیْنَا رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مِنْ بَنِیْ سُلَیْمٍ یُقَالُ لَهُ مَعْنُ بْنُ یَزِیْدَ فَاَتَیْتُهُ بِهَا فَقَسَمَهَا بَیْنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاَعْطَانِیْ مِنْهَا مِثْلَ مَا اَعْطٰی رَجُلًا مِنْهُمْ ثُمَّ قَالَ لَوْلَا اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: یَقُوْلُ لَا نَفَلَ اِلَّا بَعْدَ الْخُمُسِ لَاَعْطَیْتُكَ.

(رواہ ابو داود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۸۷، کتاب الجهاد، باب فی النفل من الذهب والفضة، الحدیث رقم ۲۷۵۳
وأحمد فی المسند ۳ / ۴۷۰

ترجمہ: ''اور حضرت ابو جویریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مجھے (ایک دن) روم کی زمین میں ایک سرخ رنگ کا گھڑا ملا جس میں دینار (بھرے ہوئے) تھے' اس وقت ہمارے علاقے کے حاکم' رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص تھے جن کا نام معن بن یزید تھا' ان کا تعلق قبیلہ بنو سلیم سے تھا۔ میں وہ گھڑا لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے ان دیناروں کو مسلمانوں (یعنی مجاہدین اسلام) کے درمیان تقسیم کر دیا اور ان میں سے مجھ کو بھی اتنا ہی دیا' جتنا ان میں سے ہر ایک شخص کے حصے میں آیا تھا (یعنی مجھے بھی سب کے برابر حصہ دیا) اور پھر انہوں نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ ''خمس نکالنے کے بعد ہی حصے سے زیادہ دیا جا سکتا ہے'' تو یقیناً میں بھی تمہیں دوسروں سے زیادہ حصہ دیتا''۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

ابو الجویریہ۔ یہ ابو الجویریہ حطان بن خفاف جرمی ہیں۔ تابعی ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور معن بن یزید کے حدیث میں شاگرد ہیں۔ اور ان کے بھی بہت سے محدثین حدیث میں شاگرد ہیں۔ جویریہ ''جاریہ'' کی تصغیر ہے۔ ''حطان'' میں حاء کا زیر ہے اور طاء مشدد ہے آخر میں نون ہے۔ ''خفاف'' میں خاء معجمہ کا ضمہ ہے اور پہلی فاء غیر مشدد ہے۔ اور ''جرمی'' میں جیم کا زبر ہے اور راء ساکن ہے۔

تشریح: **قوله: قال: "اصبت بأرض الرّوم جرة حمراء...... مأعطى رجله منهم":**

''القاموس'' میں لکھا ہے کہ امرۃ ہمزہ کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ ہے۔ "الامر" مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: **أمر علینا** یعنی اس کو ہمارے اوپر امیر بنایا گیا۔ اور "الامرة" بالکسر اس سے اسم ہے۔ جبکہ ''جوہری'' کا کہنا ہے کہ اس کو ''مصدر'' کہنا وہم ہے۔ اور جیسا کہ یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ (کہ حضرت معاویہ امیر تھے یا خلیفہ تھے)

''**معن**'' ''**ابن یزید**'' میم کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ یزید بن اخنس اسلمی کے بیٹے تھے۔ یہ خود، ان کے والد اور ان کے دادا صحابیؓ تھے۔ بعض کے قول کے مطابق یہ سب بدر میں شریک ہوئے تھے۔

قوله: ''لو لا انی سمعت رسول الله يقول "لا نفل الا بعد الخمس لأعطيتك'':

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کلام کا ظاہر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ''معن بن یزید'' نے ابو جویریہ کو ان دنانیر میں سے بطور نفل کے کچھ نہیں دیا اس وجہ سے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے سنا تھا: ''**لا نفل الا بعد الخمس**''۔ یہی بات ان کو نفل دینے کیلئے مانع بن گئی۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ اس بات پر دال ہے کہ نفل ان اخماس اربعہ میں دیا جاتا ہے جو غانمین کا حصہ ہوتا ہے جیسا کہ اس بات پر حدیث سابق دال ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ پایا تھا اس کو انہوں نے فیء میں شمار کیا۔ یہ ''فئی'' میں سے تھا۔ اس لئے انہوں نے اس میں سے ابو جویریہ کو بطور نفل کچھ نہیں دیا۔

ہمارے علماء میں سے بعض شراح فرماتے ہیں کہ راوی خمس نکالنے کے بعد نفل کو جائز سمجھتے تھے۔اور اس کو انہوں نے خمس میں سے سمجھا۔اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نفل دینا امام کی رائے پر ہے اور وہ خود چونکہ جیش کا امیر تھا۔اس لئے انہوں نے اپنے لئے امام کی اجازت کے بغیر خمس میں اپنے تصرف کو درست نہیں سمجھتا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حدیث علی وجہ مروی نہیں ہے۔اس میں جہت استثناء سے سہو واقع ہوا ہے۔ درست یوں ہے:"**لا نفل بعد الخمس ای لا نفل بعد احراز الغنيمة ووجوب الخمس فيه**"اور یہی زیادہ اشبہ اور امثل ہے۔اھ ملا علی قاریؒ اس پر لکھتے ہیں:**و فيه مالا يخفى** ۔

جنگ میں شریک نہ ہونے والوں کو مالِ غنیمت میں حصہ دینے کا بیان

۴۰۱۰:وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَدِمْنَا فَوَافَقْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :حِيْنَ افْتَتَحَ خَيْبَرَ فَاَسْهَمَ لَنَا اَوْ قَالَ فَاَعْطَانَا مِنْهَا وَمَا قَسَمَ لِاَحَدٍ غَابَ عَنْ فَتْحِ خَيْبَرَ مِنْهَا شَيْئًا اِلَّا لِمَنْ شَهِدَ مَعَهٗ اِلَّا اَصْحَابَ سَفِيْنَتِنَا جَعْفَرًا وَاَصْحَابَهٗ اَسْهَمَ لَهُمْ مَعَهُمْ ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ٣ / ١٦٨ كتاب الجهاد' باب فيمن جاء بعد الغنيمة لاسهم له' الحديث رقم ٢٧٢٥۔

ترجمه:"اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (جب) ہم (حبشہ سے) واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی جب خیبر فتح ہو چکا تھا' چنانچہ آپ ﷺ نے (خیبر کے مالِ غنیمت میں سے) ہمیں بھی حصہ عطا فرمایا۔یا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ چنانچہ آپ ﷺ نے (خیبر کے مالِ غنیمت میں سے) ہمیں بھی حصہ عطا فرمایا اور آپ ﷺ نے اس (مالِ غنیمت) میں سے کسی بھی ایسے شخص کو کوئی حصہ نہیں دیا جو فتح خیبر کے موقع پر موجود نہ رہا ہو علاوہ اس شخص کے جو (غزوۂ خیبر کے وقت) آپ ﷺ کے ساتھ تھا اور علاوہ ہم کشتی والوں کے یعنی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے کہ آپ ﷺ نے (ہم) کشتی والوں کو بھی ان (غزوۂ خیبر میں شریک ہونے والے مجاہدوں) کے ساتھ حصہ دیا (باوجودیکہ ہم اس غزوہ میں شریک نہیں تھے۔)"۔(ابوداؤد)

تشریح: **قوله:قدمنافوافقنا رسول الله الخ**:"**وافقنا**":فاء اور قاف کے ساتھ ہے۔ اور ایک روایت میں یائے تحتانیہ کے ساتھ ہے،اور"حین"میں تنازع فعلین ہے۔

لمن شهد معه الا أصحاب سفينة جعفر او أصابه":استثناء منقطع ہے تاکید کیلئے آیا ہوا ہے۔

"**الّا اصحاب سفينتنا**" "**لاحدٍ**" کیلئے استثناء متصل ہے۔اس کو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔اور بعض نے اس کو"بدل"قرار دیا ہے۔لیکن یہ مردود ہے کیونکہ روایت نصب کے ساتھ ہے۔

بعض کو وہم ہوا ہے کہ"**من شهد معه**" سے مراد اصحاب حدیبیہ ہیں۔اس صوت میں یہ استثناء بھی متصل ہو جائے گا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔کیونکہ جو لوگ فتح خیبر میں حاضر ہوئے تھے یہ"اصحاب حدیبیہ"ہی تھے۔نہ کہ کوئی اور۔

"جعفر و أصحابه" یہ "أصحاب السّفينة" کیلئے عطف بیان ہے۔اوران سے مراد جعفر بن ابی طالب اور اصحاب نبی ﷺ کی جماعت ہے جنہوں نے اس وقت حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی جب نبی کریم ﷺ مکہ میں تھے۔جب انہوں نے نبی ﷺ کی ہجرت مدینہ اور دین کی قوت کے بارے میں سنا تو واپس آئے یہ لوگ کشتی میں سوار ہو کر آئے تھے۔ان کی آمد عین فتح خیبر کے موقع پر ہوئی رسول اللہ ﷺ ان کے آنے سے بڑے خوش ہوئے۔ **قوله: "اسهم لهم معهم"**:

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کیلئے سہم اس لئے مقرر کیا کیونکہ یہ لوگ آپ ﷺ کے پاس تقسیم غنیمت سے پہلے آئے۔چنانچہ اسی بناء پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ جو آدمی لڑائی ختم ہونے کے بعد لیکن تقسیم غنیمت سے پہلے حاضر ہو جائے۔تو اس کو غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا۔اور جو علماء اس کو جائز نہیں سمجھتے۔انہوں نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے۔کہ آپ ﷺ نے اہل حدیبیہ سے اجازت لی تھی جب انہوں نے اس پر رضامندی ظاہر کی تو پھر کہیں رسول اللہ ﷺ نے ان کو حصہ دیا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ تاویل زیادہ واضح ہے۔بنسبت بعض حضرات کی اس تاویل کے کہ آپ ﷺ نے ان کو اس خمس میں سے دیا تھا جو آپ ﷺ کا حق تھا۔ان لوگوں کے حق میں سے نہیں دیا تھا جو اس جنگ میں شریک ہوئے تھے۔اس لئے کہ "فأسهم" کا تقاضا ہے کہ یہ تقسیم نفس غنیمت میں سے ہو۔اس لئے کہ خمس میں سے جو کچھ کسی کو دیا جاتا ہے اس کو "سہم" نہیں کہتے۔

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہاں پر "اسهم" سے مراد اس کا معنی لغوی ہو۔اور اس کا معنی لغوی ہے۔حصہ تو یہ بات راوی کے اس قول کے موافق ہو جائے گی اُو قال "فأعطانا منها"۔یعنی غنیمت میں سے ہمیں حصہ دے دیا یہ خمس اور غیر خمس دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

"او" یہ راوی کی طرف سے شک کو ظاہر کر رہا ہے۔اگر آپ ﷺ ان کو "مجاہدین" کی رضامندی سے دیتے۔تو یہ بات ان میں مشہور ہوتی۔اور یہی بات منقول ہوتی۔(واللہ اعلم) اور اسی طرح "الا اصحاب سفيننا" کا استثناء بھی اس کا تقاضا کر رہا ہے کہ قسمت ان کیلئے ثابت ہے۔اور تقسیم خمس میں سے نہیں ہوا کرتی۔میں کہتا ہوں کہ یہاں پر قسمت معنی لغوی میں ہے۔یعنی فی الجملہ کچھ دیا اور اس لئے کہ ابو موسیٰ فرماتے ہیں کلام کا سیاق افتخار و مباہات پر وارد ہے۔اور اس سے وہ اپنے اس اختصاص کا دعویٰ کر رہے ہیں جو کسی اور کیلئے مناسب نہیں ہے۔فرماتے ہیں: المباهاة اذا كانت من خمس خمسه أظهر و أطهر کہ اس میں ان کی کوئی اضافی فضیلت نہیں ہے۔اس لئے کہ "رضخ" اور "خمس" میں تو یتیم اور مساکین وغیرہ بھی شریک ہوتے ہیں۔میں کہتا ہوں کہ یہ تو حاضرین میں سے ہیں۔جبکہ یہاں پر کلام غائبین کے بارے میں ہے۔تو اس سے ان کا اختصاص ثابت ہو گیا جو ان کے علاوہ اور کسی کیلئے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ جب یہ بات ثابت ہوئی۔تو ظاہر ہوا کہ تقسیم خیبر کے اٹھارہ سہام تھے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب غنیمت کو دارالاسلام لے جانے سے پہلے اس لشکر کو دارالحرب میں مدد (کمک) مل جائے۔تو اس غنیمت میں یہ مددگار بھی شریک ہوں گے۔اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں۔

اور ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس کی بناء اس پر ہے جو ہم نے تمہیداً بتلایا کہ دارالحرب سے احراز سے پہلے ملک تام نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ جائز ہے کہ ان کے ساتھ "مددگار" بھی شریک ہو جائیں جب اس پر کوئی دلیل قائم ہو جائے اور "مددگار" کا حق صرف تین چیزوں کی وجہ سے منقطع ہو جاتا ہے:

① احراز بدارالاسلام غنیمت کو دارالاسلام میں محفوظ کرنے سے۔

② دارالحرب میں تقسیم ہو چکنے سے

③ مددگار کے پہنچنے سے پہلے غنیمت کو بیچ دینے کی وجہ سے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔:

عن ابی هریرةؓ: بعث علیه الصّلاة والسّلام أبانا علی سریة قبل نجد فقدم آبان وأصحابه علی رسول اللّٰه ﷺ بخيبر بعد ما افتتحها الٰی ان قال: ولم يقسم لهم"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابان کو نجد کی طرف ایک سریہ پر امیر بنا کر بھیجا۔ اُبان اور ان کے ساتھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خیبر میں اس وقت آئے جب خیبر فتح ہو چکا تھا اور حدیث کے آخر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی حصہ نہیں دیا۔ یہ حدیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ دارالاسلام میں "کمک" پہنچنے کی وجہ سے غنیمت میں حصہ واجب نہیں ہوتا اور "خیبر" فتح ہونے کی وجہ سے دارالاسلام بن گیا تھا۔ یہ لوگ اس وقت آئے جب کہ غنیمت دارالاسلام میں تھی۔

صحیحین میں ثابت ہے حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کیلئے سہام مقرر ہوا تھا۔ فرماتے ہیں کہ ہم یمن میں تھے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیبر کی طرف نکلنے کی خبر پہنچی تو ہم بھی ہجرت کرتے ہوئے ان کی طرف نکلے۔ میں اور میرے بھائی تھے، میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ اور دوسرا ان میں سب سے بڑا تھا۔ ہم اپنی قوم کے پچاس سے کچھ اوپر لوگوں کے ساتھ نکلے۔ ہم ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ نجاشی کے پاس پہنچے تو وہاں پر ہمیں حضرت جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھی ملے حضرت جعفرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہاں بھیجا ہے اور یہاں قیام کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا تم بھی ہمارے ساتھ قیام کرو۔ چنانچہ ہم نے قیام کیا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی۔ کہ جب "خیبر" فتح ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سہم دیا۔ اور ہماری کشتی والوں کے علاوہ کسی کو بھی سہم نہیں دیا جو خیبر سے غائب تھا۔

ابن حبان کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خمس الخمس سے دیا تھا اور یہ عطا ان کے دلوں کو مائل کرنے کے لئے تھی۔ اصل غنیمت سے نہیں تھی کیا آپ اس پر غور نہیں کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے علاوہ کسی اور غائب کو نہیں دیا۔

اور بعض شوافع رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا محمل یہ بیان کیا ہے کہ یہ لوگ تقسیم غنیمت سے پہلے حاضر ہوئے۔ ان کے مذہب کے برخلاف۔ اس لئے کہ ان کے مذہب کے مطابق اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ تقسیم غنیمت سے پہلے پہنچے ہوں یا فتح کے بعد پہنچے ہوں۔

غنیمت میں سوقی اہل عسکر کا حصہ تب بنتا ہے جب وہ لڑائی میں شریک ہو۔ یعنی لڑائی کے بغیر نہ ان کو سہم مل سکتا ہے۔ اور نہ ہی رضخ دیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر لڑائی میں شریک ہوں تو یہ لوگ سہم کے مستحق بنتے ہیں۔ اور یہی مسلک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام

احمد کا ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں۔ایک قول ہمارے مسلک کے مطابق ہے۔اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو سہم دیا جائے گا۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''الغنيمة لمن شهد الوقعة''غنیمت اس کو ملے گی جو اس واقعہ میں حاضر ہو گا۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عمرؓ سے موقوفاً مروی ہے جیسا کہ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں ذکر کیا ہے:

''حدثنا وكيع انبأنا شعبة عن قيس بن مسلم عن طارق عن ابن شهاب: ان اهل البصرة غزوانها وند۔ فأمدهم اهل الكوفة وعليهم عمار بن ياسر فظهروا۔ فأراد اهل البصرة ان لا يقسموا لأهل الكوفة فقال رجل من بني تميم: ايها العبد الأجدع !تريد ان تشاركنا من غنائمنا وكانت أذنه جدعت مع رسول الله ﷺ فقال: خير اذني سببت ثم كتب الى عمر فقال: ان ''الغنيمة لمن شهد الوقعة''۔

اس کو طبرانی اور بیہقی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمر کا قول ہے اور ابن عدی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے :''ملائیں لمن شهد الو قعة'' اور یہ بھی قول صحابیؓ ہے۔اس کی تاویل اس طرح ہے کہ وہ سوق قتال کے ارادے سے حاضر ہو ۔اور''وقعة'' قتال کو کہتے ہیں۔اور صاحب مجمل کے قول کا بھی یہی معنی ہے کہ وقعة میدان جنگ کو کہتے ہیں۔جہاد میں ان کی حاضری قتال کے ارادے سے ہونے کو ان دو امور میں سے کسی ایک کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔پہلی بات یہ ہے کہ وہ اس بات کا اظہار کرے کہ وہ جہاد کیلئے نکل رہا ہے اور تیاری اسی کیلئے ہو کسی اور چیز کی تیاری نہ ہو۔پھر اس قصد ظاہر پر محافظت بھی ہو۔اور یہی وہ سبب ظاہری ہے جس پر حکم موقوف ہوتا ہے۔اور اس بات کا تحقق قتال کے ذریعہ ہوگا کہ اس کا خروج ظاہراً کسی اور چیز کیلئے تھا جیسا کہ بازاری اور چرواہا وغیرہ ہے۔اس لئے کہ ان کا خروج ظاہراً کسی اور مقصد کیلئے ہوتا ہے۔یہ لوگ مجرد حاضری سے اس غنیمت کے مستحق نہیں ٹھہریں گے اس لئے کہ قصد قتال پر کوئی دلیل نہیں ہے۔جب قتال میں شریک ہو جائیں گے۔تو اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ ان کا ارادہ جہاد کا ہے۔اگرچہ انہوں نے کسی اور مقصد کو بھی اس میں شامل کیا لیکن اس سے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔جیسا کہ کوئی حج میں تجارت کرے،تو اس تجارت کی وجہ سے اس کا ثواب ناقص نہیں ہوتا۔

اُس شہید کا بیان جس نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہو

۴۰۱۱:وَعَنْ يَزِيْدُ بْنِ خَالِدٍ اَنَّ رَجُلاً مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :تُوُفِّيَ يَوْمَ خَيْبَرَ فَذَكَرُوْا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَقَالَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ فَتَغَيَّرَتْ وُجُوْهُ النَّاسِ لِذٰلِكَ فَقَالَ اِنَّ صَاحِبَكُمْ غَلَّ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَفَتَّشْنَا مَتَاعَهٗ فَوَجَدْنَا خَرَزًامِنْ خَرَزِ يَهُوْدَ لَا يُسَاوِيْ دِرْهَمَيْنِ ۔ (رواه مالك وابوداود والنسائي)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۱۵۵، الحديث رقم ۲۷۱۰، والنسائي في ٤ / ٦٤، الحديث رقم ۱۹۵۹، وابن ماجه في ۲ / ۹۵۰، ۲ / ۹۵۰، الحديث رقم ۲۸٤۸، و مالك في الموطا، ۲ / ٤٥٨، كتاب الجهاد، باب ما جاء في الغلول، الحديث رقم ۲۳، من كتاب الجهاد، وأحمد في المسند ٤ / ۱۱٤

ترجمہ: ''اور حضرت یزید بن خالد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص خیبر کے دن فوت ہو گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا (یعنی آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ فلاں شخص کا انتقال ہو گیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم لوگ اپنے ساتھی کی جنازہ کی نماز پڑھ لو (میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا) لوگوں (کا یہ سننا تھا کہ ان) کے چہروں کا رنگ اس (خوف کی) وجہ سے بدل گیا (کہ نہ معلوم کیوں آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (میں اس کی نماز جنازہ اس وجہ سے نہیں پڑھوں گا کہ) تمہارے (اس) ساتھی نے اللہ کی راہ میں (مالِ غنیمت میں) خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔ چنانچہ جب ہم نے اس کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں ہمیں یہودیوں (یعنی یہودی عورتوں) کے (گلے میں) پہننے کے ہار ملے جو دو درہموں کے برابر بھی نہیں تھے (یعنی ان کی قیمت دو درہم سے بھی کم تھی)''۔ (مالک، ابوداؤد، نسائی)

راویٔ حدیث:

یزید بن خالد: مؤلف نے ان کا نام اسماء میں ذکر نہیں کیا ہے۔ اکثر نسخوں میں اسم اوّل میں یاء کے اثبات کے ساتھ ہے۔ اور صاحب ''المغنی'' نے اس کی تصریح کی ہے کہ یاء اور زاء کے ساتھ ہے۔ خالد کے صاحبزادے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اس ''یاء'' کو حذف کر دیا جائے اس لئے کہ صحابہ میں کوئی ''یزید بن خالد'' نہیں ہے۔ بلکہ زید بن خالد ہے اور ''المصابیح'' میں بھی روایت ''زید بن خالد'' سے ہے۔

تشریح: قوله: فوجدنا خرزا:

''خرز'' وہ (بڑی) جس میں جواہرات اور موتی وغیرہ پروئے گئے ہوں۔

مالِ غنیمت کے جمع کرنے کا اہتمام

۴۰۱۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا اَصَابَ غَنِيْمَةً اَمَرَ بِلَالًا فَنَادٰى فِي النَّاسِ فَيَجِيْئُوْنَ بِغَنَائِمِهِمْ فَيُخَمِّسُهُ وَيُقَسِّمُهُ فَجَاءَ رَجُلٌ يَوْمًا بَعْدَ ذٰلِكَ بِزِمَامٍ مِنْ شَعَرٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا فِيْمَا كُنَّا اَصَبْنَاهُ مِنَ الْغَنِيْمَةِ قَالَ اَسَمِعْتَ بِلَالًا نَادٰى ثَلَاثًا قَالَ نَعَمْ فَمَا مَنَعَكَ اَنْ تَجِيْءَ بِهٖ فَاعْتَذَرَ قَالَ كُنْ اَنْتَ تَجِيْءُ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَلَنْ اَقْبَلَهُ عَنْكَ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ٣ / ١٥٦، كتاب الجهاد، باب في الغلول اذا كان يسيراً، الحدیث رقم ٢٧١٢ وأحمد في المسند ٢ / ٢١٣

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مالِ غنیمت ملتا تو آپ ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو (اعلان کرنے کا) حکم دیتے چنانچہ وہ لوگوں کے درمیان اعلان کر دیتے اور (اس اعلان کو سنتے ہی) لوگ اپنا اپنا مالِ غنیمت لے آتے (یعنی جس کے پاس مالِ غنیمت کی جو بھی چیز ہوتی وہ اس کو لا کر دربار رسالت میں جمع کر دیتا) پھر آپ ﷺ (پہلے مالِ غنیمت میں سے) خمس یعنی پانچواں حصہ نکالتے اور اس کے بعد

(اس مالِ غنیمت کو) لوگوں (یعنی مجاہدین) کے درمیان تقسیم فرما دیتے۔ (ایک دفعہ ایسا ہوا کہ) ایک شخص (مالِ غنیمت میں سے خمس نکالنے اور اس کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کے) ایک دن بعد بالوں کی بنی ہوئی ایک لگام لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ "یا رسول اللہ! جو مالِ غنیمت ہمارے ہاتھ لگا تھا اس میں یہ لگام بھی تھی"۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "بلال نے تین بار جو اعلان کیا تھا اس کو تم نے سنا تھا؟" اس نے کہا کہ "ہاں! میں نے سنا تھا"۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "پھر اس کو (اسی وقت) لانے سے تمہیں کس چیز نے روکا تھا؟" اس نے (اس تاخیر کے لئے) کوئی عذر بیان کیا' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بس (اب) یوں ہی رہو (یعنی اس کو اپنے پاس ہی رکھو' اب تو) کل قیامت کے دن ہی اس کو لے کر آنا (اور تب خدا کو اس تاخیر کا جواب دینا) میں (اب) اس کو تم سے ہرگز قبول نہ کرونگا"۔ (ابوداوٗد)

تشریح: قوله: كان رسول الله اذا أصاب۔۔۔ ويقسمه:

"**فيجئون بغنائمهم**" یہاں "باء" تعدیہ کیلئے ہے۔ یعنی لوگ اپنے پاس جمع کئے ہوئے مالِ غنیمت کو حاضر کر دیتے۔

"**فيخمسه**": میم کو مشدد و مخفف دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔

"**يقسمه**" یاء فتحہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ نیز یاء کے ضمہ اور سین کی تشدید کے ساتھ۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دراصل حال ماضی کی حکایت ہے۔ اس حالت کا استحضار کرنے کیلئے یہ اسلوب لایا گیا ہے۔ اور یہ دراصل رسول اللہ ﷺ کے حکم کا امتثال تھا کہ جب آپ ﷺ ان کو غنائم حاضر کرنے کا حکم فرما دیتے تو وہ لوگ نہیں ٹھہرے تھے اور جب کوئی آدمی ٹھہر جاتا اور ان سے پیچھے رہ جاتا تو وہ ظاہر کے مقتضیٰ کی طرف لوٹ آتا۔

قوله: "فجاء رجلٌ يومًا بعد ذالك ......":

قوله: "آسمعت بلالًا نادىٰ ثلاثًا" کیا تو نے بلال کو سنا تھا جس نے تین مرتبہ اعلان کیا ہے ممکن ہے کہ ایک دن میں تین مرتبہ اعلان کیا ہو یا کئی دنوں میں تین مرتبہ اعلان کیا ہو۔ تو اس نے کہا کہ ہاں میں نے سنا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے لانے سے آپ کو کس چیز نے روکا تھا۔ تو اس نے تأخیر کا عذر پیش کیا۔ لیکن یہ عذر کوئی قابل قبول عذر نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "**كن أنت تجئ به يوم القيامة**" علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس میں کئی قسم کی تاکیدیں ہیں۔ ایک ضمیر مستتر کی تاکید ہے۔ اور پھر اس پر خبر کی بناء مزید تقویت کیلئے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کی تاکید اور تائید اگلے جملہ "**فلن اقبله عنك**" بھی ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ یہاں پر زیادہ مناسب یہ ہے کہ "**أنت**" مبتداء ہو اور "**تجئ**" اس کی خبر ہو اور جملہ "**كان**" کی خبر ہے۔ اور فاعل معنوی کو تخصیص کیلئے مقدم کیا ہو۔ عبارت اس طرح ہوگی: "**أنت تجئ به لا غيرك**"۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ "**كان**" کسی چیز کی جنس میں استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ اس چیز کے وصف کے متعلق ہوتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے۔ یہ اس کو بیان کرتا ہے کہ یہ وصف اس کیلئے لازم ہے اور قلیل الانفکاک ہے اور اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وكان الانسان كفورًا**﴾ [الاسراء: ٦٧]

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وہ چیز قبول اس لئے نہیں کی کیونکہ اس میں تمام غانمین کا حصہ تھا۔اور وہ متفرق ہو چکے تھے۔اور ہر ایک کو اس کا حصہ پہنچانا متعذر تھا چنانچہ اس کو اس کے ہاتھ میں چھوڑ دیا تا کہ اس کا گناہ اسی پر رہے۔اس لئے کہ یہی غاصب ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دراصل اس کی حرمت کی تغلیظ بتلانی مقصود تھی۔ایسا نہیں ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہے۔اور نہ ایسا تھا کہ اس کو صاحب حق پر لوٹانا ناممکن تھا یا صاحب حق سے اس کو حلال کرانا ناممکن تھا۔

ملاعلی قاریؒ امام طیبیؒ کے اس کلام پر نقد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ردمظلمہ اور صاحب حق سے استحلال صحت توبہ کیلئے شرط ہے اور جب یہ دونوں چیزیں مشکل ہوں یا متعذر رہوں اور توبہ کی قبولیت ان دونوں کے حصول پر موقوف ہو تو اس صورت میں یہ کلام تحقیق وتاکید پر وارد ہوگا۔نہ کہ تغلیظ وتہدید پر۔لہٰذا مظہر کا کلام اظہر ہے۔

خیانت کرنے والے کی سزا کا بیان

۴۰۱۳: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : وَاَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ حَرَّقُوْا مَتَاعَ الْغَالِّ وَضَرَبُوْهُ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۱۵۸ ' كتاب الجهاد' باب في عقوبة الغال' الحديث رقم ۲۷۱۵

ترجمه: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور وہ (شعیب رحمۃ اللہ علیہ) اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے (مالِ غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا سامان واسباب جلا ڈالا اور اس کی پٹائی (بھی) کی''۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله: اَن رسول اللّٰهؐ وابابکر وعمر حرقوا متاع الغال:

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ یہ حدیث متن کے لحاظ سے غریب ہے۔بعض اہل علم نے اس حدیث کے ظاہر سے استدلال کیا ہے۔ان میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ اس کے سامان کو جلایا جائے مگر جانور اور مصحف کو نہ جلایا جائے امام احمد اور اسحاق کا قول ہے کہ اس غلول شدہ مال کو جلایا نہیں جائے گا اس لئے کہ یہ تو غانمین کا حق ہے۔یہ مال غانمین کو واپس کر دیا جائے گا۔اگر اس نے ہلاک کیا (ضائع کر دیا) تو اس کی قیمت کا ضامن ہوگا۔امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کے اس سامان کو جلایا جائے گا جس کے ذریعہ اس نے جنگ کی ہے مثلاً اس کی زین وغیرہ ہے۔البتہ اس کے جانور، نفقہ، اسلحہ اور اس کے کپڑے کو نہیں جلایا جائے گا۔دوسرے فقہاء کا مسلک ہے کہ اس کی سواری کو نہیں جلایا جائے گا لیکن اس کو اس کے اس برے فعل پر تعزیر دی جائے گی۔امام مالک امام شافعی اور اصحاب ابی حنیفہ کا یہی قول ہے۔انہوں نے اس حدیث کو زجر اور وعید پر محمول کیا ہے۔وجوب پر محمول نہیں کیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غال کے بارے میں کئی احادیث مروی ہیں لیکن کسی اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس کے متاع کے جلانے کا حکم نہیں فرمایا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ عدم ذکر تحریق والی روایات اس شخص کے بارے میں ہیں جو اس فعل کا ارتکاب کرے اور پھر توبہ کرے اور کلام تو اس کے بارے میں ہے جو غلول کرتے ہوئے پکڑا جائے۔

خائن پر پردہ پوشی کرنے والا بھی خائن ہے

۴۰۱۴: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَقُوْلُ مَنْ يَكْتُمْ غَالًّا فَإِنَّهٗ مِثْلُهٗ۔

(رواہ ابو داود)

اخرجه أبو داود في السنن ٣ / ١٥٨ كتاب الجهاد' باب النهي عن الستر على من غسل' الحديث رقم ٢٧١٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے مالِ غنیمت میں خیانت کرنے والے کی پردہ پوشی کی (یعنی وہ امیر و حاکم کے علم میں یہ بات نہیں لایا کہ فلاں شخص نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہے) تو (گنہگار ہونے کے اعتبار سے) وہ (بھی) خیانت کرنے والے کی مانند ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: يقول :من يكتم: ''يكتم'' میم پر ضمہ ہے۔ اس بناء پر کہ ''مَنْ'' موصولہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں ''جزم'' کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ ''مَنْ'' شرطیہ ہوگا۔

مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے خرید و فروخت

۴۰۱۵: وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :عَنْ شِرَى الْمَغَانِمِ حَتّٰى تُقْسَمَ۔

(رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذي في السنن ٤ / ١١٢ كتاب السير' باب في كراهية بيع المغانم' الحديث رقم ١٥٦٣ وابن ماجه في ٢ / ٤٧٠' الحديث رقم ٢١٩٦' وأحمد في المسند ٣ / ٤٢

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کا مال (مجاہدین میں) تقسیم ہونے سے قبل اس کو فروخت کرنے (خریدنے سے) سے منع فرمایا ہے (کیونکہ تقسیم سے پہلے اس کا کوئی مالک نہیں ہوتا)''۔ (ترمذی)

تشریح: اور بعض نسخوں میں واشترائها حتى تقسم'' کے الفاظ بھی ہیں

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس نہی کا مقتضی یہ ہے کہ اس کی ملکیت نہ ہو، کیونکہ ملکیت تو تقسیم غنیمت پر موقوف ہے اور تقسیم ابھی تک نہیں ہے۔ اور جو لوگ قبل قسمت کو بھی ملکیت سمجھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہاں پر مقتضائے نہی عین مبیع اور اس کی صفت سے جہالت اور ناخبری ہے۔ جب کہ مالِ غنیمت میں مختلف اجناس اشیاء ہوں۔ اور ہمارے علماء میں سے ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مجاہدین میں سے کسی نے غنیمت میں اپنے حصہ کو بیچا۔ تو جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کا حصہ مجہول ہے۔ اور اس لئے کہ یہ ملک ضعیف ہے۔ اعراض کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے۔ جبکہ ملک مستقر اعراض کے ساتھ ساقط

نہیں ہوتی۔

۴۰۱۶: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنَّهٗ نَهٰى اَنْ تُبَاعَ السِّهَامُ حَتّٰى تُقْسَمَ۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی' فی ۲ / ۲۹۸ کتاب السیر' باب فی النهی عن بیع المغانم الحدیث رقم ۲۴۷٦

ترجمہ: ''اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مالِ غنیمت کے) حصے کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے' یہاں تک کہ اس کو (مجاہدین میں) تقسیم کر دیا جائے۔'' (دارمی)

تشریح: قوله: نهٰی ان تباع السهام حتی تقسم

سهام: سین کے کسرہ کے ساتھ ہے' غنیمت کے حصہ کو کہتے ہیں اور بعض نسخہ میں ''اسہام'' (یعنی بصیغۂ جمع) آیا ہے۔

۴۰۱۷: وَعَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ اِنَّ هٰذِهِ الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَمَنْ اَصَابَهٗ بِحَقِّهٖ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْهِ وَرُبَّ مُتَخَوِّضٍ فِيْمَا شَاءَتْ بِهٖ نَفْسُهٗ مِنْ مَالِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لَيْسَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا النَّارُ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی' فی السنن ٤ / ٥٠٧' کتاب الزهد' باب ما جاء فی اخذ المال' الحدیث رقم ۲۳۷٤ وأحمد فی المسند ٦ / ۳۷۸

ترجمہ: ''اور حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''بلاشبہ یہ مال ایک سبز و شیریں چیز ہے (یعنی مال ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی نظر کو بھاتا ہے اور دل کو لبھاتا ہے) لہٰذا جو شخص اس (مال) کو حق ذریعہ سے حاصل کرتا ہے اس کے لئے اس میں برکت عطا کی جاتی ہے (اور یاد رکھو) بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مال (یعنی مالِ غنیمت) میں سے جس چیز کو ان کا دل چاہتا ہے اپنے تصرف میں لے آتے ہیں' قیامت کے دن ان کے لئے صرف دوزخ کی آگ ہوگی''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ''انَّ هذه المال خضرة حلوة......بورك لدفيه:''

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''مال'' کو مؤنث اس لئے لائے ہیں کیونکہ یہ ''غنیمت'' کی تاویل میں ہے۔ اس تاویل کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: ''من مال الله ورسوله''۔ اھ

زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس مال سے مراد جنس مال ہو۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا ہے: ''انّ هذه الأموال'' جبکہ ایک نسخہ صحیحہ میں '' انّ هذا المال '' بھی آیا ہے۔ یعنی جنس مال، یا مالِ غنیمت یا مال بیت المال تینوں مراد ہو سکتے ہیں۔ اور یہ قول زیادہ واضح ہے اس کی دلیل اگلا جملہ: ''خضرة حلوة'' ہے

''خضرة'': خاء کے فتحہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ خضرة ای حسنة المنظر ''حلوة'' حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور مزیدار ذائقہ والی چیز کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بغیر تھکاوٹ بدن اور بغیر مشقت بدن کے حاصل ہوتا ہے۔ علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مال کو وصف ''خضرة '' کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ اہل عرب ''ناعم'' کو ''خضر '' کہتے تھے۔ یا اس لئے کہ اس کی مشابہت ''خضراوات'' (سرسبز چیزوں) کے ساتھ ہے سرعت زوال میں۔ کیونکہ جس طرح سبزہ جلدی

زائل ہوتا ہے اسی طرح مال بھی جلدی ختم ہو جاتا ہے۔

یعنی اس مال میں اپنے استحقاق کے بقدر لینا ہے)

قوله:ورب نسخون فیما شامت ......:

''متخوض'':اس کا مطلب ہے تبکلّف غوطہ لگانے والا، پانی میں چلنا اور اس کو حرکت دینا۔ پھر یہ لفظ تلبس اور تصرف میں استعمال ہونے لگا۔ای **رب شارع و متصرف**۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ''**فمن اصابه**''میں''فاء''تفصیلیہ ہے۔اور بظاہر یہ کہنا چاہیے تھا''**فمن اصابه بحقه فله كذا ومن لم يصبه بحقه ليس له الا النّار**''اس سے اس قول کی طرف عدول کرتے ہوئے یوں کہا''**رب متخوض**''یہ اشارہ ہے کہ اس کو اس کے حق کے ساتھ لینے والے بہت تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔اکثر''**متخوض**''اس میں بغیر حق کے ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ابتداء میں فرمادیا''**حلوة خضرة**''یعنی لوگ اس کی اشتہاء اور اس کی طرف میلان رکھتے ہیں۔اور دوسرے جملہ میں کہا گیا ہے کہ''**فيما شاء ت به نفسه**''اور''**من مال**''اسم ظاہر کو مضمر کے قائم مقام کیا یہ بتلانا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مال میں ناحق تصرف نہیں کرنا چاہیے۔جبکہ اس میں تصرف بھی صرف اشتہائے نفسانی ہی سے ہوگا۔اور یہ حکم: **ليس له يوم القيامة الاّ النار**''وصف مناسب پر مرتب ہو رہا ہے اور وہ وصف''**خوض في مال الله ورسوله**''ہے۔یہ اس کی علّت بتلا رہا ہے۔البتہ احمد، شیخین، ترمذی اور نسائی کی روایت حضرت حکیم بن حزام سے اس طرح ہے:

ان هذا المال خضر حلوٌ۔ فمن أخذه بحقه بورك له فيه، ومن اخذه باشراف نفسٍ لم يبارك له فيه۔ وكان كالّذى يأكل ولا يشبع، واليد العليا خيرٌ من اليد السُّفلىٰ''۔

۴۰۱۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :تَنَفَّلَ سَيْفَهُ ذُالْفَقَارِ يَوْمَ بَدْرٍ۔

(رواه ابن ماجة وزاد الترمذی وهو الذی رأى فيه الرؤيا يوم احد)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤ / ١١٠' كتاب السير' باب فى النفل' عقب الحديث رقم ١٥٦١ وابن ماجه فى السنن ٢ /٩٣٩ الحديث رقم ٢٨٠٨' وأحمد فى المسند ١ / ٢٧١

ترجمه:''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ذوالفقار نامی اپنی تلوار جنگ بدر کے دن حصے سے زیادہ لی تھی۔(ابن ماجہ) اور ترمذی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ''اور یہ وہی تلوار ہے جس کو آپ ﷺ نے جنگ احد کے دن خواب میں دیکھا تھا''۔

تشریح: **قوله:ان النبی تنفل سيفه الفقاريوم بدر:**

''**فقار**'':فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور عوام اس کو کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔''الفائق''میں اسی طرح مذکور ہے۔

یہ''**سيفه**''سے بدل ہے۔

یعنی آپ ﷺ نے اس کو مالِ غنیمت میں سے اپنے لئے چن لیا۔''صفی''بھی اسی سے ماخوذ ہے''صفی'مال غنیمت کا وصف ہے جو سردار اپنے لئے خاص کرے۔علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں **أى أخذه زيادة لنفسه** کہ اس تلوار کو اپنے کیلئے بطور

اضافی چیز کے لے لیا۔لیکن میں نے کتب لغت میں ''تنفل'' کے اس معنی کونہیں پایا جس میں ہم نے استعمال کیا ہے۔ جبکہ روایت اسی طرح ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ معنی تفسیر ''الکشاف'' میں پائے ہیں اس آیت ''یصوّر کم فی الأرحام'' کے تحت طاؤس نے اس کو ''تصوّر کم'' پڑھا ہے۔اور معنی یہ لکھا ہے کہ تم کو اپنے اور اپنی عبادت کیلئے پیدا فرمایا ہے، شکل سے نوازا ہے۔جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ''اثلته مالاً'' **اذا جعلته أثلة ای اصلا و تأ ثلته اذ أثلته لنفسك اھ**

ملاعلی قاری فرماتے ہیں اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام کہ میں نے ''تنفل'' کو معنی مذکور میں مستعمل نہیں پایا۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس معنی میں اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔اور نہ یہ کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لفظ ''طلب نافلۃ'' کے معنی میں مستعمل ہے۔اور ''نافلة'' وہ عبادت ہے جو کہ فرض کی مقدار سے زائد ہو۔ ''**و اللّٰہ اعلم**''۔

''ذوالفقار'' کی وجہ تسمیہ و پس منظر

بعض نے کہا ہے کہ یہ تلوار ''منبہ بن حجاج'' کی تھی۔ جو غزوہ بدر میں قتل ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی تلوار کو جنگوں میں لے جاتے تھے۔اس تلوار کو ''ذوالفقار'' اس لئے کہتے تھے کیونکہ اس کی پشت پر برابر گڑھے بنے ہوئے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے دندانے کمر کے فقرات کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔

''القاموس'' میں لکھا ہے کہ ''ذوالفقار'' عاص بن منبہ'' کی تلوار تھی۔ بدر کے دن بحالت کفر قتل ہوا تھا یہ تلوار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور پھر ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی۔

اور یہ روایت: ''**لا سیف الاّ ذالفقار و لا فتی الاّ علیؓ**'' واہیات میں سے ہے۔حسن بن عرفہ نے ابوجعفر محمد بن علی الباقر سے نقل کیا ہے کہ بدر کے دن آسمان سے ایک فرشتہ نے آواز دی جس کا نام ''رضوان'' ہے۔ ''**لا سیف الاّ ذوالفقار لا فتیً الاّ علی**'' جبکہ زبانوں پر اس کا الٹ مشہور ہے۔اور شاید یہ رعایت ''تقدیم علیؓ'' کی وجہ سے ہو۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ موزونیت کے اعتبار سے یوں پڑھا گیا ہو، موزونیت یہاں یوں ہوگی کہ ''علی'' کو تخفیف کے ساتھ پڑھا جائے۔

قوله:وهو ''الّذی رأی فيه الرؤيا يوم آحدٍ''

''**وهو**'' یہ ضمیر ''ذوالفقار کی طرف راجع ہے۔تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ خواب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار ذوالفقار کو پھینکا تو وہ تلوار درمیان سے ٹوٹ گئی۔ پھر دوبارہ پھینکا تو وہ پہلے سے زیادہ اچھی حالت میں لوٹی۔بعض نے کہا ہے کہ وہ خواب یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنی تلوار کے آخری حصہ میں ایک داغ دیکھا میں نے اس کی تعبیر ''ہزیمت'' نکالی۔(جو کہ مجھے اُحد کے دن دیکھنی پڑی اور میں نے دیکھا کہ میں نے اپنے ہاتھ کو ایک قلعہ کے سوراخ میں داخل کیا ہے۔تو اس کی تعبیر میں نے ''مدینہ'' نکالی۔

عرض مرتب:

ملاعلی قاریؒ ''**الموضوعات الکبری**'' میں ''**لا فتی الا علی** ......'' کے تحت لکھتے ہیں ''اس روایت کی کوئی قابل

اعتماد اصل موجود نہیں ہے اھ اور حسن بن عرفہ کا مذکورہ بالا اثر مختلف کتب میں منقول ہے، مثلاً فتح الباری ۱۰/۱۹۶، الآلی ۱/۱۸۹ کشف الخفاء ۲/۵۰۶۔ آگے چل کر ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس اثر کے بطلان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر واقعی آسمان سے یہ ندا ہوئی ہوتی تو صحابہ کرام نے اس کو ضرور سنا ہوتا اور وہ اس کو نقل فرماتے۔ یہ عقلاً بھی نقلاً بھی باطل ہے۔ اگرچہ ابن مرزوق نے بھی اس کو ذکر کیا ہے اور ان کی اتباع میں قسطلانیؒ نے ''مواہب'' میں ذکر کیا ہے۔ اھ ملخصا۔

(الموضوعات الکبریٰ، ص ۲۶۵، ۲۶۶)

مالِ غنیمت کے استعمال میں احتیاط برتنے کا بیان

۴۰۱۹: وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَرْكَبْ دَابَّةً مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى اِذَا اَعْجَفَهَا رَدَّهَا فِيْهِ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَلْبَسْ ثَوْبًا مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى اِذَا اَخْلَقَهُ رَدَّهُ فِيْهِ. (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن ۲ / ۶۱۶ كتاب النكاح' باب في وطء السبايا' الحديث رقم ۲۱۵۹

ترجمہ: ''اور حضرت رویفع بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے (مشترک) مالِ غنیمت کے کسی جانور پر (بلاضرورت شرعی) سوار ہو اور پھر جب وہ (جانور) کمزور ہو جائے تو اس کو مالِ غنیمت میں واپس لوٹا دے اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے (مشترک) مالِ غنیمت کے کسی کپڑے کو (بلاضرورت شرعی) پہنے اور پھر جب وہ (کپڑا) بوسیدہ ہو جائے تو اس کو مالِ غنیمت میں واپس لوٹا دے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: ''حتى اذا أعجفها ردها فيه'': یعنی یہاں تک کہ جب وہ اس کو خوب کمزور کر دیتا ہے۔ اس کو مالِ غنیمت میں واپس کر دیتا ہے۔ یہاں ''فیئ'' سے مراد غنیمت ہے۔ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر رکوب اس کو کمزوری تک نہ لے جاتا ہو تو پھر سوار ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ مراد نہیں ہے اس کی دلیل اگلا جملہ ''ومن كان يؤمن باللہ...... '' ہے۔

دونوں مسئلوں کی تحقیق ماقبل میں ابن ہمامؒ کے کلام میں گذر چکی ہے۔

کھانے پینے کی اشیاء میں خمس کا بیان

۴۰۲۰: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِي الْمُجَالِدِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِي اَوْفٰى قَالَ قُلْتُ هَلْ كُنْتُمْ تَخْمِسُوْنَ الطَّعَامَ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اَصَبْنَا طَعَامًا يَوْمَ خَيْبَرَ فَكَانَ الرَّجُلُ يَجِيْءُ فَيَأْخُذُ مِنْهُ مِقْدَارَ مَايَكْفِيْهِ ثُمَّ يَنْصَرِفُ (رواه ابو داود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۵۱ كتاب الجهاد، باب النهی عن النهب، الحديث رقم ۲۷۰٤۔

ترجمہ: ''اورحضرت محمد بن ابوالمجالد' حضرت عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ میں نے (حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ ''کیا آپ لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کھانے کی چیزوں میں سے بھی خمس یعنی پانچواں حصہ نکالا کرتے تھے؟'' انہوں نے فرمایا کہ ''غزوۂ خیبر کے دن کھانے کی چیزیں بھی ہمیں ملی تھیں' چنانچہ ہر کوئی شخص آتا اور ان میں سے بقدر کفایت (کھانے کی چیزیں) لے کر واپس چلا جاتا''۔(ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

محمد بن ابی المجالد۔ یہ ''محمد'' ہیں۔ ''ابومجالد'' کے بیٹے ہیں۔کوفہ کے رہنے والے تھے۔کوفہ کے تابعین میں سے ہیں۔ ان کی حدیث اہل کوفہ کے یہاں ہے۔انہوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ابواسحاق اور شعبہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ''مجالد'' میں میم مضموم اور لام مکسور ہے۔

اللغات: تخمسون ''تخميس'' سے مشتق ہے۔''فكان'': ایک نسخہ میں ''وكان'' ہے۔

۴۰۲۱: **وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ جَيْشًا غَنِمُوْا فِيْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : طَعَامًا وَعَسَلاً فَلَمْ يُؤْخَذْ مِنْهُمُ الْخُمُسَ۔** (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱٤۹ كتاب الجهاد، باب فی اباحب الطعام، الحديث رقم ۲۷۰۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں (مسلمانوں کا) لشکر (جب جہاد سے واپس آیا تو اس) کو وہاں غنیمت میں کھانے کی چیزیں اور شہد ملا۔ چنانچہ (ان لشکر والوں نے ان چیزوں میں سے جو کچھ کھا پی لیا تھا یا وہ جو کچھ بچا کر لائے تھے ان میں سے) ان سے (خمس یعنی پانچواں حصہ) نہیں لیا گیا''۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله: غنموا في زمن رسول الله طعامًا وعسلاً'':

عَسَلٌ: اس کا ذکر تخصیص بعد از تعمیم کے قبیل سے ہے' یا ''طعام'' سے مراد اناج اور اس سے تیار کردہ اشیاء ہیں۔

غنیمت کے جانوروں کے گوشت میں خمس کا بیان

۴۰۲۲: **وَعَنِ الْقَاسِمِ مُوْلٰى عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : قَالَ كُنَّا نَاكُلُ الْجَزُوْرَ فِي الْغَزْوِ وَلَا نَقْسِمُهُ حَتّٰى اِذَا كُنَّا نَرْجِعُ اِلٰى رِحَالِنَا وَاَخْرِ جَتُنَا مِنْهُ مَمْلُوْءَةٌ ۔** (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۵۲ كتاب الجهاد، باب فی حمل الطعام من ارض العدو، ح ۲۷۰٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت قاسم (تابعی) جو عبدالرحمٰن کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہؓ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی ان بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے) بیان کیا کہ ''ہم جنگوں میں اونٹ (کا گوشت) کھاتے اور اس کو تقسیم نہ کرتے (یعنی ہم محاذِ جنگ پر ضرورت کے وقت مالِ غنیمت کے اونٹوں کو ذبح کرتے

اور ان کا گوشت تقسیم کیئے بغیر اپنی اپنی ضرورت کے بقدر لے لیتے) یہاں تک کہ جب ہم (سفر کے دوران) اپنے ڈیروں‘ خیموں میں واپس آتے تو ہمارے تھیلے سلے سے (یعنی گوشت) سے بھرے ہوئے ہوتے‘‘۔ (ابوداؤد)

تشریح: الجزور‘‘: جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔’’اونٹ‘‘ کو کہتے ہیں۔

قوله:’’في الغزو ولا نقسمه‘‘

قوله:’’حتّى اذا كنا لنرجع ......‘‘

’’لنرجع‘‘:لام فتح کے ساتھ ہے۔ یہ لام مضارع کو حال کے معنی میں کر دیتا ہے۔

’واخرجتنا‘‘:ہمزہ کے فتحہ اور’’راء‘‘ کے کسرہ کے ساتھ’’ **افعلة**‘‘ کے وزن پر ہے۔’’خرج‘‘ بضم الخاء کی جمع ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ’’الاخوجة‘‘’’خوج‘‘ کی جمع ہے۔ برتن کی ایک قسم ہے۔ اس میں درست لفظ’’الخرجہ‘‘ ہے۔فاء کے کسرہ اور راء کی حرکت کے ساتھ جیسا کہ’’حجرة‘‘ ہے۔

اور القاموس میں ہے کہ یہ’’خرج‘‘ (بالضم) کی جمع ہے۔اور مراد اس سے معروف برتن ہے۔اور اس کی جمع’’اخرجة‘‘ آتی ہے۔

’’مملوء‘‘:واؤ کی تشدید کے ساتھ ہے،اور ہمزہ بھی درست ہے۔

’’المصابیح‘‘میں لفظ’’مملوّة‘‘ کی جگہ پر’’مملاة‘‘ آیا ہے۔’’ای ملانة‘‘قوله:’’الى رحالنا‘‘’’رحال‘‘:اس سے مراد سفر غزوہ میں ان کی منازل اور قیام گاہ ہیں۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان دار الحرب سے نکل آئیں تو پھر ان کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ مالِ غنیمت میں سے جانوروں کو کھلائیں یا خود اس سے کھائیں۔ اس لئے کہ ضرورت ختم ہوگئی ہے۔ دار الحرب میں جو اباحت تھی وہ تو ضرورت کے اعتبار سے تھی۔اور اس لئے بھی کہ اب حق’’مؤکد‘‘ہوگیا ہے، یہاں تک کہ اس کے حصہ میں میراث جاری ہوگی جبکہ اخراج سے پہلے ایسا نہیں ہے۔اور جس کے پاس (مالِ غنیمت میں سے) کھانا یا چارہ بچ جائے تو اس کو مالِ غنیمت میں واپس کر دے۔ بشرطیکہ غنیمت کو دار الحرب میں تقسیم نہ کیا ہو۔ اگر تقسیم غنیمت سے پہلے اس سے منتفع ہوا تو افراز غنیمت کے بعد اس کی قیمت لوٹائے گا۔ اور یہی قول ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور احمد کا اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اسی کے مطابق ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ اس کو نہیں لوٹائے گا۔’’متلصص‘‘ پر قیاس کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے جب ایک یا دو آدمی دار الحرب میں داخل ہو جائیں اور وہاں سے کوئی چیز نکال لیں تو وہ اسی کے ساتھ مختص ہو جاتی ہے۔(’’متلصحص‘‘ اس شخص کو کہتے ہیں جو چوروں جیسی عادات اختیار کرے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس مال کے ساتھ غانمین کا حق متعلق ہے۔ جبکہ’’اختصاص‘‘ تو حاجت کی بناء پر تھا۔اور وہ ضرورت اب زائل ہو چکی ہے برخلاف’’متلصص‘‘ کے۔ اس لئے کہ وہ ہمیشہ قبل الاخراج اور بعد الاخراج دونوں صورتوں میں زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ بعد از تقسیم وہ چیز قائم ہے تو یہ لوگ بعینہٖ اسی شے کو صدقہ کریں گے۔ اور اگر بیچ چکے ہوں تو پھر اس کی قیمت کو لوٹایا جائے گا لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب یہ لوگ غنی ہوں اور اس سے نفع اٹھالیا ہو۔ اس وجہ سے کہ وہ محتاج تھے یہ

''لقطہ'' کے حکم میں ہو جائے گا۔ اس لئے کہ غانمین پر ''رد'' متعذر ہے کیونکہ وہ لوگ بکھر چکے ہیں اور اگر انہوں نے اس میں کوئی تصرف کرلیا ہو تو ان پر پھر کوئی چیز نہیں ہے اور اس پر قیاس ہے اس قیمت کو جس سے یہ لوگ بعد الاحراز متقع ہوئے ہیں۔ غنی اس کو صدقہ کرے گا فقیر نہیں کرے گا۔

مالِ غنیمت کی معمولی چیز چھپانے کا بیان

۴۰۲۳: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَانَ يَقُوْلُ اَدُّوْا الْخِيَاطَ وَالْمِخْيَطَ وَاِيَّاكُمْ وَالْغُلُوْلَ فَاِنَّهٗ عَارٌ عَلٰى اَهْلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (رواه الدارمی)

اخرجه أبو داود فی السنن ۲ / ۹۵۰ الدارمی' كتاب السير' باب ما جاء انه قال الحديث رقم ۲۸۵۰' والدارمی فی ۲ . ۳۰۲ الحديث رقم ۲٤۸۷' وأحمد فی المسند ٥ / ۳۱۸

ترجمہ: ''اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ''دھاگے اور سوئی کی (بھی) ادائیگی کرو (یعنی مالِ غنیمت میں اس قدر معمولی چیزیں بھی پوشیدہ کر کے نہ رکھو) اور تم (مالِ غنیمت میں یا مطلق) خیانت کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیانت کرنا خیانت کے مرتکب کے لئے قیامت کے دن بے عزتی کا باعث ہوگا۔'' دارمی

تشریح: قوله: ادوا الخياط والمخيط واياكم والغلول:

''غلول'': غین کے ضمہ کے ساتھ (''وایاکم'' فعل محذوف کا مفعول بہ ہے) ای اتقوا۔

''خیاط'' خائے معجمہ کے کسرہ کے ساتھ بمعنی ''خیط'' ہے یا اس کی جمع ہے

''مخیط'': میم کے کسرہ اور خاء سکون کے ساتھ، بمعنی سوئی۔

قوله: ''فانه عار على اهله يوم القيامة''

مطلب یہ ہے کہ خیانت خواہ مالِ غنیمت میں ہو خواہ غیر مالِ غنیمت میں ہو دنیا میں عیب ہے اور آخرت میں لوگوں کے سامنے شرمندگی اور رسوائی ہوگی۔ جیسا کہ اس سے پہلے حدیث میں گزرا: ''علٰی رقبته بعير له رغاء۔

۴۰۲۴: وَرَوَاهُ النِّسَائِیُّ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٌ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِهٖ ۔

اخرجه النسائی فی السنن ٦ / ۲٦۲' الحديث رقم ۳٦۸۸

ترجمہ: اور امام نسائی نے اس روایت کو عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کیا ہے۔

۴۰۲۵: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ دَنَا النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : مِنْ بَعِيْرٍ فَاَخَذَ وَبَرَةً مِنْ سَنَامِهٖ ثُمَّ قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَيْسَ لِیْ مِنْ هٰذَا الْفَیْءِ شَیْءٌ وَلَا هٰذَا وَرَفَعَ اِصْبَعَهٗ اِلَّا الْخُمُسَ وَالْخُمُسُ وَمَرْدُوْدٌ عَلَيْكُمْ فَاَدُّوْا الْخِيَاطَ وَالْمِخْيَطَ فَقَالَ رَجُلٌ فِیْ يَدِهٖ كُبَّةٌ مِنْ

شَعْرٍ فَقَالَ اَخَذْتُ هٰذِهٖ لِاُصْلِحَ بِهَا بَرْدَعَةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَمَّا مَا كَانَ لِيْ وَلِبَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَهُوَ لَكَ فَقَالَ اَمَّا اِذَا بَلَغَتْ مَا اَرٰى فَلَا اَرَبَ لِيْ فِيْهَا وَنَبَذَهَا. (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ٣ / ١٤٢، الحديث رقم ٢٦٩٤، وأحمد فى المسند ٢ / ١٨٤

ترجمہ:''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا (ایک دن) نبی کریم ﷺ (مال فئی میں آئے ہوئے) ایک اونٹ کے پاس تشریف لائے اور اس کے کوہان کا (ایک) بال پکڑ کر فرمایا:''لوگو! حقیقت میں اس مال فئی میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے اور (آپ ﷺ کی جس انگلی میں وہ بال تھا لوگوں کو دکھانے کے لئے) اس انگلی کو بلند کر کے فرمایا کہ یہ (مال بھی یعنی اتنا معمولی حصہ) بھی میرے لئے نہیں ہے البتہ خمس یعنی پانچویں حصے کا میں حقدار ہوں لیکن خمس بھی (میری ذات پر خرچ نہیں ہوتا بلکہ) تمہارے ہی اوپر خرچ کیا جاتا ہے (یعنی خمس کا مال تمہاری ہی بھلائی میں خرچ ہوتا ہے بایں طور کہ اس سے تمہارے لئے ہتھیار اور گھوڑے وغیرہ حاصل کئے جاتے ہیں) لہٰذا (اگر تمہارے پاس مالِ غنیمت کا) سوئی دھاگہ بھی ہو تو اس کو بھی ادا کرو''۔ (ایک شخص جس کے ہاتھ میں بالوں کی رسّی کا ایک ٹکڑا تھا کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ ''میں نے رسّی کے اس ٹکڑے کو اپنے پاس رکھ لیا تھا تاکہ اس کے ذریعہ بالان کے نیچے کی کملی کو (گانٹھ کر) ٹھیک کرلوں (اب اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہاں تک اس چیز کا سوال ہے جو میرے اور بنو عبدالمطلب کے حصے کی ہے تو وہ تمہاری ہے (یعنی اس ٹکڑے میں سے جو کچھ میرے خاندان بنو ہاشم اور ان کے حلیف وساتھی بنو عبدالمطلب کے لوگوں کے حصے کا ہے وہ تو ہم نے تمہیں بخش دیا لیکن اس میں سے جو کچھ ہمارے علاوہ دوسرے مجاہدین کا حصہ ہے اس کے بارے میں تم جانو کہ اگر تم ان سے بھی ان کے حصے معاف کرا لوگے تو کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا اور اگر ان کے حصے معاف نہیں کرا سکے تو قیامت کے دن مؤاخذہ ہوگا''۔ اس شخص نے (یہ سن کر کہا) کہ اگر یہ رسّی (گناہ کی) اس حد تک پہنچ گئی ہے جو میرے سامنے ہے تو پھر مجھ کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور (یہ کہہ کر) اس نے اس رسّی کو پھینک دیا''۔ (ابوداوٗد)

تشریح: ''وبرة'' پہلے تینوں حروف مفتوح ہیں ''سنامہ'' سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔فأخذ وبرة من سنامه ''انّہ'' یہ ضمیر شان ہے۔

قوله:انه ''ليس لى من هذا الفئى شئٌ ولا هذا'' یہ اشارہ ان بالوں کی طرف تھا جو آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھے طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''ولا هذا'' تاکید ہے۔ یہ اشارہ ''وبرة'' کی طرف ہے۔اور ''وبرة'' ''شئٌ'' کی تأویل میں ہے۔

قوله:''ورفع اصبعه''۔

''الاّ الخمس'': ''مرفوع'' ہے جبکہ بعض نسخہ میں منصوب ہے۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرفوع ہوگا بدل کی بناء پر اور یہی افصح ہے۔اور اس کا نصب بھی جائز ہے۔

''فأدوا الخياط والمخيط'' یہ اعادہ تاکید کیلئے ہے۔

"فقام رجلٌ فی یده کبةٌ" "کبة" سے مراد وہ ٹکڑا ہے۔جو کہ بالوں سے کاٹا جاتا ہے۔"من شعر" میں تجرید ہے۔ "مغرب" میں ہے کہ "بردعة" سے مراد وہ ٹاٹ ہے جو کہ اونٹ کے کجاوے کے نیچے رکھا جاتا ہے۔

امّا ما کان: طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر "اما" تفصیل کے لئے ہے اور اس کا قرینہ محذوف ہے۔عبارت اس طرح ہوگی: "امّا ما کان لی فهو لك واما ما کان للغانمین فعلیك بالاستحلال من کل واحدٍ"۔

۴۰۲۶: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ عَبْسَةَ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :اِلٰی بَعِیْرٍ مِّنَ الْمَغْنَمِ فَلَمَّا سَلَّمَ اَخَذَ وَبَرَةً مِنْ جَنْبِ الْبَعِیْرِ ثُمَّ قَالَ وَلَا یَحِلُّ لِیْ مِنْ غَنَا ئِمِکُمْ مِثْلُ هٰذَا اِلَّا الْخُمُسُ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ فِیْکُمْ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۳۸۳ کتاب الجهاد' باب فی الامام یستاثر بشئی من الفئی'الحدیث رقم ۲۷۵۵

ترجمہ: "اور حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک موقع پر) مالِ غنیمت کے ایک اونٹ کی جانب رخ کر کے ہمیں نماز پڑھائی' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا (اور نماز سے فارغ ہو گئے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹ کے پہلو سے (چند) بال پکڑے اور پھر فرمایا کہ "تمہارے مالِ غنیمت سے میرے لئے اتنا (یعنی ان بالوں کے بقدر) بھی حصہ حلال نہیں ہے علاوہ خمس کے اور وہ خمس بھی تمہاری ہی ضرورتوں میں خرچ کیا جاتا ہے"۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله:صلی بنا رسول اللّٰه ﷺ......من جنب الجیر:

الی بعیر: جارمجرور محذوف کے متعلق ہو کر حال ہے۔**أی متوجها الیه۔**

"**فلما سلّم اخذ وبرة من جنب البعیر**": پچھلی روایت میں یہ تھا کہ بال کوہان سے لئے تھے اور اس روایت میں ہے کہ بال اونٹ کے پہلو سے لئے تھے عین ممکن ہے کہ اس حدیث میں مراد یہ ہو کہ اس حصہ سے جو اس کے کوہان کے ساتھ ملا ہوا تھا۔تو اس صورت میں یہ قصہ اور ماقبل ایک ہی ہو۔اور اگر اس حدیث میں یہ مراد نہ ہو بلکہ وہی معنی مراد ہوں جو ظاہر لفظ سے مستفاد ہو رہے ہیں تو پھر یہ دو علیحدہ واقعات ہو جائیں گے۔

قوله:ولایحل لی من عنا ئمکم ......:

"**ولایحل**": اس کا عطف کلام محذوف پر ہے جو کہ قول کا مقولہ ہے وہ کلام محذوف ہے "**لا أتصرف**"

۴۰۲۷: وَعَنْ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ لَمَّا قَسَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :سَهْمَ ذَوِی الْقُرْبٰی بَیْنَ بَنِیْ هَاشِمٍ وَبَنِی الْمُطَّلِبِ اَتَیْتُهُ اَنَا وَعُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰؤُلَاءِ اِخْوَانُنَا مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ لَانُنْکِرُ فَضْلَهُمْ لِمَکَانِكَ الَّذِیْ وَضَعَكَ اللّٰهُ مِنْهُمْ اَرَاَیْتَ اِخْوَانَنَا مِنْ بَنِی الْمُطَّلِبِ اَعْطَیْتَهُمْ وَتَرَکْتَنَا وَاِنَّمَا قَرَابَتُنَا وَقَرَابَتُهُمْ وَاحِدَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :اِنَّمَا بَنُوْ هَاشِمٍ وَبَنُوْ الْمُطَّلِبِ شَیْءٌ وَاحِدٌ هٰکَذَا وَشَبَّكَ بَیْنَ اَصَا بِعِهٖ (رواه الشافعی وفی روایة ابی

داود والنسائی نحوه وفیه) اَنَا وَبَنُوْا الْمُطَّلِبِ لَا نَفْتَرِقُ فِیْ جَاهِلِیَّةٍ وَلَا اِسْلَامٍ وَاِنَّمَا نَحْنُ وَهُمْ شَیْءٌ وَاحِدٌ وَشَبَّكَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ۔

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۳۸۳' كتاب الخروج والامارة' باب فی بیان مواضع قسم الخمس' ح ۲۹۸۰ والنسائی فی ۷ / ۱۳۰' الحدیث رقم ۴۱۳۷

ترجمہ: ''اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے (مالِ غنیمت میں سے) اپنے قرابت داروں کا حصہ (یعنی خمس کہ جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے) بنو ہاشم اور بنو مطلب کے درمیان تقسیم کیا تو میں (یعنی جبیر رضی اللہ عنہ) بنو نوفل کی طرف سے) اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (بنو عبد شمس کی طرف سے) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! ہمارے یہ بھائی جن کا تعلق بنو ہاشم سے ہے' ہم ان کی فضیلت و بزرگی کا تو انکار نہیں کرتے کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ان میں پیدا کیا ہے (لہٰذا اس اعتبار سے ہماری بہ نسبت وہ آپ کے زیادہ قریب ہیں کیونکہ ان کے اور آپ ﷺ کے دادا یعنی ہاشم ایک ہی ہیں' اگرچہ ہمارے اور ان کے جد اعلیٰ بھی ایک ہی ہیں یعنی عبد مناف) لیکن ہمیں یہ بتائیے کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ ﷺ نے (خمس کے مال میں سے جو ذوی القربیٰ کا حصہ ہے) ہمارے ان بھائیوں کو تو حصہ دیا جن کا تعلق بنو مطلب سے ہے اور ہمیں محروم رکھا جب کہ ہماری (یعنی بنو نوفل اور بنی عبد شمس کی) اور ان کی (یعنی بنی مطلب کی) قرابت ایک ہی ہے (بایں طور کہ جس طرح ان کے دادا ہاشم کے بھائی تھے اسی طرح ہمارے دادا بھی ہاشم کے بھائی تھے گویا ان دونوں حضرات کی غرض کا حاصل یہ تھا کہ مالِ غنیمت میں سے جو خمس نکالا جاتا ہے وہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق آپ ﷺ کے قرابت داروں کا حصہ ہے' چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے قرابت داروں کی ایک شاخ بنو مطلب کو مال خمس میں سے دیا لیکن دوسری شاخوں یعنی بنو نوفل اور بنو عبد شمس کو کچھ نہیں دیا' جب کہ یہ ساری شاخیں ایک ہی جد اعلیٰ یعنی عبد مناف کی اولاد ہیں' تو اس امتیازی سلوک کی کیا وجہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے (ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان داخل کر کے اور اس کی طرف اشارہ کر کے) فرمایا'' (میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا) کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب بھی اسی طرح ایک چیز ہیں''۔ (شافعی) ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ کی روایت بھی اسی طرح ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ہم اور بنو مطلب نہ زمانۂ جاہلیت میں کبھی ایک دوسرے کے مخالف ہوئے اور نہ ہی زمانۂ اسلام میں' لہٰذا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہم اور وہ دونوں ایک چیز ہیں'' یہ کہہ کر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں''۔

تشریح: قوله: لما قسم رسول الله ﷺ......وضعك الله منهم:

اتیته انا وعثمان بن عفان رضی الله عنه'': ''عثمان'' فاعلیت کی بناء پر مرفوع ہے۔ اور مفعول معہ ہونے کی بناء پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔

''هؤلاء اخواننا من بنی هاشم'': یہ ''من'' بیانیہ ہے۔

"لاننكر فضلهم لمكانك": ہم ان کی فضیلت کا انکار نہیں کرتے اگر چہ ہم نسب میں برابر بھی ہیں۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ان کی فضیلت کا انکار نہیں کرتے۔ بنی ہاشم ہم سے خاص ہیں کیونکہ بنسبت ہمارے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے ہم ان کی فضیلت کا انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کا اور آپ کا جدّ ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے "ہاشم"۔ اگر چہ ہمارا اوران کا دادا بھی ایک ہے۔ اور وہ ہے "عبد مناف"۔
علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "لمانك" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کنایہ ہے جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد گرامی میں ہے: [ولمن خاف مقام ربه جنتان] اور جیسا کہ یہ قول ہے: "أخاف جانب فلانٍ وفعلت هٰذا لمكانك" اگر تم یہ کہو کہ یہ فن بیان کے کس قبیل سے ہے؟ جو میں کہوں گا کہ یہ فن "تعريض علٰى سبيل الكناية" کے قبیل سے ہے۔ اس لئے کہ اہل عرب بسا اوقات مسمّٰی سے مراد مجلس، جانب اور مکان لیتے ہیں اس کی بزرگی شان کی وجہ سے۔ زہیر بن ابی سلمٰی نے اسی معنی میں یہ اشعار کہے ہیں:

فعرض اذا ما جئت بالباب والحمى ☆ واياك أن ينسى فتذكر زينبا
سيكفيك من ذاك المسمّى اشارة ☆ فدعه مصونًا بالجلال محجبا

اس کی نظیر یہ ہے جیسے کہتے ہیں: "مثلك يجود" اى أنت تجود یہاں مثل سے مراد تشبیہ اور نظیر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو تمہارے اس مقام پر ہو اور ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ یہ کہا جاتا: تاکہ ضمیر موصول کی طرف راجع ہوتی اور ضمیر خطاب کو ضمیر غائب کی جگہ پر ذکر کیا لفظ "مكانك" کی رعایت رکھتے ہوئے اس کے قریب قریب ہی یہ شعر ہے:
"أنا الّذى سمتنى أمى حيدرة": میں وہ شخص ہوں جس کا نام اس کی ماں نے "حیدرہ" رکھا ہے۔
"منہم": میں "من" ابتدائیہ ہے "وضع" کے متعلق ہے۔ "اى: أنشأ واصدر وضعك منهم أى: لا ننكر فضلهم" لأن الله تعالٰى أنشأك منهم لا منّ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی میں سے پیدا کیا ہے نہ کہ ہم میں سے۔

قوله: "ارأيت اخواننا من بنى المطلب أعطيتهم وتركتنا":
"اخواننا": نصب کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں "رفع" کے ساتھ ہے۔
"من بنى المطلب" اخواننا کیلئے "بیان" ہے۔
"تركتنا": یہ جملہ معطوفہ ہے۔ یا حالیہ ہے۔
طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "اخواننا" کو منصوب علٰی شریطۃ التفسیر پڑھنا بھی جائز ہے۔ اعطیت اور "من بنى المطلب" حال ہے۔ (اخوننا من نبى المطلب میں دوسرا ترکیبی احتمال یہ ہے کہ "اخواننا") مرفوع علی الابتداء ہے۔ اور "بنی المطلب" اس کی خبر ہوگی اور یہ جملہ مؤطہ ہے۔
"وانما قرابتنا وقرابتهم واحدة" مراد قبیلہ بنو نوفل جن میں سے جبیر رضی اللہ عنہ ہیں اور بنو عبد شمس ہے۔ اور ان میں سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بنوعبدالمطلب کی قرابت داری ایک ہی ہے۔ کیونکہ ان کے والد ہاشم کے بھائی ہیں ہمارے آباء بھی اسی طرح ہیں۔

قوله:''وشبك بين اصابعه'':شبك من اصابعه ''هذا'' کی تفسیر ہے۔اور''تشبیك'' ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنے کو کہتے ہیں۔یعنی آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا۔اور معنی یہ ہے کہ جیسا کہ یہ انگلیاں بعض بعض میں داخل ہیں اسی طرح بنو ہاشم اور بنوالمطلب بھی ایک دوسرے میں داخل ہیں کہ یہ لوگ کفر اور اسلام میں ایک دوسرے کے ساتھ موافقت کرتے تھے اور باہم میل جول رکھتے تھے۔اور جو ان کے علاوہ ہمارے رشتہ دار ہیں۔وہ بنو ہاشم کے موافق نہیں ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ مخالطت ہے جو بنو ہاشم اور بنوالمطلب کے درمیان زمانہ جاہلیت میں تھی۔

اور یہ اس لئے کہ قریش اور بنو کنانہ نے اس پر حلف لیا کہ وہ بنو ہاشم اور بنوالمطلب کے ساتھ نہ مناکحت کریں گے اور نہ بیع وشراء کریں گے۔ جب تک کہ وہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو ان کے حوالے نہ کردیں۔

یعنی معنی میں متفق ہے اگرچہ الفاظ میں اختلاف ہے۔

قوله:''انا وبنو المطلب لا نفترق فی جاهلية ولا اسلامٍ وانما نحن وهم شیٌ واحدٌ وشبك بين أصابعه''۔

''أنا'' تخفیف کے ساتھ ہے۔اور ایک نسخہ میں''ہمزہ کے کسرہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے (اور بنوالمطلب کی بجائے)''بنی المطلب''یاء کے ساتھ ہے۔اس میں جو لفظی اختلاف گذر چکا ہے۔اور اس سے متعلقہ فقہی مسئلہ کی تفصیلات بھی گذر گئی ہیں۔

الفصل الثالث:

۴۰۲۸:عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ اِنِّی لَوَاقِفٌ فِی الصَّفِ يَوْمَ بَدْرٍ فَنَظَرْتُ عَنْ يَمِيْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ فَاِذَا اَنَا بِغُلَامَيْنِ مِنَ الْاَنْصَارِ حَدِيْثَةٍ اَسْنَانُهُمَا فَتَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ بَيْنَ اَضْلَعَ مِنْهُمَا فَغَمَزَنِیْ اَحَدُهُمَا فَقَالَ اَیْ عَمِّ هَلْ تَعْرِفُ اَبَا جَهْلٍ قُلْتُ نَعَمْ فَمَا حَاجَتُكَ اِلَيْهِ يَا ابْنَ اَخِیْ قَالَ اُخْبِرْتُ اَنَّهٗ يَسُبُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَئِنْ رَاَيْتُهٗ لَا يُفَارِقُ سَوَادِیْ سَوَادَهٗ حَتّٰى يَمُوْتَ الْاَعْجَلُ مِنَّا قَالَ فَتَعَجَّبْتُ لِذٰلِكَ قَالَ وَغَمَزَنِی الْاٰخَرُ فَقَالَ لِیْ مِثْلَهَا فَلَمْ اَنْشَبْ اَنْ نَظَرْتُ اِلٰى اَبِیْ جَهْلٍ يَجُوْلُ فِی النَّاسِ فَقُلْتُ اَلَا تَرَيَانِ هٰذَا صَاحِبُكُمَا الَّذِیْ تَسْاَلَانِیْ عَنْهُ قَالَ فَابْتَدَرَاهُ بِسَيْفَيْهِمَا فَضَرَبَاهُ حَتّٰى قَتَلَاهُ ثُمَّ انْصَرَفَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَاَخْبَرَاهُ فَقَالَ اَيُّكُمَا قَتَلَهٗ فَقَالَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا اَنَا قَتَلْتُهٗ فَقَالَ هَلْ مَسَحْتُمَا سَيْفَيْكُمَا فَقَالَا لَا فَنَظَرَ

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِلَى السَّيْفَيْنِ فَقَالَ كِلاَ كُمَا قَتَلَهُ وَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :بِسَلَبِهٖ لِمَعَاذِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْجَمُوْحُ وَالرَّجُلاَنِ مُعَاذُ بْنُ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِ وَ مُعَاذُ بْنُ عَفْرَاءَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٦ / ٢٤٦ كتاب المغازي' باب ١٠' ح ٣١٤١' وأحمد في المسند ١ / ١٩٣

ترجمہ:''حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (جو عشرہ میں سے ہیں) کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن میں (دشمن کی مقابل) صف میں کھڑا تھا' جب میں نے دائیں بائیں دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں انصار کے دو نو عمر لڑکوں کے درمیان ہوں' مجھے یہ تمنا ہوئی کہ کاش (اس وقت) میں ان دونوں سے زیادہ طاقتور اور تجربہ کار دو آدمیوں کے درمیان کھڑا ہوتا (یعنی میں نے دونوں نو عمروں کو حوصلہ وشجاعت کے اعتبار سے بے وقعت جانا اور یہ خیال کیا کہ چونکہ یہ نو عمر اور نا تجربہ کار ہیں' اس لئے ہوسکتا ہے کہ دشمن کے حملہ کی تاب نہ لائیں اور جنگ کے وقت بھاگ کھڑے ہوں جس سے میری ذات کو بھی بٹہ لگے' میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ) اچانک ان دونوں میں سے ایک نے مجھ کو ٹھوکا دیا اور کہا کہ'' چچا جان! کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں! میں جانتا ہوں' لیکن میرے بھتیجے! تمہیں ابوجہل سے کیا غرض ہے؟ اس نے کہا'' مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ (لعین ابوجہل) رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتا ہے' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے' اگر میں اس کو دیکھ لوں تو میرا جسم اس کے جسم سے اس وقت تک جدا نہ ہوگا جب تک کہ ہم میں سے کوئی ایک موت کی طرف بڑھنے میں جلدی نہ کرے (یعنی ابوجہل کے خلاف میرے دل میں اتنی نفرت ہے کہ میں اس کو دیکھتے ہی اس پر جھپٹ پڑوں گا اور اس وقت تک اس سے لڑوں گا جب تک کہ ہم دونوں میں سے جس کی موت پہلے آنے والی ہوگی وہ نہ مر جائے خواہ میں شہید ہو جاؤں' خواہ میں اس کو جہنم رسید کر دوں)''۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں (اس نو عمر کی بات کو سن کر) حیران رہ گیا (کہ خدایا' ان نو عمروں کے دل میں آپ ﷺ کی کتنی محبت ہے اور ان کے جذبات میں ہمت وحوصلہ اور شجاعت وبہادری کا کیسا محشر برپا ہے) عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر دوسرے لڑکے نے مجھ کو ٹھوکا دیا اور اس نے بھی وہی الفاظ کہے جو پہلے نے کہے تھے' اس کے بعد میں نے کوئی توقف نہیں کیا اور ابوجہل کو دیکھا جو (دشمن کے) لوگوں میں چکر لگا رہا تھا' میں نے (اس کی طرف اشارہ کر کے) ان لڑکوں سے کہا کیا تم اس شخص کو نہیں دیکھ رہے۔ یہ وہی شخص ہے جس کے متعلق تم مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ (یعنی اس شخص کو پہچان لو یہی ابوجہل ہے)''۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (یہ سنتے ہی) وہ دونوں لڑکے اپنی تلواروں کے ساتھ فوراً ابوجہل کی طرف لپکے اور ان دونوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کو قتل کر ڈالا' پھر دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹ کر آئے اور آپ ﷺ کو (اس واقعہ سے) آگاہ کیا' آپ ﷺ نے پوچھا کہ'' تم دونوں میں سے کس نے اس کو قتل کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک نے عرض کیا کہ اس کو میں نے قتل کیا ہے آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم دونوں نے اپنی تلواریں صاف کر لی ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں! چنانچہ آپ ﷺ نے ان دونوں کی تلواروں کو دیکھا اور فرمایا کہ'' تم دونوں ہی نے اس کو قتل کیا ہے''۔ نیز رسول اللہ ﷺ

نے حکم دیا کہ ابوجہل کا مال واسباب معاذ بن عمر بن جموح کو دیا جائے اور وہ دونوں لڑکے (جنہوں نے ابوجہل کو موت کے گھاٹ اتارا) معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ اور معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ تھے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: بينا أنا واقف...... بين اضلع منهما:

مروی ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۱۳ (تین سو تیرہ) ساتھی تھے اور گھوڑا صرف ایک تھا۔ اور بعض کے قول کے مطابق دو گھوڑے تھے۔ اور کفار کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی ان کے ساتھ سو (۱۰۰) گھوڑے تھے۔

''فنظرت عن يميني وعن شمالي'': ''أي فنظرت عن ليمين مرة وعن شمالي أخرى'' یعنی ایک دفعہ میں نے دائیں طرف نظر ڈالی اور دوسری مرتبہ بائیں طرف نگاہ ڈالی۔ اور حرف جر میں یہاں یہی نکتہ ہے

''فاذا'' یہ مفاجاہ کیلئے ہے۔

''أنا بغلامين'': جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔ أي حاضر محفوف

فتمنيت ان اكون بين اضلع منهما: مضبوط لوگوں کے درمیان ہوتا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ میں نے ان دونوں کے معاملے کو حقیر جانا کیونکہ وہ دونوں کم سن انصاری تھے۔ اور شیوخ خاص کر مہاجرین مضبوط اور قوی تھے۔ اور اس لئے تو ابوجہل نے کہا تھا: ''فلو غير اكار قتلني'' کاش کہ مجھے کاشتکار کے علاوہ کوئی قتل کرتا۔ یہ روایت آگے آئے گی۔

قوله: فغمزني احدهما......أنا قتلته:

''فغمزني احدهما'' ان میں سے ایک نے میری طرف ہاتھ سے یا آنکھ سے اشارہ کیا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''غمز'' آنکھ سے اشارہ کو کہتے ہیں اور ''كبس'' ہاتھ سے اشارہ کو کہتے ہیں۔

وغمزني الآخر: اس کا عطف ''فغمزني أحدها'' پر ہے۔

فلم أنشب: بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

ألا تريان: ہمزہ برائے تقریر ہے۔

''هذا صاحبكما'': رفع کے ساتھ ہے یہ تمہارا مطلوب آدمی ہے۔ ایک نسخہ میں ''صاحبكما'' نصب کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو منصوب بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ نصب ''هذا'' سے بدل کی صورت میں ہوگا۔ اور ''مرفوع'' اس لئے پڑھ سکتے ہیں کہ ''هذا'' مبتداء ہے اور یہ اس کی خبر ہے۔ اور ''تريان'' کا مفعول مقدر نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس سے مراد ''ايجاد الرؤية'' ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم ہے: ﴿ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ﴾ [القصص: ۲۳] صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ یہاں پر مفعول کو ترک کر دیا کیونکہ مقصود فعل ہے، نہ کہ مفعول۔

قوله: هل مسحتما .... كلاكما قتله:

سيفيكما: تثنیہ کے ساتھ ہے۔

''كلاكما قتله'': یہاں پر ''قتله'' میں ضمیر مفرد لائی گئی لفظ ''كل'' کی رعایت کی ہے۔ اور ازروئے معنی یہ تثنیہ سے زیادہ فصیح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: [كلتا الجنتين آتت اكلها] اور یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلداری کے لئے

فرمایا کہ تم دونوں اس کے قتل میں شریک ہو اور اس قتل پر جو ثواب اور اجر مرتب ہوگا اس میں بھی شریک ہو۔ اگر چہ ان دونوں میں تاثیر وسبقت کا فرق تھا۔

قوله: ''وقضى رسول الله ﷺ بسلبه لمعاذ بن عمرو بن الجموح'':

رسول اللہ ﷺ نے مقتول ابوجہل کے سلب دینے کا فیصلہ حضرت معاذ بن عمرو بن جموحؓ کے حق میں کیا۔ اس وجہ سے معاذ سلب کے مستحق ٹھہرے۔ پھر اس کے قتل میں ان کے ساتھ دوسرا بھی شریک ہوا۔ پھر حضرت عبداللہ ابن مسعود نے اس کو میدان میں پڑا ہوا پایا۔ جبکہ اس میں کچھ سانس باقی تھی۔ تو اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ جیسا کہ یہ واقعہ اگلی حدیث میں آئے گا۔

معاذ بن عمرو بن الجموح، ومعاذ بن عفراء، عفراء ان دونوں کی ماں تھی۔ یہ دونوں ماں شریک بھائی تھے۔ البتہ باپ جدا جدا تھے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ یہ دونوں چونکہ ابوجہل کو زخم لگانے میں شریک تھے لیکن معاذ بن عمرو نے اس کو پہلے وار سے سخت زخمی کیا تھا جس کی بناء پر وہ سلب کے مستحق ٹھہرے۔ اور آپ ﷺ نے یہ جو فرمایا: ''کلا کما قتله'' یہ اس لئے تا کہ دوسرے کا دل بھی خوش ہو جائے۔ اس طور پر کہ اس قتل میں بہر حال اس کی بھی شراکت تھی۔ ورنہ تو سلب کا استحقاق قتل شرعی کے ساتھ ہی ہوا کرتا ہے۔ اور چونکہ لہولہان معاذ بن عمرو نے کیا تھا اس لئے آپ ﷺ نے ان کے حق میں سلب کا فیصلہ دیا۔ اور آپ ﷺ نے یہ دونوں تلواریں اس لئے پکڑ لیں تا کہ اس سے اصل قتل کی کیفیت اور حقیقت کا پتہ چل جائے۔ تو پتہ چلا کہ ابن جموح نے اس کو سخت زخمی کیا تھا۔ پھر دوسرا اس کے ساتھ اس میں شریک ہوا۔ جب کہ پہلا سلب کا مستحق ٹھہر چکا تھا۔ اصحاب مالکیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان میں سے ایک کو سلب اس لئے دیا۔ کیونکہ امام سلب دینے میں مختار ہے۔ جس کو چاہے نفل دے دے۔

تعارض

① صحیح بخاری میں ابراہیم بن سعد کی روایت میں ہے کہ ابن عفراء نے اس کو مارا تھا۔

② ایک روایت میں ہے کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو ٹھنڈا کیا۔

③ ایک روایت میں ہے کہ ابن مسعودؓ نے اس کے سر کو تن سے جدا کیا تھا۔

جواب: شیخ فرماتے ہیں کہ ان روایات میں اس طرح ممکن ہے کہ یہ تینوں اس کے قتل میں شریک تھے۔ لہولہان معاذ بن عمرو بن الجموع ح نے کیا اور جب عبداللہ بن مسعودؓ آئے تو اس میں زندگی کی رمق باقی تھی انہوں نے اس کے سر کو جدا کر دیا۔

فوائد حدیث:

اس حدیث سے پتہ چلا:

① میدان جنگ میں لڑائی کی طرف جلدی بڑھنا چاہیے۔

② اللہ اور اس کے رسول ﷺ کیلئے غصہ آنا چاہیے۔

③ کسی کو اس کے چھوٹے پن یا اس کے جسم کی کمزوری کی بناء پر حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس سے بہت ہی بڑا کام صادر ہو جائے۔

④ اس حدیث سے امام مالک نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ قاتل بغیر بینہ کے سلب کا مستحق ہے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ شاید آپؐ نے بینہ یا کسی اور ذریعہ سے قاتل کو پہچان لیا ہو۔اھ اور بظاہر یہ آپ ﷺ کی طرف سے تنفیل تھی اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے ابوجہل کی تلوار حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو دی اور بنی عفراء کو کچھ بھی نہیں دیا۔

۴۰۲۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَوْمَ بَدْرٍ مَنْ يَّنْظُرُ لَنَا مَا صَنَعَ اَبُوْجَهْلٍ فَانْطَلَقَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَوَجَدَهٗ قَدْ ضَرَبَهُ ابْنَا عَفْرَاءَ حَتّٰى بَرَدَ قَالَ فَاَخَذَ بِلِحْيَتِهٖ فَقَالَ اَنْتَ اَبُوْجَهْلٍ فَقَالَ وَهَلْ فَوْقَ رَجُلٍ قَتَلْتُمُوْهُ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ فَلَوْغَيْرُ اَكَّارٍ قَتَلَنِيْ۔ (متفق عليه)

اخرجه مسلم فی صحيحه ' ۳ / ۱٤۲۳ كتاب المغازى' باب قتل ابى جهل' الحديث رقم (۱۱۸ ۔ ۱۸۰۰)

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر کے دن (میدان جنگ میں) ارشاد فرمایا کہ کون شخص ہمیں دیکھ کر بتائے گا کہ ابوجہل نے کیا کیا (یعنی اس کا کیا حشر ہوا' آیا وہ مارا گیا' یا زندہ ہے؟) چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ گئے اور انہوں نے ابوجہل کو اس حالت میں پایا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو مار مار کر ٹھنڈا (یعنی قریب المرگ) کر دیا تھا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے (یہ دیکھ کر) ابوجہل کی ڈاڑھی پکڑ کر اس سے کہا کہ ''تو ابوجہل ہی ہے نا؟ ابوجہل نے (ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس سوال کے پیچھے چھپے ہوئے طنز اور حقارت کو محسوس کر لیا اور) کہا کہ ''(بے شک میں ابوجہل ہی ہوں لیکن) کیا تم اس شخص سے زیادہ بڑے مرتبہ کے ہو جس کو تم نے قتل کیا ہے؟ (یعنی جس شخص کو تم نے قتل کیا ہے اس سے زیادہ بڑے مرتبے کا کوئی شخص نہیں ہے)۔(ان الفاظ کے ذریعہ گویا ابوجہل نے یہ دعویٰ کیا کہ قریش میں مجھ سے زیادہ بڑے مرتبہ کا کوئی شخص نہیں ہے) اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ابوجہل نے (اس موقع پر) کہا کہ کاش کہ غیر کاشتکار لوگ مجھے قتل کرتے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: من ينظر لنا ماصنع ابو جهل:

''صنع'': بصیغۂ معروف ہے۔مطلب یہ ہوگا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے' اور بصیغۂ مجہول ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کیا کیا۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''ما'' استفہامیہ ہے ''ینظر'' کے معنی ساتھ معلق ہے۔**اى من يتأمل لأجلنا ماحال أى جهل**۔امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس سے خوش ہو جائیں۔

قوله: فانطلق ابن مسعود۔۔۔فاخذ بلحيته:

''حتی برد'': اس کا مطلب ہے کہ اس کو موت کے قریب کر دیا۔اور ''القاموس'' میں ''برد'' کا مطلب ''مات'' لکھا ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''مشارفت'' (قریب الموت ہونا کے معنی) پر محمول ہے۔ کیونکہ اس کے بعد یہ الفاظ ہیں: ''فأخذ بلحية'' اور ایک دوسری روایت میں ''برد'' کی جگہ ''برك'' ہے بائے موحدہ اور کاف کے ساتھ۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بعض نسخوں میں ''برك'' ہے اور مراد اس سے ہے کہ وہ گر پڑا۔ یعنی عفراء کے بیٹوں نے اس کو زمین پر گرا دیا۔

''قال فأخذ بلحيته'' حضرت انس فرماتے ہیں کہ ابن مسعود نے اس کی داڑھی سے پکڑا اور ابو جہل کو اس لقب سے پکارا تو اس نے یہ جواب دے دیا اھ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ابو جہل نے اس حالت میں بھی اپنی بڑھائی اور عظمت شان ظاہر کہ جو شخص جیسے زندگی گزارتا ہے اسی طرح ہی مرے گا۔

قوله: وهل فوق رجل قتلمتوه:

بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابو جہل کو اپنے علاوہ کسی کے قتل ہونے کا پتہ نہیں تھا اس لئے اس نے کہا کہ تم نے ایک سے زائد آدمی تو قتل نہیں کئے۔ یعنی صرف ایک مجھے ہی قتل کیا ہے۔

قوله: فلو غير اكار قتلني:

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ''فلو غير أكّار'':

''اكار'': کاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ مجھے تمہارے ہاتھوں قتل ہونے میں کوئی عار نہیں ہے۔ لیکن کاش کہ یہ قاتل کسان کے علاوہ کوئی اور ہوتا۔ تو یہ بات مجھے زیادہ پسندیدہ تھی۔ اور میری شان بلند ہوتی۔

''النہایہ'' میں ہے: ''الأكار'' ''زارع'' کو کہتے ہیں اور ابو جہل نے یہ بات بطور تحقیر کے کہی۔ کاش کہ یہ قاتل اس مقتول کے ہم مثل ہوتا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ان الفاظ سے ابو جہل نے عفرا کے بیٹوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے اس کو قتل کیا تھا اور وہ دونوں انصاری تھے۔ اور انصار کسان اور کھجوروں والے تھے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ اگر ان کسانوں کے علاوہ مجھے کوئی اور قتل کرتا تو مجھے اچھا لگتا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''غیر'' کو مرفوع ہونا چاہیے۔ اس فعل کی بناء پر اپنے مابعد کی تفسیر کرے۔ اس لئے کہ ''لو'' کا مدخول فعل ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے: [قل لو انتم تملكون] اور یہ بھی جائز ہے کہ ''لو'' کو تمنی پر محمول کیا جائے۔ اس صورت میں (لو کو) جواب کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

۴۰۳۰: عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ اَعْطٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: رَهْطًا وَاَنَا جَالِسٌ فَتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مِنْهُمْ رَجُلاً هُوَ اَعْجَبُهُمْ اِلَیَّ فَقُمْتُ فَقُلْتُ مَالَكَ عَنْ فُلَانٍ وَاللّٰهِ اِنِّی لَاَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَوْمُسْلِمًا ذَكَرَ ذٰلِكَ سَعْدٌ ثَلَاثًا وَاَجَابَهُ بِمِثْلِ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ اِنِّی لَاُعْطِی الرَّجُلَ وَغَيْرُهُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْهُ خَشْيَةً اَنْ يُكَبَّ فِی النَّارِ

عَلٰی وَجْهِهٖ (متفق عليه وفي رواية لهما قال الزهري) فَنَرٰى اَنَّ الْاِ سْلَامَ الْكَلِمَةُ وَالْاِيْمَانُ الْعَمَلُ الصَّالِحُ.

اخرجه البخاري في صحيحه ۳ / ۳۴۰ كتاب الايمان' اذا لم يكن الاسلام على الحقيقة' الحديث رقم ۱۴۷۸ و مسلم في صحيحه ۱ / ۱۳۲' الحديث رقم (۲۳۶ ـ ۱۵۰)۔

ترجمه: ''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے ایک جماعت کو کچھ مال عطا فرمایا اور میں (اس مجلس میں) بیٹھا ہوا تھا (اس جماعت میں سے) ایک شخص کو رسول اللہ ﷺ نے چھوڑ دیا (یعنی اس کو کچھ نہیں دیا) حالانکہ وہ شخص میرے نزدیک (دین کے اعتبار سے) ان میں سب سے بہتر تھا' (یہ دیکھ کر) میں کھڑا ہوا اور (آپ ﷺ) سے عرض کرنے لگا کہ ''فلاں شخص کے لئے کیا ہے؟ (یعنی آپ ﷺ نے اس کو اپنے عطیہ سے کیوں محروم رکھا؟) اللہ کی قسم! میں (تو) اس کو مؤمن سمجھتا ہوں''۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (یوں نہ کہو کہ میں اس کو مؤمن سمجھتا ہوں) بلکہ (یہ کہو کہ) میں اس کو مسلمان سمجھتا ہوں''۔ سعد رضی اللہ عنہ نے (آپ ﷺ کے سامنے) تین بار یہ بات کہی پھر آپ ﷺ نے بھی (ہر بار) اسی طرح جواب دیا اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں ایک شخص کو (مال) دیتا ہوں جبکہ اس کی نسبت دوسرا شخص میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ شخص چہرے کے بل دوزخ میں نہ ڈالا جائے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: مالك عن فلان۔۔۔ أو مسلما: عن فلان**: اپنے متعلق محذوف سے مل کر حال ہے۔ **أى متجاوزا عن فلان ۔ لأراه**: ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ بمعنی **لأظنه** ہے اور ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے۔ **أى لأعلمه**

فقال رسول الله ﷺ ''او مسلمًا'': ''أو'' بمعنى ''بل'' ہے أى أظنه مسلما أو ظنه أنت مسلما مسلمان خیال کرتا ہوں یا تم اس کو مسلمان خیال کرو۔ ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے لیکن منصوب پڑھنے کی کوئی وجہ نہیں بنی بلکہ یہ حضرت سعدؓ کے قول سے اضراب ہے۔ اور یہاں اضراب اس معنی میں نہیں ہے کہ آپ ﷺ اس کے مؤمن ہونے کے منکر ہیں۔ بلکہ دراصل یہاں مقصود یہ ہے کہ آپ ﷺ اس بات سے منع کر رہے ہیں کہ جس کو کسی کے باطن کا پتہ نہ ہو اس کیلئے قطعی طور پر ایمان کی گواہی نہیں دینی چاہیے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''اُوْ'' ''بل'' کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شاعر کا یہ قول ہے:

''أو انت فى العين أملح''۔

یہاں ''آپ ﷺ'' نے بھی سعد کے کلام سے ''اضراب'' کیا ہے۔ اور ترقی کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تم کو اس سے بہتر جانتا ہوں۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ شریعت میں اسلام کی دو قسمیں ہیں: ایک ایمان سے کم ہے۔ یعنی صرف زبان سے اعتراف کرے۔ اور انسان ''معصوم الدم'' اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ چاہے اس کے ساتھ اعتقاد ہو یا نہ ہو۔ جیسا کہ یہاں مراد ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ [الحجرات: ۱۴]

دوسری قسم درجہ ''ایمان'' سے اوپر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اعتراف باللسان کے ساتھ اعتقادِ قلبی بھی ہو اور وفاء بالفعل بھی ہو۔ اور تمام تقدیروں اور فیصلوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے انقیاد و اتباع ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا

ہے: ﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرة:١٣١]

قوله:''ذكر ذالك سعد ثلاثا ''خشية أن يكب في النار على وجهه'':

واجابه'' اورایک نسخہ میں فأ جابہ ہے۔

''انی لأعطی الرجل'' اس سے مراد جنس ''رجل'' ہے۔ **ای رجلا من رجال۔**

''وغيره أحب اليّ منه'' یہ جملہ حالیہ ہے۔

''يُكبُّ'': مجہول کا صیغہ ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ آدمی مؤلفۃ القلوب میں سے ہوتا ہے یا اس لئے کہ کمزور یقین والوں میں سے ہوتا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت سعدؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ کچھ لوگوں کو عطا کر رہے ہیں اور ان سے دین میں افضل اور بہتر لوگوں کو چھوڑ دیا چنانچہ اس نے یہ خیال کیا۔ کہ شاید یہ عطاء **''فضائل في الدين''** کی وجہ سے ہے اور یہ خیال کیا کہ شاید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آدمی کی حالت پتہ نہیں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ میں اس کو جانتا ہوں۔ اور حضرت سعدؓ **''مسلمًا''** سے یہ بات نہ سمجھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مکرر شفاعت سے روک رہے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بتادیا کہ یہ عطاء **''فضائل في الدين''** کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور فرمایا کہ میں ان لوگوں کو دیتا ہوں جن کے ایمان میں ضعف ہے۔ ان کے دلوں کو راغب کرنے کے لئے دیتا ہوں۔ اگر میں نے ان کو کچھ نہ دیا تو وہ کافر بن جائیں گے۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ دیتا ہوں (یعنی مال نہیں دیتا) حالانکہ وہ مجھے ان سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں ان لوگوں سے جن کو میں کچھ دیتا ہوں۔ اور ان کو حقیر سمجھنے یا دین میں ناقص ہونے کی وجہ سے نہیں چھوڑتا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں ان کے اس نور اور ایمان تام کی وجہ سے جو ان کے دلوں میں ہے۔ اھ

میں کہتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اولیاء کو مصیبتوں سے دوچار کیا اور اپنے دشمنوں کو خوب دنیا دے دی۔

قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''فتوح الغیب'' میں فرماتے ہیں کہ اے تہی دست، اے ننگے بدن، اے پیاسے جگر، اے وہ ذات کہ جس سے دنیا اور دنیا والے بے نیاز ہیں۔ اے وہ شخص جو بادشاہوں اور ارباب دنیا کے ہاں گمنام بے قدر ہے اے بھوکے اے دردر پھرنے والے تم یہ نہ کہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے محتاج بنایا مجھ سے دنیا کو دور کر دیا، مجھ کو چھوڑ دیا اور مجھ سے ناراض ہو گیا، میرے ذکر کو میرے بھائیوں میں بلند نہیں کیا، میرے علاوہ لوگوں پر نعمتوں کو بہادیا۔ (نعمتوں کی بارش کردی) جس میں وہ دن رات اپنی مرضی سے تصرف کرتے ہیں اور اپنے گھروں میں عیش کرتے ہیں جبکہ ہم دونوں مسلمان، مؤمن اور برابر ہیں۔ ہم دونوں کا باپ آدم علیہ السلام اور ماں حواء علیہا السلام ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ ایسا اس لیے آپ ہے کیونکہ آپ کی خلقت وجبلت آزاد ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارش چھما چھم برس رہی ہے۔ اور صبر، رضا، یقین اور موافقت کی جملہ اقسام اور انوار معرفہ آپ کے پاس متواتر ہیں۔ چنانچہ آپ کے ایمان کا درخت اس کی ٹہنیاں اور اس کی جڑیں ثابت ہیں، شاخیں پتہ دار ہیں سایہ دار ہیں اور روزانہ اس میں بڑھوتری ہوتی ہے۔ اس کو نشو ونما کیلئے لٹکانے اور

کوڑا کرکٹ کی ضرورت نہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کے معاملے سے فارغ ہے اور آپ کو آخرت یعنی دار البقاء میں دخول عطاء کیا ہے۔اور عقبٰی میں وہ نعمتیں عطاء کی ہیں جس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔اور نہ کسی کان نے اس بارے میں کچھ سنا ہے اور نہ ہی قلب بشر پر اس کا گذر ہوا ہے۔اللہ جل شانہ کا فرمان ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴾[السجدة۔۱۷]

''**یعملون**'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اوامر کی ادائیگی کرتے تھے، منکرات کو چھوڑتے اور سر تسلیم کئے ہوئے تھے تمام معاملات میں اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کیا ہوا تھا، تمام امور میں اسی اللہ پر بھروسہ کرتے تھے۔

اور وہ دوسرا شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا دی ہے، اس کو نعمتیں دی ہیں اور اس کو موقع دیا ہے کہ وہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے تو (اس وجہ سے کہ) اس کے ایمان کا محل ایک پتھریلی اور ریتلی زمین ہے جس میں پانی نہیں ٹھہرتا اور نہ ہی اس میں درخت اگتے ہیں اور نہ ہی اس میں کھیتیاں اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔اس پر کئی قسم کی کھادیں وغیرہ ڈالتا ہے جس سے اس میں نباتات نمو حاصل کرتے ہیں۔اور یہ دنیا ہے اور اس کے اردگرد باڑ لگاتا ہے تاکہ اس کے ذریعے ''شجرۃ الایمان'' کی حفاظت کرے اور اعمال کے پودے لگاتا ہے اگر اس کو کاٹ دیا گیا تو نباتات اور درخت خشک ہو جائیں گے، پھل ختم ہو جائیں گے، دیار تباہ ہو جائیں گے۔جبکہ اللہ تعالیٰ اس کی آبادکاری چاہتا ہے۔پس غنی کے ایمان کا درخت کمزور جگہ اگتا ہے۔اور اس چیز سے خالی ہے جس سے تیرے ایمان کا درخت بھرا ہوا ہے

اے فقیر: اس کی قوت اور بقاء اس کے پاس موجود دنیا کی چیزوں سے ہے اور انواع نعمت سے ہے اگر اس درخت کو اس کے ضعف کے باوجود کاٹ دیا تو درخت خشک ہو جائے گا۔یہ کفر وجحود بن جائے گا۔اور یوں یہ شخص منافقین، مرتدین اور کفار کے ساتھ مل جائے گا۔مگر یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس غنی کو بے انتہاء صبر، رضاء، مضبوط یقین، توفیق، علم اور انوارات معرفت سے نواز دے۔تو اس کے ذریعے اس کا ایمان قوی اور مضبوط ہو جائے گا۔یہاں تک کہ اس کو مالداری اور نعمتوں کے انقطاع کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔

قولہ قال الزُّہری "فنریٰ ......" :

زہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کلمہ شہادت کی ادائیگی کا نام ہے۔اور ایمان عمل صالح کا نام ہے جو کہ عمل قلبی یعنی تصدیق کو بھی شامل ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ زہری رحمۃ اللہ علیہ کی تاویل پر کلمہ ''اَوْ'' کو تنویع پر حمل کیا جائے گا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے:[عذرًا او نذرًا]

أی مؤمنٌ ومسلمٌ ۔ایمان اور اسلام کو ظاہراً اور باطناً جمع کر دیا۔

۴۰۳۱:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : قَامَ يَعْنِيْ يَوْمَ بَدْرٍ فَقَالَ اِنَّ عُثْمَانَ انْطَلَقَ فِيْ حَاجَةِ اللّٰهِ وَحَاجَةِ رَسُوْلِهٖ وَاِنِّيْ اُبَايِعُ لَهٗ فَضَرَبَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :

بِسَهْمٍ وَلَمْ يَضْرِبْ لِاَحَدٍ غَابَ غَيْرَهٗ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۱۶۸ ' كتاب الجهاد' ح ۲۷۲٦۔

ترجمه: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ بدر کے دن (خطبہ دینے کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ بلاشبہ عثمان رضی اللہ عنہ' اللہ اور اس کے رسول کے کام سے گئے ہیں اس لئے میں (خود) ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں''۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے (جنگ بدر کے مالِ غنیمت میں سے) حصہ مقرر فرمایا اور آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کسی غیر حاضر کے لئے حصہ مقرر نہیں کیا۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قوله: ان رسول اللهﷺ قام...... وحاجة رسوله:

''يعني يوم بدر'': یہ کسی راوی کی طرف سے تفسیر ہے۔

''وحاجة رسوله'': طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''حاجة الله'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: [ان الّذين يؤذون الله ورسوله'' اور لفظ حاجت کو مکرر لانا مزید تاکید کیلئے ہے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مدینہ میں پیچھے اس لئے رہ گئے تھے کہ ان کی بیوی جو رسول اللہ ﷺ کی صاجزادی تھیں بیمار تھی۔ یعنی رسول اللہ ﷺ بدر کے میدان میں تھے۔ وہ انتقال فرما گئیں تھی حضرت عثمانؓ ان کی تجہیز وتکفین میں مصروف تھے۔

''غيره'': کو بعض نے استثناء کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ اور ایک نسخہ میں ''جر'' کے ساتھ آیا ہے۔ اور وجہ جر صفت یا بدل ہونا۔

۴۰۳۲: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَجْعَلُ فِيْ قَسْمِ الْمَغَانِمِ عَشْرًا مِنَ الشَّاءِ بِبَعِيْرٍ۔ (رواہ النسائی)

اخرجه النسائی فی ۷ / ۲۲۱ الحديث رقم ۴۳۹۱' واحمد فی المسند ۳ / ۴٦۴

ترجمه: ''اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر قرار دیتے تھے''۔ (نسائی)

اللغَاتُ: قسم: قاف کے فتحہ اور سین کے سکون کے ساتھ مصدر ہے۔ اور ایک نسخہ میں قاف کے کسرہ اور سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ ''قمسةٌ'' کی جمع ہے۔

المغانم اور ایک نسخہ میں ''مغانم'' کی جگہ پر ''غنائم'' آیا ہے۔ ''الشاء'': اسم جنس ہے۔ اس کا مفرد ''شاۃ'' آتا ہے۔

۴۰۳۳: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: غَزَانَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ فَقَالَ لِقَوْمِهٖ لَا يَتَّبِعْنِيْ رَجُلٌ مَلَكَ بُضْعَ امْرَاَةٍ وَهُوَ يُرِيْدُ اَنْ يَّبْنِيَ بِهَا وَلَمَّا يَبْنِ بِهَا وَلَا اَحَدٌ بَنٰى بُيُوْتًا وَلَمْ يَرْفَعْ سُقُوْفَهَا وَلَا رَجُلٌ اشْتَرٰى غَنَمًا اَوْ خَلِفَاتٍ هُوَ يَنْتَظِرُ اَوْلَادَهَا فَغَزَافَدَنَا مِنَ الْقَرْيَةِ

صَلَاةَ الْعَصْرِ اَوْ قَرِيبًا مِنْ ذٰلِكَ فَقَالَ لِلشَّمْسِ اِنَّكِ مَأْمُوْرَةٌ وَاَنَا مَأْمُوْرٌ اَللّٰهُمَّ احْبِسْهَا عَلَيْنَا فَحُبِسَتْ حَتّٰى فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَجَمَعَ الْغَنَائِمَ فَجَاءَتْ يَعْنِي النَّارَ لِتَاْكُلَهَا فَلَمْ تَطْعَمْهَا فَقَالَ اِنَّ فِيْكُمْ غُلُوْلًا فَلْيُبَايِعْنِيْ مِنْ كُلِّ قَبِيْلَةٍ رَجُلٌ فَلَزِقَتْ يَدُ رَجُلٍ بِيَدِهٖ فَقَالَ فِيْكُمُ الْغُلُوْلُ فَجَاءُوْا بِرَاْسٍ مِثْلِ رَاْسِ بَقَرَةٍ مِنَ الذَّهَبِ فَوَضَعَهَا فَجَاءَتِ النَّارُ فَاَكَلَتْهَا وَزَادَ فِيْ رِوَايَةٍ فَلَمْ تَحِلَّ الْغَنَائِمُ لِاَحَدٍ قَبْلَنَا ثُمَّ اَحَلَّ اللّٰهُ لَنَا الْغَنَائِمَ رَاٰى ضَعْفَنَا وَعِجْزَنَا فَاَحَلَّهَا لَنَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٦٢٨' الحديث رقم ٣١٢٤ و مسلم' كتاب الجهاد والسير' باب تحليل الغنائم لهذهِ الاعة خاصة' فی ٣ / ١٣٦٦' الحديث رقم (٣٢ ـ ١٧٤٧) وأحمد فی المسند ٢ / ٣١٧

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انبیاء میں سے ایک نبی (یعنی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ انہوں) نے جہاد کا ارادہ کیا اور (جب وہ جہاد کے لئے روانہ ہونے لگے تو) انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ میرے ساتھ وہ شخص نہ چلے جس نے کسی عورت سے نکاح کیا ہو اور اس عورت کو اپنے گھر لا کر اس سے مجامعت کا ارادہ رکھتا ہو اور ابھی تک اس سے مجامعت نہ کی ہو اور نہ ہی وہ شخص میرے ساتھ چلے جس نے گھر بنایا ہو لیکن (ابھی تک) اس کی چھت بلند نہ کر سکا ہو (یعنی چھت نہ ڈال سکا ہو) نیز وہ شخص (بھی) میرے ساتھ نہ چلے جس نے گابھن بکریاں یا گابھن اونٹنیاں خریدی ہوں اور وہ ان کے بچے جننے کا انتظار کر رہا ہو۔ اس کے بعد وہ (اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ) جہاد کے لئے روانہ ہوئے اور نماز عصر (کے وقت) یا اس سے قریب اس بستی کے قریب پہنچے (جہاں وہ جہاد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے) اس نبی علیہ السلام نے سورج کو مخاطب کر کے کہا کہ تو بھی (چلنے پر) مامور ہے اور میں بھی (اس بستی کو فتح کرنے پر) مامور ہوں۔ اے اللہ! تو اس سورج کو ٹھہرا دے۔ چنانچہ سورج ٹھہرا دیا گیا (یعنی قدیم ماہرین فلکیات کے نظریہ کے مطابق سورج کی رفتار کو یا جدید نظریہ کے مطابق زمین کی گردش کو حکم الٰہی سے روک دیا گیا تا کہ رات کی تاریکی سے پہلے پہلے وہ نبی جہاد کر لیں) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس نبی علیہ السلام کو فتح عطا فرما دی۔ پھر جب انہوں نے مالِ غنیمت جمع کیا اور اس کو جلا ڈالنے کیلئے آگ آئی تو اس آگ نے مالِ غنیمت کو نہیں جلایا' (یہ دیکھ کر) اس نبی علیہ السلام نے (اپنے ساتھیوں سے) فرمایا کہ یقیناً تمہارے اندر (مالِ غنیمت میں) خیانت واقع ہوئی ہے (یعنی تم میں سے کسی نے مالِ غنیمت کے اندر خیانت کی ہے جس کی وجہ سے یہ آگ اپنا کام نہیں کر رہی ہے) لہٰذا تم میں سے ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص کو چاہئے کہ وہ بیعت کرے' چنانچہ جب بیعت شروع ہوئی اور ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی اپنا ہاتھ اس نبی علیہ السلام کے ہاتھ میں دینے لگا تو) ایک شخص کا ہاتھ اس نبی کے ہاتھ کو چپک کر گیا' نبی علیہ السلام نے (اس شخص سے) فرمایا کہ'' (اس ذریعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ) خائن تم میں ہے (یعنی خیانت تمہارے قبیلہ کی طرف سے ہوئی ہے) پھر اس قبیلہ کے لوگ گائے کے سر کی مثل سونے کا ایک سر لائے اور اس کو رکھ دیا' اس کے بعد آگ آئی اور اس کو کھا گئی اور ایک روایت میں راوی نے یہ عبارت بھی نقل کی ہے کہ'' (آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ) چنانچہ ہم سے پہلے کسی کے

لئے مالِ غنیمت حلال نہیں تھا' پھر اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کو ہمارے لئے حلال قرار دیا' اس نے ہمیں (مالی طور پر) ضعیف و کمزور دیکھا تو اسے (یعنی مالِ غنیمت کو) ہمارے لئے حلال فرمادیا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:قال رسول الله ﷺ ۔۔۔ولما یبن بها:

قال رسول الله ﷺ: اور ایک نسخہ میں ''**النبی ﷺ**'' کا لفظ ہے۔: ''**لا یتبعنی**'' تاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں تخفیف وکسرہ کے ساتھ ہے۔

''**رجلٌ ملك بضع امرأةٍ**'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**بضع**'' کا اطلاق عقد نکاح اور جماع دونوں پر ایک ساتھ ہوتا ہے اور ''**فرج**'' پر بھی ہوتا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی ہمارے ساتھ نہ جائے جس نے کسی عورت سے عقد نکاح کر لیا ہو لیکن ابھی تک اس سے دخول نہ کیا ہو۔

''**وهو یرید ان یبنی بها ولما بین بها**'' یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله:''ولا احدٌ بنی بیوتاً ولم یرفع سقوفها''

اور نہ وہ آدمی ہمارے ساتھ چلے جس نے گھر بنایا ہو لیکن ابھی تک اس نے عمارت کی ضروریات کو پورا نہ کیا ہو۔ جمع کی قید ظاہر میں اتفاقی ہے، یا عادی ہے۔ اور ان اشخاص کو جہاد میں جانے سے اس لئے روک دیا کہ ان چیزوں کے ساتھ لٹکے ہوئے دلوں کی وجہ سے یہ مہم کمزور نہ ہو جائے اور اس طرح مصلحت فوت ہو جائے گی۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہم امور ان لوگوں کے حوالے نہیں کرنے چاہئیں جو فارغ البال نہ ہوں اور نہ اس کو جس کا دل کسی اور چیز میں اٹکا ہوا ہو۔ بلکہ ان لوگوں کے حوالے کئے جائیں جو کہ بھرپور عزم و ارادہ رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں اس کے عزم وارادہ کو کمزور کر دیتی ہیں۔

قوله:''ولا رجلٌ اشتریٰ غنمًا او خلفات وهو ینتظر ولادها'':

''**غنم**'': اس سے مراد جنس ہے۔

''**خلفات**'': ''**خلفة**'' کی جمع ہے۔ گابھن اونٹنی کو کہتے ہیں ''او'': تنویع کے لئے ہے۔

ولادتها: ''واؤ'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ''ضمیر'' **خلفات** کی طرف راجع ہے۔ یہ ''**باب اکتفاء**'' کے قبیل سے ہے۔ اس لئے کہ ایک کے علم سے دوسرے کا علم ہو جاتا ہے۔ تقدیری عبارت اس طرح ہے: ''**ولاد کل واحدة منها او ولاد المذکورات** اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا﴾ [التوبة۔ ۳۴]

اور طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ضمیر دونوں یعنی غنم اور ابل کی طرف راجع ہو لیکن ''**علیٰ سبیل التغلیب**''۔

قوله:فغزافدنا۔۔۔أقریبا من ذلك:

''**فدنا من القریة**'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بخاری میں اسی طرح ہے۔ لیکن ہمزہ کے ساتھ یعنی ''**فأدنیٰ**'' ہے۔ امام نووی شرح مسلم رحمۃ اللہ علیہ میں فرماتے ہیں کہ اسی طرح تمام نسخوں میں یہ لفظ ہمزۂ قطعی کے ساتھ ہے۔ اور قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ اور اس میں دو احتمال ہیں:

① یہ ہمزہ تعدیہ کا ہو۔ یعنی ''دنا'' سے متعدی ہو بمعنی قرب یعنی ''قریب'' ہونا۔ **ای ادنی جیو شه الی القریة**

② یہ لفظ ''حان'' کے معنی میں ہو۔ **أی حان فتحهم** جیسا کہ عرب کہتے ہیں کہ **''أدنبت الناقة اذا حان وقت نتاجها''** اور غیر ناقہ کیلئے اس کو استعمال نہیں کرتے

''النہایہ'' میں ہے: **فأدنٰی بالقریة** ''اسی طرح مسلم میں آیا ہے۔ اور ''دنو'' سے از باب افتعال ہے۔ اور اصل میں ''ادتنی'' ہے۔ تاء کو دال میں مدغم کر دیا اھ۔ تو اس صورت میں یہ اس قول کے قبیل سے ہوگا: ''**اداں من الدين**'' اور حاصل یہ کہ وہ اس گاؤں کے قریب ہو گیا۔

''**صلاة العصر**'': مراد اس سے اس کا آخری وقت ہے۔ اس لئے کہ ''**او قريبًا من ذالك**'' اسی طرف اشارہ کر رہا ہے ''او'' تردید کے لئے ہے احتیاطًا۔ اور ممکن ہے کہ یہ راوی کی طرف سے شک کے لئے ہو۔

قوله: ''فقال للشمس انك مأمورة وانا مأمور۔۔۔حتى فتح الله عليه''

کہ اے سورج تو چلنے پر مامور ہے اور میں دن کے وقت اُس گاؤں کو فتح کرنے پر مامور ہوں۔ ہوا یوں کہ اس نبی نے جمعہ کے روز ان ظالموں سے قتال کیا، جب سورج ڈوبنے لگا تو ان کو خدشہ ہوا کہ اس جہاد سے فراغت سے پہلے سورج غروب نہ ہو جائے۔ ورنہ پھر ہفتہ کا دن داخل ہو جائے گا۔ تو ان کے لئے اس میں قتال جائز نہ ہوگا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعاء فرمائی: **اللهم احبسها علينا فحسبت حتى فتح الله عليه۔**

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''**حبس الشمس**'' کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے:

① بعض علماء کا قول ہے کہ اس کو واپس کر دیا گیا۔

② بعض کا قول ہے کہ سورج واپس نہیں کیا گیا بلکہ کھڑا ہو گیا۔

③ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی حرکت سست پڑ گئی اھ۔

لیکن میرے نزدیک دوسرا قول راجح ہے۔ اسلئے کہ ''حبس'' کے یہی معنی اصل ہیں اور یہ نبوت کے معجزات میں سے ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ روایت بھی مروی ہے کہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دو دفعہ سورج کو روک دیا گیا۔ ایک دفعہ خندق کے دن کہ جب مسلمان عصر کی نماز سے بیگانے کر دیئے گئے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کو واپس لوٹا دیا۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز ادا کی۔ یہ روایت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔ اور دوسری مرتبہ ''اسراء'' کی صبح۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قافلے کا انتظار کیا جس کے پہنچنے کی خبر آپ کو دی گئی۔

اور ''المواھب'' میں ہے کہ یہ رد الشمس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوا تھا۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آ رہی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز نہیں پڑھی۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں پڑھی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**اللهم انه كان في طاعتك وطاعة رسولك فاردد عليه الشمس**' حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میں

نے سورج کو دیکھا کہ وہ غروب ہو گیا لیکن پھر میں نے اس کو غروب ہونے کے بعد طلوع ہوتے ہوئے دیکھا اور اس کی روشنی پہاڑوں اور زمین پر پڑتی دیکھی۔ یہ واقعہ ''خیبر'' میں صہباء نامی علاقہ میں پیش آیا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مشکل الحدیث میں روایت کیا ہے۔ جیسا کہ قاضی عیاض نے اس کو ''الشفاء'' میں روایت کیا ہے۔

ہمارے شیخ عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام احمد کا قول ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اور ابن جوزی نے اس کو ''موضوعات'' میں ذکر کیا ہے۔ لیکن امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ ابن مندہ اور شاہین وغیرہ نے اس کی تخریج کی ہے۔ اور یونس بن بکیر نے اس کو ''زیادۃ المغازی'' میں ابن اسحاق سے روایت کیا ہے۔ جس کو قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ''الشفاء'' میں ذکر کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر لے جایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو ایک قافلے کے آنے کے بارے میں بتلایا۔ اور قافلے کی ایک علامت بھی بتلا دی۔ قریش نے کہا کہ کب آئے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدھ کے دن۔ چنانچہ جب وہ دن آیا تو قریش اس قافلے کو دیکھنے کیلئے چھتوں پر چڑھ گئے۔ دن گزرنے والا تھا۔ وہ اس وقت تک نہ آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دن میں کچھ اضافہ کر دیا گیا۔ اور سورج کو روک دیا گیا۔

اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ''معجم اوسط'' میں سند حسن کے ساتھ حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کو حکم دیا تو وہ گھڑی کیلئے پیچھے ہو گیا۔ اور اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ ''ردشمس'' کا معنی اس کی تاخیر ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ سورج غروب کے قریب ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کو روک لیا۔ اس معنی سے بعض لوگوں کا وہ اشکال بھی دفع ہو جاتا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اس سے اس کی فضیلت صوری کو دیکھا ہے۔ اور اس میں اس کے عدم فائدہ کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہ سورج کے غروب ہونے کے ساتھ نماز عصر قضاء ہو جاتی ہے۔ اور رجوع الشمس اس قضاء کو ادا نہیں بنا سکتا۔ اھ

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس حدیث کو خصوصیات پر محمول کر لیا جائے اور یہی معجزات کے باب میں زیادہ بلیغ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بعض نے کہا ہے کہ اس روایت کا تعارض ایک حدیث صحیح کے ساتھ آتا ہے جس میں یہ آیا ہے:

''لم تحبس الشمس علٰى احد الا ليوشع بن نون''

اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ میرے علاوہ کسی اور نبی کیلئے نہیں روکا گیا ہے سوائے یوشع بن نون کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قوله:''فجمع الغنائم فجاء ت يعنى النار لتأكلها ......''

''يعنى النار'': یہ جملہ تفسیر ہے بعض رواۃ کی طرف سے۔

''لتأكلها'': **''فجمع''** کے ساتھ متعلق ہے۔

''فلم تطعمها'': اس عبارت میں ''تفنّن'' ہے۔ اور معنی یہ کہ اس آگ نے اس کو جلا کر معدوم نہیں کیا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی عادت تھی کہ جب وہ غنائم کو جمع کرتے تو آسمان کی طرف سے آگ آتی تاکہ اس کو کھائے۔ یہ اس کی قبول ہونے کی علامت ہوتی تھی اور اس بات کی کہ اس میں غلول نہیں ہوا ہے۔

''فقال انّ فيكم غلولاً'' یعنی اس نبی ﷺ نے اپنی قوم سے یہ بات اجمال کے ساتھ کہہ دی۔ ''غلول'' یہ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ کا احتمال بھی ہے۔

''فليبايعنى من كل قبيلة'' ''فلیبایعنی'' لام کے سکون کے ساتھ ''فلزقت'' زاء کے کسرہ کے ساتھ۔

''فجاؤوا برأس مثل رأس بقرةٍ'': ''مثل'' جر کے ساتھ ہے صفت بن رہا ہے اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔ حال ہونے کی بناء پر۔ ای مماثلا لرأس بقرة۔

''من الذهب'': یہ رأس اول کیلئے بیان ہے۔

فوضعها: کو مؤنث لایا کیونکہ اس سے مراد غنیمت ہے۔

''ثم أحل الله الغنائم'' ہم پر پردہ ڈالنے کیلئے اور دنیا میں توسع کیلئے غنائم کو حلال قرار دیا اور یہ تصریح ہے اس بات کی جو ''ضمناً'' معلوم ہو چکی ہے۔

رأى ضعفنا وعجزنا'' یہ جملہ متانفہ ہے۔

''فأحلها لنا'' :اس کا اعادہ ترتب حکم کیلئے ہے۔ اور پہلا ''أحل الله'' صرف اخبار کیلئے تھا۔

۴۰۳۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ عُمَرُ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ اَقْبَلَ نَفَرٌ مِنْ صَحَابَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَهِيْدٌ وَفُلَانٌ شَهِيْدٌ حَتّٰى مَرُّوْا عَلٰى رَجُلٍ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَهِيْدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّا اِنِّیْ رَاَيْتُهٗ فِی النَّارِ بُرْدَةٍ غَلَّهَا اَوْ عَبَاءَةٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اِذْهَبْ فَنَادِ فِی النَّاسِ اَنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ ثَلَاثًا قَالَ فَخَرَجْتُ فَنَادَيْتُ اَلَا اِنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا مُؤْمِنُوْنَ ثَلَاثًا۔ (رواه مسلم)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ١١٨' الحديث رقم ١٥٤٧' وأحمد فی المسند ١ / ٣٠' والدارمی فی السنن ٢ / ٣٠٢' الحديث رقم ٢٤٨٩ صحيح مسلم' كتاب الايمان' باب غلظ تحريم الغلول' ح ١١٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ہم سے یہ بیان کیا کہ جب خیبر کا دن آیا (یعنی جب غزوۂ خیبر ختم ہو گیا) تو نبی کریم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے چند لوگ آئے اور (آپس میں) کہنے لگے کہ فلاں شخص شہید ہے' فلاں شخص شہید ہے (ان کے نام لے لے کر ان کی شہادت کا ذکر کر رہے تھے) یہاں تک کہ وہ لوگ ایک شخص (کی لاش) پر سے گزرے اور کہنے لگے (یہ) فلاں شخص شہید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ہرگز نہیں' (تم لوگ جس معنی میں اس کو شہید کہتے ہو وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ) میں نے اس شخص کو مالِ غنیمت میں سے ایک چادر یا فرمایا کہ ایک دھاری دار کملی چرانے کے سبب جہنم میں (جلتے) دیکھا ہے''۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے (مجھ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ ''اے ابن خطاب! جاؤ اور لوگوں کے درمیان (تین مرتبہ) اعلان کر دو کہ ''جنت میں (ابتداء) صرف مؤمن (یعنی کامل مؤمن) ہی داخل ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ چنانچہ میں نکلا اور میں نے تین مرتبہ یہ اعلان کیا کہ ''خبردار! جنت میں صرف مؤمن ہی داخل

ہوں گے''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله:لما كان يوم خيبر......أوعباء ة**

لفظ''یوم'': نصب اور رفع دونوں کے ساتھ ہے۔

''صحابة'': صاد کے فتحہ کے ساتھ، یہ''صاحب'' کی جمع ہے۔علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے''النہایہ'' میں ذکر کیا ہے کہ کسی بھی''فاعل'' (کے وزن پر آنے والے اسم) کی جمع''فعالة'' کے وزن پر نہیں آتی سوائے اس لفظ کے۔

''کلا'': ہرگز نہیں۔ یہ کلام''ردع'' کیلئے ہے۔

''عباء ةٌ'': عین مہملہ کے فتحہ اور مد وقصر کے ساتھ یہ ایک دھاری دار چادر ہے جس کو اعراب پہنتے ہیں۔

قوله:''يا بن الخطاب اذهب فناد في الناس انه لا يدخل الجنّة الاّ المؤمنون ثلاثا ......'':

''انه'' ہمزہ کو مفتوح و مکسور دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔اور ضمیر شان ہے۔

''ثلاثا'': یہ''نادِ'' کے ساتھ متعلق ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عرف میں''مؤمن'' اس کو کہتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اس پر جو وہ لے کر آئے ہیں ایمان لے آئے۔اور جس نے خیانت کی گویا کہ اس نے ان کی تصدیق ہی نہیں کی۔اس لئے کہ وہ تصدیق کے موجبات پر نہیں چلا۔اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مؤمن نہیں کہا۔یا یہ کہ یہاں''مؤمنوں'' سے مراد وہ ہیں جو گناہوں سے بچتے ہوں۔اور''دخول'' سے مراد ''دخول بلا عذاب'' ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول''انّي رايته في النّار'' اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بعض وہ لوگ جن کو آگ کا عذاب دیا جائے گا وہ اس آگ میں داخل ہوں گے۔اور ان کو اس میں قیامت سے پہلے عذاب دیا جائے گا۔لیکن اس قول میں''تأمل'' ہے۔اس لئے کہ دوسری نصوص اس پر شاہد ہیں کہ حقیقتاً''دخول النار'' حشر کے بعد ہوگا۔اور اس مذکورہ روایت کو''تمثیل'' پر محمول کیا جائے گا۔اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ عنقریب ایسا ہی ہوگا۔

جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور تمثیل بتلایا گیا تھا کہ بلال جنت میں داخل ہے۔یہ بات آپؐ کی حیات میں آپؐ نے ارشاد فرمائی ہاں عذاب قبر حق اور ثابت ہے۔لیکن اس کی نوعیت دوسری ہے،اس طرح نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں احتمال ہے کہ اس کلام میں مجاز ہو۔اور مطلب یہ ہو کہ میں نے اس کو ایسے گناہ میں دیکھا ہے جو کہ آگ کا موجب ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿**ان الأبرار لفي نعيم وان الفجار لفي جحيم يصلونها يوم الدين**﴾

[الانفطار:۱۵]

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آگ سے مراد برزخی آگ ہو۔جیسا کہ حدیث میں ہے:**القبر روضةٌ من رياض الجنة او حفرة من حفر النيران**''یا شاید روایت یہاں پر کشف و مشاہدہ پر محمول ہو۔اور معنی یہ ہوگا کہ اس کا مال آگ ہوگا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر کلام تو شہادت میں ہے ایمان میں تو نہیں ہے۔تو اس قول کا کیا مطلب ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہاں اس سے مراد تغلیظ ہے۔جو بطور مبالغہ وارد ہے۔مطلب یہ کہ تم نے اتنے یقین کے ساتھ گواہی دے دی

کہ وہ شہید ہے اور جنتی ہے۔ حالانکہ میں نے اس کو آگ میں دیکھا ہے۔ اس لئے تم اس کلام کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ اس کے ایمان کے بارے میں کلام ہے۔ اور یہ فرمانا بطور ردع وزجر کے تھا۔ اھ

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کو یہ کشف ہو گیا ہو کہ وہ آگ میں ہے۔ اور یہ انکشاف نہیں ہوا کہ وہ اہل ایمان میں سے ہے۔ جبکہ حقیقتاً شہادت تو ایمان پر موقوف ہے۔ جیسا کہ دخول جنت اسی پر متفرع ہے۔ تو اس کے ایمان پر بالحزم شہادت نہیں دینی چاہیے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ اسباب شقاوت و بدبختی بھی ظاہر ہو چکے ہوں۔ اگر چہ اس کے بعض احوال سعادت بھی ہوں واللہ اعلم بالصواب۔

بَابُ الْجِزْيَةِ

جزیہ کا بیان

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "جزیہ" اس چیز کو کہتے ہیں جو اہل ذمہ سے لیا جاتا ہے۔ اور اس کو جزیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے خون کے بدلہ میں اس کو دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ ﴾ [التوبۃ۔۲۹] "صاغرون" کا معنی ہے کہ ذلیل، حقیر اور تابعدار۔

"ہدایہ" میں ہے کہ اگر ذمی نے اس کو اپنے نائب کے ہاتھ بھیجا تو اصح روایت کے مطابق اس سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کو اس کا مکلف بنایا جائے گا کہ وہ بذات خود آ کر کھڑا ہو کر دے اور لینے والا بیٹھا ہوا ہو۔ اور کہے گا کہ "اعط الجزية يا ذمی"۔ "او ذمی! جزیہ دے"۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ لغت میں "جزیہ" جزاء یعنی "بدلہ" کو کہتے ہیں۔ "جزیۃ" بروزن فعلۃ ہے یہ وزن بیان ہیئت کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ جزیہ یہ اعطاء کے وقت کی حالت ذلت پر دلالت کرتا ہے۔

جزیہ کی قسمیں:

دو قسمیں ہیں۔ جزیہ کی پہلی قسم وہ جو کہ رضامندی اور صلح کے ساتھ مقرر کی جاتی ہے۔ جتنی مقدار پر اتفاق ہو جائے اس متفق علیہ مقدار میں اضافہ نہیں کیا جائے گا تا کہ غدر اور دھوکہ نہ لازم آئے۔ اس کی مشروعیت کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجران کے یہودیوں کے ساتھ صلح کی جو یمن کے قریبی علاقہ میں آباد تھے۔ کہ سال میں دو ہزار "حلۃ" پر ادا کریں گے۔ ابوداؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران کے ساتھ دو ہزار حلۃ پر صلح کی۔ نصف (یعنی ایک ہزار) صفر میں ادا کریں گے اور نصف رجب کے مہینے میں ادا کریں گے۔

"حلہ" دو کپڑوں پر مستمل ہے "ازار" اور "رداء" (تہہ بند اور چادر) اور ایک روایت میں ہے: كل حلةا و فية کہ ہر حلہ کی قیمت اوقی کے برابر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو تغلب کے نصاری کے ساتھ صلح کی کہ وہ ان میں سے ہر ایک سے دوگنا

لیں گے جتنا کہ مسلمان سے مال واجب (زکوٰۃ) لیا جاتا ہے۔

جزیہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ جب امام کفار پر غلبہ حاصل کر لے۔ ان کے بلاد کو فتح کرے۔ اور ان کو ان کی املاک پر برقرار رکھے۔ اور ان لوگوں پر اپنی طرف سے جزیہ مقرر کرے۔ تو یہ ایک معین مقدار ہوتی ہے۔ وہ اس کو ادا کریں گے۔ چاہے یا نہ چاہے راضی ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ غنی (مالدار) سال میں ۴۸ اڑتالیس درہم ادا کرے گا یعنی ہر مہینہ میں چار دراہم دے گا۔ متوسط شخص ۲۴ چوبیس دراہم یعنی ہر مہینہ دو درہم ادا کرے گا۔ اور فقیر پر ۱۲ بارہ درہم مقدر ہوں گے یعنی ہر مہینہ ایک درہم ادا کرے گا۔ امام کے لئے مستحب ہے کہ وہ ان سے قیمت کم کرے۔ یہاں تک کہ متوسط سے دو دینار لے۔ اور غنی سے چار دینار لے امام شافعی کہتے ہیں کہ ہر بالغ پر ایک دینار یا بارہ دراہم ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ غنی (مالدار) سے چالیس دراہم یا چار دینار لے گا، اور فقیر سے دس دراہم یا ایک دینار لے گا۔ اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اور یہی امام احمد سے بھی روایت ہے کہ اس میں کوئی مقدار متعین نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ امام کی رائے پر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو دینار لینے کا حکم دیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ نجران کے ساتھ دو ہزار حلے پر صلح کی تھی۔

الفصل الاول :

مجوس سے جزیہ لینے کا بیان

۴۰۳۵: عَنْ بَجَالَةَ قَالَ كُنْتُ كَاتِبًا لِجَزْءِ بْنِ مُعَاوِيَةَ عَمِّ الْاَ حْنَفِ فَاَ تَانَا كِتَابُ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِسَنَةٍ فَرِّقُوْا بَيْنَ كُلِّ ذِىْ مَحْرَمٍ مِنَ الْمَجُوْسِ وَلَمْ يَكُنْ عُمَرُاَخَذَالْجِزْيَةَ مِنَ الْمَجُوْسِ حَتّٰى شَهِدَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَخَذَ هَا مِنْ مَجُوْسِ هَجَرَ۔ (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦ / ٢٧٥، كتاب الجزية والموادعة، باب الجزيه الموادعة مع اهل الذمة والحرب، الحديث رقم ٣١٥٦ ـ ٣١٥٧ و أبو داود فى السنن ٣ / ٤٣١، الحديث رقم ٣٠٤٣، والترمذى فى ٤ / ١٢٤، الحديث رقم ١٥٨٦

ترجمہ: ''حضرت بجالہ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں حضرت جزء بن معاویہ (تابعی) کے ہاں جو حضرت احنف رضی اللہ عنہ (صحابی) کے چچا تھے منشی تھا۔ (ایک مرتبہ) ہمارے پاس حضرت (امیر المؤمنین) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات سے ایک سال پہلے ان کی طرف سے ایک خط آیا (جس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ) ''مجوسیوں یعنی آتش پرستوں میں ان کے محارم کے درمیان علیحدگی کرا دو''۔ نیز (راوی کہتے ہیں کہ) عمر رضی اللہ عنہ (پہلے) مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیا کرتے تھے یہاں تک کہ جب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا (تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجوسیوں سے جزیہ لینا شروع کیا)''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

بجالۃ بن عبدۃ۔ یہ بجالہ بن عبدہ تمیمی ہیں۔ جزء بن معاویہ کے کاتب ہیں۔ احنف بن قیس مکی کے چچا ہیں۔ ثقہ ہیں اور اہل بصرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے ''عمران ابن الحصین'' سے احادیث سنیں۔ اوران سے عمرو بن دینار نے حدیث سنی ہے۔ ۹۰ھ مکہ میں زندہ تھے۔ ''بجالہ'' میں باء موحدہ مفتوح اور جیم مخفف یعنی بغیر تشدید کے ہے۔ ''جزء'' میں جیم مفتوح اور زاء ساکن ہے جس کے بعد ہمزہ ہے۔ لفظ ''جزء'' کا یہی ضبط صحیح ہے۔ اہل لغت اصحاب حدیث بھی اسی طرح روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله: كنت كاتبا: ''لجزء بن معاوية'':

صحیح یہ ہے کہ یہ اسم جیم کے فتحہ، زاء کے سکون اور ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اسی طرح اہل لغت اور محدثین نے ذکر کیا ہے۔ دار قطنی فرماتے ہیں یہ لفظ جیم کے کسرہ، زاء کے سکون اور اس کے بعد یاء کے ساتھ ہے۔ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ کہ لفظ جیم کے فتحہ اور زاء کے سکون اور اس کے بعد یاء کے ساتھ ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلا قول ہی صحیح ہے اور اصول کے مطابق ہے۔ بعض کے ہاں یہ زاء کے کسرہ اور اس کے بعد یاء مشدّدہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ تمیمی اور تابعی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ اور یہ حضرت عمرؓ کی طرف سے اھواز کے والی اور گورنر مقرر تھے۔

عم الاحنف: یہ ''جزء'' سے بدل ہے۔ **قوله: فاتأنا كتاب عمر بن الخطاب۔۔۔من المجوس**: حضرت عمرؓ کی موت سے پہلے ان کا خط ہمارے پاس آیا۔ جس میں یہ حکم تھا کہ نکاح میں مجوسی ذمی کے محرم کے درمیان جدائی ڈال دو اور ذمی مجوسی کو نکاح محرم سے منع کر دو۔ مجوسی اپنی بہن، ماں اور بیٹی کے ساتھ نکاح کیا کرتے تھے۔

وجہ ممانعت بالکل واضح ہے کہ یہ شعار اسلام کے خلاف ہے۔ لہٰذا وہ یہ کام نہ کریں۔ اگر چہ یہ ان کے دین میں جائز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کو مجوسیوں سے دور کر دو اور جدا کرو۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''محرم'' مصدر میمی ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ جس کو تکلیف دینا تم پر حرام ہے۔ ''النہایہ'' میں ہے: **كل مسلم على مسلم محرم**۔ کہ عرب کہتے ہیں: **انه محرم عنك۔ أي يحرم اذاك عليه** یعنی اس کی تکلیف تمارے اوپت حرام ہے اور یوں بھی کہتے ہیں: **مسلم محرم ، أي الذى لم يحل من نفسه شيئا يرفع به** (ہر مسلمان دوسرے مسلمان پر حرام ہے) ''مجوس'' سے مراد آگ کی عبادت کرنے والے ہیں۔

قوله: ولم يكن عمر اخذالجزية ......:

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ اہل مجوس سے جزیہ لیا جائے گا اکثر علماء کہتے ہیں کہ یہ اہل کتاب نہیں ہیں اور ان سے جزیہ لینا سنت سے ثابت ہے۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ سے قرآن کے حکم کی وجہ سے لیا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ بھی اہل کتاب میں سے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے:

كان لهم كتاب يدر سونه فأصبحوا و قداسرى على كتابهم فرفع من بين أظهرهم: کہ ان کی ایک کتاب تھی جس کو یہ پڑھتے تھے......

''امر'': تشدید میم کے ساتھ ہے بمعنیٰ ''عین''۔

علی جیش: ایک نسخہ میں ''علی جیشه'' کے الفاظ ہیں۔

الفصل الثانی:

مقدارِ جزیہ کا بیان

۴۰۳۶: عَنْ مُعَاذٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَمَّا وَجَّهَهُ اِلَى الْيَمَنِ اَمَرَهُ اَنْ يَّاخُذَ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ يَعْنِىْ مُحْتَلِمٍ دِيْنَارًا اَوْ عَدْلَهُ مِنَ الْمَعَافِرِيِّ ثِيَابٌ تَكُوْنُ بِالْيَمَنِ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۴۲۸، کتاب الخراج والامارة، باب فی اخذ الجزية، ح ۳۰۳۸ والترمذی فی ۳ / ۲۰ الحديث رقم ۶۲۳، والنسائی فی ۵ / ۲۶، الحديث رقم ۴۲۵۰ و أحمد فی المسند ۵ / ۲۳۰

ترجمہ: ''حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (معاذ رضی اللہ عنہ) کو (قاضی و حاکم بنا کر) یمن روانہ کیا تو ان کو یہ حکم دیا کہ وہ (وہاں کے) ہر حالم یعنی ہر بالغ سے ایک دینار یا ایک دینار کی قیمت کے مساوی معافری کپڑا جو یمن میں تیار ہوتا ہے (جزیہ کے طور پر) لیں''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لما وجهه......يعنى محتلم:

''یعنی'': أی کے معنی میں ہے اس لئے مابعد مجرور ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ جزیہ صرف بالغ مرد ہی سے لیا جائے گا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ مجمع علیہ ہے کہ عورت بچے اور مجنوں پر جزیہ نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جزیہ ان کے قتل کے بدلہ میں ہوتا ہے ہمارے نزدیک جزیہ بدل ہے ان کے لڑنے سے جو کہ مسلمانوں کیلئے باعث نصرت ہے اور یہ مذکورہ بالا لوگ ایسے نہیں ہیں۔ ان لوگوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جائے گا: ① نابینا ② مفلوج ③ لنجے ④ ایسا شیخ کبیر جو کسب اور قتال پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ ⑤ ایسا فقیر جو عمل پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس فقیر پر جزیہ ہے۔

حضرت معاذ کی حدیث میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خذ من كلِّ حالمٍ'' اور ''حالم'' سے مراد بالغ ہے اور یہ مطلق ہے۔

ہماری دلیل یہ حدیث ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عثمان بن حنیف کو بھیجا تو انہوں نے فقیر غیر معتمل پر کوئی وظیفہ مقرر نہیں کیا۔

''ابن زنجویہ'' نے اپنی سند کے ساتھ ''کتاب الاموال'' میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شیخ کبیر کو دیکھا جو اہل ذمہ سے مانگ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ کو کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی مال نہیں ہے جبکہ مجھ سے جزیہ لیا جاتا

ہے۔عمرؓ نے کہا کہ ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ پھر بھی ہم تم سے جزیہ لیتے ہیں۔ پھر اپنے عمال کو لکھ بھیجا کہ تم شیخ کبیر سے جزیہ مت لیا کرو۔

مندرجہ ذیل لوگوں سے جزیہ نہ لینے پر اتفاق ہے: ① غلام ② مکاتب ③ مدبر ④ ام ولد اور نہ راہبوں سے لیا جائے گا۔ ''الرھبان'' راہب کی جمع ہے۔ بشرطیکہ وہ لوگوں کے ساتھ اختلاط نہ رکھتا ہو۔ اور جو لوگوں کے ساتھ گھل مل گیا ہو اس سے جزیہ لیا جائے گا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد، ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے عن اعمش عن ابی وائل عن مسروق عن معاذؓ روایت کیا ہے:

''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف بھیجا۔ اور مجھے حکم دیا کہ میں تیس گائیوں میں سے ایک تبیعہ لے لوں اور ہر چالیس میں سے ایک مسنہ لوں کہ ہر بالغ مرد سے ایک دینار یا اس کے برابر معافری کے کپڑے لوں مالدار اور فقیر میں فرق کئے بغیر۔'' ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ روایت حسن صحیح ہے۔

بعض نے اس کو مسروق عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرسلاً نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اصح ہے۔ ابن حبان نے بھی اس کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اور اس میں ''حالم'' کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مسند عبدالرزاق میں اس طرح روایت ہے: **حدثنا معمرو سفيان الثورى عن الأعمش عن ابى وائل عن مسروق عن معاذ رضى الله عنه: من كل حالم حالمة دينارًا او عدله معافر**۔ معمر کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ عورتوں پر کچھ بھی لازم نہیں ہے۔ کئی طرق میں ''حالمة'' کا ذکر موجود ہے۔ ابوعبید کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں یہ منسوخ ہے۔ اس لئے کہ ابتدائے اسلام میں مشرکین کی عورتوں اور بچوں کو ان کے مردوں کے ساتھ قتل کیا جاتا تھا۔ اور صعب بن جثامۃ کی روایت ہے: ''**ان خيلاً اصابت من آبناء المشركين فقال عليه السلام**: ''**هم من آبائهم**'' پھر ابوعبید نے صعب بن جثامۃ سے سنداً نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاد مشرکین کے بارے میں پوچھا کہ کیا ہم ان کو ان کے ساتھ قتل کریں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**نعم فانهم منهم**'' لیکن پھر خیبر کے دن اس سے منع کر دیا گیا۔

قوله: دينارا أو عدله......:

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ اقل جزیہ کی مقدار ایک دینار ہے، اس میں غنی و (مالدار) فقیر برابر ہیں۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو عام چھوڑا ہے، اس کی تفصیل بیان نہیں کی ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہری مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مالدار سے چار دینار، متوسط سے دو دینار اور تنگ دست فقیر سے ایک دینار بطور جزیہ کے لیا جائے گا۔ اھ یہی اصل مذہب ہے۔ بلکہ مستحب بھی یہی ہے اور ہمارا مسلک حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے

دلائل:

پہلی دلیل: عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ عمر بن بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حذیفہ بن الیمان اور عثمان بن حنیف کو سوادعراق کی طرف بھیجا۔ چنانچہ دونوں نے اس کی زمین کی پیمائش کی۔ اوراس پر خراج مقرر کیا۔ اورلوگوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا۔ (جیسا کہ ہم نے کہا ہے۔) جب دونوں واپس آئے۔ تو دونوں نے اس فعل کی خبر حضرت عمر کو دے دی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے بھی اسی پر عمل کیا۔

دوسری دلیل: ابن ابی شیبہ کی روایت ہے۔ علی بن مسہر شہبانی عن اُبی عون محمد بن عبداللہ الثقفی سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے رؤس رجال پر جزیہ کو مقرر کیا ہے۔ چنانچہ غنی پر چالیس دراہم سالانہ، متوسط پر چوبیس دراہم سالانہ، اور فقیر پر بارہ دراہم سالانہ مقرر کیئے۔

تیسری دلیل: یہ حدیث مرسل ہے۔ اورابن زنجویہ نے اپنی کتاب الاموال میں ذکر کیا ہے۔ ''**حدثنا ابو نعیم حدثنا معذل عن الشيباني عن ابی عون عن المغيرة بن شعبه ان عمر وضع...... ......**''۔

چوتھی دلیل: ایک اور طریق سے ابن سعد نے ''طبقات'' میں ابی نصرۃ سے روایت کیا ہے:

''**ان عمرؓ بن الخطاب وضع الجزية علٰى اهل الذمة فيما فتح من البلاد ووضع على الغنى......**''

پانچویں دلیل: ایک اور طریق سے ابوعبید القاسم بن سلام نے حارثہ بن مغرب سے اسناداً نقل کیا ہے: ''**عن عمر انه بعث عثمان بن حنيف فوضع عليهم ثمانية واربعين واربعة وعشرين واثنى عشر**''

چھٹی دلیل: یہ ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے ہوا۔ اور کسی نے اس پر کوئی نکیر نہیں کی تو اس طرح یہ اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم ٹھہر گیا۔

روایت باب کا جواب:

پہلا جواب: روایت صلح پر محمول ہے۔ اسلئے کہ یمن عنوۃً فتح نہیں ہوا تھا بلکہ صلحاً فتح ہوا تھا۔ تو اس لئے ان پر ایسا ہی مقرر کیا۔ اور یہی بات ہم بھی کرتے ہیں۔

دوسرا جواب: یہ کہ اہل یمن فاقہ کشی میں زندگی گذار رہے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم تھی، اس لئے ان پر اتنا جزیہ مقرر کیا جتنا کہ فقراء پر مقرر کیا جاتا ہے۔ اوراس پر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت دلالت کر رہی ہے جو حضرت مجاہد سے ہے کہ میں نے مجاہد سے کہا کہ اہل شام کے کوئی چار دینار مقرر تھے۔ جبکہ اہل یمن پر ایک دینار؟ تو کہا کہ یہ ان کی مالداری کی وجہ سے۔

غنی، متوسط، فقیر کا معیار:

فقیر، غنی اور متوسط کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ جس کے پاس بیس ہزار درہم ہوں تو وہ موسر اور غنی ہے۔ جس کے پاس دوسو دراہم سے لے کر دس ہزار دراہم تک ہوں لیکن دس ہزار نہ ہوں تو وہ متوسط ہے۔ جو کمانے والا ہوگا (کام کرنے والا) وہ معسر فقیر ہوگا۔ فقیہ ابوجعفر فرماتے ہیں کہ اس بارے میں اس شہر کے عام عادت کو دیکھا جائے گا کیونکہ بلخ میں پچاس

ہزار دراہم والے مکثر اور مالدار کہا جاتا ہے۔ جبکہ بصرہ اور بغداد میں اس کو مالدار اور مکثر نہیں کہا جاتا۔

مسلمان پر جزیہ کا بیان

۴۰۳۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَصْلُحُ قِبْلَتَانِ فِي اَرْضٍ وَاحِدَةٍ وَلَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ جِزْيَةٌ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ٤۳۸، الحديث رقم ۳۰۵۳، والترمذی، ۳ / ۲۷ كتاب الزكوٰة، باب ما جاء ليس على المسلمين، ح ٦۳۳ وأحمد فی المسند ۱ / ۲۲۳

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک ملک میں دو قبلے (یعنی دو مذہب) نہیں ہونے چاہئیں اور نہ ہی کسی مسلمان پر جزیہ عائد ہو سکتا ہے''۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: قوله لا تصلح قبلتان فی أرض واحدة: "وليس على المسلم جزية"

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ برابری کے ساتھ ایک جگہ میں دو دین نہیں رہ سکتے۔ مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کفار کے درمیان رہائش اختیار کرے، اس لئے کہ جب مسلمان ایسا کرے گا۔ تو درحقیقت اس نے اپنے آپ کو ذمی کی جگہ پر رکھ دیا۔ چنانچہ اس کا مقام وہ ہوگا جو ہمارے ہاں ذمی کا جو ہوتا ہے۔ اور مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ ذلت نفس کے ساتھ رہے۔ اور اس کے ساتھ وہ سلوک ہو جو ہمارے ہاں اہل جزیہ پر ہوتا ہے۔ مسلمان ہو کر ذلت وخواری کی زندگی گزارے! حالانکہ: [ولله العزّة ولرسوله وللمؤمنين] اور کہ جس کا دین دینِ اسلام کے مخالف تو اس کے لئے بلادِ اسلامیہ میں اقامت کی اجازت نہیں ہے مگر ادائیگی جزیہ کے ساتھ۔ لیکن وہاں اس غیر مسلم کو اشاعت دین کی اجازت نہیں ہوگی۔

(حدیث میں مذکور) دونوں امور میں وجہ مناسبت یہ ہے کہ اس غیر مسلم ذمی پر جزیہ ہے لیکن مسلمان پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔ تو یہ چیز ایک دین کو بلند کرے گی اور دوسرے کو پست کرے گی اور بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ مسلمان پر جزیہ خراج نہیں ہے جو ان زمینوں پر لگایا جاتا ہے جو زمین اہل ذمہ کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی ہیں اور اکثر نے اس سے مراد یہ لیا ہے کہ اگر کوئی ذمی ادائیگی جزیہ سے پہلے پہلے مسلمان ہو گیا تو اس سے جزیہ کا مطالبہ مناسب نہیں ہوگا کیونکہ وہ مسلمان ہے۔ اور مسلمان پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔ اور یہی بات درست ہے۔ بشرطیکہ دونوں فصلوں میں وجہ مناسبت صحیح معلوم ہو جائے اھ

اس روایت میں وجہ مناسبت شرط نہیں ہے اس لئے کہ اس میں احتمال ہے کہ راوی نے یہ دونوں باتیں علیحدہ علیحدہ مجالس میں سنی ہوں اور پھر ان دونوں کو اپنی ایک روایت میں جمع کیا ہو۔ اس کی تائید جامع صغیر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ کہ جس میں صرف ایک جز مذکور ہے ''ليس على مسلمٍ جزية'' اور کہا ہے کہ اس کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اگرچہ اس میں احتمال بھی ہے کہ اس نے ایک طویل حدیث سے صرف اس ٹکڑے کو ذکر کیا ہو۔ اور باقی روایت کو حذف کر دیا ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس حدیث میں یہود اور نصاریٰ کے جزیرۃ العرب سے جلاوطنی کی طرف اشارہ ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جائز نہیں ہے کہ مسلمان اور کافر ایک جگہ میں رہائش پذیر ہوں اور یہ حکم جزیرۃ

العرب کے ساتھ مختص ہے۔اور جہاں تک بات ہے ''ولیس علی مسلم جزیة'' کی تو اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہاں ''جزیہ'' سے مراد وہ خراج (ٹیکس) ہے جو ان زمینوں پر مقرر کیا جاتا ہے جو صلحاً فتح ہوئی ہوں۔لیکن صلح اس شرط کے ساتھ ہو کہ وہاں کے لوگ اس مقرر کردہ ٹیکس کی ادائیگی کریں گے۔حتی کہ جب وہ مسلمان ہو جائیں گے تو پھر ان کی زمینوں سے خراج اور ٹیکس ختم کر دیا جائے گا اور ان پر سے جزیہ بھی ساقط ہو جائے گا یہاں تک کہ ان لوگوں کے لئے زمین کی بیع بھی درست ہوگی ۔برخلاف اس صورت کے کہ اگر ان کے ساتھ اس شرط پر صلح ہو جائے کہ یہ زمین اہل اسلام کی ہوگی،اور وہ لوگ اس میں رہیں گے ٹیکس کی ادائیگی کی شرط کے ساتھ یا وہ عنوۃً فتح ہوئی ہو اور مسلمان اہل ذمہ کو خراج یا اس سے کم رقم پر رہنے دیں تو اس صورت میں ان کے اسلام لانے یا مرنے کی وجہ سے خراج ساقط نہیں ہوگا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل جزیہ میں سے کوئی سال کی تکمیل کے بعد اسلام لے آیا تو اس سے جزیہ ساقط ہو جائے گا اور اسی طرح اگر وہ درمیان سال میں بھی اسلام لے آیا۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں صورتوں میں اختلاف فرماتے ہیں۔اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جس کی تخریج ابوداؤد اور ترمذی نے جریر عن قابوس بن ابی ظبیان عن ابیہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے کی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا۔''لیس علی مسلمٍ جزیةٌ''۔

ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی کے بارے میں سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اسلام لے آئے تو اس پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔سفیان ثوری کی بیان کردہ تفسیر کو بعینہ طبرانی نے اپنی معجم اوسط میں حضرت ابن عمرؓ کے طریقے سے یوں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

''من أسلم فلا جزية عليه''

(ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں قابوس متکلم فیہ راوی ہیں چنانچہ)''ابن قطّان'' نے قابوس کی تضعیف کی ہے۔لیکن معجم طبرانی میں قابوس کا ذکر نہیں ہے۔اس حدیث کا عموم اس چیز کے واجب کو ساقط کر دیتا ہے۔جو چیز اس پر قبل از اسلام لازم تھی یعنی جزیہ یہاں خصوصی طور پر یہ معنی بیان کرنا مقصود ہیں اس لئے کہ مسلمان پر ابتداء عدم جزیہ ضروریات دین میں سے ہے۔اور اس حدیث اور اس جیسی اور احادیث کی بناء پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جزیہ اسلام کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔جزیہ اور استرقاق کے درمیان فرق کا اعتراض بھی وارد نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں کفر کی سزا ہیں استرقاق اسلام کی وجہ سے مرتفع نہیں ہوگا اور اسی طرح خراج بھی ساقط نہیں ہوگا، جبکہ جزیہ مرتفع ہو جائے گا۔ان دونوں امور پر اجماع امت ہے۔اگر آپ اس کی حکمت کو سمجھ گئے تو ٹھیک ہے۔ورنہ اتباع تو واجب ہے ہی کہ خراج الارض اور جزیہ کے درمیان فرق واضح ہے کہ خراج الارض میں کوئی ذلت نہیں ہے اس لئے کہ یہ زمینوں کا خرچہ ہے تا کہ وہ ہمارے ہاتھ (قبضہ) میں رہے۔اور ایک مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمانوں کیلئے زمین کی بقاء کی کوشش کرتا ہے۔برخلاف جزیہ کے کہ اس میں ظاہری ذلت ہے۔جزیہ کفار کا شعار ہے۔اور جہاں تک بات ہے استرقاق کی تو واضح رہے کہ یہ شخص ایسی حالت میں اسلام قبول کر رہا ہے جب کہ یہ ایک شخص معین کی ملکیت میں ہے یعنی حق اللہ سے وابستگی بعد میں ہوئی ہے اور حق العبد پہلے سے وابستہ ہے)۔

جزیہ پر صلح کا بیان

۴۰۳۸:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :خَالِدَبْنَ الْوَلِيْدِ اِلٰى اُكَيْدِرِ دُوْمَةَ فَاَخَذُوْهُ فَاَتَوْا بِهٖ فَحَقَنَ لَهٗ دَمَهٗ وَصَالَحَهٗ عَلَى الْجِزْيَةِ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۳۲۷ ' كتاب الخراج والامارة' فى اخذ الجزيه' ح ۳۰۳۷۔

ترجمہ: ''اورحضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اکیدر دومہ کے مقابلہ پر بھیجا' چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں نے اس کو پکڑ لیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں لے آئے' آپ ﷺ نے اس کا خون معاف کر دیا اور جزیہ پر اس سے صلح کر لی''۔(ابوداؤد)

اکیدر دومۃ ۔ یہ اکیدر''عبدالملک کندی'' کے بیٹے ہیں اور''صاحب دومۃ الجندل'' کے خطاب سے مشہور ہیں۔ یہ نصرانی تھے ان کے پاس نبی ﷺ نے نامہ مبارک ارسال فرمایا تھا۔اورانہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا۔ان کا ذکر ''باب الجزیہ'' میں ہے۔اکیدر اکدر کی تصغیر ہے اور''دومۃ'' میں دال مہملہ پر ضمہ وفتحہ دونوں درست ہیں۔''دومہ'' شام اور حجاز کے درمیان ایک مقام کا نام ہے۔تبوک کے قریب واقع ہے۔

رسول ﷺ نے مہاجرین اوراعراب کا ایک ایک دستہ ان کی طرف روانہ کیا۔مہاجرین کے دستہ کے امیر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیہاتیوں کے دستہ کی سربراہی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے۔رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید سے فرمایا تھا کہ تم اس کو گائے کا شکار کرتے ہوئے پاؤ گے۔چنانچہ یہ دستہ چاندنی رات میں قلعہ تک پہنچ گیا اور اکیدر اپنی بیوی کے ساتھ اپنے محل کی چھت پر تھا' کہ ایک گائے آئی اور اس کے محل کے دروازے پر اپنے سینگ مارنے لگی یہ دیکھ کر اس کی بیوی بولی: کیا تم نے اس جیسی گائے کبھی دیکھی ہے؟ وہ بولا اللہ کی قسم نہیں' اور بولا کیا ہم اس جیسی گائے کو چھوڑ دیں گے؟ چنانچہ اسی لمحہ اس نے گھوڑا اور چراغ لانے کا حکم دیا اور اپنے ساتھ اپنے اہل خانہ میں سے چند سواروں کو ساتھ لیا' ان کے ساتھ اس کا بھائی بھی تھا جس کو''حسان'' کہا جاتا تھا۔اسی اثناء میں ان کا آمنا سامنا رسول اللہ ﷺ کے جنگی دستہ سے ہو گیا اس دستہ نے اکیدر کو پکڑ لیا' اوراس کے بھائی''حسان'' کو قتل کر ڈالا۔رسول اللہ ﷺ نے اکیدر کو قتل کرنے سے منع فرمایا تھا۔چنانچہ اس نے اس موقع پر اسلام قبول نہیں کیا' بلکہ جزیہ میں عافیت سمجھی۔پھر کچھ عرصہ کے بعد اسلام قبول کر لیا اور اچھے مسلمان ثابت ہوئے اھ۔بعض شراح کا کہنا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اکیدر مسلمان نہیں ہوئے بلکہ بحالت نصرانیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں کے لشکر کے ہاتھوں سے قتل ہوئے۔اکیدر :ہمزہ پر ضمہ، کاف پر فتحہ، اس کے بعد یاء، پھر دال مہملہ مکسورہ اور پھر راء ہے۔ یہ عبدالملک الکندی کا بیٹا ہے۔یہ دومۃ کے بادشاہ کا نام ہے۔بلاد شام میں سے تبوک کے قریب کوئی شہر یا قلعہ فتح ہے جیسا کہ''زید'' کی اضافت''خیل'' کی طرف کی جاتی ہے۔

خالد بن الولید۔ یہ''خالد'' ولید قرشی کے بیٹے ہیں جو مخزومی ہیں۔ان کی والدہ''لبابۃ الصغریٰ'' ہیں جو ام المؤمنین حضرت میمونہ کی بہن ہیں۔زمانہ اسلام سے پہلے''خالد'' کا شمار اشراف قریش میں کیا جاتا تھا۔آنحضرت ﷺ نے ان کو''سیف اللہ'' کا

خطاب عطا فرمایا۔ ۲۱ھ میں وفات پائی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو کچھ وصیت کی۔ ان سے ان کے خالہ زاد بھائی عبداللہ بن عباس، علقمہ اور جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہم روایت حدیث کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی کہ اس کو قتل نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خط بھی لکھا تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ بھیجا تھا۔ جب وہ اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے تو اس کا خون معاف کر دیا گیا اور ''مغرب'' میں ہے کہ "**حقن دمه**" اس وقت کہتے ہیں جب کو کسی واجب القتل شخص کا خون بہانے سے روک دیا جائے۔

ان کے ساتھ جزیہ پر صلح کر لی۔ پھر وہ اسلام لے آئے اور ایک بہترین مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزاری۔

عشر کا بیان

۴۰۳۹: وَعَنْ حَرْبِ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ جَدِّهِ اَبِيْ اُمِّهٖ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : قَالَ اِنَّمَا الْعُشُوْرُ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى وَلَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ عُشُوْرٌ۔ (رواه احمد وابو داود)

اخرجه أبو داود في السنن ٣ / ٤٣٥، كتاب الخراج، باب في تعشير اهل الذمه، ح ٣٠٦٤ وأحمد في المسند ٣ / ٤٧٤

ترجمہ: ''اور حضرت حرب بن عبید اللہ اپنے جد (نانا) سے اور وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہود و نصاریٰ پر عشر (یعنی دسواں حصہ) واجب ہے مسلمانوں پر ان پر چالیسواں حصہ واجب ہے عشر واجب نہیں ہے''۔ (احمد، ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

حرب بن عبید اللہ۔ یہ حرب، عبید اللہ ثقفی کے بیٹے ہیں ''عبید'' تصغیر کے ساتھ ہے۔ ان کے نام اور ان کی حدیث میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ان کی حدیث کو عطا بن السائب نے نقل کیا ہے سند میں ان حرب سے اختلاف پڑ گیا ہے۔ یعنی ایک حدیث کو سفیان بن عیینہ عطاء سے اور عطاء حرب اپنے ماموں سے اور ان کے ماموں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

دوسری سند اس طرح ہے ابن احوص نے اس طرح روایت کیا ہے: ''**عن عطآء عن حرب عن جده ابی امامة عن ابيه**'' کہ ابوالاحوص عطاء سے اور عطاء حرب سے اور حرب اپنے نانا سے اور ان کے نانا اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں

تیسری سند میں حرب نقل کرتے ہیں عطاء سے اور عطاء نقل کرتے ہیں حرب بن ہلال ثقفی سے اور وہ اپنے نانا سے'

اور امام ابوداؤد کی روایت میں سند اس طرح ہے ''**عن حرب بن عبيدالله عن جده ابی امامة**'' کہ ابوداؤد حرب ابن عبید اللہ سے اور حرب اپنے نانا سے اور نانا اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اور یہ روایت زیادہ مشہور ہے ان کی روایت یہود اور نصاریٰ سے عشر لینے کے بارے میں مروی ہے۔

عطاء بن سائب نے اس سے روایت حدیث کی ہے۔ چنانچہ ''**رواه سفيان بن عيينة عن عطاء عن حرب عن خال له عن النبی** صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ یوں روایت کرتے ہیں: ''**عن عطاء عن حرب بن هلال الثقفی عن ابی امامة**'' اور یہی زیادہ مشہور ہے۔

تشریح: العشور: ''عشر'' کی جمع ہے۔ عین اور شین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ **قوله:** ''**وليس على المسلمين عشور**'': ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عشر مال تجارت ہے نہ کہ عشر صدقات جو پیداواری زمینوں میں لازم ہوتا ہے۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمان سے سوائے عشر صدقات کے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ یہود و نصاریٰ سے صلح کے وقت ان سے جو کچھ طے ہوا تھا صرف وہی لیا جائے گا، اور اگر بوقت عقد کچھ مقرر نہیں ہوا تھا تو ان پر کوئی عشور نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی ان پر جزیہ سے زیادہ کوئی چیز لازم ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ان سے اراضی اور پیداوار پر عشر نہیں لیا جائے گا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب ہم ان کے پاس مال تجارت لے کر جاتے ہیں اگر وہ ہم سے عشر وصول کریں۔ تو ہم بھی ان سے لیں گے اور اگر وہ ہم سے نہیں لیتے تو ہم بھی نہیں لیں گے۔ اھ

اصل مذہب یہ ہے کہ مال تجارت میں حربی سے عشر لیا جائے گا، ذمی سے نصف عشر لیا جائے گا، اور مسلم سے ربع عشر لیا جائے گا ان شرائط کے ساتھ جو کہ کتاب الزکاۃ میں مذکور ہیں۔ ہاں اس کے علاوہ میں ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ شرح السنۃ میں ہے کہ جب اہل حرب بلاد اسلام میں تجارت کی غرض سے داخل ہوں۔ اگر وہ بغیر امان اور پیغام کے داخل ہوئے تو وہ مالِ غنیمت میں شمار ہوگا۔ لیکن اگر امان کے ساتھ داخل ہوئے اور شرط یہ لگائی گئی ہو کہ ان سے عشر یا اس سے کم یا زیادہ لیا جائے گا تو ان سے صرف مال مشروط لیا جائے گا۔ اور جب وہ بلاد اسلام میں چکر لگائیں تو ان سے سال میں صرف ایک ہی دفعہ لیا جائے گا۔

اہل جزیہ پر ضیافت کا بیان

۴۰۴۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّا نَمُرُّ بِقَوْمٍ فَلَاهُمْ يُضَيِّفُوْنَا وَلَاهُمْ يُؤَدُّوْنَ مَالَنَا عَلَيْهِمْ مِنَ الْحَقِّ وَلَا نَحْنُ نَأْخُذُ مِنْهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِنَّ اَبَوْا اِلَّا اَنْ تَاْخُذُوْا كُرْهًا فَخُذُوْا۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی، فی السنن ٤ / ١٢٥، کتاب السير، باب ما يحل من اموال اهل الذمة، الحديث رقم ١٥٨٩۔

ترجمہ: ''اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم جب (جہاد کو جاتے) ہوئے ایک (فلاں) قوم (کی آبادی) میں سے گزرتے ہیں تو وہ لوگ نہ ہماری میزبانی کرتے ہیں اور نہ ہمیں وہ چیز دیتے ہیں جس کا ہم (از روئے اسلام) ان پر حق رکھتے ہیں (یعنی اسلام کی رو سے ان پر ہمارا جو یہ حق ہے کہ وہ قرض وغیرہ دے کر ہماری ضرورتیں پوری کریں اور ہماری دیکھ بھال کریں وہ اس کو پورا نہیں کرتے) اور (چونکہ) ہم ان سے کوئی چیز (زبردستی) حاصل نہیں کرتے (اس لئے ہم سخت پریشان ہوتے ہیں اور ان کے اس رویہ کی وجہ سے ہمیں بڑی اضطراری حالت اور بڑے نقصان میں مبتلا ہونا پڑتا ہے) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر وہ لوگ (تمہاری میزبانی کرنے یا تمہارے ہاتھ نقد و ادھار کوئی چیز فروخت کرنے

سے انکار کریں اور (اس صورت میں) ان سے کوئی چیز زبردستی لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو (زبردستی) لے لو‘‘۔

تشریح: ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ نے محی السنہ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ یہ بات کہی گئی کہ ان مسلمانوں کا گذر اہل ذمہ کی ایک قوم پر سے ہوتا تھا اور امام نے ان پر شرط لگائی تھی کہ گذرنے والوں کی ضیافت اور مہمانی کرو گے۔ اور اگر امام نے ان پر گزرنے والوں کی ضیافت کی شرط نہ لگائی ہو، اور مہمان بھی حالت اضطرار میں نہ ہو تو پھر غیر کا مال بغیر طیب نفس کے لینا جائز نہیں ہے۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ غزوہ میں نکلتے تو ان کا گذر کسی قوم پر سے ہوتا تھا لیکن وہاں کھانے پینے کی کوئی چیز ہی انہیں نہ ملتی جو وہ خرید سکیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’**ان ابوا ان یبیعوا الا ان تأخذوا کرھًا فخذوا**‘‘۔

بعض احادیث میں اسی طرح مفسراً بیان ہوا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ’’**ولا یجدون من الطعام ما یشترون**‘‘ یہ دراصل اس جملہ کی تفسیر ہے: ’’**ولاھم یؤدون ما لنا علیھم من حقٍ**‘‘ کہ جب ہمیں کھانے پینے کی ضرورت درپیش ہوتو اور ان پر حق یہ تھا کہ وہ ہمیں ترجیح دیتے۔ یا تو بیع کے ساتھ یا ضیافت کے ساتھ۔ جب وہ ان حقوق کی ادائیگی نہ کریں تو پھر ہم کیا کریں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’**ان ابوا الخ** اور اس میں نفی کا معنی موجود ہے کہ لہٰذا استثناء صحیح ہے‘‘ **ای ان لم یحصل الأخذ بشیء من الاشیاء الا بأن تأخذوا کرھا فخذوہ**۔ یعنی اگر کوئی بھی چیز حاصل نہ ہو سوائے اس کے کہ تم ان سے زبردستی لے سکو تو (زبردستی) لے لو۔

الفصل الثالث:

مالی جزیہ کی تفصیل کا بیان

۴۰۴۱: **وَعَنْ اَسْلَمَ اَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ ضَرَبَ الْجِزْيَةَ عَلٰى اَهْلِ الذَّهَبِ اَرْبَعَةَ دَنَانِيْرَ وَعَلٰى اَهْلِ الْوَرَقِ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا مَعَ ذٰلِكَ اَرْزَاقُ الْمُسْلِمِيْنَ وَضِيَافَةُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ۔** (رواہ مالک)

اخرجه مالك في المؤطا ۱ / ۲۷۹، الحديث رقم ۴۳، من كتاب الزكوٰة

ترجمہ: ’’حضرت اسلم (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے (اپنے دورِ خلافت میں) ان (ذمیوں) پر جو (بہت زیادہ) سونا رکھتے تھے، چار دینار جزیہ مقرر کیا اور جو (ذمی) چاندی رکھتے تھے ان پر چالیس درہم جزیہ مقرر کیا اور اس کے علاوہ ان پر مسلمانوں کا خورد و نوش اور تین دن کی میزبانی بھی مقرر کی تھی‘‘۔ (مالک)

راویٔ حدیث:

اسلم۔ یہ ’’اسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب‘‘ کے آزاد کردہ تھے۔ ان کی کنیت ’’ابو خالد‘‘ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی تھے ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۱ھ میں یمنی غلاموں میں سے ’’مکہ‘‘ میں خریدا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے احادیث سنیں ان سے زید بن اسلم وغیرہ نے روایات کی ہیں۔ مروان کی خلافت کے زمانہ میں ایک سو چودہ (۱۱۴) سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

تشریح: اهل الذّهب سے مراد مالدار ہیں۔اور اہل ورقة سے مراد درمیانے اور وسط درجے کے ہیں۔

مع ذلك: ایک نسخہ میں ''و مع ذالك ہے(یعنی''مع'' سے پہلے واؤ بھی ہے)۔

ارزاق المسلمين :

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ظرف کا فاعل ہے۔اور مبتداء بننے کا بھی احتمال ہے اس صورت میں ظرف اس کی خبر ہوگی۔

''وضيافة ثلاثة ايام'' یہ عطف تفسیری ہے۔شرح السنة میں ہے کہ جائز ہے کہ اہل الذمہ کے ساتھ دینار سے زیادہ پر مصالحت کی جائے۔اور یہ کہ ان پر گزرنے والے مسلمانوں کی مہمانی کی بھی شرط لگائے اور یہ اصل جزیہ سے زائد ہو اور مردوں، شہسواروں، مہمانوں کی تعداد بتائے اور ان کی ضیافت کے دنوں کی تعداد بتائے۔اور ان کو کھلانے والی چیز کی جنس کے بارے میں بتلادے۔اور ان کے جانوروں کو کس قسم کا چارہ دیں گے۔البتہ وہ غنی اور وسط پر لازم شي کی مقدار میں تو فرق رکھے جنس طعام میں فرق نہ رکھے۔

جزیہ بت پرست عجمیوں کے پر بھی عائد گا۔ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں ان سے قتال واجب ہے۔ان کا استدلال اس آیت سے ہے۔﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ ﴾ [البقرة۔ ۱۹۳] مگر یہ کہ قتال کو جزیہ کے بدلے میں چھوڑا جائے گا۔اہل کتاب کے حق میں۔آیت ہے۔﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ ﴾[التوبة۔ ۲۹]اور مجوس کے بارے میں اس حدیث سے استدلال ہے جو بخاری میں مذکور ہے۔لہٰذا ان کے علاوہ لوگ اپنی اصل پر باقی رہیں گے۔دونوں فرقوں کے علاوہ کسی سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ان کو غلام بنانا جائز ہے اور لہٰذا ان پر جزیہ لگانا بھی جائز ہے وجو قتال کے حکم عام سے امام شافعیؒ نے مجوسی اور اہل کتاب کی تخصیص کی ہے لہٰذا اس تخصیص کے بعد ہماری ذکر کردہ تخصیص بھی درست ہے۔جس اصول کی رو سے مجوسیوں اور اہل کتاب سے جزیہ لینا درست ہے،اسی اصول کی رو سے بت پرست عجمیوں سے بھی لینا درست ہے اور فرماتے ہیں کہ مشرکوں اور مرتدین پر جزیہ عائد نہیں کیا جائے گا۔اس لئے کہ ان کا کفر سخت ترین کفر ہے۔عجمیوں کی طرح نہیں ہیں۔ عرب میں تو قرآن کریم ان کی زبان میں اترا ہے۔ ان کے حق میں معجزہ زیادہ اظہر ہے۔تو اس حالت میں ان کا کفر عجمیوں کے کفر سے زیادہ اَغلظ اور اَشد ہے۔ مرتدین کا کفر تو ہدایت الی الاسلام کے بعد آیا ہے جبکہ وہ محاسن اسلام سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔چنانچہ ان کا کفر بھی اسی طرح سخت ہو گیا۔ اس تغلیظ کفر کی وجہ سے ان دونوں فریقین سے صرف اسلام قبول ہوگا، یا تلوار چلے گی۔کیونکہ جیسا ان کا کفر سخت تھا اسی طرح ان کی سزا بھی سخت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مشرکین عرب کو غلام بنایا جائے گا۔اور یہی امام مالک واحمد کا بھی قول ہے۔اس لئے کہ استرقاق حکما اتلاف ہے۔لہٰذا یہ جائز ہے جیسا کہ ان کو قتل کر کے ان کے نفس کا اتلاف جائز ہے۔ ہماری دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:﴿ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴾ [الفتح ۔۱٦] مطلب یہ کہ اس وقت تک ان سے قتال کرو جب تک وہ اسلام نہ لائیں

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:''**لا يقبل من مشرك العرب الا الاسلام او السيف**'' کہ''مشرکین عرب سے اسلام یا تلوار کے علاوہ کچھ قبول نہ کیا جائے گا۔''

اورمحمد بن حسن نے عن يعقوب ، عن الحسن ، عن معتسم، عن ابن عباس ''أ والسيف'' کی جگہ او القتل نقل کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے:''لا رق على عربی ''(عربی پر غلامی نہیں ہے)۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لو كان ثابت على أحد من العرب رق لكان اليوم''۔

اگر اہل عرب میں سے کسی پر رقیت ثابت ہوتی تو آج بھی ہوتی۔

جب مسلمان مشرکین عرب اور مرتدین پر غالب آجائیں تو ان کی عورتیں اور بچے غنیمت ہوں گے، ان کو غلام بنایا جائے گا۔اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ اوطاس اور ہوازن کے قیدیوں کو غلام بنایا تھا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بنوحنیفہ کو غلام بنایا تھا۔

واقدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے ابو الزناد نے ہشام بن عروۃ عن فاطمۃ بنت المنذر عن اسماء بنت ابی بکرؓ بتلایا ہے کہ اُسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہے کہ میں نے محمد بن علی بن ابی طالب کی ماں کو دیکھا۔ وہ بنوحنفیہ کی قیدیوں میں سے تھی۔اور اسی لئے اس کا نام حنیفہ رکھا گیا۔اور اس کے بیٹے کا نام محمد بن الحنفیہ رکھا گیا ہے۔مزید یہ فرماتے ہیں کہ مجھے عبداللہ ابن نافع عن ابیہ نے بتایا کہ زید بن عبداللہ بن عمر کی ماں بھی ان قیدیوں میں سے تھی۔واضح رہے کہ مرتدین کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنانے کے بعد اسلام پر مجبور کیا جائے گا۔ برخلاف بت پرستوں کی اولاد کے کہ ان کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ اگر کوئی زندیق گرفتاری سے پہلے آیا اور اس نے خبر دی کہ وہ زندیق ہے لیکن اس نے توبہ کرلی ہے تو اس کی توبہ کو قبول کیا جائے گا۔البتہ اگر بعداز گرفتاری اس نے توبہ کی۔تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کو قتل کیا جائے گا۔اس لئے کہ یہ لوگ باطنی ہیں باطن میں ظاہر کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں لہٰذا ان کو قتل کیا جائے گا اور ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔وہ کہتے ہیں کہ تغلب بن وائل عربی ربیعہ سے ہیں جاہلیت میں یہ لوگ نصرانی ہو گئے تھے جب اسلام زمانۂ عمر کو پہنچا تو انہوں نے ان کو جزیہ کی طرف بلایا۔تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔اور اپنے کو برتر سمجھتے ہوئے کہا کہ ہم عرب ہیں ہم سے وہ کچھ لو۔جو تم میں سے بعض بعض سے صدقہ لیتے ہیں۔

عمرؓ نے فرمایا کہ میں کسی مشرک سے صدقہ نہیں لیتا چنانچہ ان میں سے بعض روم چلے گئے۔(اس صورتحال کو دیکھ کر) نعمان بن زرعہ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! یہ عرب بڑی طاقتور اور جنگجو قوم ہے۔ یہ لوگ جزیہ سے نفرت کرتے ہیں، آپ ان کے ذریعہ اپنے دشمن کی اپنے خلاف مدد مت کریں۔

ان سے جزیہ صدقہ کے نام سے قبول کریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی تلاش میں کسی کو بھیجا۔اور ان پر صدقہ (زکوٰۃ) کو دوگنا کر دیا۔ نیز اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم اور فقہاء کرام کا اجماع ہے کہ ان سے ہر چالیس بکریوں میں سے دو بکریاں لی جائیں گی: اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ اس کی تعداد ۱۲۱ (ایک سو اکیس) تک پہنچ جائیں چار بکریاں لازم ہوں گی۔گائے اور اونٹوں میں بھی اسی طرح ہوگا ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ جزیہ ہے، تم اس کو جو چاہو نام دو۔ واللہ اعلم۔

بَابُ الصُّلْحِ

صلح کا بیان

''مغرب'' میں ہے کہ صلاح فساد کی ضد ہے۔''صلح'' اسم ہے بمعنی مصالحت ''تصالح''''مخاصمت'' اور ''تخاصم'' کے برعکس ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ معنی تو جہاد ہے لیکن صورۃً جہاد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کو صورۃً اور معنیً دونوں طرح سے جہاد سے مؤخر کر کیا جب امام المسلمین اہل حرب کے ساتھ یا یہ ان کے کسی فریق یا گروہ کے ساتھ صلح کرنا چاہے خواہ صلح بالمال ہو یا بلا مال ہو بشرطیکہ اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو، تو پھر اس صلح میں کوئی حرج نہیں ہے۔ صلح کے جواز کی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾[الانفال۔ ٦١] ترجمہ: اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو گئے تو تم بھی صلح کرلو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔''

یہ آیت اگرچہ صلح مطلق کے متعلق ہے۔ البتہ فقہاء کا اجماع ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کی مصلحت کے ساتھ مقید ہے۔ اس قید کی دلیل یہ دوسری آیت ہے: ﴿ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ﴾[محمد۔ ٣٥] اگر موادعت وصلح میں کوئی مصلحت نہ ہو تو پھر یہ بالاجماع جائز نہیں ہے ''سلم'' سین کے کسرہ اور فتحہ نیز لام کے سکون اور فتح کے ساتھ تینوں طرح درست ہے۔ اور اللہ کا یہ فرمان بھی اسی سے ماخوذ ہے: ﴿ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ﴾[النساء۔ ٩٠]

الفصل الاول:

۴۰۴۲: عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَمَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ قَالَا خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ فِي بِضْعَ عَشْرَةَ مِائَةً مِنْ اَصْحَابِهٖ فَلَمَّا اَتٰى ذَا الْحُلَيْفَةَ قَلَّدَ الْهَدْيَ وَاَشْعَرَ وَاَحْرَمَ مِنْهَا بِعُمْرَةٍ وَسَارَ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِالثَّنِيَّةِ الَّتِي يُهْبَطُ عَلَيْهِمْ مِنْهَا بَرَكَتْ بِهٖ رَاحِلَتُهٗ فَقَالَ النَّاسُ حَلْ حَلْ خَلَاَتِ الْقَصْوَاءُ خَلَاَتِ الْقَصْوَاءُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا خَلَاَتِ الْقَصْوَاءُ وَمَاذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ وَلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيْلِ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَا يَسْاَلُوْنِي خُطَّةً يُعَظِّمُوْنَ فِيْهَا حُرُمَاتِ اللّٰهِ اِلَّا اَعْطَيْتُهُمْ اِيَّاهُمْ ثُمَّ زَجَرَهَا فَوَثَبَتْ فَعَدَلَ عَنْهُمْ حَتّٰى نَزَلَ بِاَقْصَى الْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى ثَمَدٍ قَلِيْلِ الْمَاءِ يَتَبَرَّضُهُ النَّاسُ تَبَرُّضًا فَلَمْ يُلْبِثْهُ النَّاسُ حَتّٰى نَزَحُوْهُ وَشُكِيَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْعَطَشُ فَانْتَزَعَ سَهْمًا مِنْ كِنَانَتِهٖ ثُمَّ اَمَرَهُمْ اَنْ يَجْعَلُوْهُ فِيْهِ فَوَاللّٰهِ مَا زَالَ يَجِيْشُ

لَهُمْ بِالرِّيِّ حَتّٰى صَدَرُوْا عَنْهُ فَبَيْنَا هُمْ كَذٰلِكَ اِذْجَاءَ بُدَيْلُ بْنُ وَرْقَاءَ الْخُزَاعِيُّ فِي نَفَرٍ مِّنْ خُزَاعَةَ ثُمَّ اَتَاهُ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَسَاقَ الْحَدِيْثَ اِلٰى اَنْ قَالَ اِذْ جَاءَ سُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اُكْتُبْ هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ سُهَيْلٌ وَاللّٰهِ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا صَدَدْنَاكَ عَنِ الْبَيْتِ وَلَا قَاتَلْنَاكَ وَلٰكِنْ اُكْتُبْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَاللّٰهِ اِنِّي لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاِنْ كَذَّبْتُمُوْنِي اُكْتُبْ مُحَمَّدُ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ سُهَيْلٌ وَعَلٰى اَنْ لَّا يَاتِيَكَ مِنَّا رَجُلٌ وَاِنْ كَانَ عَلٰى دِيْنِكَ اِلَّا رَدَدْتَهُ عَلَيْنَا فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ قَضِيَّةِ الْكِتَابِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهِ قُوْمُوْا فَانْحَرُوْا ثُمَّ احْلِقُوْا ثُمَّ جَاءَ نِسْوَةٌ مُؤْمِنَاتٌ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا جَآءَ كُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٌ الاية فَنَهَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ يَرُدُّوْهُنَّ وَاَمَرَهُمْ اَنْ يَرُدُّوا الصَّدَاقَ ثُمَّ رَجَعَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَجَاءَ اَبُوْبَصِيْرٍ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ وَهُوَ مُسْلِمٌ فَاَرْسَلُوْا فِيْ طَلَبِهٖ رَجُلَيْنِ فَدَفَعَهُ اِلَى الرَّجُلَيْنِ فَخَرَجَابِهٖ حَتّٰى اِذَا بَلَغَاذَا الْحُلَيْفَةِ نَزَلُوْا يَاكُلُوْنَ مِنْ تَمْرٍ لَهُمْ فَقَالَ اَبُوْ بَصِيْرٍ لِاَحَدِ الرَّجُلَيْنِ وَاللّٰهِ اِنِّي لَاَرٰى سَيْفَكَ هٰذَا يَا فُلَانُ جَيِّدًا اَرِنِي اَنْظُرْ اِلَيْهِ فَاَمْكَنَهُ مِنْهُ فَضَرَبَهُ حَتّٰى بَرَدَ وَفَرَّ الْاٰخَرُ مِنْهُ حَتّٰى اَتَى الْمَدِيْنَةَ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ يَعْدُوْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْرَاٰى هٰذَا ذُعْرًا فَقَالَ قُتِلَ وَاللّٰهِ صَاحِبِيْ وَاِنِّي لَمَقْتُوْلٌ فَجَاءَ اَبُوْ بَصِيْرٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَيْلُ اُمِّهٖ مِسْعَرُ حَرْبٍ لَوْكَانَ لَهُ اَحَدٌ فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ عَرَفَ اَنَّهُ سَيَرُدُّهُ اِلَيْهِمْ فَخَرَجَ حَتّٰى اَتٰى سَيْفَ الْبَحْرِ قَالَ وَانْفَلَتَ اَبُوْ جَنْدَلِ بْنُ سُهَيْلٍ فَلَحِقَ بِاَ بِيْ بَصِيْرٍ فَجَعَلَ لَا يَخْرُجُ مِنْ قُرَيْشٍ رَجُلٌ قَدْ اَسْلَمَ اِلَّا لَحِقَ بِاَبِيْ بَصِيْرٍ حَتّٰى اجْتَمَعَتْ مِنْهُمْ عِصَابَةٌ فَوَاللّٰهِ مَا يَسْمَعُوْنَ بِعِيْرٍ خَرَجَتْ لِقُرَيْشٍ اِلَى الشَّامِ اِلَّا اعْتَرَضُوْا لَهَا فَقَتَلُوْهُمْ وَاَخَذُوْا اَمْوَالَهُمْ فَاَرْسَلَتْ قُرَيْشٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :تَنَاشِدُهُ اللّٰهَ وَالرَّحِمَ لَمَّا اَرْسَلَ اِلَيْهِمْ فَمَنْ اَتَاهُ فَهُوَاٰ مِنٌ فَاَرْسَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اِلَيْهِمْ۔ (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥ / كتاب الحج' باب من اشعر وقلا بذى الحليفه ثم احرم' الحديث رقم (١٦٩٤ ـ ٢٧٣١) وأبو داود فى السنن ٣ / ١٩٤' الحديث رقم ٢٧٦٥' وأحمد فى المسند ٤ / ٢٣١۔

ترجمہ: اور حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مروان بن حکم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ دونوں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کے سال اپنے ایک ہزار کچھ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر (مدینہ سے) روانہ ہوئے جب آپ ﷺ ذوالحلیفہ نامی مقام پر پہنچے (جو مدینہ منورہ سے جنوب میں تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے اور جس کو ابیار علی بھی کہتے ہیں) تو آپ ﷺ نے ہدی (یعنی اپنی قربانی کے جانور) کی گردن میں قلادہ باندھا اور اشعار

کیا اور پھر ذوالحلیفہ (ہی) سے عمرہ کے لئے احرام باندھ کر آگے روانہ ہوئے' یہاں تک کہ جب آپ ﷺ ثنیہ نامی مقام (یعنی اس گھاٹی) پر پہنچے جس طرف سے اہل مکہ تک پہنچا جاتا ہے تو آپ ﷺ کی اونٹنی (جس کا نام قصواء تھا) آپ ﷺ کو لے کر بیٹھ گئی' (جب) لوگوں نے (یہ دیکھا تو) کہنا شروع کیا کہ ''حل حل (یہ لفظ اونٹ کو اٹھانے کے لئے کہا جاتا تھا) قصواء اَڑ گئی قصواء اڑ گئی۔ نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ''نہیں قصواء نہیں اڑی اور نہ ہی اس کو اڑنے کی عادت ہے بلکہ اس کو اس ذات (اللہ تعالیٰ) نے روک دیا ہے جس نے ہاتھی کو روکا تھا'' اور پھر فرمایا ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے قریش مجھ سے اللہ تعالیٰ (کے حرم) کی عظمت کے بارے میں جو مطالبہ کریں گے میں ان کی اس بات کو تسلیم کروں گا (یعنی آج مکہ کے لوگ صلح کے وقت ایسی جس بات کا بھی مطالبہ کریں گے جس میں حرم مکہ کی عظمت کا لحاظ ہو تو میں اس کو پورا کروں گا)۔ پھر آپ ﷺ نے اونٹنی کو اٹھایا جو فوراً اٹھ گئی اور آپ ﷺ اہل مکہ کا راستہ چھوڑ کر دوسری سمت کو چلنے لگے یہاں تک کہ حدیبیہ کے آخری کنارہ پر پہنچ کر ایسی جگہ اترے جہاں (ایک گڑھا میں) تھوڑا سا پانی تھا (اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا) لوگوں نے اس گڑھے میں سے تھوڑا تھوڑا پانی لے کر استعمال کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تھوڑی ہی دیر میں سارے پانی کو کھینچ ڈالا (یعنی اس گڑھے میں پانی چونکہ بہت تھوڑا تھا اس لئے لوگوں کی کم سے کم مقدار لینے کے باوجود وہ پانی بہت جلد ختم ہو گیا) لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیاس کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے اپنے ترکش میں سے ایک تیر کو نکالا اور صحابہ کو حکم دیا کہ تیر کو پانی (کے گڑھے) میں ڈال دیا جائے اور پھر (راوی کہتے ہیں کہ) خدا کی قسم (اس تیر کی برکت سے) ان لوگوں کو سیراب کرنے کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا پانی (گویا) موجیں مارتا رہا یہاں تک کہ سب اس پانی سے خوشحال ہو گئے (یعنی اللہ تعالیٰ نے اس گڑھے میں اتنا زیادہ پانی پیدا فرمایا کہ سب لوگوں کی ضرورتیں نہایت اطمینان سے پوری ہوتی رہیں بلکہ جب وہاں سے واپسی ہوئی تو اس وقت بھی پانی باقی رہا) بہر حال صحابہ رضی اللہ عنہم اسی حالت میں تھے کہ اچانک بدیل بن ورقاء خزاعی' خزاعہ کے کچھ لوگوں کے ساتھ (کفار مکہ کی طرف سے مصالحت کے لئے آیا) پھر عروہ بن مسعود بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد بخاری نے (وہ طویل گفت وشنید نقل کی' جو رسول اللہ ﷺ اور بدیل بن عروہ کے درمیان ہوئی' جس کو صاحب مصابیح نے اختصار کے پیش نظر یہاں نقل نہیں کیا اور پھر یہ) بیان کیا کہ آخر کار جب سہیل بن عمرو (اہل مکہ کا آخری سفیر اور نمائندہ بن کر) آیا تو نبی کریم ﷺ نے (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے فرمایا کہ لکھو ''یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ (ﷺ) نے صلح کی ہے''۔ سہیل نے (یہ الفاظ دیکھ کر) کہا کہ ''بخدا! اگر ہمیں یقین ہوتا کہ تم اللہ کے رسول ہو تو نہ ہم تمہیں خانۂ کعبہ (میں جانے سے) روکتے اور نہ تم سے قتال کرتے۔ لہٰذا یوں لکھو کہ (یہ وہ معاہدہ ہے جس پر) محمد بن عبداللہ (نے صلح کی ہے)''۔ نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا ''خدا کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں اگرچہ تم مجھ کو جھوٹا سمجھتے ہو (خیر میں مصالحت کی خاطر الفاظ میں تمہاری اس ترمیم کو تسلیم کر لیتا ہوں) علی! (اے علی!) تم محمد بن عبداللہ ہی لکھ دو''۔ پھر سہیل نے یہ کہا کہ (اس معاہدۂ صلح میں اس بات کو بھی تسلیم کرو کہ) اگر ہماری جانب سے کوئی شخص آپ کے پاس آئے گا' چاہے وہ آپ کے دین پر ہو تو آپ ہماری جانب لوٹائیں گے (لیکن) اگر تمہاری جانب سے کوئی شخص

ہمارے پاس آ جائے گا تو ہم اس کو واپس نہ جانے دیں گے۔(چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی قبول کر لیا' اس موقعہ پر بھی یہ واقعہ میں اختصار سے کام لیا گیا ہے یعنی صاحب مصابیح نے اسی معاہدہ سے متعلق بخاری کی بیان کردہ ساری تفصیل کو نقل نہیں کیا ہے یا یہ بخاری کی کوئی اور روایت ہے جس میں صرف اسی قدر بیان کیا گیا ہے) بہر حال جب آپ ﷺ (یا حضرت علی رضی اللہ عنہ) صلح نامہ لکھے جانے سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''کھڑے ہو جاؤ' اب (ہدی کے جانوروں کو) ذبح کر ڈالو اور پھر سر منڈ واؤ''۔اس کے بعد (مکہ سے) کئی عورتیں مسلمان ہو کر آئیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: ''اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں......''۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو (اس آیت کے ذریعہ) ان (کفار مکہ کے ہاں) واپس کرنے کے بارے میں منع فرمایا اور انہیں اس بات کا حکم دیا کہ ان کا مہر واپس کر دیں' اس کے بعد آپ ﷺ مدینہ واپس تشریف لے آئے (کچھ دنوں بعد) قریش کے ایک شخص ابوبصیر جو مسلمان ہو گئے تھے (مکہ سے نکل کر) آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے' قریش مکہ نے دو آدمیوں کو ان کی تلاش میں (مدینہ) بھیجا' آپ ﷺ نے (معاہدۂ صلح کے مطابق) ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو ان دونوں آدمیوں کے حوالہ کر دیا' وہ دونوں آدمی ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو لے کر (مکہ) روانہ ہوئے اور جب (پہلی منزل) ذوالحلیفہ میں پہنچے تو وہاں پڑاؤ ڈالا اور ان کے پاس جو کھجوریں تھیں ان کو کھانے لگے تو ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک شخص کو مخاطب کر کے کہا کہ ''خدا کی قسم' اے فلاں شخص! میرا خیال ہے کہ تمہاری یہ تلوار بہت عمدہ ہے۔ذرا مجھے تو دکھلاؤ میں بھی اس کو دیکھوں' اس شخص نے ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو وہ دے دو (یعنی اس نے اپنی تلوار ابوبصیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دی' بس اتنا موقع کافی تھا) ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے اس شخص پر (اس تلوار سے اتنا بھرپور وار) کیا کہ وہ فوراً ٹھنڈا ہو گیا (یعنی مر گیا) اور دوسرا شخص (یہ دیکھتے ہی وہاں سے) بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ مدینہ میں (واپس آ گیا اور اپنے قتل کے خوف سے) دوڑتا ہوا مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوا۔نبی کریم ﷺ نے (اس کی حالت دیکھ کر) فرمایا کہ ''یہ شخص خوفزدہ معلوم ہوتا ہے''۔اس شخص نے کہا کہ (جی ہاں) خدا کی قسم! میرا ساتھی تو مارا گیا اور میں بھی مارا جانے والا ہوں (یعنی مجھ پر خوف سوار ہے کہ میں بھی مارا جاؤں گا یا میں بس بچ ہی گیا ورنہ میں بھی مارا جاتا) اسی دوران ابوبصیر رضی اللہ عنہ بھی آ گئے' نبی کریم ﷺ نے (ان کو دیکھ کر) فرمایا' افسوس ہے اس کی ماں پر! (یعنی تعجب و حیرت کا مقام ہے) یہ (ابوبصیرؓ) تو لڑائی کی آگ بھڑکانے والا ہے اگر اس میں اس کا کوئی مددگار رہوتا (تو وہ اس کی مدد کرتا)''۔جب ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی یہ بات سنی تو وہ سمجھ گئے کہ آپ ﷺ مجھے (پھر) کافروں کے پاس واپس بھیج دیں گے چنانچہ ابوبصیر رضی اللہ عنہ (دوبارہ کافروں کے حوالے کئے جانے کے خوف سے روپوش ہونے کے لئے) مدینہ سے نکل گئے یہاں تک کہ وہ سمندر کے ساحل پر پہنچ گئے۔راوی کہتے ہیں کہ ابوجندل بن سہیل رضی اللہ عنہ بھی کفار کے قبضے سے نکل بھاگے اور ابوبصیر رضی اللہ عنہ سے آ کر مل گئے اور پھر تو یہ حال ہوا کہ (مکہ میں) جو شخص بھی مشرف باسلام ہو کر (قریش کے قبضے سے) نکل بھاگتا وہ ابوبصیر رضی اللہ عنہ سے جا ملتا یہاں تک کہ (چند ہی روز میں ابوبصیر رضی اللہ عنہ کی) ایک جماعت بن گئی۔اللہ کی قسم! جب بھی ان لوگوں کو ملک شام کی جانب قریشی قافلے کی

روانگی کا علم ہوتا تو وہ ان کا تعاقب کرتے اور ان کو قتل کر دیتے اور ان کا سارا مال واسباب چھین لیتے آخر کار (جب ان لوگوں کی وجہ سے قریش کا ناطقہ بند ہو گیا اور وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے تو ان کو احساس ہوا کہ ہم نے مسلمانوں سے ایک انتہائی غیر معقول شرط منوا کر کتنی بڑی نادانی کی ہے اور اس کا خمیازہ کس طرح بھگتنا پڑ رہا ہے تو انہوں اہل قریش نے) کسی شخص کو (اپنا سفیر و نمائندہ بنا کر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا اور اس کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی قسم دلائی اور (اس) قرابت کے حق کا واسطہ دیا (جو ان میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی اور یہ التجا کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی نہ کسی طرح صرف اتنا احسان ضرور کر دیں کہ اپنے کسی آدمی کو ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے پاس بھیج کر یہ حکم دیں کہ وہ مدینہ میں آجائیں اور ہمارے کسی قافلہ کے ساتھ قتال کا معاملہ نہ کریں) اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یہ حکم بھیج دیں (اور وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے آئیں) تو پھر (ہم اہل مکہ میں سے) جو بھی شخص (مسلمان ہو کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے گا وہ امن میں رہے گا (یعنی نہ صرف یہ کہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی بلکہ اس کو ہمارے پاس) واپس بھیجنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ نیز انہوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو ان کے طریقہ کار سے روک دیں ہم معاہدۂ صلح کی اس شرط سے باز آئے) چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے پاس بھیجا (جس کے ذریعہ ان کو یہ حکم دیا کہ وہ قریش کے قافلوں سے کوئی تعرض نہ کریں اور میرے پاس چلے آئیں)''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

ابو جندل۔ یہ ابو جندل سہیل بن عمرو قریشی عامری کے صاحبزادہ ہیں۔ مکہ معظمہ میں اسلام لائے۔ واقعہ حدیبیہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیڑیاں پہنے ہوئے بیڑیوں میں چل کر حاضر ہوئے۔ یہ بیڑیاں ان کے باپ نے اسلام لانے کی وجہ سے ان کو پہنا دی تھیں۔ ان کا ذکر غزوۂ حدیبیہ کے سلسلہ میں آتا ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

تشریح: قوله: ''وعن المسور بن مخرمة ومروان بن الحكم'':

شاید یہاں دونوں کو اس لئے جمع کیا ہے تاکہ مروان کی روایت کو تصدیق کی تقویت حاصل ہو جائے۔ ''قالا خرج النبی ﷺ'' ایک نسخہ میں ''النبی'' صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ ''رسول اللہ'' ہے۔ ''عام الحديبية'' مکہ کے قریب ایک گاؤں ہے وہاں ایک کنواں تھا۔ اسی مناسبت سے اس گاؤں کا نام بھی حدیبیہ رکھا گیا۔ ''حدیبیہ'' یاء کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ اکثر محدثین اس کو مشدد پڑھتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ مکہ اور جدہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے ''جدہ'' جیم کے ساتھ ہے۔ یہ ''حدود'' حائے مہملہ کے ساتھ) نامی بستی کے قریب واقع ہے۔ اور اس کو ''بئر شمس'' بھی کہتے ہیں اور حرم کی حدود اسی جگہ تک ہیں۔ یعنی یہاں پر حرم کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ ''حل'' میں ہے اور بعض نے اس کو ''حرم'' میں سے شمار کیا ہے۔ (واقدی)۔ اور یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے موافق ہے۔

محب الطبری کہتے ہیں کہ ''حدیبیہ'' مکہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ جس کا اکثر حصہ حرم میں شامل ہے۔ یہ ''مکہ'' سے نو

میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ اس کے منافی نہیں ہے جو بخاری میں مذکور ہے کہ حدیبیہ خارج از حرم ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''عام'' کی اضافت اس کی طرف اس لئے کی گئی ہے کیونکہ اس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پڑاؤ ڈالا تھا جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ سے روک دیا گیا تھا۔ **قولہ: خرج النبی ......''فی بضع عشرة مائة من اصحابه''**

''بضع'': اس کا اطلاق تین سے نو تک کے عدد پر ہوتا ہے۔ لہٰذا **بضع عشرة مائة** کا مطلب ہوا کہ وہ صحابہ ہزار اور کچھ سو تھے۔ اس سے پہلی روایت میں ہے کہ یہ چودہ سو آدمی تھے۔ اور بعض کے قول کے مطابق تیرہ سو صحابہ تھے۔ اور مجمع بن جاریہ سے منقول ہے کہ پندرہ سو صحابہ کرام تھے۔

صاحب المواہب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق یوں ممکن ہے، جس نے پندرہ سو کہا ہے۔ اس نے کسور کو بھی جمع کیا ہے اور اس کو پورا عدد شمار کیا ہے۔ اور جس نے تیرہ سو کا کہا ہے۔ تو اس میں ممکن ہے کہ اس کو اسی کی اطلاع ہو، اور اس کے علاوہ کو دو سو کی زیادتی کا بھی علم ہو جس کا اس پہلے والے کو پتہ نہ ہو اور ثقہ کی زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ وہ سترہ سو آدمی تھے۔ جابرؓ کے اس بیان سے استنباط پر مبنی ہے: ''**نحرنا البدنة من عشر**'' ہم نے دس آدمیوں کی طرف سے ایک اونٹنی کو ذبح کیا اور اس دن انہوں نے ستر جانور ذبح کئے تھے۔ لیکن یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ انہوں نے ''**بدنة**'' کے علاوہ کچھ بھی ذبح نہیں کیا تھا نیز یہ کہ ان میں سے بعض نے سرے سے احرام بھی نہیں باندھا تھا۔

موسیٰ بن عقبہ نے جزم کے ساتھ کہا ہے کہ اس دن ۱۶۰۰ (سولہ سو) آدمی تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں سلمہ بن اکوع کی حدیث کے مطابق سترہ سو آدمی تھے۔ جبکہ ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ان کی تعداد پندرہ سو پچیس تھی۔ اور ابن ام مکتوم کو مدینہ پر خلیفہ مقرر کیا تھا۔

قولہ:''فلما اتی ذالحلیفة، قلد الهدی وأشعر.......وسار:''

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''تقلید'' سے مراد یہ ہے کہ جانور کے گلے میں کوئی چیز لٹکائی جائے تاکہ پتہ چلے کہ یہ جانور ''ہدی'' کا ہے۔ ''اشعار'' سے مراد یہ ہے کہ اس اونٹ کے کوہان کی دائیں یا بائیں طرف زخم کیا جائے یہاں تک کہ اس سے خون بہہ جائے تاکہ پتہ چلے کہ یہ ''ہدی'' کا جانور ہے۔

مواہب میں بخاری کی ایک روایت میں ہے:

''یہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا اور بنو خزاعہ کے ایک آدمی کو جاسوس بنا کر بھیجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل دیئے یہاں تک کہ ''غدیر اشطاط'' کے مقام پر جاسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے واپس ملا جاسوس نے کہا کہ قریش نے آپؐ کے مقابلہ کے لئے لشکروں کو جمع کیا ہے اور مختلف قبیلوں کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ یہی الفاظ ''النہایہ'' میں بھی ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ قتال کریں گے اور آپ کو بیت اللہ سے روکیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! مجھے اس بارے میں مشورہ دو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ان کے اہل و عیال کا رخ کروں اور ان لوگوں کی اولاد کی طرف مائل ہو جاؤں جو ہمیں بیت اللہ کی زیارت سے روک رہے ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول آپ بیت اللہ کے ارادے سے آئے ہیں، آپ کا ارادہ کسی

کو قتل کرنے کا ہے اور نہ ہی کسی سے لڑائی کرنے کا ہے۔ آپ ہمیں لے کر ان کی طرف چلیں جس نے ہمیں بیت اللہ سے روکا ہم اس سے لڑائی کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر چل پڑو۔ بخاری کی روایت میں اس طرح ہے کہ ابھی آپ ﷺ راستے میں ہی تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خالد بن ولید قریش کے ایک لشکر کے ساتھ ہیں۔ اس لئے تم دائیں طرف چلو۔ خدا کی قسم خالد رضی اللہ عنہ کو اس کا پتہ نہیں چلا۔ یہاں تک کہ ابھی وہ لشکر کے اس گرد وغبار ہی میں تھے کہ خالد نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تا کہ جا کر قریش کو ڈرائیں۔

قوله: حتی اذا ۔۔۔ کان بالثنية حابس اضيل: ''الثنية'': پہاڑی کا نام ہے۔

''حَلْ حَلْ'': (یہ کلمہ زجر ہے)۔ اور اونٹنی کیلئے بولا جاتا ہے جب اس کو اٹھنے پر ابھارا جائے۔ اور دوسرا ''حَلْ'' تاکید کیلئے ہے اور پہلے ''حَل'' کو تنوین کے ساتھ پڑھیں گے۔ جب اس کو دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھیں گے۔ محدثین اس کو وصل میں بھی ساکن پڑھتے ہیں۔ ''المواھب'' میں ہے کہ ''حل'' سے مراد ہے کہ وہ عدم قیام پر اڑ گئی۔

قصواء: حضور ﷺ کی اونٹنی کا نام تھا۔ ''قصواء'' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے کان کٹے ہوئے ہوں۔ علامہ جوہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کا نام ''قصواء'' تھا لیکن اس کے کان کٹے ہوئے نہیں تھے۔

''خلأت القصواء'': اس کو تاکید کیلئے دوبارہ ذکر کیا ہے۔ چوں کہ وہ اٹھ نہیں رہی تھی صحابہ نے خیال کیا کہ یہ تھکاوٹ کی وجہ سے بیٹھ گئی ہے، یا یہ کہ یہ بیٹھنا اس کی عادت ہے۔ تو اس کے جواب میں نبی ﷺ نے فرمایا: **''ماخلأت القصواء''** یعنی یہ اس سبب سے نہیں ہے جو تم خیال کرتے ہو اور نہ راستے میں بیٹھنا اس کی عادت ہے۔ ہاتھی والوں کو روکنے والی ذات نے اس کو روکا ہے۔ یعنی اس کو چلنے سے منع کر دیا تا کہ یہ مکہ میں داخل نہ ہو جیسا کہ اس نے اصحاب فیل (ہاتھی والے) کو مکہ میں داخلے سے روکا تھا۔ تا کہ قبل از وقت لڑائی نہ ہو اور حرم میں خون نہ بہے۔ اگر اس کا دخول مقدر ہو۔ جیسا کہ اگر اصحاب الفیل کا دخول مقدر ہوتا۔ لیکن اللہ کے علم میں تھا کہ ان میں سے بعض لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور ان لوگوں کی پشتوں سے ایسے لوگ نکلیں گے جو اسلام لائیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روایت ہے کہ ابرہہ نے جب مکہ کو تہس نہس کرنے کا ارادہ کیا اور مکہ والوں کو تر نوالہ بنانے کی کوشش کی تو اس نے بہت بڑے لشکر کے ہمراہ مکہ کا رخ کیا جب وہ مقام ''ذی المجاز'' پہنچا تو اس کے ہاتھی مکہ کی طرف جانے سے رک گئے۔ جب ان ہاتھیوں کو کسی اور طرف موڑا جاتا تو وہ اس طرف جلدی سے مڑ جاتے تھے۔ اھ

''القاموس'' کے مطابق ''ذوالمجاز'' ایک بازار کا نام ہے جو ''کبکب'' کے علاقے میں عرفہ کے میدان سے دو فرسخ کے فاصلے پر ہے۔

قوله: والّذی نفسی بیده ۔۔۔ حتی نزحوه:

لا یسألونی: نون کی تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ ہے۔ ضمیر جمع اہل مکہ کی طرف راجع ہے۔

''یعظمون فیها حرمات اللّٰه'': ''حرُمات'' ''حرمة'' کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد ''حرم'' اور ''احرام'' کی حرمت ہے۔ کہ وہاں قتل وقتال نہ ہو۔

''الا أعطيتهم اياها'': قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھ سے جو بھی ایسا مطالبہ کریں گے جس میں اس چیز کی تعظیم ہو جس کو اللہ نے عظمت والا بنایا ہو۔ تو میں ان کو وہ چیز دے دوں گا۔ ''مضارع'' کی جگہ پر ''ماضی'' کا صیغہ لانا مبالغہ کے لئے ہے۔

فعدل عنهم: یہاں مضاف محذف ہے اصل عبارت یوں ہے: **عدل عن طريق أهل مكة**

''**حتى نزل بأقصى الحديبية**'': یعنی جانب حرم سے اس کا آخری جانب تھا۔ ''**ثمد**'': ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ماء قلیل کو کہتے ہیں اور یہاں پر اس سے مجازاً پانی کا علاقہ ہے۔ مجازاً احالٰ کا اطلاق محل پر کیا گیا ہے۔ وہاں پر ایک گڑھا تھا جس میں کم پانی تھا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ''**قليل الماء**'' یہ اس کی صفت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صفت کاشفہ لیکن لفظ ''ثمد'' خود قلت پر دلالت کر رہا ہے لہٰذا محض قلت کے معنیٰ بتانے کیلئے اس کو صفت کی ضرورت نہیں بلکہ تاکید مطلوب ہے۔ یعنی اقل قلیل کے معنیٰ بتانے کیلئے ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ثمد'' اس ماء قلیل کو کہتے ہیں جس کا کوئی قوام نہ ہو ''قوم صالح'' کو بھی ''ثمود'' کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے ''ثمد'' پر پڑاؤ ڈالا تھا۔

''**يتبرضه الناس تبرضًا**'': اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے لے رہے تھے ''تبرضًا'' مفعول مطلق ہے۔

''**فلم يلبثه النّاس**'': باب افعال اور تفعیل دونوں سے ہوسکتا ہے۔ یعنی پانی کو زیادہ دیر تک نہیں رہنے دیا۔

قوله: وشكى الى رسول الله ﷺ ---اذجاءة سهيل بن عمرو:

''**شكى**'': مجہول کا صیغہ ہے۔

''**ففعلوا**'': اس میں اشارہ ہے کہ خرق عادت امور آپ ﷺ کے اتباع کے ہاتھوں سے بھی ظاہر ہوئے ہیں۔

''**فوا للّٰه ما زال يجيش لهم بالرى**'' ری: راء کے کسرہ اور باء کی تشدید کی کے ساتھ ہے **ریّ عرب** کے اس قول سے ماخوذ۔ **عین رية اى كثير الماء**''

بديل: بائے موحدہ کے ضمہ اور دال مہملہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

خزاعی: خاء معجمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

''**سهيل**'': تصغیر کے ساتھ ہے۔

''**قوله: فقال البخاً: اكتب هٰذا ما قاضٰى عليه محمد رسول اللّٰه**'':

''**قاضی**'': صالح کے معنیٰ میں ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔ اور ایک نسخہ میں قاضی کے بجائے) ''**قضٰى**'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ ''**قضى الحكم**'' سے ماخوذ ہے۔ اور یہاں پر بھی باب مفاعلة سے لائے ہیں کیونکہ قضیّہ کا یہ فیصلہ جانبین کی طرف سے تھا۔

''مواہب'' میں مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان صلح کی تفصیلات یوں ہیں کہ اچانک ''بدیل'' خزاعة کی ایک جماعت کے ساتھ آئے۔ بدیل نے کہا کہ میں نے کعب بن لوئی اور عامر بن لوئی کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ وہ حدیبیہ کے پانی تیار کر

رہے تھے۔یعنی ان کے پاس پانی کے وسیع ذخائر ہیں۔مثلاً چشمے اور نہریں اور ان کے ساتھ ''عوذ'' اور مطافیل بھی ہیں۔''عوذ'' ''عائذ'' کی جمع ہے۔ دودھ والی اونٹنی کو کہتے ہیں اور ''مطافیل'' ان ماؤں کو کہتے ہیں جن کے ساتھ بچے بھی ہوں۔مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ نکلے ہیں کیونکہ ان کا ارادہ وہاں پر لمبے قیام کا ہے۔یہ بات ''عدم فرار'' کا زیادہ بڑا داعیہ ہوگی۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم کسی کے ساتھ لڑنے کے لئے نہیں آئے، بلکہ عمرہ کرنے کیلئے آئے ہیں۔قریش کو لڑائی نے کمزور کردیا ہے۔اگر وہ چاہیں تو میں ان کو مہلت دیتا ہوں۔میرے اور لوگوں کے درمیان راستہ چھوڑ دیں۔اگر وہ چاہیں کہ جب میں غالب آؤں تو وہ اس دین میں داخل ہو جائیں جس میں عام لوگ داخل ہو رہے ہیں تو ایسا کرلیں۔اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ استراحت کرتے رہیں (یعنی ہمارے ساتھ تعرض نہ کریں)۔اور اگر وہ اس کا بھی انکار کرتے ہیں تو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تو میں ان کے ساتھ اس وقت تک لڑوں گا کہ جب تک کہ میری گردن تن سے جدا نہیں ہوجاتی۔(یہ قتل ہونے سے کنایہ ہے) یا اللہ تعالیٰ اپنے اس دین کو نافذ کردے گا۔''بدیل'' نے کہا کہ میں ان کو آپ کی باتیں پہنچادوں گا۔

قریش کے پاس آیا۔اور بولا کہ ہم تمہارے پاس اس آدمی کے پاس سے آئے ہیں، ہم نے اس کی باتیں سنی ہیں۔اگر تم چاہو تو میں تم پر اس کی باتیں پیش کروں۔ان بے وقوفوں نے کہا کہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم ہمیں اس کی کوئی خبر دو۔لیکن ان کے اصحاب رائے نے کہا کہ جو کچھ تم نے سنا ہے وہ پیش کردو۔اس نے کہا کہ وہ اس اس طرح کی باتیں کررہا ہے۔اور نبی ﷺ کی تمام باتیں بتلادیں۔اس پر عروہ بن مسعود کھڑا ہوگیا۔اور کہا کہ اے میری قوم کے لوگو کیا تم والد نہیں ہو؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں۔پھر کہا کہ کیا میں ولد نہیں ہوں؟ تو انہوں نے کہا: کیوں نہیں۔اس نے کہا کہ کیا تم مجھ پر کوئی تہمت لگاتے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔پھر اس نے کہا کہ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ میں نے اہل عکاظ کو تمہاری طرف نکلنے کا کہا تھا؟

فائدہ: ''القاموس'' میں ہے کہ عکاظ ''غراب'' کے وزن پر ہے۔اور طائف اور نخلہ کے درمیان صحراء کا نام ہے ذوقعدہ کی پہلی تاریخ کو یہاں بازار لگتا تھا اور بیس دن تک لگا رہتا تھا یہاں پر قبائل عرب ٹھہرتے اور فخر و مباہات کی مجالس کا انعقاد کرتے تھے۔

جب انہوں (یعنی اہل عکاظ) نے میری دعوت کو ٹھکرادیا۔تو میں تمہارے پاس اپنے اہل، بچوں اور جس نے بھی میری بات مانی، کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔انہوں نے کہا۔کیوں نہیں۔پھر انہوں نے کہا کہ اگر یہ آدمی (محمد ﷺ) تم پر کوئی بھلائی کی بات پیش کرتا ہے تو اس کو قبول کرو اور مجھے موقع دو تا کہ میں ان کے پاس جاؤں۔وہ آئے اور نبی ﷺ کے ساتھ باتیں شروع کردیں۔رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ ''بدیل'' سے کہا تھا وہی ان سے بھی کہا اس پر عروہ بن مسعود نے کہا کہ اے محمد آپ مجھے بتائیں کہ اگر آپ نے اپنی قوم کا استیصال کردیا تو کیا آپ نے اس سے پہلے کسی عرب کو سنا ہے جس نے اپنی جڑ کو کاٹ دیا ہو۔اور اگر دوسری بات ہو تو قسم خدا کی! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں اور ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو بھاگ جائیں گے۔اور تم کو اسی طرح چھوڑ دیں گے۔اس پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا امصص بظر اللات انحن نفر عنه وندعه'' لات کی شرمگاہ کو چاٹ۔کیا ہم ان کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

فائدہ: کہا گیا ہے کہ یہ عروۃ کو گالی دینے میں حضرت ابوبکر نے بہت مبالغہ سے کام لیا۔کہ عروۃ کے معبود کو اس کی ماں کے قائم

مقام کر دیا۔ اس گالی کا سبب عروہ کی بات تھی کہ یہ لوگ راہ فرار اختیار کر جائیں گے "بظر" اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو عورت کے ختنہ کے بعد اس کی شرمگاہ میں رہ جاتا ہے۔ "اللات" بت کا نام ہے اور اہل عرب "بظر" کو ذم کے موقع پر بولتے تھے۔ اھ۔

عروہ نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ابوبکر ہیں اس پر عروہ بولا کہ خدا کی قسم اگر مجھ پر میرے احسان کا بدلہ باقی نہ ہوتا تو میں تم کو اس کا جواب دیتا۔ راوی کہتا ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ سے گفتگو شروع کر دی اور جب بات کرتا تو آپ ﷺ کی داڑھی مبارک کو پکڑتا۔ مغیرہ بن شعبہ نبی ﷺ کے پاس ہی کھڑے تھے۔ ان کے پاس تلوار تھی اور سر پر خود پہنا تھا۔ جب کبھی عروہ اپنے ہاتھ کو نبی کریم ﷺ کی داڑھی مبارک کی طرف بڑھاتا تو وہ تلوار کا پچھلا حصہ اس کے ہاتھ پر مار کر فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ کی داڑھی سے اپنے ہاتھ کو پیچھے کر۔ علماء فرماتے ہیں کہ اہل عرب جس کے ساتھ بات کرتے ملاطفت کے وقت اس کی داڑھی کو پکڑتے۔ لیکن نبی ﷺ نے عروہ کی دلجوئی کی خاطر اس کو اس سے منع نہیں فرمایا جبکہ مغیرہ بن شعبہ اس کو جلالت نبی کریم ﷺ کی وجہ سے روک دیتے۔ اھ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سازش کے اندیشہ کے پیش نظر ایسا کر رہے ہوں۔ (واللہ اعلم)۔ راوی کہتا ہے کہ اس پر عروہ نے سر اٹھایا اور کہا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ مغیرہ بن شعبہ ہے۔ اس نے کہا اے غدار۔ "غدر" اصل میں "غادر" سے معدول ہے۔ (كذا في النهاية)

"کیا میں نے تمہاری غداری میں کوشش نہیں کی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ مغیرہ بن شعبہ ؓ کی زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کے ساتھ ہم نشینی تھی۔ آپ نے ان لوگوں کو قتل کر کے ان کے اموال کو قبضہ میں کر لیا اور پھر اسلام قبول کر لیا تھا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا **اما الاسلام فا قبل فلست منه في شيىء** پھر "عروہ" اصحاب نبی کریم ﷺ کو آنکھ کے کناروں سے دیکھتا۔ تو وہ کہتا ہے کہ قسم خدا کی! رسول اللہ نے بلغم نہیں پھینکا مگر وہ کسی آدمی کے ہاتھ لگتا تو وہ اس کو اپنے چہرے اور جلدوں سے مل لیتا۔ جب وہ کسی چیز کا حکم دیتے تو وہ اس کی طرف جلدی کرتے۔ جب وہ وضو فرماتے تو وہ لوگ اس کے وضو کے بقیہ پانی پر لڑ پڑتے۔ اور جب وہ بات کرتے ہیں تو وہ اپنی آوازوں کو پست کر دیتے ہیں۔ اور ان کی عظمت شان کی وجہ سے وہ ان سے نگاہیں ملا کر نہیں دیکھ سکتے۔ "فتح الباری" میں فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ ان کا بھاگنا متوقع نہیں ہے۔ گویا کہ انہوں نے لسان حال سے کہہ دیا ہے کہ جو لوگ اس طرح محبت کریں اور اس کی اس طرح تعظیم کریں تو یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ اس کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور اس کو دشمن کے حوالے کر دیں گے۔ بلکہ یہ لوگ اس کے اور اس کے دین کی حفاظت پر ان قبائل سے زیادہ سخت ہوں گے جن کی مدد کی توقع ان قبائل کے آپس میں ایک دوسرے سے کی جاتی ہے۔ اھ

راوی کہتا ہے کہ عروہ اپنے ساتھیوں کے پاس گیا۔ اور کہا کہ اے میری قوم! میں بادشاہوں کے پاس وفد میں گیا ہوں۔ میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے پاس گیا ہوں۔ بخدا! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھی اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی تعظیم اصحاب محمد ان کی کرتے ہیں اللہ کی قسم محمد جب تھوکتے ہیں تو اس کے اصحاب اس کو اپنے بدن اور چہرے پر مل لیتے ہیں۔ جب کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ اس کی تعمیل میں جلدی کرتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو وہ اس کے وضو کے بقایا پانی پر مر مٹتے ہیں۔ اور جب وہ بات کرتے ہیں۔ تو یہ لوگ خاموش ہو جاتے ہیں اور اس کی تعظیم کی وجہ سے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اور بے شک انہوں نے تم کو ایک اچھی خصلت کی پیشکش کی ہے۔ لہٰذا تم اس کو قبول کر لو۔

''بنو کنانہ'' کے ایک آدمی نے کہا کہ مجھے اس کے پاس جانے دو۔ انہوں نے کہا کہ جاؤ۔ جب وہ نبی ﷺ کے پاس آ کر بیٹھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ فلاں ہے اور یہ اس قوم میں سے ہے جس کی قوم کے لوگ قربانی کے جانوروں کی تعظیم کرتے ہیں۔ لوگوں نے اس کا استقبال تلبیہ پڑھتے ہوئے کیا۔ جب اس نے دیکھا۔ تو کہا ''سبحان اللّٰہ'' ان لوگوں کو بیت اللہ سے نہیں روکنا چاہیے۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹا تو اس نے کہا کہ میں نے جانوروں کو دیکھا ہے کہ ان کو قلادے پہنائے گئے ہیں اور ان کا ''اشعار'' کیا گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کو بیت اللہ سے روکا جائے۔

پھر ان میں سے ایک آدمی مکرز بن حفص نے کہا کہ میں جانا چاہتا ہوں۔ جب وہ نبی ﷺ کے پاس آیا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ ''مکرز'' ایک فاسق آدمی ہے۔ اس نے نبی ﷺ سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اسی دوران کہ جب وہ باتیں کر رہا تھا کہ سہیل بن عمرو آیا۔ معمر کا کہنا ہے کہ مجھے ایوب نے عکرمہ کے طریق سے بتایا ہے کہ جب سہیل آیا تو نبی ﷺ نے فرمایا ''سهل لكم من امركم'' اب تمہارا معاملہ آسان ہو گیا ہے۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ قریش نے سہیل بن عمرو کو بلایا اور کہا کہ ''اس آدمی یعنی محمد ﷺ کے پاس جاؤ'' اور اس سے مصالحت کر لو۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''قریش نے اس کو بھیج کر صلح کا ارادہ کر لیا ہے''۔ جب وہ نبی ﷺ کے پاس پہنچا تو ان کے درمیان باتیں ہو رہی تھیں پھر اس پر صلح ہوئی کہ دونوں فریقوں میں دس سال تک جنگ نہ ہو گی، بعض بعض کو امان دے سکیں گے۔ اور یہ لوگ اس سے اسی طرح واپس چلے جائیں گے۔

معمر نے کہا ہے کہ امام زہری نے اپنی حدیث میں اس طرح کہا ہے کہ سہیل بن عمرو آیا اور کہا کہ مجھے کوئی کچھ دو تا کہ معاہدہ لکھا جائے نبی ﷺ نے کاتب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بلایا اور فرمایا کہ لکھو: ''بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم'' اس پر سہیل نے کہا کہ قسم خدا کی! میں نہیں جانتا کہ ''الرحمٰن الرحيم'' کیا ہے۔ لیکن ''باسمك اللهم'' لکھ لو، جیسا کہ تم جاہلیت میں لکھا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم تو ''بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم'' ہی لکھیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''باسمك اللهم'' ہی لکھو۔ اور پھر فرمایا کہ ''یہ وہ ہے کہ جس پر محمد رسول اللہ نے فیصلہ کیا ہے۔ جب کہ عبداللہ بن مغفل کی حدیث میں (جس کو حاکم نے نقل کیا ہے۔) یہ الفاظ ہیں: ''هٰذا ما صالح محمد رسول اللّٰه اهل مكة'' الحدیث۔ اھ۔

علماء کہتے ہیں کہ ''بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم'' کے ترک کتابت پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ موافقت کی اور اس کی جگہ ''باسمك اللهم'' لکھ دیا، اور اسی طرح ''محمد بن عبداللہ'' میں موافقت کر لی اور ''محمد رسول اللہ'' کو لکھنا چھوڑ دیا۔ یہ اس اہم مصلحت کی وجہ سے تھا جو کہ صلح سے حاصل ہو رہی تھی ان امور میں بظاہر کوئی فساد بھی لازم نہیں آتا نیز بسملة اور ''باسمك اللهم'' دونوں کے معانی ایک ہیں اور اسی طرح ''محمد بن عبداللہ ہی تو اللہ کے رسول تھے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے اوصاف کو چھوڑنا ان اوصاف کی حقیقت کی نفی نہیں کرتا۔ لہٰذا ان کے اس مطالبہ میں کوئی مفسدہ نہیں تھا۔ اصل مفسدہ تو اس چیز میں ہوتا کہ اگر وہ ان چیزوں کے لکھنے کا مطالبہ کرتے جو جائز نہ ہوتیں۔ مثلاً ان کے معبودان کی تعظیم وغیرہ۔

قوله: فقال سهيل: والله لو كنا... اكتبا محمد بن عبد الله:

''محمد بن عبدالله'': نصب کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے لیکن یہ رفع اعراب حکائی کی وجہ سے ہو گا اس لئے کہ ''قاضی'' اور ''صالح'' کا فاعل بنے گا۔

''فقال النبی ﷺ'':اور ایک نسخہ میں ''رسول اللہ'' ہے

اکتب :محمد بن عبدالله: اس میں دوصورتیں ہیں۔

صاحب مواہب کہتے ہیں کہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے ''فقال النبی ﷺ لعلی: امحه'' کہ نبی ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اس کو مٹادو۔تو انہوں نے کہا ماأنا بالذی أمحاه کہ میں اس کو نہیں مٹاوں گا۔'' محوه'' میں ایک لغت ''أمحاه'' بھی ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہ انکارادب مستحب میں سے تھا۔اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادِ گرامی کے بارے میں حضرت علیؓ کا خیال یہ تھا کہ یہ کوئی حتمی حکم نہیں ہے اور اسی وجہ سے حضرت نبی ﷺ نے حضرت علیؓ پر کوئی نکیر نہیں کی۔اور اگر وہ حتمی طور پر اس کو حکم کرتے کہ تم ان کو مٹادو تو حضرت علیؓ کیلئے پھر اس حکم کا ترک جائز نہیں تھا۔اھ

پھر نبی ﷺ نے فرمایا کہ مجھے وہ جگہ دکھاؤ تو حضرت علیؓ نے جگہ بتادی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو مٹا دیا۔اور ''محمد بن عبداللہ'' لکھ دیا۔

''المغازی'' میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس تحریر کو لیا حالانکہ آپ ﷺ اچھی طرح لکھ نہیں سکتے تھے۔چنانچہ آپ ﷺ نے لکھا:''هذا ما قاضٰی علیه محمد بن عبدالله''

فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ اس روایت کے ظاہر سے علامہ ابوالولید الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اس کو اپنے ہاتھ مبارک سے لکھا۔اگر چہ آپ ﷺ اچھی طرح لکھنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ علماء اندلس نے اپنے زمانہ میں اس کی تشنیع کی اور ان پر زندقہ کا الزام لگایا۔اور یہ بھی کہا کہ جو کوئی اس کا قائل ہے وہ قرآن پاک کی مخالفت کر رہا ہے۔یہاں تک کہ انہوں نے یہ شعر کہا:

برئت ممّن شریٰ دنیا بآخرة ☆ وقال ان رسول اللّٰه قد کتبا

''میں اس شخص سے برأت کا اظہار کر رہا ہوں کہ جس نے دنیا کو آخرت کے مقابلے میں خریدا۔اور کہا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے لکھا ہے''۔

چنانچہ وہاں کے اُمیر نے علماء کو جمع کیا۔

علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی علمی تحقیق پیش فرماتے ہوئے کہا کہ یہ قرآن کے منافی نہیں ہے۔بلکہ اس کو قرآن کے مفہوم سے اخذ کیا گیا ہے۔اسلئے کہ نفی کتابت کو ورود قرآن سے پہلے کے ساتھ مقید کیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿وما کنت تتلو من قبله من کتاب ولا تخطه بیمینك﴾[العنکوت۔۴۸] جب اس معجزہ کا تحقق وتقرر ہو گیا۔اور شک وشبہ سے محفوظ ہو گیا کہ آپ ﷺ کو بغیر تعلّم کے معرفت کتابت بھی حاصل ہوگئی تو یہ ایک اور معجزہ ہوگا۔اھ

ابن دحیہ نے ذکر کیا ہے کہ اس بات میں علماء کی ایک بڑی جماعت نے علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ کی موافقت کی ہے۔جن میں ان کے شیخ ابوذر راوہی، ابوالفتح نیساپوری، اور دوسرے کچھ علماء افریقہ بھی ہیں۔بعض علماء نے اس مرحلہ میں اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے مجالد عن عون بن عبداللہ کے طریق سے روایت کیا ہے:مامات رسول الله ﷺ

حتی کتب وقرأ مجالد کہتے ہیں کہ میں نے اس کا ذکر شعبیؒ سے کیا تو انہوں نے فرمایا: سچ کہا ہے۔ جس نے یہ تم کو بتایا ہے اس سے میں نے بھی سنا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کئی آثار وارد ہیں جو اس پر دال ہیں کہ آپ ﷺ خط کے حروف اور اس کی بناوٹ کو خوب جانتے تھے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے کاتب سے فرمایا تھا:

"ضع القلم علٰی أذنك فانه اذكر لك"

ایک موقع پر آپ ﷺ نے حضرت معاویہؓ سے کہا تھا: **"الق الدواة وحرف القلم وفرق السين ولا تغور الميم"** وغیرہ وغیرہ۔

فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ آپ ﷺ نے لکھا ہے۔ لیکن یہ بعید نہیں ہے کہ آپ ﷺ کو "کتابت کا علم عنایت کیا گیا ہو کیونکہ آپ ﷺ کو ہر چیز کا علم عطاء کیا گیا ہے۔ جمہور نے ان احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور قصہ حدیبیہ کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ایک ہی قصہ ہے اور کاتب صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی تھے۔ اور حدیث مسور بن مخرمہ میں تصریح ہے کہ آپ ہی نے لکھا تھا لہٰذا یہ عبارت **"فأخذ الكتاب وليس يحسن أن يكتب فكتب"** اس قول کی وضاحت کیلئے ہے: **"أرني مكانها"** یعنی جس کے مٹانے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ رک گئے تھے۔ آپ ﷺ اچھی طرح لکھ نہیں سکتے تھے۔ اور **"فكتب"** سے پہلے **"فمحاها"** مقدر ہے یعنی حضرت نے جو مٹانا تھا وہ مٹا کر تحریر دوبارہ حضرت علیؓ کو دے دی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لکھنے کا حکم ارشاد فرمایا یا کتب کا مطلب ہے أمر بالكتاب۔ اور یوں بکثرت ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ قول ہے: **"كتب الى كسرٰى وقيصر"** اس کو ظاہر پر محمول کیا جائے تو اس دن اپنا نام مبارک لکھنے سے یہ لازم نہیں تھا کہ آپؐ کتابت کر سکتے تھے جس کی وجہ سے آپ ﷺ "امیین" میں سے خارج ہو گئے جیسا کہ اکثر بادشاہ ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دن آپ ﷺ کا ہاتھ وہاں کتابت کے لئے چل گیا ہو اگرچہ آپ ﷺ اچھی طرح لکھ نہیں پا رہے تھے۔ اور مکتوب اپنی مراد کے موافق نکلا ہو۔ یہ اس وقت خاص میں ایک اور معجزہ ہو گا۔ اور اس سے آپ ﷺ "امی" ہونے سے نہیں نکلتے۔ اور یہی جواب (اشاعرہ میں سے) امام ابو جعفر سمنانی نے بھی دیا ہے ان کا شمار ائمہ اصول میں ہوتا ہے۔ اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اتباع کی ہے (اس مسئلہ میں) اور سہیل وغیرہ نے اس پر گرفت کی ہے کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ یہ دوسرا معجزہ لیکن اس کا تناقض "أمی سے "تناقض لازم سے آتا ہے کہ آپ ﷺ "امّی" تھے لکھ نہیں سکتے تھے۔ اور اسی آیت کے ذریعے حجت قائم ہے۔ اور منکر کو خاموش کرا دیا ہے اور شبہ ختم ہو جاتا ہے اگر یہ جائز ہو۔ کہ آپ ﷺ اس کے بعد لکھ سکتے تھے تو یہ شبہ پھر عود کر آئے گا۔ اور معاند کہتا ہے کہ آپ ﷺ اچھی طرح لکھ سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ اس کو چھپاتے تھے۔ اور یہ محال ہے کہ بعض معجزات بعض دوسرے معجزات کو دور کر دیں۔ اور حق یہ ہے کہ "فکتب" کا معنیٰ "امر عليًا ان يكتب" اھ اور یہ دعویٰ تو بہت ہی محل نظر ہے کہ فقط اپنا اسم گرامی لکھنا مناقضت معجزہ کو مستلزم ہے، کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ غیر امی تھے۔

میں کہتا ہوں وجہ نظر تو اللہ ہی جانتا ہے کہ معاند تو غریق کی طرح ہوتا ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اور معجزہ قرآنیہ بہت زیادہ طرق سے ثابت ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کو لانے والا اُمی ہے۔ اور اس میں عدم قرآت اور عدم کتابت کے وصف کو زائد کیا

ہے تا کہ حجت بطریق کمال ظاہر ہو اور معاندین کے کلام کا بطلان ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿وما كنت تتلوا من قبله من كتاب ولا تخطه بيمينك اذًا لارتاب المبطلون﴾[العنكبوت۔ ٤٨]

اور معنی یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ ان لوگوں میں سے ہوتے جو پڑھ لکھ سکتے ہیں تو وہ کہتے کہ اس نے اس کو سیکھا ہے یا اس کو پہلے لوگوں کی کتابوں سے لیا ہے۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں اور ان کو ''مبطلین'' کا نام اس لئے دیا کہ وہ اس میں اس طور پر شک کرتے ہیں کہ بہت زیادہ وجوہ اعجاز میں سے کسی وجہ کی نفی کر دیتے۔ اھ اور اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر آپ ﷺ اول وہلہ سے قاری اور کاتب ہوتے اور اس وقت قرآن لے آتے تو یہ معجزہ ہوتا۔ اور یہ اتنا واضح ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور بخاری کی روایت میں ہے: ''فكتب هذا ما قاضى عليه محمد بن عبدالله ''فقال ﷺ: على ان تخلوا بينناوبين البيت فنطوف به'' اس پر کہ تم ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان راستہ چھوڑ دو گے تا کہ ہم اس کا طواف کریں۔ اس پر سہیل بن عمرو نے کہا قسم خدا کی اس طرح تو عرب کہیں گے کہ ہم مجبور ہو گئے۔ اور ہم نے دباؤ لے لیا ہے۔ لیکن یہ طواف اگلے سال ہوگا۔ چنانچہ اس نے لکھا......

قوله: فقال سهيل: و على الاددته علينا:

''وعلٰی'': اس کا عطف مقدر پر ہے۔ **اى على أن تأتينا فى العام المقبل على أن لا يأ تينك رجل** اور ایک نسخہ میں ''رجلٌ'' کی جگہ پر ''احدٌ'' ہے۔

المواہب میں ہے کہ اس پر مسلمانوں نے کہا کہ سبحان اللہ اس کو کیسے واپس کیا جائے گا مشرکین کی طرف حالانکہ وہ مسلمان ہو کر آیا ہوگا۔ اور اس پر ان شاء اللہ تفصیلی کلام آگے آئے گا۔

قوله: ''قال رسول الله ﷺ لاصحابه ''قوموا فانحروا، ثم احلقوا'':

اشرفؒ کہتے ہیں کہ یہ دلیل ہے جس نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا اور اس کو روک دیا گیا تو وہ اسی جگہ پر ہدی کو نحر کرے گا اور حلال ہو جائے گا۔ اگر چہ ہدی حرم کو نہ پہنچی ہو۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ دلیل ہے کہ جس کسی نے عمرہ کا احرام باندھا اور پھر اس کو اس کے اتمام سے روک دیا گیا تو وہ اسی جگہ پر ہدی کو نحر کرے گا جہاں پر محصور ہوا اور اس جگہ پر گوشت کو مساکین میں تقسیم کر دے گا، حلق کرے گا، احرام کھول دے گا۔ اگر چہ اس کی ہدی حرم کو نہ پہنچی ہو۔ دیگر ائمہ کہتے ہیں کہ اس ہدی کو ارض حرم کے علاوہ کہیں بھی ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حدیبیہ کا بعض علاقہ حرم میں داخل ہے۔ اس سلسلہ میں کلام پہلے گذر چکا ہے۔ اور یہ اس آیت کے ظاہر کے بھی مخالف ہے:

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّه﴾[البقرة۔ ١٩٦] اور اسی طرح فرمایا: ﴿هديًا بالغ الكعبة﴾[المائدة۔ ٩٥] یعنی حرمها۔

قوله: ثم جاء نسوة......وأمرهم أن يردوا الصداق:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ

فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [الممتحنة:۱۰] ''مومنو جب تمہارے پاس مومن عورتیں وطن چھوڑ کر آئیں تو ان کی آزمائش کرلو۔(اور) خدا تو ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے سو اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں تو ان کو کفار کے پاس واپس نہ بھیجو کہ نہ یہ ان کو حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز۔اور جو کچھ انہوں نے (ان پر) خرچ کیا ہو وہ ان کو دے دو اور تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو مہر دے کر ان سے نکاح کرلو اور کافر عورتوں کی ناموس کو قبضے میں نہ رکھو (یعنی کفار کو) واپس دے دو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہو ان سے طلب کرلو اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کرلیں یہ خدا کا حکم ہے جو تم میں فیصلہ کیے دیتا ہے اور خدا جاننے والا حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے مؤمن عورتوں کو مشرکین کی طرف لوٹانے سے مسلمانوں کو منع کر دیا۔بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ عورتیں اس شرط میں داخل نہیں تھیں۔کیونکہ اس میں یہ تھا ''منا رجلٌ'' اور اس پر کوئی اشکال نہیں ہوگا اور ایک روایت میں ''منّا أحد'' آیا ہے ''احدٌ'' کا لفظ عورتوں کو بھی شامل ہے لیکن آیت قرآنیہ اس کیلئے ناسخ ہے۔ان کو علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔اور اس کی توضیح ''شرح السنۃ'' میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ صلح ردالنساء پر بھی تھی یا نہیں؟

بعض کہتے ہیں کہ یہ عورتوں اور مردوں دونوں کے بارے میں تھی اس کی دلیل یہ ہے ''**انه لا یأتیك منا احدٌ الا رددته**'' پھر ردنساء کے بارے میں اس آیت کریمہ کی وجہ سے یہ حکم منسوخ ہوگیا: ﴿**لا ترجعوهن الی الکفار**﴾ [المحمد:۱۰]

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صلح ردالنساء پر نہیں تھی۔اور دلیل یہ حدیث ہے: ''**لا یأتیك منا رجلٌ**'' چونکہ مرد کے بارے میں فتنہ کا کوئی خدشہ نہیں ہوا کرتا۔

وأمرهم أن یردوا الصداق: صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ حکم دیا کہ ان کے مہر ان کے مشرک شوہروں کو واپس کردو۔(اس کو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔) لیکن علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شوہر ان کی طلب میں آئیں اور انہوں نے ان عورتوں کو ان کے مہر حوالے کیے تھے۔بصورت دیگر ان کو کچھ واپس نہ کرو۔اھ یہ خلاف مذہب ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کفار نے صلح میں یہ شرط عائد کی کہ ان میں سے جو آدمی مسلمان ہو کر آئے گا اس کو ان کی طرف واپس کر دیا جائے گا یہ شرط باطل ہوگی، اس کو پورا کرنا واجب نہیں ہے اور مسلمان کو واپس نہیں کر دیا جائے گا۔اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے۔اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مردوں کی واپسی کی حد تک ایفائے عہد ہوگا عورتوں کے بارے میں ایفائے عہد نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام حدیبیہ میں کیا۔اور اگر اس طرح کی شرط عورتوں میں لگائی تو ان کو واپس کرنا جائز نہیں ہے اور ان کے نکاح کے فسخ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

اگر اس کو اس کے حربی شوہر نے طلب کیا تو کیا اس کو دے دیا جائے گا؟ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ ان کو ان کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔یہی قول ہمارا، امام مالک اور امام احمد کا بھی ہے۔اور ایک قول میں ان کو دے

دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:: **فان علمتموهن مؤمنات فلا ترجعوهن الى الكفار** ﴾[الممتحنة ۔ ۱۰] اور نسخ کی یہی دلیل مردوں کے حق میں بھی ہے۔ اس لئے کہ اس معاملے میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان کو ان کی طرف واپس کرنے میں زیادہ فساد ہے۔ اور جب یہ مشروع ہوا تھا تو اس وقت جس قوم میں سے کوئی مسلمان ہوتا تھا کفار قید، گالی اور اہانت سے زیادہ مبالغہ نہیں کرتے تھے۔ اور نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ میں مستضعفین کا ایک گروہ تھا جیسا کہ ابوبصیر، اور ابوجندل بن سہیل بن عمرو تقریباً ستر آدمی تھے۔ انہوں نے ان میں زیادہ مبالغہ سے کام نہیں لیا کیونکہ وہ ان کے خاندان تھے۔ لیکن آج کل اس کے خلاف ہے۔

اور تفسیر ''مدارک'' میں اس ارشار باری تعالیٰ کے تحت لکھا ہے: [**واسألوا ما أنفقتم**] کہ یہ منسوخ ہے۔ لہٰذا نہ ہم سے اور نہ ان سے مہر کا سوال باقی رہا۔ اس قول **ولا جناح عليكم ان تنكحوهنّ** امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ ہجرت کرنے والی عورت پر کوئی عدت نہیں ہے۔ اور ''المعالم'' میں اس قول میں اختلاف نقل کیا ہے کہ مہر واجب تھا یا مندوب تھا۔ اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ کیا آج کل مال کے واپس کرنے پر عمل کیا جائے گا۔ جب معاقدۂ کفار میں یہ شرط لگائی گئی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ واجب نہیں ہے۔ اور ان کا زعم ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ عطاء مجاہد اور قتادہ کا قول یہی ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔ **قوله: فجاءه ابو بصير رجل من قريش وهو مسلم...... وانى القتول**: مؤلف کتاب فرماتے ہیں کہ اس کا نام عتبہ بن اسید ہیں، ثقفی ہے۔ قدیم اسلام تھے۔ اور صحبت اختیار کی۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے عہد میں وفات پائی۔

والله انى لأرئى : ہمزہ کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں طرح درست ہے:

أرنى: راء کے سکون کے ساتھ، اس کو ساکن کرنا اور ''اختلاس'' کے ساتھ پڑھنا یہ بھی درست ہے

''**حتى برد**'' اس معنی یہ ہے کہ اس کی زندگی کی حرکت اور حرارت رک گئی۔ یہاں پر لازم کا اطلاق ملزوم پر کیا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''**برده فلانٌ**'' اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی کسی کو ''علی سبیل النکایہ'' قتل کرے۔ اس لئے کہ برودت موت کے توابع اور لوازمات میں سے ہے۔ اور اسی سے ''**السُّيوف البوارد**'' ہے۔

''**لقد رأى هٰذا زعدًا؟**'': اس کو بعض شراح نے ذکر کیا ہے۔ اس کو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور القاموس میں ہے کہ ''**الزعر**'' ضمہ کے ساتھ خوف کو کہتے ہیں۔ اور فتح کے ساتھ ''تخویف'' کے معنی میں ہے۔ لیکن تمام معانی یہاں پر صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن نسخوں میں بالضم ہے۔ **قتل** صیغہ مجہول کے ساتھ ہے

قوله: فقال النبى صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم...... **الالحق بأبى بصير**: ''**ويل آمه**'': نصب کے ساتھ مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ ابتداء کی بناء پر اور خبر محذوف ہے۔ اور اس کا معنی غم، مشقت اور ہلاکت ہے۔ اور بسا اوقات یہ تعجب کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور یہی معنی یہاں پر مراد ہے۔ جیسا کہ النہایہ میں ہے۔

''**مسعر حرب**'' ''**مسعر**'' میم کے کسرہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ منصوب بھی ہے اور مرفوع بھی ہے **أى هو من يحمى الحرب ويهيج القتال**۔

''لو كان له أحدٌ'': کہ کاش ابوبصیر کا کوئی ہوتا جو اس کی مدد کرتا اور اس کی اعانت کرتا۔اور بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ اگر کوئی ہوتا جو اس کو بتاتا کہ وہ میری طرف واپس نہیں آئے گا یہاں تک کہ میں خود اس کو ان کی طرف واپس نہ لوٹاؤں۔اور یہی معنی اس حدیث کے سیاق کے زیادہ مناسب ہے۔اور ''مسعر'' کا اصل ''مسعار'' ہے۔لوہے کے اس آلہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے آگ کو بھڑکایا جاتا ہے کہا جاتا ہے: ''سعرت النار والحرب'' جب ان دونوں (آگ اور جنگ) کو خوب بھڑکایا جائے تو اس وقت یہ جملہ بولتے ہیں۔''حرب'' کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنے کیلئے یہ تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جنگ کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی اس شخص کی طرح جو تنور کو بھڑکاتا ہے۔یعنی تنور کی آگ کو اور اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: ''حمي الوطيس'' ''تنور'' اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گول پتھر ہیں جو اس قدر گرم ہو جائیں کہ کوئی ان کو روندنے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔اور ''حمي الوطيس'' کنایہ ہے گھمسان کی جنگ سے اور یہ کلام فصیح ہے۔اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہ کلام کسی سے نہیں سنا گیا۔اس کو ''النہایہ'' میں ذکر کیا ہے۔

عرف انه سيرده: قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو اس بات سے پہچان لیا: ''**مسعر حرب لو كان له احدٌ**'' اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ اس کو پناہ دیں گے اور نہ ہی اس کی اعانت کریں گے۔اور اس کی خلاصی اس سے اس طرح ممکن ہوتی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر مخالفین پر غالب آئے۔یعنی ساحل سمندر پر۔یہ اضافت صرف بیان کیلئے ہے۔اس لئے کہ ''سیف'' سمندر کے ساحل کو کہتے ہیں یا یہ ''تجرید'' پر محمول ہے۔**قوله: حتى اجتمعت منهم عصابة الخ:**

''**عصابة**'': ایک مضبوط گروہ اور جماعت کو کہتے ہیں۔

''**بعير**'': باء حرف جر ہے، اور عین پر کسرہ ہے۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''عیر'' لدے ہوئے اونٹ کو کہتے ہیں۔اور اس کا معنی ''قافلہ'' ہے۔

''**تنا شده الله والرحم**'': یہ دونوں لفظ منصوب بنزع الخافض ہیں قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قسم دیتے۔النہایہ میں ہے: ''**نشدتك الله انشدك الله، ناشدت الله**'' میں تم سے سوال کرتا ہوں۔اور تم کو قسم دیتا ہوں اور یہ دو مفعول کی طرف متعدی ہے۔یا تو اس لئے کہ یہ بمنزلہ ''دعوة'' ہے۔جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ''**نشدتك الله بالله**'' یا یہ ''ذکرت'' کے معنیٰ کو متضمن ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''لما'' میں روایت تشدید میم کے ساتھ ہے۔اور یہ ''الا'' کی جگہ پر ہے۔جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ [الطارق۔۴] اور عرب بھی اس حرف کو اپنے کلام میں اس طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح کہ حدیث میں استعمال ہے۔جب وہ مطالبہ میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔گویا کہ وہ مسئول سے صرف اسی ایک چیز کا اہتمام کرنا مانگتے ہیں۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''فمن اتاه'' کی فاء شرط محذوف کا جواب ہے اور عبارت اس طرح ہوگی: ''**أرسلت قريش ما تطلب منه شيئاً الا ردهم الى المدينة فاذا فعلت ذلك فمن أتاه من مكة مسلمابعد فهو آمن من الرد الى قريش**'' پس اس کے بعد مکہ سے جو مسلمان ہو کر آئے گا وہ قریش کی طرف واپس کئے جانے سے مامون ہوگا۔چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے ابو بصیر وغیرہ کی طرف پیغام بھیجا اور ان کو مدینہ طلب کیا۔

۴۰۴۳: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ صَالَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْمُشْرِكِيْنَ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ عَلٰى اَنَّ مَنْ اَتَاهُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ رَدَّهُ اِلَيْهِمْ وَمَنْ اَتَاهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ لَمْ يَرُدُّوْهُ وَعَلٰى اَنْ يَدْخُلَهَا مِنْ قَابِلٍ وَيُقِيْمُ بِهَا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَلَا يَدْخُلَهَا اِلَّا بِجُلُبَّانِ السَّلَاحِ وَالسَّيْفِ وَالْقَوْسِ وَنَحْوِهِ فَجَاءَ اَبُوْ جُنْدَلٍ يَحْجُلُ فِيْ قُيُوْدِهٖ فَرَدَّهُ اِلَيْهِمْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥ كتاب الصلح، باب كيف يكتب هذا ما صالح فلان، الحديث رقم (٢٧٠٠ - ٢٦٩٨) و مسلم فی ٣ / ١٤١٠، الحديث رقم (٩٢ / ١٧٨٣) وأبو داود فى السنن ٢ / ٤١٥ الحديث رقم ١٨٣٢

ترجمہ: ''اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین سے تین باتوں پر صلح کی تھی: اوّل تو یہ کہ (مکہ کے) مشرکین میں سے جو شخص (مسلمان ہو کر) آپ ﷺ کے پاس آئے گا آپ ﷺ اس کو ان کے پاس لوٹا دیں گے اور مسلمانوں میں سے جو شخص مشرکین کے پاس آئے گا اس کو مشرکین واپس نہیں لوٹائیں گے، دوم یہ کہ آپ ﷺ (حج وعمرہ کے لئے اس سال مکہ میں داخل نہ ہوں بلکہ) آئندہ سال تشریف لائیں اور صرف تین دن مکہ میں قیام کریں اور سوم یہ کہ (آئندہ سال) مکہ میں جب داخل ہوں تو اپنے تمام ہتھیار، تلوار، کمان اور اسی طرح کی دوسری چیزیں نیام میں رکھ کر لائیں۔ اس موقع پر ابو جندلؓ آپ ﷺ کے پاس اس حال میں پہنچے کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں (جن کی وجہ سے وہ کود کود کر چل رہے تھے) لیکن آپ ﷺ نے ان کو (اس معاہدہ کی بناء پر) مشرکین کے پاس واپس بھیج دیا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: صالح النبی ﷺ المشرکین۔۔۔والقوس ونحوه:

''ثلاثة اشياء'' اشیاء سے مراد شرائط بھی ہو سکتی ہیں اور خصلتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں

''جلبان'': چمڑے کا تھیلا ہوتا ہے جس میں تلوار میان میں ڈلی ہوئی کوڑا اور آلات (سامان حرب) رکھے جاتے ہیں اور اس کو کجاوے کے پچھلے حصہ کے ساتھ لٹکایا جاتا ہے۔ مراد اس سے یہ کہ اسلحہ کی تشہیر نہیں کریں گے بلکہ بغیر تشہیر اسلحہ کے آئیں گے جیسا کہ قہر وغلبہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور عرب کی عادت تھی کہ وہ اسلحہ کو امن اور جنگ دونوں زمانے میں پاس ہی رکھتے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مکہ میں اس حال میں داخل نہیں ہوں گے کہ ان کا اسلحہ کھلا ہوا ہو۔ گویا کہ لڑائی کیلئے تیار ہیں اور یہ شرط اس لئے لگائی تا کہ یہ سلامتی کی علامت ہو۔ کسی کو یہ خیال نہیں ہوگا کہ وہ مکہ میں بزور داخل ہوئے ہیں۔ ان شرائط کو قبول کرنا مسلمانوں کے حال کی کمزوری کی وجہ سے تھا اور اس وجہ سے کہ وہ کفار کے مقابلے سے عاجز تھے۔ اھ

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صلح میں یہ شرط لگانا فاسد ہے کہ مسلمان کو کافر کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اس سے صلح بھی فاسد جائے گی الا یہ کہ جب مسلمان ضعف ظاہری میں ہوں اور اسی کمزوری کی وجہ سے آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں اس شرط کو

قبول کرلیا۔اھ لیکن یہ بات غلط ہے۔اس لئے کہ اس دن مسلمان کمزور نہیں تھے کیونکہ اس روز مسلمان دو ہزار کے لگ بھگ تھے۔اور بدر میں یہ اس وقت غالب تھے جبکہ ان کی تعداد ۳۱۳ تھی۔اور اب تو وہ دو ہزار تھے۔بلکہ صلح اس لئے تھی کہ وہ احرام اور حرم میں تھے۔اور وہاں ان کو قتال کی اجازت نہیں تھی۔اور اس لئے بھی کہ آپ ﷺ نے اس میں حکمتوں اور مصلحتوں کو دیکھا۔جن میں سے ایک حکمت کا بیان اس آیت میں ہے: ﴿ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ …… ﴾[الفتح: ۲۵] ''اور اگر ایسے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم جانتے نہ تھے کہ اگر تم ان کو پامال کر دیتے تو تم کو ان کی طرف سے بیخبری میں نقصان پہنچ جاتا (تو ابھی تمہارے ہاتھ سے فتح ہو جاتی مگر تاخیر) اس لئے (ہوئی) کہ خدا اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے اور اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے تو جو ان میں کافر تھے ان کو ہم دکھ دینے والا عذاب دیتے''۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دشمن نے مسلمانوں کا محاصرہ کرلیا اور مال پر صلح کا مطالبہ کیا کہ مسلمان ان کو مال دیں گے تو امام المسلمین کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔کیونکہ اس میں مسلمانوں کو گھٹیا چیز دینی پڑ رہی ہے اور اسی وجہ سے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا تھا جبکہ وہ صلح سے الگ تھے۔:الیس بر سول اللّٰہ؟''تو ابوبکرؓ نے فرمایا: کیوں نہیں۔پھر عمرؓ نے کہا تو پھر ہم اپنے دین کے سلسلہ میں گھٹا بات کیوں برداشت کریں؟ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ''الزم غرزه'' کہ رسول اللہ کی اطاعت کرو۔میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔اس کو ابن اسحاق نے ''السّیر''میں ذکر کیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے:''لیس للقهو من ان یذل نفسه''مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے چنانچہ عزت ایمان کا خاصہ ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾[المنافقون۔۸] مگر جب امام کو اپنے نفس اور مسلمانوں کی ہلاکت کا خدشہ ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔اس لئے کہ نبی ﷺ نے خندق کے موقع پر جب دیکھا کہ مسلمان سخت مصیبت و آزمائش میں ہیں تو آپ ﷺ نے عینیہ بن حصن فزاری، اور حارث بن عوف بن ابی حارثہ مزنی کی طرف پیغام بھیجا۔یہ دونوں بنو غطفان کے سردار تھے۔اور ان کو مدینہ کے پھلوں کا دو ثلث دینے کا وعدہ کیا۔اس شرط پر کہ وہ اپنے ہمراہ آئے ہوئے لوگوں سمیت واپس لوٹ جائیں ان میں صلح کی بات چل پڑی یہاں تک کہ انہوں نے صلح نامہ لکھ لیا۔لیکن اس پر ابھی تک نہ گواہیاں ہوئی تھیں اور نہ ہی پکی صلح ہوئی تھی۔جب نبی ﷺ نے یہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کی طرف پیغام بھیجا۔اور یہ معاملہ ان کے سامنے ذکر کیا۔آپ ﷺ نے دونوں سے مشورہ طلب کیا تو دونوں بولے کہ اے رسول اللہ! کیا یہ آپ کی چاہت ہے کہ آپ یہ معاملہ کرنا چاہتے ہیں یا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ جس کا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری خاطر یہ کر رہا ہوں۔اللہ کی قسم میں نہ کرتا۔مگر میں نے دیکھا کہ اہل عرب ایک تیر سے تم کو مارنا چاہتے ہیں اور تم سے کھلم کھلا دشمنی پر اتر آئے ہیں تو میں نے ارادہ کیا کہ ان کی قوت کو تمہارے سے کسی نہ کسی درجہ میں توڑوں۔اس پر سعد بن معاذؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول جب ہم اور یہ لوگ شرک پر تھے، ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے نہ ہم اللہ کی عبادت کرتے تھے اور نہ اس کو پہچانتے تھے۔تو یہ لوگ ہمارے پھل بیع و شراء کر کے کھاتے تھے ویسے نہیں کھا سکتے تھے۔تو اب جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت دے دی ہے۔اور ہمیں اپنی طرف ہدایت دے دی

ہے اور ہمیں آپ ﷺ کی وجہ سے عزت دی ہے تو پھر بھی ہم ان کو اپنے اموال دیں جبکہ ہمیں اس کی کوئی حاجت بھی نہیں ہے۔ قسم خدا کی ہم ان کو صرف تلوار ہی دیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو تم جانو اور یہ جانے چنانچہ سعد بن عبادہ نے وہ صحیفہ صلح لیا اور اس میں جو کچھ لکھا ہوا تھا اس کو مٹا دیا اور پھر فرمایا وہ ہم سے بھرپور دشمنی کر لیں۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے عاصم بن عمرو بن قتادہ اور اس نے جس کو میں متہم نہیں سمجھتا۔ یہ روایت محمد بن سلمۃ بن عبداللہ عن ابن شہاب الزہری رحمۃ اللہ علیہ نقل کی ہے اھ اور اس مقام کے مناسب تحقیق اس سے پہلے گذر چکی ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات کی ہے کہ اگر آپ کہیں ''لم یردوہ'' مضارع کے ساتھ جزاء لائے ہیں۔ اور اس سے پہلے ماضی کے ساتھ گذری ہے۔ علمائے معانی کے ہاں اس کا کیا فائدہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مہتم بالشان معاملے کو بیان کرنا تھا کہ ان مشرکین میں سے جو مسلمان ہو کر آیا ہے ان کو کفار کی طرف واپس کرنا زیادہ اشد ہے۔ بنسبت مسلمانوں کو ان کے حوالے کرنے کے اھ۔

اور وجہ غرابت یہ ہے کہ ''لم یردوہ'' اگرچہ لفظاً مضارع ہے مگر معنیً ماضی ہے۔ لہٰذا ''لم یردوہ'' اور ''ما ردوہ'' کے معنی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اور ارباب معانی کے ہاں معنی کا اعتبار ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ ماضی مضارع حرف جزاء کے دخول کے بعد مضارع کے معنی میں ہو جاتے ہیں۔

قوله: فجاء ابو جندل یحجل فی قیوره ......:

''**یحجل فی قیوده**'': ''**الحجل**'' اصل میں کوے کی چال کو کہتے ہیں۔

''**فردوه الیهم**'' آپ ﷺ نے ان کو بھی واپس کر دیا تا کہ عہد و شرط میں تخلف لازم نہ آئے

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ پکار پکار کر کہنے لگے کہ اے مسلمانو مجھے مشرکین کی طرف لوٹایا جا رہا ہے۔ وہ مجھے دین کی بابت فتنہ میں ڈال دیں گے نبی ﷺ نے فرمایا اے ابو جندل صبر کرو اور اللہ سے ثواب کی امید رکھو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کیلئے کشادگی و مخرج بنانے والے ہیں۔

صاحب المواہب فرماتے ہیں کہ بخاری کی روایت میں ہے کہ اسی اثناء میں اچانک ابو جندل بن سہیل بن عمرو بن یوسف اپنی بیڑیوں میں مکہ سے نکل کر آئے۔ اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان لا کر پھینک دیا۔ سہیل نے کہا کہ پہلی شرط جس پر میں آپ سے صلح کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کو تم میری طرف واپس لوٹا دو۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تک تو ہم نے معاہدہ نہیں کیا (یعنی معاہدہ سے فارغ نہیں ہوئے) (مطلب یہ کہ یہ شرط تو فیصلہ کے بعد نافذ ہوگی) تو اس نے کہا کہ خدا کی قسم! اگر ایسا ہے تو میں پھر آپ کے ساتھ کبھی بھی کسی بات پر صلح نہیں کروں گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا اس کو میری خاطر پناہ دے دو۔ اس نے کہا کہ میں اس کو پناہ نہیں دے سکتا آپ ﷺ نے کہا کیوں نہیں ایسا کر لو۔ اس نے کہا۔ میں نہیں کرتا۔ مکرز نے کہا کہ ہم اس کو تمہاری خاطر پناہ دیتے ہیں۔ ابو جندل نے کہا اے مسلمانوں! مجھے مشرکین کی طرف واپس کیا جا رہا ہے حالانکہ میں مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ اور تم میری اس تکلیف کو نہیں دیکھتے ہو۔ اور ان لوگوں نے اللہ کے راستے میں مجھے سخت ترین عذاب دیا ہے۔

ابن اسحاق نے یہ زیادت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا اے ابوجندل! صبر کرو، اور ثواب کی امید رکھو۔ اسلئے کہ ہم غداری نہیں کر سکتے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کشادگی اور نکلنے کا راستہ بنائے گا۔ حضرت عمر چل کر اس کے پہلو میں آئے اور کہا کہ صبر کرو۔ اس لئے کہ وہ مشرک ہیں اور ان کا خون کتے کے خون کی طرح ہے۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علماء کرام نے ابوجندل کے اس قصہ میں دو توجیہات کی ہیں۔

پہلی توجیہہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے ''تقیہ'' کو جائز کیا ہے۔ جب اس کو ہلاکت کا خدشہ ہو۔ اور اس کو اختیار دیا ہے کہ وہ دل میں ایمان چھپائے رکھے اور زبان سے اس کے خلاف تکلم کرے اگر اس کیلئے توریہ ممکن نہ ہو۔ ابوجندل کے اسلام کو ہلاکت کی طرف نہیں لوٹایا۔ باوجودیکہ موت سے تقیہ کے ذریعے خلاصی ممکن تھی۔

دوسری توجیہہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو ان کے والد کے حوالے کیا اور غالب گمان یہ تھا کہ وہ اس کو ہلاک نہیں کرے گا۔ اگر وہ اس کو تکلیف دے گا اور اس کو قید کرے گا تو اس قیدی کیلئے تقیہ بھی جائز ہے۔ اور یہ بات کہ ان کے بارے میں فتنہ کا خوف تھا۔ تو یہ اصل میں اللہ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے جس کے ذریعے اپنے بہترین مؤمن بندوں کو آزماتا ہے۔

۴۰۴۴: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ قُرَيْشًا صَا لَحُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَاشْتَرَطُوْا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ مَنْ جَاءَ نَا مِنكُم لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيكُمْ وَمَنْ جَاءَ كُمْ مِنَّا رَدَدْتُمُوْهُ عَلَيْنَا فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَكْتُبُ هٰذَا قَالَ نَعَمْ اِنَّهُ مَنْ ذَهَبَ مِنَّا اِلَيْهِمْ فَاَبْعَدَهُ اللّٰهُ وَمَنْ جَاءَ نَا مِنْهُمْ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ لَهُ فَرَجًا وَمَخْرَجًا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۳ / ۱۴۱۰ كتاب الجهاد والسير' باب' صلح الحديبية الحديث رقم (۹۳ - ۱۷۸٤)

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (مکہ کے) قریش نے نبی کریم ﷺ سے مصالحت کی۔ چنانچہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ شرط منوائی کہ آپ ﷺ میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے گا ہم اس کو واپس نہیں لوٹائیں گے اور ہم میں سے جو شخص آپ ﷺ کے پاس آئے گا آپ ﷺ اس کو ہمارے پاس واپس لوٹائیں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے (اس شرط کو اپنی ملی حمیت و وقار کے منافی اور اصول مصالحت کے تقاضوں سے بعید جان کر) عرض کیا کہ ''یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم ان شرائط کو لکھ دیں (یعنی کیا یہ شرائط آپ ﷺ تسلیم کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں! بات یہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص ان کے پاس جائے گا' تو (ظاہر ہے کہ وہ مرتد ہو کر بھاگے گا اس اعتبار سے) وہ (ایک ایسا) شخص ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہوگا اور ان میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے گا (اس کو اگرچہ اس وقت ہم واپس کر دینے پر مجبور ہوں گے لیکن آخر کار) اللہ تعالیٰ عنقریب اس کے لئے کشادگی اور خلاصی و نجات کا راستہ پیدا کر دے گا''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ان من جاء نارددتموه علینا: طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ کلام شرائط کی حکایت پر مشتمل ہے۔

''لم نرده'' دال کے ضمہ نیز فتحہ کے ساتھ ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''انّه من ذَهَبَ'' ''نعم'' کا بیان ہے بطور استیناف کے۔ یہ ان کے اس انکار انکسب کا جواب ہے اھ انہ میں ضمیر شان ہے اور ''مخرج'' مصدر میمی ہے ''خروج'' کے معنی میں ہے گویا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شرط کو بعید خیال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس شبہ کو رفع کیا۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ کیا آپ اللہ کے برحق نبی نہیں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں۔تو میں نے کہا کہ پھر یہ ذلت کیوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ وہ میرا مددگار ہے۔ میں نے کہا کہ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بہت جلد بیت اللہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیوں نہیں، تو کیا میں نے تم کو یہ کہا تھا کہ ہم اس سال آئیں گے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ پھر فرمایا کہ تم ضرور آؤ گے اور اسکا طواف بھی کرو گے۔ پھر میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے کہا اے ابوبکر کیا وہ اللہ کے برحق نبی نہیں ہیں انہوں نے فرمایا کیوں نہیں میں نے کہا کیا ہم حق پر نہیں ہیں اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں ہے انہوں نے فرمایا کیوں نہیں میں نے کہا پھر یہ ذلت کیوں؟ تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے۔ لہٰذا تم اس کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ اللہ کی قسم یہی حق ہے۔ پھر میں نے کہا کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نہیں بتایا تھا کہ ہم بیت اللہ جا کر اس کا طواف کریں گے؟ وہ بولے کیوں نہیں لیکن کیا تمہیں یہ بتایا تھا کہ ہم اسی سال آئیں گے؟ میں نے کہا نہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ تم ضرور وہاں جا کر طواف کرو گے۔

علماء فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ سوال اور کلام مذکور شکایت کے طور پر نہیں تھا بلکہ حقیقت حال کو معلوم کرنے۔ اور کفار کو ذلیل کرنے پر ابھارنے کیلئے تھا۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت کے بارے میں معلوم ہی ہے کہ وہ حق و باطل کے معاملہ میں کیا موقف رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کے مشابہہ جواب دینا ان کی فضیلت علمی بلندی عرفان کی زیادتی۔ اور مضبوطی کے واضح دلائل میں سے ہے۔ جو ان کے علاوہ کسی میں نہیں تھی۔ (المواهب)

اور اس میں ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور پھر اس کا مفصل جواب بھی جان لیا۔ اور اس جواب میں ایک جملہ بھی تھا ''انی رسول الله لست أعصيه وهو ناصری'' تو اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس سوال کے اعادہ کی کیا گنجائش تھی۔ الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ کے علم کی تحقیق کا امتحان لیا تھا اور اللہ ہی بہترین توفیق والے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کلام ''انی رسول الله ولست أعصيه'' میں واضح دلیل ہے کہ یہ صلح مسلمانوں کے ضعف کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی تھی یا اشارہ تھا جیسا کہ ماقبل میں گذرا ہے: ''حبسها حابس الفيل'' الہام استنباط کے باعث تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مصالح کو دیکھا جو اس صلح کے اتمام پر مترتب ہونے تھے اور جس سے اس صلح کے ثمرات ظاہر ہونے والے تھے۔

سب سے پہلا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو خیبر کی فتح نصیب ہوئی اور مسلمانوں کو اسلحہ اور سواری کے جانوروں کے ذریعہ سے تقویت ملی اور اس کا نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں ظاہر ہوا اور مکہ والے سب مسلمان ہوگئے۔ اور لوگ اللہ تعالیٰ کے دین

میں فوج در فوج داخل ہوئے۔ جبکہ صلح سے پہلے کفار کا مسلمانوں کے ساتھ اختلاط نہیں تھا اور نہ ہی کفار کے ہاں نبی ﷺ کے امور و معاملات ظاہر ہوئے تھے۔ جیسے کے اب ظاہر ہوئے تھے نہ ہی ان کا اختلاط کسی ایسے فرد کے ساتھ تھا جو نبی ﷺ کے معاملات مفصلاً ان کو بتلاتا صلح حدیبیہ ہونے کے بعد کفار کا مسلمانوں کے ساتھ اختلاط ہوا۔ اور وہ مدینہ آنے لگے، مسلمان مکہ جانے لگے اور رکاوٹ کو ختم کر دیا۔ اور اپنے اہل وعیال اور ان اُصدقاء وغیرہ کے ساتھ خلوت کرتے جو ان کے خیر خواہ ہوتے اور ان سے نصیحت حاصل کرتے۔ وہ ان سے نبی ﷺ کے احوال کے بارے میں سنتے۔ اور واضح معجزات بنوت کی واضح علامات کثیرہ آپ ﷺ کے حسن سیرت اور خوبصورت طریقے کے بارے میں سنتے اور بذات خود ان میں سے بہت سی چیزوں کا معائنہ کرتے تو ان کے نفوس ایمان کی طرف مائل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے ان میں سے بہت لوگوں نے اسلام کی طرف جلدی کی۔ اور وہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان اسلام لے آئے۔ اور دوسرے لوگ اسلام کی طرف زیادہ مائل ہونے لگے۔ جب فتح مکہ کا دن آیا تو اس دن سب مسلمان ہو گئے۔ اس وجہ سے کہ ان کا میلان مضبوط ہو گیا تھا۔ اور قریش کے علاوہ دیہات میں رہنے والے باقی عرب تو قریش کے اسلام کا انتظار کر رہے تھے۔ جب قریش مسلمان ہوئے تو دیہات والے بھی سب مسلمان ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ [النصر: ۱۔۲] ''جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح (حاصل ہو گئی) اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں''۔

''المواہب'' میں ہے کہ علماء نے اختلاف کیا ہے کہ کیا مشرکین کے ساتھ صلح میں یہ شرط جائز ہے کہ جو ان میں سے مسلمان ہو کر آئے ان کو ان کی طرف لوٹا دیا جائے گا بعض نے کہا ہے ہاں جائز ہے۔ جیسا کہ اس پر ابو جندل اور ابو بصیر کا قصہ دلالت کر رہا ہے۔ اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جائز نہیں ہے۔ اس قصہ میں مذکور یہ معاملہ منسوخ ہے اور اس کا ناسخ یہ حدیث ہے: ''أنا بریٔ من مسلم بین مشرکین''۔

اور یہی حنفیہ کا قول ہے۔ جبکہ شافعیہ کے نزدیک عاقل، مجنون اور صبی کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ لہٰذا ان دونوں کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ اور بعض شوافع کہتے ہیں کہ اس رد کے جواز کا ضابطہ یہ ہے کہ وہ مسلمان ایسی جگہ ہو کہ اس کے لئے دار الحرب سے ہجرت واجب نہ ہو۔ یہ بات فتح الباری رحمۃ اللہ علیہ میں مذکور ہے۔

مکی بن ابی طالب القیر وانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خط دے کر بھیجا۔ اور سہیل بن عمرو آپ کے پاس روک لیا گیا۔ چنانچہ مشرکین نے عثمان بن عفان کو روک لیا جس سے مسلمانوں کو غصہ آ گیا۔ مغلطای کہتے ہیں کہ قریش نے عثمان کو اپنے پاس روک لیا تو نبی ﷺ کو یہ بات پہنچ گئی کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے ہیں تو آپ ﷺ نے لوگوں کو اس درخت کے نیچے بیعت کی دعوت دی اور موت پر بیعت لی اور بعض نے کہا کہ وہ بیعت اس بات پر تھی کہ وہ بھاگیں گے نہیں۔ نبی ﷺ نے اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر رکھا اور فرمایا کہ یہ حضرت عثمان کی طرف سے ہے۔ اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے دائیں ہاتھ کے بارے میں فرمایا کہ یہ عثمان کی بیعت ہے۔ اور اپنے ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا۔ (الحدیث)۔

جب مشرکین نے اس بیعت کے بارے میں سنا تو وہ خوف زدہ ہو گئے اور حضرت عثمان اور مسلمانوں کی ایک جماعت

کو بھی بھیج دیا۔اور اسی بیعت کے بارے میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ [الفتح۔ ۱۰] اور یہ آیت اتری: [لقد رضی الله عن المؤمنین] حدیبیہ کے مقام پر آپ ﷺ نے دس دن سے کچھ زائد قیام کیا اور بعض نے کہا بیس دن قیام کیا۔اور پھر واپس تشریف لائے بعض لوگوں کے دلوں میں کوئی بات آئی۔اس پر اللہ تعالیٰ نے ''سورۃ فتح'' اتاری۔ان کو تسلی دینے کیلئے اور ان کو اپنی نعمتیں یاد کرانے کیلئے۔کہ: انّا فتحنا لك فتحًا مبینًا۔

حضرت ابن عباسؓ، انسؓ اور براء بن عازبؓ نے فرمایا ہے کہ یہاں پر فتح سے مراد فتح حدیبیہ اور صلح کا وقوع ہے۔بعد اس کے کہ منافقین یہ خیال کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین اپنے اہل کے پاس کبھی بھی واپس نہیں آسکیں گے۔یعنی انہوں نے خیال کیا کہ وہ واپس نہیں ہوں گے بلکہ سب قتل ہو جائیں گے۔اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا﴾ [الفتح۔۱۸] سے مراد صحیح قول کے مطابق فتح خیبر ہے۔اس لئے کہ اس میں مسلمانوں کو بہت زیادہ غنائم مل گئی۔

امام احمد، ابوداؤد اور حاکم نے مجمع بن جاریہ سے حدیث نقل کی ہے کہ ہم حدیبیہ میں حاضر تھے۔جب ہم واپس لوٹنے لگے تو ہم نے رسول اللہ ﷺ کو ''کراع غمیم'' کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔وہاں (پہلے سے) لوگ جمع تھے۔رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ آیت پڑھ کر سنائی۔انّا فتحنا لك فتحًا مبینًا اس پر ایک آدمی نے کہا کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول کیا یہ فتح ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ای والّذی نفسی بیده انّه لفتحٌ ہاں اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، یہ فتح ہے۔

سعید بن منصور نے اسناد صحیح کے ساتھ شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: انّا فتحنا لك فتحًا مبینا سے مراد حدیبیہ ہے۔اور ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے اور انہوں نے بیعت رضوان کی۔اور انہوں نے خیبر کی کھجور کھائی اور روم فارس پر غالب آ گیا اور مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہو گئے۔اور اس آیت اذا جآء نصر اللّٰه والفتح اور اس حدیث ''لا هجرة بعد الفتح'' سے مراد بالاتفاق فتح مکہ ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے اشکال رفع ہو جاتا ہے اور اقوال جمع ہو جاتے ہیں۔والله اعلم بالاحوال۔اور فتح مکہ کا قصہ مشہور ہے ''کتب سیر ومغازی میں لکھا ہوا ہے۔اور خلاف تو اس میں تھا کہ مکہ عنوۃً فتح ہوا تھا یا صلحاً فتح ہوا تھا۔اور صحیح قول پہلا ہی ہے۔اس لئے کہ مسلم میں ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کا ذکر کیا کہ رسول اللہ ﷺ آئے یہاں تک کہ مکہ میں داخل ہو گئے۔آپ ﷺ نے حضرت زبیر کو لشکر کے میمنہ و میسرہ میں سے ایک جانب کو بھیجا۔اور خالد ابن الولید کو دوسری جانب بھیج دیا۔اور ابوعبیدہ کو لشکر کے ایک حصہ ''کتیبہ'' پر بھیجا۔اور رسول اللہ ﷺ لشکر کے ایک بڑے حصہ میں تھے۔حضرت ابوہریرۃ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میری طرف دیکھا، اور فرمایا اے ابوہریرہ تو میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔آپ ﷺ نے فرمایا۔''احقف لی بالانصار فلا یأتینی الاّ أنصاری'' میرے پاس انصار کو بلاؤ۔اور انصار کے علاوہ کوئی میرے پاس نہ آئے۔تو میں نے ان کو آواز دے کر بلایا۔چنانچہ وہ سب آئے رسول اللہ ﷺ کے اردگرد جمع ہو گئے۔اور قریش کے کمینے لوگ کودنے لگے آپ ﷺ نے انصار سے کہا'' کہ کیا تم قریش کے کمینوں اور ان کے پیکاروں کو نہیں دیکھ رہے ہو''۔پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارا۔اور فرمایا کہ

ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دو یہاں تک کہ تم مجھے صفا پر ملو' ابو ہریرہ ہیں کہ ہم چلے ہم میں سے کسی نے کسی کو قتل کرنا نہیں چاہا مگر اس کو قتل کر دیا۔ یہ طویل حدیث ہے۔ مغانم میں یہ حدیث اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

۴۰۴۵: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ فِيْ بَيْعَةِ النِّسَاءِ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَانَ يَمْتَحِنُهُنَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَاجَآءَ كَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ فَمَنْ اَقَرَّتْ بِهٰذَا الشَّرْطِ مِنْهُنَّ قَالَ لَهَا قَدْ بَايَعْتُكِ كَلَامًا يُكَلِّمُهَا بِهٖ وَاللّٰهِ مَا مَسَّتْ يَدُهٗ يَدَا مْرَاَةٍ قَطُّ فِي الْمُبَايَعَةِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥ / ٣١٢ كتاب الشروط' باب ما يجوز من الشروط فى الاسلام' الحديث رقم ٢٧١٣ و مسلم فى صحيحه ٣ / ١٤٨٩' الحديث رقم (٨٨ ـ ١٨٦٦)

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی بیعت کے بارے میں فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان عورتوں کو (جو مکہ سے آتیں اور قبولیت اسلام کا اظہار کرتیں) اس آیت کریمہ کی روشنی میں پرکھتے تھے :یَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَ كَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ اے نبی! جب مؤمن عورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کے لئے حاضر ہوں ......''۔ چنانچہ ان میں سے جو عورت اس آیت میں مذکورہ شرائط کو ماننے کا اقرار کرتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرماتے کہ ''میں نے تم سے بیعت لے لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان عورتوں سے صرف زبانی طور پر بیعت لیتے مگر اللہ کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کرنے کے دوران کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''وعن عائشة رضى الله عنها ''قالت فى بيعة النسآء ......''

یعنی اس کے سبب اور ان کی بیعت کی کیفیت کے بارے میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مؤمن عورتوں کا امتحان لیتے تھے۔ یا اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو مکہ سے صلح حدیبیہ میں آئی تھیں۔ کیونکہ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے:[**يايها الّذين اٰمنوا اذا جآء كم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهنّ**] امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکلیں وہ آزاد تھیں ان کے گھر والے رسول اللہ کے پاس آئے اور سوال کیا کہ اس عورت کو ان کے اہل کی طرف واپس کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت اتاری:[**اذا جآئكم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن اَللّٰه أعلم بايمانهنّ**] حضرت عروہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا امتحان اس آیت سے لیتے تھے:[**يايها النبى ﷺ اذاجآء ك المؤمنات يبايعنك على ان لا يشركن بالله شيئاً ولا يسرقن ولا يزنين ولا يقتلن اولادهنّ ولا يأتين ببهتان يفترينه بين ايديهن وارجلهن ولا يعصينك فى معروف فبايعهن واستغفرلهن الله انّ الله غفور رحيم**] جو عورت ان شرائط کے مجموعہ کا اعتراف کر لیتی اور اس کو قبول کر لیتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرما دیتے کہ میں تمہارے ساتھ بیعت کر رہا ہوں۔

''**كلامًا**'': یہ منصوب ہے۔ کیونکہ یہ مصدر من غیر لفظہ ہے۔

''**يكلمها**'': یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یا صفۃ مؤکدۃ ہے۔ تاکہ اس وہم کا دفع ہو جائے۔ مطلب یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس عورت سے بات کرتے جو اس کلام کا اقرار کرتی۔ اور اس کا عقد کرتے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ''كلامًا'' حال ہونے کی بناء پر منصوب

ہے۔مفعول۔حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عورتوں کے ساتھ بیعت صرف کلام کے ساتھ ہوتی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھوں پر ہاتھ نہیں رکھتے تھے۔اور اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بیعت میں آپؐ کے ہاتھ نے کبھی بھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔یہ احتراز ہے بیعت کے علاوہ کی حالت میں اپنی محارم عورتوں سے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ صرف قولاً بیعت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ عمرہ کی ادائیگی کیلئے آئے یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم "حدیبیہ" کے مقام پر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرکین مکہ نے اس پر صلح کہ اہل مکہ میں سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو وہ اس کو مشرکین کی طرف لوٹادیں گے۔اور جو صحابی رسول اہل مکہ کے پاس آئیں گے ان کو واپس نہیں کیا جائے گا۔اور اس پر انہوں نے معاہدہ لکھا اور اس پر مہر لگائی۔اس کتابت کے بعد سبیعہ بنت حارث اسلمیہ مسلمان ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو ان کا شوہر مسافر جو بنو مخزوم سے تھا آیا۔ اور مقاتل کا بیان ہے کہ صیفی ابن الواہب ان کی تلاش میں آیا تھا وہ کافر تھا۔اور کہا کہ اے محمد! مجھے میری بیوی واپس کردو۔اس لئے کہ تم نے یہ شرط لگائی ہے کہ جو ہم میں سے آئے گا وہ ہمیں واپس لوٹایا جائے گا۔اور یہ ابھی ابھی لکھا گیا ہے اس کی کتابت کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ [الممتحنة:۱۰] "مومنو جب تمہارے پاس مومن عورتیں وطن چھوڑ کر آئیں تو ان کی آزمائش کرلو۔(اور) خدا تو ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے سو اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں تو ان کو کفار کے پاس واپس نہ بھیجو کہ نہ یہ ان کو حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز۔اور جو کچھ انہوں نے (ان پر) خرچ کیا ہو وہ ان کو دے دو اور تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو مہر دے کر ان سے نکاح کرلو اور کافر عورتوں کی ناموس کو قبضے میں نہ رکھو (یعنی کفار کو) واپس دے دو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہو ان سے طلب کرلو اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کرلیں یہ خدا کا حکم ہے جو تم میں فیصلہ کیے دیتا ہے اور خدا جاننے والا حکمت والا ہے۔"یعنی دار الاسلام سے ہجرت کر کے آئی ہو۔اس پر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس کا امتحان یہ تھا کہ کہیں وہ بغض زوج کی وجہ سے نہ نکلی ہو کسی مسلمان کے ساتھ عشق نہ ہو' کسی زمین میں رغبت نہ ہو نہ کسی حادثہ کی وجہ سے اور نہ ہی خواہش دنیا کی وجہ سے۔ بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اسلام میں رغبت کی وجہ سے نکلی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اس پر حلف لیا چنانچہ اس نے حلف اٹھا لیا اس کو مشرکین کی طرف نہیں لوٹایا اور ان کے شوہر کو اس کا مہر اور جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا تھا وہ لوٹا دیا جاتا پھر اس کے ساتھ حضرت عمرؓ نے شادی کرلی۔(کذا فی المعالم)

الفصل الثانی:

۴۰۴۶: عَنِ الْمِسْوَرِ وَمَرْوَانَ اَنَّهُمُ اصْطَلَحُوْا عَلٰى وَضْعِ الْحَرْبِ عَشْرَ سِنِيْنَ يَاْمَنُ فِيْهِنَّ النَّاسُ

وَعَلٰی اَنَّ بَیْنَنَا عَیْبَةً مَکْفُوْفَةً وَاَنَّهٗ لَا اِسْلَالَ وَلَا اِغْلَالَ۔ (رواہ ابوداود)

سنن أبی داود' کتاب الجهاد' باب فی صلح العدو' ح ٢٧٦٦۔

ترجمہ: ''حضرت مسور رضی اللہ عنہ اور حضرت مروان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (یعنی قریش مکہ نے) دس سال جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تا کہ ان دنوں میں لوگ امن و امان کے ساتھ رہیں اور لوگ اس دوران آپس میں ہر قسم کی غلط فہمی سے محفوظ رہیں گے اور ایک دوسرے پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے اور نہ ہی (امانت میں) خیانت کریں گے۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: **انهم اصطلحوا۔۔۔یامن فیمن الناس:** بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر صلح کی کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی۔ اور لوگ اس میں امن سے رہیں گے۔ جب اس صلح کے بعد تین سال گذر گئے تو انہوں نے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا۔ اس طور پر کہ انہوں نے خزاعہ کی لڑائی میں بنوبکر کی اعانت کی۔ بنوخزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف تھے۔ اور کسی شخص کے حلیف کے ساتھ لڑائی کرنا اس شخص کے ساتھ لڑائی کے مترادف ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ انہوں نے اس مدت کیلئے صلح کی تھی۔ لیکن مشرکین نے چوتھے سال میں اس کو توڑ دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ جہاد کیا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی عہد شکنی سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جب ''معاہدین'' کی طرف سے خیانت ظاہر ہوگی تو ہم ان کے ساتھ قتال کریں گے۔ اور ہم عہد کو نہیں توڑیں گے جب یہ خلاف ورزی ان کے اتفاق سے ہو۔ اسلئے کہ وہ عہد کو توڑنے والے بن گئے۔ لہٰذا اب اس کے توڑنے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی طرح اگر وہ کسی جماعت پر داخل ہوتے۔ اور ان کے ساتھ عہد ہو۔ اور وہ مسلمانوں کے ساتھ علانیہ قتال کرے۔ تو یہ ان کے حق میں خاص طور پر عہد شکنی ہوگی۔ اور ان کے علاوہ کسی کے حق میں نہیں ہوگی۔ اسلئے کہ سب کا حق تھا۔ لیکن اگر ان کے پاس قوت نہ ہو۔ تو یہ نہ ان کے حق میں نقض ہوگا۔ نہ ان کے علاوہ کے حق میں۔ اور اس لئے ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ سے ابتداء نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے غدر کی ابتداء کی۔ مدت گزرنے سے پہلے۔ تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ قتال کیا اور عہد کو نہیں توڑا بلکہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا۔ ان کو اندھا کر دے۔ یہاں تک کہ ان کو ڈھانپ لیا۔ اور یہی تمام اصحاب سیر اور مغازی نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کو روایت کیا ہے۔ جیسا کہ حدیث ابن اسحاق عن الزہری عن عروۃ بن الزبیر عن مروان بن الحکم والمسور بن مخرمہ کے طریقے سے۔ دونوں کہتے ہیں کہ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی صلح میں موجود تھے۔ ''بنوبکر'' قریش کے عقد میں تھے یہ لوگ اس صلح پر تقریباً سات یا آٹھ مہینے تک رہے۔ (سات آٹھ ماہ گذر چکنے کے بعد) قریش کے حلیف بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا بنوخزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف تھے۔ مکہ کے قریب واقع ''اثیر'' نامی پانی کے ایک گھاٹ پر دھاوا بول دیا قریش بولے یہ رات کا وقت ہے۔ اور ہمیں محمد تو جانتے نہیں اور نہ ہی کوئی اور ہمیں دیکھ رہا ہے۔ انہوں نے بنوبکر کی مدد اسلحہ وغیرہ کے ساتھ کی اور ان کے ساتھ مل کر بنوخزاعہ کے خلاف لڑے۔ عمرو بن سالم رسول اللہ ﷺ کو خبر دینے لئے نکلے۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئے تو یہ اشعار کہے۔

لاهم أني ناشدٌ محمدًا حلف أبينا وابيبه الا تلدا
إنّ قريشًا أخلفوك الموعدا ونقضوا ميثاقك المؤكد
هم بيتونا بالوثير هجدًا فقتلونا ركعًا و سجدًا
فانصر رسول الله نصرًا عتدًا

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نصرت یا عمرو بن سالم'' اے عمرو بن سالم تیری مدد کی جائے گی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا۔ انہوں نے تیاری کی اور اللہ سے دعاء کی کہ قریش کو ان کی خبر سے بے خبر رکھ۔ یہاں تک وہ ان کے شہروں کو ڈھانپ لے۔ موسیٰ بن عقبہ نے بھی اس سے ملتی جلتی روایت ذکر کی ہے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ کیا آپ اور ان کے درمیان مدت نہیں تھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تجھے یہ خبر نہیں پہنچی ہے کہ انہوں نے بنو کعب کے ساتھ کیا کیا۔

اس روایت کو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے میمونہؓ سے ابن ابی شیبہ نے عروۃ سے مرسلاً نقل کیا ہے اور ایک بڑی جماعت سے کتاب المغازی میں مرسلاً روایت کیا ہے۔ جس میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول کیا ہمارے اور ان کے درمیان مدت مقرر نہیں تھی؟ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا: انہوں نے غداری کی ہے، عہد کو توڑا ہے۔ اس لئے میں ان کے ساتھ لڑوں گا۔ (**هذا كلام ابن الهمام**)۔

''المواہب'' میں ہے کہ ان مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان دس سال تک کیلئے صلح ہوئی تھی جیسا کہ کتب سیر میں منقول ہے۔

ابوداؤد نے ابن عمرؓ سے ابونعیم نے عبداللہ بن دینار کی ''مسند'' میں روایت کیا ہے کہ یہ مدت چار سال تھی۔ امام حاکم نے بھی مستدرک میں اسی طرح روایت کیا ہے لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ جو حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے حدیبیہ کے سال اہل مکہ کے ساتھ دس سال کا معاہدہ کیا تھا۔

اس کو بعض شارحین نے محل نظر قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اصحاب مغازی کے ہاں صحیح یہ ہے کہ یہ معاہدہ دو سال کا تھا۔ معتمر بن سلیمان نے اپنے والد سے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ لازم نہیں ہے۔ اس لئے کہ حاصل یہ ہے کہ اہل نقل کا اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ سیرۃ موسیٰ بن عقبہ میں دو سال کا لکھا ہے۔ جس کی تخریج بیہقی نے عروۃ بن زبیر سے مرسلاً کی ہے۔ پھر امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دو سال کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاہدہ دو سال باقی رہا۔ اور اس کے بعد مشرکین نے اس کو خود ہی توڑ دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ان کی طرف خروج کیا تھا اور وہ مدت کہ جس پر عقد صلح ہوا تھا محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ دس سال تھی۔ اور یہی محمد بن اسحاق سے اس کی ''سیرت'' اور سیرت بن ہشام رحمۃ اللہ علیہ میں بغیر تعقب کے مذکور ہے۔

ابوداؤد نے ابن سحاق کی حدیث کو زہری عن عروۃ بن الزبیر عن المسور و مروان کے طریق سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ اصل میں ہے۔ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں فتح مکہ کے قصہ کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔:

''**حدثنا يزيد بن هارون انبانا اسحاق** پھر وہ حدیث بیان کی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں: ''**على وضع**

الحرب عشر سنين يأمن فيها الناس ويكف بعضهم عن بعضٍ'' واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''المغازی'' میں اس طرح روایت کیا ہے: حدثنی ابن ابی سبرة عن اسحاق بن عبدالله بن ابی فروة عن واقد بن عمرو''۔ اور پھر پورے قصہ کو ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ اس پر کہ دس سال تک جنگ بندی ہوگی۔ لہٰذا جو توجیہہ امام بیہقی نے بیان کی ہے وہ بڑی اچھی توجیہہ ہے اور اس سے تعارض بھی رفع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسی کا اعتبار واجب ہے۔ اس لئے کہ سب اس پر متفق ہیں کہ فتح مکہ کا سبب قریش کی عہد شکنی تھی۔ جب انہوں نے بنوخزاعہ کے خلاف دوسروں کی اعانت کی تھی۔ جبکہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف میں داخل ہوئے تھے۔ اور مدۃ صلح کا اختلاف بھی اس طرح رفع ہو جاتا ہے۔ کہ جس نے ''دو سال'' کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ معاہدہ دو سال باقی رہا ہے۔ اور جس نے دس سال کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل معاہدہ دس سال کیلئے ہوا تھا اس میں کوئی منافاۃ نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ چار سال والی روایت کی تطبیق باقی رہ گئی کہ یہ معاہدہ چار سال کا تھا۔ نقض عہد کے سال کو بھی شمار کرلیا ہو۔ (واللہ اعلم)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے ساتھ دس سال کا معاہدہ کیا۔ کیونکہ مسلمان کمزور تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صلح کی مدت زیادہ سے زیادہ دس سال ہے۔ لہٰذا اس پر زیادتی جائز نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے عام اوقات واحوال میں کفار کے ساتھ قتال کا حکم دیا۔ لہٰذا صرف اتنی ہی مدت کا استثناء درست ہے جتنی مدت کا اثناء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ تین سال سے زیادہ وقت تک کیلئے صلح جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صلح اس سے زیادہ تک باقی نہیں اس لئے کہ مشرکین نے چوتھے سال میں اس عہد کو توڑ دیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ لڑائی کی اور فتح حاصل کی لیکن اس قول کا ضعیف ہونا بالکل ظاہر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور اس کی مدت اصل میں امام کی رائے اور حالات کے تقاضوں پر ہے علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مدت عہد کے جواز کا مدت مذکور پر اقتصار کرنا صحیح نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ دس سال سے زیادہ کا معاہدہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ اس معاہدہ کی علت مسلمانوں کی ضرورت یا ان کی مصلحت کا ثبوت تھا۔ تو چنانچہ یہ مصلحت بعض دفعہ اس سے زیادہ وقت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ برخلاف اس صورت کے کہ جب معاہدہ میں یا مدت مقررہ میں مسلمانوں کی خیر اور بھلائی نہ ہو تو وہ معاہدہ سرے سے ہی جائز نہیں ہے۔ اسلئے کہ پھر تو یہ صورۃً اور معنیً ترک جہاد ہے۔ اور اس کو جائز ہی صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ بھی جہاد ہے۔ اور اس کا تحقق تب ہوگا جب اس معاہدہ میں مسلمانوں کی خیر اور بھلائی ہو۔ ورنہ بصورت دیگر یہ مامور بہ کا ترک ہوگا۔ اس مفصل کلام کے بعد وہ ممانعت دفع ہو جاتی ہے جو بعض علماء سے منقول ہے کہ وہ دس سال سے زیادہ مدت کے معاہدہ سے منع کرتے ہیں۔ اور صلح حدیبیہ میں تو بہت زیادہ مصلحتیں تھیں۔ اس لئے کہ جب لوگ آپس میں قریب ہوتے تو جو لوگ اسلام سے دور بھاگتے تھے ان کے سامنے اسلام کے محاسن کھل کر سامنے آگئے۔ اور یہ دور رہنے والے لوگ ان محاسن کو تب ہی سمجھ سکے جب یہ لوگ مسلمانوں کے قریب آئے اور ان میں گھلے ملے (واللہ اعلم) قوله: وعلى ان ابيننا عيبة مكفوفة:

''عيبةٌ'': وہ چیز مثلاً گٹھڑی کہ جس میں کپڑے رکھے جاتے ہیں۔

''مكفوفة'' اى مشددوة ممنوعة بعض نے کہا ہے کہ ایسا سینہ مراد ہے جو خیانت اور دھوکہ سے بالکل صاف ہو عہد جو حسن عہد اور وفائے صلح کے جذبہ سے پر ہو عرب ''عيبة'' کو ''صدر'' سے کنایہ کرتے ہیں اسلئے کہ سینہ میں راز ودیعت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ تھیلے میں کپڑے اور دوسرا سامان محفوظ ہوتا ہے۔ اور آپ یہ بات جانتے ہیں کہ مسلمانوں اور کفار کے سینے ایک دوسرے کے کینے سے خالی نہیں پس اس کی توجیہہ یوں کی جاسکتی ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ فریقین میں قتل وقتال اور لوٹ مار کی جو کیفیت تھی اس کو ترک کر دیا جائے۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا ہم عہد اور شرط کی حفاظت کریں گے۔ اور اس کو نہیں توڑیں گے۔ جیسا کہ ہم تھیلے میں موجود چیزوں کی سختی سے حفاظت کرتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ معاہدہ تصادقہ ہوگا۔ جو دو سچوں کے درمیان ہوتا ہے جو امور میں آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ ان میں ہر فریق دوسرے کیلئے صاحب مشاورت ہوگا۔ اور ایک دوسرے کے راز کی حفاظت کریں گے۔ اس توجیہہ کی نظیر آپ ﷺ کا یہ قول ہے: ''الأنصار كرشي وعيبتي''۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہم پہلے ایک دوسرے کے ساتھ کر چکے ہیں وہ تمام حالات عیبہ مکفوفہ ہوں گے۔ یعنی اس کو ہم میں سے کوئی بھی ظاہر نہیں کرے گا اور نہ کسی سے اس کا تذکرہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: [عفا الله عما سلف]

قوله: وانه لا اسلال ولا فلال:

انه : یہ ضمیر شان ہے ''اسلال'' چپکے سے چوری کرنے کو کہتے ہیں۔ ''اغلال'': اس کا مطلب ''خیانت'' ہے۔

اور معنی یہ ہوگا کہ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کا مال نہ خفیۃً لے گا نہ علانیۃً لے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اسلال تلوار سونتنے کو کہتے ہیں جبکہ ''اغلال'' زرہ پہننے کو کہتے ہیں مطلب یہ کہ ہم اس سے بعض بعض کے ساتھ لڑائی نہیں کریں گے۔

''شرح السنۃ'' میں اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو امن دیں گے۔ لہٰذا وہ ان کے خون، اور مال کے ساتھ نہ جہراً تعرض کریں گے اور نہ سراً۔ اھ

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں پر باقی تمام امور فساد کو چھوڑ کر ''اسلال'' اور ''اغلال'' کو کیوں خاص طور پر ذکر کیا اور یہاں ضمیر شان لانے کا کیا فائدہ ہے؟ جواب جب اس چیز کے دخول کی نفی کر دی جو ان کے درمیان تھی کہ اس کو پھیلائیں گے نہیں۔ بلکہ وہ اس سے دور رہیں گے۔ تو اسکے بعد وہ جملہ کیا جس کا تعلق ظاہر کے ساتھ ہے۔ اور یہاں پر ان دونوں کی تخصیص ''استیعاب'' لئے ہے۔ اس وجہ سے لائے نفی جس کو مکرر ذکر کیا اور اس کی خبر کو نسیاً منسیاً کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴾ [مریم۔ ٦٢] گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے باطن اور ظاہر تمام فسادات سے خالی ہونا چاہئیں۔

۴۰۴۷: وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عِدَّةٍ مِنْ اَبْنَاءِ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :عَنْ اٰبَائِهِمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا اَوِ انْتَقَصَهُ اَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ

طَاقَتِهٖ اَوْ اَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ . (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ٤۳۷' کتاب الخراج والامارة' باب فی تعشیر اهل الذمة' الحدیث رقم ۳۰۵۲۔

ترجمہ: ''اورحضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے صاحبزادوں سے' وہ (صاحبزادے) اپنے آباء سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یاد رکھو! جس شخص نے کسی ذمی شخص پر ظلم کیا یا اس کے حقوق کو پامال کیا اس پر اس کی طاقت واستطاعت سے زائد اس پر جزیہ (ٹیکس) عائد کیا (جیسے کسی ذمی سے اس کی حیثیت واستطاعت سے زیادہ جزیہ لیا یا اس حربی مستامن سے جو دارالاسلام میں تجارت کی غرض سے آیا ہو اس کے مال تجارت میں سے عشر یعنی دسویں حصے سے زیادہ لیا) اور یا اس کی مرضی وخوشنودی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن اس شخص کے خلاف اس ذمی کی طرف سے احتجاج کروں گا''۔(ابوداؤد)

تشریح: ''**ابناء اصحاب رسول اللّٰه**'' اس میں ''**ابناء صحابه**'' یہ احتمال بھی ہے کہ یہ بھی صحابہ ہوں۔اور یہ احتمال کہ یہ تابعین ہوں۔

الا: یہ تنبیہ کے لئے ہے۔

معاهد: ھاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

قوله:''**من ظلم معاهدًا او انتقصه**'' **معاهدًا** سے مراد مستامن یا ذمی ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عیوب بیان کرنا۔اس لئے کہ ''اساس'' میں ''**استقصه**'' اور ''**انتقصه**'' کا ترجمہ ''عابہٗ'' کے ساتھ کیا ہے۔اھ اس کا بُعد کوئی مخفی نہیں ہے اس لئے کہ یہ حقیقت لغویہ کا مخالف ہے۔یہ کوئی ایسا مفہوم نہیں رکھتا کہ شرعی اعتبار سے منہیات کے قبیل میں داخل ہو۔اور ایک نسخہ میں ضاد معجمہ کے ساتھ انتقضہ ہے یعنی نقض اجل ہوتا کید ہے۔''**فأنا حجيجه يوم القيامة**'' میں ''**حجة**'' اصل میں دلیل اور برھان کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے۔''**حاججه حجاجًا ومحاجةً۔ فأنا محاج وحجيج**'' یہ فعیل بمعنیٰ فاعل ہے۔ (کذا فی النہایہ)

۴۰۴۸: وَعَنْ اُمَيْمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ قَالَتْ بَايَعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فِيْ نِسْوَةٍ فَقَالَ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَاَطَقْتُنَّ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَرْحَمُ بِنَا مِنَّا بِاَنْفُسِنَا قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بَايِعْنَا تَعْنِيْ صَافِحْنَا قَالَ اِنَّمَا قَوْلِيْ لِمِائَةِ امْرَاَةٍ كَقَوْلِيْ لِامْرَاَةٍ وَّاحِدَةٍ وَرَوَاهُ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥ / ۳۰۳' الحدیث رقم ۲۶۹۹' و مسلم فی ۳ / ۱٤۰۹' الحدیث رقم (۹۰۔ ۱۷۸۳) والدارمی فی ۲ / ۳۱۰' الحدیث رقم ۲۵۰۷' وأحمد فی المسند ٤ / ۲۹۱۱ موطا لامام مالك' کتاب البیعة' باب ۱' ح ۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کچھ عورتوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے بیعت کی (یعنی ہم چند عورتوں نے اجتماعی طور پر آپ ﷺ سے بیعت کی) چنانچہ (اس وقت) آپ ﷺ نے ہم سے

ارشاد فرمایا کہ (اے خواتین! میں نے تم سے اسی چیز پر بیعت لی ہے) جس پر عمل کرنے کی تم طاقت و استطاعت رکھتی ہو (یعنی آپ ﷺ نے از راہ شفقت ان عورتوں کو ان کی عملی استطاعت و ہمت تک محدود رکھا)۔ میں نے عرض کیا کہ (بے شک اپنی ذات پر ہم خود جتنے مہربان اور رحم دل ہو سکتے ہیں) اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہم پر ہماری جانوں سے بھی زیادہ مہربان ہیں اور پھر میں نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! ہم سے بیعت لیجئے''۔ اس بات سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہم سے مصافحہ کیجئے (یعنی بیعت کرتے وقت ہمارا ہاتھ اپنے دست مبارک میں پکڑیئے)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میرا سو' عورتوں سے کچھ کہنا ایک عورت سے کہہ دینے کی مثل ہے (یعنی اول تو عورتوں کو بیعت کرتے وقت صرف زبان سے کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے تمہیں بیعت کیا ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوم یہ کہ اگر کچھ عورتیں اجتماعی طور پر بیعت ہو رہی ہوں تو زبان سے یہ کہنے کے لئے بھی الگ الگ ہر عورت سے مخاطب ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ صرف ایک عورت سے کہہ دینا سب عورتوں کے لئے کافی ہے)۔''

تشریح: قوله: بایعت النبی ﷺ..... ارحم بنامنا بانفسنا:

''فقال لنا: فیما استطعتنَّ وأطقتن'': یہ (جار مجرور) یہ محذوف کے ساتھ متعلق ہے۔ **ای أبا یعکن فیما استطعتن** یعنی میں تمہارے ساتھ تمہاری استطاعت اور طاقت کے موافق بیعت کرتا ہوں۔ گویا کہ آپ ﷺ نے ان پر شفقت فرمائی اس طور پر کہ بیعت کو ان کی استطاعت کے ساتھ مقید کر دیا۔ (ذکرہ طیبی)

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قید با قاعدہ طور پر تلقین فرمائی بایں طور کہ آپ ان سے یہ فرمایا ہو: قلن: **بایعنا فیما استطعنا ''قلتُ اللّٰہ ورسوله ارحم بنا منا بأنفسنا''** لفظ اللہ کو تزیین کلام کیلئے ذکر فرمایا یا اشارہ ہے کہ رسول کی رحمت بھی دراصل اس اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اثر ہے۔ یا اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن۔۱۶]

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''بنا'' ''ارحم'' کے ساتھ متعلق ہے اور ''بأنفسنا'' اس کی تأکید ہے۔ اھ لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ''بأنفسنا'' کے متعلق ہے جو یہاں رحمت مقدر ہے۔ تقدیری عبارت اس طرح ہے ''**اللّٰہ ورسوله ارحم بنا من رحمتنا بأنفسنا**''۔

قوله: ''قلت یا رسول اللّٰہ بایعنا ......'': اے اللہ کے رسول ہمارے ساتھ بالفعل بھی بیعت جیسا کہ آپ ﷺ نے بالقول بیعت فرمائی ہے۔ بیعت رجال پر قیاس کرتے ہوئے کہ جیسے وہ بیعت ہاتھ اور زبان دونوں کے ساتھ ہوتی ہے

''انما قولی لمائة امرأة کقولی لامرأة واحدةٍ'': خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب اس عورت نے مصافحہ بالید کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ بیعت بالقول کافی ہے اور مصافحہ کی حاجت نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہر عورت کے ساتھ بالقول بیعت کی ضرورت ہے۔ اور دراصل ''**مائة امرأة**'' سے مراد مبالغہ ہے۔ یہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا خلاصہ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے تو اس پر طویل کلام کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ جواب سوال کے کیسے مطابق ہے؟۔ کیونکہ سوال تو یہ تھا کہ ہمارے ساتھ مصافحہ بالید کیجئے اس کا مطالبہ مصافحہ بالید کا تھا جبکہ آپ ﷺ نے جواب مصافحہ باللسان کا دیا۔ اور اس نے تمام کیلئے مصافحہ کا مطالبہ کیا تھا۔ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ سو عورتوں کیلئے کافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ

کہنا ''انما قولی ''ان کے اس قول ''صافحنا'' کی تردید ہے۔

پہلی بات: یہ ہے کہ یہ بیعت قول پر مقصور ہے فعل پر نہیں ہے۔اور دوسری یہ کہ عورتوں کے سامنے میرا آپ کے ساتھ قولاً بیعت کرنا ایسا ہے جیسے میں سب سے کہتا ہوں قولہ: رواہ اصل میں یہاں بیاض ہے۔لیکن ''حاشیہ میرک'' میں ہے کہ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مالک نے موطاء میں ذکر کیا ہے اور ان سب نے یہ حدیث محمد بن المنکد ر کے طریق سے روایت کی ہے کہ انہوں نے یہ حدیث امیمہ سے سنی ہے۔ترمذی نے کہا ہے ''**هٰذا حديث حسنٌ صحيحٌ لا نعرفه الا من حديث ابن المنكدر** ''(ابن الجزری) اور ایک نسخہ کے حاشیہ میں ہے کہ احمدؒ اور ابن حبانؒ نے اس کی تخریج کی ہے۔ترمذی،نسائی اور ابن ماجہ نے اور امام مالک نے اس کو مؤطا میں ذکر کیا ہے۔(واللہ اعلم)

الفصل الثالث:

۴۰۴۹:**عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فِيْ ذِى الْقَعْدَةِ فَاَبٰى اَهْلُ مَكَّةَ اَن يَدَعُوْهُ يَدْخُلُ مَكَّةَ حَتّٰى قَاضَا هُمْ عَلٰى اَنْ يَّدْخَلَ يَعْنِىْ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ يُقِيْمُ بِهَا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَلَمَّا كَتَبُوْا الْكِتَابَ كَتَبُوْا هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا نُقِرُّبِهَا فَلَوْنَعْلَمُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا مَنَعْنَاكَ وَلٰكِنْ اَنْتَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ لِعَلِيِّ بْنِ اَبِىْ طَالِبٍ اُمْحُ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا وَاللّٰهِ لَا اَمْحُوْكَ اَبَدًا فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَلَيْسَ يُحْسِنُ يَكْتُبُ فَكَتَبَ هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ ابْنُ عَبْدِاللّٰهِ لَا يَدْ خُلُ مَكَّةَ بِالسَّلَاحِ اِلَّا السَّيْفَ فِى الْقِرَابِ وَاَنْ لَّا يَخْرُجَ مِنْ اَهْلِهَا بِاَحَدٍ اِنْ اَرَادَ اَنْ يَّتْبَعَهٗ وَاَنْ لَا يَمْنَعُ مِنْ اَصْحَابِهٖ اَحَدًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُقِيْمَ بِهَا فَلَمَّا دَخَلَهَا وَمَضَى الْاَ جَلُ اَتَوْا عَلِيًّا فَقَالُوْا قُلْ لِصَاحِبِكَ اُخْرُجْ عَنَّا فَقَدْ مَضَى الْاَجَلُ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** ۔(متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥ / ٣٠٣‘ كتاب الصلح‘ باب كيف يكتب هذا ما صالح‘ الحديث رقم ٢٦٩٩ و مسلم فى ٣ / ١٤٠٩‘ الحديث رقم (٩٠ ـ ١٧٨٣) والدارمى فى ٢ / ٣١٠ الحديث رقم ٢٥٠٧‘ وأحمد فى المسند ٤ / ٢٩١١

ترجمه:''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ ذی قعدہ (سن ٦ ہجری) میں عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا مگر اہل مکہ نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ آپ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دیں (یعنی انہوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مکہ میں آنے سے روک دیا) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اہل مکہ سے اس بات پر مصالحت کر لی کہ آپ ﷺ (آئندہ سال) مکہ میں تشریف لائیں گے اور اس وقت بھی (صرف) تین دن مکہ میں قیام کریں گے' چنانچہ جب صلح نامہ لکھا گیا تو (آپ ﷺ کی طرف سے) صحابہ رضی اللہ عنہم نے (آپ ﷺ کا اسم گرامی اس طرح لکھا کہ ''یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے مصالحت کی ہے۔اہل

مکہ نے (یہ الفاظ دیکھ کر آپ ﷺ سے) کہا ''ہم اس کو (یعنی تمہاری رسالت کو) تسلیم نہیں کرتے اگر ہمارا یقین یہ ہوتا (یعنی ہمیں اس پر اعتقاد ہوتا) کہ تم اللہ کے رسول ہو تو ہم تمہیں (مکہ میں داخل ہونے سے) نہ روکتے' البتہ (ہم تو صرف اتنا مانتے ہیں کہ) تم محمد ہو جو عبداللہ کے بیٹے ہو' (لہٰذا اس صلح نامہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی بجائے محمد بن عبداللہ لکھو)''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں اللہ کا رسول بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی ہوں (یہ محض تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی ہے ورنہ تم خوب جانتے ہو' میری یہ دونوں صفتیں یعنی اللہ کا رسول ہونا اور محمد بن عبداللہ ہونا آپس میں اس طرح لازم وملزوم ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتیں' لہٰذا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان دونوں کو ذکر کیا جائے یا ایک ہی کو ذکر کر دیا جائے)'' پھر آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا (جو صلح نامہ لکھ رہے تھے) کہ ''رسول اللہ کے لفظ کو مٹا دو''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''خدا کی قسم! میں تو آپ کا نام کبھی بھی نہیں مٹا سکتا''۔ (یہ سن کر) آپ ﷺ نے (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے وہ) صلح نامہ لے لیا اور باوجودیکہ آپ ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن آپ ﷺ نے (رسول اللہ ﷺ کا لفظ مٹا کر) یہ لکھا کہ ''یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے مصالحت کی ہے (اور اس معاہدہ میں یہ شرطیں تھیں کہ) وہ (یعنی آپ ﷺ اور صحابہ) مکہ میں ہتھیاروں کے ساتھ داخل نہیں ہوں گے مگر یہ کہ ان کی تلواریں نیاموں میں ہوں اور یہ کہ اگر اہل مکہ میں سے کوئی شخص آپ ﷺ کے ساتھ جانے کا ارادہ کرے تو اس کو مکہ سے جانے نہیں دیا جائے گا (یعنی جب آپ ﷺ مکہ میں آئیں اور پھر واپس جانے لگیں تو اہل مکہ میں سے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے کر نہ جائیں) اور یہ کہ اگر آپ ﷺ کے صحابہؓ میں سے کوئی شخص مکہ میں رک جانے کا ارادہ کرے تو آپ ﷺ اس کو (مکہ میں ٹھہرنے سے) منع نہیں کریں گے''۔ چنانچہ جب (اگلے سال) آپ ﷺ مکہ میں تشریف لائے اور (مکہ میں ٹھہرنے کی تین دن کی) وہ مدت (جو معاہدۂ صلح میں طے پائی تھی) گزر گئی (یعنی تین دن پورے ہونے کو ہوئے) تو اہل مکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہنے لگے کہ ''تم اپنے سردار (یعنی آپ ﷺ) سے کہو کہ (طے شدہ) مدت پوری ہوگئی ہے اور اب ہمارے شہر سے چلے جاؤ''۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ مکہ سے روانہ ہوگئے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله:اعتمر رسول الله ﷺ في ذي العقدة ...... ثلاثة ايام:**

أن يدعوه: دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی ''ترک''

''يدخل مكة'': یہ مفعول بہ ہے۔ ''ان'' کو حذف کر دیا گیا اور فعل مرفوع رہ گیا۔

يعني من العام المقبل'': یہ راوی کی طرف سے براء بن عازب کے کلام کی تفسیر ہے۔ یعنی براء کی مراد یہ تھی کہ آپ ﷺ اگلے سال آئیں گے۔ ان کے اس جملہ کا مقصد یہ تھا کہ ماقبل کلام سے متعارض نہ ہو جائے۔ براء نے اس کلام کو اس کے واضح ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔

''يقيم بها'': ''یدخل'' کے فاعل سے حال ہے۔

''ثلاثة ايام'': امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس میں دلالت ہے کہ مسافر کے کسی جگہ تین دن تک ٹھہرنے سے اس کا حکم

مقیم کا سا نہیں ہوگا اھ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس میں اس پر نہ نفیاً دلالت ہے اور نہ ہی اثباتاً۔ بلکہ اس کے ظاہر سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ لفظ "یقیم بھا" اسی سلسلہ میں بالکل واضح ہے۔

قوله: فلما كتبوا الكتاب۔۔۔وأنا محمد بن عبد الله:

"**فلما كتبوا الكتاب**": ان کی رضامندی کے ساتھ کاتب حضرت علیؓ مقرر ہوئے تھے۔ اس لئے کتابت کو ان سب کی طرف منسوب کر دیا۔ "**هٰذا**" یہ اشارہ "ما فی الذہن" کی طرف ہے۔ یا اس کی طرف جو خارج میں عنقریب آگے آنے والا ہے۔ یعنی "**ما قاضى عليه محمد رسول الله**"۔

ما قاضى عليه: یہ ما موصولہ ہے "**فقالوا لا نقربها**" یہ قائل سہیل تھا "**ما منعناك**" یہ کلام "**لا نقربها**" کیلئے بمنزلہ کے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اگر یہ کہو کہ "لو" کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ساتھ ماضی کا صیغہ ہو۔ تو یہاں پر مضارع کا صیغہ (لونعلم) لانے کا کیا فائدہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ تاکہ استمرار پر دلالت کرے۔ مطلب یہ کہ ہم نے نہ ماضی میں تمہاری رسالت کا قرار کیا ہے۔ نہ زمانہ حال میں کرتے ہیں اور نہ ہی زمانہ مستقبل میں کریں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ [الحجرات۔ ۷]

اور اس طرح کہا جاتا ہے: "**لو تحسن الی لشركت**" (یہاں پر دونوں جگہوں میں "لو" استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔)

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ حکیمانہ اسلوب ہے۔ یعنی تمہارا یہ کہنا کہ "**محمد رسول الله**" کی بجائے "**انت محمد بن عبدالله**" کہو یہ بتا رہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان جمع صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ رسالت تو دعویٰ اور معجزہ کے اظہار کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اور یہ بات حاصل ہو چکی ہے۔

جیسا کہ پیغمبران دین کا یہ جملہ ہے: [**قالوا ربنا يعلم انا اليكم لمرسلون**] یہ جملہ منکرین کے اس اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا: [**ما آنتم الا بشر مثلنا**] اھ

اور ان کے جواب کا حاصل یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے بیان فرمایا ہے: ﴿إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ [ابراھیم۔ ۱۱] اور اسی بات کی طرف صاحب بردہ نے اس قول میں اشارہ کیا ہے:

فمبلغ العلم فيه انه بشرٌ ☆ وانه خير خلق الله كلهم

ان (محمد ﷺ) کے بارے میں مبلغ علم یہ ہے کہ وہ بشر ہیں اور یہ کہ وہ تمام مخلوقات میں سے بہترین ہیں۔

"**امح رسول الله**": "رسول" نصب کے ساتھ ہے۔ اور اعراب حکائی کی بناء پر مرفوع بھی پڑھا گیا ہے۔ "**لا والله، لا أمحوك**": یہاں مضاف محذوف ہے۔ **أى لا أمحو اسمك**۔

قوله: "وليس يحسن يكتب.....فكتب:

ایک روایت میں "ان یکتب" ہے۔ ان کو حذف کر کے فعل کو رفع دے دیا۔ معطوف معطوف علیہ کے درمیان بطور جملہ معترضہ ہے۔ "**فأخذ الكتاب من يد علىؓ**"

''هذا ما قاضى عليه محمد بن عبد الله'': بخاری کی بعض روایات میں بھی اسی طرح آیا ہے۔''فکتب'' یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابت میں صریح ہے البتہ اس سے بھی کچھ مانع نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ ''کتب'' کا معنی ہے''أمر علیاً ان یکتب'' الا یہ کہ یہ حال مقدر مانا جائے کہ آپ نے اپنا نام محو کرنے کیلئے''معاہدہ'' ان کے ہاتھ سے لیا تھا اور اپنے دست مبارک سے اپنا اسم گرامی مٹایا تھا۔ اسلئے کہ حضرت علیؓ نے ادب کی بناء پر انکار کر دیا اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو کتابت کا حکم دیا۔ یا یہ کہ حضرت علیؓ نے آنحضرت کے اس عمل محو کے بعد لکھا:''هذا ما قاضى عليه محمد بن عبدالله'' اور بظاہر یہ بھی اس معاہدے میں پہلے سے لکھے ہوئے تھے تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس کو ثبت کر دیا: هذا ما قاضى عليه محمد بن عبدالله ۔(واللہ اعلم)

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''وليس يحسن يكتب'' میں دو توجیہات ہیں:

① یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے باب سے ہے: ﴿وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ﴾ [المرسلات۔٣٦]

ترجمہ: ''اى لا كتابة ولا اجادة ولا اعتذار ولا ايذان''۔

② لکھ تو سکتے تھے لیکن اس میں اجادہ اور حسن نہیں تھا۔ اور اسی پر اختلاف واقع ہوا ہے۔

شرح مسلم للنووی رحمۃ اللہ علیہ میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق منقول ہے کہ اس سے بعض لوگوں نے اس مسئلہ میں حجت پکڑی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اور دلیل کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر اس کو جاری کر دیا تھا۔ یا تو کہ قلم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی معاونت سے لکھا' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لکھے ہوئے کو نہیں جانتے تھے۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا سکھا دیا تھا تا کہ معجزہ میں مزید زیادتی ہو جائے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کچھ سکھایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ اور نبوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے والا بنایا۔ حالانکہ قبل النبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ نہیں سکتے تھے۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت''اُمّی'' میں قادح نہیں۔

قائلین نے ان آثار سے بھی دلیل پکڑی ہے جو اس بارے میں امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض سلف سے مروی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک موت نہیں آئی تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنا نہیں سیکھا۔ علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے اور اس کو سمنانی اور ابو ذر وغیرہ سے حکایت کیا ہے۔ لیکن اکثر علماء کا مذہب ہے کہ آپؐ مطلقاً نہیں لکھ سکتے تھے: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ﴾ [العنکبوت۔٤٨]

اور''کتب'' کا معنی ہے''امر بالكتابه''۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:''رجم ما عزا''۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ علماء کا پہلا گروہ اس آیت کے معنی یہ بیان کرتا ہے کہ اگر آپؐ قبل الوحی پڑھ لکھ سکتے ہوتے تو مبطلین اس قرآن میں شک کرتے۔ اور جیسا کہ یہ بات جائز (یعنی ممکن) ہے کہ آپ پڑھ سکتے ہیں۔ تو یہ بھی جائز ہے کہ آپ لکھ سکتے ہیں۔ اور یہ آپ کی صفت''امیت'' میں قادح نہیں ہے۔ اسلئے کہ معجزہ صرف''اُمّی'' ہونا نہیں ہے۔ اسلئے کہ معجزہ کا حصول اس سے ہو رہا ہے کہ پہلے پہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم''اُمّی'' تھے۔ پھر بھی آپ قرآن اور ایسے علوم کو لے آئے جن کو''اُمّی'' جانتے ہی نہیں تھے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے علوم بھی ساتھ لائے ہیں جن کو کوئی بھی عالم نہیں جانتا۔ چنانچہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

''امی'' نہ ہوتے تو تب بھی یہ علوم لانا خود ایک معجزہ تھا۔ اس لئے کہ قرآن تو ڈھیر سارے معجزات پر مشتمل ہے۔ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾[العنکبوت۔۴۹] اھ

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان کے قول کا یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ ''فکتب'' میں اگر ''أمر'' کو محذوف مانیں۔ تو اس میں ظاہر سے عدول لازم آئے گا اور یہاں پر اس عدول کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ قول ''ولیس یحسن ان یکتب فکتب'' اس سلسلہ میں ''نص'' کی مانند ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود لکھا تھا۔ اھ

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے آپ کی یہ کتابت اس آیت کے ہوتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امی ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے باب سے ہو:

وهل انت الا اصبع دميت ☆ وفى سبيل الله مالقيت

اور اس کی مثال یہ آیت بھی ہے: ﴿**وما علمناه الشعر ما ينبغى له**﴾ [یس۔ ۲۹] علماء کہتے ہیں کہ یہ اس جنس کے کلام میں سے ہے جو وزن شعری پر بغیر صنعت کے کہا گیا ہو اور وزن شعری کا قصد نہ ہو۔ اور نہ اس کی طرف کوئی التفات ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تصور تو کیا جا سکتا ہے البتہ اس کا وقوع فعلی کلام سابق میں گذر گیا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں دلیل ہے کہ کتابت مستحب ہے' وثائق، املاک اور مال صدقات وغیرہ کے کے معاملات میں ''**هذا ما اشترى فلانٌ۔ او هذا ما أصدق هذا أعتق وغيره**'' ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کا ظاہر اس کے جواز پر دلالت کر رہا ہے نہ کہ استحباب پر۔ اسلئے کہ اس کتابت کا حکم تو کفار کی طرف سے تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مصالحت کی بناء پر قبول فرمایا تھا۔ لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ اس کے استحباب پر استدلال آیت مداینہ سے کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ﴾[البقرۃ۔۲۸۲] اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ امر وجوب کیلئے ہے یا ندب کیلئے ہے؟ اور جمہور کا مسلک یہی ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی بھی دلیل ہے کہ کسی بھی مشہور نام کے ساتھ یہ کافی ہے کہ اس کے ساتھ اس کے والد کا نام ذکر کیا جائے۔ برخلاف بعض حضرات کے جو کہتے ہیں کہ کہ چار چیزیں لکھنا ضروری ہے: ① نام ② اس کے والد کا نام ③ دادا کا ④ اس کی نسبت۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اصل مدار حصول علم پر ہے اور اس علم کا ترتب شہرت کا پر ہے اور شہرت مدار لوگوں کے اختلاف زمان ومکان کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اصطلاح میں بھی اس میں اختلاف اور تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مثلاً آپ دیکھئے کہ جب محدثین ''عن عبد اللہ'' کہتے ہیں تو اس سے مراد ''عبد اللہ ابن مسعودؓ'' ہوتے ہیں۔ اور جب وہ ''عن الحسن'' ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ''حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ'' ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس نام کے بہت سے صحابہ اور تابعین ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ امام ان شرائط پر صلح کرے جن میں وہ مسلمانوں کیلئے مصلحت سمجھے اگرچہ بعض بادی الرائی لوگوں کو یہ مصلحت اور فائدہ سمجھ نہ آئے۔ اور اسی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے شر کا تحمل جائز جس میں تھوڑا سا نقصان ہو لیکن دفع ضرر کا پہلو زیادہ یا اس میں جلب منفعت بنسبت نقصان کے زیادہ ہو۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "هذا" اشارۃ "مافی الذهن" کی طرف ہے۔ اور "ما قاضی" اس کی خبر ہے۔ جو اس کی تفسیر بھی ہے۔ "لا يدخل مكة" اس تفسیر کی تفسیر ہے۔ اھ۔

وقوله: "لايدخل مكة بالسلاح الا السيف فى القراب"

اس سے مراد جنس اسلحہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں "بسلاحٍ" تنوین تنکیر کے ساتھ ہے۔

"قراب": ای جعبة "نیام"۔ قراب اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس میں تلوار کو رکھا جاتا ہے۔ اور ایک نسخہ صحیحہ میں (فی القراب کے بجائے) "بالقراب" ہے۔ اس میں باء ظرفیت کیلئے ہے۔

قوله: "وأن لا يخرج من اهلها بأحدٍ......" فصل ثانی کی پہلی حدیث میں یہ شرط نہیں تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شرائط تین سے زائد تھیں۔ جیسا کہ "حدیث براء" میں گذرا ہے اس کو حمل کیا جائیگا۔ اصل شروط تین ہی تھیں "ومضى الأجل" کا معنی یہ ہے کہ جب انقضاء اجل کا وقت قریب آیا۔ یا أصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُجل کے قریب پہنچ گئے۔ جیسا کہ اللہ کا یہ قول ہے: ﴿ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ [البقرة۔ ۲۳۱] یہ تاویل ضروری ہے تاکہ عدم وفاء بالشرط لازم نہ آئے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مشرکین مکہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قیام ناپسند تھا۔ اور یہ بات انہوں نے مدت پوری ہونے سے پہلے کہی تھی۔ اھ اور ممکن ہے کہ یہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شان وشوکت اور غلبہ کے خوف سے کہی ہو۔ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مین یہ اضافہ روایت کیا ہے: "فتبعته ابنة حمزه تنادى يا عمّ يا عمّ" اس دن علیؓ کے پیچھے حضرت حمزہؓ کی بیٹی پکارنے لگی۔ اے چچا جان اے چچا جان! تو حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ اس کو لے لو۔ تیرے چچا کی بیٹی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو اٹھا لیا۔ اس بچی کے بارے میں حضرت علیؓ، زید اور حضرت جعفر کا تنازعہ ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اس کو میں لوں گا اس لئے کہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت جعفر نے کہا کہ میرے چچا کی بیٹی بھی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں بھی ہے۔ حضرت زید نے فرمایا کہ میری بھتیجی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خالہ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور فرمایا: "الخالة بمنزلة الأم" خالہ ماں کی جگہ پر ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچی کو ساتھ لے جانے پر کسی قسم کا انکار نہیں فرمایا۔ حالانکہ مشرکین کے ساتھ یہ شرط لگائی تھی کہ مکہ سے کسی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے نہیں۔

عمرۃ القضاء کے احوال جس طرح "المواہب" میں مجملاً بیان کئے ہیں اسی طرح حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے "الاکلیل" میں ذکر کئے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ احادیث اس پر متواتر ہیں کہ جب ۷ھ ہجری کو ذوالقعدہ کا ہلال طلوع ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ اس عمرہ کی قضاء کریں جس سے ان کو مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر روکا تھا۔ اور جو بھی حدیبیہ میں شریک ہوا ہے وہ اس عمرہ قضاء سے پیچھے نہ رہے۔ چنانچہ کوئی بھی پیچھے نہیں رہا مگر جو لوگ فوت ہو گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ دو ہزار صحابہ روانہ ہوئے اور آپ نے ابوذر غفاری کو مدینہ میں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ ۶۰ (ساٹھ) اونٹ، تلوار، زرہیں اور نیزے وغیرہ لے کر گئے تھے۔ اور سو (۱۰۰) شہسواروں کو آگے بھیجا۔ جب ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گھوڑا آیا۔ جس پر محمد بن سلمہ سوار تھے اور اسلحہ کو آگے کیا۔ اور اس پر بشر بن سعد کو عامل مقرر کیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام

باندھا اور تلبیہ شروع کی۔ تو مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تلبیہ پڑھنے لگے۔ اور محمد بن سلمہ لشکر کے ہمراہ ''مرظہران'' نامی جگہ پر پہنچ گئے تو وہاں پر قریش کی ایک جماعت کو پایا۔ انہوں نے ان سے پوچھا تو محمد بن سلمہ نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' کل صبح ان شاء اللہ اس مقام پر قیام کریں گے۔ وہ جماعت قریش کے پاس آئی اور ان کو اس کے بارے میں خبر دی تو وہ خوف زدہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرظہران میں پڑاؤ ڈالا۔ اور اسلحہ کو ''بطن یاجج'' لے گئے۔ یہ مکہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دوسو آدمیوں کے لشکر میں اوس بن خولی الأنصاری تھے۔ قریش مکہ سے نکل کر پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف نکل آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ''ہدی'' کو آگے کر دیا۔ مقام ''ذی طوی'' میں ان کو روک دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری ''قصواء'' پر نکلے تھے مسلمانوں نے تلواریں لی ہوئی تھیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تلبیہ پڑھتے جا رہے تھے۔ اس ''ثنیہ'' سے داخل ہوئے۔ جس پر ''حجاج'' جھانکتے ہیں۔ ابن رواحہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کی لگام پکڑی ہوئی تھی۔

شمائل ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے کہ ابن رواحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چلتے ہوئے یہ اشعار کہہ رہے تھے:

خلوا بنی الکفار عن سبیله ☆ الیوم نضربکم علٰی تنزیله

ضربًا یزیل الهام عن مقیله ☆ ویذهل الخلیل عن خلیله

''اے کفار کے بیٹو! اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ خالی کر دو۔ آج ہم تمہیں اس کے تنزیل پر ماردیں گے۔ ایسی مار کہ جو کھوپڑی کو منہ سے جدا کر دے گی۔ اور دوست کو دوست سے جدا کر دے گی''۔

تو حضرت عمرؓ نے کہا: اے ابن رواحہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو اشعار کہہ رہا ہے! اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خل عنه یا عمر فلهی أسرع فیهم من نضح النبل''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل تلبیہ کہتے رہے۔ یہاں تک کہ ''رکن'' استلام اپنی ''محجن'' کے ساتھ کیا۔ کہ دائیں بغل سے چادر وغیرہ نکال کی بائیں کاندھے پر ڈالی ہوئی تھی اپنی سواری پر بیٹھ کر طواف کیا۔ مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف کر رہے تھے ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمل کرو تا کہ مشرکین تمہاری قوت اور طاقت کو دیکھ لیں۔ مشرکین ''قعسقعان'' کی جانب تھے جو ایک پہاڑی کا نام ہے۔ اس کے سامنے ''ابوقیس'' ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر بیٹھ کر صفا اور مروہ کے درمیان طواف کیا۔ جب فراغت کے وقت طواف کا ساتواں چکر آیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ہدی'' کو مروہ میں ٹھہرایا تو فرمایا یہ قربان گاہیں مکہ کے راستے قربان گاہ میں مروہ کے پاس نحر کیا اور وہیں پر حلق بھی کیا۔ اس طرح مسلمانوں نے بھی کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو اپنے ان ساتھیوں کے پاس بھیجا جن کو بطن یاجج میں اسلحہ دے کر کھڑا کیا تھا۔ اور دوسرے آئے اور انہوں نے مناسک کو ادا کیا۔ تو انہوں نے ایسا کر لیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تین دن قیام کیا۔ اور پھر مدینہ واپس لوٹ گئے۔

بَابُ اِخْرَاجِ الْيَهُوْدِ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ

یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دینے کا بیان

''النہایہ'' میں ہے کہ ''جزیرہ'' زمین کی اس جگہ کا نام ہے کہ جو طول میں ابوموسیٰ اُشعری کی قبر سے لے کر اُقصیٰ یمن تک ہے۔ اور عرض میں رمل سے لے کر آسمان تک ہے۔ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ اُصمعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ طولاً یہ اُقصیٰ عدن ابین سے ریف العراق تک ہے اور عرضاً جدّہ اور ساحل سمندر سے اطراف شام تک ہے۔

وجہ تسمیہ:

ازہری کہتے ہیں کہ اس کو جزیرہ اس لئے کہتے ہیں کہ بحر فارس اور بحر سوڈان نے اس کے جانبین کا احاطہ کیا ہوا ہے اور اس کے جانب شمال کو دریائے دجلہ اور فرات نے گھیر کر رکھا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جزیرۃ العرب مکہ، مدینہ، یمامہ اور یمن پر مشتمل ہے۔ القاموس میں ہے کہ اس کو ایک طرف سے بحر ہند اور بحر شام نے گھیرا ہے اور دوسری طرف سے دجلہ اور فرات نے گھیر رکھا ہے۔

عرض مرتب:

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے جزیرہ عرب کی حدود یہ بیان کی ہیں: اردن کی سرحد سے یمن تک لمبائی میں اور چوڑائی میں بحر احمر سے خلیج فارس تک۔ اس وقت جزیرہ عرب کے اندر کم از کم ایک درجن حکومتیں ہیں۔

(تقریر ترمذی۔ ج:۲، ص: ۲۶۷)

الفصل الاول:

۴۰۵۰: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَا نَحْنُ فِی الْمَسْجِدِ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ انْطَلِقُوْا اِلٰى يَهُوْدَ فَخَرَجْنَا مَعَهٗ حَتّٰى جِئْنَا بَيْتَ الْمِدْرَاسِ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ يَهُوْدَ اَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا اِعْلَمُوْا اَنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَاِنِّیْ اُرِيْدُ اَنْ اُجْلِيَكُمْ مِنْ هٰذِهِ الْاَرْضِ فَمَنْ وَجَدَ مِنْكُمْ بِمَالِهٖ شَيْئًا فَلْيَبِعْهُ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦ / ٢٧٠، كتاب الجزيه عالموادعة، باب اخراج اليهود من جزيرة العرب، الحديث رقم ٣١٦٧ و مسلم فی ٣ / ١٣٨٧، الحديث رقم (٦١ ـ ١٧٦٥) وأبو داود فی السنن ٣ / ٤٠٣، الحديث رقم ٣٠٠٣، وأحمد فی المسند ٢ / ٤٥١

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ ہم لوگ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیٹھے ہوئے

تھے نبی کریم ﷺ (اپنے حجرۂ مبارکہ سے) تشریف لائے اور فرمانے لگے ''یہودیوں کے پاس چلو''۔ چنانچہ ہم لوگ آپ ﷺ کے ساتھ روانہ ہوئے یہاں تک کہ یہودیوں کے مدرسہ میں پہنچے تو نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر فرمایا ''اے جماعت یہود! تم لوگ اب مسلمان ہو جاؤ (دنیا کی پریشانیوں اور آخرت کے عذاب سے) سلامتی پاؤ گے! اچھی طرح جان لو کہ زمین خدا اور اس کے رسول کی ہے (یعنی اس زمین کا خالق و مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا رسول اس کا نائب و خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس زمین پر متصرف و حکمران ہے) لہٰذا (اگر تم مسلمان ہونے سے انکار کرتے ہو تو پھر) سن لو کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ تم کو اس زمین (یعنی جزیرۃ العرب) سے جلا وطن کر دوں' پس تم میں سے کوئی شخص اپنے مال و اسباب میں سے (کوئی ایسی) چیز رکھتا ہو (جس کو اپنے ساتھ لے جانا ممکن نہ ہو جیسے جائیداد غیر منقولہ وغیرہ) تو اس کو چاہئے کہ وہ اسے فروخت کر دے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: بينا نحن في المسجد۔۔۔حتی جئنا بيت المدراس:

''بينا'': ایک نسخہ میں ''بينما'' میم کے ساتھ ہے۔

''المدارس'': قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''مدراس'' دراستہ سے مفعال کے وزن پر ہے۔ یہ مبالغہ کیلئے ہے۔ جیسا کہ ''مکثار'' اور ''معطاء'' بولے جاتے ہیں۔ اور مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی کتابیں پڑتے ہیں لوگوں کو درس دینے کیلئے۔ اور یا مدرسہ کے معنی میں ہے۔ اور مراد وہ جگہ ہے جہاں اہل کتاب اپنی کتابیں پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اور بیت کی اضافت ایسی ہے جیسا کہ مسجد کی اضافت ''جامع'' کی طرف ہے۔ اور دلالت اس معنی ثانی پر زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ بعض صحیح روایات میں ''حتی اتی المدارس'' ہے۔

قوله: فقام النبیؐ فقال۔۔۔ان الدرض لله ولرسوله: ''فقام النبی ﷺ'': مطلب یہ کہ آپ وہاں کھڑے رہے۔ آپ ﷺ تشریف فرما نہیں ہوئے

''اسلموا تسلموا'': دوسرا جملہ جواب اُمر ہے۔ اور مراد اس سے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''تسلموا'' عام ہے۔ قرینہ حال ہے ''خص عنه البعض'' کے قبیل سے ہے۔ ''ای تسلموا من الاجلاء'' اور فائدہ اس کا یہ ہوگا کہ پہلی مصیبت جو کہ جلاوطنی ہے تم اس سے بچ جاؤ گے۔ اپنے مانوس وطنوں کو چھوڑنا پڑے گا جو کہ سخت آزمائش اور مصیبت ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ [البقرة۔۱۹۱]

شاعر کہتا ہے:

لقتل بحد السيف أهون موقعًا ☆ علی النفس من قتل بحد فراق

تلوار کی دھار سے قتل ہونا نفس کیلئے زیادہ آسان ہے۔ بنبت فراق کی دھار سے قتل کرنے کے۔

يقولون ان الموت صعب ☆ وانما مفارقة الاوطان والله اصعبُ

لوگ کہتے ہیں کہ موت سخت چیز ہے۔ لیکن قسم خدا کی وطن کو چھوڑنا اس سے بھی زیادہ سخت اور شدید ہے۔

''اعلموا'': یہ استئناف ہے اور مابعد کیلئے بمنزلہ تمہید ہے۔ ماقبل کے کلام سے مایوسی کے بعد۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ جن سے یہ کہا گیا: اسلمو ا تسلمو، تو ہوسکتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات آئے کہ تم یہ بات کس بنیاد پر کر رہے ہو۔ تو یہ اس کا جواب ہے کہ ''اعلموا أن الأرض للّٰه'' یعنی حقیقۃً زمین اللہ کی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان الأرض للّٰه یورثُ من یشآء من عباده والعاقبة للمتقین﴾ [الاعراف۔۱۲۸]

''بے شک زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے مالک بنا دے۔ اور انجام کار تو متقیوں کا ہی بہتر ہوگا۔''

''ولرسوله'' شریعت کی وجہ سے تبعًا اور انجام کار کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مطلب وہی ہے جو اس آیت مبارکہ میں بیان ہوا ہے: [ان الأرض للّٰه یورثها من یشآء عن عباده]

مطلب یہ کہ تمہاری اس زمین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس کا وارث اور مالک بنائے گا۔ لہٰذا تم اس کو چھوڑ دو۔ یہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جلاء'' کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے اس لئے کہ آنحضرت ؐ زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجلاء ایسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اجلاء ہے۔ (جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے)۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق [قل الأنفال للّٰه والرّسول] حاصل کلام یہ ہوا کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کا ذکر تزئین کلام کیلئے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ یخدعون اللّٰه والّذین اٰمنوا﴾ [البقرۃ۔۹]

قوله: انی ارید ان اجلیکم ......:

أنی : ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے ماقبل پر عطف ہے۔ اور ایک نسخہ میں ''بکسرہ الہمزہ'' ہے جملہ حال ہوگا۔

بنوالنضیر کو چار ہجری میں جلاوطن کر دیا گیا تھا اور پانچ ہجری کو بنوقریظہ میں قتل کر دیا گیا۔ جبکہ ابو ہریرہؓ نے سات ہجری میں اسلام قبول کیا لہٰذا یہ حدیث اس اجلاء بنونضیر اور بنوقریظہ کے بعد کی ہے۔ پس خطاب مدینہ اور مدینہ کے اردگرد رہنے والے یہودیوں مثلاً بنوقینقاع وغیرہ سے ہے۔

''بما له'': باء ''منْ'' کے معنی میں ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ [الانسان۔٦]

بعض نے کہا ہے کہ یہ ''باء'' ''فی'' کے معنی میں ہے۔ اور بعض کے ہاں ''باء'' ''بدلیت'' کیلئے ہے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں ''بعت هذا بهذا'' میں نے اس کو اس کے بدلے میں بیچا''۔ اور معنی یہ ہے کہ جس کے پاس ایسا مال ہو جس کا انتقال ممکن نہ ہو جیسا کہ زمین اور درخت ہیں تو اس کو بیچ دے۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ابوعبداللہ البخاری نے مکرہ کی بیع کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ یہ بیع مضطر کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جہاں تک مکرہ علی البیع کی بات ہے تو اس کو تو بیع پر مجبور کیا جاتا ہے وہ بیع کرنا چاہے یا نہ چاہے۔ اور اگر یہود نے زمین کو نہ بیچا تو ان کو اس پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے اموال پر مشقت میں پڑ گئے اور انہوں نے اس کو بیچنا اختیار کیا۔ تو وہ ایسے ہوگئے گویا کہ وہ اس بیع پر مجبور ہو گئے۔ جیسا کہ کوئی آدمی اپنا مال بیچنے پر مجبور ہو تو یہ جائز ہے لیکن اگر اس کو اس بیع پر مجبور کیا گیا تو جائز نہیں ہوگا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی اور امام مالکؒ وغیرہ کے ہاں کافر کو جزیرہ عرب سے نکالنا واجب ہے، ان کو وہاں رہائش دینا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حکم ''حجاز'' کے ساتھ خاص ہے۔ ''حجاز'' سے مراد مکہ، مدینہ، یمامہ اور اس کے ماتحت علاقے ہیں۔ یمن وغیرہ کے علاوہ کفار کو سرزمین حجاز میں سفر سے نہیں روکا جائے گا البتہ وہ تین دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکیں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مکہ اور حرم میں تو کسی بھی حالت میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اگر خفیۃً داخل ہوا تو اس کو نکالا جائے گا۔ اگر مرا اور وہاں دفن ہوا تو اس کی قبر اکھیڑ دی جائے اس کی لاش وہاں سے نکالی جائے گی بشرطیکہ متغیر نہ ہوئی ہو۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے دخول کو حدودِ حرم میں جائز قرار دیا ہے۔ جمہور کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبة۔۲۸]

''معالم'' میں ہے کہ یہاں پر ان کو دخول حرم سے اس لئے منع کر دیا کہ جب یہ حرم میں داخل ہو گئے تو گویا کہ مسجد حرام کے قریب ہو گئے۔

البتہ اہل کوفہ نے معاہد کیلئے دخول حرم جائز کہا ہے۔

''المدارک'' میں ہے کہ وہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔ وہ حج نہ کریں اور عمرہ بھی نہ کریں جیسا کہ وہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے اس سال کے بعد۔ یہ واقعہ ۹ ہجری کا تھا جب صدیق اکبرؓ نے موسم حج کے موقع پر اعلان کیا تھا یہی ہمارا مذہب ہے۔ ہمارے ہاں مسجد حرام، حرم اور کسی بھی مسجد سے ان کو نہیں منع کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں خاص طور پر ان کو مسجد حرام سے روکا جائے گا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد حرام اور دوسری مساجد سے بھی روکا جائے گا۔

یہودیوں کو خیبر سے جلاوطن کرنے کا بیان

۴۰۵۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَامَ عُمَرُ خَطِيْبًا فَقَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَانَ عَامَلَ يَهُوْدَ خَيْبَرَ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَقَالَ نُقِرُّكُمْ مَا اَقَرَّكُمُ اللّٰهُ وَقَدْ رَأَيْتُ اِجْلَا ئَهُمْ فَلَمَّا اَجْمَعَ عُمَرُ عَلٰى ذٰلِكَ اَتَاهُ اَحَدُ بَنِيْ اَبِي الْحُقَيْقِ فَقَالَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُخْرِجُنَا وَقَدْ اَقَرَّنَا مُحَمَّدٌ وَعَامَلَنَا عَلَى الْاَمْوَالِ فَقَالَ عُمَرُ اَظَنَنْتَ اَنِّيْ نَسِيْتُ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَيْفَ بِكَ اِذَا اُخْرِجْتَ مِنْ خَيْبَرَ تَعْدُوْ بِكَ قَلُوْصُكَ لَيْلَةً بَعْدَ لَيْلَةٍ فَقَالَ هٰذِهٖ كَانَتْ هُزَيْلَةً مِنْ اَبِي الْقَاسِمِ فَقَالَ كَذَبْتَ يَا عَدُوَّ اللّٰهِ فَاَجْلَاهُمْ عُمَرُ وَاَعْطَاهُمْ قِيْمَةَ مَا كَانَ لَهُمْ مِنَ الثَّمَرِ مَالًا وَاِبِلًا وَعُرُوْضًا مِنْ اَقْتَابٍ وَحِبَالٍ وَغَيْرِ ذٰلِكَ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥ / ٣٢٧، كتاب الشروط، باب اذا اشترط فی المزارعة، الحديث رقم ٢٧٣٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک دن) امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور (اس خطبہ میں) ارشاد فرمایا'' (تم سب جانتے ہو کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر

کے یہودیوں سے ان کے مال و جائیداد سے متعلق ایک معاملہ طے فرمایا تھا (اور وہ یہ کہ ان یہودیوں کو خیبر ہی میں رہنے دیا جائے گا نیز ان کے کھجوروں کے باغات اور کھیت کھلیان کو بھی انہی کی تحویل و ملکیت میں باقی رکھا جائے گا البتہ ان کی پیداوار اور آمدنی میں سے آدھا حصہ لیا جایا کرے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اسی طرح جزیہ بھی مقرر کیا تھا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسی وقت) ان یہودیوں سے فرمادیا تھا کہ ہم تمہیں (خیبر میں) اس وقت تک برقرار رکھیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں رہنے دے گا (یعنی تم لوگ اس وقت تک خیبر میں مقیم رہنے کے حقدار ہو گے جب تک کہ ہمیں اللہ تعالیٰ تم کو جلاوطن کر دینے کا حکم نہ دیدیں) لہٰذا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ) اب میں ان کو جلاوطن کر دینا مناسب سمجھتا ہوں''۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا ارادہ کر لیا (کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے) تو (ان یہودیوں کے) قبیلہ بنی ابی الحقیق کا ایک شخص (جو اپنی قوم کا بڑا بوڑھا سردار تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ اے امیر المؤمنین! کیا آپ ہمیں جلاوطن کر رہے ہیں حالانکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں (خیبر میں) رہنے دیا تھا اور ہمارے مال و اسباب سے متعلق ہم سے ایک معاملہ بھی طے کیا تھا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (یہ) بات بھول گیا ہوں (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو مخاطب کر کے کہی تھی) کہ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب تجھ کو خیبر سے جلاوطن کر دیا جائے گا اور رات کے بعد رات میں تیری اونٹنی تیرے ساتھ دوڑ رہی ہوگی (گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ کو اس آنے والے وقت سے ڈرایا تھا جب تجھ کو راتوں رات خیبر سے جلاوطن ہونا پڑے گا)'' اس شخص نے (یہ سن کر) کہا کہ ''یہ بات تو ابوالقاسم نے بطور مذاق کہی تھی''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اے خدا کے دشمن! تم جھوٹ بولتے ہو (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات مذاق کے طور پر نہیں کہی تھی بلکہ از راہ معجزہ تمہیں ایک غیبی بات کی خبر دی تھی) اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان (یہودیوں) کو جلاوطن کر دیا اور ان کو ان کے پھلوں کے بدلے اموال' اونٹ' پالان اور رسیاں دے دیں'' (بخاری)

تشریح: ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم تم کو یہاں چھوڑتے ہیں جب تک اللہ نے چاہا۔ یعنی جب تک تم جزیہ کی ادائیگی کرتے رہو گے۔ پہلی توجیہہ زیادہ مناسب ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو مساقات کو مدت مجہولہ تک کیلئے جائز کہتے ہیں۔ جمہور نے اس کی تاویل یہ کی ہے یہاں مدت معہود ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا پکا عزم کیا تھا کہ یہودیوں کو جزیرہ عرب سے نکالیں گے بعض کہتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں خاص کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے یہ جائز تھا۔

قولہ: "وقد رأیت اجلاء هم":

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔ اور "رأیت" رأی سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہے کہ ابھی میں تمہاری جلاوطنی میں مصلحت سمجھتا ہوں۔ حقیقت میں یہ اس مدت کی انتہا کا بیان ہے۔

قولہ: فلما أجمع عمر علی علی ذلك ......:

"**هزیلة**": "**هزلة**" کی تصغیر ہے۔ "**هزل**" سے اسم مرۃ ہے جو "**جد**" (سنجیدگی) کی ضد ہے۔

"ابو القاسم"۔ یہ محمد ﷺ کی کنیت ہے۔
"اقتاب"، "قتبٌ" کی جمع ہے۔ اونٹ کے پالان کو کہتے ہیں، جیسا کہ اکاف اونٹ کے علاوہ دیگر جانوروں کے پالان کیلئے مستعمل ہے۔

۴۰۵۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :اَوْصٰى بِثَلاَثَةٍ قَالَ اَخْرِجُوا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَاَجِيْزُ وْالْوَفْدَ بِنَحْوِ مَاكُنْتُ اُجِيْزُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ اَوْ قَالَ فَاُنْسِيْتُهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٧٠ کتاب الجهاد، باب هل یستشفع الی اهل الذمه، الحدیث رقم ٣٠٥٣ و مسلم فی ٣ / ١٢٥٧، (٢٠ ـ ١٦٣٧) وأبو داود فی السنن ٣ / ٤٠٣٣ الحدیث رقم ٣٠٢٩، و أحمد فی المسند ١ / ٢٢٢

ترجمه: "اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (وفات کے وقت) تین باتوں کی وصیت فرمائی چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مشرکوں کو جزیرۂ عرب (یعنی مکہ اور مدینہ سے) باہر نکال دینا اور قاصدوں اور ایلچیوں کو ان کی ضروریات کی اشیاء مہیا کر کے دینا جیسے میں انہیں مہیا کر کے دیا کرتا تھا (یعنی وہ جب تک تمہارے پاس رہیں ان کی دیکھ بھال کرنا اور انہیں ان کی ضروریات زندگی مہیا کر کے دینا) راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تیسری بات سے خاموشی اختیار فرمائی یا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تیسری بات کو میں بھول گیا ہوں"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ان رسول الله ﷺ اوص بثلاثة۔۔۔ما کنت اجیزهم:
اجیزوا: یہ "اجازہ" سے ہے مطلب ہے امیر کا کچھ دینا۔
"الوفد": اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو امراء کے پاس ان کی زیارت کیلئے یا ان کو کوئی پیغام وغیرہ دینے کیلئے آتے ہیں۔
"بنحو" اس سے یہ اشارہ کر رہا ہے کہ "مقدار عطاء" میں امام کی رائے کا اعتبار ہے۔ اس میں کمی زیادتی دونوں جائز ہیں۔
علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وفود کے اکرام کو وصیت کے ذریعے عموم مصالح سے ہٹ کر علیحدہ سے ذکر کیا اس میں خود ایک بڑی مصلحت ہے اور وہ یہ کہ وافد قوم کے سفیر ہوتے ہیں اگر ان کی عزت و اکرام نہیں کیا جائے گا تو وہ اپنی قوم کے پاس ایسی صورتحال سے دوچار لوٹیں گے کہ جس کے باعث دین اسلام میں رغبت کم ہوجائے گی کیونکہ وہ سفیر ہیں۔ اس کی رغبت میں قوم کی رغبت ہوا کرتی ہے۔ اور بالعکس بھی ہوتا ہے۔ وافد امام کے پاس آنے والے وفد جو کہ بندوں کی مصالح کیلئے قائم کیا گیا ہے۔

قوله: قال ابن عباس ......: "قال" ایک نسخہ میں ہے کہ اس کا فاعل ابن عباس رضی اللہ عنہ ہے۔ لیکن بظاہر یہ صحیح نہیں ہے بلکہ "قال" کی ضمیر راوی کی طرف راجح ہے جو کہ ابن عباس سے روایت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ اس قول "**وسکت عن الثالثة**" کا فاعل ابن عباس ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں کہا ہے کہ یہ بھولنے والے راوی سعید بن جبیر رحمہ اللہ ہیں۔ انہوں نے یہ

روایت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔اس توجیہہ پر ''قال'' کی ضمیر سعید بن جبیرؒ کی طرف اور ''سکت'' کی ضمیر ابن عباسؓ کی طرف راجح ہے۔صحیح بخاری کے متن میں ابن عباسؓ سے روایت اس طرح ہے: ''**وأجيزوا الوفد بنحو ما كنت اجيز هم ونسيت الثالثة**'' یہ کلام صریح ہے کہ یہ کلام ابن عباسؓ کا ہے۔

سید جمال الدین نے ''**روضة الأحباب**'' میں فرمایا ہے کہ سعید بن جبیرؒ سے روایت کرنے والے راوی کا کہنا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ سعید بن جبیر نے تیسری بات ذکر نہ کرنے میں کیا مصلحت سمجھی کہ اس کو ذکر نہیں فرمایا انہوں نے تیسری بات ذکر کی تھی لیکن میں اس کو بھول گیا ہوں۔ پھر بعض نے کہا ہے کہ یہ جیش اسامہؓ کی روانگی تھی۔مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس بارے میں اختلاف بھی کیا تھا۔تو انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو موت کے وقت اس کی وصیت کی تھی۔اس کو علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔اور اسی طرح ''**المهلب**'' سے بھی منقول ہے۔شرح مسلم نووی رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تیسری وصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہو: ''**لا تتخذوا قبرى وثناً يعبد**'' (میری قبر کو بت بنانا کہ جس کی عبادت کی جائے)۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مؤطا میں اجلاء یہود کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جزیرۃ العرب سے یہود ونصاریٰ کو نکالنے کے بارے میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

۴۰۵۳: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :يَقُوْلُ لَاُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا اَدَعَ فِيْهَا اِلَّا مُسْلِمًا۔ (رواه مسلم وفى رواية) لَئِنْ عِشْتُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَاُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ۔

اخرجه مسلم فى صحيحه ٣ / ١٣٨٨ كتاب الجهاد والسير' باب اخراج ليهود من جزيرة العرب' الحديث ٦٣ ـ ١٧٦٧) وأبو داود فى السنن ٣ / ٤٢٤ الحديث رقم ٣٠٣٠ والترمذى فى ٤ / ١٣٤' الحديث رقم ١٦٠٧

ترجمہ: ''اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ''میں یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے ضرور بہ ضرور باہر نکال دوں گا یہاں تک کہ مسلمانوں کے سوا (جزیرۂ عرب میں) کسی کو نہیں چھوڑوں گا''۔ (مسلم) اور (ترمذی کی) ایک روایت میں ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے ضرور نکال دونگا۔ان شاءاللہ

تشریح: قوله: ''**لئن عشت ان شآء الله لأخرجن اليهود والنصارٰى من جزيرة العرب**'' کے لئے قید ہے

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ ترمذیؒ نسائیؒ اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

لَيْسَ فِيْهِ اِلَّا حَدِيْثُ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا يَكُوْنُ قِبْلَتَانِ وَقَدْ مَرَّ فِيْ بَابِ الْجِزْيَةِ

''(مصابیح کی) دوسری فصل میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صرف یہ ایک حدیث ''لا یکون قبلتان ......'' تھی اور وہ جزیہ کے بیان میں نقل کی جا چکی ہے''۔

فائدہ: یعنی اس روایت کو مکرر ہونے کی وجہ سے ساقط کیا ہے۔ پس اعتراض بھی ہے اور اعتذر بھی ہے۔

الفصل الثالث:

یہود کو خیبر سے تیماء اور اریحاء کی طرف جلاء وطن کرنے کا بیان

۴۰۵۴: عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَجْلَى الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ اَرْضِ الْحِجَازِ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَمَّا ظَهَرَ عَلٰى اَهْلِ خَيْبَرَ اَرَادَ اَنْ يُّخْرِجَ الْيَهُوْدَ مِنْهَا وَكَانَتِ الْاَرْضُ لَمَّا ظُهِرَ عَلَيْهَا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ فَسَاَلَ الْيَهُوْدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنْ يَّتْرُكَهُمْ عَلٰى اَنْ يَّكْفُوْا الْعَمَلَ وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُقِرُّكُمْ عَلٰى ذٰلِكَ مَا شِئْنَا فَاُقِرُّوْا حَتّٰى اَجْلَاهُمْ عُمَرُ فِيْ اِمَارَتِهٖ اِلٰى تَيْمَاءَ وَاَرِيْحَاءَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ٢٥٢، الحدیث رقم ٣١٥٢، و مسلم فی ٣ / ١١٨٧، الحدیث رقم (٦ ـ ١٥٥١)

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہود و نصاریٰ کو سرزمین حجاز (یعنی جزیرۃ العرب) سے جلا وطن کر دیا۔ (اس سے پہلے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اہل خیبر پر غلبہ حاصل ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو وہاں (خیبر) سے نکال دینے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر غالب آ گئے تھے تو وہ زمین اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کی ہو گئی تھی (کہ وہاں صرف اللہ ہی کا دین غالب اور مسلمانوں ہی کو حق تصرف و حکمرانی حاصل ہوتا ہے) لیکن یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان (یہودیوں) کو اس شرط پر (خیبر کی زمینوں پر قابض و متصرف) رہنے دیں کہ وہ محنت کریں (یعنی باغات کی دیکھ بھال اور ان کی سیرابی وغیرہ کی ساری ذمہ داری ادا کریں) اور (ان سے پیدا ہونے والے) پھلوں کا آدھا حصہ ان کے لئے ہوگا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی یہ درخواست منظور کر لی لیکن یہ) فرمایا کہ ''ہم تمہیں (خیبر میں) اسی وقت تک برقرار رکھیں گے جب تک کہ ہم چاہیں گے'' اس کے بعد ان کو خیبر میں رہنے دیا گیا یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ان سب کو تیماء اور اریحا کی طرف جلا وطن کر دیا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''اجلی الیهود والنصارٰی من ارض الحجاز'':

ارض حجاز سے مراد جزیرۂ عرب مراد لینے کی صورت میں تمام روایات میں موافقت ہو جائے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر پر غلبہ حاصل کر لیا تو اس وقت ارادہ فرمایا تھا کہ یہودیوں کو یہاں سے نکالا جائے تو یہودیوں نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ان کو ان کی زمین پر رہنے دیا جائے' اس شرط پر کہ عمل یہود کریں گے' مؤنت یہ برداشت کریں گے اس طور پر کہ زمین کو سیراب کریں گے اور کھجور میں گابہ لگائیں گے اور جو بھی ذرع اور فصل کے ساتھ متعلق عمل ہے وہ کریں گے اور ان کو اس کے بدلے نصف پھل دیا جائے گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''نقرهم على ذلك ماشئنا'' کہ ہم ان کو اس پر برقرار رکھیں گے اس وقت تک جب تک ہم چاہیں۔

''فاقروا'': یہ صیغہ مجہول کا ہے۔ اور ایک نسخہ میں صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔ اسکا مفعول محذوف ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو اس پر برقرار رکھا یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ان کو اپنے دوران خلافت تیماء اور اریحاء کی طرف جلاوطن کر دیا۔ یہ دونوں معروف جگہیں ہیں۔

کتاب ''المغرب'' کے مطابق ''تیماء'' بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ دونوں شام کے علاقے ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ آنحضرت کی مراد یہ تھی کہ یہود اور نصاریٰ کو جزیرۃ العرب کے بعض علاقوں سے نکال دیا جائے اور وہ خاص طور پر حجاز کا علاقہ ہے۔ اس لئے کہ ''تیماء'' بھی تو جزیرۂ عرب میں ہے۔ لیکن ''حجاز'' میں سے باہر ہے۔

بَابُ الْفَیْءِ

فئی کا بیان

''مغرب'' میں ہے کہ ''فئ'' اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ کے بعد کفار سے حاصل کیا جائے اور دار الکفر دار الاسلام بن جائے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ سارا مال مسلمانوں کا ہے اس میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ ''المفاتیح'' میں فئ کی تعریف یہ لکھی ہے۔ وہ مال جو کفار سے بغیر لڑائی کے حاصل ہو جائے اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے چار خمس نبی کیلئے خاص ہوں گے وہ جس پر چاہیں خرچ کریں اپنے اہل وعیال پر اس میں سے خرچ کریں' لشکروں کو تیار کریں' مہانوں کو کھانا کھلائیں۔ جو کوئی آپ ﷺ کے پاس کوئی پیغام لائے اس کو دیں یا حاجت مند کو دیں اور پھر خمس کو مزید پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ وہ مال جس پر مسلمان گھوڑے دوڑائیں لیکن بغیر قتال کے حاصل ہو جائے تو اس مال کو مصالح مسلمین میں صرف کیا جائے گا جیسا کہ خراج کو صرف کیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح جزیہ کے مال سے پل، بند اور وہ بڑی بڑی نہریں بنائی جائیں گی جو کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ سیحون جیحون، فرات اور دجلہ ہے۔ اس سے قاضیوں معلمون اور فوجیوں کی تنخواہیں ادا کی جائیں گی۔ راستہ کو چوروں سے محفوظ رکھنے کے انتظامات پر خرچ کیا جائے گا۔ یہ مال کسی ایک چیز کے

ساتھ خاص نہیں ہوگا۔

فقہاء کہتے ہیں کہ مال فئے ان اراضی کی طرح ہے جس سے زمین والوں کو بے دخل کر دیا گیا ہو اور جزیہ کی طرح ہے اس میں کوئی خمس نہیں ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ جو مال کفار سے بغیر قتال کے حاصل ہو۔ لیکن خوف کے ساتھ ہو یا ان کی حفاظت کے عوض لیا گیا ہو اس سے خمس نکالا جائے گا اور وہ مال جو ان سے بغیر خوف لیا جائے جیسا کہ جزیہ، عشر تجارت، اور میت کا مال جبکہ لاوارث ہو تو اس سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اور یہی امام مالک کا قول بھی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اس کو وہاں خرچ کیا جائے گا جہاں خمس غنیمت کو خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ، میں ان سے نہ اس کے بعد کسی نے یہ قول اختیار کیا ہے امام شافعی نے اس کو غنیمت پر قیاس کیا ہے۔ اور علت مشترکہ یہ بیان کی ہے کہ اس مال کو جو مسلمانوں نے قوت کے ساتھ کفار سے لیا ہے۔

صاحب ہدایہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے استدلال کیا ہے کہ آپؐ نے نصاریٰ نجران سے جزیہ لیا ہے، اہل یمن کے ہر بالغ پر دینار جزیہ لازم کیا تھا۔ لیکن یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس سے خمس نکالا ہو بلکہ یہ مال مسلمانوں کے درمیان تقسیم ہوتا تھا اگر ایسی بات ہوتی تو ضرور منقول ہوتی' اگرچہ ضعیف طریق کے ساتھ ہی کیوں نہ منقول ہوتی ۔جیسا کہ عادت ہے اور طریقہ عادیہ کی مخالفت باطل ہے' لہٰذا اس کا وقوع بھی باطل ہے بلکہ اس میں کے خلاف بھی وارد ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں ضعف ہے جس کی تخریج ابوداؤد نے ابن العدمی بن العدی الکندی سے کی ہے کہ عمر بن العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے مواضع فیء کے بارے میں پوچھنے والوں کو جواب میں لکھا۔ جو فیصلہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے کیا تھا مؤمنین نے اس فیصلہ کو عدل سمجھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے موافق سمجھا: ''جعل الله الحق علىٰ لسان عمر وقلبه'' انہوں نے عطیہ کو فرض کیا۔ اور اہل ادیان کا ذمہ اس چیز کے بدلے میں لے لیا جو ان پر جزیہ وغیرہ کی شکل میں لازم تھا۔ اس میں نہ کوئی خمس مقرر کیا اور نہ ہی اس میں غنیمت مقرر کی۔

الفصل الاول :

۴۰۵۵: عَنْ مَالِكِ بْنِ اَوْسِ بْنِ الْحَدَثَانِ قَالَ : قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ خَصَّ رَسُوْلَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فِيْ هٰذَا الْفَيْءِ بِشَيْءٍ لَمْ يُعْطِهٖ اَحَدًا غَيْرَهٗ ثُمَّ قَرَأَ مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ قَدِيْرٌ فَكَانَتْ هٰذِهٖ خَالِصَةً لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : يُنْفِقُ عَلٰى اَهْلِهٖ نَفَقَةَ سَنَتِهِمْ مِنْ هٰذَا الْمَالِ ثُمَّ يَاْخُذُ مَابَقِيَ فَيَجْعَلُهٗ مَجْعَلَ مَالِ اللّٰهِ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦ / ١٩٧ 'كتاب فرض الخمس' باب فرض الخمس' الحديث رقم ٣٠٩٤ و مسلم فی ٣ / ١٣٧٨ الحديث رقم (٤٩ ـ ١٧٥٧) وأحمد فی المسند ١ / ٢٠٨

ترجمہ: ''حضرت مالک بن اوس بن حدثان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس مال فئے کے سلسلے میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جس چیز کے ساتھ خاص کیا تھا وہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے علاوہ کسی اور کو عطا نہیں کی گئی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ قَدِيْرٌ اور فرمایا کہ چنانچہ یہ مال صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص ہو گیا تھا اس مال میں سے آپ ﷺ اپنے گھر والوں کے سال بھر کا خرچ دیا کرتے تھے اس کے بعد اس میں سے جو کچھ بچ رہتا تھا' اس کو ان جگہوں میں خرچ کرتے جہاں اللہ کا مال خرچ ہونا چاہیے (یعنی اس باقی مال کو مسلمانوں کے مفاد و مصالح مثلاً ہتھیاروں اور گھوڑوں وغیرہ کی خریداری پر خرچ کر دیا کرتے تھے' نیز محتاج و مساکین میں سے جس کو چاہتے اس کی امداد کیا کرتے تھے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: ان الله قد خص۔۔۔الی قوله: قدير:

وَمَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَاۤ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

''اور جو کچھ (مال) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان (یعنی بنونضیر) سے دلوایا ہے وہ رسول کے لئے مخصوص ہو گیا ہے کیونکہ تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ (یعنی تم نے اس کے حصول کے لئے کسی جنگ و جدال کی مشقت برداشت نہیں کی ہے نہ سفر کی پریشانیاں جھیلی ہیں' بلکہ پیدل ہی چلے گئے تھے) لیکن اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) اپنے رسولوں کو جس پر چاہے (خاص طور پر) مسلط فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت حاصل ہے''۔

راویٔ حدیث:

مالک بن اوس۔ یہ مالک ہیں اور ''اوس ابن الحدثان'' کے بیٹے ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اکثر کے نزدیک ان کا صحابی ہونا ثابت ہے۔ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ثابت نہیں ہے۔ ان کی آنحضرت ﷺ سے روایات کم ہیں اور صحابہ سے جو روایات یہ نقل کرتے ہیں کافی زیادہ ہیں۔ انہوں نے عشرہ مبشرہ سے روایات کی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی روایات بکثرت منقول ہیں۔ راویوں کی ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے جن میں زہری و عکرمہ بھی شامل ہیں۔ بمقام مدینہ ۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔ ''الحدثان'' میں حاء اور دال دونوں پر فتحہ اور ثاء مثلثہ (تین نقطوں والی) مفتوح ہے۔ (ابن الاثیر)

''ما افآء الله على رسوله'' ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ بھی ہے۔ اور قرآن میں بھی واؤ کے ساتھ ہی ہے۔

یہ کسی راوی کی طرف سے اختصار ہے۔

''أو جفتم'': فما ''وجیف'' سے ماخوذ ہے۔ اور یہ سرعت اسیر کو کہتے ہیں۔ یہاں آیت میں ''ما'' نافیہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تم نے اس کے حصول پر اور غنیمت پر نہ گھوڑے دوڑائے ہیں اور نہ ہی اونٹ دوڑائے ہیں، نہ ہی تم اس کے لیے قتال کی وجہ سے تھکے ہو۔ بلکہ تم تو صرف اپنے پاؤں پر پیدل چل کر گئے ہو۔ (اس لئے کہ یہ علاقہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر ہے اور نبی ﷺ گدھے پر سوار تھے۔) اور لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے یعنی ان کفار کے دلوں میں رعب اور دبدبہ ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اموال بنی نضیر میں سے جو کچھ اپنے رسول ﷺ کو دیا ہے تم نے وہ قتال اور ان پر

غلبہ کی وجہ سے حاصل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان پر اور ان کے اموال پر مسلط کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اپنے دشمنوں پر مسلط کیا کرتا تھا۔

بہر حال اب اس کا معاملہ نبی ﷺ کے حوالہ ہے، وہ جہاں چاہیں اس کو خرچ کر دیں اور اس کو ان غنائم کی طرح تقسیم نہ کریں جن پر لڑائی ہو اور جس کو قہراً اور عنوۃً لیا گیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا اور انصار کو کچھ بھی نہیں دیا۔ سوائے تین انصاریوں کے کہ وہ بہت غریب اور مجبور تھے۔ اس کو ''المدارک'' میں ذکر کیا گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ بعض دفعہ وہ وسائل ظاہرہ کے ذریعے کام کرتا ہے۔ اور بعض دفعہ صرف اپنی قدرت باہرہ اور غالبہ کے ذریعے، کبھی کبھی وہ عام حکم دیتا ہے، بعض دفعہ خاص حکم دیتا ہے جیسے حکمت اور اس کی مشیت کا تقاضا ہو۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس بارے میں ''مجمل'' ہے۔ اس ''مجمل'' کا بیان اس آیت میں: ﴿**ما آفاء الله علىٰ رسوله أهل القرىٰ**﴾[الحشر: ۷] اھ

صحیح بات یہ ہے کہ پہلی آیت اموال بنی النضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور ان اموال کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ؐ کے لئے خاص کر دیا ہے۔ اور دوسری آیت مذکورہ اس قریہ کے غنائم کے بارے میں ہے جس کو قوت غزاۃ کے ذریعے لیا جاتا ہو۔ اور اس آیت میں خمس کے مصرف کا بیان ہے۔ لہٰذا اس آیت کا تعلق ایک مستقل مسئلہ سے ہے، یہ آیت بیانیہ نہیں ہے۔

قوله: ''فكانت هذه خالصةً لرسول الله ﷺ''

یہ اموال فے صرف رسول ﷺ کیلئے خاص ہیں۔ ان کے بعد کے ائمہ کیلئے نہیں ہیں کہ وہ اس میں مرضی کے مطابق تصرف کریں۔ بلکہ ان پر لازم ہے کہ وہ ان کو فقراء مہاجرین اور انصار میں خرچ کریں۔ وہ انصار جنہوں نے ان مسلمانوں کا اتباع کیا ہے اور ان جگہوں میں خرچ کریں۔ جہاں مصالح مسلمین وابستہ ہوں۔

قوله: ''ينفق علىٰ اهله نفقه سنتهم من هذا المال''

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''**لا يدخر شيئاً لغدٍ**'' آپ ﷺ اگلے دن کیلئے کچھ بھی ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔ اسلئے کہ اگلے دن کے لئے عدم ادخار اپنے لئے تھا جبکہ یہ ادخار دوسروں کیلئے ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ جائز معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال کا غلے اور خوراک کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے ،اس سے توکل میں کوئی قربی لازم نہیں آتی۔

علماء کا اجماع ہے کہ ذخیرہ اس چیز میں جائز ہے جو قریہ اور گاؤں سے حاصل ہو۔ اگر کوئی چیز بازار سے خرید کر اپنے عیال کے لئے ذخیرہ کرتا ہے اور یہ ذخیرہ اندوزی اس وقت میں کہ جبکہ لوگ طعام کی تنگی میں ہوں تو پھر جائز نہیں ہے۔

اور ظاہر حدیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حصول زرع تک بقدر کفایت ذخیرہ کرنا جائز ہے ادسال بھر کے ذخیرہ پر قیاس کرتے ہوئے۔

''**من هذا المال**'': طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''**هذا**'' کا مشار الیہ ''**الفيئ**'' اپنی تمام قسموں کے ساتھ ہے۔ ''**من هذا المال**'' کو مکرر اس لئے لائے تا کہ یہ بیان ہو کہ آپ ﷺ کا نفقہ اسی مال میں سے ہوتا تھا۔ اور ''**ينفق علىٰ اهله**'' استئناف

ہے اور کلام اوّل کے لئے بیان ہے اور اجمال کی تفصیل ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ قولہ: ''ثمَّ يأخذ مابقي فيجعله مال الله''

یعنی اس کو مصالح مسلمین میں خرچ کرے۔ مثلاً ان کے لئے اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ خریدے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کرے گا: ① ایک حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے۔ ② نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بنو ہاشم اور بنو المطلب میں سے اقرباء کیلئے۔ ③ ایک حصہ یتیموں کیلئے۔ ④ ایک حصہ مساکین کیلئے۔ ⑤ ایک حصہ ابن سبیل کیلئے۔ اھ

لیکن یہ کلام دو اعتبار سے محل نظر ہے، اول تو اس لیے کہ اس حدیث سے یہ مطلب اخذ نہیں ہو رہا ہے، دوسری بات یہ ان کے مذہب کے مخالف بھی ہے، یہ بات انہوں نے امام نووی کی اتباع میں کہہ دی ہے۔ چنانچہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مال فیئے میں چار خمس تھے۔ اور باقی خمس کا خمس ہوتا تھا۔ یعنی پچیس میں سے اکیس حصے آپ کیلئے تھے۔ اور باقی چار حصے ذوالقربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل کیلئے ہوتے تھے۔

''معالم'' میں ہے کہ اہل علم نے مصارف الفئے میں اختلاف کیا ہے۔ کہ آنحضرت کے بعد اس کے مصارف کیا ہیں؟ ایک قوم کی رائے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ کیلئے ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مقاتلین کا حصہ ہوگا۔ دوسرا یہ کہ مصالح مسلمین میں خرچ ہوگا اور ابتداء مقاتلین سے ہوگی پھر اس کے بعد ''اهم فالأهم'' مصالح پر خرچ ہوگا۔ مال فئے سے خمس نکالنے میں بھی اختلاف علماء منقول ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے خمس نکالا جائے گا اور یہ خمس غنیمت کے خمس کے حقداروں کا ہوگا۔ اور چار آخماس مقاتلین یا مصالح مسلمین کیلئے ہوں گے۔ اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ مال فئی میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا بلکہ اس پورے کا مصرف ایک ہی ہے اور اس میں تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ آیت پڑھی: [ما آفاء رسوله علىٰ من اهل القرىٰ۔۔۔ ''للفقراء۔ والذين جاؤوا من بعدهم]'' پھر فرمایا کہ یہ مال تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ اور فرمایا کہ روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان کا اس مال فئے میں حق ثابت ہے مگر وہ چیز جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں۔

''معالم'' کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے۔: ''اخبرنا عبدالواحد الیلی اخبرنا احمد بن عبدالله النعيمي أخبرنا محمد بن يوسف حدثنا محمد بن اسماعيل البخاری رحمۃ اللہ علیہ حدثنا ابو اليمان اخبر نا عن شعيب عن الزهری اخبرنی مالك بن اوس بن الحدثان البصری رحمۃ اللہ علیہ ان عمر بن الخطاب دعاه ...... کہ حضرت عمرؓ نے ان کو بلایا۔ اچانک حضرت عمرؓ کے پاس انکا دربان آیا اور کہا کہ عثمانؓ، عبدالرحمنؓ۔ زبیرؓ اور سعدؓ اندر آنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دی تو وہ اندر آئے' تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ پھر آیا اور کہا کہ حضرت علیؓ اور عباس کو اندر آنے کی اجازت ہے؟ تو عمرؓ نے فرمایا: ہاں جب وہ دونوں اندر آئے تو حضرت عباسؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین میرے اور اس علیؓ کے درمیان فیصلہ کردو۔ (یہ دونوں فیے کے بارے میں جھگڑ رہے تھے)۔ اس مال فی کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے اموال میں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا تھا۔ اس جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اے امیر المؤمنین ان دونوں کے درمیان فیصلہ دیجئے اور ایک کو دوسرے سے راحت دلا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم دونوں آرام سے رہو میں

تم سب لوگوں کو اس اللہ کا واسطے دیتا ہوں جس کے حکم پر آسمان وزمین قائم ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''لا نورثُ ما تركنا صدقة''

اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات تھی؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور عباسؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا: میں تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ کیا تم دونوں اس بات کو جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا؟ تو دونوں نے کہا کہ ہاں جانتے ہیں۔ تو پھر فرمایا کہ میں اس معاملے کے بارے میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مال میں سے بعض حصہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص کیا ہے اور کسی کو نہیں دیا ہے۔ اور یہ آیت تلاوت کی: [وما آفاء الله على رسوله منهم فما او جفتم عليه من خيل ولا ركاب] اس کو ''قدیرٌ'' تک پڑھ لیا۔ یہ خالص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تھا۔ پھر اللہ کی قسم یہ حصہ میں نے تمہارے علاوہ کسی کو نہیں دیا۔ اور نہ ہی اس کے ساتھ تم پر کسی کو ترجیح دوں گا۔ تو اس نے تم کو دے دیا ہے۔ اور تمہارے درمیان اس کو تقسیم کر چکا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں یہ مال باقی بچ گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مال میں اپنے اہل کیلئے سال گھر کا نفقہ نکالتے تھے پھر ماںقی کو اللہ تعالیٰ کے مال (غنیمت) کے خرچ کرنے کی جگہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ اس پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عمل کیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔ تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ولی ہوں۔ انہوں نے اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور اس میں وہی کام کیا' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور تم اس دونوں وقت موجود تھے۔ پھر حضرت علیؓ اور عباسؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تمہیں یاد ہے کہ تم ابو بکرؓ کے بارے میں کیا کہتے ہو کہ وہ اس میں صادق، نیکوکار، ہدایت یافتہ اور حق کے تابعدار تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو وفات دے دی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کا ولی ہوں تو میں نے اس کو ابتدائے امارت سے لے کر دو سال تک قبضہ میں رکھا۔ اور اس میں وہی عمل کرتا ہوں جو رسول اللہ اور ابو بکرؓ نے کیا ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں اس میں صادق، نیکوکار، ہدایت یافتہ اور حق کا تابعدار ہوں۔ پھر تم دونوں میرے پاس آئے ہو۔ اور تم دونوں کی ایک بات ہے اور تمہارا معاملہ متفق ہے۔ پھر میں نے تم کو کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لا نورث ما تركنا صدقة'' تو مجھے ظاہر یہی ہوا کہ میں مال تمہارے حوالے کر دوں اس شرط پر کہ تم اس میں اللہ تعالیٰ کے عہد اور میثاق کو لازم پکڑو گے۔ اور اس میں وہ عمل کرو گے جو عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکرؓ اور میں نے کیا ہے جب سے میں خلیفہ بنا ہوں۔ ورنہ بصورت دیگر میرے ساتھ اس معاملے میں بات نہ کرو۔ تم نے کہا کہ اس کو ہم دونوں کے حوالے کر دو۔ میں نے تمہارے حوالے کر دیا ہے تو اب تم مجھ سے امید کرتے ہو کہ میں اس کے علاوہ کوئی اور فیصلہ کروں گا۔ اس ذات کی قسم جس کے حکم سے آسمان وزمین قائم ہیں میں قیامت تک اس بارے میں اس فیصلہ کے علاوہ کوئی اور فیصلہ نہیں کروں۔ اگر تم اس سے عاجز آ گئے ہو تو اس کو دوبارہ میرے حوالے کر دو۔ میں تمہارے لئے اس کو کافی ہو جاؤں گا۔

۴۰۵۶: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ كَانَتْ اَمْوَالُ بَنِي النَّضِيرِ مِمَّا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِمَّا لَمْ يُوْجِفِ الْمُسْلِمُوْنَ عَلَيْهِ بِخَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ فَكَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :خَاصَّةً يُنْفِقُ عَلٰى اَهْلِهٖ نَفَقَةَ سَنَةٍ ثُمَّ يَجْعَلُ مَا بَقِيَ فِي السِّلَاحِ وَالْكُرَاعِ عُدَّةً فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٦ / ٩٣ كتاب الجهاد، باب المجن ومن يترس صاحبه، الحديث رقم ٢٩٠٤ و

مسلم فی ۳ / ۱۳۷۸ الحدیث رقم (۴۸ ـ ۱۷۵۷) وأبو داود فی السنن ۳ / ۳۷۱ الحدیث رقم ۲۹٦۵، والنسائی فی ۷ / ۱۳۲ الحدیث رقم ٤١٤٠، وأحمد فی المسند ۱ / ۲۵

ترجمه: ''اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وایت ہے کہ'' (یہود کے قبیلہ) بنو نضیر کا مال اس قسم کے مال میں سے تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو (کسی جدوجہد کے بغیر) خاص طور پر عطا فرمایا تھا۔ اس کے لئے نہ تو مسلمانوں نے گھوڑے دوڑائے تھے اور نہ ہی اونٹ اس لئے وہ مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہو گیا تھا اس مال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کی سال بھر کی ضروریات میں سے خرچ کرتے تھے اور پھر اس میں سے جو کچھ بچ رہتا تھا اس کو ہتھیاروں اور گھوڑوں کی خریداری پر خرچ کر دیا کرتے تھے تا کہ وہ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں کام آئیں''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: وعن عمر...... نفقة سنتهم:

عن عمر: ایک نسخہ میں ''وعنه'' آیا ہے۔ بظاہر یہ ضمیر ''مالک'' (مالک بن اوس) کی طرف راجع ہے۔ لیکن اس کی صحت اس پر موقوف ہے کہ یہ روایت بھی مالک بن اوس نے حضرت عمرؓ سے سنی ہو۔

''**كانت اموال بنی النضير مما آفاء الله علی رسوله**'': ''منْ'' بیانیہ بھی ہوسکتا ہے اور تبعضیہ بھی ہوسکتا ہے ''الی والحال انها من جملةما آفاء الله علی رسوله''

''**ممالم بوجف**'': یہ ''کانت'' کی خبر ہے۔

''**ركاب**'': اس اونٹ کو کہتے ہیں کہ جس پر سفر کیا جاتا ہے۔ اس کا واحد ''خود اسی مادے اور لفظ سے'' نہیں آتا۔ بلکہ اس کا واحد ''**راحلة**'' ہے۔

''**ينفق علی اهله**'': آہل سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں، بیٹیاں اور خدام ہیں۔ ایک نسخہ میں ''**سنته**'' کا لفظ ہے۔ اور ایک نسخہ میں تنوین تنکیر کیساتھ ہے۔ اور ''ابن ہمام کی روایت'' میں ''**قوت سنته**'' کا لفظ ہے۔

قوله: ثم يجعل ما بقی فی السلاح والكراع ......'': یہ ایک روایت میں ہے: ''**فما بقی جعله**''۔

''**كراع**'': تمام گھوڑوں کیلئے بولا جاتا ہے۔ (النہایہ) ''**المغرب**'' کراع سے مراد گھوڑے، خچر اور گدھے ہیں۔

بظاہر کراع سے مراد وہ تمام جانور ہیں جو لڑائی میں استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تصرف کا حق حاصل ہے، جیسے چاہیں اس میں تصرف فرمائیں اور یہ ہماری اس مذکورہ بات کی تائید ہے اس لئے کہ مصالح بیت المال اس وقت زیادہ نہیں تھے بلکہ ائمہ کا نفقہ، آلات جہاد بھی گھوڑے اور اسلحہ وغیرہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نفقہ تھا۔ اس لئے کہ اس وقت قضاۃ، جسور، اور قناطر نہیں تھے۔ اور جہاں تک بات فقراء مہاجرین کے نفقہ کی تو ہم یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے اس پر قدرت خاص ہوئی آپ ان کے لئے انتظام فرما دیتے تھے۔

الفصل الثانی:

۴۰۵۷: عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَتَاهُ الْفَیْءُ قَسَمَهُ فِیْ

يَوْمِهٖ فَاَعْطَى الآهِلَ حَظَّيْنِ وَاَعْطَى الْاَعْزَبَ حَظًّا فَدُعِيْتُ فَاَعْطَانِيْ حَظَّيْنِ وَكَانَ لِيْ اَهْلٌ ثُمَّ دُعِيَ بَعْدِي عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ فَاَعْطَى حَظًّا وَاحِدًا۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۳۵۹' کتاب الخراج والامارة' باب فی قسم الفئيالحديثقم وأحمد فی المسند ٦ / ۲۵

ترجمہ: ''حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال فئے آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اسی دن (ضرورتمندوں کے درمیان) تقسیم فرما دیتے تھے۔ جو بیوی والا ہوتا اس کو دو حصے عنایت فرماتے اور مجرد وکنوارے کو ایک حصہ عنایت فرماتے'۔ چنانچہ (ایک مرتبہ) مجھ کو بھی بلایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو حصے عنایت فرمائے کیونکہ میری بیوی تھی اور پھر میرے بعد عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا (جن کی بیوی نہیں تھی) ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حصہ عنایت فرمایا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''اهل'' سے مراد ''متأهل'' ہے۔یعنی وہ شخص جس کی بیوی ہو۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''اَهَلَ يأهلُ'' سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ بظاہر ہروہ شخص اہل کے حکم میں آتا ہے جس پر کسی کا نفقہ واجب ہو۔

''أعزب'': وہ شخص جس کی بیوی نہ ہو۔

۴۰۵۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَوَّلُ مَا جَاءَهُ شَيْءٌ بَدَاَ بِالْمُحَرَّرِيْنَ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۳۵۸' کتاب الخراج والامارة' باب فی قسم الفئ'الحديث رقم ۲۹۵۱۔

ترجمہ: ''اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ مال فئی کے آنے کے بعد اس میں سے سب سے پہلے ان لوگوں کو مرحمت فرماتے جن کو (حال ہی میں غلامی سے آزاد کیا گیا ہوتا)''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قال: رایت رسول اللّٰه اوّل ماجآءہ شئٌ من الفئی بدأ بالمحررين''۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''اوّل'' منصوب ہے اور ''بدآ'' کیلئے ظرف ہے اور رأیت کا مفعول ثانی ہے۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''محررین'' سے مراد وہ آزاد لوگ ہیں جن کا کوئی رجسٹر نہیں ہوتا تھا اور وہ جملہ آزاد کردہ غلاموں میں داخل تھے۔بعض شراح کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مال کے آنے کے ابتدائی وقت میں مکاتبین کا حصہ دیتے تھے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیلئے مختص کیا تھا۔

۴۰۵۹: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اُتِيَ بِظَبْيَةٍ فِيْهَا خَرَزٌ فَقَسَمَهَا لِلْحُرَّةِ وَالْاَمَةِ قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ اَبِيْ يَقْسِمُ لِلْحُرِّ وَالْعَبْدِ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فی السنن ۳ / ۳۵۹' کتاب الخراج والامارة' باب فی قسم الفئ' الحديث رقم ۲۹۵۲ و أحمد فی المسند ٦ / ۱۵٦

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی گئی جس میں نگینے بھرے ہوئے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (نگینوں) کو آزاد عورتوں اور باندیوں میں تقسیم کر دیا''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ''میرے والد آزاد اور غلام مرد وزن میں (ان کی حاجت کے بقدر) تقسیم فرماتے۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: ان النبی ﷺ اتی بظبیۃ ......:

اتی بظَبْیَۃٍ'' اور ایک نسخہ میں'' اتی رسول اللہ ﷺ'' ہے۔

''النہایہ'' میں ہے کہ ''ظبیۃٌ'' سے مراد ہرن کی کھال کی چھوٹی سی تھیلی ہے جس پر بال ہوں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تھیلے کے مشابہ ایک چیز ہے۔

''خرزٌ'': خاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ القاموس میں ہے کہ جواہرات اور اس سے بنی ہوئی چیز مراد ہے۔ ''فقسمها للحرة و لأمة'' ان میں سے جو آپؐ کے پاس ہوتے یا جن کو آپؐ پہچانتے تھے انکے درمیان تقسیم کر دیتے تھے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ ''العبد'' اور ''الأمة'' سے مراد آزاد کردہ غلام یا مکاتب ہیں۔ اس لئے کہ مملوک کسی چیز کا مالک نہیں بنتا اور اس کا نفقہ اس کے مالک کے ذمہ ہوتا ہے بیت المال کے ذمہ نہیں ہوتا۔

۴۰۶۰: وَعَنْ مَالِكِ بْنِ اَوْسِ بْنِ الْحَدْثَانِ قَالَ ذَكَرَ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ يَوْمًا الْفَيْءَ فَقَالَ مَا اَنَا بِاَحَقَّ بِهٰذَا الْفَيْ مِنْكُمْ وَمَا اَحَدٌ مِنَّا بِاَحَقَّ بِهِ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا اَنَا عَلٰى مَنَازِلِنَا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَقَسْمِ رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَالرَّجُلُ وَ قِدَمُهُ وَالرَّجُلُ وَبَلَاؤُهُ وَالرَّجُلُ وَعِيَالُهُ وَالرَّجُلُ وَحَاجَتُهُ۔

(رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود في السنن، كتاب الخراج والامارة، باب فيما يلزم الامام من امر الرعية، الحديث رقم ۲۹۵۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت مالک بن اوس بن حدثان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مال فئ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ''اس مال'' فئے کا میں تم سے زیادہ حقدار نہیں ہوں اور نہ ہم میں سے کوئی شخص اس مال فئی کا کسی دوسرے سے زیادہ حقدار ہے البتہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی تقسیم کے مطابق اپنے اپنے مرتبہ پر ہیں چنانچہ ایک وہ شخص ہے جو (قبولیت اسلام) میں سبقت رکھنے والا ہے' ایک وہ شخص ہے جو (دین کی راہ) میں شجاعت و بہادری رکھنے والا ہے اور سعی و مشقت (کے اوصاف) رکھتا ہے' ایک وہ شخص ہے جو اہل وعیال رکھتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو ضرورت مند ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: '' فقال ما انا احق بهٰذا الفئی منكم''

''احق'': رفع کے ساتھ ہے۔ (أنا) مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے) اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ (مشابہ بلیس کی خبر ہونے کی وجہ سے) أی لست أولٰی طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''أحقُّ'' مرفوع مروی ہے اور یہ مذہب بنوتمیم کے مطابق ہے۔ اور ''نصب'' زیادہ معقول ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اگلے جملہ میں بھی ''ما'' نے عمل کیا ہے:

قولہ: ''وما آحدٌ منّا بأحق به من أحدٍ......وقسم رسول'' ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ محل نظر ہے، کیونکہ اس مجرور کے بارے میں دونوں احتمال ہیں کہ مرفوع بھی ہوسکتا ہے اور منصوب بھی ہوسکتا ہے اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ یہاں ''رفع''

زیادہ اولیٰ ہے تا کہ دونوں لغات پر عمل ہو جائے اور دونوں عبارتوں میں ''تفنن (پرکاری اور عمدہ تنوع)'' پیدا ہو جائے۔

''أحقُّ'' میں اشارہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے اس قدر حقدار نہیں ہیں جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حقدار تھے۔

''الاّ انا علٰی منازلنا'' طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''مستثنیٰ'' اعم ہے عبارت اس طرح ہوگی: ''لشیٔ من الأشیاء الاّ أنا علٰی منازلنا من کتاب اللّٰہ''۔ ''منازلنا'' سے حال ہے۔ أی حاصلة منه اھ۔

اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ استثناء منقطع ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی: ''لکن نحن علٰی منازلنا ومراتبنا المبینة من کتاب اللّٰہ'' جیسا کہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: [للفقراء المهاجرين] (سورة الحشر)۔ اور یہ ارشاد گرامی تعالیٰ: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ [التوبة۔ ۱۰۰] اور اس کے علاوہ بھی کئی آیات ہیں جو مسلمانوں کے مراتب اور منازل کے تفاوت پر دلالت کرتی ہیں۔

''وقسم رسول اللّٰہ'' یہ جر کے ساتھ ہے کیونکہ ''علٰی کتاب اللّٰہ'' پر عطف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم کرتے وقت اہل بدر، واہل بیعت الرضوان اور ذو المشاہر کے درمیان فرق کیا کرتے تھے۔

قوله: فالرجل قدمه ......:

''فالرجل'' یہ رفع کے ساتھ ہے۔ اور اسی طرح ''وقدمه'' بھی مرفوع ہے۔ ''قدمه'': قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ مراد وہ لوگ ہیں جو سابق فی الاسلام تھے۔ اور ایک نسخہ میں ان دونوں (یعنی قاف اور دال) کے فتحہ کے ساتھ ہے تقدیر کلام اس طرح ہے: ''فالرّجل یقسم له ویراعی قدمه فی القسم'' یا اس طرح ہوگی: ''أو الرجل ونصیبه علٰی ما یقتضیه قدمه'' او الرجل وقدمه بعتبران فی الاستحقاق وقبول التفاضل''۔

الرجل وقدمه اس طرح ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: الرجل وضیعته۔

''والرجل وبلاؤہ'' یعنی اس کی وہ بہادری اور بزدلی جس کی بناء پر اس کو اللہ کے راستے میں آزمایا جاتا ہے۔ اور مراد اس سے ان کی مشقت اور کوشش ہے۔

''والرّجل وعیاله''۔ عیال اس کو کہتے ہیں کہ جس کا خرچہ کسی کے ذمہ لازم ہو۔

''والرّجل وحاجته'': یعنی اس کی حاجت کے بقدر۔

ایک شارح کا کہنا ہے کہ ''کتاب المصابیح'' میں ''والرجل'' واؤ کے ساتھ ہے حالانکہ یہ نہ درایۃً صحیح ہے اور نہ روایۃً۔ یہ تو فاء تفصیلیہ کے ساتھ ''فالرجل وقدمه'' یہ ''الاّ انا علٰی منازلنا ......'' کے لئے بطور تفسیر کے ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مال فئے سے خمس نہیں نکالا جائے گا یہ مال عام مسلمین کیلئے ہوگا، ان کی مصالح پر خرچ ہوگا، کسی کو کسی پر اصل استحقاق میں کوئی ترجیح نہیں ہوگی۔ البتہ مراتب اور منازل کے اختلاف کے بدولت تفاضل میں تفاوت ہوگا۔

(اس تفاوت کی مرعددو جوہ ہو سکتی ہیں:)

① اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے استحقاق پر نص فرمائی ہے، خصوصاً مہاجرین والانصار کے بارے میں چونکہ ارشاد باری

تعالیٰ ہے:[والسّابقون الاوّلون من المهاجرين والآنصار]

۲ یا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو حق تقدیم عطا فرمایا ہے۔

۳ اس وجہ سے کہ یہ قدیم الاسلام ہیں

۴ اس وجہ سے کہ انہوں نے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا

۵ اس وجہ سے کہ یہ زیادہ ضرورت مند ہیں، اوران کے اہل وعیال زیادہ ہیں۔

۴۰۶۱: وَعَنْهُ قَالَ قَرَأَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَلْمَسَاكِيْنَ حَتّٰى بَلَغَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ فَقَالَ هٰذِهٖ لِهٰؤُلَاءِ ثُمَّ قَرَأَ وَاعْلَمُوْآ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ حَتّٰى بَلَغَ وَابْنِ السَّبِيْلِ ثُمَّ قَالَ هٰذَا لِهٰؤُلَاءِ ثُمَّ قَرَأَ مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى حَتّٰى بَلَغَ لِلْفُقَرَآءِ ثُمَّ قَرَأَ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ ثُمَّ قَالَ هٰذِهٖ اسْتَوْعَبَتِ الْمُسْلِمِيْنَ عَامَّةً فَلَئِنْ عِشْتُ فَلَيَاتِيَنَّ الرَّاعِيَ وَهُوَ بِسَرٍ وَحِمْيَرَ يُصِيْبُهٗ مِنْهَا لَمْ يَعْرِقْ فِيْهَا جَبِيْنُهٗ۔ (رواه فى شرح السنة)

اخرجه البغوى فى شرح السنة ١١ / ١٣٨' عبدالرزاق' المنصف' كتاب الجامع ' باب الديوان' الحديث رقم ٢٧٤٠۔

ترجمہ:''اور حضرت مالک بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: (جس میں زکوٰۃ کے مصارف کا بیان ہے) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ اور اس آیت کو انہوں نے عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ تک تلاوت کیا اور فرمایا کہ یہ (آیت) انہی لوگوں کے لئے ہے (جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے یعنی فقراء ومساکین وغیرہ) پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ اور اس آیت کو وَابْنِ السَّبِيْلِ تک پڑھا اور فرمایا کہ یہ (خمس کا مال) انہی لوگوں کا حق ہے (جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے یعنی ذوی القربیٰ وغیرہ) اس کے بعد انہوں نے یہ آیت پڑھی (جس میں مال فئے کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس کس کو دیا جائے) مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى اس آیت کو لِلْفُقَرَاءِ...... تک تلاوت کیا پھر اس کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی: وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ (ایک نسخہ میں یہ عبارت ہے کہ: حَتّٰى بَلَغَ لِلْفُقَرَاءِ ثُمَّ قَرَأَ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا اس کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ انہوں نے اس آیت مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ کو پڑھنا شروع کیا اور لِلْفُقَرَآءِ تک کی دو آیتوں کو پڑھا اور پھر یہ آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ تلاوت کی اور فرمایا کہ اس آیت نے تمام مسلمانوں کا احاطہ کرلیا ہے لہٰذا اگر میری زندگی رہی تو میری حدود خلافت میں کوئی ایسا مسلمان نہیں بچے گا جس کو اس کے حصہ کا مال نہ پہنچے گا یہاں تک کہ اس چرواہے کو بھی مال فے میں سے اس کا حصہ پہنچے گا جو مقام بسر اور حمیر میں ہوگا حالانکہ اس (مال کے حاصل کرنے میں اس کی پیشانی بھی پسینے میں شرابور نہیں ہوئی ہوگی''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله:قرأ عمربن الخطاب :انما الصدقات۔۔۔علم حكم:

انما الصدقات للفقرآء والمساكين والعاملين عليها والمولفة قلوبهم وفى الرقاب والغارمين وفى

سبيل اللّٰه و ابن السَّبيل فريضة من اللّٰه و اللّٰه عليم حكيمٌ]اس آیت میں مصارف زکوۃ کا بیان ہے۔

قوله:ثم قرأ :واعلموا ابن ۔۔۔قال هذا لهؤلاء:واعلموا انما غنمتم منْ شئ فان للّٰه خمسه وللرسول ولذى القربٰى واليتمٰى والمساكين وابن السبيل یہ آیت اہل خمس کیلئے ہے۔**ما آفآء اللّٰه علٰى رسوله من آهل القراى۔**

اس میں کوئی خفاءنہیں ہے کہ خوارج اور روافض اس آیت شریفہ میں دخول سے محروم ہیں ان کیلئے مالِ فئی میں کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے۔"واللہ اعلم"

پھر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیات عام مسلمانوں کو شامل ہے برخلاف دونوں سابقہ آیات کے کہ ان میں سے ایک آیت اہل زکوٰۃ کے ساتھ خاص ہے اور دوسری آیت اہل خمس کے ساتھ خاص ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں اموال فئے کی طرف اشارہ ہے جس پر آیت مذکورہ دلالت کررہی ہے[**ما آفآء اللّٰه علٰى رسوله**]یعنی یہ مال فئے ان کے مصالح اور حاجات کیلئے ہوگا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مال فئی سے خمس نہیں نکالا جائے گا جیسا کہ غنیمت سے خمس نکالا جاتا ہے۔بلکہ یہ مصالح مسلمین میں خرچ ہوں گے۔تفاوت درجات اور تفاوت طبقات کی بناء پر۔اور یہی عام اہل فتویٰ کا مسلک ہے۔سوائے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ وہ مال فئی میں بھی خمس کے قائل ہیں۔اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے چار اخماس بنا کر مقاتلین اور مصالح مسلمین میں خرچ ہوں گے۔

"شرح السنہ" میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ یہ آیات بعض بعض کے ساتھ منسوخ ہیں جبکہ جملہ مالِ فئی تمام مسلمانوں کیلئے ہوگا۔اس کو امام اپنی سمجھ کے مطابق صرف کرے گا اور یہی عام اہل فتوی کا قول ہے۔اور تفضیل میں سبقت ایمانی اور نسب میں اختلاف ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کے درمیان تسویہ کے قائل ہیں اور سبقت ایمانی کی وجہ سے کسی کو فضیلت نہیں دی یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ کیا آپ ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے اموال اور نفوس (جان) کے ساتھ جہاد کیا اور اپنے گھروں سے ہجرت کی اس کی طرح قرار دیتے ہیں جو اسلام میں مجبوراً داخل ہوا ہو؟۔تو انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ کیلئے عمل کیا ہے اور ان کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور دنیا تو بلاغ ہے۔جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں سبقت ایمان اور نسب کی وجہ سے فضیلت بعض پر دی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر فضیلت دیتے تھے۔اور فرماتے تھے کہ عائشہ تم میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ پسند تھی اور اس کے والد مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ محبوب اور پسندیدہ تھے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو مجھ سے زیادہ حصہ دیتے تھے۔میں نے کہا کہ میری اور اس کی ہجرت تو ایک ہی ہے۔تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا باپ تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھا اور یہ اسامہ تجھ سے زیادہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسندیدہ ہے۔اور تیرے ساتھ تو تیرے والد نے ہجرت کی ہے۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان تسویہ کی طرف ہے اور اس کو میراث کے مشابہ قرار دیا ہے۔جس میں نیک اور بد اولاد سب

برابر ہوتے ہیں۔اور سہم غنیمت بہادر اور بزدل کے درمیان برابر ہوتا ہے حالانکہ فتح بہادر کے ہاتھوں حاصل ہوتی ہے۔

قوله:''فلئن عشتُ......''

یعنی اگر میں بلاد کفار کی فتح تک زندہ رہا اور اموال فئے بکثرت حاصل ہوئے تو میں تمام محتاجوں کو ان کی ضروریات پہنچاؤں گا۔

''فليأتين الراعي وهو بسرو حمير'': ''راعی'' مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے۔سرو یمن کے نواحی میں واقع میں ایک علاقہ کا نام ہے۔اور ''حمیر'' یہ یمن کے ایک قبیلہ کے والد کا نام ہے۔''سرو'' حمیر کو اس کی طرف مضاف کیا ہے اس لئے کہ وہ ان کا محلّہ تھا۔اور بعض نے کہا ہے کہ ''سرو حمیر'' یمن کے علاقوں میں سے ایک جگہ ہے۔اور ''سر'' اصل میں اس کو کہتے ہیں جو نچلی جگہ سے اوپر ہو لیکن بہت اونچائی سے نیچے ہو۔اور ''سرو حمیر'' کو ذکر کیا کیونکہ اس کے اور مدینہ کے درمیان طویل مسافت تھی۔اور ''راعی'' کے ذکر میں مبالغہ مقصود ہے کہ حصّہ اور حق کو طالب اور حقدار تک پہنچایا جائے گا۔چاہے وہ حق کو طلب کر رہا ہو یا نہ کر رہا ہو۔قریب ہو بعید ہو فقیر ہو حقیر ہو راعی کو اس لئے ذکر کیا کہ راعی کو اس کا کام اس کے طلب حق سے کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا یا اس کی حقارت کی وجہ سے کہ اس کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔بلکہ کم ہی وہ جانتا ہے کہ اس کا بھی اس میں حق ہے۔

یہ جملہ مفعول سے حال ہے اور مفعول اور فاعل کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے ہے۔

''لم يعرق فيها'' یہ جملہ حالیہ ہے۔

۴۰۶۲: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ فِيمَا احْتَجَّ بِهٖ عُمَرُ قَالَ كَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثُ صَفَايَا بَنُو النَّضِيْرِ وَخَيْبَرُ وَفَدَكُ فَاَمَّا بَنُو النَّضِيْرِ فَكَانَتْ حُبُسًا لِنَوائِبِهٖ وَاَمَّا فَدَكُ فَكَانَتْ حُبُسًا لِاَبْنَاءِ السَّبِيْلِ وَاَمَّا خَيْبَرُ فَجَزَّأَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ثَلَاثَةَ اَجْزَاءٍ جُزْئَيْنِ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَجُزْءٌ نَفَقَةً لِاَهْلِهٖ فَمَا فَضَلَ عَنْ نَفَقَةِ اَهْلِهٖ جَعَلَهٗ بَيْنَ فُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه أبو داود في السنن ۳ / ۳۷۵' كتاب الخراج والامارة' باب في صفايا رسول الله صلى الله عليه وسلم من الاموال' الحديث رقم ۲۹۶۷۔

ترجمہ: ''اور حضرت مالک بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جس بات سے استدلال کیا وہ یہ تھی کہ انہوں نے فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ کے لئے تین جگہوں کا مال مخصوص تھا: (۱) بنو نضیر (۲) خیبر (۳) فدک۔ چنانچہ بنو نضیر (کے جلاوطن ہو جانے کے بعد ان کی جو زمین جائیداد قبضے میں آئی تھی اس سے حاصل ہونے والا مال) آپ ﷺ کے اخراجات (جیسے مہمانوں کی ضیافت و تواضع اور مجاہدین کے ہتھیاروں اور گھوڑوں کی خریداری وغیرہ) کے لئے مخصوص تھا' فدک کے محاصل (ان) مسافروں (کی امداد و اعانت کے لئے) مخصوص تھے (جو اگر چہ اپنے وطن میں تو مال رکھتے ہوں مگر سفر کے دوران ان کے پاس مال و اسباب ختم ہو گیا ہو) اور خیبر (کے

محاصل) کو رسول اللہ ﷺ نے تین حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا: ان میں سے دو حصے تو آپ مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے تھے اور ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے اخراجات کے لئے مقرر فرماتے اور اس میں سے بھی اہل وعیال کے خرچ سے جو کچھ بچ جاتا اس کو آپ ﷺ نادار مہاجرین پر خرچ فرما دیتے تھے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: كان فيما احتج فيه۔۔۔وخيبر وفدك: ''ان قال'': یہ ''كان'' کا اسم ہے۔ ''ثلاثة صفايا'' یہ اضافت کے ساتھ ہے۔ اور صفایا ''صفية'' کی جمع ہے۔ وہ چیز جس کو چنا اور جس کو پسند کیا جاتا ہے۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''الصفی'' اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کو امام سامان غنیمت میں سے اپنے لئے تقسیم غنیمت سے پہلے پسند کر لیتا ہے اور چن لیتا ہے۔ غلام لونڈی، گھوڑا یا تلوار وغیرہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا۔ اور ساتھ آپ ﷺ کیلئے خمس بھی خاص تھا۔ اور آپ ﷺ کے بعد کسی امام کیلئے بھی یہ حق نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت صفیہ بنت حیی بھی صفایا میں سے ہیں یہ آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہوئیں ان کو غنیمت میں سے اپنے لئے خاص کیا تھا۔

فدك یہ ایک گاؤں تھا جو حجاز کے نواح میں واقع ہے۔ ''القاموس'' میں ہے کہ ''فدك'' خیبر کے ایک گاؤں کا نام ہے۔

ایک نسخہ میں ''ثلاث'' تنوین کے ساتھ ہے اور ''صفايا بنى النضير'' آیا ہے۔ اور ''بنی'' صفایا کی اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ لفظ ''خیبر'' اور ''فدک کا'' آخر مفتوح ہو جبکہ نسخہ صحیحہ اور اصول معتمدة میں اس کے برعکس ہے۔ اگرچہ یہ بات درایت کے بھی خلاف ہے۔

قوله: فاما بنو النضير فكانت حبسالنوائبه ......:

لنوائبه: طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''نوائب'' ''نائبة'' کی جمع ہے۔

''واما فدك فكانت حبسًا لأبناء السَّبيل'' ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ ''فدك'' مسافروں اور ابناء سبیل کی حاجت اور ضرورت کیلئے شرعاً وقف کر دیا ہو۔

''وامَّا خيبر فجز أها رسول اللّٰه ثلاثة اجزاءٍ

''جزّا'' تشدید زاء کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے ''تقسیم کرنا''۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایسا اس لئے کیا کہ خیبر میں بہت سارے گاؤں تھے، جن میں سے بعض عنوۃً فتح ہوئے تھے، بعض صلحاً فتح ہوئے تھے۔ جو علاقے عنوۃً فتح ہوئے تھے اس میں آپ ﷺ کے لئے خمس الخمس ہوتا تھا۔ اور جو علاقے صلحاً بغیر قتال کے اور بغیر گھوڑے اور اونٹ دوڑانے کے فتح ہوئے تھے یہ مال فئی صرف خاص رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ اس کو آپ ﷺ وہاں خرچ کرتے تھے جہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کی ضرورت وحاجت اور مصالح مسلمین نبی کریم ﷺ کو سمجھائے تقسیم اور عدل کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے ان کے اور جیش کے درمیان تین حصے کر دیئے جاتے۔

الفصل الثالث:

۴۰۶۳:عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ اِنَّ عُمَرَبْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ جَمَعَ بَنِى مَرْوَانَ حِيْنَ اسْتُخْلِفَ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :كَانَتْ لَهُ فَدَكُ فَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيَعُوْدُ مِنْهَا عَلٰى صَغِيْرِ بَنِى هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا اَيِّمَهُمْ وَاَنَّ فَاطِمَةَ سَأَلَتْهُ اَنْ يَجْعَلَهَا لَهَا فَاَبٰى فَكَانَتْ كَذٰلِكَ فِىْ حَيَاتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا اَنْ وُلِّىَ اَبُوْبَكْرٍ عَمِلَ فِيْهَا بِمَا عَمِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَلَمَّا اَنْ وُلِّيَ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ عَمِلَ فِيْهَا بِمِثْلِ مَا عَمِلَ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهٖ ثُمَّ اقْتَطَعَهَا مَرْوَانُ ثُمَّ صَارَتْ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فَرَاَيْتُ اَمْرًا مَنَعَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَاطِمَةَ لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ وَاِنِّى اُشْهِدُ كُمْ اَنِّى رَدَدْتُهَا عَلٰى مَا كَانَتْ يَعْنِىْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :وَاَبِىْ بَكْرٍ وَعُمَرَ۔(رواه ابوداود)

اخرجه أبو داود فى السنن ۳ / ۳۷۸ ' كتاب الخراج والامارة' باب فى صفايا رسول الله صلى الله عليه وسلم من الاموال' الحديث رقم ۲۹۷۲۔

ترجمہ:اور حضرت مغیرہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز (بن مروان بن حکم رحمۃ اللہ علیہ) خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے مروان کے بیٹوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ کے لئے فدک (کی زمین و جائیداد) مخصوص تھی جس کے محاصل (آمدنی و پیداوار) کو آپ ﷺ (اپنے اہل و عیال اور فقراء و مساکین پر) خرچ فرماتے تھے' اسی میں سے بنو ہاشم کے چھوٹے بچوں (کی امداد و اعانت) پر خرچ فرماتے (ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے) اور بے شوہر عورتوں اور بغیر زن مردوں کی شادی کرتے تھے (ایک مرتبہ) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ فدک (کی زمین و جائیداد کو مجھے دیدیں (یا اس کی آمدنی میں سے میرا حصہ بھی مقرر کر دیجئے) لیکن آپ ﷺ نے ان کی درخواست کو (قبول کرنے سے) انکار کر دیا۔' رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اسی طرح معاملہ چلتا رہا (یہاں تک کہ آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے) اور جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو ان کا معمول بھی وہی رہا جو رسول اللہ ﷺ کا اپنی حیات مبارکہ میں رہا تھا (یعنی آپ ﷺ کے مذکورہ معمول کی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی فدک کے محاصل کو آپ ﷺ کے اہل و عیال اور بنو ہاشم کے بچوں اور نادار مردوں و عورتوں کی شادی میں خرچ کرتے تھے) معاملہ اسی طرح چلتا رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور (ان کے بعد) جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو اس سلسلہ میں ان کا بھی عمل وہی رہا جو ان دونوں (یعنی آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) کا رہا تھا یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور پھر مروان نے (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے

میں یا اپنی حکمرانی کے دور میں) اس (فدک) کو اپنی (اور اپنے وارثین کی) جاگیر قرار دے دیا پھر وہ جاگیر عمر بن عبدالعزیز بن مروان کی ہوگئی ہے' لیکن میں دیکھتا ہوں کہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے (اپنی بیٹی) فاطمہ رضی اللہ عنہا کو (مالکانہ حقوق کی بنیاد پر) نہیں دیا اس کا حقدار میں بھی نہیں ہوسکتا' لہٰذا میں تمہیں (اپنے اس فیصلہ کا) گواہ بناتا ہوں کہ میں نے فدک کو اس کی اسی حیثیت پر واپس کر دیا ہے۔ جس پر وہ تھا یعنی رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں (جس طریقہ پر اس کے محاصل کو خرچ کیا جاتا تھا (اب پھر اسی طریقہ پر خرچ کیا جائے گا اور فدک کسی شخص کی ذاتی جاگیر نہیں بنے گا)۔''۔(ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

مغیرة بن زیاد۔ یہ ''مغیرہ'' ہیں جو زیاد کے بیٹے ہیں اور بجلی وموصلی ہیں۔ انہوں نے عکرمہ اور مکحول سے اور جو دان سے وکیع اور ابوعاصم اور ایک جماعت نے روایت کی۔ امام احمد بن حنبل نے ان کو منکر الحدیث فرمایا اور یہ میں نے مغیرہ بن زیادہ کو صحابہ میں نہیں پایا۔

جاننا چاہیے کہ ''مغیرہ'' کا نام اسماء الرجال میں تین افراد پر بولا جاتا ہے:

(۱) مغیرۃ ابن شعبہؓ ان کا تعارف گذر چکا ہے۔ یہ صحابیؓ ہیں اور اطلاق کی صورت بظاہر وہی مراد ہوتے ہیں۔
(۲) ''مغیرۃ بن زیاد الموصلی'' انہوں نے عکرمہ اور مکحول سے روایات نقل کی ہیں۔ اور اس سے وکیع اور عاصم اور ایک جماعت نے روایات نقل کی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''منکر الحدیث'' ہیں۔ (۳) تیسرے شخص ''مغیرۃ بن مقسم الکوفی الفقیہ الأعمی'' ہیں ان سے ابووائل اور شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور ان سے شعبہ اور فضیل نے۔ اور جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے یہ روایت کی ہے: ''ما وقع فی مسامعی شئ فنسیته'' یعنی میرے کانوں میں جو بات پڑی میں اس کو بھولا نہیں۔ ان کی وفات ۱۳۳ھ کو ہوئی۔ یہ دونوں تابعی ہیں۔ البتہ مغیرہ بن شعبہؓ کی وفات ۵۰ ہجری میں ہوئی اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ۹۹ ہجری کو خلاف ملی ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا اجتماع ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا مؤخر الذکر دونوں میں کوئی ایک متعین ہے۔ تیسرا اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

تشریح:قوله:ان عمر بن العزیز...... ویزوج منها امیمهم:

'' استخلف '': صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

اس میں سے اپنے پر اور اہل اہل پر خرچ فرماتے اور بنو ہاشم کے چھوٹوں پر بھی خرچ فرماتے تھے جب ان کا نفقہ ختم ہو جاتا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کو مزید عنایت فرماتے تھے۔

''ایُّمهم'': ہمزہ کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ وہ شخص جو غیر شادی شدہ ہو۔ ''القاموس'' میں ہے کہ ''الایم ککیس ''من لا زوج لها بکرًا و ثیبًا و من لا امراۃ له''۔ یعنی ''ایم'' بروزن ''کیس'' ہے۔ (اس کا اطلاق مرد و زن دونوں پر ہوتا ہے) اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو چاہے باکرہ یا ثیبہ ہو اور اس مرد کو کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو۔

قوله:وان فاطمة سالته ......: ''مضی لسبیله'' یہ کنایہ ہے۔آپ ﷺ کی وفات سے۔

''**قطيعة**'': خراجی زمین کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں کہ جس کو سلطان اور بادشاہ جس کیلئے چاہے خاص کر دیتا ہے۔

''**مروان**'': سے مراد یہاں ''مروان بن الحکم'' ہے۔ یہ عمر بن عبدالعزیز کے دادا ہیں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں پیدا ہوئے لیکن نبی ﷺ کو نہیں دیکھا اس لئے کہ نبی ﷺ نے ان کے والد (مروان کے والد) کو طائف کی طرف جلا وطن کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان خلیفہ بنے تو انہوں نے ان کو مدینہ واپس بلا لیا چنانچہ وہ اپنے بیٹے مروان کے ساتھ مدینہ آ گئے ''**ثم صارت لعمر بن عبدالعزيز**''۔ ''الی'' کی جگہ پر ''لام'' ذکر کیا یہ بتلانے کیلئے کہ ان کا نفس اس پر راضی نہیں تھا۔ (بلکہ یہ غیر اختیاری طور پر ان کے پاس آئی تھی۔

❀ ❀ ❀